جنوری ۸۹ء

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہوتی۔ یہاں سے نوبل انعام یافتگان نکلتے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ملک کی سینکڑوں یونیورسٹیوں میں سے ہماری بھی ایک یونیورسٹی ہے اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ نہ تو یہاں کے طلبہ میں اور نہ اساتذہ میں محنت، لگن اور قربانی کا وہ جذبہ آسکا ہے جس سے تعلیمی ادارے اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔ اگر ہم میں آج سے وہ جذبہ پیدا ہو جائے اور ہم سخت محنت شروع کر دیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ہم کو اوپر جانے سے نہیں روک سکتی۔

سید ہاشم علی

مجلس ادارت

اغراض و مقاصد

۱ . جہل رجعت پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد - ذہنی بیداری، وانسوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء - ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت -

۲ . مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت -

۳ . ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش -

۴ . ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی -

۵ . ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا -

۶ . سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت -

۷ . علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف -

مقالہ نگاروں کیلئے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے -

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی -

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص [illegible] مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں -

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی - [illegible] پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے -

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید [illegible] ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر [illegible] ہے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے -

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور [illegible] الگ سے دی جائیں - شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں - [illegible] تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے [illegible] انہیں لگانا ہو -

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بلا وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے - باہر سے آنیوالے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو -

سرپرست : جناب سید هاشم علی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : اسرار احمد —— جوائنٹ ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : شباب الدین

تزئین : سرفراز —— انچارج سرکولیشن : مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ :	زر سالانہ	مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت	انڈیا Rs. 30.00	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔	بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک	ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,	عام ڈاک US $ 8.00	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY		انڈیا۔

مندرجات

اداریہ

سہارن پور کا شہران دنوں فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور وہاں کے امن و امان کو اس طرح کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ اس کے سدّباب کے لیے پیرا ملٹری فورس کو بلا لیا گیا ہے، اس کے باوجود مار پیٹ، دھینگا مشتی، لپا ڈگی کے واقعات برابر ہو رہے ہیں اور ایک فریق دوسرے فریق کو "واصل جہنم" کرنے کے "کارخیر" میں مصروف ہے۔ یہ ساری دھینگا مشتی ایک ہی فرقہ کے افراد کے درمیان برپا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دونوں ہی فریق کا خدا، رسول اور قرآن ایک ہے، دونوں ہی کے لبوں پہ ایک ہی کلمہ توحید جاری ہے۔ دونوں ایک ہی طرح نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، حشر و نشر پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی فریق ایسا نہیں ہے جو صراط مستقیم سے ہٹ گیا ہو۔ نہ تو کسی نے اللہ کی وحدانیت سے انکار کیا ہے نہ ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ہی سے، نہ انبیائے سابقین پر سے کسی فریق کا ایمان اٹھا ہے اور نہ ہی کسی فریق نے حشر و نشر کا انکار کیا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ کیوں برپا ہے۔ امن و امان عامہ کو خطرہ کیوں لاحق ہو گیا ہے، پیرا ملٹری فورس کو کیوں تعینات کرنا پڑا ہے؟ ان سوالوں کا جواب صرف اور صرف یہ ہے کہ مذکورہ فریقوں میں سے ہر فریق اس بات پر بضد ہے کہ مظاہر العلوم نامی دینی مدرسہ جس کو ایک عربی یونیورسٹی سمجھنا چاہیے، اس کے تصرف میں رہے۔

دارالعلوم دیوبند کے بدنما واقعات کی تلخ یادیں ابھی فراموش بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ مظاہر العلوم سہارنپور کے علمائے عظام و مفتیان کرام کے ہنگامۂ دار و گیر نے پوری قوم کو ایک سکتہ کے عالم میں مبتلا کر دیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اپنے آپ کو دوسروں سے ارفع و اعلیٰ، پاکباز و پارسا، زاہد و متقی اور صاحب عقل و دانش سمجھنے والے افراد اپنی انانیت کا اس طرح شکار ہو گئے ہیں کہ ان کو نہ تو نقصان مایہ کا احساس باقی رہ گیا ہے اور نہ ہی شماتت ہمسایہ کا۔ دونوں فریقوں پر ایک جنون کا سا عالم طاری ہے اور وہ ایک دوسرے کو لوح جہاں سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے زعم باطل میں اسی کو جہاد فی سبیل اللہ سمجھتے ہیں۔ جس قوم کے علمائے عظام و مفتیان کرام غیظ و غضب میں نعل در آتش ہو کر تخریب کاری پر اتر آئیں اس کے عوام کا اللہ ہی حافظ ہے۔ جماعتیں ہوں یا افراد، ان میں نظریاتی اختلاف کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔ ان اختلافات کو فرو کرنے اور امت کو افتراق و نفاق سے بچانے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے واضح احکام موجود ہیں جن کا علم ہم سے کہیں زیادہ ان علمائے عظام اور مفتیان کرام کو ہے جو بد قسمتی سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ کاش دونوں ہی فریق نفسانیت کا لبادہ اتار کر عاجزی و انکساری

کے جامے میں آجاتے اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے آگے سرِنیاز خم کر دیتے۔ شاید جگر مرحوم نے ایسے ہی افراد کے لیے کہا ہے ؎

باہمہ ذوقِ آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

مادرِ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ابنائے قدیم کو قومی پریس کے ذریعے یہ اندوہ ناک اطلاع مل چکی ہوگی کہ مادرِ علمی کے ایک نامور فرزند شعبۂ جغرافیہ کے سابق صدر اور ایک عہد کی یادگار پروفیسر سید محمد طاہر رضوی صاحب نے ستاسی سال کی عمر میں ۷ دسمبر ۱۹۸۸ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؁

پروفیسر طاہر رضوی صاحب نے اس صدی کے تیسرے دہے میں اپنی اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ بعد ازاں لندن تشریف لے گئے، جہاں سے انہوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ چوں کہ ان کی طبیعت کا رجحان تعلیم و تدریس کی طرف تھا اس لیے ایک بار پھر لندن تشریف لے گئے، اور ۱۹۳۶ء میں وہیں سے جغرافیہ میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اور اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ جغرافیہ میں استاد مقرر ہوئے۔ انھوں نے تقریباً ستائیس برس تک یونیورسٹی کی خدمت کی اور ۱۹۶۳ء میں جب کہ وہ شعبۂ جغرافیہ کے صدر اور فیکلٹی آف سائنس کے ڈین تھے، اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

طاہر رضوی صاحب کا شمار اس درس گاہ کے بڑے باا ثر اساتذہ میں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کی ہماری ابتدائی طالب علمی کی زندگی میں جب کہ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر اور پروفیسر یوسف حسین خاں مرحوم پرو وائس چانسلر تھے، طاہر صاحب مرحوم یوسف حسین خاں صاحب کے دستِ راست سمجھے جاتے تھے۔ اُس زمانے میں پروفیسر طاہر رضوی صاحب اور پروفیسر عمر الدین صاحب دو ایسے اساتذہ تھے جو یوسف حسین خاں صاحب کے افکار و خیالات کے اکیڈمک کونسل اور مجلس انتظامیہ دونوں ہی میں نہ صرف مؤید ہوتے بلکہ ان کے نفاذ کے لیے بڑی تگ و دو بھی کرتے۔ طاہر رضوی صاحب کے انتقال سے یونیورسٹی کے عہدِ رفتہ کی ایک اور زریں یادگار ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اعلیٰ درجات سے نوازے اور ان کے صاحب زادے ڈاکٹر سید ہادی رضا، استاد شعبۂ کیمیا کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

دوسرا علمی حادثہ پروفیسر سید حسن صاحب کا سانحۂ ارتحال ہے۔ انھوں نے ۱۶ر نومبر ۱۹۸۸ء کو پٹنہ میں اٹھتر سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ وہ ملک کے نامور محقق اور نقاد تھے اور پٹنہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ فارسی۔ ان کے علمی کارناموں کی بدولت ان کو بہت سے انعامات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے فارسی کا سارٹی فکٹ آف آنر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے تحقیق و تنقید کا انعام بھی اُن کو ملا تھا۔ ان کی وفات سے علمی و ادبی دنیا کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اُن کو غریقِ رحمت فرمائے۔ آمین

SYED HASHIM ALI
VICE-CHANCELLOR

OFFICE : 3994
RES. : 3173
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202002
U. P. INDIA

ہندوستان کے چپے چپے اور کونے کونے میں پھیلے ہوئے تہذیب الاخلاق کے قارئین کو نیا سال مبارک ہو۔ خدا کرے یہ آپ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا سال ہو اور گذشتہ سال حکمت عملی اور بر وقت فیصلے کی کمی کی وجہ سے آپ نے جو کچھ گنوایا ہو، اس کو نہ صرف حاصل کرنے میں کامیاب ہوں بلکہ اس بات پر بھی قادر ہو سکیں کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق لیں اور اس بات کا عہد کریں کہ آپ اُن غلطیوں کو دہرا کر اپنے ہی ہاتھوں اپنی محرومی کا سامان مہیا نہ کریں گے۔ میری دعا ہے کہ سارے قارئین تہذیب الاخلاق خواہ وہ طالب علم ہوں یا استاد، انتظامیہ کے اراکین ہوں یا آزاد پیشوں سے وابستہ افراد اپنے اپنے مقاصد میں نہ صرف کامیاب ہوں بلکہ ملت و ملک کے لیے بھی باعثِ فخر بنیں۔ آمین

اِدھر کچھ عرصے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام نہاد بہی خواہوں نے پھر افواہوں کا بازار گرم کر رکھا ہے اور یہاں کے طلبا، اساتذہ، انتظامیہ اور وائس چانسلر کے بارے میں طرح طرح کی منت گڑھت، بے بنیاد اور دروغ گوئی کی شاہ کار خبروں کو عام کرنے میں شب و روز مصروف ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اِس یونیورسٹی پر پولس کی حکمرانی ہے تو کبھی یہ الزام تراشی ہوتی ہے کہ طلبا کو عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے، کبھی بدعنوانی کے افسانے تراشے جاتے ہیں تو کبھی غبن کی داستان۔ ان افسانوں اور داستانوں کو سن کر اس درس گاہ کے قدیم طلبہ اور ہمدردوں کا مضطرب اور فکر مند ہونا ایک فطری امر ہے۔ میں تہذیب الاخلاق کے ذریعے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تمام قدیم طلبہ، موجودہ طلبہ کے سرپرستوں اور یونیورسٹی کے تمام بہی خواہوں کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اِس یونیورسٹی پر پولس کی حکمرانی نہیں ہے طلبا کو تقریر و تحریر کی آزادی حاصل ہے اور نہ کسی بدعنوانی کا کوئی وجود ہے نہ ہی غبن کا کوئی واقعہ ہوا ہے۔ یہ تمام باتیں شکست خوردہ اور بیمار ذہنیت کے وہ افراد پھیلا رہے ہیں جو یہاں کے طلبا کو اطمینان اور سکون کی فضا میں اپنی تعلیم مکمل کرتے ہوئے، اساتذہ اور انتظامیہ کے اراکین کو اپنے اپنے فرائض منصبی سے عہدہ بر آ ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا مقصدِ حیات تو اپنی لیڈری کو چمکانا ہے خواہ یونیورسٹی کے سر سے جوئے خوں ہی کیوں نہ گذر جائے۔

ایک مومن کا دوسرے مومن کے لیے سب سے بڑا تحفہ دعائے خیر ہے۔ میں قارئین تہذیب الاخلاق

کے حق میں اپنے معبود کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ اُنھیں دینی اور دنیوی کامیابیوں اور کامرانیوں سے نوازے اور ان کو قردن ادلےٰ کا مومن بنائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں امید کرتا ہوں کہ قارئین تہذیب الاخلاق میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں گے اور معبود برحق سے اس بات کی التجا کریں گے کہ وہ مجھ کو اتنی قوت وطاقت دے کہ میں سترہ ہزار طلبہ کے مستقبل کو کسی طرح بھی خطرے میں نہ پڑنے دوں اور اس درس گاہ کو پیش رفت کی راہوں پر گامزن رکھوں خواہ طلبہ اور اس درس گاہ کے نام نہاد بہی خواہ کتنی ہی الزام تراشیاں کیوں نہ کرتے رہیں۔

میں ایک بار پھر آپ سب کو سالِ نو کی مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ یہ سال آپ کی زندگی کا ایک اہم اور یادگار سال بنے۔ آمین۔

۲۴-۱۲-۱۹۸۸ء

مسدس حالی سے چند بند

(مسدس مدوجزر اسلام جو عام طور سے مسدس حالی کے نام سے معروف ہے، حالی نے ۱۸۷۹ء میں سرسید کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس مسدس میں مسلمانوں کی جس زبوں حالی کا نقشہ کھینچا گیا ہے کم و بیش آج بھی مسلمانوں کا وہی عالم ہے۔ اسی لیے تہذیب الاخلاق مسدس حالی کے چند بند شائع کر رہا ہے۔) (ادارہ)

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے — فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے — چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت — نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت — خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں دوستی آشکارا
غرض کی تواضع غرض کی مدارا

پر اس قوم غافل کی غفلت وہی ہے — تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے — ہوئی صبح اور خواب راحت وہی ہے
نہ افسوس انھیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

نہ اہل حکومت کے ہم راز ہیں ہم — نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایان اعزاز ہیں ہم — نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے — کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے — ہمارا قدم ننگ اہل وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

تنزل نے کی ہے بری گت ہماری — بہت دور پہنچی ہے نکبت ہماری
گئی گزری دنیا سے عزت ہماری — نہیں کچھ ابھرنے کی صورت ہماری
پڑے ہیں اک امید کے ہم سہارے
توقع پہ جنت کی جیتے ہیں سارے

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں — جمادات کی طرح بار زمیں ہیں
ہیں دنیا میں ایسے کہ گویا نہیں ہیں — زمانے سے کچھ ایسے فارغ نشیں ہیں
کہ گویا ضروری تھا جو کام کرنا
وہ سب کر چکے ایک باقی ہے مرنا

خطبۂ صدارت

از

سید ہاشم علی

[یہ خطبہ سینٹر فار پروموشن آف سائنس کے دینی مدارس کے اساتذہ کے سائنسی تعارفی تربیتی کورس کے افتتاحی اجلاس میں دیا گیا]

حضرات!

میں آپ لوگوں کو مولانا نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ آپ لوگ اتنے نوجوان ہیں کہ میری عمر کے آدمی کو آپ حضرات کو مولانا کہہ کر مخاطب کرنا میری سمجھ سے مناسب نہ رہے گا۔ ویسے آپ کی علمیت اور لیاقت پر مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔

آپ لوگ جب اس ہال کے اندر داخل ہو رہے تھے تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تقریباً آپ سبھی نوجوان ہیں۔ اس لیے بجا طور پر آپ سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس ٹریننگ کے دوران جو باتیں بتائی جائیں گی آپ انھیں بغور سنیں گے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ واپسی پر آپ اپنے ساتھ وہ ساری معلومات لے جائیں گے جو آپ کو دی جائیں گی اور ساتھ میں آپ تھوڑا سا بدلا ہوا ذہن بھی لے جائیں گے۔

ہم آپ کو یہ یاد دلانا چاہیں گے کہ ہم جس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، وہ چودہ سو سال پہلے دنیا کے سب سے بڑے انقلاب کی شکل میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ انقلاب ایک ایسے وقت میں آیا تھا جب ایک سے زیادہ خداؤں کی بات ہوتی تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خدا کا پیغام دیا تو اس زمانے کے قدامت پرستوں کے نزدیک یہ 'کفر' تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ جب ہر قبیلے کے الگ الگ خدا ہیں اور جب کعبہ میں بت کی شکل میں اتنے سارے خدا ہیں تو یہ بشر (صلی اللہ علیہ وسلم) کس طرح ایک خدا کی بات کرتا ہے۔ اس انقلاب کا تعلق صرف تصور خدا سے ہی نہ تھا بلکہ یہ انقلاب پوری انسانی معاشرت پر محیط تھا۔ آنحضرتؐ نے عورتوں کے جو حقوق بتائے وہ اس زمانے میں کسی اور مذہب میں حاصل نہ تھے۔ اسلام نے انسانی مساوات کا جو تصور دیا وہ آج بھی مشعل راہ ہے۔ خدا کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ اس کے یہاں انسان کے حسب ونسب کی نہیں بلکہ انسان کے کردار کی اہمیت ہے، 'تقوی' کی اہمیت ہے۔ خدا کے یہاں عزت کی بنیاد جاگیرداری، نوابی یا دولت نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

اس طرح دیکھیے تو آپ ایک بڑے انقلاب کے پیروکار ہیں، اب غور طلب بات یہ ہے کہ اس دور کے قدامت پرستوں کی سخت مخالفت کے باوجود اس انقلاب کے پیروکار ایک بہت چھوٹی اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی ایک قلیل عرصے میں دنیا کے ایک بڑے حصے پر حاوی ہو گئے تھے اور دور دراز کے علاقوں میں اسلام کی صداقت کا علم بلند کر دیا تھا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ صحیح معنوں میں اسلام کے پیرو تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے کردار کو دیکھ کر دوسرے لوگ متاثر ہوتے تھے اور ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ سوال یہ ہے

کہ آج ہم اسی انقلاب کے پیروکار اس لائق کیوں نہیں کہ دنیا کو متاثر کرسکیں۔

ہندوستان میں دینی مدارس اور مکاتیب کی تاریخ بہت پرانی ہے اور مسلمانوں کی تعلیم کے میدان میں ان کی نمایاں خدمات ہیں۔ مسلمان بچوں کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنانے اور مذہب سے واقف کرانے میں بالعموم ان مدارس کا بڑا اہم رول ہے۔ اس لیے ہمیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ان مدارس میں علم عقیدہ جیسے فلسفہ اور منطق وغیرہ کی جو کتابیں آج پڑھائی جا رہی ہیں وہ وہی ہیں جو صدیوں پہلے نصاب میں داخل کی گئی تھیں، جب کہ اس دور میں ان علوم کی ترقی کا یہ حال ہے کہ وہ ہر سات سال بعد دوگنا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ۱۹۴۴ء میں جب میں نے ایم۔ایس سی پاس کیا تھا، اس وقت یہ پڑھایا جاتا تھا کہ پودوں یا جانوروں کا کام کوڈ ناقابل تقسیم ہے۔ اسی طرح تقریباً ایک صدی پہلے تک یہ خیال رائج تھا کہ مادے کا ایٹم ناقابل تقسیم ہے لیکن آج سبھی یہ ماننے لگے ہیں کہ یہ چیزیں ناقابل تقسیم نہیں ہیں۔ یہ ٹوٹ سکتی ہیں، بکھر سکتی ہیں اور ان میں خدا کی قدرت کے ایسے مناظر پوشیدہ ہیں جن کا تصور بھی محال ہے ایٹم کے مرکزے جیسی چھوٹی شئے میں قدرت نے کتنی توانائی مرکوز کر دی ہے، اس کا صحیح اندازہ وہی کرسکتا ہے جو ان چیزوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ آپ نے ایٹم بم کا نام سنا ہوگا۔ ایک ادنیٰ ایٹم بم میں اتنی طاقت پوشیدہ ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں کئی سو ڈائنامائٹ ہیچ ہے۔ یہ خدا کی کاریگری کی محض ایک ادنیٰ مثال ہے کہ کس طرح خدا نے ایک نقطے سے کم حجم میں لامتناہی توانائی کو مرتکز کر دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا کی قدرت اور اس کی عظمت کا صحیح اندازہ وہی کرسکتا ہے جو اس کی کائنات اور تخلیقات کا صحیح طور پر گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے۔ اگر آپ کو یہی نہیں معلوم کہ یہ کائنات کتنی وسیع ہے تو پھر آپ خالق کائنات کا صحیح اندازہ کیسے کرسکتے ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ بھی یہ اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ماضی میں ان کی سیاسی برتری کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہے کہ وہ اس دور کے علوم جدیدہ بشمول سائنس اور ٹکنالوجی کے امام تھے۔ وہ ان علوم کو جنگی معاملات میں بروئے کار لاتے تھے جس کی وجہ سے ان کی جنگی چالیں اور صلاحیتیں دوسری اقوام کے مقابلے میں بہتر تھیں۔ جب سے مسلمانوں کی علم سے رغبت کم ہوگئی، ان کی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا اور ان پر زوال آگیا۔ اس وقت دنیا میں ہر پانچ آدمی میں ایک مسلمان ہے۔ یعنی اگر دنیا کی آبادی پانچ سو کروڑ ہے (جیسا کہ لگ بھگ ہے) تو اس میں سے ایک سو کروڑ مسلمان ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہم جہاں کہیں ہیں پسماندہ ہیں، دوسروں سے پیچھے ہیں۔ ان ممالک میں بھی جہاں ہم اقلیت میں ہیں اور ان میں بھی جہاں ہماری اکثریت ہے۔ آج کچھ ایسے مسلم ممالک ہیں جنھیں خدا نے تیل کی دولت سے مالامال کر رکھا ہے اور ان کے پاس اربوں کھربوں کی دولت ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ صحیح معنوں میں آزاد نہیں ہیں ان میں سے بیشتر مغرب کے غلام ہیں۔ انہیں اپنے دفاع کے لیے ایک ایک کارتوس ایک ایک بندوق اور ایک ایک جہاز کے لیے مغرب کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ گذشتہ پانچ صدیوں میں ہم نے سائنسی علوم کی تخلیق کا ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جو ہماری دنیوی ترقی میں معاون ہو۔ یہ ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے سائنس اور ٹکنالوجی کے کارنامے جن سے پوری انسانیت فائدہ اُٹھا رہی ہے، عیسائیوں اور یہودیوں کے ہیں۔ ہماری موجودہ پستی کی ایک بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہم نے خدا کی کائنات پر غور و فکر کرنا ترک کر دیا ہے اور اس کی مخلوق کی بہبودی کے کام کرنے کی روش سے ہٹ گئے ہیں۔

آج سے تقریباً سو سال پہلے جب علی گڑھ تحریک شروع ہوئی تھی تو سرسیدؒ نے یہ محسوس کیا کہ باوجودیکہ اسلام ہمیں ترقی کی راہ دکھلاتا ہے، ہم تنزلی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم حالات کے ساتھ مطابقت نہیں کرسکتے۔ اس خامی کی ایک چھوٹی سی مثال ماضی سے پیش کروں گا۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ مغلوں کے دورِ حکومت میں ملک کی زبان فارسی تھی۔ جب اُن کا زوال ہونے لگا اور انگریزوں کی حکومت پھیلنے لگی تو آخرالذکر نے یہ محسوس کیا کہ فارسی تو صرف ملک کے حکمران طبقے کی زبان ہے۔

ملک کے عوام کی زبان فارسی آمیز ہندی ہے جسے اردو کہا جاتا ہے اس لیے شمالی ہندوستان میں جہاں جہاں ان کا قبضہ ہوتا گیا، انھوں نے عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اردو کو رائج کردیا۔ اس کے برخلاف ریاست حیدرآباد میں جہاں خود مسلمانوں کی حکومت تھی اور جہاں کا میں رہنے والا ہوں، شمالی ہند میں اردو کی ترویج کے پچاس سال بعد تک بھی فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ وہاں ۱۸۸۴ء میں پہلی دفعہ اردو کو سرکاری زبان بنایا گیا۔ وہاں آج بھی ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو فارسی ہی کو پڑھنا پسند کرتے ہیں حالاں کہ ملک میں اب نہ تو فارسی رہی اور نہ ہی اردو کو وہ مقام حاصل رہا۔ اب تو ہر صوبے کی اپنی زبان ہے جس کو سیکھنا ضروری ہے۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں، ان سے مطابقت کے بغیر ترقی کا حصول ناممکن ہے۔ چنانچہ حیدرآباد کی سلطنتِ اسلامیہ آصفیہ میں بھی جب اردو رائج ہوگی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو پڑھائی جانے لگی تو قدیم مدارس کے فارغین کو جو عالم فاضل کہلاتے تھے اور جنھیں بی۔ اے (B.A) کے مساوی قرار دیا گیا تھا نوکریوں کے حصول میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ ان کے مقابلے میں بی۔ اے (B.A) کو ترجیح دی جاتی تھی۔ یہ فضلا، لاکھ کہتے تھے کہ ہم تو بی۔ اے کے برابر ہیں مگر ان کو نوکری نہیں ملتی تھی۔ کیوں کہ اب عربی و فارسی کے بجائے اردو اور علوم جدیدہ کا زمانہ آگیا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صرف زبان کے معاملے میں ہی حالات سے مطابقت نہ کرسکنے کی وجہ سے کس طرح ترقی اور ایک بہتر زندگی کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ جب کہ مذہبی نقطۂ نظر سے سب زبانیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں۔ قرآن شریف میں صاف صاف اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ خدا نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے ہیں جو اُن کی زبان میں اللہ کا پیغام دیتا تھا۔

در اصل ہماری پسماندگی کی ایک بنیادی وجہ یہ رہی ہے کہ ہم بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت نہیں کر پا رہے ہیں۔ زمانے میں جو رفتہ رفتہ تبدیلیاں آرہی ہیں، انھیں سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ آج ہم سائنس میں پسماندہ ہیں جب کہ ماضی میں ہم سائنس کے امام تھے۔ عربی میں سائنس کے معنی 'علم' کے ہیں۔ اس کو عربوں نے اور مسلمانوں نے خوب ترقی دی۔ مگر آج یہی سائنس ہمارے لیے شجرِ ممنوعہ بنا دی گئی ہے۔ اس کی وجہ ہمارا بدلتے حالات سے مطابقت نہ کرسکنے کی صلاحیت کھو بیٹھنا ہے۔ اپنی اس کمی کی وجہ سے ہم نے اسلام جیسی عظیم تحریک کو جامد کردیا ہے۔ اسے قدامت پرستوں اور دقیانوسیوں کا مذہب بنا دیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک مثال پیش کروں گا۔ تقریباً تین سال پہلے ایک امریکن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ دس سال پہلے امریکہ میں جتنے لوگ مسلمان ہوتے تھے اب نہیں ہو رہے ہیں۔ جب میں نے یہ پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا لوگ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام میں وہ خوبی نہیں ہے جسے سمجھ کر لوگ مسلمان ہو رہے تھے تو اس نے جواب دیا نہیں یہ بات نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام کی تبلیغ کا جو طریقہ دس سال پہلے اپنایا گیا تھا وہ اب اتنا موثر نہیں رہا ہے۔ جب کہ مبلغین اسی طریقے پر کاربند ہیں۔ پچھلے دس سالوں میں اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے طریقوں میں کافی تبدیلی آگئی ہے اور اب لوگ پرانے طریقے پر پہنچائے گئے پیغام پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ غور کیجیے! کس طرح مسلمان زمانے کے رجحانات کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے اسلام کے اعلیٰ پیغام کو دوسروں تک نہیں پہنچا پا رہے ہیں۔

کچھ دنوں پہلے میں دیوبند گیا تھا۔ وہاں کے شیخ الحدیث کے بیٹے امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہ ہر سال مغرب کی سمت سے ہوائی جہاز سے اڑ کر جاتے ہیں اور مشرق کی سمت سے واپس آتے ہیں۔ اس طرح خوب معلوم ہے کہ دنیا گول ہے لیکن وہاں پر رائج متعلقہ کتابوں میں لکھا ہے کہ دنیا چپٹی ہے۔ قرآن شریف میں یہ کہا گیا ہے کہ چاند اور سورج اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ پہلے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات واضح طور پر نہیں آتی تھی۔ کیونکہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا چپٹی ہے۔ ماضی میں عیسائیوں میں بھی یہ تصور عام تھا کہ دنیا چپٹی ہے اور جب یہ کہا گیا کہ دنیا گول ہے تو بڑی زبردست مخالفت ہوئی۔ اس حد تک کہ ایک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا نام تھا
The earth is Flat Society (زمین چپٹی ہے سوسائٹی)

اس سوسائٹی کا نعرہ تھا:

"دنیا چپٹی ہے، دنیا چپٹی ہے، میری ٹوپی سے
بھی زیادہ چپٹی ہے۔"

ان مثالوں کو پیش کر کے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ آپ کے مدارس میں جو نصاب رائج ہے، وہ کافی پرانا ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ اپنے نصاب اور طریقۂ تعلیم میں زمانے کے لحاظ سے تبدیلیاں لائیں۔ تبھی آپ اسلام کے آفاقی پیغام سے دوسروں کو متاثر کر سکیں گے۔

اب میں کچھ سائنس کے موضوع پر گفتگو کروں گا اور مثالیں پیش کر کے یہ بتاؤں گا کہ سائنس کیا ہے؟ عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سائنس انسان کو خدا سے دور کرتی ہے۔ میں سائنس کا ایک طالب علم رہا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ سائنس خدا سے دور نہیں بلکہ نزدیک کرتی ہے۔ انسانی خونی ساخت ہی کا اگر آپ بغور مطالعہ کریں تو خدا کی قدرت پر عش عش کرنے لگیں گے کہ خون کس طرح آپ کے جسم میں گردش کر رہا ہے۔ اس میں کتنے سو کیمیائی مرکبات ہیں، کن طریقوں سے یہ وریدوں سے شریانوں میں آتا ہے اور کس طرح سے اس میں آکسیجن جذب ہوتی ہے۔ انسانی جگر ہی کو دیکھیے یہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ کلو کا ہوتا ہے مگر اس کے اندر تقریباً تین سو پچاس ایسے پیچیدہ مرکب بنتے ہیں کہ اگر انہیں کسی کارخانے میں تیار کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید علی گڑھ جیسے دس شہر لگانے پڑیں گے۔ اس طرح خدا کی قدرت کا صحیح اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اُن چیزوں کا مطالعہ کرتا ہے اور اسی مطالعے کا نام سائنس ہے۔ دراصل سائنس ہر وہ علم ہے جس کا تعلق موجوداتِ کائنات ہو۔

ہندوستان میں سر سیّد وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے جدید سائنس کی تعلیم پر زور دیا لیکن ساتھ میں انھوں نے دینی تعلیم کو بھی ضروری سمجھا۔ چنانچہ یہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینیات کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح یہاں سے ایسے مسلمان نوجوان نکلتے ہیں جو اپنے دین سے بھی واقف ہیں اور جدید علم بھی رکھتے ہیں۔ وہ دنیا میں دوسروں کے شانہ بشانہ چل سکتے ہیں اور جدید دنیا کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ آج کے زمانے کا تقاضا یہی ہے کہ قوم میں ایسے نوجوان پیدا ہوں جو صحیح معنوں میں مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ علومِ جدیدہ کے ماہر ہوں۔ یہی سر سیّد کی علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔ اب اس بات کا اعتراف تقریباً سبھی لوگ کرتے ہیں کہ سو سال پہلے سر سیّدؒ نے جو بات کہی تھی یا جو راہ دکھائی تھی وہی صحیح ہے۔ غور کیجیے اگر سر سیّدؒ نے یہ ادارہ نہ قایم کیا ہوتا تو کیا ہم میں وہ شعور پیدا ہو سکتا تھا کہ ہم ملک میں برابر کی حیثیت کے شہری کے اپنے حقوق کو پہچانیں۔ نہ تو میں یہاں بہ حیثیت وائس چانسلر کے کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ ہی مسلم کمیونٹی میں ان پروفیسروں کے ہم پلہ لائق آدمی ملتے۔ ہم لوگ جتنے پسماندہ ہیں اس سے بھی زیادہ پسماندہ ہوتے۔ پس یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم سر سیّد کی بتائی ہوئی ترقی کی راہ پر چلیں اور ترقی کرتے ہوئے پھر اسی اعلیٰ مقام کو حاصل کر لیں جو صدیوں پہلے ہمیں حاصل تھا۔ کیا یہ بات باعثِ شرم نہیں، مسلمان دنیا میں ہر جگہ علمی لحاظ سے اور کردار کے لحاظ سے سب سے پیچھے ہیں۔ ان خطوں میں بھی جہاں اُن کی حکومتیں ہیں اور ان میں بھی جہاں وہ اقلیت میں ہیں ہر جگہ پسماندگی کا حال یکساں ہے۔ کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ ہماری پسماندگی کی یہ حالت برقرار رہے؟ یقیناً نہیں۔

میں جب کبھی دینی مدارس کے فارغین کے مستقبل کی بابت غور کرتا ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر کی نگاہ کسی مسجد میں پیش امامی یا مؤذنی کے عہدے پر ہوتی ہے یا وہ سائیکل مرمت کرنے کی دوکان کرنے یا اسی قسم کے چھوٹے موٹے کاروبار کرنے کی بات سوچتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ وہ ملک میں وزیر، فوج کے سپہ سالار یا کسی سائیکل کارخانے کے مالک بننے کی بات سوچتے۔ جب کہ یہ سب راہیں ملک میں کھلی ہیں۔ جب آپ اسلام کے اچھے زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے زمانے کا بھی ذکر کرتے ہیں، جب اسلام کو ہر میدان میں برتری حاصل تھی جب ہم اس زمانے کا ذکر فخر سے کرتے ہیں تو پھر اسے حاصل

کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ؟ آپ ان علوم کو کیوں نہیں حاصل کرتے جن کے بغیر اس دور میں برتری کے اس مقام پر پہنچنا ناممکن ہے۔ آپ ان فنون میں مہارت کیوں نہیں حاصل کرتے جن کے بغیر ترقی کرنا محال ہے۔ آپ لوگ اگر اس خوش گمانی میں مبتلا ہوں کہ صدیوں پرانے عقلی علوم کو پڑھا کر مسلمانوں کو ان کے پرانے مقام پر لا سکیں گے تو اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

آخری بات کے طور پر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قرآن شریف جو ہم سب لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے، کھلا ذہن بناتا ہے۔ اس میں بار بار غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ صاحب کردار اور صاحب عمل بننے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ صاف صاف کہا گیا ہے کہ نیکی مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لینے کا نام نہیں، نیکی صاحب کردار بننے میں ہے، نیکی صاحب عمل بننے میں ہے۔ یہاں جو کورس آپ کو دیا جائے گا اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ علمی لحاظ سے دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم مسلمان کہاں گرے ہوئے ہیں اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ علم میں اور کردار میں ہم بلند تر ہوں۔ سوچیے! جس قوم کو سات سو سال تک سیاسی بالاتری حاصل رہی ہو آج اس کا شمار پسماندہ اقوام میں ہو رہا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے اپنے آپ کو پسماندہ کہتے ہوئے۔ جی چاہتا ہے کہ پکار کر کہوں کہ ہم پسماندہ نہیں ہیں اور نہ رہنا چاہتے ہیں، لیکن لوگ ہمیں پسماندہ نہ کہیں تو کیا کہیں۔ غلطی خود ہماری اپنی ہے یہ ہماری فکری کجروی ہے جس نے ہمیں پسماندہ کر رکھا ہے۔ اگر ہم زمانے کے ساتھ چلتے رہے ہوتے تو آج ہماری یہ درگت نہ بنتی اور زمانے کے ساتھ چلنے سے اسلام خطرے میں نہیں آتا بلکہ زمانے سے پیچھے رہنے سے اسلام خطرے میں پڑتا ہے۔

میری دعا ہے کہ آپ لوگ یہاں سے کچھ سیکھ کر جائیں ہم پر غلط فکر سرایت کر گئی اور جو ہماری پسماندگی کی بنیادی وجہ ہے، اسے محسوس کریں اور یہ کوشش کریں کہ ہمیں وہ مقام دوبارہ حاصل ہو جائے جس کے ہم مستحق ہیں۔

شکریہ۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۹ء)

انسانیت

سید حامد*

انسانیت انسان ہونے کو تو کہتے ہی ہیں لیکن اس کا ایک مفہوم اور بھی ہے، اور اسی مفہوم سے ہمیں اس وقت سروکار ہے یعنی انسان کو انسان سمجھنا۔ بات ابھی تک ادھوری ہے۔ انسان کو انسان سمجھ کر بیٹھ جایے تو "انسانیت" آپ کے ساتھ منسوب نہیں کی جائے گی۔ شرط یہ ہے کہ آپ کے برتاؤ سے یہ ظاہر ہو کہ آپ انسان کو انسان سمجھ رہے ہیں۔ سکندر نے پورس سے پوچھا تھا:
"آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے؟"

جواب ملا:

"جیسا بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں"

انسانیت سے مراد ہے انسان کا انسان کے ساتھ انسان جیسا برتاؤ کرنا۔ بظاہر یہ بات کچھ دشوار نظر نہیں آتی، لیکن غور کیجیے تو آسانیاں روپوش ہونے لگیں گی۔

مان لیجیے کوئی شخص تکلیف میں ہے؛ آپ سے مدد مانگنے آیا ہے۔ آپ چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تم نے ایسی غلطی کیوں کی جس کی وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑی اور پھر بادل ناخواستہ اس کی مدد کر دیتے ہیں۔ آپ نے وہ انسانی فرض ادا کر دیا کہ مصیبت میں ایک انسان کا ہاتھ پکڑا، لیکن آپ نے انسانیت کا برتاؤ ہرگز نہیں کیا۔ آپ نے اپنے آپ کو اس سے اوپر رکھا، اس پر نکتہ چینی کی اور اس پر یہ ظاہر کر دیا کہ آپ احسان کر رہے ہیں۔ کلام مجید میں آیا ہے کہ احسان اس طرح نہ کرو کہ ایذا پہنچے، احسان جتا کر تکلیف نہ پہنچاؤ۔

بعض لوگ نوکروں سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں گویا وہ انسان ہی نہیں وہ تو زرخرید مشینیں ہیں، انھیں آرام کی کیا ضرورت۔ اور دل میں یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ نوکر کام کرنے کے لیے ہی تو رکھا گیا ہے، آرام کرانے کے لیے نہیں۔ کچھ عرصے بعد نوکر نہ رہیں گے تو یہ قبیح رسم بھی ختم ہو جائے گی لیکن اس وقت تک لاتعداد گھروں میں روز انسانیت کا خون ہوتا رہے گا۔

"انسانیت" کے مقام پر وہی لوگ فائز ہو سکتے ہیں جو اپنے کو دوسرے کی جگہ رکھ سکتے ہیں۔ جو اس کے ردعمل پر قیاس کر سکتے ہیں۔ جنھیں اس بات کا احساس ہے کہ زبان کی انی کلیجہ کو چھید ڈالتی ہے اور سرد مہری سے دلوں کو جراحت پہونچ جاتی ہے ایسے لوگ وہ برتاؤ دوسروں کے ساتھ روا نہیں رکھتے جو اگر ان کے ساتھ کیا جاتا تو انھیں ناگوار ہوتا۔

انسانیت سوز باتیں ہم روز کرتے ہیں۔ دفتر کا اگر کوئی چھوٹا ماتحت ہمارے گھر پر ملنے آگیا تو ہم میں سے بیشتر اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں جیسا دفتر میں کیا جاتا ہے، گویا افسر اور ماتحت والا رشتہ گھر میں بھی قایم رہا۔ بدقسمتی سے اگر خود ہمارا کوئی حاکم بالا یا کوئی دوسرا صاحب حیثیت انسان اسی وقت ملنے آگیا تو ہم اپنے غریب ماتحت کے وجود کو ہی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بحیثیت انسان ہونے کے دونوں برابر ہیں (اور کیا عجب کہ شرافت

* سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اور پاکبازی میں غریب ماتحت اعلیٰ افسر سے بہتر ہو۔ اس کج خلقی کی انتہا جب دیکھنے میں آتی ہے جب کوئی نو دولت انسان ذی حیثیت دوستوں کے سامنے اپنے غریب رشتہ داروں سے قرابت کو اس طرح چھپاتا ہے جیسے وہ کوئی ناسور ہیں یا کوئی شرمناک حرکت۔ بعض نامرادوں نے اس نوع کا برتاؤ اپنے باپ کے ساتھ بھی روا رکھا ہے۔ ایسے لوگوں کو آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں، انسان نہیں کہہ سکتے۔

اس گفتگو سے ایک کلیہ مرتب ہوتا ہے، جو شخص انسان کی تحقیر کرے اس میں انسانیت نام کو نہیں ہے۔ آپ اگر زردار ہیں تو آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ غریبوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں جہاں آپ نے ایسا کیا آپ انسانیت کے منصب سے گر گئے۔

اگر آپ کو خدا نے حسن دیا ہے، وجاہت دی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ بدشکل اور بدقوارہ لوگوں کا مذاق اڑا سکتے ہیں یا انھیں ترحم کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ ترحم جس میں تحقیر شامل ہو انسانیت سے بعید ہے۔ ایسا ترحم خوبی نہیں عیب ہے۔

آپ کو ذہن رسا عطا ہوا ہے تو گویا آپ کو کھلی چھوٹ مل گئی کہ معمولی دماغ والوں یا کند ذہن لوگوں کی دیر فہمی پر بے صبری کا اظہار کریں۔ آپ بھول جاتے ہیں کہ آپ کے ذہین ہونے میں آپ کا کوئی دخل نہیں اور جو بے چارہ کند ذہن ہے وہ اپنی مرضی سے ایسا نہیں ہے۔

انسانیت کا ایک بڑا دشمن طنز ہے۔ طنز کرنے والا اوچھا اور گھمنڈی اور بے رحم ہوتا ہے۔ دوسروں کی تحقیر کرکے وہ ایک ارزاں سی لذت حاصل کرتا ہے۔ اس کی یہ کھوٹی لذت ہدف کے لیے کتنا بڑا آشوب، کتنی شدید عقوبت بن جاتی ہے۔

انسان وہ بھی نہیں جو ظالم کے خوف سے مظلوم کو دیکھ کر کترا جاتے ہیں۔ جو غریبوں، کمزوروں، مصیبت رسیدوں کی مدد کو ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ انگریز مضمون نگار چارلس لیمب نے اپنی ہم قلم بہن میری لیمب کی دیکھ بھال کے لیے، جس پر جنون کے دورے پڑتے تھے اور جس نے ایک دورے کے زیر اثر اپنی ماں کو مار ڈالا تھا، اپنی زندگی وقف کر دی۔

انسانیت کی ایک پہچان عورتوں کا احترام ہے کہ عورت ہی نے انسان کو جنا ہے، عورت نازک ہے اور کمزور ہے اور اکثر بے بس ہے۔ جو لوگ عورتوں کو تختۂ مشقِ ہوس سمجھتے ہیں یا انھیں ضعیف العقل قرار دے کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، انسانیت انھیں چھو کر نہیں گئی۔ ایک انگریز مصنف نے کیا پتے کی بات کہی ہے کہ اگر آپ خوش حال، خوش پوش، نوعمر اور خوب صورت عورتوں کو سبقت دیتے ہیں، اُن کا احترام کرتے ہیں تو یہ نہ سمجھیے کہ آپ اس عنوان شائستگی اور تہذیب کے معیار پر پورے اُتر رہے ہیں۔ بات تو جب ہے کہ آپ بدصورت خستہ حال بڑھیا کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوں اور اسے تپاک اور عزت دیں۔ یہی انسانیت ہے۔

ظفر کا مشہور مقطع ہے ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

'خوفِ خدا' کی ترکیب یہاں انسانیت کی جگہ استعمال ہوئی ہے۔ غصہ میں جو شخص اپنے آپے سے باہر ہو جائے، بُرا بھلا جو کچھ منہ میں آئے کہہ ڈالے، اسے انسانیت سے کیا تعلق، انسان وہی لوگ ہیں جو ابلتے ہوئے غصے کو دبا دیتے ہیں اور انسانوں کو غصے کا ہدف بنانے سے حذر کرتے ہیں۔

اخلاقی بُرائیاں، جیسے فریب، لالچ، حسد، ظلم انسانیت سے میل نہیں کھاتیں، لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص بُرائیوں کا پشتارہ رکھتا ہو اور اس کے باوجود اس میں انسانیت ہو اور کبھی کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص عابد و زاہد ہو، پرہیزگار ہو لیکن انسانیت سے بے بہرہ ہو۔ انسانیت کو ایک فراخ دل اور اغماض کرنے والی آنکھ درکار ہوتی ہے۔ ایسا دل اور ایسی آنکھ جو بسا اوقات درویشوں اور بڑے فن کاروں کے یہاں ملتی ہے۔ مثلاً سعدی، چاسر، شیکسپیئر اور غالب کے یہاں۔ یہ لوگ انسانوں کو قاضی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے؛ خالق نے جب انھیں پیدا کیا ہے، پروان چڑھایا ہے اور ان کے رزق کا بندوبست کیا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں انھیں نفرت یا مغایرت کی نگاہ سے

دیکھنے والے۔ ہمیں یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ ان کے اعمال اور کردار کا محاسبہ کریں اور اُن کو انسانیت کے دائرے اور اپنے حلقۂ تلطف سے باہر کر دیں۔

یہ لوگ دو باتیں جانتے ہیں:

۱۔ خامی اور خطا، بُرائی اور گناہ انسان کے خمیر میں ہے

۲۔ دوسرے کے عیب وہ ڈھونڈے جو خود بے عیب ہو۔

یہ لوگ ۔ یہاں میرا روئے سخن فن کاروں کی طرف ہے۔ ان خطاوار انسانوں کی خطاؤں اور چالاکیوں، کمزوریوں اور دیدہ دلیریوں پر نہ صرف منہ نہیں بناتے بلکہ ان سے حظ اندوز ہوتے ہیں۔ وہ خود انسان ہیں، وہ اپنی برادری میں فرشتوں کو ڈھونڈنے کی بے کیف اور لاحاصل کوشش کبھی نہیں کرتے۔ لہٰذا انسانیت محتسب بن کر کبھی نہ بیٹھے گی۔ وہ دھوپ، ہوا اور بارش کی طرح ہے کہ بلند و پست میں تمیز نہیں کرتی۔

انسانیت انسان کو سارے خارجی عناصر سے الگ کر کے دیکھتی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ انسان شائستہ ہے یا گنوار وجیہ ہے کہ بدصورت، مال دار ہے یا کنگال، عالم ہے یا جاہل، پارسا ہے یا گناہ گار، سیدھا سچا ہے یا مکّار، خوش پوش ہے یا چیتھڑے لگائے ہوئے۔ خوش گفتار ہے یا ہکلاتا ہے انسانیت انسان کو یہ ساری قبائیں اُتار کر برہنہ دیکھتی ہے وہ چھلکے کے اندر مغز کو دریافت کر لیتی ہے۔ اس کی نگاہ سطح یا جلد پر نہیں رُکتی۔ انسانیت کی پرواز خالق کی طرف ہے اور انسانیت کے حامل وہی انسان ہیں جنھیں ایک ہی وقت میں انسان کی خامی کا احساس و اعتراف ہے اور جن میں خالق کی چشم پوشی اور وسیع النظری کا عکس ملتا ہے۔ تو گویا انسانیت کا ایک عنصر یہ بھی ہے کہ انسانوں کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ ہو بعض رچی ہوئی اور کڑھی ہوئی طبیعتیں یہ نرم گوشہ تو نہیں رکھتیں وہ دوسروں کو سخت گیر پیمانے سے جانچتی ہیں لیکن جانچ کے نتیجہ کو نہ زبان پر آنے دیتی ہیں، نہ جبیں پر، نہ آنکھوں سے چھلکنے دیتی ہیں، نہ ہونٹوں سے۔ ان لوگوں کو ہم انسانیت سے محروم نہیں کہیں گے بلکہ ایک اعتبار سے وہ داد کے اور زیادہ ہی مستحق ہیں۔ لیکن یہ لوگ انسانیت کے اس مقام پر فائز نہیں ہیں جہاں تحمّل اور محبت موجزن ہوتے ہیں۔ اور ساری خطاؤں اور بدصورتیوں چالاکیوں اور مکاریوں اور ساری گھناؤنی عادتوں کو بہالے جاتے ہیں اور نکھرا ہوا دمکتا ہوا انسان کو روبرو کر دیتے ہیں۔ یہاں دلگیری اور دلسوزی انسانیت کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہو جاتی ہے

انسانیت کی تشریح ہو چکی۔ اگر اجمال درکار ہو تو "انکسار" کر کے کام چلا لیجیے۔ مراد اس جھوٹے انکسار سے نہیں ہے جو رسم کے طور پر برتا جاتا ہے اور جو دامن دل کو چھو بھی نہیں پاتا۔ ایسے انکسار کا سرچشمہ دماغ ہے اور جولاں گاہ زبان، دل کو اس کی آہٹ بھی نہیں ملتی۔ ایسے انکسار نما افتخار سے پردہ اُٹھانا ہو تو انکسار کرنے والے کے انکسار کی سرِ محفل تائید کر دیجیے، پھر دیکھیے کہ وہ آپ کی تائید سے خوش ہوتا ہے کہ بدمزہ یا برہم۔ بعض لوگ انکسار کو ریاکاری کی سرحد تک لے گئے ہے اور سفر جہاں سے شروع کیا تھا وہاں کبھی واپس نہیں آئے۔ یہ انکسار دکھانے اور لبھانے کے لیے ہے اور خراج وصول کرنے کے لیے آپ اپنے آپ کو نیچا دکھائیں گے تو شائستہ سامع آپ کو بام آسمان پر پہنچا دے گا۔ بناوٹی انکسار کرنے والا اس بھکاری کی طرح ہے جو اپنی کنگالی کا اظہار اس لیے کرتا ہے کہ سننے

"اس شخص پر خدا اپنے رحم و کرم کی بارش کرے جو خرید و فروخت میں خوش دلی اور سلیقہ مندی برتتا ہے اور قرض کا تقاضہ کرنے میں نرمی سے پیش آتا ہے۔"

(بخاری و ترمذی)

اس کی چھوی بھر دے ۔

سچا انکسار ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے ۔ اس سے زیادہ
دلکش اور خوب صورت کوئی وصف نہیں ۔ اس کی تہ میں حقیقت
کا ادراک ہوتا ہے ۔ انسان کی نظر جب حیات و کائنات کے
رموز کو پا جاتی ہے ، جب انسان نہاں خانہ دل میں زندگی کی
بے ثباتی کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے ، جب اس کا دل انسانوں
کی بے بسی پر پگھلنے لگتا ہے ، جب اُن کی مجبوریاں اس کی چشم
تصور کے سامنے صف آرا ہو جاتی ہیں ، جب وہ سوچنے لگتا
ہے کہ مجبوری ، بے ثباتی ، کم مائیگی کے حمام میں سب ہی یکساں
طور پر ننگے ہیں تو اس کا سر جھک جاتا ہے اور اسے اپنی کمزوری
و انکشاف نظر آنے لگتا ہے ۔ حباب کو پھولنا کب راس آیا
ہے ؟

سچے انکسار کی قبا میں تشکر کا استر لگا ہوتا ہے ۔
" مجھ میں جو بھی اچھائیاں ہیں ان پر میرا پیدائشی حق نہیں
تھا ۔ مجھے یہ عطا کی گئی ہیں ۔ جو لوگ ان خوبیوں سے محروم ہیں میں کس
برتے پر خود کو ان سے بہتر سمجھوں ۔ شکر ادا کرنے کا طریقہ صرف
یہی ہے کہ خود کو بے بنیاد گھمنڈ سے بچاؤں اور کوئی ایسی بات نہ
کروں جو اُن لوگوں کو گراں گزرے جو مقسوم کے معاملے میں محروم
ہیں ۔ گھمنڈ کرنا گویا ان کو محرومی کا احساس بار بار دلانا ہے
ان کے زخموں کو کریدنا ہے ۔ حالاں کہ مختلف پیدا ہونے میں نہ
اُن کا کوئی قصور ہے نہ میرا کوئی کمال ۔ " اور پھر یہ سارا کھیل
یہ تفاوت ؛ مزاج اور مرتبہ ، صلاحیت اور رجحان کا یہ فرق
ایک لمحہ کی بات ہے ۔ آنکھ جھپکتے یہ سب کچھ فنا ہو جائے گا ۔

جو لوگ نہاں خانہ دل میں انکسار کو محسوس کرتے ہیں ،
فروتنی جن کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے ، وہ
انسان کو انسان سمجھتے ہیں ، اُن کا رُواں رُواں خالق کے
سامنے سر بہ سجود رہتا ہے ۔ ان کے دل میں نفرت اور
حقارت کا گزر نہیں ہوتا ۔ انسانیت ان کے کردار و
گفتار سے چھلکتی ہے ۔ انسانیت کو کسی
ایک وصف میں ڈھونڈنا ہے
تو سچے انکسار کی
طرف دھیان
دیجیے ۔

" جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے مال کی زکوٰۃ
ادا نہ کی تو قیامت کے دن اللہ اس مال کو ایک خوفناک
سانپ کی شکل میں ظاہر کرے گا جس کے سر پر بال کھڑے
ہوں گے اور جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ نقطے
ہوں گے ۔ یہ سانپ اس کے گلے کا ہار بنایا جائے گا ۔
اور سانپ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ رکھے گا ۔ پھر کہے
گا کہ میں ہوں تیرا مال ، میں ہوں تیرا خزانہ ۔ "

(بخاری و نسائی)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۱ (جنوری ۸۹ء)

ایمان اور سائنسی آزادی

قرآن پاک اور اسلامی روایات کی روشنی میں

عبدالسلام
مترجم
سید شفیق احمد**

میں شروع ہی میں یہ بات خاص طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بحیثیت ایک مسلمان طبیعی سائنس داں، مذہبی اعتقادات اور عبادات کے بارے میں روشن خیالی اور رواداری میرے دینی عقاید کا ایک اہم حصہ رہی ہیں۔ میرے خیال میں مذہبی رواداری اور روشن خیالی جیسے مسایل پر سائنسی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے گفتگو کرنا چاہیے، حزب مخالف کے خیالات کو نہ صرف صبر و سکون سے سننا چاہیے بلکہ انھیں پرکھنا بھی چاہیے کیوں کہ یہی طریقہ کار سائنسی ترقی کا باعث بھی بنا ہے۔

مذہبی آزاد خیالی یا روشن خیالی کو میں قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کروں گا اور جہاں تک ممکن ہوا احادیث کا سہارا لے کر مثالیں بھی پیش کروں گا۔ اس کے بعد میری کوشش ہوگی کہ میں صدیوں سے چلی آرہی اُن فرسودہ روایات پر اپنی رائے کا اظہار کروں جو سائنسی بنیادوں پر منحصر آزادانہ تبادلۂ خیالات میں حارج رہی ہیں

مذہبی رواداری سے متعلق قرآن کریم کی چھ آیات کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ پہلی آیتِ قرانی، اسلامی ایمان کی بنیاد کو نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہے:۔

" دین میں زبردستی (کا فی نفسہٖ کوئی موقعہ) نہیں "
(البقرۃ – ۲ – ۲۵۶)

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایمان ایک شخصی معاملہ ہے جیساکہ حسب ذیل آیت سے ظاہر ہے:۔

" آپ کہہ دیجیے کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے، سو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے"!
الکھف (۱۸ – ۲۹)

شخصی ایمان میں آزادی کا تصور کا حسب ذیل قرآنی آیات سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے:۔

" شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں"
" آپ (اُن کافروں سے) کہہ دیجیے کہ اے کافرو! میرا اور تمہارا طریقہ متحد نہیں ہو سکتا اور نہ تو (فی الحال) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرتے ہو اور نہ (آئندہ) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ تم میرے

---

* ڈائرکٹر انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس، تریستے ۔ اٹلی
** ڈپٹی فنانس آفیسر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

معبود کی پرستش کر دگے۔ تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا۔"   الکافرون

"تو (آپ بھی اُن کی فکر میں نہ پڑیے) بلکہ صرف نصیحت کر دیا کیجیے (کیوں کہ) آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں (اور) آپ اُن پر مسلط نہیں ہیں۔"

(الغاشیہ - ۲۳-۲۲ : ۸۸)

آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ اے لوگو تمہارے پاس (دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (بدلیل) پہنچ چکا ہے۔ سو جو شخص راہ راست پر آجاوے گا سو وہ اپنے (نفع کے) واسطے راہ راست پر آوے گا اور جو شخص (اب بھی) بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا (یعنی اس کا وبال بھی) اُسی پر پڑے گا۔"

(یونس ۱۰۸ : ۱۰)

"اور ہم نے آپ کو اُن کا نگران نہیں بنایا اور نہ آپ اُن پر مختار ہیں۔"   (انعام ۱۰۸ : ۶)

"اور دشنام مت دو اُن کو جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں (یعنی ان کے معبودوں کو)۔"

(انعام ۱۰۹ : ۶)

اسلام نے دوسرے مذاہب کے مقدس رہنماؤں کی عزت اور تکریم کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں جا بجا بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا اور ہمیں ان پیغمبروں میں کوئی تفریق نہیں کرنی چاہیے۔ وہ سبھی اللہ تعالیٰ کے پیغام کو انسانیت کی فلاح کے لیے لائے تھے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک نے واضح الفاظ میں مذہبی رواداری کو مسلمانوں کے ایمان کا ایک بنیادی جز قرار دیا ہے۔ قرآن پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول کا کام صرف اللہ کے پیغام کو انسانوں تک پہنچانا ہے۔ اس کے پاس کوئی ایسا اختیار نہیں ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس مذہب کو ماننے کے لیے مجبور کر سکے جس کی تعلیم وہ دینے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔

نہ ہی اس بات کی کوئی ذمہ داری اُس پر عاید ہوتی ہے۔

اب مذہبی رواداری کی تین روشن مثالیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے پیش کرتا ہوں۔ ہجرت سے قبل ۱۳ سال تک رسول اللہؐ کو مکّہ میں ستایا گیا۔ صحابیوں کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہاں تک کچھ صحابی شہید بھی ہو گئے۔ لیکن مدینہ پہنچتے ہی انھوں نے سب سے پہلے وہاں کے یہودیوں کو امان دینے کی شرائط طے کیں اور ان کے حقوق و اختیارات کے تحفظ کے لیے ایک معاہدہ تیار کیا جس کی رو سے انھیں مذہبی معاملات میں مکمل آزادی دی گئی۔ مکّہ میں آنحضرتؐ کا بدترین دشمن ابوجہل تھا جو کہ افواج مکّہ کا سپہ سالار تھا اور جو بدر کی جنگ میں کیفر کردار کو پہنچا۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ بھی شروع میں اسلام دشمن تھے اور جنگ احد میں افواج کفار کا سپہ سالار بھی تھے۔ ہزیمت کے بعد وہ بھاگ کر حبشہ جانا چاہتے تھے۔ ان کی بیوی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے شوہر کو معاف کرنے کی درخواست کی اور عرض کیا کہ کیا وہ مکّہ میں اپنے آباء و اجداد کے مذہب پر قایم رہ سکتے ہیں۔ رسول خدا نے جواب دیا کہ مذہب ایمان اور ضمیر کا معاملہ ہے۔ ضمیر آزاد ہے وہ مکہ آکر رہ سکتے ہیں اور ان کا جو جی چاہے وہ مذہب اختیار کر سکتے ہیں۔ عکرمہ واپس آئے اور رسول اکرمؐ سے دوبارہ حفاظت اور آزادی کا اعادہ کرایا۔ رسول اللہؐ کی فراخ دلی اور دینی معاملات میں شخصی آزادی اور رواداری میں ان کے مکمل یقین اور اس پر پابند رہنے کے اس واقعہ نے عکرمہ کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہؐ نے ان کی مغفرت کے لیے دعا بھی فرمائی جو قبول ہوئی اور حضرت عکرمہؓ نے شہادت پائی۔

ایک اور مثال نجران کے عیسائیوں کے اس وفد کی ہے جو رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ نجران کے کلیساؤں کی حفاظت کی جائے اور عیسائیوں کے اداروں کو بھی تحفظ دیا جائے۔ ملاقات کے دوران وفد نے عبادت کرنے کے لیے اجازت چاہی۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ وہ کس جگہ جا کر عبادت کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف

ان کی مشکل کو سمجھ لیا بلکہ مذہبی رواداری کی سب سے اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ لوگ مین مسجد میں ہی "سروس" ادا کر سکتے ہیں۔ کیا کسی اور مذہب میں عبادت گاہوں کو باہمی طور پر استعمال کرنے کی یہ درخشاں مثال ملتی ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور الوداعی خطبہ میں انسانی حقوق سے متعلق واضح ہدایات ملتی ہیں اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ہر معاملے میں معتدل اور معقول رویہ اپنانا چاہیے۔ اپنی وفات سے پہلے آخری حج کے موقع پر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> اے لوگو! میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ شاید ہی دوبارہ یہاں اس موقع پر جمع ہوں ـــ اس متبرک دن، ماہ اور شہر کی طرح تمہاری زندگیاں ملکیت اور عزت و وقار مقدس قرار دیئے جاتے ہیں۔ اے لوگو! تمہارا خالق ایک ہے اور تم سب ایک ہی آبا و اجداد کی اولاد ہو۔ تمہارے درمیان نسلی اعتبار سے نہ کوئی برتر ہے اور نہ کوئی بدتر اور اس بنا پر کوئی تفریق قابل قبول نہیں ہوگی۔
>
> ایک عربی کسی عجمی سے بہتر نہیں ہے اور نہ ہی کسی دوسرے عرب سے۔ نہ ہی کوئی سفید فام کسی سیاہ فام سے اور نہ کوئی سیاہ فام کسی سفید فام سے رنگ کی بنا پر بہتر کہا جا سکتا ہے۔ خوف خدا اور ذاتی خوبیوں کی بنا پر کوئی کسی سے بہتر کہا جا سکتا ہے۔ رنگ اور نسل کسی کو برتر یا بدتر نہیں بناتے۔ ہر انسان آدم کی اولاد ہے اور تمام انسانوں کے وہی جدّ امجد تھے۔"

برادرانہ تعلقات، مساوات اور رواداری کی کیسی اچھی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دکھائی۔ رنگ، نسل اور وراثت کے بجائے اعلیٰ انسانی اقدار کو انھوں نے انسانی بقا اور امن و آشتی کے لیے لازمی قرار دیا۔

اب ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ صحابۂ رسول اور خلفائے راشدین کا رویہ احکام قرآنی اور شریعت کے بارے میں کیا تھا؟ اس کی ایک مثال خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اس معاہدے سے ملتی ہے جو انھوں نے ایلیا کے عیسائیوں سے کیا تھا:

> "معاہدہ کی رو سے یہ وہ تحفظ ہے جس کی ضمانت خادم اللہ امیر المومنین عمرؓ ایلیا کے لوگوں کو دیتا ہے۔ وہ (عمرؓ) ہر انسان کو چاہے وہ بیمار ہو یا صحت مند، ان کی زندگیوں، ملکیتوں، کلیساؤں صلیبوں اور ہر اس چیز کی جس کا تعلق مذہب سے ہو، تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ ان کے کلیساؤں کو رہائش گاہوں میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی انھیں مسمار کیا جائے گا۔ ان سے ملحق آراضی کو بھی بحق حکومت اسلام ضبط نہیں کیا جائے گا۔ ان کے دینی معاملوں میں کوئی زور زبردستی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی انھیں کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے اسی سال بعد تک (یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں جب طارق بن زیاد نے اندلس (اسپین) فتح کیا) یہی رواداری اور تحمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ طارق بن زیاد کے وہ احکامات جو انھوں نے اپنے سپاہیوں کو اسپین میں داخلے کے وقت دیے تھے آج بھی تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں اور کبھی بھلائے نہیں جا سکتے:

> "ہم انھیں امان دیتے ہیں اور ان کے تحفظ کا وعدہ کرتے ہیں جنھوں نے ہمارے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ کسی شخص سے بھی بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ کسی شخص کی بھی جائیداد یا ملکیت کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی نہیں لیا جائے گا اور نہ ہی کسی شخص کی زمین اور فصلوں کو بحق حکومت ضبط کیا جائے گا۔ اندلس کے باشندوں کو عام اجازت ہے کہ وہ جس طرح سے چاہیں عبادت کریں اور اپنے مذہب اور

ایمان پر قایم رہیں۔ ہر اُس مسلمان سپاہی کو سخت
سزا دی جائے گی جو کسی گرجا گھر یا کسی اور مقدس
مقام کو نقصان پہنچائے گا۔"

نویں صدی میں ہمیں خلیفہ مامون الرشید کی ایک مثال ملتی ہے۔ وہ اپنی تلاشِ حق کے لیے مشہور تھے اور ہمیشہ حقیقت جاننے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ انھوں نے دوسرے مذاہب کے علمار کو بھی مناظرہ کی دعوت دی۔ دور دراز کے ملکوں جیسے وغیرہ کے علما کو بھی مدعو کیا۔ فرغانہ اور ماوراء النہر مذہب کے پیرو یزداں بخت نے ان کی دعوت قبول کی اور بغداد آیا۔ علمائے اسلام کے مدلل مذاکروں کے سامنے وہ ٹک نہ سکا۔ بالآخر خاموشی اختیار کر لی۔ خلیفہ نے فرمایا کہ اب تم کیوں اسلام قبول نہیں کر لیتے؟ جیسا کہ ٹی۔ ڈبلو آرنلڈ نے اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام"
میں لکھا ہے کہ یزداں بخت نے خلیفہ
کی اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا:

یا امیر المومنین! میں نے آپ کی تجویز سنی
اور الفاظ پر غور کیا! لیکن آپ تو اُن لوگوں میں
سے ہیں جو کسی کو اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے
مجبور نہیں کرتے۔"

اس کے بعد ہم صلیبی جنگوں کے دور میں داخل ہوتے ہیں اور دوسری جنگ کے موقع پر ایک ایسی ہی مثال سے دوچار ہوتے ہیں جیسے ڈیول کے اوڈو نام کے ایک پادری نے بیان کیا ہے جو سینٹ ڈینس سے وابستہ تھا۔ لوئی ہفتم کے ہمراہ اوڈو ایک نجی پادری کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہوا تھا۔ اُس نے اِس واقعے کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے:

" زمینی راستے سے ایشیائے کوچک سے ہو کر یروشلم پہنچنے
کی کوشش میں صلیبی جنگجوؤں کو ۱۱۴۸ء میں فرائی جیا
کے پہاڑی دروں میں بھاری شکست اُٹھانی پڑی
بڑی دشواریوں سے وہ لوگ اطالوی ساحل تک پہنچ
سکے۔ جو لوگ یونانی تاجروں کی بڑی بڑی مانگوں کو
پورا کر سکے صرف وہی بذریعہ جہاز انتیوہ پہنچ سکے
بیمار، زخمی اور بہت سے زائرین کو غدار یونانی
ہم نواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ جنھوں نے
ان کی رہنمائی اور تیمار داری کے لیے لوئی ہفتم سے
نی کس ۵۰۰ مارک لیے لیکن جیسے ہی فوج ہٹی،
انھوں نے مسلمانوں کو زائرین کی بُری حالت کی
اطلاع دی اور اس کے بعد وہ یونانی انتظار کرنے
لگے کہ کب مسلمانوں کے تیر، بھوک مری اور بیماریاں
انھیں مکمل طور پر تباہ کر دیں۔ تین چار ہزار افراد
نے خاموشی سے بھاگنا بھی چاہا لیکن وہ کامیاب نہ
ہو سکے۔ بچنے والے افراد کی حالت اور بھی خستہ
ہو جاتی اگر مسلمانوں کے دلوں میں اُن کی حالت کو
دیکھ کر رحم نہ امنڈ آیا ہوتا۔ انھوں نے بیماروں
کی تیمار داری کی، غریبوں اور بھوکوں کو کھانا کھلایا
اور کھلے دل سے ان کی مدد کی۔ عیسائیوں کی بے رحمی
اور سنگ دلی اور مسلمانوں کی رحم دلی اور کشادہ
دلی میں اتنا تضاد تھا کہ بہت سے عیسائیوں نے
اپنے محسن مسلمانوں کا مذہب (اسلام) بخوشی
قبول کر لیا۔"

مورخ اس واقعہ کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے:

" اپنے بے رحم ہم مذہبوں کا ساتھ چھوڑ کر وہ مسلمانوں
کے تحفظ میں چلے گئے، جنھوں نے ان کے ساتھ بہت
اچھا سلوک کیا تھا اور رحم دلی سے پیش آئے تھے
اُن سے متاثر ہو کر تین ہزار سے بھی زیادہ عیسائی
مسلمان ہو گئے۔ رحم دلی تو سنگ دلی سے بھی زیادہ
خطرناک ثابت ہوئی۔ انھوں نے روٹی تو دی لیکن
ان کا مذہب چھین لیا۔ یہ پھر بھی یقینی طور پر کہا جا سکتا
ہے کہ مسلمانوں نے کسی کو بھی اپنا مذہب تبدیل کرنے
کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔"

تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی کے اندلس (اسپین) میں ہم دیکھتے
ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے وہاں عدل، مذہبی آزادی اور رواداری
کی شاندار مثالیں قائم کیں۔ یہ دور یہودیوں کے مذہبی اور ثقافتی
تاریخ کا ایک سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔ جب انھیں مراعات دی
گئیں اور کچھ لوگ تو اُن میں سے وزارت کے عہدوں تک پہنچ گئے
آپ کے علم میں ہوگا کہ موسیٰ بن ماموں قرطبہ میں پیدا ہوئے تھے اور
انھوں نے یہودیوں کے دینی اعتقادات پر ایک مشہور کتاب "گائڈ
ٹو پرپلکسڈ" عربی زبان میں لکھی تھی۔ کچھ عرصے بعد جس کا ترجمہ ان
کے ایک شاگرد نے ہبرو (عبرانی) زبان میں کیا تھا۔

۱۶۱۰ء میں مسلمانوں کے اخراج اسپین کے وقت ایک
مسلمان کی زبانی مذہبی رواداری کے واقعات ملاحظہ فرمایئے۔
میں پھر ٹی۔ڈبلو۔آرنلڈ کی کتاب سے اقتباس پیش کرتا ہوں؛

> "کیا ہمارے آبا و اجداد نے جب وہ برسرِاقتدار
> تھے کبھی اسپین میں عیسائیت کو ختم کرنے کی کوشش
> کی تھی؟ کیا انھوں نے آپ کے آبا و اجداد کو
> آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر برقرار رہنے کی
> اجازت نہیں دی تھی؟ رسول اللہؐ نے حکم دیا تھا کہ
> جب بھی کسی ملک کو فتح کیا جائے تو وہاں کے باشندوں
> کو اپنے مذہبی عقاید اور عبادات کو برقرار رکھنے
> کی اجازت دی جائے۔ کیا انھوں نے ایسا نہیں
> کیا؟ کیا کوئی ایسی مثال پیش کی جاسکتی ہے جب
> کوئی مسلمان خون کا پیاسا نظر آیا ہو یا اس نے
> جبریہ تبدیل مذہب کرایا ہو۔"

ویلنشیا کے آرچ بشپ نے ۱۶۰۲ء میں بادشاہ فلپ سوم کو
مسلمانوں کو اسپین سے نکالنے کی سفارش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ
مسلمانوں کی کسی خوبی کی اگر سب سے زیادہ تعریف کی جاسکتی ہے
تو وہ ہے اُن کے ضمیر کی آزادی اور یہ آزادی چاہے عرب حکمراں
ہوں یا ترک وہ سب ہی اپنی رعایا کو دیتے آئے ہیں۔ اس کی مکمل تفصیل
"ایپاٹیسنز اینڈ ٹریزن آف دی مورس کوز" میں درج ہے

میں نے تصویر کا ایک رُخ پیش کیا تھا لیکن کیا یہ حقیقت
ہے کہ اسلامی حکومتوں میں کبھی بھی غیر مسلموں کی تذلیل نہیں کی گئی
افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا ہوا تھا اور خاص طور سے اُس
دور کے بعد جس کا ذکر میں نے مندرجہ بالا سطور میں کیا ہے۔ ایسا
شاید غیر مسلموں کو زیر تسلط رکھنے کے لیے کیا گیا تھا، یا پھر علماء نے
اسلامی روایات کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لیے کیا تھا۔ یہ ایک المیہ
ہے کہ بانیٔ مذاہب کی اصل تعلیمات کچھ نسلوں کے بعد غلط راہوں پر
دی جانے لگتی ہیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اسلام میں علماء کی کوئی
سرکاری حیثیت نہیں ہے اور اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ غیر مسلموں
کو تسلط میں رکھنے کے لیے چند علماء نے کچھ سخت تجاویز لکھی ہیں اور
حکم عدولی کی صورت میں سخت سزائیں دینے کا حکم دیا تھا۔ مغربی
مفکر نے یہ ذہنی طور پر یقین کرلیا کہ عملاً بھی ایسا ہی ہوا ہوگا اور اس
طرح سے اسلامی حکومت میں غیر مسلموں پر ایذا رسانی کی داستانیں
خوب نمک مرچ لگا کر بیان کی گئیں ہیں۔ کچھ عہد نامے بھی پیش کیے جاتے
ہیں۔ ایسا ہی ایک عہد نامہ جو عیسائیوں نے ایک مکتوب کی شکل
میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش
تھا جو ان کے ایک فرمان کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ ہے۔ اس عہد نامہ
میں عیسائیوں نے از خود وعدہ کیا تھا کہ

> "ہم کوئی نیا عبادت خانہ نہیں کھولیں گے اور ہم قرآن
> نہ خود پڑھیں گے اور نہ اپنے بچوں کو پڑھوائیں گے
> ہم کسی کو عیسائی بھی نہیں بنائیں گے۔ ہم نہ عربی لباس
> پہنیں گے نہ ہی انگوٹھیوں پر عربی عبارت کندہ
> کروائیں گے۔ اپنی کمروں کے گرد پیٹی باندھیں گے۔
> سروس میں گھنٹے زور زور سے نہیں بجائیں گے
> اور نہ ہی جلوس نکالیں گے۔ ہم مسلمانوں کی عزت اور
> تکریم کریں گے اور اس کے بدلے میں ہم جان و
> مال کی حفاظت چاہتے ہیں۔ خلاف ورزی کی شکل
> میں آپ کو مجاز ہوگا کہ آپ ہمارے ساتھ وہی
> سلوک کریں جو باغیوں اور دشمنوں کے ساتھ کیا

جاتا ہے۔"

مکتوب کی شکل میں ایک ایسے ہی عہد نامے کا ذکر سب سے پہلے ابن حزم نے کیا تھا جن کی وفات بارہویں صدی کے آخر میں ہوئی تھی آرنلڈ، ڈی جوجے اور کیتانی نے یہ بلاشبہ ثابت کر دیا ہے کہ اس طرح کے عہد نامے بہت بعد میں اختراع کیے گیے تھے ــــ حضرت عمرؓ کا یہ دستور نہیں تھا۔ انھوں نے ایلیا کے عیسائیوں کے ساتھ ایک عہد نامہ کیا تھا جس کا ذکر میں اس سے قبل کر چکا ہوں۔

۱۶۹۰ء میں بادشاہ اورنگ زیب کے دور حکومت میں ایک سرکاری کارکن نے شہنشاہ ہند کی خدمت میں ایک درخواست پیش کی کہ اس کے ساتھ کام کرنے والے دو کافروں کو نوکری سے برخاست کر دیا جائے کیوں کہ وہ پارسی ہیں اور کلام پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

"اے ایمان والو تم میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ اُن سے دوستی کا اظہار کرنے لگو۔ (الممتحنہ ۱، ۶۰)

اورنگ زیب عالم گیر نے اس عرض داشت پر لکھا:

"میں نے تمہاری درخواست پڑھی۔ کوئی پارسی یا ہندو سرکاری نوکری سے محض اس لیے سبکدوش نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ وہ کافر ہے۔ تم نے قرآنی آیت بھی پوری طرح سے نہیں لکھی۔ پوری آیت قرآنی اس طرح ہے۔ "اے ایمان والو تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو۔ حالاں کہ تمہارے پاس جو دین حق آ چکا ہے۔ وہ اس کے منکر ہیں۔ رسول کو اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے شہر بدر کر چکے ہیں"

(الممتحنہ ۱، ۶۰)

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کافروں سے دوستی نہ رکھیں جنھوں نے مسلمانوں کو ستایا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ کو مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا اگر تم نے اور آگے غور سے پڑھا ہوتا تو تمہیں پتا لگتا کہ اللہ تعالےٰ نے اسی پارہ میں آگے صاف صاف حکم دیا ہے کہ

اللہ تم کو اُن لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتے جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالےٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں"۔

تمہاری درخواست اس وجہ سے فوری طور پر رد کی جاتی ہے۔"

اس کے بعد اب میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات اور دینی معاملات میں آزادی پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا اگرچہ کہ کلام پاک میں واضح طور پر آیا ہے کہ

"ایسے شخص کو جو تمہاری اطاعت ظاہر کرے دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش میں یوں مت کہہ دیا کرو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔" (النساء ۴، ۹۴)

پھر بھی صدیوں سے سیاسی نظریوں کے حامل فرقہ وارانہ ذہنیت کے مذہبی رہنماؤں نے اُن مسلمانوں سے ربط وضبط منقطع کرنے کی تلقین کی ہے جن کے خیالات سے انہیں اتفاق نہ تھا۔ اسلامی تاریخ ان نامی گرامی ناموں سے بھری پڑی ہے جن سے تعلقات منقطع کرنے (یعنی تکفیر) کی تلقین کی گئی تھی۔ سب سے پہلے خارجیوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف ایسا ہی اعلان کیا اور آخر میں انھیں شہید بھی کر دیا۔ ایک ایسا ہی دوسرا سانحہ حضرت علیؓ کے بیٹے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا۔ قاضی شریح نے چند سکوں کے عوض ایک فتویٰ جاری کیا جس میں کہا گیا کہ:

یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حسین بن علیؓ اسلام کے حلقے سے

خارج ہوگئے ہیں اور اس وجہ سے ان کا قتل لازم
قرار دیا جاتا ہے۔"

خلیفہ مامون الرشید جن کا ذکر میں گزشتہ سطور میں کر چکا ہوں اور جو اپنی مذہبی رواداری کے لیے مشہور تھے۔ دراصل وہی پہلے شخص تھے جنھوں نے مسلمانوں میں آزادانہ مذہبی تحقیقات کی بنیاد ڈالی اور اپنے ہی ہم مذہبوں کے خلاف معتزلہ کے زیر اثر ۸۰۰ء میں نام نہاد قائم کیا۔ معتزلہ کے عقیدہ کے مطابق قرآن حادث ہے۔ اس عقیدہ پر یقین کرنا اور حلف لینا تمام ارکان سلطنت کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا۔ اسلام کے برگزیدہ درویش صفت عالم امام احمد بن حنبل نے اس طرح حلف لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر انھیں بُری طرح کوڑوں سے زدوکوب کیا گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہی خلیفہ مامون الرشید سائنسی معاملات میں اختلاف رائے کو نہایت تحمل سے سنتا تھا۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے بیت الحکماء کی بنیاد ڈالی جس میں تمام دنیا کے عالم چاہے وہ یونانی، ہندو، عیسائی، یہودی ہوں یا مسلمان سب ایک جگہ جمع ہو کر تحقیق کرتے تھے اور اپنے اپنے بہترین قدیم (کلاسیکی کتابوں) کا ترجمہ عربی زبان میں کرتے یا کراتے تھے۔

ان مسلمان علماء کے ناموں کی فہرست کافی طویل ہے جنھوں نے وقت اور مقامی حالات سے سمجھوتا نہیں کیا تھا اور جنھیں ایذا پہنچائی گئی تھی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک بن انس، امام غزالی، علامہ ابن رشد، شیخ الکبر ابن عربی، امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، سید محمد جون پوری جیسے برگزیدہ اور قابلِ احترام علماء کو بھی ایذا رسانی سے بخشا نہیں گیا۔ بسا اوقات اختلاف رائے بالکل معمولی اور مقامی تھا لیکن سزائے موت سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔ ان شہید ہونے والوں میں حلاج، شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی، شیخ علائی اور سرمد جیسے بزرگوں کے نام گرامی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔

شیخ سرمد کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے:

"تیرہ سو سال کی اس تاریخ میں علمائے فقہ کے قلم نے
ایک بے نیام تلوار کا کام کیا ہے اور ان بے گناہ
خدا رسیدہ افراد کے خون سے اپنے دامن کو تر
کیا ہے۔ یہ شہادتیں صرف صوفیوں اور آزاد خیال
افراد تک محدود نہ تھیں بلکہ ان کی زد میں کٹر علماء
دین بھی یکساں طور پر تھے۔"

دوسرے مسلمان ساتھیوں سے قطع تعلق کا یہ رواج اب بھی جاری ہے۔ ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود مسلمانوں کے اندرونی دینی معاملات میں اختلاف کی شکل میں ان کا رویہ غیر مسلموں کی بہ نسبت اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ زیادہ سخت رہا ہے۔ مسلمانوں میں دو طرح کے نظریات ساتھ ساتھ پنپے ہیں۔ پہلا نظریہ ان صوفیوں کا ہے جنھوں نے اسلام کی روحانی اقدار پر زیادہ زور دیا ہے اور دوسرا ان علماء فقہ کا ہے جنھوں نے اسلامی قوانین، رسم و رواج، سیاسی نظریات اور اسلامی حکومتوں کے چلانے کے فن پر زیادہ توجہ دی ہے۔ تاریخ کے موجودہ دور میں اسلامی حکومتیں اس دوسرے نظریے پر زیادہ عمل پیرا نظر آتی ہیں تاکہ مغربی ثقافت اور سیاسی تسلط سے بچی رہ سکیں۔

اب میں اپنے اس خاص موضوع کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا جس کا مجھ سے براہ راست تعلق ہے یعنی سائنسی مذاکرہ کی آزادی اور ایمان اسلامی۔ میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ میں ایک سائنس داں ہوں اور ایک باعمل مسلمان۔ میں مسلمان ہوں کیوں کہ میں کلام پاک کے روحانی پیغام میں یقین رکھتا ہوں۔ کلام پاک میرے اندر چھپے ہوئے سائنسداں کو قوانین قدرت پر منحصر کاسمولوجی، بیالوجی، علم الادویہ اور فزکس کے اصولوں کی مزید تحقیق کے لیے اُکساتا ہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ:

"اور کیا وہ آسمانوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح
بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس
طرح کھڑے کیے گیے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ
کس طرح بچھائی گئی ہے۔" (الغاشیہ ۱۷--۲۰)

"بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں
اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے
جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لیے۔ جن کی حالت
یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں
کھڑے بھی، بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمان اور
زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے
ہمارے پروردگار! آپ نے اس کو لایعنی پیدا
نہیں کیا۔" (آل عمران ۱۹۰ - ۱۸۹ - ۳)

۷۵۰ قرآنی آیات (تقریباً کلام پاک کا آٹھواں حصہ) ایمان والوں کو قدرتی رازوں کو سمجھنے، تحقیق، علم اور معاشرتی زندگی میں سائنسی نظریات کو اپنانے کی دعوت دیتی ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ نے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے علم حاصل کرنا اور سائنسی رویہ اپنانا یعنی توجیہ پسندی لازمی قرار دیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر چین جانا پڑے تو بھی جانا چاہیے۔ لفظ چین کا استعمال اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ رسول اللہؐ کے ذہن میں اس وقت بھی تھا کہ سائنسی جستجو بین الاقوامی سطح پر کی جانی چاہیے۔ وہ مستقل اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے تھے کہ اے پروردگار! مجھے اتنا علم دے کہ کائنات کی حقیقت سمجھ سکوں۔"

کٹر اسلامی نقطۂ نگاہ سے بھی سائنسی علوم پر گفتگو کرنے کے لیے یہ پہلی بات قبول کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد مورس بکائی کے مدرک مضمون "دی بائبل، دی قرآن اینڈ سائنس" کو سمجھنا چاہیے۔ قرآن کی خوب صورت اور بلیغ آیات اُسی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں جن کی تلاش ہم سائنس میں کرتے ہیں۔ قرآن کسی غلط اصول کو ماننے کے لیے نہیں کہتا ہے۔

اس تمہید کی تیسری بات یہ ہے جو ہمیں مان لینی چاہیے کہ پوری اسلامی تاریخ میں کوئی گیلیلیو پیدا نہیں ہوا۔ ایذا رسانی، مذمت اور تکفیر کی مثالیں تو بہت ملتی ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمان قرآن کریم اور رسول اکرمؐ کے ان احکامات کو کس سنجیدگی کے ساتھ مانتے تھے۔

رسول اللہؐ کی وفات کے تقریباً سو سال بعد ہی اس وقت کی تمام مروجہ سائنسوں میں مسلمانوں نے مہارت پیدا کر لی تھی بہت جلدی ہی انھوں نے منظم طریقے سے تمام علمی کتابوں کے ترجمے تیار کر لیے تھے۔ عربوں کے قایم کردہ بیت الحکمہ نے ۳۵۰ سال تک ان کی بالادستی کو باقی رکھا تھا۔ اس فوقیت کا کچھ اندازہ جارج سارٹن کی شہرہ آفاق کتاب "ہسٹری آف سائنس" سے ہوتا ہے سارٹن نے سائنس میں پائی جانے والی کامیابیوں کو پچاس پچاس سال کے ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ مثلاً ۴۵۰ سے ۵۰۰ قبل مسیح کو وہ افلاطون، ارسطو، اقلیدس، ارشمیدس کا دور بتاتا ہے۔ اسی طرح ۷۵۰ سے ۱۱۰۰ صدی عیسوی کو وہ جابر، خوارزمی، رازی، مسعودی، ابوالوفا، بیرونی، عمر خیام کا دور بتاتا ہے۔ ۱۱۰۰ صدی عیسوی کے بعد تقریباً ڈھائی سو سالوں تک مغربی سائنس دانوں کے نام ابن رشد، نصیر الدین طوسی اور ابن نفیس کے ساتھ لیے جاتے رہے۔ اس کے بعد کسی مسلم سائنس داں کا نام نظر نہیں آتا ہے۔ سائنس میں مسلمانوں کی نمایاں کامیابی کی دو وجوہات سامنے آتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہؐ کی روایت کے مطابق انھیں مذہبی آزاد خیالی اور سائنس تحقیق کی آزادی تھی دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی دولت مشترکہ میں نسل، رنگ اور دوسری برائیاں داخل نہیں ہوئی تھیں۔ وہ لوگ انتہائی رواداری اور دوسرے مذاہب کے افراد اور ان کے خیالات کا احترام کرتے تھے۔

گیارہویں صدی سے سائنسی تعلیم اور تحقیق میں انحطاط شروع ہو گیا تھا اور تقریباً ڈھائی سو سال بعد عالم اسلام کی سائنس میں دلچسپی ختم ہو گئی۔ عالم اسلام سے تخلیقی سائنس کیوں ناپید ہو گئی؟ میرے خیال میں اسلامی دولت مشترکہ سے سائنس کے خاتمے کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ ہمارا داخلیت کا رجحان اور سائنسی جدوجہد میں تنہا پسندی تھی اور دوسری وجہ ایجادات اور تقلید میں حوصلہ افزائی کی کمی تھی۔ گیارہویں اور

بارھویں صدیوں میں سیاسی فرقہ وارانہ اور کٹر مذہبی غیر رواداری کی تقلید نے اجتہاد کے دروازے حصول علم و سائنس کے لیے بند کر دیے تھے۔ سائنسی تعلیم و تحقیق کی طرف سے اس بے رُخی کا پتہ ہمیں ابن خلدون کے مقدمہ سے ملتا ہے جو اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے مورخ اور دانش ور تھے۔

ہم نے سُنا ہے کہ فرانس اور بحر روم کے شمالی ساحل پر واقع ملکوں میں فلسفیانہ سائنس کی ترویج پر بڑا زور دیا جا رہا ہے وہاں اس کی تعلیم، تحقیق اور تدریس کو بڑے پیمانے پر دوبارہ شروع کیا گیا ہے۔ ان علوم کی تشریح نہایت مکمل طور پر ایک نظام کے تحت کی جاتی ہے۔ اُن کے جاننے والے اور طلبا کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان علوم کی تعلیم سے کیا ہوگا لیکن ایک بات نہایت واضح ہے کہ طبیعی علم کی تعلیم کی ہماری مذہبی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لہذا ہمیں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔"

ابن خلدون کے الفاظ سے کوئی تجسس مترشح نہیں ہوتا نئے علوم حاصل کرنے کی طرف بے حسی رجحان کی غمازی کرتی ہے جو کسی سائنسی علم کو حاصل کرنے میں حارج ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سائنسی تحقیق میں اکیلا پن اور اقتدار کی خواہش سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری ترقی کے زمانے یعنی نویں اور دسویں صدی میں مسلمانوں نے بغداد اور قاہرہ میں بڑے بڑے بیت الحکما قایم کیے تھے اور ان میں اس وقت کے علما سے مذاکرہ کرتے تھے لیکن تیرھویں صدی کے بعد سب ختم ہو گیا۔ سائنس کی تھوڑی بہت تعلیم مذہبی خانقاہوں میں دی جاتی تھی جہاں روایت کو جدیدیت پر فوقیت دی جاتی تھی۔ اس طرح مہارت حاصل کرنے کے اس دور میں علوم اور سائنس کی فطرت مسلمانوں کی راہ کا روڑا بن رہی تھی۔ مدارس میں کسی تنقید، یا اساتذہ سے تعلیم پر کوئی سوال، جدت پسندی اور نئے خیالات کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ ان کو ناقابل برداشت سمجھا جاتا تھا۔ ابن خلدون کے زمانے سے ہی جدت پسندی کو ناقابل برداشت سمجھا گیا اور یہ سلسلہ اسلامی حکومتوں مثلاً عثمانی ترکی، صفیوں کے ایران اور مغلوں کے ہندوستان میں جاری رہا۔

کیا یہ انحطاط خود پسندی یا تکبّر کی وجہ سے ہوا تھا؟ ترکی حکومت میں برطانوی سفیر ولیم ایٹن نے ۱۸۰۰ء میں لکھا ہے:

کسی کو بھی جہاز رانی اور مقناطیس کے استعمال کا علم نہیں ہے، سیاحی جو نئے تجربات سے دوچار کراتی ہے اور جو ذہنی وسعت کا ایک ذریعہ ہے تکبر اور مذہبی خودپسندی کی وجہ سے ممنوع ہے۔ غیر ملکیوں سے ربط ضبط خصوصاً ان لوگوں سے جو سرکاری عہدوں پر فائز نہ ہوں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔"

کیا یہ صورت حال اب بھی برقرار ہے؟ کیا اسلامی ملکوں میں ہم سائنسی اور آزادانہ تحقیق کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں؟ کیا اس کام کے لیے ہم مناسب انتظامات کر رہے ہیں؟

سائنس میں اسلامی دولت مشترکہ دنیا کی تقریباً سبھی بڑی اور موجودہ تہذیبوں سے کمزور اور پیچھے ہے۔ کچھ مسلمانوں کا خیال ہے کہ صنعت و حرفت بنیادی طور پر غیر جانب دار ہیں لیکن اس کی زیادتی اور سائنسی تعلیم مل کر دنیاوی جاہ و حشمت حاصل کرنے میں مددگار ہوتی ہیں اور یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ دور حاضر کی سائنسی "عقلیت" کی راہ دکھاتی ہے اور بالآخر بے دینی تک پہنچا دیتی ہے۔ سائنسی اصولوں پر تربیت یافتہ لوگ ہماری تہذیب کے مابعد الطبعیاتی (میٹافزیکل) مفروضوں سے منکر ہو جائیں گے۔ اس حقیقت سے انکار کیے بغیر کہ اعلیٰ حرفت بغیر اعلیٰ سائنس کی تعلیم کے پنپ نہیں سکتی اور اس کے اثرات ہماری تہذیب کے کمزور دھاگے برداشت نہ کر پائیں گے میں محسوس کرتا ہوں کہ سائنس کی نسبت یہ رجحان اُن نام نہاد عقلیت پسند

فلسفیوں کی علمی جنگوں سے ترکہ میں ملا ہے جو غیر عقلی رویہ :
فرسودہ علم کائنات اور توہمات پر یقین رکھتے تھے اور جنھیں شاید
ارسطو سے ورثہ میں ملا تھا۔ ان کی دشواری یہ تھی کہ وہ سائنس
اور دین میں ہم آہنگی پیدا نہ کر پائے تھے۔

آپ کو شاید یاد ہو گا کہ انھیں مسائل سے عیسائی دوچار
ہوئے تھے اور انھیں مسلمانوں سے بھی زیادہ سخت لڑائی لڑنی
پڑی تھی۔ ان کے سامنے بھی "کاسمولوجیکل اور میٹافزیکل" مسائل
تھے۔ مثلاً کیا دنیا گھومتی ہے؟ کیا اسے خدا گھماتا ہے؟ کیا آسمانی
طاقتیں بھی کبھی تھکتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب گلیلیو نے ان مسائل
کے جوابات دیے جو بنیادی طور پر کبھی مسائل تھے اور جسے اُس
نے ثابت بھی کر دیا تھا تو اس پر شدید ظلم کیا گیا۔ ۳۵۰ سال بعد
اس کی تلافی اب کی گئی ہے۔ ۹ رمئی ۱۹۸۳ کو ویٹیکن کے ایک جلسہ
میں پوپ نے اعلان کیا کہ :

"گلیلیو کے معاملے اور اس کے بعد کے واقعات نے
چرچ کو ایک زیادہ جامع نظریہ اپنانے کا راستہ
دکھایا۔ چرچ بھی تجربات سے ہی سیکھتا ہے اور
وہ اب بہتر طور پر سمجھتا ہے کہ تحقیق میں آزادی کا
کیا مفہوم ہوتا ہے۔ وہ انسانی خوبیوں میں سب
سے بہتر خوبی ہے تحقیق کے ذریعہ ہی انسان حقیقت
کو پانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس لیے چرچ کو اب
یقین کامل ہے کہ سائنس اور دین میں کوئی حقیقتاً
تضاد نہیں ہے۔ سنجیدہ اور عمیق مطالعے سے
ہی چرچ نے سیکھا ہے کہ دین کی اہم جزئیات
کو کسی دور کے سائنسی نظام سے کس طرح الگ
رکھا جا سکتا ہے۔ خاص سے اس وقت جب
بائبل کی تلاوت پر ثقافتی اثرات پڑ رہے ہوں
اور اسے بھی اس علم سے جوڑا جا سکتا ہو جس کے
ذریعے کائنات اور ستاروں کی ابتدا اور ارتقا
پر روشنی پڑتی ہے"

مندرجہ بالا اقتباس میں پوپ نے سائنس کی نسبت چرچ
کے ایک جامع اور مانع رویہ اپنانے کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس کے
برخلاف گلیلیو سے لے کر آج تک کے سائنس دانوں کی خدمت
کو سراہ سکتے تھے اور کہہ سکتے تھے کہ ان سائنس دانوں کی بھی اپنے
اپنے میدانوں میں حدود تھیں۔ بہت سے ایسے سوالات ہیں جن
کا جواب دورِ حاضر کی سائنس یا مستقبل قریب کی سائنس شاید
نہ دے سکے۔ کیوں کہ ہر علم کی اپنی ایک حد ہوتی ہے۔ سائنس کی کامیابی
کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک مخصوص طرح کی تحقیق کسی ایک
مخصوص مسئلہ پر ہی مرکوز کی ہے۔

ہم سائنسی مسائل پر قیاس آرائی کر سکتے ہیں لیکن اس
رائے کو پرکھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا اور یہی تجرباتی جانچ ہی
موجودہ سائنس کا نچوڑ ہے۔ آج ہم شاید ابن رشد
سے بھی زیادہ منکسر المزاج ہیں۔ ابن رشد ایک بہت بڑے حکیم
تھے جنھوں نے پہلی بار ربخار اور آنکھ کے پردے کا مطالعہ کیا اور
اپنے اولین کارناموں کی بدولت سائنسی دنیا میں امر ہو گئے ہیں۔
لیکن علم کائنات میں انھوں نے ارسطو کے مفروضوں کو جوں کا توں
مان لیا اور یہ نہ سوچا کہ وہ صرف مفروضے تھے اور مستقبل میں
کیے جانے والے تجربات انھیں غلط بھی ثابت کر سکتے ہیں آج
کا سائنس دان جانتا ہے کہ وہ کہاں قیاس آرائی کر رہا ہے اور
وہ قطعیت کا دعویٰ کبھی نہیں کرے گا۔ تسلیم شدہ حقیقتوں کے
بارے میں بھی ہم جانتے ہیں کہ نئی تحقیق کچھ اور نئی حقیقتیں سامنے
لا سکتی ہے جن کی بنیاد پر کچھ اور عام اُصول مرتب کیے جا سکتے
ہیں' جو ہمارے نظریات میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ فزکس
میں اس صدی کے آغاز میں دو بار ایسا ہو چکا ہے۔ پہلے ڈسکوری
آف ری لی ٹی وٹی آف ٹائم اینڈ اسپیس اور بعد میں "کوانٹم تھیوری"
نے نظریاتی انقلاب برپا کر دیا۔ ایسا دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔
کیونکہ نئے نئے جامع خیالات سامنے آ رہے ہیں اور تجربات کا
سلسلہ جاری ہے۔

میں اس بات پر زور دیتا رہا ہوں اور اس کی اہمیت سے

پھر آگاہ کر رہا ہوں کہ ہیں گزشتہ فلسفیانہ لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ میں نے اپنے ایمان اور اپنی سائنس میں کبھی کوئی تضاد نہیں پایا۔ بلکہ دین اسلام نے اُن مسائل کو حل کرنے میں میری رہنمائی کی ہے جن کی بابت علم طبیعی خاموش ہے۔ قرآن کریم کی اولین آیت کریمہ بھی یہی کہتی ہے کہ

" یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو۔ وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر۔"

(البقرہ ۲- ۱)

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک قرآن کریم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رواداری، تحمل اور مذہبی آزادی کی روایات برقرار ہیں، اسلام میں سائنس پنپتی رہے گی کیوں کہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور یہی ہمارا ایمان ہے۔

"سر سید مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا، بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا اس حلقے کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالہ نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ تہذیب الاخلاق سے مرتب ہوئے۔ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں ان کے حلقے کے رفیقوں کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالے نے استوار کیں اور اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی و ادبی مطلب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔"

مولانا آزاد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۹ء)

رونے والا فلسفی

احمد صدیقی مجنوں گورکھپوری*

مجنوں گورکھپوری مرحوم کا درج ذیل مضمون ہم کو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب نے ارسال فرمایا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت یہ ہے کہ غالباً یہ مجنوں صاحب کی اولین تحریر ہے۔ جو جولائی ۱۹۲۲ء کے رسالہ نقیب بدایوں میں شائع ہوئی تھی۔ ادارہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا شکرگزار ہے کہ انھوں نے مجنوں صاحب کے مضمون کو نہ صرف نقل کیا بلکہ اس کی دوبارہ اشاعت کے لیے ان کی نظر انتخاب تہذیب الاخلاق پر پڑی ۔

—— ادارہ ——

سقراط سے پہلے جو سب سے بڑا حکیم گزرا ہے وہ ہراقلی طس تھا۔ یہ ۵۰۰ ق م قبل مسیح کے قریب ایشیائے کوچک کے ایک مشہور شہر ایفیسس (EPHESUS) میں پیدا ہوا، جہاں دیوی دائنا کی پرستش بڑی سرگرمی کے ساتھ ہوتی تھی

اس عجیب و غریب فلسفی کی شہرت اس قدر ہوئی کہ اکثر شہر کے معزز اشخاص نے اس کے ہاتھ میں زمام حکومت دینی چاہی مگر وہ برابر انکار کرتا رہا۔

ہراقلی طس کا مزاج سوداوی تھا اس لیے عام مجالست سے احتراز کرتا ۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کی نادانی اور جہالت پر ہمیشہ رویا کرتا تھا اور اسی وجہ سے وہ رونے والا فلسفی مشہور ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ یہ روایت غلط ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ درد آشنا طبیعت رکھتا تھا۔ آخر کار اس نے ایک پہاڑ پر عزلت گزینی اختیار کر لی اور باقی عمر وہیں ذکر و فکر میں گزار دی ۔ اس نے زمین کی قدرتی پیداوار (غالباً گھاس وغیرہ) کو اپنی غذا بنا لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ استسقا کے مرض میں مبتلا ہو کر ۶۰ برس کی عمر میں مر گیا ۔

ہراقلی طس کی نگاہوں میں ہیلاز کے بڑے بڑے معلموں کی کوئی وقعت نہ تھی ۔ اس کا قول ہے :

”زیادہ علم حاصل کرنے سے انسان عقل نہیں سیکھ سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو آج ھیلسی اوڈ اور فیثاغورث، زینوفینیز اور ہیکے تی اس، قابل قدر فلسفی ہوتے “

ہومر اور رار کی لوکس، کے بارے میں اس کی رائے ہے کہ اُن کو جہد للبقا کے میدان سے کوڑے مار کر نکال دینا چاہیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا فلسفہ کو ”ہراقلی طس“ بزم فلسفہ

* سابق استاد، شعبۂ اردو، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

میں جگہ دینا نہیں چاہتا۔ جب ایسے بڑے بڑے حکماء کو وہ ہیچ سمجھتا تھا تو عوام الناس کی اس کی نظر میں کیا حقیقت ہو سکتی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ عوام اپنی لایق معافی ناقابلیت کی وجہ سے اس کے ادق فلسفہ کو نہ سمجھ سکے۔ اس کی ایک جگہ اس نے یوں شکایت کی ہے

"میں نے تو نظام فطرت کی تشریح عوام کی منفعت
کے لیے کر دی ہے مگر وہ ابھی اس قدر کورے ہیں
جتنا کہ استفادہ سے پہلے تھے۔ معلوم ہوا کہ لوگ
ابدی قانون کو نہیں سمجھ سکتے۔"

دیکھنا یہ ہے کہ وہ 'ابدی قانون' کیا تھا جس کا سمجھنا لوگوں کے لیے اس قدر دشوار تھا۔ اب تھوڑی دیر کے لیے ہراقلیطس' سے پیشتر کے بھی اس فلسفے پر غور کرنا چاہیے جس کی تعلیم یہ تھی کہ تمام دنیا یا تو بذریعہ انفصال یا بذریعہ تکثیف و انبساط ایک ہی ابدی جوہر سے پیدا ہوئی ہے اور پھر اسی کی طرف مراجعت کر جائے گی۔ ہراقلیطس کا خیال بھی قریب قریب یہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے چند باتیں اور شامل کر دی تھیں۔ مثلاً یہ کہ آگ ہی ابدی جوہر ہے، قدیم اور غیر مختتم ہے۔ سکون یا قیام حیات دنیوی کے لیے نہیں بلکہ حیات بعد الممات کے لیے ہے۔ وہ فطرت کو ایک ایسا بہتا ہوا چشمہ سمجھتا ہے جس میں کوئی دو مرتبہ غسل نہیں کر سکتا۔ اس نے جنگ کی بڑے زوروں سے تعلیم دی ہے۔ اسی وجہ سے ہومر کی دعاؤں کو رد کر دیا جو جھگڑوں کو ترک کرنے کی تلقین کرتی تھیں۔ اس کا مقولہ ہے کہ ان دعاؤں کی پیروی کرنا قانون قدرت کا گناہ ہے۔

وہ آگ کو واجب الوجود اور علۃ العلل قرار دیتا تھا۔ تمام دنیا کو خیال کرتا تھا کہ آگ ہی سے پیدا ہوئی ہے۔ ثوابت و سیار کو سمجھتا تھا کہ آگ ہی سے بنے ہیں۔

وہ کہتا تھا کہ

"عالم کو کسی خدا یا آدمی نے نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ
سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ غیر فانی آگ
جو کل کائنات کی علت ہے، کبھی بھڑک
اٹھتی ہے اور کبھی بجھ جاتی ہے۔ آگ
سے پانی پیدا ہو سکتا ہے اور پانی زمین کی
صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے
برعکس زمین پانی ہو جائے گی اور پانی پھر
آگ ہو جائے گا۔"

ہراقلیطس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ

"ایک وقت معینہ پر تمام دنیا آگ کی صورت
میں تبدیل ہو جائے گی"

لیکن اس کے ساتھ وہ معاد کا بھی قائل تھا کہ:

"دنیا پھر از سر نو بالکل مختلف صورت میں
پیدا ہوگی۔"

موجودہ سائنس کا بھی یہی خیال ہے۔

ہراقلیطس کا کل مذکورہ بالا نظریہ 'رواقیوں' نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ ہراقلیطس نے علم الاخلاق کو بڑی اہمیت دی ہے اور یہ پہلا یونانی حکیم ہے جس نے عقل اور حاسہ میں تمیز کر کے عقل کو ترجیح دی۔ اس نے نفسیات اور علمیات کی بنیاد ڈالی قانون اضافیت کو بھی اس نے اہم قرار دیا۔ یعنی وہ اس مسئلہ کو مانتا تھا کہ بغیر بے انصافی کے انصاف، بغیر علالت کے صحت بلا بھوک کے کھانے کے لطف کا احساس محال تھا اور واقعی اگر برائی نہ ہوتی تو اچھائی کی کوئی قدر نہ ہوتی۔

ہراقلیطس کا فلسفہ اُن تمام فلسفوں کا جو اس سے قبل گزر چکے تھے پختہ پھل تھا۔ اگرچہ وہ اکثر مستبعدات اور متناقضات میں الجھ جاتا تھا۔

"جس قدر دل سوزی اور قومی ہمدردی ہم لفظوں
میں ظاہر کرتے ہیں، اگر اس کا پچاسواں حصہ بھی عمل
میں آوے تو قوم کو لازوال فائدے حاصل ہوں۔"
(سرسیدؒ)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۱ (جنوری ۸۹ء)

بچوں کی تعلیم اور ماحولیات

محمد اسحاق *

"THE EARTH IS THE HOME OF MAN"

"کرۂ ارض انسان کا گھر ہے۔"

انسانی یا حیوانی زندگی کے لیے ہوا، پانی، غذا، تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا سر چھپانے اور راحت کی زندگی بسر کرنے کے لیے مکان یا آسرا ضروری ہیں جن چیزوں کے بغیر حیات یا زندگی ممکن نہ تھی۔ قدرت نے اپنی فیاضی سے اسے اتنا ہی عام اور ارزاں کر دیا ہے۔ ہوا اور پانی کے بغیر زندگی ممکن نہ تھی۔ لیکن قدرت کا فیضان اتنا عام ہے کہ آدمی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی قیمتی شے ہر آن استعمال کر رہا ہے۔

ہمارے ماحول میں کیا ہے۔ یہی ہمارے اطراف و اکناف کے قدرت و فطرت کے نظارے۔ زمین، آسمان، چاند، ستارے، جنگل پہاڑ، ندی، نالے، چشمے، سمندر، بادل کی گرج، بجلی کی چمک، پرندے، چرندے، درندے، جنگل میں کوئل کی کوک، مور کی چنگھاڑ، شیر کی ڈکار، ہرن کی چشم، ہری گھانس کا مخملی قالین، بھانت بھانت کے پھول، کنول، گلاب، تتلیاں، شہد کی مکھیاں وغیرہ وغیرہ۔ یہی کچھ تو ہے جو انسان کو زندگی کا پیغام دیتی ہیں۔ انھیں دیکھنے سے زندگی میں تازگی اور زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

آیا ہے تو جہاں میں مثال شرار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

زمین روح آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے ؎

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

ہر بڑا شاعر چاہے وہ کسی زبان کا ہو، اپنے فطری ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شاعر کا دل اس فطرت کے میخانہ سے شراب طہور کے جام پیتا رہا۔ ٹیگور لکھتے ہیں:

"جب میں بچہ تھا تو صبح اٹھ کر باغ میں دوڑ کر جاتا۔ حسین فطرت ایک خوب صورت لڑکی کے روپ میں میرے سامنے مسکراتی کھڑی ہو جاتی اور اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر لیتی۔ مجھ سے پوچھتی کہ بتا اس میں کیا ہے اور میں جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔"

اس میں سچ مچ زندگی کا حسن اور خوب صورتی تھی، جو ہماری زندگی کے تاروں کو چھیڑتی ہے جس سے دل کی گہرائیوں سے نغمے نکلتے ہیں جو لافانی شاعری کا خزانہ ہیں۔ شاعر فطرت، ورڈسورتھ جنگل میں پھولوں کے رقص کو دیکھ کر مچل جاتا ہے اور جو لوگ اس حسن کو نہیں دیکھ سکتے اور جو دنیا کے دھندوں ہی میں گرفتار ہیں ان کے متعلق حسرت سے کہتا ہے۔

" THE WORLD IS TOO MUCH
WITH US."

اسی لیے اقبال کہتے ہیں ؎

دل بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

★ ریٹائرڈ پرنسپل سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن ۔ حیدرآباد ۔

گولڈاسمتھ، انگلستان کے صنعتی انقلاب کے سیلاب میں اُجڑتے
گاؤں، شہروں اور کارخانوں کے اطراف اُبھرتی ہوئی گندی بستیوں
کو دکھ بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ گاؤں، دیہات کی سیدھی سادی
پاک وصاف زندگی سے دور، گندی بستیوں، اخلاقی پستیوں اور
سرمایہ داروں کی حرص وآز پر کہتا ہے

"WHERE WEALTH ACCUMULATES,
MEN DECAY."

قرآن شریف میں قریب دو سو سے زائد آیتیں ایسی ہوں گی جو ہمیں
قدرت و فطرت کی صناعیوں پر غور
کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ سورۂ فاتحہ
کی تفسیر میں مولانا ابوالکلام آزاد
حسن فطرت اور قدرتی ماحول کا ذکر
کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جس قدرت نے ہمیں
زندگی دی اس نے یہ بھی
ضروری سمجھا کہ زندگی کی سب سے
بڑی نعمت یعنی حسن وزیبائش
کی بخشش سے مالا مال کردیا
اس نے ایک ہاتھ سے ہمیں
حسن کا احساس دیا، دوسرے ہاتھ سے تمام دنیا کو
جلوۂ حسن بنادیا۔"

(ترجمان القرآن۔ تفسیر سورۃ فاتحہ۔ جلد اول۔ ص ۱۰۹)

" انسانی فطرت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک
وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہوجاتا، اس کی قدر وقیمت
کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کرسکتا۔ تم گنگا کے کنارے
بستے ہو اسی لیے تمہارے نزدیک زندگی کی سب سے
زیادہ بے قدر چیز پانی ہے۔"

(ص ۱۱۰)

" تم بسا اوقات زندگی کی مصنوعی آسائشوں کو ترستے
ہو اور خیال کرتے ہو کہ زندگی کی سب سے بڑی نعمت
چاندی سونے کا ڈھیر اور جاہ وحشم کی نمائش ہے۔۔۔
نہیں، جس دنیا میں سورج ہر روز چمکتا ہو، جس دنیا میں
صبح ہر روز مسکراتی ہے اور شام ہر روز پردۂ شب
میں چھپ جاتی ہے، جس کی راتیں آسمان کی قندیلوں سے
مزین اور جس کی چاندنی حسن افروزیوں سے جہاں تاب
رہتی ہے۔ جس کی بہار سبزہ وگل سے لدی ہوتی اور
جس کی فصلیں لہلہاتے کھیتوں سے گراں بار ہوں،
جس دنیا میں روشنی اپنی
چمک، رنگ اپنی بوقلمونی،
خوشبو اپنی عطر بیزی اور
موسیقی اپنا نغمہ وآہنگ
رکھتی ہو، کیا اس دنیا کا
کوئی باشندہ آسائش
حیات سے محروم اور
نعمت معیشت سے مفلس
ہوسکتا ہے۔"

(صفحہ ۱۱۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے لوگو! اللہ سے ڈرو، بھلے طریقے سے دنیا کو
طلب کرو۔ کیوں کہ ہر ایک اپنا رزق پورا کر کے ہی اس
دنیا سے رخصت ہوگا۔ اگرچہ اس میں کچھ دیر ہی کیوں نہ
لگے۔ اللہ سے ڈرو، دنیا کی طلب میں باعزت رہو۔
حلال چیزوں کو اپنا کر اور حرام سے بچو۔"

ابن ماجہ ص ۱۵۶

ہمارے سنت، صوفی، فقیر،
درویش، رشی نے فطرت کے گہوارہ ہی میں سکون پایا۔ جنگلوں،
پہاڑوں، وادیوں اور ریگ زاروں میں انھیں قدرت کی تجلیاں نظر
آئیں، وہیں ان کی ذات سے روحانی سکون کے چشمے پھوٹے جن سے
انسانی آبادیاں سیراب ہوگئیں۔

سائنس نے جہاں قدرت وفطرت کے نظام کائنات کو
انسان کی ترقی و آسائش کے لیے جس طرح کارآمد بنایا ہے وہ انسانی
تاریخ کا حیرت انگیز کارنامہ ہے وہیں پر انسان کو اس کرۂ ارض
سے مٹا دینے کے امکانات بھی پیدا کر کے دل ودماغ پر خوف و
دہشت کے بادل پھیلا رکھے ہیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ سائنس
کی کھوج اور تشریح کی وجہ انسان کے دل سے وہ حیرت واستعجاب

کا عنصر جاتا رہا جو فطرت کے ساتھ ہزاروں برس سے قایم تھا۔

بچوں کی تعلیم کا بنیادی کام دو قسم کا ہے۔ ایک تو بچے کی شخصیت ترقی کرے۔ اس کے باطنی یا نفسیاتی نظام، جسم، دل و دماغ میں توازن پیدا کرے۔ دوسرے اس کی شخصیت کا توازن اپنے اطراف و اکناف کے ماحول، گھر، اسکول، سوسائٹی اور فطرت کے ساتھ برقرار رہے۔ جہاں یہ توازن بگڑ جائے وہاں کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تعلیم باطنی و ظاہری توازن کو نہ صرف برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے بلکہ اس پر قابو یا کنٹرول رکھنے کا نام ہے۔

ماحولیات کا تعلق اسکول کے سب ہی مضامین، باٹنی، بیالوجی فزکس، کیمسٹری، ریاضی، زبان و ادب لٹریچر وغیرہ سے ہے۔ ان مضامین میں سوشل اسٹڈیز سے شاید ماحولیات کا کچھ زیادہ ہی تعلق ہے۔ ۱۹۶۲ء میں سارے آندھرا پردیش کے ملٹی پرپز ہائی اسکولوں میں پڑھانے والے سوشل اسٹڈیز ٹیچرس کا ایک سمینار مرکزی وزارت تعلیم کی جانب سے حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا۔ ان میں اکثر اساتذہ ایسے تھے جنھوں نے ہندوستان کے اہم پروجیکٹ، دریا، پہاڑ اور سمندر دیکھے ہوئے نہ تھے۔ بھلا ایسے اساتذہ کیا سوشل اسٹڈیز پڑھا سکتے ہیں۔ میں نے ایک تجویز یہ رکھی تھی کہ تمام سوشل اسٹڈیز کے اساتذہ کو لازماً مختلف گروپس میں تعلیمی تفریح کے طور پر ملک کے تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے مقامات کی سیر کروائی جائے یا انھیں اس قسم کے سفر کی سہولتیں دی جائیں۔ اساتذہ اگر گہری نظر رکھتے ہوں تو اسکولوں اور کالجوں میں دوران سبق یا لیکچر اپنے مضمون کو ماحولیات سے مربوط کر سکتے ہیں۔

ماحول کی قدر و قیمت، فطری ماحول کو برقرار رکھنے کی اہمیت سے واقف کروانے کا زمانہ پرائمری اسکول سے سکنڈری سطح تک کا ہے۔ کیوں کہ یہی بچے بڑے ہو کر اس کی حفاظت کر سکیں گے۔

ماحولیات کی تعلیم اور ترقی دینے کے سب پروگرام پرائمری اسکول سے شروع ہونے ضروری ہیں اور مختلف نصابی مضامین میں ماحولیات کو مناسب جگہ دینا ضروری ہے۔ اگر دور رس پروگرام کے نقطۂ نظر سے جانچا جائے، تو اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ دوسری سب کوششیں اس بنیادی کام کے سامنے ثانوی یا دوسرے درجے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ماحولیات کی تعلیم کلاس روم ہی میں نہیں بلکہ دیہات میں، شہروں کے باہر بہتر طور پر دی جا سکتی ہے۔ ہمارے اسکول اور کالجوں میں اسکاؤٹنگ، گرل گائیڈس، این۔سی۔سی اور این۔ایس۔ایس جیسی طلبا کی تنظیمیں طلبا کو ماحول سے قریب لانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ تعلیمی تفریح HIKING، کیمپ فائر میں طلبا کو غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے اور ماحول سے انھیں انس پیدا ہو جاتا ہے۔ گھر ہو کہ اسکول، طلبا کو باغبانی اور پودے لگانے کی ترغیب دی جاتی رہے، تو انھیں فطرت سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ تعلیم کا ایک مقصد طلبا میں حسن و قبح (Sense Of Appreciation) کی تمیز پیدا کرنا بھی ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے زمانے سے یہ مقصد اساتذہ کے سامنے رہے۔

" مختصر یہ کہ آسمان و زمین میں (معرفت حق) کی کتنی ہی نشانیاں ہیں لیکن (افسوس انسان کی غفلت پر) لوگ ان پر سے گزر جاتے ہیں اور نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔"

(سورہ یوسف ۱۲ : ۱۰۵

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا، جہانِ دیگر تھا

(میر تقی میر)

" اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان و مال جنت کے بدلے میں خرید لی ہے۔"

پارہ یعتذرون (۱۱) ۔ سورۂ توبہ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸، شمارہ ۱ (جنوری ۸۹ء)

سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ

اور ان کے طریق کار اور روایات کا ایک سرسری جائزہ

محمد ظل الرحمن خاں*

اب ہم قدیم زمانے سے لے کر پندرہویں سولہویں صدی تک سائنس اور ٹکنالوجی کے ارتقاء کا ایک سرسری جائزہ لیں گے اور سائنسی اور تکنیکی ترقی جو یورپ میں چودہویں صدی کے قریب شروع ہوئی اور پھر تیزی سے بڑھتی گئی، مختصراً اس کے اسباب بھی بتائیں گے۔

اس بات کا ہم حصۂ اول میں ذکر کر چکے ہیں کہ قدیم زمانے کی سائنس اور اب کی سائنس میں بہت بڑا فرق ہے۔ کام کرنے کا انداز اور سوچنے کے طریقے بہت مختلف تھے۔ سائنس کا فلسفہ بہت مختلف تھا وغیرہ وغیرہ۔

جیسا کے بہت پہلے کہا جا چکا ہے کہ بعض مبصرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ موجودہ سائنس کی طرح کی کوئی چیز قدیم زمانے میں سرے سے تھی ہی نہیں لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قدیم زمانے میں جو کاوشیں کی گئیں، انھوں نے موجودہ زمانے کی سائنس کو جنم دینے میں بہت مدد دی۔ اس وجہ سے قدیم زمانے کی سائنس کو تاریخ میں ایک مقام حاصل ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم کو غلط فہمیوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ ہم یہ جھوٹے دعوے کرنا شروع کر دیں کہ قدیم زمانے میں سب علوم، جن میں سائنسی علوم بھی شامل ہیں، اوج کمال کو پہنچ چکے تھے آج ایسے علماء ہیں کہ جن کو پرانے مخطوطات اور دستاویزات کے حاصل کرنے اور ان کو تشریح کے ساتھ چھاپنے کے کام میں بہت دلچسپی ہے۔ یہ کام تاریخ کے لیے اہمیت رکھتا ہے، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان چیزوں سے آج کی سائنس کی رہنمائی ہوتی ہے۔

سائنس تقریباً اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی تہذیب۔ قدیم سائنس کا پتا ہم کو مصر، بابل، چین، ہندوستان اور خاص طور سے یونان اور شروع کی اسلامی دنیا میں واضح طور پر ملتا ہے لیکن بمقابلہ سائنس کے فلسفہ کا زیادہ رواج تھا جو مختلف قسم کے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے۔ مگر اس وقت کے قریب قریب سب فلسفے رائج الوقت معاشرے کے علمبردار تھے۔ حساب میں کچھ شد بد حاصل ہو گئی تھی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے مگر ریاضی کی صرف بہت معمولی سی بنیاد ہی پڑنا شروع ہوئی تھی۔ ریاضی میں بڑے بڑے کام سترہویں صدی سے مغربی یورپ میں ہونا شروع ہوئے۔ اس پس منظر کا مختصر ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ ایک بات یہ بھی دہرادی جائے کہ قدیم زمانے میں ٹکنالوجی کا روایتی ہنروں سے ہزارہا سال میں آزمائش اور خطا کے طریقے سے ارتقاء ہوا۔ وہ سائنس سے بہت کم فیض یاب ہو سکی۔

یونان کی سائنس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بجا طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یورپ کی سائنس کا آغاز وہاں سے ہوا جہاں پر یونان نے اپنے تباہ ہونے سے پہلے سائنس کو چھوڑا تھا۔ یونان قدیم زمانے کے

---

* پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

علوم اور ثقافت کا گہوارہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے فلسفی، مفکرین، اقلیدس (EUCLIDS) اور فیثاغورس (PATHAGORAS) جیسے ماہرین ریاضی، ارشمیدس جیسے سائنس داں پیدا کیے اور بڑے بڑے ڈرامہ نگار، مصور، سنگ تراش، موسیقار، شاعر، فن تعمیر کے ماہر، مقرر، دانش ور اور دیگر ماہرین کو جنم دیا۔ یونان کے کھنڈر اس کے گواہ ہیں اور بہت سی چیزوں کی طرح اولمپک کھیل بھی قدیم یونان کی دین ہے

اس دور میں شاید تاریخ میں پہلی بار باقاعدہ علمی کام کرنے کے لیے ادارے، کتب خانے اور میوزیم بنائے گئے اور بڑے بڑے عالم ان میں نوکر رکھے گئے۔ یونان کے فلسفیوں اور مفکرین میں، ارسطو، افلاطون اور سقراط کے نام خاص طور پر نمایاں اور قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اول الذکر نے سائنس کے بہت سے مسائل پر بھی طبع آزمائی کی۔ مثلاً ارسطو نے کہا کہ اگر ہلکی اور بھاری چیزیں ایک ہی اونچائی سے زمین پر چھوڑی جائیں تو بھاری چیزیں پہلے گریں گی اور ہلکی بعد میں۔ اگر تجربہ کرکے کسی نے دیکھا ہوتا تو اسے فوراً ہی معلوم ہو جاتا کہ ارسطو کا یہ دعویٰ سراسر غلط تھا۔ ہلکی اور بھاری چیزیں ایک ساتھ گرتی ہیں لیکن کسی نے تجربہ کرکے نہیں دیکھا۔ ارسطو کی بات کو ان کے اعلیٰ مقام کی وجہ سے صحیح اور ناقابل تردید سمجھا گیا۔ اس وقت کی سائنس میں مشاہدہ اور تجربہ کی عام طور پر کوئی خاص اہمیت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ تقریباً دو ہزار سال کے بعد گیلیلیو نے تجربہ کرکے ارسطو کے دعوے کو غلط ثابت کردیا ارسطو کے برخلاف ارشمیدس نے مشاہدے کا استعمال کیا، جس کی وجہ سے ان کا کام آج بھی زندہ ہے۔ بہت سے لوگ ارسطو، افلاطون اور سقراط کو آج تک کی تاریخ کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکرین سمجھتے ہیں لیکن یہ بات اُن کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حضرات جس یونان میں پیدا ہوئے تھے وہ زوال پذیر تھا گو کہ شاید ظاہری شان و شوکت حقیقت کو چھپائے ہوئے تھی۔ ان کا فلسفہ اپنے وقت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ حضرات بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے، جس کی وجہ سے ان کے فلسفہ کی کمزوریاں بادی النظر میں نہیں معلوم ہوتی تھیں اور وہ ایک زبردست عقلی فلسفہ معلوم ہوتا تھا اور بہت سے لوگوں کو اب بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ڈماکرائٹس نامی ایک فلسفی تھا جس کے خیالات زیادہ صحت مند تھے۔

قدیم یونان اپنے آس پاس کے ملکوں سے خانہ جنگیوں میں مصروف رہتا تھا۔ ایک زمانے تک تو اسے کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں جس کی نمایاں مثال سکندر اعظم کی فتوحات ہیں، مگر روما سے جو اس کی لڑائیاں ہوئیں ان میں وہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتا چلا گیا اور آخر کار ایک وقت وہ آیا جب روما نے یونان پر قبضہ کرکے اس کی تہذیب کا خاتمہ کردیا۔ ثقافت اور علم کا گہوارہ کھنڈر بن گیا جس پر چرواہے اپنے گلے چراتے تھے اور بانسری بجاتے تھے۔ وہاں کے لوگ اپنے عظیم ورثے سے بالکل ناواقف اور بے بہرہ تھے۔ اگر قصے کہانیوں میں کچھ سنا جاتا ہو تو وہ الگ بات ہے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں رہ گیا تھا کہ ان کا سرمایہ کتنا گراں قدر تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رومی حاکم یونانیوں کے علوم اور فنون کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکے، جس کی وجہ سے روما سے یورپ کو اس عظیم ورثے کا پتہ نہیں چلا۔ وہ صرف کئی صدیوں کے بعد عربوں کو حاصل ہوا۔ روما سے یورپ نے فن عمارت سازی، انتظامی ادارے، قانون کے اصول اور ادب کے کچھ شہ پارے ہی حاصل کیے۔

عرب میں جب اسلام کا آغاز ہوا تو اس نے عرب بدوؤں کو ایک عظیم قوم بنا دیا۔ جس کو علم کی ایسی پیاس پیدا ہوئی جس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم موجود ہیں۔ عربوں کو جہاں جہاں سے بھی علم حاصل ہو سکا، اس میں انھوں نے کوئی کمی نہ اُٹھا رکھی۔ انھوں نے علم چین سے بھی حاصل کیا اور ہندوستان سے بھی۔ غالباً مصر میں یونانی علوم کا سرمایہ کہیں کھنڈروں میں پڑا تھا اس کا بھی انھوں نے اپنی کاوشوں سے سُراغ لگالیا۔ اس کو دریافت کر کے انھوں نے اس علم کو بڑی جانفشانی سے سیکھا اور اس پر عبور حاصل کرلیا۔ اس سے آگے چل کر دنیا کی قسمت کھل گئی۔ اپنے سنہری دور میں اسلام نے اس قسم کے علمی ادارے اور کتب خانے بنائے جو ان سے پہلے یونان نے اپنے سنہری دور میں بنائے تھے۔ کتابوں کے یونانی زبان سے عربی میں ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا اور بہت جلد عرب درسگاہوں میں یونانی علوم کا بول بالا ہوگیا اور اس طرح گویا یونان نے دوبارہ جنم لیا۔

عربوں کا جب اسپین (اندلس) پر تسلط ہوا تو انھوں نے وہاں اپنی درس گاہیں اور کتب خانے قایم کیے۔ اس کے علاوہ سسلی کے جزیرے پر بھی اُن کا قبضہ ہو گیا تھا اور وہاں بھی انھوں نے علم کی شمعیں روشن کر دی تھیں۔ عربوں کے قابل ستائش علمی کارنامے ہیں جن کا اعتراف ہر ذی شعور عالم کو ہے۔ ہم یہاں مثال کے طور پر اُن میں سے چند کارناموں کا ذکر بہت مختصر طور پر کرنے جا رہے ہیں اس دور کے بہت مشہور ریاضی دانوں، سائنس دانوں اور مفکرین کے مثال کے لیے ہم چند نام بتاتے ہیں:

اس عہد کی سب سے معروف ہستی بوعلی سینا کی ہے جن کو انگریزی میں ادی سینا (AVICENNA) کہتے ہیں۔ پورا نام ابوعلی الحسین ابن سینا ہے۔ ان کو اس زمانے کے ہر علم و فن اور ادب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ وہ قریب قریب سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ طب میں ان کو خاص طور پر بہت شہرت ہے۔ کیوں کہ انھوں نے سائنسی انداز میں کئی بیماریوں کو بیان کیا ہے، جب کہ اُس زمانے کے بہت سے لوگ جادو ٹونے میں یقین رکھتے تھے اور بیماریوں کو محض خدا کا نازل کیا ہوا قہر سمجھتے تھے۔

ابن رشد جن کو انگریزی میں اویروز (Averroes) کے نام سے جانا جاتا ہے، بہت جید فلسفی تھے، جنھوں نے عقلی معیاروں پر چیزوں کے سمجھنے کی تلقین کی۔ اس زمانے کے علم کیمیا میں جابر ابن حیان اور ابوبکر رازی بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو انگریزی میں گیبر (GEBER) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ویسے تو اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کیمیا بالکل خرافات تھی اور اس کو سائنس کا درجہ کسی حالت میں نہیں دیا جا سکتا لیکن اس کام کے سلسلے میں بہت سے کیمیاوی عمل جو انھوں نے ایجاد کیے، بعد میں مفید ثابت ہوئے اور اس لیے ان کے کام کا آج بھی اعتراف کیا جاتا ہے۔ آج بھی گیبر سالٹ (GEBERSALT) کا نام رائج ہے۔

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی جن کو عام طور پر صرف الخوارزمی کہا جاتا ہے، بڑے پایے کے ریاضی داں تھے۔ ابوریحان البیرونی بڑے ریاضی داں اور فلسفی تھے جو ہندوستان آئے اور جنھوں نے یہاں کے علم، مذہب اور رسم و رواج پر ایک بڑی وقیع کتاب لکھی جس سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جغرافیہ اور تاریخ میں بھی اس عہد میں بڑے کارنامے انجام پائے۔ نہ صرف یہ کہ علما علم کی تلاش میں باہر کے ممالک خاص طور پر ہندوستان، قسطنطنیہ اور کسی حد تک چین جاتے رہتے تھے بلکہ کبھی کبھی ہندوستانی علما کا بھی ہارون الرشید اور مامون الرشید وغیرہ کے دربار میں آنے کا ذکر ملتا ہے۔ قدیم زمانے میں نجوم کا بہت زور تھا۔ ویسے تو سائنس کی روشنی میں نجوم خرافات ہے۔ کیوں کہ اجرام فلکی کا آدمیوں سے کوئی تعلق ہونا سمجھ میں آنے کی بات نہیں ہے اور اس بات کا احساس اس وقت کے بڑے علما کو بھی ہو چکا تھا، مگر نجوم کی یہ اہمیت ماننا چاہیے کہ اس سے جدید سائنس کی شاخ فلکیاتی طبیعات (Astrophysics) کو جنم دینے میں مدد دی۔ نجوم میں قدیم ہندوستان، قدیم یونان اور اسلامی دنیا کا نمایاں ہاتھ ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اسلام کے سنہری دور کی نمایاں ہستیاں قریب قریب سب عرب تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں خاصی بڑی تعداد ایرانی اور تورانی علما کی تھی۔ ان کے علاوہ ہسپانوی اور دیگر ایسے لوگ بھی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ سب حضرات مسلمان تھے۔ غالباً بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی مگر خاصی تعداد میں عیسائی اور کچھ یہودی بھی تھے۔ ان کے عربی اور فارسی ناموں کی وجہ سے ہمارے یہاں کے بہت سے لوگ ان سب کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور عرب عیسائی مورخ فلپ کے۔ ہٹی (PHILLIP. — K. HITTI) کا یہ قول کہ اسلام کا سنہری دور سارے عربوں کا سنہری دور ہے۔ ہم پر یہ بات صاف کر دیتا ہے وہ شاید یہ کہہ کر عربوں کے ایک قوم ہونے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ جب عرب علمی سرگرمیوں میں لگے ہوئے تھے تو یورپ عہد تاریک میں تھا۔ وہاں علم و فضل کے بجائے جہالت کا غلبہ تھا۔ کلیسا نے سوچنے سمجھنے پر پابندیاں لگا رکھی تھیں

کے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا مگر کچھ مبصرین یورپ کی اس تصویر کو پوری طرح صحیح نہیں سمجھتے ہیں شاید انکی یہ رائے بجا ہے کہ یورپ گو کہ علم کی دنیا میں اس وقت کوئی مقام نہیں رکھتا تھا اور اس کا عربوں اور ایشیا کے دیگر ملکوں سے مقابلے کا کوئی سوال نہیں تھا تاہم وہاں کا جاگیردارانہ نظام اپنی تمام ترخرابیوں کے باوجود آہستہ آہستہ یورپ میں کاشت اور تجارت کو بہتر بنا تا جا رہا تھا اور اس طرح اس کو آنے والے انقلاب کے لیے غیر دانستہ طور پر تیار کر رہا تھا۔ اس بنا پر یورپ کے اس زمانے کو عہد تاریک کہہ دینا ایک زیادتی اور نا فہمی ہے۔

یورپ سے طلبا عرب کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں خاص طور پر اسپین اور سسلی میں علم حاصل کرنے آتے تھے۔ شروع میں تھوڑے لوگ آئے لیکن یہ تعداد برابر بڑھتی گئی اور آخر میں بہت بڑی تعداد طلباء کی آنے لگی تھی۔ اس طرح یونان کا علم عربوں سے یورپ پہنچنا شروع ہو گیا۔ وہاں اس کے عربی سے لاطینی میں ترجمے ہونے لگے اور یہی کتابیں یورپ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں رائج ہو گئیں عرصے تک یہ ادارے کلیسا کے زیر اثر رہے۔ پچھلے سو دو سو سال ہی میں علمی ادارے کلیسا کے اثر سے آزاد ہو سکے ہیں۔ علم کی افادیت کے مدنظر کلیسا نے عربوں کے علمی اثرات قبول کیے اور اپنی درسگاہوں میں ان کو جاری کیا۔ جیسا کہ ہم نے مختصراً پہلے ذکر کیا ہے کہ اس عہد میں یورپ میں تجارت بڑھ رہی تھی جس کی وجہ سے دولت پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیزی سے آنے لگی جس کی وجہ سے نئے علمی ادارے قائم ہونے لگے۔ نئے علم کی روشنی سے جس کی بنیاد یونان میں تھی اور کاشت اور تجارت کے بڑے پیمانے پر فروغ پانے کی وجہ سے یورپ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی جس نے زندگی، علم اور ثقافت کے ہر شعبے پر گہرا اثر ڈالا۔ اس سے ایک بالکل نیا ماحول پیدا ہوا جس نے لوگوں کو نئے زاویوں سے سوچنے کی راہ دکھائی اور ان کی رہنمائی اور ہمت افزائی کی۔ اس طرح فنا ہو جانے کے بعد قریب دو ہزار سال بعد یورپ میں یونان دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اس دور میں فنون ادب، فلسفہ، ریاضی، سائنس۔ غرض کہ ہر شعبے میں انقلاب آ گیا۔ اس دور کو نشاۃ ثانیہ کا نام دیا گیا ہے۔ موجودہ یورپ صحیح طور پر نشاۃ ثانیہ کو اپنی تہذیب اور علوم کی شروعات سمجھتا ہے۔ وہ اس پر فخر کرتا ہے اور اس کا بہت ممنون ہے۔

ہم نے جو اوپر کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہے کہ نشاۃ ثانیہ کو یورپ میں پیدا کرنے کے ذمہ دار عرب اور ان کے یورپ کو دیے ہوئے یونانی علوم ہیں۔ یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ نشاۃ ثانیہ کا آغاز اٹلی میں کیوں ہوا۔ وجہ صاف ہے۔ اٹلی عربوں کے اسپین اور سسلی سے بہت زیادہ قریب تھا اور وہاں کے علماء اور طلباء نے سب سے زیادہ ان علمی اداروں سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ اٹلی میں تجارت کے فروغ پانے سے کثیر دولت بھی جمع ہو گئی تھی۔ ان دونوں باتوں کے مدنظر اٹلی ہی سب سے بہتر پوزیشن میں تھا۔ چنانچہ نشاۃ ثانیہ کا وہاں آغاز ہوا اور وہاں سے وہ یورپ کے اور ملکوں میں پھیلا اور وہاں زمین زرخیز پا کر تناور درخت بن گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ روس اور مشرقی یورپ کے کئی ممالک نشاۃ ثانیہ کی برکتوں سے کئی سو سال تک محروم رہے نئی روشنی روس میں پیٹر اعظم سترھویں صدی کے آخر میں لائے۔ اس وقت سے روس بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جو ترقی یورپ میں شروع ہوئی برابر بڑھتی جا رہی ہے اور اب ساری دنیا میں پھیل رہی ہے۔

ہر علم و فن کی طرح سائنس کی ترقی بھی نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوتی ہے۔ خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسی دور میں سائنس کے نئے طریقۂ کار اور روایات کی بنیاد پڑی جن پر سائنس آج بھی چل رہی ہے۔ اس طرح نشاۃ ثانیہ جدید سائنس اور قدیم سائنس کے درمیان حد فاصل ہے۔ وسالیس (VESALIUS) گیلیلیو (GALILEO) اور ہاروے (HARVEY) سائنس کے اسی اہم دور کے قائدین اور عمائدین ہیں۔ ان کے دور کے فوراً ہی بعد برطانوی سائنس داں نیوٹن (NEWTON) نئی سائنس کے سب سے نمایاں علمبردار تھے۔ پھر تو ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی ایک نئی زندگی پیدا ہوئی۔ انگریزی زبان میں ولیم شیکسپیر

(William Shakespeare) اس کی سب سے نمایاں مثال ہیں۔

نیوٹن نے حرکت کے قوانین اور مادی کشش کے نظریے کی مدد سے سورج کے گرد سیاروں کی گردش کو پوری طرح سمجھا دیا اور کیپلر (Kepler) کے دریافت کردہ قوانین کو اپنے نظریے سے حاصل کر کے سب کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ نیوٹن کے نظریوں کو اور اس سے برآمد ہونے والی سیاروں کی سورج کے گرد گردش کرنے کی تصویر کو مانیں۔ اس سے پہلے ارسطو کا نظریۂ عالم (World View) مانا جاتا تھا، جس کے مطابق سیاروں کو ان کے راستوں پر چلانے کے لیے کسی کی ضرورت تھی اور خیال تھا کہ اس کام کو فرشتے انجام دیتے ہیں۔ نیوٹن نے اس نظریۂ عالم (World View) کو مکمل طور پر بدل دیا۔ نیوٹن کے یہاں سیارے خود بخود اپنے مداروں پر چلتے ہیں۔ ان کو کوئی ڈھکیلنے والا نہیں ہے۔ اس طرح ارسطو کے محتاج آفاق (Maintained Universe) کے بجائے نیوٹن کے خودکفیل آفاق (Self Sustained Universe) کی تصویر صحیح مانی گئی۔ اس نے سوچنے کے ڈھنگ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور کسی اور مشینری کی طرح دنیا ایک مکینیکل نظام (Mechanical System) قرار پائی جس کے بارے میں سب معلومات، پیشین گوئیاں، مشاہدے اور تجربات کی بنیاد پر حاصل کردہ قوانین کی مدد سے کی جا سکتی تھیں۔ البتہ پچھلے پچھتر سال میں سوچنے کے اس ڈھنگ میں کچھ تبدیلی کوانٹم میکانیات (Quantum Mechanics) کے ظہور میں آنے سے پیدا ہوئی ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ نیوٹن سے پہلے گیلیلیو نے ارسطو کے ایک دعوے یا پیشین گوئی کو غلط ثابت کیا تھا۔ اس طرح کے اور دعوے اور اقوال بھی غلط ثابت ہوتے گئے۔ اس طرح سو سال سے کم کے عرصے میں تجربات اور مشاہدات کے ذریعے ارسطو اور دیگر قدیم مفکرین کی [illegible] پر بنائی ہوئی پوری عمارت منہدم ہو گئی اس طرح سائنس ان کے ہزاروں سال کے اثر سے آزاد ہو گئی اور اس نے ایک نئی ڈگر پائی جس میں اس کے لیے ترقی کی راہیں کھلی تھیں

گئیں۔ نئی سائنس کو مشاہدے اور تجربے کے راستے پر چلانے کی تلقین کرنے والوں میں برطانوی مفکر فرانسس بیکن (Francis Bacon) کا نمایاں ہاتھ ہے۔ سائنس نے یہی راستہ اختیار کیا۔ ہمارے یہاں کے روایتی تعلیمی نظام میں اب بھی ارسطو وغیرہ کو اعلیٰ ترین مفکر، فلسفی اور دانش ور ہونے کا رتبہ ملا ہوا ہے۔ اس پر نظر ثانی ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ البتہ ان بزرگوں کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ شروع میں تو کلیسا نے یونانی فلسفے کو اپنا دشمن جان کر اس کی زبردست مخالفت کی مگر بعد میں انھوں نے اس کو اس حد تک اپنا لیا کہ جب برونو (Bruno) اور گیلیلیو نے الگ الگ سائنسی نقطۂ نگاہ سے اس فلسفے سے اخذ کردہ کچھ نتائج کی نکتہ چینی کی تو اس کو کلیسا پر براہ راست حملہ سمجھا گیا۔ برونو کو آگ میں زندہ جلا دیا گیا اور گیلیلیو کو قید و بند سہنا پڑا اور بعد کو معافی تلافی کے بعد ان کی برأت ہو سکی کچھ عرصے بعد کلیسا کے لوگ تھوڑا بہت سائنسی سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ اسلام کی روایت شاید ایسی نہیں رہی ہے۔

ہم مختصراً اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس بات کی کیا وجہ ہے کہ یونان کے علوم و فنون اور تکنیکیں ہندوستان اور چین کے کارناموں کے ساتھ جب مسلمانوں نے اپنے اضافے اور تشریح کے ساتھ یورپ کو دیے تو وہاں انقلاب پیدا ہو گیا جو آج تک چل رہا ہے لیکن خود ان ممالک میں وہ کوئی دور رس، دیرپا اور خاطر خواہ صورت پیدا نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ چین میں رائج بہت سی تکنیکیں یورپ نے حاصل کر کے اپنے یہاں رائج کیں۔ مبصرین کا خیال ہے کہ ان سے یورپ نے معاشی طور پر بڑا بھاری فائدہ اٹھایا جس کی وجہ سے وہ نہ صرف نشاۃ ثانیہ کی برکتوں سے مستفید ہونے کے قابل بنا بلکہ ان میں سے کچھ تکنیکیں خاص طور پر بارود نے یورپ کے علماء کے ذہن میں ایسا گہرا تجسس پیدا کر دیا کہ جس سے آگے چل کر بہت اہم باتیں دریافت کرنے میں اسے بڑی مدد ملی۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے

مگر جب یہ چیزیں چین کو پہلے سے معلوم تھیں تو سائنسی اور صنعتی انقلاب نے وہاں یورپ سے پہلے کیوں جنم نہیں لیا۔ قدیم چین کی عظمت کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ہوتا ہے جس میں آپؐ نے حصولِ علم کے لیے چین جانے کو فرمایا۔

قدیم چین کی سائنس اور ٹکنالوجی پر گہری نظر رکھنے والے عالم جوزف نیڈہم (Joseph Needham) کا خیال ہے کہ چین میں جاگیر دارانہ نظام کو چلانے والا حکمران طبقہ بہت تنگ نظر تھا اور وہ سوداگروں کو خاص طور سے بہت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اُن کو نہ بڑھنے دیتا تھا تاکہ وہ حکمراں طبقے کا مقابلہ نہ کر سکیں اس کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بغیر سوداگروں کو فروغ دیے ہوئے صنعتی اور سائنسی انقلاب کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ لہذا چین جہاں تھا وہیں رہا۔ قدیم ہندوستان پر شاید اس بات کا انطباق کچھ اور زیادہ ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو سوسائٹی اور بھی زیادہ چھوٹے چھوٹے ٹکروں میں بٹی ہوئی تھی اور برہمنوں اور راجپوتوں کے علاوہ باقی لوگوں کو مشکل ہی سے کچھ حقوق حاصل تھے۔ برہمنوں کے علاوہ کوئی علم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ دیگر دقتوں کے علاوہ اونچ نیچ اور چھوت چھات کی بنا پر لوگ شاید سفر کچھ کم ہی کرتے ہوں گے۔ ویسے بھی ملنا جلنا کم ہوتا تھا۔ ایسے حالات میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کیسے جنم لے سکتا تھا۔ یونان اور اسلامی دنیا بظاہر کچھ بہتر پوزیشن میں تھے کہ وہاں صنعتی انقلاب شروع ہو جاتا۔ قدیم یونان کو بھی اس لیے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہاں کے معاشرے کی بنیادیں غلاموں کی محنت اور مشقت پر تھیں۔ بہت تھوڑے ہی لوگ سوسائٹی میں اہمیت رکھتے تھے۔ اسلام نے کم از کم مسلمانوں کے درمیان برابری اور اخوت کے اصول دے کر خاصی بڑی تعداد میں لوگوں کو ایک اہمیت اور وقار بخشا جس سے ان کو ترقی کرنے کے مواقع فراہم ہو جانا چاہیے تھے اور بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو صنعتی انقلاب کو جنم دینے کا کچھ موقع تھا۔ پھر علمی سرگرمیوں نے بھی ایک سازگار ماحول پیدا کر دیا تھا جو صدیوں بعد یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے وقت پیدا ہوا۔

اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی خوبیوں کے باوجود اسلامی دنیا میں بھی جاگیردارانہ نظام تھا جو عام طور پر صنعتی ترقی پیدا کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ تجارت کو کافی فروغ ملا مگر چوں کہ اس وقت کی دنیا کی چیزوں کے خریدنے کی طاقت بہت کم تھی اس لیے اس فروغ کے باوجود تاجروں کے پاس اتنی زیادہ دولت اکٹھا نہیں ہو سکی کہ جس کے زور پر وہ جاگیر دارانہ نظام پر حاوی ہو کر اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے۔ کچھ حالات کی بنا پر یہ ایسا نشاۃ ثانیہ کے یورپ میں ہو سکا جس کا ہم مختصراً ذکر کریں گے۔ لہذا اسلامی دنیا کا سنہری دور اس وقت تک رہا جب تک وہ فتوحات کر کے اپنی تجارت اور اثرات کو بڑھا سکتی تھی۔ جب فتح کرنے کو کچھ اور نہیں رہ گیا تو اس کی تعمیری صلاحیتیں شل پڑ گئیں اور جنگوں کی وجہ سے بھی وہ کمزور ہوتی گئی گو کہ کافی عرصے تک اس کی کمزوریاں منظرِ عام پر نہیں آئیں۔ ہلاکو خاں کے حملے نے اس کا بالکل خاتمہ کر دیا جس سے وہ آج تک نہیں پنپ سکی ہے۔ تاج محل اسلامی دنیا کا آخری شاہکار ہے مگر اس کی روح دراصل اس سے قریب تین چار سو سال پہلے نکل چکی تھی۔

آخر میں ہم مختصراً اس پر بحث کریں گے کہ یورپ کی کامیابی کے کیا اسباب ہوئے؟ جب دنیائے اسلام اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی، یورپ میں لوگ زیادہ تر گھنے جنگلوں میں رہتے تھے۔ علوم و فنون اور تہذیب سے بڑی حد تک بے بہرہ تھے۔ آہستہ آہستہ یہاں کے لوگوں کو ایشیا اور خاص طور پر چین سے کچھ نئی تکنیکیں معلوم ہوتی رہیں۔ مثلاً پہلے یورپ میں لوگ ساز گھوڑے کی گردن میں باندھتے تھے جس سے اس کی سانس گھٹنے لگتی تھی اور اس کی وجہ سے اس کی کارکردگی کم ہو جاتی تھی۔ چین میں ساز گھوڑے کی پیٹھ پر باندھا جاتا تھا جس سے گھوڑے کو اس طرح کی تکلیف نہیں ہوتی تھی اور وہ بہتر کام کرتا تھا۔ اس طریقے کو یورپ نے فوراً چین سے لے کر اختیار کر لیا۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوا۔ ان کو دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ یورپ کا بہت بڑا حصہ اس وقت

جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کے لیے ممالک فتح کر کے ترقی کرنے کی راہیں ڈھونڈنے کے بجائے یہ زیادہ آسان تھا کہ وہ جنگلات کاٹ کر کاشت کاری اور پیداوار میں اضافہ کریں۔ عرصے تک یہ زمین پرانی زمینوں کے مقابلے میں زیادہ زرخیز رہی۔ انھوں نے جنگلات کاٹنے کا راستہ اختیار کیا۔ چوں کہ یہ راہ کھلی ہوئی تھی، جاگیرداروں کو کسانوں پر ظلم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بہت عرصے تک کاشت کاری میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور سوسائٹی میں اندرونی جھگڑے نہیں بڑھے۔ پھر جہاز رانی میں انھوں نے چین کی دیکھا دیکھی دنبالہ سے قریب ترین پتوار (Stern Post Rudder) کو بھی اپنے یہاں لے لیا۔ اس سے جہاز رانی میں بڑی مدد ملی اور اس طرح تجارت کو فروغ ملنے کی راہیں کھلیں۔ شاید قطب نما بھی چین سے آیا تھا جس سے جہاز رانی اور سفر کرنے میں بڑی مدد ملی۔ یہ سب ایسے حالات پیدا ہوئے کہ یورپ کی سوسائٹی کو کافی عرصے تک ترقی کرنے کا موقع ملتا رہا اور تجارت سے کثیر دولت جمع ہوتی چلی گئی اور اس طرح سوداگروں کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔ کئی صدیوں کے بعد ہونے والا کامیاب فرانسیسی انقلاب تاجروں کی جاگیرداروں پر جیت کا صریح اعلان تھا۔ اس سے پہلے لمبے عرصے میں انگلستان میں ہونے والی آئینی تبدیلیاں جن سے آج کا آئینی بادشاہت کا نظام وجود میں آیا وہ بھی تاجروں کی جاگیرداروں پر بتدریج سبقت حاصل کرنے کی وجہ سے ہوئیں۔ پھر ان باتوں کے علاوہ اسلامی دنیا سے یورپ کے لوگ جن کو علم کی پیاس تھی، صحت مند خیالات لاتے رہے ان سب باتوں نے نشاۃ ثانیہ کو جنم دیا۔ اس عہد سے ترقی کی رفتار برابر بڑھتی چلی گئی۔ ان باتوں کے علاوہ جن باتوں کا سائنس کے عروج میں بڑا ہاتھ ہے، وہ درج ذیل ہیں:۔

۱۔ چھپائی اور کاغذ بھی یورپ کو چین سے ملے جس کی وجہ سے کتابیں چھپنا شروع ہوئیں۔ ان سے علم کے فروغ میں بڑی مدد ملی۔

۲۔ رسل و رسائل کے بہتر ہونے سے بھی سائنس کو بڑی مدد ملی۔ کیوں کہ علماء کو آپس میں ملنے کی سہولت ہو گئی۔ ڈاک سے بھی خط و کتابت بڑھ گئی۔

۳۔ سائنس کی زبان سب کے لیے لاطینی تھی۔ اس کی وجہ سے مختلف ملکوں کے لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کر سکے اور اس زبان میں کتابیں لکھی جانے لگیں جو سب علماء تک پہنچ سکیں۔ ترجمے کرانے کا مشکل کام نہیں کرنا پڑا۔ وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ کچھ آگے چل کر سائنس کی اکادمیاں ـــــ (Scientific Academies) بنیں جن سے سائنس کو بڑا فروغ ملا۔

اسلام نے اپنے عروج کے عہد میں سائنس اور دیگر علوم میں بڑے عظیم کارنامے انجام دیے اور اس عہد میں سائنس کے فروغ سے مذہب کو خطرہ پیدا نہیں ہوا تو آج بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں مذہب کوئی ایسی کمزور چیز نہیں ہے کہ ذرا سے جھٹکے سے ٹوٹ جائے۔ کم سے کم موجودہ زمانے کی ایک مثال ایسی ہے کہ جس سے اس رائے کو بہت تقویت ملتی ہے۔ ستر سال سے زیادہ مذہب مخالف حکومت روس میں رہنے کے باوجود وہاں مذہب کا جوش ختم نہیں ہو سکا۔ اسی سال روس میں عیسائیت کا جشن ہزار سالہ منایا جا رہا ہے جس کی افتتاحی تقریب میں روس کے نائب صدر اور اور مسز رئیسہ گورباچوف نے سرکاری طور پر شرکت کی۔ دوسرے مذاہب بھی دوبارہ

> "اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں لاکر ڈھیر کر دی جائیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اپنے آپ کو بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔"
>
> ــ (سقراط) ــ

سرگرم ہو رہے ہیں۔ یہی صورت دوسرے مشرقی یورپ کے ممالک میں بھی سامنے آرہی ہے۔

کسی مذہب کی مقبولیت آنے والے زمانے میں اس پر ہوگی کہ وہ اپنے پیروؤں کو کتنی انسان دوستی اور خدمت کا سبق دیتا ہے۔ کمزور طبقوں کی مدد کرنے کا جذبہ اس کے پاس کتنا ہے۔ ہر قسم کے نیک کاموں میں وہ کتنی دلچسپی لیتا ہے، عالمی امن کے لیے وہ کیا کر رہا ہے، آگے بڑھانے میں وہ کتنی دلچسپی لیتا ہے، وغیرہ وغیرہ
مدر ٹریسا (Mother Teresa) جیسے لوگوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ بلا امتیاز مذہب وملت وہ سب کو متاثر کر رہی ہیں۔ آج کے دور میں ہماری توجہ اگر ان مسائل کی طرف نہیں ہوگی تو ہم جس پیغام کو دنیا میں پھیلانے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ دوسروں کی مدد کرنے سے پہلے ہم اپنے لیے ترقی کی راہیں کھولیں تاکہ آئندہ چل کر ہم
دوسروں کی مدد
کرسکیں۔

"میں نے پیشین گوئی کی تھی کہ مستقبل میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دیا ہوا دین یورپ میں مقبول ہو کر رہے گا۔ درحقیقت یہ دین آج بھی یورپ کو پسند آنے لگا ہے۔ قرون وسطیٰ میں عیسائی مذہبی طبقے نے اپنی ناواقفیت یا گھناؤنے تعصب کی بنا پر اسلام کی تصویر کو زیادہ سے خوفناک بنا کر پیش کیا تھا۔ دراصل وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے دین سے نفرت میں حد سے تجاوز کر رہے تھے۔ وہ اُن کو حضرت مسیحؑ کا دشمن سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک یہ فرض ہے کہ محمدؐ کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ان جیسا آدمی آج کی دنیا کی قیادت سنبھالے تو وہ یقیناً ساری مشکلات کے حل میں کامیاب ہو سکے گا اور دنیا کو امن و فلاح سے بہرہ یاب کر سکے گا۔ آج دنیا ان دونوں چیزوں کی کتنی زیادہ محتاج ہے۔"

برنارڈ شاہ۔
(اسلام میں عدل اجتماعی۔ ص۔ ۴۱۵)

رشید احمد صدیقی ___ چند یادیں چند تاثرات

نواب رحمت اللہ خاں*

رشید صاحب سے میرے خاندانی تعلقات تھے۔ ان کا اور میرا رشتہ بزرگ اور چھوٹے کا تھا۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں اور آج پھر اعادہ کر رہا ہوں کہ میری کردار سازی میں رشید صاحب کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں آج جو کچھ ہوں وہ بہت بڑی حد تک رشید صاحب اور ذاکر صاحب کا طفیل ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ذاکر صاحب تک پہنچنے کے لیے رشید صاحب میرے لیے زینہ بن گئے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ مضمون صرف ذاتی یادوں پر مشتمل ہے۔

میری زندگی کا پہلا اہم واقعہ ۱۹۵۱ء میں پیش آیا۔ میری عمر اس وقت ۲۲ سال تھی۔ مزمل منزل میں شہر کے مشہور وکیل بچن بابو کی لڑکی کی بارات ٹھہری ہوئی تھی۔ وکیل صاحب سے رشید صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ ایک دن شام کو موصوف بچن بابو کے گھر والوں سے ملنے مزمل منزل تشریف لائے۔ ان کی موجودگی میں بچن بابو کے صاحبزادے نے مجھ سے کہا کہ بارات کے لیے آپ کی موٹر درکار ہے۔ میں نے جواب دیا۔ واہ صاحب اگر میں نے موٹر آپ کو دے دی تو میں کاہے پر بیٹھ کر جاؤں گا۔ رشید صاحب نے یہ سنا اور خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے۔ گھر جاکر انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں اپنے قلبی رنج و ملال کا اظہار فرمایا۔ موصوف نے لکھا کہ

مجھے تم سے یہ بات سن کر بہت تکلیف ہوئی۔ آدمی موٹر دینے سے بڑا بنتا ہے نہ کہ موٹر میں بیٹھنے سے۔"

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے ہمیشہ بزرگوں کے قول کو اہمیت دی۔ چنانچہ رشید صاحب کا خط پڑھ کر میں کانپ گیا اور وکیل صاحب کے صاحبزادے کو بلا کر کہا کہ موٹر حاضر ہے۔ جب انھوں نے منظور کر لیا تو میں نے رشید صاحب کو مطلع کیا اور ان سے معافی بھی مانگی۔ موصوف بہت خوش ہوئے جس کا آئینہ دار وہ خط ہے جو انھوں نے میرا خط ملنے کے بعد مجھے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے ایک بہت اہم بات یہ تحریر فرمائی ہے کہ

" بھلائی کرنے کے بعد کبھی احسان نہیں جتانا چاہیے ورنہ سب کیا دھرا خاک میں مل جاتا ہے۔"

اگر کوئی شخص رشید صاحب کے ذرا بھی کام آجاتا تو موصوف اس طرح احسان مند ہوتے کہ خود کام آنے والا نادم ہونے لگتا۔ ایک دو مرتبہ رشید صاحب کو میری موٹر کی ضرورت پڑی میں نے فوراً حاضر خدمت کر دی۔ موصوف نے اس طرح احسان مانا کہ نہ معلوم میں نے اُن کے ساتھ کتنا بڑا سلوک کر دیا۔

اُن کی شخصیت کا ایک بہت تابناک پہلو یہ تھا کہ وہ کبھی غیبت نہیں کرتے تھے۔ عرصے تک معمول کے طور پر میں مغرب کے بعد اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا لیکن کبھی اُن کی محفل میں میں نے

* مزمل منزل۔ سول لائن۔ علی گڑھ

کوئی سستی بات نہیں سنی۔ کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ رشید صاحب
کی نظر اسلام پر بڑی گہری تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ارکان
ظاہری کے زیادہ پابند نہ تھے۔ ایک مرتبہ میں اُن کی خدمت میں
حاضر تھا۔ بات نکلی تو فرمایا کہ:

میاں بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس دیس میں مرد
بغیر عورت کی مدد کے کھیت میں کام نہ کر سکتا ہو
وہاں مرد و پردہ کیسے نازل ہو جائے گا۔"

ایک اور مرتبہ گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اگر خلیفۂ اول نے اس سلسلے میں اتنی شدت
نہ برتی ہوتی تو آج علماء اسے معاف کرنے کی
کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکال لیتے۔"

رشید صاحب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری ارادت
تھی۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا بھئی کہ

"کل رات میں نے ریڈیو پاکستان سے نعت کا
ایک ایسا شعر سنا کہ اس میں جو لطف آیا وہ
دسیوں میلاد کی محفلوں میں نہیں آیا۔ تم تو
جانتے ہو کہ مجھے شعر یاد نہیں رہتے۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد میں نے عزت بخاری کا
یہ شعر پڑھا ـــ

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

فرمایا:

"بھئی شعر تو یہی تھا۔ تم نے کیسے اندازہ
لگایا کہ یہی ہوگا؟

میں نے عرض کیا کہ میں جانتا تھا کہ آپ کا ذوق اس سے کم پر
راضی نہ ہوگا۔ پھر عرض کیا کہ دیکھیے تو رشید صاحب کیسے کیسے
بزرگوں کے نام اس شعر میں آگئے ہیں۔

فرمایا:

"کیا کہتے ہو! یہ نہیں کہتے کہ نام لے کر شاعر
نے انہیں بزرگ بنا دیا۔"

غالباً ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ میں علاج کے لیے انگلینڈ گیا
ہوا تھا۔ وہاں مجھے رشید صاحب کا خط ملا۔ رشید صاحب
کی عادت تھی کہ خط کہیں بھی لکھیں، ہمیشہ پوسٹ کارڈ پر ہی لکھتے
تھے اور ایک پوسٹ کارڈ میں اپنا پورا مطلب تحریر فرما دیا کرتے
تھے۔ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ

"تاریخ ادب اردو مرتب کی جا رہی ہے اور
میں اس کی مالی معاونت کے لیے تیار رہوں۔"

میں نے جو جواب دیا اس میں ذاکر صاحب کا ذکر آیا تو میں نے
اسی عقیدت کا اظہار کیا جو آں محترم کی میرے دل میں تھی ـــ
رشید صاحب کو میرا خط بہت پسند آیا۔ جب میں ہندوستان
واپس لوٹا تو ایک دن فرمایا:

ماشاء اللہ تم خط اچھا لکھتے ہو۔ مجھے تمہارا
خط بہت پسند آیا اور میری پسند کی معراج
یہ ہے کہ جو چیز مجھے پسند آتی ہے وہ ذاکر صاحب
کو بھیج دیتا ہوں۔ چنانچہ تمہارا خط بھی ذاکر
صاحب کو بھیج دیا۔"

میں نے اپنے خط میں کسی جگہ اقبال کا ایک شعر نقل کیا تھا
فرمانے لگے کہ:

یہ بتاؤ کہ تم اقبال تک پہنچے کیسے؟

میں نے ہنس کر جواب دیا: کیسے کوئی گناہ ہو گیا ہے؟
فرمانے لگے:

نواب زادے ہو، تمہیں مثنوی میر حسن سے آگے
نہیں بڑھنا چاہیے تھا۔"

میں نے عرض کیا: قبلہ دہرہ دون میں میرے استاد ملگرامی
صاحب تھے۔ انھوں نے مجھے اقبال تک پہنچایا ہے۔

فرمایا:

اب بات سمجھ میں آئی۔ ورنہ یہاں رہ کر تمہیں
کچھ نہ ملتا۔

رشید صاحب میری مالیات کی طرف سے ہمیشہ وحشت کی حد تک پریشان رہتے تھے اور ہمیشہ مجھے نصیحت فرماتے رہتے کہ زیادہ خرچ نہ کرو۔ مگر میں اُن کا یہ حکم کبھی نہ مان سکا اور حقیقت تو یہ ہے کہ خود ممدوح نے نہیں ماننے دیا۔ ۱۹۶۰ء میں جب ایک مرتبہ پھر ولایت جانے لگا تو رشید صاحب نے مجھے ایک ٹوٹا ہوا قلم دیا اور فرمایا اگر ایک پاؤنڈ تک میں اس کی مرمت ہو جائے تو اس کی مرمت کرا کر لانا۔ میں اُن کا قلم لے گیا اور وہاں جا کر دوکان میں مرمت کے لیے دے دیا۔ اس کی مرمت میں ایک پاؤنڈ سے کچھ زیادہ خرچ ہو گیا۔ جب میں واپس آیا تو وہ قلم انہیں دیا۔ دریافت کیا کہ کتنے خرچ ہوئے۔ میں نے جو رقم خرچ ہوئی تھی بتا دی۔ ناراض ہوئے اور فرمایا:

"میں نے تم سے تاکید کر دی تھی کہ ایک پاؤنڈ سے اوپر خرچ ہو تو نہ کرنا۔ پھر تم نے یہ کیا کیا۔"

میں نے عرض کیا: اتنی دور گیا اگر میں نے پانچ شلنگ زیادہ خرچ کر دیے تو کون سی ایسی بات ہو گئی۔ فرمانے لگے:

"جی نہیں۔ اصولاً بھی غلط ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

اسی سال کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ آخر سال میں میرے اسکول کی سلور جوبلی منائی جا رہی تھی۔ میں اس میں شرکت کے لیے جانے لگا تو فرمایا:

"حضرت کچھ زیادہ چندہ وندہ نہ دے آئیے گا۔"

میں جب واپس آ کر حاضر خدمت ہوا تو میں نے عرض کیا: رشید صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ میں نے چندہ میں ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ پوچھنے لگے کہ

"آج کل آپ کی مالی حالت کیسی ہے؟"

میں نے اپنی مالی صورت حال سے آگاہ کیا تو فرمایا:

"یوں نہیں کہتے کہ آج کل آپ کے پاس پیسے ہیں ہی نہیں اور احسان آپ مجھ پر رکھ رہے ہیں۔"

اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

"قرآن میں بخل اور اسراف دونوں کی مذمت آئی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسراف کرنے والے سے بخیل پھر بھی بہتر ہے۔ اس لیے کہ وقت پڑنے پر اُس کے پاس رکھا ہوا پیسہ نکل آتا ہے۔"

ایک مرتبہ کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں بھی چلا آیا۔ لیکن مجھے رات بھر قلق رہا۔ اس زمانے میں رشید صاحب جنرل ایجوکیشن سینٹر کے ڈائرکٹر تھے۔ صبح کو میں نے سوچا کہ میں حاضر ہو کر معافی مانگ لوں۔ میں جانے کے لیے تیار ہو ہی رہا تھا کہ میر الٰہی صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ رشید صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ میں نے کہا چلو میں خود ہی آ رہا تھا۔ بہر حال جب میں پہنچا تو میں نے اپنے رویے کی معافی مانگی۔ رشید صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے:

"اچھا اب تشریف لے جایئے۔ میں کسی شریف آدمی کو زیادہ دیر تک اپنے سامنے نادم کھڑا نہیں دیکھ سکتا۔ اب شام کو تشریف لایئے گا۔ شام کو ملاقات ہو گی۔"

رشید صاحب کی تنقیدی نظر بھی بڑی گہری تھی۔ ایک دفعہ نہ معلوم کیا ذکر نکلا کہ غالب کے سلسلے میں فرمانے

"جو قیامت کے روز کرب و اضطراب سے بچنا چاہتا ہے، اُسے چاہیے کہ تنگ حال مقروض کی مشکلات رفع کرے یا اس سے جو مطالبہ ہو اُس میں کچھ کمی کر دے۔"

(مسلم شریف)

سمجھئے یہ شخص دیو تھا۔ علامہ اقبال نے
قرآن اور سنت کو ساتھ لیا، تب اتنے بڑے
ہوئے اور یہ خدا کا بندہ عمر بھر قرآن اور
سنت سے لڑتا رہا، پھر بھی اتنا عظیم ہے۔ اگر
اس نے بھی اقبال کی طرح قرآن اور سنت کو
ساتھ لیا ہوتا تو نہ جانے کہاں پہنچتا"۔

رشید صاحب کو غریب طلبا کا بہت خیال رہتا تھا
اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ اس سلسلے میں موصوف نے مجھ
سے کافی خدمات لیں۔ جب وہ ڈیوٹی سوسائٹی کے کیپر
تھے تب بھی اور اس کے بعد بھی وہ ذہین اور حاجت مند
طلبا، کو میرے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ خدا کا شکر ہے
کہ میں نے کبھی انھیں نا امید نہیں کیا اور اُن کے کام آکر
ہمیشہ مجھے مسرت ہی ہوئی۔

میری کمزوری یہ ہے کہ جس شخص سے
مجھے لگاؤ ہوتا ہے، میں اس کے غم میں شریک نہ
ہو پاتا۔ چنانچہ رشید صاحب کا انتقال ہوا، تب بھی
میں اُن کے گھر تعزیت کے لیے نہیں جا سکا۔ بلکہ سچ
تو یہ ہے کہ آج تک اس گھر میں پھر نہیں گیا۔

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

"میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر
اپنی طاقت کے تحقیق کرکے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ اور
عمدہ اور سچا یقین کیا ہے اور اسی سچے مذہب نے مجھے
سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی
ہے جو کہتا کچھ اور کرتا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ
کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو
اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن وطعن
کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے... جس چیز
میں ہم کو خدا سے ڈر نہیں اس میں دنیا کے لوگوں سے
کیا ڈر ہے"۔

سر سید احمد خان

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۹ء)

مولانا آزاد اور موسیقی

کلیم سہسرامی*

اس میں شک نہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک دانش ور ہی نہیں مفکر بھی تھے، ان کی شخصیت میں جاذبیت کے ساتھ انانیت بھی تھی۔ ان کی فلسفیانہ موشگافی، غیر معمولی قوت حافظہ اور خطیبانہ انداز تحریر و تقریر سے کون واقف نہیں؟ ان کی سیاسی دور اندیشی اپنی جگہ مسلم لیکن ان کی شخصیت میں بعض ایسے سربستہ راز تھے جن سے عوام کیا خواص کو بھی کم واقفیت ہے۔ وہ یوں کہ مولانا عام طور پر لوگوں سے بے تکلف نہ تھے اور نہ خاص طور پر ہر شخص کے سامنے اپنے سینے میں پوشیدہ راز کو ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ وہ جس موضوع پر گفتگو کرتے تھے اسی کے دائرے میں محدود رہ کر اظہار خیال کرتے تھے۔ ان کے ذاتی معمولات سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے۔ وہ کلکتہ میں بالی گنج کی آرام دہ عمارت میں زندگی کے دن گزار رہے تھے اور عام طور پر اُن سے ملنا ممکن نہ تھا، جب تک پہلے سے ملاقات کا وقت مقرر نہ ہو۔

مولانا اپنی ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات اشعارانہ ذوق اس سلسلے میں مولوی عبدالواحد سہسرامی سے مشورہ، شوق نیموی سے استادی و شاگردی کے تعلقات کی نوعیت پر کہیں کہیں سرسری سی نظر ڈالی ہے لیکن انھیں موسیقی سے بھی بے حد دلچسپی تھی اور وہ اسے روحانی غذا سمجھتے تھے۔ اس کا تذکرہ آج تک کہیں نہ آسکا۔ اس لیے کہ وہ ہر شخص سے کھل کر نہ ملتے اور نہ اس کے سامنے اپنی ابتدائی عمر کے ذوق و شوق کی کیفیت بیان کرتے۔

پروفیسر شمس شیدائی جو خود بھی اب اپنی زندگی کے پچھتر سال پورے کر چکے ہیں اپنے عہد جوانی اور مولانا آزاد کے سیاسی و مذہبی عروج کے زمانے میں ان سے بہت قریب ہو گئے تھے اور ہفتے میں عام تعطیل کے دن لازمی طور پر مولانا کی ملاقات کو جایا کرتے تھے، ان کے ذاتی اور شخصی زندگی کے بہت سے پہلو سے آہستہ آہستہ واقف ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جب کرید کرید کر کوئی بات مولانا سے دریافت کرتے تو مولانا سگریٹ جلا کر کئی کش لگاتے، پھر اسے خاکستر دان پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیتے اور حسب عادت گزشتہ واقعات کو اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں بیان کرنے لگتے۔

ایک دن انھوں نے فرمایا کہ عنفوان شباب میں ستار اور وائلن بجانے کا بہت شوق تھا اور اس فن پر انھوں نے چند مہینوں میں دست رس حاصل کر لی تھی۔ گفتگو کے درمیان پروفیسر شیدائی نے دریافت کیا کہ مولانا آپ کے جیسے مذہبی خاندان کے ایک فرد کے لیے ستار سیکھنا کس طرح ممکن ہو سکا؟ ایک طرف آپ کے والد محترم کی گھر میں موجودگی اور دوسری طرف ہمسایوں کا خوف کہ کہیں یہ راز فاش نہ ہو جائے، پھر یہ کہ کسی ایسے استاد فن

---

* پروفیسر و چیرمین ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز۔ راج شاہی یونیورسٹی، بنگلادیش۔

تک رسائی جو آمادگی کے ساتھ رازدارانہ طور پر آپ کو ستار بجانے
کی تربیت دے سکے۔ مولانا نے جواب دیا کہ میرے بھائی! یہ
ایک دلچسپ داستان ہے۔ اس کے بعد فرمانے لگے کہ کلکتہ
میں مسیتا خاں نامی ایک شخص تھا جو طوائفوں اور رقص کرنے
والی عورتوں کو موسیقی کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ یہ مسیتا خاں، مولانا
آزاد کے والد مولانا خیر الدین صاحب سے متاثر ہو کر ان کے
حلقۂ ارادت میں شامل ہونا چاہتا تھا لیکن مولانا کے والد محترم
نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ ایسے شخص کو جو پیشہ ور عورتوں کو
رقص و موسیقی کی تعلیم دیتا تھا، اپنے مریدوں کی صف میں شریک
نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مسیتا خاں نے یہ پیشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
ترک کر دیا اور مولانا خیر الدین صاحب کی دہلیز پر آ کر پڑ رہا
اس کے دل میں ایک لگن تھی کہ بے روزگاری اور فاقہ مستی کا
مقابلہ وہ کر سکتا ہے لیکن جس طرح بھی ہو مولانا خیر الدین صاحب
کے حلقۂ ارادت میں شریک ہو کر رہے گا۔ اس لیے وہ مولانا کی
دہلیز سے اس طرح وابستہ ہو گیا تھا کہ صبح و شام وہیں پڑا رہتا
تھا۔ کچھ دنوں کے بعد جب پیر و مرشد کو اطمینان ہو گیا کہ بازاری
عورتوں کو رقص و موسیقی کی تعلیم دینے سے مسیتا خاں مکمل طور
پر دست بردار ہو چکا ہے تو اسے اپنے حلقہ بگوشوں میں شریک
کر لیا۔ اسی مسیتا خاں سے جب مولانا آزاد نے ایک دن اپنے
ذوق موسیقی اور اس فن کی تربیت حاصل کرنے کا تذکرہ کیا تو
اس نے نہایت تعجب کا اظہار کیا اور دوسری طرف دل ہی دل میں
خوش ہوتا رہا کہ مرشد زادہ اس کا شاگرد ہونے والا ہے۔ دونوں
طرف سے ایک عجیب کشمکش اور خوشی کا اظہار ہوا اور یہ مسئلہ
دونوں کے ذہن میں آیا کہ آخر اس کا آغاز کب، کہاں اور کس طرح
ہو؟ تاکہ مولانا آزاد کی دلی مراد پوری ہو سکے۔ کیوں کہ اس
ثقہ مذہبی خاندان میں آج تک ساز و آواز کی روایت کا
شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ بہرکیف ستار سیکھنے کا مسئلہ
بھی حل ہو گیا۔ وہ یوں کہ مولانا آزاد اپنے ایک دوست کے
مکان پر سہ پہر کے وقت تشریف لے جاتے اور مسیتا خاں بھی
مقررہ وقت پر وہاں حاضر ہو جاتا۔ مولانا نے نہایت توجہ اور پابندی سے
مشق شروع کی اور تقریباً چھ مہینے کے اندر اتنی دست رس بہم پہنچائی
کہ اپنی انگلیوں کو ستار کے تاروں پر چلانے کا فن سیکھ لیا اور مسیتا
خاں نے نہایت تعجب سے لیکن خوش ہو کر اعلان کر دیا کہ مولانا کو ستار
بجانے کے فن پر پورا عبور حاصل ہو گیا ہے۔ اس وقت مولانا کی عمر سترہ
سال تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے دوبارہ سگریٹ جلایا اور اس کا کش
لے کر مرغولے بناتے ہوئے کہا کہ جب وہ آگرہ میں تھے تو اکثر و بیشتر نور
صبح سے پہلے ستار لے کر تاج محل پر چلے جایا کرتے تھے۔ اپریل کا مہینہ
تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زرد چاند تاج محل کے نقرئی گنبد پر
آویزاں ہے۔ ایسی رومانی فضا اور صبح کی خاموشی میں وہ تاج محل
کی بالکنی میں جمنا ندی کی طرف رُخ کر کے بیٹھ جاتے تھے۔ جمنا
ندی ان کے قدموں کے نیچے شور مچاتی، لہراتی، مچلتی بہتی رہتی اور
وہ ستار کے تاروں پر اپنی انگلیوں سے مضراب کو جنبش دے کر
ایسے دلگداز نغمے چھیڑ دیتے جو سحر انگیز خاموشی میں تمام کائنات
اور فضائے بسیط کو اپنے آغوش میں سمو لیتا۔ وہ اپنے آپ کو
موسیقی کی نرم و نازک موجوں میں بہتا ہوا محسوس کرتے۔ ان کے
تصور میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تاج محل کا چمکتا ہوا مقبرہ ان
کے قدموں میں سجدہ کر رہا ہے اور ستار سے ابلتی ہوئی موسیقی کے جذب
اور کیف میں تاج محل کے لرزتے ہوئے منارے رقص کر رہے ہیں اور جمنا
ندی کی ہلکی ہلکی لہریں ان کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہیں۔ وہ ستار
بجانے میں اس قدر محویت کے عالم میں کھوئے رہتے جب تک مؤذن
مسجد کے منارے سے صبح کی اذان نہ دیتا۔ مولانا نے یہ بیان کرتے ہوئے
اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی ابتدائی زندگی کی یادوں میں کھو گئے۔ انھوں
نے مزید فرمایا کہ ستار نوازی کا یہ محبوب مشغلہ تقریباً آٹھ سال تک جاری
رہا اور اس کے بعد بالکل ختم ہو گیا۔ مضراب کے نشانات ان کی انگلی
پر اب تک باقی ہیں، وہ زندگی کی بہت ساری آسائشوں سے کنارہ کش
ہو سکتے ہیں، لیکن موسیقی سے ان کے لیے قطع تعلق ممکن نہیں۔ موسیقی
تو اُن کی روحانی غذا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۱۔ (جنوری ۱۹۸۹ء)

قصہ "عزیزانِ علی گڑھ" کے چھپنے کا

(رشید صاحب کی گیارہویں برسی کے موقع پر)

فصیح احمد صدیقی *

قبلہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ خطبہ "عزیزانِ علی گڑھ" ان کی آخری تحریر ہے۔ گو کہ اس کا لکھا جانا ۱۹۶۷ء میں شروع ہوا اور کسی نہ کسی صورت سے ۱۴ر جنوری ۱۹۷۷ء کی رات یعنی انتقال سے چند گھنٹوں پہلے تک جاری رہا۔ یہ خطبہ کیوں لکھا گیا اور اس کو کتابی شکل میں چھاپے جانے کی کیسی کیسی کاوشیں ہوئیں، ان کی ہی زبانی سنیے:

"۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر عبد العلیم صاحب وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہوئے تو موصوف نے یونیورسٹی کی صد سالہ جوبلی منانے کا خیال ظاہر کیا۔ ضروری انتظامات شروع کر دیے گئے۔ میرے دل میں بے اختیار یہ بات آئی کہ اس موقع پر آپ نوجوانوں کو ایک خطبہ دوں گا۔ اس کی نوبت نہ آئی تو چھپوا کر تقسیم کر دوں گا۔ اس سے دل میں کچھ اس طرح کی کشاد محسوس ہوئی کہ خطبہ لکھا جانے لگا۔ کچھ دنوں بعد حالات اس طرح بدلے کہ جوبلی کی تحریک ملتوی ہو گئی لیکن خطبہ کا لکھا جانا ملتوی نہ ہوا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو خطبہ توقع سے کہیں زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ شوقِ فضول اور جرأتِ رندانہ پر ہنسی بھی آئی، شرمندہ بھی ہوا لیکن اس امید نے دامن نہ چھوڑا کہ طباعت و اشاعت کی شاید کبھی نہ کبھی صورت نکل آئے۔ اس کا اندیشہ البتہ رہا کہ اگر یہ جلد شائع نہ ہو سکا تو قابو سے باہر ہو جائے گا۔ یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔

سرکاری اور غیر سرکاری پبلشنگ اداروں سے رجوع کیا۔ سب نے اس طرح کانوں پر ہاتھ دھرے جیسے مجھے بھی آئندہ سے کان پکڑ لینا چاہیے۔ آخر میں کسی اسمگلر کی تلاش میں نکلا۔ کتنے بڑے بڑے لوگ اور ان کے منصوبے اس قبیلے کی داد و دہش کے منتظر و محتاج رہتے اور رجوع کرنے پر اپنی مراد کو پہنچے لیکن اس کوچہ میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ حکومت نے ایک "خوشگوار صبح" پردۂ غیب سے باہر نکل کر سارے اسمگلروں کو بحق سرکار ضبط کر لیا۔ یہاں تک کہ بلیک مارکیٹ سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے۔ ایک زمانہ میں "دفترِ بے معنی" کو غرقِ مئے ناب کر دیتے تھے، اب اس طرح کی اشیا یا مجوبہ کو سرد خانے یا غالب کے عہد کے طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے ہیں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں۔"

پوری مسل داخلِ دفتر ہو چکی تھی کہ ایک عزیز نے مشورہ دیا کہ اس خطبہ "عزیزانِ علی گڑھ" لکھنؤ کے

---

* پروفیسر کیمسٹری ڈپارٹمنٹ، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

مستند اور مشہور اخبار "قومی آواز" کے ہفتہ
وار ضمیمہ میں شائع ہونے کے لیے بھیج دیا جائے۔
مشورہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مسودہ پر قبضہ کر کے
اس کے اجزاء بھیجنے شروع کر دیے۔ اڈیٹر صاحب
کے لطف خاص کا شکر گزار ہوں کہ موصوف نے
پورے خطبہ کو چھبیس قسطوں میں شائع کر دیا۔
کیسا اطمینان اور خوشی ہوئی کہ اس پر موصوف
کو کسی طرف سے کوئی گزند نہیں پہونچی!"

اس "مشورہ" اور "مسودہ پر قبضہ" کا کام راقم الحروف نے سرانجام دیا۔ یہ "داخل دفتر" مسل پروفیسر صاحب قبلہ نے ان صفحات پر لکھ رکھے تھے جو دراصل یونیورسٹی کی امتحان کی پرانی کاپیوں کے نکلے ہوئے فاضل اوراق تھے۔ عرصہ دراز سے جب یونیورسٹی میں امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملا کرتا تھا، رجسٹرار صاحب محنتانے کی جگہ یہ اوراق پروفیسر صاحب کی نظر کرتے۔ یہ اوراق شاید زبیری صاحب (۱۹۴۷ سے پہلے) کے زمانہ رجسٹراری کے تھے۔ یونیورسٹی کے ان اوراق سے پروفیسر صاحب کو جذباتی لگاؤ تھا، اس لیے کہ جب کبھی بہتر سے بہتر کاغذ پیش کیا گیا، اس کی قسمت نہ جاگی! یہ کاغذ عام طور سے خاصا ہلکا ہوا کرتا اور بہت جلد عمر طبعی پا کر بھر بھرا ہونے لگتا۔ بال پن سے لکھی عبارت اتنی باریک ہوتی کہ ان کے لکھے ہوئے ایک صفحہ کے لیے میرے کم از کم پانچ صفحات درکار ہوتے۔ الفاظ کا پڑھا جانا کبھی کبھار خاصا دشوار ہو جاتا۔ مسودہ کی نقل کا کام میرا ہوتا۔ اس پر وہ نظر ثانی کرتے اور پھر ڈاک کے حوالے۔

پتہ نہیں کیوں جیسے ہی قومی آواز میں یہ خطبہ سلسلہ وار چھپنا شروع ہوا ملک میں "ایمرجنسی" لگنے کے آثار ظاہر ہونے لگے اور کچھ قسطوں کے بعد اخبارات "سنسرشپ" کی گرفت میں آ گئے۔ پروفیسر صاحب کی اس تحریر میں جذبات کی شدت ضرور تھی۔ عشرت علی صدیقی صاحب بڑے مان دان والے اڈیٹر تھے لیکن پھر بھی دھڑکا لگا ہی رہتا۔ اس لیے تحریر پر برابر نظر ثانی و ثالث کی فرمائش کسی نہ کسی بہانے سے کرتا رہتا۔ ہر طرح کے موضوعات اس خطبہ میں زیر بحث تھے۔ جنس کے موضوع کے تحت بھی قوم پر جب لعن طعن زیادہ ہونے لگتی تو میرے اس کہنے پر کہ اس میں فلاں کا رنگ آ رہا ہے ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد پوری تحریر قلم زد کر دیا کرتے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی لطیفہ بھی بیان کر دیتے۔ ایک لطیفہ یاد رہ گیا ہے۔ کوئی محترمہ جانسن کے پاس یہ فریاد لے کر پہنچیں کہ حضرت آپ نے اپنی ڈکشنری میں فحش الفاظ جمع کر ڈالے ہیں جانسن نے جواب دیا کہ بی بی آپ نے صرف وہی ڈھونڈھے ہیں۔

خطبہ کے پھر سے لکھے جانے، نقل ہونے اور لکھنؤ بھیجے جانے کے دوران تقریباً روزانہ ہی حاضری رہتی۔ پھر بھی کسی چیز کی یاد دہانی کے لیے وہ دو چار لائنوں کے خطوط لکھ دیا کرتے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے حاضر ہیں:

۱۲/۱۷ ڈیر فصیح

ان تینوں کاپیوں کو میں دیکھ گیا۔ ہو سکے تو ورق گردانی کر جاؤ۔ ورنہ ایسی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اب میں اپنے پچھلے کام کو ہاتھ میں لیتا ہوں۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

ڈیر فصیح

جب تک امتحان کے کاموں سے (دہلی اور لکھنؤ سے) فارغ ہو کر علی گڑھ واپس [ہو]، مسودہ کا کوئی جز لکھنؤ قومی آواز میں نہ بھیجنا، کچھ اصلاح اور اضافہ کرنا ہے۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

جمعہ۔ ۳ر دسمبر ۷۶ء

ڈیر فصیح

خطبہ کا ابتدائی حصہ نظرِ ثانی کے لیے کسی وقت بھیجو۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

شنبہ ۱۴ر جون ۷۵ء

ڈیر فصیح

بحوالہ رات کی گفتگو

تعمیر حیات کی مطلوبہ خبر بھیجتا ہوں۔ "عزیزانِ علی گڑھ" کے ایک صفحہ کا جو تعارف ہے اس کی نقل ڈپارٹمنٹ جاتے ہوئے مجھے دے دینا اس کو میں درست کر دوں گا، جیسا کہ تم چاہتے ہو۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

5-3-75

ڈیر فصیح

معلوم ہوتا ہے کل تم کو قومی آواز دستیاب نہیں ہوا۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

قومی آواز میں "عزیزانِ علی گڑھ" کے چھپنے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے الیکشن ہوئے سکریٹری صاحب نے پروفیسر صاحب قبلہ کو استقبالیہ دینے اور جلسے میں شرکت کی دعوت دی۔ سکریٹری یونین کے مسلسل اصرار اور قبلہ کے انکار کے درمیان میں پڑا۔ اس کی روداد اُن کی ہی زبانی سنیے:

"میں یہ سمجھ رہا تھا کہ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین ایک طویل مدت کے بعد بروئے کار آئی۔ یونین کے سکریٹری صاحب کا ارشاد ہوا کہ میں اس استقبالیہ میں حاضر ہوں جو وہ یونین کی طرف سے یونین اور یونیورسٹی سے میری دیرینہ وابستگی کے صلہ میں دینا چاہتے تھے۔ طرح طرح کی معذوریوں کے باعث میرے لیے شرکت ناممکن تھی۔ بہت کچھ ردوقدح کے بعد طے پایا کہ میں خطبہ لکھ کر دے دوں وہ جس طرح مناسب سمجھیں گے کام میں لائیں گے۔"

اب میں پھر پکڑا گیا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے خطوط حاضر ہیں:

24.5.75

ذاکر باغ

ڈیر فصیح

اعظم صاحب کا یہ خط بھیجتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے پاس میرے ہاتھ کا لکھا ہوا جو اوریجنل نسخہ ہے وہ ان کے حوالہ کر دیا جائے اس لیے اعظم صاحب سے کہو کہ وہ اس کی نقل حاصل کرنے کے لیے کسی خوشنویس کو متعین کر دیں وہ تمہاری نگرانی میں نقل کر لے۔ خوشنویس کا معاوضہ یونین ادا کرے گی۔ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً تم سے میری جو گفتگو ہو چکی ہے وہ تمہارے ذہن میں ہوگی۔

یہ چاہے کہہ دینا کہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے لیے ایڈریس تیار ہے، لیکن وہ حوالہ اسی وقت کیا جائے گا، جب چھپ جائے گا۔ اسی لیے نقل کرانے پر اصرار ہے۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

۲۲ر اپریل

ڈیر فصیح

یونین کے ایڈریس میں جو پانچ مدیں دستور العمل کے طور پر پیش کی گئی ہیں، ان کو کسی وقت بھیج دینا ان پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہوں۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

15.7.75

ڈیر فصیح

یہ خط آج ملا ہے۔ شام کو آؤ تو یونین والا ایڈریس ساتھ لانا، اس پر گفتگو کرنی ہے۔ محمد حسن صاحب کو لکھا ہے کہ پندرہ روزہ مقالہ کی میعاد بڑھا دیں تو بہتر ہوگا۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

یونین کا مقدر تو کچھ اور ہی تھا تو پھر یہ خطبہ کیسے دیا جاتا خود لکھتے ہیں:

"قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونین ایک دفعہ پھر تعطل میں آگئی ہے اور عجب نہیں متذکرہ صدر جو تحریک اس کے سامنے تھی وہ نامعلوم مدت تک "منجمد" رہے۔ ان دونوں خطبات کا نصیب کچھ اس طرح کا معلوم ہونے لگا جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے کہ
"آشیانے کے لئے جو شاخ چنی وہ شاخ جل گئی۔"

اسی دوران سرسید ہال میگزین کے مرتب اور نگراں ڈاکٹر اصغر عباس صاحب (استاد شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی) نے پروفیسر صاحب سے مضمون کی درخواست کی۔ اس سلسلے میں اصغر عباس صاحب نے سید شفیع اللہ صاحب (استاد شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی) کی معرفت اپنا خط پروفیسر صاحب کے پاس بھجوایا۔ اب پھر میری طلبی ہوئی خط ملاحظہ ہو۔

منگل ۱۳ر ستمبر

ڈیر فصیح

کئی دن ہوئے شفیع اللہ ان اصغر عباس صاحب کا خط لائے کہ ان کے ہال کے لئے کوئی مضمون لکھ دوں۔ میں نے معذرت لکھ بھیجی اس کے جواب میں انھوں نے یہ خط بھیجا۔ خیال آیا کہ کیوں نہ اُن کو یونین والے خطبے سے عبدالرحمٰن صدیقی صاحب کا تذکرہ بھیج دیا جائے۔ چنانچہ میں نے اصغر عباس صاحب کو لکھا ہے کہ وہ شفیع اللہ کو میرے پاس بھیج دیں۔ ان سے ضروری باتیں کہہ دوں وہ اصغر عباس صاحب کو پہنچا دیں گے۔

تمہاری کیا رائے ہے؟ اگر متذکرہ صدر مضمون کو چھپنے کے لیے دینا ہے تو پہلا سوال ہوگا کہ اس کی نقل کون کرے گا۔ پورا خطبہ حوالہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اصغر عباس کو جلدی ہے۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

رائے مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ اصغر عباس صاحب کو یونین کا پورا خطبہ دے دیا جائے اور اس طرح یہ "ایک خطبہ جو دیا نہ جا سکا" کے نام سے سرسید ہال ریویو اولڈ بوائز نمبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہو گیا۔

ان دونوں خطبات کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی زبردست خواہش میری ہی تھی۔ باوجود قبلہ کے منع کرنے کے

میں نے مسودہ پر پھر قبضہ کیا اور اشاعت کی ترکیبوں میں لگ گیا۔

پروفیسر محمد شفیع صاحب اس زمانے میں پرو وائس چانسلر تھے ان سے اس خطبے کے کتابی شکل میں شائع کئے جانے کی بات ہوئی۔ انھوں نے ایک کمیٹی بنائی جس میں پروفیسر علی محمد خسرو صاحب (وائس چانسلر) ڈاکٹر کمال الدین صاحب (ریڈر شعبۂ اکنامکس) جاوید حبیب صاحب (طلبا کے نمائندے)، شفیع صاحب خود اور راقم الحروف شامل تھے۔ طے یہ ہوا کہ یونیورسٹی اس مسودے کو خود چھاپے۔ دفتری کاروائی کے سلسلے میں مسودہ پرو وائس چانسلر کے دفتر پہنچ گیا۔ اسی سلسلے کے خطوط ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اتوار۔ ۱۱ر اپریل ۱۹۷۶ء

ڈیر فصیح

شفیع صاحب نے پریس سے تخمینہ طلب کرنے کے لیے "عزیزان علی گڑھ" کا مسودہ طلب فرمایا ہے۔ تمہارے پاس جو اجزا ہیں، ان کو ساتھ لاؤ تو تھوڑی سی گفتگو کے بعد اسے شفیع صاحب کی خدمت میں بھیج دوں۔ ہو سکے تو تمہاری ہی معرفت علی گڑھ تحریک ثانی کا مسودہ میرے پاس ہے۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

شنبہ ۵ر جون ۷۶ء

ڈیر فصیح

کل میں نے پرو وائس چانسلر سے درخواست کی تھی کہ "عزیزان علی گڑھ" کا مسودہ میرے پاس بھجوا دیں۔ تاکہ اس پر اطمینان سے نظر ثانی کر سکوں۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اندیشہ ہے کہ کہیں پریس اور پرو وائس چانسلر کے دفتر کے درمیان کھو یا نہ جائے یا اس کا حلیہ بگڑ جائے تم ذرا کوشش کر کے اسے حاصل کر لو۔ ورنہ تمہاری عدم موجودگی میں اندیشہ ہے مسودہ کہیں سے کہیں نہ پہونچ جائے۔ وہی ایک کاپی رہ گئی ہے۔

ڈپارٹمنٹ سے جاتے ہوئے مجھ سے ذرا دیر کے لئے ملتے جانا۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

اب اس سلسلے کی تھوڑی سی کہانی اور

کمیٹی نے یہ طے کیا کہ چھ ہزار روپے پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر کیے جائیں تاکہ وہ اس کو چھپوانے کا کام اپنی پسند سے شروع کرا دیں۔ میں نے ایجوکیشنل بک ہاؤس کے اسدیار صاحب کو اس کام کو سونپا۔ وہ خود پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مسودہ پھر سے ٹھیک ٹھاک کیا جانے لگا اور کتابت شروع ہوئی۔ اب یونیورسٹی سے چیک لینے کی بات آئی۔ اس سلسلے میں جو خاص بات ہوئی، وہ ناظرین کی خدمت میں حاضر ہے۔ قبلہ اس چھ ہزار روپے کے چیک کو ایڈوانس کی حیثیت سے لینے کو بالکل ہی رضامند نہ تھے۔ چاہتے تھے کہ جو رقم منظور ہوئی ہے وہ نہ نکالی جائے۔ کام کے ختم ہو جانے پر ہی چیک وصول کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ پبلشر کو پیشگی رقم تھوڑی بہت دینا ہی ہے، فرمائیں تو میں اس کا اپنے طور سے انتظام کر دوں۔ وہ اس پر بھی کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ ایک بیچ کی راہ انھوں نے خود نکالی۔ مجھ سے کہا کہ تم اور کمال ایک تحریر لکھ کر دو کہ اگر اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو اُن کے نہ رہنے کے بعد اس رقم کو میری اور کمال کی تنخواہوں سے فوراً وضع کر لیا جائے۔ انھوں نے پرو وائس چانسلر صاحب کے نام ایک خط اس مضمون کا لکھا اور اس پر میرے اور کمال بھائی کے دستخط کرائے۔ خط ملاحظہ ہو۔

۱۱ر دسمبر ۷۶ء

ڈیر فصیح

(۱) ۷۶۔ ۷۔ ۷ کے نام میں نے خط لکھ دیا ہے۔

کمال کی طرح تم بھی اپنے دستخط سے تصدیق کر دینا
اس کے بعد کام میں لانا

(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس کے تخمینے میں
یو. جی. سی کے مقالے کا بھی تخمینہ ہونا چاہیے۔ تاکہ
چھ ہزار کی رقم پوری ہو جائے۔ ایسا کرنا ضروری
ہے۔

جلدی نہیں کسی وقت آجاؤ تو تفصیل سے گفتگو
ہو جائے گی۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

اس خط کے ساتھ ایک پرزہ بھی منسلک تھا۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ کاتب کی تلاش
۲۔ کاغذ وغیرہ کے لیے کچھ رقم پیشگی
۳۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس سے شرائط کی تصدیق
خطبات کا سائز۔ صفحات کا تعین۔ وان ڈائنگ
کا انتظام کیوں کر ہوگا۔ نرخ وغیرہ کا تعین۔ کاغذ
کا نمونہ۔ سائز۔ پروف کا دیکھنا۔ دوسرے
اخراجات۔ کام کب تک مکمل ہوگا۔

تمہارا
رشید احمد صدیقی

یہ خط ۱۱ر دسمبر ۷۶ء کا ہے۔ میں نے قبلہ کے U.G.C صاحب
کو لکھے گئے خط پر دستخط تو کر دیے لیکن گھبراہٹ سی شروع ہو گئی
چوں کہ U.G.C آفس اور دیگر دفاتر اور پبلشر کے یہاں آنے
جانے کا کام میرے ہی ذمہ تھا۔ میں نے طے کیا کہ جب تک
پبلشر صاحب تھوڑا بہت کام نہ کر ڈالیں میں یونیورسٹی سے
اس مد کی کوئی رقم نہ لوں گا اور پھر ایسا ہی کیا گیا اور کسی قسم
کی رقم یونیورسٹی سے نہ لی گئی

مسودہ پر اب کام تیزی سے شروع کیا جانے لگا۔ کچھ
صفحات کم کیے گئے اور کچھ بڑھائے گئے۔ اسی دوران وہ حادثہ پیش
آ ہی گیا جس کا مجھ کو سب سے زیادہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔

۱۴ر جنوری ۱۹۷۷ء کو رات میں خاصی دیر تک ان سے
باتیں ہوتی رہیں۔ ان کی میز پر اُن کی لکھنے والی تختی پر سر سید ہال
کا ریویو جس میں "ایک خطبہ جو دیا نہ جا سکا" لگا ہوا تھا اور وہ اس
کی تراش خراش میں لگے رہے۔ چلتے وقت فرمایا کہ صبح ڈپارٹمنٹ
کئی بجے جاؤ گے۔ گھر سے ذرا جلدی چلنا۔ تاکہ تھوڑی دیر تم کو کچھ
چیزیں بتا سکوں۔ اور ہاں دو ایک خطوط بھی لکھنے ہیں ان کو دیکھ
لینا اور خود ہی ڈال دینا۔ ایک خط سیّد حامد صاحب کو دہلی
اور دوسرا تمہارے پرو وائس چانسلر صاحب کو۔ دوسرے
روز صبح تڑکے سکندر بھاگے ہوئے گھر پہونچے اور بتایا کہ
میاں کی رات سے سخت طبیعت خراب ہو گئی ہے فوراً ہی چلیے۔
دیکھتے دیکھتے قبلہ ہم سب عزیزوں کو چھوڑ چھاڑ رخصت ہو گئے

اب میری ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ اس مسودہ کو دیکھتے
ہی بے قابو ہو جایا کرتا تھا۔ اس لیے اسے کمال بھائی کی خدمت
میں حاضر کر دیا اور کچھ عرصے کے بعد علی گڑھ سے لمبی رخصت لے
کر ہندوستان سے باہر چلا گیا۔

یہ مضمون شاید اس طرح نہ لکھا جاتا کیوں کہ قبلہ
کے خطوط شائع نہ کرنے کی ذمہ داری میری بھی ہے لیکن یہ سوچ
کر کہ حکم عدولی ضرور ہو رہی ہے لیکن شاید بڑا مقصد حل ہو جائے
ان خطوط کو اس میں شامل کر لیا گیا۔ پروفیسر صاحب قبلہ کے
مضامین نہ معلوم کتنے رسالوں خصوصاً "فکر و نظر" میں بکھرے
پڑے ہیں ان کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع ہو جانا چاہیے۔ اگر
ایسا جلد نہ کیا گیا تو وہ ضائع ہو جائیں گے اور شاید یہ بات اچھی
نہ ہو۔

قبلہ نے اپنے آپ کو کہیں "علی گڑھ کا دیوانہ" کہیں "نوترے دیم
کے گرجے کے گھنٹہ بجانے والا کبڑا" اور کہیں "بوڑھا منشی"
کہا ہے لکھتے ہیں:

"کیسے کیسے ننھے جن کی بازیافت صرف منشی اور اس
کا بوڑھا ساز ہی کر سکتا ہے۔ وہ ننھے جن کے

سننے کی نئی نسل میں شاید تاب نہ توفیق۔ تاریخ کی سنگیت پر تقدیر کے نغموں کو پہچاننا اور اپنانا ان کے بس کی بات نہیں لیکن بوڑھا مغنی اپنے نغمے بجاتا رہے گا۔"

"عزیزان علی گڑھ" ان کے ہی الفاظ میں "آہ دفغان نیم شب کا پیام ہے" ملاحظہ فرمائیں

جس عظیم تہذیب کے کھنڈر پر جن اقدار و عزائم کو سامنے رکھ کر جس سر آمد روزگار نے علی گڑھ تعمیر کیا تھا اور جس علی گڑھ نے اپنے فرزندوں کو زندگی اور زمانے کے بڑے سے بڑے چیلنج کو قبول کرنے کا حوصلہ دیا۔ جن کی تاریخ اور تقدیر کو اس نے ان کے لیے دریافت کیا اور تب و تاب دی' اس کو رسوا اور مسمار دیکھ کر علی گڑھ کا دیوانہ اپنے نوجوانوں کو اللہ اور انسانیت کی طرف بھاگنے اور بھگالے جانے پر آمادہ نہ ہو جائے تو کیا کرے۔"

کیا ہم سب کو اس میں قبلہ کے دل کی دھڑکنیں نہیں سنائی دیتیں ؟ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں برسوں ان کے ساتھ ان کی ان دھڑکنوں میں شریک رہا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب کبھی یونیورسٹی قبرستان جا کر فاتحہ پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے تو شرم سے سر جھکائے آنکھیں نم کیے رہتا ہوں اور سوچا کرتا ہوں کہ میں نے وہ کام کیوں نہ کیا جو مجھ پر فرض تھا ؟

کیسے میں یہ لکھوں کہ میں کہاں کہاں نہ گیا! کس کس کو نہ لکھا اور کیا کیا نہ کیا ۔ اس کی تفصیل لکھنے سے اپنوں کی سبکی کا خیال آ جاتا ہے۔ قبلہ خود ہی لکھ چکے ہیں " سب نے اس طرح کانوں پر ہاتھ دھرے ....." جب انھوں نے ہی تفصیل نہ لکھی تو میں لکھنے والا کون!

"سر سید نے اپنے قوائے ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی اور اسی لیے ان کی لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگیوں سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا لیکن جس قدر آگے بڑھتے جاتیے اسی قدر اس میں عظمت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہیرو کو معمولی آدمیوں کی سطح سے بالاتر کر دیتی ہے"

مولانا الطاف حسین حالی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۹ء)

جانوروں میں جنس کی ابتدا ارتقا اور عروج

عبدالحسیب

عالم قدرت میں نسل بڑھانے کے آلات وذرائع ہر جاندار کو عطا کیے گیے ہیں. خواہ درخت ہوں یا جانور انسان ہوں یا خوردبینی کرۂ حیات سب ہی کسی نہ کسی طرح اپنی نسل کو بڑھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر جانداروں میں تولید وتناسل کے ذرائع بند ہوجائیں تو کچھ دنوں کے بعد یہ عالم جانداروں سے خالی ہو جائے گا.

یہ ظاہر ہے کہ انسانی نسل کو بڑھانے کے لیے دو جنسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور انسانوں ہی پر کیا موقوف ہے تمام اعلیٰ جانوروں میں بغیر نر و مادہ کی موجودگی کے نسل قائم نہیں رہ سکتی لیکن اب ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس جنسی تفریق کی ابتداء کیسے ہوئی ؟ ہم کو یہ تو معلوم ہے کہ صفحۂ دنیا پر کسی نہ کسی زمانے میں زندگی کا آغاز مادۂ حیات یا ایک خلیے سے ہوا. تمام جاندار دفعتاً تو اس عالم میں آنہیں گئے. ابتدائے عالم میں ضرور ادنیٰ جانور تشریح اور زندگی کے ہر شعبہ میں ہم سے سادہ ہوتے ہوں گے.

اسی کے ساتھ ہم کو اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ جنسی تفریق جو اعلیٰ قسم کے جانوروں میں پائی جاتی ہے کوئی ایک بار تو پیدا نہ ہو گئی ہو گی بلکہ اس کا عروج بھی تدریجاً ہوا ہوگا اور واقعہ بھی یہی ہے ۔

اس چھوٹے سے خوردبینی سادہ ایک خلیے کے جانور امیبا (Amoeba) کے حالات زندگی پر غور کیجیے. اس میں جنس کی کسی تفریق کا تو پتہ ہی نہیں ہوتا. یہ اپنی نسل کو اپنے جسم کے حصے کر کے بڑھاتا ہے. جیسے کہ ایک آٹے کے گولے کو بیچ سے ایک تاگے کے زور سے باندھ دیا جائے تو وہ گولا ڈگڈگی کی شکل کا ہو کر دو حصوں میں منقسم ہو جائے گا. اسی طرح امیبا کے جسم کے بھی دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں. یہ ضرور ہے کہ امیبا چوں کہ جاندار ہے، اس لیے اس کے جسم کے منقسم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے نواۃ کا تقسیم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے.

اس کے بعد دوسرے ایک خلیے کے جانور پیرامیشیم (Paramoecium) کو ملاحظہ کیجیے. مسئلہ ارتقاء کے نظریے سے یہ جانور امیبا سے بلند ہے. اس میں بھی کوئی جنسی تفریق نہیں پائی جاتی. ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنی نسل کو بڑھانے کے لیے دو یکساں پیرامیشیم قریب آجاتے ہیں. یہاں تک کہ ایک دوسرے سے مس ہو کر ہم جنسی مباشرت کرتے ہیں. اس کے بعد ایک خاص طریقے سے ان کے نواۃ کا ایک دوسرے کے ساتھ ملاؤ ہوتا ہے اور پھر یہ نواۃ سات حصوں میں منقسم ہو کر سات جانوروں کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں ۔

جنسی تفریق کی ابتدا سمجھنے کے لیے اب اگر ہم ارتقا کے ایک اور زینہ پر چڑھیں تو ہم کو ایک دوسرے ایک خلیے کے جانور ورٹی سیلا (Vorticella) کی جنسی تفریق پر غور کرنا ہوگا۔ ورٹی سیلا الٹی گھنٹی کی شکل کا ایک جانور ہوتا ہے۔ اس جانور میں اچھی خاصی جنسی تفریق نمودار ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک جوان ورٹی سیلا اپنے نیچے کے دم نما حصّے سے پانی میں کسی چیز سے اٹکا رہتا ہے اب ایک دوسری وضع کا ورٹی سیلا اس کے قریب آ کر اس سے مس ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا ورٹی سیلا پہلے اٹکے ہوئے ورٹی سیلا سے حسب ذیل باتوں میں مختلف ہوتا ہے۔

۱۔ مقابلتاً اس کا جسم چھوٹا ہوتا ہے۔

۲۔ نیچے کا دُم نما حصّہ موجود نہیں ہوتا۔

۳۔ علاوہ اوپر کی ادنیٰ آبی جانوروں کی حرکی روئیں[1] کی ٹوپی کے اس کے جسم کے پچھلے حصّے میں حرکی روئیں موجود ہوتے ہیں۔

۴۔ یہ چھوٹا ورٹی سیلا اپنے دوران زندگی میں کسی ایک جگہ اٹکا نہیں رہتا بلکہ تیزی کے ساتھ پانی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تیرتا پھرتا ہے۔

پس ہم نے دیکھ لیا کہ ان دونوں ورٹی سیلا کی صورتوں اور عادتوں میں بین فرق نظر آنے لگا۔ اس چھوٹے ورٹی سیلا کو ہم نر اور بڑے کو مادہ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ (۱) عام طور سے نر ہی بہ نسبت مادہ کے زیادہ ہلکا اور پھرتیلا ہوتا ہے (۲) عام طور سے نر ہی اپنی خواہشات کے زیر اثر مادہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ (۳) مادہ کا جسم عام طور پر بھدا اور بڑا ہوتا ہے، جیسے کہ چھوٹے ورٹی سیلا کے مقابلے میں اٹکے ہوئے ورٹی سیلا کا جسم ہوتا ہے۔ (۴) مادہ عام طور سے مجہول ہوتی ہے اور ایک جگہ ٹھیری رہتی ہے جیسے کہ اٹکے ہوئے ورٹی سیلا میں ہوتا ہے۔

آئیے اب ان ایک خلیے کے جانوروں میں جنسی تفریق کی ابتدا کا پتہ لگانے کے بعد دو یا دو سے زیادہ خلیات کے جانوروں پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

ہائیڈرا (Hydra) میں جو کہ تالابوں وغیرہ میں پایا جاتا ہے انیثین اور بیضہ دان ایک ہی فرد میں موجود ہوتے ہیں۔ جسم کے کچھ خلیات انیثین یا بیضہ دان کی خاصیت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ خصوصی خلیات جسم کے اندر سے بدن کے کناروں پر ابھر آتے ہیں۔

اس سے زیادہ منضبط اور صاف مثال کینچوؤں کی ہے کینچوؤں میں نر اور مادہ کے اعضائے تناسل ایک ہی فرد میں ہوتے ہیں۔ یعنی نہ تو کوئی کینچوا محض نر اور نہ محض مادہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نر اور مادہ کے اعضائے تناسل ہمیشہ کیڑے کے مخصوص حصوں میں ہوتے ہیں۔ مثلاً بیضہ دان اور متعلقہ نلکیاں جسم کے تیرھویں اور چودھویں خانوں میں ہوتی ہیں۔ نر اور مادہ کے اعضاء الگ الگ راستوں سے جسم کے باہر کھلتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی امر واقعی ہے کہ ایک کیڑے کا مادہ منویہ اُسی کیڑے کے انڈوں کو زرخیز نہیں بنا سکتا۔ بلکہ ایک فرد کا مادۂ منویہ دوسرے کے انڈوں کو زرخیز کرتا ہے۔ زرخیز کرنے سے قبل دو کیڑے جو ظاہری اور اندرونی تشریحی نقطۂ نظر سے بھی بالکل یکساں ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو چپٹا لیتے ہیں اور اس کے بعد انڈے زرخیز بنتے ہیں۔ اس طرح سے ایسی اور سیکڑوں نر مادی جانوروں کی مثالیں ملیں گی۔ مثلاً جونک وغیرہ۔ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی کینچوا کسی وقت بچوں کی ماں بنتا ہے اور کسی وقت وہی کینچوا باپ ہو جاتا ہے۔

خیر یہ نر مادی پن بے ریڑھ کی ہڈی کے بہت سے چھوٹے درجے کے جانوروں میں تو پایا ہی جاتا ہے مگر ایسی شاذ و نادر شہادتیں بھی ملیں گی جہاں کہ اعلیٰ ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں میں بھی جو کہ ارتقائی حیثیت سے ایک بلند درجے پر ہیں کبھی کبھی یہ نر اور مادین حالت ایک ہی فرد کی زندگی کے مختلف اوقات

---

[1] حرکی روئیں (Cilia)

میں دیکھی گئی ہے۔ مثلاً ایڈنبرا یونیورسٹی کے مشہور ڈاکٹر کرلیو (Crew) اپنے ایک مشاہدہ کی بنا پر لکھتے ہیں کہ ایک مرغی تھی جو کئی جھول انڈے دے چکی تھی اور اس کے ان انڈوں میں سے بچے بھی نکل چکے تھے۔ بڑھاپے میں مرغ جیسے پر اور عادات نمایاں ہونے لگیں۔ یہ "مرغ نما" مرغی کچھ دنوں کے بعد ایک دوسری مرغی کے انڈوں کو زرخیز بنانے میں بھی کامیاب ہو گئی اور ان زرخیز کیے ہوئے انڈوں میں سے بچے بھی نکل آئے۔ پس یہ مرغی اپنے دوران زندگی میں ماں اور باپ دونوں بن گئی۔ اس کی تشریح کرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ بیماری کی وجہ سے اس کے بیضہ دان بالکل بیکار ہو گئے تھے اور اس کی جگہ شکمی اندرونی تہ کے خلیوں سے ایک انیشیین پھوٹ آیا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ ایک پرند جو کہ ارتقا کی کئی سیڑھیاں طے کر کے اپنی اس اعلیٰ حالت کو پہنچا ہے کبھی کبھی اپنی دوران زندگی میں اپنی پچھلی ارتقائی تاریخ کے مدارج جن سے ہو کر وہ گزرا ہوگا پھر کسی نہ کسی طریقہ پر طے کرنے لگتا ہے۔

یہ امر واقعی ہے کہ اس پرند کی زندگی کے دو جنسی رخ اور کینچوؤں کے نرمادی پن میں بیّن فرق نمایاں ہے۔ کینچوا اپنی پوری زندگی نرمادی حالت میں گزارتا ہے۔ جب کہ یہ بچوں کا باپ ہونے کا فرض ادا کرتا ہے، اس وقت بھی اس میں بیضہ دان اپنی درست حالت میں موجود رہتے ہیں بات صرف یہ ہے کہ جب ایک جنس کے اعضا کام کرتے ہیں تو دوسرے جنس کے اعضا اپنے کام سے رکے رہتے ہیں لیکن اس مرغی میں ماں اور باپ بننے کی صلاحیت اس کی زندگی کے دو مختلف اوقات میں پیدا ہوئی اور جب وہ ماں سے باپ بنی تو اس کے بیضہ دان ہمیشہ کے لیے بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ ان مشاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاید کینچوؤں کی نرمادی حالت جس میں کہ دونوں اجناس بہ یک وقت ایک ہی فرد میں ہوتے ہیں ارتقائی درجوں کی سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے دونوں اجناس ایک دوسرے سے الگ الگ ہونے لگے یہاں تک کہ ایک زمانے کے بعد دونوں اجناس میں پیدائشی تفریق ہونے لگی اور یہ دونوں مختلف اجناس اپنے ایسے عروج و انتہا پر پہنچے کہ دونوں کی زندگی میں تشریحی فرق ممتاز حیثیت سے نمایاں ہونے لگا۔ مذکورہ بالا عجیب و غریب مرغی نے تو شاید اپنے جنس کو بدل کر کینچوؤں کی نرمادی حالت کو اپنی زندگی کے دو مختلف ادوار میں پیش کیا اور جنسی تفریق کے ارتقاء کی بکھری ہوئی کڑیوں میں ایک اور سلسلہ پیدا کرنے کی طرف ایک اشارہ سا کیا۔

مینڈکوں، چڑیوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کو دیکھیے دونوں جنسوں میں کتنا بیّن اور ممتاز فرق پایا جاتا ہے۔ علاوہ اعضاء تولید و تناسل اور دیگر متعلقہ نلکیوں کے بہت سے ضمنی جنسی تفریقات بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً نر اور مادہ کی آوازوں میں فرق۔ مرد کی مونچھیں اور داڑھی، عورتوں اور مردوں کے اطوار اور عادات میں اختلاف وغیرہ وغیرہ۔

ہم کو یہ معلوم ہے کہ انسان کا درجۂ ارتقائی نقطۂ نظر سے نہایت بلند ہے۔ اس میں اجناس کی تفریق نہایت ممتاز اور بیّن ہے اور اعضاءِ تناسل اور متعلقہ نلکیاں نہایت مکمل اور منضبط ہوتی ہیں۔

اب اگر ہم انسان کی جنسی تفریق کے مکمل ہونے اور اس کی شہوانی تحریک کے ارتقاء پر ایک نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے اپنی زندگی وہی ایک سادہ خلیہ سے شروع کرتا ہے۔ اس خلیے میں کوئی ظاہری جنسی عنصر نظر نہیں آتا۔ جب یہ خلیہ آہستہ آہستہ جنین کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے تو اس میں نر یا مادہ اعضاء تولید و تناسل کا نمو شروع ہو جاتا ہے اور جنین کے مکمل ہونے کے ساتھ یہ اعضاء بھی تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں لیکن ابھی تک اس میں شہوانی جنسی خواہشات پیدا نہیں ہوتیں۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس میں نر یا مادہ کے اعضاءِ تناسل مکمل ہوتے ہیں۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ آیا باوجود ان مکمل اعضاء تناسل کے بچّہ میں شہوانی تحریکات پیدا ہو جاتی ہیں یا نہیں۔ عام طور سے

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بچوں میں بالغ ہونے تک شہوانی خواہشات نہیں پائی جاتیں لیکن حال میں نفسیات کے ماہر ڈاکٹر فرائڈ (Freud) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس میں شہوانی لہریں موجود ہوتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ شہوانی لہریں اس وقت اعضائے تناسل یا اس کے ارد گرد جمع نہیں ہوتیں یا وہ مباشرت کی صورت میں اپنا اظہار نہیں کرتیں۔

(۱) شہوانیت کی نشو و نما کا پہلا درجہ "خود عاشقانہ پیار (Auto-Erotism) کا ہے۔ اس درجے کے دوران میں بچہ خود اپنے جسم کی عاشقانہ دھاریوں یا حصوں سے اپنی شہوانیت کو بجھاتا ہے۔ ان حصوں میں اعضائے تناسل کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے لیکن بچوں میں یہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ پہلے عاشقانہ دھاریاں ہونٹوں میں نشو و نما پاتی ہیں۔ کیونکہ پہلے بچے کے ہونٹوں ہی کا تعلق ماں کے پستان سے وابستہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ روزانہ یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ روتے ہوئے بچے کے منہ میں چوسنی دے دینے سے ان کو ایک قسم کی تسکین سی ہو جاتی ہے اور نہ صرف اس لیے کہ چوسنی کے چوسنے سے بغیر کسی غذائی مدد کے بچوں کو ایک قسم کا مزہ حاصل ہوتا ہے اور یہ لطف اُن کے ہونٹوں کی فطری شہوانی تحریک کو اطمینان دیتا ہے۔ اسی وجہ سے بچے اپنے انگوٹھوں کو بھی چوسا کرتے ہیں یا وہ کسی کھلونے کو منہ میں ڈال کر چوستے رہتے ہیں۔ اس درجہ پر گو کہ بچہ خود اپنے جسم سے، اپنی شہوانی خواہشات کو عمل میں لا کر ان سے لطف حاصل کرتا ہے مگر وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ جس سے وہ لطف حاصل کر رہا ہے وہ خود اسی کا جسم ہے۔

(۲) شہوانیت کی نشو و نما کا دوسرا درجہ جان بوجھ کر اپنی عاشقانہ دھاریوں کی خود پرستی کرنا ہے۔ اس درجہ کو نارسیزم (Narcissism) بھی کہتے ہیں۔ ادبی روایات کے قصوں کے مطابق نارسی سس (Narcissus) ایک خوبصورت نوجوان تھا جو کہ اپنے جسم پر خود اتنا فریفتہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی زندگی ایک تالاب میں اپنا عکس دیکھنے دیکھنے گزار دی یہاں تک کہ وہ کمزور ہو کر گھلنے لگا اور یونانی دیوتاؤں نے اسے ایک پھول کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ نارسی ازم اسی کے نام سے موسوم ہے۔

(۳) شہوانیت کے نشو و نما کے تیسرے درجہ پر بچہ یہ معلوم کر کے کہ اس کا جسم خود ہی ایک لطف اُٹھانے والی شے ہے اپنے جسم میں دوسرے عاشقانہ حصوں کی تلاش اور جستجو کرنے لگتا ہے۔ یہ حصے وہ اپنے جسم میں ان اعضاء میں پاتا ہے جو کہ جسم کے فضلے کے اخراج میں مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ بچے کو پاخانہ کرنے میں خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں بچہ کو شور و غل اور ظلم کرنے سے محبت ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کو تو سوسائٹی میں پاخانہ یا پیشاب کے متعلق ذکر کرنے سے شرم آتی ہے اور اپنی ذلت کو بھی اس قسم کی چیزوں سے نفرت و کراہیت ہوتی ہے لیکن بچوں کا رویہ اس کے متعلق بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان کو پاخانہ کرنے میں ایک عجیب قسم کی دلچسپی حاصل ہوتی ہے اور وہ پاخانہ کے متعلق بات چیت کرنے میں ایک خاص لطف حاصل کرتے ہیں چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک پاخانوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور وہاں اپنی فطری خواہشات کی تحریک سے اپنے کو مسرور کیا کرتے ہیں۔

اسی زمانے میں بچوں کی فطری خواہشات اور ماں باپ کے تعلیمی پند و نصائح کے درمیان بچے کے دماغ میں ایک خوفناک قسم کی جنگ ہوتی ہے اور یہی زمانہ بچوں کی مستقبل کی عادات و اطوار بنانے کا ہوتا ہے۔ اگر بچہ اپنے بڑوں کی باتوں کو آسانی سے مان لیتا ہے تو خیر ٹھیک ہے ورنہ اگر بزرگوں کو مار پیٹ سے زبردستی منوانے کی ضرورت پڑتی ہے تو بعد میں اُس کے نتائج نہایت خراب نکلتے ہیں۔ بچوں کی خواہشات اس وقت تو ڈرانے اور دھمکانے سے دب جاتی ہیں لیکن وہ ڈائنامیٹ کی طرح دبی رہتی ہیں اور بالغ ہونے پر خوفناک صورتوں سے اظہار کرتی ہیں۔

بچوں کے یہ تینوں مدارج پانچ برس کی عمر کے لگ بھگ

گزر جاتے ہیں۔ زندگی کے اس پنج سالہ دور کو فرائڈ اور اس کے ساتھی اور تمام دوسرے ماہرین نفسیات نہایت اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانوں میں اعضائے تناسل اور جنسی تفریق کے دوسرے نشانات وغیرہ تو خیر تدریجاً ترقی پاتے ہی ہیں۔ نیز یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی جنسی شہوانیت کا جذبہ اور تحریکات بھی ایک خاص طریقے سے تدریجاً عروج پاتی ہیں۔ بچوں کی شہوانی تحریکات اور ان کا مختلف افعال سے مظاہرہ اور اس کے بعد بالغ ہونے پر ان خواہشات اور افعال کا تدریجاً ایک دوسرے روپ میں آنا ہم کو اس کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ انسانی جنسی شہوانیت و خواہشات کے مظاہرے صرف مباشرت ہی کی شکل میں نمودار نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف رویوں سے رونما ہوتے تھے۔

پس ہم نے دیکھ لیا کہ ایک خلیے کے جانور میں جنس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ پیرامیشیم کی ہم جنسی مباشرت ورٹی سیلا میں جنسی تفریق کی ابتدا، کینچوؤں وغیرہ میں دو زوجیا یا مخنثانہ پن (نرمادی پن)[1] پھر مینڈکوں اور چڑیوں وغیرہ میں صاف جنسی تفریق اور یہاں تک کہ اشرف المخلوقات انسان میں جنسی تفریقات کی تکمیل ہمارے سامنے جنسی ارتقا کی تاریخ کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہرین نفسیات کے تجربات و مشاہدات انسانی شہوانی جذبات و تحریکات کے نشو نما کی تاریخ بھی پیش کرتے ہیں اور اس بات کا مکمل ثبوت دیتے ہیں کہ انسان دراصل ہر لحاظ سے دوسرے جانوروں سے زیادہ بلند و اعلیٰ و ارفع ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ان وجوہات کی بنا پر اپنے کو اشرف المخلوقات کہنے کا حق رکھتا ہے۔

ثاقب لکھنوی نے کیا خوب کہا ہے ؎

طینت آدم میں تھی اللہ کیا نشو نما
ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ انساں ہو گئی

لیکن انسان بھی آخر انسان ہی ہے فرشتہ نہیں اور اس لیے وہ کبھی کبھی اپنے بعض افعال جیسے ہم جنسی مباشرت یا کثرت مجامعت (جیسا کہ ادنیٰ جانوروں میں زیادتی کے ساتھ پایا جاتا ہے) سے اپنی ارتقائی تاریخ کے بعض مدارج کا ثبوت دیتا ہے اور یہ بتادینا چاہتا ہے کہ وہ باوجود اعلیٰ و ارفع اور مہذب ہونے کے ان ادنیٰ اور ذلیل افرادِ قوم" مثلاً پیرامیشیم اور دیگر ادنیٰ جانوروں کی عادات کو بھولا نہیں ہے۔

نوٹ۔ [1] ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے Hermaphrodite کا ترجمہ مخنث یا دُو زوجیا یا نرمادی کیا ہے۔

"ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا امر ضروری ہے"۔

سرسید

مغربی بنگال کے سترہ مسلم ہائی اسکولوں میں مادھیمک بورڈ امتحان کے نتائج پر

احمد رشید شیروانی *

الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ چیرمین جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائریکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے مغربی بنگال کے سترہ مسلم ہائی اسکولوں کے چالیس ہونہار ترین طلباء و طالبات کے لیے ان موقر اسکولوں کے ہیڈ صاحبان اور ہیڈ مسٹریس صاحباؤں کی معرفت انعامات بھیجے گئے۔ ہر ایک اسکول میں ۱ نے ڈھائی سو روپیے ۲ نے ڈیڑھ سو روپیے اور ۳ نے سو روپیے کے انعامات جیتے۔

ہوڑہ ہائی اسکول

۱ محمد شفیع اللہ سلمہٗ ۲ شکیل احمد سلمہٗ ۳ نسیم احمد سلمہٗ۔

ہوڑہ ہاٹ (بوائز)

۱ محمد انوار الحق سلمہٗ ۲ آصف اقبال سلمہٗ ۳ افضل انصاری سلمہٗ۔

رشڑا انجمن ہائی اسکول۔ ضلع ہوگلی

۱ محمد عابد حسین سلمہٗ ۲ صابر علی سلمہٗ۔ ۳ محمد عارف محی الدین انصاری سلمہٗ۔

ایم۔ ایل جوبلی انسٹی ٹیوشن۔ کلکتہ

۱ شیخ سیف الحق زاہد سلمہٗ ۲ محمد شاہجہاں سلمہٗ ۳ محمد افسر۔

انجمن گرلز ہائی اسکول کلکتہ۔

۱ کماری تبسم اسلم سلمہا ۲ کماری شگفتہ شہناز سلمہا۔ ۳ کماری زینب ظہور سلمہا۔

خضر پور ہائی اسکول کلکتہ

۱ محمد شمشیر علی سلمہٗ ۲ شاکر احمد سلمہٗ ۳ ذاکر حسین سلمہٗ۔

بنگالی بازار ہائی اسکول کلکتہ

۱ نور الدین خاں سلمہٗ ۲ سید شعیب حسین سلمہٗ ۳ شفیق احمد سلمہٗ۔

کمرہٹی ہائی اسکول کلکتہ

۱ پرویز احمد سلمہٗ ۲ عابد حسین سلمہٗ ۳ محمد صابر حسین سلمہٗ۔

پریذیڈنسی مسلم ہائی اسکول کلکتہ

۱ سید اصغر علی سلمہٗ ۲ محمد جمیل خاں سلمہٗ

---

* کناٹ پلیس، نئی دہلی

۳۔ غزالی غوث سلمہ

انجمن غریب المسلمین ہائی اسکول۔ ٹیٹا گڑھ

۱۔ محمد اشرف الزماں سلمہ ۲۔ محمد ذاکر حسین سلمہ

۳۔ ذوالفقار انصاری سلمہ

رانی گنج ہائی اسکول ضلع بردوان

۱۔ محمد سلطان چودھری سلمہ

۲۔ محمد آفتاب عالم سلمہ

گیتے گرام ہائی اسکول۔ ضلع مرشد آباد

۱۔ محمد امین الاسلام سلمہ

۲۔ اے کیار ساہا سلمہ

کانکی نارہ حمایت الغرباء ہائی اسکول ضلع چوبیس پرگنہ

۱۔ راجیش کمار شرما سلمہ

۲۔ نیرّ نہال سلمہ

ہوڑہ مسلم ہائی اسکول

۱۔ افتخار مقدس سلمہ

پارک سرکس ہائی اسکول کلکتہ

۱۔ میر حسن سلمہ

عالم بازار ہائی اسکول کلکتہ

۱۔ تنویر عالم انصاری سلمہ

ہوڑہ ہاٹ گرلز

۱۔ نیلوفر ناہید سلمہا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

"اور تم میں سے مال دار اور صاحبِ مقدور لوگ یہ قسم نہ کھا بیٹھیں کہ وہ رشتہ داروں، مساکین اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہ دیں گے اور ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ آیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

(سورۃ النور، آیت ۲۲)

سینٹر فار پروموشن آف سائنس (سی۔پی۔ایس) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سی پی ایس۔تہذیب الاخلاق انعامات

برائے

عام فہم سائنسی مضمون نگاری

تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس (Third World Academy of Sciences) کے گراں قدر عطیے سے قائم ۸۶-۱۹۸۵ء کے سی۔پی۔ایس۔تہذیب الاخلاق انعامات برائے عام فہم سائنسی مضمون نگاری کا فیصلہ پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی نے کیا۔ جس کی صدارت محترم وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب نے کی۔

کمیٹی نے یونیورسٹی کے اردو ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں یکم جولائی ۸۶ء سے ۱۵ ستمبر ۸۶ء تک شایع ہوئے یا اشاعت کے لیے موصول ہوئے عام فہم سائنسی مضامین پر غور کے بعد درج ذیل مضامین کو اپنے اپنے میدان میں بہترین مضمون کی حیثیت سے سی۔پی۔ایس۔تہذیب الاخلاق انعامات کا مستحق قرار دیا ہے۔ ان میں سے ہر مضمون پر مبلغ ۔/۱۵۰۰ روپیے بطور انعام دیے جائیں گے۔

۱۔ سائنٹفک سوسائٹی اور اس کی خدمات	جناب امتیاز احمد	علی گڑھ
۲۔ ابن الہیثم اور علم مناظر و مرایا	حکیم الطاف احمد اعظمی	دہلی
۳۔ خلا میں انسان کے قدم	جناب یوسف سعید	دہلی
۴۔ فلکیات کی ابتدائی منزلیں	ڈاکٹر عبدالقیہم	علی گڑھ
۵۔ ایڈیس	حکیم سمیع الرحمٰن خاں	علی گڑھ
۶۔ جنسیاتی ہارمون اور اس کے اثرات	جناب فہیم نعمانی	کلکتہ

جن مضامین کو خصوصی انعامات کا مستحق قرار دیا گیا ہے ان کے لکھنے والوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

جناب آصف نقوی (دہلی)
جناب صغیر افراہیم (علی گڑھ)

ڈاکٹر مختار احمد — علی گڑھ
ڈاکٹر صفی اختر — دربھنگہ (بہار)

ان میں سے ہر ایک کو مبلغ /۵۰۰ روپیے بطور خصوصی انعام دیے جائیں گے

جن مضامین کو تشویقی انعامات دیے گئے ہیں ان کے مضمون نگاروں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

جناب اختر حسین آفتاب — پٹنہ
جناب ابراہیم خلیل جوہر — بھٹکل، (کرناٹک)
جناب احرار حسین و جناب صغیر افراہیم — علی گڑھ
جناب شمیم انصاری و جناب مسرور خاں

تشویقی انعام کے لیے منتخب کیے گئے ہر مضمون پر /۲۵ روپیے بطور انعام دیے جائیں گے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان میں عام فہم سائنسی مضمون نگاری پر اب تک جو انعامات کسی علمی ادارے یا کسی علمی رسالے کی طرف سے دیے گئے ہیں ان میں یہ سب سے بڑے انعامات ہیں اور یہ دراصل ان اقدامات کا ایک حصہ ہے جو محترم وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب کی طرف سے مسلمانوں میں سائنسی علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً کیے گئے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مبارک قدم مسلمانوں میں سائنسی بیداری اور سائنسی طرز فکر پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوگا۔

پروفیسر اسرار احمد
ڈائرکٹر سینٹر فار پروموشن آف سائنس
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

۱ میسرز آزاد بک اسٹور
ساکچی بازار ۔ جمشید پور بہار

۲۔ میسرز اعظم خاں
ٹاؤن اینڈ پوسٹ، تھریا نجابت خاں، بریلی

۳۔ میسرز بک ایمپوریم
سبزی باغ پٹنہ بہار

۴ میسرز محمد الیاس نیوز ایجنسی
۹۱۔ کالوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

۵ میسرز اسلامیہ بک ڈپو
تیتارپور چوک ۔ بھاگل پور سٹی ۸۱۲۰۰۲

۶ میسرز مکتبہ معارف الاسلام
نظام پورہ ۔ بھیونڈی ۔ تھانے ۔ مہاراشٹر

۷ میسرز طالب حسین
ایف۔ ڈی۔ ہائر سکنڈری اسکول۔ کاٹھ دروازہ۔ مرادآباد

۸۔ میسرز محمد جاوید
بہار ووڈ ورکس ۔ دھرم پور۔ سمستی پور بہار

۹۔ میسرز احمد حسین ۔ جمال بک ڈپو ۔ باری روڈ ۔ گیا ۔ بہار

۱۰ میسرز صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ ۔ وارث پورہ ۔ کامٹی

۱۱ میسرز محمد پرویز اقبال میگزین ایجنٹ
دوست محمد میموریل پرائمری اسکول ۔ ۲۱۔ جی۔ ٹی روڈ
بنس بگان ۔ پوسٹ ۔ ٹیٹاگڑھ ۔ ۲۴۔ پرگنہ ۔ مغربی بنگال

۱۲ میسرز طارق نیوز ایجنسی
مکتبہ معصوم شاہ ۔ مومن پورہ ۔ ناگپور

۱۳۔ میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ ۔ ای۔ آر۔ روڈ بمبئی۔

۱۴ میسرز آزاد بک اسٹور
اردو بازار دربھنگہ بہار

۱۵ میسرز مکتبہ عمر بک سیلرز اینڈ نیوز پیپرس
مدینہ مسجد کمپلیکس ۔ بیناکشی سرکل ۔ بیجاپور۔

۱۶۔ میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بخیا ۔ فیروزآباد ۔ ڈسٹرکٹ آگرہ

۱۷ میسرز بک ہاؤس ۔ دریاپور ۔ پٹنہ ۴

۱۸ میسرز جنتا بک ہاؤس ۔ مین روڈ ۔ رانچی

۱۹ میسرز ایم۔ ایچ بک سیلر ۔ دھم گنج ۔ دربھنگہ

۲۰ میسرز کتاب سینٹر ۔ شمشاد مارکیٹ ۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

۲۱۔ میسرز مختار الحق ۔ ہاؤس ۲۱۔ اسٹریٹ نمبر ۵ کانکی نارہ نارتھ
۲۴۔ پرگنہ ۔ کلکتہ (نارتھ) مغربی بنگال ۔

۲۲ میسرز سنی بک ڈپو ۔ پرانا قلعہ ۔ سیوان ۔ بہار

۲۳ میسرز ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔ شمشاد مارکیٹ ۔ اے ۔ ایم یو علی گڑھ

۲۴۔ میسرز انوار بک ڈپو ۔ شمشاد مارکیٹ ۔ اے ۔ ایم ۔ یو ۔ علی گڑھ

۲۵۔ میسرز فردوسی کتاب گھر ۔ بک سیلر و پبلشر ۔ بھوسپا چاک دھار وار

۲۶۔ میسرز سپر پبلی کیشنز ۔ ایچ ۔ ۳۲ ۔ گارڈن ریچ روڈ ۔ کلکتہ ۔

۲۷ میسرز ۔ ایم ۔ ایچ بک سیلر پوسٹ لہریا سرائے ۔ دربھنگہ ۔

۲۸ میسرز ایم ۔ ایچ بک سیلر ۔ رم گنج دربھنگہ

۲۹ میسرز عبد القیوم ۔ اردو لائبریری تحصیل گیٹ ۔ گھنٹہ گھر ۔ بدایوں

۳۰ میسرز آفتاب بک ڈپو سبزی باغ پٹنہ

۳۱ میسرز کمالیہ بک ڈپو تیتار پور بھاگل پور ۲

۳۲ میسرز نیوز ریڈر ڈپو ۔ بھولی موڑ دھنباد

۳۳۔ میسرز عبد الستار بک اسٹور ۔ کمپنی باغ ۔ مظفر پور بہار

۳۴ ۔ میسرز اسلامک بک سینٹر ۔ جامعہ کمپلکس ۔ ایم ۔ آر ۔ روڈ
بنگلور

۳۵ ۔ میسرز اسحاق عظیم شاہ آبادی ۔ ولد علامہ صابر شاہ بادی
صابر کتاب گھر ۔ نزد خورشید محلہ ۔ شاہ آباد ۔ گلبرگہ (کرناٹک)

۳۶ میسرز گڈ بکس ۔ سبھاس روڈ ۔ ہزاری باغ

۳۷ گلابی اردو نیوز ایجنسی ۔ مین روڈ لونڈا ۔

۳۸ میسرز کتاب محل ۔ تکیہ اعظم گڑھ (یو ۔ پی)

۳۹ میسرز محمد شمیم ۔ معرفت خورشید بک اسٹال ۔ پار نوادہ ۔ رانچی روڈ ۔ نوادہ

۴۰ میسرز عبد القدیر بک سیلرز ۔ مین روڈ ۔ موتی ہاری شرقی چمپارن

۴۱ ۔ میسرز مومن بک ڈپو ۔ محلہ پیرزادہ مرادآباد

۴۲ میسرز الہلال بک ہاؤس
حمایت نگر ۔ ناندیڑ مہاراشٹر

۴۳ میسرز دی کوثر ایجنسی ۔ نزد انجمن ہائی اسکول ۔
باگل کوٹ کرناٹک ۔

۴۴ میسرز کریسنٹ بکس
اردو بازار دربھنگہ بہار ۔

۴۵ میسرز شری امرناتھ جھا ۔ نیوز پیپر ایجنٹ
پوسٹ مادھو پور ڈسٹرکٹ دیوگڑھ

۴۶ میسرز اجنتا بک ہاؤس ۔
گاندھی چوک ۔ پوسٹ مادھو پور ۔ دیوگڑھ

بہار نوربی ٹانک
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام۔ نزلہ کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنیوالوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی پھوڑے
پھنسی، خارش اور
داد وغیرہ کی
دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ یو۔پی

Tahzibul Akhlaq January 1989 Regd. No. L/ALG 344/88

Colour Printers, Achal Tal. G. T Road, Aligarh Phone 4185

ماہنامہ

تہذیب الاخلاق

جو ابر یہاں سے اٹھے گا
وہ سارے جہاں پر برسے گا

فروری ۸۹ء

سائنس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ فطرت کو سمجھا جائے اور اس پر قبضہ کیا جائے اور یہ بھی کہ آدمی حقیقتوں کو جانے اور توہمات کی بندش سے رہائی حاصل کرے۔ خیالات اور طبیعت میں آزادی پیدا کرے اور محض اختیار و حکم کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔ سائنس نے ذہنی آزادی کا اعلان عام کیا ہے اور انسانی خیالات کی وسعتوں کو ترقی دے دی ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں سائنس کی طرف رجوع ہونا چاہیئے۔

—— سر شاہ سلیمان

تین روپیہ

ادارہ
تہذیب الاخلاق

مجلس ادارت

اغراض و مقاصد

۱. جہل، رجعت پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد۔ ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔

۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت۔

۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔

۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔

۶. سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷. علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کے لیے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی ادب سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ ٹائپ شدہ 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر کیے جائیں ورنہ ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انھیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

سرپرست : جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : اسرار احمد —— جوائنٹ ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : شہاب الدین

تزئین : سرفراز —— انچارج سرکولیشن : مستقیم احمد

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ	زرِ رسالانہ	ترسیلِ زر کا پتہ :
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	انڈیا Rs. 30.00	ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ لشانت
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ لشانت	بیرونِ ممالک ہوائی ڈاک US $ 20.00	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	عام ڈاک US $ 8.00	Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & ANSHANT,
انڈیا۔		ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

مندرجات

(تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو)

اداریہ

ہماری یونیورسٹی کے کیمپس میں کئی بینکوں نے اپنی اپنی شاخیں کھول رکھی ہیں جن سے یونیورسٹی کے ملازمین مستفید ہوتے ہیں اور اپنی اپنی تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کا اپنا اکاؤنٹ چوں کہ اسٹیٹ بینک میں ہے اور یہاں سے جاری ہونے والے سارے چیک اسی بینک کے نام ہوتے ہیں، اس لیے بیشتر یونیورسٹی ملازمین نے اپنے اپنے اکاؤنٹ اسٹیٹ بینک میں کھول رکھے ہیں۔ تنخواہ والے دن ہر بینک میں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے اور کافی چہل پہل نظر آتی ہے۔ اس اژدھام اور ہماہمی سے قطع نظر تنخواہ والے دن کچھ سالخوردہ، گرگ باراں دیدہ اور شائی لاک کے قبیل کے افراد بینک کے دروازے پر بیٹھے نظر آتے ہیں جو ایک مشاق شکاری کی طرح کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے اپنے شکار کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں۔ ادھر آدمی اپنی رقم سنبھالتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور ادھر وہ چوکنے ہوئے۔ جس شکاری کا یہ شکار ہے وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا منہ سے رال ٹپکاتا اُس پر ٹوٹ پڑا اور اس کی تہائی یا آدھی تنخواہ ضبط کر لی۔ یہ کسی ڈاکے کا ذکر نہیں ہے بلکہ ذکر ہے ان افراد کا جو سودخوروں سے روپیہ لے کر اپنی زندگی میں گھن لگا بیٹھے ہیں۔ یہ منظر ہر ماہ نظر آتا ہے۔ ہمارے جیسے لوگ اس کو دیکھتے گزر جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے کڑھتے تو سب ہی لوگ ہیں مگر اس لعنت کو ختم کرنے کا عملی قدم کوئی بھی نہیں اُٹھاتا۔ میں بھی نہیں — آپ بھی نہیں — آپ بھی نہیں۔

ہم نے گزشتہ سطور میں جن سالخوردہ گِدھوں کا ذکر کیا ہے، ان کے مذہب کی رو سے سودی کاروبار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور یہ اُن کا مشغلہ نہیں بلکہ پیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان اگر اپنے پیشے سے روگرداں ہو جائے تو اپنے جسم کا جہنم کہاں سے بھرے گا؟ اسی لیے ان مردار خور گِدھوں سے ہم کو نہ تو کوئی نفرت ہے نہ ہی ان کے خلاف دل میں کوئی جارحانہ جذبہ۔ ہم کو غصہ تو ان لوگوں پر آتا ہے جو گلا پھاڑ پھاڑ کر سود لینے اور دینے دونوں کے حرام ہونے کا اقرار کرتے ہیں مگر جھوٹی شان و شوکت اور نام و نمود کے لیے اس حرام فعل کا ارتکاب کر کے دین ہی نہیں کھوتے دنیاوی طور پر بھی آوارہ و سرگرداں رہتے ہیں۔

یہاں پر ممکن ہے کہ کوئی صاحب روز افزوں گرانی کا ذکر کر کے اس بات کو جائز قرار دیں کہ آدمی سود پر روپیہ لے کر اپنا کام چلائے۔ اس دور کی کمر توڑ گرانی سے ہم کو انکار نہیں مگر یہ گرانی تو سب کے لیے ہے۔ آخر دوسرے لوگ سود پر روپیہ لے کر اپنا کام کیوں نہیں چلاتے مسلمان ہی اس کا زیادہ تر شکار کیوں ہیں؟ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ شادی بیاہ کا ذکر ہی کیا۔ عقیقہ، ختنہ اور طعام موتیٰ کے سلسلے میں مسلمان جس شان و شوکت اور نام و نمود کی نمائش کرتے ہیں وہی ان کو سود کے دلدل میں گرفتار کر کے زندگی بھر ان کا خون نچوڑتی رہتی ہے جس ننھّے یا منّے کے عقیقہ میں ہزاروں روپیہ بے جا طور پر صرف کر کے جھوٹی شان بگھاری جاتی ہے۔ نہ تو اس کی تربیت کی طرف کوئی دھیان

دیتا ہے اور نہ ہی تعلیم کی طرف۔ وہ جب اپنے پیروں سے چلنے کے قابل ہو جاتا ہے تو پھر والدین کی توجہ اس کی طرف سے کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور وہ خود رو پودوں کی طرح بڑھنے لگتا ہے۔ قسمت نے یاوری کی اور اچھی صحبت ملی تو وہ تالہ بنانے، کپڑا سینے، ٹھیلا لگانے کے کام میں مصروف ہو جاتا ہے اور اگر خراب صحبت میں پڑ گیا تو وہ چوری بھی کر سکتا ہے، قفل شکنی بھی، کرایہ کا قاتل بھی بن سکتا ہے اور اپنے علاقے کا دادا بھی۔ یہ وہی للاّ ہوتا ہے جس کے لیے اس کا باپ سود پر روپیے کر اپنے ہاتھوں اپنی زندگی اجیرن بنا چکا ہوتا ہے۔

یہ تو خوشی میں ہوتا ہے۔ غمی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ طعام موتیٰ کے سلسلے میں ہمارے یہاں جو اسراف بے جا ہوتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جو قبر میں گیا اس کا عالم تو یہ ہے کہ زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب دینے کا خوف اس پر طاری ہے۔ وہ دارالعمل سے نکل کر دارالجزا میں آچکا ہے اور اس کے عمل کا سلسلہ بند ہو چکا ہے۔ اب وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اس کے اعزہ، اقربا، دوست احباب اس کی مغفرت کی دعا کریں۔ ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کلام پاک کی چند سورتیں پڑھ کر اس کا ثواب اس کو بخش دیں۔ کوئی ان باتوں پر تو دھیان دیتا نہیں، البتہ برادری کا کھانا کرنے میں کوئی کسی سے ہیٹا نہیں ہونا چاہتا۔ چنانچہ قورمہ، قلیہ، پلاؤ، زردہ اور شیرمال پکوا کر اس کے نام سے کھلایا جاتا ہے جو بسا اوقات گرم گرم سادی روٹیوں سے بھی محروم اس دنیا سے رخصت ہوا ہوتا ہے۔ اس کھانے کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ نہ مرنے والا کا ذکر، نہ اس کی یاد، ہاتھ دھوتے وقت ہی سے تبصرہ شروع ہو جاتا ہے کہ پلاؤ میں بڑے کا گوشت تھا، زردہ میں شکر کم تھی، شیرمال ٹھکری ہو کر رہ گئی تھی۔ کھانا بڑا خراب تھا۔ یہ اُس کھانے کا حشر ہوتا ہے جس کو پکوانے کے لیے صاحب خانہ ایسی جگہ سے رقم لایا ہوتا ہے جس کا قرض اس کو زندگی بھر ادا کرنا ہوتا ہے۔

یونیورسٹی نے یہاں کے ملازمین کی بہبود کے لیے ایک اسکیم چلا رکھی ہے۔ اس میں ہر ماہ صرف دس روپیے جمع کرنے ہوتے ہیں۔ ایک سال بعد اس کا ممبر اس سے قرض لینے کا حق دار ہو جاتا ہے اور یہ قرض آسان قسطوں میں اس کی تنخواہ سے وضع کر لیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہاں کے ملازمین اپنے اپنے پراوی ڈنٹ فنڈ سے قرض لے سکتے ہیں جو چوبیس یا چھتیس قسطوں میں تنخواہ سے وضع کر لیا جاتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر ملازم کی مدت ملازمت بیس سال ہو چکی ہے یا اس کی عمر پچاس سال کی ہو گئی ہے تو وہ اپنے پراوی ڈنٹ فنڈ سے پچھتر فیصد رقم نکال سکتا ہے جو اس کو واپس نہیں کرنی ہوتی۔ ان تمام آسانیوں کے باوجود اگر یہاں کے ملازمین سود خوروں کے چنگل میں گرفتار ہیں تو اس میں قصور کسی اور کا نہیں خود ان شیخی خوروں کا ہے جو اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کو جہنم بناتے ہیں۔

علی گڑھ میں بہت سے فلاحی کام ہو رہے ہیں۔ تعلیم بالغان ہے، دین کی طرف راغب کرنے کی کوششیں ہیں۔ مقابلے میں حصہ لینے کے لیے طلبہ کے کوچنگ سینٹر ہیں۔ یہ سب کام اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں مگر سب سے اہم کام یہ ہے کہ کوئی جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر لوگوں کو شان و شوکت اور نام و نمود کے مظاہرے کے لیے سود پر رقم لینے سے روکا جائے اور ان کو ان سالخوردہ گدھوں کی زد سے بچایا جائے جو ہر تنخواہ والے دن بینک کے دروازے پر ان کی تہائی یا نصف تنخواہ ضبط کر لیتے ہیں۔ دیکھیں اس کار خیر کے لیے کون آگے بڑھتا ہے۔ "فرقۂ زہاد یا رندان قدح خوار"؟

عورتوں کے حقوق

سر سید احمد خاں

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے اگر تمثیلاً کہا جاوے کہ عورت انسان کے لیے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپیے کے تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔

بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے، اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی کا بڑا حامی کا رہے جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لا یعقل اور لاشئے سمجھا ہے۔

انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم الوجود متصور ہوتی ہے اور ذات شوہر سے مبدل ہو جاتی ہے

وہ کسی قسم کے معاہدے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لیے وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلا شوہر کی مرضی کے لکھی ہو ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔

جو ذاتی اسباب اور مال و نقد و جائیداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی بقبضہ شوہر آجاتی ہے۔

جو جائداد کہ عورت کو وراثتہ قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو اس سب پر اس کا شوہر تا حین حیات قابض ہو جاتا ہے اور وہی اس کا محاصل لیتا ہے۔

وہ مثل لا یعقل شخص کے نہ کسی پر دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی دعویٰ رجوع کر سکتا ہے۔

وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی اور کوئی چیز بیع نہیں کر سکتی۔

وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے خرچ کے جو ضروریات زندگی کے لیے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر رضا شوہر کے نہیں کر سکتی۔

۱۸۷۰ء میں پارلیمنٹ میں منکوحہ عورتوں کی جائداد کا ایک بل پیش ہوا تھا اس میں صرف یہ بات چاہی گئی تھی کہ وہ قانون جس کے ذریعے سے بعد شادی کے عورت اپنی جائداد سے محروم ہو جاتی ہے، منسوخ کیا جاوے۔

آنریبل مسٹر رسل گرے ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون کا پیش کیا تھا، اس وقت انھوں نے نہایت لطیف بات یہ کہی تھی کہ حال کے قانون کے بموجب جو کچھ جائداد عورت کے پاس قبل شادی ہوتی ہے اور بعد شادی ملتی ہے اور جو کچھ کہ وہ اپنی محنت و لیاقت سے کماتی ہے، بعد شادی کے وہ اس کا نہیں رہتا۔ سب پر شوہر مالک ہو جاتا ہے۔ پس شادی کا اثر اس عورت پر ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کسی جرم قابل ضبطی جائداد کا اثر ہوتا ہے۔

اس گفتگو پر تمام ہوس آف کامنز ہنس پڑا اور اکثر ممبروں نے آنریبل مسٹر رسل گرے کی تائید کی۔ پس انگلستان کے قانون

کا عورتوں کی نسبت یہ حال ہے اور غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ
خراب اور مضرت رساں اور نا انصاف نہ ہوگا۔

ذکر مسلمانی قانون کا نسبت عورتوں کے

اب خیال کرو کہ مسلمانی قانون میں عورتوں کو کس طرح عزت
دی گئی ہے اور مردوں کے برابر ان کے حقوق اور اختیار تسلیم کیے
گئے ہیں:۔

حالت نابالغی میں جس طرح مرد اُسی طرح عورت بے اختیار اور
ناقابل معاہدہ متصور ہے۔ الا بعد بلوغ وہ بالکل مثل مرد کے مختار
اور ہر ایک معاہدے کے لائق ہے۔

جس طرح مرد اسی طرح عورت اپنی شادی کرنے میں مختار
ہیں۔ جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا اُسی
طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا۔

وہ اپنی تمام ذاتی جائداد کی خود مالک اور مختار ہے اور
ہر طرح اس میں تصرف کرنے کا اُس کو اختیار کامل حاصل ہے۔

وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی
ہے اور اس کی ذات اور اُس کی جائداد اُن معاہدوں اور دستاویزوں
کی بابت جواب دہ ہے جو اس نے تحریر کی ہوں۔

جو جائداد قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت میں
آئی ہو وہ خود اس کی مالک ہے اور خود اس کے محاصل کی لینے
والی ہے۔

وہ مثل مرد کے دعویٰ بھی کر سکتی ہے اور اس پر بھی دعویٰ
ہو سکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے اور جو چاہے
اس کو بیع کر سکتی ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہبہ اور
وصیت اور وقف کر سکتی ہے۔

وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائداد میں سے بہ ترتیب
وراثت ورثہ پا سکتی ہے۔

وہ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کر سکتا ہے، حاصل
کر سکتی ہے۔

وہ تمام گناہوں کے عوض میں دنیا اور آخرت میں وہی سزا
پا سکتی ہے جو مرد پا سکتا ہے۔

کوئی قید خاص عورت پر بجز اس کے جو خود اس نے بسبب
معاہدہ نکاح کے اپنے پر قبول کی ہیں یا اُس تفاوت سے جو عورت
میں جو نیچر، یعنی قدرت نے دونوں میں مختلف طور سے بنایا ہے ایسی
نہیں ہے جو مرد پر نہ ہو۔ پس حقیقت میں مذہب اسلام میں جس طرح
کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے ویسا نہ کسی مذہب میں ہے اور نہ
کسی قوم کے قانون میں ہے۔

مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات میں ہے کہ تمام تربیت یافتہ
ملک مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے اس پر بہت کچھ نام رکھتے
ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ملک کی عورتوں کی حالت
مسلمانوں اور مسلمان ملک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے
حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہیے تھا۔

عورتوں کی حالت کی بہتری جو تربیت یافتہ ملکوں میں ہم نے
تسلیم کی ہے اس میں کچھ بھی خیال ہم نے بے پردگی کی آزادی کا نہیں
کیا ہے۔ کیوں کہ ہماری رائے میں ہندوستان میں اس باب میں
جس قدر کہ تفریط ہے اُسی قدر تربیت یافتہ ملکوں میں افراط ہے۔
اور جو حد کہ شرع نے مقرر کی ہے اور جہاں تک کہ انسان اس پر
غور کر سکتا ہے اور اپنی عقل کو کام میں لا سکتا ہے بلاشبہ وہی
حد نہایت درست اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس مقام پر جو ہم کو
بحث ہے وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور
حسن معاشرت اور تواضع اور خاطرداری اور محبت اور پاس خاطر
اور ان کی آسائش اور آرام اور خوشی اور فرحت کی طرف متوجہ ہونا
اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا اور بعوض اس کے کہ عورتوں کو اپنا
خدمت گزار تصور کریں ان کا اپنا انیس اور جلیس اور رنج و
راحت کا شریک اور اپنے کو ان کی اور اُن کو اپنی باعث مسرت اور
تقویت کے سمجھنے پر بحث ہے۔ بلاشبہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے
تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ مراتب بخوبی برتے جاتے
ہیں اور مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے اور ہندوستان

میں تو ایسی نالایقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذ باللہ منہا

جو لوگ کہ ان خرابیوں کو مذہب اسلام کی طرف نسبت کرتے ہیں یقینی ان کی غلطی ہے، بلکہ ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے۔ اگر ان کی پابندی اد کی جاوے تو بلاشبہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں۔ معہذا بڑا باعث اس کا ان سولیزڈ، یعنی نامہذب ہونا مسلمانوں کا ہے۔ مہذب قوموں نے باوجودیکہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا۔ اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجے کی ترقی پر پہنچایا ہے اور مسلمانوں نے باوجودیکہ ان کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے اور ان کی حالت کی بہتری کے تمام دنیا کے قانون سے زیادہ بہتر اور عمدہ تھا۔ مگر انھوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے الاّ ماشاءاللہ، اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں۔ پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھا دیں۔

> "علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مقصد ہندی مسلمانوں کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے ایسے مواقع فراہم کرنے تھے جو ایک طرف ان کو قومی زندگی میں ایک فعال اور ترقی پذیر جماعت کی حیثیت دلانے میں معین ہوں اور دوسری طرف ملک میں اسلامی تہذیب کی بامعنی اور تخلیقی نشو و نما میں مدد دیں اس طور پر ایک بوقلموں متوازن ہندوستانی تمدن کے صحت مند، ہم آہنگ اور بابرکت ارتقاء کے فروغ کا باعث ہوں۔"
>
> رشید احمد صدیقی
>
> [ہمارے ذاکر صاحب]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۲ (فروری ۸۹ء)

یاد اللہ

سیّد حامد*

الفاظ اپنے معنی بڑی بے مہری سے بدلتے ہیں، جہاں دو لفظ مل جائیں وہاں اور بھی ستم ڈھایا جاتا ہے۔ شناخت دشوار ہو جاتی ہے لیکن الفاظ کا یہ ارتباط اتنا دلکش ہے کہ زبان پر چڑھ کر ہی دم لیتا ہے۔ اس مضمون کی سرخی ہی کو لے لیجیے۔ یاد اللہ کے معنی اللہ کی یاد کے نہیں بلکہ اس کے بندوں کی باہمی جان پہچان کے لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ان سے یاد اللہ ہے۔" صاحب سلامت" کا استعمال بھی اسی مفہوم میں ہوتا ہے۔ حالاں کہ ان دو لفظوں سے الگ الگ یہ مفہوم نکلتا ہی نہیں۔ شاید کبھی خیر سگالی کے طور پر کہتے ہوں گے کہ صاحب سلامت رہیں۔ انجام کار 'صاحب سلامت' جان پہچان یا رواروی کی ملاقات یا شناسائی کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا کیا عجب کہ یہ ترکیب حافظ کے اس شعر سے نکلی ہو ؎

اے صاحب کرامت شکرانۂ سلامت
روزی تفقدی کن درویش بے نوا را

[اے باعزت انسان اپنی سلامتی کے شکرانہ کے طور کسی دن نادار فقیر پر مہربانی کر]

یعنی سلامتی اور عافیت اور فارغ البالی کے شکریہ کو ادا کرنے کا طریق یہ نہیں ہے کہ پروردگار کا شکر زبان پر آگیا۔ اس کا عملی ڈھنگ یہ ہے کہ محروموں کی محرومی کو دور کر دو یا کم از کم اسے کم ہی کر دو کہ اے پروردگار تو نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں اپنے بندوں کی خدمت کی توفیق دی۔ 'علیک سلیک' بھی 'یاد اللہ' اور 'صاحب سلامت' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

مقصود ان سب محاوروں کا یہ ہے کہ انسان جب دوسرے انسانوں کو دیکھے یا ان کے سامنے آئے تو ان کی پذیرائی کرے، ان کی شناسائی کا دم بھرے اور ان کو روبرو پاکر خوشی کا اظہار کرے نکتہ اس میں یہ ہے کہ انسان تنہا رہنے کے لیے خلق نہیں ہوا ہے۔ ایک دوسرے سے انسیت اُس کی فطرت کا جزو ہے۔ انسیت محسوس کرنے سے ہی کام نہیں چلتا اس کا اظہار کم اہم نہیں۔ اظہار سے مقصد ظاہر داری کرنا نہیں ہے بلکہ دوسرے انسان کو دیکھ کر ہمیں جو خوشی ہوئی ہے اسے نہ صرف ظاہر بلکہ منتقل اور منعکس کرنا ہے ہر انسان کا دل ایک آئینہ ہے (یہ اس پر منحصر ہے کہ اسے صاف رکھے یا گرد سے اٹنے دے) جس میں دوسروں کے مسکراتے ہوئے چہروں کا عکس پڑتا ہے۔ منعکس مسکراہٹ کی تابش سے یہ آئینہ جگمگانے لگتا ہے۔ ہم دوسروں کی پذیرائی خوشی سے کرتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ خوشی کے اس لین دین، مسکراہٹ کے اس کاروبار، شگفتگی کی اس داد وستد میں فایدے ہی فایدے ہیں۔ یہ ایک فطری خوشی ہے جسے ہمیں بناوٹ سے بچانا چاہیے۔

انگریز اپنی تنہاروی اور کم آمیزی کے لیے بدنام ہیں۔ اس کی وجہ گھمنڈ اور آدم بیزاری نہیں بلکہ اپنی زندگی کو مداخلت سے بچانا ہے۔ انہیں اس کی ٹوہ نہیں رہتی کہ ہمسایہ کیا کر رہا ہے، کہ

* سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ہمدرد نگر۔ دہلی

یہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ انھیں اپنے وقت کی قیمت کا احساس اور دوسروں کی نجی زندگی کا احترام ہے لیکن وہ بھی دوسروں کو دیکھ کر انسیت کے ساتھ سر ہلا دیتے ہیں، ہلکے سے مسکرا دیتے ہیں۔ یہ لوگ، سرد مہری جن کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے، مہر آمیز اور نشاط انگیز مسکراہٹ سے حذر نہیں کرتے۔ یہ بات پہلے سے طے ہے کہ سر کی اس خفیف جنبش اور ہونٹوں کے اس نقرئی تبسم کا جواب اسی طرح دیا جائے گا اور جواب دینے کے لیے رکا نہیں جائے گا۔ ان کے سلام کا خطاب عام انسانیت سے ہے۔ کسی فرد واحد کو اس کا حق نہیں کہ تعمیم کو تخصیص میں بدلے اور تبسم نما سلام کی عالمگیر وسعت کو محدود کر دے۔ ایسے دلکشا تبسم، ایسے جانفزا اشارہ کو گفتگو کا بہانہ بنا نا رنگ میں بھنگ ڈالنا اور لطف کو کرکرا کر دینا ہے۔ یہ اشارت وسلامت افراد سے تجاوز کر کے بنی نوع آدم پر محیط ہو جاتی ہے۔ ایک انسان شادمانی بکھیرتا ہوا جا رہا ہے، کسی دوسرے انسان کو اس کا حق نہیں ہے کہ ساری شادمانی کو سمیٹ لے، اسی طرح جیسے کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ سورج کی شعاعوں اور فضا کی ہواؤں پر بلا شرکت غیرے متصرف ہو جائے۔

یورپ میں رہنے والے سرد مہری سے بچے ہوئے ہیں لیکن ایسا کم ہوتا ہے کہ وہ راہ میں کسی اجنبی کی پذیرائی مسکرا کر یا موانست میں سر ہلا کر کریں۔ وہ جس طرح نا آشنایانہ گزر جاتے ہیں، اس پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یا تو یہ گھمنڈ میں اکڑ رہے ہیں یا انہیں دوسرے انسانوں کو دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی یا وہ اپنی فکروں کو دوسروں کی پذیرائی سے برتر سمجھتے ہیں۔ سوچیے انسان کس طرح کرب میں زندگی بسر کرتا ہے، فکریں اسے کھائے جاتی ہیں، ذمہ داریوں کا بوجھ اسے نڈھال کر دیتا ہے۔ گھر سے نکلتا ہے، دفتر یا کاروبار میں داخل ہوتا ہے تھکا تھکا ہوتا ہے، تلملا کر رہ جاتا ہے، تناؤ سے اعصاب کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ سمجھنے لگتا ہے کہ ساری دنیا اس کی مخالف ہے، سب انسان اس کے درپے آزار ہیں۔ ایسے میں راہ چلتے یا کسی نشست میں اس کا گزر آپ پر ہوا۔ آپ نے اس کا خیر مقدم مسکرا کر کیا؟ آپ نے جو ایک اجنبی ہیں اس کے دل کی کلیاں اسی وقت کھل جائیں گی۔ اسے احساس ہو گا کہ وہ اکیلا نہیں، وہ مظلوم نہیں — بنی نوع انسان اس کے ساتھ ہے۔ وہ بنی نوع انسان جس کا ایک اجنبی فرد اپنے رواں دواں التفات سے اسے نہال کر گیا۔

جن لوگوں سے آپ کا معاملہ ہے، آپ کا سابقہ ہے، جن کے ساتھ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہے، جن کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے جن کے ساتھ بہت سے اوقات گزارنے ہیں، ان کے ساتھ جو چاہے کیجیے جیسا برتاؤ دل میں آئے روا رکھیے کہ اس برتاؤ کے پیچھے عوامل اور روابط اور علت و معلول کا ایک طویل سلسلہ ہے لیکن اس انسان کے ساتھ جو اجنبی ہے، اس مجرد اور مطلق انسان، اس عام انسان کے ساتھ جو دراصل فرد کی حیثیت سے نہیں نوع انسانی کے نمائندہ کے روپ میں آپ کے سامنے سے گزر رہا ہے، آپ انسیت، التفات اور لطف کا برتاؤ کیجیے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو مسکراہٹیں آپ نے اسے دیں سر ہلا کر احترام اور اپنائیت کی جو کرنیں آپ نے بکھیریں وہ اسی ایک اجنبی تک محدود رہ جائیں گی۔ ایسا ہونا انسان کی فطرت اور قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ آپ نے جو کچھ اسے دیا ہے وہ دوسروں کو بانٹتا چلے گا اور آپ کی خفیف سی جنبش سر آپ کی لطیف سی مسکراہٹ عالمگیر ہو جائے گی۔ جس طرح منہ سے نکلی ہوئی آواز کبھی فنا نہیں ہوتی اور دنیا کے ہر گوشہ میں سنی جا سکتی ہے، اسی طرح ہونٹوں پر آیا ہوا تبسم بھی کبھی فنا نہیں ہوتا، خوشی کی کڑیاں یا لڑیاں بناتا ہوا اکناف عالم تک پہنچ جاتا ہے، خوشی کو قید کس نے کیا ہے؟ انسان اس کی اشاعت کا ذریعہ بن جاتے ہیں، انسیت کو کوئی دفن کر سکتا ہے؟ کوشش کر کے دیکھ لیجیے، بیج کی طرح زمین کو توڑ کر باہر آ جاتی ہے، لہلہانے لگتی ہے، دلوں کو باغ باغ کر دیتی ہے۔ دونوں باتیں آپ کے اختیار میں ہیں، انسانوں کو مغموم کرنا یا مسرور کرنا۔ بھویں تان لیجیے ماتھے پر بل ڈال لیجیے، مغموم ہو جائیں گے، مسکرا دیجیے، محبت سے دیکھ لیجیے، التفات کے طور پر سر ہلا دیجیے، آپ خوشی کو فروغ دیتے چلے جائیں گے۔

ہاں ذرا سی احتیاط شرط ہے۔ اس طرح نہ مسکرائیے کہ کوئی قسمت کا مارا یہ سمجھ بیٹھے کہ آپ اس کی تکلیف پر خوش ہیں، یا اس

پر طنز کر رہے ہیں۔ احتیاط وہاں بھی واجب ہے، جہاں سابقہ دوسری صنف سے ہو۔ دونوں صورتوں میں مفہوم آپ کے مقصود سے مختلف لیا جا سکتا ہے۔ پھر مذکر راقم الحروف کو الزام نہ دیجیے گا۔

مسلمانوں کو تو مردم ناشناسی کی اجازت ہی نہیں۔ وہ دوسرے انسانوں کے سامنے سے بے نیازانہ یا متکبرانہ گزر ہی نہیں سکتے۔ انہیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ سلام کرنے میں پہل کرو۔ دوسرا شناخت کرنے اور سلام کرنے سے دل پگھل جائے گا۔ رعونت اور علیحدگیت کا زنگ کٹ جاتا ہے۔ وہ لوگ جو عمر، رتبہ، دولت، شہرت یا لیاقت کے اعتبار سے خود کو بڑا سمجھتے ہیں اور اس کا انتظار کرتے ہیں کہ دوسرا انہیں سلام کرے تو وہ جواب میں سر ہلا دیں؛ وہ لوگ دنیا کی نظر میں شاید بڑے ہوں لیکن ان کا دل چھوٹا ہے۔ غور کیجیے تو انسان کی بڑائی یا چھوٹائی نہ عمر پر منحصر ہوتی ہے نہ اکتسابات پر۔ بڑا وہ ہوتا ہے جس کا دل بڑا ہو، جس کا دل چھوٹا ہو وہ خود چھوٹا ہے۔ یہی ایک سچا پیمانہ ہے انسانوں کو ناپنے کا۔

اسی بات کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھیے۔ یہ دور اقدامیت کا ہے۔ آگے وہی بڑھتے ہیں، جو پہل کرتے ہیں۔ لوگوں کی پذیرائی میں پہل کیجیے آپ کا پلہ بھاری رہے گا لیکن آپ اس نیت سے پہل نہ کیجیے۔ پھر تو یہ سوداگری ہو جائے گی۔

اپنے سے چھوٹوں کو سلام کر کے آپ انسان کے وقار میں اضافہ کرتے ہیں، آپ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ بنی نوع انسان کا ہر فرد لائق احترام ہے، آپ یہ اعلان کرتے ہیں کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں اور قدرت کی جمہوریت میں سب افراد برابر ہیں۔ جو رشتہ ان کو جوڑ رہا ہے وہ سب سے مضبوط رشتہ ہے، انسانیت کا رشتہ، انسیت کا رشتہ۔ اس طرح آپ دھوکا دینے والے ظواہر اور پُر فریب مادیت کی قبا کو چاک کرتے ہوئے زندگی کی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔
چلتے ہوئے یہ بات یاد رکھیے کہ جو اجنبیوں کو تواضع نگاہ سے دیکھے گا، وہ اپنوں سے منحرف نہیں رہ سکتا۔ پہچانیے مسکرائیے، احترام کیجیے۔ آپ ایسے بیج بکھیر رہے ہیں جو معصوم خوشیوں اور ہمدردیوں کے برگ و بار لائیں گے ـــ دیکھیے "یاد اللہ" کا مفہوم یہ نکلا کہ بندوں کو پہچاننا، ان کا دل رکھنا ہی اللہ کو یاد کرنا ہے۔

" ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنے خاص اوقات کا اور جو کام عام قوم سے متعلق ہیں، ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک اصل الاصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔"

سر سید احمد خاںؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸، شمارہ ۲ (فروری ۱۹۸۹ء)

سرسیّد اکیڈمی — ایک تعارف

عتیق احمد صدیقی *

عظیم شخصیتوں کی یادگاریں قایم کرنا چنداں ضروری نہیں ہوتا کہ ان کے کارنامے خود ان کی سب سے اچھی یادگار ہوتے ہیں۔ دیگر بہت سے کاموں کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سرسید کی عظیم یادگار ہے سرسیّد نے اور کوئی کام نہ کیا ہوتا تو یہ ادارہ ہی ان کی عظمت کو ثابت کرنے اور ان کی یاد دلاتے رہنے کے لیے کافی تھا۔ گزشتہ ایک سو تیرہ سال میں اس ادارے نے جہالت کی تاریکی دور کرنے، تعلیم کا فیضان عام کرنے جدید ذہن پیدا کرنے، مسلمانوں میں عام بیداری کے رجحان کو فروغ دینے میں جو خدمات انجام دیں، ان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس چراغ سے برصغیر میں کتنے چراغ روشن ہوئے ان سب کو محسوب کیا جائے تو اس کی فیض رسانی کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے اور اس دائرے کے ہر جگمگاتے نقطے میں اسی ایک شخصیت کی جلوہ گری نظر آتی ہے لیکن زندہ قومیں محسنوں کی یاد کو طرح طرح سے زندہ رکھنے کے مواقع پیدا کرتی ہیں تاکہ ان کی تعلیمات اور ان کے پیغام کی بازخوانی ہوتی رہے اور زمانے کی تند و تیز ہوائیں ہمارے ذہنوں سے ان کی یادوں کو محو نہ کر دیں۔

۱۹۶۰ء میں یہ طے کیا گیا کہ ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جشن زریں منایا جائے تو سرسیّد ہاؤس کی باز تعمیر کا منصوبہ بھی بنا۔ یہ وہ مکان تھا جس میں سرسیّد نے اپنی زندگی کے آخری بیس بائیس سال گزارے تھے۔ اسی مکان میں رہ کر انھوں نے کالج کی مختلف عمارتوں کی تعمیر کرائی۔ اسی مکان میں رہ کر انہوں نے اپنے خوابوں کو عملی شکل دینے کے منصوبے بنائے۔ یہی مکان بہی خواہان قوم کا مرجع بنا رہا اور قوم کی امیدوں کا مرکز۔ اپنی سادہ مگر پرشکوہ تعمیر اور اپنے وسیع سبزہ زاروں کی بدولت یہ مکان اپنے مکین کی طرح سے ہی عظمت و جلال کا حامل تھا۔ گراہم بیلی نے اس کی منظر کشی کچھ اس طرح کی تھی:

> "پورے ماحول پر علم و ادب چھایا ہوا۔ ان کا زیادہ وقت اپنی نشست گاہ میں میز پر گزرتا تھا۔ یہ کمرہ کتابوں اور کاغذوں سے بھرا ہوا تھا۔ کھانے کے کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں جن میں انگریزی کی معیاری کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ کتب خانہ کا کمرہ نہایت شاندار ہے۔ اس میں متنوع کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ مذہبیات کی بے شمار کتابیں ہیں جنہیں انجیل اور قرآن کی تفسیر لکھنے میں استعمال کیا گیا ہے۔"

اندر کا یہ عالم اور باہر وسیع سبزہ زاروں کے ساتھ پھولوں کی خوشنما کیاریاں۔ اس سلسلے میں خود سرسیّد کا ذوق بہت پاکیزہ تھا۔ اس کی شادابی کو برقرار رکھنے کے لیے انھوں نے زر کثیر بھی صرف کیا اور ذاتی طور پر اس کی نگرانی کی۔

لیکن ۱۹۶۰ء تک آتے آتے یہ عمارت کھنڈر ہو چکی تھی۔ ہوا یہ کہ تقسیم ہند کے بعد سر راس مسعود کے بیٹے جو اس مکان کے جائز وارث

* ڈین فیکلٹی آف آرٹس، پروفیسر شعبۂ اردو، ڈائرکٹر سرسید اکاڈمی۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

تھے، پاکستان [illegible] اور اس تمام جائیداد کو متروکہ جائیداد
قرار دے کر حکومت نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ لیکن نگہداشت بالکل نہیں
ہو گی۔ رفتہ رفتہ چھتیں گر گئیں، منبت کاری ادھڑ گئی، دیواریں ٹوٹیں اور
اس طرح اپنے دور کے اس شاندار مکان نے کھنڈر کی صورت اختیار
کر لی تھی تاآنکہ اس جائیداد کو یونیورسٹی نے ۱۹۷۱ء میں پھر خرید لیا اور
اس کی باز تعمیر کی طرف توجہ کی۔

جشن زریں کے سلسلے میں ہی پروفیسر خلیق احمد نظامی کی
سرگرمی میں سرسید اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ تاکہ نہ صرف
یہ کہ سرسید کی قیام گاہ کو یادگار کے طور پر باقی رکھا جاسکے بلکہ اُسے
بعض مفید کاموں کے مرکز کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکے۔ نظامی صاحب
کی یہ تجویز محض والہانہ محبت و عقیدت کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کو سرسید
اور ان کے مشن کے ساتھ عالمانہ شیفتگی تھی اور اس کو آگے بڑھانے
کی فکر ان کو ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی۔ اسی لیے ان کی متجسس طبیعت نے سرسید
ہاؤس کا بھی ایک ایسا مفید استعمال سوچ نکالا کہ جس سے اس کا تعلق
ایک طرف سرسید کی ذات سے بھی قایم رہے اور دوسری طرف یہ
علمی و تحقیقی کاموں کا مرکز بھی بن جائے۔ اس اکادمی کے دائرہ عمل میں
مندرجہ ذیل امور شامل کیے گیے:

۱۔ **لائبریری** ایک ایسی لائبریری قایم کی جائے جس میں
سرسید کی جملہ تصانیف، سرسید پر لکھی جانے والی تمام کتابیں
اور مضامین موجود ہوں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد متعدد سیاسی
سماجی، ادبی اور مذہبی تحریکیں پیدا ہوئیں ان سب سے متعلق
کتابوں کا اچھا ذخیرہ اس لائبریری میں مہیا کیا جائے۔ اس
کے علاوہ یہ بھی کوشش کی جائے کہ اہم شخصیتوں کے مکاتیب،
ذاتی یادداشتیں اور ایسی تمام دستاویزیں بھی حاصل کی جائیں
جن سے سرسید، ایم۔اے۔او کالج اور اس تحریک پر روشنی
پڑ سکتی ہو۔

۲۔ **آرکائیوز:** کالج کے قیام سے لے کر یونیورسٹی
کے جتنے کاغذات ہیں ان کو محفوظ کیا جائے۔ ان میں کارپردازان
کالج کی مراسلات، مختلف مجالس کی رودادیں اور مختلف
اوقات میں مرتب کی جانے والی رپورٹیں بھی شامل ہوں گی۔
ان کاغذات میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں ہندوستانی
مسلمانوں کی تعلیمی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ سے
متعلق نہایت اہم مواد موجود ہے اور مستقبل کے مورخوں اور
تحقیق کاروں کے لیے بیش بہا ذخیرہ ہے، اس کو نہ صرف محفوظ
کیا جائے بلکہ اسے ترتیب دے کر تحقیق کرنے والوں کی
آسانی کے لیے مہیا کیا جائے۔ لائبریری اور آرکائیوز مل کر
ایک ایسا مرکز بن جائیں جہاں گزشتہ ایک صدی کی مسلمانان
ہند کی تعلیم، سیاست، تمدن، مذہب، معاشرت پر تحقیق
کرنے والوں کے لیے نایاب کتابیں اور دستاویزیں موجود
ہوں۔

۳۔ **نوادرات خانہ** سرسید سے متعلق جملہ اشیاء
جو دستیاب ہوسکیں، حاصل کی جائیں اور ان کو نمائش کے لیے
رکھا جائے۔ اس میں استعمالی اشیاء کے علاوہ اس دور
کی تصاویر کو بھی شامل کیا جائے

۴۔ **مصور راہداری:** تصاویر اور نقشوں کے
ذریعے یونیورسٹی کے مختلف ارتقائی مراحل کو دکھایا جائے
تاکہ ان کو دیکھ کر کوئی بھی شخص پوری تاریخ سے واقف
ہو سکے۔

۵۔ **سائنٹفک سوسائٹی:** سرسید نے اپنی تعلیمی مہم
کا آغاز کرنے سے کہیں پہلے یہ سوسائٹی قایم کی تھی جس کا
مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی لوگوں میں توہمات، قدامت پرستی
کے خیالات ترقی سے گریز کے تصورات موجود ہیں، ان کو دور
کیا جائے، انھیں ایک سائنسی ذہن دیا جائے۔ تاکہ وہ
جدید دور کے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور ان سے عہدہ برآ
ہونے کے لیے خود کو تیار کر سکیں، جدید علوم سے آشنا
ہوں اور جہالت کی تاریکیوں سے باہر نکلیں۔ اس سوسائٹی
نے ترویج علوم کے لیے بہت سی مفید کتابوں کے ترجمے بھی کرائے
تھے۔ اس لیے اب بھی تجویز کیا گیا کہ اس سوسائٹی کی انھیں خطوط

پر تجدید کی جائے اور نہ صرف یہ کہ اردو میں علوم پر معیاری کتابیں لکھائی جائیں بلکہ عربی فارسی اور اردو سے کتابوں کا ترجمہ ہندی میں بھی کرایا جائے۔

۶۔ سرسید یادگاری خطبات :۔ ہر سال یوم سرسید کے موقع پر سرسید یادگاری خطبات کرائے جائیں اور ملک کی اہم علمی شخصیتوں کو ان خطبات کے لیے مدعو کیا جائے۔

۷۔ قرآنی مطالعہ کا مرکز :۔ سرسید نے اپنے بنگلے کے احاطہ میں مولانا شبلی کی بھی رہائش کا انتظام کیا تھا۔ اس مکان کا نام "شبلی کی بنگلیہ" پڑ گیا تھا۔ اس حصہ کی تجدید و تعمیر کے بعد اس میں مطالعات قرآنی کا مرکز قایم کیا جائے کہ جس میں قرآنی تعلیمات پر برابر تحقیق و مطالعہ کا کام جاری رہے۔

لیکن ہماری کارکردگی ہمیشہ ہمارے منصوبوں کا ساتھ نہیں دیتی۔ کبھی وسائل فراہم نہیں ہوتے اور کبھی دیگر عوامل کاموں کو الجھا دیتے ہیں' ان میں روڑے اٹکاتے ہیں اور ان کی رفتار کو ختم یا کم کر دیتے ہیں۔ اکاڈمی کے بانیان کی تمام تر نیک نیتی اور قوت عمل کے باوجود نہ ان تمام منصوبوں کو روبکار لانے کے لیے اقدامات کیے جا سکے' نہ شروع کردہ کاموں میں مناسب رفتار پیدا کی جا سکی' لیکن جہاں یہ بات درست ہے وہیں یہ بھی درست ہے کہ تمام تر دشواریوں کے باوجود کام سست روی سے ہی سہی مگر جاری ہیں۔

یوں دیکھیے تو یونیورسٹی کے بڑے کارخانے میں جہاں مطالعات و تحقیقات کے بڑے شعبے ہیں اور انہیں کو اہمیت بھی ہونی چاہیے' کسی ایسے چھوٹے سے جز کی کیا فکر ہو اور کسے! لیکن یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ یہ اس بانیٔ درس گاہ کی یادگار ہے جس کے مینارۂ نور کی روشنی سے ہی ہم آج فیض یاب ہو رہے ہیں۔ چھوٹا ہی سہی مگر اس ادارہ کو زیادہ سے زیادہ فعال ہونا چاہیے اور اب یونیورسٹی کی توجہ کا مرکز بھی۔ چنانچہ کچھ پہلے یونیورسٹی کورٹ میں بھی اس پر گفتگو آئی اور اس کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کی ہدایت کی گئی۔ موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب نے یونیورسٹی کے دوسرے چھوٹے بڑے حصوں کی [illegible] کرنے کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی [illegible] مبذول فرمائی۔ اکاڈمی کے کارگزاروں کی ہمت افزائی کی اور اگرچہ بقدر قلیل لیکن مالیہ کی فراہمی کا بند و بست بھی کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ جب بھی ضرورت ہوئی انھوں نے دست تعاون بڑھایا۔ اسی سب کے نتیجے میں اکادمی کی رفتار میں کچھ گرمی آنی شروع ہو گئی ہے۔ اکادمی کی کارکردگی کا مجمل بیان درج ذیل ہے۔

۱ لائبریری :

کتابوں کی خریداری کا سلسلہ پہلی مرتبہ شروع ہوا اور تقریباً آٹھ ہزار روپے کی کتابیں ۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران لائبریری میں خریدی گئیں۔

۲۔ آرکائوز :

قدیم کاغذات و دستاویزات کی ترتیب و تنظیم کا کام برابر جاری ہے۔ کافی بڑے حصے کی فہرستیں اور اشاریے مرتب کیے جا چکے ہیں۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں کئی تحقیق کاروں نے اس مواد سے استفادہ کیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے توسط سے وہ بہت سی کتابیں بھی آرکائوز میں شامل کی گئیں جو ایم۔ اے۔ او کالج کے زمانے میں اسکولی نصاب میں شامل تھیں۔ کل جب کوئی شخص تعلیمی معیاروں اور نصابات کے سلسلے میں تحقیق کرنے بیٹھے گا تو یہ کتابیں مفید ماخذ ثابت ہوں گی۔

آرکائوز کے سرمایہ سے پرنسپل تھیوڈر بک کی مراسلات مرتب کر کے شائع کی جا رہی ہے اور یہ اشاعت کے آخری مرحلوں میں ہے۔

اس سے قبل [illegible] دستاویزات کی ایک جلد پروفیسر یوسف حسین خاں مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ جن حضرات کے پاس یونیورسٹی سے متعلق کوئی مراسلات یا دستاویزات ہوں وہ اس آرکائوز کو عطیہ کر دیں۔ تاکہ یہ اہم سرمایہ آئندہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔

۳۔ مصوری دستاویزی:
اس کے لیے تیاری جاری ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء تصویروں کے حصول/تحفظ پر پانچ ہزار روپیے صرف کیے گئے۔ تصویر سازی کا کام جاری ہے اور جیسے ہی مناسب ذخیرہ فراہم ہو جائے گا اور اس کو ترتیب دیا جائے گا۔ ہمدردان اور متعلقین یونیورسٹی کے ذاتی ذخیروں سے بھی تصاویر حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

۴۔ سرسید یادگاری خطبات
۱۹۸۲ء تک چار خطبات ہو چکے تھے لیکن یہ سلسلہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ ۱۹۸۴ء میں یہ یادگاری خطبہ اکادمی کے دائرہ کار سے باہر کرایا گیا۔ ۱۹۸۷ء سے اس کی پھر تجدید کی گئی اور مندرجہ ذیل خطبات انعقاد پذیر ہوئے:

(i) عزت مآب بشمبھر ناتھ پانڈے (گورنر اڑیسہ)
مذاہب میں بنیادی وحدت۔ ۱۹۸۷ء
(ii) جسٹس جگ موہن ریڈی (سابق جج سپریم کورٹ)
اتحاد و یک جہتی کی تلاش۔ ۱۹۸۸ء
(iii) ڈاکٹر رفیق زکریا (بار ایٹ لا)
کیا اسلام سیکولر ہے ۱۹۸۸ء

اب امید ہے کہ یہ خطبات ہر سال سرسید تقریبات کے اکتوبر کے مہینے میں ہوتے رہیں گے اور ملک کے نامور ذی علم حضرات اپنے خیالات سے ذہنوں کو روشن کرتے رہیں گے۔

۵۔ اکادمی، ۱۹۸۸ء میں مندرجہ ذیل کتابیں شائع کر چکی ہے:
(i) منتخب مضامین سرسید: اس میں سرسید کے ایسے مقالات کو جمع کیا گیا ہے جن سے ان کے دور میں بھی قومی بیداری پیدا ہوئی اور آج بھی ان سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے (اردو میں یہ مضامین شائع ہو چکے ہیں اور ہندی رسم خط میں اس کی اشاعت کی تیاری جاری ہے جو عن قریب مکمل ہو جائے گی)۔
(ii) یادگاری خطبہ از بشمبھر ناتھ پانڈے
Basic oneness in all Religions
(iii) یادگاری خطبہ از جسٹس جگ موہن ریڈی
In Search of Unity and Integration.
(iv) پرنسپل بیک کی مراسلت بھی عن قریب شائع ہو جائے گی۔

۶۔ سرسید کی جملہ کتابوں کو مناسب تدوین کے ساتھ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا جا چکا ہے اور مالیہ کی فراہمی کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جیسے ہی یہ انتظام ہوا، اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

۷۔ ایسوسی ایشن آف انڈین آرکائیوسٹس کے اشتراک و تعاون سے آرکائیوز کے مسائل پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے اہم اراکین کے علاوہ ملک بھر کے ریاستی محافظ خانوں (آرکائیوز) کے نمائندوں نے شرکت کی۔ محافظ خانوں کے مسائل پر مقالات پیش کیے گئے اور مباحث بھی ہوئے۔ محافظ خانوں کی ترتیب و تنظیم کو بہتر بنانے میں اس سیمینار کے مباحث سے کافی مدد ملے گی۔ اس سیمینار کے وسیلے سے خود یونیورسٹی آرکائیوز بھی پہلی بار قومی سطح پر متعارف ہوا۔

۸۔ نوجوانوں میں سرسید اور ان کی تعلیمات کا تعارف کرانے کے لیے اس سال (۱۹۸۸ء میں) یوم سرسید کی تقریبات کے سلسلے میں مصوری کا مقابلہ کرایا گیا جس میں تین بڑے موضوعات رکھے گئے:
(i) سرسید اور ان کے رفقا میں کسی کا خاکہ/تصویر
(ii) یونیورسٹی عمارتوں میں سے کسی کی نقشہ کشی
(iii) سرسید کے اقوال میں سے کسی ایک کی بصری پیش کش۔

اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبا کی بڑی تعداد نے

اس میں شرکت کی۔ اس بہانے ان بچوں نے سرسید کی بہت سی تحریروں کو پڑھا اور ان سے واقفیت حاصل کی۔ جس ذوق و شوق کے ساتھ اس مقابلے میں بچوں نے حصہ لیا اس سے نہ صرف ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا بلکہ اس مقابلے کے مقصد کے حصول کا یقین بھی ہو گیا۔

سچ ہے کہ سرسید اکادمی کو ایک ایسا مرکز بن جانا چاہیے جہاں :۔

(i) سرسید کی تعلیمات پر تحقیق کا کام جاری رہے۔

(ii) مسلمانان ہند کی گذشتہ سو سال کی سیاسی، سماجی، تعلیمی سماجی، تعلیمی ثقافتی، مذہبی تحریکات پر تحقیق ہو۔

(iii) سرسید کی ان تعلیمات کو عام کرنے کا کام انجام دیا جا سکے۔ جس سے مسلمانوں میں جدید ترقی پسند رجحانات کا فروغ ہوا۔

(iv) مسلمانان ہند کی موجودہ تعلیمی اور ثقافتی ضرورتوں پر تحقیق ہوتی رہے۔ اور ان میدانوں میں رہنمائی کا کام انجام دیا جا سکے۔

حالات نے معاونت کی تو کاربردازانِ اکادمی یہ سب بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے کوشاں رہیں گے۔

"سرسیّد نے کام کرنے والوں کی ایک ایسی فوج تیار کر دی تھی جن میں نظر تھی، دھن تھی، استقلال تھا اور عمل کی صلاحیت تھی۔ آج کی دنیا ہم سے سرسید کی سیرت گری مانگتی ہے، سرسید کی روشن خیالی مانگتی ہے، سرسیّد کا تصنیف و تالیف سے شغف مانگتی ہے، سرسیّد کی ادبی بصیرت مانگتی ہے، سرسید کا انتھک عزم مانگتا ہے جو مشکلات میں سپر ہو اور سب سے زیادہ وہ دوربین اور دور رس ویژن (VISION) مانگتی ہے جو قوموں کی تقدیر بناتا ہے اور وقت کی آواز کہلاتا ہے۔ سرسیّد کا نام لیتے رہنا اور سرسید کے مشن کی روح کو نظر انداز کرنا کیا یہی ہمارا شیوہ رہ گیا ہے۔"

(آل احمد سرور)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۲ (فروری [illegible])

تعلیم میں قناعت پسندی کا رجحان

محمد اسحاق *

بہت عرصہ قبل عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک غیر مسلم پروفیسر نے ایک ہونہار پوسٹ گریجویٹ مسلم طالب علم سے کہا کہ آئندہ سال اپنا نام پی ایچ۔ڈی کے لیے رجسٹر کرادو۔ ایک دو سال میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جائے گی۔ طالب علم نے کچھ پیشیانی کا اظہار کیا۔ تم اس کی فکر نہ کرو تمہارے انتخاب کے مراحل میں خود دیکھ لوں گا۔ اس قدیم طالب علم سے کچھ عرصے قبل ملاقات ہوئی اور یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ وہ بیس برس کے عرصے میں اپنا نام پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹر نہ کروا سکا۔ ان سے تفصیلی بات ہوئی تو وہ احساس کمتری میں مبتلا تھے۔ میں نے کہا کہ آپ آئی۔ اے۔ ایس کے لیے ضرور کوشش کرسکتے تھے۔ کہنے لگے امتحان تو پاس کرلیتا لیکن انٹرویو کے شکنجے سے نکلنا ہم مسلم امیدواروں کے لیے آسان نہیں۔ خوب۔ میں نے کہا دیکھیے اولمپک دوڑ میں بہت سے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ انعام کے مستحق ظاہر ہے بس تین ہی ہوتے ہیں لیکن ان سب کو ساری عمر یہ اعزاز تو حاصل رہتا ہے کہ وہ اولمپک دوڑ میں شریک رہے ہیں کیونکہ ہر ملک اپنے ہزاروں اسپورٹس مین میں سے انہیں منتخب کرتا ہے۔ جو شخص اس دوڑ میں شریک ہی نہیں ہے اس کے جیتنے ہارنے اور کچھ پانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے

"تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا"

یہ تو صرف ایک مثال تھی۔ آئے دن ہم ایسے حادثات علمی اور حرماں نصیبی سے دوچار ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں ہماری بحث عام طلبا سے نہیں بلکہ ان ذہین و فطین طلبا سے ہے جو علم کے کسی شعبے میں کمال حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ملک و قوم میں نامور ہوسکتے ہیں زمین کا نمک کہلا سکتے ہیں جن کے وجود پر ساری قوم فخر کرسکتی ہے۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے عام طور پر مسلم طلبا میں قناعت پسندی کا رجحان عام ہے۔ یہ ایک ایسا گہرا نفسیاتی مرض ہے جس کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے، سدی تعلیم، پیشہ وارانہ قابلیت اور ترقی کا انحصار اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کی جدوجہد پر موقوف ہے۔ خود یہ کوشش نتیجہ ہے طالب علم کے اندرونی جذبے اور شوق و ذوق پر جو اس جدوجہد کے لیے تیار کرتی ہے۔ تعلیم کے میدان میں اس قسم کی قناعت پسندی کا رجحان پرائمری، سکنڈری اور یونیورسٹی کی اعلیٰ سطح تک مل جائے گا۔ والدین اور طلبا کو اکثر آپ یہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ زیادہ پڑھنے سے کیا فائدہ ہے۔ اس مرض کی جڑیں بہت گہری اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں جن میں انفرادی کمزوریوں کے علاوہ کچھ تو تاریخی، سماجی اور مذہبی ہیں۔

۱۔ اپنے آپ کی پہچان ایک مشکل کام ہے۔ خود اپنے میں کیا صلاحیتیں اور کمالات پوشیدہ ہیں ان سے عام طور پر نوجوان طلبا ناواقف رہتے ہیں جب تک کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے جانچنے اور پرکھنے کے مواقع سے دوچار نہ ہوں۔ ایسے طلبا جو اسکول یا کالج میں مختلف غیر نصابی مصروفیات اور مقابلوں میں حصہ نہ لیں ان میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو پاتی۔ دوسری طرف انھیں ماہرانہ رہنمائی یا گائیڈنس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو طالب علم شش و پنج میں رہ جاتا ہے۔ اکثر زریں مواقع کھو بیٹھتا ہے۔

---

* رٹائرڈ پرنسپل سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن۔ حیدرآباد، آندھرا پردیش۔

۲۔ مختلف تاریخی وجوہات خصوصاً انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں میں مایوسی اور بے حسی کی وجہ سے وہ تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے۔ انگریزوں کے توپ و تفنگ سے زیادہ ریل، تار، جہاز، موٹر اور بجلی کی ایجادات نے انہیں سخت حیرت میں ڈال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ سر سیدؒ کی تعلیمی تحریک کے ایک سو برس سے زیادہ عرصے کے بعد بھی مسلمانوں کا تعلیمی فیصد ۱۵ ہے جب کہ ملک میں تعلیم کا فیصد ۳۲ سے زائد ہے۔

۳۔ حال ہی میں مولانا ابو الکلام آزاد کی صدی تقاریب کا دہلی میں افتتاح کرتے ہوئے ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اس بات کا اعتراف کیا کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ سیاسی حالات نے پلٹا کھایا تو سب سے پہلے مسلمانوں پر معیشت کے دروازے بند ہو گئے۔ ان کا سارا انحصار سرکاری ملازمتوں پر تھا۔ دوسرے ذرائع معیشت زراعت صنعت و حرفت تجارت سب سے اہم اور بنیادی ہیں لیکن ان کے لیے مزدوری سرمایہ کے علاوہ صلاحیت اور محنت و مشقت کی عادت بھی ضروری ہیں جن سے عام طور پر مسلمان محروم ہیں۔

۴۔ جمہوری نظام کی کمزوریوں سے یہاں بحث نہیں لیکن اس نظام حکومت میں آج بھی ڈارون کا نظریہ "تنازع للبقا" Survival of the Fittest. برابر کام کر رہا ہے۔ اپنے وجود کو باقی رکھنے اور اوپر آنے کی جدوجہد Struggle for Existence جس طرح نباتات اور حیوانات میں موجود ہے، اسی طرح جمہوری نظام میں نہ صرف فرد بلکہ مختلف سماجی و مذہبی طبقات پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اگر انہیں باعزت زندگی گزارنی ہے تو وہ نہ صرف اپنے اطراف و اکناف کے سماجی، معاشی و سیاسی حالات پر گہری نظر رکھیں بلکہ وہ ان حالات اور ماحول میں اپنے کو باقی رکھنے اور اونچا مقام حاصل کرنے

کی جدوجہد میں عملاً حصہ لیں جس کے لیے تعلیم نہایت ضروری ہے۔ ورنہ کوئی اس دوڑ میں چھوٹ گیا اور کون مٹ گیا اس کا کسی کو افسوس نہ ہوگا۔

مسلم طلبا کا یہ عام ذہنی مزاج ہے کہ وہ کسی مسابقتی امتحان میں شریک ہونے سے قبل ہی طے کر لیتے ہیں کہ ان کا انتخاب مشکل ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جو کسی مقابلے میں شریک ہونے سے قبل ہی اپنی شکست کو تسلیم کر لے، جو پہلے ہی سے شکست کے لیے تیار ہے۔ اس کو علم کی سربلند چوٹی کے سر کرنے کا سودا سر میں سما ہی نہیں سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ گھوڑا سوار جب خود ہی مرعوب اور خوفزدہ ہو تو گھوڑا اپنے جسم کی رگوں میں سوار کی گھبراہٹ اور پریشانی کو محسوس کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ تھوڑی ہی دیر میں اس کو زمین پر پٹک دیتا ہے۔ آل انڈیا سروسز کے لیے انٹرویو لینے والے اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں، وہ دو چار منٹ ہی میں سمجھ لیتے ہیں کہ امیدوار کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔

۵۔ غالی علمائے دین اور مذہبی حضرات نے مذہبی حلقوں میں دنیاوی علوم سے بیزاری کا اظہار کیا، یا پھر ان علوم کا ذکر بڑی حقارت سے کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناپختہ ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ تعلیم میں شُد بُد تو حاصل کر لینا ٹھیک ہے لیکن ان میں کمال حاصل کرنے یا تمغۂ امتیازی کی ہر کوشش پر پہلے ہی سے بریک لگ جاتا ہے۔

یہاں پر ہمیں ایک اہم سوال کرنا ہے۔ یہ تو ہر حاجی جانتا ہے کہ حج میں طواف کعبہ کے پہلے تین چکر "رمل" کہلاتے ہیں جن میں شانے اچھال کر، سینہ تان کر چلنے کی ہدایت ہے۔ حضور اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایسا ہی کیا تھا تاکہ کفار مکہ کو یہ خیال نہ آنے پائے کہ مسلمان کمزور اور بدحال ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے قوت حاصل کرنے کو کہا اور پھر اس کا مطلب یوں سمجھایا کہ قوت سے مراد شمشیر زنی، تیر اندازی اور شہسواری میں کمال پیدا کرو۔ ان باتوں سے ایک بات واضح ہے کہ مسلمان دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی نہ گزاریں۔ اسوۂ حسنہ کی وہ اسپرٹ آج بھی باقی ہے لیکن اعتبارات بدل گئے ہیں۔ آج علم سائنس تحقیق اور

"صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔ بولنے میں تو یوں آتا ہے کہ "تعلیم و تربیت" مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔"

سر سید احمد خاں

ٹکنالوجی میں کمال اور اخلاق کی برتری کا زمانہ ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو روئے زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا گیا اور انھیں اشیائے کائنات کا سارا علم دے دیا گیا جن میں آثار و خواص بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اشیا کے آثار و خواص کا علم بغیر کسی سائنٹفک تحقیق کے ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ سارے مادی علوم کا حصول بھی دین ہی کا حصہ ہے۔ خلافت، حکومت، دولت، عزت بھی انعامات الٰہی ہیں بشرطیکہ ان کا صحیح استعمال ہو۔ یہاں پر ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان دنیوی علوم میں کمال پیدا کیے بغیر بھی دوسروں کے مقابلے میں کس طرح ہمسری یا برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ کیا مسلمان اس زمین پر دوسروں کے رحم و کرم پر قناعت کر لیں اور قناعت کی زندگی گزار لیں۔ اے کاش، کوئی صاحب علم و یقین اس پہلو پر بصیرت افروز مضمون لکھے جو مسلمانوں کی نظر سے بالکل ہی اوجھل ہو گیا ہے۔

یہاں پر ہمارا مقصد تعلیم میں قناعت پسندی کے رجحان کے اسباب کو مزید طول دینا نہیں ہے لیکن ہمارا یہ شدید احساس ہے کہ مسلم طلبا میں غیر محسوس راستوں سے ان کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ بس کسی حد تک تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ یونیورسٹی کی سند کام چلانے کے لیے کافی ہے، کچھ روزگار مل جائے گا اور معاشرے میں بھی مقام حاصل ہو جائے گا۔ کسی علم میں کمال اور اس کی بلندیوں کے اعلیٰ معیار تک پہنچنے کے لیے جس کاوش اور جد و جہد کی ضرورت ہے وہ اس ذہنی ساخت کی وجہ سے ممکن ہی نہیں ہے۔

ہمارے سارے ماہرین تعلیم، دانش ور، علمائے کرام، لیڈر اور سماجی کارکن، ادیب اور شاعر سب ہی ان بنیادی اسباب پر غور کریں اور طلبا میں تعلیم کا وہ ذوق و شوق پیدا کرنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ علم کے ہر شعبے میں جو اپنی وسعت اور گہرائی کے ساتھ ایک چیلنج بنا ہوا ہے اس میں کمال پیدا کر سکیں۔

"ہم اپنی قوم کو بارہا جتا چکے ہیں کہ جب تک مسلمان خود اپنی تعلیم کا بوجھ آپ نہیں اٹھا دیں گے، اس وقت تک ان کی ذلت، ان کا ادبار دور نہیں ہو سکتا۔ اس ہمارے قول کی تصدیق بہت ہو چکی ہے اور جو رہی سہی باقی ہے وہ بہت جلد ہو جانے والی ہے۔ قوم کی جو حالت ہونے والی ہے اور جو ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے، اس نے ہمارے دل کو دکھایا ہے۔ اس ہمدردی اور دل کے دکھنے سے ہم نے مسلمانوں کے لیے مدرسۃ العلوم کے قایم کرنے کا بوجھ اٹھایا ہے"

سر سیّد احمد خانؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۲۔ (فروری ۱۹۸۹ء)

لنڈاؤ مین

ایک نیا دریافت شدہ آدمی

سید عاصم محمود*

۱۹۸۴ء کی بات ہے برطانوی علاقے چیشائر میں ایک انوکھی واردات ہوئی۔ لنڈاؤ موس کے مقام پر دلدلی کوئلے سے ایک لاش نکلی۔ اس لاش کی دریافت نے ماہرین اثرات کو یوں اپنی طرف کھینچا جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ اس لیے کہ جس کسی کی بھی وہ لاش تھی وہ آج سے کوئی دو ہزار سال پہلے زندہ تھا۔ یقیناً وہ لوہے کے زمانے کا انسان تھا۔ مقام دریافت کی رعایت سے اسے 'لنڈاؤ مین' کا نام دیا گیا۔

اگست ۱۹۸۴ء میں اس نئے آدمی کی دریافت انسانیات اور اثریات کی تاریخ میں ایک نیا موڑ تھی۔ اب تک جس قدر تفصیلی تحقیق لنڈاؤ مین پر کی گئی ہے، پہلے کسی اور دریافت پر نہیں کی گئی تھی۔ اس تحقیق کے نتیجے میں آج ہم دو ہزار سال بعد بھی یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیسے مرا؟ اور اس نے آخری کھانا کیا کھایا؟ اور وہ دیکھنے میں کیسا لگ رہا ہوگا؟ اس کے باوجود ہمیں معلوم نہیں کہ اس نے ایک تکلیف دہ موت کا سامنا نہایت سکون و اطمینان سے کیوں کیا جب کہ وہ ایک طاقت ور اور مضبوط شخص تھا۔ ایک بھرپور جوان۔ موت کے وقت اس کی عمر ۲۵ تا ۳۰ برس کے درمیان تھی۔ اس بات کی کوئی نشانی نہیں ملتی کہ موت سے پہلے اس نے کسی لڑائی میں حصہ لیا ہو یا خود کو بچانے کی کوشش کی ہو۔ پہلے اس کے سر پر پچھلی طرف ڈو ایسی چوٹیں ماری گئیں کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ پھر اسے پھانسی دی گئی۔ اس کے بعد گلا کاٹ کر پانی کے تالاب میں یوں پھینک دیا گیا کہ اس کا چہرہ نیچے کو رہے اور یوں زندگی کو موت کے حوالے کر دیا گیا۔

لنڈاؤ مین کی موت میں جو پیچیدگی اور بہیمیت پائی جاتی ہے وہ اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اسے سزا یا قربانی کے طور پر مارا گیا۔ اس لیے کہ صرف پھانسی ہی کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ نفرت اور درندگی یہاں تک بڑھی کہ پھانسی کے بعد گلا بھی کاٹا گیا۔ پھر اسی کو کافی نہ جان کر تالاب میں بھی یوں پھینکا گیا کہ بچنے کی کوئی صورت نہ رہے

لنڈاؤ مین کا تعلق اس زمانے کے برطانیہ سے ہے جب وہاں رومیوں کا تسلط تھا۔ یورپ جہالت و وحشت میں ڈوبا ہوا تھا اور انسانیت کی تذلیل قدم قدم پر بڑے فخر سے نیکی سمجھ کر کی جا رہی تھی چنانچہ لکھنے والوں کی تحریروں میں اس زمانۂ تاریک کی سیاہی صاف نظر آتی ہے جو اس زمانے کے یورپ پر چھائی ہوئی تھی جولیس سیزر بیان کرتا ہے کہ جنگی قیدیوں کو کاہنی دیوتاؤں کی خوشی کے لیے زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ ایسی قربان گاہیں عام تھیں جہاں اُن کی نظر میں ملزم انسانوں کو سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا اور خود کاہن اس

---

* حاجی بلڈنگ، حسن علی آفندی روڈ، کراچی ۲، پاکستان

لنڈاؤ سے لطف اُٹھاتے۔ برطانیہ پر قبضہ کرنے کے بعد رومی کاہنوں نے یہی سلوک یہاں کے لوگوں سے بھی کیا۔

کاہن پرست اپنی وحشیانہ رسموں اور مذہب کے نام پر قتل و غارت کے لیے مشہور تھے۔ اس لیے ان ہی کے دور سے تعلق رکھنے والے ایسے جسم کا ملنا جسے وحشیانہ انداز میں موت پر مجبور کیا گیا، اس امر کو واضح کرتا ہے کہ لنڈاؤ مین کسی کاہن پرست معاشرے سے تعلق رکھتا تھا اور کسی نہ کسی وجہ سے اسے قربان کر دیا گیا۔ سب سے تعجب خیز بات پھر بھی یہی رہ جاتی ہے کہ لنڈاؤ مین نے کسی قسم کی مزاحمت کیوں نہ کی اور سکون سے موت کو کیوں کر گلے لگا لیا۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے کہ لنڈاؤ مین نے موت کو اس طرح کیوں کر قبول کر لیا کہ گویا اس کی بھی یہی خواہش تھی، ہمیں ان شہادتوں پر غور و فکر کی ضرورت ہے جو اس ضمن میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔

لنڈاؤ مین کا تندرست و توانا جسم اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ نہ تو غلام تھا اور نہ ہی کسان۔ جنگجو معاشروں میں (جو یورپ کے وحشیانہ دور کا طرۂ امتیاز تھے) اعلیٰ طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو زیادہ سے زیادہ جنگجو صفت ہوں۔ اس لیے اگر لنڈاؤ مین غلام یا کسان نہ تھا تو وہ اعلیٰ طبقے کا کوئی جنگجو ہو سکتا ہے لیکن اسے جنگجو قرار دینا بھی ممکن نہیں۔ اس بات کی کوئی نشانی نہیں ملتی کہ وہ کبھی لڑائی میں شریک ہوا ہو۔ اس کے بازوؤں میں وہ قوت اور سختی موجود نہیں جو لڑاکوؤں کے جسم میں ہوتی ہے۔

لنڈاؤ مین کا جسم ظاہر کرتا ہے کہ وہ نہ تو غلام تھا اور نہ ہی سپاہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یا تو وہ گویا تھا یا شاعر یا پھر پادری۔

لنڈاؤ مین کے شاعر ہونے کا امکان ان وجوہات پر کم ہے کہ اوّل تو اس کے ہاتھوں اور ناخنوں میں وہ سختی بھی موجود نہیں جو آلاتِ موسیقی استعمال کرنے سے پیدا ہو جاتی ہے

دوم اس کاہن پرست معاشرے میں شاعر کو مذہبی قربانی کی بھینٹ چڑھانا پسند نہ کیا جاتا تھا۔ اب آخری صورت یہی رہ جاتی ہے کہ وہ خود بھی کسی نہ کسی طرح کا کاہن ہی تھا یا مذہبی رہنما

کاہنوں کے بارے میں بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں جن میں مبالغہ بھی شامل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کاہن پرست دنیا میں وہ ایک طاقتور مذہبی اور سیاسی قوت کے طور پر موجود تھے۔ بالخصوص برطانیہ میں ان کی قوت سب سے زیادہ تھی۔ کاہن بننے کے لیے بیس برس تک تعلیم و تربیت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ بہت کچھ رٹنا پڑتا تھا۔ نیز انتہائی پر صعوبت آزمائشوں اور مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا لیکن کاہن بن جانے کے بعد اعلیٰ طبقۂ اشرافیہ میں اہم مقام حاصل ہو جاتا۔

لنڈاؤ مین کو ایک کاہن قرار دینے میں ہچکچاہٹ اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ اس کی عمر بے حد کم تھی۔ اگر تربیت کا آغاز سات یا آٹھ سال کی عمر میں بھی ہوا ہو تو موت سے پہلے اس کا کاہن بن جانا مشکل تھا۔ چنانچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کسی قسم کی ناکامی کی سزا رہی ہو۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شاعر تھا یا پادری لیکن وہ قربانی کے لیے بہترین سمجھ کر چنا گیا۔ اس کا جسم ہر لحاظ سے بے داغ تھا اور صحت بھی اس قابل تھی کہ مختلف رسوم کے صدمے سہہ سکتی۔ ایک ایسا جسم اس دور میں قربانی کے لیے بہترین تھا

لنڈاؤ مین کے آخری کھانے پر تحقیق

لنڈاؤ مین کے بارے میں بہت سی باتوں کی تردید یا تصدیق اس کھانے کے مطالعے سے بھی ہو سکتی ہے جس کی باقیات غذائی نالی میں موجود ہیں۔ یقیناً یہ اس کا آخری کھانا تھا۔

لنڈاؤ مین کی غذائی نالی میں موجود غذائی آثار کا تجزیہ گورڈن ہلمین اور ٹم ہولڈن نے کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اثریات سے ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق لنڈاؤ مین کا آخری کھانا ایسے اناج پر مشتمل تھا جس میں دانے

اور مجوسی دونوں شامل ہوں۔ اسے کوئی عمدہ شے کھانے کو نہیں دی گئی تھی بلکہ کسی رسمی کارروائی کو پورا کرنے کی غرض سے کچھ کھانے کو دیا گیا تھا جو غالب امکان ہے کہ جلی ہوئی روٹی کا ٹکڑا تھا۔

ماہرین اثریات کی دوسری ٹیم نے اس سلسلے میں مزید تحقیق کی اور جدید ترین تکنیک ایجاد کر کے حیرت انگیز باتیں دریافت کیں کوئنز میری کالج لندن سے تعلق رکھنے والی اس ٹیم کے رکن ڈون روبن نے گورڈن اور ہولڈن کی مدد سے آخری کھانے پر حرارتی تحقیق کی۔ چنانچہ یہ بات سامنے آئی کہ اناج کے پسے ہوئے دانوں کو مختصر وقت کے لیے تقریباً ۲۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک پکایا گیا۔ کچھ حصے کو تو ۴۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک حرارت ملی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ دراصل وہ ایک روٹی تھی جو خاص اسی مقصد کے لیے پکائی گئی اور اس قدر حرارت دی گئی کہ روٹی جل گئی۔ برطانیہ میں کاہنی دور کی ایک ماہر مس این روز کا کہنا ہے کہ اس دور میں موسمی تہوار منائے جاتے تھے۔ ان تہواروں پر دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے انسانوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں اور قربانی سے پہلے ایسے انسانوں کو جلی ہوئی روٹی کا ٹکڑا کھلانا رسم کا حصہ تھا۔

قدیم رسوم کے متعلق جو معلومات دستیاب ہیں، ان کے مطابق اچھی فصل کاٹ لینے کے بعد برطانیہ کے کاہن پرست ایک تہوار مناتے تھے جس کا نام "بلیٹن ے ایو" تھا۔ لنڈاؤمین کی موت جن کیفیات میں واقع ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی قربانی ایک نہیں بلکہ تین دیوتاؤں کے حضور پیش کی گئی گویا ایک تیر سے تین شکار کھیلے گئے۔ تین دیوتاؤں کے لیے ایک انسان کو بے رحمی سے قربان کر دیا گیا یہ تھے ٹوٹیٹس، ایسس اور ٹیوناڈس جو سیلٹوں کے تین بڑے دیوتا تھے۔

دستور تھا کہ ٹوٹیٹس دیوتا کے حضور قربانی پیش کرنے کے لیے انسانوں کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ ایسس کی خوشنودی گلا کاٹنے میں تھی اور ٹیوناڈس تب خوش ہوتا تھا جب کسی کو پانی میں غرق کر کے مارا جائے۔ لنڈاؤمین کے جسم پر ان تینوں قسم کی قربانیوں کے آثار ہیں۔

لنڈاؤمین کے معدے سے باقی اشیاء کے ساتھ آکاس بیل کے اثرات بھی ملے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کاہنوں کی مذہبی رسوم کا شکار بنا۔ آکاس بیل کو اس دور میں مقدس ترین پودا سمجھا جاتا تھا اور مذہبی رسوم میں اس کا استعمال کلیدی اہمیت رکھتا تھا۔

لنڈاؤمین کے جسم اور کھانے دونوں سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ایک نوجوان پادری تھا جو کاہنوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس نے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لیے سکون و اطمینان کے ساتھ موت کا سامنا کیا۔ یقیناً یہ حقیقت اسے نہ صرف مغرب کی نظر میں بلکہ تمام دنیا کی نظر میں ایک ایسا مظلوم انسان ظاہر کرتی ہے جسے ضمیر کی آواز سننے پر سزائے موت دے دی گئی۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجالس بھی پھیکی ہے مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

مستقل

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۲ (فروری ۱۹۸۹ء)

ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی مسائل

محمد یسین*

اے خاصۂ خاصانِ رسل، وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

مولانا حالی نے ۱۸۵۷ء کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی ابتری اور سیاسی بدحالی کا جو عبرتناک نقشہ اپنی لافانی تصنیف "مدوجزر اسلام" میں کھینچا ہے، وہ آج بھی ہمارے لیے اہم ہے۔ یوں تو مغلیہ حکومت کے خاتمہ سے پہلے ہی ہندوستانی مسلمانوں کا معاشی شیرازہ بکھرنے لگا تھا لیکن غدر کے بعد یہ احساس عام ہونے لگا کہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور انگریزوں کی جابرانہ پالیسی کے تحت ان کے لیے باعزت زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ دلی سمیت تمام شمالی ہند میں مسلمان زمینداروں، جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں ہوئیں۔ ان کی ریاستیں ضبط کی گئیں اور انہیں دربدر ٹھوکریں کھانے کے لیے مجبور کیا گیا۔ امرا، رؤسا اور شرفا بھی ذلیل و خوار ہوئے اور ان کی اولاد روٹی کے لیے محتاج ہونے لگی۔ مایوسیوں اور ذلتوں کی گھنگھور گھٹاؤں کے باوجود سرزمین علی گڑھ سے قوم کے محسن اعظم سرسید احمد خاںؒ نے لٹے ہوئے کارواں سے خطاب کیا اور پھر ان کے حالات کا جائزہ لے کر انہیں عملی جدوجہد کے لیے آمادہ کیا۔ انگریزوں سے ٹکر لینے کے بجائے مصالحت، برادرانہ کے شانہ بہ شانہ چلنے کے لیے تعلیمی میدان میں کوشش اور سیاسیات سے دور رہ کر اپنی حالت سدھارنے کا جذبہ سرسید نے ہی پیدا کیا۔ علی گڑھ تحریک کے باعث مسلمانوں میں نہ صرف عام بیداری پیدا ہوئی بلکہ انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ اگر انھوں نے بروقت تدابیر نہ کیں تو وہ تاریخ کے دھارے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے دوران مسلمان معاشی طور پر حسب ذیل طبقات میں منقسم تھے:

۱۔ نوابین، جاگیردار و زمیں دار اور اعلیٰ سرکاری و فوجی افسران
۲۔ فوج، پولس، عدالت کے علاوہ ضلع و تحصیل کے چھوٹے سرکاری ملازمین۔
۳۔ شہروں میں تجارت پیشہ، اہل حرفہ اور کارخانہ دار
۴۔ دیہاتوں میں چھوٹے زمیں دار اور کاشتکار
۵۔ کارخانوں اور کھیتوں کے معمولی مزدور
۶۔ مفلس و نادار، فقیر و قلندر۔

اس دوران میں سیاسی انقلابات آتے رہے۔ سرسید کی مصالحتی پالیسی کی بدولت اگر ایک طرف انگریز کچھ مہربان ہوئے تو دوسری طرف مسلمان قومی دھارے سے الگ ہونے لگے۔ انگریزوں کے "لڑاؤ اور راج کرو" کے فارمولے کے بدولت ملک میں ہندو مسلمان سیاسی، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ انگریزی مداج میں مسلمان ہر اعتبار سے برادران وطن سے پیچھے تھے لیکن وہ ملی غیرت کے باعث خود کو دوم درجہ کے شہری تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔

* پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف انگلش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مگر تقسیم ہند نے بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی خود اعتمادی کو زبردست چوٹ پہنچائی۔ پاکستان بن جانے کے بعد زمین داروں، سرمایہ داروں، اعلیٰ افسروں اور مسلم دانش وروں کے ایک بڑے طبقے نے اپنی قوم کے غریب، مجبور اور بے سہارا لوگوں کو الوداع کہا اور ملک کی سرحدوں کو پار کر کے نئے دیار میں مستقل مہاجر بن گئے۔

آزاد ہندوستان میں اگرچہ دستور نے جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کی بنیاد پر ایک نئے جمہوریہ کو جنم دیا جس میں تمام شہریوں کو بنیادی اور جائز حقوق کی یقین دہانی کرائی گئی لیکن عملاً مسلمان دوم درجہ شہری ہو گئے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند تھے اور فوج اور پولس میں بھی ان کی نمائندگی برائے نام رہ گئی۔ پرائیویٹ سیکٹروں ملازمتوں میں تعصب اور جانب داری برتی گئی اور پبلک سیکٹر کی اسامیوں کی بحالی میں بھی کچھ زیادہ انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اب صورت حال اس قدر مایوس کن نہیں جیسا اب سے بیس سال پہلے تھا لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی حالت کو کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں کہہ سکتے۔ آزاد ہندوستان کے چالیس برسوں میں مسلمانوں نے معاشی طور پر کیا ترقی کی ہے اس کے سرکاری اعداد و شمار نہیں ملتے البتہ مقامی و علاقائی ایجنسیوں سے جو اطلاعات بہم ہو سکی ہیں ان سے کچھ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

سرکاری نوکریاں اب یونین پبلک سروس کمیشن، ریاستی کمیشن، اسٹاف سلیکشن کمیشن، ریلوے کمیشن، بنک وبیمہ کمیشن کے مقابلہ جاتی امتحانات وانٹرویو میں کامیابی کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔ مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے ہونے کی وجہ سے ان امتحانوں میں اچھی تعداد میں شریک نہیں ہو پاتے جو شریک ہوتے ہیں ان کی تیاری اچھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے لیے بھی محنت اور لگن کے ساتھ سرمایہ کی ضرورت ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو دلّی، الہ آباد، کلکتہ، بمبئی اور حیدرآباد کے کوچنگ سنٹروں کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں؟ ادھر حکومت نے اقلیتوں اور پسماندہ اقوام کے لیے کچھ تربیتی مراکز قایم کیے ہیں لیکن ان سے ابھی تک خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہو سکے ہیں۔

[illegible]

گزشتہ سات آٹھ برسوں سے قایم ہے جس کے لیے گورنمنٹ ڈھائی لاکھ روپیہ دیتی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۰ء تک جب سینٹر کے مہتمم اور اساتذہ اعزازی طور پر خدمات انجام دیتے رہے نتائج کافی حوصلہ افزا رہے لیکن گزشتہ آٹھ سال کے ریکارڈ پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یونیورسٹی میں فیکلٹی آف لا اپنے طور پر جو کچھ کر رہی ہے وہ قابل تعریف بھی ہے اور لایق تقلید بھی۔ گزشتہ چند برسوں سے یو۔پی، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان کی عدلیاتی ملازمتوں (JUDICIAL SERVICES) میں مسلم یونیورسٹی کے امیدواروں نے دوسرے مراکز کے امیدواروں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس سے امید بندھتی ہے کہ اگر یونیورسٹی اپنے لایق طالب علموں کی صحیح تدریس و تربیت کے ذریعے ہمت افزائی کرے تو دوسری ملازمتوں میں بھی نتائج اچھے ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ ملازمتوں کے سلسلے میں یہ شکایت عام طور پر سننے میں آئی ہے کہ تحریری امتحانوں میں اچھے نمبر حاصل کرنے کے باوجود انٹرویو میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا۔ اگر یہ حقیقت بھی ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم مقابلے کے امتحانوں میں شرکت کا خیال چھوڑ دیں۔ حکومت اپنے طور پر مسلم قائدین کی مدد سے اقلیتی پروگرام چلانا چاہتی ہے لیکن اگر اس کے لیے مخصوص رقم، فضائی معائنہ اور فائلوں کے لیے رپورٹ تیار کرنے پر صرف کر دی جائے تو قصور اپنا ہی ہے۔ ہمارے نام نہاد رہنماؤں پر اکبر الہ آبادی کا یہ شعر آج بھی صادق آتا ہے ؎

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج صاحب کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

بڑی ملازمتوں کے سلسلے میں تو ایک حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ میں مقابلہ کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن چھوٹی نوکریوں کو حاصل کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ہر جگہ سفارش اور رشوت کی گرم بازاری ہے۔ اب یہ بات کھلے خزانہ کہی جا رہی ہے کہ بیشتر اسامیوں پر تقرری کے لیے نذرانہ مقرر ہے۔ اس طوائف الملوکی کے دور میں ہندو مسلمان نوجوان بھی

[illegible]

ہجرت کرتے ہیں۔ اپنی پسپائی کے بعد خستہ حالی ہو جاتے ہیں۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم سے بے توجہی، تعلیمی معیاروں اور نمونوں پر مشتمل تعلیمی پروگراموں اور انتظامیہ کی بدعملی سے ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ مستقبل قریب میں بیروزگاری کا مسئلہ حکومت اور سماج کے لیے زبردست خطرہ بن سکتا ہے۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ہماری ذراعتی یونیورسٹیاں اپنے محکمہ کے حاکم اور افسر زیادہ پیدا کر رہی ہیں، بہ نسبت ان لوگوں کے جو دیہاتوں میں جا کر کسانوں کے شانہ بہ شانہ کام کر سکیں یا ان کی رہنمائی کر سکیں۔ میڈیکل کالجوں سے فارغ التحصیل ڈاکٹر شہروں میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں اور دیہات کی طرف رخ کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ حالیہ سروے کے مطابق ایک نرس پر تین ڈاکٹروں کا تناسب ہماری تعلیمی پالیسی کے مضمرات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

اعلیٰ درجہ ڈگری حاصل کرنے والے ڈاکٹروں، انجینیروں، تجارتی انتظامیہ کے ماہروں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سفید پوشوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے اور انھیں کھپانے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے اختیار کیے جا رہے ہیں لیکن کھیتوں، کارخانوں، دفتروں، اسپتالوں، اسکولوں میں باصلاحیت کام کرنے والوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ بیروزگاری کا اژدہا ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے بچن کی آڑ میں لیے ہوئے ہے۔ روزگار دفتروں کے چکر لگاتے لگاتے پھر مایوس ہو کر گھر بیٹھ جاتے ہیں، کچھ خودکشی سے بھی دریغ نہیں کرتے لیکن اکثریت اب غیر سماجی عناصر کے ساتھ روابط قایم کرنے لگی ہے۔ ملک میں جس پیمانے پر اسکول اور کالج کھلے ہیں اور گوشے گوشے میں نئی یونیورسٹیاں قایم ہوئی ہیں اس تناسب سے روزگار کے ذرائع نہیں پیدا ہوتے ہیں۔ ماہرین معاشیات کے سرکاری اعداد و شمار سے نہ تو غریبی دور ہو سکی ہے اور نہ پست اقوام (جن میں مسلمانوں کو بھی شریک کر لینا چاہیے) کی حالت سدھر سکی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی حالات کا سرسری جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزادی کے بعد زمیندار اور جاگیردار تو بالکل ختم ہو گئے ہیں لیکن اعلیٰ سرکاری اور فوجی ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ۱٪ یا ۲٪ سے زیادہ نہیں رہ گیا ہے۔ عدلیہ اور پولیس محکموں کی چھوٹی ملازمتوں اور ضلعوں، تحصیلوں اور بلاکوں کی نوکریوں میں مسلمان خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ گنتی کے چند مسلمان سرمایہ دار، تاجر اور صنعت کار کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے ہندوستان میں ٹاٹا، برلا، سنگھانیہ کا تصور ہی محال ہے۔ البتہ بوہرہ اور میمن برادری ایک حد تک تجارت میں کامیاب ہے۔ قصبات میں چھوٹے کارخانہ دار اور اہل حرفہ اپنے میدان میں روٹی روزی کے لیے محتاج نہیں ہیں۔ مرادآباد، بریلی، سہارنپور، فیروزآباد، آگرہ، کانپور، بنارس، گورکھپور، ٹانڈہ اور مئو میں مسلمان کاریگر آبائی پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ مشرقی اور جنوبی ریاستوں میں بھی چھوٹے کاریگر نسبتاً بہتر ہیں۔ ان کے علاوہ مسلمان بڑھئی، دھوبی، نائی، معمار، سنار، قصاب، کنجڑے اور حلوائی نچلے متوسط طبقے میں دیہات کے کھیت مزدوروں کے مقابلے میں خوش حال کہے جا سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں عام طور پر مسلمان چھوٹے کاشتکار یا کھیتی مزدور ہیں۔ ایک تو ان کے پاس زمین بہت کم ہے اور جو ہے وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہے۔ دوسرے ان میں لاگت کے اعتبار سے پیداوار بھی کم ہوتی ہے۔ مانسون اگر اچھی ہے تو کچھ امید بندھتی ہے، ورنہ لگان اور بیج کھاد کی قیمت چکانے کے لیے قرض لینا پڑتا ہے۔ کچھ علاقوں میں شہروں و قصبات کے قریب کسان پھل اور سبزیوں سے اچھی آمدنی پیدا کر لیتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ شہری علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت معمولی مزدوری، رکشہ ٹھیلہ چلانے، چوکیداری یا اس قسم کے دوسرے کاموں میں مصروف نظر آتی ہے۔ یہ مسلمانوں کا جاہل طبقہ ہے جس کی حالت معاشی اعتبار سے تسلی بخش نہیں کہی جا سکتی۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان لوگوں کی ہے جو بالکل مفلس یا معذور ہیں یا خاندانی گداگر ہیں۔ یہ لوگ مزاروں، خانقاہوں اور خیراتی اداروں کے ارد گرد نظر آتے ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ دکھ اور افسوس اس وقت ہوتا ہے جب ہم ریلوے پلیٹ فارموں، بس اڈوں، بازاروں اور میلوں میں "اللہ کے نام پر" بھیک مانگنے والے مسلمانوں کو عجیب و غریب حلیوں میں دیکھتے ہیں۔

یہ سرسری جائزہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ

اعلیٰ و اوسط طبقہ کے ۱۰٪ لوگوں کو چھوڑ کر عام مسلمانوں کی معاشی حالت خستہ اور غیر تسلی بخش ہے۔ اس ابتری کے اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم محض "تاریخی جبریت" کے ہی شکار نہیں بلکہ ایک حد تک خود بھی اپنی پست حالی کے لیے ذمہ دار ہیں۔

۱۔ مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ والدین تعلیم کو محض روزگار کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ایک پڑھا لکھا معمار، بڑھئی، لوہار یا کاریگر ایک جاہل سے بہتر کام کر سکتا ہے، جہاں تربیتی ادارے قائم ہیں اور سرٹیفکیٹ یا ڈپلوما کورس کی سہولتیں موجود ہیں، وہاں بھی مسلمان خال خال ہی نظر آتا ہے

۲۔ مسلمانوں کی صوبائی یا مرکزی سطح پر کوئی ایسی تنظیم نہیں جو علاقہ وار اعداد و شمار فراہم کرے اور اس کی روشنی میں حکومت یا دوسرے اداروں سے فلاحی اسکیموں کے نفاذ پر غور کرے۔

۳۔ آج کی دنیا مقابلے اور اپنی بقا کے لیے جد و جہد کی دنیا ہے مسلمان عام طور پر محنت سے کتراتا اور مقابلے سے گھبراتا ہے۔ مقابلہ میں ناکامی بھی ہوتی ہے اور رسوائی کا بھی سامنا ہوتا ہے لیکن اگر خدا پر بھروسہ کر کے محنت کی جائے تو کامیابی ناممکن بھی نہیں۔

۴۔ مسلم اوقاف ملت کی امانت ہیں۔ کروڑوں روپے کی جائیداد سے جو آمدنی ہوتی ہے اس کا استعمال لازمی طور پر قومی فلاح بہبود کے لیے نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں ترویجی دیوا استھان کی طرح کوئی ایسا ادارہ نہیں جو اوقاف سے خاطر خواہ فائدہ پہنچا سکے۔

۵۔ ہندوستانی مسلمان بے جا اسراف میں اپنا جواب نہیں رکھتے شہروں اور قصبوں میں رہنے والے مسلمان تاجر یا کاریگر ہوں یا دیہاتوں کے غریب کسان و مزدور، سبھی شادی بیاہ اور تقریبات پر اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں۔ اندھی تقلید میں ایسے رسومات ہمارے یہاں علم [illegible] کی بدولت محنت کی کمائی کا [illegible] برباد ہوتی ہے قرض تک لینے کی نوبت آجاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ برادری کے دباؤ اور فرسودہ رسومات سے جلد چھٹکارا ممکن نہیں لیکن تعلیم یافتہ نوجوان بھی کچھ تعمیری اقدامات نہیں کرنا چاہتے۔

۶۔ یہ بات اخبارات میں برابر شائع ہوتی رہتی ہے کہ جو لوگ ہندوستان سے باہر سعودی عرب یا خلیجی یا افریقی ممالک میں ملازمت کے لیے جاتے ہیں وہ اپنی توقعات سے زیادہ کما لیتے ہیں لیکن عموماً مسلمان اس آمدنی سے نہ تو کوئی ٹھوس کاروبار شروع کرتے ہیں اور نہ کوئی جائداد خریدتے ہیں۔ اس کے برخلاف وہ اپنی محنت کی کمائی شادی بیاہ کی بیجا نمائش میں پھونک کر دوبارہ عرب جانے کے لیے کھیت اور دکان بھی رہن رکھ دیتے ہیں۔
ہم نے مشرقی یوپی اور مغربی بہار میں یہ منظر دیکھا ہے کہ جب یہ نوجوان کیمرہ، ٹرانسسٹر، ٹیپ ریکارڈر، لوٹا، ان جیسی فضول چیزوں سے لدے پھندے اپنے گاؤں یا قصبے واپس آتے ہیں تو دوسروں پر بڑا رعب پڑتا ہے۔ لیکن چند ہی مہینوں کے بعد جب کیمرہ کے فلم اور ٹیپ ریکارڈر کی بیٹری کا خرچ کمر توڑنے لگتا ہے تو پھر سامان تعیش کی نیلامی کی نوبت آنے لگتی ہے۔

مسلمانوں کی معاشی حالت سدھارنے میں مسلمان سیاسی رہنما علمائے دین، دانشور اور سرمایہ دار سبھی تعمیری رول ادا کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے سیاسی رہنما وہ کردار نہیں ادا کر رہے ہیں جو مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی یا مولانا حفظ الرحمٰن کا طرۂ امتیاز تھا۔ ذرا سکھ رہنماؤں کو دیکھیے وہ کئی اعتبار سے بدنام سہی مگر اپنے فرقے کے لوگوں کی مالی حالت سدھارنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہتے ہیں علمائے دین اگر اپنی مجالس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر زور دیں اور بے جا اسراف کی طرف توجہ دلائیں تو یقیناً کچھ بہتری کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔ مسلمان دانشور بھی حالات کا جائزہ لینے اور اپنی قوم کے لوگوں کو جائز حقوق دلوانے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ مسلمان سرمایہ داروں میں خدمت کا وہ جذبہ نہیں پایا جاتا جو مارواڑیوں اور پارسیوں کا خاصہ ہے۔ بہرحال ہم نہایت خلوص سے چند امور کی طرف

ارباب حل وعقد، مسلم قائدین اور زعماے دین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی معاشی حالت سدھارنے کے لیے صوبائی اور مرکزی تنظیم کی اشد ضرورت ہے۔ اگر ہم کوئی اقتصادی کمیٹی بنا سکیں تو اس کے ذریعے سبھی جائز وسائل مثلاً زکوٰۃ، عشر، صدقات اور عطیات سے مال ورقوم حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ مقامی، علاقائی اور ریاستی پیمانہ پر مسلمانوں کے معاشی حالات کا جائزہ لے کر انہیں موزوں کاروبار کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے انہیں کچھ مالی امداد دی جاسکتی ہے

۳۔ غریب اور نادار مسلمان طالب علموں کے لیے کچھ وظیفے مختلف اداروں کے ذریعے دیے جاتے ہیں۔ مگر یہ ناکافی ہے اگر مسلم یونیورسٹی کی "ڈیولپمنٹ سوسائٹی" کی طرح پورے ملک میں ایک تحریک چلائی جائے اور مستحق و ذہین طالب علموں کی مالی امداد کی جائے تو آئندہ نتائج بہتر ہو سکتے ہیں۔ پیشہ ورانہ تربیت گاہوں میں بھی ان کے لیے کچھ سہولتیں بہم کی جاسکتی ہیں۔

۴۔ مسلم اوقاف کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ اس سے مختلف اداروں میں کئی ادارے چلائے جاسکتے ہیں جنوبی ہند میں عبدالحق مرحوم کی کوششوں سے کئی اسکول اور کالج قایم کیے گئے ہیں۔ کرناٹک، آندھرا پردیش اور تمل ناڈو میں تربیتی ادارے بھی کھولے جارہے ہیں۔ شمالی ہند میں ایسے کاموں کے لیے بہت گنجایش ہے

۵۔ اگرچہ اچھوتوں اور دوسری پست اقوام کی طرح مسلمانوں کے لیے ملازمتوں میں ریزرویشن ممکن نہیں ہے لیکن ریاستی اور ضلعی سطح پر ضابطوں میں کچھ لچک پیدا کر کے انہیں مناسب نمائندگی دی جاسکتی ہے۔ انٹرویو کے موقع پر انصاف اور فراخ دلی سے کچھ کام بن سکتا ہے۔

۶۔ فوج، پولس اور نیم فوجی ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد ان کے تناسب سے بہت ہی کم ہے۔ مسلمان لیڈر متعلقہ افسران سے رابطہ قایم کر کے کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اب تک کوئی خاص پیش قدمی نہیں کی گئی ہے۔ آسام رائفلز کی بھرتی میں کچھ مسلمان ضرور لیے گئے ہیں لیکن یو۔پی اور بہار پولس میں مسلمانوں کو زیادہ موقع ملنا چاہیے۔

۷۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بیشتر ملازمتیں ایسی ہیں جہاں برائے نام بھی مسلمان نظر نہیں آتے۔ ممکن ہے اعلیٰ تعلیمی صلاحیت یا پیشہ ورانہ تربیت نہ ہونے کے باعث یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی تعصب اور اقربا پروری کا ماحول ہے۔ مارواڑیوں، جینیوں، ٹاٹاؤں اور برلاؤں پر ہمارا کوئی بس تو نہیں چل سکتا، البتہ گورنمنٹ ہمارے لیے کچھ مراعات کی سفارش کرسکتی ہے۔

۸۔ آج کل صنعت و تجارت کے فروغ و ترقی کے سارے اختیارات اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کو حاصل ہیں۔ قومیائے ہوئے بینکوں سے لے کر ان تمام کارپوریشنوں میں مسلمان ڈائرکٹر شاید ہی کہیں نظر آتے ہیں۔ یہاں ہم پھر حکومت سے رجوع کرسکتے ہیں کہ ہمیں ان بورڈوں میں نمائندگی دی جائے

۹۔ ہندوستان ایک جمہوری، سوشلسٹ اور سیکولر ملک ہے۔ اگر ملک میں پیداواری صلاحیت بڑھتی ہے تو اس دولت میں ہمارا بھی حصہ ہے لیکن تقسیم کی نابرابری سے ہم انکار نہیں کرسکتے۔ ہندوستان کا غریب ہندو مسلمان طبقہ ملک کے نیم سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کا شکار ہے۔ یہاں ہمیں ان سیاسی اور سماجی جماعتوں سے رابطہ بڑھانے کی ضرورت ہے، جن کے ساتھ مل کر ہم اپنے جائز حقوق حاصل کرسکتے ہیں۔

۱۰۔ مجلس مشاورت اور مجلس اتحاد المسلمین جیسی تنظیموں کو اپنا دائرہ عمل وسیع کرنا چاہیے۔ ان کی بدولت مسلمانوں میں کچھ سیاسی بیداری پیدا ہوئی ہے اور اپنے تشخص کا احساس بھی بڑھا ہے لیکن معاشی میدان میں

بھی ان سے ہماری کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ موقع بہ موقع یہ انجمنیں حکومت وقت کو مسلمانوں کی طرف سے یادداشتیں (Memorandum) پیش کر سکتی ہیں۔

۱۱۔ مسلمانوں کی معاشی بہتری کے لیے معاشرتی اصلاح بھی بہت ضروری ہے۔ گھروں میں کفایت شعاری، بچوں کی صحت و تعلیم کی طرف توجہ، فضول رسومات سے پرہیز اسی قدر لازم ہے جس قدر عام زندگی میں سخت محنت، جد و جہد، جفاکشی اور مقابلے کی اسپرٹ پیدا کرنا ہے۔ تساہل، تشکیک، مایوسی اور خود ترسی ایسے روگ ہیں جن کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جو اپنی مدد خود کرتا ہے اسے تائید غیبی بھی حاصل ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے۔

• •

" ہماری قوم نے تعلیم کی طرف سے جس کی اس زمانے میں حد سے زیادہ ضرورت ہے اور اس زمانے میں وہی ایک ذریعہ اقبال مندی اور دولت مندی کا ہے، یک لخت توجہ ہٹالی ہے اور خود اپنے تئیں ایسا نالائق کر دیا ہے کہ کسی کام کے لائق نہیں رہے ہیں۔ جن لوگوں کی اقبال مندی اور عروج روز افزوں پر ہم رشک کرتے ہیں وہ تو ایک زمانے میں ہم سے بھی کم درجے پر تھے۔ ہم سوئے وہ جاگے۔ ہم بیٹھے وہ کھڑے ہوئے۔ ہم کھڑے ہوئے وہ چل نکلے۔ ہم چلے وہ دوڑ گئے۔ پس وہ آگے بڑھ گئے، ہم پیچھے رہ گئے۔ اگر ہم کو کچھ مانگنا ہے یا کچھ شکایت کرنی ہے تو ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اول اس کے ملنے کے لائق ہو جائیں جس کو مانگتے ہیں۔ اول ہم اپنے تئیں اس شکایت کے لائق کر لیں جس کی شکایت کرتے ہیں۔"

سر سید احمد خاںؒ

طائر لاہوتی

ریاض الدین احمد*

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(علامہ اقبال)

ہر سال موسم خزاں کے شروع ہوتے ہی چالیس لاکھ سمندری چڑیاں شمالی یورپ کے ساحل پر ایک ایسے عمل سیاحی کے لیے اکٹھا ہو جاتی ہیں جو سیاحت کی تاریخ میں ایک عجوبہ ہے۔ کون سا داعیہ انھیں اس عظیم سفر کے لیے آمادہ کرتا ہے اور کون سی جبلت انھیں بلا خطا ٹرستان ڈاکیونھیا (Tristan Da Gunnia) کے دور افتادہ حسین ترین جزیروں پر جو جنوبی اٹلانٹک میں واقع ہیں، پہنچا دیتی ہے اور کون سا علم انھیں کمال صحت مندی کے ساتھ جائے قیام تک پہنچانے کا ضامن ہوتا ہے فکر انسانی ابھی تک اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

یہ سفر سائبیریا، شمالی امریکہ اور یورپ سے شروع ہو کر انٹارکٹکا کے کنارے تک یعنی قطب شمالی سے قطب جنوبی تک ۲۴ گھنٹہ روزانہ کی پرواز کے حساب سے آٹھ مہینے میں پورا ہوتا ہے۔ فاصلہ تقریباً پچیس ہزار کیلو میٹر ہے۔ اس سیاحی کے پیچھے کسی باوثوق تاریخ سیاحی کا ذخیرہ موجود نہیں ہے مگر ماہرین کا خیال یہ ہے کہ اس عمل کی ابتدا دس ہزار سال قبل مسیح کے اختتام پر ہوئی ہوگی پہلا دور جو سائنس کی روشنی میں ہے تین سو پچاس ملین سال قبل واقع ہوا تھا۔ خیال ہے کہ جب برف پگھل کر شمال کی طرف روانہ ہونے لگی ہوگی، اس وقت کچھ چڑیوں نے اڑ کر کسی بہتر جائے قیام و طعام کی طرف جانے کا ارادہ کیا ہوگا۔ چڑیوں کا ایک باعزم جھنڈ قسمت آزمائی کے لیے کمربستہ ہو گیا ہوگا۔ کچھ پیچھے بھی رہ گئے ہوں گے اور کچھ نے راہ سفر میں ساتھ چھوڑ دیا ہوگا۔ بہتر موسمی حالات واپس آنے پر انھوں نے مرکز کی طرف سفر کرنا مناسب سمجھا ہوگا۔

ڈارون کے نظریے کے مطابق چڑیوں کا وہ کمزور طبقہ جو سفر کی ہمت نہیں رکھتا تھا، پیچھے رہ گیا ہوگا۔ یہ طبقہ رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا ۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

تجزیے سے پتہ چلا ہے کہ چڑیوں کا رحیل سفر ہونا اور واپس آنا بدلے ہوئے ٹمپریچر کے مطابق ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ موسم بہار میں چڑیوں کے جنسی غدود ریڈیائی روشنی کی وجہ سے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے انھیں موسم بہار میں عملیات جسمانی کو تیز کرنا پڑتا ہے۔

ان کوائف کے باوجود بہت سے سوالات ایسے ٹیڑھے ہیں کہ ان کے جواب سے سائنس قاصر ہے۔ مثلاً:

۱۔ تقریباً آدھی تعداد ان چڑیوں کی ایسی ہے جو قافلہ سفر

---

* رٹائرڈ پرنسپل۔ جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل یو۔پی۔ جنرل سکریٹری مائی ناریٹیز ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز ایسوسی ایشن

مقا فریک نہیں ہوتی اور مقامی حالات سے مطابقت قبول کرلیتی ہے۔

۲۔ باوجود ناقابل تسخیر سردی کے بعض چڑیوں نے جن میں سفید الو اور آئی وری گل - ۱۷۵۴) (Gullemot شامل ہیں، ترکِ وطن کا ارادہ نہیں کیا اور سرد خوابی میں مبتلا ہونا پسند کیا۔

۳۔ قافلۂ سفر اس قدر سختی سے وقت کا پابند ہے کہ جان لیوا بھوک اور سردی میں حادثہ، اموات کے باوجود اپنے مقررہ وقت سے پہلے سفر کا ارادہ نہیں کرتا۔

۴۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ غذائی سامان کی کثرت کے باوجود ان کی اڑان وقت مقررہ پر ضرور شروع ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پرندوں کے جسم کے اندر تعین اوقات کے لیے قدرت نے کوئی گھڑی نصب کردی ہے جو سائنس دانوں کے حدودِ فہم سے باہر ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا داعیہ نہ صرف غذا ہے نہ سردی سے تحفظ۔ پھر داعیہ کیا ہے؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔ ان کی سیاحی کا مزید کمال صرف پابندی اوقات نہیں ہے، بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ہر سال انھی گھونسلوں میں بسیرا لیتی ہیں جن کو پچھلے سال چھوڑ کر گئی تھیں۔

قدرت کے یہ کرشمے اہلِ سائنس کے سامنے عقدۂ لاینحل بنے ہوئے ہیں۔

ماخوذ

اقلیت کی صورتِ حال کا تقاضہ ہے کہ اس کا ہر فرد اپنی بقا، خوش حالی اور پیش رفت کے لیے اکثریت کے افراد سے کہیں زیادہ محنت کرے اور بحیثیت ہندوستانی شہری کے خود کو کہیں زیادہ لائق اور کارگزار ثابت کرے۔ ہماری یونیورسٹی کے ہر مسلمان استاد اور طالب علم کا یہ پیدائشی فرض ہے، جو اس فرض سے کوتاہی کرے گا، وہ اگر استاد ہے تو گمراہ اور گمراہ ساز کہلائے گا اور اگر طالب علم ہے تو نا خلف اور کپوت گردانا جائے گا۔"

(سید حامد)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۲ (فروری ۱۹۸۹ء)

نظامِ اعداد کا تاریخی اور وجدانی ارتقاء

مرتضیٰ قادری*

ا۔ تاریخی ارتقاء

کارخانۂ قدرت عجائبات سے بھرپور ہے۔ اعداد اور ان کی خصوصیات بھی کچھ اتنی عجیب و غریب ہیں کہ انسان تہذیب کے ابتدائی عہد سے آج تک اُن میں دلچسپی لیتا چلا آیا ہے۔ آسمانی صحیفوں اور دینی خطبات میں بھی اکثر اعداد کے تعلق سے بڑے بڑے حکیمانہ نکات کی تشریح کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی سورۃ المدثر میں آیا ہے،

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ

[اس پر (دوزخ پر) انیس داروغہ ہیں]

ایک جگہ خطبۂ "ابنِ نباتہ" میں آیا ہے،

اللہ واحد لا بالعدد

[اللہ ایک ہے لیکن عدد نہیں ہے]

یہاں عدد سے مطلب ایک۔ دو تین۔ ۔ ۔ وغیرہ شمار میں کام آنے والے نظامِ اعداد سے ہے۔ آخر یہ عدد ہیں کیا؟ عربی لغت میں عدد کی تعریف اس طرح کی گئی ہے

العددُ نصفُ مجموعِ الحاشیتین

[عدد اپنے بازو (دائیں اور بائیں) کے مجموعہ کا آدھا ہوتا ہے]

جیسے تین اپنے بازو کے اعداد دو اور چار کے مجموعہ چھ کا آدھا ہے مگر اس طرح کی کسی بھی تعریف میں کئی مشکلات اور ابہام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا تعریف میں کسی عدد کو سمجھنے کے لیے بازو کے اعداد کو سمجھنا پہلے ضروری ہے۔ اسی طرح عدد "ایک" کے دائیں بازو پر کیا عدد ہے؟ شاید اسی لیے جرمنی کے مشہور ریاضی داں لیوپولڈ کرونیکر (Leopold Kronecker - 1823 - 1891) نے تسلیم کیا کہ

"اعداد کو اللہ نے پیدا کیا باقی انسان کا کام ہے"

دراصل اعداد کا تصور اتنا پرانا ہے کہ اس کی ابتدا کی تلاش ممکن ہی نہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسان نے شروع میں کنکر اور پتھر کے ٹکڑوں یا تنکوں کو گنتی کے بطور استعمال کیا ہوگا۔ مثال کے طور پر غار یا کشتی سے باہر نکلنے والے ہر مویشی کے لیے ایک ایک پتھر رکھتے گئے اور جب جانوروں کی چراگاہ سے واپسی ہوئی تو شمار کیے گئے ڈھیر میں سے ایک ایک پتھر ہر ایک جانور کے لیے الگ کرتے گئے۔ اگر کچھ پتھر بچ گئے تو یہ سمجھ لیا گیا کہ اتنے جانور جنگل میں ہی رہ گئے۔ پھر شاید مختلف قسم کی

---

* ریڈر، شعبہ ریاضیات - اے ایم یو - علی گڑھ

آوازوں سے شمار کرنے کا کام لیا جاتا رہا۔ آج بھی چند قبائل میں ڈھول اور تاشوں کی آواز سے دشمن کی تعداد اپنے آدمیوں کو بتانے کا طریقہ رائج ہے۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا اور جیسے جیسے لکھنے کا شعور انسان میں آتا گیا، گنتی کے لیے کچھ نشانات متعین ہوتے رہے۔ آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ کم سے کم ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح مصر میں اعداد کو تصویروں سے ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ کافی زمانہ گزرنے کے بعد روم میں حروف سے اعداد کو ظاہر کرنے کا دلچسپ طریقہ رائج ہوا جس کا کہیں کہیں استعمال (جیسے دیوار کی گھڑی کے ڈائل پر) آج بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ بعض اعداد کے لیے مخصوص حروف کی مثال حسب ذیل ہے:

۱	I	۶	VI	۵۰	L
۲	II	۷	VII	۱۰۰	C
۳	III	۸	VIII	۱۰۰۰	M
۴	IV	۹	IX		
۵	V	۱۰	X		

اس طرزِ تحریر میں دقت یہ تھی کہ بڑے بڑے اعداد کو لکھنے اور حسابی عمل میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا جیسے

MMCMLVIII ۲۹۵۸

یا

MMMMCCCXXXIX ۴۳۳۹

اعداد کو لکھنے کے ساتھ ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کس گنتی کو اساس (Base) بنایا جائے۔ الگ الگ زمانہ اور الگ الگ تہذیب میں الگ الگ گنتی سے اساس کا کام لیا گیا۔ زیادہ تر ۵ ۔ ۱۲ ۔ اور ۲۰ ایسے اعداد ہیں جن کے اساس ہونے کے نمونے آج بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے ایک فٹ میں ۱۲ انچ۔ گھڑی میں ۱۲ گھنٹے۔ سال میں ۱۲ مہینے یا قدیم پونڈ میں ۱۲ شلنگ اور ہر شلنگ میں ۱۲ پنس ۔ اسی طرح ایک گھنٹے میں ۶۰ منٹ۔ ہر منٹ میں ۶۰ سکنڈ وغیرہ۔ لیکن سب سے زیادہ مروج اساس ۵ کا رہا ہے۔ کیونکہ ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں سے گننے کا کام بآسانی لیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح ارتقا کی کئی منازل طے کرنے کے بعد ہند و ریاضی دانوں نے اعشاری نظام

چارٹ ۱

اعداد کو ظاہر کرنے کے دو قدیم نمونے

تقریباً ۵۰۰ قبل مسیح کی ایک مقدس عبارت۔ جس کا مفہوم ہے خاقان بادشاہ نے ہرپون جھیل کے ملک کے ۰۰۰ آدمیوں کو ...

تقریباً ۳۴۰۰ قبل مسیح کے ایک برتن پر منقش مصری اعداد

لاادکیا جس میں ہندوؤں ہاتھوں کی دس انگلیوں کو دس مختلف نشانات سے منسلک کیا گیا جنکو ہم صفر۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ سات آٹھ۔ نو کہتے ہیں۔ اعداد کا یہ نظام ہندوستان سے بغداد پہنچا، جہاں عربوں نے انھیں تہذیب سے کیا۔ تقریباً بارہ سو سال قبل یہ نظام مغرب کو متعارف ہوا اور ہندو عربی نظام اعداد کے نام سے مشہور رہا۔ اب ریاضی داں انھیں "ہندو عربی ہندسے Hindu Arabic Numerals" کہنے لگے انگریزی میں ان دس اعداد کو شاید انگلیوں کی ہی مناسبت سے (Digits) کہتے ہیں۔

ان ہندسوں کے لیے آج جو دس نشانات

0, 1, 2, 3, 4, 5, 6, 7, 8, 9

یا

۰، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹

مروج ہیں۔ یہ بھی کافی بنتے سنورتے رہے انسان کی نکھری ہوئی شکل تقریباً سولہویں صدی عیسوی میں متعین ہوئی۔ ان ہندسوں کی مختلف شکلوں کا مختصر خاکہ چارٹ ۲ سے واضح ہو سکتا ہے

THE DEVELOPMENT OF THE DIGITS

ہندسوں کا ارتقاء

— = ≡ ۲ ۲ | ۶ ۲ ۲ ۲

Brahmi (برہمی)

۱ ۲ ۳ ۴ ۵ | ۶ ۷ ۸ ۹ ۰

Indian (Gwalior)

ہندوی (گوالیار)

१ २ ३ ४ ५ | ६ ७ ८ ९ ०

Sanskrit Devanagari (Indian)

ہندوی (سنسکرت دیوناگری)

1 2 3 4 5	6 7 8 9

Westarabic (Gobar)

مغربی عربی

۱ ۲ ۳ ۴ ۵	۶ ۷ ۸ ۹ ۰

Eastarabic

مشرقی عربی

1 2 3 4 5	6 7 8 9

11 Cent (Apices)

گیارہویں صدی

1 2 3 4 5	6 7 8 9 0

پندرہویں صدی عیسوی

1 2 3 4 5	6 7 8 9 0

سولہویں صدی عیسوی

1 2 3 4 5 6 7 8 9 10

عہد حاضر

0 1 2 3 4 5 6 7 8 9

بیسویں صدی عیسوی

کمپیوٹر سے

? ?

اکیسویں صدی عیسوی

۲۔ وجدانی ارتقاء

۲-۱ فطری اعداد

NATURALS NUMBERS

ہماری روز مرہ کی زندگی میں سب سے زیادہ ضرورت اشیاء کو گننے سے پڑتی ہے اور یہ عمل ہم فطری طور پر ہوش سنبھالتے ہی سیکھنے لگتے ہیں۔ اسی لیے گننے کے کام میں آنے والے اعداد ۱، ۲، ۳، ...... وغیرہ فطری اعداد کہلاتے ہیں۔

ان فطری اعداد کو دو مختلف زاویۂ نگاہ سے دو دو گروپوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(ا) جفت اور طاق اعداد

وہ اعداد جو ۲ سے تقسیم ہو جاتے ہیں جفت (EVEN) اعداد کہلاتے ہیں جیسے ۲، ۴، ۶، ۱۶، ۴۰۔ باقی اعداد طاق (ODD) اعداد کہلاتے ہیں جیسے ۱، ۳، ۵، ۹، ۲۳ وغیرہ

(ب) مفرد اور مرکب اعداد

عدد 1 کے ماسوا ہر وہ عدد جو کسی دیگر عدد سے تقسیم نہ ہو سکے، مفرد عدد (Prime Number) کہلاتا ہے جیسے ۲، ۳، ۵، ۱۱، ۱۳، ۴۷ وغیرہ باقی تمام اعداد مرکب اعداد یا غیر مفرد Composite Numbers کہلاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں۔

(i) عدد 1 مفرد نہیں ہے

(ii) صرف عدد ۲ ہی ایسا مفرد عدد ہے جو جفت بھی ہے۔ باقی تمام مفرد اعداد طاق ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ۲ کے سوائے تمام جفت اعداد مرکب ہیں۔

(iii) ہر مرکب عدد کے مفرد اجزائے ضربی یکتا (UNIQUE) ہوتے ہیں۔ البتہ ان کی ترتیب بدلی سکتی ہے۔ جیسے

۵ × ۳ × ۵ = ۵ × ۵ × ۳ = ۷۵

۴۲ = ۷ × ۳ × ۲ = ۷ × ۳ × ۲ = ۲ × ۳ × ۷ = ...

اگر دو فطری اعداد کو جوڑیں تو اُن کا مجموعہ ایک فطری عدد ہی ملتا ہے اسی طرح دو فطری اعداد کا حاصل ضرب بھی فطری عدد ہی آتا ہے۔ جیسے

۲ + ۴ = ۶ ، ۳ + ۸ = ۱۱ ، ۹ + ۲ = ۱۸

اعداد کی اس خصوصیت کو ہم خاصیت بندش ۔ Closure Property کہتے ہیں۔

۲۰۲ صحیح اعداد

اوپر ہم نے دیکھا کہ دو فطری اعداد کا جوڑ یا ضرب کا حاصل فطری عدد ہی ہوتا ہے لیکن یہ صورت گھٹانے کے عمل میں نہیں رہ پاتی۔ مثال کے طور پر (۳−۳) یا (۵−۷) فطری اعداد نہیں ہیں۔ لہذا ضرورت پڑی کہ فطری اعداد کے نظام کی توسیع ہو۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہندو ریاضی دانوں نے صفر کا اور اٹلی کے لوگوں نے منفی اعداد کا تصور پیش کیا اور اس طرح ان نئے اعداد کو فطری اعداد کے ساتھ شامل کرکے صحیح اعداد (Integers) کا سیٹ حاصل ہوا جو حسب ذیل ہے۔

..... −۴ −۳ −۲ −۱ ۰، ۱، ۲، ۳، ۴ .....

۲-۳ اعداد ناطق

صحیح عدد کا سیٹ جوڑ۔ گھٹاؤ اور ضرب کے اعمال کے تحت تو بند ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ کسی صحیح عدد کو ہر صحیح عدد سے تقسیم کرنے پر صحیح عدد ہی مل جائے۔ مثال کے طور پر ۳ کو ۵ سے یا ۴ کو ۶ سے تقسیم کرنے پر ہم صحیح اعداد نہیں پاتے ہیں۔ اسی خامی کو پورا کرنے کے لیے ناطق اعداد (Rational Numbers) کی ضرورت پڑی۔

کوئی ناطق عدد $\frac{a}{b}$ کی ساخت کا ہوتا ہے، جہاں a اور b کوئی صحیح اعداد ہیں لیکن b ≠ 0 جیسے $\frac{۲}{۳}$ وغیرہ

ناطق اعداد کی تعریف سے یہ بات واضح ہے کہ ہر صحیح عدد بطور ناطق عدد بھی ہوتا ہے کیوں کہ ۲ = $\frac{۴}{۲}$ ، $\frac{۷}{۱}$ = ۷ وغیرہ

۲۰۴ اعداد کا اعشاریوں میں اظہار

اعداد کو ظاہر کرنے کا ایک بہت ہی کارآمد طریقہ اعشاری عبارت (Decimal Expression) کا ہے جیسے ۰٫۵ ، ۲٫۳ ؛ ۷٫۷۷۷.... وغیرہ

اعشاری عبارت کی سب سے مفید بات یہ ہے کہ $\frac{۱}{۲}$ ، $\frac{۳}{۶}$ اور $\frac{۴}{۸}$ ایک ہی ناطق عدد کی کئی ساخت ہیں۔ جب کہ اس عدد کی اعشاری عبارت صرف ۰٫۵ ہی ہے۔

اعشاری عبارتیں دو اقسام کی ہوتی ہیں۔

(الف) مختتم اعشاریہ ۔ Terminating Decimal جیسے ۰٫۵ ، ۲٫۱۳۴۱ وغیرہ

(ب) غیر مختتم یا لا متناہی اعشاریہ (Non-Terminating or Infinite) جیسے ۲٫۳۱۴۰۳۰۰۰ ، ۷٫۳۳۳۳۰۰۰ وغیرہ

جو اعشاریے مختتم نہیں ہوتے ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں:

(i) تکراری اعشاریہ (Recurring Decimal) R

یہ وہ لا متناہی اعشاریے ہوتے ہیں جن میں ہندسوں کا کوئی سیٹ بار بار آتا ہے۔ جیسے

۷٫۳۳۳.... ، ۲۳۱٫۱۲۵۱۲۵.... وغیرہ

ان تکراری اعشاریوں کو لکھنے کا آسان طریقہ تکرار کرنے والے ہندسوں پر ایک خط کھینچ کر ظاہر کرنے کا مروج ہے۔ جیسے مندرجہ بالا اعشاریوں کو مختصراً $۷٫\overline{۳}$ اور $۲۳۱٫\overline{۱۲۵}$ لکھا جاتا ہے۔

(ii) غیر تکراری اعشاریہ Non-Recurring Decimal

ظاہر ہے جو لا متناہی اعشاریے تکراری نہیں ہوتے انہیں غیر تکراری کہتے ہیں جیسے ۵٫۷۴۳۴۲....

۲۰۵ حقیقی اعداد

وہ تمام اعداد جو کسی بھی طرح کی اعشاری عبارت

سے ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔ حقیقی اعداد (Real Numbers) کہلاتے ہیں۔ ان میں مختتم اور تکراری اعشاریوں میں ظاہر ہونے والے اعداد ناطق اعداد (Rational Numbers) اور غیر تکراری لامتناہی عبارتوں سے ظاہر ہونے والے اعداد غیر ناطق (IRRATIONAL) اعداد کہلاتے ہیں۔ ناطق اعداد کی طرح غیر ناطق اعداد کو دوسری شکلوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے $\sqrt{2}$ ، π ، e وغیرہ

متعلقات

۱۔ دیکھیے چارٹ نمبر ۱

۲۔ بعض محققین اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ یہ تمام ہند سے ہندوستان کی ایجاد ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندسہ 'ہندو' سے نہیں بلکہ "وادیٔ فارس" سے مناسبت رکھتا ہے

۳۔ ہندوستان کی سب سے اہم ایجاد صفر کی تسلیم کی جاتی ہے۔ جس کے بغیر اعشاری نظام نامکمل اور بے معنیٰ سا رہ جاتا۔ صفر کب ایجاد ہوا یہ بتانا تو بہت مشکل ہے۔ البتہ اب تک کے ملے ثبوت کے مطابق ٥ یا صفر سب سے پہلے "گیولیار" کے ۸۷۶ سن عیسوی کے ایک قلمی نسخے میں لکھا ملتا ہے۔ دراصل اس نسخہ میں ۵۰ اور ۲۷۰ دونوں اعداد کو صفر کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

۴۔ چوں کہ عربی ہندسوں میں پانچ کو ۵ سے ظاہر کرتے ہیں، لہٰذا صفر کو ۰ سے ظاہر کرتے ہیں۔

"آج جس چیز کی وجہ سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے، جس نے ہماری طاقت کو بالکل گھٹا دیا ہے، جس کی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی، جس کی وجہ سے مخالفین کو ہم پر شماتت کا موقع ملا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف و اتفاق کو اصلی حدود پر نہیں رہنے دیتے۔"

(علامہ شبلی نعمانی)

تعصب

محمد مختار اصلاحی*

عربی زبان میں تعصب کا لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس کا ہوبہو ترجمہ اردو زبان میں مشکل ہے۔ اردو لغت میں اس کے معنی بے جا حمایت، رعایت، طرف داری، ہٹ دھرمی اور ترجیح کرنے کے ہیں۔

امتحان کی چند کاپیاں جانچنے کے لیے آپ کے پاس آئیں آپ کو یہ معلوم ہوا کہ اس میں فلاں نمبر کی کاپی آپ کے کسی عزیز کی ہے جانچنے پر آپ کو یہ بھی پتہ چلا کہ آپ کا یہ عزیز ان طلبہ میں سب سے کمزور ہے پھر بھی آپ نے اپنے خاص تعلق کی رعایت سے اس کو نمبر سب سے زیادہ دیے۔ یہ رعایت اور بے جا طرف داری بھی تعصب ہے۔

ڈی۔ ایل صاحب کو ایک انٹرویو لینے کا موقع ملا جس میں ہر مسلک و مذہب کے امیدوار شریک تھے لیکن انہوں نے اس میں صرف اپنے ہم مذہب کا انتخاب کیا جب کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ اس جگہ کے لیے اس سے زیادہ باصلاحیت و لائق امیدوار موجود تھے۔ جس غلط جذبے کے تحت انھوں نے حق و انصاف کا خون کیا اس کا نام بھی تعصب ہی ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ لعنت آج کم و بیش ساری دنیا میں عام ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس خطرناک بیماری کا بڑا زور ہے۔ جس طرف نظر اٹھایئے مختلف ناموں اور بدلی ہوئی شکلوں میں ہر طرف موجود ہے۔ اب تو اس کی بہت سی قسمیں ہو گئی ہیں جن میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مذہبی تعصب، قومی تعصب، لسانی تعصب، نسلی تعصب، علمی تعصب، سیاسی تعصب، وطنی تعصب، صوبائی تعصب، علاقائی تعصب، پیشہ ورانہ تعصب، فرقہ دارانہ تعصب اور اونچ نیچ کا تعصب وغیرہ وغیرہ۔

تعصب کسی طرح کا بھی ہو انسانیت و شرافت، اتحاد و اتفاق، یک جہتی و رواداری، خوش حالی اور ترقی سب کا دشمن ہے۔ جس فرد میں، جس جماعت میں، جس گھر میں، جس بستی میں، جس ملک میں اور جس قوم میں یہ بیماری موجود ہو، اس کا زوال یقینی ہے۔

ملکی فوج میں بھرتی کے وقت تنگ نظر سلکشن کمیٹی نے تعصب کی بنا پر صرف ان لوگوں کو منتخب کیا جن کو وہ چاہتی تھی۔ یہ انتخاب قابلیت و صلاحیت کی بنا پر نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے ایسی فوج کمزور ہوگی اور ہر محاذ پر شکست کھائے گی۔ کھلاڑیوں کے انتخاب میں جہاں بے جا طرف داری و تعصب کی کارفرمائی ہوتی ہے اور اچھے کھلاڑیوں کو صرف تعصب کی بنا پر ٹیم میں شامل نہیں کیا جاتا وہ ٹیم مقابلہ میں ہر جگہ ناکام رہتی ہے اور ملک کی رسوائی کا باعث بنتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مذہبی، لسانی، وطنی اور صوبائی تعصبات نے ہزاروں گھر برباد اور لاکھوں بے گناہوں کی جانیں لی ہیں۔ جس شخص میں تعصب کا زہر سرایت کر جاتا ہے اس کو وہ جنونی اور پاگل بنا دیتا ہے۔ اسی طرح جس آنکھ پر تعصب کی عینک لگی ہو اسے

---

* اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی، مہاراشٹر۔

حق و ناحق اور نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی۔

دنیا کے تمام مذاہب نے تعصب کو بُرا کہا ہے اور رواداری اور یک جہتی پر زور دیا ہے۔ اپنے آخری حج کے موقع پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے جو پیغام نشر فرمایا تھا اس میں بھی یہی روح کارفرما تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ:

"اب کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے اور نہ گورا کالے سے۔ سارے ہی انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنائے گئے۔ سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔"

اس اعلان کا منشا و مقصد یہی تھا کہ ایک ایسا صاف ستھرا معاشرہ وجود میں آئے جس کی بنیاد نیکی، پرہیزگاری، انصاف و احسان، محبت و بھائی چارگی اور آزادی و مساوات پر ہو، تاکہ نفرت و تعصب کو آگے بڑھنے و پھیلنے کا موقع نہ مل سکے۔

تعصب کا علاج کچھ بہت آسان نہیں ہے۔ یہ عموماً جہالت، غلط ماحول، تعلیم و تربیت کی خرابی، زہر بھری تاریخی کتابوں اور فساد انگیز لٹریچر کے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تعصب کو ختم کرنے کے لیے پہلے ان اسباب کو جو اسے جنم دیتے ہیں ختم کرنا ہوگا۔ ماحول اگر صحیح نہ ہو اور وہاں ہمیشہ نفرت کے بیج بوئے جاتے ہوں، تعلیم و تربیت دینے والے خود اپنے دلوں میں کینہ و کپٹ رکھتے ہوں، تاریخی کتابوں میں صحیح تاریخی حقائق کے بجائے غلط بیانی سے کام لیا جائے، مخرب اخلاق اور فتنہ انگیز مضامین کی بے باکانہ اشاعت ہوتی رہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر ایسے پروگرام پیش کیے جائیں جو بغض و نفرت کو بڑھانے والے ہوں تو تعصب کو کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تعصب سے نجات پانے کے لیے ماحول کا پاک صاف ہونا انتہائی ضروری ہے۔ ماحول کو بہتر بنانے میں بلاشبہ حکومت وقت کی ایک اہم ذمہ داری ہے لیکن عوام کی ذمہ داری بھی کچھ کم نہیں۔ دوسروں پر الزام رکھنے کے بجائے اگر اپنے گریبان میں جھانک کر خود اپنی اصلاح کی جائے تو یہ سب سے بہتر ہے جو وقت اور محنت دوسروں کو کھینچنے و گرانے میں ہم صرف کرتے ہیں اگر وہ اپنی اور اپنے بھائیوں کی اصلاح و سدھار میں لگادیں تو اس کے نہایت بہتر اور خوش گوار نتائج برآمد ہوں گے۔

بچوں کو تعصب سے پاک رکھنے میں ماں باپ کا کردار بہت اہم ہے۔ ہم اگر گھر میں بیٹھ کر کسی کو بُرے الفاظ سے یاد کریں گے یا اس کے خلاف کوئی سازش رچائیں گے تو گھر کے بچے بھی اس کو اپنا مخالف سمجھ کر اس سے تعصب برتیں گے۔ مذہبی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے کے لیے بے سروپا الزامات ایک دوسرے پر عائد کیا کرتے ہیں اور ایسے غیر مہذب و رکیک الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کو سن کر دلوں میں حقارت و نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر یہی جذبہ تعصب کو ہوا دیتا ہے۔

یاد رکھیے! گھر اور باہر کا ماحول اگر پاکیزہ ہو، رواداری، خیر سگالی، باہمی اخوت و ہمدردی کا چلن عام ہو تو پھر تعصب کو جگہ پانے کا موقع نہیں ملتا۔

"ہماری رسم و راہ جو دوستوں سے ہے اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح پر نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں، بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا امر ضروری ہے۔"

سر سید احمد خاںؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۲ (فروری ۱۹۸۹ء)

رنگِ حیوانات

علی رضا خاں

ہر شخص جانوروں کے مختلف رنگوں کو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ خصوصاً علم حیاتیات (Biology) کے طالب علموں کے لیے جانوروں کے مختلف رنگ باعث دلچسپی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رنگوں کی حیثیت قدرتی ترکیب تطابق — (Adaptation) Scheme of Nature) میں ایک جز و خاص کی ہے۔ لیکن یہ بھی قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ جانوروں کے تمام رنگ اسی ترکیب و نظام کے ماتحت ہیں۔ بہت سے رنگ اس قسم کے نہیں ہوتے کہ نظریہ افادیت (Utility) کی رو سے ان کی کوئی وجہ سمجھ میں آسکے پرانے زمانے کے ارباب فطرت (Naturalists) جانوروں کی انواع و اقسام مرتب کرنے میں رنگ کی کوئی اہمیت تصور نہیں کرتے تھے۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کیڑوں، پرندوں اور پھولوں کے مختلف رنگ صرف انسان کو محظوظ کرنے کے لیے ہیں یا فطرت کے کچھ نامعلوم اور پوشیدہ قوانین ان کے ظہور کا باعث ہیں۔

لیکن ڈارون (Darwin) کی معلومات نے ہمارا نظریہ اس بارے میں بدل دیا۔ اس نے صاف طور پر بتا دیا کہ کچھ رنگ تو جانوروں کے لیے مفید ہیں اور کچھ ضرر رساں، وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ بہت سے خوش نما رنگ انتخاب جنسی (Sexual Selection) کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے اس کا یہ اصول کہ جانوروں کے بہت سے قدیمی خواص (Fixed Characters) قانون افادیت (Law of Utility) کے اثر سے ظہور پذیر ہوئے اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ رنگِ حیوانات جو کہ ان کی انواع و اقسام کے علیحدہ علیحدہ ترتیب دینے میں معاون ثابت ہوتا ہے (Survival of the Fittest) بقا اور تفوق کے اصول پر ہی پیدا ہوا ہوگا۔ گذشتہ چالیس پچاس سال کے سائنس دانوں کے مشاہدات اور تجربات نے اس نظریہ کو ثبوت کے درجہ پر پہنچا دیا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ اور اہم نظر آنے لگا ہے۔ وہ مختلف اطوار و طرائق جن کی بدولت جانوروں کا رنگ ان کے لیے مفید ہو بہت زیادہ ہیں۔ بلکہ یہ ابھی تک تمام و کمال معلوم نہیں ہو سکے۔

قبل اس کے کہ ہم ان رنگوں کو تشریح کے ساتھ بیان کریں، اس بات کے بتا دینے کی ضرورت ہے کہ رنگ کی ماہیت کیا ہے۔ جس چیز کو ہم رنگ کہتے ہیں ہمارے دماغ اور عصبی ترتیب کی بناوٹ — (Constitution of Brain and Nervous System) کا ایک مظہر موضوعی (Subjective Phenomenon) اور معروضی حیثیت سے Objectively دیکھا جائے تو وہ روشنی کی مختلف امواج (Different wave lengths of light) کا نام ہے جن کا نام مختلف معارض سے انعکاس ہوتا ہے۔ ہر ایک چیز ایک نہ ایک رنگ کی ضرور ہوتی ہے کیوں کہ ہم کو نظر آنے کے لیے روشنی کی شعاعیں اس سے ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہیں۔ کچھ شعاعیں جذب ہو جاتی ہیں اور کچھ پلٹ آتی ہیں اور ان کا ہماری نظروں میں ایک خاص رنگ ہے یہ رنگ بعض اوقات نہایت شوخ ہوتا ہے اور چند پرندوں اور کیڑوں

اگر ان کا رنگ اسی وجہ سے ہوتا ہے۔

عام طور پر جنگلی جانوروں کا رنگ یکساں ہوتا ہے۔ پالتو
رنگ کے پیدا ہونے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو اجزائے رنگین کی قوتِ
جاذبہ (Absorption Power of Pigments) کی وجہ
سے اور دوسرے طبعی طور پر (Physically) اجزائے رنگین
جانور کی قریب قریب تمام ساخت میں موجود ہوتے ہیں۔ جسم کے صرف
سطحی حصے ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ اندرونی حصص (Parts)
میں بھی نظر آتے ہیں۔ بعض حالتوں میں رنگ کیمیائی مادوں (Chemi-
cal Substances) کی قوت جاذبہ کی وجہ سے جن سے
کہ بافت (Tissues) مرکب ہے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال
ہیموگلوبین (Haemoglobin) اور ہیموسائنین (Haemo-
cyanin) ہیں۔ ہیموگلوبین لوہے کا ایک مرکب ہے اور بڑی
دار جانوروں اور کچھ کیڑوں کا خون اسی کی موجودگی سے سرخ ہوتا ہے
ہیموسائنین اکٹوپس (Octopus) کے خون کو نیلا بنا دینے کا باعث
ہے۔ اجزائے رنگین صرف خارجی بھی ہو سکتے ہیں اور جانوروں کا جو رنگ
ایسی صورت میں ہوتا ہے وہ اس کو تنازع للبقا میں خاص مدد دیتا ہے
جسم کا وہ حصہ جس میں کہ اجزائے رنگین (Pigments) ہوتے
ہیں اور اس کے پھیلنے کی وجہ سے اندرونی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔
اس پھیلی ہوئی حالت میں کم نظر آتا ہے لیکن ریشوں کے سکڑ جانے کی
وجہ سے جب کہ اجزائے رنگین سطحی جانب پھیل جاتے ہیں، ہمیں آسانی
سے یہ حصہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

طبعی رنگ

رنگ کی دوسری حیثیت سطح کے کچھ ابھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے پیدا
ہوتی ہے۔ اس سطح پر بہت سی گہری اور بالمقابل لکیریں (Finely
incised parallel) ایک دوسرے کے قریب ہوتی ہیں۔ یہ
لکیریں اکثر ایک سے زیادہ اطراف میں بھی نمایاں ہوتی ہیں

چند کیڑوں اور تتلیوں کے پروں کی ناہموار اور ابھری
ہوئی سطح بھی ایسا اثر پیدا کرتی ہے۔ یعنی روشنی کی ایک شعاع کو اس
کے مفردات میں جن سے کہ وہ مرکب ہے تحلیل کر دیتی ہے۔ اس سے
قوس وقزح کا سا رنگ پیدا ہوتا ہے جس کو طیف (Spectrum)
کہتے ہیں اور جس کا مقابلہ یا توازن اس طیف سے کیا جاسکتا ہے جو کہ کسی
شعاع کے ایک منشور (Prism) میں سے گزرنے پر پیدا ہوتا
ہے۔ یہ طیف صرف ایک خاص زاویہ نظر سے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن
جوں جوں ہم زاویۂ نظر (Angle of Vision)
کو بدلتے جاتے ہیں اس میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک ٹراپکل
تیتری کا رنگ زاویہ نظر کے بدلنے سے نیلے رنگ سے لے کر سبزی مائل
نیلے رنگ تک معلوم ہو سکتا ہے۔ یا کبوتر کی گردن کا رنگ چمکدار سرخ
رنگ سے چمکیلے سبز رنگ تک بدل جاتا ہے۔

اصولی نظر سے وحشی جانوروں کی ہر ایک نوع
(Species) کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے لیکن گھریلو جانوروں
کی ایک ہی نوع مختلف رنگ کے افراد پر مشتمل ہو سکتی ہے جیسا کہ
ہم پالتو گھوڑوں، مویشیوں، کتوں، بلیوں، کبوتروں اور مرغیوں میں
دیکھتے ہیں۔ گھریلو یا پالتو اور وحشی جانوروں کی شرائط زندگی میں ہم
ایک اہم ترین فرق یہ پاتے ہیں کہ اول الذکر تو آدمی کی حفاظت اور
نگرانی میں رہتے ہیں اور آخر الذکر کو اپنی حفاظت اور نگرانی خود
کرنا پڑتی ہے

ماحول اور رنگ

اگر ہم جانوروں کے رنگ پر مجموعی حیثیت سے غور کریں تو سب
سے پہلا امر جو ہم کو اہم معلوم ہوتا ہے وہ ان کے رنگ کا اُن کے ماحول
سے تعلق ہے۔ شمالی خطہ (Arctic Region) کے رہنے والے
جانوروں کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ ریگستان کے جانوروں کا رنگ زرد
یا بھورا ہوتا ہے اور سبز رنگ صرف جنگلات میں عام ہے۔ اگر ان
باتوں پر ہم کچھ غور و فکر کریں تو ہمیں بہت اچھا مواد ان نظریوں پر
تنقید و تعریف کرنے کے لیے دستیاب ہو سکتا ہے۔ جو جانوروں کے
رنگوں کے بارے میں پیش کیے گئے ہیں۔

شمالی خطہ (Arctic Region) میں بہت سے جانوروں
کی ایک ایسی تعداد ہے جو کہ ہمیشہ سفید رہتے ہیں یا سفید رنگ سے

ملتے جلتے ہیں۔ یا موسم سرما میں سفید رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ
سفید رہنے والے جانور قطبی ریچھ، قطبی ہرن، امریکی قطبی خرگوش وغیرہ
ہیں اور ان جانوروں کی مثال جو کہ صرف موسم سرما میں سفید رنگ کے
ہو جاتے ہیں، شمالی خرگوش (Arctic hare) شمالی لومڑی
(Arctic Fox) ہیں۔ ہمیشہ سفید رہنے والے جانور
قریب قریب تمام سال برف ہی میں رہتے ہیں اور وہ جانور جن کا رنگ
بدل جاتا ہے ایسے خطے میں رہتے ہیں جہاں کہ موسم گرما میں برف
نہیں ہوتی۔ اس نوعیت رنگ کی وجہ حفاظت ہی معلوم ہوتی ہے جس کے
وسیلے سے وہ جانور جو کہ سبزی خور (Herbivorous —
Animals) ہیں اپنے دشمنوں سے بچے رہتے ہیں اور وہ
جانور جن کی خوراک گوشت ہے، اپنے شکار تک بغیر دکھائی دیے پہنچ
جاتے ہیں۔ بعض لوگ اور وجوہات بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ
آرکٹک خطہ (Arctic Region) کا سفید رنگ وہاں کے
جانوروں میں سفید ہی رنگ پیدا کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ
یا تو کسی ضیائی طریقے سے یا ان کی جلد میں کسی کیمیاوی تبدیلی کے اثر سے
ان کا رنگ سفید ہو جاتا ہے یا ہماری نگاہ کو کسی فعلِ اضطراری کے باعث
ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سفید رنگ
جانوروں کو آرکٹک خطہ کی سردی سے اس طرح بچاتا ہے کہ جانوروں
کے جسم کی گرمی باہر نکل کر ضائع نہیں ہوتی۔ پہلی وجہ تو اس عام نظریے
سے تعلق رکھتی ہے کہ معروض کا رنگ طبیعاتی حیثیت رکھتا ہے اور دوسری
وجہ صرف ایک خیال ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ ابھی تک یہ ثابت نہیں
ہو سکا کہ بالوں اور پروں کا سفید رنگ گرمی کی شعاعوں کو روکنے
میں کس حد تک مدد کرتا ہے۔ جانوروں اور ماحول کے رنگ میں زیادہ
تر تطابق اور التباس ریگستانی خطوں میں پایا جاتا ہے۔ شیر، اونٹ اور
تمام ریگستانی ہرنوں کے رنگ مثل ریت یا چٹان کے رنگ کے ہوتے
ہیں جن میں وہ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مصری بلی کا رنگ مثلاً یا
ریت کا سا ہوتا ہے۔

ریگستان میں نہ تو درخت، نہ جھاڑیاں اور نہ زمین جانوروں
کو ان کے دشمنوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ بلکہ گردونواح کے رنگ سے تطابق
ایک اہم اور ضروری چیز ہے۔ لہٰذا ہاں بغیر کسی استثنا کے پرندے چھوٹے
قسم کے دودھ پلانے والے جانور اور سانپ اور دوسرے رینگنے والے جانور ریت
کے ہم رنگ ہوتے ہیں۔ خطِ حارہ (Tropical Region)
کے ہرے ہرے جنگلوں میں پرندوں کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ طوطے عام طور
پر سبز رنگ کے ہوتے ہیں اور مشرق کی طرف بہت سے دیگر پرندے اسی
رنگ کے پائے جاتے ہیں۔ چند جانوروں کا رنگ تو اس قدر سبز ہوتا
ہے کہ درختوں کے گھنے پتوں میں چھپ جانے کے بعد وہ بالکل نظر نہیں
آتے۔

گردونواح کے ساتھ مطابقتِ رنگ کی ایک اور مثال گہرے
سمندر میں رہنے والے جانوروں کی ہے۔ پروفیسر موزلے نے برٹش
ایسوسی ایشن کے ایک لیکچر میں بیان کیا ہے کہ چند سمندری جانوروں
کی ایک خصوصیت ان کے جسم کی قطعی شفافیت ہے۔ یہ اس قدر مکمل
ہے کہ بعض مرتبہ وہ پانی کی سطح پر بہتے ہوئے قطعی دکھائی نہیں دیتے
جلد اعصاب عضلات اور دیگر حصے بالکل صاف اور شفاف ہیں لیکن
جگر اور آلات ہضم اکثر غیر شفاف یا زرد اور بھورے رنگ کے ہوتے
ہیں۔ بڑے جانور جو کہ پانی کی سطح پر تیرتے ہیں ہلکے نیلے رنگ کے ہوتے
ہیں اور سمندر کے رنگ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ سیاح پرندوں
کا رنگ اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ علم حیاتیات (Biology)
کے لحاظ سے رنگ حسب ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

لایعنی رنگ

چند رنگ وراثت میں ملنے کی وجہ سے قائم رہتے ہیں۔ ہم دیکھتے
ہیں کہ سمندر کی گہرائی اندھیرے میں چھپے رہنے کے باوجود چند جانوروں
کا رنگ اپنی اصلی حالت میں ہی رہتا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی واقع
نہیں ہوتی، نہ کسی قسم کے سیاہ دھبے پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی
اور تغیر ان کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے۔

چند جانوروں کے بالوں اور پروں کے سفید ہونے کی وجہ
یہ ہے کہ ان کی بافت میں وہ جگہ جو عموماً دانہ دار اجزائے رنگین سے پُر
ہوتی ہے ہوا سے بھر جاتی ہے اور وہاں سے روشنی کی شعاعوں
کا انعکاس ہوتا رہتا ہے۔

[illegible] رنگ ہوتے ہیں جو کہ بظاہر فعلیاتی ضرورت [illegible] اور [illegible] کے لحاظ سے مندرجہ ذیل عنوانات [illegible] تقسیم کیے گئے ہیں۔

۱۔ خود اختیاری رنگ
(الف) تحفظی رنگ
(ب) حملہ پرور رنگ
۲۔ لبھانے والے رنگ۔
۳۔ آگاہ کرنے والے رنگ
۴۔ شناخت کنندہ نشانات
۵۔ تذبذب والے رنگ
۶۔ جنسی رنگ

رنگ خود اختیاری وہ ہے کہ جب کسی جانور کا رنگ اس کے گرد و نواح کے رنگ سے مشابہ ہو جائے۔ اس کی مشابہت کی بدولت وہ اپنے دشمنوں سے بچا رہتا ہے یا اپنے شکار کو بغیر کسی تکلیف کے حاصل کر لیتا ہے۔ اول الذکر تحفظی رنگ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسرے کو حملہ پرور رنگ کہتے ہیں جیسا کہ قطبی لومڑی کا رنگ ہوتا ہے۔ ایک ہی نوع کے جانور دو طریق سے اختلاف پذیر ہو سکتے ہیں ۱۔ مقامی رنگ کی (Local Colour) حیثیت سے۔ ۲۔ موسمی رنگ (Seasonal colour) کی حیثیت سے۔

پہلی صورت میں تو ایک رنگ کی انواع بہت زیادہ حصوں میں مل سکتی ہیں۔ کیوں کہ جانور کا اصلی رنگ اگر خود اختیاری ہے تو زمین کے مختلف رنگوں سے تطابق پیدا ہو جانے کی وجہ سے مختلف ہو سکتا ہے۔ کچھ ٹڈوں کے (جن کے پچھلے پر بہت چمکدار قسم کے سرخ یا زرد ہوتے ہیں) اگلے پر نیچے کی طرف بہتے ہیں۔ تاکہ جس وقت وہ بیٹھیں تو پچھلے پر اُن کو اور باقی ماندہ جسم کو بھی چھپا سکیں اور اس طرح زمین کے رنگ سے مکمل تطابق پیدا ہو جائے۔ ان پرندوں میں جو کوہ بوہا کی سرخ زمین پر پائے جاتے ہیں، اگلے پر سرخی مائل بھورے ہوتے ہیں اور اس قسم کی انواع جو سمندر کے قریب پائی جاتی ہیں ہلکے بھورے رنگ کی ہوتی ہیں۔ تاکہ ریت کے رنگ سے بآسانی مشابہت ہو سکے۔

پرندوں اور دودھیلے جانوروں کی ایک بہت بڑی تعداد کا رنگ موسم گرما اور موسم سرما میں برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی ان کے ماحول کی مناسبت سے پیدا ہوتی ہے۔ ویسل کی کھال موسم سرما میں ایک بہت شاندار قسم کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ایک اوسط درجے کی تحریک جو کہ جانور کی کھال کے کچھ تھوڑے حصے کے رنگ کو تبدیل کر سکتی ہے، ممکن ہے کہ بڑھ کر اور زیادہ حصہ پر اثر کر سکے۔ لیکن درجہ حرارت کی تبدیلی حقیقتاً التباس و تطابق کے قائم رکھنے میں کوئی اثر نہیں رکھتی جیسا کہ یورپینی خرگوش کی جلد کا رنگ باوجود سردی کے زیادہ ہونے کے کبھی نہیں بدلتا۔

ماحول کے رنگ کے لحاظ سے جانوروں میں دو مختلف قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ تبدیلیٔ رنگ فعل اضطراری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جیسے جیسے جانور اپنی جائے وقوع بدلتا جاتا ہے، رنگ میں بھی تبدیلی واقع ہوتی جاتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں کہ تبدیلی رنگ صرف ایک مرتبہ ہی واقع ہوتی ہے اور اس کی وجہ کوئی فعل اضطراری یا فعل حسی (Sense Actions) نہیں بلکہ سطحی بافت کا براہ راست متاثر ہونا ہے۔ یہ اثر اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب کہ جانور کسی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو رہا ہو یا یہ کہ وہ منجوروپ اختیار کر رہا ہو۔ پہلی قسم کی مثال گرگٹ ہے جس کا رنگ اس چیز کے رنگ کے لحاظ سے جس پر کہ وہ بیٹھتا ہے سفید بھورا، زرد یا سبز ہوتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی اجزائے رنگین کے سکڑنے اور پھیلنے سے وقوع میں آتی ہے۔ عصبی حسیات کے باعث طرح طرح کے رنگ ظاہر ہونے لگتے ہیں، حالانکہ جلد کا رنگ عموماً ملگجا ہوتا ہے۔

دوسری قسم کی مثالیں بھل روپ اور منجوروپ ہیں جن کے رنگوں میں ماحول کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ٹی۔ ڈبلیو۔ووڈ نے ۱۸۶۶ء میں اس بات کو ثابت کر دیا کہ (Cabbage Butterflies) کے منجوروپوں کا رنگ ان صندوقوں کے رنگ کے مطابق، جن میں کہ وہ رکھے جاتے ہیں، ہلکا یا گہرا سبز ہوتا ہے۔

تتلیوں کے بارے میں اب ہم کچھ ذکر تحفظی رنگ کا کریں گے

جنوبی افریقہ میں چند درختوں کی چھال کا رنگ سفید یا چمکدار روپہلی ہوتا ہے اور بہت سی تتلیاں اور چھوٹے کیڑے اسی چمکدار سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ سفید رنگ ان کے تحفظ کا باعث ہوتا ہے کیونکہ ماحول سے ہم رنگ ہونے کی وجہ سے یہ کیڑے اور تتلیاں اپنے آپ کو چھپائے رکھتی ہیں۔ افریقہ کی تتلی ہمیشہ اپنے پروں کو سیکڑ کر بیٹھتی ہے چونکہ اُس کے پروں کا رنگ ماحول کے مطابق ہوتا ہے، لہذا وہ بہت مشکل سے نظر آتی ہے۔

دنیا میں بہت سی تتلیوں کا رنگ خشک اور مردہ پتیوں کا رنگ کی طرح ہوتا ہے۔ بہت سی تتلیاں بڑی اور رنگین ہوتی ہیں۔ ان کا رنگ نیلے قسم کا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ ان جگہوں پر بیٹھتی ہیں جہاں کہ خشک اور مردہ پتیاں سڑی ہوئی حالت میں پڑی ہوتی ہیں۔ ان کے پروں اور جسم کا رنگ ان جگہوں کے رنگ سے مناسبت لیے ہوئے ہوتا ہے ان کے رنگ میں گہرے بھورے رنگ سے لے کر زیتونی اور زرد رنگ تک تبدیلی ہوتی ہے۔ مشکل سے دو انواع ایک قسم کی ہو سکتی ہیں لیکن سب کا رنگ مردہ پتیوں کے مختلف رنگوں سے مطابقت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ تطابق و التباس اتنا مکمل ہوتا ہے کہ اگر ہم کسی ایک تتلی کو جھاڑی میں جاتے ہوئے دیکھ بھی لیں تو وہاں پہنچنے کے بعد قطعی طور پر نظر نہیں آتی۔

دریائی اور سمندری جانوروں میں بھی اسی قسم کا تحفظ بالکل مکمل ہوتا ہے۔ بہت سے کیکڑے اور جھینگے اپنے ماحول کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ بہت سے سرطان ہلکے نیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ چند مثالیں اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ زمین اور سمندر دونوں مقامات کے جانوروں کا رنگ تحفظی ہوتا ہے اور کیا تعجب ہے کہ بہت سی مچھلیوں کا رنگ بھی جو کہ بہت خوشنما ہوتا ہے۔ قدرت نے ایسا بنایا ہوتا کہ وہ اپنے ہم رنگ مونگے کی چٹانوں میں چھپ کر دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہیں۔

بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے جو کہ اپنے آپ کو ڈھونڈ نہیں پا سکتے وہ اپنے دشمنوں کے [illegible] ایک [illegible] [illegible] ہیں جن سے کہ [illegible] معلوم ہو اور ان کے [illegible]

ستا سکیں۔ یہ ہیئت صورت کے بدل جانے سے، عادت کی تبدیلی سے، یا رنگ کے دوسرے ہو جانے سے یا ان سب باتوں کے مجموعے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی ادنیٰ مثال چند تتلیوں کے پھل روپ ہیں ایک اور مثال (Royal Persian Moth) کے پھلدار ہیں جو کہ جنوبی امریکہ میں ہوتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ نارنجی ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کو چھوئیں تو یہ سیدھا ہو کر ایک طرف سے دوسری طرف کو ہلتا ہے۔ حبشی اس کو اتنا ہی مہلک تصور کرتے ہیں جتنا کہ سانپ کو۔ حالانکہ یہ بالکل غیر ضرر رساں ہے۔

لبھانے والے رنگ

ان کیڑوں کے علاوہ جو کہ ماحول کی ہم رنگی اور قطعا یتی کی وجہ سے حفاظت میں رہتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا رنگ ان کو دشمنوں کا آسانی سے شکار بنا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ اس قسم کے کیڑے بہت ہی کم ہیں۔ خاص طور سے مکڑیوں میں ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ فاربس (Forbes) نے جاوا کی ایک عجیب مثال بیان کی ہے جب کہ وہ جنگل میں تتلیاں پکڑتے پھر رہے تھے تو ایک جھاڑی کے قریب انھوں نے ایک تتلی کو ایک پرندے کے مردہ جسم پر بیٹھے دیکھا۔ انھوں نے اس کو آہستہ آہستہ جا کر پکڑ لیا اور یہ دیکھ کر کہ اس میں سے کچھ لیس دار مادہ نکل رہا ہے وہ بہت حیران ہوئے اور جب اُسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ حقیقت میں ایک مکڑی ہے مکڑیوں کی ایک اور نوع میں اسی قسم کا تحفظی رنگ ظاہر ہوتا ہے وہ کلیوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ ان کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ پیٹ کی شکل کلیوں کی طرح ہوتی ہے جن میں وہ بیٹھی رہتی ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ ان مکھیوں کو جو پھولوں پر آ کر بیٹھتی ہیں، پکڑ لیتی ہیں۔

ہندوستان کے بغیر پر کے مینٹس (Mantis) کی مثال اس سلسلہ میں عجیب و غریب ہے۔ یہ انڈا اصل میں ایک پھول کی شکل کا ہوتا ہے اور اسی قسم کا اس کا رنگ ہوتا ہے۔ اس کا بڑا اور گول پیٹ پھول کی پنکھڑی کے مشابہ ہوتا ہے اور پچھلی ٹانگیں [illegible] ہوتی ہیں اور پھول کی پنکھڑیوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔

یہ کیڑا بغیر حرکت کیے سبز پتوں پہ بیٹھا رہتا ہے جس کی وجہ سے
تتلیاں اور دوسرے کیڑے اس پر بیٹھ جاتے ہیں اور اسی طرح
اس کا شکار بن جاتے ہیں ۔

شناخت کنندہ رنگ

اگر ہم ان خوش رنگ اور چمک دار جانوروں کی زندگی اور
عادات و اطوار غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاص رنگ
ان کے جیت دور سے پہچانے جانے کا باعث بھی ہوتا ہے اور اس
طرح ان کی اجتماعی زندگی کا تحفظ بھی ہو جاتا ہے. کیوں کہ اس قسم کے
جانوروں میں کوئی اور جانور ایک دم سے نہیں جا سکتا۔ اگر یہ جانور
اجتماعی حالت میں رہیں تو اپنے دشمنوں سے بچے رہ سکتے ہیں مگر جب تنہا
ہوں تو بچنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔

ڈارون کہتا ہے کہ "اگرچہ خرگوش اپنے رنگ کی وجہ سے اپنی ہستی
کو چھپا سکتا ہے لیکن یہ اصولِ حفاظت منسلکہ انواع میں شاید مفید
ثابت نہیں ہوتا۔" جب خرگوش اپنی کھوہ میں جاتا ہے تو درندوں اور
شکاریوں کی نظر اس پر پڑ جاتی ہے. کیوں کہ اس کی دم اوپر کو مڑی
ہوئی ہوتی ہے اور وہ دور سے اس کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے لیکن
جانوروں کی عادات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی مڑی
ہوئی دم خطرے سے آگاہ کرنے والے جھنڈے کا کام بھی کرتی ہے
خرگوش سورج کے غروب ہونے کے فوراً بعد یا چاندنی راتوں میں
کھانے پینے کے لیے اپنے بل سے نکلتا ہے لیکن اگر کہیں خطرہ معلوم ہو
تو فوراً اپنے مسکن کی طرف بھاگ جاتا ہے اور اس کی اوپر مڑی
ہوئی دم خطرے سے دوسرے خرگوشوں کو آگاہ کرتی ہے جو چیز کہ
بظاہر ایک جانور کے لیے مضر معلوم ہوتی ہے وہ حقیقت میں اسی کے لیے
مفید اور کار آمد بھی ہوتی ہے ۔

اسی قسم کی دوسری مثالیں Musk Sheep (جس کا
خاکی رنگ ان کے لیے مفید ہے) زیبرا (جس کی چمک دار دھاریاں
کار آمد ہیں) اور زرافہ (جس کا رنگ بھی اس کے لیے مفید ہے) ہیں۔
پرندوں میں خاص طور سے یہ چیز نمایاں ہے۔ ان انواع و
اقسام کا رنگ جو کہ کھلی جگہ میں رہتی ہیں تحفظی ہوتا ہے لیکن ان میں کوئی
نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے ہم جنس ان کو
پہچان سکیں۔ ایسی نشانیاں یا تو سفید رنگ کی دھاریاں یا سفید رنگ
کے دھبے وغیرہ ہوتے ہیں اور یہ نشانات ان کے بالائی حصۂ جسم پر پائے
جاتے ہیں۔ گردن اور سر کے حصے ان کے لیے مخصوص ہیں۔ بعض پرندوں
میں ایک خاص قسم کے حلقے آنکھوں کے گرد ہوتے ہیں یا گلے میں طوق
وغیرہ ہوتا ہے ۔

ان پرندوں میں جو کہ ایک ساتھ اُڑا کرتے ہیں نشانیاں بہت
اہم چیز ہیں لیکن یہ اُن کے عام تحفظی رنگ میں مخل نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ
سے ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کے پروں اور دم پر بہت سی نشانیاں
ہوتی ہیں جو کہ ان کے اُڑنے کی حالت میں تو ظاہر ہوتی ہیں ورنہ چھپی
رہتی ہیں ۔

حقیقت میں تمام پرندوں کی یہی ایک اہم خاصیت ہے کہ اُن
کی دم پر مختلف قسم کی نشانیاں ہوتی ہیں جو پرند کے بیٹھنے پر دوسرے
پروں سے چھپ جاتی ہیں۔ مشرقی ایشیا کے جانوروں کی دو انواع
کی دم کے پروں کو ہم بطور مثال بیان کرتے ہیں۔ کبوتر، باز، مرغابیاں
اور دوسرے اسی قسم کے پرند اس امر کو اچھی طرح ظاہر کرتے ہیں اور
تحقیق کر لینے کے بعد ہم کو اس کے تسلیم کر لینے میں کوئی شبہ باقی نہیں
رہتا۔ یہ پرند جو گرم جنگلات کے رہنے والے ہیں ہمیشہ درختوں کی
چھاؤں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی خاص نشانیاں اُڑنے کی حالت
میں نظر نہیں آتیں۔ بلکہ چمک دار رنگ کے نشانات ان کی گردنوں اور
سروں پر ویسے ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ رنگ کا یہ اصول چھوٹے
کیڑوں خاص طور سے تتلیوں میں عجیب و غریب حیثیت رکھتا ہے
غالباً ان کا اس قدر مختلف اور خوب صورت رنگوں کا رکھنا ان
کو اپنی ہی نوع کے ساتھ شادی کرنے میں مدد دیتا ہے ۔

آگاہ کر دینے والے رنگ

اب ہم ایسے رنگوں کو بیان کریں گے جو مندرجہ بالا
حیثیت سے بالکل مختلف ہیں۔ بجائے اس کے کہ اس قسم کے رنگ
تحفظ میں مدد دیں جانوروں کو دوسروں سے قطعی طور پر نمایاں
رکھتے ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ یہ جانور یا تو مہلک ہوتے ہیں

یا کسی دوسرے جانور کی خوراک بھی نہیں بن سکتے۔ ان مہلک جانوروں کے ڈنک زہریلے ہوتے ہیں یا اُن جانوروں میں زہریلے قسم کی تھیلیاں سی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ دوسروں کے لیے باعث تکلیف و ضرر ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ چیز اور دوسرے ان کے چمک دار و خوشنما رنگ جو کہ اول الذکر رنگوں سے بالکل مختلف افادہ ظاہر کرتے ہیں۔ دونوں ایسے ہیں کہ اُن کی مدد سے وہ دوسروں کو اپنی اس تکلیف دہ حالت سے آگاہ کرتے ہیں۔ مسٹر ویلیس (Mr. Wellace) جب کہ جولائی ۱۸۸۰ء میں ایک جگہ ٹھہرے ہوئے تھے، ایک روز تفریح کی غرض سے کہیں جا رہے تھے، انھوں نے کچھ دور جانے کے بعد دیکھا کہ ایک بہت ہی خوب صورت سیاہ و سفید رنگ کا جانور جس کی دم بہت گچھے دار ہے، ان کی طرف آرہا ہے۔ چوں کہ وہ بہت آہستہ آہستہ آرہا تھا، انھوں نے خیال کیا کہ وہ کوئی پالتو جانور ہے، مگر بعد کو یکایک انھوں نے غور سے دیکھا تو وہ ایک جنگلی جانور نکلا۔ کوئی پانچ یا چھ گز کے فاصلہ پر سے وہ خاموش ایک جھاڑی کی طرف چلا گیا اور کچھ مرغیوں کی پیچھے ہو لیا۔ اس جانور میں ایک بہت بدبودار چیز ہوتی ہے جس کا اخراج برابر ہوتا رہتا ہے۔ اس کی بدبو ایسی ہوتی ہے کہ اگر یہ کسی چیز سے چھو جائے تو اس کو قطعی بے حس و بیکار کر دیتی ہے اس بدبودار چیز کی وجہ سے دوسرے جانور اس پر حملہ نہیں کرتے۔ اپنے سفید و سیاہ بالوں کی وجہ سے اور کچھ گچھے دار دم کی وجہ سے یہ شام کی روشنی اور چاندنی میں بہ آسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔

آگاہ کرنے والے رنگ

چھوٹے چھوٹے کیڑوں میں بھی اس قسم کے رنگ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ہم لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھڑوں اور مکھیوں کے رنگ کیسے خوشنما ہوتے ہیں اور دنیا کے کسی حصہ میں ان کا رنگ تحفظی نہیں خیال کیا جاتا۔

ان کیڑوں کی جتنی تعداد معلوم ہوتی ہے حقیقت میں اس سے زیادہ ہے۔ تتلیوں کی تین قسمیں اس بارے میں اہم ہیں۔ ان میں [illegible] انواع ہیں۔ ان تتلیوں کا رنگ اوروں سے بالکل علیحدہ اور جداگانہ ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اُن کے مقابلہ میں بہ آسانی اور اچھی طرح پہچانی جاسکیں، ان کے پروں کے نیچے کے حصہ میں بھی تقریباً ویسا ہی رنگ ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر کی طرف۔ تجربات نے اس بات کو ظاہر کر دیا ہے کہ اگر ایک بھوکا جانور ایک مرتبہ کسی رنگین چھوٹے جانور یا کیڑے کو کھالے تو یہ رنگ اس جانور کی شناخت میں آئندہ ہمیشہ مدد دیتا ہے۔ ایک تیتری کے پچھلے حصہ میں آنکھوں کی طرح دو سیاہ نشانات ہوتے ہیں جو اس کے بیٹھنے کی حالت میں چھپے رہتے ہیں اور اگر اس کو چھیڑا جائے تو وہ پروں کو اوپر اُٹھا لیتی ہے اور وہ نشانات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی مہلک چیز ہے۔

اس قسم کے رنگ کی ایک بہت ہی اچھی مثال کچھ پھل روپ ہیں۔ کیوں کہ ان کے رنگوں کا اچھی طرح سے مشاہدہ کیا گیا ہے۔ ۱۸۶۱ء میں ڈارون جب کہ اس بات کے متعلق کہ آخر بڑے جانوروں کس طرح رنگ انتخاب جنسی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، معلومات حاصل کر رہا تھا تو اس نے یہ بات دیکھی کہ بہت سے پھل روپ خوشنما رنگوں کے ہوتے ہیں لیکن ان کا انتخاب جنسی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تذبذب والے رنگ

بعض جانوروں میں مثلاً کچھ تتلیوں میں وہ رنگ جس سے کہ ان کی شناخت آسان ہوتی ہے، اس قدر نمایاں ہوتا ہے کہ جب وہ اُڑ رہے ہوں تو دکھائی دے جاتے ہیں اور اگر کسی جگہ بیٹھ جائیں تو نظر سے فوراً غائب ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس حالت میں ان کا رنگ اس چیز کے رنگ سے جس پر وہ بیٹھتے ہیں ہم رنگ ہوتا ہے۔ جس وقت اُڑنے کی حالت میں ہم کو ان کا رنگ خود اختیاری دکھائی دیتا ہے تو ہم ان کو بیٹھتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن بیٹھ جانے کے بعد اگر ہم غور سے ان کو تلاش بھی کریں تو بوجہ ہم رنگی وہ دکھائی نہیں دیتے یہی دھوکہ ان جانوروں کو بھی ہوتا ہے جو ان کے پیچھے ان کے شکار کی غرض سے لگے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے رنگ صرف کیڑوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ بہت سے ریگنیوں کی دموں کا نچلا حصہ سرخ رنگ کا ہوتا ہے جب تک وہ دوڑتے رہتے ہیں تو نظر آتے ہیں ورنہ جہاں رُکے

ان کی دشمن بھی ہوتی تو نظر کام نہیں کرتی۔ کیونکہ ایسی حالت میں وہ ماحول کے رنگ کے مانند ہوتے ہیں۔

رنگ جنسی

بہت سے نر پرندوں کے پروں کا رنگ بہت ہی چمکیلا اور نمایاں ہوتا ہے اور مادہ کا رنگ سادہ ہوتا ہے۔ نر پرندوں کے اس قدر نمایاں رنگ ہونے کی ابھی تک کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوئی ہے لیکن مادہ کے سادہ رنگ کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قدرت کو ان کا تحفظ نسل قایم رکھنے کے لیے مدنظر ہے۔ وہ نر جو کہ ابھی بالکل بچے ہوتے ہیں مثل مادہ کے سادہ تحفظی رنگ کے ہوتے ہیں لیکن جب بڑے ہو جاتے ہیں تو نمایاں رنگوں کا ظہور ہونے لگتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان چھوٹے بچوں کو جب تک غور سے نہ دیکھا جائے ماداؤں سے تمیز کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

شیر اور ہرن کی کھالوں کو لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ داغدار ہوتی ہیں اور ان میں مختلف قسم کے دھبے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جنگلی مرغیوں کا رنگ مثل ایک بڑے مرغ کے ہوتا ہے۔ ان کے بچوں کے جو کہ بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور جن کے جسم کا رنگ نہ زرد ہوتا ہے اور نہ گہرے قسم کا جیسا کہ عموماً پالتو نسلوں میں دیکھا گیا ہے۔ جسم پر پیٹھ کی جانب دو لانبی گہرے رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ یہ بات کہ اس قسم کے رنگ سے قدرت ان کی حفاظت کرتی ہے صاف عیاں ہے۔ کیوں کہ اگر ان کے رنگ میں چھوٹی عمر میں رنگینیاں ہوتیں تو دوسرے جانور ان کو بہ آسانی اپنی خوراک بنالیتے اور یہ بالکل بے بس رہتے۔

رنگ پر مقام اور آب و ہوا کا اثر

مقامی حالت اور وہاں کے رنگ میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہوتا ہے۔ وہ پرند جو کہ اندرونی حصہ جزائر یا براعظم میں رہتے ہیں ان پرندوں کے مقابلے میں جو ساحل سمندر پر ہوتے ہیں، زیادہ چمک دار رنگوں کے ہوتے ہیں۔ بہت سے امریکہ کے سائنس دانوں نے بھی اسی قسم کے مشاہدات کیے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ رنگ کی زیادتی شمال سے جنوب کی جانب بڑھنے میں ترقی کرتی جاتی ہے۔ مرطوب ہوا اور دھوپ کی تیزی کا بھی رنگ پر کافی اثر ہوتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ یہ کہتے تھے کہ دھوپ کی وجہ سے رنگ میں شوخی پیدا ہوتی ہے لیکن اب کہتے ہیں کہ دھوپ رنگ اڑا دیتی ہے اور سفید رنگ پیدا ہونے لگتا ہے۔ شمالی برطانیہ کے حصوں میں جانوروں کا ہلکا رنگ خیال کیا جاتا تھا کہ بادلوں اور کہر کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن اب لوگ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں تو رنگ کو اور گہرا بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

رنگت کے اسباب

بلا شک و شبہ بہت سے رنگ تو ان کیمیائی اجزا کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جن سے کہ جانوروں کے مختلف حصے مرکب ہوتے ہیں۔ صرف ان اجزائے کیمیاوی کی قوت جاذبہ کا اثر رنگ کا باعث ہوتا ہے۔ اس وجہ سے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں اندرونی حصوں کا رنگ غذا کے رنگ جیسا ہوتا ہے۔ چند جانوروں کی ہڈیوں کا رنگ کچھ فعلیاتی حالتوں کی وجہ سے سبز ہوتا ہے۔

اجزاء رنگین کے علاوہ تحفظی و آگاہی حیثیت کے ایک اور اہمیت بھی ہے یعنی اون اور پروں کے اجزا رنگین گرمی کی شعاعوں کو جذب بھی کرتے ہیں اور بعض صورتوں میں منعکس بھی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے جانور کے لیے مفید ہوتے ہیں۔

جانوروں کے لیے رنگ حقیقی معنی میں بہت اہم ہے اور اُن کی بقا کے لیے بہت کام دیتا ہے۔ چاہے رنگ کے پیدا ہونے کی کوئی بھی وجہ ہو مگر حفاظت و تحفظ کے لیے اُن کا ماحول سے تطابق یا دوسروں کو ان کی موجودگی سے آگاہ کرنے کی صلاحیت یا دیگر خدمات ایسے امور ہیں جو کہ "انتخابِ فطرت" میں نہایت اہم ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ - جلد ۸ - شمارہ ۲ (فروری ۸۹ء)
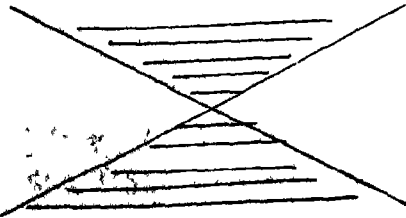
قاضی تھانوی اور ان کی تصنیف

کشاف اصطلاحات الفنون کا مختصر تعارف

ایس۔ کفیل احمد قاسمی

ہندوستان کے مسلم سلاطین نے اگر اس ملک کو سیاسی اور سماجی استحکام بخشا تو ہندوستانی علماء نے اپنے علمی خدمات سے ایسے ایسے کارنامے پیش کیے جن سے ساری دنیا کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں ان علماء نے ہر قسم کے علمی موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ فلسفہ، علم کلام، حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ اور علم لغت وغیرہ۔ غرضیکہ کوئی ایسا موضوع نہ رہا کہ جس پر ہندوستانی علماء نے اپنی یادگار نہ چھوڑی ہو ان میں ایک ایک شخص نے وہ کارنامہ انجام دیا جو آج کل اکیڈمیاں بھی اسے پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، مرتضیٰ بلگرامی، غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی، نواب صدیق حسن خاں اور علامہ حسن صنعانی جیسے کتنے ہی لوگ ہمیں مل جائیں گے کہ جن کے کارنامے درخشاں ستاروں کی طرح آج بھی منور ہیں۔ انھیں جیسے لوگوں میں ایک عالم قاضی تھانوی بھی ہیں جن کی معرکۃ الآرا تصنیف "کشاف اصطلاحات الفنون" ان کے تبحر علمی محنت، لگن اور علمی ذوق کو اجاگر کرتی ہے۔

محققین ان کے نام و نسب کے سلسلے میں مختلف آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا سید عبد الحیٔ حسنی اپنی کتاب "نزھۃ الخواطر" میں ان کا سلسلہ نسب اس طرح بیان کرتے ہیں: "الشیخ الفاضل محمد اعلیٰ بن علی بن حامد بن صابر الحنفی العمری التھانوی" مشہور مصنف جرجی زیدان اپنی کتاب تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ میں رقم طراز ہیں:

"محمد بن علاء ابن علی بن محمد بن صابر الفاروقی السنی التھانوی"۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں بطرس بستانی ان کا نام و نسب اس طرح ذکر کرتے ہیں:

محمد علی بن شیخ بن علی بن قاضی محمد حامد بن صابر الفاروقی السنی الحنفی التھانوی"

ڈاکٹر زبید احمد نے اپنی تصنیف "الآداب العربیۃ فی القارۃ الھندیۃ" میں صفحہ ۱۲۲ پر اُن کا نام محمد علی لکھا ہے اور اسی کتاب میں صفحہ ۲۲۲ پر محمد اعلیٰ لکھا ہے۔

مصنف کے نام و نسب کے سلسلے میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ان کی مشہور و معروف تصنیف "کشاف اصطلاحات الفنون" مطبوعہ کلکتہ کے سرورق پر اُن کا نام محمد اعلیٰ لکھا ہوا ہے اور اسی کتاب کے مقدمہ میں مصنف کی عبارت اس طرح ہے

"یقول العبد الضعیف محمد علی بن شیخ علی بن قاضی محمد بن مولانا اتقی العلماء محمد صابر الحسنی الفاروقی السنی الحنفی التھانوی"

اس سلسلے میں راقم السطور کا خیال یہ ہے کہ کشاف اصطلاحات الفنون کے مقدمہ میں مصنف کا نام "محمد علی" طباعت کی غلطی ہے اور ہمارے اس قول کی تائید مولانا عبد الحیٔ حسنی کے اس قول سے ہوتی ہے جو انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کے حوالے سے لکھا ہے اور وہ قول یہ ہے:

وکان منقوشا علی خاتمہ خادم الشرع والقاضی محمد اعلیٰ

قاضی تھانوی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اہم مراجع میں بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے۔ اسی طرح ان کا سالِ وفات بھی کتب مراجع میں موجود نہیں ہے۔ ان کی تصنیف کشاف اصطلاحات الفنون کا سال تکمیل ۱۱۵۰ھ ہے۔ اس لیے احتیاط کی زبان میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات بارھویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی ہوگی۔

تھانوی کی نسبت کس مقام کی طرف ہے؟ اس سلسلے میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تھانہ سے مراد وہ مقام ہے جو مہاراشٹر میں بمبئی کے قریب واقع ہے۔ یہ مقام مغلیہ دور میں ایک اہم مرکز تھا اور آج بھی اس مقام کی اہمیت کم نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ تھانہ سے مراد تھانہ بھون سمجھا جائے جو مظفر نگر کا ایک قصبہ ہے جس کی شہرت مولانا اشرف علی تھانوی کی نسبت سے زیادہ ہوئی۔ صاحب نزہۃ الخواطر مولانا اشرف علی تھانوی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"قاضی صاحب تھانہ میں عالمگیرؒ کے زمانے میں قاضی تھے۔۔
ان کی قبر یہاں موجود ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو شخص ان کی
قبر کے پاس بیٹھ کر مطالعہ کرتا ہے اس پر دقیق معانی کا
انکشاف ہوتا ہے۔"

گو کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے خود مقام تھانہ کے متعلق صراحت نہیں فرمائی ہے، تاہم قاضی صاحب کو تھانہ بھون کی جانب منسوب کرنے میں مندرجہ ذیل اشکالات سامنے آتے ہیں:

۱۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے جو کچھ قاضی صاحب کے متعلق ذکر فرمایا ہے اس کی کوئی قدیم سند ہمیں نہیں ملتی ہے اور مولانا عبدالحیؒ نے نزہۃ الخواطر میں جو کچھ لکھا ہے، وہ مولانا تھانوی کی صدائے بازگشت ہے۔

۲۔ مغلوں کے دور میں تھانہ بھون کوئی مشہور جگہ نہیں تھی اور نہ سیاسی حیثیت سے اس کی شہرت موجودہ دور میں ہے۔ سوائے اس کے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی وجہ سے اس صدی میں اس کو شہرت مل گئی ہے۔ مغلیہ دور میں قاضی صاحب موصوف کو بظاہر مہاراشٹر کے تھانہ کا قاضی بنایا گیا ہوگا۔

اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب تک ٹھوس شواہد مقام تھانہ کے حق میں ہمارے سامنے نہ آجائیں اور اس کی قطعی تعیین نہ ہو جائے اس وقت مولانا اشرف علی کی تنہا شہادت پر قاضی تھانوی کو تھانہ بھون کا ہی مان لیا جائے اور ان کے وطن کے بارے میں تحقیق و تفتیش جاری رکھی جائے۔

قاضی صاحب موصوف نے قرآن پاک، عربی کی ابتدائی کتابیں ادب، فقہ اور دیگر علوم اسلامیہ کی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیں۔ پھر وہ دیگر علوم و فنون کی جانب متوجہ ہوئے اور انھوں نے اپنے والد کے علاوہ دیگر اساتذۂ فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ بلکہ اپنا ذاتی مطالعہ جاری رکھا اور مروجہ فنون کی جو کتابیں انھیں دستیاب ہو سکیں۔ اپنے طور پر ان کا برابر مطالعہ کرتے رہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ

"مروجہ علوم و فنون میں اکثر و بیشتر اشتباہ ہوتا ہے اور
اسی لیے قدیم کتب یا اساتذہ سے رجوع کرنے کی ضرورت
ہوتی ہے۔"

اپنے خیال کے مطابق قاضی تھانوی کو کوئی ایسی کتاب نہیں ملی جو علوم و فنون کے تمام اصطلاحات پر مشتمل اور جامع ہو ۔۔ قاضی صاحب علوم شرعیہ اور علوم عربیہ کی تحصیل کے بعد فلسفہ، ریاضی اور علم کلام کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے مطالعے کے دوران وہ ہر فن کی اصطلاحات کو متعلقہ ابواب میں حروف تہجی کی ترتیب سے نقل کرتے رہے اور پھر ان اصطلاحات کو دو حصوں میں تقسیم کیا:

۱۔ اصطلاحات الفاظ عربیہ
۲۔ اصطلاحات الفاظ عجمیہ

قاضی تھانوی کی تصانیف میں کشاف اصطلاحات الفنون کو ہی شہرت ملی۔ اس کے علاوہ مراجع اور مصادر میں ان کی کسی دوسری تصنیف کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری میں ایک مخطوطہ ہے۔ "رسالۃ فی تحقیق اراضی الھند" نمبر ۱۰۴۳ اور اس پر کتاب کا نام "رسالۃ فی احکام الآراضی" ہے۔ اس رسالہ پر مصنف کا نام محمد علی بن القاضی محمد حامد بن محمد صابر التھانوی

درج ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد اس رسالہ کو شیخ جلال الدین تھانیسری م ۹۸۹ھ کی تصنیف بتاتے ہیں[۹]۔ قاضی صاحب کی تصنیف کشاف اصطلاحات الفنون کو بروکلمان نے کشف اصطلاحات الفنون کے نام سے ذکر کیا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ ایسا کسی غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے۔ اس کتاب کا صحیح نام کشاف اصطلاحات الفنون ہے جیسا کہ اس کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں درج ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے جن اصطلاحات سے بحث کی ہے وہیں ان کے اشتقاق کا ذکر بھی کیا ہے اور اہل فن کے مختلف آرا، کو بھی نقل کیا ہے۔ بیشتر اصطلاحات کے وجہ تسمیہ کے متعلق تاریخی پہلو کو بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً لفظ "تاریخ" پر چھ صفحات پر مشتمل طویل بحث ہے۔ عربوں، یہودیوں، ایرانیوں رومیوں اور قبطیوں کے یہاں یہ لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا رہا اس کا مفصل ذکر ہے۔ عیسوی اور ہجری تاریخ کے آغاز کا تفصیلی ذکر ہے۔ تمام عقلی، نقلی اور طبعی علوم کی اصطلاحات کے سلسلہ میں اسی قسم کی بحث دیکھنے کو ملتی ہے۔ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ مستند اور اہم مراجع سے لے کر لکھا ہے۔ جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے اور یہ کتاب خود ایک اہم مصادر میں شمار ہونے لگی ہے۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ایک جگہ اسپرنگر نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے:

"اس کتاب کے مؤلف نے بیشتر اصطلاحات کی تعریف اہم ترین مصادر اور مراجع سے لی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب انتہائی قدر و قیمت کی حامل ہے"[۱۰]

کشاف کے مخطوط نسخوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی لیکن اسپرنگر کے بیان سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ اس کے زمانے میں اس کتاب کے کم از کم تین نسخے ہندوستان میں محفوظ تھے اور یہ تینوں نسخے خود مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ ایک نسخہ ان کے خاندان میں محفوظ رہا اور مصنف کے پوتے نے اسے اسپرنگر کو دیا تھا۔ دوسرا نسخہ دہلی میں تھا جس سے کسی شخص نے ۱۸۴۲ء میں نقل کر کے اسپرنگر کو دیا تھا۔ انہیں دو نسخوں پر اس نے اپنے ایڈیشن کی بنیاد رکھی اور تیسرے نسخے کے متعلق کشاف کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ مجھے توقع ہے کہ تیسرے نسخہ کا پتہ مجھے جلد ہی مل جائے گا[۱۱]۔

جہاں تک ان نسخوں کے وجود کا ذکر ہے تو اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ایک نسخہ مصنف کا مسودہ جس کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے وہ حبیب گنج کلکشن کا ہے جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مولانا آزاد لائبریری کا ایک حصہ ہے۔ اس مخطوطہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کا نام تاریخی ہے۔ مسودہ خود مصنف کا ہے اس میں بعض بعض جگہ حاشیے بھی ہیں اور ابتدا میں دو ورق سورہ والصافات کی تفسیر زاہدی پر مشتمل ہیں۔

اس کتاب کا ایک دوسرا نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے جس کا نمبر ۵۱۳ ہے۔

اس کا تیسرا نسخہ خدا بخش لائبریری، بانکی پور، پٹنہ میں موجود ہے اور اس کا نمبر ۳۰۰۹ ہے۔

"اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جب کسی سے ملے کچھ ہنس کر سلام کیا، کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں، دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں، کچھ اپنی جھوٹی نیازمندی کا اظہار کیا، کچھ ان کی جھوٹی تعریف کی، آؤ بھگت کی اور دل میں کہا کہ خوب الو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو یا تو برا کہنے لگے یا جو باتیں کی تھیں ان کا نقش بر آب کا سا بھی نشان نہ تھا۔"

سر سید احمد خاںؒ

اس کتاب کو اسپرنگر اور ولیم ناسولیس نے جو مستشرقوں میں اہم مقام رکھتے ہیں، اپنی نگرانی میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے بڑی تقطیع میں ۱۵۰۴ صفحات میں شایع کیا اس کا سال طباعت ۱۸۶۲ء ہے۔ اس کتاب کی تصحیح مولوی محمد وجیہ الدین نے کی ہے جو کلکتہ کے مشہور مدرسہ عالیہ میں استاد تھے۔ بقول صاحب نزہۃ الخواطر، انھوں نے اس میں بعض اضافے بھی کیے ہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۱۸ھ میں استانبول سے شایع ہوا۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ حال ہی میں اس کا ایک اور ایڈیشن بیروت سے شایع ہوا ہے لیکن یہ ایڈیشن ابھی تک ہندوستان نہیں پہنچا ہے۔ خدا کرے کہ یہ ایڈیشن واقعی معنوں میں علمی ایڈیشن ہو جو تحقیق متن کے علمی تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔ کلکتہ یا استانبول کے ایڈیشن کا عکس نہ ہو۔ جیسا کہ آج کل یہی طریقہ رائج ہو گیا ہے۔ اگر بیروت ایڈیشن میں وہی بات ہے جو کلکتہ ایڈیشن یا استانبول ایڈیشن میں ہے تو اس کتاب کے علمی اور تنقیدی ایڈیشن کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

آج سے پانچ چھ سال قبل جب استاد عدنان درویش مدیر المعہد الفرنسی بدمشق، جن کا کام عربی مخطوطات کی تلاش اور اشاعت ہے ۔ علی گڑھ آئے تو انھیں مولانا آزاد لائبریری میں حبیب گنج کلکشن کا قلمی نسخہ دکھایا گیا۔ اس نسخہ پر انھوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور وہ اسے دمشق سے شایع کرنے کے لیے تیار تھے، بشرطیکہ اسے جدید تقاضوں کے مطابق ایڈیٹ کر دیا جائے۔

حوالہ جات

۱ نزھۃ الخواطر ۲۸۷/۶
۲ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۳۵۴/۳
۳ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ۲۴۶/۶
۴ الآداب العربیۃ فی القارۃ الهندیہ
۵ مقدمہ کشاف اصطلاحات الفنون، طبع کلکتہ ۱۸۶۲ء
۶ نزہۃ الخواطر ۳۸۷/۶
۷ الاعلام ۱۸۸/۷
۸ نزہۃ الخواطر ۲۸۷/۶
۹ مقدمہ کشاف اصطلاحات الفنون، طبع کلکتہ ۱۸۶۲ء
۱۰ الآداب العربیہ فی القارۃ الهندیہ، ص ۳۱۱
۱۱ تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ کشاف اصطلاحات الفنون، طبع کلکتہ ۱۸۶۲ء
۱۲ ایضاً
ایضاً
ایضاً

"اللہ تعالیٰ اپنے تمام احکام میں نرمی کو زیادہ پسند فرماتا ہے۔"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۲ (فروری ۱۹۸۹ء)

شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین احمد لکھنوی

سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی*

مرکز اودھ لکھنؤ نے بعہد نوابانِ اودھ ایک اہم طبی مرکز کی حیثیت حاصل کی۔ یہاں اکثر نامی گرامی اطبا گزرے جنہوں نے فن طب کو ہندوستانی افراد کے مزاج کے مطابق مرتب و مدون فرمایا اور بام عروج تک پہنچایا اور اسے ایک ایسا رنگ و روپ دیا جو دہلوی طب کے رنگ و روپ سے مختلف اور ممتاز تھا۔ اطبائے لکھنؤ کے تذکرے شائع ہوئے ہیں لیکن اکثر نامور اطبا ایسے گزرے ہیں کہ جن کی حیات و کارناموں کو واضح طور سے پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اُن ہی میں سے لکھنؤ کے ایک مایہ ناز ماہر طبیب شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب تھے جن کا تذکرہ سطور ذیل پیش کرنا مقصود ہے۔

حکیم صاحب موصوف قریشی النسب تھے اور آپ کے بزرگ عرب سے لکھنؤ وارد ہوئے تھے۔ خواجہ نواب ابوالحسن خاں شقدار کشمیر آپ کے مورث اعلیٰ تھے اور جملۃ الملک وزیر الوزراء نواب خواجہ اسد اللہ خاں بہادر الملقب جلالی دہناں وزیر اعظم سلطنت مغلیہ آپ کے اجداد میں تھے سلاطین مغلیہ کے عہد میں اس خاندان کو کئی پشتوں تک جاہ و منصب حاصل رہا پھر زوال سلطنت کے قریب بعض افراد اس خاندان کے دکھا کر چلے گئے، جن میں اس وقت تک ریاست و امارت چلی آتی ہے اور بعض اشخاص لکھنؤ چلے آئے اور یہاں سکونت اختیار کی اور سر شاہان اودھ کے زمانے میں بہت موقر اور مرفع الحال تھے۔ جن شرفائے کشمیر نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا تھا، ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اپنی شرافت، خداداد قابلیت اور خدمات جلیلہ کی بنا پر اعلیٰ ترین مناصب کے مستحق سمجھے گئے، منجملہ اُن اصحاب کے خاندان مذکور سے رشتۂ قرابت رکھنے والے لوگوں میں نواب ظہیر الدولہ محمد یحییٰ خاں اور شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں سلطنت اودھ کے وزیر مقرر ہوئے۔ خواجہ محمد مقیم محمد علی شاہ کے داروغۂ خاص اور ان کے بھائی نواب قمر الدولہ بادشاہ کے مصاحب تھے

آپ کے جد امجد ابو البرکات خواجہ نجم الدین احمد تھے جن کو زہد و تقویٰ کے لحاظ سے لوگ حضرت نجم الدین کبریٰ سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

* چیرمین شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

عربی، فارسی میں آن کی استعداد بہت اچھی تھی اور درسیات میں اُن کے شاگرد بھی بہت تھے جن میں شیخ محمد مرضا، سید ابن حسن اور منشی سالگ رام مالک مطبع گلزار اودھ زیادہ مشہور ہوئے۔ خط نستعلیق کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ ذرہ تخلص کرتے تھے اور بہ روایت جناب خواجہ عزیزالدین صاحب عزیز مرحوم ان کے کلام فارسی و اردو کے دو مکمل دیوان الگ الگ تھے۔ بیدل کے طرز پر صوفیانہ رنگ میں کہتے تھے اور رشالیہ میں صائب کا انداز تھا ایک مثنوی نجم الہدیٰ لکھی تھی جو مثنوی مغربی طرز کی تھی۔

نہایت متواضع اور خوش اخلاق تھے۔ باوجود کہ تجارت و کاروبار سے دولت بہت حاصل کی تھی لیکن طبیعت فقیرانہ پائی تھی اور دنیا سے وابستگی نہ تھی۔ ۱۰ جمادی الاول ۱۲۷۵ھ کو بعمر ۳۹ سال وفات پائی۔

آپ کے والد ماجد ابو الحسنات حاجی حافظ خواجہ قطب الدین احمد صاحب بانی و مالک مطبع نامی لکھنؤ تھے۔ جن کی ولادت ۲۴ جمادی الاول ۱۲۷۰ھ مطابق ۲۳ فروری ۱۸۵۴ء شب جمعہ میں ہوئی۔ آپ نے خاندانی حالات میں مستقل ایک کتاب ۱۳۴۲ھ میں لکھی تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے وقت آپ کی عمر تقریباً پانچ یا چھ سال کی تھی۔ انقلابات زمانہ کے ہاتھوں جائیداد سے محروم ہو گئے تھے۔ لہذا تعلیم ترک کر کے مطبع منشی نول کشور میں کاپی نویسی کی ملازمت اختیار کی۔ ابتداءً مشاہرہ پانچ روپیے ماہوار مقرر ہوا، بعدہٗ ترقی پاتے رہے اور دو سال کی مدت میں پچیس روپے مشاہرہ مقرر ہوا۔ منشی نول کشور صاحب آنجہانی پر والد مرحوم کے حسن خدمات و اظہار لیاقت کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ وہ ان کے حال پر بے حد شفقت و عنایت مبذول فرمانے لگے اور ان پر انتہائی اعتماد و بھروسہ ہو گیا۔ چنانچہ مطبع کے جملہ کاتبوں اور مصحح‌وں کا ان کو افسر مقرر کر دیا۔

ماہ ربیع الاول ۱۳۰۰ھ مطابق فروری ۱۸۸۳ء میں آپ نے دو پریس ولایتی و آہنی اور چار پتھر دو رُخے اور ایک افتادہ زمین ایک سو پچاس روپے میں خرید کر دو پھر ڈال کر اپنا ذاتی چھاپہ خانہ "مطبع نامی" کے نام سے جاری کیا جس نے بہت ترقی کی۔ حتی کہ العیشان پریس قائم ہوا۔ مطبع کی دوکانیں شہر لکھنؤ اور اس کے علاوہ کانپور، الٰہ آباد دہلی، کلکتہ، چاٹگام اور ڈھاکہ وغیرہ میں قائم ہوئیں۔ آپ نے ۱۹۲۱ء تک براہ راست اپنے انتظام میں پریس کا کام کیا۔ پھر ضیق النفس کے شدائد سے عاجز رہے۔ اس عرصے میں مطبع نامی سے چھ ہزار اکیاون کتب علوم و فنونِ اسلامیہ سے متعلق شائع ہوئیں۔

جنوری ۱۸۸۶ء میں مطبع نامی سے ہفتہ وار اخبار "صحیفہ نامی" جاری کیا جس کے ایڈیٹر مولانا عبدالحلیم شرر تھے اور منیجر خواجہ احمد حسن مقرر ہوئے۔ پھر کچھ اسباب کی بنا پر یہ بند ہو گیا۔

اس مطبع نے شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا کی مایہ ناز طبی کتاب القانون فی الطب ۱۹۰۵ء میں بزبان عربی شائع کی جس پر حواشی حکیم مرزا محمد مہدی نے لکھے۔ اس کے علاوہ اس مطبع نے کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف مصنفہ ابو القاسم خلف ابن عباس الزہرادی ۱۹۰۸ء میں شائع کی ان کتب کے علاوہ اکثر درسی کتب اس مطبع نے شائع کیں۔ مثلاً اردو ترجمہ موجز القانون بعنوان موضح الکانون از قلم حکیم مرزا محمد مہدی لکھنوی وغیرہ علم طب کا ایک مبسوط لغت "لغات قطبیہ" بھی اسی مطبع سے شائع ہوا اور علم تشریح پر تشریحات قطبیہ اور تشریحات شمسیہ کی اشاعت بھی اسی مطبع سے ہوئی۔ اس مطبع نے جنتری صد سالہ بھی شائع کی۔

غرضیکہ علوم و فنون اسلامیہ خصوصاً علم طب کی نشر و اشاعت بھی اس مطبع سے اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی جس سے طلباء اور اطباء نے خاطر خواہ استفادہ فرمایا۔ آپ کو شیعوں کے ساتھ کبھی مغایرت نہیں رہی اور آپ نے ہمیشہ یہ خیال رکھا کہ شیعوں کو کبھی کوئی موقع شکایت کا نہ ملنے پائے۔ مطبع میں بہت سے شیعہ ملازم رہے اور بیش قرار تنخواہوں اور ذمہ داری کے کاموں پر رہے اور وہ سب ہمیشہ آپ کی رواداری سے خوش رہے۔ شیعہ سنی جھگڑوں کے زمانہ میں آپ نے کوئی کتاب پریس سے ایسی شائع نہیں کی جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ حالاں کہ اُس زمانہ میں ایسی کتابوں کی بہت بکری ہوتی تھی۔ مناظرہ کی کتابیں بھی آپ اپنے پریس میں نہیں چھاپتے تھے اور نہ ایسے

اشتہارات بھی واپس کر دیتے تھے جن سے کسی کی دل آزاری مقصود ہو۔ اُن کا قول تھا

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

آپ کی وفات ۲۶ راپریل ۱۹۲۵ء، شب جمعہ میں ہوئی اور دفن مقبرہ خواجہ محمد سلیم میں واقع ہوا۔

ابو البرکات شفاء الملک حکیم شمس الدین احمد آپ کے فرزند اکبر ہوئے۔ آپ ۵ رجنوری ۱۸۹۴ء مطابق ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ بروز جمعہ پیدا ہوئے۔ ابتداً حفظ قرآن مجید بعمر چھ سال نو ماہ کیا۔ بعدہٗ فارسی کی تکمیل کی۔ سکندر نامہ خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز سے پڑھا۔ پھر اردوئے معلّٰی غالب کا ترجمہ فارسی میں کیا اور عزیز صاحب سے اصلاح لی۔ پھر شرح جامی اور شرح تہذیب وغیرہ کتب پڑھیں۔ پھر آپ کے والد ماجد نے آپ کو مولانا محمد قیام الدین عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کیا۔ آپ نے مختصر المعانی اور قطبی بکمال شفقت پڑھائیں۔ پھر مدرسہ عالیہ نظامیہ قایم کیا تو اس میں آپ نے داخلہ لیا اور درس نظامی کی تکمیل ۱۹۱۱ء میں فرمائی۔ جس کے بعد آپ کو مدرسہ نظامیہ سے مولانا کی سند عطا کی گئی۔ اس کے بعد مدرسہ نظامیہ میں دو سال تک ادب اور منطق کے اسباق پڑھائے۔

درس نظامی کی تکمیل کے بعد آپ کے والد صاحب نے آپ کو تکمیل الطب میں داخل فرمایا اور حکیم حاجی محمد عبد العزیز صاحب کے سپرد کیا۔ اپریل ۱۹۱۴ء میں تکمیل الطب سے سند حاصل کی پھر ایک سال تک شفاخانہ تکمیل الطب میں آپ نے آنریری انچارج کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی عرصے میں آپ کے والد صاحب نے آپ کے لیے ایک عالی شان مکان تعمیر کرا دیا۔ جہاں آپ نے مطب شروع کیا ساتھ حکیم عبد العزیز صاحب کی فرمائش سے تکمیل الطب کالج میں چھ سات سال تک بطور اعزازی مدرس رہے اور معالجات کی تعلیم دی۔ طلبا آپ سے بہت خوش اور مطمئن رہے۔ ۱۹۲۰ء میں بصلۂ خدمات تعلیمی تکمیل الطب کی جانب سے آپ کو ایک تمغہ بھی دیا گیا۔

اس کے بعد سے تا آخر عمر مطب اور درس و تدریس کا سلسلہ مکان ہی پر جاری رکھا۔

اخبار قومی آواز بروز جمعہ بتاریخ ۳۰ راپریل ۱۹۷۱ء میں جو حالات آپ کے شایع ہوئے، ان کا اقتباس درج ذیل ہے:

"آپ نے درسیات کی تکمیل فرنگی محل کے مدرسہ میں کی تھی مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے شاگرد رشید و مرید باختصاص تھے۔ طب یونانی کی تکمیل، تکمیل الطب کالج جھوائی ٹولہ میں کی پھر طب کی درس و تدریس کا سلسلہ برسوں تک جاری رکھا اور پابندی سے مطب کرتے رہے۔ تشخیص کے ماہر تھے اور علاج عام طور سے مفردات کے ذریعے کیا کرتے تھے۔ ان کے مطب میں زبردست ہجوم رہتا تھا۔ مہارت فنی کا یہ عالم تھا کہ شیخ ابو علی سینا کے قانون کا اکثر حصہ انہیں زبانی یاد تھا اور وہ گفتگو میں اس کے طویل جملے نقل فرماتے تھے۔ آپ نہ مریضوں سے فیس لیتے تھے اور نہ دواخانہ رکھتے تھے۔ بلکہ مریضوں کو عام اجازت تھی کہ جہاں سے چاہیں دوا لیں۔ آپ کے مطب میں نہ صرف شہر لکھنؤ بلکہ دور دراز سے مریض آتے تھے۔ مطب کی پابندی فرماتے تھے اور مطب کے اوقات میں باہر نہیں جاتے تھے۔

آپ زبان و ادب میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں ترجمہ بڑی روانی سے فرماتے تھے۔ آپ کی اردو تحریر بڑی شگفتہ ہوتی تھی۔ آپ کے متعدد مضامین دار المصنفین اعظم گڑھ کے رسالہ معارف میں شایع ہوئے۔

آپ طب یونانی کے شیدائی تھے مگر جدید مغربی طب کی بعض خوبیوں کے بھی قائل تھے۔ ڈاکٹر عبد الحمید صاحب نے آپ کی وفات پر نمائندہ قومی آواز سے ایک گفتگو میں فرمایا کہ حکیم خواجہ شمس الدین صاحب ایک ماڈرن حکیم اور ایک ماڈرن مولوی تھے۔ ان کی شخصیت میں قدیم و جدید کا بڑا اچھا امتزاج تھا۔"

حکیم صاحب انگریزی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی ابتدا پہلے مدرسہ نظامیہ میں ماسٹر نجف علی سے پڑھی پھر شیخ احسان الرحمن قدوائی (ساکن بڑا گاؤں، بارہ بنکی) جو کیننگ کالج میں پڑھتے تھے ان سے پڑھی اور جب وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن گئے، تو حکیم صاحب نے شیخ شوکت علی سے جن کی نسبت سے احاطہ شیخ شوکت علی رکاب گنج میں مشہور ہے، انگریزی کی تعلیم جاری رکھی۔

لکھنؤ کے اہم اور سربرآوردہ شہریوں میں ان کا شمار تھا بہت سے علمی وملی مجالس واداروں کے اہم رکن آخر تک رہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وانجمن اصلاح المسلمین وغیرہ سے ان کا تعلق آخر تک قایم رہا۔ ان کے عام اور انتظامی جلسوں میں شرکت کرنے والوں میں ممتاز بلکہ منفرد تھے۔ جس محفل میں تشریف رکھتے اس پر چھا جاتے تھے۔ گفتگو ہر موضوع پر اور بڑی قابلیت اور خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ شاعری ہو یا فلسفہ قدیم، سیاسیات حاضرہ ہو یا قدیم تاریخ تقریباً ہر موضوع پر یکساں گفتگو کرتے اور اپنی معلومات ومطالعہ سے دوسروں کو مستفید کرتے۔ حافظہ غضب کا تھا، بکثرت اشعار یاد تھے۔ قرآن مجید کے تو باقاعدہ حافظ تھے۔ آخری زمانہ تک ماہ رمضان میں نماز تراویح میں کلام پاک سناتے رہے۔ دعائیں اور وظائف سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور عمر کے آخری برسوں میں تو اپنے مریضوں کو دوا سے بھی زیادہ دعا سے مستفید ومستفیض کرنے لگے تھے۔ ایک زمانے میں اور اس کی مدت بیس سال سے کیا کم رہی ہوگی شہر کی میونسپل سیاسیات میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ چوک کے حلقے سے کئی بار میونسپل بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے اور ممبری کے فرائض بڑی تندہی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے۔

کتابوں اور رسالوں واخبارات کا مطالعہ بھی خوب کرتے تھے۔ طبیعت بڑی رسا پائی تھی۔ اگر باقاعدہ تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھتے تو بہت سی قابل ذکر کتابوں کے مصنف بن سکتے تھے۔

بڑے وسیع الاخلاق تھے۔ مذہب کا رنگ شروع ہی سے غالب تھا۔ آخر میں اور زیادہ گہرے قسم کے دین دار ہوگئے تھے، لیکن اس کے باعث مزاج میں کسی قسم کی خشکی و یبوست ذرا بھی دخیل نہیں ہونے پائی تھی۔ نظام اوقات کے بھی بڑے پابند تھے اور اپنی مثال آپ ہی تھے۔

آپ ۱۹۲۸ء میں انجمن طبیہ صوبہ جات متحدہ لکھنؤ کے جوائنٹ سکریٹری بھی رہے، جب کہ حکیم محمد عبدالمعید صاحب سکریٹری اور حکیم خواجہ کمال الدین صاحب پریسیڈنٹ تھے۔

آپ بورڈ آف انڈین میڈیسن یو۔پی کے دو بار ممبر بھی منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۹ء سے لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ممبر رہے۔

تصانیف

زمانۂ طالب علمی میں آپ نے ایک فارسی رسالہ اصطلاحات صوفیہ کے عنوان سے تصنیف فرمایا تھا۔ معالجات قانون شیخ پر آپ نے بڑی محنت سے حاشیہ بھی لکھا تھا لیکن کوئی طالب علم اسے مستعار لے لیا اور پھر اس کو واپس نہ کیا۔

خطابت وتقریر اور عربی طب کے عناوین سے دو رسالے آپ نے تصنیف فرما کر طبع کرائے تھے اور یہ مقالے آپ نے مسلم اکاڈمی لکھنؤ کے سمیناروں میں بھی پیش کیے تھے۔

عربی طب پر ایک فاضلانہ اور تاریخی لیکچر جس کو عالی جناب مولانا حافظ حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب نے مسلم اکاڈمی لکھنؤ کے جلسۂ منعقدہ ۶ر اگست ۱۹۲۶ء میں پیش فرمایا تھا، نامی پریس لکھنؤ میں اگست ۱۹۲۶ء ہی میں نامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوا ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کے اکتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ "تاریخ طب عربی پر یہ ایک جامع مقالہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے فاضل مصنف کے علم تاریخ میں تبحر کا اندازہ ہوتا ہے اور موضوع سے متعلق وسعت نظر واضح ہوتی ہے۔"

شفاء الملک مولوی حکیم حافظ خواجہ شمس الدین احمد صاحب کا ایک طویل مضمون بعنوان "ہمارے مطبوں کے تجربے" مسلسل ۱۹۴۸ء میں رسالہ تکمیل الطب لکھنؤ میں شایع ہوا ہے۔ اس رسالے کے ناظم وناشر حکیم محمد عبدالحسیب صاحب اور مدیر حکیم شکیل احمد شمسی رہے

لکھنؤ کے مشہور ادیب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب نے حکیم شمس الدین صاحب کے انتقال پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ حکیم خواجہ شمس الدین صاحب ایک قابل طبیب ہونے کے ساتھ عربی زبان کے بھی لائق عالم تھے۔ اکثر مباحثوں میں وہ ابو علی سینا کی کتابوں کے حوالے دیا کرتے تھے اور انہیں عربی زبان کے پورے پورے مقولے یاد تھے۔ نیز فرمایا کہ حکیم صاحب بچپن ہی سے تیز طرار تھے۔ اور ان کا حافظہ قوی تھا۔ حکیم صاحب کو صبح سویرے چہل قدمی کی عادت تھی اور یہ عادت بڑھاپے تک رہی۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے یہ بھی فرمایا کہ لکھنؤ میں مولانا عبدالحلیم شرر نے ایک مسلم اکیڈمی قایم کی تھی۔ اس میں حکیم صاحب نے "خواجہ وزیر پر اپنا جو مقالہ پڑھا" اس کو سن کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے ایک باکمال شاعر کسی دوسرے شاعر کی خوبیوں اور محاسن پر روشنی ڈال رہا ہے۔"

مرحوم نے طب یونانی تکمیل الطب کالج میں حاصل کیا اور شفاء الملک حکیم عبد الرشید مرحوم کے شاگرد رشید اور ان کے سچے جانشین تھے۔ تکمیل برادری کی حیثیت سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اطباء جوائی ٹولہ کے بعد لکھنؤ طبی اسکول کا کسی نے بھرم رکھا تو وہ شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب تھے۔ موصوف ہمیشہ اپنے استادوں اور تکمیل الطب کالج کی شاندار روایات کے ماتحت مفردات ہی سے علاج فرماتے تھے اور شیخ الرئیس ابو علی سینا کی مفردات کی تو گویا موصوف کی نوک زبان پر تھی۔ علمی تجربہ کا یہ عالم تھا کہ جس مرض کے متعلق پوچھیے، اس کا جواب دیتے ہوئے شیخ کے عبارات سے اس کی تصدیق بھی کرتے جاتے تھے

موصوف تکمیل الطب کالج کے اساتذہ میں شامل تھے اور اس کی منیجنگ کمیٹی کے سرگرم رکن بھی تھے اور تکمیل الطب کالج کے لیے بڑا احساس اور درد بھی رکھتے تھے۔ بورڈ آف انڈین میڈیسن یوپی کی بھی گورنمنٹ کی مختلف کمیٹیوں کی رکنیت، بڑی بڑی ذمہ داریاں کی جتنی آپ کے لیے پیش کی گئی تو آپ نے بڑے انہماک اور وقت کی تنگی کے ہمیشہ خندہ پیشانی سے قبول کرتے رہے۔

سلون (رائے بریلی) سے تعزیتی پیغام میں حکیم چودھری محمد کلیم صاحب نے لکھا ہے کہ نبض شناسی ان پر ختم ہو گئی۔

خواجہ صاحب کو طب کی عظمت پر بڑا عقیدہ تھا۔ وہ ایک وسیع النظر انسان تھے۔ علوم کی ترقیوں کو دیکھتے اور سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ موجودہ دور میں فن علاج کافی ترقی کر رہا ہے اور اطباء کو اس ترقی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعدد مضامین بھی لکھے۔

حکیم صاحب کو شفاء الملک کا خطاب آپ کی فنی مہارت پر گورنمنٹ برطانیہ نے پیش کیا تھا۔ مسلم لیگ کے انتہائی عروج کے زمانہ میں جب کہ انگریز سرکار کے خطاب یافتگان اپنے خطابات کو واپس کر رہے تھے اور خطاب دینے والی سرکار خود پا بہ رکاب تھی اور پوری امت کا دباؤ مسلم لیگ کے واسطے سے اُن لوگوں پر پڑ رہا تھا جو واپسی خطاب پر آمادہ نہیں تھے۔ حکیم صاحب نے ذرا بھی پروا نہ کی اور اپنا شفاء الملک کا خطاب واپس نہیں کیا۔ فرماتے تھے کہ میرا خطاب میری طبی خدمات کا اعتراف ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی کر کے خطاب حاصل کرنے والے اپنا خطاب واپس کریں تو کریں۔

اپنے مطب کے واقعات کے سلسلے میں حکیم صاحب نے بیان فرمایا کہ میرے مطب کا شروع شروع کا زمانہ تھا۔ شمس العلماء مولانا ناصر حسین صاحب مجتہد خود علیل ہوتے یا اور کوئی بیمار ہوتا تو مجھے ہی علاج کے لیے بلواتے تھے۔ حالاں کہ وہ چاہتے تو بڑے سے بڑا حکیم اور ڈاکٹر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ ایک دن خود میں نے پوچھ لیا کہ آپ مجھے ہی کیوں یاد فرماتے ہیں جب کہ میرا تجربہ ابھی ابتدائی منزلوں میں ہے۔ شمس العلماء نے جواب دیا کہ شفا دینا نہ چھوٹے معالج کے ہاتھ میں ہے نہ بڑے معالج کے ہاتھ میں ہے۔ مگر علاج و معالجہ کا بھی حکم ہے۔ اس حکم کی تعمیل میں علاج کرانا پڑتا ہے۔ شفاء اور صحت کے خیال سے نہیں، اس لیے کہ وہ تو کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ بڑے ڈاکٹر اور حکیم آئیں گے تو کیا ہو گا۔ آپ ہمارے پڑوسی بھی ہیں اور ہمارے بچے بھی ہیں آپ کو دن میں کئی بار بلا سکتا ہوں۔

وفات

اس نابغہ روزگار شخصیت نے ۲۹؍ اپریل ۱۹۷۱ء کو عدم کو راہی اور اپنے پیچھے نہ مٹنے والے کارنامے چھوڑ گیا۔

مصادر

۱۔ حیات خواجہ حافظ قطب الدین احمد بانی مطبع نامی، لکھنؤ
مولفہ حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب میونسپل کمشنر
لکھنؤ۔ مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ، بماہ مئی ۱۹۳۵ء

۲۔ من کیستم ۔ مولفہ مرزا محمد عسکری ۔ مطبوعہ اتر پردیش
اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۔ ۱۹۸۵ء

۳۔ اخبار قومی آواز، جمعہ ۳۰؍ اپریل ۱۹۷۱ء

۴۔ اخبار ایک آنہ فنڈ گزیٹیر، لکھنؤ اپریل ۱۹۷۱ء

۵۔ اخبار قومی آواز منگل ۴ مئی ۱۹۷۱ء

۶۔ 〃 〃 〃 سنیچر یکم مئی ۱۹۷۱ء

۷۔ 〃 〃 〃 بدھ ۵؍ مئی ۱۹۷۱ء

۸۔ 〃 〃 میگزین یکشنبہ (اتوار) ۱۳؍ مئی ۱۹۷۱ء

۹۔ اخبار صدق جدید، لکھنؤ ۱۴؍ مئی ۱۹۷۱ء

۱۰۔ اخبار حقیقت لکھنؤ شنبہ ۱۵؍ مئی ۱۹۷۱ء

۱۱۔ قومی آواز میگزین یکشنبہ (اتوار) ۱۶؍ مئی ۱۹۷۱ء

۱۲۔ قومی آواز میگزین یکشنبہ (اتوار) ۶؍ جون ۱۹۷۱ء

۱۳۔ الحکیم بابت ماہ مارچ ۱۹۲۸ء

۱۴۔ عربی طب پر ایک فاضلانہ و تاریخی لیکچر مطبوعہ ۱۹۲۶ء، نامی
پریس، لکھنؤ۔

۱۵۔ علم النبض مولفہ حکیم مبین الدین احمد، مطبوعہ ۱۹۲۵ء، نامی
پریس، لکھنؤ۔

۱۶۔ رسالہ تکمیل الطب ۱۹۴۸ء زیر ادارت حکیم شکیل احمد شمسی کا۔

آخر میں یہ اعتراف بھی ضروری سمجھتا کہ مذکورہ تذکرہ کی تدوین میں شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب کے فرزند ارجمند ڈاکٹر خواجہ جلال الدین احمد صاحب نے راقم کی خصوصی معاونت فرمائی اور جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

" آپ میں جو حضرات محقق و باخبر ہیں وہ جانتے ہوں
گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان
سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے
پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔"

شیخ الہند مولانا محمود حسن
خطبۂ افتتاحیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
موج کوثر۔ ص ۷۷

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔شمارہ ۲ (فروری ۱۹۸۹ء)

مراد آباد شہر کے چار مسلم اداروں میں ہائی اسکول امتحان میں فرسٹ ڈویژن کی تعداد بارہ سال میں

تین (۳) سے بڑھ کر سترہ (۱۷)

احمد رشید شیروانی*

پھر وہی سوال کہ مسلمان تعلیم میں آگے بڑھ بھی رہے ہیں یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ جناب مسلمان کسی کے (آپ کے یا میرے) باپ کے غلام تو ہیں نہیں جو آپ کے یا میرے حکم سے آگے کی طرف مارچ کرنا شروع کر دیں۔ لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ۔ مسلمان اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں مسلمانوں کا دل چاہتا ہے آگے بڑھنے کے لیے وہاں وہ آگے بڑھتے ہیں اور اگر کہیں مسلمانوں کا دل چاہتا ہے الٹے پیچھے کی طرف جانے کے لیے تو وہاں مسلمان اُلٹے پیچھے کی طرف چلے جاتے ہیں اور جہاں مسلمانوں کا دل نہ آگے بڑھنے کو چاہتا ہے اور نہ الٹے پیچھے جانے کو وہاں مسلمان وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اس لیے آپ مسلمانوں کے بارے میں یہ "عمومی" سا سوال مت پوچھیے۔ ہاں خصوصی طور پر کسی جگہ کے مسلمانوں کی بابت آپ یہ جاننا چاہیں کہ وہ تعلیم میں آگے بڑھے یا نہیں تو اس جگہ معلوم کرنے کی کوشش کیجیے۔

چنانچہ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ۱۹۷۶ء سے لے کر اب تک یعنی بارہ سال میں ہائی اسکول بورڈ امتحان کی سطح پر مراد آباد شہر کے مسلم اداروں میں مسلمان آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے۔ تو کیا پتہ چلا؟

اب آپ پوچھتے ہیں تو دیکھیے۔ کیا دیکھیں؟ چارٹ دیکھیے! اس میں مراد آباد شہر کے چار مسلم اداروں کے ۱۹۷۶ء کے نتائج اور پھر ان ہی اداروں کے ۱۹۸۸ء کے نتائج درج ہیں۔ ان اداروں میں صرف مسلم بچے پڑھتے ہیں۔ چاروں سے ملا کر ۱۹۷۶ء میں تین سو تیس طلباء و طالبات ہائی اسکول بورڈ امتحان میں شریک ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں چھ سو نو شریک ہوئے۔ دو سو اناسی عدد کا یہ اضافہ بچاسی فیصد ہے یعنی بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے بچوں کی تعداد قریب دوگنی ہو گئی بارہ سال میں۔

اب اگر آپ خوشی سے تالیاں بجا کر کہیں کہ "وہ مارا پاپڑ والے کو" تو عرض کرنا پڑے گا کہ جی نہیں پاپڑ والے کو بالکل نہیں مارا۔ کیونکہ اتنے عرصے میں یو۔پی میں پورے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے بچوں کی تعداد بھی لگ بھگ دوگنی ہو گئی ہے۔ اسلیے اگر مراد آباد شہر کے چار اداروں میں مسلم بچوں کی تعداد بھی دوگنی ہو گئی تو یہ کوئی اتنے کمال کی بات نہیں ہے۔ اتنا اضافہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

مگر پاس فیصد کم

۱۹۷۶ء میں ایک سو اکیانوے پاس ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء

* کناٹ پلیس، نئی دہلی۔

... سو چوبیس پاس ہوئے۔ ایک سو تئیس عدد کا یہ اضافہ ستر فیصد ہے۔ اب اگر آپ اتفاق سے بہت نکتہ بیں نکتہ رس نکتہ داں نکتہ چیں قسم کے ہیں تو آپ پوچھیں گے کہ جب شریک ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد پچاسی فیصد بڑھی تو پھر پاس ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد بھی اتنی ہی بڑھنی چاہیے تھی مگر یہ صرف ستر فیصد کیوں بڑھی ؟ جی ہاں۔ آپکا سوال بہت اچھا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ۱۹۷۶ء میں اٹھاون فیصد پاس ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں صرف ۵۳ فیصد پاس ہوئے۔ گویا اوسط پانچ عدد گر گیا۔ تو جناب اگر کہیں پر مسلمان اپنا اوسط پاس فیصد گرا لیں گے تو پھر وہاں پاس ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد اتنی نہیں بڑھے گی جتنی شریک ہونے والوں کی تعداد بڑھی۔ بلکہ اس سے کم بڑھے گی۔ آئی بات سمجھ میں ؟ آگئی تو آگے چلیں۔

شاباش لیکن .....

بارہ سال میں کتنی ترقی؟ (۱۲)

شریک (۱۹۷۶ء)	پاس	فیصد	فرسٹ	ادارہ کا نام	شریک (۱۹۸۸)	پاس	فیصد	فرسٹ
۵۶	۲۸	پچاس	۱	فلاح دارین ہائی اسکول	۸۳	۲۸	چونتیس	۱
۵۵	۳۴	باسٹھ	۱	انصار انٹر کالج	۱۲۰	۴۵	اڑتیس	۵
۱۹	۷	سینتیس	—	مہاسن ہائی اسکول	۱۰۱	انچاس	انچاس	۲
۱۳۰	۶۹	ترپن	۲	تین میں مسلم لڑکے	۳۰۳	۱۲۲	چالیس	۸
۲۰۰	۱۲۲	اکسٹھ	۱	عبدالسلام مسلم گرلز انٹر کالج	۳۰۶	۲۰۲	چھیاسٹھ	۹
۴۳۰	۱۹۱	[illegible]	۳	چاروں میں مسلم لڑکے اور لڑکیاں	۶۰۹	۳۲۴	ترپن	۱۷

اب جناب واقعی خوشی کی بات یہ ہے کہ فرسٹ ڈویژن لانے والے مسلم بچوں کی تعداد ۷۶ء میں صرف تین عدد تھی۔ یہ بڑھ کر ۱۹۸۸ء میں سترہ ہو گئی یعنی قریب چھ گنی۔ شاباش! ایک سو ... بچوں میں سے ساٹھ کا فرسٹ ڈویژن آتی تو یہ بورڈ کے اوسط کے برابر ہوتی۔ صرف سترہ فرسٹ ڈویژن کا مطلب ہے کہ مرادآباد کے چار اداروں میں ہائی اسکول بورڈ امتحان میں فرسٹ ڈویژن لانے کے معاملے میں اب بھی مسلم بچے دوسروں سے کم سے کم تین گنا پیچھے ہیں۔ اس لیے مرادآباد میں ملت کے فرزندان ارجمند اور دختران نیک اختر ذرا اور محنت کریں اور فرسٹ ڈویژن کی تعداد تیزی سے بڑھائیں۔ چھ سو نو میں سے صرف سترہ عدد فرسٹ ڈویژن تو پوری تین فیصد بھی نہیں۔ فرسٹ ڈویژن کا تناسب تیس فیصد تو ہونا ہی چاہیے۔ ہے نا ؟ تو پھر مرادآباد کے ہمارے ان اداروں کے سلمپوز اور سلمہاز ذرا ڈٹ کر محنت کر ڈالیں اور ۱۹۸۹ء میں فرسٹ ڈویژن کی تعداد بڑھا کر دکھائیں۔ شاباش !

الگ الگ دیکھیں

چاروں میں سب سے خراب رزلٹ اس سال فلاح دارین ہائی اسکول کا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں اس اسکول سے پچاس فیصد پاس ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں صرف چونتیس فیصد پاس ہوئے۔ بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے طلبا کی تعداد چھپن سے بڑھ کر بیاسی ہو گئی۔ چھبیس عدد کا یہ اضافہ چھیالیس فیصد ہے۔ یعنی تعداد قریب دو گنی لیکن چونکہ پاس فیصد بری طرح گر گیا۔ اس لیے پاس ہونے والے طلبا کی تعداد اتنی ہی یعنی اٹھائیس[۲۸] عدد رہی۔ فرسٹ ڈویژن کا تناسب ۱۹۷۶ء میں (چھپن میں ایک یعنی قریب) دو فیصد تھا۔ ۱۹۸۸ء میں (بیاسی میں ایک یعنی قریب) ایک فیصد رہ گیا۔ رزلٹ کیوں گرا؟ محترم پرنسپل صاحب اور محترم منیجر صاحب کو لکھا ہے کہ براہ کرم اس بابت کچھ فرمائیں۔ جواب کا انتظار ہے۔

انصار کالج سے بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے طلبا کی تعداد پچپن سے بڑھ کر ایک سو بیس ہو گئی۔ یعنی دو گنی سے زیادہ پینسٹھ عدد کا یہ اضافہ ایک سو اٹھارہ فیصد ہے۔ بہت خوب۔ پاس ہونے والوں کی تعداد چونتیس سے بڑھ کر پینتالیس ہو گئی۔ گیارہ عدد کا یہ اضافہ صرف بتیس فیصد ہے۔ یعنی شریک ہونے والوں کی

تعداد بڑھنے سے جتنا فائدہ ہو سکتا تھا، اس لیے نہیں ہوسکا کہ رزلٹ باسٹھ فیصد سے گر کر صرف انتیس فیصد رہ گیا ۔ کیوں؟ محترم پرنسپل صاحب اور محترم منیجر صاحب اگر بتائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ بہرحال شکر ہے کہ فرسٹ ڈویژن کی تعداد ایک سے بڑھ کر پانچ ہو گئی۔ مبارکباد۔

عباس ہائی اسکول سے شریک ہونے والوں کی تعداد انیس سے بڑھ کر ایک سو ایک ہوئی۔ پانچ گنی سے زیادہ۔ اور چونکہ رزلٹ بھی سینتیس فیصد سے بہتر ہو کر انچاس فیصد پاس ہو گیا۔ اس لیے پاس ہونے والوں کی تعداد سات سے بڑھ کر انچاس ہو گئی یعنی سات گنی۔ فرسٹ ڈویژن بھی صفر سے بڑھ کر دو ہو گئی۔ گویا ہر اعتبار سے بارہ سال میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ مبارکباد۔

تینوں بوائز اداروں میں ملا کر شریک ہونے والوں کی تعداد ایک سو تیس سے بڑھ کر تین سو تیس ہوئی۔ دو گنی سے زیادہ۔ ایک سو پچھتر کا یہ اضافہ ایک سو تینتیس فیصد ہے لیکن چوں کہ رزلٹ ترپن فیصد پاس سے گھٹ کر صرف چالیس فیصد رہ گیا۔ اس لیے پاس ہونے والوں کی تعداد انہتر سے بڑھ کر ایک سو بائیس ہوئی۔ ترپن عدد کا یہ اضافہ صرف ستہتر فیصد ہے۔ فرسٹ ڈویژن کی تعداد دو سے بڑھ کر آٹھ ہو گئی یعنی چار گنی لیکن فرسٹ ڈویژن کا تناسب اتنا نہیں بڑھا۔ ۱۹۷۶ء میں (ایک سو تیس میں سے دو یعنی قریب) ڈیڑھ فیصد طلبا فرسٹ ڈویژن لائے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں (تین سو تیس میں سے آٹھ یعنی قریب) ڈھائی فیصد طلبا فرسٹ ڈویژن لائے۔ یہ اضافہ بارہ سال میں بہت کم ہے ان تین مسلم بوائز اداروں سے دس فیصد یعنی تیس عدد فرسٹ ڈویژن تو آنی ہی چاہیے تھیں۔

مسلم لڑکیاں

عبدالسلام مسلم گرلز انٹر کالج سے شریک ہونے والی طالبات کی تعداد ۱۹۷۶ء میں دو سو تھی، ۱۹۸۸ء میں تین سو چھ ہو گئی۔ ایک سو چھ عدد کا یہ اضافہ ترپن فیصد ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا بارہ سال میں تعداد ڈبل تو ہونی ہی چاہیے تھی۔ اصل میں مراد آباد میں ایک اور مسلم گرلز ہائی اسکول کی شدید اور فوری ضرورت ہے۔ یہ ایک ادارہ مراد آباد کی مسلم لڑکیوں کی تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ بہرحال خوشی کی بات ہے کہ اس موقر کالج کا رزلٹ اکسٹھ فیصد پاس سے بہتر ہو کر چھیاسٹھ فیصد پاس ہو گیا۔ اس طرح پاس ہونے والی طالبات کی تعداد ایک سو بائیس سے بڑھ کر دو سو دو ہو گئی۔ اسی عدد کا یہ اضافہ چھیاسٹھ فیصد ہے۔ یعنی شریک ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد صرف ترپن فیصد بڑھی۔ مگر پاس ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد چھیاسٹھ فیصد بڑھ گئی۔ کیوں کہ پاس فیصد بہتر ہوا۔ فرسٹ ڈویژن لانے والی طالبات کی تعداد ایک سے بڑھ کر نو ہو گئی۔ فرسٹ ڈویژن کا تناسب ۱۹۷۶ء میں (دو سو میں ایک یعنی) آدھا فیصد تھا۔ ۱۹۸۸ء میں (تین سو چھ میں سے نو یعنی) تین فیصد ہو گیا۔ البتہ جیسا کہ اوپر عرض کیا یہ تناسب دس فیصد تو ہونا ہی چاہیے۔

گویا کہ چنانچہ یہ ہیں کچھ باتیں جو ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۸ء کے اعداد کی بنا پر لکھ دیں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ پھر کبھی سہی۔ ابھی تک مراد آباد شہر کے سب سے قدیم مسلم کالج یعنی ہیوٹ مسلم انٹر کالج کا رزلٹ نہیں آیا۔ وہ بھی آجائے تو پھر یہ مطالعہ اور جائزہ زیادہ مکمل ہوگا۔ پورے ضلع مراد آباد میں صرف یہی ایک مسلم انٹر کالج یا ہائی اسکول بچا ہے جہاں سے رزلٹ نہیں آیا۔ فی الحال میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ رہا۔ اگر اب بھی رزلٹ نہیں آیا تو پھر اس کالج کے بارے میں فائل دیکھ کر زیادہ تفصیل سے کچھ لکھنا ہوگا۔ اگر اس کالج کے ذمہ داران یہی چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اب بھی رزلٹ نہ بھیجیں۔

> "اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق لو۔"
>
> (النحل۔ پ ۱۴، ۱۴–۱۳)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸، شمارہ ۲ (فروری ۸۹ء)

ذہنی علالتیں اور ان کے اسباب

بختیار فاطمی

ذہنی علالتوں سے مراد ہمارے ذہنی نظام میں وہ گڑبڑ ہے جس کی وجہ سے صحیح سالم دماغ رکھنے کے باوجود ہم اپنے ماحول کی مطابقت سے صحیح اعمال کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور جو عمل ظاہر ہوتے ہیں وہ دوسروں کو قطعی بے معنی اور اجنبی نظر آتے ہیں۔ روزانہ کے میل ملاپ اور راہ و رسم میں جس شخص کو بھی ہم موقع محل کے لحاظ سے غلط اور عجیب حرکات کرتے دیکھتے ہیں ہم فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس شخص کی دماغی مشین کا کوئی پیچ ڈھیلا ہوگیا ہے اگر یہی طرز رویہ حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو ہم اسے دماغ کی خرابی سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں مریض کسی بھی ذمہ دارانہ کام کے لائق نہیں سمجھا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں ترقی یافتہ ممالک میں دماغی توازن کھو بیٹھنے والے ایسے مریضوں کے علاج کے لیے خاص اسپتال کھولے گئے ہیں، جہاں بڑے بڑے ماہر نفسیات مریضوں کا ذہنی علاج نفسیاتی اصول کے ماتحت اسی تندہی اور جاں فشانی سے کرتے ہیں جس طرح کسی بھی دوسرے جسمانی مریضوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ چند ہی روز بعد دوسرے معمولی مریضوں کے مانند یہ مریض بھی صحت مند ہوکر دنیا میں آجاتے ہیں اور اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے لگتے ہیں جس کی امید ایک "باہوش" شخص سے کی جاتی ہے۔

جدید تجربات اور تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ پاگلوں کی حرکات اور اعمال بے مقصد اور بے معنی نہیں ہوتے بلکہ نہایت ہی پیچیدہ اسباب کے نتائج ہوتے ہیں جسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نکتہ کو مدنظر رکھا جائے کہ انسانی شخصیت اور کردار کی اصل اس کی فطری جبلتیں ہوتی ہیں۔ جو خارجی دنیا کی اشیاء اور حالات پر مرتکز ہوکر جذبات کا ایک نظام تیار کرلیتی ہے۔ اس نظام میں توانا جذبات کمزور جذبات پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ سب سے عمدہ کردار اور شخصیت وہ ہوتی ہے جس میں انسان کے تمام جذبات اپنی اپنی مناسب جگہوں پر وقت اور برتری کے لحاظ سے ایک منظم رشتہ میں بندھے ہوتے ہیں۔ جبلتیں جذبہ خودشناسی کے تحت انجام پاتی ہیں لیکن غیر معمولی حالت یا ذہنی علالت کے دوران ماحول کے بڑھتے ہوئے مطالبات انسان کے فطری رجحانات اور جبلتوں کے خلاف اعمال کے متقاضی ہوتے ہیں۔ مریض ان تقاضوں کو اپنی فطرت کے خلاف پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ان تمام جذبات اور خواہشات کو دباتا رہتا ہے جو حالات سے باغی ہونے پر کمربستہ رہتی ہیں لیکن خارجی مطالبات اور داخلی رجحانات کی یہ رسہ کشی زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی اور بالآخر فیصلہ یک طرفہ ہو جاتا ہے۔ مضبوط کردار کے حامل تو ایسے جذبات کو ہمیشہ کے لیے پسپا کر دیتے ہیں یا ان کو عمل کے ذریعہ ظاہر ہونے کی اجازت دے دیتے ہیں لیکن جن اشخاص میں ایسی قوت موجود نہیں ہوتی ان کی دبی ہوئی جبلتیں جذبہ خودآگاہی سے باغی ہوکر اپنے اظہار کا راستہ ڈھونڈھ لیتی ہیں۔

٭ نیو کریم گنج، گیا - ۸۲۳۰۰۱ - بہار

ذہنی عدم توازن کشمکش اور تنازع کا ہی نتیجہ ہوتا ہے جو دو متضاد جبلتوں یا ان سے پیدا شدہ جذبات میں برپا ہو جاتا ہے اور یا تو مریض کے کردار کی کمزوری کا یا پھر باطنی عناصر کی حد سے زیادہ قوت اور خواہش کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کی "قوت ضابطہ" سے آزاد ہو کر اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ذہنی توازن اور ہم آہنگی کو ختم کر دینے والے ان سست مگر تدریجی اسباب کے علاوہ اکثر وجوہات فوری بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو عموماً کسی سخت جذباتی صدمے کے نتائج ہوتے ہیں۔ عام زندگی میں ایسی مثالیں کسی عزیز یا رشتہ دار کی اچانک موت یا کسی فوری حادثے پر ملتی ہیں۔ ایسے حادثات اس شدت سے ذہن پر اثر ڈالتے ہیں کہ اکثر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے

کبھی کبھی جذبات کی رو میں سنگین جرم کے ارتکاب کے بعد اس کی اہمیت سے آگاہی اور اپنی غلطی کے احساس کے صدمے سے بھی انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن اس قسم کی کیفیات سب سے زیادہ لڑائی کے میدان میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بم وغیرہ کے پھٹنے کے شدید اور ہولناک آواز سے ایسا سخت صدمہ دل و دماغ کو پہنچتا ہے کہ اکثر سپاہیوں کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ ایسے صدماتی موقعوں پر نفسیاتی عمل یہ ہوتا ہے کہ خارجی دنیا کا کوئی محرک ہماری جبلتوں میں سے کسی ایک جبلت کو اس شدت کے ساتھ تحریک میں لاتا ہے کہ وہ ذہن کے باقی تمام حصوں کی قوت کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، جس سے ان ارکان کے کام بند ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ بم کی آواز سے متاثر ہو کر ایک سپاہی نے چیخنے کے لیے منہ پھیلایا لیکن شدت آواز سے اس کے اعضا تنگ اور بے حس ہو گئے اور نہ صرف یہ کہ وہ کوئی آواز

پیدا نہ کرسکا بلکہ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور گزشتہ ساری یادیں اس کے دماغ سے محو ہو گئیں۔ ہوا یہ کہ بم کے دھماکے سے سپاہی کی جبلت فرار اور اس سے پیدا شدہ جذبہ نے خوف کو اس شدت کے ساتھ ابھارا کہ دوسرے نظاموں کی قوت بھی اس نے سلب کر لی اور اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔

دماغ کی خرابی (ذہنی علالت) کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ یعنی اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو کسی ایک طرف کسی ایک طرح کے افعال کو موزونیت کے ساتھ بجا لانے میں دقت و دشواری پیش آتی ہے لیکن دوسری حرکات و اعمال میں وہ کسی بھی باہوش اور عقل مند آدمی سے کم نہیں ہے۔ اس سے ایک قدم آگے وہ مریض ہیں جو اپنے ماحول کو سمجھنے اور اس کی مناسبت سے صحیح ردّ عمل پیدا کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن جو کچھ بھی کرتے ہیں اسے اپنی حرکت سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ شعوری دنیا سے ہٹ کر لاشعوری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں اور وہی ان کے لیے ٹھوس حقیقت بن جاتی ہے لیکن سب سے خطرناک حالت وہ ہے جس میں مریض کو اپنا بھی ہوش نہ ہو اور وہ اپنی بھلائی برائی کے وجود، عدم وجود، آرام و تکلیف غرض کہ اپنی خود آگاہی کو فراموش کر دے۔ ایسے امراض کے علاج میں فنی طریقوں سے مریض پر یہ واضح کر دیا جاتا ہے کہ اس کی بیماری کن وجوہات سے ہے اور اگر ان وجوہات کو (جن کو اپنانے سے انکار کرنے کی وجہ سے مریض کے اندر کشمکش پیدا ہو جاتی ہے) وہ ایمان داری سے اپنی کمی اور کمزوری سمجھ لے تو اس کی بیماری دور ہو سکتی ہے۔ چوں کہ THE RAPIST کے ذریعہ مریض سے نہایت آہستگی اور اطمینان سے باتیں کر کے اس کا بھروسہ اور اعتبار قائم

> "اگر کوئی مذہب سچ ہے اور معتقد اس کو خدا کی طرف سے جانتے ہیں تو ان کو یقین کرنا چاہیے کہ اس میں باہم انسانوں میں محبت اور ہمدردی کا پیدا کرنا سب سے بڑا فرض ہے۔ پس اگر اس فرض کو ہمیشہ خیال میں رکھیں تو کسی مذہب سے انسان کے دل میں بغض و حسد کینہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا تو یہی یقین ہے اور اسی پر برتاؤ ہے۔"
>
> سر سید احمد خاں

کیا جاتا ہے۔ اس لیے مریض بھی حتی الامکان بیماری کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنی صحت مندی کی حالت پر آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے دماغ کو صحت مند حالت میں اس وقت رکھ سکتے ہیں جب کہ ہم خود اپنے ضمیر اور اپنی فطرت کے ساتھ ایمان دار رہیں۔ اگر بالفرض ہم میں کسی چیز کی کمی ہے تو اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے غلط ردعمل اور غلط قسم کے حسن ظن سے جو مہلک نتائج برآمد ہوتے ہیں اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنی کمزوری کا اعتراف کرلیں اور اسے پورا کرنے کے لیے کسی اور صحت مند راستے کی طرف رجوع کریں۔ مثلاً خوف انسان کا ایک فطری جذبہ ہے اور ظاہر ہے کہ لڑائی کے میدان میں سپاہی لاکھ بہادری دکھلائے لیکن کوئی نہ کوئی وقت ایسا ضرور آتا ہے جب سپاہیوں کو اپنی جان بچانے کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن چوں کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے سپاہی کے لیے موت سے ڈرنا ایک ذلیل امر خیال کیا جاتا ہے اس لیے وہ ایسے مواقع پر آکر سچے دل سے اعتراف نہیں کرتے کہ ہاں کہ وہ موت سے خائف اور زندگی کے خواہاں ہیں نتیجتاً ان کی جبلت خوف اور جذبۂ خود فرازی اور غرور میں کشمکش پیدا ہو کر طرح طرح کی ذہنی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہیں۔

چنانچہ خود شناسی یعنی اپنی فطرت آپ پہچاننے کی عادت ہی تمام ذہنی الجھنوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ آپ کے سامنے جو بھی مسائل ہیں ان کا حل ٹھنڈے دماغ سے سوچیے۔ اپنی عادات، اپنے رجحانات اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اعمال کا دوسروں پر اثر، غرض کہ ہر پہلو پر غور کیجیے اور فوراً فیصلہ کیجیے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ لیکن یہ فیصلہ ذہن کی عمیق ترین گہرائیوں سے یعنی آپ کی خواہشات اور آپ کے رجحانات کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔ تاکہ پھر بعد میں آپ کی پُرسکون زندگی میں کسی قسم کی ہلچل نہ پیدا ہو جائے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ آپ اپنی ہر خواہش کو بے لگام چھوڑ دیجیے بلکہ ان کے طریق اظہار کو بدل کر انہیں تسلی اور سکون بخشیے اور آرام و اطمینان کی زندگی بسر کیجیے۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔ لین دین ہونا چاہیے آپس کی رضامندی سے اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔"

(النساء۔ پ ۴۔ ر۔ ۵)

احساسِ زیاں

جب تک کوئی شخص اپنی بھول کو بھول تصور نہیں کرتا۔ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کو بُرا نہیں سمجھتا، تب تک وہ خود کو صحیح اور مکمل سمجھتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسے اشخاص کی کمی نہیں۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ خطرناک اس لیے کہ جب تک ہم اپنی بھول اور کوتاہیوں کو اپنی خامی شمار نہیں کرتے۔ ہم بار بار اسی بھول اور کوتاہی کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح ہم وہ نہیں کر پاتے جو ہمیں کرنا چاہیے۔

آج مسلم معاشرے کی حالت بالکل اسی شخص کی سی ہے جو اپنی بھول کو بھول تصور نہیں کرتا، اپنی کوتاہیوں اور خامیوں پر نادم نہیں ہوتا اور ساری زندگی غلط کو صحیح اور اپنی ناکامیوں کو کامیابیوں میں شمار کرتا ہے۔ اس فریبِ مسلسل کا نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ اور نہیں۔

کوئی شخص، کوئی معاشرہ یا کوئی قوم اس وقت تک کامیابی اور سرخروئی حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اسے اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا احساس اس کو کچوکے نہ لگانے لگے اور پھر وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر ڈھونڈ نہ نکالے۔ مگر اپنی کوتاہیوں اور خامیوں سے نجات کی تدبیر تو اسی وقت کی جا سکتی ہے جب اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا احساس بھی ہو۔ مسلم معاشرے کا المیہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو اپنی کوتاہیوں، اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اپنی زبوں حالی اور بدحالی کا احساس نہیں بلکہ المیہ یہ ہے کہ

"پدرم سلطان بود"

اور

"ہم چوں منے دیگرے نیست"

کا بھوت اب تک اس کے سر پر سوار ہے۔

اس وقت مجھے سرسیدؒ کی وہ تحریر یاد آرہی ہے جس میں انھوں نے اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے،

"دنیا میں کسی قوم کی ترقی کے یہی دو نشان ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ وہ ذلت اور خرابی میں مبتلا ہیں اور دوسرا نشان یہ ہے کہ اس ذلت سے نکلنے کی کچھ کوشش شروع کر دیں۔"

سرسیدؒ نے اس حقیقت کو پالیا تھا، اس لیے انھوں نے مسلم معاشرے میں موجودہ خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی اپنے خلوص کے ساتھ شروع کی تھی۔ انھوں نے نہ صرف نشان دہی کی بلکہ اسی کے ساتھ ہی ساتھ نجات کی راہ بھی سجھائی — محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام، سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد اور تہذیب الاخلاق کا اجراء اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

---

* سکریٹری مسلم یوتھ سوسائٹی، پوسٹ ڈاکخانہ دھوئی، دربھنگہ، بہار

آج اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ مسلم معاشرے کو اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا، کمزوریوں اور محرومیوں کا احساس دلایا جائے اور اپنی زبوں حالی اور بدحالی کی طرف توجہ دلائی جائے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر اسے بیدار کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

مسلم معاشرے میں موجود عام خرابیاں اور کمزوریاں سب کے سامنے ہیں۔ ناخواندگی، افلاس، بے حسی، مذہب سے دوری، احساس کمتری، تنظیم و تحریک کی کمی مگر

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں

جیسی خوش فہمی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ ان خامیوں اور کوتاہیوں اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی زبوں حالی اور تنگ دامانی کا احساس اس طرح دلایا جائے کہ اسے اس بات کا پورا یقین ہو جائے کہ اگر وہ اسی طرح بے حسی کی چادر اوڑھ کر کوتاہیوں اور خوش فہمیوں کا شکار رہا تو اس کی تباہی دور نہیں۔

اگر کسی فرد یا قوم میں صحیح معنوں میں احساس زیاں پیدا ہو جائے تو اس کی زندگی اور زمانے کا ہم گام بنانا چنداں دشوار نہیں ہوتا۔

"قرآن کریم میں زور صرف عقیدہ رکھنے پر ہی نہیں بلکہ عمل پر بھی دیا گیا ہے۔ یہ بات زمانۂ حال کے مسلمانوں پر بھی چسپاں ہوتی ہے جو اپنے عقائد کا اظہار تو بڑے زور و شور سے کرتے ہیں مگر جن کے اعمال قرآنی تعلیمات، اعلیٰ اقدار، فراست، منصف مزاجی، خیر سگالی، رواداری اور فراخ دلی سے کوسوں دور ہیں۔ کاش آج کے مسلمان قرآن کریم کی ان واضح ہدایات پر عمل پیرا ہوتے۔"

سید ہاشم علی

شاہجہاں پور میں یوم سرسید

افتخار احمد خاں*

گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی ۱۷ر اکتوبر کو ضلع کے اسلامیہ انٹر کالج میں کالج کی انتظامیہ اور کچھ علیگ برادران نے مل کر یوم سرسید کی تقریبات کا اہتمام کیا جس میں شہر کی بہت سی معزز و مقتدر ہستیاں، وکلا، ڈاکٹر، انجینیر، ٹیچرس اور دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے شرکت کی۔

جلسہ شام چھ بجے سے شروع ہوا اور رات کو ساڑھے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔ پچھلی روایت سے کچھ ہٹ کر اس بار جلسے میں مہمان خصوصی کے طور پر علیگ برادر جناب راجندر سکار گوئل کو مدعو کیا گیا تھا جنھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل۔ایل ایم کیا ہے اور آج کل شہر میں ایس۔ڈی۔ایم صدر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ مہمان خصوصی علی گڑھ کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بالکل صحیح وقت پر جلسہ میں تشریف لے آئے۔ جلسے کے آغاز کے لیے سب سے پہلے مہمان خصوصی کو ڈائس پر بلایا گیا۔ اس کے بعد صدر کی حیثیت سے شہر کی ایک معزز ہستی جناب عزیز الرحمان خاں صاحب کو بلایا گیا جو اپنی علالت کے باوجود سرسید تقریبات میں تشریف لائے لیکن ناسازیٔ طبع کی بنا پر پورے وقت اس میں تشریف نہ رکھ سکے۔ ان کے بعد شہر کی اور معزز ہستی محمد احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ کو صدارت کے فرائض سونپے گئے۔ ڈائس پر شہر کے سب سے سینیر علیگ بزرگ جناب تقی احمد صدیقی بھی موجود تھے

صدر کی اجازت سے جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا اس کے بعد تقاریر کا اور مقالوں کا آغاز ہوا۔ جلسے کے کنوینر جناب مشہود جمال صاحب نے اپنے استقبالیہ جلسے میں کہا کہ سرسید احمد خاں کو صرف انسان اور مسلم دوست کہہ دینا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ وہ ایک انجمن تھے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی وہ موقع شناس شخصیت کے مالک تھے۔ انگریزوں کے دور میں جب انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان کے مسلمان کو انگریز کس بری طرح ہر شعبے میں پامال کر رہے ہیں تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ انگریزوں کا اس کے ہی علم اور انگریزی زبان سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی روح پھونکی اور مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی جو آج مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ایک تناور درخت بن کر لوگوں کو اپنی علم کی پیاس بجھانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

جناب وصی احمد صدیقی، جو یہاں کے پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج کے پرنسپل ہیں اور ریاضی کے استاد، انھوں نے کہا کہ چوں کہ میری ساری عمر ریاضی پڑھتے اور پڑھاتے ہی گزری ہے اور مجھ کو تقاریر کا تجربہ بھی کوئی خاص نہیں ہے، پھر بھی یہ موقع ایسا ہے کہ میرے دل کی گہرائیوں سے خود بخود کچھ الفاظ نکلنے کو

---

* ایڈوکیٹ، شاہجہاں پور ۔ ۲۴۲۰۰۱ ۔ یو۔پی

بے تاب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک ایسے شخص کے بارے میں کچھ
بولنا بہت ہی مشکل کام ہے جس کے بارے میں خاص وعام سب
اچھی طرح جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سرسید تعلیم کا ایک سرچشمہ
تھے جو کبھی نہ ختم ہوسکے گا۔ انھوں نے تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان
کے لیے جتنا کیا ہے بہت کم لوگ اتنا کرسکے ہیں اور اب یہ ہماری
ذمہ داری ہے کہ ہم اُن کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلیں اور
دوسروں کو چلنے میں مدد دیں۔

شہر کی ایک معزز ہستی جناب ملک محمد اسماعیل خاں صاحب
نے بھی ایک مقالہ پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا، جس میں انھوں نے سرسید
کی کچھ خاص خوبیوں کا بھی ذکر اپنے دل کش پیرائے میں کیا۔

جناب ممتاز علی میاں شہر کی ایک مقبول شخصیت ہیں۔ کوئی
بھی ادبی اور معیاری نشست ان کے بغیر سونی ہوتی ہے۔ انھوں
نے سرسید پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا۔

انھوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ قدرت نے سرسید کو
ان کا امتحان لینے کے لیے اُس دور میں پیدا کیا جب مسلمانوں کا تعلیمی
معیار گرتا چلا جارہا تھا اور مسلمان انگریزوں کے برپا کیے ہوئے
ظلم وستم سے بہت خوف زدہ تھے۔ اس وقت سرسید احمد خاں
مسلمانوں کے مسیحا بن کر آئے اور انھوں نے مسلمانوں میں
علم کی ایسی روح پھونکی جس نے ہر شخص کو متاثر کر دیا۔

جناب بی۔ ڈی۔ مشرا جو شہر کی محفلوں کی جانی مانی شخصیت
ہیں انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر سرسید احمد خاں نہ ہوتے
تو آج ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی حیثیت شاید ایسی نہ ہوتی۔

شہر کے سب سے سینیئر علیگ برادر جناب تقی احمد
صدیقی صاحب نے کہا کہ ہر بار کی طرح نشستاً، گفتنً و برخاستً
سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اگر آج کے دن کوئی تعلیمی مرکز اور تعلیمی
ادارہ کھولیں، کوئی ٹریننگ سینٹر شروع کریں، کسی مسلم بچے کو اس
کی پڑھائی کے دوران میں آگے بڑھائیں، کسی غریب طالب علم کی
مالی امداد کریں، کسی تعلیم یافتہ مسلمان کو سروس دلوادیں یا
کوئی ایسا فنڈ قایم کرسکیں جو سرسید مرحوم کے اس تعلیمی اور
تربیتی مشن کو اور آگے کی جانب لے جاسکے تو یہ سرسید رحمۃ اللہ
علیہ کو آج سب سے بڑا خراج عقیدت ہوگا

انھوں نے جلسے میں موجود حاضرین سے کہا کہ اگر ہم سب
اپنی ایک ہفتہ کی آمدنی جمع کریں تو اس سے ایک بڑا فنڈ
قایم ہوسکتا ہے اور اس فنڈ سے ہمیں سرسید احمد خاں
مرحوم کے تعلیمی اور تربیتی مشن کو اور آگے بڑھانے میں بڑا
مدد ملے گی۔

آخر میں مہمان خصوصی جناب آر۔ کے۔ گوئل علیگ
نے اپنی مختصر لیکن جذباتی تقریر میں اس بات پر فخر کا اظہار
کیا کہ شہر کی اولڈ بوائز کمیٹی نے ان کو اپنی تقریب میں مہمان
خصوصی کے طور پر بلایا۔ موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے
تعلیمی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے دور میں وہاں
کا ماحول اتنا اچھا اور صاف تھا کہ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کون
ہندو ہے اور کون مسلمان۔ ذات پات، مذہب اور چھوت
چھات کی بنا پر کسی سے کوئی برا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص
کو اپنے عقائد اور خیالات کے سلسلے میں اجازت تھی کہ وہ اس
پر عمل کرے۔

انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے تعلیمی معیار کا ذکر کرتے ہوئے
بتایا کہ جس سال وہ پی سی ایس میں آئے اس سال اس یونیورسٹی
سے ۲۴ لڑکے منتخب ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے پرانے علیگ
بھائی اللہ رحم صاحب ایڈیشنل سیشن جج غازی آباد کا ذکر
کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کس طرح سب کو گائڈ کرتے تھے
انھوں نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ سرسید مرحوم کو صحیح خراج
عقیدت یہی ہوگا کہ ہم سب تسلیم کریں کہ ان کا مشن انسانیت سے
جہالت کو مٹانا تھا

آخر میں جلسے کے صدر جناب محمد احمد خان علیگ اور کالج
کے پرنسپل جناب اقرار احمد خاں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا
شرکا کی چائے وغیرہ سے تواضع کی گئی۔

●●●●●●●

ماہنامہ تہذیب الاخلاق

بانی : سرسید احمد خاںؒ

مارچ ۸۹ء

ایک دور وہ تھا

جب مسلمان عالمی تجارت کے امام تھے اور ایک مسلمان عالم ابوالقاسم مسلم بن محمد لیطی (متوفی ۱۰۰۷ء) نے تجارتی حساب پر ایک گرانقدر کتاب " المعاملات " لکھی تھی جس کا کئی یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہوا

ایک دور یہ ہے

جب مسلمان عالمی تجارت کے میدان میں مفقود بھی نہیں اور تجارتی امور میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے بند ہیں۔

کہاں کل کی بلندی۔ کہاں آج کا زوال

ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ اشاعت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجلس ادارت

اغراض و مقاصد

۱. جہل، رجعت، بے حسی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد ۔ ذہنی بیداری، دلسوزی اور مروت داری کی روایت کا احیاء ۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت ۔

۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت ۔

۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش ۔

۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی ۔

۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا ۔

۶. سائنسی علوم وفنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت ۔

۷. علوم وفنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف ۔

مقالہ نگاروں کیلئے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے ۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مضامین کو ترجیح دی جائے گی ۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں ۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی ۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے

مسودہ ٹائپ شدہ یا خوشخط 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر ایک طرف دو سطروں کے درمیان مناسب فاصلہ چھوڑ کر لکھے گئے ہوں اور اصل مسودات ارسال کئے جائیں ۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں ۔ شکلیں سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر انداز میں ہوں ۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر لگے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو ۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالہ کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے ۔ باہر سے آنیوالے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو ۔

جلد ۸

شمارہ ۳

مارچ ۸۹ء

سرپرست : جناب سید حامد
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : اسرار احمد ——— جوائنٹ ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : شباب الدین

تزئین : سرفراز ——— انچارج سرکولیشن : مستقیم احمد

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ	زرِ سالانہ	ترسیل زر کا پتہ :
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	انڈیا Rs. 30.00	ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت	بیرونی ممالک US $ 20.00 ہوائی ڈاک	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	عام ڈاک US $ 8.00	Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT.
انڈیا۔		ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

مندرجات

اداریہ

ہمارے ایک موقر عالم دین نے اپنے "رشحات" میں مسلمان عوام وخواص کو اس بات پر لایق تبریک گردانا ہے کہ انھوں نے نامساعد بہ الفاظِ دگر مخالفانہ ماحول میں اپنے تشخص وامتیاز کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اس کے حصول وبقا کے لیے "اقدامی پوزیشن" حاصل کی ہے اور زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن ان کو شکوہ ہے کہ "اِس وقت مسلم جماعتوں کا کام صرف اپنے حلقے اور مخصوص پروگرام تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔" جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان جماعتوں کی جدوجہد کے باوجود کوئی دیرپا اور انقلاب انگیز اثر پیدا نہیں ہونے پاتا۔

مندرجہ بالا سطور میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق ہماری انفرادی زندگی سے ہے اور دوسرے کا اجتماعی زندگی سے۔ اپنے تشخص وامتیاز کو برقرار رکھنا اور اس کے حصول کے لیے "اقدامی پوزیشن" حاصل کرنا، انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جہاں تک ہماری اجتماعی زندگی کا سوال ہے ہمارے لایق احترام بزرگ نے بلاشبہ یہ بات بالکل درست تحریر فرمائی ہے کہ مسلم جماعتوں نے اپنے آپ کو اپنے مخصوص پروگراموں اور تنگ حلقوں میں محصور کر رکھا ہے۔ ان کے مخصوص حلقوں کے باہر کیا ہو رہا ہے؟ فتنہ و فساد کے دروازے کہاں کہاں اور کس کس عنوان سے کھل رہے ہیں؟ ملت کی تباہی وبربادی کن کن خوش رنگ اور دلفریب لبادوں میں ملبوس شب خون مار رہی ہے؟ نفسانیت اور دوسروں پر اپنی برتری جتانے کا جذبہ کن کن خوش کُن اور دل آویز فلسفوں کی نقاب اپنے منہ پر ڈالے ہمارے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے؟ ان تمام باتوں پر انفرادی طور سے تو غور وفکر کر بھی لیا جاتا ہے مگر اجتماعی طور پر ان مسائل کی سنگینی کا ابھی تک احساس نہیں کیا جا سکا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ صورت حال جزو کو کُل سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جزو کو کُل سمجھ لینا وہ مرض ہے جو ہماری تمام جماعتوں کی شناخت بن چکا ہے اور ہماری ہر جماعت کا اصرار صرف اتنی سی بات پر ہے کہ جزو کو کل سمجھا جائے۔ ہماری نیم ثقافتی، نیم مذہبی جماعتیں ہوں یا خالص دینی سیاسی جماعتیں سب ہی نے کسی نہ کسی ایک جز کو پکڑ رکھا ہے اور اسی جزو کے حصول کے لیے افراد کی بہترین صلاحیتیں، وقت اور سرمایہ سب کچھ صرف کیا جا رہا ہے۔ گو کہ ان میں خلوص، محنت اور لگن کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے مگر ان کے ذریعے سے انقلاب انگیز فکر ونظر صرف اسی لیے پیدا نہیں ہو رہی ہے کہ ان کا ہدف اصلی جزو ہے کُل نہیں۔ ہماری تعلیمی جماعتیں اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف بے مقصد علم کے حصول کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں اور دیگر تمام مسایل کی طرف سے انھوں نے اس طرح آنکھیں بند کر رکھی ہیں گویا کہ ان مسائل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ہماری نیم ثقافتی نیم مذہبی جماعتوں نے بھی یہی روش اختیار کر رکھی ہے۔ اب رہ گئیں خالص دینی جماعتیں۔ یہ وہ مقدس جماعتیں ہیں جن کے بارے میں اسی کو لب کشائی کرنی چاہیے جو خود اسی تقدس مآب طبقہ کا کوئی فرد ہو۔ یہ ہمارے جیسے عاصی کا نہ منصب ہے اور نہ ہی ہم اس کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

اعتراف عجز ونارسائی کے باوجود یہ کہے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مذہبی جماعتیں فعال وسرگرم

ہیں اور جن سے مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد وابستہ ہے۔ ان جماعتوں میں بھی کُل کو کُل سمجھنے والے اگر معدوم نہیں تو انگشت شمار ضرور ہیں۔ کسی جماعت کے نزدیک صرف ایک فقہی مسلک درست ہے بقیہ سب کے سب ضال و مضل۔ کسی جماعت کے نزدیک مومن کا کارِ منصبی یہ ہے کہ وہ کسی کو اسلامی تعلیمات کی دعوت دے یا نہ دے، بہر حال اس کو اپنے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگوں کی تکفیر کرتے رہنا چاہیے۔ کسی جماعت کے نزدیک قرطاس و قلم ہی کُل ہیں تو کسی کے نزدیک بے سر و پا غیر منطقی و عقلی مجرد دوڑ دھوپ اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنے ساتھ موقع ہوا تو جبراً، ڈرا دھمکا کر یا مصلحت دیکھی تو خوشامد کر کے چند قدم ساتھ لے کر چلنا اور اس بات پر خوشی سے پھولے نہ سمانا کہ ہم نے ثوابِ دارین حاصل کر لیا ہے، کُل کا درجہ رکھتا ہے۔ صورتِ حال جب یہ ہو تو فکر و نظر میں انقلاب پیدا ہو تو کہاں سے ؟ خلوص و للّٰہیت کی دولت بیدار ملے تو کیسے ؟

اگر مسلمانوں کی فعال جماعتیں گروہی، جماعتی اور فقہی عصبیتوں کو ختم کر سکیں، ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ چلنے کا اپنا بھولا سبق یاد کر سکیں نفسانیت کی عبائے صد رنگ اور ریا کی قبائے شوخ و شنگ کو پارہ پارہ کر سکیں۔ جزو کو جزو اور کُل کو کُل نہ صرف سمجھنے لگیں بلکہ ان کی اہمیت و معنویت دونوں ہی سے آشنا و آگاہ ہو سکیں، گروہی عصبیت سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک دوسرے کی تکفیر کا مشغلہ ترک کر سکیں جس انسان میں جو صلاحیت پوشیدہ ہے اس کو ابھار کر اس سے کام لے سکیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ جو کچھ کریں اس کا منتہا و مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کی جماعتوں کے ذریعے دور رس اور انقلاب انگیز اثرات معرضِ وجود میں نہ آئیں لیکن اس راہ پر چلنے کے لیے ایک اور صرف ایک لازمی شرط ہے جس کو فارسی کے ایک شاعر نے ایک مصرعے میں بیان کر دیا ہے ؏

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

ہماری کوئی بھی جماعت ہو، وہ کسی بھی جزو کو کیوں نہ اپنائے ہوئے ہو، اس کا رنگ و آہنگ دونوں ہی خوش کُن کیوں نہ ہو، ابھی تک فلاں ابن فلاں کے تصور کو نہ صرف اپنائے ہوئے ہے بلکہ اس سے آگے کی چیز دیکھنے سے قاصر ہے۔ جس دن مسلمانوں کی جماعتوں سے یہ تصور جاتا رہے گا وہی دن ہماری ملی زندگی کا سنہرا دن ہوگا اور اسی دن ہمارا کارواں اپنے اصل مقصود کی طرف جادہ پیما ہو جائے گا۔

کبیر احمد جائسی

ہندوؤں اور مسلمانوں میں ارتباط

سر سید احمد خاں

جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت وارتباط ہندو اور مسلمانوں میں ترقی پکڑتا جاوے، ہم کو نہایت خوش گوار معلوم ہوتا ہے ہندوؤں کی آریہ قومیں بھی خاص ہندوستان کی رہنے والی نہیں ہیں. دوسرے ملکوں سے آکر ہندوستان میں فتح مندی کے ساتھ آباد ہوئی ہیں۔ ان کے ہندوستان میں آباد ہونے کو زمانہ کثیر گزر گیا جس کے سبب وہ ہندوستان کے متوطن اور ہندوستان کے رہنے والے ہندو کہلائے۔ مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ ان کی بھی متعدد پشتیں ہندوستان ہی کی زمین پر گزر رہی ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جاسکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں ——— پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغایرت نہیں ہے۔ جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاسکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوب صورت دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جاوے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے۔ بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں۔ پس جس قدر ان دونوں قوموں میں زیادہ تر محبت، زیادہ تر اخلاص زیادہ تر ایک دوسرے کی امداد بڑھتی جاوے اور ایک دوسرے کو مثل بھائی کے سمجھیں، کیونکہ ہم وطن بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں، اسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے.

اس زمانے میں تین باتوں سے محبت واخلاص کا علانیہ ثبوت دیا گیا ہے.

سب سے اول یہ بات ہے کہ ان دنوں میں سلطان (روم) کی یونان پر فتح ہونے کی اکثر جگہ مسلمانوں نے خوشی کی اور مجلسیں آراستہ کیں، شہر میں چراغاں روشن کیے. سلطان کو مبارکباد کے تار بھیجے ہم نے سنا ہے کہ دکن کے ہندوؤں نے بھی اسی طرح خوشی منائی اور سلطان کو مبارکباد کے تار بھیجے، جو کافی ثبوت دونوں قوموں میں اخوت کا ہے. دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ بریلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے. یعنی بقرعید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی بلکہ ہندوؤں کی خاطر سے بکروں اور بھیڑوں کی قربانی کی اور ہندوؤں نے بھی اس بات کا خیال اٹھالیا کہ کوئی مسلمان گائے کی قربانی کا خیال کرتا ہے یا بکرے بھیڑ کی اور ہندوؤں نے محرم کے زمانے میں سبیلیں لگانے اور مسلمانوں کے ساتھ غم میں شریک ہونے کا اقرار کیا ہے. ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر

ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ سول ڈویژن مانک پور گنج ضلع ڈھاکہ میں
ایک مسجد بنانے کی ضرورت ہے اور اس مسجد کی تعمیر کے لیے روپیہ جمع کرنا
چاہیے۔ اس کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں نے شامل ہو کر کمیٹی بنائی اور
ہندو مسلمان مل کر اس کی تعمیر کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا
ہے کہ وہاں کے مسلمان زیادہ غریب اور زیادہ ذلیل ہیں۔ اس لیے
ہندو اس مسجد کی تعمیر کے لیے زیادہ کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس
محبت اور ہمدردی اور باہمی بھیا چارہ پر جو ہندوؤں نے ظاہر کی ہے
دونوں قوموں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ہماری رائے میں جس طرح کہ اختلاف
مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں ہے، سوشل برتاؤ اور باہمی
محبت و اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا۔
اسی طرح پولیٹیکل امور کا اختلاف بھی سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و
اخلاص اور ایک دوسرے کی ہمدردی کا مانع نہیں ہے۔ اس زمانہ
میں ہندو اور مسلمان دونوں گورنمنٹ انگلشیہ کی رعایا ہیں اور
اس کے سایۂ عاطفت میں ہر قسم کی خوشی اور امن و آزادی سے بسر کرتے
ہیں لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ دونوں قوموں کے باہم پولیٹیکل امور میں
اختلاف رائے ہے۔ ہندو اس پولیٹیکل پالیسی کے طرف دار ہیں جو
کانگریس کے اعلیٰ ممبروں یا اس کے حامیوں اور طرف داروں کی ہے
اور جس کا ہر سال مختلف مقامات میں کانگریس کے نام سے اعلان کیا
جاتا ہے اور اس پر زور دیا جاتا ہے۔ مسلمان اس پالیسی کے برخلاف
ہیں۔ لوگ ان پر اتہام لگاتے ہیں کہ گورنمنٹ کے خوشامدی ہیں لیکن
یہ اتہام غلط ہے بلکہ مسلمانوں کے نزدیک ملک کے انتظام اور امن
میں اسی پالیسی سے خلل پڑنے کا اندیشہ ہے اور کسی طرح وہ پالیسی
ہندوستان کی حالت کے مناسب نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم یہ چاہتے ہیں
کہ جس طرح ہم اختلاف مذہب سے قطع نظر کر کے ہندو مسلمانوں میں
دوستی و محبت و یگانگت اور آپس میں ہمدردی کا برتاؤ چاہتے
ہیں اسی طرح پولیٹیکل اختلاف رائے سے بھی قطع نظر کر کے سوشل
امور میں باہم دوستی و محبت و ہمدردی و بھائی بندی کا برتاؤ چاہتے
ہیں اور ہم یقین کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں جو غیر معمولی طریقہ پر ہندوؤں
نے مسلمانوں کے ساتھ بھائی بندی و ہمدردی کا اظہار کیا ہے وہ ایک
دعوا کا مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کا نہیں ہے، بلکہ سچی
بھائی بندی، سچی ہمدردی اور سچی ہم وطنی کا سبب ہے اور ہم خدا
سے دعا کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہو۔

"عزیزو! تعلیم اگر اس کے ساتھ تربیت نہ ہو اور جس
تعلیم سے قوم قوم نہ بن سکے، وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے
لائق نہیں ہے۔ پس انگریزی پڑھ لینا اور بی۔ اے اور
ایم۔ اے ہو جانا جب تک کہ اس کے ساتھ تربیت اور
قومیت کی فیلنگ نہ ہو ہم قوم کو قوم اور ایک معزز قوم
نہیں بنا سکتے۔"

سر سید

اس گھر کو آگ لگ گئی ...

مولانا ابوالحسن علی ندوی*

حضرات!

اس موقع پر جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کے اظہار کے لیے ایک شعر سے کام لوں گا۔ وہ شعر لکھنوی مذاق اور لکھنوی زبان کا شعر ہے۔ لکھنو کے ایک مشاعرہ میں جو نوابی عہد میں ہوا تھا اور جس میں لکھنو، کے بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے، جب ایک کمسن شاعر نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا۔ تو مشاعرہ میں دھوم مچ گئی۔ مطلع یہ تھا ـــ

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس شعر کا دوسرا مصرعہ زیادہ مشہور ہے، اور خاص موقعوں پر پڑھا جاتا ہے، اس کو ایسے موقع پر پڑھتے ہیں جب کسی گھرانے کا کوئی بچہ بڑا ہونہار ہو، جس کی پیشانی پر بڑائی کے آثار کندہ ہوں اور کچھ امیدیں اپنے خاندان کی اور جاننے والوں کی اس سے وابستہ ہوں۔ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے اور وہ اپنے خاندان کے نام کو بٹہ لگاتا ہے یا اپنے خاندان کے لیے کسی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

آپ دیکھیے کہ آج دنیا کا نقشہ ایسا ہی ہے۔ انسانیت کے گھرانے کو مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک اس گھر کے چراغ ہی سے آگ لگی ہے، باہر سے یہ آگ نہیں آئی۔

تاریخ انسانی کے کسی دور میں یہ نہیں ہوا کہ جانوروں، درندوں، سانپوں اور بچھوؤں نے انسانیت پر کبھی کوئی منظم حملہ کیا ہو۔ تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ فلاں سلطنت کا زوال اس طرح ہوا، اور ملک کی اینٹ سے اینٹ اس طرح بجی کہ شہر کے چیتوں، شیروں اور بھیڑیوں نے اس پر یلغار کی اور انسانوں کو لقمۂ اجل بنا لیا اور تہذیب کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ سانپ اور بچھو تو شہر کے اندر بھی ہوتے ہیں لیکن ایک گھر یا ایک خاندان کے متعلق بھی تاریخ میں لکھا ہوا نہیں ملتا کہ سانپوں اور بچھوؤں کی وجہ سے اس گھر کا صفایا ہوا ہو۔ محلے کا محلہ صاف ہو گیا ہو، انسانی تاریخ کے جتنے بھی المیے (TRAGEDIES) ہیں ملکوں اور قوموں کی تباہی سوسائٹیز اور معاشروں کی بربادی کے جتنے واقعات ہیں۔ وہ سب انسانوں کے کرتوت ہیں۔ اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں کہوں کہ انسانی تاریخ کے بڑے بڑے المیے اور انسانوں پر جو بڑی بڑی مصیبتیں آئیں، وہ زیادہ تر ان انسانوں کی لائی ہوئی تھیں جو زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ جو زیادہ مہذب، شائستہ اور آسودہ تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ بہت زیادہ ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے تو غلط نہ ہوگا۔ کسی ملک کو کبھی جاہل، کندہ ناتراش، بے پڑھے لکھے انسانوں نے تباہ نہیں کیا۔ ایک واقعہ بھی تاریخ میں نہیں مل سکتا کہ کوئی ملک اس ملک کے جاہلوں کے ہاتھوں تباہ ہوا ہو۔ ان بیچاروں میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی، وہ تو بے چارے موٹی موٹی باتیں جانتے ہیں۔ ان کو تو کھانا پینا ملتا رہے۔ وہ تو تباہ کن آلات ایجاد بھی نہیں کر سکتے

---

* معروف عالم دین اور سربراہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

کا ذہن وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ قوموں اور سوسائٹیوں کی ا ہی کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے۔ وہ کسی ایک دو افراد کی غلطی یا کسی ایک یجے کے ظلم کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ جب کسی تمدن کا قوام بگڑ جاتا ہے، تمدن جب سڑ جاتا ہے، اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے تو تباہی آتی ہے۔

غلامی اور محکومی کے اسباب

تاریخ میں ایسی بہت کم مثالیں ہیں کہ کسی قوم نے کسی قوم پر سیکڑوں ہزاروں برس تک حکومت کی ہو۔ یہ تو غیر فطری چیز ہے۔ کہ کوئی قوم باہر سے آئے اور اس کو غلام بنائے اور صدیوں تک غلام ہی رکھے۔ بعض قوموں کے زوال سے، یا کسی بادشاہ یا حکمراں کی غلطی سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ خود ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ جب یہ انتظام بگڑا اور لوگوں کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی، زندگی ان کے لیے عذاب بن گئی، نہ امن و امان تھا نہ سکون و اطمینان، اس وقت ملک کی آبادی زبان حال سے کہتی تھی کہ کوئی اور طاقت ملک کا انتظام سنبھالے اور ہم کو اس عذاب سے نجات دے۔

پیغام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک پیغام جو آفیشیل ہوتا ہے قانونی اور تحریری ہوتا ہے اور ایک پیغام ہوتا ہے جو دل، دماغ اور روح کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ روح کہتی ہے اور روح سنتی ہے۔ قوم کی روح جو ستائی ہوئی اور کرب و اذیت میں ڈوبی ہوتی ہے، فریاد کرتی ہے۔ بچوں کی آہ و فغاں، عورتوں کی نالہ و فریاد، دکھے ہوئے انسانوں کی آہیں، ان کے دل کی کراہ خدا تک ہزاروں پردوں کو چاک کر کے پہنچتی ہے۔ اگر اس کی راہ میں سمندر حائل ہو، پہاڑ حائل ہوں وہ اس کراہ کو نہیں روک سکتے۔ جیسے کہ اللہ کے پیغمبرؐ نے فرمایا:

> مظلوم کی آہ سے بچو، اس لیے کہ وہ سیدھی آسمان
> تک پہنچتی ہے، کوئی چیز اس کو روک نہیں سکتی۔"

خدا کو اپنی مخلوق پر پیار آتا ہے۔ ہم کو اور آپ کو نہ ہو، اللہ کو اپنی مخلوق سے بہرحال پیار ہے۔ ہر بنانے والے کو اپنی بنائی ہوئی چیز سے پیار ہوتا ہے۔ ایک کمہار کو اپنی مٹی کی بنائی ہوئی چیز سے پیار ہوتا ہے۔ خدا کی مخلوق کہیں ہو، جب اس کا دل دکھے گا، جب اس کی انسانیت پامال ہوگی، جب اس کی ہستی کو خاک میں ملایا جائے گا، جب اس کے حق کا خون کیا جائے گا، جب حقیقت کا انکار کیا جائے گا۔ جب دن کو رات اور رات کو دن کہا جائے گا۔ جب بچوں کے منھ سے نوالہ چھین لیا جائے گا، جب بیواؤں کے سر پر سے دوپٹہ اتار لیا جائے گا، جب غریب کے چولھے پر سے توا کھینچ لیا جائے گا تو در و دیوار سے آواز آنے لگتی ہے کہ ہماری مدد کرو، ہماری مدد کرو۔ اس وقت خدا یہ نہیں دیکھتا کہ ان غریبوں اور دکھ کے مارے انسانوں کو نجات دلانے والا کہاں سے آتا ہے۔ یہی انسانی تاریخ کا بار بار کا تجربہ ہے کہ جب لوگ زندہ درگور ہو کر زندگی گزارتے ہیں جن کا ایک گھنٹہ ایک ساعت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت پورے ملک کا پتہ پتہ، تنکا تنکا اور در و دیوار یہ صدا لگاتے ہیں کہ ہمیں بچاؤ، زندگی عذاب بن گئی ہے۔ ہم ان اپنوں کو لے کر کیا کریں۔ یہ ہمارے کس کام کے جو امن قایم نہیں رکھ سکتے، اس وقت خدا اُن کو سزا دیتا ہے، ان غریبوں کی مدد کرتا ہے اور آپ دیکھیں گے کہ تاریخ میں جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو باہر سے کوئی قوم آئی اور اس نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ فائدہ بھی پہنچایا اور فائدہ بھی اٹھایا۔ اس صورت حال پر آپ جتنے بھی چیں بہ جبیں ہوں، آپ کو اختیار ہے لیکن مجھے اس پر بالکل تعجب نہیں آتا۔ کیوں کہ خدا کو بہرحال اپنی مخلوق کی دادرسی کرنی ہے اور اس صورت حال میں زیادہ دن باقی رہنے کی صلاحیت نہیں۔ میرے نزدیک بیرونی حکومت کی یہی توجیہ ہے کہ وہ ملک کے ذمہ داروں اور برسرِ حکومت طبقے کی بے عنوانیوں اور نااہلی کی سزا اور مظلوموں کی آہ و فغاں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

بیرونی حکومت اور ملکی حکومت کا فرق

لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ انگریزوں کو جنھوں نے اس ملک پر سو برس تک حکومت کی، اس ملک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ان کے نزدیک صرف ایک دودھ دینے والی گائے کی حیثیت رکھتا تھا، وہ تو اپنے اور اپنی قوم کے مفاد کے لیے آئے تھے اور چلے گئے۔ اگر وہ یہاں سے ریل کی پٹریاں اور مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں اکھاڑ کر لے جاتے تو مجھے کچھ تعجب نہیں تھا۔ اس لیے کہ ان کو اس ملک میں

رہنا ہی نہیں تھا۔ وہ اس ملک میں رہ کر بھی اپنے ملک کی فکر میں رہتے تھے۔

لیکن تعجب اس پر ہے کہ ؎
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

انگریز اس گھر کے چراغ نہیں تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ اس گھر کی آگ تھے۔ اگر وہ آگ لگاتے بھی تو ہمیں تعجب نہ ہوتا۔ وہ یہاں مہمان کی طرح آئے اور مہمان کی طرح رہے اور مہمان کی طرح چلے گئے۔ ان کے تو دن گنے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد اس ملک کے ساتھ اپنوں نے جو سلوک کیا وہ حیرت انگیز ہے۔ آپ مجھے معاف کریں۔ میں آپ ہی میں کا ایک فرد ہوں۔ اگر میں آپ کی شکایت کرتا ہوں تو اپنی ہی شکایت کرتا ہوں۔ اگر میں آپ پر تنقید کرتا ہوں تو اپنے پر تنقید کرتا ہوں۔ یہاں آپ کو بلانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ صورت حال کا جائزہ لیں اور ہم اقرار کریں کہ

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

جن لوگوں نے اس ملک کا چارج لیا، وہ اس ملک کے اصلی باشندے تھے جن کی قسمت اس ملک سے وابستہ تھی، جن کو اس ملک میں جینا اور اس ملک میں مرنا تھا اور جنھوں نے آزادی کی لڑائی جوش و خروش سے لڑی۔ یہ امین آباد پارک جو آپ سے چند گز کے فاصلے پر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ آواز وہاں پہنچ رہی ہے۔ یہ پارک ابھی تک گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریروں سے گونج رہا ہے، یہ گنگا پرشاد میموریل ہال جس میں آپ اس وقت جمع ہیں، یہ اس احتساب کے لیے بہت موزوں مقام ہے۔ یہ جنگ آزادی کے رہنماؤں کا خاص ایوان اور اسٹیج رہ چکا ہے میں نے بھی ان کی تقریریں سنی ہیں، آج گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، مولانا آزاد، مولانا شوکت علی اس جگہ کھڑے ہو کر تقریر کر رہے ہیں، یہ کل کی بات مجھے معلوم ہو رہی ہے، اور یہ امین آباد پارک تو جنگ آزادی کے عظیم ترین اسٹیجوں میں سے ایک اسٹیج تھا، ہمارے لکھنؤ کو فخر ہے، آزادی کی لڑائی میں اس کا وہ حصہ ہے جو ہندوستان کے کم شہروں کا حصہ ہوگا، سائمن کمیشن ہندوستان آیا ہوا ہے ملک کے رہنماؤں کی طرف سے اس کے بائیکاٹ کی اپیل کی گئی ہے، اسی سلسلہ میں امین آباد پارک میں ایک زبردست جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد علی، اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر ہوئی۔ میں اس جلسہ میں شریک تھا، اس لکھنؤ میں آزادی کا صور پھونکا گیا۔ اس پارک میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی گئی۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے کے مناظر ہیں۔

صرف لکھنؤ ہی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص دیکھتا تو وہ کہتا کہ وہ لائق ترین لوگ ہیں جو اس ملک کی کشتی پار لگائیں گے، جو اس ملک کو ایک گلدستہ بنادیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس ملک سے ہر قسم کا دکھ درد دور کر دیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صرف ہندوستانیت ہی نہیں بلکہ انسانیت کو سربلند کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے زمانے میں ہر قسم کی تکلیفیں دور ہو جائیں گی، بدامنی کافور ہو جائے گی۔ ناانصافی کوئی جانے گا بھی نہیں، عدالتیں انصاف کا پیکر ہوں گی، محکمے ذمہ داری اور امانت داری کا نمونہ ہوں گے، پولس کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہندو مسلمان اس طرح سے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں گے جیسے بھائی بھائی۔

اتحاد و محبت، اور ایثار و قربانی کے یہ مناظر آپ میں سے بہت سے لوگوں نے دیکھے ہوں گے۔ کسی کے وہم و خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اس ملک کا نقشہ یہ ہوگا جو ہم دیکھ رہے ہیں، یہ ملک تو خود اہل ملک کے ہاتھ سے تباہ ہوا۔ لیکن جیسا میں نے کہا کہ

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

آج سارے ملکوں اور ساری دنیا میں انسانیت جس طرح پامال ہو رہی ہے وہ تو ایک لمبی داستان ہے اور ایک عام موضوع ہے۔ میں اس پر کیا روشنی ڈالوں؟ اس کے لیے تو بہت اسٹیج ہو سکتے ہیں۔ موٹی موٹی کتابیں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔

آپ کی کہانی کہنی ہے

لیکن آج مجھے آپ سے آپ کی کہانی کہنی ہے اور مجھے تو اپنا اور آپ کا محاسبہ کرنا ہے۔ خود مشاہدہ کریں آپ کے اور اپنے خلاف

آپ ہی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتا ہوں۔ آج ہمارے سامنے ملک کا
جو نقشہ ہے کیا جنگ آزادی کے رہنماؤں کے وہم وگمان میں بھی آسکتا تھا۔
میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات آجاتی تو شاید ان کے
ہاتھ پاؤں شکست ہو جاتے اور جس جوش و خروش کے ساتھ جنگ آزادی
لڑ رہے تھے وہ ختم ہو جاتا۔

ہم نے ملک کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے کس طرح
اس کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں جیسے یہ ملک کسی دشمن کے ہاتھ لگ گیا ہے اور
وہ اچھی طرح اس سے انتقام لینا چاہتا ہے، اپنے دل کا بخار نکال رہا
ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کو اجاڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں
اور اس کو کسی قابل رہنے دینا نہیں چاہتے۔ اس ملک کے ساتھ ہمارا معاملہ
ایک دشمن، حریف قوم کا سا معاملہ ہے۔ ریلوں پر سفر کر کے آپ دیکھ
لیجیے، بسوں پر سفر کر کے آپ دیکھ لیجیے۔ آپ کسی شعبے میں جا کر دیکھ لیجیے
انصاف کے ساتھ کر کیا ہو رہا ہے۔ ہم خود اپنے ملک کو اپنے ہاتھ سے
تباہ کر رہے ہیں۔ ریل کا حال یہ ہے کہ پنکھے، نلوں کی ٹونٹیاں، کھڑکیاں
سیٹوں کے چمڑے چرائے جاتے ہیں۔ گلی میں مین ہول کے ڈھکن چرائے
جاتے ہیں، اس کی بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ معصوم بچوں کی اس میں جان چلی
جائے گی۔

ایسی پستی ایسی گراوٹ

ایک ایسی انسانی پستی ایک ایسی گراوٹ کے لیے میرے
پاس الفاظ نہیں، ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسے مجمع کے سامنے مجھے کہتے ہوئے
تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، میں اپنے مقام سے لرز رہا ہوں گر رہا
ہوں۔ لیکن حقائق ہیں جن کے بغیر صورت حال کی صحیح عکاسی اور تصویر آپ
کے سامنے نہیں آسکتی۔ پھر یہ دیکھیے کیا ایک شہری دوسرے شہری کو اپنا
بھائی سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کا بنایا ہوا ایک انسان ہے
بالکل نہیں۔ ہر شخص دوسرے کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ ایک شکار
ہے۔ آج ہمارے معاشرہ اور انتظامیہ میں قیمتی انسان سے ایک موذی جانور
کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ آج یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم اپنے ہی طرح انسانوں
کو، اپنے ہم وطن کو، اس ملک کے شہری کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے۔ ہماری
نظر اس کی جیب پر رہتی ہے، ہماری نظر اس کے دھڑکتے ہوئے دل، ہماری
نظر اس کی سلگتی ہوئی روح، ہماری نظر اس کے بلکتے ہوئے بچوں، ہماری
نظر اس بوڑھی ماں، اس کے غریب خاندان پر نہیں ہوتی، ہماری نظر اس کی
جیب کے چار پیسوں پر رہتی ہے۔ سارے ملک کا یہ حال ہو گیا ہے کہ کسی
کو کسی سے ہمدردی معلوم نہیں ہوتی۔ سارا ملک ایک منڈی اور ایک
جوا خانہ بن گیا ہے۔ جس میں ایک کی جیت اور ہزاروں کی ہار ہے۔ کسی کے
دل میں کوئی بلند جذبہ، بلند تخیل، انسانیت کا احترام خدا کا لحاظ باقی
نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل و دماغ پر کوئی فالج گر گیا
ہے، ہمارا ضمیر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمارے ضمیر میں ملامت کرنے
کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ سب اقدار (values) ختم ہو چکے
ہیں اور صرف ایک value باقی ہے اور وہ ہے پیسے کی محبت
اور اس صورت حال اور بگاڑ سے کوئی پنجہ آزمائی کرنے کے لیے تیار
نہیں۔ سارا ملک اور معاشرہ اصلاح اور سدھار سے مایوس نظر
آتا ہے۔ یہ وہ خطرناک علامت ہے کہ جس سے ملک و قوم کبھی پنپ
نہیں سکتی۔ اجتماعی بگاڑ نے پورے ملک کو کھوکھلا بنا دیا ہے اور ہر
شخص اپنے ذاتی اغراض اور محدود مفادات کو پورے ملک پر ترجیح
دے رہا ہے۔

انسانیت کو اس پر ماتم کرنا چاہیے اور انسانیت کے دعویداروں
کو شرم کے مارے اپنی گردن جھکا دینی چاہیے۔ ہولناک حادثات پر پتھر پگھل
جاتے ہیں، مگر ہمارے معاشرے نے سنگ دلی کے ایسے نمونے پیش
کیے ہیں کہ جن کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی۔

اجتماعی بگاڑ سے انفرادی بناؤ

اجتماعی بگاڑ سے انفرادی بناؤ کا جو مزاج اس ملک میں
پیدا ہو گیا ہے، اس نے وہ خطرات پیدا کر دیے ہیں جو کسی بیرونی طاقت
سے بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ ریل اور ہوائی جہاز کے حادثے تو شاذ و نادر
ہی پیش آتے ہیں لیکن ہر دفتر، ہر بازار، ہر شعبۂ زندگی میں وہ لوٹ
کھسوٹ اور انسانیت و شرافت کی پامالی کا سلسلہ جاری ہے جو
انسانوں کے لیے باعث ننگ و عار اور باعث شرم ہے۔ سارے
ملک میں کام چوری، رشوت خوری اور اقربا پروری کا عام مزاج پیدا
ہو گیا ہے۔ وہی ملک ہے جو انگریزوں کے زمانے میں تھا مگر نہ معلوم اس کی

صلاحیت کار کو کیا ہو گیا ہے، نہ انتظام ہے نہ امن ہے۔ کسی شخص کو یہ پرمسرت احساس نہیں کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ لوگ بڑی سے بڑی عزت بڑی سے بڑی دولت چھوڑ کر اپنے وطن آتے ہیں کہ وطن کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔ اپنا گھر اور اپنا ملک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو وہاں اطمینان عزت اور خوشی حاصل ہو۔ ایک کو دوسرے پر بھروسہ ہو، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئے، اسی کا نام ہے اپنا گھر اپنا وطن۔ ایسے وطن میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ جس میں آرام ملے نہ امن وچین نصیب ہو، اپنے گھر اور اپنے وطن کا مطلب تو یہ ہے کہ انسان کو وہاں زیادہ آرام اور خوشی اور امن و عافیت نصیب ہو۔ اور اگر یہ حاصل نہ ہو تو لوگ ایسے وطن سے کیا خاک محبت کریں گے۔

منفی حب الوطنی۔

۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد انسان دوستی، ہمدردی، خلوص و محبت کا ایسا مثالی دور آنا چاہیے تھا کہ لوگ دور دور سے دیکھنے آتے۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہوں گا کہ ہم نے اپنے کو اس ملک کے انتظام کے چلانے کا اہل ثابت نہیں کیا۔ ہماری حب الوطنی سلبی اور منفی Negative تھی۔ مثبت اور ایجابی (Possitive) نہ تھی۔ یعنی ہماری اصل دلچسپی اور صلاحیت انگریزوں کے نکالنے پر مرکوز تھیں ملک کو بنانے اور سنوارنے سے ہمیں زیادہ دلچسپی تھی اور نہ اس کی اہلیت کا ہم نے ثبوت دیا۔ بہت سے لوگ لڑائی جیت لیتے ہیں اور صلح ہار جاتے ہیں۔ بہت سی قومیں ہیں جو معتدل حالات میں اس صلاحیت کا ثبوت نہیں دیتیں جو غیر معتدل حالات میں انھوں نے دیا ہے۔ جنگ کے زمانے میں آدمی کی قوت مقابلہ اس کی تمام کمزوریوں پر پردہ ڈال دیتی ہے — ہم ہندوستانیوں میں کمزوریاں تھیں، جنگ آزادی نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا۔ جب ہیجانی دور ختم ہوا اور ہمارے امتحان کا دور آیا تو ہم ناکام ہو گئے۔ دولت جب تک نہیں ہوتی بہت سے لوگ عابد و زاہد بن جاتے ہیں لیکن دولت آنے کے بعد ان کا رویہ اور زندگی بدل جاتی ہے۔ اس طرح کا تجربہ ہمیں رات دن ہوتا رہتا ہے۔ جنگ کا زمانہ ان چیزوں پر توجہ کرنے کی فرصت نہیں دیتا۔ جنگ کی بھاپ نکل جانے کے بعد اس کی تہہ [illegible] وہ ابھر آتی ہیں۔ جب آزادی کی جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہم اہل نہیں۔ ہم صرف اپنا فائدہ چاہتے ہیں۔ ہمیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ معلوم ہوا کہ ہمارے اندر انسان کا دل نہیں ہے بلکہ چیتے، بھیڑیے اور درندے کا دل ہے۔ آخر چند برس میں یہ کایا پلٹ ہو گئی۔ لڑائی کے زمانے میں ہم کیا تھے۔ جنگ آزادی کے زمانے میں ہم غریبوں کی خدمت کرتے پھرتے تھے۔ ہمارے جو ساتھی جیل میں تھے، ہم ان کے گھروں کی سیوا کرتے تھے۔ تمام نفرتیں اور کدورتیں کافور ہو گئی تھیں۔ ہندو اور مسلمانوں کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ جنگ آزادی کی اس آگ نے ہماری آپس کی دشمنی کو پگھلا دیا تھا۔ لڑائی کے دوران میں تو اصلاح کا موقع نہیں تھا۔ لیکن جنگ آزادی شروع کرنے سے پہلے اور آزادی ملنے کے بعد ہمیں کتنا موقع ملا تھا مگر ہم نے اپنی تربیت کا اس مدت میں کوئی سامان نہیں کیا۔

اصلاح سے مایوسی خطرناک ہے۔

ہم میں کتنے ادارے ہیں؟ کتنے مصنفین و ادباء ہیں جنھوں نے انسان میں صحیح شہری احساس، انسانیت کا احترام، صحیح حب الوطنی پیدا کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے؟ آج صورت حال سے ہر شخص پریشان و مایوس ہے۔ ہر مجلس کا موضوع گفتگو آج کی ابتر صورت حال ہے۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ نہ کھانے کا مزہ ہے، نہ امن و امان ہے لیکن اس صورت حال کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔ اس گندے پانی میں ہم سب گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں۔ سب اس گندے پانی کے دریا سے اپنے مفاد کا موتی نکالنا چاہتے ہیں۔ اس گدلے پانی پر تنقید تو ہر شخص کرتا ہے مگر اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اسی میں غوطے لگائے اور ہو سکے تو اس سے اپنے فائدے کے موتی نکالے۔

یہ سب اس مایوسی کا نتیجہ ہے کہ اب اس ملک کی قسمت میں بگاڑ ہی لکھا ہوا ہے اور اس کی سدھار کی کوئی صورت نہیں۔ یہ مایوسی حد درجہ خطرناک اور ملک و قوم کے لیے بڑی مہلک ہے۔

نقار خانہ میں طوطی کی آواز

آج کا یہ جلسہ اور یہ حقیر کوشش نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں۔ ہندوستان کے ۵۵ کروڑ انسانوں کا یہ

فقدانہ؟ اس میں چند آدمیوں کی آواز کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یہ صرف تکلیف دہ صورت حال پر احتجاج کرنے کے لیے راستہ تلاش کرنے کے لیے ہے کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائے اور اس صورت حال سے ناپسندیدگی کا اظہار کرے۔

میرے دوستو! ملک اس وقت شدید خطرے میں مبتلا ہے' باہر سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ وہ زمانہ گزر گیا' جب ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ کرتا تھا اور ایک قوم دوسری قوم کو غلام بناتی تھی۔ اس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ آج کے حالات میں کوئی ملک دوسرے ملک پر قبضہ کرے لیکن صورت حال ایسی ہے کہ ہر شخص پریشان ہے اور وہ کسی نجات دہندہ کا منتظر ہے۔ ہمارے ملک کے لوگ اس صورت حال سے اتنے تنگ آچکے ہیں کہ نہ تو آزادی کی اعلیٰ اقدار کا خیال کرتے ہیں اور نہ اس کا شعور؟ لٹریچر کی کوئی پرواہ کریں گے جو آزادی کی فضیلت میں لکھا گیا ہے اور نہ اس زمانے کے مصائب کا خیال کریں گے جو انگریزوں کے دور میں یہاں کے رہنے والوں نے برداشت کیے۔ وہ تو اس صورت حال کے تبدیل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اس ملک کی آزادی سے پورا فائدہ اٹھانے میں مانع ہے۔

آزادی کے بعد

ہندوستان کی آزادی کا تاریخ انسانی میں ایک مقام ہے' اس کا اس کتاب میں ایک زریں باب ہے۔ لیکن جس ملک کے رہنے والے اس ملک کے نظم و نسق (ایڈمنسٹریشن) سے مایوس ہوں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارا جائز مطالبہ ہمیں نہیں مل سکتا ہم امن و عزت کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ اس سے بڑھ کر حکومت پر سے عوام کی بے اعتمادی اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ کروڑوں معصوم عوام یہ راستہ کا چلنے والا عام آدمی (Man of street) جس نے سیاست کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا ہے' یہ سیاسی داؤں پیچ نہیں جانتا' جو کہتا ہے صحیح کہتا ہے۔ یہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے یہ زبان حال' زبان حقیقت' زبان واقعہ سے بار بار اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میرا اعتماد اس نظام پر سے اُٹھ چکا ہے۔

ایک پارٹی کا مسئلہ نہیں ــــ میں کسی ایک پارٹی کی ایک جماعت ایک طبقہ کو نہیں کہتا' بلکہ ساری پارٹیوں' ایک دوسرے کے بعد کی آنے والی حکومتوں اور نئے تجربے کی دعوت دینے والوں' ماہرین سیاست اور حکومت کے امیدواروں' سب کو کہتا ہوں کہ ان پر سے عوام کا اعتماد اُٹھ چکا ہے۔ اگر آپ دلوں کو کرید سکیں اور اس کے لیے کسی عمل جراحی کی ضرورت نہیں۔ اسٹیج پر تقریر کرنا' مضمون لکھنا اور چیز ہے اصل احساسات وہ ہیں جو گھر میں اور نجی مجلسوں میں ظاہر کیے جاتے ہیں اکبر الہ آبادی نے کہا ہے

نقشوں کو تم نہ جانچو' لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے' کیا چیز مر رہی ہے

حضرات! عام طور پر لوگ کسی خاص طبقے یا چند افراد اور بعض اوقات تنہا کسی فرد کی پوری سوسائٹی کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان عناصر نے یا اس بگڑے ہوئے فرد نے پوری زندگی کو غلط رُخ پر ڈال دیا تھا۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میں تاریخ کے مطالعے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ ایک مچھلی تالاب کو گندہ کر سکتی ہے لیکن ایک فرد سوسائٹی کو بگاڑ نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اچھی سوسائٹی میں بُرے آدمی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔ جس طرح مچھلی کو پانی سے نکال دیا جاتا ہے تو وہ گھٹ کر مر جاتی ہے' اسی طرح جو سوسائٹی برائی کی ہمت افزائی نہیں کرتی وہ اسے خوش آمدید (welcome) کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس میں بُرائی تڑپنے لگے گی اس کا دم گھٹنے لگے گا اور وہ دم توڑ دے گی۔

ہر زمانے میں اچھے بُرے انسان ہوئے ہیں لیکن سب برائیوں کا ان کو ذمہ دار ٹھہرانا اور تمام بُرائیوں کو ان کے سر تھوپ دینا ٹھیک نہیں۔ اگر کچھ بُرے لوگ حاوی ہو گئے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پوری زندگی کا ہینڈل اُن کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جس طرف چاہتے تھے زندگی کو موڑ دیتے تھے بلکہ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں سوسائٹی میں خود خرابی آگئی تھی۔ اس زمانے کا ضمیر conscience گندا ہو گیا تھا۔ اس میں برائیوں کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے اندر اندھیر' ظلم اور خواہشات کو پورا کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خود غرض اور نفس پرست بن گیا تھا۔ جس دل کو گھن لگ جائے' جو بن پانی ہو جائے' آپ اسے جرائم سے

کسی طرح روک نہیں سکتے۔ آپ اس کو بیڑیوں میں جکڑ کر بھی رکھیں گے تب بھی ان چیزوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

مصنوعی صورت حال:۔ آج جو صورت حال ہے بالکل مصنوعی اور غیر فطری ہے، اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ یہ اہل ملک کی کمزوری ہے کہ ہم اس صورت حال کو برداشت کر رہے ہیں۔ میں بغاوت کا نعرہ نہیں دیتا میں انقلاب کا بھی نعرہ نہیں دیتا، میں اصلاح کا نعرہ دیتا ہوں، میں انسانی حقوق کی اپیل کر رہا ہوں۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے یہ اپیل کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ میرا اگر ان بلند پایہ شخصیتوں اور تحریکوں سے تعلق نہ ہوتا جنھوں نے سب سے پہلے اس ملک کی آزادی کا خواب دیکھا تھا اور اس کی آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا تو میں اتنی صاف گوئی سے کام نہ لے سکتا۔ لیکن میرا دل وضمیر اس تلخ نوائی اور تنقید کے باوجود مطمئن ہے کیونکہ میرے اور میرے اسلاف اور بزرگوں کا ریکارڈ نہ صرف صاف اور پاک ہے بلکہ درخشاں اور تاباں ہے۔

خوف خدا اور حب الوطنی:۔ کسی ملک یا قوم کے تحفظ وبقا کے لیے اور افراد کو خود غرضی ظلم، بے ایمانی اور خیانت سے بچانے کے لیے اصل طاقت تو خدا کا عقیدہ اور خوف ہے۔ جب کسی انسان کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جائے کہ ایک ایسی بالاتر ہستی ہے جو اندھیرے اجالے میں میری نگراں ہے اور مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے تو وہ کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔ اصلاح کے لیے اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں۔ یہ وہ اصل طاقت ہے جو چوروں کو پاسبان بناتی ہے۔

اس کے بعد کسی درجے میں کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا نہیں سکتی ہے تو وہ سچی حب الوطنی ہے۔ یہ احساس ہو کہ یہ ہمارا ملک ہے، ہمارا شہر ہے۔ خدانخواستہ کسی ملک میں یہ دونوں جذبے ختم ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا نہیں سکتی۔ کوئی فلسفہ، اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم، ایک لاکھ یونیورسٹیاں کام آ نہیں سکتیں یورپ آج جذبۂ حب الوطنی کی وجہ سے باقی ہے۔ اس نے دو عظیم جنگیں جھیلیں ہیں یورپ دو مرتبہ خون کے دریا میں نہایا ہے۔ ہم پر تو صرف خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔ یورپ تو خون کے سمندر میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ڈوب کر نکلا ہے جنگ عظیم میں بعض بڑے بڑے شہر تباہ ہو گئے تھے مگر وہاں کے لوگوں کی یہی حب الوطنی تھی جس نے پھر انھیں دنیا کے نقشے پر اہمیت دلادی۔

کھنڈر اور ملبہ پر ایک نیا ملک، ایک نیا شہر وجود میں آیا۔ یورپ میں ہزار خرابیاں الحاد و دہریت، فسق وفجور اور عیش وعشرت کی ترقی ہے مگر سچی حب الوطنی، انصاف پسندی، ذمہ داری کا احساس اور ہر شہری کے حقوق کی حفاظت اور جان ومال کے تحفظ کے احساس نے اس کو تھام رکھا ہے۔

اگر کسی ملک یا قوم میں نہ تو خوف خدا ہو، نہ سچی حب الوطنی ہو تو اس کو تعمیری منصوبے اور مادی ترقیاں تباہی سے بچا نہیں سکتیں۔ اہل ملک اس صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

مسلمانوں کی دوھری ذمہ داری

آخر میں اپنے مسلمان دوستوں اور بھائیوں سے کہوں گا کہ ان کی اس موقع پر دوہری ذمہ داری ہے۔ ایک تو یہ اُن کا مذہبی صحیفہ قرآن اور ان کے پیغمبر کی تعلیم ان کو نہ صرف اس عام بگاڑ اس پھیلی ہوئی آگ اور دولت کی پرستش کے اس بہتے ہوئے گندے پانی سے بچنے کی تلقین کرتی ہے بلکہ ان پر اس کو روکنے اور اس سے لوگوں کو بچانے کی ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے۔ ان کو ان کے پیغمبر نے صاف طریقہ پر سمجھا دیا ہے کہ اگر کسی کشتی کے کسی سوار کو بھی ایسی حرکت سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی گئی جس سے یہ کشتی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور یہ کشتی ڈوبی تو پھر اس کشتی کا کوئی سوار بھی بچ نہیں سکے گا اور یہ کشتی نیک و بد قصوروار اور بے قصور، سوتے جاگتے سب کے ساتھ ڈوب جائے گی اور اس وقت کوئی نیکی اور کوئی دانائی کام نہ آئے گی۔

ان کی دوسری ذمہ داری کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ملک میں انسانیت کے احترام، عدل ومساوات اور سماجی انصاف کا پیغام لے کر آئے تھے اور انھوں نے اس ملک کی بڑے نازک وقتوں میں مدد کی تھی یہ پیغام ان کی مذہبی تعلیمات میں اب بھی پورے طور پر محفوظ ہے۔ اگر انھوں نے ملک کی سوسائٹی کی اس ڈوبتی یا ڈگمگاتی کشتی کو بچانے کی امکانی کوشش نہ کی تو وہ خدا کے سامنے قصوروار اور گنہگار ٹھہریں گے۔ اور تاریخ میں فرض ناشناس، بلکہ احسان فراموش اور مجرم قرار پائیں گے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸، شمارہ ۳ (مارچ ۸۹ء)

منزل مقصود؟

سید حامد *

مغرب کو ہم برا کہتے ہیں اور اس کی برائیوں کو اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی اچھائیوں سے ہم چھوت کی بیماری کی طرح دور رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی برائیوں میں ہم پکے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر آپ کہیں گے کہ دو ایک کا نام لو، تو سنیے؛ ریاکاری، دو عملی، چاپلوسی، روپے اور طاقت کی پوجا، ذخیرہ اندوزی، نفع خوری، ملاوٹ، بے جا مداخلت اور لوٹ۔

جب ہمیں چھانٹنے کا موقع دیا گیا ہے تو مغربی تہذیب کی اچھائیاں کیوں نہیں چنتے۔ اس کی صاف گوئی، آزاد منشی، صداقت، ایفائے عہد، پابندی وقت، عملی ہمدردی، معروفیت اور علم کی طلب۔ فراخ دلی، روشن خیالی کو اختیار کیوں نہیں کرتے۔

لیکن قلم تو آج ہم نے اس لیے اٹھایا ہے کہ مغرب کی ان عادتوں اور صفتوں کا ذکر کریں جنھیں ہم برا سمجھتے ہیں اور جنھیں ہم ذوق و شوق کے ساتھ اپناتے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح ہمیں پتہ چلے گا کہ جو راہ ہم نے پکڑی ہے وہ ہمیں کہاں پہنچائے گی۔ ۵ رفروری ۸۹ء کے ٹائمز آف انڈیا سے ہم دو خبریں نقل کر رہے ہیں۔

پہلی خبر کا عنوان ہے ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کے بچے:

" لاکھوں کی تعداد میں امریکن بچے اور لڑکے دماغی دیکھ بھال کے ہسپتالوں میں داخل کیے جا رہے ہیں۔ سبب؟ ان کے ماں باپ کام کرتے ہیں اور کام انھیں مہلت ہی نہیں دیتا کہ خود بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ان ہسپتالوں کی خدمات کو اشتہاروں میں بہت دلکش بنا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن وہاں ان بچوں کے ساتھ کیسا برتاؤ ہوتا ہے، اس کا اندازہ جبھی ہوتا ہے جب وہ گھر واپس آتے ہیں، جذباتی طور پر، اور کبھی کبھی جسمانی طور پر، بری طرح گھایل۔"

غور کیجیے یہ غفلت زدہ، ستم رسیدہ بچے جب زندگی میں قدم رکھیں گے اور اختیار اور طاقت اُن کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ کیا قیامت ڈھائیں گے۔ اندھی جدیدیت اور مغرب سے مرعوبیت کا جو چلن ہمارے روشن خیالوں کے ذہنوں پر چھا گیا ہے، وہ صاف کہہ رہا ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہندوستان کے نوجوانوں کا وہی حال ہوگا جو امریکہ اور ایک حد تک یورپ کے نوجوانوں کا بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہوا ہے۔

اور سنیے:

پہلی خبر کے پہلو میں دوسری خبر ہے:

" امریکہ کے اخباروں میں ایک اشتہار چھپا ہے:

ضرورت ہے ۱۸ سے ۲۹ سال تک کے لوگوں کی جو

---

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ہمدرد نگر، دہلی

ایک سائنسی ریسرچ کے لیے فرحت انگیز دواؤں
کو لینے کو تیار ہوں۔ انھیں اپنی چار سہ پہریں دینی
ہوں گی۔ لگ بھگ ۴۰۰ ڈالر کے بدلے۔

یہ اشتہار اس لڑائی کا حصہ ہیں جو امریکہ
کی حکومت اور دوا ساز کمپنیوں نے اس لیے شروع
کی ہے کہ اُن دواؤں کا، جو نسخوں میں لکھی جاتی
ہیں، لذت انگیز اور فرحت بخش استعمال روکا
جائے۔ سائنس داں رضا کاروں کو بھاڑا یہ
جاننے کے لیے دیتے ہیں کہ بعض دوائیں کیوں اتنی
فرحت اثر ہوتی ہیں کہ لوگ انھیں لذت اندوزی
کے لیے استعمال کرنے لگے ہیں۔

دوا کمپنیاں ان تجربات کی روشنی میں طے
کرتی ہیں کہ نئی دوا بازار میں لائی جائے یا نہیں
اور لائی جائے تو خوراک کی کیا مقدار رکھی جائے
وفاقی یا فیڈرل ادارے ان ہی تجربوں کی روشنی
میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کسی دوا کو بیچنے کی اجازت
دی جائے یا نہ دی جائے اور اگر دی جائے تو
کن ہدایات اور شرطوں کے ساتھ۔

اگر دوا لینے کے بعد غیر معمولی فرحت اور
انشراح محسوس ہوتا ہے تو زیر تجربہ نوجوانوں
سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ اس دوا کو فرحت اور
لذت کے لیے پھر استعمال کرنا چاہیں گے اور
بازار میں اس کو کس قیمت تک پر خریدنے کے لیے
تیار ہوں گے۔"

غور کیجیے کہ یہ ذکر اُن نشیلی دواؤں کا نہیں ہے جن کا چلن
امریکہ اور یورپ سے گزر کر تیسری دنیا میں وبا کی طرح پھیل
گیا ہے اور جو ہمارے نوجوانوں اور لڑکیوں کی جسمانی اور اخلاقی
صحت کے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ یہ دوائیں تو چور بازار
کے راستے آتی ہیں اور اپنے اسیروں کی صحت کو کھوکھلا کر کے
چلی جاتی ہیں۔ یہاں تو ذکر ان دواؤں کا ہے جو بیماروں کو علاج
کے لیے دی جاتی ہیں اور منچلے ان کا رُخ علاج سے تفریح اور
لذت انگیزی کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ بہت سی چیزیں اچھی
ہیں لیکن استعمال کا محل انھیں بُرا بنا دیتا ہے۔ کیا فرحت اندوزی
اور لذت انگیزی ہی دنیا کا مقصد ہے؟ کیا تیسری دنیا کو ہم ترقی یافتہ
دنیا کے شاگرد پیشہ کی حیثیت دینے پر راضی ہیں؟ کیا یہی ہماری
منزل مقصود ہے؟

ہمیں خود اپنی موروثی برائیاں ڈھونڈنے کے لیے زیادہ
دور جانا نہیں پڑے گا۔ ہماری ایک بڑی قومی بُرائی یہ ہے کہ ہم بُرائیوں
کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ مذکورہ بالا دو خبروں سے
ملی ہوئی ایک خبر چھپی ہے جس کا عنوان ہے: "راج بھون سے
بہت سی چیزیں غائب"

"تقریباً ۵۰ لاکھ مالیت کی چیزیں گزشتہ دسمبر میں
صدر ہند کے دو روزہ قیام کے سلسلے میں خریدی
گئی تھیں تاکہ بہار راج بھون کو نئی وضع دی جاسکے
اطلاع یہ ہے کہ یہ سارا ساز و سامان گم ہو گیا ہے
یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ پچھلے سال ساری خریداریاں
منظوری کے بغیر کی گئیں۔ کوئی اڑسٹھ (68000) ہزار
روپے کے آٹھ رنگین ٹیلی ویژن سیٹ اور چوبیس
ہزار روپیہ متعلقات یعنی این ٹنے اور راس ٹیبل اڈونہ
پر خرچ ہوا۔ پہلے سے آدھی درجن ٹیلی ویژن سیٹ
راج بھون میں موجود تھے۔ سات لاکھ روپے سے
زیادہ کے تو قالینوں کے بل ہیں۔ دو ماہ پہلے گیارہ
لاکھ روپے کے قالین دلی میں خریدے گئے
تھے، ان کا بھی کہیں سراغ نہیں ملتا۔"

راج بھون کے ان افسروں کی نوکریاں جن کا مذکورہ خریداریوں سے
کچھ تعلق تھا، ختم کر دی گئی ہیں۔ ان سے حساب دینے کے لیے
کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سابق گورنر ڈاکٹر گووند نرائن سنگھ
بہت سی خریداریاں جنھوں نے بہ نفس نفیس کی تھیں اپنے افسروں

کو چھوڑنے کے لیے پٹنہ آئے ہیں۔ اخبار میں اسراف اور بے ضابطگی کی اور بہت سی تفصیلات ہیں۔

یہ باتیں دراصل کھل اس لیے گئیں کہ گورنر اور وزیراعلیٰ میں صحت مت سپید ہو گیا۔ ورنہ یہ پہلی مثال نہیں ہے کہ راج بھون کے ساز و سامان کو راج پال نے اپنی ملکیت سمجھ کر جاتے وقت اپنے رخت سفر میں بندھوا لیا ہو۔ ایک گورنر کے بارے میں جو بعد میں ہندوستان کے پہلے شہری بنے، یہ روایت باخبر حلقوں میں عرصے تک گشت کرتی رہی کہ وہ راج بھون کے قیمتی قالین جو انگریزوں کے زمانے سے گورنمنٹ ہاؤس کی زینت تھے، اپنے ساتھ لیتے چلے گئے۔ منصب سے منصب دار کی ایسی ہوش ربا یگانگت کی مثالیں ہمارے یہاں کم نہیں ہیں۔ ان ساری بے عنوانیوں کو ہم اس طرح گوارا کر لیتے ہیں کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے نجی اور عوامی ملکیت میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ امریکہ اخلاقی اعتبار سے کتنا ہی گیا گزرا سہی وہاں اس قسم کی حرکتیں اگر صدر سے سرزد ہو جائیں تو اس کا عہدہ تو جائے ہی، آبرو بھی خاک میں مل جائے۔ وہاں اختیار و اقتدار اور طاقت اور حکومت، عزت اور آبرو کے لیے ڈھال نہیں بن سکتے۔ وہاں سب کو حساب دینا پڑتا ہے، وہاں حساب سے بالاتر کوئی نہیں ہے

یہ بات بھی عبرتناک ہے کہ یہ اسراف اس ملک میں کیا جا رہا ہے جہاں کروڑوں انسان جہالت بھوک اور بیماری میں گرفتار ہیں اور جس ملک کو آزادی ایک ایسے رہنما نے دلوائی جو سادگی اور فقر کا پیکر تھا۔

جمہوریت کے لیے ضروری ہے کہ شہریوں کی جان و مال سے بھی زیادہ اخلاقی قدروں کی پاسبانی کرے۔ کیوں کہ جب یہ قدریں کمزور پڑ جاتی ہیں تو جنگل کا قانون لاگو ہو جاتا ہے۔ جس کے ہاتھ جو کچھ آ جاتا ہے اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ بھینس اسی کی ہو جاتی ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو، دولت اسی کے پاس کھنچ کر پہنچ جاتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ جمہوریت کامیاب جبھی ہوتی ہے اور لوگوں کی آزادی اور عزت، ان کا اعتماد اور اُن کا ضمیر بحال جبھی ہوتا ہے جب اُن میں جرأت ہو برائی کے خلاف آواز اُٹھانے کی۔ بُرائی کو انگیز کرنے والے بُرائی کو پروان چڑھاتے ہیں۔

معاملہ دراصل نہ جدیدیت کا ہے نہ قدامت کا، نہ مشرق کا نہ مغرب کا۔ مسئلہ دراصل نیک و بد میں تمیز کرنے کا ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ یہ کس سے سرزد ہو رہے ہیں۔ ان رجحانات کی ہمیں روک تھام کرنی چاہیے جو اُس لکیر کو روشن خیالی کے نام پر مٹاتے جا رہے ہیں جو انسانی تہذیب نے صدہا صدیوں کے تجربے کی بنا پر اچھائی اور بُرائی کے بیچ میں کھینچی تھی۔ سہل پسند اور عشرت طلب لوگ اس لکیر کو رجعت پرستی کی علامت سمجھنے لگے ہیں اور نفسیات اور سماجیات کو اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ اخلاقی قدریں بالکل دھندلی ہو جائیں اور جزا و سزا کا سلسلہ ہی ختم کر دیا جائے۔ عام طور پر زنجیریں ٹوٹنا اچھا ہے لیکن ہوس کا بے زنجیر ہو جانا شاید اچھا نہ ہو۔

"ہم کو بات بات پر سائنس کی عدالت میں نہیں جانا چاہیے کیوں کہ سائنس کے نظریے کبھی بدلتے بھی ہیں۔ سائنس کی روح ہمیں جان لینا چاہیے اور اس کو زندگی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔"

پروفیسر عبدالسلام

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸۔ شمارہ ۳۔ (مارچ ۸۹ء)

ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ: سر جارج گریرسن

عتیق احمد صدیقی *

ہندوستان نہ صرف اپنی تہذیبوں، مذہبوں اور نسلی سلسلوں کے اعتبار سے گلدستۂ صد رنگ ہے بلکہ اپنے لسانی سلسلوں کے اعتبار سے بھی اس کی رنگا رنگی بے مثل ہے۔ یہاں نہ صرف بہت سی بولیاں اور زبانیں رائج ہیں بلکہ زبانوں کے بڑے عالمی خاندانوں میں سے اکثر کی نمائندگی ہوتی ہے۔ یہاں بعض ایسے خاندانوں کے آثار بھی ہیں جو اپنی قدامت کی وجہ سے معدوم ہو چکے ہیں اور ایسے لسانی خاندان بھی موجود ہیں جن کی زبانیں آج بھی اقصائے عالم کے بڑے حصے پر چھائی ہوئی ہیں۔ یہاں ایسی زبانیں بھی ہیں جو ابھی تک ضبط تحریر میں نہیں آسکیں اور ایسی بھی جن کا ادبی سرمایہ ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے۔ ایسی زبانیں بھی ہیں جن کی بنیادی صوتیات چند سو الفاظ سے زیادہ کی متحمل نہیں ہو سکتی اور ایسی بھی جن کا ذخیرۂ الفاظ بے شمار ہے۔ یہاں ایسی زبانیں بھی ہیں جن کا ہر لفظ یک رکنی ہے اور ایسی بھی جن میں رکن کے بعد رکن جڑتا چلا جاتا ہے اور پورا جملہ بن جاتا ہے۔ ایسی بھی زبانیں ہیں جن میں نہ کوئی اسم کا تصور ہے نہ فعل کا بلکہ صرف نحو کا تصور ہے اور ایسی بھی جن میں مکمل قواعدی نظام موجود ہے۔ یہاں ایسی زبانیں بھی ہیں جن کے پاس ہزارہا سال کی روایات موجود ہیں اور ایسی بھی جن کی سرے سے کوئی ادبی روایت ہی نہیں ہے۔ یہاں ایسے علاقے بھی ہیں جن میں ہر قبیلے کی زبان الگ ہے، خواہ وہ قبیلہ چند نفوس پر ہی مشتمل ہو اور ایسے بھی جن میں ہزارہا میل کے رقبہ میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے۔

ہندوستان کے وسیع وعریض رقبے میں پھیلے ہوئے یہ لسانی رنگ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم تھے کہ ان کو جدا کرکے دیکھنا یا اُن کے درمیان حد فاصل قایم کرنا مشکل تھا اہل ملک نے اس طرف کوئی خاص توجہ بھی نہیں کی تھی لیکن یہ رنگارنگی غیر ملکی سیاحوں کو برابر چونکاتی رہی اور اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ اگرچہ قدیم الایام میں البیرونی، امیر خسرو اور ابوالفضل وغیرہ نے ہندوستانی زبانوں کا ذکر کیا لیکن اسے سرسری ذکر سے زیادہ نہیں کہا جاسکتا۔ سترھویں صدی سے یورپی لوگوں کی آمد شروع ہوئی اور انھوں نے مذہبی تبلیغ یا یہاں کے لوگوں میں رسائی حاصل کرنے کی غرض سے یہاں کی زبانوں میں دلچسپی لینا شروع کی تو مطالعات میں وسعت پیدا ہونا شروع ہوئی۔ ٹیری، فرانز ہینرخ روتھ، شلز، جان جوشو اکٹیلر وغیرہ کے ابتدائی کاموں نے اہل یورپ میں ہندوستانی زبانوں کے لیے دلچسپی پیدا کی۔ ۱۷۸۶ء میں سر ولیم جونز نے سنسکرت، فارسی اور لاتینی وغیرہ کے باہمی تعلق کا تصور پیش کیا تو ہند یورپی کے تصور نے ایک ہلچل پیدا کردی۔ پھر تو بہت سے مستشرق اس طرف متوجہ ہوگئے۔ کالڈویل نے دراویدی زبانوں کو توجہ کا مرکز بنایا

* ڈین فیکلٹی آف آرٹس، ڈائرکٹر سر سید اکاڈمی، پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستانی زبانیں لوگن، فاربس اور شمت وغیرہ کی توجہ کا مرکز بنیں۔
بنگالی زبانوں کی طرف لیچ، اسٹیونسن، جان بیمز، ہارنلے اور سر
جارج کیمپ بیل وغیرہ متوجہ ہوئے۔ ولیم کیری نے نہ صرف عہدنامہ
جدید کا بنگالی ترجمہ (۱۸۰۱) کیا بلکہ ہندوستان کی ۳۳ زبانوں اور
بولیوں کے ۳۴ نمونے بھی پیش کیے۔ انیسویں صدی کے ان مطالعات
نے حوصلہ مندان یوروپ میں بڑا شوق پیدا کر دیا۔ ۱۸۶۸ء میں
پروفیسر اٹکنسن نے اپنے شاگرد جارج گریرسن کو سنسکرت
کے حروف تہجی سکھائے تو اُن کے دل میں ہندوستانی زبانوں کی
محبت کی چنگاری بھی ڈال دی اور پانچ سال بعد گریرسن کو
ہندوستان آنے کا موقع ملا تو استاد نے ان پر یہ ذمہ داری
بھی ڈال دی کہ وہ ہندوستانی زبانوں کا جائزہ بھی لیں شاگرد
نے بھی استاد کی بات کو گرہ میں باندھ رکھا اور یہاں کی زبانوں
سے اپنی دلچسپی کو برقرار رکھا۔ مستشرقین کی ایک بڑی جماعت
یہ دلچسپی محسوس کر رہی تھی۔ تاآنکہ ۱۸۸۶ء میں منعقدہ Orien-
tal Congress میں اس امر سے متعلق قرارداد
منظور کی گئی کہ ہندوستانی زبانوں کا مربوط و منظم جائزہ لیا جائے
لیکن مالی وسائل کی دشواریوں کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ
سکی۔ بالآخر آٹھ سال بعد (۱۸۹۴ء) اس کو عملی جامہ پہنانے
کی نوبت آئی اور قرعۂ فال جارج گریرسن کے نام پڑا کہ وہ اس
کام کا بیڑا اٹھائیں۔ ان کی دیرینہ آرزو بر آئی اور ۳۳ سال کی
محنت شاقہ کے بعد ۱۹۲۷ء میں یہ کام مکمل ہوا۔ Linguistic
Survey of India (ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ) اسی
محنت کا ثمرہ ہے۔ تو آیئے ذرا اس کا جائزہ لیں۔

یہ کتاب کیا ہے، ہندوستانی زبانوں کی قاموس ہے۔
ابتدا میں یہ قرار پایا کہ صوبہ جات مدراس و برما اور ریاست
حیدرآباد و میسور کو اس کے دائرہ کار سے باہر رکھا جائے اور
بلوچستان، صوبہ سرحد، کشمیر، پنجاب، بمبئی (بشمول سندھ)، راجپوتانہ،
وسط ہند، صوبہ جات متوسط و برار، صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ
بہار، اڑیسہ، بنگال و آسام کی زبانوں کا جائزہ لیا جائے۔ گویا
دراویدی اور برمی خاندان کی زبانوں کو علیحدہ رکھا گیا لیکن بعد ازاں
یہ خاندان بھی اس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح انتیس کروڑ لوگوں کی
زبانیں اور بولیاں زیر مطالعہ آئیں۔

اس دوران ہندوستان میں تین مرتبہ یعنی ۱۹۰۱ء، ۱۹۱۱ء اور
۱۹۲۱ء میں) مردم شماری ہوئی۔ اس سے حاصل شدہ اعداد و شمار
بھی زیر مطالعہ آئے اور جائزہ میں ایسی جدولیں بھی شامل کی گئیں
جن میں دونوں کے اعداد و شمار کے فرق بھی واضح کیے گئے۔ یہ جائزہ
گیارہ مجلدات پر مشتمل ہے، جن میں سے بعض کے کئی حصے ہیں۔ ان
کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

جلد	حصہ	موضوع
جلد اول	حصہ اول	تعارف
	حصہ دوم	تقابلی فرہنگ
جلد دوم		مون کھمیر، سیامی چینی (بشمول کھاسی و تائی) خاندان کی زبانیں
جلد سوم	حصہ اول	تبتی، ہمالیائی اور شمالی آسامی بولیوں کے گروہ
	حصہ دوم	بوڈو، ناگا وغیرہ بولیوں کے گروہ
	حصہ سوم	کوکی چین اور برمی خاندان
جلد چہارم		منڈا اور دراویدی زبانیں
جلد پنجم		(ہند آریائی خاندان: مشرقی شاخ)
	حصہ اول	بنگالی اور آسامی
	حصہ دوم	بہاری اور اُڑیا
جلد ششم		ہند آریائی خاندان؛ متوسط گروہ: مشرقی ہندی
جلد ہفتم		ہند آریائی خاندان؛ جنوبی گروہ۔ مراٹھی
جلد ہشتم		ہند آریائی خاندان شمالی مغربی گروہ
	حصہ اول	سندھی اور لہندا
	حصہ دوم	دردی یا پشاچی زبانیں (بشمول کشمیری)
جلد نہم		ہند آریائی خاندان: وسطی گروہ

حصہ اول   مغربی ہندی اور پنجابی (اس
حصہ کا اردو ترجمہ عنقریب ترقی
اردو بورڈ سے شائع ہوگا)
حصہ دوم   راجستھانی اور گجراتی
حصہ سوم   بھیل خاندیشی، بنجاری وغیرہ
حصہ چہارم   پہاڑی زبانیں اور گجری۔
جلد دہم   ایرانی زبانیں۔
جلد یازدہم   جپسی زبانیں۔

گریرسن کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تو کام کا خاکہ تیار کیا گیا۔ طے یہ پایا کہ ہر علاقے کی زبان یا بولی کے نمونے جمع کیے جائیں ان میں یکسانیت برقرار رکھنے کے لیے نمونوں کا یکساں ہونا ضروری تھا اور ایسا بھی کہ اس سے زبان کی خصوصیات سامنے آئیں۔ اس لیے طے کیا گیا کہ ہر علاقے کی زبان یا بولی کے تین نمونے جمع کیے جائیں: سب سے پہلے فضول خرچ بیٹے کی حکایت کا اس زبان میں ترجمہ ہو۔

دوسرے کوئی کہانی اس زبان میں کہی گئی ہو

اور   تیسرے کچھ بنیادی الفاظ کی مقررہ فہرست کا ترجمہ اس زبان میں ہو۔

جس بڑے پیمانے پر یہ کام ہونا تھا، اس کے لیے افرادی قوت کی ضرورت تھی۔ تحصیل اور ضلع کی سطح کے تمام سرکاری افسران کو اس میں شامل کیا گیا کہ وہ اپنے علاقے سے نمونے مہیا کریں۔ مگر اس سے بھی پہلے یہ ضروری تھا کہ ہر علاقے کی زبانوں اور بولیوں کی فہرست تیار ہو۔ اس میں مشکل یہ تھی کہ اکثر جگہ کے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ جو زبان بول رہے ہیں اس کا کیا نام ہے۔ اس فہرست سازی میں اولاً ۲۳۱ زبانوں اور ۷۷۴ بولیوں کی نشاندہی کی گئی۔ لیکن مزید چھان پھٹک سے یہ تعداد کم ہوگئی اور ۱۷۹ زبانوں اور ۵۴۴ بولیوں پر آکر بات ٹھہری۔

پہلا نمونہ حکایت کا ترجمہ تھا۔ حکایت انگریزی میں تھی۔ ان لوگوں کے لیے مشکل تھی جو انگریزی نہیں جانتے تھے اور بیشتر ایسے ہی لوگ تھے۔ اس لیے ۶۵ ہندوستانی زبانوں میں اس کا ترجمہ مہیا کرکے شائع کیا گیا کہ ان میں کسی نہ کسی زبان کی مدد سے وہ اپنی زبان میں ترجمہ کرسکیں۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔

دوسرا نمونہ مقامی طور پر منتخب کرنا تھا تاکہ اس میں نہ صرف زبان کی روانی اور اصلیت برقرار رہے، بلکہ اس علاقے کے رسم و رواج پر بھی اس سے روشنی پڑ سکے۔ یہ بھی ہدایت دی گئی کہ اس میں پرتکلف یا ادبی زبان کے بجائے وہ زبان استعمال کی جائے جو عموماً لوگ گھروں میں روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔

دونوں نمونوں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا تھا کہ پہلے زبان کے اپنے رسم خط میں پھر رومن الفاظ لکھے جائیں۔ ان کے ساتھ لفظی ترجمہ دیا جائے اور پھر اس کا رواں ترجمہ ہو۔ یہ احتیاط اس لیے برتی گئی کہ غلطی کے امکانات کم سے کم ہو جائیں۔

تیسرے نمونے کے لیے مطبوعہ فہرستیں مہیا کی گئیں۔

ان سب عبارتوں کو اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ ان میں زبان کی بنیادی باتیں۔ الفاظ سے لے کر ساخت تک سب آجائیں۔ مثلاً الفاظ کی جو فہرست مہیا کی گئی، اس میں کل ۲۴۱ اندراجات تھے ان میں بنیادی گنتی (ایک سے دس تک، بیس، پچاس، سو)، ضمائر اور ان کی شکلیں، اعضائے جسم (ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان وغیرہ)، رشتے (باپ، ماں، بھائی، بہن، بیٹا وغیرہ)، عام جانور (گھوڑا، گائے، کتا، بلی وغیرہ) افعال (آنا، جانا، بیٹھنا، کھانا، دوڑنا وغیرہ) حروف ربط، عام استعمال کے دیگر الفاظ اسما کی مختلف صورتیں (اضافی، مفعولی وغیرہ) صفات، جنس و تعداد کے اظہار کے لیے الفاظ کی مختلف صورتیں، افعال کی مختلف صورتیں اور صیغے نیز چند جملے شامل کیے گئے۔

ان حاصل شدہ نمونوں سے کچھ قواعد اخذ کیے گئے۔ بولی کی خصوصیات متعین کی گئیں۔ بولیوں کی زبانوں کے ساتھ گروہ بندی کی گئی۔ پھر ہر زبان یا بولی کا تعارف نامہ لکھا گیا، اس کے علاقے کا جغرافیائی نقشہ اور بولنے والوں کی تعداد بتائی گئی۔ مختلف بولیوں کے امتیازات اور خصوصیات واضح کی گئیں۔ زبان کی قدیم تاریخ اور

[illegible] دوسری زبانوں سے اس کا تعلق اگر اس [illegible] کی خصوصیات' اس میں دستیاب کتابوں کی [illegible] اس کی قواعد کا خاکہ۔ تفصیل و اجمال کے فرق کے [illegible] زبانوں اور بولیوں کے بارے میں جہاں تک ممکن ہوا یہ [illegible] بیان کی گئیں۔

زبانوں کی گروہ بندی خاصی دشوار تھی۔ کسی نمونے کو آزاد زبان قرار دیا جائے یا کسی زبان کی بولی' اس کا فیصلہ آسان نہیں تھا۔ باہمی تفہیم کا جو معیار اس امتیاز کے لیے قائم کیا جاتا ہے اس کو بھی بنیاد بنانا مشکل تھا۔ کیوں کہ ایسی بولیاں موجود تھیں کہ تفہیم کے باوجود ان کے محاوروں اور ساختوں میں بڑا فرق تھا اور ساخت کا فرق ہو تو ان کو ایک ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی میں ملاقائی قومیتوں کا مسئلہ بھی تھا' جس کے باعث زبان میں یکسانیت ہونے کے باوجود ادبی اور تاریخی ارتقا نیز ان کی نوعیت و کیفیت میں فرق کے باعث ایک زبان نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ ان تمام امور کا بڑی احتیاط کے گہرائی سے مطالعہ کیا گیا اور جو نتائج نکالے گئے' اُن کی صحت پر آج بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس گروہ بندی میں پانچ بڑے خاندانوں اور پھر اُن کی زبانوں اور بولیوں کی نشاندہی کی گئی یہ پانچ بڑے خاندان آسٹرو ایشائی' سیامی چینی' تبت برمی دراویدی اور ہند آریائی ہیں۔ سب سے زیادہ زبانیں تبت برمی خاندان میں یعنی ۱۱۳ زبانیں اور سب سے زیادہ بولیاں ہند آریائی خاندان میں یعنی ۲۰۴ بولیاں سامنے آتی ہیں۔ اگرچہ تبت چینی زبانیں بولنے والوں کی تعداد صرف انیس لاکھ چوراسی ہزار تھی۔ جب کہ ہند آریائی زبانوں کو بائیس کروڑ لوگ بولتے تھے۔

پہلی جلد کا حصہ اول تمہیدی ہے' جس میں تمام زبانوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس میں تین نہایت مفید ضمیمے بھی شامل کیے گئے ہیں۔

پہلے ضمیمے میں تمام زبانوں اور بولیوں کی درجہ بند فہرست اور اُن کے بولنے والوں کی تعداد دی گئی ہے۔ اس سے ہر خاندان کی جملہ زبانیں اور ان سے متعلق بولیاں یک جا مل جاتی ہیں۔ تقابل کے لیے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق بولنے والوں کی تعداد بھی دی گئی ہے۔ ان میں چھوٹی بڑی سبھی بولیاں آگئی ہیں۔ مثلاً تلگو کو ہم جانتے ہیں جس کے بولنے والوں کی تعداد اس وقت ایک کروڑ ستانوے لاکھ بتیس ہزار تھی لیکن اسی کے ساتھ ذیلی بولیاں کومتاؤ' سالیواری' گولاری' بیراڈی' وڈاری' کماٹھی وغیرہ بھی درج ہیں۔ ان میں سے گولاری کے بولنے والوں کی تعداد صرف ۲۵ تھی۔

جب نمونے جمع کیے جانے لگے تو یہ خطرہ تھا کہ تحریر میں غلطیاں ہو سکتی ہیں اور تحریر میں بولنے والوں کا لب و لہجہ بھی محفوظ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے بہت سی زبانوں کے گراموفون ریکارڈ بھی تیار کرائے گئے ان ریکارڈوں کو انڈیا آفس لائبریری' برٹش میوزیم' رایل ایشیاٹک سوسائٹی' اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز' بودلین لائبریری' کیمبرج' ڈبلن اور ایڈنبرا یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں محفوظ کر دیا گیا۔ دوسرا ضمیمہ ان زبانوں کی فہرست پر مشتمل ہے جن کے ریکارڈ محفوظ کرا دیے گئے۔ ان ریکارڈوں کا پورا حوالہ وغیرہ بھی دیا گیا ہے' جس سے سو سال گزرنے کے بعد آج بھی کوئی ان سے استفادہ کرنا چاہے تو کوئی دشواری

"دو شخص قید خانے کی ایک ہی کوٹھری میں بند تھے۔ رات بڑی اندھیری اور بھیانک تھی اور طوفان شدت پر طوفان تھا تو دونوں کوٹھری سے دروازے پر آئے اور سلاخوں سے جھانکنے لگے۔ ایک یہ کہتا ہوا واپس گیا:

"اف کس بلا کی تاریکی ہے!"

دوسرا وہیں کھڑا رہا اور اپنے ساتھی سے بولا:

"دیکھنا ایک تارہ بھی چمک رہا۔"

رشید احمد صدیقی

نہ ہو گی۔

تیسرے ضمیمے میں جائزہ میں مذکور تمام زبانوں اور بولیوں کی فہرست حروف تہجی کی ترتیب میں دی گئی ہے۔ ساتھ ہی درج بند فہرست میں اس کا نمبر، بولنے والوں کی تعداد، جلد اور صفحہ کا نمبر بھی دے دیا گیا ہے۔

یہ تینوں ضمیمے جائزے کی گیارہ جلدوں میں پھیلے ہوئے مباحث کا جوہر ہیں اور نہایت مفید ہیں۔

جلد اول کے حصہ دوم میں بنیادی فہرست کے ۲۱۶ الفاظ کی تقابلی فرہنگ دی گئی ہے، جہاں ایک لفظ کی تمام ہندوستانی زبانوں میں شکلیں ایک ہی صفحہ پر درج مل جاتی ہیں۔

تقریباً سو سال گزر جانے کے بعد بھی یہ جائزہ ہندوستانی زبانوں کے بارے میں مستند معلومات کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور اس کو بنیادی اور حوالہ جاتی حیثیت حاصل ہے۔ آج بھی اس کے مرتب یعنی سر جارج گریرسن کے سامنے ہمارے سر عزت و احترام سے جھکے ہیں۔

اس جائزے پر تقریباً ایک صدی گزر رہی ہے۔ اس دوران نہ صرف ملک کی سیاسی حدود میں بڑی تبدیلی واقع ہو گئی ہے بلکہ بولیاں اور زبانیں بھی بڑی تبدیلیوں سے گزر چکی ہیں۔ تعلیم اور ذرائع ابلاغ عام ہونے کے باعث بہت سی بولیاں اپنی ماخذ زبانوں میں ضم ہوتی جا رہی ہیں۔ ممکن ہے بعض آزاد زبان کی حیثیت اختیار کر چکی ہوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی زبانوں کا اب پھر اسی طرح کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔

جہاں ذہن خوف سے آزاد ہوں اور انسانوں کا سر اونچا ہو
جہاں علم آزاد ہو؛
جہاں تنگ دیواروں نے دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا ہو؛
جہاں الفاظ حقیقت کی گہرائیوں سے نکلتے ہوں
جہاں انتھک کوشش اپنے بازوؤں کو تکمیل کمال کے لیے پھیلا رہی ہو؛
جہاں [illegible] شفاف ندی بھٹک کر مردہ عادت کے ویران صحرا میں نہ چلی گئی ہو؛
جہاں دماغ کو تیری رہنمائی مدام بڑھتے ہوئے خیال اور عمل کی طرف لے جا رہی ہو،
پروردگار میرے وطن کی آنکھیں آزادی کی اس فردوس میں کھول

رابندر ناتھ ٹیگور (گیتانجلی)

دینی تعلیمی کونسل کا قابل تقلید کارنامہ

محمد اسحاق*

دینی تعلیمی کونسل (اتر پردیش) کی ایک شاخ جو حیدرآباد میں گزشتہ دو سال سے کام کر رہی ہے۔ اس کا ایک اہم اجلاس حیدرآباد میں ۳۱ر دسمبر کو ہوا۔ کونسل کے کام اور "پیام انسانیت" کی تحریک سے واقف کروانے کے لیے مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، مولانا یاریکھ اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ایڈیٹر ندائے ملت (لکھنؤ) کی پرمغز تقاریر سننے میں آئیں ان تقاریر سے ان دو تحریکات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہو سکا۔ جن تحریکات سے مولانا علی میاں مدظلہ کا تعلق ہو۔ اس تحریک کے اخلاص اور جذبہ کا وہی اندازہ کر سکتے ہیں جو عالم اسلام کی اس ہمالیاتی شخصیت سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں۔ ڈاکٹر قریشی سے مختصر بات چیت اور لٹریچر دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ موجودہ دور میں دینی تعلیمی کونسل کا تعلیمی مشن ایک عظیم کارنامہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار برس کی تاریخ میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتا جس کا اعتراف خود علمائے کرام نے بھی کیا ہے۔

دینی تعلیمی کونسل کے قیام کی بنیادی وجوہات

۱۔ ملک کے سیکولر دستور کے تحت کسی سرکاری اسکول میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں سرکار کسی مذہب کی سرپرستی نہیں کرے گی۔ البتہ لسانی اور مذہبی اقلیتیں چاہیں تو اپنے مدارس قایم کر سکتی ہیں اور دستور کے دیے ہوئے حقوق کے تحت اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھ سکتی ہیں۔ اس طرح اپنے مذہبی عقائد، تہذیب و ثقافت کے ورثہ کو محفوظ کر سکتی ہیں۔

۲۔ آزادی کے بعد سے علاقائی زبانیں جو اب تک خوابیدہ تھیں وہ ایک دم سے جاگ اٹھیں۔ اس انقلابی تبدیلی کی وجہ سے اردو سوائے جموں و کشمیر کے کسی ریاست کی علاقائی زبان باقی نہیں رہی۔ باوجود اردو عام بول چال کی زبان ہونے کے مسلمانوں کی اکثریت کی مادری زبان بھی ہے۔ کچھ تو سیاسی انقلاب اور کچھ ریاستی حکومتوں کی سرد مہری کی وجہ سے اردو کے ساتھ سخت ناانصافیاں روا رکھی گئیں۔ اردو کے ساتھ ناانصافی کے معنی مسلمانوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہے ہمارے وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی نے دہلی میں ابوالکلام آزاد صدی تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ آزادی کے بعد سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا۔

وزیر اعظم کا یہ اعتراف ان کی وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔ ان کی جان، مال و آبرو کے ساتھ ساتھ زبان کے ساتھ بھی سخت ناانصافیاں ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔

عربی زبان کے بعد اسلامیات کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو میں ہے۔ اگر اردو سے ہمارے بچے ناواقف رہ جائیں تو وہ یک لخت اپنے مذہب، ثقافت، تمدن، آرٹ اور ادب کے بیش بہا خزانوں سے ہی محروم رہ جائیں گے اور یہ قیمتی سرمایہ کوئی ایک ہزار برس میں تشکیل پایا ہے۔ اگر اس ورثہ سے اپنی اولاد کو محروم کر دیا جائے تو آنے والی

---

* ریٹائرڈ پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد۔

نسلیں مفلس و نادار، یتیم رہ جائیں گی۔ وہ موجودہ بے ہنگم نظامِ تعلیم سے ضرور آشنا ہوں گی لیکن ماں باپ کو انھیں دیکھ کر شرم آئے گی۔ کیوں کہ انھیں یہ احساس ہوگا کہ ہم اپنے مذہب و ثقافت کا قیمتی سرمایہ اپنے بچوں کو منتقل نہ کر سکے۔ وہ ایک ایسے ذہنی خلا میں نشوونما پائیں گے جن کے پاؤں زمین پر نہ ہوں گے۔ انھیں ہر ہوا کا جھونکا اُڑا لے جائے گا

۳ - اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ پرائمری اسکول کی نصابی کتابوں میں عام طور پر وہی دیومالائی قصے اور کہانیاں ہوتی ہیں جن کی غالب اکثریت اس علاقے میں ہوتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر ملک کا یہی حال ہے۔ ابتدائی عمر میں ان قصے کہانیوں کا بڑا اثر ہوتا ہے اور یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو اسلام کے بنیادی عقیدہ سے ٹکراتا ہے۔

اہم خد و خال :-

۱۹۵۹ء میں قاضی عدیل عباسی نے مختلف مکاتبِ خیال کے علما اور دانش وروں کا ایک اجلاس طلب کیا اور اس تحریک کا یہی نقطۂ آغاز ہے۔ اس اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ ۴ تا ۱۰ سال کی عمر کے بچوں کی تعلیم کا انتظام خود مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے اگر وہ اپنے بچوں کے دین و مذہب کو سلامت رکھنا چاہتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ اپنی مادری زبان اردو ہی کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے۔ اس طرح اردو زبان حکومت کے رحم و کرم سے آزاد ہوگی اور بچوں کو اسلام سے بے گانہ ہونے کی نوبت نہ آئے گی۔ یہ ایک انقلابی تجویز تھی جو انقلابی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ کیوں کہ صرف ۳۰ سال کے عرصے میں اتر پردیش میں مسلمانوں کے قائم کیے ہوئے ۴۰ اضلاع میں کوئی دس ہزار پرائمری اسکول ہیں جن میں پانچ لاکھ طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ بعض اضلاع میں ۱۰۰۰ اسکول ہیں جو سرکاری اسکولوں کی تعداد کے برابر ہے اور کہیں پر زیادہ بھی ہیں۔ بچوں کو اول تا پنجم اردو میڈیم کے ذریعے نصابی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ساتھ قرآن ناظرہ، دینیات اور مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ قرآن [illegible] تیسری جماعت سے پڑھایا جاتا ہے۔ پانچویں جماعت کے بعد ان طلبا کو سرکاری اسکولوں کی چھٹی جماعت میں با آسانی

داخلہ مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان اسکولوں سے آئے ہوئے طلبا کا معیارِ تعلیم سرکاری اسکولوں کے طلبا سے بہتر ہوتا ہے۔

ان اسکولوں کو چلانے کے لیے کوئی سرکاری امداد نہیں لی جاتی ماہانہ ۴ کروڑ روپے کا سرمایہ خود مسلمانوں کی باہمی امداد، چندہ اور 'چٹکی فنڈ' سے فراہم ہو جاتا ہے۔ 'چٹکی فنڈ' وہ ہے جو غریب خاندان بھی روز کے کھانے میں سے آٹا، چاول یا گیہوں کا تھوڑا سا حصہ الگ کر دیتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک بہت معمولی ایثار نظر آتا ہے لیکن ہر گھر کو اس اسکیم میں شامل ہونے کا فخر حاصل رہتا ہے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے ایک قسم کا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم سے راست دلچسپی کا واسطہ اس اسکیم کی کامیابی کا روشن پہلو ہے۔ ہر فرد، مرد و عورت کا یہ احساس کہ وہ بھی اس اسکیم کا ایک حصہ ہے، یہ احساس ہی اس تنظیم کی اصل روح ہے۔

اس تنظیم نے حکومت سے نہ کچھ طلب کیا ہے اور نہ کچھ پوچھا ہے اور نہ اس چٹان سے سر ٹکرانے میں اپنا وقت ضائع کیا ہے۔ اپنے بچوں کی پرائمری ایجوکیشن اپنے حسبِ مرضی چاہیں تو پھر اس کا نظامِ تعلیم بھی اپنے ہی ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔ بے شک ہندوستان میں اس کا عملی کامیاب تجربہ ہمارے تعلیمی نظام کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔

اس اسکیم کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے دستور میں "لازمی جبری تعلیم" کی ذمہ داری مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو سونپی گئی ہے۔ جدید قومی تعلیمی پالیسی کے ایکشن پروگرام میں ۱۹۹۵ء تک ملک کے وہ تمام بچے جن کی عمریں ۶ تا ۱۴ سال ہوں گی، اس اسکیم کے تحت اسکولوں میں شریک رہیں گے۔ لیکن آزادی کے بعد سے دو مرتبہ اس ٹارگٹ کو چھونے میں ناکامی ہو چکی ہے اور یہ نیا ٹارگٹ بھی قابلِ عمل نہیں ہے۔ اس کی ناکامی کے آثار ابھی سے شروع ہو چکے ہیں۔

ایسی صورت میں دینی تعلیمی کونسل ملک کے دستور کی اسپرٹ کو قائم رکھتے ہوئے ایک بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہے۔ وہ ۴ تا ۱۰ سال کی عمر کے بچوں کو پانچویں جماعت تک تعلیم دے کر دستور کی ایک اہم دفعہ کی [illegible] ہے۔

اس تعلیم کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اگر ذوق و شوق اور دلچسپی سے دی جائے تو طلبا کا معیار تعلیم بھی اونچا ہوگا۔ بچوں کو آگے کی تعلیم کے مراحل طے کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہ بچے اونچی جماعتوں میں بھی اپنے معیار کو باقی رکھ سکیں گے۔ اس سے ہٹ کر تربیت کا جو سرمایہ ان کے پاس ہوگا وہ ساری زندگی کام آئے گا۔

یہاں پر ایک عام اور شدید غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ صرف انگلش میڈیم کے طلبا کا معیار تعلیم اونچا ہوتا ہے اور جب بھی اردو میڈیم طلبا کا ذکر چلتا ہے تو پست معیار تعلیم ذہن میں آجاتا ہے۔ یہاں پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں۔ دراصل معیار تعلیم کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہے۔ یہ تو مسلمہ ہے کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ "بچہ مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے" (ذاکر حسین)۔ اصل میں انگلش میڈیم مدارس کی مہنگی تعلیم ہے۔ جو تعلیم مہنگی ہوگی وہ معیاری ہوگی۔ اور جو ارزاں ہوگی اس کا معیار بھی کم ہوگا۔ اس کے علاوہ ادارہ کا انتظامیہ اساتذہ کی لگن، ماں باپ کی غیر معمولی دلچسپی، انگریزی کے ساتھ سماج میں مرتبے کا احساس، گھر پر ٹیوشن کا انتظام وغیرہ وغیرہ ـــــ ایسی باتیں ہیں جو تعلیم کے معیار کو بلند کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ورنہ انگریزی زبان میں از خود ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریزی داں حضرات بھی ساری عمر اچھی انگلش نہیں لکھ سکتے۔ کام چلاؤ انگریزی بولنا لکھنا اور بات ہے۔

آندھرا پردیش میں اردو کا مسئلہ

اترپردیش کی اس دینی تعلیمی کونسل کے کام سے ہمیں کچھ روشنی ملتی ہے۔ جہاں تک ہماری ریاست میں اردو کا مسئلہ ہے آزادی کے بعد سے جوں کا توں قائم ہے۔ وہ زیادہ تر کسی علمی سنجیدہ کاوش کے وسمینار، ادبی کانفرنسوں اور سیاسی پلیٹ فارم کا موضوع رہا ہے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے ان سب کا کام ۳۰، ۴۰ برسوں میں صفر سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سب ہمارے بچوں کی تعلیم ہماری حسب مرضی کر دے گی، ایک لاحاصل کوشش ہے اور وقت ضائع کرنا ہے۔ اور طویل تجربہ بتلاتا ہے کہ بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ ہاں کسی نے اس میدان میں خاموشی سے عملی قدم اٹھایا ہے تو وہ مساجد کے متعمدین ہیں یا دینی تعلیمی درس گاہوں کے سربراہ ہوں گے جنھوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ پرائمری ایجوکیشن کا انتظام اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ کیا ہے۔

دینی تعلیمی کونسل کی عملی مثال ہمارے لیے ایک مشعل راہ ہے۔ اچھا ہوتا کہ ہمارے اکابر جنھیں ملت کے بچوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی ہے وہ مل کر بیٹھیں اور کوئی عملی تعلیمی پنج سالہ منصوبہ بنا کر آگے بڑھیں حکومت کے جی۔ اوز اردو سے متعلق ہوں یا اقلیتوں سے۔ چاہے وہ کتنے ہی خوش آئند ہوں، حکومت کی مشنری اتنی پیچیدہ ہے کہ ان پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کاغذی پیرہن سے اصلی تصویر کے نقوش ابھرنے تک ایک عرصہ گزر جائے گا۔ آج سے دس برس بعد حیدرآباد میں کوئی سمینار ہوگا تو ہر شخص کہے گا کہ ہم جہاں سے چلے تھے بس وہیں پر ہیں ـــ

"تعلیم دراصل کسی سماج کی اس کی جانی بوجھی سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لیے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی پیدا کر سکیں"

ذاکر حسین خاں

چین میں زرعی سائنس

چینی کاشت کار، اس وقت خوراک کی جو مقدار پیدا کر رہے ہیں، وہ ماضی کے مقابلے میں کم ہے۔ اس لیے زرعی حکمت عملی اور زرعی زمین کا غلط استعمال گرما گرم موضوع بحث بن چکے ہیں۔ پچھلے سال چینی اسمبلی نیشنل پیپلز کانگریس نے حکومت پر زور دیا کہ وہ سائنسی اور تکنیکی بنیادوں پر زراعت کی طرف توجہ دے جب کہ چینی وزیر اعظم زاؤ زیانگ پہلے ہی اپنا نقطۂ نظر بیان کر چکے تھے کہ معاشی دولت کا انحصار صرف اور صرف سائنس اور ٹکنالوجی پر ہے۔ ان باتوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ماؤ زے تنگ کی سیاست اس کے ساتھ ہی ختم ہو چکی ہے اور ماؤ کے بعد کا چین نئے انداز سے سوچ رہا ہے۔

چین نے حال ہی میں ایک "تکنیکی انقلاب" برپا کرنے کا اعلان کیا ہے جو ماؤ زے تنگ کے "سرخ انقلاب" سے زیادہ پائیدار اور مستحکم نتائج پیدا کرے گا۔ اس تکنیکی انقلاب کا آغاز "چنگاری منصوبے" سے کیا گیا ہے۔ یہ عزم ظاہر کیا گیا ہے کہ سائنس دانوں اور انجینئروں کو کمیونسٹ پارٹی کے دائرہ اختیار سے آزاد کر دیا جائے گا اور انھیں اس بات کا مکمل حق حاصل ہوگا کہ وہ نجی کمپنیاں قایم کریں یا اپنی سائنسی دریافتوں اور کامیابیوں کو فروخت کر دیں۔

چین کی آبادی ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے جس کا ۸۰ فیصد ایسے کاشتکاروں پر مشتمل ہے جو بہت کم آراضی پر کاشت کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے حصے میں دو ایکڑ سے بھی کم رقبہ آتا ہے۔ ایسے دیہاتی کاشت کاروں کا بڑا حصہ ان جدید زرعی طریقوں کا استعمال نہیں کر پاتا جن کے استعمال نے چند سال پہلے چین کی زرعی پیداوار میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ۱۹۸۵ء سے حکومت نے ایک سائنسی و تکنیکی کمیشن قایم کیا اور اس کے ذمہ یہ کام لگایا کہ وہ دیہاتی علاقوں میں سائنسی تحقیق اور سائنسی طریقۂ کار کو پھیلائے۔ اس کمیشن نے ۱۹۸۶ء میں چنگاری منصوبے کا اعلان کیا۔ منصوبے کا نام چنگاری اس چینی کہاوت سے ماخوذ ہے جس کے مطابق "ایک چھوٹی سی چنگاری سے بڑی آگ لگ جاتی ہے"۔ چنگاری منصوبہ، چین کے موجودہ پنج سالہ ترقیاتی پروگرام کا سب سے اہم حصہ ہے۔

۱۹۷۸ء میں چین نے پہلا مرتبہ یہ کوشش کی کہ درآمد کردہ ٹکنالوجی کی مدد سے معیشت کو جدید بنایا جائے۔ نیز کاشت کاروں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ آزاد منڈی میں اپنی معاشی سرگرمیاں انجام دیں۔ اس کے نتیجے میں زرعی اور دیہاتی صنعت کی پیداوار حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی اور ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۴ء تک کے عرصے میں اناج کی پیداوار ۰ء۴ فیصد سالانہ شرح سے اس قدر بڑھی کہ ۴ کروڑ ٹن سے بھی تجاوز کر گئی۔ دیہاتی صنعتوں کو تیزی سے فروغ حاصل ہوا، کسانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور مختلف قسم کی فصلوں کی بھرپور پیداوار حاصل ہونے لگی لیکن یہ رجحان اگلے برسوں میں برقرار نہ رہ سکا۔ ۱۹۸۵ء میں پیداوار بڑھنے کے بجائے ۷ فیصد گھٹ گئی۔ اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہنگامی اقدامات کے تحت زائد کھاد کی فراہمی جیسی کوششیں کی گئیں اور ۱۹۸۶ء میں پیداوار ۱۹۸۴ء کے مقابلے میں

ایک فیصد بڑھ گئی۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ بعض کسان تو کھاد ایسی
قیمت پر خریدنے کو بھی تیار ہیں جو سرکاری قیمت کا تین گنا ہو۔

یقیناً ذمہ داری نظام جسے چینی "سوشلزم" کہتے ہیں، منفی اثرات
کا باعث بنا ہے۔ زرعی خاندانوں کے بجائے زرعی کمیون یا برادری کا نظام
رائج کیا گیا جس کی وجہ سے زراعت میں سرمایہ کاری بہت کم رہ گئی
پانی کی بہم رسانی کا نظام بگڑ گیا۔ زمین کا بہت سا حصہ بے کار چھوڑ دیا گیا
اور اس پر کسی قسم کی کاشت جاری نہ رکھی گئی۔ ریگستان بننے اور مٹی کے
کٹاؤ جیسے قدرتی عوامل نے بہت سی زرعی زمین کو نقصان پہنچایا نیز
نئے شہروں اور قصبات کے پھیلاؤ سے بھی زیر کاشت رقبہ متاثر ہوا
حتیٰ کہ حکومت نے اس بات کا اعلان کیا کہ اس زرعی رقبے پر جہاں کاشت
نہیں کی جائے گی، نئے ٹیکس عاید کیے جائیں گے۔

۱۹۷۰ء سے لے کر اب تک اس زرعی رقبے میں بھی کمی ہوئی ہے
جس پر پہلے اناج والی فصلیں کاشت کی جاتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ رہی ہے
کہ کاشت کار ان سے زیادہ فائدہ مند فصلوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔
تاہم زرعی رقبے میں اس کمی کے باوجود، بہتر بیج، غیر معمولی پیداواری
حالات اور مصنوعی کھاد کے وافر استعمال نے ۸۴-۱۹۷۸ء کے
عرصے میں اناج کی پیداوار ۲۲.۶ فیصد بڑھا دی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے
کے لیے کھاد کا اس قدر زیادہ استعمال کرنا پڑا کہ پہلے کے مقابلے میں
۷۰ فیصد زیادہ کھاد استعمال کی گئی۔

ان حالات کے باوجود حکومت زرعی رقبے کی پامالی پر کوئی خاص
توجہ نہیں دے سکی۔ چنانچہ چینی اکیڈمی برائے سماجی سائنس اور اسٹیٹ
کونسل کی شایع کردہ رپورٹ "چین ... ۲۰۰۰ء میں" میں خدشہ ظاہر کیا گیا
ہے کہ اس وقت تک قابل کاشت آراضی میں ۲۰ لاکھ ہیکٹر تک کمی واقع
ہو جائے گی لیکن یہ رپورٹ اس کے باوجود امید ظاہر کرتی ہے کہ نئی صدی
کے آغاز تک چین میں اناج کی پیداوار ۵۰ کروڑ ٹن سالانہ بڑھ جائے
گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چینی کسان ۱۹۸۰ء کی ۲.۴۲ ٹن فی ہیکٹر سے
۲۰۰۰ء کی ۳.۵ ٹن فی ہیکٹر پیداوار کا ہدف حاصل کرنے لگا

چینی وزارت برائے زراعت، مویشیان و ماہی گیری، ان بلند مقاصد
کو حاصل کرنے کے لیے ابھی سے تیاریاں کر رہی ہے اور اس سلسلے میں
اس کا ایک حالیہ اقدام اناج کی قیمتوں میں اضافہ تھا۔ وزارت نے زرعی
مشینوں، ان کے ایندھن اور کھاد کے سلسلے میں رعایتیں بھی فراہم کی ہیں
اور آب پاشی کا نظام بھی پہلے سے بہتر کر دیا ہے۔ وزارت کا اب ایک اور
مقصد یہ ہے کہ کھاد کی فراہمی میں اضافہ کیا جائے تحقیق کے مطابق چین کی
زرعی زمین کے لحاظ سے نمکیات کی کمی سے اناج کی پیداوار متاثر ہوتی ہے
چینی زمین میں پوٹاش کی سب سے زیادہ کمی ہے کھاد کی فراہمی سے اس
کمزوری کو دور کرنے میں خاطر خواہ مدد ملے گی۔

فارمنگ کے جدید طریقوں سے بھی چینی وزارت زراعت کو
ترقی دینے میں مدد لے رہی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اب تک وزارت
نے جو طریقے رائج کیے ہیں۔ وہ بہت مہنگے ہیں اور عام کسان کے بس سے
باہر ہیں اسی طرح زرعی مشینیں بھی خاصی زیادہ قیمت پر مل پاتی ہیں۔
۹۰ کلو واٹ کے ٹریکٹر کی قیمت ۲۴۰۰۰ یوان ہے جو ایک عام کسان کی
دو سال کی آمدنی کے برابر ہے۔ پھلوں، سبزیوں، کپاس اور چاول کو
محفوظ کرنے کے لیے پلاسٹک کی جو شیٹ استعمال ہوتی ہے، وہ بھی
عام چینی کسان کی قوت خرید سے باہر ہے۔

چینی دیہات میں صنعتی فروغ

زراعت کو جدید راہوں پر ڈالنا 'چنگاری منصوبے' کا محض
ایک حصہ ہے اس منصوبے کا دوسرا بڑا مقصد دیہاتی صنعتوں میں کسانوں
کی دلچسپی بڑھانا ہے۔ اس قسم کی صنعتیں پہلے ہی چین بھر میں قایم ہیں اور
کام کر رہی ہیں تاہم ابھی دیہات میں صنعتی و تکنیکی فروغ کی بڑی گنجایش
موجود ہے۔ ان صنعتوں کے قیام سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ صنعتی و
تکنیکی پیشوں سے وابستہ ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان کو مقامی طور
پر روزگار مل جائے اور وہ شہروں کی طرف نہ جائیں۔

دیہات میں صنعتی فروغ کے لیے حکومت نے ایک بڑا قدم تو یہ
اُٹھایا ہے کہ افراد کو نجی کمپنیاں قایم کرنے کی اجازت دے دی ہے
اس سے پہلے صرف کمیون ہی صنعت قایم کرتے اور چلاتے تھے۔ اس اصلاح
کے نتائج اچھے برآمد ہو رہے ہیں اور ۱۹۸۰ء کی ۴۰ ارب یوان کی دیہاتی
صنعتی پیداوار ۱۹۸۶ء تک ۳ کھرب ۳ ارب یوان مالیت کی ہو گئی تھی

اس وقت چین میں دیہاتی کارخانوں کی تعداد ایک کروڑ ۲۰ لاکھ کے قریب ہے جن میں ایسے ۹۰ لاکھ کارخانے ان افراد کی ملکیت ہیں جو زراعت کے ساتھ ساتھ اسے اضافی پیشہ بنائے ہوئے ہیں۔

دیہاتی صنعتوں سے متعلق حکومتی ادارے کی نظر میں یہ ۹۰ لاکھ کارخانہ دار وہ پُر امن صنعتی انقلاب لا رہے ہیں جو چین کے گوشے گوشے میں نئی خوش حالی کا باعث بن رہا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں یہ صنعتیں دیہاتی آبادی کے ۲۰ فیصد افراد کو روزگار فراہم کر رہی تھیں حکومت کو امید ہے کہ ۱۹۹۰ء میں یہ تناسب ۴۰ فیصد اور ۲۰۰۰ء میں ۶۰ فیصد ہو جائے گا ان صنعتوں سے دیہاتی علاقوں میں خوش حالی کا نیا دور شروع ہو گا چنانچہ اب ایک اوسط درجے کا چینی کسان ۹۰۰ یوان سالانہ کما رہا ہے اور اسے خوراک کے لیے ۴۰۰ کلو گرام اناج (جو زیادہ تر پانی میں اُبالے ہوئے چاول ہوتے ہیں) سالانہ مل رہا ہے۔

غیر ملکی ادارے بھی چینی زراعت میں گہری دل چسپی لے رہے ہیں اور ان کی طرف سے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے ان اداروں میں اقوام متحدہ کا عالمی خوراک پروگرام، عالمی بینک اور مختلف ممالک کے سرکاری و نجی ادارے شامل ہیں اور ان اداروں کے مشترکہ منصوبوں کے تحت سارے ملک میں مویشیوں کے فارم، باغات چراگاہیں اور خوراک محفوظ کرنے کے مراکز قایم ہو رہے ہیں۔ سبزیوں گوشت، دودھ اور لکڑی کو محفوظ کرنے کا سارے کا سارا کام ملک میں جاری ہے۔

غیر ملکی ماہرین زراعت کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آ رہی ہے، وہ جدید ٹکنالوجی سے چینی کسانوں کی ناواقفیت ہے۔ مثال کے طور پر شنگھائی کے قریب زرعی علاقے میں ایک زرعی ٹریننگ مرکز ہے جس میں گائے پالنے اور ڈیری فارم بنانے کی تربیت جدید ترین اصولوں پر دی جاتی ہے لیکن فرسودہ خیالات اور عادات کا خاتمہ ہر جگہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ اس لیے چینی کسانوں کو جو بھی ہدایت دی جاتی ہے وہ بڑی مشکل سے اس کو سمجھنے اور عمل کرنے کے قابل ہو پاتے ہیں۔ چینی کسانوں کا رویہ ہے کہ وہ مویشیوں کو وہ غذا دیتے ہیں جو بچی کھچی ہو۔ گرمیوں میں مٹر ہونے جو بازار میں بک نہ سکیں گائے کی خوراک بنتے ہیں۔ جدید ماہرین کے لیے چینی کسان کو گائے کی خوراک "خریدنے" پر آمادہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

۱۹۸۶ء میں ایک یورپی کمپنی نے ہیلونگ زیان صوبے میں خشک دودھ بنانے کا کارخانہ قایم کرنے میں حصہ لیا۔ کارخانہ قایم ہونے کے بعد یورپی انجینئروں کو یورپ واپس گئے مہینہ بھر ہوا تھا کہ کارخانے کا اسپرے ٹاور پھٹ گیا۔ اس لیے کہ کسی نے وہ سیفٹی گارڈ ہٹا دیے تھے جو ٹاور کو دودھ موجود نہ ہونے پر چلتے رہنے سے روکتے تھے۔ اس کمپنی نے مکھن کا ایک کارخانہ بھی قایم کیا تھا لیکن چینیوں نے اسٹینلیس اسٹیل کی بجائے کانسی کا والو لگا کر بننے والے مکھن کو ناقابل استعمال بنا ڈالا۔ چنانچہ اس کمپنی کے ایک ماہر نے یوں تبصرہ کیا کہ:

> چین میں واقعی ایسے عام لوگوں کا قحط ہے جو کسی بھی قسم کی تکنیکی معلومات رکھتے ہوں۔ لوگوں میں نئی ٹکنالوجی جذب کرنے کی صلاحیت موجود نہیں جب کہ انہیں ایسی ٹکنالوجی پر چلنے والے پلانٹ چلانے پڑ رہے ہیں۔"

دیہاتی علاقوں میں تیکنیکی افراد کی کمی

چین کے سائنس و ٹکنالوجی کمیشن کی ایک اولین ذمہ داری یہ بھی ہے کہ دیہاتی علاقوں میں تیکنیکی افراد کی کمی دور کرے۔ اس کام کے لیے ملک بھر میں موجود ۲ ہزار ٹریننگ سینٹرز کو از سر نو مؤثر بنایا گیا ہے۔ اب یہ مرکز اس قابل ہو چکے ہیں کہ کسانوں کو جدید زرعی تکنیک سکھا سکیں ان میں سے بہت سے مراکز میں باقاعدہ کلاس ہوتی ہے جس میں کسانوں کو زرعی لکچر دیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں تحقیق کرنے اور زرعی تکنیک کا مظاہرہ کرنے کی سہولیات بھی رکھی گئی ہیں ان مراکز کی مدد سے ہی سرکاری سطح پر کام کرنے والے زرعی سائنس داں بھی عام کسان اور زراعت سے رابطہ قایم رکھتے ہیں۔

کمیشن ایک ایسے منصوبے کا بھی آغاز کر چکا ہے جس کے تحت ۵۰۰۰ دیہاتی صنعت کاروں کو منتخب کیا جائے گا۔ پھر ان کے صنعتی

پروجیکٹ کو ڈیزائن اور مصنوعات کے لحاظ سے مثالی بنا دیا جائے گا ان کارخانوں میں ملازمت کرنے والے کوئی ۱۰ لاکھ افراد کو ۱۹۹۰ء تک جدید تکنیک پر عبور ہو جائے گا۔ یہ افراد کم عمر نوجوان ہیں اور ان سے چین کے چھوٹے قصبات اور دیہاتوں میں تکنیکی عالموں کی ایک نئی نسل وجود میں آرہی ہے۔

کمیشن مرکزی حکومت کا ادارہ ہے لیکن اس کا صوبائی حکومتوں کے زرعی اداروں کے ساتھ گہرا تعلق قایم کیا گیا ہے۔ اب ایسے زرعی ادارے براہ راست کمیشن کے تحت ہیں اور پہلے کی طرح ان پر پارٹی کا غلبہ موجود نہیں ہے۔ اب ان اداروں کو آزادی ہے کہ وہ نجی شعبوں کو اپنی کوششیں پیش کریں۔ ان اداروں کے سربراہ ہی زرعی تحقیق کے ۱۱۰۰ مراکز کے ڈائرکٹروں کا تقرر کرتے ہیں۔ حکومت نے چالیس ہزار سائنس دانوں اور تکنیک کاروں کو اس کام پر لگا رکھا ہے کہ وہ زرعی تحقیق کے ان مراکز کے لیے کام کریں۔ یہ سائنس داں پودوں، جانوروں، مچھلیوں اور فصلوں کی حفاظت، فصل کو اسٹور کرنے اور غذائی اشیاء کو محفوظ کرنے سے لے کر کم قیمت مشینوں تک پر کام کر رہے ہیں۔

زرعی فروغ کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی کہ زرعی تحقیق سے کسانوں کو کس طرح آگاہ کیا جائے۔ وزارت زراعت کا اپنے کارکنوں اور سائنس دانوں سے یہ مطالبہ ہے کہ ۷۰ تا ۸۰ فیصد تحقیق عام کسانوں تک پہنچنی چاہیے۔ یہ رویہ ماضی کے اس رویے کی اصلاح ہے جس میں ایک تحقیقی سائنس داں کے لیے عملی کشش موجود نہ تھی۔ اب صورتِ حال نہایت خوش آئند اور حقیقت پسندانہ ہے۔ مثال کے طور پر زیانگ سو زرعی یونیورسٹی نے فارمنگ اور نئی زرعی انواع پیدا کرنے کے کوئی ۵۰ ٹھیکے رکھے ہیں، ان کے تحت یونیورسٹی فارمنگ نئی زرعی انواع کیڑے مار دواؤں اور کھانے یا پینے والی زرعی پیداوار کو محفوظ کرنے کا کام انجام دے رہی ہے۔ ان سے ہونے والی آمدنی کا دس فیصد حصہ یونیورسٹی کو ملے گا۔ جن لوگوں نے یہ ٹھیکے یونیورسٹی کو دیے ہیں ان میں سے ہر ایک کو سالانہ پانچ ہزار سے ایک لاکھ یوان سالانہ کی ادائیگی کرنا پڑتی ہے لیکن اس ادائیگی کا انحصار صرف اور صرف نتائج پر ہے۔ اگر یونیورسٹی مفید نتیجہ فراہم نہ کر سکے تو اسے ساری رقم واپس کرنا پڑتی ہے۔

ایسے ہی ایک ٹھیکے کی مدد سے تربوز کی ایک نئی قسم سوچی نمبر ا پیدا کی گئی۔ اب ہر سال اس کے ۵۰۰۰ کلوگرام بیج پیدا کرنے کا ٹھیکہ مل رہا ہے۔ یہ ٹھیکہ زیانگ گیانگ کے زرخیز علاقے سے ملتا ہے اور ان بیجوں کی سب سے زیادہ فروخت زیانگ سو صوبے یا یانگ سی دریا کی وادی کے ان علاقوں میں ہوتی ہے جو گنجان آباد ہیں۔

سوچی نمبر ا کا تربوز باقی تربوزوں کے مقابلے میں زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ یہ جلدی پک جاتا ہے اور اس کا اوپری چھلکا بھی کم موٹائی رکھتا ہے۔ اس لیے دیکھتے ہی دیکھتے زیانگ سو کے ۱/۲ زرعی رقبے پر سوچی کی کاشت چھا گئی ہے اور یونیورسٹی کو اس کامیابی کی بدولت ۳ لاکھ یوان سالانہ مل رہے ہیں۔ اس لیے یونیورسٹی کے ڈائرکٹر زیانگ باؤشان کہتے ہیں کہ

> "یہ نیا طریقہ کار سائنسی تحقیق کو تیزی سے مقبول بنا رہا ہے۔ آمدنی حاصل ہونے سے خود بخود سائنسی تحقیق موثر ہو جاتی ہے۔"

اس بات کا امکان واضح ہے کہ اگر اس تحقیقی طریقہ کار کو مزید بہتر بنا لیا جائے تو نتائج اور بھی خوش کن نکلیں گے چنانچہ زرعی کمیشن کے نائب وزیر زنگ زیالنگ نے ایک کانفرنس کے موقع پر کہا ہے کہ زیانگ اکیڈمی جیسے تحقیقی اداروں کا زراعت و صنعت سے ابھی تک مکمل تعلق قایم نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے ایسے اداروں کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے ان کی انتظامی ذمہ داریاں نجی اداروں کو سونپی جا رہی ہیں۔ زیالنگ کا کہنا ہے کہ اگر حسب خواہش کارکردگی حاصل نہ ہوئی تو ایسے اداروں کو سائنس دانوں کو پٹے پر دے دیا جائے گا۔ (ماخوذ از ماہنامہ طالب علم کراچی)

> "لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق باتیں کرو"
>
> (نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۸ - شمارہ ۳ - (مارچ ۹۰ء)

اسلام کا تصور علم و مسلمانوں کے تعلیمی مسائل

ظفر الاسلام*

اسلام ابتدا ہی سے علم و آگہی کا علم بردار اور عقل و خرد کے استعمال کا داعی رہا ہے۔ نزولی ترتیب کے اعتبار سے قرآن کریم کی پہلی سورہ میں خواندگی کی تلقین کی گئی اور اسے خدائے تعالیٰ کا ایک عظیم فضل و کرم بتایا گیا کہ اس نے انسان کو علم کی دولت سے نوازا اور اسے قلم کے استعمال کا طریقہ سکھایا (۹۶ : ۱ - ۵) اس کے علاوہ قرآن نے مختلف پیرایہ میں علم کی اہمیت اور اہل علم کی فضیلت واضح کی۔ ایک جگہ اس نے علم کو رفع درجات کا وسیلہ قرار دیا (۵۸ : ۱۱) تو دوسری جگہ اس میں اضافے کے لیے خصوصی دعا کی نصیحت کی (۲۰ : ۱۱۴) اس نے کہیں اہل علم و غیر اہل علم کے مابین موازنہ پر استعجاب ظاہر کیا (۳۹ : ۹) تو کسی مقام پر قرآنی حقایق کی اساس علم و ادراک کو گردانا (۷ : ۵۲) قرآن کے ترجمان حقیقی اور ہدایات ربانی کے پرتو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعے علم کی اہمیت و فضیلت کو اور واضح کیا۔ پیغمبر آخر الزماںؐ نے حکمت کو مومن کی متاع گم شدہ قرار دے کر اس کی قدر و قیمت کو متعین کیا اور دوسروں کو اس سے روشناس کرانے کو بہترین ہدیہ سے تعبیر کر کے اس کی اشاعت کی ترغیب دی۔

علوم و فنون کے میدان میں اسلام کا سب سے اہم و قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کو علم کا ایک بلند و وسیع تصور عطا کیا اور دینی و دنیوی، مذہبی و غیر مذہبی یا روایتی و عقلی علوم کی تقسیم کے بغیر مطلق علم و فن کے سیکھنے و سکھانے کا درس دیا۔ اسلام نے بغیر کسی تفریق کے ان تمام علوم و فنون کی اشاعت کی تعلیم دی جو خدا کی مرضیات کی تکمیل اور خلق خدا کی نفع رسانی کا ذریعہ بن سکیں۔ درحقیقت اسلام میں تعلیم سے مقصود خدا کی مرضیات کو جاننا، کائنات میں انسان کے صحیح مقام کو پہچاننا اور ایک ایسے معاشرہ کو پروان چڑھانا ہے جہاں جہل و نادانی کے بجائے علم و آگہی کا بول بالا ہو اور حق شناسی و صداقت کا دور دورہ ہو۔ مزید براں یہ مقصد بھی اسلام کے تصور علم کے منافی نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ خدائے تعالیٰ کے بے پایاں انعامات کا پتہ لگایا جائے اور قدرتی وسائل کو انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ اسلام میں انجام کے اعتبار سے ہر کام کے حسن و قبح کا مدار نیت پر ہوتا ہے۔ علم کے میدان میں بھی اس اصول کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس لیے اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ وہ علوم بھی جو بظاہر دنیوی تصور کیے جاتے ہیں۔ اگر مذکورہ مقاصد کے تحت حاصل کیے جائیں تو وہ اسلام کی نگاہ میں غیر مذہبی نہیں بلکہ محمود و باعث ثواب قرار پائیں گے۔ اصل میں دینی و دنیوی دو خانوں میں علم کی تقسیم ایک مصنوعی تقسیم ہے اور یہ دین و دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے جو اسلامی نقطۂ نظر کے منافی ہے۔ اسلام علم کی خانہ وار تقسیم کا قایل نہیں ہے۔ اس کی ایک قوی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں جہاں جہاں علم کی اہمیت و فضیلت واضح کی گئی ہے اور اس کی طلب کی تلقین کی گئی ہے وہاں مطلق علم کا ذکر آیا ہے۔ ان آیات

---

* اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ر احادیث کو بعض اوقات علم دین سے مقید کیا جاتا ہے لیکن اسلام
نے انسانی زندگی کا جو وسیع تصور پیش کیا ہے اور حیات انسانی کو
بامعنی و بامقصد بنانے کے لیے جو جامع نظام عطا کیا ہے اس کی روشنی
میں علم کا دائرہ محدود کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے. علم کی فی نفسہٖ ایک
معنوی قدر و قیمت ہے۔ اسلام نے اس کے تصور کو وسیع کر کے نہ
صرف اس کی قدر و قیمت کو دو بالا کیا ہے. بلکہ اس کی اصل ماہیت و
حقیقت کو بھی بے نقاب کیا ہے۔

ان سب تفصیلات سے مقصود خدانخواستہ اساسی علوم کی
اہمیت کم کر کے دکھانا یا ان کی افادیت سے اعراض کرنا نہیں ہے. اساسی
علوم سے میری مراد تفسیر، حدیث و فقہ ہے۔ اسلام میں ان کی اولیت و
افضلیت اپنی جگہ مسلم ہے اور کسی بھی صورت میں اس سے انکار ممکن
نہیں اور نہ ہی دوسرے علوم سے ان کا موازنہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان
کے علاوہ کچھ ایسے علوم و فنون ہیں جو اساسی علوم کی تحصیل میں ممد و معاون
ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً نحو و صرف، عربی زبان و ادب، علم معانی و بلاغت
وغیرہ اور اسی کے ساتھ ایسے علوم کی بھی کمی نہیں جو علمی دنیا میں بنیادی
علوم کی افادیت بڑھانے، قرآن و حدیث کے تقاضوں کو پورا کرنے
اور ان کی تعلیمات کو موثر انداز میں پیش کرنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں
اس زمرہ میں وہ تمام علوم شامل کیے جا سکتے ہیں جن کا تعلق سماجیات و
عمرانیات سے ہے یا جو مظاہر فطرت اور عجائبات قدرت کے مطالعہ و
تحقیق سے مرتبط ہیں۔ ظاہر ہے کہ اساسی علوم کی اولیت و افضلیت
کے ساتھ ساتھ موخر الذکر علوم کی ضرورت و افادیت سے بھی انکار
نہیں کیا جا سکتا اور اسی لیے نہ تو ماضی میں مسلمانوں نے اس سے پہلوتہی
کی ہے اور نہ موجودہ زمانے میں ان سے اعراض کی گنجایش ہے۔ یہ
مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت ہی کا تقاضا تھا کہ معلم اعظم نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کی ہدایت
کی اور بعض دیگر صحابہ کو اس کی ترغیب دی۔ مزید برآں آپؐ نے یہ فرما کر
کہ "حکمت مردِ مومن کی متاعِ گم شدہ ہے"۔ نہ صرف اس کی قدر و
قیمت کو واضح کیا اور اس کی طلب کی ترغیب دی بلکہ اسلام میں علم کے
تصور کی وسعتوں کو بھی آشکارا کیا اور اس کے حصول کے ذرائع میں

اپنوں و غیروں کی تفریق کو بھی مٹایا۔ اس کی مزید توثیق اس سے بھی ہوتی
ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے سخت ترین مخالفین کفار
مکہ سے مسلم لڑکوں کو فن کتابت کی تعلیم دلانے میں کوئی حرج محسوس
نہیں کیا جیسا کہ مسلم لڑکوں کو لکھنا سکھانے کے عوض جنگ بدر کے کچھ
قیدیوں کی رہائی کا واقعہ مشہور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام علم کی نوعیت
اور اس کے حصول کے ماخذ و ذرائع کے باب میں نہایت وسیع تصور کا حامل
ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ممتاز مفکر اسلام امام غزالیؒ نے طب،
حساب، سیاست، زراعت، پارچہ بافی و خیاطی جیسے فنون سیکھنے کو نہ
صرف فرض کفایہ قرار دیا ہے بلکہ اُن علوم کی تحقیر کو ناروا اور ان سے
پہلوتہی کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تصور کیا ہے جو معاشرتی ضروریات
کی تکمیل اور خلق خدا کی خدمت کا وسیلہ بنتے ہیں لیکن بظاہر "دنیوی"
نظر آتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر کی تائید مشہور مورخ اور عمرانیات کے ماہر
ابن خلدون کی اس رائے سے بھی ہوتی ہے کہ تعلیم انسانی زندگی کی ایک
اہم ضرورت ہے اور اس کا مقصد معاشرہ کو منظم و متمدن بنانا ہے۔
اور یہ مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب مختلف علوم و فنون کو
فروغ حاصل ہو اور زمانے کی ضروریات کے مطابق علوم و فنون کے
ماہرین موجود ہوں۔

یہاں یہ وضاحت اشد ضروری ہے کہ جس طرح زمانے کے
تقاضے کے مطابق معاشرہ کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں اور انسان کے
طریق بود و باش میں فرق رونما ہوتا ہے اسی طرح ہر زمانے کے اعتبار
سے عصری علوم کی نوعیت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور ان کی تحصیل کے
ذرائع میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ
انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ وہ فنون اور تکنیک بھی تبدل
پذیر ہوتے ہیں جن سے قدرتی وسایل کو قابل استعمال بنانے اور انسان
کے لیے آسانیاں مہیا کرنے میں کام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں
کی معاشرتی و تمدنی زندگی کے مسائل کو سمجھنے اور اسلامی تعلیمات کی
روشنی میں ان کے تجزیے کے لیے عہد وسطیٰ میں جو کتابیں شامل درسیات تھیں
ان کی مدد سے آج کی معاشرت کے مسایل کو جاننا و سمجھنا دشوار ہے
اسی طرح پہلے معاشی زندگی کی تعمیر کے لیے زراعت و تجارت کے سیدھے سادے

اصول اور صنعت و حرفت کے سادہ طریقے معمول بہ تھے۔ اس لیے اسی اعتبار سے ان کی جان کاری درکار تھی لیکن آج کسب معاش کے یہ ذرائع اتنے ترقی کر چکے ہیں اور ان کے استعمال کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد پا چکے ہیں کہ ان سے بہرہ ور ہونے کے لیے اور انسانی ضروریات کی تکمیل کی خاطر سائنس و ٹکنالوجی کی تعلیم ناگزیر ہو گئی ہے۔ امام غزالیؒ نے بجا طور پر طب و حساب کی تعلیم کو فرض کفایہ کے درجہ میں رکھا ہے لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ کیا حساب کے پرانے اصول آج کی ریاضی کے قواعد و ضوابط سے مناسبت رکھتے ہیں یا کیا طب کی تعلیم کا قدیم طریقہ موجودہ زمانے کے طبی مسایل کا حل پیش کر سکتا ہے۔ اس حقیقت سے بھی ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ معدنیات اور دوسری صورتوں میں قدرت کے بیش بہا وسایل کائنات میں موجود ہیں۔ انسانی زندگی کی بہتری و خوش گواری کے لیے پہلے بھی ان کی ضرورت تھی اور آج بھی یہ ضرورت باقی ہے لیکن انھیں کام میں لانے اور انسان کے لیے نفع بخش بنانے کے لیے ماضی میں جو بھی طریقے رہے ہوں عصر حاضر میں وہ سائنس و ٹکنالوجی کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ دور حاضر میں نہ صرف اسلام کی موثر تبلیغ کے لیے جدید علوم اور عصری ذرائع ابلاغ و نشر و اشاعت کی نئی تکنیک سے واقفیت درکار ہے بلکہ دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے اور مخالفین دین کے شکوک و شبہات کو رفع کرنے کے لیے بھی عصری علوم سے مسلح ہونا ضروری ہے۔ آج سے ہزار بارہ سو سال قبل یونانی علوم و فنون کی راہ سے اسلام کے عقاید و نظریات پر جو حملے کیے گئے تھے ان کے دفاع کے لیے اس وقت مسلم علما، و دانش وروں نے یونانی فلسفہ و منطق، علم کلام اور دیگر عقلی علوم میں مہارت حاصل کرنا ضروری تصور کیا اور وہ اس راہ سے مخالفین کے شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن آج اسلام کے عقاید و نظریات پر اعتراضات کرنے یا ان میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے مخالفین جو انداز بیان، اسلوب بحث اور طرز استدلال اختیار کرتے ہیں ان کا مُسکت جواب دینے کے لیے نہ تو فلسفہ کی پرانی کتابیں کافی ہو سکتی ہیں اور نہ علم کلام کی قدیم تحقیقیں کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس کے لیے جدید فلسفہ و منطق و سائنسی علوم یا علامہ شبلی کی زبان میں "جدید علم کلام" سے روشناس ہونا ضروری ہے۔ دوسری جانب خود اسلام کے اساسی علوم کو عملی دنیا میں مزید مفید و موثر بنانے اور ان کے فیوض و برکات کو عام کرنے کے لیے نئے نئے علوم اور عصری طریق تعلیم سے واقفیت کی جو اہمیت ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ بات اسلام کے تصور علم اور نظریۂ تعلیم کے عین مطابق ہوگی کہ زمانے کے تقاضے، معاشرے کی ضروریات اور خود مسلمانوں کے عام مفاد کی روشنی میں اساسی علوم کے ساتھ عصری علوم پر توجہ دی جائے، درسیات میں مفید تبدیلی لائی جائے اور درس و تدریس کے جدید اسلوب و نئے طریقے اختیار کیے جائیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی سماج و معاشرت اور اس کے مسایل سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس کے نقطۂ نظر سے ایسے علوم بے معنی ہیں اور ایسی تعلیم بے روح ہے جن کا ربط زندگی اور اس کے معاملات سے باقی نہ ہو۔

یہ دعوی بلا دلیل ہوگا کہ اسلام کے اس وسیع تصور علم کے باوجود مسلمانوں نے اسلام کے اساسی علوم کے علاوہ دیگر علوم میں کبھی دلچسپی نہ لی اور نہ انھیں شاملِ درس کیا اور یہ کہنا بھی بے بنیاد ہوگا کہ مسلمانوں نے عقلی علوم کے تئیں ہمیشہ بے نیازانہ و منافرانہ رویہ اختیار کیا اور اپنے تعلیمی نصاب کو ان سے دور رکھا۔ تاریخ اسلام کے زریں ابواب اس پر شاہد ہیں کہ قرون اولیٰ و وسطیٰ کے مسلمانوں نے وقت کے تقاضے معاشرے کی ضروریات اور اپنے اجتماعی مفاد کے تحت عملی طور پر بھی تعلیم کے دائرہ کو بہت وسیع رکھا اور مختلف علوم و فنون تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ علم کے حصول میں انھوں نے دینی و دنیوی کی کوئی تفریق قایم نہیں کی اور تفسیر، حدیث و فقہ کے ساتھ ساتھ زبان و ادب، تاریخ و جغرافیہ، فلسفہ و علم کلام، طب و ہیئت اور ریاضی و کیمیا کو بھی اپنی درسیات میں شامل کیا جیسا کہ اموی، عباسی اور اس کے بعد کے زمانے کے تعلیمی نصاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ اس سے اہم یہ کہ انھوں نے علم کے میدان میں اپنوں و غیروں میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی۔ انھیں علم کی روشنی دیارِ غیر میں نظر آئی تو تعلیم نبویؐ کے مطابق بڑھ کر اسے بھی بہ ذوق و شوق حاصل کیا

اور حکمت و دانائی کی باتیں دوسری قوموں سے ملیں تو انھیں بھی بخوشی
قبول کیا۔ مسلم حکمرانوں نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ
کرانے کے علاوہ ایران و ہند و یونانی علوم سے بھی مسلمانوں کو متعارف
کرانے کا اہتمام کیا۔ انھوں نے مختلف ملکوں سے علوم و فنون کے قیمتی
خزانوں کی فراہمی کے ساتھ ساتھ علم و فن کی ترویج میں غیر مسلم علاقوں کے
بعض ماہرین علم کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔
مزید یہ کہ ان علوم کو صرف عربی میں منتقل کرنے پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ
ان پر بحث و مباحثہ اور ان کے سیکھنے سکھانے کا بھی اہتمام کیا گیا
جیسا کہ عباسی عہد کے "بیت الحکمۃ" اور فاطمی دور کے "دار الحکمۃ"
کی کارکردگی کی تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے۔

یہاں اس حقیقت کا انکشاف ناگزیر ہے کہ ایسا نہیں ہے
کہ مسلمانوں نے دوسری قوموں کے علوم و فنون کو من و عن قبول کر لیا۔
چاہے یونانی فلاسفہ کے اصول و نظریات ہوں یا دوسری قوموں کے
حکماء کے افکار و خیالات، علماء وقت نے انھیں تحقیق و تجربہ کی کسوٹی
پر رکھا اور ان کی غلطیوں کو واضح کیا اور اس سے اہم یہ کہ اسلامی عقائد
و نظریات کی روشنی میں انھوں نے یونانی علوم کی تطہیر و تنقیح کی اور انھیں
اس قابل بنایا کہ وہ مسلمانوں کے نصاب تعلیم کا حصہ بن سکیں۔ اس ضمن
میں فیلسوف اسلام ابو نصر فارابی، امام رازی، امام غزالی و ابن
رشد کی خدمات مسلمانوں کی علمی تاریخ کا اہم باب ہیں۔ یہاں یہ ذکر
بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ اولیں ادوار کے مسلمانوں نے دوسری
قوموں کی علمی میراث سے استفادہ کے ساتھ خود بھی تحقیق و جستجو کی راہ
اپنائی اور اپنے مشاہدات و تجربات سے نہ صرف قدیم حکماء و فلاسفہ
کی خامیوں کی نشان دہی کی بلکہ ان کی تحقیقات و انکشافات پر کچھ اضافے
بھی کیے۔ انھوں نے اپنی علمی دلچسپی و تحقیقی ذوق سے کام لے کر علم و فن کی
ایسی نئی نئی راہیں ہموار کیں کہ دانش وران یورپ انھیں پر چل کر بعد میں
ان علوم کے امام بن گئے جنھیں مجموعی طور پر آج سائنس کا نام دیا جاتا ہے
واقعہ یہ ہے کہ علم ہیئت کے میدان میں ابو العباس احمد الفرغانی
محمد بن ابراہیم الفزاری، کیمیا میں جابر بن حیان، نباتات میں ابن بیطار
طب میں رازی و بو علی سینا، سرجری میں ابو القاسم الزہراوی، ریاضیات میں
محمد بن موسیٰ الخوارزمی و یعقوب الکندی، علم المناظر میں ابن الہیثم، تاریخ
میں بلاذری و طبری، جغرافیہ میں مقدسی و ادریسی، عمرانیات میں ابن خلدون
ابن مسکویہ، حیوانیات میں ابو عثمان الجاحظ اور فلسفہ میں ابو نصر فارابی
اور امام غزالی نے ایسے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں کہ دیگر مغربی مفکرین
اور یورپی دانش وروں کے علاوہ سائنسی علوم کے نامور مورخ جارج سارٹن
(George Sarton) کے یہاں بھی ان کی قدر و قیمت کا اعتراف
صاف صاف لفظوں میں ملتا ہے۔

ان تفصیلات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا تصورِ علم اپنی
نوعیت و وسعت دونوں اعتبار سے امتیازی خصوصیت کا حامل ہے
اور ماضی میں اس کے عملی مظاہر بھی سامنے آچکے ہیں جن سے اندازہ ہوتا
ہے کہ اصل زور تو اساسی علوم کی تحصیل پر تھا لیکن معاون علوم (یا علوم
آلیہ) اور عصری فنون پر بھی ضروری توجہ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ
تفسیر، حدیث و فقہ کے ماہرین کے علاوہ دوسرے علوم (یا اس وقت
کے لحاظ سے عصری علوم) میں نمایاں خدمات انجام دینے والے مسلم علماء و
دانش ور بھی پیدا ہوئے۔ یہ ایک ایسا بدیہی واقعہ ہے کہ اس سے شاید
ہی کسی کو انکار ہو لیکن قابل غور اور بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس
تصورِ علم کو اپنا کر اور اسلاف کے علمی کارناموں سے سبق حاصل کرتے
ہوئے موجودہ حالات بالخصوص ہندوستانی تناظر میں کیسا نظام تعلیم تشکیل
دیا جائے اور کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے کہ اس سے مستفید ہونے
والے دینی و ملی تقاضوں کو پورا کر سکیں اور معاشرتی و معاشی ذمہ داریوں
سے بھی عہدہ برآ ہو سکیں۔ مسلمانانِ ہند کے سامنے یہ آج کوئی نیا مسئلہ
نہیں ہے بلکہ اس پر سالہا سال سے اظہار خیال ہوتا رہا ہے لیکن یہ ایک
خوش آئند پہلو ہے کہ ادھر چند سالوں سے اس مسئلے کو کافی اہمیت اختیار
کر لی ہے اور اس مسئلہ کے تئیں احساس کی بیداری کی یہ علامت ہے کہ
اس میں اجتماعی طور پر بھی غور و فکر ہونے لگا ہے اور اس کے لیے مخصوص
سیمیناروں و کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس سے قبل اس مسئلہ پر
ایک قابل ذکر کانفرنس ۷ — ۸ اپریل ۱۹۸۴ء کو دہلی میں "تعلیمی و ملی
کانفرنس" کے نام سے منعقد ہوئی تھی۔ اور دوسری مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ میں "مرکز فروغ سائنس" کے زیر اہتمام ۲۶-۲۸ مارچ [illegible]

کو "دینی مدارس و سائنسی تعلیم" کے نام سے انعقاد پذیر یا اور مستقبل قریب میں اسلامیہ عربک کالج منصورہ (کرناٹک) کے زیر انتظام نظام تعلیم پر منعقد ہونے والا سمپوزیم بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے اس نوع کی مختلف کانفرنسوں کی روداد اور متعلقہ موضوع پر معاصر علما، ودانشوروں کی رائیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ ان سب کے مطالعہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ قدیم وجدید تعلیم میں ہم آہنگی اور مسلمانوں میں عصری علوم کی ترویج وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کیسے ہو یہ ایک مشکل مسئلہ ہے اور متعدد مسائل سے گھرا ہوا ہے۔

اس ضمن میں ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دوہرا نظام تعلیم سے دوچار ہیں۔ ایک ان کا اپنا نظام تعلیم ہے جو مکاتب ومدارس میں رائج ہے۔ دوسرا وہ نظام ہے جو حکومت سے منظور شدہ یا اس کے زیر نگرانی اسکولوں، کالجوں ویونیورسٹیوں میں جاری وساری ہے۔ ان دونوں کے نصاب وطرز تدریس میں ایک بین فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی نہ تو بظاہر کوئی صورت نظر آتی ہے اور نہ یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں اس انداز سے تبدیلی پیدا کریں کہ وہاں سے مسلم طلباء دین مبین کے ترجمان اور عصری علوم کے ماہر بن کر نکلیں۔ دوسری جانب مسلمانوں کے زیر اہتمام جو اسکول یا عصری تعلیم کے اعلیٰ ادارے ہیں ان کی درسیات میں بھی اس طور پر ترمیم نہیں کی جاسکتی کہ وہ قدیم وجدید تعلیم میں ہم آہنگی کے لیے موثر ثابت ہوسکے۔ اس لیے کہ ملک کی تعلیمی پالیسی کی متابعت کا سوال ہے، حکومت سے منظوری کے مسائل ہیں اور ملک وبیرونی ممالک کے تعلیمی اداروں میں داخلہ وملازمت کی دشواریاں ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلم اسکولوں واداروں میں دینیات اور اسلام کے اساسی علوم کے مضامین نصاب میں شامل کیے جائیں جیسا کہ آج بعض مسلم جامعات میں یہ معمول بہ ہے لیکن ان علوم کی بنیادی تعلیم کے بغیر اس جزوی شمولیت سے ان میں کہاں تک مہارت پیدا ہوسکتی ہے اسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس سے کم از کم دین اور مذہب کی بنیادی باتوں اور ان علوم کے مبادیات کی معلومات فراہم ہوسکتی ہیں اور اگر کوئی ان علوم کی تحصیل آگے جاری رکھنا اور ان میں مہارت حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے دروازہ کھلا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو بہتر بنانے اور مسلم طلباء کی ذہنی وفکری تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے جدید تعلیمی اداروں میں مذہبی واخلاقی اقدار کے فروغ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم پر مزید توجہ دی جائے اور اسے باعث کشش وموثر بنایا جائے اگر ان علوم کی درسیات میں بہت زیادہ اضافہ نہیں کیا جاسکتا تو کم از کم غیر درسی پروگرام اور تربیتی کورس کے ذریعے طلباء میں دینی مزاج پیدا کرنے اور اسلامی فکر کو پروان چڑھانے کی بھرپور کوشش کی جانی چاہیے۔ درحقیقت اصل مسئلہ طلباء کو مذہبی معلومات فراہم کرنے اور ان میں دینی روح سرایت کرنے کا ہے۔ اس کے لیے اسکولوں وکالجوں کی سطح پر خصوصی توجہ درکار ہے، اگر اسکول یا ثانوی تعلیم کی سطح پر طلباء کے دل ودماغ میں اسلامی فکر پیوست کر جائے تو پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جس کالج یا یونیورسٹی میں بھی داخلہ لیں اور آرٹ، سوشل سائنس وسائنس کے جس مضمون میں بھی وہ اختصاص یا تحقیقی ڈگری حاصل کریں وہ انشاء اللہ اس مضمون میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کے ترجمان بن کر عملی دنیا میں قدم رکھیں گے اور ملک وملت کے لیے بہتر ثابت ہوں گے۔

اس ضمن میں اس امر کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانان ہند اہل علم، اصحاب خیر وارباب حکومت کے تعاون سے ابتدائی وثانوی سطح کے اسکول زیادہ سے زیادہ تعداد میں قائم کریں اور پہلے سے جو موجود ہیں ان کی بہتری وترقی کے لیے کوشاں ہوں اس لیے کہ اپنے زیر انتظام اداروں میں انھیں نصاب میں حسب ضرورت اصلاح وترمیم کی زیادہ گنجائش مل سکتی ہے اور وہ یہاں طلباء کی ذہنی وفکری تعمیر اور دینی واخلاقی تربیت کا اہتمام بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہی ابتدائی اسکول اور ثانوی ادارے، کالج اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے فیڈر (Feeder) ثابت ہوں گے اور یہ ایک ایسی اہم ضرورت ہے جو عمومی طور پر تمام مسلمانوں اور بالخصوص مسلم تنظیموں اور اداروں کے سربراہوں کی فوری توجہ کی

ہندوستانی مسلمانوں کے قدیم نظامِ تعلیم کو نئے زمانہ کے رنگ و مزاج سے ہم آہنگ کرنے اور مسلم طلباء کو بنیادی اور عصری علوم دونوں کا جامع بنانے کے لیے یہ تجویز اکثر بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی لائی جائے اور اس میں سائنس و دیگر عصری علوم بھی شامل کیے جائیں۔ یہ تجویز بلا شبہ معنویت اور اصلاحی جذبے سے خالی نہیں ہے لیکن اس راہ میں سب سے بڑی عملی دشواری یہ ہے کہ مدارس کے نصاب میں تفسیر، حدیث و فقہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے بلکہ ان علوم میں مہارت پیدا کرنا ہی ان مدارس کے قیام سے اصل مقصود ہے۔ اس لیے اس کے نصاب کو اس انداز سے ترتیب دینا ممکن نہیں کہ ان علوم کی بنیادی تعلیم علی حالہ باقی رہے اور عصری علوم کی تعلیم بھی اس سطح کی جاری کی جائے کہ طلباء ان میں مہارت حاصل کر سکیں۔ بلا شبہ یہ صورت ناقابلِ عمل ہے اور خاص طور سے اس وجہ سے کہ اگر اساسی علوم کی درسیات میں کوئی کمی نہ کی جائے تو بھی مذکورہ طور پر نئے مضامین کے اضافے کی وجہ سے ان علوم کی تعلیم متاثر ہونی لازمی ہے جو بہرحال نقصان دہ و ضرر رساں ثابت ہوگی لیکن یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ قدیم مدارس کا موجودہ نصابِ تعلیم اس نقطۂ نظر سے ایک موثر اصلاح و ترمیم کا محتاج ہے کہ وہ عصرِ حاضر میں اپنی معنویت و افادیت کو برقرار رکھ سکیں اور مسلمانوں کی علمی، سماجی و معاشی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہو سکیں۔

مدارس کے نصابی اصلاح کا سب سے اہم پہلو از کار رفتہ و غیر ضروری درسیات کو نکال کر عصرِ حاضر کے تقاضوں و اجتماعی مفاد کے تحت نئے مضامین کا شامل کرنا ہے اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ یونانی فلسفہ، ما بعد الطبیعیات اور علمِ کلام و منطق کے وہ قدیم مباحث آج اپنی معنویت و افادیت قریب قریب کھو چکے ہیں جو تیسری و چوتھی صدی ہجری میں اسلامی عقاید و نظریات پر حملوں کے خلاف دفاعی تیاری کے لیے شاملِ درس کیے گئے تھے۔ اس وقت یونانی علوم و فنون کی ترویج سے مقصود انہیں علوم کی مدد سے اسلامی عقاید و نظریات کے اثبات و احقاق میں عقلی و منطقی دلائل و براہین فراہم کرنا تھا تاکہ یونانی حکماء و فلاسفہ کے زیرِ اثر اسلام کے دینی عقاید و مبادیات کے بارے میں پیدا کیے گئے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ دور میں بھی معاندینِ اسلام کے فکری و نظریاتی حملوں کے خلاف دفاعی تیاری کی ضرورت ہے لیکن آج ان حملوں کا انداز و رخ بدل چکا ہے۔ اس لیے اسی اعتبار سے ذہنی ہتھیار فراہم کرنے و قوتِ مقابلہ پیدا کرنے اور اندازِ دفاع اختیار کرنے کی احتیاج ہے۔ اس میدان میں اب ہمارا مقابلہ یونانی فلاسفہ یا ان کے ہمنواؤں سے نہیں بلکہ مغربی مفکرین اور جدید دانشوروں سے ہے جو سائنس و ٹکنالوجی و دیگر عصری علوم کے پیداوار ہیں اور جو مابعد الطبیعات اور الٰہیات کی بہ نسبت مادیات و محسوسات سے زیادہ بحث کرتے ہیں اس لیے مدارس کے نصاب میں قدیم یونانی علوم کے بجائے ایسے مضامین کی شمولیت زیادہ موزوں ہوگی جو اسلامی عقاید و تعلیمات کو موثر انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں اور اجتماعی ضروریات کو بھی پورا کر سکیں۔ عصری علوم میں سائنس کی بہ نسبت سماجی علوم (تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، اقتصادیات، فلسفہ و سیاسیات) کی تحصیل مدارس کے طلباء کے لیے زیادہ آسان ہوگی بلکہ جہاں پہلے سے یہ علوم شاملِ نصاب ہیں وہاں اُن کے معیار کو مزید بلند کرنے میں کچھ دشواری نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ آج ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں نے متعدد مدارس کی اسناد کو بی۔ اے یا ایم۔ اے میں داخلہ کے لیے تسلیم کر لیا ہے اور ماشاء اللہ قدیم و جدید تعلیم میں امتزاج کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ مدارس میں سماجی علوم کی تحصیل ان طلباء کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگی جو عالم یا فاضل کورس کی تکمیل کے بعد جدید جامعات کی تعلیم سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں اور آرٹ یا سوشل سائنس کے کسی مضمون میں اختصاص پیدا کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ آج امت کو ایسے افراد کی بھی سخت ضرورت ہے جو ان علوم میں مہارت حاصل کریں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اس میدان میں علمی و تحقیقی کارنامے انجام دے کر اسلامی نقطۂ نظر کی صحیح و موثر ترجمانی پیش کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہ افراد بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں جو اسلام کے اساسی علوم اور ان کے ماخذ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں بھی اچھی صلاحیت و استعداد کے مالک ہوں۔ جہاں تک مدارس کے نصاب میں سائنسی علوم

کے مضامین کی شمولیت کا سوال ہے۔ اس کی ضرورت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ خاص کر ان حالات میں جب کہ انسانی زندگی میں سائنس کا عمل دخل دن بدن بڑھتا جارہا ہے لیکن مدارس کے نصاب میں سائنسی مضامین کو اُسی حد تک داخل کرنا قابل عمل و موزوں ہوگا کہ طلباء سائنس کی اصطلاحات اور اس کی مبادیات سے روشناس ہوجائیں اور سائنس سے اس درجہ متعارف ہوجائیں کہ اگر کوئی سائنس کی زبان و اصطلاح استعمال کرتے ہوئے دین و شریعت کے کسی مسئلہ پر اُن سے ہم کلام ہو تو انھیں اجنبیت نہ محسوس ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم اتنی ترقی کرچکی ہے اور اس کے لوازمات اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ مدارس میں اس معیار کی سائنسی تعلیم ممکن نہیں کہ وہاں کے طلباء سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے اہل ہوجائیں یا وہاں کی اسناد کو جدید جامعات میں سائنسی مضامین میں داخلے کے لیے منظوری مل جائے۔ درحقیقت مدارس کے نصاب کو سائنس یا دیگر عصری علوم کے مضامین سے غیر متناسب انداز میں زیر بار کرنا ان کے کلیدی مضامین کی تعلیم کو متاثر کرنا اور ان کے بنیادی مقاصد میں خلل ڈالنا ہوگا جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں میں سائنسی علوم کے جو ماہرین پیدا ہوئے انھوں نے مروجہ نصاب تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنی دلچسپی کے علم و فن میں مطالعہ و تحقیق کا عمل جاری رکھا اور ان علوم میں اعلیٰ تعلیم کے جو ذرائع تھے، خواہ ماہرین فنون کی انفرادی مجلسیں و درس گاہیں یا حکومت وقت کے زیر نگرانی چلنے والے بیت الحکمۃ جیسے تحقیقی ادارے اور عملی تجربات کے مراکز، انھیں استعمال کیا اور اس طرح اپنی تحقیقات و اکتشافات کی بدولت سائنسی علوم کے میدان میں مقام امتیاز حاصل کیا۔ دوسرے ایسا نہیں تھا کہ ہر شخص لامحالہ سائنسی علوم میں اختصاص پیدا کرنے میں مصروف ہوا بلکہ تفسیر، حدیث، فقہ، نحو و صرف اور لغت و ادب کے میدان میں بھی ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں جاری ہوئیں اور ان علوم میں بھی ان کے عظیم الشان کارنامے ہمارے لیے قابل تقلید و لائق امتثال ہیں۔ مزید برآں اس وقت علوم کا دائرہ آج کل کی طرح اتنا وسیع نہیں تھا اور نہ مضامین درسیات کا اتنا انبار تھا۔ اس لیے بیک وقت کئی علوم میں اختصاص حاصل کرنا آسان تھا۔ مزید براں یہ بھی پیش نظر ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کو دوہرے نظام تعلیم سے سابقہ نہیں تھا بلکہ جو کچھ نظام تھا وہ سب کے لیے تقریباً یکساں تھا۔ اس لیے موجودہ صورت حال میں مدارس کے طلباء سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسلام کے بنیادی علوم کے ماہر ہونے کے ساتھ سائنسداں بن کر بھی نکلیں گے حقائق کی دنیا سے انحراف کے مترادف ہے۔ مہارت اور واقفیت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے

مدارس کے نصاب میں جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے، وہ بھی اپنی جگہ کافی اہمیت رکھتا ہے اور اسے علوم آلیہ یا معاون مضامین میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس وقت اکثر مدارس میں کلاسیکل زبانوں کے علاوہ مادری یا قومی اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی دی جاتی ہے لیکن انگریزی زبان کی تعلیم پر ابھی مزید توجہ درکار ہے۔ نہ صرف ہر مدرسہ میں اس کو رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ جہاں پہلے سے داخل نصاب ہے وہاں اس کے معیار کو اور بلند کرنا چاہیے۔ عالمیت کی سطح پر ہائی اسکول اور فضیلت کے لیے انٹر یا ۱۰+۲ کے معیار سے کم کی انگریزی زبان کی تعلیم کسی بھی صورت میں مناسب نہیں ہے۔ سماجی علوم یا سائنس میں مہارت ہو یا نہ ہو مدارس کے طلباء کے لیے انگریزی زبان سے بخوبی واقفیت بہرحال ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر عصر حاضر میں اسلام کی ترجمانی و تبلیغ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ مدارس کے تعلیمی نظام میں اصلاح کا ایک اور قابل ذکر پہلو طرز تدریس میں تبدیلی ہے۔ مدارس میں جو نصاب رائج ہے وہ زیادہ تر کتابی بنیاد پر Book Oriented ہے۔ مختلف فنون کے منتخب مباحث کے بجائے ہر فن کی کتابیں مکمل جزوی طور پر شامل نصاب ہوتی ہیں۔ اگرچہ ابتدائی درجات میں نحو و صرف یا گرامر کی مشق اور زبان و ادب کی تعلیم کے لیے اس طریقے میں افادیت ہے لیکن باقی مضامین میں خاص طور سے اوپر کے درجات کے لیے ہر مضمون کے مباحث کو منتخب کرکے طلباء کے سامنے درس (لکچر) دینا زیادہ مفید ہوگا۔ اس طریقے کے تحت کم وقت میں زیادہ مضامین پڑھائے جاسکتے ہیں اور یہ طریقہ عصری طرز تعلیم کے مطابق بھی ہوگا۔ ورنہ عصری تقاضوں کے تحت نصاب میں ضروری تبدیلی کے ساتھ قدیم اسلوب تعلیم کو باقی رکھا گیا تو مجموعی طور پر تعلیمی نظام میں

[illegible] نہیں پیدا ہو سکتے۔

مختصر یہ کہ مسلمانان ہند کی علمی و ثقافتی ترقی، ان کے تعلیمی نظام کی بہتری اور اسے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے مفید و کارگر بنانے کے لیے ایک جانب عصر حاضر کے مطالبات کی روشنی میں مدارس کے نصاب و طرز تعلیم میں مناسب و موثر ترمیم و تبدیلی کی ضرورت ہے تو دوسری جانب جدید مسلم اسکولوں اور اعلی تعلیمی اداروں میں اسلامی علوم و فنون کو فروغ دینا اور مذہبی و اخلاقی اقدار کو پروان چڑھانا بھی ضروری ہے۔ آخر میں اس حقیقت کے اعتراف سے گریز نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم کو دینی و مذہبی تقاضوں کی تکمیل کے لائق بنانا اور اسے نئے زمانے کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کا کام جتنا اہم ہے اسی قدر پیچیدہ و دقت طلب بھی۔ اس میں سب سے دشوار گزار مرحلہ بہ یک کئی تقاضوں (مثلاً دینی و سماجی، ملکی و ملی) کا پاس و لحاظ ہے۔ اس لیے اس کام میں جو عزم صمیم، محنت و مشقت اور صبر و استقلال درکار ہے اسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس راہ میں ان سب پر مقدم نیت کا خلوص و توفیق الٰہی کی طلب ہے کہ ان کے بغیر دشوار گزار راہوں کا طے کرنا اور منزل مقصود تک پہنچنا کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہے۔

[وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم - رب زدنی علما]

اعلان بابت ملکیت

مالک:	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
قومیت:	ہندوستانی
حصہ دار:	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ایڈیٹر:	پروفیسر اسرار احمد
قومیت:	ہندوستانی
پرنٹر پبلشر:	پروفیسر اسرار احمد
پریس:	ایس۔ کے۔ آفسیٹ پریس۔ دہلی۔
اشاعت کی مدت:	ماہانہ
مقام اشاعت:	ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے یقین کی حد تک درست ہیں۔

اسرار احمد

ہفتہ کیسے بنا؟

سعید الظفر چغتائی *

انسان کی تہذیبی تاریخ میں مشرق وسطیٰ کا ہمسر کوئی نہیں۔ آدم و حوا یوں تو پچاسوں ہزار سال سے بنوں، میدانوں میں مارے مارے پھرتے رہے ہیں لیکن اب سے کوئی دس ہزار سال پہلے ہی انہوں نے زراعت کی شروعات کی اور آج سے پانچ چھ ہزار سال پہلے چھوٹی چھوٹی بستیوں کی شکل میں انسانی سماج کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے وادیوں میں دجلہ و فرات کی اور دریائے نیل کی۔ سندھ، شمالی چین، ویت نام، میکسیکو اور وسط مغرب جنوبی امریکہ کے نام اس کے بعد آتے ہیں۔

اس مشرق وسطیٰ (یا مغربی ایشیا اور شمالی مشرقی افریقہ) میں سات کا عدد بہت اہم رہا ہے اور چوں کہ سامی حامی مذاہب - یہودیت، عیسائیت، اسلام - اسی علاقے میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اُن میں بھی یہ ہندسہ اہم ہو گیا۔ ہم سات آسمانوں، سات اجرام فلکی، اور سات جنتوں اور سات دن کے ہفتے وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں، لیکن کیا ہم سمجھتے ہیں کہ ان میں گہرا آپسی رشتہ بھی ہے؟

گھنٹہ، منٹ، سکنڈ اور ان کے اعشاری یا غیر اعشاری اجزا کو بھلا دیں تو ہفتے کے علاوہ وقت کے معروف پیمانے تین بچتے ہیں۔ دن مہینہ اور سال۔ تینوں کی قدرتی تعریفیں ہیں۔ سال، دراصل، وہ میعاد ہے جس میں سورج کے گرد دنیا ایک پورا چکر لگا لیتی ہے لیکن ہم دنیا کی سطح پر بستے ہیں اور یہیں سورج چلتا نظر آتا ہے۔ جیسے ٹرین پر سفر کر رہے ہوں تو لائن کے کنارے ہر چیز پیچھے بھاگتی معلوم ہوتی ہے۔ مشہور بات ہے کہ سورج پورب میں نکلتا اور پچھم میں ڈوبتا ہے۔ بلکہ دراصل پورب پچھم کی تعریف یہی ہے کہ ادھر سے سورج نکلتا یا اُدھر ڈوبتا ہے۔ مگر غور سے دیکھیں تو سورج ہر روز کسی ایک ہی جگہ سے نہ طلوع ہوتا ہے اور نہ کسی ایک ہی جگہ پر غروب۔ آسمان پر یہ جگہیں اُتر کے ایک نقطے سے دکھن کے ایک دوسرے نقطے تک اُدلتی بدلتی رہتی ہیں۔ اِن دونوں نقطوں کے درمیانی فاصلوں کو ہی ادبیات میں "بعد المشرقین" اور "بعد المغربین" کہا گیا ہے یعنی دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا فاصلہ۔ اسی راستے پر کسی ایک نقطے سے چل کے سورج جب دوبارہ اُسی سمت میں (یعنی اتر یا دکھن کی طرف) کھسکتا ہوا، اسی پہلے نقطے سے (یا پہ) طلوع یا غروب ہوتا ہے تو ہم ایک سال کی مدت گزار چکے ہوتے ہیں۔ سال کی میعاد کا تعلق سورج کے گرد خلا میں زمین کی گردش سے ہے۔ یہ باریکی سے ناپی جانے پر ۳۶۵٫۲۴۲۱۹۳۳ دن ٹھہرتی ہے۔ یا ۳۶۵ دن پانچ گھنٹے ۴۸ منٹ، ۴۵٫۵۱ سکنڈ۔

مہینہ، بنیادی طور پر، وہ وقفہ ہے جس میں چاند زمین کے گرد پورا چکر لگا لے۔ یہ کام قریب قریب ۲۷ ⅓ دن میں ہو جاتا ہے لیکن اِس مدت میں زمین سورج کے گرد دائرے کا ۲۷⅓/۳۶۵ یعنی 3/40 یا [illegible] حصہ آگے بڑھ جاتی ہے اور چاند پر سورج کی کرنیں نہیں پڑنے دیتی۔ اس لیے ہلال نظر آنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ چاند (27.5 × 3/40 =) دو دن اور زمین کے گرد آگے بڑھے۔ اس طرح چاند کا مہینہ ۲۹ یا ۳۰ دن

---

* پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ

کا ہوتا ہے۔

سال اور مہینہ کی اور بھی تعریفیں ہیں۔ مثلاً بارہ یا تیرہ مہینے کی مدت کا یا سیارہ مشتری کی فطری گردش کی میعاد کے $\frac{1}{12}$ کا بھی سال ہو سکتا ہے۔ آسمان کی جس پٹی سے سورج، چاند اور سیارے گزرتے معلوم ہوتے ہیں، اسے بارہ برجوں میں بانٹا گیا ہے جتنی مدت میں سورج ان میں سے ایک ایک برج سے گزرتا ہے۔ اسے ایک ایک شمسی مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دن کی تعریف اتنی سادہ ہے جتنی ہمیں لگتی ہے اور کیا دن کی میعاد کسی فطری عمل پر مبنی ہے؟

اپنے محور پر زمین کو پورا چکر گھوم جانے میں جتنا وقت لگتا ہے۔ وہ ایک دن ہے لیکن ہم ناپتے ہیں دن کو سورج کے حوالے سے۔ یعنی اگر صبح کی پہلی کرن پھوٹنے سے دن شروع کریں تو اگلی بات یہی واقعہ پیش آنے تک کی مدت ایک دن ہوگی لیکن ہم جانتے ہیں کہ سورج طلوع ہونے کی جگہ بدلتی رہتی ہے اور دن رات چھوٹے بڑے ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے صبح طلوع ہونے کا وقت بھی تھوڑا تھوڑا ایک طرف یا دوسری طرف کھسکتا رہتا ہے۔ اس لیے دن کا وقفہ صحیح صحیح ناپنے کے لیے دوپہر کا اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ جب سورج نصف النہار پر پہنچے یعنی جس لمحے کے بعد اس کا اتار شروع ہو جائے۔

اس طرح بات صاف ہو گئی کہ دن، مہینہ اور سال کی قدرتی تعریفیں ہیں اور یہ تینوں میعادیں تین قدرتی مشینوں کی حرکت سے الگ الگ ٹپکتی ہیں۔

۱۔ سال زمین کے خلا میں سورج کے چاروں طرف چکر کاٹنے سے

۲۔ مہینہ چاند کے خلا میں، زمین کے گرد چکر کاٹ کے اس جگہ واپس آجانے سے جہاں پر چاند کے چکر کے شروع کی طرح روشنی پڑے اور

۳۔ دن زمین کے لٹو کی طرح اپنے ہی محور پر گھوم کے چکر پورا کر لینے سے۔

اب یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ان میں سے کسی اکائی کو دوسرے سے ناپیں تو کسر کیوں آتی ہے۔ پوری پوری گنتی کیوں نہیں بنتی یعنی سال میں ۳۶۵ $\frac{1}{4}$ کے قریب اور مہینے میں ۲۹ $\frac{1}{2}$ کے قریب دن کیوں ہوتے ہیں۔ سیدھے سیدھے ۳۶۵ اور ۲۹ یا ۳۰ کیوں نہیں ہوتے۔ یہ اس لیے ہے کہ تینوں میعادوں کی پیمائش کرنے والی مشینوں کا ایک دوسرے پر بہت کم انحصار ہے۔

مہینے اور سال کا رشتہ جوڑنے میں خاص طور پر دقت پڑی۔ جس کی وجہ سے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف کلنڈر رائج رہے اور اب بھی یہ اختلاف چلے جاتے ہیں۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ ہفتہ ایک ہی ہے اور اس کی تعریف یا ساخت میں کہیں کوئی اختلاف نہیں۔ آخر یہ ہفتہ کیسے بنا؟

دن، مہینے یا سال کے برعکس ہفتے کی کوئی قدرتی تعریف نہیں اسے انسان نے اپنے طور پر اختیار کر لیا۔ شاید آج کے بصرہ کے قریب سُمیریہ میں جہاں پانچ ہزار برس پہلے دریائی وادیوں کی تہذیب شروع ہوئی۔ یا اُس سے بھی پہلے جب انسان ہنوز صحرا نشین چرواہا تھا اور یہ تصور تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہر جگہ ایک سا منتقل ہوتا گیا، دنوں کے ناموں تک میں ترمیم کے بغیر!

گرم ملکوں کی راتیں، زیادہ تر پرکشش ہوتی آئی ہیں۔ اختر شماری کرتے کرتے، دیکھنے والوں نے وہاں عجیب وغریب شکلیں بنائیں اور دیو مالائیں سجا دیں۔ دھیرے دھیرے یہ اندازہ ہوا کہ زیادہ تر تارے ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی جگہ نہیں بدلتے سب گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ قطب تارے کے گرد دائروں یا قوسوں میں ان کے بیچ کے فاصلے مسطح جیومیٹری کے لحاظ سے تو (جس سے ہم زمین کی سطح پر مانوس ہیں) تھوڑے سے بدلتے رہتے ہیں اور اسی لیے قریب کے تاروں کو نظری طور سے ملانے پر جو شکلیں سی بنتی ہیں وہ ٹیڑھی میڑھی ہوتی رہتی ہیں لیکن کروی جیومیٹری کا استعمال کریں تو یہ فرق اور اینٹھنیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں اور آخر میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آسمان کچھ رفتار اپنے تاروں کی پوری سجاوٹ کے ساتھ پورب سے پچھم کی طرف گھومتا اس لیے نظر آتا ہے کہ زمین اپنے محور (یا کیلی) پر پچھم سے پورب کی طرف گھومتی ہے۔ اس لیے یہ سب تارے ستارے اور ثوابت قرار دیے گئے جو خود حرکت نہیں کرتے۔

جلد ہی یہ پتہ بھی چل گیا کہ اِن ثوابت کے برخلاف سورج اور چاند کے علاوہ پانچ سیارے بھی نظر آتے ہیں جو سورج، چاند ہی کی طرح اور انہیں کی پٹی میں عام طور پر پورب سے پچھم حرکت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اُن میں سے بعض کی رفتار الٹ بھی جاتی ہے۔ خصوصاً زہرہ کی۔ ان سب اجرام فلکی کی میعادِ گردش بھی برسوں بلکہ صدیوں کے مشاہدے سے خاصی صحیح دریافت ہو گئی جو اس طرح ہے

فہرست ا

١	٢	٣	٤	٥	٦	٧
چاند	عطارد	زہرہ	سورج	مریخ	مشتری	زحل
Moon	Mercury	Venus	Sun	Mars	Jupiter	Saturn
चन्द्रमा	बुध	शुक्र	सूर्य	मंगल	बृहस्पति	शनि
چندرماں	بدھ	شکر	سوریہ	منگل	برہسپت	سنیچر
قریب ٢٩ ½ دن	٨٨	٢٢٤	قریباً ٣٦٥	٦٨٧	٤٣٣٢،٦٢	١٠٧٥٩،٠٦

اور چونکہ اب سے قریب چار سو سال پہلے تک زمین کو کائنات کا مرکز مانا جاتا تھا۔ یعنی خیال تھا کہ آسمان اور اس کے سیارے سب زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اس وقت یہ قیاس کر لینا غلط نہ تھا کہ اُن اجرام کے فاصلے بھی زمین سے اسی ترتیب میں ہوں گے (جیسا کہ بعد میں معلوم ہونے والے کیپلر کے دوسرے قانون سے نکلتا ہے۔ اگر سارے سیارے ایک ہی جسم کے گرد گھوم رہے ہوں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے صرف چاند زمین کے گرد گھومتا ہے، بقیہ سیارے زمین کی طرح سورج کے چاروں طرف چکر لگاتے ہیں اور سورج سے وابستہ میعادِ گردش اصل میں سورج کے گرد زمین کی گردش کی میعاد ہے۔

ہفتے کے دنوں کی فہرست یوں ہے۔

فہرست ب

١	٢	٣	٤	٥	٦	٧
پیر یا دوشنبہ	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر	اتوار
Monday	Tuesday	Wednesday	Thursday	Friday	Saturday	Sunday
सोमवार	मंगलवार	बुधवार	बृहस्पतिवार	शुक्रवार	शनिवार	रविवार
lunedi	martedi	mercoledi	giovedi	venerdi	sabato	domenica

آخری سطر میں فرانسیسی نام اس لیے شامل کیے ہیں کہ دونوں فہرستوں کی مماثلت زیادہ

واضح ہو جائے۔ یہ بات صاف صاف نظر آتی ہے کہ دنوں کے نام کسی نہ کسی سیارے یا سورج چاند سے اس تیسری فہرست ج کے مطابق وابستہ ہو جاتے ہیں مگر پہلی دونوں فہرستوں کی ترتیب بُری طرح لوٹ جاتی ہے

فہرست ج

اتوار	سوموار	منگل وار	بدھ وار	برہسپت وار	جمعہ (شکر وار)	سنیچر وار
سورج	چاند	مریخ (منگل)	عطارد (بدھ)	برہسپت	شکر	سنیچر (زحل)

یہ کیوں؟

ہفتہ سیدھے سیدھے ان اجرام کی مدد سے نہیں بن گیا اس میں ہیئت و نجوم کا پیچ بھی پڑا ہے۔ ہم فہرست ب کے مطابق آسمان کے سات اجرام سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آسمان پر ان اجرام کی گزرگاہ کو بارہ برجوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ اب اگر ساتوں اجرام کو ان برجوں پر تقسیم کیا جائے تو ١٢ × ٧ = ٨٤ صورتیں پیدا ہوں گی۔ قدیم ہیئت کے موجدوں نے دن کو ٦٠ پلوں یا چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کیا۔ ٨٤ میں نہیں (لطف یہ ہے کہ ٦٠ + ٢٤ = ٨٤) اب اگر کسی دن کے پہلے پل کو چاند سے نسبت دے دیں اور دوسرے تیسرے وغیرہ پل کو فہرست ا کے لحاظ سے عطارد، زہرہ وغیرہ سے نسبت دیتے چلے جائیں تو ٥٧ ویں پل کو بھی چاند ہی سے نسبت ہو گی اور اگلے دن کے پہلے پل کو (جو اس سلسلے میں ٦١ واں ہو گا) مریخ سے۔ اسی طرح تیسرے دن کا پہلا پل عطارد سے منسوب ہو جائے گا چوتھے دن کا مشتری سے، پانچویں دن کا زہرہ سے، چھٹے دن کا زحل سے اور ساتویں دن کا سورج۔ آٹھویں دن کا پہلا پل پھر چاند کا ہو گا اور یہ دائرہ یونہی گھومتا رہے گا۔ دن کے پہلے پل کے "سیارے" کا نام دے دیں تو ہفتے کے ساتوں دن اسی ترتیب میں بن جاتے ہیں جس میں کہ ہیں۔

اگر دن کو ٦٠ پلوں کے بجائے چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کریں اور فہرست ا کے دائرہ کو الٹا گھمائیں (پیچھے کی طرف، یعنی چاند کے بعد زحل وغیرہ) تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے اور ہفتہ بن جاتا ہے۔

ہم ادب کی کتابوں میں دیکھیں (جیسے اقبال کا جاوید نامہ

سات آسمانوں کے نام مل جاتے ہیں۔ یہ فہرست ا کے مین مطابق سات اجرام فلکی کے ناموں پر ہیں۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ سورج، چاند اور سیاروں کے محوروں کو افلاک قرار دیا گیا ہے — ہر ایک اپنے اپنے فلک میں تیر رہا ہے (سورہ یٰس) پھر اس تصوراتی چیز کو جس پر ثوابت قایم ہیں (اور جو موجودہ علم کے مطابق ثوابت و سیار کو اپنی اپنی سمت میں تاحد نگاہ دور لے جانے پر فطری طور سے حاصل ہوتی ہے) آٹھواں آسمان کہا گیا — اس کے حوالے سے آٹھ دوزخوں کا تصور پیدا ہوا۔ پھر یہ دیکھا گیا کہ چوبیس گھنٹوں کا وقت اِن ثابت ستاروں کی مدد سے صحیح صحیح ناپا جائے تو چوبیس گھنٹے سے تین منٹ ۵۶ سکنڈ کم نکلتا ہے اور اصل سبب معلوم ہونے سے پہلے (جس کے بیان کا یہ موقع نہیں) فرض کر لیا گیا کہ ماورائے فلک کے دن رات کا وقت ٹھیک چوبیس گھنٹے ہے اور اس طرح فارسی ادب میں "نہ سپہر" کا ذکر آنے لگا ع

میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں۔ (اقبال)

ا۔ علم ہیئت کہتے ہیں اجرام فلکی کی حرکت کے ریاضیاتی حساب کو۔ نجوم ان قیاسات پر مبنی ہے جو سیاروں کے باہمی رشتوں سے فرض کر لیے گئے تھے۔ یہ محض فرضی ہیں۔ ان مضمونوں میں علم ہیئت کی باریکیوں سے بچ کے بالکل سادہ باتیں بیان کی گئی ہیں۔

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے نابینا کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے آپؓ نے اس سے پوچھا۔ تمہیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا؟" اس نے جواب دیا۔ "جزیہ۔ ضرورت — اور — بڑھاپا"۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے گئے اور اتنا کچھ دیا جو اس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا کہ اس شخص اور اس جیسے دوسرے اشخاص کی طرف توجہ کرو۔ خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم اس کی جوانی (کی کمائی) کھائیں اور بڑھاپے میں اسے دھتکار دیں۔ زکوٰۃ فقرا اور مساکین کے لیے ہے اور یہ اہل کتاب کے مساکین میں سے ہے۔ آپؓ نے اس فرد اور اس جیسے دوسرے افراد کو جزیہ سے بری قرار دے دیا۔"

سیّد قطب

(اسلام میں عدل اجتماعی - ص ۲۴۳)

نیند کیوں آتی ہے؟

عذرا سلیم *

مرزا غالب نے خود سے یا سائنس دانوں سے پوچھا تھا کہ ؎

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سائنس داں بچارے کیا جواب دیتے۔ وہ تو ابھی یہ بھی معلوم نہیں کر سکے کہ نیند کیوں آتی ہے۔ نیند کیوں نہیں آتی ہے؟ اگلا مرحلہ ہے۔ پہلے یہ معلوم کر لیں کہ آتی کیوں ہے؟ پھر اس کی تحقیق بھی کر لیں گے کہ کیوں نہیں آتی؟

نیند کے متعلق فکر مندی چچا غالب ہی کا دردِ سر نہ تھا بلکہ ارسطو کے دور سے یہ مسئلہ چلا آتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے اسے یوں حل کیا ہے کہ نیند کا مقصد آرام کرنا اور تھکاوٹ سے نجات پانا ہے جو جاگتے ہوئے کام کرنے سے ہو جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر نیند کی ابتدائی وضاحتیں سامنے آئیں۔

نیند کے متعلق ابتدائی نظریات' اس سوال کا جواب ہیں کہ انسان کے اندر وہ کون سی میکانیت ہے جو نیند کا باعث بنتی ہے۔ مقبول ترین نظریہ وہ رہا جس کی رُو سے جاگنے کے دوران دماغ میں ایسا مادہ پیدا ہوتا ہے جس کی مقدار خاص حد سے بڑھنے کے بعد نیند کی ضرورت پڑتی ہے۔ نیند کے دوران مادے کی مقدار بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔ جب انسان نیند پوری کر لیتا ہے تو مادے کی مقدار ختم ہو جاتی ہے اور وہ بیدار ہو جاتا ہے

ان ہی خطوط پر مزید غور و فکر سے ارسطو نے خیال پیش کیا کہ لوگوں کے معدے سے بخارات اُٹھتے ہیں جو دماغ میں جا کر نیند کا باعث بنتے ہیں۔ ارسطو لکھتا ہے ؎

"تغذیہ کے بعد اُٹھنے والے بخارات کا رخ قدرتاً اوپر کو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کھانے کے بعد غنودگی کے جھونکے آتے ہیں۔"

بیسویں صدی سے قبل دماغ' دل اور دورانِ خون کے متعلق انسانی علم بہت ترقی کر چکا تھا۔ اس کے باوجود اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ خون کا دماغ میں بھر جانا' نیند کا باعث ہے۔ اس خیال کے برخلاف ایک نیا نظریہ بھی مقبول ہوا جس کے مطابق دماغ میں خون کی کمی سے نیند آتی ہے۔ ان متضاد نظریات کی بنیاد پر تضاد پیدا ہوا کہ رات کو اچھی نیند کیوں کر حاصل کی جائے؟ وہ ڈاکٹر جو دماغ میں خون بھرنے کو نیند کی وجہ سمجھتے ہیں مریضوں سے کہتے کہ تکیے استعمال نہ کریں۔ خون دماغ کی طرف بہے گا اور نیند آئے گی۔ دوسری طرف وہ ڈاکٹر تھے جن کے خیال میں خون کی کمی سے نیند آتی ہے۔' وہ اونچے اونچے تکیے استعمال کراتے تاکہ خون دماغ سے نیچے کو آئے۔

بیسویں صدی سے قبل نفسیاتی وضاحتیں بھی کی جا رہی

* ۴۴/۳۲' حسن آفندی روڈ ـــ کراچی' پاکستان

تھیں۔ بعض کا کہنا تھا کہ حرکت کا فقدان نیند پیدا کرتا ہے کوئی انسان یا جانور اسی وقت جاگ سکتا ہے جب تک وہ کوئی نہ کوئی سرگرمی انجام دیتا رہے۔ کرنے کو کوئی کام نہ ہو تو جانور سو جاتے ہیں۔ اس خیال کو بہت پسند کیا گیا اور سمجھا گیا کہ رات کو سونے اور دن کو جاگنے کے پیچھے بھی میکانیت کارفرما ہے۔ شروع شروع میں ہر خیال اسی طرح اچھا لگتا ہے۔ پھر غور و فکر کیا جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس خیال کا بھی از سر نو جائزہ لینے پر علم ہوا کہ بعض لوگ باوجود مصروفیت کے سو جاتے ہیں (جیسے کہ سرکاری دفاتر والے) اور بعض ہر طرح کی خاموشی اور سکون کے باوجود نیند کو ترستے ہیں۔ اس لیے محض حرکت اور سکون کی حالتوں سے بالترتیب بیداری اور خوابیدگی کو منسوب کرنا غلط ٹھہرا ہے۔

نیند ایک جبلّت ہے!

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر سوئٹزرلینڈ کے ڈاکٹر کلیپرڈ نے ایک نیا اور قابلِ قبول خیال پیش کیا۔ اس نے کہا کہ نیند حرکت کے فقدان کا ساکت و جامد نتیجہ نہیں بلکہ نیند بذاتِ خود ایک قسم کی حرکت ہے۔ اور اسی طرح انسانی ذہن اور جسم کا حصّہ ہے جیسے دوسری قدرتی جبلتیں۔ یہ حرکت ایسا اندرونی عمل ہے جو ہمارے جسم کو ان زہروں سے پاک کرتی ہے جو جاگتی حرکتوں میں کیمیائی تعاملات سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کلیپرڈ کے پاس اس امر کی وضاحت بھی موجود تھی کہ کوئی انسان کتنی دیر تک سو سکتا ہے اور مختلف لوگوں کا وقفۂ خوابیدگی مختلف کیوں ہوتا ہے؟ اس نے کہا جس طرح دوسری جبلتوں کی تسکین ہو جانے کے بعد انسان کو خواہش نہیں رہتی بالکل اسی طرح وہ نیند کی تسکین حاصل کر لینے کے بعد مزید کی خواہش نہیں رکھتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان دوسری جبلتوں کی طرح نیند پر بھی قابو پا سکتا ہے اور اس بات کا کوئی جواز موجود نہیں کہ لوگ ہر جگہ اور ہر وقت سونے کے موڈ میں رہیں۔ اس نظریے سے اس بات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ مختلف لوگوں کا وقفۂ خوابیدگی مختلف کیوں ہوتا ہے۔ جس طرح کچھ لوگ بہت کھانے کی عادت ڈال لیتے ہیں اور کچھ کم کھانے کو عافیت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح کم سونے کی عادت بھی ڈالی جا سکتی ہے۔ رات کو سونے اور دن کو جاگنے کی وضاحت اس نظریے سے یوں ہوتی ہے کہ کھانے کی طرح سونے کے بھی اوقات ہیں۔ کچھ لوگ ان روایتی اوقات کی پابندی نہیں کرتے اور کچھ کرتے ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی اس نظریے ہی کی تائید کرتا نظر آتا ہے کہ

"کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا، عافیت ہے۔"

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے نیند پیدا کرنے والے قدرتی مادوں کی تلاش شروع کر دی گئی جو دماغ میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح نیند کا باعث بنتے ہیں۔ ان مادوں کو "خوابیدہ مادے" کہا گیا ہے۔ خوابیدہ مادوں میں کئی تو ایسے ہیں جو دریافت شدہ مرکبات پر مشتمل ہیں جیسے لیکٹک ایسڈ، کاربن ڈائی آکسائڈ اور کولیسٹرول۔ ان کے ساتھ ساتھ کئی ایک مادے ابھی زیرِ تحقیق ہیں۔ جیسے میٹابولزم سے پیدا ہونے والے زہریلے امائن اور یوروٹوکسن۔

۱۹۰۷ء میں دو فرانسیسیوں نے ایک نئی کامیابی کا دعویٰ کیا۔ ان کے نام رین لیجنڈر اور ہنری پائرون تھے۔ دعویٰ یہ تھا کہ ۷ تا ۱۵ دن "مسلسل جاگتے" کتوں کے دماغی سیال سے ایک مادہ حاصل کیا گیا۔ انھوں نے مادے کا نام "ہائپنوٹوکسن" رکھا۔ ہائپنوٹوکسن کا ٹیکہ ایسے کتوں کو لگایا گیا جنھیں سونے سے محروم رکھا گیا تھا۔ ٹیکے کی وجہ سے ان کتوں کو فوراً نیند آ گئی۔

ہائپنوٹوکسن کی دریافت ان لوگوں کے لیے نیک شگون تھی، جن کے خیال میں نیند ایک خاص قسم کے مادے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس خیال کے حامیوں میں از سر نو جوش و خروش پیدا ہوا۔ بالخصوص جرمنی میں اگلے بیس برس مسلسل اور سرگرم تحقیق جاری رہی۔ تحقیق کے نتیجے میں کئی مادوں کو دریافت

کرنے کے دعوے کیے گئے، مثلاً سکیلفلوف اور برومورمون،
مادوں کی دریافت۔ اس کے باوجود کوئی ایسا منفرد مادہ
دریافت نہ ہو سکا جو نیند کا اصل جواز فراہم کر سکتا۔ سائنسدانوں
میں رفتہ رفتہ مایوسی پیدا ہونے لگی اور بالآخر انھوں نے ایسے
مادے کی تلاش ترک کر دی۔

مادے کی تلاش ترک کرنے کا مطلب نیند پر تحقیق سے
دست برداری نہ تھا۔ تحقیق جاری رہی، صرف اس کی بنیادی
نہج کو تبدیل کیا گیا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں
میں یہ خیال ابھرا کہ "دماغی رکاوٹوں" سے نیند پیدا ہوتی
ہے۔ دماغ کا کوئی حصہ ایسا ہوتا ہے جو اعصاب سے آنے
والے پیغامات اور عضلات کی حرکت روک دیتا ہے۔ اس
طرح نیند سرایت کرتی ہے۔ اس نظریے کا اصل بانی ایون
پاولوف تھا جس نے ۱۹۲۰ء کی دہائی میں اس خیال کو سائنسی
دلائل کے ساتھ پیش کیا۔

مراکز خوابیدگی

پاولوف نے اپنا نظریہ قایم کرتے وقت اس تحقیق کو نظرانداز
کر دیا تھا جو دماغ کے اندر مخصوص مرکز خوابیدگی پر جاری تھی
۱۹۴۰ء کی دہائی میں اس تحقیق نے ثابت کر دکھایا کہ دماغ کا
وسطی اور پچھلا حصہ خوابیدگی اور بیداری میں حصہ لیتا ہے
اس طرح مراکز خوابیدگی کا وجود ثابت ہو گیا۔

دریافت کرنے کے بعد مرکز خوابیدگی ہی نیند پر تحقیق کا
اصل محور بن گئے۔ اس وقت بھی ان پر تیزی کے ساتھ تحقیق جاری
ہے۔ اس تحقیق نے اب تک جو حقائق دریافت کیے ہیں اُن کی
رو سے دماغ کے اندر ایسے مراکز خوابیدگی موجود ہیں جن کا
ایک دوسرے سے رابطہ ہے۔ یہ مراکز خوابیدگی، مراکز بیداری
سے بالکل مختلف کارکردگی رکھتے ہیں اور بیداری میں اُن کا وجود
بھی محسوس نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض مراکز نیند کے اوقات
اور کمی اور زیادتی سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ خوابوں کو دیکھنے
اور یاد رکھنے سے۔ ان ہی میں سے کچھ مراکز اس کیفیت سے بھی
متعلق ہیں، جس کے دوران ہم آنکھیں بند کر کے گزری باتوں کو
خواب کی طرح دیکھتے ہیں۔

تحقیق نے یہ بھی دریافت کر لیا ہے کہ نیند کے دوران
دماغ کی کارکردگی دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک حصہ اعضا
کو بیدار رکھتا ہے جب کہ دوسرا نیند کی کیفیت کو ذہن پر حاوی
رکھتا ہے۔ نہ تو کوئی ایک واحد مرکز خوابیدگی ہے نہ ہی کوئی ایک
مادہ۔ بلکہ ایسے کئی مراکز اور مادے موجود ہیں جو خوابیدگی کو
حد اعتدال پر رکھتے ہیں۔ ان مراکز اور مادوں کا بنیادی فریضہ
یہ ہے کہ نیند کے اوقات اور عمل کو باقاعدہ رکھیں

نیند اور بھوک بنیادی جبلتیں ہیں اور ان دونوں میں
گہری یکسانیت موجود ہے۔ بعض دوائیں، مصالحہ جات، خوشبوئیں
اور مخصوص کیفیات سے بھوک بڑھ جاتی ہے لیکن ان سے اس
سوال کا کوئی تعلق نہیں کہ ہم کھاتے کیوں نہیں؟ بالکل اسی طرح
مخصوص حالات میں نیند کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات
انسان کھانا کھا چکنے کے بعد بھی کسی غذا کی کشش محسوس کرتا ہے
یہ غذا اس کے لیے ضروری نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس کی صحت کو فائدہ
پہنچاتی ہے۔ اسی طرح انسان اچھی جگہ سکون و اطمینان پا کر زیادہ
بھی سو لیتا ہے۔ اس کی یہ نیند بھی صحت کو فائدہ نہیں پہنچاتی
نہ ہی ناگزیر ہوتی ہے۔

یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ نیند کے مادے، نیند کی گولیاں
ہیں۔ اس کے برعکس یہ دماغ ہی میں نشو و نما پانے والے مرکبات
ہیں۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر جون ہیمر کا تجربہ اس سلسلے میں
بطور خاص قابل ذکر ہے۔ اس نے یہ تجربہ کچھ بکریوں، چوہوں اور
خرگوشوں پر کیا۔ بکریوں کو سونے نہ دیا گیا۔ پھر ان کے دماغ سے
ایک مادہ "ایس فیکٹر" نکالا گیا۔ اس مادے کے ٹیکے چوہوں
اور خرگوشوں کے لگائے گئے، تو وہ فی الفور سو گئے۔ یہ کوئی نہیں
جانتا کہ "ایس فیکٹر" اور "ہپنوٹوکسن" ایک ہی مادہ ہے یا الگ

۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر جان ہیپر کے شاگردوں نے انسانی پیشاب میں بھی "ایس فیکٹر" دریافت کر لیا۔ انھوں نے یہ بھی معلوم کیا کہ ... ۳ لیٹر پیشاب میں صرف ۲ مائیکروگرام "ایس فیکٹر" ہوتا ہے۔ بہر حال یہ مقدار اس قدر تھی کہ ۵۰۰ خوراکیں تیار کر لی گئیں۔ ہر ایک خوراک نے خرگوش کی گہری نیند ۶ گھنٹے تک بڑھا دی اور یہ نیند بالکل قدرتی نیند کی مانند تھی۔ اس کے اثرات بھی دوسری خواب آور دواؤں کے مقابلے میں محفوظ پائے گئے۔ خوراک کا اثر کم ہونے کے بعد خرگوشوں نے گھومنے پھرنے اور کھانے پینے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر جان ہیپر اور ان کے شاگردوں کا کام اب ڈاکٹر جم کروگر کے ہاتھوں آگے بڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر جم کا تعلق ٹینی سی یونیورسٹی سے ہے۔ انھوں نے اس میں مزید اضافہ یہ معلوم کر کے کیا ہے کہ ایس فیکٹر ایسا کیمیہ (کیمیکل) ہے جو جرثومی خلیوں کی جھلیوں میں موجود کیمیہ سے مشابہ ہے۔ اس بنیاد پر تحقیق کرنے والوں کو خیال گزرا کہ ایس فیکٹر کسی ایسے جراثیم کی پیداوار ہے جو انسانی دماغ کے سیال اور پیشاب میں پایا جاتا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر کروگر نے مزید تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ یہ خیال غلط ہے۔ ایس فیکٹر دماغ کے اندر حیاتی و کیمیائی تعاملات سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایس فیکٹر ان جراثیم کا ہضم شدہ فضلہ ہے جو سفید خلیات کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ تحقیق کرنے والوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ تا حال ابھی تک کوئی ایسا محفوظ کیمیا دریافت نہیں ہوا جسے انسان پر آزمایا جا سکے۔ خرگوشوں پر جو تجربات کیے گئے ہیں ان میں بھی درجۂ حرارت میں اضافہ اور بخار چڑھ جانے کی علامات ملی ہیں۔ اس لیے تحقیق والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ انسانی جسم پر اپنی تحقیق آزما سکیں۔

گہری نیند کی میکانیت بھی انسانی تحقیق کا اہم موضوع ہے لیکن اس پر بھی کوئی فیصلہ کن تحقیق سامنے نہیں آسکی۔ ورزش کے متعلق البتہ یہ دریافت ہوا ہے کہ اس سے جسم میں مخصوص کیمیہ کی پیداوار بڑھ جاتی ہے اور مصروف دن گزارنے یا ورزش کرنے کے بعد رات کو اچھی اور گہری نیند آتی ہے۔

لیجیے صاحب! نیند کیوں آتی ہے یہ بیان تو ختم ہوا۔ حتمی بات سامنے نہیں آئی لیکن سائنس داں مصروف ہیں اور سائنس داں جس کام کے پیچھے لگ جائیں اسے پورا کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔ اس لیے یہ کام سائنس دانوں پر چھوڑتے ہوئے آیئے ہم اور آپ یہ معلوم کریں کہ ؎

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔

"ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔"

"سرسید"

توبہ کی حقیقت اور دین میں اس کی اہمیت

محمد بدیع الزماں*

توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور پلٹنے کے ہیں۔ یعنی گناہ کے بعد بندہ توبہ کرتا ہے تو وہ اپنی غلطی کا معترف اور اپنی نافرمانی پر نادم ہو کر بغاوت کی روش چھوڑ کر سرکشی سے باز آنے کا عہد کر کے بندگی کی طرف پلٹ آتا ہے اور اگر وہ خدا کی طرف سے توبہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اپنے شرم سار بندے کی طرف رحمت اور نظر عنایت کے ساتھ متوجہ اور مائل ہوتا ہے اور اس طرح مالک کی نظر اپنے غلام کی طرف از سر نو منعطف ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ توبہ کے ذریعہ اُس نے شرم ساری اور ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا جس سے صرف یہی نہیں کہ اُس کے گناہ معاف ہو جائیں گے بلکہ اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادہ سے بھی محفوظ رہے گا۔ مگر توبہ ایمان کے ساتھ ہی نافع ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ارشاد باری ہے کہ۔

"اور جو لوگ بُرے عمل کریں، پھر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو یقیناً اس توبہ اور ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمانے والا ہے۔" (الاعراف ۷ ۔ ۱۵۳)

اللہ تعالیٰ سنگ دل اور بے رحم نہیں ہے۔ جب بھی انسان اپنے اعمال پر نادم ہو کر اس کی طرف پلٹ آئے گا، اُس کے دامن رحمت کو اپنے لیے وسیع پائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی مخلوق سے بے پایاں محبت رکھتا ہے۔ ایک موقع پر حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو ہٹ دھرمی پر آمادہ تھے، مخاطب کرتے ہوئے توبہ کر کے خدا کی طرف پلٹ آنے والوں کو خدا کی رحمت کا یقین دلاتے ہوئے فرمایا:

"دیکھو! اپنے رب سے معافی مانگو اور اُس کی طرف پلٹ آؤ۔" بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔" (ھود ۱۱ ۔ آیت ۹۰)

توبہ کی شروعات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے۔ جب حضرت آدمؑ نے باوجود خدا کی سخت تاکید کے جنت میں شیطان کے بہکاوے میں آکر اُس درخت کا رُخ کیا جس سے انھیں منع فرمایا گیا تھا تو انہیں خدا کی حکم عدولی کرنے پر جنت سے اُتر جانے اور زمین پر ٹھہرنے اور گزر بسر کرنے کا حکم صادر ہوا۔ اس وقت حضرت آدمؑ نے توبہ کی جسے قبول فرما لیا گیا۔ ارشاد ہے:۔

"اس وقت آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا۔ کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

(البقرہ ۲ ۔ آیت ۳۷)

مگر قبول توبہ کا یہ مقتضیٰ نہ تھا کہ حضرت آدمؑ کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اُتارا جاتا ۔ زمین اُن کے لیے دار العذاب نہ تھی، وہ دنیا میں سزا کے طور پر نہیں اُتارے گئے بلکہ انسان کی تخلیق ہی اس لیے کی گئی تھی کہ اسے زمین کی خلافت سونپی جانی تھی۔

یہی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو بُرائی کسی شخص نے پہلے کی ہے

* ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ، ہارون نگر کالونی ، فرسٹ سیکٹر ، پھلواری شریف ، بہار

اس کی تلافی کرنے کے لیے اپنی حد تک کوشش کرے اور جہاں تلافی کی کوئی صورت نہ ہو وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرکے اُس دھبے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگائے ہیں لیکن قرآن کی رو سے بعض توبہ اس وقت تک توبہ نہیں سمجھی جاتی جب تک کہ ایسی توبہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ کی گئی ہو۔ کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی بُرے فعل کو چھوڑ دینا کہ وہ مثلاً صحت کے لیے نقصان دہ ہے یا کسی بدنامی کا، یا مالی نقصان کا موجب ہے توبہ کی تعریف میں نہیں آتا کیوں کہ توبہ کی اصل روح گناہ پر شرمساری ہے۔ اسی توبہ کو قرآن میں توبۃً نصوحًا سے موسوم کیا گیا ہے۔ نصح کے معنی عربی زبان میں خلوص اور خیر خواہی کے ہیں۔ توبۃً نصوحًا کی شرعی تفسیر حدیث میں بھی فرمائی گئی ہے۔ جب حضرت ابیؓ بن کعب رضی اللہ عنہ نے آپؐ سے توبۂ نصوح کا مطلب پوچھا تو آپؐ نے فرمایا:

"اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو
اپنے گناہ پر نادم ہو، پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ
سے استغفار کرو اور آئندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب
نہ کرو۔"

یہی مطلب حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے اور ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے توبہ نصوح کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اعادہ تو درکنار، اس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے۔" (ابن جریر)

"توبہ نصوح" کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے:

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے توبہ کرو
خالص توبہ۔ بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں تم سے
دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے
جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔" (التحریم ۶۶۔ رکوع ۲)

اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ توبہ کر لو تو تمہیں ضرور معاف ہی کر دیا جائے گا اور لازماً تم جنت میں داخل کر دیے جاؤ گے۔ بلکہ یہ امید دلائی گئی ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرو گے تو بعید نہیں کہ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے۔ یعنی بندہ کو اس بھروسہ پر گناہ نہیں کرنا چاہیے کہ توبہ سے معافی مل جائے گی اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توبہ کے ساتھ ساتھ عمل توبہ بھی ضروری ہے۔ جس کی ایک شکل یہ ہے کہ انسان خدا کی راہ میں مالی خیرات کرے۔ فرمایا:

"کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو
اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اُن کی خیرات کو قبولیت
عطا فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور
رحیم ہے۔" (التوبہ ۹۔ آیت ۱۰۴)

"جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ تو اللہ
کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔"
(الفرقان ۲۵۔ آیت ۷۱)

"پھر اگر بُرائی کے بعد اس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو)
بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔"
(النمل ۲۷۔ آیت ۱۱)

جو شخص توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے اُس کے پچھلے قصوروں پر اللہ گرفت نہیں کرتا۔ ارشاد باری ہے:

"(یہ اُس کا رحم و کرم ہی ہے کہ) اگر تم سے کوئی نادانی
کے ساتھ کسی بُرائی کا ارتکاب کر بیٹھا ہو پھر اُس کے بعد
توبہ کرے اور اصلاح کر لے تو وہ اُسے معاف کر دیتا ہے
اور نرمی سے کام لیتا ہے۔" (الانعام ۶۔ رکوع ۶)

"البتہ جن لوگوں نے جہالت کی بنا پر بُرا عمل کیا اور
پھر توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو یقیناً توبہ و اصلاح
کے بعد تیرا رب اُن کے لیے غفور اور رحیم ہے۔"
(النحل ۱۶۔ آیت ۱۱۹)

"اگر کوئی شخص بُرا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے
اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے
تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔"
(النسآء ۴۔ آیت ۱۱۰)

خدا ترس (متقین) اور نیک لوگ (محسنین) کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی ایک صفت جو کہ توبہ کے آداب کے سلسلہ میں بھی ہے یوں ذکر فرمایا گیا ہے کہ :۔

" اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام اُن سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کرکے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انھیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔ اور وہ کبھی دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزا اُن کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ اُن کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انھیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا اچھا بدلہ ہے نیک اعمال کرنے والوں کے لیے۔"

(آل عمران ۳۔ رکوع ۱۴)

توبہ کی قبولیت کے حق اور کن کن کی توبہ قبول ہوتی ہے، کے متعلق فرمایا گیا :۔

" ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق اُنہی لوگوں کے لیے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہوتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے۔" (النسآء ۴ آیت ۱۷)

ایک اور موقع پر ایسے لوگوں کی توبہ کے متعلق جو خدا کی نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے تھے اور اس روش سے باز آگئے ہیں فرمایا گیا :۔

" البتہ جو اس روش سے باز آجائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے اسے بیان کرنے لگیں، اُن کو میں معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔" (البقرہ ۲۔ آیت ۱۶۰)

کن کی توبہ کو قبولیت کا شرف حاصل نہیں ہوتا، اس کے متعلق صاف اور صریح طور پر ارشاد ہے :۔

" مگر توبہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے، اس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی اور اسی طرح توبہ اُن لوگوں کے لیے بھی نہیں ہے جو مرتے دم تک کافر رہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔"

(النسآء ۴ آیت ۱۸)

" جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے، اُن کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔ ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں۔ یقین رکھو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دی ان میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے روئے زمین بھر کر بھی سونا فدیہ میں دے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا تیار ہے اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔"

(آل عمران ۳ آیات ۹۰ - ۹۱)

چونکہ انسان بشری کمزوری کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس لیے اس پر غفلت کا طاری ہونا لابدی ہے۔ اس لیے حقیقی مومن کی صفت یہی ہے کہ جب بھی، غیر شعوری طور پر، اس سے عارضی بھول ہو جاتی ہے تو وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے کیونکہ اس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہے اور اسے اپنی کمزوریوں اور لغزشوں کا احساس ہے۔ حضرت آدمؑ کے ساتھ بھی بشری کمزوری تھی جس کی وجہ سے وہ خدا کے حکم کو بھول گئے، اور اُن کی اولاد بھی اکثر اس بھول میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی اس غلطی کو بھول سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ :۔

" ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا، مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔" (طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۱۱۵)

توبہ کے ساتھ اصلاح کی اہمیت پر بھی واضح ارشادات وارد ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر چوری کے متعلق پہلے توبہ فرمایا گیا کہ:۔

"اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ اُن کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔" (المائدۃ ۵ - آیت ۳۸)

مگر ہاتھ کاٹنے کی یہ سزا تو کسی چور کو نظامِ تمدن کی طرف سے دینے کی فرمائی گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کوئی شخص ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدنیتی سے پاک نہ کرے اور وہی گندے جذبات اپنے اندر رکھے تو پھر وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اسی لیے اگلی ہی آیت میں فرمایا گیا کہ:

"پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ کی نظرِ عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

اصلاح کی دوسری مثال اس طرح سمجھی جائے کہ عورتوں میں جو بدکاری کی مرتکب ہوں، انہیں اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھنے اور تکلیف دینے کا حکم ہے۔ یہاں تک کہ انہیں موت آجائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ یہ سزا تو نظامِ تمدن کی طرف سے دی گئی مگر اس گناہ کی معافی کی صورت صرف اس فعل سے توبہ کر کے اصلاح کرنے پر ہی رکھی گئی ہے۔ ارشادِ باری ہے:۔

"پھر اگر وہ (زانیہ عورتیں) توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انہیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (النسآء ۴، آیت ۱۶)"

قرآن اور حدیث دونوں اس معاملے میں ناطق ہیں۔

کہ توبہ و استغفار کی جگہ دُنیا ہے نہ کہ آخرت اور اس کا موقع اُسی وقت تک آثارِ موت طاری نہ ہو جائے۔ اُسی وقت کی توبہ ناقابلِ قبول ہے۔ فرمایا:۔

"(اُنہیں کچھ ہوش بھی ہے کہ اس روز کیا بنے گی) جب کہ ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، پھر کافروں کو نہ حجتیں پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا نہ اُن سے توبہ و استغفار ہی کا مطالبہ کیا جائے گا۔"

(النحل ۱۶ - آیت ۸۴)

قیامت کے دن بھی توبہ کے نہ قبول کیے جانے کے متعلق فرمایا گیا:۔

"اور (فراموش نہ کریں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ اُن کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ "جو رسول بھیجے گئے تھے اُنہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟" اُس وقت کوئی جواب اِن کو نہ سوجھے گا اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ ہی سکیں گے۔ البتہ جس نے آج توبہ کرلی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کرسکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔" (القصص ۲۸ - رکوع ۷)

چونکہ شیطان دل میں یہ وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ خدا ترسی اور راست بازی اور احساسِ ذمہ داری کا طریقہ اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت بنتی ہو تو بنتی ہو مگر دنیا میں وہ فاقہ مست اور خستہ حال ہی رہتا ہے۔ اس لیے اس کی تردید قرآن میں یہ کی گئی کہ راہِ راست کو اختیار کرنے سے صرف آخرت ہی نہیں بنتی۔ بلکہ اُس کی دنیا بھی بنے گی اور خدا اُسے اِس دنیا میں بھی اپنی نعمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائے

وقت کی قدر

"کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اِس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا اور موت کے لیے تیار رہتا! آہ! وقت گزر گیا، آہ وقت گزر گیا۔ اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ افسوس میں نے آپ اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر برباد کیا کہ ابھی وقت بہت ہے۔"

(گزرا ہوا زمانہ - سرسید احمد خاں)

گا۔ بشرطیکہ وہ رسولؐ کی پکار پہ لبیک کہے اور معافی چاہے اور اس کی طرف پلٹ آئے یعنی توبہ کرے۔ دعوت کے سلسلے میں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

" میں اس خدا کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ تو وہ ایک مدت خاص تک تم کو اچھا سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اُس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔"

(سورہ ھود ۱۱۔ رکوع۔۱)

دعوت ہی کے سلسلے میں حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا کہ:۔

" اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو، پھر اس کی طرف پلٹو، وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمہاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرم بن کر (بندگی سے) منہ نہ پھیرو۔"

(ہود ۱۱۔ آیت ۵۲)

قرآن مجید میں مغفرت کی چار شرطوں میں توبہ کرنی بھی شامل ہے۔ باقی تین شرطیں ایمان لانا، نیک عمل کرنا اور پھر سیدھا چلتے رہنا ہے۔ ارشاد باری ہے:۔

" اور جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے، اس کے لیے میں بہت درگزر کرنے والا ہوں۔"

(طٰہٰ۔ ۲۰ آیت ۸۲)

" مسلمان مقابلہ کیوں نہیں کر پا رہے ہیں، وہ پیچھے کی طرف کیوں ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے قوٰی اور حوصلے کو کسلمندی اور بے دمی اور آرام طلبی نے کیوں گھیر لیا ہے۔ پیش قدمی سے انھیں چڑ کیوں ہو گئی ہے۔ ان کی غیرت کو کیا ہو گیا، تحقیر کا ہدف بنتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ بے حسی کا دبیز لبادہ اوڑھنے سے ان کا مدعا کیا ہے۔ کیا خون اُن کی رگوں میں جم گیا ہے۔ کیا وہ بھول گئے کہ حرکت میں برکت ہے۔ آخر وہ محنت سے جی کیوں چراتے ہیں۔ رات گئے تک تیل کیوں نہیں جلاتے، پسینہ کیوں نہیں بہاتے، تعلیم میں دل کیوں نہیں لگاتے۔"

سید حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۱۰ ش ۳ (مارچ ۹۱ء)

مزاج نزفی HAEMOPHILIA

حکیم سمیع الرحمٰن خاں *

تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دس ہزار افراد میں ایک فرد مزاج نزفی (Haemophilia) میں مبتلا ہے۔ یہ ایک خلقی حالت ہے جو موروثی طور پر ملتی ہے اور ہر نسل کے لوگ اس میں یکساں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے اکثر جانیں ابتدائی عمر میں ہی ضائع ہو جاتی ہیں۔

مستند مزاج نزفی

CLASSICAL Haemophilia.

مزاج نزفی الف (Haemophilia-A) ایک ایسی موروثی حالت ہے جس میں مرد مبتلا ہوتے ہیں لیکن اس کی وراثت عورتوں سے منتقل ہوتی ہے اور بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ عورتیں اس بیماری سے غیر متاثر رہتی ہیں۔

اس حالت میں خون کی انجمادی طاقت (خون کا جم جانا) اتنی کم ہو جاتی ہے کہ معمولی اسباب کی بنا پر جسم سے بہت زیادہ خون خارج ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر بروقت علاجی تدابیر نہ کی جائیں تو مریض مر جاتا ہے۔

اس موروثی حالت کے انتقال کا دار و مدار جینس Genes پر ہے جس کا براہ راست تعلق x کروموسوم X-Chromosom سے ہے۔ اسی لیے اس میں مرد (males) مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی بھی مزاج نزفی Haemophilia میں مبتلا مرد کی تمام لڑکیاں اس بیماری کی حامل ہوتی ہیں جب کہ لڑکے اس بیماری سے آزاد رہتے ہیں اور آنے والی نسل میں بیماری کے منتقل ہونے کا ذریعہ نہیں بنتے۔ اس مرض کی حامل عورت کی پچاس فیصد لڑکیاں اس مرض کی حامل ہوتی ہیں اور پچاس فیصدی لڑکے اس مرض میں موروثی طور پر مبتلا ہوتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو خاکہ نمبر ۱)

ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ کسی ایسا خاندان میں جو مزاج نزفی میں مبتلا ہو، اس کی کئی نسلوں میں کوئی بھی ایسا لڑکا پیدا نہیں ہوتا جو مزاج نزفی میں مبتلا ہو۔ اس لیے کم و بیش ایسے تیس فیصد لوگوں میں جب اس بیماری کا پتہ چلتا ہے جن کے کسی رشتہ دار میں اس بیماری کی روداد نہ ملے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بیماری از سر نو ہوئی ہو۔ پھر بھی کچھ مریضوں میں اس بیماری کو خود بخود تبدل (Mutation) سے منسوب کیا جاتا ہے۔

مستند مزاج نزفی خون میں جز ہشتم Factor VIII یعنی مانع مزاج نزفی گلوبیولین (Anti Haemophilic Globulin) کی فعلیاتی کمی (Functional Deficiency) کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ مصل الدم Plasma میں مانع مزاج نزفی جز (Anti Haemophilic Factor) کی مقدار کم نہیں ہوتی بلکہ اس کی خاصیت جس کی وجہ سے خون منجمد (Coagulate) ہوتا ہے، بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں خون میں انجماد (خون کا جمنا)

* ریڈر، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نہیں ہو پاتا۔ جس کا انحصار X کروموسوم سے متعلقہ جین پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا وقوع صرف مردوں میں ہوتا ہے۔ کسی بھی مزاج نزفی میں مبتلا مرد کے نرینہ بچے اس سے مبرا ہوتے ہیں اور آنے والی نسل میں اس بیماری کو منتقل نہیں کرتے جب کہ اس کی تمام تر لڑکیاں اس بیماری کی حامل ہوتی ہیں۔ اس کی حامل عورتوں میں جریان الدم (خون بہنا) ہونے کی کوئی استعداد نہیں ہوتی لیکن ایسی عورتوں کے پچاس فیصد لڑکے مزاج نزفی میں مبتلا ہوتے ہیں جبکہ پچاس فیصد لڑکیاں اس بیماری کی حامل ہوتی ہیں جو آئندہ آنے والی نسل میں اس بیماری کو منتقل کرتی ہیں (ملاحظہ ہو خاکہ نمبر۱)

اس بیماری کی سریریاتی Clinical حالت Manifestation ہر خاندان میں مختلف ہوتی ہے، جس کا انحصار مانع مزاج نزفی جز کی فعلیاتی کمی Functional Deficiency پر ہے لیکن ایک ہی خاندان میں اس میں مبتلا اشخاص میں خون بہنے کی استعداد تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے۔ اس مرض کی خاندانی روداد Family History دو تہائی مریضوں میں ہی مل پاتی ہے۔

اس مرض کی شدت کے درجات کو جز ہشتم سی یعنی مانع مزاج نزفی گلوبیولین کے انجمادی عمل (Clotting Activity) کے معیار پر مقرر کیا جاتا ہے۔

I شدید: جز VIII C طبعی حالت کے ایک فیصد سے بھی کم

II اوسط: جز VIII C طبعی حالت کے دو فیصد سے پانچ فیصد تک۔

III معمولی: جز VIII C طبعی حالت کے پانچ فیصد سے بیس فیصد تک

اس مرض میں سریریاتی حالت کی شدت مذکورہ بالا درجات سے مطابقت رکھتی ہے لیکن مرضی سریریاتی اختلافی حالت کی شدت کی جینی بنیاد (Genetic Basis) ابھی تک اندھیرے میں ہے۔

حامل عورت X¹ X — طبعی مرد X Y

حامل عورت X X¹ — طبعی مرد X¹ Y — حامل عورت X X — طبعی مرد X Y

طبعی عورت X X — مبتلا مرد X¹ Y

حامل عورت X X¹ — طبعی مرد X Y — حامل عورت X X¹ — طبعی مرد X Y

خاکہ نمبر۱ - غیر طبعی X کروموسوم (X Chromosom) کی جینی (Genetic) منتقلی
X¹ کروموسوم = مزاج نزفی (Haemophilia) کا ذمہ دار کروموسوم

جز ہشتم کی اہمیت

اس کی کمی سے پیدا ہونے والی سریریاتی حالت سے ظاہر ہے جو مزاج نزفی الف اور وان ولی براند کے مرض Von Wille-Brand-Disease کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دونوں حالتیں خون کی موروثی جمنے کی طاقت کے نقص ہیں۔

جز ہشتم کو دو ترکیبی Component اجزا کی پیچیدہ شکل خیال کیا جاتا ہے۔ ان دونوں میں سے بڑا یعنی وان ولی براند جز Von Willebrand-Factor (VIII-R:WF) کی خفیہ پیغام رسانی Coding آٹوسومل جینز Autosomal Genes سے ہوتی ہے۔ مرض وان ولی براند میں وان ولی براند جز (VIII.R.W.F) یا تو کم ہوتا ہے یا ناقص ہوتا ہے۔ یہ جز منجمات دموی بلڈ پلیٹ لیٹ (Blood Platelet) کے ساتھ عمل کر کے ابتدائی [illegible]

کا بڑھاتا ہے اور جیسے کہ جز ترکیبی یعنی جز ہشتم انجمادی Factor کے حامل کا کام بھی کرتا ہے جس کی خفیہ coagulation پیغام رسانی Coding کے موسوم جینس سے ہوتی ہے۔ جز ہشتم سی براہ راست خون کے انجمادی ردعمل (خون کے جمنے) میں حصہ لیتا ہے۔ یہ جز مستند مزاج نزفی کی حالت میں کم ہوتا ہے۔

جب مناعتی اعتبار (بیماری سے بچنے کی طاقت) -Immunologically) سے ان کو جانچا جاتا ہے تو ان دونوں اجزا کو بالترتیب انٹیجن (Ag) یعنی Antigen VIII R Ag اور VIII C Ag ظاہر کیا جاتا ہے۔

ان کو اس طرح جانچنا جس کے ساتھ اضافی طور پر فعلی جائزہ Functional Assay بھی شامل ہو مستند مزاج نزفی اور وان ولی برانڈ کی بیماری میں تفریق کرنے کے لیے ضروری ہے۔

سریریاتی حالت (Clinical Feature)

مزاج نزفی الف کی شدید حالت میں جب کہ مصل الدم (خون کی ماہیت) Plasma میں مانع مزاج نزفی جز نہ پایا جائے۔ پیدائش کے بعد نوزائیدہ بچے کی ختنہ کی صورت میں شدید خون بہہ سکتا ہے جو اتنا زیادہ بہہ سکتا ہے کہ بچہ ہلاک ہو جاتا ہے (ناف سے خون بہنا غیر عام ہے) زمانہ طفولیت میں معمولی چوٹ اتنی معمولی کہ جس کی طرف توجہ نہ کی جائے لگنے کے بعد نرم ساختوں (Soft Tissues) میں یا جلد کے نیچے خون رگوں سے نکل کر جمع ہو جاتا ہے (Ecchymosis) چھوٹے بچوں میں منہ سے خاص طور پر بالائی لب اور مسوڑھے کے بیچ میں ملنے کے مقام سے خون نکلنے لگتا ہے۔ یہ خون اتنا زیادہ بہتا ہے کہ اس کو بند کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

ابتدائی عمر کے بعد جوڑوں میں خون کا جمع ہونا خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ بار بار جوڑوں میں خون جمع ہونے کی وجہ سے جوڑ بدشکل ہو جاتے ہیں۔ ان کی حرکات محدود ہو جاتی ہیں اور آخر کار جوڑ تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ حالت اس بیماری کی بڑی خراب حالت ہے جس کے نتیجے میں مریض اپاہج ہو جاتا ہے۔ گھٹنے کا جوڑ، ٹخنے کا جوڑ اور کہنی کے جوڑ اس حالت میں خصوصی طور پر متاثر ہوتے ہیں جب خون رگوں سے نکل کر جوڑ (Joint capsule) میں جمع ہونے لگتا ہے تو جب تک جوڑ میں تناؤ نہ پیدا ہو جائے، جمع ہوتا رہتا ہے اور جب تناؤ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ مزید خون جمع ہونے کی گنجائش نہیں رہتی، تو خود بخود بند ہو جاتا ہے۔

نرم ساختوں میں خون کا رگوں سے نکل کر جمع ہونا غیر محدود ہو سکتا ہے جو عضلات (گوشت - Muscle) کے اندر گوشت کی پرتوں کے درمیان یا جلد کے نیچے کافی رقبہ میں پھیل جاتا ہے۔

اکثر یہ خون جذب ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات سخت سوجن کی شکل میں قایم رہتا ہے جس میں بعد میں چونہ جمع ہو جاتا ہے۔ یہ سوجن (کاذب سلعہ (Pseudo Tumour) دوسری ساختوں پر دباؤ ڈال کر ان کے متاثر ہونے کی علامات پیدا کر سکتی ہے یا ہڈی میں چھلن (Erosion) پیدا کر دیتی ہے یا رسولی کی شکل سے مشابہت اختیار کر لیتی ہے۔

گوشت (عضلات) (Muscles) میں خون جمع ہونے کی صورت میں اس کے جذب ہونے کے بعد سکڑن Contractures پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے بدشکلیاں (Deformities) پیدا ہو جاتی ہیں جیسے ہاتھ کا سکڑ کر پرندوں کے پنجے کی شکل کا ہو جانا۔

زبان کے نیچے حلق یا گردن میں نرم ڈھیلی ساختوں میں خون کا رگوں سے نکل کر جمع ہونا خطرناک ہو سکتا ہے کیوں کہ اس سوجن کی وجہ سے نگلنے میں دقت یا سانس لینے میں تنگی پیدا ہو جاتی ہے

پیٹ میں اگر یہ خون رگوں سے نکل کر جمع ہو جائے تو اس کی وجہ سے یا تو التہاب زائدہ دودیہ (اپنڈی سائٹس Appendicitis) جیسی علامات ظاہر ہوتی ہیں یا پت کی نالی (Bile Duct) پر دباؤ ڈالنے سے یرقان ہو جاتا ہے۔ یا گردہ پر دباؤ ڈالنے کی وجہ سے خون کا دباؤ Blood Pressure بڑھ جاتا ہے۔

آنتوں کی جھلی (ماساریقا (Mesentery) میں خون جمع ہونے کی صورت میں پیٹ میں درد ہوتا ہے یا آنت مُردہ ہو جاتی ہے۔ مریض کے پیشاب سے خون آ سکتا ہے جس کے ساتھ درد گردہ کی

علامات ہو سکتی ہیں۔ نظام ہضم کے کسی بھی حصہ میں خون خارج ہو سکتا ہے جس کا اظہار خون کی قے یا پاخانہ میں خون آنے سے ہوتا ہے۔

ایسے مریضوں میں معمولی سے معمولی آپریشن جیسے دانت اکھاڑنے میں بھی بہت زیادہ خون خارج ہو سکتا ہے اور کسی بڑے آپریشن میں اتنا خون بہہ جاتا ہے کہ مریض مر جاتا ہے۔ اسی لیے کسی ایسے مریض میں معمولی سے معمولی آپریشن بھی بغیر احتیاطی تدابیر کے اس وقت تک نہ کرنا چاہیے جب تک آپریشن کرنا ناگزیر نہ ہو۔

دماغ میں جریان الدم Subdural Haemorrhage ہونے سے جو اتفاقاً بہت کم ہوتا ہے مریض یا تو محتاج ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے کسی بڑی نس (Nerve Trunk) میں خون جمع ہونے سے یا تو حس باطل ہو جاتی ہے یا فالج ہو جاتا ہے۔

خوش قسمتی سے اس مرض میں مبتلا صرف پچاس فیصد مریضوں میں ہی مرض کی اتنی شدید حالت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسے مریضوں کے مصل الدم (خون کی مائیت Plasma) میں عامل مانع مزاج نزفی جز موجود نہیں ہوتی۔ باقی پچاس فیصد مریضوں میں جن میں مانع مزاج نزفی جز طبعی حالت کا تیس فیصد تک ہو سکتا ہے۔ علامات اتنے شدید نہیں ہوتے۔ اور خون کا بہت زیادہ بہنا کسی آپریشن دانت اکھاڑنے یا چوٹ لگنے کے بعد ہوتا ہے۔

ہدایات

جیسے ہی کسی مریض میں اس بیماری کی موجودگی کا پتہ چلے مریض یا اس کے والدین یا دیکھ بھال کرنے والوں کو احتیاطی تدابیر کے متعلق پوری جانکاری ہونا ضروری ہے۔

ایسے بچوں کی پرورش ایسے ماحول میں کرنا ضروری ہے جہاں اُن کی پوری دماغی نشو و نما ہو سکے۔ اس لیے کہ دماغی نشو و نما کی خرابی کے اثرات مریض میں خون نکلنے سے ہونے والی خرابیوں کے اثرات سے بدتر ہو سکتے ہیں۔

جب مریض اتنا چھوٹا بچہ ہو جو اپنی حفاظت خود نہ کر سکے تو اس کی پرورش کے لیے اس کے ماحول کو اتنا بے خطر رکھا جائے کہ مریض کے گھومنے پھرنے میں کسی خطرے کا امکان نہ ہو جس سے بچے کی حرکات بے روک ٹوک ہو سکیں۔

بڑے ہونے پر مریض کو اس طرح کے کھیل کھیلنا چاہیے جس میں چوٹ لگنے کا امکان نہ ہو۔ مثلاً تیرنا، دوڑنا، گولف کھیلنا، بیڈمنٹن یا ٹینس وغیرہ۔ ایسے لوگوں کو پیشہ بھی ایسا ہی اختیار کرنا چاہیے۔ جس میں اُن کے لیے کوئی خطرہ نہ ہو جیسے تجارت تاکہ ایسے لوگ دوسروں پر منحصر نہ ہو کر اپنی کفالت خود کر سکیں اور دوسروں کو سہارا دے سکیں۔ یعنی زندگی اس انداز سے گزاریں جس سے زندگی خوش گوار رہے اور جینے کا احساس اور تمنا باقی رہے۔

ضروری ہدایت

ایسے مریضوں کو کوئی بھی آپریشن، چاہے وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، نہ کرانا چاہیے۔ حتیٰ کہ گوشت میں انجکشن (Intra-muscular Injection) بھی نہ لگوانا چاہیے۔ اس لیے کہ مرض کی شدید حالت میں انجکشن لگوانے سے بھی بہت زیادہ خون بہہ سکتا ہے۔

اگر خدانخواستہ کوئی آپریشن کرانا ناگزیر ہی ہو تو کسی ایسے اسپتال کی طرف رجوع کریں جہاں اس مرض کے مریض کے آپریشن کرنے کی صورت میں تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا انتظام ہو۔

اگر کبھی کسی ایسی حالت سے دوچار ہوں جس میں خون ضائع ہونے کا زیادہ امکان ہو تو فوراً علاج کی طرف توجہ کریں۔

علاج۔

اس مرض کے علاج کے لیے خون میں ڈالے جانے والے جز یعنی مانع مزاج نزفی جز کا فوری طور پر مرض کے مطابق مہیا کر کے جسم میں داخل کرنا ضروری ہے۔ یہ جز تندرست لوگوں کے تازہ انسانی خون سے حاصل کیے ہوئے تازہ مصل الدم میں موجود ہوتا ہے۔ رکھے ہوئے خون (Stored Blood) میں یا مصل الدم (Plasma) کو دیر تک رکھنے سے یہ جز یعنی مانع مزاج نزفی جز ضائع ہو جاتا ہے۔

اگر کرایو پریسی پیٹیٹ (Cryoprecipitate) حاصل ہو جائے (جو تازہ مصل الدم (Plasma) کو جما کر حاصل کیا جاتا ہے) تو یہ مریض جزء آٹھ (Factor - VIII) داخل کرنے کا آسان ذریعہ ہے۔ اس کی کم مقدار سے زیادہ مانع مزاج نزفی جزء حاصل ہو جاتا ہے۔

. . . .

تشریحات

ا؎ استقرار حمل کے وقت بچے کی جنس یعنی مرد یا عورت (Male or Female) ہونا عورت کے بیضہ (Ovum) اور مرد کے حیوان منوی (Sperm) کے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے وقت X یا Y کروموسوم کے ملنے سے متعین ہوتی ہے۔ مرد کے حیوان منوی میں X Y کروموسوم ہوتے ہیں جب کہ عورت کے بیضہ میں X X کروموسوم ہوتے ہیں۔ اگر مرد اور عورت دونوں کے X کروموسوم ایک دوسرے سے ملتے ہیں (XX) تو بچہ مادہ (Female) پیدا ہوتا ہے اور اگر مرد کا Y کروموسوم عورت کے X کروموسوم سے ملتا ہے (XY) تو بچہ نر (Male) پیدا ہوتا ہے۔

۲؎ مصل الدم (Plasma) خون کی زردی مایل رنگ کی مائیت جو خون کو کسی بوتل میں کچھ دیر رکھنے کے بعد اوپری حصہ میں آجاتی ہے اور سرخ حصہ (کریات حمرا (Red Blood corpuscles)) تہ نشین ہو جاتا ہے۔ اس مائیت کو نتھار کر الگ کیا جا سکتا ہے۔

۳؎ خون کے انجماد (خون کے جمنے) (Coagulation of Blood) سے مراد فائبرنوجن (Fibrinogen) کا جامد لیفین (Solid Fibrin) میں منتقل ہو کر خون کا جم جانا ہے یہ ایک سلسلہ وار ردِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جس سے انجمادی اجزا (Clotting Factors) یکے بعد دیگرے بالترتیب قابل عمل ہوتے جاتے ہیں جن میں سے بیشتر نائب خمیر (Pro-Enzyme) ہوتے ہیں اور خمیر (Enzyme) میں تبدیل ہو کر قابل عمل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی پیچیدہ نظام ہے۔ اس عمل میں شریک ہونے والے اجزا کو اپنے نمبروں (ایک سے تیرہ) سے جانا جاتا ہے۔ یہ نمبر اُن کی دریافت کی سلسلہ وار ترتیب سے دیے گیے ہیں نہ کہ ان کے انجماد (خون کے جمنے) میں حصہ لینے کی ترتیب سے۔

یہ اجزا مندرجہ ذیل ہیں:

جزء ایک	فائبرینوجن	Factor I Fibrinogen
جزء دو	پروتھرومبین	Factor II Pro Thrombin
جزء تین	تھرومبو پلاسٹین (نسیجی)	Factor - III Thromb plastin (Tissue)
جزء چار	چونا	Factor IV Calcium.
جزء پانچ	پرواسیلرین	Factor V Pro Accelerin
جزء سات	پروکنورٹین	Factor VII Pro convertin
جزء آٹھ	مانع مزاج نزفی گلوبیولین	Factor VIII Anti Haemophilic Globulin
جزء نو	پلازما تھرومبوپلاسٹین کمپونینٹ	Factor IX Plasma Thromboplastin Component Christmas Factor

جز دس — کرسمس جز۔ اسٹیوارٹ پرور جز — Factor X Stuart Prower Factor.

جز گیارہ — پلازما تھرومبو پلاسٹین۔ این پی سی ڈینٹ — Factor XI Plasma Thromboplastin Antecedent

جز بارہ — ہیج مین جز — Factor XII Hageman Factor

جز تیرہ — فائبرین اسٹیبی لائیزنگ جز۔ (پلازما ٹرانس گلوٹا مینز — Factor XIII Fibrin Stabilizing Factor — Plasma Transglutaminase

انجمادی نظام کی ترکیب محدود تحلل لحمین رد عمل (Proteolytic Reaction) Coagulation cascade (وہ ردّ عمل جس میں لحمین (Protien) ٹوٹ کر تحلیل ہوجاتی ہیں) کے سلسلے سے ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں تھرومبین (Thrombin) پیدا ہوتی ہے جو فایبرینوجن کو لیفین Fibrin میں بدل دیتی ہے۔ اس سلسلہ وار رد عمل کے ہر درجے میں ایک پیرنٹ زائموجن (Parent Zymogen) قابل عمل بنتی ہے جو اپنے بعد ہونے والے رد عمل کی کیٹالیسس (catalysis) کرتی بہت سے انجمادی اجزا سادہ پیپٹائیڈ (Simple Peptides) ہیں جو واحد ساختی جین (Structural Gene) کی پیداوار ہیں۔ جز دو۔ سات۔ نو۔ دس۔ گیارہ۔ بارہ اور تیرہ (Factor II, VII, IX, X, XI, XII, XIII) اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ اجزا بہت پیچیدہ ہیں جو ایک سے زیادہ ساختی جین (Structural Gene) کی پیداوار ہیں۔ جز ایک، پانچ اور آٹھ (Factor I (Fibrinogen) V, VIII) اسی گروہ میں شامل ہیں۔ جز پانچ کی تشکیل کے لیے کم از کم دو جینیں ذمہ دار ہیں جب کہ جز آٹھ کی تشکیل میں تین سے پانچ حصہ لیتے ہیں۔

طبعی حالت میں خون میں ہر خون جمانے والے جز کی کافی جیا وراثی مقدار (Relative Abandance) موجود ہوتی ہے اور شاذ و نادر ان اجزا میں کسی ایک کی کمی کی وجہ سے وہ بھی اُس وقت جب اس کی کمی طبعی حالت کی پچاس فیصد سے کم ہو جائے، خون بہت زیادہ بہتا ہے۔

وان ولی برانڈ کا مرض (Von Willebrand's Disease) مزاج نزفی سے ملتی جلتی بیماری ہے جو عورتوں کو متاثر کرتی ہے۔

> قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے، شریف خاک میں مل گئے ہیں
> علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھٹا گھر پکار
> ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ چکے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی
> ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔
> جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے، امرا غافل و بے پرواہ
> ہیں، علماء زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔"
>
> سر سید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۳/ مارچ ۸۹ء

تعلیم کا نیا روپ اور نیا سروپ

امان اللہ خاں شیروانی *

تعلیم اور سماج کے باہمی تعلق اور رشتہ کے متعلق ہمیشہ سے اختلاف رائے رہا ہے۔ کچھ ماہرین اور اکابرین کا خیال ہے کہ "تعلیم برائے تعلیم" ہونا چاہیے۔ یعنی تعلیم کا مقصد صرف علم حاصل کرنا یا تاریخ پڑھانا ہے جب کہ دوسرے اہل دانش کے خیال میں تعلیم سماج میں تبدیلی لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ایک اور طرز فکر یہ بھی ہے کہ تعلیم مکمل طور پر اپنے ماحول اور حالات کے تابع ہوتی ہے اور سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کی تبدیلی کے ساتھ تعلیم کے مقاصد اور نظام تعلیم میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے متعلق یہ سب نظریات تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھتے ہیں۔ تعلیم کے مقاصد اور اُن کی وضاحت کے لیے اسے ہر رُخ سے دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ تعلیم اپنے ماحول اور حالات سے متاثر ضرور ہوتی ہے لیکن ان پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے سماجی انقلاب اور تہذیبی ترقی کے لیے تعلیم ہی بہترین وسیلہ ہے اور اسی کے ساتھ قومی مقاصد پورے کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ 'تعلیم' کا مقصد نوجوانوں کو حالات سے باخبر کرنا اور اُن کی معلومات میں اضافہ کرنا ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ انھیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور سماج کا ایک سودمند رکن بننے میں مدد کرنا بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ "تعلیم" ہی کے ذریعے انسان خود کو اس قابل بناتا ہے جس سے وہ طبعی اور قدرتی وسائل کا بھرپور استعمال کرکے اپنی اور سماج کی زندگی کو آرام دہ اور خوب صورت بنا سکے اور حال اور مستقبل کی دشواریوں کا مقابلہ کر سکے۔ 'تعلیم' اقتصادی اور معاشی ترقی میں معاون ہوتی ہے اور تعلیم ہی سماج کی آزادی اور بقا کی ضامن بھی ہوتی ہے۔ اس لیے 'تعلیم' کا انسان کی نشو و نما اور ترقی سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اگر ایک طرف یہ سماج کو ترقی کی طرف لے جاتی ہے تو دوسری طرف اسے بھی سماج کی بدلتی قدروں اور تیز رو تبدیلیوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس طرح سماج اور تعلیم میں دوطرفہ رشتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

عالمی بینک نے اپنے ایک دستاویز میں لکھا ہے کہ

> "زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت کی طرح تعلیم کو بھی قومی نشو و نما اور ترقی کا صرف ایک حصہ سمجھنا مناسب نہیں۔ کیوں کہ تعلیم قومی ترقی کے ہر ادارہ میں سرایت کرکے خود اس کا ایک اثر دار اور اہم جزو بن گئی ہے اور ہر طرح قومی ترقی میں حصّہ دار ہو گئی ہے۔"

جب تعلیم کو قومی ترقی کا ایک اہم اور تکمیلی جزو تسلیم کر لیا گیا تو تعلیم کو قومی ترقی کے سب ہی عناصر سے باہمی ربط اور رشتہ قایم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک درسگاہ

* سابق پرنسپل اسلامیہ کالج، اٹاوہ، اترپردیش۔

کے لیے لازمی ہے کہ اس کا رشتہ اپنے علاقے کے اسپتال، کارخانوں، تجارتی کمپنیوں، پیشہ ورانہ تربیت دینے والے اداروں اور لوکل انتظامیہ سے قایم ہونا چاہیے تاکہ درس گاہ کے پروگراموں اور اس کی ترقی کے منصوبوں میں مدد ملتی رہے اور اسی کے ساتھ درس گاہ بھی اپنے علاقے کے سماجی اداروں کو ہر طرح کی امداد پہنچاتی رہے۔ اس قسم کے روابط کے لیے دائرہ بڑا وسیع ہے اور یہ دوطرفہ روابط اور تعلقات دونوں کے لیے سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔

ایک ماہر تعلیم کا قول ہے کہ "تعلیم خود ایک عالم بھی ہے اور پورے عالم کا عکس بھی۔" حقیقت یہ ہے کہ تعلیم ایک طرف سماج کی تابع ہے تو دوسری طرف یہ سماج کے مقاصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ سماج کے یہ مقاصد صرف تمدنی اور تہذیبی ہی نہیں ہوتے بلکہ اقتصادی اور معاشی بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً غریبی دور کرنا، پیداوار کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا، معیار زندگی بلند کرنا اور امیری اور غریبی کا فرق کم سے کم کرنا بھی تعلیمی مقاصد ہوسکتے ہیں۔ اس طرح تعلیم صرف تہذیبی، اخلاقی اور روحانی ترقی کا ذریعہ ہی نہیں یہ مادی ترقی کا بھی ایک وسیلہ ہے لیکن ان سب ذرائع اور طاقتوں کے ساتھ تعلیم اپنے چاروں طرف کے طبعی حالات اور سماجی روایات کا بھی اثر قبول کرتی ہے۔ اپنے اطراف سے آنکھیں بند کرکے نہ تو تعلیمی کام کرنے والے صحیح طور پر کام کرسکتے ہیں اور نہ ہی تعلیمی عمل جاری رہ سکتا ہے۔ ایسی تعلیم جس کا کوئی تعلق اور رشتہ اپنے ماحول سے نہیں ہوگا وہ تعلیم ناقص اور نامکمل ہوگی۔ اس لیے اب تعلیمی اداروں کو صرف آپس میں ہی ربط و تعلق نہیں رکھنا ہے بلکہ غیر تعلیمی اداروں اور غیر تعلیمی عناصر سے بھی پورا رشتہ قایم کرنا چاہیے۔ ان اداروں اور عناصر سے بھی تعلیمی عمل میں بڑی مدد حاصل ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ خود تعلیم کو ان غیر تعلیمی عناصر پر اثر انداز ہوکر سماج کے لوگوں کی خدمت کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لیے اسکولوں میں "کمیونٹی سروس" کا نظریہ سامنے آیا ہے۔ اب اسکولوں کو صرف بچوں کو ہی لکھانے پڑھانے کا کام نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ بچوں کے والدین اور اس علاقے میں رہنے والے سب ہی لوگوں کی ناخواندگی دور کرنے اور انھیں روشن خیال بنانے میں بھی مدد کرنا چاہیے اور ان کی سماجی ثقافتی خدمت بھی انجام دینا چاہیے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی معاشی ترقی میں بھی معاون بننا چاہیے۔

تعلیم کا مقصد صرف فرد کی معلومات میں اضافہ کرنا یا اس کے نجی فوائد کے لیے کسی ہنر یا حرفت میں تربیت دینا ہی نہیں ہے، اس کا مقصد قومی اور سماجی ترقی بھی ہے۔ اب تعلیم حاصل کرنا صرف دولتمندوں اور چنیدہ لوگوں کا ہی حق نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ اب یہ تمام انسانوں کا حق بن گیا ہے۔ اب انسان خواہ کسی طبقے یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ کسی مذہب یا قوم کا فرد ہو یا کسی بھی علاقے کا رہنے والا ہو تعلیم حاصل کرنا اس کا پیدائشی حق ہے۔ اسی طرح تعلیم کا عمل بھی صرف چیدہ جگہوں پر ہی نہیں ہوتا، اس کی پہنچ ملک کے ہر گوشے اور طبقے تک ہو گئی ہے۔ اب یہ سب کا حق ہے کہ لوگ فرسودہ رسم و رواج اور غیر صحت مند اور منفی روایات کو چھوڑ کر جدید سائنٹفک اور تکنیکی کھوج سے فائدہ اٹھائیں اور اپنا معیار زندگی بلند کرنے کی جدوجہد میں شامل ہوں۔ اسی لیے ۱۹۶۶ء کے تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: "تعلیم کو زندگی کی ضرورتوں اور لوگوں کی آشاؤں سے ربط رکھنا چاہیے اور اسے سماجی، اقتصادی اور تہذیبی تبدیلیوں کا ایک طاقت ور ذریعہ بننا چاہیے۔"

حکومت ہند نے اپنی قومی پالیسی 'برائے تعلیم' ۱۹۶۸ء میں بھی تعلیم اور سماج میں ایک قریبی ربط قایم کرکے تعلیم کو سماجی تبدیلیوں کا ایک اہم ذریعہ بنانے پر زور دیا تھا۔ اسی پالیسی اعلان میں کہا گیا تھا کہ "نظام تعلیم کچھ اس قسم کا ہونا چاہیے جس سے تعلیم کی پہنچ عوام تک اور ہر فرد کی پہنچ تعلیم تک بہ آسانی ہو سکے۔" اب چونکہ تعلیم کو قومی مقاصد پورے کرنے اور قوم و سماج کی تعمیر نو میں پوری طرح حصہ لینا ہے، اسی لیے اب تعلیم مندرجہ ذیل کاموں میں بڑا اہم اور کلیدی رول ادا کر سکتی ہے۔

۱۔ ایسے سماج کی تشکیل جس میں برابری اور مساوات ہو۔
۲۔ ایسی فضا تیار کرنا جس سے ملک و قوم کی تعمیر نو میں پوری

سد دمل سکے۔

۳۔ قوم میں سائنٹفک مزاج پیدا کرنا۔

۴۔ نیشنل ازم اور سیکولرازم کے نظریات کو فروغ دینا۔

۵۔ ملک کے لوگوں کی توجہ بڑھتی ہوئی آبادی کی خرابیوں کی طرف دلانا۔

۶۔ ملک سے غریبی دور کرنا۔

۷۔ ملک سے ناخواندگی دور کرنا۔

۸۔ فرسودہ اور تباہ کن سماجی روایات اور سماجی برائیوں کو دور کرنا۔ جیسے ستی کی رسم، جہیز کی رسم، کالا بازاری اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ۔

بھارتی دستور اساسی آزادی، مساوات، انصاف اور بھائی چارہ کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی دستور میں چھوت چھات کے خلاف قوانین بھی ہیں لیکن پھر بھی ملک میں ناانصافی چھوت چھات اور فرقہ پرستی قائم ہے۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان دیہاتی اور شہری آبادی کے درمیان، مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان عدم مساوات اور ناانصافی بڑھتی ہی جارہی ہے اور آج بھی ملک کی کثیر آبادی، فرسودہ اور دقیانوسی روایات اور توہم پرستی کا شکار ہے۔ حالاں کہ ملک کی خواندگی میں کافی اضافہ ہوا ہے مگر ابھی تک ملک کی ½ آبادی ناخواندہ ہے۔ اس لیے اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ تعلیمی نظام ان سب برائیوں کو دور کرنے کا اہل ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر تعلیم کو اس کا اہل اور رضاکار بنانا ہوگا۔ اب تعلیم کا سب سے اہم کام یہی ہے کہ اس کے ذریعے سماج میں تبدیلی لائی جائے اور اس دور کی تاریکیوں کو دور کیا جائے۔

موجودہ تعلیم کے بارے میں چند مزید اہم سوالات بھی سامنے آتے ہیں۔ کیا ہمارا تعلیمی نظام قومی ترقی کے دائرہ سے الگ ہے؟ کیا اسکول اور کالج صرف طلبا کی معلومات بڑھانے کا ہی کام کرتے ہیں؟ کیا یہ طلبا اور اُن کے ذریعے سماج میں کسی قسم کی بیداری پیدا کرنے کا وسیلہ نہیں بن سکتے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اسکول اور کالج اپنی مقرر کردہ حدود سے باہر نکلنے اور درس وتدریس کے راستے سے کچھ ہٹ کر آگے بڑھنے کی بات ہی نہیں سوچتے۔ ان کا بس ایک ہی کام ہے طلبا کی معلومات میں اضافہ کرنا اور انھیں امتحانات میں پاس کرانا اب تو پہلا کام بھی بہت کم رہ گیا ہے۔ اب تو صرف امتحانات پاس کرانا ہی ہماری درس گاہوں کا نصب العین بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے تقریباً سب ہی اسکول اور کالج اب صرف امتحانات پاس کرانے والے مقصد کو سامنے رکھ کر ہی کام کرتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر زیدی:

"تعلیم تو انسانی ترقی کے لیے ایک قسم کی سرمایہ کاری ہے اور اسی لیے معاشی اور اقتصادی ترقی کا اصل محرک بھی۔ تعلیم سماجی تبدیلیوں کا سب سے اہم ذریعہ ہے اس لیے ملک وقوم کی فلاح وبہبودی اور اقتصادی اور سماجی ترقی کا دارومدار تعلیم پر ہی ہے۔ تعلیم کو اب اجتماعیت اور سماجیت میں رنگ جانا چاہیے اور تعلیمی اداروں کو طلبا کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عوام کی تعلیم کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔"

تعلیم کے اس نئے روپ میں اسکولوں اور کالجوں کا رول

اب تک اسکول اور کالج ایسے محل سمجھے جاتے تھے جن کو زمانے کی ہوا تک نہیں لگنے دی جاتی تھی۔ انھیں سماج کے بُرے اثرات سے بچایا جاتا تھا۔ ان درس گاہوں کے منتظمین اور اساتذہ جیسا چاہتے تھے کرتے تھے۔ ان کو علم کے "پاک مندر" کہا جاتا تھا اور عوام کو بہت کم معلوم ہوتا تھا کہ اندر کیا ہورہا ہے لیکن آج کے جمہوری اور عوامی دور میں یہ "محل" سب کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ اب تعلیمی درس گاہوں اور باہر کی دنیا کے تعلقات دن بدن بڑھتے جارہے ہیں۔ اس دور میں اسکولوں اور کالجوں کو صرف نئی نسل اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے فرائض کے کام ہی انجام نہیں دینا ہے بلکہ انھیں سماج کے لیے تمدنی اور تہذیبی رہنمائی کا کام بھی کرنا ہے۔ انھیں اپنے حلقہ اور سماج میں تعلیم

اور روشن خیالی کو بھی فروغ دینا ہے۔ پرانی دقیانوسی اور نقصان دہ رسم ورواج کے خلاف آواز اٹھانا ہے اور سماجی زندگی کے مراکز بن کر بھی اس کی ترقی اور فلاح وبہبود کے کاموں میں آگے بڑھ کر حصہ لینا ہے۔

تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں اور سماج کے دوسرے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ ان دونوں کے درمیان قریبی تعلق ہو اس میں دونوں کا مفاد ہے۔ سماج کو اسکولوں اور کالجوں سے اپنے سماجی اور ثقافتی کاموں میں رہنمائی ملتی ہے تو دوسری طرف اسکولوں اور کالجوں کو 'تعلیمی عمل' کے لیے ہر قسم کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ کمیونٹی کے بزرگ اور تجربہ کار طبقہ سے 'تعلیم کے عمل' میں پورا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ حقیقت میں نئی نسل کے نوجوانوں کو سماج کے تجربہ کار بزرگ طبقہ سے علیحدہ کر دینے سے ان کو زندگی کے مسائل سمجھنے میں بڑی دشواری آتی ہے اور ان کی تعلیم صرف 'کتابی تعلیم' ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو کچھ بچے کتابوں اور اساتذہ سے سیکھتے ہیں اس کا عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے انھیں اپنے گاؤں، قصبہ، شہر اور محلے کی زندگیوں کے عمیق اور گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

حصول علم کے لیے کتابوں اور اساتذہ کے ساتھ ساتھ عوام بھی ایک وسیلہ ہیں۔ عوام علاقائی، سماجی اور معاشی اعتبار سے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے 'تعلیمی عمل' کو لوکل اور علاقائی حالات سے ہی تجربہ حاصل کرنا لازمی ہے۔ اسی طرح علاقے کے عوام کو بھی اسکول سے بہت کچھ سیکھنا بھی 'تعلیمی عمل' کا ایک حصہ ہے۔ اس کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں 'کمیونٹی سروس' کے مراکز بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں بھی اسکولوں اور کالجوں میں درس وتدریس کے کام میں صرف چند گھنٹوں کے لیے ہی ہوتے ہیں اور کافی وقت اسکولوں کی عمارتیں، فرنیچر اور عملہ خالی رہتا ہے۔ اسی لیے شام اور رات کے اوقات میں یہاں تعلیم بالغان مزید تعلیم (Further Education) اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مراکز کھولے جا سکتے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو عوام کے لیے کھولا جا سکتا ہے۔ جدید نظریۂ تعلیم میں اسکولوں اور کالجوں کے ان کاموں کو بھی بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ہندوستان جیسے غریب اور ترقی پذیر ملک کے لیے تعلیمی اداروں میں سماجی کاموں اور سماجی فلاح وبہبود کے مراکز قایم کرنا نہ صرف فائدہ مند ہے بلکہ کفایتی بھی ہے۔ اس ملک میں نئی نسل کو تعلیم یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ عوام میں بیداری پیدا کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ قومی یک جہتی قایم کرنے، معاشی نابرابری کو دور کرنے اور تندرستی اور صفائی کے متعلق عوام کو آگاہ کرنے، بڑھتی ہوئی آبادی کی خرابیوں کو سمجھانے وغیرہ جیسے فلاح وبہبود کے کام ان کمیونٹی مراکز سے انجام پا سکتے ہیں اور ان کاموں میں اساتذہ کی مدد لی جا سکتی ہے۔

"اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس! ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا! اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے، کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں۔"

سرسید

ابو وارث جمیل *

غم اور ہم (تفکرات) کے متعلق ابو الطب بقراط (۴۶۰ ق م) کے قول کو حنین بن اسحاق نے جو کہ یونانی کتابوں کا براہ راست مترجم بھی ہے اپنی شہرہ آفاق تصنیف نوادر الفلاسفہ میں اس طرح بیان کرتا ہے :

قال بقراط فی کلامہ مما ذکرہ حنین بن اسحاق فی کتاب نوادر الفلاسفة وقال للقلب آفتان وھما الغم والھم فالغم یعرض منه النوم والھم یعرض منه السھر، وذالک بان الھم فیه فکر فی الخوف مما سیکون، فمنه یکون السھر والغم لا فکر فیه لانه یکون بما قد مضیٰ وانقضیٰ"

(عیون الانباء فی طبقات الاطباء۔ ابن ابی اصیبعہ)

(حنین بن اسحاق اپنی کتاب نوادر الفلاسفہ میں ابو الطب بقراط کا قول نقل کرتا ہے کہ قلب کے لیے دو آفتیں ہیں ایک غم دوسرا ہم (تفکرات) غم سے نیند آتی ہے اور ہم سے نیند اڑ جاتی ہے۔ کیوں کہ ہم (تفکرات) میں فکر ہوتی ہے ایک ایسی چیز کہ جو ہونے والی ہو۔ اس لیے اس فکر سے نیند نہیں آتی ہے اور غم میں فکر نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ چیز گزر چکی ہوتی ہے۔)

سبب غم کے متعلق حکماء کا نظریہ یہ ہے کہ غم کا سبب معمولات زندگی کی بے اعتدالی، غذائی نقص اور ورزش میں کمی ہے۔ اگر ہم فعال زندگی گزارتے ہیں جس میں کام ورزش اور کھیل کود شامل ہے تو طبیعت کے اندر ولولہ، جوش، حوصلہ اور جولانی پیدا ہوتی ہے۔ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ منفی جذبات یا انفعالات نفسانیہ جیسے غم، غصہ، فکر و تردد، خوف وغیرہ سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور یہ دل پر خراب اثرات ڈالتے ہیں جس سے قلب کی حرکت غیر منظم ہو جاتی ہے اور مثبت جذبات جیسے مسرت وشادمانی ہمارے دل پر اچھے اثرات ڈالتے ہیں۔

شیخ الرئیس بو علی سینا وہ پہلا شخص ہے جس نے علم النفسیات کا تعلق علم طب سے ثابت کیا اور تمام امراض نفسانیہ مثلاً "غم اور ہم" (تفکرات) نفرت ومحبت، بغض وعداوت اور غیظ وغضب کا مرکز قلب کو قرار دیا اور اس کی ساخت اور مختلف قسم کی رطوبات و اخلاط کو نفسیاتی کیفیات کا سبب قرار دیا جن کی اصلاح ادویات کے ذریعے ممکن ہے۔

ہماری نفسیاتی صحت کا بڑا گہرا تعلق قلب کی حرکت و کیفیت سے ہے۔ نظام عصبی کے ذریعے قلب کا فعل متعین رہتا ہے اگر اس نظام میں فتور واقع ہو جائے تو قلب پر فوراً اثر پڑتا ہے ہمارے جذبات جس طرح دماغ پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح

* ایم۔ ڈی اسکالر۔ شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ۔

قلب کو بھی متاثر اور مغلوب کرتے ہیں۔

زیر نظر مضمون غم اور ہم (تفکرات) کے ماہیت کی بحث کلیاتی ہے جو کہ ارواح کی بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا اب ہم ارواح کی بحث کی روشنی میں غم اور ہم کی وضاحت کریں گے۔ ارواح کے ذیل میں امام طب علامہ ابن نفیس (۱۲۱۰ – ۱۲۸۸ء) لکھتے ہیں کہ یہاں پر روح سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جس کے متعلق ارشاد ربانی ہے "قل الروح من أمر ربی" بلکہ اس سے ہماری مراد وہ لطیف اور بخاری جسم ہے جو جسم کے لطیف اخلاط سے پیدا ہوتی ہے جس طرح کثیف اخلاط سے اعضاء۔ یہ لطیف اجزا چونکہ ہوائی شکل کے ہوتے ہیں اس لیے ارواح کہلاتے ہیں۔

جالینوس کا خیال تھا کہ کسی نہ کسی دن روح ہوا سے جدا کرلی جائے گی۔ چنانچہ جالینوس کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا اور سترھویں صدی عیسوی میں لیوائی زیر (Rere i Bzo Avara) نام کے ایک فرانسیسی کیمیا داں نے روح حیوانی کو ہوا سے جدا کر کے اس کا نام آکسیجن رکھا۔ اسی طرح ابو سہل مسیحی اور علامہ گیلانی کے اقوال سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ روح حیوانی دراصل آکسیجن ہے۔ جب کہ شیخ الرئیس بوعلی سینا کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ شیخ کا نظریہ یہ ہے کہ روح کے بننے میں بیرونی ہوا آکسیجن کے ساتھ اخلاط کا لطیف حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ یعنی مادہ روح دو چیزوں کا مرکب ہے۔

۱۔ اخلاط لطیفہ

۲۔ بیرونی ہوا (آکسیجن)

روح کی حرکت تمام عوارض نفسانیہ مثلاً غم اور ہم (تفکرات) نفرت و محبت لغض و عداوت کے تابع ہوا کرتی ہے۔ یہ حرکت روح یا تو قلب کی طرف ہوتی ہے یا قلب سے دور بیرونی اعضاء کی طرف ہوا کرتی ہے۔ جب روح باہر کی طرف حرکت کرتی ہے تو اندر برودت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی روح کی یہ حرکت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ روح یک لخت تحلیل ہو جاتی ہے جس سے اندر اور باہر دونوں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں غشی یا موت واقع ہو جاتی ہے۔

روح کی حرکت باہر کی طرف کبھی یک لخت ہوتی ہے جیسا کہ غصہ کی صورت میں اور کبھی آہستہ آہستہ جیسا کہ لذت اور معمولی خوشی کی صورت میں ہوتا ہے اور اسی طرح روح کی حرکت اندر کی طرف کبھی یک لخت ہوتی ہے۔ جیسا کہ خوف شدید کی صورت میں اور کبھی کبھی آہستہ آہستہ جیسا کہ غم اور ملال کی صورت میں ہوتا ہے۔

غم اور ہم (تفکرات) کی صورت میں روح ایک ہی وقت میں دونوں طرف (ظاہر و باطن) حرکت کرتی ہے۔ ایسا اس صورت میں ہوتا ہے کہ عارض نفسانی اس قسم کا ہو کہ ایک عارض کے ساتھ دو عارض شامل ہوں۔ مثلاً ہم (تفکرات) کے ساتھ کبھی غصہ آتا ہے اور کبھی غم طاری ہوتا ہے جس سے دو مختلف حرکتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

عوارضات نفسانیہ کے علاوہ کیفیات نفسانیہ بھی ہوتی ہیں جن سے کہ بدن متاثر ہوا کرتا ہے۔ مثلاً تصورات نفسانیہ جن کو تخیلات بھی کہتے ہیں ان خیالی اور ذہنی تصورات سے بھی جسمانی عوارضات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی غیر شخص ترشی کھا رہا ہو اور اس سے دوسرے شخص کے دانت کھٹے (کند) ہو جائیں۔ یا کبھی کسی غیر کے درد کو دیکھ کر اسی قسم کا درد دیکھنے والے کے عضو میں ہو جانا یا نکسیر والوں کو سرخ چیزوں کی طرف دیکھنے سے نکسیر کا جاری ہو جانا۔

کبھی کبھی کسی ڈرانے یا خوش کرنے والی چیزوں کے تصور سے بھی مزاج بدل جاتا ہے۔ جیسا کہ رازی کی ایک حکایت سے واضح ہوتا ہے۔ طبیب اعظم محمد بن زکریا رازی امیر منصور کے علاج کے لیے جو کہ وجع المفاصل (Rheumatic Arthritis) میں مبتلا تھا، ماوراء النہر پہنچا اور علاج شروع کیا۔ علاج میں کامیابی نہ دیکھ کر اسے ایک تدبیر سمجھ میں آئی۔ رازی امیر کو شہر کے باہر ایک گرم حمام میں غسل کرانے کے لیے لے گیا۔ حمام میں داخل ہوا اور امیر کے جسم پر پانی کی دھاریں ڈالیں اور ایک دوا پلائی جس سے کہ جسم کے فضلات اور رطوبات میں نضج پیدا ہو گیا جیسا کہ رازی بیان کرتا ہے اس کے بعد رازی باہر گیا اور امیر کو ڈرانے کی خاطر ایک چاقو ہاتھ میں

نے کہ حمام میں قاتل چھا اور امیر کو گالی دے کر کہنے لگا کہ او نابکار کیا تو نے میری جان لینے کی سازش نہیں کی تھی۔ اب اگر انتقام میں تجھ کو ہلاک نہ کردوں تو میرا نام محمد بن زکریا رازی نہیں۔ یہ سن کر امیر اور خوف کی وجہ سے بے قابو ہو گیا۔ رازی اُسے غصے میں دیکھ کر فوراً حمام سے باہر نکل آیا اور رے کے لیے بھاگ نکلا اور وہاں پہنچ کر امیر کے نام ایک خط لکھا:

"خدائے برتر بادشاہ کی زندگی مع صحت واقبال دراز کرے۔ میں نے اپنے وعدے کے مطابق اپنی انتہائی توجہ اور قابلیت کے ساتھ آپ کا علاج کیا ہے۔ اب میرے علاج کی بھی کیفیت سنیے — حقیقت یہ ہے کہ آپ کی حرارت غریزی ضعیف تھی۔ اس لیے میں نے علاج دوائی کو توچھوڑا اور اس کی جگہ آپ کے لیے نفسیاتی علاج اختیار کیا اور جب میں نے دیکھا کہ گرم حمام میں غسل کرنے کے بعد اخلاط فاسد میں پوری طرح نضیج (قابل اخراج) اور نرمی کی علامات پیدا ہو گئی ہیں تو پھر اچھی طرح سوچ سمجھ کر آپ کو اشتعال دلایا تاکہ آپ کی حرارت غریزی میں اضافہ ہو کر اتنی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ پوری طرح جسم کے نضیج یافتہ اخلاط کو تحلیل کر سکے۔ اب یہ امر خلاف مصلحت ہے کہ آئندہ ہم ایک دوسرے سے ملیں۔"

ادھر جب امیر کا غصہ فرو ہوا تو اس کو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ صحت یاب ہو چکا تھا اور اب باآسانی چل پھر سکتا تھا۔ لہٰذا امیر نے خوش ہو کر بہت سے تحائف رازی کو بھیجے اور آئندہ کے لیے ...۲ دینار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ ہر سال ۲۰۰ خروار اناج رازی کے گھر بھجوا دیا جایا کرے۔

مندرجہ بالا حکایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خوف اور غصہ کے ذریعے رازی دراصل حرارت غریزی کو برانگیختہ کر کے اخلاط فاسدہ کی اصلاح کے ذریعہ سوء مزاج یا مزاج میں تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔

علامہ قریشی نے بھی اسی سلسلے کی ایک حکایت بیان کی ہے کہ "کچھ لوگوں نے سفر کیا جو دموی مزاج تھے، راستے میں ان کو چوروں کی ایک جماعت مل گئی جس نے بعض مسافروں کو لوٹا اور بعض کو قتل کیا۔ چنانچہ ان میں سے جو بچے وہ دموی سے سوداوی مزاج ہو گئے"۔ (گیلانی)

جس طرح نفس بدن سے متاثر ہوتا ہے، اسی طرح بدن بھی نفس سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی کے ضمن میں بقراط کے اس قول سے تقویت ملتی ہے کہ "اخلاط کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے"۔ کیونکہ جو مزاج اور جو اخلاط بدن میں غالب ہوتا ہے وہ اپنے مناسب نفس میں اخلاق پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جب خشکی یا سوداوی خلط غالب ہو جاتی ہے تو خوف اور وحشت اور برے تخیلات پیدا ہو جاتے ہیں اور جب صاف اور بہترین خون کی زیادتی ہوتی ہے تو فرحت اور سرور حاصل ہوتا ہے اور حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور جب مزاج میں حرارت اور صفراء کی زیادتی ہوتی ہے تو نفس میں بہادری اور تیزی آجاتی ہے اور جب رطوبت اور بلغم زیادہ ہو جاتا ہے تو بزدلی، کاہلی اور سستی پیدا ہو جاتی ہے۔

انسان کے قلب کو جذباتی اور جسمانی عوارضات سے درست رکھنے کے لیے دو چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ پہلی چیز یہ کہ دل میں غبار اور بھڑاس کو مجتمع نہ ہونے دیں بلکہ اسے کسی ہمدرد یا ہمراز سے ذکر کر کے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کریں اس سے شعوری یا لاشعوری طور پر جو چیزیں صحت پر اثر انداز ہو رہی تھیں ان سے جسم محفوظ ہو جائے گا۔ قلب کو درست رکھنے کا دوسرا راز جسمانی توانائی ہے اس کے لیے ورزش، سیر و تفریح ضرور کرنا چاہیے۔ اس سے دل جو بیمار رہنے لگا تھا تازگی محسوس کرے گا۔ ورزش کا بدل قلب کے لیے کوئی دوسری دوا یا غذا نہیں ہو سکتی اور اس سے دماغی تفکرات میں بھی کمی ہوتی ہے۔

تفکرات جسم انسانی میں کاہلی، سستی اور نڈھال پیدا کرتے ہیں اور جسمانی حرکات اور تفریح ایک قسم کا تریاق ہے۔ تشویش اور تفکرات کے ردعمل کا مقابلہ کرنے میں سب سے زیادہ زود اثر چیز جو تمام جسم انسانی کو متاثر کرتی ہے سانس کی مشق ہے۔ یہ قلب اور جملہ اعصاب کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ دل کی حرکت کو منظم، جذبات کو برقرار رکھنے اور ضابطے میں لانے کے لیے ایک گہرا سانس لینا اور ناک کے راستے باہر نکال دینا بہت عمدہ مشق ہے۔ جس قدر لمبا اور گہرا سانس ہو گا اتنا ہی بہتر ہو گا۔ اس سے دماغ میں تازگی، اعصاب کی حس و حرکت میں نظم اور قلب میں درستی اور دیگر فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۳ (مارچ ۱۹۸۹ء)

اسرار حسین*

پروفیسر مائیکل 'ہکلانے' پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کی تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ہکلانا کوئی بیماری نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہکلانے والا شخص بات کرتے وقت سانس کو اندر کی طرف کم لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ بات کرتے وقت اگر ہوا کو اندر لے جانے پر قابو کرلیں تو یہ جسمانی پریشانی بہت ہی آسانی سے دور ہوسکتی ہے۔

شوہر اور بیوی میں کس حد تک محبت ہے اس کو معلوم کرنا بہت آسان ہے۔ ڈاکٹر رسل کریّن جو برہم یونیورسٹی کے ایک مشہور و معروف سائنس داں ہیں۔ انھوں نے ایک عجیب وغریب طریقہ ایجاد کیا ہے جس سے شوہر اور بیوی کے بیچ کتنی محبت ہے بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر کریّن کے مطابق ایک خوش وخرم ازدواجی زندگی گزارنے والے جوڑے کے بیچ کی دوری ۵ر۲۸ سینٹی میٹر ہوتی ہے اور اس کے برعکس ناخوش رہنے والے جوڑوں کے بیچ کی دوری ۵ر۲۹ سینٹی میٹر یا اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی نے 'ڈونا پاینلا' گوا میں ہندوستان کا سب سے پہلا کمپیوٹرائزڈ آٹومیٹک ویدر اسٹیشن قایم کیا ہے جس سے ۲۴ گھنٹے کے اندر واقع ہونے والے موسم میں تبدیلی کی جان کاری معلوم کی جاسکے گی۔ جیسے ہوا کی رفتار و سمت، ہوا کا درجۂ حرارت، ہیومڈٹی (نمی)، بیرومیٹرک دباؤ وغیرہ جیسی دوسری جان کاری معلوم کی جاسکتی ہے۔

شیرخوار بچوں اور ان کی خوراک سے متعلق بہت سے سائنس داں اپنے اپنے تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک اطلاع کے مطابق نوزائدہ بچّے کو عموماً دو سال تک ماں کے دودھ پر ہی منحصر رکھنا چاہیے اور اس کے بعد کچھ دوسری سالڈ غذا دینا زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسا دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے بچے جنھوں نے دو سال تک ماں کا دودھ پیا ہے وہ صحت مند پائے گئے ہیں۔

چلڈرن ہاسپٹل میں سن فرانسسکو کے ڈاکٹر مائیکل کیٹز کے مطابق پری میچور بچوں کی پیدائش کے بارے میں جان کاری حاصل کرنے کے لیے ایک نیا آلہ ایجاد کیا ہے۔ اس آلہ کا نام ٹوکوڈائنو میٹر ہے۔ اس آلہ کو حاملہ عورت کے پیٹ پر باندھ دیا جاتا ہے اور اس سے یوٹیرین کنٹرکشن کو نوٹ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی حاملہ عورت کے یوٹیرین کنٹرکشن فی گھنٹہ چھ بار سے زیادہ ہو تو اس عورت کو پری میچور بچے کی پیدائش کی بہت حد تک امید ہوتی ہے۔

---

* لیکچرر، یونیورسٹی پالی ٹیکنک، اے ایم یو، علی گڑھ، یوپی

یوروپین سائنس داں آج کل ایک ایسا کمپیوٹر بنانے میں مصروف ہیں جو انسان کی طرح سوچ و سمجھ سکے اور اپنی غلطیوں کو خود ٹھیک کر سکے۔ سائنس دانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ اس طرح کے کمپیوٹر بنانے میں بہت جلد کامیابی حاصل کر سکیں گے۔

ایک اطلاع کے مطابق کورونری ہرٹ ڈیزیز کے مسئلے کو مچھلی کھانے سے بھی روکا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ مچھلی خون میں کولسٹرال کے مادّے کو بننے سے روکتی ہے۔ اگر ہفتہ میں چار یا چھ مرتبہ مچھلی کا استعمال کیا جائے تو کورونری ہرٹ کی بیماری سے بہت حد تک نجات پائی جا سکتی ہے۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ کے سائنس داں ڈاکٹر مائیکل جسلوف نے مینڈک کی کھال سے ایک خاص قسم کا اینٹی بائیٹک نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

ایک جاپانی کمپنی ٹاکیڈا کیمکلس انڈسٹریز لمیٹڈ نے نئی طرح کی دوا تیار کی ہے جس کے استعمال سے پستان کے سرطان (کینسر) و پروسٹریٹ کینسر کو روکنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس دوا کا نام لیوپرولائٹڈ ایسیٹیڈ رکھا گیا ہے لیوپرولائیڈ ایسیٹیڈ جو نو امینو ایسڈ سے بنے پیپٹائڈ کی شکل میں ایک ہارمون ہے جو سرطان کے مریضوں کے لیے ایک قدرتی عطیہ ثابت ہوگی۔

ملیریا سے نجات پانے کے لیے ایک نئی دوا ملسن ایجاد ہوئی ہے، جس کے استعمال سے ۴۸ گھنٹے کے اندر ملیریا جیسی مضر بیماری سے چھٹکارا مل سکتا ہے دنیا میں ہر سال تقریباً ۲۰ کروڑ انسان اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔

اس دوا کی صرف چھ گولیوں کو کھانے سے اس بیماری سے نجات مل سکتی ہے۔ اس دوا کے کھانے سے کسی طرح کا بُرا اثر بھی نہیں ہوتا ہے۔

"ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ بس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لادیں۔"

سرسیدؒ
(منتخب مضامین سرسید)

مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ ثقافت ... — چھپی ... دہلی ... پرنٹنگ پریس، دہلی

"آج
جب کہ ہمارے
زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی ادارے
ابتری کے سیلاب میں
ڈوب رہے ہیں،
یہ دیکھ کر بڑی
تقویت ہوئی کہ ملک
میں علی گڑھ جیسے
شائستگی، تہذیب اور
ڈسپلن کے چند جزیرے بھی
موجود ہیں"

پروفیسر رمیش موہن
سابق وائس چانسلر میرٹھ یونیورسٹی

اپریل ۸۹ء

تین روپیہ

ادارہ
تہذیب الاخلاق
اینڈ
نشانات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اغراض و مقاصد

۱. جہل، رجعت پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد۔ ذہنی بیداری، روشن خیالی اور مرلوط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔

۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت۔

۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔

۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔

۶. سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷. علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلئے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابیں برائے تبصرہ شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ ٹائپ شدہ یا 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر شدہ ہونے چاہئے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالوں میں وضاحت کے لیے دی جانیوالی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ تصویریں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنیوالے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

سرپرست : جناب ...
وائس چانسلر ... الاخلاق ...

ایڈیٹر : ... ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : ...

ترتیب : ...

مندرجات

کی خوشنودی حاصل ہو اور تقوے کی پاکیزہ صاف ستھری زندگی گزار سکوں ----
-----علوم و فنون کی حیثیت بحر ذخار کی ہے، علم و فن کے اس بحر ذخار میں آخر
میں گھس پڑا۔ بہت غوطے لگائے مگر اس کی تھاہ نہ ملی اور منزل دور ہی نظر آئی"

ابن الہیثم کی درج بالا تحریر کی آخری دو سطروں کا موازنہ نیوٹن کے درج ذیل قول سے کیجیے:

"مجھے اس سے غرض نہیں کہ لوگ میری بابت کیا رائے رکھتے ہیں۔ اپنے طور پر میں
خود کو ایک ایسے بچے کی مانند محسوس کرتا ہوں جس کے سامنے علم کے خزانوں سے بھرا
ایک سمندر پھیلا ہوا ہو اور جو کناروں کے سنگریزوں کو چن کر دل بہلا رہا ہو"

کتنی مماثلت ہے ابن الہیثم اور نیوٹن کے اقوال میں۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس بات کو نیوٹن نے سترھویں صدی عیسوی میں کہا وہ بات ابن الہیثم گیارھویں صدی عیسوی میں کہہ چکا تھا۔

آج ہمارے درمیان الازہر بھی ہے اور الازہر کے ہم پلہ سیکڑوں اور درسگاہیں بھی۔ ان درسگاہوں میں حجرے بھی ہیں اور حجرہ نشین بھی لیکن افسوس کہ ان میں کوئی ابن الہیثم نہیں۔ پچھلی کئی صدیوں کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے بڑے بڑے خطیب، بڑے بڑے انشاء پرداز اور بڑے بڑے شاعر تو پیدا کیے لیکن کوئی ابن الہیثم نہ پیدا کر سکے بجز ایک عبدالسلام کے۔ ہم شاید تاریخ کا یہ سبق بھول گئے ہیں کہ کسی قوم کی قسمت کو الفاظ سے کھیلنے والے نہیں بنایا کرتے بلکہ وہ افراد بناتے ہیں جو کائنات کی ٹھوس حقیقتوں سے کھیلتے ہیں۔

اسرار احمد

بہت کم لوگ ہیں جو اس کی حقیقت جانتے ہوں اور بہت کم ہیں جو اس کے مشتقات کے معزز القابوں کے مستحق ہوں جن کی لوگ بہت زیادہ آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اس کو لوگ معزز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے۔ دولت، حکومت، ظاہری طمطراق خواہ نخواہ لوگوں کو معزز بنا دیتی ہے اور وہ خود بھی آپ کو معزز سمجھتے ہیں اور لوگ بھی ان کو معزز جانتے ہیں۔ اوصاف ظاہری بھی ایک ذریعہ معزز ہونے اور معزز بننے کا ہے جو دولت اور حکومت اور حشمت سے بھی زیادہ ان کو معزز بنا دیتا ہے۔ مگر یہ اعزاز اس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا جیسے کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو۔ اس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر و قیمت کے لائق نہیں ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک اس کی اندرونی حالت بھی عزت کے قابل نہ ہو وہ معزز نہیں ہو سکتا۔ لوگوں کو کسی انسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل اور قریب ناممکن کے ہے۔ پس ان کا کسی کو معزز کہنا درحقیقت اس کے معزز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ ہاں وہ شخص بلاشبہ معزز ہے جس کا دل اس کو معزز جانتا اور معزز سمجھتا ہو جس کو انگریزی میں سیلف ریسپکٹ کہتے ہیں۔ کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچی بات بنا کر کہتا ہے تو خود اس کا دل اس کو ملامت نہ کرے یہ کافی نہیں ہے گو مخاطب اس کو سچ سمجھتا ہو مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹ [illegible] ایک جھوٹا اور بے عزت [illegible] ایک [illegible] ہے

[illegible]

طور پر کیے جاتے ہیں گو لوگ ان کی عزت کرتے ہوں مگر درحقیقت وہ عزت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزت کے لائق وہی کام ہیں جن کو دل بھی قابل عزت سمجھے۔ اس لیے انسان کو انسان بننے کے لیے ضروری ہے کہ تمام اس کے کام سچائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں جس کو ہمارا دل جھٹلاتا ہو۔ کسی سے ہم اظہار دوستی اور محبت کا نہ کریں، اگر درحقیقت ہمارے دل میں اس سے ویسی ہی محبت اور دوستی نہ ہو جیسی کہ اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کو ہمارا دل اچھا نہ سمجھتا ہو۔ صلح کل ہونا اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ سب سے اس طرح ملیں کہ ہر شخص جانے کہ یہ میرے دوست ہیں تو یہ تو نفاق اکبر ہے اور ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اس کا دوست ہوتا ہے اور اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ کسی سے بغض، عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھے کسی کا برا نہ چاہے۔ دشمن کی بھی برائی نہ چاہے وہ بلاشبہ تعریف کے قابل ہے۔ دل انسان کا ایک ہے۔ اس میں دو چیزیں یعنی عداوت کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو، اور محبت سما نہیں سکتیں۔ وہ ایسا کوئی ظرف نہیں ہے جس میں دو خانے ہوں۔ ایک محبت کا ایک عداوت کا اور [illegible] یہ دو چیزیں گو اشخاص متعدد اور حیثیات مختلفہ کے ساتھ کیوں نہ ہوں، سما نہیں سکتیں۔ اس لیے انسان کو لازم ہے کہ محبت کے [illegible] دوسری چیز کے دل میں آنے کا خیال نہ کرے [illegible] زندگی ہے۔

سید حامد*

بغیر بنیاد کے جو عمارت اٹھادی جائے وہ زیادہ دیر نہیں ٹکتی۔ وہ خبریں، وہ افواہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی، چند روز گشت کرتی ہیں، پھر دروازے سے اس طرح نکل جاتی ہیں کہ ان کے نقش پا تلاش کیجیے تو نگاہیں ناکام واپس لوٹیں گی۔ اس میں بڑی مصلحت ہے قدرت کی، ورنہ راست رو اور جری اور قبولیت نا طلب انسان زندگی بھر بدنامی میں گزارتے اور تاریخ بھی ان کے ساتھ انصاف نہ کرپاتی اور پھوہڑ بھرپھرے اور ہٹ دھرم انسانوں کے علاوہ کوئی راست روی، حق گوئی اور حق پروازی کی ہمت نہ کرتا۔ ہمارے پیدا کرنے والے نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ زبانوں سے جو بری اور ناپاک باتیں نکلی ہیں، ان کا تصفیہ ہوتا رہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ بہتا ہوا پانی پاک مانا جاتا ہے، حالانکہ گندگی کو اس میں پہنچنے سے روکا نہیں گیا ہے۔ بہتے ہوئے پانی میں خود کو صاف کرنے کی طاقت پنہاں ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بند پانی سے فساد کی بو آتی ہے۔ گویا جو سماج یا بستی اپنے آپ کو زندگی کی لہر سے کاٹ لیتی ہے وہ بند پانی کی طرح آلودہ ہو جاتی ہے، تعفن اس کی فضا کو مکدر کر دیتا ہے۔ قلعہ بند ہو کر یا پاؤں پسار کر بیٹھ جانے میں بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایسے لوگ زندگی کے کارواں میں شرکت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ زندگی کے قافلے سے الگ ہیں وہ زندہ تو ہیں، زندگی کی ماہیت سے بے خبر اور راس پیش قدمی سے جس کا نام زندگی ہے، محروم ہو جاتے ہیں۔

اسلاف اس بنیادی حقیقت سے واقف تھے۔ سفر کو انھوں نے تعلیم کا لازمی جزو بنا لیا تھا؛ برکت کو وہ حرکت کا ہم وزن ہی نہیں ہم معنی بھی سمجھتے تھے۔ ذہن اور روح سے اگر جسم کی طرف آیئے تو پتہ چلے گا کہ جسم کی صحت کا اعضا کی ورزش کے ساتھ براہ راست تعلق ہے اور ٹانگوں کو تو جدید اطبا دل کا رفیق بلکہ عدیل اور مثیل مانتے ہیں۔ ایک دوران خون کا منبع ہے تو دوسرا معاون۔ جو لوگ ٹانگوں اور ذہنوں کو خاطر خواہ حرکت دیں گے وہ کسی قلعے یا بستی یا کسی طلسم خانہ اوہام کے اسیر ہو کر نہیں رہ سکتے۔ ان کی رگوں میں تندرستی اور صحت فکر کا خون گردش کرتا رہے گا۔

گندگی یا غلاظت اگر کسی ندی میں ڈال دی جائے، جیسا کہ ہماری ساری ندیوں کے [illegible] ہو رہا ہے، تو اس کا پانی اس غلاظت سے لڑ کر اسے زیر کر لے گا، فنا کر دے گا۔ ہمارے بدن میں خون بھی تو یہ کام کرتا ہے۔ غلاظت اور فاسد اور فالتو مادہ کو گوشوں اور کونوں سے نکالتا ہے، لے بہالے جاتا ہے اور اعضائے رئیسہ کی مدد سے اُسے جسم سے باہر نکال پھینکتا ہے۔ خون اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہے؛ جن سیلوں یا خلیوں سے جسم بنا ہے لہو ان کو غذا پہنچاتا ہے لیکن فاسد مادہ اگر بہت بڑی مقدار میں کسی ندی میں ڈال دیا جائے تو وہ بہتے ہوئے پانی کے مصفی اثرات یا اس کے ان کارکنوں کو جو تصفیہ کرتے ہیں نااہل اور معطل کر دیتا ہے۔ ہمارے ملک کی ندیاں اس

---

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ———— ہمدرد نگر، نئی دہلی۔

وقت اسی مصیبت سے دو چار ہیں۔ خون میں کبھی غلاظتیں بڑھ جائیں اور
رگوں کے اندر جمنے لگیں تو دل لڑکھڑانے لگتا ہے اور بالآخر جھٹکے کے ساتھ
اپنی حرکت بند کر دیتا ہے۔

بالکل اسی طرح اگر کوئی سوسائٹی افواہوں، دروغ بافیوں،
ہرزہ سرائیوں اور بہتانوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہے اور تہمت
اور جھوٹ کے ماحول میں سانس لینے لگتی ہے تو اس کے افراد جھوٹ
کو قبول اور بے بنیاد باتوں کو باور کرنے لگتے ہیں اور سچی باتیں ان کے
ذہن کے تالو کو پھیکی، سیٹھی، بے کیف، بے مزہ لگنے لگتی ہیں اور اگر
سماج نے اپنے آپ کو کال کوٹھری میں بند کر لیا ہے جہاں ہوا اور روشنی
کا گزر بھی نہیں تو سچائی اور صحت فکر کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔
اب یہ کہنے کی شاید چنداں ضرورت نہیں کہ اس بات کا اطلاق ہمارے وطن
اور اس کا انطباق ہماری ملت پر ہوتا ہے۔ یعنی ہمارا ملک ایک حد
تک اور اس ملک میں ہماری ملت ہو بہو اسی حالت میں ہے۔ جو لوگ
حقیقت کی بنیاد سے اپنا ناتہ توڑ لیتے ہیں ان کے پاؤں زمین پر نہیں
رہتے وہ فضا میں لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں؛ ان کی گرفت حقائق پر
نہیں رہتی۔ وہ اصل سے بیگانہ ہو جاتے ہیں؛ انھیں ڈھونڈنے نکلیے
تو وہ اصل کی زمین پر نہیں ملیں گے، فروعات سے الجھے ہوئے نظر آئیں
گے جڑ اور تنے سے بہت دور، وہ ٹہنیوں پر ٹنگے ہوئے دکھائی دیں
گے پھر ہوا میں اس عنوان پرواز کرتے ہوئے ملیں گے کہ زمین پر
دوبارہ قدم رکھنے کا امکان باقی نہ رہے۔ آپ ہی سوچیے۔ ایسی
زندگی کتنی گریز پا ہوگی اور کس قدر شکست پیشہ۔ ذرا سا دھکا لگا
اور چکنا چور۔

بے بنیادی کی بیماری خبروں اور افواہوں تک محدود نہیں رہتی
جب یہ کسی معاشرہ کی تعلیم اور تربیت کے نظام میں سرایت کر جاتی ہے
تو معاشرے کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ پڑھے لکھے خوشحال، متوسط طبقے کے
مسلمان اپنے بچوں کو اس طرح اٹھا رہے ہیں کہ انھیں نہ نظام فکر کے لیے
بنیاد ملتی ہے نہ عقیدے کے لیے۔ ہماری نئی پیڑھیاں، خصوصاً اونچے
اور درمیانی طبقے کے بچے عقاید کی بنیاد اور ان کی مبادیات سے بے نیاز
اور بے بہرہ ہیں۔ ابتدائی تعلیم اور تربیت اگر صحیح اور سرسری ہوتی

ہے تو سطحیت قدم پکڑ لیتی ہے اور زندگی بھر ذہنی طور پر آگے نہیں بڑھنے
دیتی۔ ان بچوں کے ذہن چونکہ زمین سے طاقت اور نشو و نما نہیں پاتے
اس لیے زندگی بھر پراگندہ رہتے ہیں، ان کا ذہن بھٹکا رہتا ہے۔ کسی
مسئلے پر وہ جم کر غور و فکر کر ہی نہیں سکتے۔ بے دلی اور [illegible]
کے مزاج کا جزو بن جاتی ہے، بے یقینی اور تشکک لوردی کو وہ لوگ
خو بنا لیتے ہیں۔ وہ اچٹتی ہوئی نظر زندگی پر ڈالتے ہیں اور حیات و
کائنات سے اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں۔ ان میں نہ اعتماد پیدا ہوتا
ہے نہ فکر کی صلابت اور تسلسل، نہ یقین کا جلال و جمال۔

قارئین شاید جانتے ہیں کہ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی ملک گیر
تشہیر کے بعد وظائف کے لیے ذہین طالب علموں کو چنتی ہے۔ تحریری
امتحان لینے کے بعد ایک بورڈ انٹرویو کے لیے بیٹھتا ہے۔ امتحان دینے
والوں کو تو انٹرویو بورڈ سے کوئی روشنی نہ ملتی ہوگی لیکن بورڈ
کے ممبروں کو امیدواروں سے بصیرتیں اور آگاہیاں ضرور حاصل
ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف
علاقوں میں ہماری نئی نسل کیسی اٹھ رہی ہے۔ ہمارے بچے کیا جانتے
ہیں، ہمارے نونہال کیا سوچتے ہیں، ان کی آرزوئیں اور امنگیں
کیا ہیں۔ یہ بچے ایسے ہیں جیسے دودھ کو جوش دے کر اس میں سے
ملائی نکال لی گئی ہو۔ ان کے والدین ان کی تعلیم و تربیت پر خاص
توجہ دیتے ہیں۔ اکثر تو بچوں کے ساتھ ہمدرد نگر آ کر ٹھہرتے بھی ہیں
لیکن ان بے حد ذہین بچوں کی تعلیم و تربیت ہوا میں ہو رہی ہے۔ یہ
عزیز بنیاد سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایسی ناؤ ہیں لنگر نے
جنھیں چھوا نہ ہوا۔ لنگر کے بنا کوئی ناؤ ساحل پر رک نہیں سکتی یہی حال
ان نونہالوں کا ہے۔ ایک سال ایک طالبہ نے اپنے نام معراج (فاطمہ)
کے معنی "میرا راج" بتائے تھے۔ اس سال ایک طالب علم سے کہا گیا
کہ کلمہ پڑھے تو وہ بیچارہ نامراد بغلیں جھانکنے لگا۔ پھر بھی وہ اپنے
آپ کو کلمہ گو کہتا ہے اور اس کے والدین بھی اسے مسلمان سمجھتے ہیں۔
لیجیے عقیدے کی بنیاد تو پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ باقی کیا رہا ہے
بے اطمینانی، سراسیمگی، بے اعتمادی، بے محوری —— بنیاد سے
محرومی فی زمانہ ایک عالمگیر مرض ہے۔ ہندوستان میں کوئی فرقہ

بھی اس سے مختلف نہیں لیکن مسلمانوں کے یہاں یہ پوری شدت پر ہے۔

شمالی ہندوستان کے اُمیدواروں سے اردو کے بارے میں سوال کیا گیا۔ بیشتر بے نیاز اور بے التفات نکلے۔ ان میں سے بعض نے یہ بتانے کی جرات مندانہ کوشش کی کہ وہ اردو بولتے ہیں، کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں اور اپنا نام لکھ لیتے ہیں۔ لیجیے صدیوں کی پیش رفت کے بعد تان انتخاب دستخطوں پر ٹوٹی۔ ترقی معکوس کی یہ عبرت ناک شکل بھی دیکھنی تھی۔

دیکھیے ہماری نئی نسل کی دین اور زبان دونوں سے واقفیت بے بنیاد ہے۔ زمین پر ہمارے قدم مضبوطی سے نہیں ٹک سکیں گے۔ بنا محور کے ہم بھٹکتے رہیں گے۔ چونکہ ہم بنیاد سے بے نیاز ہو گئے ہیں اس لیے امور پر ہماری گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے اور جب ذہن کی پکڑ ڈھیلی ہو جاتی ہے تو تناسب، تناظر، انتخاب اور فیصلے کی صلاحیتیں باقی نہیں رہتیں۔ چنانچہ ہمارے رہنما سایوں کے پیچھے دوڑتے ہیں اور اہم ترین باتوں کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہیں۔ انھیں اس کی فکر نہیں کہ بچوں کی تربیت اچھی ہو، تعلیم درست ہو، انھیں زندگی کے سمندر میں بھیجنے سے پہلے ان کی ناؤ کو یقین کے لنگر سے لیس کر دیا جائے، ان کی گرفت عقاید پر بھی ہو اور فکر اور اظہار کی طاقتوں پر بھی۔ ہمارے رہنماؤں کو اس پر اصرار ہے کہ ان مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے جو آثارِ قدیمہ کی تحویل میں ہیں۔ انھیں اس کی ضد ہے کہ مغربی یوپی سے ایک جلوس لے کر چلیں جو اجودھیا کی بابری مسجد میں جا کر نماز پڑھے۔ چاہے اس مسجد پر غاصبانہ تصرف کرنے والے راہ میں اس جلوس کو تہ تیغ کر دیں۔ چاہے یہ کوشش ہی ماحول کو نہایت مکدر کر دے اور ہندوستان بھر میں فرقہ وارانہ عداوت اور تناؤ کی فضا پیدا ہو جائے۔ میں مزید مثالیں نہ دوں گا کہ اس قسم کے امور آنکھ جھپکاتے نزاعی بن جاتے ہیں۔ ہمیں ہر قدم پر نزاع سے بچنا ہے۔ اپنی حالت کا جائزہ ٹھنڈے دل سے لینا ہے اور اصلاح کی سمت میں قدم بڑھانا ہے۔

ہماری حالت دراصل یہ ہے کہ خوش حال اور پڑھے لکھے مسلمان اسلام سے بھی کٹ گئے ہیں اور ملت سے بھی۔ ان کو تربیت ہی اس طرح کی مل رہی ہے کہ اسلام اور اپنی میراث سے واقفیت کا کوئی چھینٹا بھی اُن کے ذہن اور حافظے کے دامن پر نہ پڑنے پائے۔ اُن کے "دانش ور" ان بپتاؤں سے بے خبر رہتے ہیں جو اُن پر پڑتی ہیں۔ وہ بالعموم خوشنودی اور کارگزاری کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اور خوشنودی حاصل کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے کہ عام مسلمانوں کی برائیاں، اور اُن کے بنیادی مفادات کو نظر انداز کرتے رہیں۔ بے بنیادی کے ہم بری طرح خوگر ہو گئے ہیں۔ لوگ اس عمارت کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں جن کی بنیاد کچی رکھی گئی ہو۔ اس عمارت کا کیا حشر ہو گا جس کی بنیاد رکھی ہی نہیں گئی، جو بے بنیاد ہے۔

"ہم ایک طرف قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی دنیوی کامرانیوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے قول و عمل سے اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ دنیوی کاموں سے دین کمزور ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی دنیوی کامرانیاں قابلِ فخر ہیں تو ہمارا یہ خیال کہ دنیاوی کاموں سے دین کمزور ہوتا ہے کیونکر صحیح ہوا۔"

سید ہاشم علی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ

محمد اسحاق*

کوئی بیس برس قبل کی بات ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر ایک آل انڈیا سیمینار جوبلی ہال میں ہوا تھا۔ اس میں ملک کی مشہور سوشل ورکر شریمتی درگا بائی دیشمکھ نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا تھا۔ مہاراشٹر کے کسی اسکول میں بھائی بہن دونوں چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ سالانہ امتحان میں بھائی فیل ہو گیا اور بہن کامیاب ہو گئی۔ دوسرے دن ان کی ماں اور باپ دونوں ایک درخواست کے ساتھ اپنی لڑکی کو لے کر ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچے اور خواہش کی کہ بہن کو فیل کر کے بھائی کو ترقی دی جائے، اس کے لیے بہن بھی راضی ہو چکی تھی۔

صالحہ عابد حسین نے مولانا الطاف حسین حالی کی مختصر سوانح حیات بچوں کے لیے لکھی ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ مولانا حالی اپنی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ کو بہت چاہتے تھے۔ جب وہ چھوٹی سی تھیں تو اس وقت پانی پت میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا۔ انھیں بس قرآن شریف پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ لکھنا سیکھنا تو "لڑکیوں کے لیے بہت برا سمجھا جاتا تھا مگر وہ لکھنے پڑھنے کی شوقین تھیں۔ یہ توے کی کالک کی سیاہی اور لکڑی کے ٹکڑے کا قلم بنا کر چھپ چھپ کر آسان اردو کی کتاب سے نقل کر کے لکھنا سیکھ گئیں۔ ایک دن ان کی دادی (حالی کی بھاوج) نے دیکھ لیا۔ خفا ہوئیں اور حالی سے کہنے لگیں:

"مبارک ہو۔ اب تمھاری لڑکی خط پتر لکھا کرے گی
جب خاندان کا نام روشن ہوگا۔"

حالی نے سنا تو ہنس پڑے۔ اس لڑکی کو خود لکھنا سکھایا، پھر اس کے بعد خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج ہوا۔ یہ بات کوئی ایک سو برس پہلے کی ہے۔ "نئی تعلیم پھیلانے کا کام سرسید نے کیا لیکن مسلمان لڑکیوں میں تعلیم پھیلانے کا کام حالی نے شروع کیا۔" اس زمانے میں اکبر الٰہ آبادی آزادیٔ نسواں اور تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ ان کے اکثر اشعار میں لڑکیوں کی تعلیم و ترقی پر گہرا طنز موجود ہے۔

حامدہ چمکی نہ تھی تعلیم سے بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی بارہ تا پندرہ کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ان کی نصف آبادی ۴۹ فیصد عورتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں پڑھی لکھی عورتیں صرف ایک فیصد ہیں اور مسلمان مردوں میں ۱۹ فیصد پڑھے لکھے ہیں۔ اس طرح جملہ ۲۰ فیصد آبادی پڑھی لکھی ہے اور ۸۰ فیصد ناخواندہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں علم و عقل کا ۸۰ فیصد خطہ ابھی تک بنجر ہی رہ گیا ہے۔ یہ بات نہایت افسوسناک ہے کہ ہماری نصف آبادی کو پڑھنے لکھنے سے دور رکھا گیا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ سیکڑوں برس سے ہماری بے دلی، بے توجہی اور بے حسی کا شکار رہا ہے۔ آج بھی اگر آپ اکثر ماں باپ سے لڑکیوں کی تعلیم پر گفتگو کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کے لیے تعلیم کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

---

* ریٹائرڈ پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد

ہم کیوں نہیں پڑھاتے

اوپر کی دو مثالوں سے یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ ہی نرالا ہے اور پھر زمانہ قدیم سے جو روایات چلی آرہی ہیں وہ تو لڑکیوں کی تعلیم میں زبردست رکاوٹ ہیں۔ جس طرح ہم لڑکوں کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں اور اُن پر جو کچھ روپیہ خرچ کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں ویسا اپنی بیٹی کے لیے نہ تو تیار ہیں اور نہ ضروری سمجھتے ہیں۔ چند ایک وجوہات تو ہم سب جانتے ہیں۔

۱۔ لڑکی کی روزِ پیدائش ہی سے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ اس پر جو کچھ خرچ ہوگا، وہ سب پرایا ہے۔ اصل کام تو اس کی پرورش ہے اور بڑی ہو جائے تو شادی ہو کر دوسرے گھر چلی جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

۲۔ چند لڑکیوں کا حال ہمیں معلوم ہے۔ وہ چھٹی اور ساتویں جماعت تک تو بہت تیزی سے پڑھتی گئیں، اس کے بعد اسکول سے غائب رہنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ گھر میں چھوٹے بھائی بہنوں کا اضافہ ہو گیا ہے، ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ان بڑی بہنوں کو لگ گئی ہے۔ رفتہ رفتہ اسکول چھوٹ گیا۔ خاندان میں افراد کی زیادتی سے گھر بار اور چولھے کا کام بڑھ گیا۔ ماں کا ہاتھ بٹانے کے لیے بڑی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ پس اُن کی تعلیم پر بریک لگنا شروع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بہت کم میٹرک کی سطح تک پہنچ پاتی ہیں۔

۳۔ ساتویں، آٹھویں جماعت تک پہنچتے تک لڑکیاں سیانی ہو جاتی ہیں۔ مائیں گہری سوچ میں پڑ جاتی ہیں۔ یہ زمانہ تعلیم کے ترک کرنے یا جاری رکھنے کے لیے فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ جاتا ہے

۴۔ آج کل تعلیم پر اخراجات بھی کافی ہوتے ہیں۔ اسکول کی فیس، سواری کا خرچ، مہنگی کتابیں کاپیاں، یونیفارم پر کافی خرچ آتا ہے۔ جس خاندان میں چار یا پانچ بچے ہوں تو ترجیح لڑکوں کی تعلیم پر دی جاتی ہے۔ غریب خاندانوں میں لڑکیاں کچھ نہ کچھ محنت مزدوری کر کے سات آٹھ سال کی عمر ہی سے آمدنی میں اضافہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ متوسط طبقے میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ لڑکی کی تعلیم کے اخراجات کس حد تک برداشت کیے جائیں۔ اگر زیادہ قابل بھی بنا دیں تو پھر سسرال ہی کا فائدہ ہے۔

۵۔ جن گھروں میں کچھ فراغت ہے وہاں پر بھی میٹرک، انٹر کے بعد لڑکیوں کی تعلیم پر بریک لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اب فکر ان کے ہاتھ لال پیلے کرنے کی ہوتی ہے۔ اگر کہیں پیام طے نہیں ہوا ہے تو اُن کی تعلیم ویٹنگ روم میں انتظار کرنے کی ہوتی ہے۔ کسی وقت دولھا آیا اور دوسری ٹرین سے انھیں ساتھ لیتا گیا۔ چاہے گریجویشن کا امتحان مہینہ دو مہینہ ہی رہ گیا ہو۔ یہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ سچ یہ ہے کہ پھر کبھی نہیں دیکھا جائے گا۔

لڑکیوں کی تعلیم کیوں ضروری ہے۔

جہاں تک لڑکیوں کی تعلیم اور ذہانت کا تعلق ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ فطرتاً لڑکیاں زیادہ محنتی اور زیادہ دلچسپی سے پڑھنے والی ہوتی ہیں تعلیم میں انہماک قابلِ داد ہوتا ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے بہت رشک کرتی ہیں۔ اس لیے شاید مقابلے کی اسپرٹ بہت کام کرجاتی ہے۔ وہ اکثر لڑکوں کے مقابلے میں تعلیم میں بہت آگے رہتی ہیں۔ حال ہی میں، تعلیمِ نسواں کے سلسلے کے ایک سیمینار میں وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے بتایا کہ یونیورسٹی میں ۲۰ فیصد طالبات ہیں، لیکن گولڈ میڈل پانے والوں کی فہرست میں ۷۰ فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں۔

لڑکیوں کو ان پڑھ اور جاہل رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پھلدار درخت ساری عمر پھول اور پھل سے محروم رہ گیا ہو۔ ایک لڑکی کی تعلیم سے پورا خاندان روشن ہو جاتا ہے۔ وہ جس گھر میں جائے گی عزت پائے گی۔ اپنے بچوں کو گھر پر پڑھا سکے گی، خاندان کے بچوں کی رہبری کرے گی۔ ہمارے تجربے میں یہ بات آئی ہے کہ جو لڑکیاں بی۔ ایڈ کامیاب ہو گئیں ان کے جلد جلد بیاہ ہو گئے۔ ان کی وجہ سے خاندان کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ نئے گھر نئے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی صلاحیت اپنے میں پاتی ہیں۔ بہت جلد اس گھر میں باعزت مقام پیدا کر لیتی ہیں۔ پڑھی لکھی بہو سارے

خاندان میں ایک جگمگاتا چراغ ہے۔ صورت شکل کے ساتھ، پڑھی لکھی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں بات کرنے کا سلیقہ، تہذیب و شائستگی اور خود اعتمادی ان کی شخصیت کو چار چاند لگاتی ہیں۔ جو لڑکیاں پڑھی لکھی نہیں ہوتیں گو خوب صورت ہی کیوں نہ ہوں، اکثر انھیں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ ابھی تک کسی سنجیدگی کے ساتھ ملک میں تحریک کا مقام حاصل نہ کر سکا اور اس سلسلے میں ہمارے ذمہ دار لیڈر، رہنما، دانش ور اور درد مند حضرات کو خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لڑکیوں کو کم از کم ساتویں جماعت تک تعلیم دلوانا ضروری سمجھا جائے جو میٹرک تک پڑھالیں تو بہت اچھا ہے۔

عورت کی عظمت کا راز اقبالؒ نے بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

جب عورت پڑھی لکھی نہ ہو تو تصویر کائنات میں رنگ بے رنگ رہ سکتا ہے۔ ساز کے تاروں سے زندگی کے وہ سب راگ پیدا نہ ہو سکیں گے جو ایک اچھی تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی باوجود تعلیم نسواں کے مخالف ہونے کے وہ بھی اس بات کے قایل ہیں ؎

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو وہ بے شعور ہے
ایسی معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

بقیہ متعلقہ صفحہ نمبر ۲۷

توپ ہی وہ اصل ہتھیار تھا جس کی مدد سے سولہویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں یورپیوں نے ایشیا، امریکہ اور افریقہ میں نوآبادیاں قایم کیں۔

مارٹر توپوں کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا۔ ان توپوں کے گولے پروجیکٹائل حرکت پر چلتے تھے۔ اس لیے فصیل ہونے کے باوجود شہر کے اندر جا کر گرتے۔

بڑی آرٹلری دستوں کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی سے ہو چکا تھا لیکن ان کو اصل قوت توپ خانے سے ملی۔ بالخصوص توپوں کے وزن میں کمی لانے اور لے جانے کی نئی اور موثر ٹکنالوجی کے بعد آرٹلری نے تیزی سے قوت حاصل کی۔ آرٹلری اور توپ خانے کے مسائل بتدریج کم ہوتے گئے اور اٹھارھویں صدی میں ان پر مکمل قابو پا لیا گیا۔ ان مسائل کے حل میں سائنسی تحقیق نے مرکزی کردار ادا کیا۔ چنانچہ نپولین کی جنگوں میں (۱۷۹۹ - تا ۱۸۱۵ء) آرٹلری اور توپ خانے نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

عید الفطر۔ ایک بامقصد تیوہار

صفدر سلطان اصلاحی*

عید اس دن کو کہتے ہیں جو بار بار آتا ہو یا مسرت کے اس دن کو کہتے ہیں جس کی واپسی یقینی ہو۔ عید کا یہ مفہوم عربی لغت میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ فی الواقع اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لیے بہت ہی موزوں اور مناسب ہے۔ تیوہار اور خوشی کے دن ہر قوم میں آتے ہیں۔ روم، ایران، ہندوستان اور مصر کی قدیم قومیں اپنے تیوہاروں اور خوشی کی محفلوں کو بڑے اہتمام سے منایا کرتی تھیں۔ آج بھی ان ممالک کی متعدد قوموں میں تیوہار کی قدیم روایات اور شکلیں پوری آن بان کے ساتھ زندہ ہیں۔ تاریخ کے صفحات پر کسی بھی ایسی قوم کا ذکر نہیں ملتا، جس کے یہاں ایام مسرت و شادمانی کی تعین و تشکیل نہ ہو۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان قوموں میں سے کسی قوم کا تیوہار اپنی معنویت کے اعتبار سے اتنا مناسب نہیں ہے، جتنا مسلمانوں کا تیوہار عید ہے۔ عید کی حکمت، غرض و غایت اور موقع و محل الغرض ہر پہلو دیگر قوموں کے تیوہاروں سے ممتاز اور قابل فہم و ادراک ہے۔

اگر ہم دنیا کی مختلف قوموں کے اندر معروف و مشہور تیوہاروں اور ان کے اغراض و مقاصد کا جائزہ لیں تو ان کی ایک طویل فہرست تیار ہوگی جس کا احاطہ ان صفحات میں کرنا ایک مشکل کام ہوگا۔ تاہم تفصیل سے گریز کرتے ہوئے اگر ان کا ایک اجمالی تجزیہ کیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ ان تیوہاروں کے پیچھے بالعموم تین محرکات اور اغراض و مقاصد کارفرما رہے ہیں جن کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ فصلوں کے تیار ہونے اور کھیتوں کے سرسبز و شاداب ہونے کے مواقع پر خوشی و مسرت کا اظہار۔

۲۔ قدیم معبودوں اور گزرے ہوئے لوگوں کی یاد اور پوجا پاٹ۔

۳۔ بہادری اور شجاعت کے قدیم واقعات پر لہو و لعب کے ذریعے جذبات کی تسکین۔

یہ تیوہار اگرچہ ہر سال اور ہر ماہ ہوا کرتے ہیں لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان تیوہاروں میں کھانے پینے، سیر و تفریح کرنے اور شراب و کباب سے لطف اندوز ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ انگریزی لغات میں عید اور اس کے مترادف الفاظ کے معانی ہی "دسترخوان" اور "کھانے کی پارٹی" دیا جاتا ہے۔ عید سے متعلق یہ تصور قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے، اس کا سب سے بڑا ثبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ دعا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

"اے میرے رب! تو ہمارے لیے آسمان سے ایک دسترخوان نازل کردے جو ہمارے لیے اور ہم سے بعد کے لوگوں کے

---

* لکچرر، اجمل خاں طبیہ کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

لیے عید منانے کا ذریعہ بن جائے۔

اِس طرح بلا کسی خوف تردید کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کی اکثر قوموں میں عید اور تیوہار کا مقصد جسمانی مطالبات کی تکمیل اور جسمانی فوائد کا حصول ہے۔ کھانے، پینے اور عیش و عشرت کرنے کے علاوہ ان تیوہاروں میں اور کچھ نہیں ہوتا۔ حد تو یہ ہے کہ مردہ اسلاف کی یاد میں منعقد کیے جانے والے تیوہاروں میں بھی ان جسمانی فوائد کو پوری طرح ملحوظ رکھا جاتا ہے اور ان کی تکمیل کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے جو اپنے متبعین کو عید منانے کا ایک بہترین طریقہ اور ایک عظیم مقصد عطا کرتا ہے۔ اِسلام میں طریقۂ عید اور مقصد عید کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں عید کا تعلق جسم سے زیادہ انسانی عادات و اطوار اور اخلاق و کردار سے ہے۔ مسلمانوں کے دونوں عظیم تیوہار فی الواقع اس خوشی میں منائے جاتے ہیں کہ انسان نے اپنے نفس پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور مشکلات و مصائب میں جھنے اور ایثار و قربانی دینے کا عزم و حوصلہ پا لیا ہے۔

اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ان کے سامنے آئیں۔ خاص طور سے ان فرائض اور ذمہ داریوں کے بعد جن کی ادائیگی محنت اور مشقت کے بغیر ممکن نہ ہو۔ ذمہ داریاں اور فرائض خواہ وہ خدا کی طرف سے ہوں یا خاندان کی طرف سے، یہ سب انسان کے پاس رکھی ہوئی امانتیں ہیں اور اس کے کندھوں پر بوجھ ہیں۔ ہر انسان کے ارد گرد کچھ ذاتی اور خارجی مشغولیات ایسی ہوتی ہیں جو اس کو ذمہ داریوں کی ادائیگی سے روکتی ہیں اور اس کے زورِ بازو کو لایعنی اعمال و افعال میں ضائع کر دیتی ہیں۔ اگر اس کارزارِ حیات میں انسان اپنی بے جا مشغولیات سے کنارہ کش ہو کر اپنے فرائضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو جائے اور اپنی اصل ذمہ داریوں کو ادا کر دے تو اس کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی اور خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور فرحت و مسرت کے اظہار کے لیے اس سے بہتر دن اور کیا ہو سکتا ہے؟ کھانے پینے اور شہوانی خواہشات کی تکمیل میں مسلسل ایک ماہ خدا کی طرف سے جو پابندی عائد کر دی گئی تھیں، ان کا صحیح پاس و لحاظ کرنے کے بعد عید کا دن حقیقی معنوں میں مومنوں کے لیے خوشی اور انبساط کا دن ہوتا ہے۔ مومن نے اپنے رب کے مطالبات کو پورا کر کے ایک بڑی ذمہ داری ادا کر دی جس سے اس نے اپنے رب کی رضا کا پروانہ حاصل کر لیا۔ اس کامیابی و کامرانی پر اگر وہ اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کرے تو اس کا اسے حق ہے اور اسے کرنا چاہیے۔

عید الفطر جسے رمضان المبارک کے فوراً بعد پوری دنیا کے مسلمان مناتے ہیں، اپنے اندر نصیحت، موعظت اور حکمت کا بہت سا سامان رکھتی ہے، جن میں سے چند یہ ہیں۔

عید رمضان کے روزے ختم ہونے کے فوراً بعد آتی ہے اسی لیے اس کا نام عید الفطر رکھا گیا۔ روزے کے خاتمے کے معاً بعد اللہ تعالیٰ کی یہی مصلحت رہی ہوگی کہ انسان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"مسلمانوں کو جو مصیبت پہنچتی ہے خواہ وہ کسی قسم کی ہو، بیماری کی ہو، رنج ہو، غم ہو، تکلیف و ایذا ہو، حتیٰ کہ اسے ایک کانٹا بھی چبھے، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کی خطائیں معاف کر دیتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

عید الفطر کے ذریعے تیوہار یا کسی طرح کی خوشی منانے کا صحیح طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ رمضان کے فوراً بعد عید منائی جاتی ہے اور عید کے

اسلام کو خوشی و مسرت کے اظہار کے لیے مخصوص کر کے چند دن دیے ... دنیا کی سب سے پہلے وہ کام کیا جاتا ہے جس پر مسلمانوں کی قلت

اور کامرانی کا انحصار ہے۔ یعنی دو رکعت نماز باجماعت اور خطبۂ عید کی سماعت، عید کے دن ان دونوں چیزوں کو واجب قرار دیے جانے کی حکمت یہی ہے کہ انسان اپنے رب کو ہمیشہ یاد رکھے۔ اس لیے کہ اگر اس نے اپنے دل کو یادِ الٰہی سے ایک لمحے کے لیے خالی کر لیا اور شہوات نفسانی کی اتباع میں بے لگام ہو گیا تو اس کی خوشی بہت جلد غم سے تبدیل ہو جائے گی اور عید کا دن خوشی اور شادمانی کے بجائے فجور و فسق اور برائی کا سبب بن جائے گا۔ پس مسلمانوں کا عید کے دن صبح سویرے نماز کے لیے حاضر ہو جانے اور خطبۂ عید کو سننے کا مقصد یادِ الٰہی اور حبِ الٰہی سے دلوں کی تاریک دنیا کو منور کرنا ہے۔ یقیناً یہی وہ چیز ہے جس سے خوشیوں میں اعتدال قائم رہ سکتا ہے۔

رمضان کے بعد صدقۂ فطر کی ادائیگی ہر صاحبِ حیثیت مسلمان پر واجب ہے۔ اسے نفس کی پاکی کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ہر شخص کو اپنی ذات، اپنے اہل و عیال اور اپنے خادموں کی طرف سے صدقۂ فطر کی ادائیگی کا پابند کر دیا گیا ہے۔ یہ صدقہ عید کی نماز سے قبل ہی غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا جاتا ہے۔ تاکہ عید کی خوشی میں امت کے وہ افراد بھی شریک ہو لیں جو زندگی کی دوڑ میں معاشی اعتبار سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ خدا کی طرف سے صدقۂ فطر کا حکم صادر کیے جانے میں فی الواقع یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ انسانوں کو اپنے خوشی کے دن بھی عام لوگوں کے مفاد کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ خوشی اور مسرت کی بہاروں میں مگن ہو کر حقوقِ انسانی کی پامالی کا اندیشہ زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ صدقۂ فطر دلوں کی اصلاح اور پاکیزگی کا موثر ذریعہ ہے۔ اس کی ادائیگی کے بعد انسانوں کے دلوں پر تابعی لغو خیالات یکلخت ختم ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عید کے تیوہار کی شہرت ایک رفاہی تیوہار کی حیثیت سے زیادہ عام ہے۔

عید سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ عبادت غم، افسوس اور ملال کے ساتھ تو نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے ان لوگوں کے خیالات اور افکار کی تردید ہوتی ہے جو دین داری کو زیب و زینت اور آرائش و زیبائش سے خالی عمل سمجھتے ہیں۔ رمضان کے بعد عید کی خوشی یہ پیغام دیتی ہے کہ عبادت دراصل مقامِ مسرت ہے۔ اس کو کرنے سے خوشی ہونی چاہیے۔ رہبانیت اور دنیا سے گوشہ نشینی اختیار کر لینا اسلام میں سخت معیوب ہے اور اسلام کا پورا نظامِ عبادت اس کی پر زور تردید کرتا ہے۔

عید کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعیین قمری مہینوں سے کی جاتی ہے۔ اس طرح مختلف مہینوں اور موسموں میں اس خوشی کو منانے کا موقع ملتا ہے۔ اگر شمسی مہینوں کا خیال رکھا جاتا تو یہ موقع نہ ملتا۔ قمری مہینوں کی وجہ سے گرمی، سردی، خزاں، بہار اور سرسبزی و شادابی الغرض ہر موسم سے لطف اندوز ہونے کی خوشگوار اور رنگا رنگ فضا ملتی ہے۔

رمضان کے روزوں سے مسلمانوں کے اندر دو اہم خصوصیات پیدا کی جاتی ہیں۔ عزم و ارادہ اور صبر و ثبات۔ مسلمان اس لیے خوشی مناتے ہیں کہ انھوں نے خواہشاتِ نفسانی پر غلبہ حاصل کر لیا جو عبادت اور ریاضت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سال بھی رمضان المبارک سے مسلمانوں کے اندر یہ دونوں خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہوں۔ تاکہ ان کی عید فرحت و شادمانی کی عید ہو۔

آمین ثم آمین

> "ہم تم کو کچھ چیزوں کے ساتھ آزمائیں گے۔ ڈر اور بھوک سے، مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصانات سے اور خوش خبری دو صبر کرنے والوں کو۔"
>
> (سورہ بقرہ - ع ۲۰)

خلائی ایفل ٹاور

علی ذوالفقار★

آج ایفل ٹاور کی شہرت دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے. لیکن تقریباً سو سال پہلے ۱۸۸۰ء میں اس کا منصوبہ سامنے آنے پر پیرس کے "دانشوروں" نے بہت ناک بھوں چڑھائی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایفل ٹاور اگر بن گیا تو پیرس کی ساری نفاست و کشش جاتی رہے گی یہ عظیم اور بلند و بالا مینار اس کے لیے باعث شرم ہوگا۔ اس کے جواب میں الیگزینڈر ایفل نے کہا تھا کہ اس کی یہ تخلیق ایک ایسی مثال ہوگی جس کی نظیر ماضی میں اگر کہیں ملے گی تو صرف فراعنۂ مصر کے اہرام ہیں۔ یہ "ٹاور" پیرس ہی نہیں، فرانس کے نام کو بھی بلند کرے گا (ایفل اس ٹاور کا خالق تھا)۔

ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایفل صحیح کہتا تھا۔ وقت نے خود اس کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ وقت بہت بڑا منصف ہے اس کی عدالت میں کسی کے بڑے چھوٹے ہونے کا لحاظ نہیں۔ یہ کسی کے عہدے، بزرگی، شہرت، اور دولت سے مرعوب نہیں ہوتا، انصاف کے ساتھ فیصلے دیتا چلا جاتا ہے۔

وقت بہت بڑا منصف ہونے کے ساتھ بہت بڑا قدامت پسند بھی ہے۔ جی ہاں! قدامت پسند لیکن اسے ہم عام معنوں کے لحاظ سے قدامت پسند نہیں کہہ سکتے۔ عام قدامت پسندی تو فرسودگی اور دقیانوسی باتوں سے چمٹے رہنا ہے اور —

"دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو"

کے نعرے بلند کرتا ہے۔ ایسی قدامت پسندی سے ہمیں قدرت نفرت کرتی ہے اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ وقت تو تمام ہی فرسودگی اور دقیانوسیت کو مکمل خیرباد کہتا ہے۔ یہ کبھی پیچھے کو نہیں دوڑتا ہمیشہ آگے بڑھتا ہے اس کی قدامت پسندی ہے تو صرف اتنی کہ خود کو دہراتا رہتا ہے۔ دیوار پہ لگے کلاک کی سوئی کی طرح جو ہر روز ایک طے شدہ وقت پہ ۱۲ کا ہندسہ ظاہر کرتی ہے۔

ایفل ٹاور کا وقت بھی خود کو دہرانے پہ کمربستہ ہے۔ ٹاور کی دیکھ بھال کرنے والی انجمن کا ارادہ ہے کہ ۱۹۸۹ء میں ٹاور کی صد سالہ تقریبات کا انعقاد کیا جائے۔ یہ تقریبات بیسویں صدی کے عین اختتام اور ۲۱ ویں کے عین آغاز کے قریب ہو رہی ہیں اس لیے "ایفل انجمن" انہیں یادگار بنانا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں انجمن نے ایک ایسا [illegible] منصوبہ بنایا ہے کہ آپ بھی پڑھ کر پھڑک اٹھیں گے [illegible] وقت کو دہرانے کا جواز مہیا کر رہا ہے۔ یقیناً آپ جاننا چاہیں گے کہ وہ کیسے تو لیجیے ہم عرض کیے دیتے ہیں۔

ایفل انجمن نے ایفل ٹاور کی صد سالہ تقریبات منانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ بعض حضرات اور دوسری طرف اعتراضات کا نشانہ بن گیا ہے۔ یہ اعتراضات اور کوئی نہیں بلکہ فلکیات داں کر رہے ہیں۔

فلکیات دانوں کو کیا اعتراض ہے؟ ایفل ٹاور والوں کو اپنی خوشیاں منانی ہیں تو منائیں فلکیات داں کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔ ایسے فلکیات داں کا رب بھلا کرے [illegible]

★ [illegible] روڈ، سیکٹر نمبر ۶، کراچی، پاکستان

پہ کھیں جھاڑتے ہیں ۔
تجھے پرائی کیا پڑی
اپنی نبیڑ تو !

او ہو جناب عالی! آپ کس چکر میں پڑ گئے۔ فلکیات داں آپ سے اور مجھ سے کہیں زیادہ سنجیدہ فہمیدہ ہوتے ہیں۔ ان میں قوت برداشت بھی ہوتی ہے۔ دوسروں کی خوشی سے جلتے نہیں بلکہ خود بھی اُن کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ دخل در معقولات اور فلکیات داں؟ نہیں کبھی نہیں۔ لیکن دخل در نامعقولات سے نہ تو آپ رُک سکتے ہیں نہ فلکیات داں۔

فلکیات دانوں کو اعتراض اس لیے کرنا پڑا ہے کہ ایفل ٹاور والوں کی "وقتی خوشی" فلکیات دانوں کے لیے "دائمی غم" کا سبب بن سکتی ہے۔ بالکل وہی کیفیت ہے جیسے کوئی کسی کا گھر جلا کر "وقتی خوشی" حاصل کرے اور دوسرے کو ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد کر دے۔ کیا اس ظلم کو (خواہ کوئی بھی کرے) کوئی بھی باضمیر انسان (یا جس میں ذرہ بھر انسانیت بھی باقی ہو) جائز کہے گا؟ اور کیا ایسی خوشی واقعی خوشی ہے؟ کیا تمام انسانیت ایک کنبہ نہیں اور آج دوسرے کے لیے جو دکھ پیدا کیا جارہا ہے، وہ سلسلہ در سلسلہ ایک دن اپنے ہی بدن کو نہ تڑپائے گا کہ دنیا گول ہے۔

ایفل انجمن کیا کہتی ہے ؟

ایفل انجمن اپنے ایفل ٹاور کی سوسالہ سالگرہ منانا چاہتی ہے اس سالگرہ کو زیادہ سے زیادہ پرشوکت اور یادگار بنانے کے لیے وہ ۱۹۸۹ء میں ایک مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجے گی۔ اس مصنوعی سیارے کا نام ہوگا "خلائی ایفل ٹاور"۔

انجمن اس منصوبے پر سنجیدگی سے کام کر رہی ہے۔ انجمن کے ترجمان فلپ گلیرون نے انجمن کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس طرح بیسویں صدی کا استقبال زمین پر ایفل ٹاور بنا کر کیا گیا تھا بالکل اسی طرح اکیسویں صدی کا استقبال 'خلا میں ایفل ٹاور' بھیج کر کیا جائے گا۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ گھوڑا پہاڑ اور نکلا چوہا، مصنوعی سیارے تو خلا میں جاتے ہی رہتے ہیں۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ جلدی نہ کیجیے پوری کتھا سن لیجیے۔

خلا میں ایفل ٹاور کو عام سا مصنوعی سیارہ نہ سمجھیے۔ یہ ایسا مصنوعی سیارہ ہوگا جو زمین پر سے جگمگ جگمگ کرتے ہار کے مانند نظر آئے گا بالکل ایسا لگے گا جیسے زمین کے سب سے قیمتی ہیروں کا ہار اُڑ کر خلا میں جا بسا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ بڑے بڑے سو غباروں کو مصنوعی سیارے سے وابستہ کیا جائے گا۔ یہ غبارے اتنے بڑے ہوں گے کہ ہر ایک کا قطر ۸ انچ کا ہوگا۔ ان غباروں کو پلاسٹک کی ایک بہت بڑی زنجیر میں پرو دیا جائے گا۔ اس طرح جو ہار بنے گا وہ پندرہ میل کے رقبے تک محیط ہوگا۔ خلا میں پہنچنے کے بعد تین سال تک یہ ہار زمین والوں کو یوں نظر آئے گا جیسے سورج اور چاند کے بعد کوئی اور فلکی جگمگانے لگا ہے۔ جگمگاہٹ اس قدر ہوگی کہ مدہم ستارے تو رہے اپنی جگہ، قطبی ستارہ بھی ماند پڑ جائے گا۔ یہ جگمگاہٹ سورج کی روشنی کو منعکس کرنے سے پیدا ہوگی۔ تین سال بعد یہ غبارے زمین کی طرف گرنے لگیں گے اور زمینی فضا میں پھٹ جائیں گے۔

خلا میں ایفل ٹاور کی مدد سے پیرس والے دنیا بھر کے لوگوں کو محظوظ کرنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو گھروں سے نکلے بغیر اپنے اپنے باغیچوں، چھتوں اور برآمدوں سے آسمان پر اکیسویں صدی کی پھلجھڑیاں نظر آئیں گی اور یوں بیک وقت کئی ممالک نئی صدی کا استقبال کریں گے۔ اس طرح عالمگیر انسانیت کے جذبے کو تقویت ملے گی۔

خلا میں ایفل ٹاور کا مجوزہ منصوبہ بڑی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہے اس سلسلے میں بہترین تکنیک کاروں اور ڈیزائن بنانے والوں کا ایک سخت مقابلہ ہوا۔ مقابلے میں ایک سو منصوبے پیش کیے گئے، جن میں اس منصوبے کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ پسند کرنے کے لیے باقاعدہ منصفین مقرر کیے گئے تھے۔

مقابلے میں حصہ لینے والوں سے کہا گیا تھا کہ انھیں جو منصوبہ تیار کرنا ہے اس کے لیے تین ترجیحات لازمی ہیں:

۱۔ منصوبہ ایسا ہو کہ دنیا بھر میں زیادہ سے زیادہ ممالک کے لوگ بغیر کسی آلے کے نظارہ کر سکیں۔
۲۔ کم سے کم لاگت آئے۔
۳۔ ساخت اور جسامت ایسی ہو کہ خلا میں لے جانا آسان بھی ہو اور محفوظ بھی۔ نیز پرکشش بھی ہو۔

تمام مہم آزما مہم جوؤں نے ان ترجیحات کو سامنے رکھ کر ایک سے بڑھ کر ایک منصوبہ پیش کر دیا۔ لیکن قسمت "جین پیری لا پوری" کی جاگی۔ پوری ایک ایسا انجینئر ہے جو غباروں کی تکنیک میں چوٹی کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ڈیزائن کی تیاری میں اس نے اپنے نوجوان ٹیکنیکل رفقا سے بھی مدد لی جو فرانس کے قومی مرکز برائے سائنسی تحقیق میں اس کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

مزید تفصیلات کے مطابق غباروں کا ہار خلا میں جب بھیجا جائے گا تو اس کا وزن ۱۲۰۰ پونڈ ہو گا۔ حفاظت کی غرض سے اسے ایک بڑے صندوق میں یوں بند کیا جائے گا کہ اوپر ۹ پونڈ پانی ہو گا۔ جب یہ صندوق خلا میں پہنچ جائے گا تو پانی بخارات بن کر اڑ جائے گا۔ دباؤ ختم ہوتے ہی ہار باہر نکل آئے گا اور آسمان کی وسعتوں میں ۵ میل رقبے میں بیضوی شکل بنائے گا۔ بیضوی شکل کا یہ ہار زمین کے گرد ہر روز ۱۴ چکر لگائے گا اور زمین کے کسی بھی مقام پر کھڑے ہو کر رات میں چار مرتبہ دیکھا جائے گا۔

یقیناً اس بڑے منصوبے پر اخراجات بھی بے پناہ اٹھیں گے۔ چنانچہ اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو یہ لالچ دیا گیا ہے کہ ان کی کمپنیوں یا مصنوعات کے نام اشتہاری صورت یوں کندہ ہوں گے کہ دنیا بھر میں نظر آئیں گے۔ اس طرح ۳۲ ملین ڈالر کی رقم جمع کر لی گئی ہے۔ یقیناً آسمان پر کوکا کولا یا الکس سوپ لکھا دیکھنا ایک نیا ہی تجربہ ہو گا (بشرطیکہ یہ میلہ منعقد ہو سکی)۔

خلا میں ایفل ٹاور کے روشن و تاباں ہار کے علاوہ ایک دوسرا منصوبہ "آرسٹ منصوبہ" ہے۔ آرسٹ بھی ایک مصنوعی سیارہ ہو گا۔ جو چاند کے مقابلے میں دس گنا زیادہ روشن ہو گا۔ روشنی کے لیے سورج کی روشنی کا انعکاس کیا جائے گا۔ اس کے خالق ہوری کمسن کا کہنا ہے کہ آرسٹ صرف اسی موقع کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر موقع کے لیے موزوں ہو گا۔ عالمی نوعیت کے کسی بھی موقع پر اسے آسمان کی وسعتوں میں یوں دکھایا جائے گا جیسے کوئی چمکتی ہوئی پتنگ اڑ رہی ہے۔

فلکیات دان کیا کہتے ہیں

ایفل انجمن کا موقف سن کر آپ کو فلکیات دانوں پر غصہ آ رہا ہو گا کہ اتنے شاندار منصوبے میں ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ بھلا پہلے کبھی ایسا دیکھا۔ زمانہ واقعی ۲۱ ویں صدی نئی کامیابیوں کی صدی ہو گی۔

دیکھیے ایسا نہ کیجیے۔ ایک فریق کا موقف سن کر فیصلہ دینا انصاف پسند کا کام نہیں۔ دونوں کی سنیے۔ پھر انسانی ضابطہ اخلاق کے مطابق فیصلہ کیجیے۔ ہم نہیں کہتے کہ انجمن والوں کو اچھا کہیے یا فلکیات دانوں کو۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ ہر قسم کا تعصب بالائے طاق رکھ کر دونوں کا موقف سنیے اور جو حق پر ہو اس کے حق میں فیصلہ دیجیے۔ وقت اسی لیے انصاف سے فیصلہ کرتا ہے کہ تعصب اور طرف داری سے ماورا ہو کر دونوں فریقوں کی سنتا ہے اور پھر حق کی تائید کرتا ہے۔

فلکیات دانوں کا کہنا یہ ہے کہ انسان کی یہ حرکت زمینی فضا کی طرح خلائی فضا کو بھی آلودہ کر دے گی۔ ہم نے پچھلے ۲۰ برسوں کے دوران خلائی تحقیق کی خاطر بڑی بڑی دوربینیں بنائی ہیں۔ ایسی کئی اور دوربینیں ہنوز بن رہی ہیں۔ چونکہ انسان نے کرۂ ارض کے چپے چپے پر روشنی نچھاور کر دی ہے اور خلائی مناظر مدھم ہیں۔ اس لیے ہمیں ایسے علاقوں کو منتخب کرنا پڑتا ہے جو ویران و بے آباد ہوں۔ اسی طرح مصنوعی روشنیوں سے پرے ہم نے آسمانی روشنیوں کو دیکھنے کی چاہ کی۔ اب یہ لوگ خلا ہی میں روشنیاں کرنے کی ٹھان رہے ہیں۔ ہماری [illegible] والی دھری کی دھری رہ جائے گی۔

فلکیات دانوں نے اپنا موقف بیان کرنے اور منوانے کے لیے اخباروں کے اداریوں اور عدالتوں سے رجوع کر رکھا ہے۔ اداریوں اور عدالتی درخواستوں کی بھرمار کر کے وہ اس منصوبے کو رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایفل انجمن والوں پر ان کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ [illegible] تماشے کے لیے تمام بنی نوع انسان کے مستقبل سے کھیل رہے ہیں۔

[illegible] فلکیات داں پال مارڈن تو اس قدر برافروختہ ہیں کہ یہ [illegible]

"فلکیات داں یہ تو کبھی نہ چاہیں گے کہ خلا میں کامیابیاں حاصل نہ ہوں ضرور ہوں لیکن کیا فلکیات داں یہ برداشت کر لیں کہ ایک کمپنی محض اپنی سال گرہ منانے کے لیے خلا کا ستیاناس کر دے۔"

فلکیات دانوں کی بھی ایک باقاعدہ عالمی یونین ہے جس کا نام "آئی۔اے۔یو" ہے۔ آئی۔اے۔یو میں دنیا بھر کے کوئی چھ ہزار فلکیات داں شامل ہیں۔ یونین کے سکریٹری جین پیری سونگ کہتے ہیں کہ

"الیفل انجن کو منصوبہ منظور کرنے سے پہلے یونین سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ منصفین میں خلائی سائنس داں بھی تھے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آئی۔اے۔یو کا صدر دفتر پیرس میں ہونے کے باوجود کسی نے اس سے رجوع نہیں کیا۔"

الیفل انجن کو سب سے زیادہ مزاحمت برداشت کرنا پڑی ہے اس کی قیادت یہی یونین کر رہی ہے۔

فلکیات دانوں کا کہنا ہے کہ انتہائی جدید دوربینیں بے حد نازک آلات پر مشتمل ہیں۔ یہ آلات ایک خاص حد سے زیادہ روشنی برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر چمکتے ہار کی روشنی ان پر پڑ گئی تو وہ آلات اسی وقت جل کر بے کار ہو جائیں گے۔ انھیں یہ بھی خدشہ ہے کہ اس طرح خلائی آلودگی کا بھی ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گا جو ممکن ہے کرۂ ارض ہی کو خطرے میں ڈال دے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس طرح کے شعبدے اور کرتب شروع ہو گئے تو بہت جلد کئی نام نہاد جمہوری ممالک اپنے عظیم "لیڈروں" کو آسمان پر پہنچا دیں گے۔ یعنی اپنی نمائش کے لیے خلا کو غلط طور پر استعمال کریں گے۔

فیصلہ ہمیشہ کی طرح وقت پر چھوڑ دیجیے، بشرطِ زندگی ہم سب دیکھ لیں گے کہ کس کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ فی الحال تو دونوں کی بات معقول لگتی ہے۔ جیسے ملّا نصیر الدین نے ایک بار منصف بن کر دونوں فریقوں کو صحیح قرار دے دیا۔ تیسرے نے کہا کہ یا تو ایک غلط ہو گا یا دوسرا۔ بیک وقت دونوں صحیح کیوں کر ہوئے۔ کہا کہ تو بھی صحیح کہتا ہے۔ سو سائنس فلکیات اور خلا کی وسعتوں میں اپنا حال بھی ملّا نصیر الدین سے کم نہیں۔ پھر بھی فلکیات دانوں کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ خلا تمام انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے اور چھوٹے چھوٹے شعبدوں کے لیے اس کا کیا، کسی کا بھی استحصال نہیں کرنا چاہیے۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی مریض کی عیادت کرتا ہے یا اللہ کی خوشی کی خاطر کسی مسلمان بھائی سے ملاقات کرنے جاتا ہے تو ایک پکارنے والا پکارتا ہے تو مبارک ہے، تیرا چلنا مبارک ہے تو نے جنت میں ایک جگہ بنائی۔"

ترمذی

اولاد — اسلام کے گہوارے میں

اسرار احمد خاں*

ایک بزرگ نے راقم الحروف کو ایک واقعہ سنایا کہ میرے پاس ایک شناسا آئے اور رو کر درخواست کی کہ حضرت میرے لیے دعا فرمائیے۔ میرے پوچھنے پر کہ خیریت تو ہے؟ وہ اور رونے لگے اور بار بار یہی جملہ دہراتے رہے کہ حضرت میرے لیے دعا فرمائیے۔ ان کے زار زار رونے سے دل پر بڑا اثر ہوا، ساتھ ہی ساتھ جستجو بھی ہوئی کہ آخر بات کیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر ان سے پوچھا کہ کیا دعا کروں؟ اس پر ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اور پوری شدت کے ساتھ بولے:

"حضرت دعا کیجیے کہ میرے لڑکے ہلاک ہو جائیں۔"

میں یہ سن کر سناٹے میں آگیا۔ حیرت ہوئی کہ ایک باپ اپنے جگر گوشوں کے تئیں ان جذبات کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ پوچھنے پر کہ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا:

"میرے تینوں بیٹے مجھے اتنی اذیتیں دیتے ہیں کہ اب ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں ان کی صورتیں دیکھنا نہیں چاہتا میرے بس میں نہیں، میرے جسم میں اتنی قوت نہیں کہ انھیں قتل کر سکوں۔ اب اللہ ہی ان پر عذاب نازل کرے میں آپ کے پاس بڑی امید لے کر آیا ہوں کہ آپ اللہ سے میرے بیٹوں کی موت کی دعا مانگیں گے۔"

میں نے انھیں سمجھا بجھا کر ٹال دیا اور دعائے خیر کا وعدہ کر لیا۔ ان بزرگ نے مزید بتایا کہ وہ صاحب جو دعا کی درخواست لے کر آئے تھے، ان کے تین بیٹے ہیں۔ تینوں جوان اور صحت مند ہیں۔ اہل محلہ اور اہل علاقہ ان سے ہر وقت خائف رہتے ہیں۔ کب اور کون ان کے مظالم کا ہدف بن جائے کچھ پتہ نہیں۔ اور تو اور خود ماں باپ بھی اُن کی ستم رانیوں سے محفوظ نہیں۔ میں انہیں اُن کے بچپن سے جانتا ہوں کم سنی کے دور ہی میں اُن کی شرارتیں معصومیت کی حدود سے گزر کر ایذا رسانیوں تک جا پہنچی تھیں۔ محلے کے دوسرے بچوں کی بے دردی سے پٹائی، مظلوم بچوں کی جانب سے مدافعت یا تنبیہ کی صورت میں فحش گالیاں ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ ان کے والد سے شکایت کی جاتی تو الٹے اپنے بچوں کی حمایت کرتے تھے۔ اس سے بچوں کو اور شہ ملتی تھی۔ لوگ انہیں بہت سمجھاتے اور ان کے والد کو بھی تلقین، فہمائش اور تنبیہ کرتے مگر بے سود۔ وہ بچے اب جوان ہیں۔ جوا، شراب اور زنا ان کے محبوب مشغلے بن چکے ہیں اور گرد کے لوگوں کو اتنی جرأت بھی نہیں کہ انھیں آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔ وہ اپنے والدین کو بھی گالیوں اور جسمانی اذیتوں کے تحفے دیتے ہیں۔ اب جب خود پر پڑی ہے تو بلبلا اٹھے ہیں اور اُن کی ہلاکت کی دعا کرتے ہیں۔ وہ لڑکے اپنے والدین کے ساتھ جو بدسلوکی کرتے ہیں وہ ہر طرح سے لائق مذمت ہے لیکن اس کا بڑا سبب خود والد ہی ہیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کو جیسا بنایا ویسے ہی بنے [illegible]

* ریسرچ اسکالر، شعبہ دینیات سنی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

[illegible] اس بیت کا ٹے بوائیں گے، آم تو اگنے سے رہے۔

یہ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ہمارے معاشرے میں ایسے بے شمار واقعات بکھرے ہوئے ملیں گے۔ ماں باپ کی غیر معتدل محبتوں اور مہمل [illegible] لاپرواہیوں نے ان گنت بچوں کو سماج پر بوجھ بنا دیا ہے [illegible] معاشرے کا بیش قیمت اثاثہ ہیں کل یہی معاشرے کے نگران و محافظ ہوں گے۔ ملک و قوم کی زمام کل انہیں کے ہاتھوں میں جانی ہے۔ ماں باپ بچوں کو کل کی ذمہ داریوں کا اہل بنائیں۔ یہ محض ان کی سماجی اور قانونی ذمہ داری ہی نہیں اخلاقی اور دینی فریضہ بھی ہے جس کے سلسلہ میں وہ معاشرے کو بھی جواب دہ ہیں اور اللہ کو بھی۔ اس فریضہ کی کوتاہی والدین کا ناقابل معافی سماجی جرم ہے۔ آخرت میں بھی ان پر سخت گرفت ہوگی۔

عام طور سے ماں باپ کے حقوق معلوم و معروف ہیں۔ اگرچہ عملاً ایک اکثریت ان سے گریزاں ہے لیکن اولاد کے تئیں ماں باپ کے کیا فرائض ہیں ان کے بارے میں واقفیت بہت کم ہے۔ معاشرہ کی نئی نسلوں کی بے راہ روی میں جہاں بہت سے دوسرے عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے، وہیں اس کا اولین سبب ماں باپ کی اپنے فرائض کے تئیں کوتاہی اور غفلت بھی ہے۔

اسلام کی تعلیمات اس سلسلے میں بہت واضح ہیں۔ والدین ان کا پورا لحاظ کریں تو ممکن نہیں کہ غلط اور بدکار قسم کی نسل وجود میں آئے۔

محبت

اولاد کے سلسلے میں ماں باپ کا پہلا فرض محبت و مودت اور رحمت و رافت ہے۔ کہ اپنی اولاد سے محبت نہیں ہوتی۔ ماں باپ اور اولاد کے درمیان ہی تو ایک فطری تعلق ہوتا ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ عموماً ماں باپ یا تو اپنی اولاد سے محبت کرنے میں ساری حدود و قیود کو پھلانگ جاتے ہیں اور مبالغہ آمیز حد تک اظہار مودت کرتے ہیں یا پھر اس کے اظہار میں بخل سے کام لیتے ہیں اور دل میں محبت کے جذبات رکھنے کے باوجود محض نام نہاد اصول پسندی کے نام پر اولاد کو محبت کی پھوار سے محروم رکھتے ہیں۔ زیادہ لاڈ پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں اور اظہار محبت میں بخل سے اولاد احساس محرومی کا شکار ہو جاتی ہے۔ مناسب رویہ یہ ہے کہ اولاد کو اتنی محبت دی جائے کہ وہ اس کی حرارت کو محسوس کرے، نہ اس کی حدود کو پار کیا جائے اور نہ اس میں کوئی کمی کی جائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادے تھے ابراہیم ان کی پرورش ایک صحابی ابو سیفؓ کے سپرد تھی۔ صاحبزادے بیمار ہوگئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے۔ اس وقت بچے کی سانس اکھڑ چکی تھی۔ فرط محبت سے آپؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں موجود ایک صحابی حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا:

"یا رسولؐ! آپ بھی رو رہے ہیں؟"

فرمایا:

"اے ابن عوف! آنسوؤں کے یہ قطرے رحمت کی علامت ہیں۔ آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں اور دل غمزدہ ہے۔ ہم تو وہی کہتے ہیں جو ہمارے رب کو پسند ہے۔ اے ابراہیم تیری جدائی پر ہمیں بہت دکھ ہے۔"

(بخاری، مسلم)

ایک بار ایک بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور بولا:

"کیا آپ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں۔ ہم تو بچوں کو نہیں چومتے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر اللہ نے تمہارے دل سے جذبۂ رحمت نکال دیا ہے تو اس پر میں کیا کر سکتا ہوں۔"

(بخاری، مسلم)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بچوں کو چومنا اور انہیں پیار کرنا جذبۂ رحمت کی علامت ہے۔ اگر کوئی شخص بچوں سے پیار نہیں کرتا تو یہ قساوت قلبی اور سنگ دلی کی نشانی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے معصوم صاحبزادے ابراہیم سے اتنی محبت تھی کہ ابو سیفؓ، جن کے یہاں آپ کی پرورش

ہوتی تھی، ان کے گھر اکثر پیدل جاتے۔ ابو سیفؓ پیشے کے اعتبار سے لوہار تھے، ان کے گھر میں اکثر دھواں رہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دھوئیں کی پروا کیے بغیر کافی دیر تک صاحبزادے ابراہیم کو گود میں لیے پیار کرتے۔ (سیرت النبی جلد دوم)

ایک بار ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اس کے ایک بچہ بھی تھا۔ وہ اپنا بچہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ بچے کی ماں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور بڑے درد انگیز لہجے میں فریاد کی اور درخواست کی کہ بچہ مجھے دے دیا جائے۔ رسول اللہؐ نے اس عورت سے فرمایا:

"تم سے تمہارے بچے کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ البتہ اگر تم دوسرا نکاح کر لو گی تو بچہ اپنے باپ کے پاس چلا جائے گا۔" (ابو داؤد)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ ایک بار اپنے نواسے حسنؓ کو پیار کر رہے تھے۔ وہاں ایک صحابی اقرع بن حابسؓ بھی موجود تھے۔ وہ بولے: میرے تو دس بچے ہیں لیکن میں نے تو کبھی کسی بچے کو بھی اس طرح پیار نہیں کیا۔" رسول اللہؐ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"

(بخاری)

ایک بار رسول اللہؐ مسجد نبوی میں منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے۔ اسی اثنا میں آپؐ نے دیکھا کہ دونوں نواسے حسنؓ و حسینؓ گرتے پڑتے مسجد میں آ رہے ہیں۔ آپ فرط محبت سے خطبہ روک کر منبر سے نیچے اترے، دونوں نواسوں کو گود میں لیا اور اپنے قریب بٹھا لیا۔

(ترمذی)

حسن سلوک

قرآن کریم میں ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت دیتے ہوئے اس بات کی بھی تاکید کی ہے کہ بڑھاپے میں والدین کے حق میں جوان اولاد دعا کرے۔

"رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا"

"اے ہمارے رب ان دونوں (یعنی والدین) پر رحم کر بالکل اسی طرح جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں جذبۂ رحم کے ساتھ پالا تھا۔"

(الاسراء: ۲۴)

قرآن کی سکھائی ہوئی اس دعا میں ماں باپ کو یہ واضح ہدایت دی گئی ہے کہ اولاد کی پرورش و پرداخت ان کے ساتھ محبت بھرا سلوک اور حسن تربیت ان پر فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے نتیجے ہی میں اولاد اپنے ماں باپ کے حق میں اللہ سے دعا کرے گی۔

قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ بچوں کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرنے کی تاکید آئی ہے:

"اگر تم انھیں (اولاد) معاف کر دو، ان سے درگزر کا معاملہ کرو اور ان کی غلطیوں پر انھیں معاف کر دیا کرو تو اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بڑا رحم فرمانے والا ہے۔" [التغابن: ۱۴]

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ معصوم بچوں کے ساتھ درشتی اور ظلم کرنے والے ماں باپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ رحم کا معاملہ نہیں کر سکتا۔ اللہ کی رحمت کے طالب ماں باپ کو اپنے بچوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہوگا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب بھی رسول اللہؐ سے ملنے کے لیے آتیں تو آپ بڑھ کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔" [ابو داؤد]

کفالت:۔

ہمارے معاشرے میں اولاد کی معاشی کفالت اور ان کی پرورش کے سلسلے میں دو متضاد تصویریں نظر آتی ہیں۔ کچھ لوگ اولاد کے حقوق کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ انفاق اور خرچ کی دوسری مدیں نظر انداز ہو جاتی ہیں اور ایسے بھی لوگ پائے جاتے ہیں جو استطاعت کے باوجود محض اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے اولاد کو ان کے معاشی حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔ اولاد کی کفالت اور ان کی پرورش کے معاملے میں اسلام کی تعلیمات بہت واضح ہیں۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ایک دینار وہ ہے جو تم اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہو، ایک دینار وہ ہے جو تم کسی غلام کو آزاد کرانے میں خرچ کرتے ہو، ایک دینار وہ ہے جو تم کسی مسکین پر صدقہ کرتے ہو اور ایک دینار وہ ہے جو تم اپنے اہل و عیال کی کفالت میں لگاتے ہو۔ ان سب میں اس دینار کا ثواب زیادہ ہے جو تم اپنے اہل و عیال پر صرف کرتے ہو۔"

(مسلم)

دیکھیے یہ ارشاد نبویؐ بالکل واضح ہے کہ اپنے اہل و عیال کو محروم رکھ کر نیکی کے دوسرے کاموں میں مال و دولت صرف کرنا بھی دین داری نہیں ہے۔ یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک کے کچھ واقعات مثلاً غزوۂ تبوک کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایثار کو بطور مثال پیش کر کے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا اور اہل و عیال کو ان کی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم کر دیا۔ یاد رہے ان واقعات سے مندرجہ بالا ہدایت نبوی کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ نارمل حالات سے نہیں بلکہ ہنگامی حالات سے متعلق ہے، جب اسلامی معاشرے کو ہنگامی حالات درپیش ہوں گے تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی سنت دہرانا فرض ہو جائے گا لیکن عام حالات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ ہدایت ہی ہمارے لیے مشعل راہ ہوگی۔ یہی نہیں کہ اولاد کی کفالت باعث اجر و ثواب ہے بلکہ اس سے غفلت اور کوتاہی موجب سزا اور گناہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آدمی کے گنہگار ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جن لوگوں کی روزی کا وہ ذمہ دار ہے ان کے حقوق ضائع کر دے۔"

(ابوداؤد)

ایک دوسرے موقع پر اسی بات کو مثبت طور سے آپؐ نے اپنے صحابہؓ کے سامنے رکھا۔

"اوپر والا ہاتھ (یعنی خرچ کرنے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ (یعنی صدقہ لینے والے ہاتھ) سے بہتر ہے اور خرچ کی ابتدا ان سے کرو جن کی کفالت کے تم ذمہ دار ہو۔"

(بخاری)

ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک بار رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا میں اگر ابوسلمہ کی اولاد پر خرچ کروں تو مجھے اس کا اجر ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا:

"ہاں! تم ان پر جو کچھ خرچ کرو گی اس پر تمہیں اجر ملے گا۔"

(بخاری و مسلم)

ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

"جس نے حلال طریقے سے دنیا طلب کی تاکہ دوسروں کے سامنے دست سوال نہ دراز کرنا پڑے اور اپنے اہل و عیال کے لیے روزی حاصل کرے اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرے تو وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا۔"

تعلیم و تربیت:

اولاد کے حقوق میں اہم ترین حق ان کی تعلیم و تربیت ہے۔ قیامت کے دن اس حق کے سلسلے میں والدین سے باز پرس بھی ہوگی۔

ابن ماجہ میں رسول اللہؐ کا یہ فرمان نقل ہوا ہے کہ:

"اللہ جس شخص کو بھی کم یا زیادہ لوگوں کا ذمہ دار بناتا ہے، قیامت کے دن اس سے پوچھے گا کہ آیا اس نے اپنے زیر کفالت لوگوں کو اللہ کے احکامات کی پابندی کرائی یا نہیں۔ اللہ خاص طور سے اس کے گھر والوں کے متعلق اس سے پوچھے گا۔"

ابن ماجہ ہی میں اسی سلسلہ کی ایک اور حدیث نبوی مذکور ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"اپنی اولاد کے ساتھ رحم کا سلوک کرو اور ان کو اچھی تعلیم و تربیت سے آراستہ کرو۔"

اسی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تاکید کرتے رہنا چاہیے:

"اپنے اہل و عیال کو نماز کی تاکید کرو اور خود بھی اس کی پابندی کا خیال رکھو۔"

اولاد کو نماز کی تاکید کرتے رہنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ نماز دین میں بڑا اہم مقام رکھتی ہے۔ نماز کی پابندی، اخلاق و معاملات کی صفائی کی ضامن ہے۔ مشکوٰۃ میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول موجود ہے کہ جن لوگوں نے نماز قائم کی، انھوں نے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی اور جن لوگوں نے نماز سے بے اعتنائی برتی ان سے دین و دنیا کے دیگر معاملات میں خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو انھیں نماز کا حکم دو اور جب وہ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان پر سختی کرو اور اس عمر میں ان کے بستروں کو الگ کر دو۔"

(بخاری)

اولاد کی تعلیم و تربیت اس لیے بھی ضروری ہے کہ ماں باپ کے انتقال کے بعد اولاد صالح کا اجر ان کے حق میں جاری رہتا ہے۔ رسول اللہؐ کی حدیث ہے:

"آدمی کی موت کے بعد اس کے اپنے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزیں ایسی ہیں جن کا ثواب موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ، نفع بخش علم اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔"

مساوات: اپنی اولاد کے درمیان تفریق نہ کیجئے

ہے۔ ان سے عدل اور مساوات کا سلوک فرض ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی اولاد میں کسی سے خاص معاملہ کرتے ہیں اور بقیہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ معاشرہ میں بعض ایسی بھی مثالیں ہیں کہ کسی بچے سے آدمی اتنا ناراض ہوا کہ اسے نہ صرف اپنی زندگی میں جائز حقوق سے محروم رکھا بلکہ مرتے وقت جائداد اور وراثت میں بھی حصہ نہ دینے کی وصیت بھی کر گیا۔ یہ انتہائی غیر اسلامی کردار ہے۔ اسلامی شریعت میں اس طرح کے رویہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ حضرت بشیرؓ نے اپنے ایک بیٹے نعمانؓ کو کوئی چیز دی تو نعمانؓ کی ماں نے کہا کہ میں تو اس وقت خوش ہوں گی جب تم اس عطیہ پر رسول اللہؐ کو گواہ بناؤ گے۔ حضرت بشیرؓ نے اپنی اہلیہ کی خواہش کے احترام میں خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور رسول اللہؐ سے سارا ماجرا عرض کیا۔ اس پر رسول اللہؐ نے پوچھا:

"کیا تم نے اپنے سارے بچوں کو یہ تحفہ دیا ہے؟"

انھوں نے کہا: نہیں۔

اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا:

"اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف سے کام لو۔"

اسی طرح بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان بھی تفریق گناہ ہے۔ ہم ایام جاہلیت کے عربوں کی طرح بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ بیٹی کی پیدائش پر دکھ کا اظہار کرتے ہیں اور بیٹے کی آمد پر خوش ہوتے ہیں۔ یہ تصور اور مزاج اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ابھی چند ماہ قبل اخبارات میں خبر آئی تھی کہ ایک باپ نے اپنی معصوم بچی محض اس وجہ سے ایک دوسرے شہر میں ایک سنسان جگہ چھوڑ کر چلا آیا کہ وہ اس پر بوجھ بنے گی۔

اسلام نے اس تفریق کو مٹا کر رکھ دیا اور اس کے نام لیواؤں میں ایسی فکری تبدیلی آئی کہ نہ صرف اپنی بیٹیاں انھیں عزیز ہو گئیں بلکہ دوسروں کی بیٹیاں بھی ان کی نظروں میں وجہ فضیلت بن گئیں۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بچی جو مکہ ہی میں رہ گئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو گود میں اٹھالیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ اس پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی اس بچی کو لینے کے لیے درخواست کرنے لگے۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کہ اس کی خالہ میری بیوی ہے۔ لہٰذا یہ بچی مجھے ملنی چاہیے۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ میری بہن ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے۔ لہٰذا مجھے ملنی چاہیے۔
رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس بچی کے ذمہ دار جعفرؓ ہوں گے (بخاری)

بیٹے بیٹیوں کے درمیان یکساں سلوک اور مساوات اسلامی معاشرہ کی بنیادوں میں سے ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس کے پاس کوئی بیٹی ہے۔ اس نے نہ اس کو زندہ دفن کیا، نہ اس کی تحقیر کی اور نہ بیٹوں پر ترجیح دی تو اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤد)

"دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر، گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو، متفق ہو جاویں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو چن لوں اور اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دل سوز دوست بتاتا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کو تر و تازہ کرنے کے لیے نہایت دلچسپ ظرافت بھی کر بیٹھتا ہے اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی بول اٹھتا ہے اور باوجود مخالفت کے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔"

سرسیدؒ

توپ کی قدیم ترین نشانیاں تیرھویں صدی عیسوی کے چین سے منسوب ہیں، اس لیے یہی ممکن ہے کہ اس کی ایجاد چین میں ہوئی ہو۔ یورپی تاریخ میں اس کا پہلا استعمال ۱۳۲۰ء میں ملتا ہے جب کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ۱۳۲۴ء کے دوران غرناطہ کے قریب پہلی بار توپ چلی۔ غرناطہ کے شمال مشرق میں اڑسٹھ میل پرے (ایک سو دس کلو میٹر) واقع بشتلار کا قلعہ عیسائی فوج کے قبضے میں تھا۔ غرناطہ کے حکمران اسماعیل نے اس قبضے کو ختم کرنے کے لیے محاصرہ کر لیا اور ایک ایسا ہتھیار استعمال کیا جو لوہے کے دہکتے گولے، قلعے کے برج پر پھینکتا تھا۔ گولا چلتا تو فوارے کی طرح چنگاریاں نکلتی تھیں۔ ان چنگاریوں سے مخالف فوج کو یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے بجلی گر رہی ہے، چنانچہ بعد میں شعرا نے اس پُراسراریت سے فائدہ اٹھا کر سخن طرازی کی۔

۱۳۴۳ء میں عیسائی فوج نے الجزیرہ کا محاصرہ کیا تو اس وقت بھی مسلمانوں کی طرف سے لوہے کے بھاری گولے برسائے گئے۔ ملکین کے محاصرے میں جو ۱۴۸۶ء کا واقعہ ہے اہل قشتالہ نے آگ برسانی توپیں استعمال کیں۔ توپ سے جو آگ کے گولے نکلتے وہ بلندی پر جا کر (پھر چمکتا بجلی کی طرح) نیچے کو آتے، جس کے سر پر بھی وہ گرتے اسے ختم کر دیتے۔

لیو افریقانس نے جو ۱۵۱۲ء میں مراکش سے چلا تھا، وہاں کی فوج کے پاس توپوں کی موجودگی بیان کی ہے۔ اس کے بعد شاہان سعدیہ نے اس طرف خصوصی توجہ دی۔ ایسے حربی افراد کو جو کسی وجہ سے [illegible]

سے واقف تھے۔ چنانچہ دوسرے امور کے ساتھ ساتھ توپوں کے معاملے بھی انھوں نے کی۔ ۱۵۷۸ء میں وادی المخازن میں جنگ ہوئی تو مراکشی لشکر کے پاس ۳۴ توپیں تھیں۔ ۱۵۹۱ء میں مراکش اور سوڈان کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں مراکش نے چھ مارٹر توپوں اور کئی چھوٹی توپوں کے ساتھ حصہ لیا جب کہ سوڈانیوں کے پاس بندوقیں بھی نہ تھیں، وہ صرف بھالوں، تلواروں اور تیر کمانوں سے مسلح تھے۔ یہی ٹکنالوجی سے محرومی درحقیقت ان کی شکست کا سبب بنی۔ ۱۶۰۰ء میں سلطان مولائی کے پاس ۱۵۰ سے زائد توپیں تھیں اور ایک توپ کی تو نو نالیاں تھیں۔ یہ توپ آج بھی پیرس کے عجائب گھر "میوزی ڈی لا آرمی" میں محفوظ ہے۔ توپ کی مغربی ٹکنالوجی کو مشرق میں منتقل کرنے کا کردار اسپین نے ادا کیا۔ ۱۶۳۰ء میں اسپین کا ایک مفرور تیونس پہنچا تو اس نے ہسپانوی زبان میں ایک کتاب لکھی جس میں یورپی ملکوں کی جنگی ٹکنالوجی کی وضاحت کی۔ ۱۶۳۸ء میں ہسپانوی اور عربی کے ایک ماہر نے اس کا عربی ترجمہ کیا۔

مراکشی بادشاہوں "شاہان سعد" نے کانسی کی توپیں بنوائیں۔ بعض حوالوں کے مطابق یہ توپیں فیض، مراکش اور تارودانت کے کارخانوں میں بنائی گئیں، جب کہ بعض حوالوں میں کہا گیا ہے کہ انھیں ہالینڈ نے شاہان مراکش کے لیے بنایا۔ کانسی کی یہ توپیں شاندار نمونے تھیں اور ان میں سے کئی ایک آج بھی مراکش شہر کے قلعوں میں موجود ہیں۔

یورپ سے مشرقی علاقوں کی طرف جدید اسلحہ کی منتقلی ہوتی رہی [illegible] توپ خانہ [illegible]

تھیں۔ اس کے علاوہ یورپی ممالک مارٹر اور اسی طرح کی دوسری توپیں
یا اسلحہ بنا کر مشرقی ممالک کو فروخت کرتے تھے۔ عرب ممالک ان پر عربی
کندہ کر لیا کرتے تھے۔

مملوک خاندان کے بادشاہوں نے چودھویں صدی عیسوی میں
توپخانے کا استعمال بتدریج بڑھایا لیکن انھوں نے اس سے جارحیت
کے بجائے ہمیشہ دفاع کا کام لیا۔ سلطان الغوری نے توپ سازی
کی صنعت قایم کی اور تخت نشینی کے چند برس بعد ہی کئی ایسے مراکز قایم
کر دیے۔ اس طرح اس کے دور میں بکثرت توپیں مقامی طور پر بننے لگیں
ان توپوں کی تیاری کا مقصد عثمانی ترکوں پر جارحیت نہیں بلکہ ان مصری
بندرگاہوں کا دفاع تھا جو بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم کے ساتھ ساتھ واقع
تھیں۔ انھیں بحری جہازوں پر بھی نصب کیا گیا۔ بڑا کا سرحدوں اور
قلعوں میں بھی توپ خانہ موجود تھا۔

عثمانی ترکوں نے توپ خانے کا استعمال کب سے شروع کیا
یہ واضح نہیں۔ البتہ محمد ثانی (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ
کا محاصرہ کیا تو بھاری توپ خانہ استعمال کیا۔ میدانی توپیں ترکوں نے
۱۴۴۴ء کی جنگ وارنا کے دوران استعمال کیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ
جائز ہے کہ مراد ثانی کے دور حکومت ۱۴۲۱ تا ۱۴۵۱ء کے دوران
ہنگری کے خلاف ان کا استعمال ہوا۔ کسی بڑی جنگ میں ترکوں نے پہلی
بار توپیں اس وقت استعمال کیں، جب ۱۴۴۸ء میں "قصورہ کی دوسری
لڑائی" پیش آئی۔ ترکوں نے توپ خانے کو ایک باقاعدہ شعبے کی اہمیت
دی اور "توپ جبلر" کا فوجی شعبہ قایم کیا۔ اس شعبے کا ہیڈ کوارٹر استنبول
تھا اور یہاں نہ صرف توپ سازی، دیکھ بھال اور مرمت کا کام
کیا جاتا بلکہ ڈھلائی کے مراکز پر بھی نظر رکھی جاتی۔ شروع شروع
میں ترک توپوں کے بجائے صرف دھات لے جاتے تھے اور بوقت
ضرورت میدان جنگ میں ہی ڈھلائی کر لیتے لیکن محمد ثانی کے بعد یہ
طریقہ کار ختم ہو گیا۔ ذرائع آمدورفت اور نئی ٹکنالوجی آجانے سے
یہ از خود فرسودہ ہو کر ختم ہو گیا۔

ذرائع عثمانی ترکوں کی توپوں کے کیمیائی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ زیادہ تر خالص کانسی سے بنی تھیں۔ بڑی اور بھاری توپوں کو
ایسے چھکڑوں پر لاد دیا جاتا تھا جن کو گھوڑے، بیل یا خچر کی قوت سے
چلایا جاتا۔ ہلکی توپوں کو اونٹ لے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ پہیے والی توپیں
عام ہو گئیں۔

دریائے ڈینوب کے کنارے عثمانی ترکوں نے ایک بحری بیڑا
بھی بنایا تھا جس میں چھوٹے بحری جہاز شامل تھے۔ ہنگری کے خلاف
جنگوں میں اسی بیڑے کے ذریعے توپوں اور دیگر اسلحہ کو لاتے لے جاتے
رہے۔ محمد ثانی نے سربیا اور بوسینا کے عیسائی کاریگروں کو ملازم
رکھا اور ان کی ماہرانہ صلاحیتوں سے ڈھلائی اور لڑائی دونوں میں
فائدہ اٹھایا۔ نیز یورپی ممالک مثلاً نورمبرگ، برطانیہ، اٹلی، المانیہ
فرانس اور پرتگال سے ماہرین کو بلا کر اُن سے فائدہ اٹھایا۔

محمد ثانی کے بعد رفتہ رفتہ عثمانی ترک، یورپی ترقی کا ساتھ نہ
دے سکے۔ اٹھارویں صدی میں بھی وہ پچھلے زمانوں کی ٹکنالوجی پر
جمے رہے۔ چنانچہ ۱۷۳۹ء میں عثمانی ترکوں نے اچھے مشوروں کو نظرانداز
کیا، جس کی وجہ سے بلغراد کے محاصرے میں منہ کی کھائی۔

ایران میں توپ خانے کا آغاز صفوی بادشاہت کے دوران
ہوا۔ دو قسمت آزما انگریز جنگ باز سر انتھونی شرلے اور سر رابرٹ
شرلے نے شاہ عباس اول کے عہد میں ایران کو توپ خانے سے روشناس
کرایا۔ یہ دونوں دسمبر ۱۵۹۸ء میں ایران پہنچے۔ یہ کل ۲۶ افراد تھے جن
میں سے ایک توپ ساز تھا۔ انھی ۲۶ افراد میں سے ایک ایبل پنکن کا بیان
ہے کہ قبل ازیں ایرانی لوگ توپ خانے سے محروم تھے لیکن ایک دوسرے
والے کے مطابق ایرانی بادشاہ کے پاس توپیں تھیں اور عثمانی ترکوں سے
بھاگے ہوئے کچھ ماہر بھی اس کے ملازم تھے۔ ۱۶۳۴ء تک ایرانیوں کے
پاس ۵۰۰ توپیں ہو چکی تھیں۔ تاریخی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ شرلے
برادران کی وجہ سے ایران میں توپ کو فروغ ضرور ملا لیکن توپ کا
علم پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

شاہ عباس اول کے عہد میں ایرانی فوج طاقت ور رہی۔
پھر اس کے جانشین شاہ صفی (۱۶۱۲ء) نے فوج کا زور اور تعداد
کم کر دی۔ شاہ عباس ثانی (۱۶۶۶ء) کے دور میں تو فوج کی نوعیت
گھٹ گیا۔ اس لیے کہ توپ خانے کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔

۸ مارچ ۱۷۲۲ء کو جب ایران و افغانستان کی جنگ گلن آباد کے مقام پر ہوئی تو ایران نے شکست کھائی۔

ہندوستان میں توپ یا توپ نما ہتھیار منجنیق کا پہلا استعمال راجہ داہر کے خلاف ۷۱۱ء میں محمد بن قاسمؒ نے کیا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق ۱۰۰۸ء میں محمود غزنویؒ نے آنند پال کے خلاف پشاور میں توپخانہ استعمال کیا۔ لودھی حکومتوں نے (۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء) توپ خانے کی اصلاح کی۔ ابراہیم لودھی نے بابر کے خلاف پانی پت میں ۱۵۲۶ء میں مارٹر توپیں بھی استعمال کیں۔

آٹھویں تا پندرھویں صدی عیسوی کے دوران دکن میں توپوں کا استعمال بڑھتا رہا۔ دکن کا تعلق عرب، ایران اور ترکستان سے تھا۔ اس سے وہاں سے توپ کی ٹکنالوجی اور تکنیک کار بآسانی میسر تھے۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق ۱۳۶۶ء میں سلطان محمود شاہ بہمنی نے اسلحہ سازی کا کارخانہ قایم کر لیا تھا۔ دکن کے مسلمان بادشاہوں میں وہ پہلا تھا جس نے یہ کام کیا۔ سلطان محمد بیقرہ نے ترک توپچیوں کی مدد سے ۱۵۰۹ء میں دیو کے مقام پر پرتگال کا ایک بہت بڑا جہاز ڈبو دیا لیکن گجرات (دکن) کے سلطان بہادر شاہ کو ہم عصروں میں سبقت رہی۔ اس کے میر توپچی رومی خاں نے کئی توپیں ڈھالیں بہتر توپ خانے کی مدد سے بہادر شاہ پرتگیزوں کے مقابلے میں کامیاب رہا۔ اس لحاظ سے یہ غلط تصور ہے کہ ۱۵۳۶ء میں بابر نے توپ خانے کا پہلا استعمال کیا تھا بلکہ اس سے بہت پہلے یہاں توپ اور توپ خانہ موجود تھے۔

مغلوں نے توپ خانے پہ توجہ مرکوز رکھی۔ بابر کے پاس جو توپیں تھیں وہ ایک دن میں آٹھ تا سولہ بار چلتی تھیں اور پھر ان کو ٹھنڈا کرنا پڑتا تھا۔ اورنگ زیبؒ کے زمانے تک (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) توپ خانے کو بہت فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ اورنگ زیب نے نہ صرف مقامی بلکہ ترک، عرب، پرتگالی ملازم رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ توپ خانے کا ایک لندنی انجینئر سولہ برس ملازم رہا اور ۱۶۶۶ء میں واپس گیا۔

بھاری میدانی توپیں افغان اور دکنی حکمرانوں نے استعمال کیں۔ مغلوں میں ... بھی توپ ... کے مقام پر بنائی گئی ... کا نام

"جہنم گردی" تھا۔ ۱۵۹۷ء میں برہان نظام شاہ نے "ملک میدان" بنائی، جس کی تشکیل تانبے اور قلعی کی بھرت سے کی گئی۔ ملک میدان کا وزن ۴۰۰ من اور اس کے گولے کا وزن دس من ہے۔ دہانہ اتنا بڑا کہ آدمی آ جائے۔ ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کے بیٹے تخت کے لیے جھگڑ پڑے تو لاہور میں تین بڑی توپیں سامنے آئیں۔ ہر توپ کو ڈھائی سو بیل اور چھ ہاتھی مل کر کھینچتے تھے۔ سات توپوں نے لاہور کے قلعے سے میدان جنگ کا فاصلہ دس دن میں طے کیا۔ یہ فاصلہ چار میل تھا۔

توپ کی تاریخ

یورپ میں توپ کی پہلی شکل ۱۳۲۰ء میں سامنے آئی۔ شروع شروع میں لوہے کے تیر اس کے ذریعے چلائے جاتے تھے۔ پھر ان کی جگہ پتھروں اور لوہے کے گولوں نے لے لی۔ ان کی تشکیل میں لوہے اور کانسی کا زیادہ استعمال رہا۔

سولہویں صدی کی ایک توپ آج بھی ایڈن برگ قلعے میں رکھی ہوئی ہے جسے ۱۴۵۳ء میں بنایا گیا تھا۔

سولہویں صدی کے یورپ میں ایسی آرٹلری کی ابتدا ہوئی جس میں توپ خانہ استعمال ہوتا تھا۔ توپوں کو لانے اور لے جانے کے لیے جو چھکڑے استعمال ہوتے تھے، انھیں جانوروں کی قوت سے چلایا جاتا۔

توپوں کے شامل ہونے سے جنگ کے پرانے طریقوں میں انقلاب آ گیا۔ ۱۴۵۳ء میں کیسٹیلون کی جنگ برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہوئی۔ برطانیہ نے روایتی تیر کمانوں پر انحصار کیا جب کہ فرانس نے توپوں سے گولہ باری کی۔ چنانچہ فرانس نے کامیابی حاصل کر لی۔ ابھی برطانوی تیر انداز نشانہ درست کر رہے ہوتے تھے کہ کسی فرانسیسی توپ کا گولہ ان پر آ پڑتا تا۔ اس طرح "سو سالہ جنگ" میں فرانس نے فتح حاصل کی۔

۱۴۵۳ء میں ہی ترکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ ترک توپوں کے بھاری گولوں نے فصیل میں دراڑیں ڈال دیں اور بازنطینی سلطنت کا ہزار سالہ دور ختم ہو گیا۔

باقی صفحہ نمبر ۱۲ پر ملاحظہ فرمایئے

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸۔ شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

صوفی، سنت اور قومی یک جہتی

غلام یحییٰ انجم

آفتاب رسالت کی بے شمار کرنوں میں سے دو ممتاز درخشندہ کرنیں علما اور صوفیا ہیں۔ علما علم ظاہر کے معلم اور شریعت کے مبلغ ہوتے ہیں۔ جب کہ صوفیا علم باطن کے عامل اور طریقت کے رہنما ہیں۔ علما شرعی دلیلوں سے احکام شرع کی تعلیم دیتے ہیں اور صوفیا فیض باطن سے قلب کے تزکیہ کے بعد حقیقت شرع سے آگاہ کرتے ہیں۔

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اس کی صراحت اس طرح ملتی ہے۔

"طریقت و حقیقت کہ باں صوفیا ممتاز گشتہ ہر دو خادم شریعت اند پس مقصود از تحصیل آں ہر دو شریعت است نہ امر دیگر۔"[۱]

[طریقت و حقیقت جس سے صوفیا کو امتیاز حاصل ہے دونوں شریعت کے خادم ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کے حاصل کرنے سے شریعت ہی کی تکمیل مقصود ہے اور کوئی دوسری چیز نہیں۔"]

طریقت و حقیقت کی تعلیم ایک عرصے سے جاری ہے۔ دنیائے رنگ و بو میں صوفی کا وجود حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے جڑا ہوا ہے حضرت آدمؑ پہلے صوفی ہیں جو دنیا میں تشریف لائے اس کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام کو صوفی کے لقب سے نوازا گیا۔ مخدوم جہاں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ہے۔

"اول صوفی در عالم پیغامبر علیہ السلام بودہ است"

اسی مکتوب میں دوسری جگہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت شیثؑ کو صوفی کہا گیا۔ اصل عبارت کا ترجمہ یہ ہے :

"منقول ہے کہ جناب آدم علیہ السلام کو جو اولاد پیدا ہوتی اسے کسی نہ کسی پیشہ یا کام میں لگا دیتے۔ جتنے فرزند پیدا ہوئے انھیں ان کے مزاج کے مطابق کام میں لگا دیا۔ جب حضرت شیث علیہ السلام پیدا ہوئے تو انھیں ابتدا ہی سے خلوت نشینی محبوب تھی لہٰذا جناب آدم علیہ السلام سوچ میں پڑ گئے کہ آخر اُن کی طبیعت کے مطابق کون سا کام ہے جس میں اُن کو لگایا جائے۔ اسی فکر میں تھے کہ جبریل آئے اور کہا الشیث صوفی [شیث صوفی ہیں]"[۳]

زمانہ نبوت اور بعد کے ادوار میں صوفیا کی مقدس جماعت رہی مگر اس دور میں علامہ ابوالقاسم القشیری کے قول کے مطابق اس کے مفہوم میں کافی وسعت ہو گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں :

ھذہٖ التسمیۃ غلبت علیٰ ھذہٖ الطائفۃ فقال الرجل "صوفی" وللجماعۃ "صوفیۃ" ومن یتوصل الیٰ ذالک یقال

★ شعبہ دینیات سنی، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

لہٗ "متصوف"، وللجماعۃ "متصوفہ"

[یہ نام (صوفی) اس جماعت (مشائخ) کے لیے کثیرالاستعمال ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایک شخص کو صوفی کہا جانے لگا اور پوری جماعت صوفیہ کہلانے لگی اور جو ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنے لگے اور ایک شخص ہو تو متصوف کہلائے گا اور پوری جماعت کو "متصوفہ" کہا جائے گا"]۔ ؎۴

مذکورہ بالا عبارت کے علاوہ لفظ صوفی کی ابتدا اور آغاز کے بارے میں علما کے مختلف اقوال ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ صوفیا کی جماعت ہر دور میں رہی اور ان کی تعلیمات تمام اقوام عالم کے لیے ہمیشہ سے عام رہی صاحب قوت القلوب نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

" زمانہ کے جلیل القدر علما فقہا، صوفیا کی تعلیم سے بہرہ در رہتے ہیں۔ امام شافعی علیہ الرحمہ کے جلالت علمی کا اعتراف کسے نہیں مگر جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش آتا تو امام شافعی حضرت شیبان راعی جو وقت کے معزز ترین صوفی تھے ان کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مسئلہ کا حل ڈھونڈھتے"۔ ؎۵

اسی طرح ہر زمانہ میں صوفیا کا دربار مشکلات میں الجھنے والوں کے لیے مشکل کشا رہا ہے۔ حیاۃ القلوب کے مصنف نے ایسے صوفیا کی ایک مختصر فہرست دی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمات ہر صدی ہر قرن کے لیے مشعل راہ رہی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ زمانہ صحابہ میں خلفائے راشدین کے علاوہ حضرت ابو الدرداؓ، حضرت عکاشہ حضرت سلمان فارسی وغیرہم۔ دور تابعین میں امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ، حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت خواجہ حسن بصریؒ اور حضرت محمد بن سیرینؒ وغیرہم اور دور تبع تابعین میں واحد بن زیدؒ، حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت ابراہیم بن ادھمؒ، حضرت داؤد طائیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ وغیرہم علیہم الرحمۃ والرضوان کے علاوہ تینوں ادوار میں ایسے لوگ تھے "ممن لا یحصی عددھم" جن کی تعداد بیان سے باہر ہے۔

صوفی کی طرح سنت بھی عرصہ دراز سے دنیا میں پائے جاتے رہے ہیں۔ ہندوستان سنتوں کا دیش رہا ہے۔ یہ لوگ دنیا و مافیہا سے قطع تعلق رہ کر ایک پالنہار کی پیروی اس طرح کرتے ہیں گویا ان کا پالنہار انھیں دیکھ رہا ہے۔ ہمیشہ ایک پالنہار کا خوف ان پر مسلط رہتا ہے۔ دنیا کی خرافات سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اپنے مذہب اور دھرم کی تعلیم ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہندو دھرم یا کسی مذہب کا ماننے والا انسان جو اپنے استاد یا گرو کی رہنمائی میں کچھ خاص اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے اپنی آتما یعنی روح کی پاکیزگی کے لیے بھگتی کی راہ پر چلتا ہو، اسے سنت کہتے ہیں۔ ایسے سنتوں میں کبیر، ملک محمد جائسی، علاء الدین، تلسی داس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی تعلیمات میں جہاں مذہب اور مذہب کے خالق سے سچا لگاؤ اور تعلق خاطر کا ثبوت ملتا ہے، وہیں آپسی میل و محبت اور بھائی چارہ کا درس بھی ملتا ہے۔ وہ ہندو نہ مسلمان بلکہ سچا انسان بننے کی تعلیم دیتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان سنتوں کا دربار ہمیشہ سب کے لیے کھلا رہتا تھا اور ہے۔

ان صوفیا اور سنتوں کی تعلیمات میں مذہبی تعصب اور باہمی منافرت کا دور دور تک پتا نہیں۔ وہ لوگ آپس میں مل جل کر رہنے کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کی تعلیمات میں خلق حسن، احسان، جود و کرم، ہمدردی، غم گساری، خیر اندیشی، منفعت رسانی کا کام نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ نظام الدین اولیا کی تعلیمات میں سے ہے کہ کسی انسان کو اذیت پہنچانا اللہ جل مجدہ کو دکھ پہنچانا ہے۔ چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی جس میں لکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچاؤ"۔ ؎۶

ان کی تعلیمات میں سے یہ بھی ہے کہ بدی کا بدلہ نیکی سے دو۔ وہ فرماتے تھے کہ اگر کوئی کانٹا رکھے اور تم بھی کانٹے رکھو تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں گے۔ ؎۷

مخدوم نصیر الدین چراغ دہلوی صبر و شکر کی تعلیم دیتے تھے فرماتے تھے کہ درویش کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ تم درویش ہو دوسرے

ظلم کریں تو اسے معاف کر دیا کرو۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ فقر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ الصوفی غنی من اللہ صوفی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے غنی ہو۔ اس واسطے کہ اس کو دنیا کی طرف سے کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ صرف اور صرف خدا تعالیٰ سے طلب کرتا ہے اور غنی ہوجاتا ہے۔ [۸]

مختصر یہ کہ صوفیا کی تعلیمات بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہبری کے لیے شمع راہ ہیں۔ آج صحیح طریقے سے اگر ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو انسانوں کی آپسی خلیج ختم ہو سکتی ہے اور بھائی چارہ کا ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔

صوفیا اور سنتوں کی تعلیمات میں سب سے اہم تعلیم جو نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ قومی یک جہتی ہے۔ خواہ وہ کوئی بھی صوفی سنت کیوں نہ ہو قومی یک جہتی کی تعلیم سب کے یہاں پائی جاتی ہے۔

حضرت شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ کا شمار گیارھویں صدی ہجری کے اہم اور جلیل القدر صوفیا میں ہوتا ہے۔ ولادت تو بلگرام میں ہوئی مگر وطن مارہرہ کو بنایا۔ سید محمد امین لکھتے ہیں:

> انھوں نے ہندو مسلم ایکتا کی بنیاد رکھی اور انھوں نے اپنے آپ کو ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر بنا کر پیش کیا اور اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھا۔" [۹]

شاہ برکت اللہ اپنی کتاب پیم پرکاش میں لکھتے ہیں۔

> پیمی ھندو ترک موں ہر رنگ رہو سمائے
> دیول اور مسیت موں دیپ ایک ہی بھائے [۱۰]

شاہ صاحب اس شعر میں کھلے لفظوں میں ہندو مسلم ایکتا کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی قدرت کے جلوے دونوں میں ملتے ہیں۔ مندر اور مسجد میں جلنے والے چراغ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں قومی یک جہتی کی تعلیم ملتی ہے۔ ان کے نزدیک ہندو مسلمان اگرچہ دونوں دو قومیں ہیں سب اپنے مذہب۔ مسلک کے اعتبار سے جداگانہ درجہ رکھتے ہیں

مگر انھوں نے اسے مناسب نہ سمجھ کر اپنے ۱۶۷ ویں مکتوب میں لکھا ہے:

> "بداں و آگاہ باش کہ پروردگار ما و شما بلکہ پروردگار عالمیاں چہ سموات چہ ارضین و چہ علیین و چہ سفلین یکے است۔" [۱۱]
>
> (ہمارا تمہارا ہی نہیں بلکہ آسمان و زمین اعلیٰ و اسفل سب کا ایک ہی خالق ہے۔")

ان کی تعلیمات سے واضح ہے کہ جب ہم سب ایک ہی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں تو پھر آپس میں بغض و عناد اور بھید بھاؤ کیسا۔ ہم سب کا خالق ایک ہے۔ ہم سب کو ایک اور متحد ہو کر رہنا چاہیے

قومی یک جہتی کے باب میں بھکتی تحریک کا ذکر بے حد ضروری ہے کیوں کہ اس تحریک کی اساس ہی قومی یک جہتی پر ہے۔ اس کے بانی چیتنیہ دیو تھے جن کا زمانہ (۱۵۲۳ — ۱۴۸۴ م) ہے۔ یہ ایک سچے سنت تھے۔ انھوں نے بنگال کے چشتی بزرگ حضرت نور قطب العالم علیہ الرحمۃ کی روحانی تعلیمات سے استفادہ کیا ہے۔ اس تحریک کے پیروکار ہندو مسلمان دونوں تھے۔ انھوں نے ذات پات، رنگ و نسل اور آپسی اختلافات کو دور کر کے بنگال کے لوگوں میں بیداری کی نئی لہر دوڑادی اور ساتھ ہی بھید بھاؤ اور باہمی بغض و عناد کا جنازہ ہی نکال دیا۔ [۱۲]

سکھ گروؤں کی تعلیمات کی اساس ہی قومی یک جہتی پر ہے۔ انھوں نے جو صدائے روحانی بلند کی۔ اس کی تہہ میں اسی ایک جہتی کا وجدان و شعور کام کر رہا تھا۔ سکھ مت کے بانی گرو نانک کا کہنا ہے کہ مذہب کا راز اس طرح رہنے میں ہے کہ دنیا تم پر غالب نہ آسکے۔ [۱۳]

انھوں نے ایک زبردست مکاشفہ کے بعد پہلی مرتبہ زبان کھولی تو اُن کے منھ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے:

> " نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان۔" [۱۴]

ان کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب اخوت و مساوات اور قومی یک جہتی کا بہترین صحیفہ ہے۔ سیر مذہبی گرنتھ میں عموماً ایک ہی مذہب کے ہادیوں کا پیغام ہوتا ہے مگر گرنتھ صاحب سکھوں کے دس گروؤں

کے علاوہ دیگر کئی فرقوں کے سادھوؤں، سنتوں کے کلام اور ارشادات بھی شامل ہیں۔ آج بھی اُن کے ہر روحانی دربار میں گردؤں کے بانی کے ساتھ شیخ فرید، کبیر، مدنا اور روائداس جیسے کئی سنتوں کے ارشادات بھی بڑے احترام کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

اگر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ سکھ دھرم کی بنیاد ہی دراصل مختلف فرقوں کے باہمی اتحاد کے پیش نظر رکھی ہے۔ چنانچہ گرد ارجن سنگھ کو جب امرتسر کے گرودوارہ "ہرمندر صاحب" کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے کسی روحانی مہاتما کی ضرورت پڑی تو انھوں نے اس مبارک کام کے لیے ایک مشہور مسلمان "پیر سائیں میاں میر" سے درخواست کی۔ چنانچہ ہرمندر صاحب کا سنگ بنیاد حضرت میاں میر ہی کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ یہ مشہور مذہبی تیرتھ اگرچہ گرودوارہ تو سکھوں کا ہے لیکن نام ہری مندر صاحب؟ سے گمان ہندوؤں کے دھرم استھان کا ہوتا ہے۔"[15]

کبیر داس (فوت ۱۵۱۵ء) ضلع بستی میں مگھر کے رہنے والے تھے وہ ایک سنت اور صوفی منش انسان تھے۔ قوم و ملت سے ورے وہ انسانوں کے رہنما تھے ان کے دربار میں آج بھی اگر ایک طرف ہندو پوجاپاٹ کرتے ہیں تو دوسری طرف مسلمان جبین عقیدت جھکا کر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پوتھی پوتھی پڑھے جگ موا پنڈت نہ ہوئے کوے
ڈھائی اکھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوسے [16]

کبیر کے اس دوہے میں قومی یک جہتی جس کا سارا دارومدار آپسی تعلقات پر ہے نمایاں اور واضح ہے۔

رجب داس نے کہا کہ تمام مذاہب میں جو بات عام طور سے پائی جاتی ہے وہی سچائی ہے جو دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی وہ جھوٹ ہے۔

سب سانچ ملے سو سانچ ہے نہ ملے سو جھوٹ" (۱۷)

سنت ملوک داس نے کہا ہے کہ میرے لیے جو غیر مرئی روحانیت ہے وہی اللہ ہے وہی برہم ہے، وہی خالق ہے وہی خدا ہے مجھے تو فرق نظر نہیں آتا، فرق تو مایا سے پیدا ہوتا ہے۔ رام میری جان ہیں، رحمٰن میرے دین و ایمان۔ میں اب تو سارا فرق بھول گیا ہوں

الکھ اللہ برہم خالق خدا ہے ایک
میرے تو ابھید بھاؤ مایا متی کھوتی ہے

رام میرے پران رحمٰن میرے دین ایمان
بھول گیو بھیا سب لوگ لاج دھوتی ہے [18]

مہاتما تلسی داس نے مذہب کی سیدھی سچی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ دوسرے کی بھلائی کے برابر دوسرا کوئی مذہب نہیں اور دوسروں کو تکلیف دینے کے برابر کوئی ذلیل کام نہیں۔

پرہت سرس دھرم نہیں بھاتی
پرپیڑا الم نہیں ردھمائی" [19]

اس طرح صوفیا اور سنتوں کی تعلیمات میں قومی یکجہتی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے انھیں صوفی سنتوں میں سے گوالیار کے درویش محمد غوث شاہ گوالیاری بھی تھے۔ ۹۳۶ھ میں جب بابر نے راجہ چندیری کو چندیری کے بدلے شمس آباد دینے کو کہا مگر جہاں اس نے انکار کیا اور معاملہ لڑائی تک پہنچا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چندیری ۹۳۶ھ میں فتح ہو گیا۔ اس کے بعد بابر شیخ گھورن کو لے کر حضرت شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ وہاں سے واپسی میں کچھ ایام گزرنے کے بعد کسی موقع سے شیخ گھورن نے بابر کی خدمت میں ایک سیر انگور پیش کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بابر اس سے اتنا خوش ہوا کہ گوالیار شیخ گھورن کے سپرد کر دیا اور شہاب الدین خسرو اور شیخ محمد غوث درویش گوالیاری کو اس کا قلعہ دار منتخب کیا۔[20]

گوالیار کے دوسرے جلیل القدر صوفی حضرت شاہ خانون علیہ الرحمۃ ہیں ان کی سال ولادت ۸۵۳ھ اور سنہ وفات ۹۴۰ھ ہے۔ کل ۸۷ سال زندہ رہے۔ وہ شیخ اسمٰعیل کے خلیفہ ہیں اور خواجہ شیخ حسین ناگوری سے بھی خرقہ خلافت ملا تھا۔ اس طرح ان کا سلسلہ صرف ۵ واسطوں سے سلطان التارکین شیخ حمید الدین ناگوری سے جا ملتا ہے جو اپنے زمانے کے انتہائی معتبر رسیدہ بزرگ تھے۔ [21]

مذکورہ بالا ہر دو صوفیا کی تعلیمات میں قومی یک جہتی کو اہم مقام حاصل ہے اور آپسی میل ملاپ کا عنصر نمایاں ہے۔

صوفیا سنتوں کی تعلیم سے مذاہب کے بنیادی جذب میں کہیں فرقہ پرستی اور مذہبی فرق کا احساس نہیں ابھرتا۔ ان کی تعلیمات میں لوگوں کو آپس میں مل جل کر رہنے، صلح و آشتی اور محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کی غم و خوشی کی محفلوں میں شریک ہونے کا پتا چلتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے تو واضح طور پر مذہب اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مذہب لوگوں میں جدائی نہیں بلکہ میل ملاپ پیدا کرنے آیا ہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

سنت دادو دیال نے ہندو مسلم اتحاد اور باہمی میل ملاپ کے بارے میں لکھا ہے ؎

دونوں بھائی ہاتھ یک دونوں بھائی کان
دونوں بھائی نین ہیں ہندو مسلمان

اس طرح صوفیا اور سنتوں کی تعلیم سے خلوص و محبت، رواداری اور وسیع المشربی کا جذبہ ابھرتا ہے اور نفسانی خواہشات کرودھ (غصہ) موہ (دنیوی وابستگی) لوبھ (لالچ) اہنکار (تکبر) بدیانتی اور چور بازاری سے دوری اور بد سے بدترین شی تصور کرنے کا پتا چلتا ہے۔

جب قومی یک جہتی کا اس قدر اعلیٰ نمونہ صوفیا اور سنتوں نے پیش کیا ہے تو اس زمانے میں ہم لوگ ان کی تعلیمات کو کیوں فراموش کر چکے ہیں۔ صوفی اور سنت میں کسی کی تعلیم میں نہ تو بغض و عناد اور نہ ہی مذہبی تنفر کی بو آتی ہے تو پھر اس زمانے میں آج کل ایک انسان دوسرے انسان کو اپنی خوراک بنانے پر کیوں تلا ہوا ہے وہ کون سے عناصر ہیں اور کون سے اسباب ہیں جس کی بنا پر ایک بھائی اپنے بھائی کو نگل لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس زمانے میں قومی یک جہتی کیوں نہیں رنگ و نسل کا تفاوت کیسا قبیلہ و خاندان میں جنگ و جدال کیوں، وحشت و درندگی کیسی۔ یہ تمام چیزیں کسی ایک قوم کی میراث نہیں بلکہ معاملہ جانبین سے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی طرف سے کم کسی طرف سے زیادہ۔ آج ہندوستان جیسے سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔ قومی یک جہتی کے نام کتنے جلسے، جلوس حکومت ہند کرواتی ہے کتنے نعرے لگتے ہیں، کتنے پرچے چھپتے ہیں مگر آپ یقین جانئے کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں نفرت، عناد اور بیگانگی کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہی لوگ اس میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قومی یک جہتی کا نعرہ کب سے لگایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں سرگرمیاں کب سے جاری ہیں مگر ابھی تک اسے کامیابی نہیں مل سکی ہے۔

جب تک فسادات، نسل کشی، مذہب کی بیخ کنی، وحشیت و بربریت کا اس ملک سے جنازہ نہیں نکلے گا اور اکثریت والے اقلیت فرقے کو اپنا بھائی نہیں رہنے دیں گے تو اس وقت قومی یک جہتی کا درخت نہ تو پنپ سکتا ہے اور نہ ہی بار آور ہو سکتا ہے۔ قومی یکجہتی کے جو علمبردار اور دعوے دار ہیں ان سے میری گزارش ہے کہ اگر وہ واقعی صوفیا اور سنتوں کی تعلیم قومی یک جہتی کو دوبارہ اسی ہندوستان میں زندہ کرنا چاہتے ہیں تو مفکر اسلام علامہ اقبال کی نظم "شوالہ" کے چند بند ضرور پیش نظر رکھیں۔

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

حوالہ جات

۱۔ عبدالمصطفیٰ اعظمی معمولات الابرار ص ۱۳۰ مطبوعہ الہ آباد ۱۹۷۷ء
۲۔ مخدوم جہاں دہلی اکتوبر ۱۹۸۸ء ص ۱۷
۳۔ ایضاً ص ۱۷
۴۔ عبدالمصطفیٰ اعظمی معمولات الابرار ص ۱۹

۵ عبدالمصطفیٰ اعظمی ۔ معمولات الابرار ص ۲۲

۶ مخدوم جہاں ص ۳۵

۷ ایضاً ص ۳۵

۸ ایضاً ص ۲۱

۹ سید محمد امین ۔ شاہ برکت اللہ حیات اور کارنامے کانپور، ۱۹۸۰ء ص ۱۰۲

۱۰ سید محمد امین ۔ شاہ برکت اللہ حیات اور کارنامے کانپور، ۱۹۸۰ء ص ۵۷

۱۱۔ مجدد الف ثانی۔ مکتوبات امام ربانی استانبول ۱۹۷۷ء ص ۲۷۷

۱۲ مخدوم جہاں ص ۳۴

۱۳ ہربنس سنگھ گرونانک پٹیالہ ص ۱۱۸

۱۴ ایضاً ص ۱۲۶

۱۵۔ ماہنامہ شاعر، قومی یکجہتی نمبر، بمبئی، ۱۹۷۴ء جلد ۴۵ ص ۱۰۲

۱۶۔ مخدوم جہاں ص ۳۳

۱۷۔ شاعر قومی یکجہتی نمبر ص ۹۷

۱۸۔ ایضاً ایضاً ص ۹۷

۱۹۔ ایضاً ایضاً ص ۹۷

۲۰۔ راجی محمد اخبار الجمال مخطوطہ ص ۲۵۸

۲۱۔ غوث شطاری غوث الابرار لاہور ۱۳۲۶ھ ص ۲۳۴

۲۲۔ شاعر قومی یکجہتی نمبر ص ۹۳

۲۳ ایضاً ایضاً ص ۱۱۰

۲۴۔ علامہ اقبال بانگ درا طبع دوازدہم ۱۹۴۸ء ص ۸۶

"بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں، کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجے سے نہایت پست درجہ مذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجے سے ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے پر پہنچ گئیں۔"

سرسید ؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

احسن تقویم

ریاض الدین احمد*

انسان کو جو صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ وہ کسی جاندار مخلوق کو نہیں ملیں - اس کو حیرت انگیز نفضل وکمال کا نمونہ بنایا گیا - اس لحاظ سے اس کی جسمانی ساخت بھی نادر ونایاب ہے - یہ ایک ایسی مشین ہے جو عام مشینوں سے اعلیٰ وافضل ہے - آیئے ذرا دیکھیں کہ اس مشین کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور صانع قدرت نے اس میں کیسے کیسے کمالات رکھے ہیں۔

جسم انسانی بہت سی مشینوں کا مجموعہ ہے - ہر مشین اپنے فرائض منصبی الگ الگ بھی ادا کرتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی ان میں اتحاد عمل ہے - ہر مشین کو چلنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو توانائی مختلف ذرائع سے فراہم کی جاتی ہے - انسانی مشین کو توانائی اس کی غذا سے حاصل ہوتی ہے -

انسانی جسم اگرچہ مشین کی طرح ہے مگر ساخت اور کاریگری میں یہ عام مشینوں سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے - یہ ایسے ایسے کام انجام دیتی ہے جو مشینوں کے دائرہ عمل سے بہت آگے ہیں۔ مثلاً انسانی جسم میں نمو ہے، مشین میں مفقود ہے - انسانی جسم ایک خلیے سے شروع ہو کر لاکھوں خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے - یہ اپنے خراب اور بوسیدہ اجزا کو خود بخود تبدیل کر لیتا ہے - انسانی جسم کے تقریباً دو ملین خلیے روزانہ خراب ہو جاتے ہیں، ان کی جگہ فوراً نئے خلیے لے لیتے ہیں - انسان کا جسم ہر وقت ایک تغیر نو میں مبتلا رہتا ہے - ہر ۱۵ سے ۳۰ دن کے اندر اس کی اوپری کھال بدل جاتی ہے - سیکڑوں بیماریوں سے اس کا جسم خود اپنا دفاع کر لیتا ہے - چھوٹے موٹے زخم خود ہی مندمل کر لیتا ہے - جسم کی مشین کے بہت سے حصے مثلاً دل اور گردہ یک لخت چلتے ہی رہتے ہیں اور کبھی آرام نہیں کرتے ایک ۷۰ سالہ انسان کا دل اس مدت میں ۴۶ ملین گیلن خون پمپ کرتا ہے اور اس کے گردے کی مدد سے ایک ملین گیلن خون کا فضلہ باہر آ چکتا ہے -

مصنوعی مشینوں کے برخلاف انسان حسیات کا مالک ہے حسیات کے استعمال سے وہ درجہ حرارت، روشنی اور آواز کی تبدیلیوں کا پتہ چلا سکتا ہے اور اندرون جسم کی بہت سی تبدیلیوں کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کے تمام اعضا، خود کار ہیں اور اپنے کو اندرونی تبدیلیوں کے مطابق خود ہی کر لیتے ہیں - یہ کام وہ ان پیغام بروں کی وجہ سے کر سکتے ہیں جو ان کے اعضا اور دماغ کے درمیان ۶۰ میٹر فی سکنڈ کی رفتار سے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

لیکن انسان کے جسم کا سب سے حیرت ناک پرزہ اس کا دماغ ہے دماغ ہی کی صلاحیتوں کی وجہ سے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ ملا ہے۔ اس کی عظمت اس کو تخیلات کی بلندیوں سے ہمکنار کر دیتی ہے - وہ اعلیٰ ترین نظمیں بھی بنا سکتا ہے اور تخیلات کی دنیا میں اڑ بھی سکتا ہے - وہ اپنے دماغ کو معمولی سے معمولی کام میں بھی لگا سکتا ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ ایجادات کرنے میں بھی - ایٹم کی توانائی کو باہر نکالنا اسی کے دماغ کا کرشمہ ہے۔

کوئی جانور وہ کیسا ہی فہیم کیوں نہ ہو اور کوئی کمپیوٹر وہ کیسا ہی کارگر کیوں نہ ہو، انسانی فکر کی پرواز کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

Source:
(World Book Encyclopedia Vol. - 9)

* جنرل سکریٹری، دینی تعلیمی کونسل - یوپی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۴ (اپریل ۱۹۸۹ء)

ھائیڈروجن بم کا بانی

ایڈورڈ ٹیلی

حمود الرحمٰن شاہین*

"۱۹۴۷ء میں میرا قول تھا۔ ایٹمی جنگیں کرۂ ارض سے نسل انسانی کو ختم کر کے رکھ دیں گی مگر آج اس بات پر میرا یقین بالکل نہیں۔ کیونکہ مقابلے پر مہلک اسلحہ بنا لینے کی وجہ سے کوئی بھی اپنی تباہی کو آواز نہ دے گا۔ فتح و شکست کا تو اب تصور ہی ختم ہو گیا ہے" ——— ان خیالات کا اظہار کرنے والا ہائیڈروجن بم کا خالق ایڈورڈ ٹیلر ہے۔

ماہر طبعیات ایڈورڈ ٹیلر نے اپنی زندگی میں تین چیزیں پیدا کی ہیں ایک بیٹا، ایک بیٹی اور ایک ہائیڈروجن بم! ہائیڈروجن بم کے بارے میں وہ خود ایٹمی توانائی کے نظریات پر بعض اوقات طعن و تشنیع بھی کرتا ہے اور مذاق بھی اڑاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جب انسان کے تحفظاتی امور پر ایک بین الاقوامی عدالت ہوئی تو اس نے بڑی گھن گرج کے ساتھ ایٹم بم کے موجد اوپن ہائمر کے خلاف بد زبانی سے کام لیتے ہوئے شہادت قلم بند کرائی تھی اور آج بھی وہ صدر امریکہ کے سائنسی مشیروں و یڈر اور ڈاکٹر مسٹر تیج لو کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔

وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے:

"میں بھی ایک انسان ہوں، کوئی مافوق الفطرت شے نہیں۔ غصہ اور رنج انسانی فطرت ہے۔ جب لوگ مجھ پر تنقید کرتے ہیں تو مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ چونکہ عام لوگوں کو صحیح صورت کا علم نہیں، اس لیے میں ان پر برس پڑتا ہوں۔ میری خوش قسمتی دیکھیے کہ پانچ سال پہلے مجھ پر دل کا شدید حملہ ہوا۔ بائی پاس آپریشن سے میری جان بچ گئی۔ اب میں ایک ایسی گولی استعمال کرتا ہوں جو دل و دماغ کے خون کی شدت کے اثرات کو کم کرتی ہے، خون کا دباؤ گھٹا کر نبض کو سست کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب میں غصے، نفرت اور دوسروں کی توہین کے جذبات پر قابو پا لیتا ہوں"۔

دیکھا گیا ہے کہ جب بھی اسے تند خوئی اور درشتی کا کچھ محسوس ہونے لگتا ہے ٹیلر قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے کہتا ہے:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ جب سے میں روزانہ یہ دوائی استعمال کر رہا ہوں، میں ٹھنڈے دل، حوصلے اور رواداری سے بات کرتا ہوں اور غصہ کھانے کی جگہ ... میں پڑ جاتا ہوں اب میرے خلاف کوئی توہین آمیز بات بھی کرے تو میں مزاحیہ لب و لہجہ اختیار کرتا ہوں جس سے مجھے سکون ملتا ہے"۔

سچی بات بھی یہی ہے کہ وہ غیر متعلقہ اور اجنبی لوگوں سے یہی طرز عمل اختیار کرتا ہے مگر اخبارات ہا ئد کے صحافی اپنے طویل انٹرویو میں اس پر جب چبھتے ہوئے سوالات کرتے ہیں تو وہ برملا اپنے ماضی کی فتنہ سازیاں اور جھگڑالو طبیعت کو تسلیم کر لیتا ہے۔ پھر اس نے سائنسی تحقیق میں جو مفادات حاصل کیے ہیں، ان سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر پانچ سال ہوئے جب وہ جوہری توانائی کے جائز و ناجائز استعمال پر ایک سیمینار میں تقریر کر رہا تھا تو چیتھڑوں میں ملبوس کچھ مظاہرین طرح طرح کے کتبے اٹھائے ہوئے مائیکروفون پر غل مچاتے ہوئے وہاں آ دھمکے۔ ایک نوجوان خاتون نے طنزیہ لہجے میں کہا، "مجھے پتہ ہے تم تو دوسروں کے رسیا ہو اور

* ایچ۔ اے آفندی روڈ، کراچی، پاکستان

بجانا اچھا بجاتے ہو؟" ٹیلر نے جواب دیا، "نہیں! میں تو باغ موزارٹ اور بیتھوون کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" خاتون نے طنزیہ کہا: "اچھا تو تمہارے خیال میں بیتھوون کو ہائیڈروجن بم کی منظوری دینے کا راگ الاپنا چاہیے تھا؟" خاتون کے اس فی البدیہہ طنز پر ٹیلر لاجواب ہو کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

۱۹۷۰ء میں جب سوشل اور پولیٹکل ایکشن پارٹی کے سائنسدانوں اور انجینئروں نے ڈاکٹر سینٹگیلو دکا سالانہ ایوارڈ ٹیلر کو جنگی خدمات کے سلسلے میں دینا چاہا تو ٹیلر نے نہایت غصے کی حالت میں انعام کا چیک واپس کر دیا۔ ٹیلر پر عموماً اعتراضات اور لے دے ہوتی رہی ہے۔ ازراہ طنز و مزاح اسے "اختیارات اور حکمرانوں کا خوشامدی ٹٹو اور سبھکاری" کہا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ جوہری توانائی قایم کرنے میں اس کا کردار اور مزید ایٹمی دھماکوں کی وکالت کرنے اور روس سے تخفیف اسلحہ کے معاہدے میں روڑے اٹکانے اور روگردانی ہے۔ نہ جانے کس خیال سے وہ ان لفظوں میں کہتا سنا گیا ہے، "جوہری جنگ دنیا کی تباہی کیے بغیر لڑی جا سکتی ہے اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ مہلک ترین اسلحہ سے کرۂ ارض کو تباہ کیا جا سکتا ہے یا پرخچے اڑائے جا سکتے ہیں تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیائی تابکاری اور بہت سی توانائی خلا کے بیرونی ماحول میں ضایع کریں۔"

کبھی کبھار وہ کہتا ہے کہ "قیامت کی پیشین گوئیاں کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ایٹمی بموں کے دھماکوں کو دھویں کے بہت بڑے کھمبی نما بادل کے تناظر میں دیکھ کر وسیع و عریض علاقے کی قیامت خیز تباہی کا تصور باندھ لیتے ہیں جو سراسر غلط ہوتا ہے۔"

اس کے برعکس ۱۹۴۴ء کے نوبل انعام یافتہ کولمبیا یونیورسٹی کے معروف ماہر طبیعیات آئی۔آئی۔ رابی کا خیال ہے، "ٹیلر کی انہی باتوں پر تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ جتنے بھی اہم حیاتیاتی معاملات ہیں، ان کے لیے ٹیلر زبردست خطرہ ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ٹیلر پیدا نہ ہوتا تو دنیا کے لیے کتنا اچھا ہوتا۔" ادھر فلکیات داں کارل ساگان اس سے قدرے نرم لہجے میں یوں کہتا ہے، "میرے خیال میں ہم لوگ اس شخص کے طرز عمل کو اچھی طرح عقل کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں جس نے خوفناک قسم کے نہایت مہلک ہتھیار ایجاد کیے اور پھر کمال ڈھٹائی سے سینہ تان کر کہتا ہے کہ فی الحقیقت یہ اچھی ہے۔"

ٹیلر کے مخالفین کے نزدیک جو بات سب سے زیادہ قابل اعتراض ہے، وہ یہ ہے کہ ٹیلر تباہ کن ہتھیاروں میں اپنی تمام تر ذہنی توانائیاں صرف کر کے اس پر اپنے جنگ جویانہ طرز استدلال کو بروئے کار لاتا ہے اور تباہی کے جواز میں طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتا رہا ہے۔ چونکہ ٹیلر ایٹمی توانائی کے نتائج پر شرمندہ ہے اور نہ ہی معذرت خواہ۔ اس لیے بڑی آسانی سے اسے پاجی اور ولن ثابت کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اگر اس کی وکالت کرنے والے کچھ لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس نے ہائیڈروجن بم خود تیار نہیں کیا تھا، صرف فارمولا بنایا تھا۔ لیکن مخالف سوال کرتے ہیں کہ ایک شخص راستہ ہموار کرتا ہے اور دوسرے اسے تیار کر لیتے ہیں تو اصل قصوروار کون ہوا؟ یہ لوگ اس کے حق میں کہتے ہیں کہ ٹیلر کوئی فاشسٹ بم ساز نہیں جب کہ اس کے حریف رابرٹ اوپن ہائمر نے ایٹم بم بنا کر لاکھوں انسان بھی ہلاک کیے اور پھر اپنی قوم کا مہاتما گاندھی بنا رہا۔ یاد رہے کہ اوپن ہائمر نے جنگ عظیم دوم کے زمانے کی لاس ایلموس ٹیم سے اپنی نگرانی میں ایٹم بم تیار کرائے اور ٹیلر کے بقول ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے سے قبل ظاہرین کی رائے عامہ کو اس کے حق میں ہموار بھی کیا تھا اور خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ جاپان اتنے جانی اتلاف پر شکست قبول نہ کرے تو مزید بم گرائے جائیں۔

اپنے مخالفین کو خم ٹھونک کر جواب دینے والا ایڈورڈ ٹیلر جس کے دل کا تین بار بائی پاس آپریشن ہو چکا ہے اب بھی اپنے کام میں اتنا ہی منہمک اور مشغول ہے جتنا کہ پہلے تھا۔ آپریشن کے دو ماہ بعد ہیوود کی سائنسی درس گاہ میں دس دس گھنٹے روزانہ کام میں معروف رہنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ سٹینس فورڈ کیمس لارنس لیومور نیشنل لیبارٹری میں جنگ عظیم دوم کے بعد مہلک ہتھیاروں کی تیاری کی پیش رفت کا عملی جائزہ لیتا ہے۔ اس نے نیویارک، بوسٹن اور واشنگٹن کا طوفانی دورہ کیا۔ جہاں ہتھیاروں کے موضوع پر مذاکرے اور گفت و شنید کی وہ سابق صدر امریکہ کا سب سے بڑا مشیر ہے جس نے ۱۹۸۳ء میں "ستارہ وار" کا پروگرام بنایا۔

مکمل انہماک کی زندگی گزارنا ٹیلر کے لیے کوئی نئی بات نہیں کیونکہ

اس کی فطرت میں سبقت، فضیلت اور شرف حاصل کرنا شامل ہے۔ ٹیلر ہنگری کے دارالحکومت بڈاپسٹ کے ایک اعلیٰ یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں لیو زیلارڈ اور یوجین وگنر جیسے نامور طبیعیات دان پیدا ہوئے اور ٹیلر کے ساتھ مل کر ایٹم بم کی تیاری کے لیے کام کرتے رہے۔ پھر ان کے ساتھ جان وان نیومان جیسا مشہور ریاضی دان بھی شامل ہوگیا۔ جس کی غیر معمولی شماریاتی ذہانت نے ہائیڈروجن بم کو حقیقت کا روپ دینے میں ان سے تعاون کیا۔

بچپن سے ہی ٹیلر بہت زیادہ ذہین تھا اور تعلیمی میدان میں چھلانگیں لگاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ ریاضی اس کا پسندیدہ مضمون تھا وہ بستر پہ لیٹے لیٹے ہی کئی بڑی بڑی گنتی زبانی کرتا رہتا۔ مثلاً ایک دن میں کتنے سیکنڈ ہوتے ہیں یا ایک سال میں گھنٹے اور منٹ ہوتے ہیں اور یوں رات گئے تک جاگتا رہتا۔ ٹیلر کا باپ اس کی ذہنی چالاکیوں اور کمالات سے بہت متاثر تھا مگر اسے اس وقت مایوسی ہوئی۔ جب ٹیلر نے یہ اعلان کیا کہ وہ ریاضی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ باپ نے اس سے کہا کہ ریاضی کے علم سے زندگی کا معیار بلند نہیں ہو سکتا۔ پھر باپ بیٹے میں کیمسٹری کے مضمون پر سمجھوتا ہو گیا۔ ٹیلر ماضی کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "میں نے اپنے باپ کو دھوکہ دیا اور معاہدہ پر قایم نہ رہا۔ میں کیمسٹری کی ریاضی کی تعلیم حاصل کرنے لگ گیا۔ چنانچہ دو سال بعد میرے باپ نے ہتھیار ڈال دیے اور مجھے کھلی چھٹی دے دی کہ میرے جی میں جو آئے وہی کروں"۔

ایک وقت آیا کہ ٹیلر کی نگاہیں ایٹمی نظریے کی پیش رفت پہ جم گئیں۔ اس کے ساتھ آئن اسٹائن کی کوانٹم میکانیات کی تھیوری بھی شامل تھی۔ یہ وہ نظریہ تھا جس نے دنیائے سائنس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلا گیا۔ جب وہ بیس سال کا ہوا تو ایک حادثے میں اپنا دایاں پاؤں ضائع کر بیٹھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب کہ اس کی عمر صرف ۲۲ سال تھی اس نے لائپزگ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کے لیے اس نے اپنا مقالہ وارنر ہیسن برگ کے مطالعے کی بنیادوں پر لکھا۔ وارنر وہ طبیعیات دان تھا جس نے آگے چل کر نازیوں کے لیے ایٹم بم بنانے کے لیے تحقیق کام کیا تھا۔ اس تحقیق نے ٹیلر کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ ہائیڈروجن بم کی تیاری کے لیے غور و فکر کرنے لگا۔

ٹیلر نے جرمنی کے شہر گوٹنگین میں مادے کے سالموں کی ساخت اور ترکیب پر بہت فاضلانہ تحقیقی کام کیا۔ وارنر یہودیوں کے سخت خلاف تھا اور بڑے ظالمانہ طریقے سے ان کا قلع قمع کر رہا تھا۔ ایسے حالات میں ٹیلر تنگ آکر جرمنی چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ ۱۹۳۵ء میں امریکہ پہنچا اور جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گیا۔ وہاں اس نے ایک روسی نژاد طبیعیات دان جارج گیموف کے ساتھ مل کر ریڈیائی تابکاری کی حالت پر تحقیق و مطالعہ جاری رکھا۔ اس تحقیق کے نتیجے میں اسے ایک نظریہ ہاتھ لگ گیا جسے "جان ٹیلر" کا نام دیا گیا۔ اس میں یہ انکشاف کیا گیا کہ خاص خاص سالموں میں قرار (ثابت قدمی) نہیں ہوتا۔

ٹیکساس یونیورسٹی کا طبیعیات دان جان وہیلر جو ٹیلر کا بہت مداح تھا کہتا ہے کہ "طبیعیات کے میدان میں اس کا کام مینارۂ نور کی حیثیت اختیار کر گیا، جس کی جگمگاہٹ نے طبیعیاتی مکتب فکر میں دُور دُور تک روشنی پھیلا دی۔" بطور سائنس دان یوجین وگنر بھی ٹیلر کی ذہانت کو بہت سراہتا ہے۔ چند سال ہوئے اس نے ٹیلر کی سوانح حیات لکھنے والے ایک مصنف کو بتایا تھا، "میں جتنے بھی صاحبان علم و دانش سے آگاہ ہوں ان میں ٹیلر سب سے بڑا صاحب فکر و تجسس اور انتہائی کارگر ذہن کا مالک ہے۔ آپ اس بات سے اندازہ لگالیں کہ میں آئن اسٹائن سے بھی آگاہ ہوں"۔ یہاں تک کہ معروف سائنس دان آئی آئی رابی اس کے جنگ عظیم دوم سے پہلے اور بعد کے تحقیقی کاموں کو یوں خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ "ٹیلر کا کام" نہایت عمدہ اور اعلیٰ سطح کا تھا۔ میں اسے سائنس دانوں میں سر فہرست تو شمار نہیں کرتا مگر کسی سے کم بھی نہیں سمجھتا"۔

یورپ میں دوسری جنگ عظیم چھڑنے سے سات ماہ پیشتر امریکی سائنس دانوں کو علم ہو گیا تھا کہ جرمن سائنس دان ایٹم کو توڑ کر ایٹمی توانائی حاصل کرنے کے طریقوں پر قادر ہو چکے ہیں۔ ادھر امریکہ میں ٹیلر کے رفیق کار لیو زیلارڈ نے دوسرے ساتھیوں کی ہمراہی میں جب یہ بھید حاصل کرلیا کہ اب جرمنی میں ایٹمی دھماکہ کرنا ممکن ہو گیا ہے تو اس نے اس بات پر زور دیا کہ البرٹ آئن اسٹائن کے دستخطوں سے ایک خط صدر روزویلٹ کو لکھا جائے، یہی ایک موثر طریقہ ہے جس سے حکومت امریکہ کو اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسے بھی جلد از جلد اپنے ایٹم بم بنانے کا پروجیکٹ

تیار کر لینا چاہیے۔ زیلارڈ نے اپنے دوست ٹیلر سے کہا کہ وہ اپنی کار نکالے آئن اسٹائن سے کے جائے مقام لانگ آئی لینڈ لے چلے۔

ٹیلر ماضی کو یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے: "چنانچہ میں نے ایٹمی طبیعات کے میدان میں زیلارڈ کے شوفر کے طور پر قدم بڑھانے شروع کیے"۔ خط کی دستاویز تیار کی تھیں۔ آئن اسٹائن نے اس پر متفق ہو کر دستخط کر دیے چنانچہ روزویلٹ کی منظوری سے مین ہٹن پراجیکٹ شروع ہو گیا۔ ابتدائی طور پر ایٹم بم بنانے کے لیے لاس الموس میں جو سائنسی لیبارٹری تھی، اس میں کام کرنے والی ٹیم میں ٹیلر نمایاں طور پر شامل تھا۔ دن رات کام ہوتا رہا اور پھر ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کا دن آ پہنچا جس روز امریکہ نے آزمائشی ایٹمی دھماکہ کر ڈالا۔ دنیائے سائنس کا یہ تاریخی واقعہ نیو میکسیکو کے مقام الاموگورڈو پر ہوا ٹیلر کہتا ہے: "میں قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے محو تماشہ تھا۔ آنکھوں پر گہرے سیاہ رنگ کے شیشوں کا چشمہ، چہرے پر لوشن اور ہاتھوں پر دستانے چڑھا رکھے تھے۔ میں سیدھا اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اُف میرے خدایا یکایک میری آنکھوں کے سامنے ایک دیو ہیکل ڈراؤنی بادل نما چیز نمودار ہوئی جسے دیکھ کر سنسنی سے میرا دل لرز اٹھا۔

بس اس واقعے کے بعد ٹیلر کا ذہن اس سے بھی زیادہ طاقتور ہتھیار بنانے کی طرف مائل ہو گیا۔ وہیں سے اس کی چپقلش آزاد خیال سائنس دانوں سے شروع ہو گئی۔ اوپن ہائمر سے بھی اس کا نزاع رہا۔ کیونکہ اس کے خیالات ٹیلر کے لیے تکلیف دہ تھے۔ وہ اوپن ہائمر کو اپنا رقیب تصور کرنے لگا۔ اسی جذبۂ رقابت یا مسابقت نے ہائیڈروجن بم کی تیاری کی تحریک پیدا کی۔ مگر ٹیلر کے بہت سے رفقائے کار اوپن ہائمر کی عظمت سے مرعوب ہو کر رہ گئے۔ ٹیلر کے لیے اس وقت حالات اور بھی خراب ہو گئے جب لاس ایلموس کے بم سازوں نے اس سے عدم تعاون کا اظہار کر دیا۔ چنانچہ ٹیلر جنگ سے پہلی کی نوکری پر چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے انریکو فرمی کے ساتھ مل کر شکاگو یونیورسٹی میں نیوکلیائی مطالعہ پھر شروع کر دیا۔ دوسرے سائنس دانوں کے برعکس اس کو یہ شک تھا کہ انشقاقی بم قوم کے تحفظ کے لیے ناکافی ہے اس سے بھی زیادہ طاقتور ہتھیار کی ضرورت ہے کیونکہ ایٹم بم دوسرے ممالک بھی بنا سکیں گے۔ اس کا ذہن ایک تھرمونیوکلر بم پر مرکوز تھا۔ جو دھماکے کی طاقت ہائیڈروجن کے ایٹموں کے انشقاق سے حاصل کرتا ہے۔ یہ خیال 'مین ہٹن پراجیکٹ' کے ایام سے ہی ٹیلر کے ذہن میں آ گیا تھا۔ سوویت یونین نے جب ۱۹۴۹ء میں اپنا پہلا کامیاب ایٹمی دھماکا کیا تو امریکہ والوں کے لیے یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی۔ اس پر ٹیلر بہت تلملایا اور زور دے کر اس سے زیادہ طاقتور انشقاقی بم پر اصرار کرنے لگ گیا۔ اس نے طاقت کے توازن کے حق میں بہت سے دلائل دیے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ حالات اس کے حق میں ساز گار ہو گئے۔ ہوا یہ کہ مارچ ۱۹۵۰ء میں ایک جرمن نژاد طبیعات دان کلاز فش پر، جو ٹیلر کے ساتھ لاس ایلموس میں جنگ عظیم دوم کے دوران کام کرتا تھا، یہ جرم ثابت ہو گیا کہ اس نے امریکہ کے بہت سے ایٹمی راز روس پہنچا دیے ہیں۔ کلاز فش کے مقدمے کے دوران ہی صدر ٹرومین نے اٹامک انرجی کمیشن کو حکم دیا "آگے بڑھو اور ہائیڈروجن بم بناؤ"۔ اس مقام پر ٹیلر نے بڑے ہی راز دارانہ انداز میں اس ہتھیار کی تیاری کے لیے دن رات عرق ریزی سے کام کیا۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں تاریخ عالم کا پہلا تھرمونیوکلر دھماکہ جنوبی بحر الکاہل میں کرۂ ارض پر نمودار ہوا۔ اس دھماکے کے نتیجے میں سمندر کی تہہ میں ۱۷۵ فٹ گہرا اور ایک میل وسیع گڑھا بن گیا۔ مگر اس کے اگلے ہی سال روس نے بھی ہائیڈروجن بم کا دھماکہ کر دیا۔

ٹیلر اور اس کے دوسرے ساتھی سائنس دانوں نے بعد میں گلہ کیا کہ امریکی ہائیڈروجن بم بہت پہلے تیار ہو سکتا تھا بشرطیکہ اوپن ہائمر اور اس کے ساتھی اخلاقی تعاون پیش کرتے۔ صدر آئزن ہاور نے بھی محسوس کیا کہ اوپن ہائمر مبینہ طور پر بائیں بازو کے زیر اثر ہو گیا ہے اور اس نے مستقبل میں ایٹمی اسلحہ بنانے سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر مقدمہ چلایا گیا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس کو ملک دشمن قرار دینے سے پہلے مقدمہ واپس لے لیا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اوپن ہائمر کی رہائی ٹیلر کی مرہون منت تھی جس کا وہ پہلے استاد رہا تھا۔ ٹیلر کا کہنا ہے، "میں نے اپنی شہادت میں یہی کہا تھا کہ اوپن ہائمر کے طرز عمل میں امریکہ کو نقصان پہنچانے کی کوئی نیت یا ارادہ کارفرما نہیں ہے۔ اس پر شک کرنا غلط ہے۔ وہ الزام سے پاک ہے"۔ اوپن ہائمر نے اپنی آئندہ زندگی پرنسٹن کے ایڈوانس اسٹڈی کی درس گاہ میں گزارنا شروع کر دی۔ ۱۹۶۳ء میں اسے

نیوکلیائی طبیعیات کی خدمات پر "فرمی ایوارڈ" دیا گیا۔ اس موقع پر مبارکباد دینے کے لیے ٹیلر پیش پیش تھا۔ اوپن ہائمر کے بارے میں اب بھی ٹیلر کا خیال یہ ہے۔ "وہ دلن تو نہیں مگر قابل تعریف بھی نہیں ہے۔ میں اوپن ہائمر پر جو بھی الزام لگاتا ہوں وہ اس کے شاگردوں اور رفقائے کار کے سبب ہے۔ وہ میری ہائیڈروجن بم کی تیاری میں کامیابی پر حسد سے جل گئے تھے تاہم میں رعونت پسند یا تنہائی پسند نہیں۔ میں دوسروں سے مل کر اور دوسروں کے تعاون سے کامیابی حاصل کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ میں اکیلا تو کچھ بھی نہیں۔ اگر میرے کچھ دوست کھوٹے ہیں تو اس وجہ سے کہ وہ میری ذہانت اور کامیابیوں سے حسد کرنے لگے تھے اس لیے طرح طرح سے مجھے انسانیت کا دشمن ثابت کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایٹم بم تیار کر کے نسل انسانی کو تہس نہس کرا دیا تھا۔ یہ لوگ مجھ پر الزام کیوں دھرتے ہیں جب کہ ہائیڈروجن کسی ایک انسان پر بھی نہیں آزمایا گیا۔"

ٹیلر نے اب مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ توانائی طبیعیات کے لیے وقف کر دے اور ہتھیاروں کی تیاری سے دست کش ہو جائے، مگر وہ کہتا ہے، "میرا ہتھیاروں کی تیاری کے میدان سے نکل جانا مناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ آج کے دور میں جس تیزی سے نئے نئے ہتھیار بن رہے ہیں اتنی ہی تیزی سے ان ہتھیاروں کی روک تھام کے لیے ہتھیار ایجاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر طاقت کا توازن یکساں رہے گا تو جنگوں کا خطرہ بھی نہ رہے گا۔ پچھلی جنگ عظیم میں صرف امریکہ کے پاس ایٹم بم تھا جس نے جاپان پر چلا کر اسے فتح کر لیا اگر جاپان کے پاس بھی ایٹم بم ہوتا تو امریکہ کبھی استعمال نہ کرتا۔ تیسری جنگ عظیم کو روکنا بہت ضروری ہے۔ جس کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی شدید ضرورت ہے۔ دوسرے سائنس دان اس پس منظر میں نہیں سوچتے۔ کرۂ ارض پر جوہری توانائی کا دور ہی اصل میں بڑی جنگوں کی روک تھام کا سبب ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ سائنس دان جو جنگ عظیم میں جاپان کو تباہ و برباد کرنے کے حق میں تھے اور وارننگ دیے بغیر جاپان پر بم گرائے جانے کے حق میں تھے، اب بموں کی تیاری کی مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔ یہ ایک ایسا تضاد ہے جو سمجھ سے بالاتر ہے یا پھر وہ لوگ میرے نظریات کو نہیں سمجھ رہے۔"

جب ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر اسے منٹوں میں تہس نہس کر دیا گیا تھا تو اوپن ہائمر نے بھگوت گیتا کا ایک مقولہ دہراتے ہوئے کہا تھا "میں ایسی موت بن گیا ہوں جو ساری دنیا کو تباہ کر سکتی ہے۔" اس کے برعکس ٹیلر کہتا ہے "انسانی زندگی کو وسیع پیمانے پر ختم کرنے کا گنہگار وہی شخص ہوگا جو اپنے ایجاد کردہ ہتھیاروں کو ناجائز استعمال کی اجازت دیتا ہے اور اس کی طاقت کا جائز استعمال کرنا نہیں جانتا۔" میں ہمیشہ سائنس دانوں کی ذمہ داری کو سیاست دانوں اور حکمرانوں کی ذمہ داریوں سے الگ رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حکمران اسلحہ کو استعمال کرنا نہیں جانتے تو پھر ان کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دنیا کو تباہ کرنے کا طریقہ کیوں بتایا جائے۔ سائنس دانوں کی خدمات کی اتنی گراں قدر قیمت نہیں ہونی چاہیے"۔ کس قدر حیرت ہے کہ جب اسے بابائے ہائیڈروجن کے نام سے پکارا جائے تو وہ کرب ناک احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس کے مخالفوں اور اس کے حامیوں کو یقین ہے کہ اسے تھرمونیوکلیئر توانائی کی تحقیق کی وجہ سے نوبل انعام مل سکتا ہے مگر اس موضوع پر ٹیلر بات کرنا یا سننا ہی گوارا نہیں کرتا۔ اس نے ایک دلچسپ بات بتائی۔ جب میں اسپتال میں ہارٹ سرجری کے زیر عمل تھا تو ایک نرس نے کہا: یہ بہت نامور ماہر طبیعیات ہے جو نوبل انعام یافتہ ہے۔ گلے میں ٹیوبوں کے باوجود میں نے سر ہلایا کہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا یا رسول اللہؐ! میرے اچھے برتاؤ کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تمہاری ماں"۔ کہا پھر؟ فرمایا: "تمہاری ماں"۔ کہا پھر؟ فرمایا: "تمہاری ماں" کہا پھر؟ فرمایا "تمہارے باپ"

(بخاری و مسلم)

یہ غلط ہے۔ مگر جب نرس نے کہا ہائیڈروجن بم کے خالق ہونے کے باوجود آپ کو نوبل انعام نہیں دیا۔ اس نے گلے کی ٹیوبوں کی پرواہ کیے بغیر زور لگا کر کہا "نہیں، نہیں، نہیں۔"

اب ٹیلر صدر امریکہ کی ہدایت کے مطابق امریکہ کے دفاع میں "جنگ ستارہ" (Star Wars) کی جو تیاری کر رہا ہے، اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتاتا۔ وہ الیکٹرانک سسٹم اور لیزر شعاعوں سے میزائلوں کو فضا میں تباہ کرنے کے تجربے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کی تفصیلات اس نے ابھی تک صیغۂ راز میں رکھی ہیں۔

ٹیلر سے پوچھا گیا کہ آپ کو لوگ کس وجہ سے یاد رکھیں گے تو اُس نے جواب دیا:

"اگر آپ مجھے اس کے جواب کے لیے مجبور کرتے ہیں تو میں کہوں گا "لیور مور" کے مقام کی وجہ سے۔ اگر مجھے کسی بات پر فخر ہے تو وہ اس مقام کی لیبارٹری ہے جس نے سائنس کو ایک نئی جہت دی یہیں دنیا کی طاقت کا توازن قایم کرنے کے لیے میں نے ہائیڈروجن بم بنایا تھا، یہی وہ مقام ہے جہاں دفاعی ہتھیاروں کا دوسرا دور شروع ہو چکا ہے۔

"ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملک میں آڑھت اور کمپنیاں قایم کریں جس سے اعلیٰ درجے کے تاجر پیدا ہوں، ملک کی پیداوار، قدرتی چیزیں جو زمین میں گڑی پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھا دیں۔ اس طریقے سے اپنے ملک میں اپنے ہی بھائی کا روپیہ لے کر فائدہ اٹھادیں، ملک میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ روپے کو کبھی اس تھیلی میں اور کبھی اس تھیلی میں ڈالنے سے روپیہ بڑھ نہیں جاتا جب تک کہ باہر سے لا کر اس میں روپیہ نہ ڈالا جائے۔ جب تم ایسا کرو گے، اس وقت بے شک جس طرح ہمارے ملک کا روپیہ دوسرے ملک میں جاتا ہے، ہم بھی دوسرے ملک کا روپیہ اپنے ملک کھینچ لادیں گے یہ سب باتیں ہم کو ہائی ایجوکیشن کے نہ ہونے سے حاصل نہیں ہوتیں۔"

— سرسید —

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

بین الاقوامی کانفرنس برائے ایٹمی و سالماتی طبیعیات ۔۔ ایک رپورٹ

صابرہ خاتون*

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعیات میں مرزا سعید الظفر چغتائی کی زیر نگرانی ۱۲۔ تا ۱۷ دسمبر ۱۹۸۸ء میں ساتویں کل ہند کانفرنس برائے ایٹمی و سالماتی طبیعیات منعقد ہوئی جس میں ۱۵۴ ملکی و غیر ملکی سائنس داں تشریف لائے۔ غیر ملکی شرکاء میں منیر نائفے 'اسٹرالنگ' ٹامس جارج اور وینکاٹیشورلو (امریکا)' وائی۔ این جوشی' پے نگلی اور رشید احمد (کنیڈا)' اف۔ ایچ۔ ایم۔ فیصل اور نشز (مغربی جرمنی) شماسورا (جاپان)' ضمیر الحسن (آسٹریلیا) منگ ہے (چین)' ادم جیک (پولینڈ)' محمد رفیع (پاکستان) اور ہمانشو شرما (نیپال) سے تھے۔ ان غیر ملکی مندوبین کی شرکت نے اس کانفرنس کو بین الاقوامی بنادیا۔

۱۲ دسمبر ۸۸ء کو صبح ساڑھے دس بجے کانفرنس کا افتتاح وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے کنیڈی ہال میں کیا۔ جلسہ کی صدارت انڈین سوسائٹی برائے ایٹمی و سالماتی طبیعیات کے صدر پروفیسر اس۔ سی۔ مکھرجی (کلکتہ) نے کی نظامت کی ذمہ داری پروفیسر چغتائی نے سنبھالی۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد فزکس کے شعبہ کے سینیئر پروفیسر ظل الرحمٰن خان نے شرکاء کو خوش آمدید کہا اور علی گڑھ کے شعبۂ طبیعیات میں ایٹمی و سالماتی طبیعیات کی تاریخ بیان کی۔ آپ نے فرمایا کہ اس مضمون کی داغ بیل پروفیسر سیمئل اور آر۔ کے۔ اسٹیکی نے ۱۹۳۰ء میں ڈالی تھی۔ بعد میں وینکاٹیشورلو کے تعاون سے اسے پھلنے پھولنے میں کافی مدد ملی۔

بعد ازاں انڈین سوسائٹی برائے ایٹمی و سالماتی طبیعیات کے سکریٹری۔ اے۔ ان۔ ترپاٹھی (رڑکی) نے اپنی رپورٹ پیش کی اور سوسائٹی کی مختصر تاریخ بیان کی۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۶ء میں اس سلسلہ کا پہلا ورک شاپ احمد آباد (PRL) میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد سے ہر تیسرے سال یہ ورک شاپ ملک کے مختلف اداروں میں ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں وشو بھارتی (شانتی نکیتن)' ۱۹۸۱ء میں رڑکی' ۱۹۸۲ء میں کلکتہ (I.A.C.S) ۱۹۸۴ء میں بمبئی (T.I.F.R) ۱۹۸۶ء میں بنارس (B.H.O) اور اب ساتواں ۸۸ ۱۹ء میں علی گڑھ میں۔ ان کانفرنسوں کا مقصد محض اس مضمون کے سائنس دانوں میں باہمی ربط و ضبط پیدا کرنا اور مضامین کو فروغ دینا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ جناب سید ہاشم علی نے یونیورسٹی کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ تقریباً سو برس پیشتر سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی قایم کی تھی جس کا مقصد سائنس کو فروغ دینا تھا انھیں کی قایم کردہ یہ یونیورسٹی سیکولرازم کی ایک زندہ مثال ہے۔ جہاں بغیر کسی تفریق کے ہر مذہب و ملت اور ہر فرقے کے لڑکے ایک ساتھ ہاسٹلوں میں رہتے ہیں اور ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔

مہمان خصوصی جناب اس۔ کے۔ مترا (T.I.F.R) نے خصوصی خطبہ پڑھا جس میں ایٹمی و سالماتی طبیعیات میں ہونے والی عالمی ترقی کا پس منظر

---

* ڈپارٹمنٹ آف فزکس' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ

بیان کرکے ہندوستان کی صورت حال بتائی۔

آخر میں پروفیسر چغتائی نے غیر ملکیوں کا تعارف اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاح کا خاتمہ یونیورسٹی ترانہ اور قومی ترانہ پر ہوا۔

پہلے سائنسی سیشن کا آغاز بعد دوپہر انجینیرنگ کالج کے اسمبلی ہال میں ہوا۔ اس سیشن کا پہلا لکچر منیر نلفے کا تھا۔ آپ نے بتایا کہ جب ہائیڈروجن کے ایٹموں کو بہت طاقتور برقی میدان میں رکھا جاتا ہے تو اُن کی ساخت میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور اس طرح نئے اقسام کے ایسے ایٹم بن سکتے ہیں جن کی طبعی اور کیمیاوی خصوصیات اور خواص انوکھے قسم کے ہوں۔ یہ کام لیزر شعاعوں کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ جن کے ذریعے الیکٹرونوں کو پروٹانوں سے کافی دور لے جاتے ہیں اور ایٹم کے نیوکلیئس جہاں چاہیں اپنی مرضی کے مطابق رکھ سکتے ہیں۔

دوسرا لکچر ٹی۔کے۔ بالا سبرامینیم (BARC) کا تھا۔ جس میں موصوف نے تجرباتی اور نظریاتی دو ایٹمی (DIATOMIC) طیف شناسی (Spectroscopy) کے کچھ مخصوص حصوں پر روشنی ڈالی۔

بمبئی یونیورسٹی کی روشن جہاں بیگم نے اپنا تحقیقی کام "نیوٹران ذرات کی مدد سے ایٹمی و مقناطیسی ساخت کا مطالعہ" بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ الیکٹران یا ایکس ریز کی مدد سے ایٹمی ساخت کے متعلق ہم اتنی معلومات فراہم نہیں کرسکتے جتنی کہ نیوٹران ذرات کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر بی۔ ادم چک کا موضوع شام کے سیشن میں روشنی اور گیس کا بہاؤ (Eff usion) زیر بحث رہا۔

۱۳ر دسمبر کو چار سیشن ہوئے۔ پہلے سیشن میں مغربی جرمنی سے آئے ہوئے بنگلہ دیشی پروفیسر۔ ایف۔ اچ۔ ام فیصل نے "تیز شدت کے لیزر کے ساتھ ایٹمی ٹکراؤ" پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بعد ازاں ٹامس جارج نے سطحوں پر لیزر طیف شناسی کے متعلق اپنے تحقیقی کام ... اور رمن طیف شناسی جیسے موضوع تصاویر ... ریاضیاتی فارمولوں کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی۔

دوسرے سیشن میں پی ونیکا تیشورلو نے جو فی الحال امریکا کی البامایونیورسٹی میں ہیں اور کئی برس تک علی گڑھ سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں، اپنا نیا اور پُرانا تحقیقی کام ہیلوجن سالموں پر پیش کیا۔ آپ کے بعد ڈاکٹر شمیم احمد (CEERI پلانی) نے مائیکرو الیکٹرانکس میں لیزر کی مدد سے تحقیق کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا اور ہندوستانی سائنسدان اور انجینیروں کو آواز دی کہ وہ یہ کام بہت اچھے پیمانے پر کرسکتے ہیں۔

سیشن کے آخر میں دی۔ بی۔ سٹیور (P.R.L احمد آباد) نے کوانٹم افراتفری (Chaos) کے بارے میں بتایا کہ یہ کیا ہے؟ کہاں دیکھا جاسکتا ہے اور اس پر وہ کیا تحقیق کر رہے ہیں۔

آج کا تیسرا سیشن (I.A.C.S) کلکتہ سے آئے ہوئے شرکاء کو ملا جس میں نظریاتی طبعیات کا دخل زیادہ تھا۔

شام کے سیشن میں بنارس کے پروفیسر ڈی۔کے۔ رائے نے سی۔ وی۔ رمن کی زندگی اور ان کی تحقیق پر تقریر کی۔

۱۴ر دسمبر کو کانفرنس کے تین سیشن ہوئے۔ صبح میں ولیم اسٹوالے نے لیزر طیف شناسی کے اہم پہلوؤں پر تبصرہ کیا۔ ان کے بعد ڈاکٹر ضمیر الحسن نے ٹھوس طبعیات کی تحقیق میں لیزر کے استعمال کے متعلق جدید ترین معلومات فراہم کیں۔ انھوں نے وہ میدان بتائے جن میں ابھی تحقیق کی کافی گنجائش موجود ہے۔

دوسرا سیشن طیف شناسی کے لیے وقف تھا۔ پروفیسر ڈینگلن نے نہایت جامع مگر سہل انداز میں ایک اور دو الکٹرانوں کی دھاری دار (Beam Foil) طیف شناسی پر اپنا کام بیان کیا۔ پھر کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر محمد رفیع نے ہائیڈروجن کے دو ایٹمی سالموں پر اپنا تحقیقی کام پیش کیا۔

بارک کے سائنس داں ڈاکٹر آفتاب احمد نے ایٹموں سے متعلق کئی ایسے تجربات بیان کیے جو حال ہی میں انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیے تھے۔ ان تجربات کی مدد سے ایٹموں کی نیوکلیائی خصوصیات معلوم کی جاتی ہیں۔ مثلاً نیوکلیئس کا گھماؤ، حجم اور شکل وغیرہ۔ بعد دوپہر یونیورسٹی میوزیم گیلری میں پوسٹر لگائے گئے اور ان پر تبادلہ خیالات ہوا۔

۱۵ر دسمبر کو تین سائنسی سیشن اور بعد دوپہر پوسٹر سیشن

ہوا۔ مغربی جرمنی کے ایچ۔ او۔ لنٹز (H. O. Lutz) نے ایٹمی جھنڈ (Atomic Clusters) کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ آپ نے بتایا کہ یہ جھنڈ نہ تو ٹھوس کی صف میں شامل کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی یہ ایٹم ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی طبعیات اور اپنی کیمیا ہے۔

ڈاکٹر شما مورا نے ہائیڈروجن سالموں کے متعلق اپنی تحقیق سے روشناس کرایا۔ پے ننگٹن کا دوسرا لیکچر دھار ہرت طیف شناسی پر ہوا۔ اس کے بعد وائی۔ ان جوشی نے اعلیٰ برقائے ہوئے ایٹموں کا تذکرہ طیف شناسی کی روشنی میں کیا۔ اس۔ کے۔ گوہارے (احمدآباد) آج صبح کے سیشن کے پانچویں سائنس داں تھے جنھوں نے ڈو کامک پلازما کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

شام کے سیشن میں ڈاکٹر ڈی۔ بی۔ دلوانگن (احمدآباد) نے نظریاتی تحقیق سے متعلق اپنا کام پیش کیا۔ کانفرنس کا آخری لیکچر پروفیسر اس۔ کے۔ مترا کا تھا جس میں انھوں نے 14.5.Mev کے Palletron کی ڈیزائن اور ساخت کے بارے میں معلومات فراہم کیں جو T.I.F.R میں لگایا گیا ہے۔

۱۶ دسمبر کو کانفرنس کے سبھی شرکا، تاج محل، سکندرہ اور فتح پور سیکری وغیرہ دیکھنے گئے۔ ۱۷ دسمبر کو صبح پوسٹر سیشن ہوا۔ اسی روز شام کو پانچ بجے اختتامیہ جلسہ ہوا، جس کی صدارت پرو وائس چانسلر جناب وصی الرحمٰن صاحب نے کی۔ چین کے پروفیسر منگ ہے (Ming Hai) نے پروفیسر چغتائی کو چینی اکادمی آف سائنس کی جانب سے ایک تمغہ اور رومال تحفتاً دیا اور ہندوستانی عوام اور سائنس دانوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔

آخر میں دی۔ بی۔ بشیورے جو سوسائٹی کے نائب صدر مقرر کیے گئے تھے، کانفرنس کے اختتام کا اعلان کیا۔

کانفرنس کے شرکا علی گڑھ سے بہت اچھا تاثر لے کر واپس گئے۔ کچھ لوگوں کو اس بات کا افسوس تھا کہ وہ اس سے قبل علی گڑھ کیوں نہیں آئے۔ فاضل اوقات میں شرکا، یونیورسٹی ہی گھومتے نظر آتے تھے۔ انھیں یہاں کا پرسکون ماحول بہت پسند آیا۔ ایک بنگالی خاتون نے تو یہاں تک کہہ دیا:

"You are living in Heaven"

[آپ لوگ جنت میں رہ رہے ہیں]

ایک شام علامہ اقبال، سرسید اور یونیورسٹی پر خان اشتیاق صاحب کی تیار کردہ فلمیں دکھائی گئیں جنھیں شرکا، نے بہت سراہا۔ یونیورسٹی ترانہ کی اتنی دھوم مچی کہ اردو نہ جاننے والے بھی اس کا کیسٹ خرید کر ساتھ لے گئے۔

مختصراً یہ کہ ہر اعتبار سے کانفرنس نہایت کامیاب رہی جس کا سہرا یہاں کے وائس چانسلر اور شعبۂ طبعیات کے ان چند اراکین کے سر ہے جنھوں نے پروفیسر چغتائی کے ساتھ تن دہی، جفاکشی اور نیک نیتی سے کام کرکے کانفرنس کو کامیاب بنانے میں اپنا پورا پورا تعاون دیا۔

پروفیسر منگ ہے سے ایک ملاقات

چینی پروفیسر منگ ہے علی گڑھ اور چینی اشتراک کے معاہدے کے تحت ایک ماہ کے لیے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ یہ معاہدہ پانچ برس کے لیے اکادمی آف سائنسز (I.C.T.P.) کے تعاون سے ہوا ہے جس میں ہر سال ایک چینی سائنس داں علی گڑھ آئے گا اور علی گڑھ کے شعبۂ طبعیات میں ایٹمی و سالماتی طیف شناسی پر تحقیق کرنے والا ایک شخص چین جائے گا۔ لہٰذا سب سے پہلے اس معاہدہ کے مطابق چینی سائنس داں منگ ہے علی گڑھ تشریف لائے۔ ایک شام ان سے ہند و چین کے متعلق گفتگو ہوئی۔ ہندوستان میں انھیں یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ کچھ لوگ کافی امیر ہیں اور کچھ بے حد غریب جب کہ چین میں ایسا نہیں ہے وہاں خواہ کوئی وزیر ہو یا

> "انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے بہت سی نیکیاں کی ہوں گی مگر سب سے زیادہ نیک وہی ہوگا جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ ہوں۔
> سرسید"

بڑھئی، کوئی پروفیسر ہو یا چپراسی، سب کی تنخواہیں کم و بیش برابر ہیں۔ اس لیے امیر اور غریب ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہاں خاندان کا ہر فرد کچھ نہ کچھ کام ضرور کرتا ہے۔ اس کے برعکس یہاں ایک شخص کے ذمے پورے خاندان کا بوجھ ہوتا ہے اور عموماً خواتین تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی گھر سے باہر کام نہیں کرتیں، جب کہ چینی عورتیں مرد کے شانہ بشانہ کام بھی کرتی ہیں اور گھریلو ذمہ داریاں بھی سنبھالتی ہیں۔ اس لیے ان کی بہت عزت کی جاتی ہے اور سماج میں انھیں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

چین میں تقریباً ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔ وہاں لکھنا پڑھنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے، جس کے لیے مختلف قسم کے اسکول اور کالج ہیں جن میں رات میں بھی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔

ہند و چین کے تعلقات کے متعلق موصوف نے فرمایا کہ چینی عوام ہندوستانیوں کو اپنے سے زیادہ نزدیک تر سمجھتے ہیں جب کہ چین کا سرکاری رشتہ ہندوستان کے بمقابلے پاکستان سے زیادہ مضبوط ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدہ کی بنا پر بتایا کہ جہاں تک محنت کا تعلق ہے، جاپانی سب سے زیادہ محنت کشی اور لگن سے کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ امریکا سے بھی بہت آگے ہیں۔

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری طاقت وصفائی سے اعلان کیا کہ انسان کی فطرت ایک سادہ تختی کے مانند ہے جس پر پہلے سے کوئی تحریر لکھی نہیں ہے۔ اس پر بہتر سے بہتر تحریر لکھی جا سکتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کا آغاز خود کرتا ہے اور اپنے اچھے یا بُرے عمل سے اپنی دنیا و عاقبت بناتا یا بگاڑتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار یا جواب دہ نہیں ہے۔"

سید ابوالحسن علی ندوی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

ہوش و حواس اور دماغ

حبیب الحق انصاری *

ہوش و حواس کی طبعی کیفیت کا راست تعلق دماغ سے ہوتا ہے ۔

جانوروں میں دماغ کے ایک حصے یعنی تھیلمس، کو علیحدہ کر دیا گیا تو دریافت ہوا کہ جانوروں کے خود اختیاری طبعی فعل تو جاری تھے لیکن وہ جانور پھر بے ہوشی سے ہوش میں نہ آ سکے

جہاں تھیلمس کا تعلق ہوش کی حالت سے ہوتا ہے، وہاں جاگتے رہنے یا ہوش میں رہنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تھیلمس کو برابر مناسب برقی اشارے وصول ہوتے رہیں۔ یہ اشارے دماغ کے ایک دوسرے حصے یعنی دماغ تنے کے اوپر واقع اعصابیتوں کے ایک مجموعے بنام شبکی تنشیطی نظام سے وصول ہوتے ہیں۔ شبکی تنشیطی نظام ہم اصلوں کے ذریعے دماغ کو آنے اور دماغ سے جانے والے تقریباً تمام اہم برقی مراسلات کی جزوی گزرگاہ کا کام دیتا ہے اور بدن کے لیے ہوش کے ہونے یا نہ ہونے کی ضرورت تھیلمس کو برقی اشارے بھیج کر ظاہر کرتا ہے لیکن مصنوعی طریقے سے برقی تار گزار کر شبکی تنشیطی نظام کا حفز ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ برقی حفز اگر تیز تر ددد کا ہو تو سوتا جانور جاگ اور آہستہ تردد کا ہو جاگتا جانور سو جاتا ہے۔ بعض تجربوں میں شبکی تنشیطی نظام سے مخصوص برقی اشارے تھیلمس تک لے جانے والا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تو شخص مذکور اس کے بعد مستقل حالت بے ہوشی میں رہا۔ اگرچہ کہ اس کا تھیلمس برقرار رہا۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر شبکی تنشیطی نظام مفتاح الوعی بھی کہلاتا ہے ۔

انسانی ہوش و حواس کے مفہوم و مظہر کی تحلیل چار جزوں احساسات جذبات، تصور اور یاد داشت میں کی جا سکتی ہے ۔ احساسات میں چھونے، سننے، دیکھنے، بھوک پیاس وغیرہ کی کیفیات شامل ہیں — دریافت ہو چکا ہے کہ قشر دماغ کے مخصوص مراکز کو مصنوعی طور سے برقی حفز دے کر یہ تمام کیفیات پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مزید یہ کہ دماغ کے وہ حصے جو کسی خاص احساس کے لیے مرکز ہوتے ہیں، ایک دی ہوئی نوع حیوان کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ یعنی اس مظہر میں "سیکھنے" کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ یہ اعصابی رابطے بوقت پیدائش ہی تشکیل پا چکے ہوتے ہیں اور ان کی تحدید موروثی مواصفات سے بالکل اسی طرح ہوتی ہے جیسے ہاتھوں پیروں وغیرہ کی ساخت یا تعداد کی ہوتی ہے ۔

غصے، خوف، دہشت اور رغبت کے جذبات سے متعلق کیے گئے تجربوں کی تفصیل اس طرح ہے ۔

ایک بندر کے دماغ کے ایک مخصوص حصے کا برقی حفز کیا گیا تو دیکھا گیا کہ بندر کے بال اپنے سروں پر کھڑے ہو گئے۔ وہ غرانے لگا، دانت نکالنے لگا۔ ہر شخص یا ہر شے کو جو اس کے قریب لایا گیا نوچنے کھسوٹنے لگا وغیرہ ۔ اسی بندر کے دماغ کے ایک مختلف حصے پر حفز سے وہ بھاگ دوڑ کر چھپ جانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے حالت خوف میں ہو ۔ ایک اور حصے کے حفز سے بندر پر جسمانی تھرتھراہٹ اور سخت بدحواسی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جیسے سخت دہشت اسے ہو رہی ہو اور جب

---

* ریسرچ آفیسر، شعبہ طبیعیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اسی بندر کو یہ سکھایا گیا اور ایسے ذرائع بہم پہنچائے گئے کہ وہ مصنوعی طور پر دماغ کے حظ سے متعلق مرکز پر برقی حضر کر سکے تو دیکھا گیا کہ وہ بندر چوبیس تا اڑتالیس گھنٹے تک مسلسل اور کھانا پینا تک بھول کر صرف یہی فعل دہراتا رہا۔ حتیٰ کہ تھکن کی انتہا نے اسے مزید کچھ کرنے کا نااہل نہ بنا دیا۔ بولنے سے تعلق رکھنے والے مخی لحاء کے حصے کے برقی حضر سے بعض دلچسپ انکشاف ہوئے ہیں۔ ایک مریض اس طرح برقی حضر کے تحت بعض الفاظ دہرانے کے قابل نہیں رہا جیسے اس کے خیال کی رمزی تحلیل متاثر ہو گئی ہو۔ ہوا یہ کہ جب مریض کے بولنے سے تعلق رکھنے والے ایک حصے کا برقی حضر کیا گیا اور مریض سے پوچھا گیا کہ اس کے روبرو آویزاں تصویر میں آتری چیز کا نام بتائے تو جواب ملا: اوہ! میں جانتا ہوں وہ کیا ہے! وہ تو وہی ہے جو سب لوگ جوتوں میں ڈالتے ہیں؟

برقی رو ہٹا لینے پر جواب ملا: "پیر"!

اس کے کچھ ہی دیر بعد مریض تصویر میں واقع ایک جھاڑ کا نام نہ لے سکا اگرچہ کہ وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا لیکن جیسے ہی برقی رو ہٹائی گئی تو مریض نے درست نام فوراً بتا دیا۔

سب سے دلچسپ انکشاف ہوش و حواس کے ایک اور جز یعنی یادداشت کے مظہر سے متعلق ہوئے۔ ایک تجربے میں کان کے اوپر واقع حصے کے برقی حضر سے مریض کو اس کے بچپن کا ایک ایسا واقعہ یاد آ گیا جو اس پر گزرا تو ضرور تھا لیکن جو اسے بالکل یاد نہ تھا اور یاد بھی ایسا آیا کہ جیسے ہر بات دوبارہ ہو رہی ہو، دوبارہ سنائی دے رہی ہو، دوبارہ دکھائی دے رہی ہو وغیرہ۔ اس سے زیادہ محیرالعقول بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ برقی حضر روک دینے پر یاد کا تسلسل یک لخت ختم ہو گیا مگر حضر دوبارہ جاری کرنے پر یہی یاد بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ برقی حضر دوبارہ جاری کرنے پر یہی یاد دوبارہ وہاں سے نہیں شروع ہوئی جہاں ختم ہوئی تھی بلکہ دوبارہ بالکل شروع ہی سے شروع ہوئی۔ یہ کچھ اسی طرح کی بات تھی کہ واقعہ کسی فلم کے ٹیپ پر چڑھا ہو کہ جب بھی خلل پائے تو فوراً آپ ہی آپ لپٹ جاتی ہو یا یہ کہ کسی آلہ حاسبہ کا کوئی نائب وغیرہ ہو جو برقی حضر پر عمل میں آ جاتا ہو لیکن اس طرح کہ ہر دفعہ شروع ہی سے شروع ہوتا ہو۔

الغرض احساسات، جذبات، تصور اور یادداشت، ہوش و حواس کے ان چاروں جزوں کو اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ طبیعیاتی طور پر اثر انداز ہوتا پایا گیا ہے اور انسانی دماغ اور آلہ محاسبہ کی کارکردگی میں دلچسپ یکسانیت کا انکشاف ہوا ہے۔

مخی لحاء	Cereberal Casten
اعصابیہ	Neuron
شبکی تنشیلی نظام	Reticuler Acti- vating System
ہم اصلے	Collaterals
حضر	Stimulation
لحاء	Corebulum
مفتاح	Switch, key
مفتاح الوعی	Consciousness Switch
موروثی مواصفات	Genetic Specification
حظ	Pleasure
رو، تیار	Cusrent
آلہ محاسبہ	Computer
نائب وغیرہ۔	Subroutine

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

اندلس کے چند ممتاز عالم نباتات

ابو النصر*

مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں جہاں دینی علوم وفنون کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا ہے، اسی کے ساتھ دنیاوی اور سائنسی علوم کی ترقی میں ان کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر اسلام کے نزدیک دینی اور دنیاوی علوم میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ دینی علوم و فنون کی تشریح و توضیح کے لیے کائنات اور اس کی تخلیق کی حکمت اور راز کی دریافت کے لیے ہی دنیاوی علوم معرض وجود میں آئے اور مسلمانوں نے اسی مقصد کے پیش نظر اس کی تحصیل کی۔

ہم اس مقالے میں، مسلمانوں نے علم نباتات کے متعلق جو پیشرفت کی ہے اس کا ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے۔

علمائے اندلس نے جہاں دیگر سائنسی علوم میں عظیم کارنامے انجام دیے ہیں اور علمی برتری کو تسلیم کروایا ہے، وہیں طب اور نباتات کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں

اطبائے اندلس مختلف عہدوں میں مسلسل جڑی بوٹیوں اور نباتات کے ذریعے علاج ومعالجہ کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ چنانچہ اطباء، دواسازوں اور ماہرین نباتات کی ایک بڑی جماعت نباتات اور جڑی بوٹیوں کو اندلس کے مختلف علاقوں میں ڈھونڈنے اور اس کے افعال او رخواص کا سراغ لگانے میں سرگرداں رہی ہے اور بدن انسانی پر اس کے اثرات معلوم کیے ہیں۔ ان میں کچھ اطباء نے علم نباتات پر عظیم کتابیں تصنیف کی ہیں، یہاں تک کہ علم نباتات کی تاریخ ان کے کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اموی خلیفہ عبد الرحمٰن ناصر نے ۳۳۷ھ میں شہنشاہ قسطنطنیہ سے دیسقوریدس کی کتاب (Materia Medica) (الحشائش المفردات) تحفتہً حاصل کی۔ اندلس کے اطباء اور حکما اس عظیم تحفے کو پاکر بہت خوش ہوئے لیکن چونکہ کتاب یونانی زبان میں تھی اس لیے اس سے استفادہ ذرا مشکل تھا مگر کچھ ہی دنوں بعد قسطنطنیہ سے نقولا نامی ایک راہب ترجمان بھی پہنچ گیا۔ اس طرح علمائے اندلس کے لیے اس کتاب سے استفادہ آسان ہو گیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اندلس میں علم طب کے ساتھ ساتھ علم نباتات کی بھی ترقی ہوئی ہے اور اس کے ارتقاء میں چند اطباء امتیازی شان کے حامل ہیں جنھوں نے نباتات کا تذکرہ ادویہ مفردہ کے ضمن میں کیا ہے۔

۱۔	علی بن ابی طبری	المتوفی ۲۴۷ھ	فردوس الحکمۃ
۲۔	ابوبکر رازی	المتوفی ۳۱۳ھ	الحاوی
۳۔	ابن الجزار القیروانی	المتوفی ۳۶۰ھ	زاد المسافر وقوت الحاضر
۴۔	علی بن عباس	المتوفی ۴۰۰ھ	کامل الصناعۃ الطبیۃ
۵۔	ابو القاسم زہراوی	المتوفی ۴۲۷ھ	التصریف لمن عجز عن التالیف
۶۔	ابو علی سینا	المتوفی ۴۲۸ھ	القانون فی الطب
۷۔	عبد الملک بن زہر	المتوفی ۵۵۷ھ	التیسیر فی المداواۃ والتدبیر

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اب ہم مختصراً چند ممتاز شخصیتوں کا تعارف کرائیں گے جنھوں نے علم نباتات کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔

۲۔ ابو حنیفہ الدینوری المتوفی ۲۸۲ھ

اندلس کے مشہور مصنفین و مؤلفین نباتات میں سب سے روشن نام ابو حنیفہ بن داؤد بن وَنَند کا ہے جو ہمدان کے ایک شہر دینور کا رہنے والا تھا۔ اس نے بہت سے عرب ممالک کا دورہ کیا۔ بہت سے علوم و فنون میں مہارت رکھتا تھا۔ معجم الادبا، میں مذکور ہے کہ ابو حنیفہ کو نحو، لغت، فلسفہ اور حساب میں مہارت حاصل تھی[۳]

تصنیف و تالیف کی وہ تحریک جس کا آغاز ہمارے آبا و اجداد نے آٹھویں صدی عیسوی میں کیا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ ایسی تصنیفات معرض وجود میں آئیں جو معجم کی شکل کی ہوں اور ان میں ان الفاظ کی شرح ہو جو دوسری زبانوں سے عربی میں آگئے ہیں۔ بعد میں مصنفین نے نباتات پر مستقل کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ چنانچہ خلیل بن احمد فراہیدی المتوفی ۱۸۱ھ نے اپنی کتاب "العین" میں نباتات اور جڑی بوٹیوں کو شامل کیا ہے اور اصمعی المتوفی ۲۱۶ھ نے بھی "النبات والشجر" کے نام سے اسمائے نباتات اور اوصاف نباتات پر ایک مستقل کتاب لکھی جس میں ڈھائی سو نباتات کا ذکر ہے۔ تیسری صدی ہجری میں نباتات پر مستقل کتابیں آنے لگیں۔ چنانچہ اس عہد کی مشہور تالیفات میں ابو حنیفہ کی وہ کتاب ہے جس میں اس نے عربی زبان میں تمام نباتات کے نام اور ان کے اوصاف کو شامل کیا ہے۔ اس کا نام کتاب النباتات " ہے جو چھ بڑی جلدوں پر محیط ہے اور جو بعد میں ان تمام لوگوں کے لیے مرجع کی حیثیت اختیار کر گئی جو علم الادویۃ المفردہ کے موضوع پر کچھ تالیف کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر احمد شوکت الشطی نے اس کتاب کے متعلق لکھا ہے:

"علمائے مغرب کے نزدیک اس کتاب کی زبردست اہمیت ہے، اپنی تصنیفات میں اس کتاب کو مرجع بنایا ہے اور اسے نباتات عربیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا قرار دیا ہے۔"

ابن جلجل

ابو داؤد سلیمان بن حسان عرف ابن جلجل، خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر کے دور حکومت (۳۰۰ — ۳۷۷ھ) میں قرطبہ میں پیدا ہوا[۳]۔ بچپن ہی میں اپنی تمام تر توجہ علم طب پر لگا دی۔ چوبیس[۲۴] سال کی عمر میں اس میں مہارت حاصل کر لی۔ ابن اصیبعہ ان کے بارے میں یوں لکھتا ہے کہ:

"وہ فن طب اور علم نباتات کے ماہر تھے۔"[۱]

ابن جلجل کو ادویہ مفردہ سے جن میں بیشتر نباتاتی ہیں، دلچسپی تھی انھیں وہ "ھیولی الطب" کا نام دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ

"ہیولی الطب" جو ادویہ مرکبہ کی اصل اور بنیاد ہے، اس کی تصحیح کی معرفت کی مجھے شدید خواہش تھی، بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اس کا علم دیا اور میں نے نباتات اور اُن کے افعال و منافع کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔[۲]"

یہی وہ داعیہ تھا جس کی وجہ سے اس نے اس میدان میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ دیسقوریدس کی کتاب الحشائش والمفردات کی شرح کی۔
۲۔ ایک مقالہ ان ادویہ کے بیان میں جن کا ذکر دیسقوریدس نے اپنی کتاب میں نہیں کیا تھا۔
۳۔ اس کے علاوہ تاریخ طب میں اس کی مشہور ترین کتاب "طبقات الاطباء والحکماء" ہے۔ جس کی تالیف[۳] اپنی موت سے چند دنوں قبل فارغ ہوا تھا۔

ابن جلجل نے قرطبہ کے ان سات مشہور اطباء کا بھی ذکر کیا ہے جو اس کے دور میں موجود تھے اور جنھوں نے نقولا راہب کا خیر مقدم کیا تھا اور دیسقوریدس کی کتاب سمجھنے میں اس کی مدد کی تھی۔ ابن جلجل نے اپنے معاصرین کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتاب وہ واحد ماخذ ہے جو ہمارے لیے زمانے کی دستبرد سے بچ گیا۔ اس سے ان اطبا کی علمی سرگرمیوں اور نباتات سے ان کے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیسقوریدس کی جڑی بوٹیوں اور ادویہ مفردہ سے متعلق کتاب

الحشائش والمفردات کا یونانی زبان سے عربی ترجمہ عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ (۲۳۲ - ۲۴۷ھ) کے عہد میں مدینۃ السلام میں اصطفن بن بسیل نے کیا تھا۔ بعد ازاں حنین بن اسحاق نے اس کی تصحیح کی۔ اصطفن بن بسیل کو جن یونانی ناموں کے متبادل الفاظ عربی زبان میں معلوم تھے وہ تو عربی میں منتقل کیے لیکن جن یونانی ناموں کے عربی الفاظ اس کو نہیں معلوم تھے اس کو اس نے بعینہٖ یونانی ناموں کے ساتھ لکھ دیا اور جب یہ نامکمل ترجمہ شدہ کتاب اندلس پہنچی تو وہاں کے لوگوں نے ان نباتات کی معرفت حاصل کی جن کا نام عربی زبان میں موجود تھا۔ اہل اندلس ایک زمانے تک اس سے فیض حاصل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کتاب کو ۳۴۰ھ میں قسطنطنیہ کے بادشاہ ارمانیوس نے خلیفہ ناصر کو ہدیہ کر دیا اور اس نے یہ بھی کہلوا دیا کہ دیسقوریدس کی کتاب سے کماحقہٗ وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو یونانی زبان و عبارت کو اچھی طرح سمجھتا ہو لیکن اس وقت قرطبہ میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کو یونانی زبان پر عبور حاصل ہو۔ لہٰذا ناصر نے قسطنطنیہ کے بادشاہ کو لکھا کہ یونانی اور لاطینی زبان سے واقف کسی شخص کو اس کے پاس روانہ کر دیں۔ چنانچہ بادشاہ نے راہب نقولا کو بھیجا۔

چونکہ دیسقوریدس کی کتاب میں مذکورہ بعض دواؤں کے نام مجہول تھے جس سے بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اس لیے قرطبہ میں اطبا کی ایک جماعت نے دیسقوریدس کی کتاب میں مجہول نباتات و اعشاب کی تحقیق و استخراج کا بیڑا اٹھایا۔ وہ اطبا مندرجہ ذیل ہیں[۵]

۱۔ محمد جو "شجار" کے نام سے مشہور ہوئے۔

۲۔ ایک ماہر نباتات جو بسباسی کے نام سے موسوم ہوا۔ اصل نام معلوم نہ ہو سکا۔

۳۔ ابوعثمان الجزار جس کا لقب "الیابسہ" تھا۔

۴۔ الطبیب محمد بن سعید۔

۵۔ عبدالرحمٰن بن اسحٰق بن ہیثم

۶۔ ابو عبداللہ الصقلی

۷۔ حسدای بن شبروط الاسرائیلی۔

اس میدان میں نئے نئے محققین پیدا ہونے لگے اور نئی نئی چیزیں دریافت ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ اندلس کے پہاڑوں اور چٹیل زمینوں پر بھی نباتات اُگنے لگیں۔

ان محققین میں سے طلیطلہ کے وزیر ابوالمطرف عبدالرحمٰن بن محمد بن وافد المتوفی ۴۶۷ھ بھی تھے جو ادویہ مفردہ اور علم نباتات میں اتنے ماہر تھے کہ انھوں نے ان تمام چیزوں کو منضبط کیا جنھیں دوسرے لوگ بیان نہیں کر سکے تھے اور ایسی عمدہ کتاب تصنیف کی جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس میں انھوں نے ان تمام چیزوں کو اکٹھا کر دیا جو دیسقوریدس اور جالینوس کی کتاب میں مذکور تھیں۔ یہ کتاب تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل تھی انھوں نے اس کی جمع و ترتیب اور تصحیح میں اس بات کا خیال رکھا کہ اس میں ادویہ مفردہ کے تمام نام آجائیں۔ اس کام میں انھیں تقریباً بیس سال لگے[۶]

ابن وافد کو طب کے میدان میں عبور حاصل تھا وہ حتی الامکان دوا کے بجائے غذا سے علاج کو پسند کرتے تھے۔ دوا کی شدید ضرورت آن پڑتی تو مفردہ کا سہارا لیتے۔ مرکبات کے استعمال سے حتی الامکان اجتناب کرتے[۷]

"اے مسلمانو! اس بات کا بھی تم خیال کرو کہ اگر اس وقت تم نے ہمت نہ کی اور سعی و کوشش میں کوتاہی کی اور خدا نخواستہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو پھر کبھی تمہاری بھلائی اور تمہاری بہبودی کی توقع نہ ہوگی"

سرسید

ابن وافد طلیطلہ میں قیام کے دوران اطباء

کے کارنامے اور جڑی بوٹیوں سے علاج ومعالجہ پر تحقیق کیا کرتے تھے اور ان ہی کی کوششوں کی وجہ سے علم نباتات وطب دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔

ان چند سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم نباتات کے ارتقا میں اہلِ اندلس، اہلِ یونان سے کافی آگے ہیں۔ علم نباتات کو ترقی دینے میں علمائے اندلس کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حوالجات

۱۔ القافلہ۔ جمادی الآخر ۱۴۰۸ھ
۲۔ الفہرست ابن ندیم ص ۸۷
۳۔ معجم الادباء یاقوت الحموی۔ ج۔۳ ص۔ ۲۷
۴۔ القافلہ جمادی الآخر ۱۴۰۸ھ
۵۔ الذیل والتکملہ لکتابی الموصول والصلۃ۔ ابو عبداللہ محمد بن محمد الانصاری۔ تحقیق احسان عباس ج۔ ۴ ص ۶۲
۶۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ ص ۴۹۳
۷۔ طبقات الاطباء والحکماء ابن جلجل ص ۴۹۴
۸۔ ایضاً ایضاً ص ۴۹۳
۹۔ طبقات الامم او السلائل البشریہ۔ جرجی زیدان ص ۱۲۸
۱۰۔ التیسیر فی المداواۃ والتدبیر۔ عبدالملک بن محمد بن زہر الدیادی ص ۴۱۵

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ پس آدمی کو دیکھ لینا چاہیے کہ کس سے دوستی کرتا ہے۔"

(ابوداؤد۔ ترمذی)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

بچوں کی تربیت مت سہل جانو اسے

عذرا نقوی*

بچوں کی تعلیم و تربیت کس طرح کی جائے، اس بارے میں ہر شخص اپنی شخصیت، تجربے اور سماجی و خاندانی پس منظر کے تحت ایک نظریہ رکھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس قسم کے مفروضے اکثر سننے میں آتے ہیں کہ "کھلاؤ سونے کا نوالہ، دیکھو شیر کی آنکھ"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے سماج میں زیادہ تر بچے بغیر کسی نظریے یا اصول کے ہی پلتے رہتے ہیں۔ کبھی نتائج خوش کن ہوتے ہیں اور کبھی دل شکن۔

اس مضمون میں صرف بچوں کی تربیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بچوں کی تعلیم اور نفسیات تعلیم ایک بہت وسیع موضوع ہے جس کا احاطہ اس مضمون میں مکمل نہیں۔ اس مضمون میں بچوں سے مراد ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں سے ہے۔

بچوں کی تربیت کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں۔ کیوں کہ ہر بچے کا سماجی پس منظر، شخصیت اور ماحول مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے کلیتاً کوئی اصول وضع نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ ہر ماں باپ کا زندگی سے متعلق اپنا نظریہ ہوتا ہے، جس کے تحت وہ بچوں کی تربیت کرنا چاہتے ہیں لیکن مجموعی طور پر چند باتیں ایسی ہیں جن کو اگر دھیان میں رکھا جائے تو بچوں کو پالنا بھی آسان کام ہو جاتا ہے اور بچے بھی کشمکش کا شکار نہیں ہوتے۔ بچوں کی تربیت کے عموماً تین مختلف انداز ہیں۔ پہلا طریقہ جو اکثر ہمارے بزرگ اپناتے تھے وہ تحکمانہ ہے۔ یعنی جو کچھ ماں باپ نے کہہ دیا وہی حرف آخر ہے (اور عام طور پر باپ کا ہی حکم چلتا تھا)۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں ماں باپ کے وضع کیے کچھ اصول ہوتے ہیں، جو بچوں کو سمجھا دیے جاتے ہیں۔ پھر بچوں کی پسند ناپسند کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ اس طریقے کو ہم جمہوری بھی کہہ سکتے ہیں۔ تیسرا طریقہ جو دراصل تحکمانہ طرز تربیت کے ردعمل سے وجود میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ بچے خودرو پودے ہیں۔ ان کو من مانی کرنے دیا جائے تو وہ زندگی گزارنے کا طریقہ خود ہی سیکھ لیں گے۔

مندرجہ بالا تین مختلف انداز تربیت از خود مکمل یا صحیح نہیں ہیں۔ ان تینوں طریقوں میں توازن قائم رکھنا ہی میری نظر میں بہترین طریقہ کار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دشوار کام کیسے کیا جائے۔ اس سلسلے میں ماہرین نفسیات نے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کچھ اصول وضع کیے ہیں۔

ایک بات جس پر ماہرین تعلیم و نفسیات نے زور دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ماں باپ اور اہل خاندان بچوں سے ایک سی ہی بات کہیں یہ نہیں کہ ماں نے ایک بات کہی تو باپ یا دادا، دادی نے اسے منقطع کر دیا۔ اس طرح بچے کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اکثر دیکھا گیا ہے کہ باپ نے کہا کہ آج بچہ کھیلنے نہیں جائے گا کیوں کہ اس نے اپنا ہوم ورک نہیں کیا ہے۔ لیکن شام کو ماں کا دل نرم ہو جاتا ہے اور وہ

* سر سید نگر۔ علی گڑھ

کہتی ہے کہ جاؤ چپکے سے کھیل آؤ۔ ابا کو پتہ نہ چلے گا۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ ایک تو باپ کی بات کا اثر زائل ہوتا ہے اور دوسرے بچے نے سمجھ لیا کہ ماں کو پھسلانا آسان ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر آپ نے بچے سے ایک بات کہی ہے تو اس پر قائم رہیں۔ مثلاً اگر کہا ہے کہ پہلے اپنا کمرہ صاف کرو پھر ٹی۔وی دیکھ سکتے ہو تو جب تک بچہ اپنا کام ختم نہ کرلے اسے ہرگز ٹی۔وی نہ دیکھنے دیا جائے۔ اس کے لیے ذرا دل سخت کرنے کی ضرورت ہے لیکن ایک دوبار اس طرح اپنی بات مضبوطی سے اگر آپ منوالیں گے تو بچہ بھی آپ کی بات کے ماننے کا پابند ہو جائے گا اور آپ کے لیے بھی آسانی ہو جائے گی۔ بچہ سمجھ جائے گا کہ آپ کی بات میں وزن ہے لیکن اسی سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ آپ بچے سے کیا ہوا اپنا وعدہ بھی پورا کریں۔ کوئی چیز لانے کا یا کوئی کام کرنے کا آپ نے وعدہ کیا ہے تو اس پر بھی اٹل رہیے۔

ایک اور بات جو دھیان میں رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ بچے پر صرف اس وقت توجہ نہ دی جائے جب وہ کوئی غلط کام کر رہا ہو، یا ضد کر رہا ہو۔ جب بچے اچھے موڈ میں ہوں، کھیل رہے ہوں، تب بھی وہ توجہ کے مستحق ہیں۔ ان کی تعریف کیجیے، پیار کیجیے۔ ان کے کھیل میں دلچسپی لیجیے تو بچے سمجھ جائیں گے کہ ماں باپ کا کام صرف ڈانٹنا نہیں ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ بچے کو کسی معمولی بات پر ڈانٹ دیا کرتے ہیں اور بڑی سے بڑی بات نظر انداز کر دیا کرتے ہیں یا کسی ایک وقت اسی بات کے لیے ٹوکا جاتا ہے، دوسرے وقت کچھ نہیں کہا جاتا۔ اس طرح سے بچے سمجھ نہیں پاتے کہ وہ کیا کریں۔ اس کے علاوہ بچے کی ضد کے آگے ہتھیار کبھی نہ ڈالیں۔ اگر بچے کی ضد سے الجھ کر یا تنگ آکر اس کی بات مان لی جائے تو بچے کو یہ پیغام ملتا ہے کہ ضد ایک کارگر ہتھیار ہے۔ مثلاً اگر بچے سے کہا ہے کہ اگر تم نے ہمارا کہا نہ مانا تو تمھیں مٹھائی نہیں ملے گی یا کھیلنے نہیں دیا جائے گا تو صرف یہ زبانی دھمکی ہی نہ ہو بلکہ اس پر عمل بھی ہو۔ ورنہ بچہ ان خالی خولی دھمکیوں سے ڈرے گا ہی نہیں۔

ایک اور بات جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بچے کو اس کی غلطی پر تنبیہ کی جائے یا ڈانٹا جائے اسے جتلایا جائے کہ تم نے یہ کام غلط کیا ہے اس لیے تمھیں تنبیہ کی جا رہی ہے۔ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ تم احمق ہو، لاپرواہ ہو، غیر ذمہ دار ہو۔ اس طرح ایک تو بچہ یہ نہیں سمجھ پاتا ہے کہ میری غلطی کیا ہے، دوسرے اس طرح کی اہانت آمیز باتوں سے بچوں کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ وہ اپنے کو انھیں خطابات کے آئینے میں دیکھنے لگتے ہیں۔ بچوں کو تنبیہ دوسرے بہن بھائیوں، دوستوں یا غیروں کے سامنے نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے بچے سمجھ جاتے ہیں کہ ان کی بھی کچھ عزت ہے اور اس عزت کو برقرار رکھنے کی وہ کوشش کرتے ہیں۔ بعض بچوں کو دوسروں کے سامنے ڈانٹ کھا کر چڑھ سی ہو جاتی ہے اور وہ انتقاماً وہی غلطی پھر کرتے ہیں۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ بچوں کو بھی ایک ہستی سمجھیے۔ ان سے کھلونوں کی طرح مت کھیلیے۔ آپ سب نے اکثر دیکھا ہوگا کہ چھوٹے بچے جب بولنا سیکھتے ہیں تو لوگ انھیں عجیب عجیب باتیں سکھاتے ہیں نقل کرتے ہیں، چڑاتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک تو اس طرح بچے چڑچڑے ہو جاتے ہیں، دوسرے جب وہ بڑے ہو کر اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں تو انھیں ڈانٹ پڑتی ہے۔

آخر میں ایک اور بات کا تذکرہ کرنا ضروری ہے کہ بچوں کو شاباشی یا سزا دینے کا کیا طریقہ ہو۔ اگر بچے کو کسی بات پر شاباشی دینی ہو تو ان کی پسند کی کوئی شے کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً چاکلیٹ، کھلونا وغیرہ۔ اگر بچے کو کسی اچھی عادت کی طرف مائل کرنا ہے تو اس کی آہستہ آہستہ ہمت افزائی کیجیے۔ مثلاً اگر اسے یہ سکھانا ہے کہ اپنا کمرہ صاف رکھو تو ایک چارٹ بنا لیں۔ اگر پہلے دن وہ کمرہ صاف رکھتا ہے تو اس چارٹ پر ایک ستارہ بنا دیں اور کہیں کہ اگر تمھارے ہفتے بھر کے ستارے جمع ہو گئے تو تم کو انعام ملے گا یا آئس کریم کھلائیں گے۔ اگر بچے کو تنبیہ کرنی ہو تو اسے اس کی پسندیدہ چیز یا مشغلے سے محروم کر دینا کارگر ثابت ہوتا ہے۔ مارنے پیٹنے سے کبھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ یہ طریقے ہر عمر کے بچوں پر کارگر ہو سکتے ہیں۔ بچے فطری طور سے ذہین ہوتے ہیں۔ جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں کوئی نئی نہیں ہیں۔ صدیوں سے سمجھ دار ماں باپ ان پر عمل کرتے آئے ہیں مگر سمجھ داری شرط ہے اور اس کے علاوہ آج کل کے بچے اس ماحول میں پل رہے ہیں جہاں ٹی۔وی، ریڈیو اور فلموں کی وجہ سے ان کو مختلف طرح کی معلومات ہوتی ہیں۔ آج کے بچے پہلے کے مقابلے زیادہ جانتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ اور بھی احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

سائنس اور زندگی

آصف نقوی*

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

عناصر کے ترتیب کے ہی نتیجے میں نہ صرف زندگی کا آغاز ہوا بلکہ پوری کائنات سورج، ستارے، سیارے عناصر کے تعمیری عمل کی ایک مرحلہ وار ترتیب کا نتیجہ ہیں۔

اس تناظر میں اگر سائنس اور زندگی کے عنوان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور زندگی دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اس لیے کہ زندگی کی تمام نشانیوں، مثلاً سانس کا آنا جانا، خون کا دوران، دل کی دھڑکن، پیدا ہونا، بڑھنا اور مرنا سب سائنس ہے مگر سائنس اور زندگی عنوان سے ہماری مراد اس وقت دراصل تہذیب یافتہ جانور یعنی ہم انسانوں کے تہذیبی ارتقا میں سائنس کے کردار سے ہے۔ جب سے ہم انسانوں نے دوسرے ذی حیات سے قدرے زیادہ دماغ کو استعمال کرنا سیکھا۔ اس وقت سے ہی انسانی دماغ کے فطری تجسس کو ہم سائنسی تجسس کا نام دے سکتے ہیں اور اس وقت سے سائنس اور زندگی کا تعلق پیدا ہوا۔

رفتہ رفتہ سائنس زندگی کی اہم جز بن گئی اور انسانی زندگی اور تہذیب کا یہ ارتقائی سفر قدیم انسانی تہذیبوں سے ہوتا ہوا عرب اور یورپ سے گزر کر آج جس منزل پر ہے وہاں دن بدن سائنس اور اس کی تحقیقات و ایجادات کا اثر اور دخل انسانی زندگی میں بڑھتا ہی جا رہا ہے جس کے نتیجے میں آج بیسویں صدی کے اواخر میں انسانی زندگی کے ہر شعبے میں سائنس نہ صرف کارفرما ہے بلکہ زندگی کی ہر ضرورت کے لیے ہر روز ہمارا انحصار سائنس پر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

جہاں ایک طرف سائنسی ایجادات اور تحقیقات انسانی زندگی کو بہتر بنانے اور انسان کی مشکلوں کو آسان کرنے کا ذریعہ بنی ہیں وہاں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دوسری طرف پسٹا سائڈ (Pesticide)، زہریلی گیسوں، ایٹم بم جیسے مہلک ہتھیاروں کی صورت میں سائنس زندگی کی تباہی اور بربادی کی وجہ بھی ثابت ہوتی ہے اور بدقسمتی سے سائنس کا تخریبی استعمال وقت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔

قصور سائنس کا نہیں بلکہ سوال دراصل سائنسی علوم، معلومات تحقیقات اور ایجادات کے انسانی زندگی میں صحیح استعمال کا ہے۔ یعنی دنیا کی مختلف تہذیبوں، علاقوں اور سماجوں میں وہاں کے حالات، اقدار اور ماحول کے مطابق ترجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے سائنسی معلومات اور ایجادات کے استعمال کا فیصلہ مقامی لوگوں کو ہونا چاہیے یہ امر نہایت ضروری ہے کیونکہ دنیا کی مختلف قومیں اور ممالک تہذیبی اقتصادی اور سماجی ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزر رہے ہیں اور ہر قوم و ملک کی اپنے اقدار کے مطابق ترجیحات مختلف ہیں۔ مثلاً ہندوستان جو کہ بنیادی طور پر ایک ترقی پذیر زرعی ملک ہے اس

---

* سائنٹسٹ این. سی. نیشنل میوزیم آف نیچرل ہسٹری، دہلی

لیے یہاں زندگی اور اس سے متعلق موضوعات اور میدانوں میں سائنسی تحقیقات اور معلومات پر توجہ مرکوز ہونی چاہیے۔ ۔ ۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

جہاں ایک طرف سائنس زندگی کی روزمرہ کی عام استعمال کی مادی چیزوں پر اثر انداز ہوتی ہے وہاں دوسری طرف سائنس انسانی سوچ، یقین اور مذہبی تصورات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً ڈارون کی سائنسی تحقیقات نے زندگی کے آغاز و تغیرات کے انسانی تصور اور قیاس کو جھنجوڑا ہے۔ مگر مادی زندگی کے مقابلے میں سائنس کا اثر انسانی خیالات، مذہبی تصورات پر قدرے کم رہا ہے جس کی سیاسی اور سماجی پہلوؤں اور وجوہات کا تجزیہ بذات خود ایک الگ مضمون کا موضوع ہے۔

آج بین الاقوامی سطح پر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ صنعتی انقلاب اور جدید سائنسی دور کے آغاز کے بعد کس طرح انسانی زندگی کو تیز رفتاری سے بہتر بنانے کے لیے سائنس کو بطور ایک آلہ استعمال کیا گیا ہے۔ ہم کو اس امر کا بھی تنقیدی تجزیہ (Critical Analysis) کرنا چاہیے کہ وہ کیا سماجی اقتصادی، سیاسی وجوہات اور مقاصد تھے جن کے زیر اثر سائنس دنیا کی اکثریت کی زندگیوں میں راحت کا سبب بننے کے بجائے اکثر و بیشتر محض کچھ گروہوں، قوموں اور ممالک کی آلہ کار بن کر تباہ کاریوں، مشکلات اور بربادیوں کا پیغام لائی ہے جس کی تازہ ترین مثال بھوپال گیس کا سانحہ ہے۔

اسی طرح جہاں ایک طبقے کے لیے سائنسی تحقیقات، تجربات اور ایجادات آسانیوں، آسائشوں اور اقتصادی بہتری کا ذریعہ بنی ہے وہاں دوسری طرف سائنسی ایجادات کی بدولت لوگ بے روزگاری، بھوک مری اور تباہ کاریوں کا شکار ہوئے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم سمجھیں کہ سائنس کی تباہیوں اور منفی اثرات کے لیے دراصل قصوروار خود سائنس اور اس کی ایجادات، تجربات اور تحقیقات نہیں بلکہ وہ افراد ہیں جنھوں نے سائنس کو بعض چند گروہوں اور طبقوں کی زندگیوں کو آسان سے آسان تر اور آسائشوں سے بھرپور کرنے کا وسیلہ بنا دیا اور دوسری طرف اسی سائنس کی بدولت عوامی اکثریت کا استحصال ہوا ہے اور ان کی زندگیوں کے لیے سائنس ایک نعمت کے بجائے لعنت ثابت ہوئی ہے۔ مثلاً سائنسی آلات اور مشینوں کے مقابلے میں پرانے طریقوں سے کھیتی کرتے غریب کسان۔ یا بڑی بڑی صنعتوں کے مقابلے میں ہتھ کرگھا تجارتیں یا بہتر سے بہتر وسائل آمد و رفت کے مقابلے میں گھوڑوں پیدل یا جانور جتی گاڑیوں پر چلتے نادار یا بڑے بڑے باندھ اور ان سے بنتی بجلی سے فائدہ اٹھاتی اقلیت اور سیلاب اور سوکھے سے مرتی اکثریت۔

سائنس اور زندگی" موضوع کے تحت کاش میں کہہ سکتا کہ سائنس اور زندگی میں کوئی تضاد نہیں اور سائنس انسانی زندگی کے لیے راحت کا سبب ہے مگر تاریخ اس کی شہادت نہیں دیتی اور نہ ہی موجودہ دور میں ایسی زیادہ مثالیں ملتی ہیں جو اس امر کی تصدیق کریں۔ ۔ ۔ مگر میں بالکل قنوطی نہیں ہوں کیونکہ امید باقی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ابھی وقت ہے کہ جو گزر گیا ہم اس کو بھول جائیں اور دنیا کے تمام ارباب حل و عقد اور سائنس داں سر جوڑ کر بیٹھیں اور کچھ ایسی صورت نکلے کہ دنیا میں ہر جگہ وہاں کے حالات اور ترجیحات کے مطابق سائنسی معلومات کا استعمال سفر کے تیز رفتار اور آسان طریقوں اور صحت عامہ کی بہتری میں سائنس کی کارکردگیوں کی طرح عوام کی بہبود کے لیے ہو اور ہم انسانوں میں سے ہر ایک کہہ سکے کہ سائنس ہماری زندگی کے لیے ایک نعمت ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنس کی معلومات کا سماجی اور اقتصادی ترجیحات کے مطابق استعمال (Application) کے طریقۂ کار کے تعین کی ذمے داری کس کی ہے۔ حکومت کی، سماجی بہبودی اداروں کی یا خود سائنس دانوں کی۔ میری دانست میں سائنس کو عوامی اکثریت کی زندگیوں کے لیے کار آمد بنانے کی ذمہ داری سب سے زیادہ خود ہم سائنس دانوں کی ہے۔ کیونکہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ سائنس داں یا سائنسی ادارے اپنی معلومات اور تحقیقات کو دنیا کے بازار میں لے کر آجاتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ منافع کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس بات سے بے تعلق کہ ان کے علم یا تحقیق کا تخریبی استعمال ہوگا یا تعمیری۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مثال ایٹم بم کے موجد جرمن نژاد امریکی سائنس داں اوپن ہائمر (Open Himer) کی ہے۔ اسی سلسلے کی دوسری

مثال ہندوستانی ڈاکٹروں کی ہے کہ وہ جس طرح اپنی سائنسی معلومات کو انسانی زندگیوں کی بہبود اور ان کی صحت کی بہتری کے لیے استعمال کرنے کے بجائے خود اپنی زندگی کی اقتصادی سطح - ECONOMIC STATUS) بڑھانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک ڈاکٹر گاؤں اور چھوٹے شہروں میں رہ کر خدمت خلق کرنے کے مقابلے میں بڑے بڑے شہروں میں آرام کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں اور جو لوگ مجبوراً یا جبراً گاؤں اور قصبات میں تعینات کیے جاتے ہیں ان میں سے اکثریت اپنے علم اور مہارت کو ایمانداری سے عوام کی خدمت اور ان کی صحت کی بقا کے لیے استعمال کرنے کی نسبت زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

میں اپنی بات ختم کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آج جو سائنس کے طالب علم ہیں، وہ سائنسی علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ سائنس کے صحیح اور مثبت استعمال اور سائنسی پالیسی کی طرف بھی توجہ دیں گے۔ کیونکہ سائنس محض ایک مضمون اور پیشہ نہیں بلکہ ایک نقطۂ نظر اور انداز فکر ہے اور جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، سائنس اور زندگی دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ ایک جان دو قالب ہیں جو انسان کے ارتقائی سفر میں کہیں بچھڑ گئے تھے یا ایک سوچی سمجھی تحریک کے تحت الگ کر دیے گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں سائنس بظاہر عوام کی اکثریت کی زندگیوں کے لیے مجموعی طور پر راحت کا باعث بننے کے بجائے ایک زحمت اور لعنت بن گئی تھی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ عالمی پیمانے پر سائنس اور عوامی زندگی کو قریب لایا جائے تاکہ دنیا بھر کے عوام کہہ سکیں کہ سائنس ہماری

زندگی ہے کسی کی

اجارہ داری نہیں۔

"حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو جوان کسی بوڑھے کی عزت اس کے سن کی وجہ سے کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھی کسی شخص کو مقرر کرے گا جو اُس کے بڑھاپے کے وقت اس کی بھی عزت کرے۔"

(ترمذی)

سائنس نامہ

سورج کا درجۂ حرارت کیوں کر ناپا جا سکتا ہے

کسی جسم یا چیز کا درجۂ حرارت عام طور پر تھرمامیٹر سے ناپا جاتا ہے۔ تھرمامیٹر کی اساس پارہ ہے جو شیشے میں ہوتا ہے۔ حرارت کی مناسبت سے پارہ کا درجہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ بنیادی طور پر پارہ ایٹموں کی ہیجانی توانائی کو ظاہر کرتا ہے۔ حرارت بڑھ جاتی ہے تو ایٹموں میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے جس سے پارہ پھیل جاتا ہے۔ گویا درجۂ حرارت کی تمام پیمائشیں دراصل ایٹوں یا سالمات کی توانائی کے ہیجان کی پیمائش ہے۔ توانائی میں جتنا ہیجان ہوگا، اتنا ہی حرارت کا درجہ ہوگا۔

سورج کی طرح ستارے بھی گیسی اجسام ہوتے ہیں جو پروٹون، الیکٹرون، ایٹوں اور سالمات سے مل کر بنے ہیں۔ اصولی طور پر کسی ستارے کا درجۂ حرارت یوں معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ظاہری بیرونی سطح پر ایٹموں کے ہیجان کا مشاہدہ کر لیا جائے۔ سورج کی سطح پر ایٹموں کا جو رجحان ہے وہ اس نوعیت کا ہے کہ ان کی توانائی کا اندازہ (پیمائش) کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ہوئی اصول کی بات، لیکن حرارتی حرکت کے اثرات اتنے کم اور دھیمے ہیں کہ سورج کا درجۂ حرارت مذکورہ بالا طریقے سے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

اس لیے سورج کا درجۂ حرارت معلوم کرنے کے لیے حرکیات کے علم سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ سورج کی اشعاع کی امواج طول یا فریکوئینسیاں بہت زیادہ اور متنوع ہیں۔ ان کی تقسیم اور پھیلاؤ کے بارے میں موجودہ صدی کے شروع میں جرمن سائنس داں میکس پلانک نے ایک نظریہ پیش کیا، جو اب تک چل رہا ہے۔

ماہرین فلکیات ستارے کی خارج کردہ توانائی کی کل مقدار معلوم کرتے ہیں۔ پھر یہ فرض کر کے کہ ستارہ بھی سیاہ جسم کی طرح اشعاع خارج کرتا ہے۔ میکس پلانک کے مقررہ حرکیاتی خطوط میں اس خط کا انتخاب کرتے ہیں جو ستارے کی شکل کے زیادہ متناسب ہو۔ تب ستارے کا درجہ حرارت ناپ لیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام ستارے سیاہ جسم نہیں ہوتے، کچھ نہ کچھ مختلف بھی ہوتے ہیں۔ سورج کے لیے سرخ اور بنفشی رنگ میں پلانک کے متعلقہ خط کا درجۂ حرارت ۵۰۰۰ درجے کیلون ہے۔ موزیرین سرخ کا متعلقہ خط ۵۶۰۰ کیلون درجہ حرارت ظاہر کرتا ہے۔ سبز رنگ کا متعلقہ خط تقریباً ۶۱۵۰ درجے کیلون ہے۔

درجۂ حرارت معلوم کرنے کا ایک اس سے بھی زیادہ سہل اور سادہ طریقہ ہے وہ یہ کہ مختلف امواجِ طول پر پھیلی ہوئی توانائی کی تقسیم سے بھی درجۂ حرارت ناپا جا سکتا ہے۔

درجۂ حرارت معلوم کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ پلانک کے فارمولے کے اطلاق سے یہ معلوم کیا جائے کہ متعلقہ خط کے نیچے آیا ہوا پورا رقبہ کتنا ہے۔ پس سورج کی خارج کردہ کل توانائی اور اس کی سطح کے کل رقبے کے حساب سے دیکھا جائے تو سورج کی سطح کا درجۂ حرارت ۵،۵۰۰ درجے کیلون ہے۔

سورج کی رفتار کیا ہے: اس سلسلے میں پہلے ہمیں یہ معلوم

ہونا چاہیے کہ "سوچنا" کیا ہے؟ سوچنا دماغ کا ایک عمل ہے۔ سوچنے کا عمل دراصل اس ہیجان کا ردعمل ہے جو حواس خمسہ میں سے کسی ایک کی تحریک پر پیدا ہوتا ہے۔ ہیجان ایک برقی ارتعاش (دھڑکن) کی صورت اختیار کرکے عصبی خلیوں کے درمیانی خلاء سے اچھل اچھل کر گزرتا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی خلاؤں کو عصبی مانعقہ کہا جاتا ہے۔

جب آپ اپنے اسٹریو کا سوئچ آن کرتے ہیں تو آواز کی لہریں آپ کے کانوں کے پردے سے ٹکراتی ہیں اور ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے جو برقی لہر کی صورت میں مانعقوں میں سے گزرتا ہوا دماغ تک پہنچتا ہے۔ یہاں اس ہیجان کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور ایک جوابی ہیجان دماغ کا حکم نامہ لے کر دوسرے عصبیے مثلاً آپ کے ہاتھ کے اعصاب کی طرف دوڑتا ہے۔ حکم نامے میں لکھا ہوتا ہے: "آواز کا حجم کم و بیش کرنے کے لیے ہاتھ کے عصبیے استعمال کرو۔" چنانچہ ہاتھ خود بخود اٹھ کر آواز کے حجم کو حسب حال کر لیتا ہے۔ ہیجان نے اپنے اصل مقام پیدائش سے دماغ تک جانے اور واپس ڈیوٹی کے مقام تک آنے میں جو فاصلہ ہے اسے طے کرنے میں جتنا وقت لیا، وہی سوچنے کی رفتار ہے۔

ممتاز سائنس داں ہرمن وان ہیلم ہولٹز نے ۱۸۵۲ء میں سوچنے کی رفتار ناپنے کا تجزیہ کیا۔ اس نے ایک عصبیہ لیا، جس سے ایک خلیہ بھی پیوست تھا۔ اس نے خلیے میں ایک ہیجان پیدا کیا اور دیکھا کہ عصبیے کو جواب دینے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ معلوم ہوا کہ خلوی محرک کی رفتار ۳۶۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی جسم کے ایک نقطے سے دوسرے دور کے نقطے تک پہنچنے اور واپس آنے میں ہیجان کو $\frac{1}{25}$ سکنڈ (ایک سکنڈ کا ۲۵واں حصہ) لگتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بعض لوگوں کے سوچنے کی رفتار زیادہ، اور بعض کی کم کیوں ہوتی ہے؟ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دماغ کو ہیجان کا تجزیہ کرنے میں جو وقت لگتا ہے، وہ مختلف افراد میں مختلف ہوتا ہے۔

سائیکل کے اگلے پہیئے کا چھٹا مڑا ہوا اور پچھلے پہیئے کا چھٹا سیدھا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے ملک میں

پچھلے پہیے کا چمٹا قینچی کہلاتا ہے۔ انگریزی زبان میں دونوں کے لیے FORK کا لفظ چلتا ہے۔ آج کل کی تمام سائیکلوں میں چمٹا قدرے ترچھا اور مڑا ہوا ہوتا ہے۔ پہلی سائیکل ۱۸۵۵ء میں بنی تھی۔ اس میں چمٹا پچھلے پہیے کی قینچی کی طرح بالکل سیدھا تھا۔ سیدھے چمٹے کی وجہ سے نہ تو اگلے پہیے پر وزن پورا آتا ہے، نہ رفتار قایم ہو سکتی ہے۔ نہ موڑ مڑنے میں سہولت پیدا ہوتی ہے اور نہ دونوں اطراف کے مابین ایک توازن قایم ہوتا ہے۔ چمٹے میں جو خم پیدا کیا گیا ہے، اس کا اسلوب
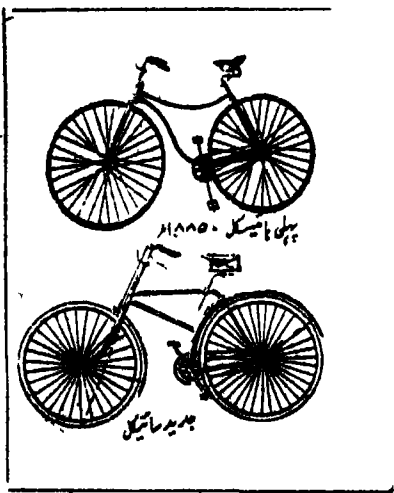
اس طرح کا ہے کہ سٹیرنگ ہیڈ کی مرکزی لائن (نقطہ زدہ) اور پہیے کے مرکز سے گرایا جانے والا عمود دونوں اس مقام پر ملتے ہیں، جہاں ٹائر زمین سے چھوتا ہے۔ اس ایک خوبی کی وجہ سے پہیے میں اتنی مضبوطی آجاتی ہے کہ جس طرح چاہو، جب چاہو موڑ لو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہیے کو سامنے کے رخ پر سیدھا رکھنا آسان ہو جاتا ہے جو کہ غیر خمیدہ چمٹے کی صورت میں ممکن نہ تھا۔ چمٹا مڑا ہوا نہ ہوتا بلکہ سیدھا ہوتا تو اگلے پہیے کو سیدھا رکھنے اور دوڑانے میں بہت دشواری پیش آتی۔ پچھلے پہیے کو اوپر کی اور نیچے کی دونوں قینچیاں مرکز میں ایک دوسرے سے پیوست ہو کر قایم رکھتی ہیں۔

کنوئیں کا پانی رات کو اور صبح کے وقت گرم اور سہ پہر کے وقت ٹھنڈا کیوں ہوتا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ پانی

ایک مائع ہے لیکن یہ دوسرے مائعات سے بعض باتوں میں اس قدر مختلف ہے کہ سائنس داں اسے "بے مرکز" مائع کہتے ہیں۔ اس کے بعض خواص غیر معمولی ہیں۔ ایک غیر معمولی خاصیت یہ ہے کہ حرارت کو جذب کرلینے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر ہم پانی کا ایک گرام اور کسی اور مائع کا بھی ایک گرام لیں اور دونوں کو یکساں حرارت میں رکھیں تو پانی میں حرارت کا اضافہ دوسرے مائع کے مقابلے میں بہت کم ہوگا اسی لیے پانی کو "حرارت خور" بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اپنے درجۂ حرارت میں اضافہ ظاہر کیے بغیر حرارت کو اپنے میں جذب کرلیتا ہے۔

کسی چیز کی حرارت مخصوصہ سے اس چیز کی حرارت جذب کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ تقریباً تمام مائعات اور ٹھوس اشیاء میں سب سے زیادہ حرارت مخصوصہ پانی میں پائی جاتی ہے۔

اب ذرا آگے بڑھیے۔ پہلے تو یہ دیکھیے کہ کنوئیں کا پانی اور ارد گرد کی زمین دن کے دوران میں کتنی شمسی حرارت (دھوپ) جذب کرتی ہے۔ مٹی کی حرارت مخصوصہ پانی کی حرارت مخصوصہ کا دسواں حصہ ہوتی ہے۔ مٹی جلدی گرم ہوجاتی ہے اور اسی اصول پر جلدی ٹھنڈی بھی ہوجاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد مٹی اپنی حرارت چھوڑ دیتی ہے اور تیزی سے ٹھنڈی بھی ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس پانی اپنی جذب شدہ حرارت کو تادیر اپنے اندر سموئے رکھتا ہے پھر یہ جب حرارت چھوڑنا شروع کرتا ہے تو بہت آہستہ آہستہ۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت کنوئیں کا پانی ارد گرد کے ماحول کے مقابلے میں نسبتاً گرم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حرارت کا ذخیرہ کرنے کے لیے پانی کا ذخیرہ کرلیا جاتا ہے، جو "توانائی بنک" کا کام دیتا ہے۔

آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوا ہوگا کہ پانی دوسرے مائع کے مقابلے میں اتنا عجیب اور مختلف کیوں ہے تو ان کے سالمات اور ان کے باہمی تعاملات کا بغور مطالعہ کیجیے۔ پانی کے سالمے کی شکل والٹ ڈزنی کی مشہور مخلوق "مکی ماؤس" سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے کان چہرے کی مناسبت سے زیادہ بڑے ہیں۔ پانی کے سالمات میں دوسرے مائعات کے سالموں کی نسبت بہت گہرا اور مضبوط بندھن ہوتا ہے بندھن جتنا زیادہ مضبوط ہوگا اُسے توڑنے کے لیے زیادہ توانائی (زیادہ حرارت) کی ضرورت پڑے گی۔ جوں جوں پانی کو گرم سے گرم تر کیا جاتا ہے اس کے سالمات کا بندھن ٹوٹتا جاتا ہے۔

بڑوں کی بڑی باتیں

قدیم یونان کا عظیم فلسفی ارسطو مسلسل اٹھارہ سو سال تک طبعیات اور حیاتیات کے علوم میں حرفِ آخر سمجھا جاتا رہا لیکن اس کی غلط فکری کا حال اب سب کو معلوم ہوچکا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اڑنے والی چیز مثلاً تیر یا پھینکا ہوا پتھر فضا کی قوت سے اڑتی ہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ذہانت اور حواس کی نشست گاہ دل ہے، حالانکہ اب کون نہیں جانتا کہ دماغ ہے اس کا یہ بھی خیال تھا کہ بھاری چیزیں ہلکی چیزوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے گرتی ہیں۔ ان غلطیوں کے علاوہ ارسطو نے حیاتیات کی ایک بنیادی غلطی یہ کی کہ اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زندہ اشیاء بغیر والدین کے ازخود پیدا ہوسکتی ہیں۔ مثلاً بعض کیڑوں کی پہلی روپ سڑے ہوئے گوشت میں اور بعض حشرات کیچڑ میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ممتاز ریاضی داں ایڈمنڈ وھٹکر (۱۸۷۳ اور ۱۹۵۶) نے لکھا کہ ارسطو کا فلسفہ سائنس شروع سے آخر تک بیکار اور گمراہ کن تھا۔

(ماخوذ)

"زمانۂ حال میں جس قدر وسیلے تعلیم کے موجود ہیں، ان میں وہی نقص ہے جس کے سبب ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں اسباب تعلیم مجتمع نہیں ہوتے اور عموماً تعلیم کا رواج باوصف بے انتہا کوشش اور سعی گورنمنٹ کے نہیں ہوتا ہے۔"

سرسید رح

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۴ (اپریل ۸۹ء)

بہار میں مسلمانوں کی تعلیم

مختار احمد مکی٭

بہار میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ عام طور پر اختیار الدین محمد بختیار خلجی کے فتح بہار و بنگال (۱۱۹۷ء) سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس سے قبل جیسا کہ روایت ہے کہ ایک بزرگ مومن عارف منیر میں قیام پذیر تھے۔ منیر کا راجہ خواہ مخواہ انھیں تنگ کیا کرتا تھا اس وجہ سے انھوں نے مدینہ منورہ کی راہ لی اور بیت المقدس کے ایک بزرگ امام تاج محمد فقیہ سے مدد کے طلب گار ہوئے۔ قطب سالار کے ساتھ تاج فقیہ اپنے گروہ سمیت غزنی ہوتے ہوئے ہندوستان ۱۱۷۸ء میں آئے اور منیر کے راجہ کو ۱۱۷۸ء میں شکست دی۔ تانبہ کی ایک تختی کی دریافت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بہار کے لوگ ۱۱۲۴ء میں ترکوں کے باجگذار تھے اور انھیں جزیے کی رقم ادا کرتے تھے۔ لیکن عام طور پر بہار میں مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ ۱۱۹۷ء تا ۱۷۵۷ء تک سمجھا جاتا ہے۔

بہار میں مسلمانوں کے آباد ہونے اور ہندوستانی معاشرے میں شرکت سے ہندوستانی طرز رہائش پر اس کا اثر ضرور پڑا۔ کیونکہ ان کا مذہبی نقطہ نظر، طرز رہائش، انداز گفتار، خورد و نوش، عادات اطوار مختلف تھا لیکن ان کا اثر ایسا نہیں تھا جیسا کہ ایران و مصر یا دوسرے ایشیائی و افریقی ممالک میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی بیاں مخالفت بھی ہوئی اور ایک واضح فرق کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ صوفیائے کرام کی طرز رہائش مختلف نوعیت کی تھی جہاں بلا امتیاز مذہب و ملت لوگوں کا ازدحام رہتا تھا اور فیض و برکت کا دریا موجزن تھا۔ ان بزرگوں کے اخلاق اور روحانی قوت کے نتیجے میں مقامی لوگوں کی بڑی تعداد مشرف بہ اسلام بھی ہوئی۔

بہار میں مسلمانوں کی تعلیم کو ہم چار مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ ترک و افغان دور حکومت ۱۱۹۷ء تا ۱۵۲۶ء
۲ مغل دور حکومت ۱۵۲۶ء تا ۱۷۵۷ء
۳ برطانوی دور حکومت ۱۷۵۷ تا ۱۹۴۷ء
۴۔ بعد آزادی ہند ۱۹۴۷ء تا حال

مسلمانوں نے اپنے قیام کے ابتدائی دور میں بہار میں بڑی تعداد میں مساجد تعمیر کرائیں۔ ان مساجد سے ملحق ہی مکاتب اور مدارس کا بھی انتظام تھا۔ جس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور فنون حربی کا درس بذریعہ مادری زبان دیا جاتا تھا۔ طبقات ناصری کے مطابق بختیار خلجی نے بڑی تعداد میں مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کرائیں جس کی تقلید اس کے امرا نے بڑی تعداد میں کی اور ان کے ذریعے ان تمام علاقوں میں تعلیم عام ہو گئی اور بتدریج منیر شریف، بہار شریف، باڑھ، راج گیر، اجور، پھلواری شریف اور حاجی پور وغیرہ علم و ادب کا گہوارہ بن کر سامنے آئے۔ ان مقامات پر مدرسہ احمدیہ چہرم پوش مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ عبد النبی

٭ کریم کالج آف ایجوکیشن ۔ جمشید پور ۔ بہار

قاضی عبدالشکور، قاضی ضیاء اللہ، شیخ بدھ صوفی، مولانا منصور دانشمند ملا عبدالسمیع، امیر عطاء اللہ زبی اور ملاّ آفاق وغیرہ کے مدارس ہندوستان میں کافی مشہور تھے۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری اور حضرت احمد چرم پوش نہ صرف اپنے ہندوستانی ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے بلکہ سلطان فیروز تغلق بھی ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔

اس دور کا نصاب تعلیم مذہبی اور سیکولر دونوں نوعیت کا تھا جو حروف تہجی کی شناخت سے شروع ہو کر ابتدائی طور پر قرآن کی تعلیم پر ختم ہوتا تھا۔ وہ طلبا جو قرآن کے حفظ اور قرات کی جانب متوجہ نہیں تھے اور ادب، تاریخ، اسلامی فقہ واخلاقیات اور فلسفہ و منطق کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے انہیں فارسی میں پندنامہ، گلستاں و بوستاں، جامع القوانین، رقعات امان اللہ حسینی، بہار دانش، سکندر نامہ وغیرہ کتابیں پڑھنی ہوتی تھیں اور انھیں دانش مند، مولوی اور فاضل وغیرہ کی سند دی جاتی تھی۔ عربی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے پر قابل، فلسفہ منطق کی تعلیم پر، فاضل اور مذہبی تعلیم پر عالم کی سند عطا کی جاتی تھی۔ عربی کے نصاب میں فقہ، اصول اسلامی فقہ، تفسیر، حدیث، ادب، منطق و فلسفہ کی تعلیم پر زیادہ زور تھا۔

طلبا کے لیے نہ صرف مفت تعلیم کا انتظام تھا، بلکہ ان کے قیام و طعام کی ذمہ داری بھی اہل خیر حضرات نے اٹھا رکھی تھی۔ خود حکومت کے اعلیٰ عہدے دار بھی اپنے خالی اوقات میں درس و تدریس کا کام انجام دیتے تھے۔ ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی جو کہ قیمتی قلمی نسخوں کو حاصل کر کے طلبا تک پہنچائیں۔ ایسے نقل نویس بھی اس دور میں موجود تھے جو کہ شرح جامی جیسے بڑے صفحات کی ۵۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب کو صرف ایک ہفتہ میں نقل کر سکیں۔

ان مدارس میں طلبا پر انفرادی طور پر نظر رکھی جاتی تھی ذہین طلبا جو معید کہلاتے تھے معلم کے درس کے بعد اپنے ہم جماعتوں کو اور تلمیذ اپنے نچلی جماعت کے طلبا کو درس دیا کرتے تھے۔ اس طرح تعلیم کا طریقہ مطالعہ، معلم کے ذریعے بیان، آپسی بحث و مباحثہ وغیرہ پر مشتمل تھا۔ تعلیم کے حصول کے بعد انھیں امتحان سے گزرنا پڑتا تھا۔ جس میں صرف نصاب کے اختتام پر ہی امتحان نہیں دینا ہوتا تھا بلکہ دوران تعلیم ہی ان پر نظر رکھی جاتی تھی اور بعد میں انھیں فراغت کی سند دی جاتی تھی۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی داغ بیل کے ساتھ ہی بہار کے مسلمانوں کی تعلیم میں کچھ تبدیلی آئی اور شیر شاہ سوری کے زمانے میں سہسرام اور شیر گھاٹی مسلمانوں کی تعلیم کے دوسرے مرکز کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ مولانا شمس الحق عرف ملاّ حقانی، ملاّ بدھ دانش مند اور ملاّ عبدالرحیم سوری وغیرہ اس زمانے کے مشہور علما تھے جن سے فیض حاصل کرنے کے لیے نہ صرف بہار کے اطراف وجوانب سے طلبا پہنچتے تھے بلکہ ملتان جیسے دور دراز جگہوں سے بھی لوگ آتے تھے۔ سرجان شور (SIR JOHN SHORE) صدر مالیاتی کمیٹی برائے فورٹ ولیم نے بھاگل پور کے محلے قلاچک کے مدرسے شہباز کا ایک دلچسپ خاکہ کھینچا ہے جس کے تحت اس مدرسے میں طلبا کی تعداد تقریباً دو سو تھی۔ شاہ شجاع نے اس کے لیے پرگنہ گول گنج کی ۵۰۰ بیگھہ زمین وقف کر دی تھی [illegible] حضرت شاہ کبیر کی خانقاہ بھی کافی مشہور تھی اور اس کے ساتھ ہی مدرسے کی شاندار عمارت بھی تھی۔ فرخ سیر اور شاہ عالم نے اس کے لیے کافی زمین وقف کر رکھی تھی۔

اس دور میں بہار کے بہت سے مشہور معلموں نے خاندانِ تیموریہ کے بہت سے شاہزدگان کے اتالیقی کے فرائض بھی انجام دیے مولانا محی الدین عرف ملاّ موہن بہاری اورنگ زیبؒ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ قاضی محب اللہ نے جہاندار شاہ کو تعلیم دی۔ دربھنگہ کے ملا عبدالحسن عرف ملاّ جیون اورنگ زیب کی صاحبزادی اور مشہور ادیبہ و شاعرہ زیب النسا کے اتالیق مقرر کیے گئے۔ اس کے علاوہ قاضی عنایت اللہ شیر گڑھی، مولانا فصیح الدین (پھلواری شریف) ملاّ محمد سعی اور محمد آفاق (امتھوا۔ گیا) اور قاضی سید میر محمد رضی اللہ (بھاگلپور) شہرہ آفاق کتاب "فتاویٰ عالمگیر" کی ترتیب و تدوین کے لیے دوسرے علما کے ساتھ مقرر کیے گئے۔ شہزادہ معظم کی تعلیم کے لیے مولانا امان اللہ، ملاّ ضیاء الدین محدث اور ملاّ سراج الدین

وغیرہ مقرر کیے گئے۔

مغلیہ دور کا ایک مشہور مدرسہ، مدرسہ سیف خاں بھی تھا جو ۱۶۲۹ء پٹنہ سٹی میں قایم کیا گیا۔ اس کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ نواب آصف خاں کے ذریعے قایم شدہ ایک مدرسہ داناپور میں بھی تھا جس کی بلند و بالا عمارت کے سلسلے میں مولانا عبدالحق دہلوی کا قول ہے کہ اس طرز کی دوسری کوئی عمارت دیکھنے کو نہ ملی۔

بہار کے ان مدارس کے نصاب کے سلسلہ میں کوئی واضح اطلاع نہیں مل پائی ہے۔ آئین اکبری کے مصنف ابوالفضل نے اس دور کے نصاب کی ایک تفصیل پیش کی ہے جس کے تحت اخلاقیات، ریاضی، زراعت، ادویات، معاشیات، منطق و فلسفہ، قواعد اور فن انتظام، علم طبی اور الٰہی، فقہ و تاریخ وغیرہ خاص تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب الجزء اللطیف (۱۱۴۷ھ) میں ان کی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے پڑھی تھیں۔ مدرسہ نظامیہ سلسلہ کے بانی ملا نظام الدین نے عربی نصاب کی ایک پوری تفصیل دی۔ فارسی نصاب کا الگ سے انتظام تھا۔

طریقۂ تدریس کے سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ نے اپنے تجربات کی بنیاد پر ایک نظام تدریس کا ذکر کیا ہے جس کے تحت ابتدا میں بچوں کو ان کی ذہنی صلاحیت کے مطابق نحو پر کچھ پرچے پڑھائے جاتے تھے۔ اس کے بعد تاریخ اور فن انتظامیہ سے متعلق کچھ کتابیں عربی میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس دوران عربی قواعد پر خاص توجہ دی جاتی۔ Malta کی کتاب پڑھائی جاتی تھی قرآن کریم کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوتا۔ کیونکہ حدیث، تاریخ، نزول وحی وغیرہ کی غیر موجودگی میں قرآن فہمی دشوار کام ہے۔ اس پر دسترس حاصل ہونے کے بعد ہی دوسری کتابوں کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوتا تھا آئین اکبری کے مصنف ابوالفضل نے طریقۂ تدریس کے سلسلہ اکبر کے ذریعہ شروع کیے گئے ایک نئے طریقے کا ذکر کیا ہے جو ان کے خیال میں انتہائی کامیاب رہا۔ اس کے تحت ابتدا میں غیر مسلم طلبا کو پڑھاتے ہوئے حروف تہجی سکھا دیے جاتے تھے جو دو روز کے اندر وہ سیکھ لیتے۔ حروف تہجی کے سیکھنے کے بعد دو حرفی، سہ حرفی حروف کا نمبر آتا تھا۔ اس طرح جلد ہی وہ لوگ چھوٹے چھوٹے جملے دہرانے کے قابل ہو جاتے یہ نثر پارے یا نظمیں اس نوعیت کی ہوتی تھیں جن میں سیکھے گئے الفاظ کا تکرار ہوتا تھا اور بقول ابوالفضل آموزش کا وہ کام جو کہ قدیم طریقہ سے سالوں میں ممکن ہوتا تھا اب مہینوں میں سیکھا جانے لگا۔ مکتب کی تعلیم کا سلسلہ عام طور پر چار سال چار مہینے اور چار دن سے بچہ کی بسم اللہ خوانی کے بعد شروع ہوتا تھا۔ مساجد کے صحن، خانقاہ کے برآمدے ابتدائی تعلیم کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد ہی طلبا مدرسہ میں داخلہ لیتے تھے۔

مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم سے بہار کے ہندوؤں نے بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جیساکہ بلوچ مین BLOCH MAN کا خیال ہے کہ ایک صدی کے اندر ہی ہند و قوم ادبی میدان میں مسلمانوں کے مقابل ہو گئی۔ راجہ رام نرائن موزوں، راجہ کیرت چند، بال مکند شہود، مہاراجہ کلیان سنگھ، لالہ سبھا رام دانش، لالہ اجاگر چند الفت، اور لکشمی نرائن وغیرہ کا شمار اس دور کے عربی و فارسی کے عالموں میں کیا جاتا ہے۔

بہار کی مسلم خواتین میں بھی اچھی خاصی تعلیم تھی۔ بی بی عائشہ، بی بی رابعہ، بی بی طاہرہ، بی بی سعیدہ، روشن اور امیر النسا وغیرہ اس دور کی کچھ مشہور علمی شخصیات تھیں، جن کے کارنامے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

بہار کے مسلمانوں کی تعلیم کا تیسرا دور نواب سراج الدولہ کی پلاسی کی جنگ میں شکست اور لارڈ کلایو کی فتح یعنی ایک عہد کے خاتمے اور دوسرے عہد کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے لیے دورِ انحطاط تھا جس کے باعث مسلمانوں کی سیاسی طاقت کے زوال کے ساتھ ہی ان کی تعلیم بھی متاثر ہوئی۔ اس کے باوجود تعلیم مسلمانوں میں عام تھی جیساکہ ولیم آدم (WILLIAM ADAM) نے اپنی مشہور ۱۸۳۵ء کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ بہار و بنگال میں تقریباً ایک لاکھ مدارس تھے۔ یعنی اس دور میں آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو ہر چار سو کی آبادی پر اوسطاً ایک اسکول تھا۔ بعد کے انگریز مصنف سر فلپس ہرٹوگ (SIR PHILIPS HARTOG) اس کو

افسانہ قرار دیتے ہیں اور انھیں اس بات کا یقین ہی نہیں ہے کہ یہ بھی ممکن رہا ہوگا۔ وارڈ آدم (WARD ADAM) کی رپورٹ سے کسی حد تک متفق ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "ہر بڑے گاؤں میں ایک اسکول ہوتا تھا"۔ بوچ مین (BUCHAMAN) کے ایک سروے کے مطابق پورنیہ میں ۳۴۶ اسکول/مدارس اور ۲۰ پاٹھ شالے تھے۔ جنوبی بہار میں، ۲ سنسکرت اور ۲۹۱ عربی و فارسی کے اسکول تھے۔ ترہت ضلع میں ۸۰ ہندی، ۵۶ سنسکرت اور ۲۳۸ عربی اور فارسی کے اسکول تھے۔ یہ تمام رپورٹ نہ تو من گھڑت ہے اور نہ ہی افسانوی اور اسکو نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔ کیوں کہ اس زمانے میں ہر گاؤں ایک خود مختار اکائی تھا۔ مہاتما گاندھی ان مدارس کے بہتات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۳۱ء کے "ینگ انڈیا" کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی ایک صدی قبل جس قدر تعلیم یافتہ تھے، آج ان کی اتنی تعداد بھی نہیں ہے۔" دور انحطاط کے باعث گو ان کا نصاب تعلیم متاثر ضرور رہا کیونکہ نصاب میں منطق و فلسفہ کی موشگافیوں پر توجہ زیادہ دی جانے لگی تھی اور زبان و ادب، جغرافیہ و تاریخ میں ان کی دلچسپی ختم ہوتی گئیں اس کے باوجود ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری تھیں اور اس دور میں ہزاروں کی تعداد میں عربی و فارسی اور اردو کے نثر نگار اور شاعر پیدا ہوئے سترھویں اور اٹھارویں صدی کے بہار کے علمی و ادبی سرگرمیوں کا علم ہمیں صبح صادق اور انشائے الفت سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود کے خیال میں انگریز طلبا جن مضامین کی تعلیم لاطینی اور یونانی زبان کے ذریعے انگلینڈ کے کالجوں میں حاصل کرتے تھے وہی تعلیم عربی و فارسی کے ذریعے اس عہد میں یہاں کے طلبا بھی حاصل کرتے تھے۔ ایک انگریز مصنف [illegible] یہاں کے لوگوں کی علم دوستی کے معترف ہیں کہ ایک غریب مسلمان جو صرف ۲۵ روپے ماہانہ کی تنخواہ پر کسی دفتر میں ملازم ہیں وہ ابھی اپنے بچوں کو وہی تعلیم دلواتے ہیں جو کہ ایک وزیر اعظم کو دلائی جاتی ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ دار اپنے ابتدائی زمانے میں ہندوستانیوں کے لیے انگریزی تعلیم کے قایل نہیں تھے۔ کیونکہ انہیں خوف تھا کہ امریکہ کے مانند ہندوستان بھی ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے لیکن Bantinck اور Macaulay کی کوشش کے نتیجے میں اس طرف توجہ دی جانے لگی۔ حکومت کا یہ بھی اعلان تھا کہ ہندوستانیوں کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی لیکن پرجوش پادریوں، انگریز افسروں کی ریشہ دوانیوں اور انگریزوں کے ذریعے چلائے جانے تعلیمی اداروں میں عیسائیت کی تعلیم و تبلیغ کے نتیجے میں انھیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ان کی عزیز ترین متاع یعنی مذہب اسلام ان سے چھن جائے گا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کی ناکامی اور انگریزوں کی جانب سے بدلے کی فطرت نے انھیں مزید مایوسی کے غار میں ڈھکیل دیا لیکن اس کا ایک فائدہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو اس کا احساس ہو گیا کہ ان کا واسطہ اب انگریز اور مغربی تعلیم سے ہے اور عہد وسطیٰ کی مسلم سیاسی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشی نظام دور حاضر میں نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے اور بدلے ہوئے نظام سے نبرد آزما ہونے کے لیے مسلمانوں کو اپنے پرانے طریقہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر نئے علوم کو اپنانا چاہیے۔ جس سے ان کے اندر ایک انقلاب انگیز نقطہ نظر پیدا ہوا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" نے انگریزوں کے رویے میں بھی ایک امید افزا تبدیلی پیدا کر دی۔

سر سید احمد خاںؒ کی تحریک علی گڑھ کے زیر اثر مظفر پور میں ۱۸۶۸ء میں بہار سائنٹفک سوسائٹی اور انجمن تہذیب کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد تعلیم اور فلسفیانہ گفتگو کے لیے سیمینار و جلسہ کا انعقاد تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے طرز پر پٹنہ میں محمڈن ایجوکیشن کمیٹی قایم کی گئی جس نے ۱۸۸۴ء میں اینگلو اورینٹل اسکول پٹنہ میں قایم کیا جس میں طلبا کی تعداد دو ہی سال میں بڑھ کر ۲۰۰ تک پہنچ گئی۔ مغربی و انگریزی تعلیم کی علما کے ایک طبقے نے بھرپور مخالفت ضرور کی لیکن جلد ہی یہ تعلیم مسلمانوں میں عام ہو گئی۔ ریاست کی انتظامیہ میں یوروپین اور بنگالیوں کے بعد بہار کے مسلمانوں کی ہی اکثریت تھی اور بنگال سے بہار کو علیحدہ کرنے کی تحریک میں بہار کے مسلم رہنماؤں نے ہی بھرپور حصہ لیا۔ کیونکہ ان کا ہی مقابلہ سرکاری نوکریوں کے حصول میں بنگالیوں سے تھا۔ آزادی کے حصول تک کوشش

یہی صورت حال باقی رہی گویا اس صدی کی تیسری دہائی کے بعد بہار کے ہندوؤں میں انگریزی تعلیم زیادہ تیزی سے عام ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند کا خونچکاں واقعہ بہار بلکہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک زبردست المیہ ہے جس کے نتیجے میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی گئی اور علاقے کا علاقہ ان سے خالی ہو گیا۔ جانے والوں میں اکثریت متوسط طبقہ (Middle class) کی تھی جو کہ کسی قوم و ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت جو یہاں رہ گئی وہ بدامنی، پشیمانی، اقتصادی بدحالی اور احساس کمتری کا شکار تھی انھوں نے اپنے کو خول میں بند کر لیا۔ کچھ لوگوں نے حالات کے رُخ کو دیکھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے بجائے حالات کے اس رواں دھارے میں شامل ہو گئے۔ ملک میں مسلمانوں کے لیے غیر یقینی حالات کے پیش نظر تعلیم یافتہ مسلمان موقع ملتے ہی پاکستان نکل جایا کرتے تھے۔ اس Brain Drain کا سلسلہ ۱۹۷۵ء میں سقوط ڈھاکہ تک جاری رہا۔ گو یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے جس قدر جذباتی صدمہ کا باعث ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی۔

حالات اب بدلتے جا رہے ہیں۔ بہار ایجوکیشن سوسائٹی کے ایک سروے کے مطابق بہار میں ۱۹۴۶ء سے قبل صرف ۱۳ مسلم ہائی اسکول قایم ہوئے تھے۔ ۱۹۷۱ء تک ان کی تعداد بڑھ کر ۴۰ تک پہنچی لیکن اسی کے بعد ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور ایک مختلف اندازے کے مطابق اب ڈیڑھ سو سے تجاوز کر چکی ہے لیکن یہ تبھی ممکن ہو سکا جب کہ مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ان کا جینا اور مرنا اسی دھرتی پر ہے اور ان کے لیے اب جائے فرار تنگ ہو چکی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حسین و جمیل، سب سے زیادہ سخی و فیاض اور سب سے زیادہ شجاع و بہادر تھے۔ ایک رات اہل مدینہ خوف زدہ ہو گئے اور جدھر سے آواز آئی تھی ادھر لوگوں نے رخ کیا۔ راستے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے ہوئے ملے۔ آپؐ آواز سن کر سب سے پہلے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ آپؐ فرماتے جاتے تھے کہ ڈرو نہیں، ڈرو نہیں۔ آپؐ اس وقت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھوڑے پر سوار تھے جس پر زین بھی نہ تھا۔ تلوار آپؐ کے شانے سے لٹک رہی تھی۔ آپؐ نے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اس کو سمندر کی طرح رواں اور تیز رفتار پایا۔"

الادب المفرد ص ۴۶

ہماری چند ایجنسیاں

ایجوکیشنل بک ہاؤس
شمشاد مارکیٹ۔
اے۔ ایم یو۔ علی گڑھ

محمد الیاس نیوز ایجنسی
۹۱۔ کالو ٹولہ اسٹریٹ
کلکتہ

مسٹر طالب حسین
ایف ڈی ہائر سکنڈری اسکول
کاٹھ دروازہ۔ مراد آباد۔

مسیرز ناصر حسین
جمال بک ڈپو۔
بارہ روڈ۔ گیا۔ بہار۔

میسرز عبد الستار بک سیلر
کمپنی باغ
مظفرپور بہار

مسٹر اعظم خاں
ٹاؤن اینڈ پوسٹ آفس نعریا نجابت خاں
بریلی۔

میسرز انوار بک ڈپو
شمشاد مارکیٹ
اے۔ ایم یو۔ علی گڑھ

میسرز کتاب منزل
سبزی باغ
پٹنہ - بہار

کتاب محل
تکیہ
اعظم گڑھ

میسرز نیوز ریڈر ویوز
بھولی موڑ
دھنباد - بہار

میسرز کتاب سینٹر
شمشاد مارکیٹ
اے۔ ایم یو۔ علی گڑھ

صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ۔ وارث پورہ
کامٹی۔

مالک مطبوعہ ... علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات۔ اے ایم یو علی گڑھ۔ پرنٹر: ایس۔ کے۔ آفسیٹ پریس دہلی

S. No.	Name of Posts & Pay Scale	No of Posts	A G E	Educational Qualifications And Experience
4.	Technical Assistant/S One in each section, C Cockery & Food & Beverage Service Scale of Pay :— Rs 330-560 (Unrevised) Plus other Allowances admissible to the Government Employees	Two	20-28	3 Years Diploma in Hotel Management & Catering Technology or a Certifiicate Course in the relevant field with atleast 10 years experience.
5.	Stenographer Scale of Pay :— Rs. 330-560 (Unrevised Scale) Plus other Allowances admissible to the Government Employees	One	22-30	Matriculation / Higher Secondary with a minimum speed of 80 and 40 words per minutes in English Shorthand and Typing respectively and 2 years experience.
6	Clerk-cum-Typist Scale of Pay :— Rs. 260-400 (Unrevised Scale) Plus other Allowances admissible to the Government Employees	One	20-28	Matriculation with a Typing speed of 40 words per minutes with at least one year experience Desireable :—Working knowledge of Hindi and Hindi Typing.

Preference will be given to the Schedule Casts/Scheduled Tribes candidates Higher inittal start may be given to candidates possessing exceptional qualifications and experience.

Prescribed applications forms may be obtained from the Administrative Officer, Foodcraft Institute, Aligarh (University Polytechnic Campus, Aligarh Muslim University, Aligarh) on payment of Rs. 5/= in cash or through an Indial Postal Order payable to the Secretary, Foodcraft Institute, Aligarh either personally or by sending a self addressed stamped envelop of 23 × 10 cms. Last date for receipt of applications is 15-4-1989 upto 1.30 P. M. Incomplete application and those received late will not be considered.

(Prof. Ziaul Hasan)
Actg Secretary

FOODCRAFT INSTITUTE ALIGARH

(UNIVERSITY POLYTECHNIC CAMPUS)

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH

Dated : 25-2-1989

Advertisement No FCIA./1988-89/2

Application are invited for the following Temporary Posts (Likely to be continued).

S. No.	Name of Posts & Pay Scale	No. of Posts	AGE	Educational Qualifications And Experience
1.	Senior Instructor (Cookery) Scale of Pay :— Rs. 700-1300 (Unrevised Scale) Plus other Allowances admissible to the Government Employees	One	25-40	3 Years Diploma in Hotel Management & Catering Technology (Atleast IInd. Division) or equivalent. Experience :—Atleast 5 years experience of Teaching or Practical in an Educational Institution or Industry in the relevant field. Desireable:—Post Diploma in specialised Hotel Management.
2.	Senior Instructor (Travel & Tourism) Scale of Pay :— Rs. 700-1300 (Unrevised Scale) Plus other Allowances admissible to the Government Employees	One	25-40	M Com and M.B.A. (Atleast IInd Division). Experience :—Atleast 5 years Teaching or Practical experience in an Educational Institution or Industry in the field of Travel & Tourism
3.	Assistant Instructor (Cookery) Scale of Pay :— Rs. 425-700 (Unrevised Scale) Plus other Allowances admissible to the Government Employees	One	20-28	3 Years Diploma in Hotel Management & Catering Technology (Atleast IInd Division) or equivalent. Experience :—Atleast One Year experience in Cookery Desireable :—A Craft Certificate in the relevant field.

Contd. 2

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone : 4185

ماہنامہ
تہذیب الاخلاق
بانی۔ سر سید احمد خاںؒ
مئی ۹۶ء
عبد السلام
عبد السلام

مندرجات

قوتوں کی وحدت کے تصورات کی تاریخ —— عبدالسلام

خصوصی اداریہ

خوش آمدید ـــــــــــــــــ پروفیسر عبدالسلام خوش آمدید

عالمِ اسلام کے مایۂ ناز سائنسدان اور تیسری دنیا کی سائنس کے مسیحا ،

کائنات میں کارفرما قوتوں کے نکتہ‌داں ،

برق مقناطیسی اور خفیف نیوکلیائی قوتوں کی وحدت کے شارح ،

الکندی ، البیرونی اور ابن الہیثم کی عظیم روایتوں کے امین و وارث ،

اسلامی سائنس کی ٹوٹی کڑی کو پھر سے جوڑنے والے ،

عالمِ اسلام کی علمی پسماندگی پر آشفتہ نوا ،

حکمائے اسلام کے علمی کارناموں کے نقیب ـــــــــــــــــ خوش آمدید

خوش آمدید کہ

آپ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین کی لائف ممبری قبول کر کے علیگ برادری کے ایک رکن بن گئے ہیں ،

خوش آمدید کہ

آپ کی عنایتوں سے ہمارے فزکس اور میتھمیٹکس کے شعبے آپ کے بین الاقوامی مرکز سے وابستہ ہیں ،

خوش آمدید کہ

آپ نے سنٹر فار پرموشن آف سائنس اور ماہنامہ تہذیب الاخلاق کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی ،

خوش آمدید کہ

آپ نے ڈیوٹی سوسائٹی کا سرپرست بننا قبول فرمایا ،

خوش آمدید کہ

آپ نے ہمارے اور ہمارے ملک کے سائنسی پروگراموں میں گہری دلچسپی لی ،

خوش آمدید کہ

آپ سر سید کے خوابوں کی تعبیر ہیں اور آپکے شب و روز اس فکر میں گذرتے ہیں کہ

جامِ مے بدلے گئے، پیرِ مغاں بدلے گئے
ذوقِ سجدہ کی طلب پر آستاں بدلے گئے
ہر طرف پیمانۂ سود و زیاں بدلے گئے
یہ زمیں بدلی گئی، یہ آسماں بدلے گئے
ایک ہلچل ہے بپا، ہیجان ہے طوفان ہے
ملتِ اسلام کی بستی مگر سنسان ہے

ہم آپ کے ممنونِ کرم ہیں کہ آپنے یہاں آنے کی زحمت فرمائی
ہم دست بدعا ہیں کہ خدا آپ کو عرصۂ دراز تک صحیح و سلامت اور صحت مند رکھے تاکہ آپکے ہاتھوں دنیائے سائنس اور انسانیت کی خدمات انجام پاتی رہیں ۔

اسرار احمد

خوشامد

سر سید احمد خاںؒ

دل کی جس قدر بیماریاں ہیں، ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اسی وقت انسان مرض مہلک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ جس طرح کہ خوش گلو گانے والے کا راگ اور خوش آئند باجے کی آواز انسان کے دل کو نرم کر دیتی ہے۔ اسی طرح خوشامد بھی انسان کے دل کو ایسا ہی پگھلا دیتی ہے کہ ہر ایک کانٹے کے چبھنے کی جگہ اس میں ہو جاتی ہے۔

اول اول یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر چیز کو اچھا سمجھتے ہیں اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کر اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہی محبت ہم سے باغی ہو جاتی ہے اور ہمارے بیرونی دشمنوں سے جا ملتی ہے اور جو محبت و مہربانی ہم خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں اور وہی ہماری محبت ہم کو یہ بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں پر مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو ایسا سمجھتے ہیں اور ان کی اس قدر قدر کرتے ہیں۔ جب کہ ہمارا دل ایسا نرم ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پھسلاوے اور فریب میں آ جاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے اندھی ہو جاتی ہے اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب آ جاتا ہے۔

لیکن اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالایق اور کمینے سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو یقینی خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی ویسا ہی نالایق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ جب کہ ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں، تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینے شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں، مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں سمجھنے لگیں۔ یہ بات نہایت عمدہ ہے کہ ہم خود اپنی حقیقت کو درست کریں اور سچ مچ وہ اوصاف خود اپنے میں پیدا کریں اور بجز من جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں کیونکہ ہر قسم کی طبیعتیں جو انسان رکھتے ہیں اپنے اپنے موقع پر مفید ہو سکتی ہیں۔ ایک تیز مزاج اور چست چالاک آدمی اپنے موقع پر ایسا ہی مفید ہوتا ہے جیسے کہ ایک روتی صورت کا چپ چاپ آدمی اپنے موقع پر۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے، جب چپ چاپ

سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں بیہودہ پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی ہے۔ مگر یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔ جس طرح کہ لائق شاعر دوسروں کی تعریف کرتے ہیں کہ ان اشعار سے ان لوگوں کا نام باقی رہتا ہے جن کی وہ تعریف کرتے ہیں اور شاعری کی خوبی سے خود ان شاعروں کا نام بھی دنیا میں باقی رہتا ہے۔ دونوں شخص خوش ہوتے ہیں ایک اپنی لیاقت کے سبب سے اور دوسرا اس لیاقت کو تمیز کرنے کے سبب سے، مگر لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند ہو کر وہ اصل صورت اور رنگ اور خال و خط کو بھی قائم رکھتا ہے اور پھر بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔

ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے وہ تعریف تعریف نہیں رہتی، بلکہ فرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔

ناموری کی مثال نہایت عمدہ خوشبو کی ہے جب ہوشیاری اور سچائی سے ہماری واجب تعریف ہوتی ہے تو اس کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے عمدہ خوشبو کا مگر جب کسی کمزور دماغ میں زبردستی سے وہ خوشبو ٹھونس دی جاتی ہے تو ایک تیز لپک مانند دماغ کو پریشان کر دیتی ہے۔ فیاض آدمی کو بدنامی اور نیک نامی کا زیادہ خیال ہوتا ہے اور عالی ہمت طبیعت کو مناسب عزت اور تعریف سے ایسی ہی تقویت ہوتی ہے جیسے کہ غفلت اور حقارت سے پست ہمتی ہوتی ہے۔ جو لوگ کہ عوام کے درجے سے اوپر ہیں انہی لوگوں پر اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسے کہ تھرمامیٹر میں وہی حصہ موسم کا زیادہ اثر قبول کرتا ہے جو صاف اور سب سے اوپر ہوتا ہے۔

(از تہذیب الاخلاق - بابت یکم ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سات آدمی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنا سایہ کرے گا جس دن بجز خدا کے سائے کے کوئی سایہ نہ ہوگا اور وہ سات یہ ہیں:

۱۔ منصف حاکم ۲۔ وہ جوان جس نے اللہ عزوجل ہی کی عبادت میں نشو و نما پائی۔ ۳۔ وہ جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے ۴۔ وہ دو آدمی جو اللہ کے لیے محبت کریں۔ ملیں تو اسی کے لیے اور الگ ہوں تو اسی کے لیے ۵۔ وہ جس کو کوئی صاحب جمال عورت بلائے تو کہے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں ۶۔ جو اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بایاں ہاتھ بھی نہ جانے کہ سیدھا ہاتھ کیا خرچ کرتا ہے۔ ۷۔ جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کے آنسو بہنے لگیں۔"

(بخاری و مسلم)

تاج محل کے سو سال بعد!

عبد السلام

آج سے تقریباً تین سو سال قبل ۱۶۶۰ء میں جدید عالمی تاریخ کی دو عظیم یادگاریں قایم ہوئیں۔ ایک مغرب میں — لندن کا سینٹ پال کیتھیڈرل۔ دوسری مشرق میں — آگرہ کا تاج محل۔ بیان کی ضرورت نہیں یہ دونوں یادگاریں بذاتِ خود اس بات کا مجسم اظہار ہیں کہ تاریخ کے اس دور میں ان دو میں سے کون سی تہذیب فن تعمیرات، کاریگری، دستکاری، صناعی اور ثروت کی کس منزل میں تھی۔ البتہ لگ بھگ اسی زمانہ میں ایک تیسری یادگار بھی وجود میں آئی۔ جس کے بعد کے اثرات زیادہ گہرے اور دور رس ثابت ہوئے۔ یہ نیوٹن کی طبعیات کے موضوع پر شہرۂ آفاق تخلیق پرنسپیا (Principia) ہے۔ مغرب کے اس شاہکار کے ہم پلہ مغل ہندوستان میں کچھ بھی نہ تھا۔ اب میں آپ کو مختصراً بتاؤں گا کہ نادرالمثال تاج محل دینے والی ٹیکنالوجی پر، نیوٹن کی پرنسپیا پر قایم ٹیکنالوجی سے ٹکرانے کے بعد کیا بیتی۔

اس ٹکراؤ کا پہلا دھماکہ ۱۷۵۷ء میں ہوا۔ شاہ جہاں کے تاج محل کی تعمیر کے تقریباً سو سال بعد رابرٹ کلائیو کے ہلکے پھلکے اسلحہ جات کی بہتر کارکردگی نے شاہ جہاں کے وارثوں کو شرمناک شکست دی اور اس کے مزید سو سال بعد ہندوستانی شہنشاہ کا شاندار تاج ملکہ وکٹوریہ کے قدموں پر تھا۔ آہ! یہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ نہ تھا، بلکہ ایک تہذیب، ایک تمدن، ایک طرز معاشرت اور ایک ٹیکنالوجی کی موت تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی اسٹیٹ کی زبان فارسی کے بجائے انگریزی ہو گئی۔ مشرق کے شیریں نغموں کو اسکولوں کے نصاب سے نکال کر ان کی جگہ شیکسپیئر اور ملٹن کی ادبیات کو لایا گیا۔ مشرق کے علمی خزانوں کو تاریخ کے اوراق سے اُڑا دیا گیا اور ڈھاکہ کے ململ کے خاکستر پر لنکا شایر کی سوتی پرنٹوں کا محل تعمیر ہوا۔

ترجمہ: اسرار احمد

نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام کا یہ مضمون تہذیب الاخلاق کے جنوری ۸۶ء کے شمارے میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کی گہری افادیت کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے

ادارہ

میں جھنگ کالج میں ۱۹۳۸ء میں ۱۲ برس کی عمر میں داخل ہوا، چار سال یہاں گزارے۔ اس زمانے میں یہ کالج انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ نویں، دسویں، فرسٹ ایر اور سکنڈ ایر کی کلاسیں تھیں۔ کثرت ہندو طلباء کی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ کالج میں مجھے نہایت قابل اور شفیق استاد ملے۔ پرنسپل گجرات کے حکیم محمد حسین مرحوم تھے۔ انگریزی کے استاد شیخ اعجاز احمد، عربی کے شفیق استاد صوفی ضیاء الحق، فارسی کے استاد خواجہ معراج الدین، حساب اور سائنس کے مضمون اس زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ حساب میں لالہ بدری ناتھ اور لالہ رام لال، فزکس کے استاد لالہ ہنس راج اور کیمسٹری کے استاد لالہ لوبت رائے تھے۔

میرے تعلیمی کیریر کی بنیاد اسی کالج میں پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بعد کی حقیر کامیابیاں اس کالج کی تعلیم اور میرے جھنگ کے استادوں کی شفقت کی مرہون منت ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔ اس توجہ کی ایک مثال عرض کروں۔ فرسٹ ایر کے دوران میں نے انگریزی کے بہت سے نئے اور خوب صورت لفظ سیکھے، پسند آئے اور میں اپنی تحریروں میں ان مشکل اور بعض اوقات متروک لفظوں کو بے تکلف اور بے محل استعمال کرنے لگا۔ استاد گرامی جناب شیخ اعجاز صاحب نے کئی بار ٹوکا، تنبیہ فرمائی۔ میری طرف سے تعاون نہ ہوا۔ سہ ماہی کا امتحان آیا۔ جناب شیخ صاحب نے پرچہ مارک فرمایا۔ ہر متروک اور مجہول لفظ کے استعمال پر فی لفظ پانچ نمبر کے حساب سے نمبر کاٹ لیے۔ ظاہر ہے میرا ٹوٹل صفر کے قریب جا پہنچا۔ پھر اسی پر اکتفا نہ کی کلاس میں میرا پرچہ لائے اور ہر ہر غلط لفظ کا تذکرہ ساری کلاس کو سنایا۔ اس کے بعد پرچہ میرے حوالے کیا۔ اس پر تحریر تھا:

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی   کیں راہ کہ میروی بترکستان است

اس وقت مجھے یہ خصوصی سلوک بہت ناگوار گزرا، لیکن اب غور کرتا ہوں تو یہ سراسر شفقت تھی، نوازش تھی، کرم تھا۔ اس SHOCK THERAPY کا اثر یہ ہوا کہ کم از کم انگریزی میں خوبصورت لیکن بے محل لفظ استعمال کرنے کی عادت چھوٹ گئی۔

میری تعلیم جہاں استادوں کی مرہون منت تھی، اُسی سے زیادہ قبلہ والد صاحب کی نگہ اور ان کی دعاؤں کی مرہون منت تھی۔ اس زمانے میں میٹرک کا امتحان صوبۂ پنجاب کے لیے ایک قسم کا اکھاڑا ہوا کرتا تھا جس میں مختلف اسکولوں کے پہلوان دنگل کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر سناتن دھرم اور آریہ اسکولوں کے طلباء اس دنگل کے نامی پہلوان تصور کیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جس دن میٹرک کا نتیجہ نکلا میں مکھیانہ کچہری میں قبلہ والد صاحب کے دفتر میں

بیٹھا تھا رزلٹ کی کاپی دوپہر کے وقت لاہور سے مگھیانہ اسٹیشن پہنچی والد صاحب نے آدمی بٹھا رکھا تھا۔ کاپی ان کے دفتر میں لائی گئی۔ ساتھ ہی لاہور سے مبارک بادوں کے تار آنے لگ گئے۔ جس طرح میں نے عرض کی ہے اس زمانے میں میٹرک کا رزلٹ ایک نیشنل EVENT کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی وجہ سے ہندو کمیونٹی Community کی علم دوستی تھی۔ مجھے یاد ہے دو بجے دوپہر سائیکل پر سوار ہو کر میں مگھیانہ سے جھنگ شہر واپس لوٹا۔ رزلٹ کی خبر جھنگ شہر میں میرے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ جھنگ پولس والے گیٹ سے مجھے بلند دروازہ کی طرف جانا تھا مجھے اب تک یاد ہے وہ ہندو دکاندار جو عموماً مئی کی اس تیز گرم دوپہر کے وقت اپنے کھاتوں پر دکانوں کے چھپروں کے سائے تلے سوئے ہوئے تھے جس وقت میں سائیکل سے گزرا اس روز وہ سب تعظیماً اپنی دکانوں میں میرے آنے کے انتظار میں قطاروں میں کھڑے تھے۔ ان کی اس علم نوازی کا نقشہ ہمیشہ میرے دل پر رہا ہے۔

میں جھنگ سے گورنمنٹ کالج لاہور اور وہاں سے کیمبرج پہنچا۔ کیمبرج میں انگیز طلبا کی علم نوازی کا ایک نیا مشاہدہ ہوا۔ کیمبرج کے کلاس روم میں طالبعلم اس انداز سے بیٹھتے ہیں جس طرح نماز سے پہلے نمازی مسجد میں آکر بیٹھتے ہوں لیکچرار کے آنے سے پیشتر ایک سناٹا ہوتا ہے۔ لیکچر کے درمیان میں انگریز طالبعلم چار چار قسم کی سیاہیوں والا قلم صحیح لکیریں ڈالنے کے لیے رولر استعمال کر رہا ہوگا اس کی نوٹ لینے والی کاپیاں ایسی احتیاط سے لکھی گئی ہوں گی جیسے پروفیشنل خوش نویس لکھ رہا ہو۔ میرے ساتھ والے طالب علم براہ راست اسکولوں سے آئے تھے۔ عمر میں مجھ سے سب کم تھے لیکن ان کی خود اعتمادیوں اور ان کی امنگوں کا وہ عالم تھا جسے تحصیل کرنے کے لیے مجھے کم از کم دو سال درکار ہوئے۔ وہ ایسے ماحول سے آئے تھے جس میں ان کے اسکولوں کا استاد اچھے پڑھنے والے بچوں کو یہ سمجھا کر کیمبرج روانہ کرتا کہ عزیزو تم اس قوم کے فرزند ہو جس میں نیوٹن پیدا ہوا تھا، سائنس اور ریاضی کا علم تمہاری میراث ہے اگر تم چاہو تو تم بھی نیوٹن ہو سکتے ہو۔

کیمبرج میں ڈسپلن کا انداز بھی میرے لیے نیا تھا۔ کیمبرج میں بی اے کا امتحان آپ زندگی میں صرف ایک بار دے سکتے ہیں آپ خدانخواستہ فیل ہو جائیں تو پھر دوسری بار امتحان دینا ممکن نہیں۔ ہوسٹل کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ دس بجے رات تک آپ بلا اجازت کالج سے باہر رہ سکتے ہیں۔ دس سے بارہ بجے تک ایک پینی جرمانہ لیکن اگر آپ ۱۲ بجے کے بعد آئے تو سات دن کی Gating ہوگی اور اگر سال کے دوران ۳ بار ایسا ہوا تو آپ کو کیمبرج سے نکال دیا جائے گا۔ کیمبرج میں ہر طالب علم Adult تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے سب کاموں میں مکمل ذمہ دار گنا جاتا ہے۔ اس سے بے جا تعرض نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ سزائیں بھی وحشیانہ ہیں جنھیں وہ طالب علم مردانہ وار قبول کرتے ہیں۔

کیمبرج کا طالب علم ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے پہلے دن جب میں St Johns College پہنچا میرا ۲۰ سیر کا بکس ریلوے اسٹیشن سے تو ٹیکسی پر چلا آیا لیکن جب کالج پہنچ کر میں نے پورٹر کو بلایا اور کہا یہ میرا بکس ہے۔ اس نے کہا ٹھیک ہے وہ Wheel Barrow ہے۔ آپ اسے اٹھایے اور باقیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں لے جایئے۔ ان پرانے قصوں کی بازخوانی محض ذاتی حظ لینے کے لیے نہیں کر رہا۔ میں تعلیم اور علم نوازی کے موضوع پر چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں یہ داستانیں میرے مضمون کا حصہ ہیں۔

آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا کہ ہماری تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تعلیمی پسماندگی اور خصوصیت سے غلط اور ناقص تعلیم ساری قوم کا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قوم اس وقت جس بحران سے گزر رہی ہے اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے تعلیمی نظام کی طرف توجہ نہیں دی۔

تعلیمی نظام کا اولین کام شخصی کردار کو ڈھالنا تصور کیا جاتا ہے۔ کردار کی جو بنیاد کالج میں بنتی ہے وہ زندگی بھر شاید ہی بدلتی ہے لیکن میں شخصی کردار کے بارے میں عرض نہیں کروں گا میرا رخ ہمارے تعلیمی نظام کے قومی پہلوؤں کی طرف ہے۔ دو سوال

کی غلامی کے بعد پاک پروردگار نے ہمیں آزادی عطا فرمائی تھی۔ اس بات کو اب تقریباً چالیس سال گزر چکے ہیں لیکن اس طویل عرصے میں ہم اپنے اندر احساس یگانگت، احساس اخوت اور احساس قومیت پیدا نہ کر سکے۔

آزادی کے بعد ہمارے تعلیمی نظام کا اولین فرض یہ ہونا چاہیے تھا کہ ہماری یگانگت اور قومیت کے احساس کو پختگی دیتا۔ یگانگت اور قومیت کا تصور مختلف زمانوں میں بدلتا چلا آیا ہے۔ آج کے تصور کے لحاظ سے دنیا کے کئی ملکوں اور قوموں کی مثالیں ملتی ہیں جن کا استحکام محض ان کے تعلیمی نظام کا مرہون منت ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ کا حال لیجیے۔ امریکہ کے یونائیٹڈ سٹیٹس میں انگریز، جرمن، اٹالین، سویڈش، فرانسیسی سب قبیلوں کے لوگ بستے ہیں۔ میں ان لوگوں کو قبیلوں کا نام دے رہا ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو یورپ میں اپنی علیحدہ قومیت کے لیے دو عظیم جنگوں میں جانیں دے چکے ہیں۔ ان کی زبانیں امریکہ آنے سے پہلے مختلف تھیں، مذہب مختلف تھے اور اب بھی مختلف ہیں لیکن امریکہ کے تعلیمی نظام نے جیسے ایک melting pot میں پگھلا کر ان قبیلوں کو ایک واحد قومیت میں منسلک کر دیا ہے۔ اسکولوں میں ہر بچے کو امریکن کانسٹی ٹیوشن حفظ کرائی جاتی ہے، امریکن ہیرو اس کے زبان زد ہوتے ہیں۔ دن رات وہ امریکن ترانے سنتا ہے۔ ادیب، لکھنے والے، شاعر، افسانہ نویس اس طرز سے لکھتے ہیں کہ امریکہ کے ہر ہر خطے سے محبت اس کے شہری کے خمیر میں رچ جائے۔ امریکہ کے ہر شہری کو نہ صرف اپنے شہر سے محبت کا درس دیا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو امریکہ کے ہزاروں شہروں کا شہری سمجھتا ہے۔ دور افتادہ یورپ کی گلیوں سے جہاں سے وہ یا اس کے آباؤ اجداد آئے تھے اسے مناسبت نہیں رہتی۔ اسے اپنے اس خطے سے مناسبت ہوتی ہے جس سے اس کا کھانا اس کا پینا اس کا روزگار اور اس کا ہر وسیلہ متعلق ہے۔ اس خطے کو بڑھانے اور چمکانے کے لیے کوشاں رہتا ہے اور یہ سب کچھ اسکولوں کالجوں، اخبارات، رسائل اور ٹی۔ وی کے ذریعے ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم یگانگت کے احساس کو شعوری طور پر اجاگر کرے۔

میری دوسری گزارش ٹکنالوجی اور سائنس کی تعلیم کے بارے میں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان اقتصادی طور پر پس ماندہ ہیں۔ یہاں ایک فرد کی اوسط آمدنی ستر ڈالر کے قریب بنتی ہے۔ ایک امریکن ہماری نسبت پچاس گنا زیادہ کماتا ہے۔ انگلستان کے ایک فرد کی اوسط آمدنی ہم سے بیس گنا زیادہ ہے۔ جاپان کی پندرہ گنا زیادہ، ایران کی آٹھ گنا زیادہ، ترکی کی آٹھ گنا زیادہ، عراق، الجیریا، شام مصر کی فی کس آمدنی ہم سے چھ گنا زیادہ ہے۔ افریقہ میں گھانا کی فی کس آمدنی ہماری نسبت سے چھ گنا زیادہ ہے۔ ہم قومی طور پر اس قدر غریب کیوں ہیں۔ مان لیا کہ ہماری بہت سی قومی دولت انگلستان والوں نے دہلی، پنجاب اور سندھ پر سو سالہ حکومت کے زمانے میں لوٹ لی۔ مان لیا کہ امریکہ خوش قسمت ہے۔ امریکہ والوں کو قدرتی اور معدنی وسائل سے بھرپور ایک خالی خطۂ زمین مل گیا لیکن پوچھنے والا ہم سے سوال کر سکتا ہے کہ ہم انگریز کے غلام کیسے بنے۔ اگر انگریز فن جہاز رانی سے واقف تھا اور ہم نہ تھے تو یہ فن اسے کس نے سکھایا۔ اگر کلائیو کی فلنٹ لاک رائفلوں، بندوقوں اور توپوں کی ساخت اتنی اعلیٰ تھی کہ سراج الدولہ کی فتیلہ سوزان کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں تو بندوق سازی کا یہ فن کس نے انگریز کو ودیعت کیا کیا یہ فن اس قوم نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ کیا یہ فن ایجاد کرنے کے بعد تعلیم کے ذریعے سے انگریز نے خود ہی اسے اپنی قوم میں فروغ نہیں دیا۔

پانی پت کے میدان میں بابر کی فتح بابر کے رومی توپ خانے کی مرہون منت تھی۔ رومی ترک تو اس فن میں ۱۵۲۶ء کے بعد بھی مزید تحقیق کرتے رہے لیکن بدقسمتی سے بابر کی اولاد کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ توپ سازی کے فن میں ترقی کے لیے باقاعدہ تجربہ گاہ بناتے۔ آپ قسطنطنیہ میں تشریف لے جائیں۔ رومی ترک کا مسجد کا تصور اپنے زمانے میں یہ تھا کہ ہر شاہی جامعہ کے ایک طرف اسپتال بنے گا دوسری طرف مدرسہ۔ یہ مدرسہ صرف دینی درس گاہ ہی نہیں ہوگا، اس میں توپ سازی کے تجربے بھی ہوں گے۔ بدقسمتی سے جو ترک پاکستان اور ہندوستان آئے

علم سے ان کی رغبت نسبتاً کم تھی۔ وہ اپنی یادگاریں مزار اور مقبرے تو چھوڑ گئے، مدرسے اور تجربہ گاہیں نہیں۔

اگر خدا کی ذات نے امریکن پر رزق کھولا اور اسے ایک نئے براعظم سے نوازا تو کیا یہ اس کے اس عزم کا بدلہ نہ تھا جس نے لسے بے کنار سمندروں میں نئے براعظم کی دریافت میں طوفانوں سے لڑوا دیا۔ اگر آج جاپان نے اپنی انڈسٹری کی دھاک ساری دنیا میں بٹھا دی ہے تو اس میں جاپانی نظام تعلیم کا کتنا حصہ ہے۔ خدا کے فرشتے جاپانیوں کو ٹیکنالوجی کی تعلیم دینے کے لیے نازل نہیں ہوتے۔ ایک زمانہ تھا کہ جاپان کا مال دنیا کی منڈیوں میں ناکارہ شمار کیا جاتا تھا، اب ٹیکنیکل لحاظ سے سب سے زیادہ اسی کی ساکھ ہے۔ برٹش لے لینڈ نے منی مورلیس کار تیار کی، جاپان والوں نے وہی کاریں بنائی ہیں۔ بجائے 1000 c.c کے جاپانی 600 c.c کے آدھے سائز کے انجن سے وہی پاور پیدا کرتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ بیس سال ہوئے امریکہ کے پروفیسر ٹاونس نے ٹرانسسٹر ایجاد کیا۔ انھیں اس دریافت پر نوبل پرائز ملا۔ ان کا پیٹنٹ توڑنے کے لیے ٹوکیو کی یونیورسٹیوں میں کوشش شروع ہوئیں اور اس قدر کامیاب ہوئیں کہ اس وقت سے الیکٹرونکس میں جاپانی بادشاہ ہیں۔ نہ صرف انھوں نے وہ ایجاد دوبارہ دریافت کی بلکہ انھوں نے اس کا نسخہ رسالہ عام میں شائع کر دیا تاکہ جو چاہے ہندوستانی ہو، پاکستانی ہو، عرب ہو ایرانی ہو، ٹرانسسٹر ٹیکنالوجی کو ترقی دے سکتا ہے۔

یہ علم کے رستم جاپانی کون ہیں۔ آپ یقین نہ کریں گے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو انیسویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی نعل بندی کے فن سے ناآشنا تھے۔ ایک امریکن ایڈمرل جب پچھلی صدی میں اپنے جنگی جہاز جاپان لے کر آئے اور جاپانیوں نے انھیں روکنا چاہا تو جہاز کی توپوں کی چند باڑوں نے جاپان والوں کو اپنی بندرگاہیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امریکن ایڈمرل کے جہاز سے ایک چوری ہوئی، وہ ایک گھوڑے کی چوری تھی۔ رات کے وقت گھوڑا غائب ہو گیا اور دوسرے دن اسے واپس کر دیا گیا۔ جاپانی اس کے نعل غور سے دیکھنے اور نعل بندی سیکھنے کے مشتاق تھے۔ اس وقت ان کی دھات سازی اس حد تک نہ پہنچی تھی کہ وہ لوہے کے نعل بناتے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جاپان کے میٹرک کے امتحان کا موسم خودکشی کا موسم کہلاتا ہے۔ اس امتحان کے نتائج پر آئندہ داخلے ہوتے ہیں لیکن اس کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس عمر کے بچے دنیا کے کسی اور ملک میں ریاضیات، فزکس اور کیمسٹری میں اس سے اعلیٰ سطح پر امتحان نہیں دیتے۔ ان امتحانوں کے دوران میں پرچوں کے راز افشا نہیں ہوتے۔ اسٹرائکیں نہیں ہوتیں، امتحان کے سینٹروں کے دروازے اور شیشے توڑے نہیں جاتے۔ ساری قوم سب والدین طالب علم امتحان کے بخار کا شکار رہتے ہیں اور پھر یہ لوگ ان امتحانوں کے نتائج کو اپنی مخصوص طرز پر قبول کرتے ہیں۔

ستمبر کے مہینے میں مجھے خوش قسمتی سے چین جانے کا موقع ملا۔ چین کے مڈل اسکول میں طالب علم بارہ برس کی عمر میں آتا ہے اور سترہ برس کی عمر میں ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان مڈل اسکولوں کو میرے طالب علمی کے زمانے کے انٹرمیڈیٹ کالج سمجھ لیجیے۔ ان پانچ سالوں میں لازمی تعلیم کی وجہ سے ہر چینی کو ۱۲ مضامین پڑھنا پڑتے ہیں جن میں کوئی مضمون اختیاری نہیں ہوتا۔ وہ بارہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

۱ وطنیات
۲ چینی زبان
۳ ۴ دو غیر ملکی زبانیں۔ انگریزی، روسی یا جاپانی
۵ ریاضی
۶۔ فزکس
۷۔ کیمسٹری
۸۔ بیالوجی اور زراعت
۹۔ تاریخ
۱۰ جغرافیہ
۱۱ آرٹس، ڈراما، میوزک
۱۲ ورک شاپ

طالب علم پورے بارہ مضمون پڑھتا ہے۔ چینیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ سو فیصدی طالب علم سائنس اور آرٹس دونوں پڑھیں گے۔

آپ شاید یہ گمان فرمائیں کہ سائنس کی اس لازمی تعلیم کا لازمی

نتیجہ یہ ہوگا کہ ان مضمونوں کا معیار ، ۱۶/۱۷ برس کے طالب علم کے لیے ہمارے
انٹرمیڈیٹ کے معیار سے کم ہوگا ۔ اس کا تجربہ کرنے کے لیے میں فزکس
اور ریاضی دونوں کے ایک ایک گھنٹے کے درس کے لیے کلاس میں گیا ۔
ریاضی میں میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ چودہ سالہ طالب علم
درجہ لا متناہی پڑھ رہے ہیں۔ یہ وہ مضمون ہے جو ہم لوگ بی۔ اے
میں پڑھاتے ہیں۔

چین نے تہیہ کیا ہے کہ وہ ہر صنعتی ٹیکنک کو چین میں رائج کریں گے
ان کی نئی قومی زندگی ہمارے دو سال ۱۹۴۹ میں شروع ہوئی ۔
لیکن ان کے اس عزم کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان چالیس سالوں میں
انھوں نے قومی سطح پر الیکٹرونکس کا فن اس کے آخری مرحلوں تک حاصل
کیا ہے۔ فولاد سازی ۴۰ ہزار ٹن سالانہ سے شروع کر کے آج انگلستان
کے برابر دو کروڑ ٹن تک جا پہنچی ہے۔ وہ اب نازک مشینی پرزے بناتے
ہیں، مِگ ۲۱ ہوائی جہاز بناتے ہیں۔ ہر چینی طالب علم اپنے اسکول اور
اپنی یونیورسٹی کے زمانے میں ہفتہ میں ایک دن ورکشاپ پریکٹس میں
صرف کرتا ہے، جس اسکول کا معائنہ میں کرنے گیا تھا، اس میں یہ
کیفیت تھی کہ ۱۴ سال سے ۱۶ سالہ طلبا کا ایک گروپ ٹرانزسسٹر کے
اجزا بنا رہا تھا۔ دوسرا گروپ پوٹیشیم کاربونیٹ معدنی صورت سے
لے کر Titration Grinding وغیرہ کرنے کے بعد
بوتلوں میں بند مارکیٹ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ۱۲ سالہ ہم طالب علموں
کا ایک گروپ اپنے ہم جماعتوں کے باقی طلبا کے جوتوں کی مرمت کرنے میں
معروف تھا۔ ان میں سے ایک بچی بول اٹھی ۔ آپ اس کمرے کی کھڑکیوں
پر نگاہ ڈالیں ۔ ان پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ ہم نے جب پہلے
جوتوں کی مرمت شروع کی تھی تو ہم بدبودار جوتوں کو ہاتھ لگانے سے
شرماتے تھے ۔ کھڑکیوں پر پردے ڈالے رہتے تھے ۔ آہستہ آہستہ ہمیں
اس محنت سے اب شرم نہیں آتی ۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے طالب علمی
کے زمانے میں پیداواری ہوں، جونک نہ ہوں ۔ سارے چین میں
یونیورسٹی، کالج اور اسکول کے طلبا اور استاد اپنی تعطیلات گرما
فیکٹریوں اور فارموں پر گزارتے ہیں ۔

آپ میری باتوں میں مبالغہ سمجھیں گے ۔ یقین مانیے مجھے بھی
آکر کوئی یہ کہانی سناتا کہ اتنا بڑا ملک اس قدر یک جہتی سے چل رہا ہے
تو میں ہرگز نہ مانتا، لیکن اپنے مشاہدے کو کس طرح جھٹلاؤں ۔
ایک بار نہیں میں تین بار چین کا سفر کر چکا ہوں مجھے اب بھی یقین
نہیں آتا کہ ۷۰ کروڑ انسان اسی طرح قومی مفاد کے لیے نہ صرف اپنے
ذاتی منافع کو قربان کر سکتے بلکہ اس سے بھی زیادہ قومی خودی میں
اپنی انفرادی خودی مدغم کر سکتے ہیں۔ اس قوم کا ہر فرد دن رات
انتھک طریقے پر کام کرتا ہے ۔ ان کے شہر جو ۱۹۴۹ میں مکھیوں
سے بھنبھناتے تھے ۔ پیکنگ جہاں شاہی محل کے عقب میں ڈراگن سمندر
کے نام سے معروف گندگی کی تیس فٹ چوڑی نہر تھی جو ۳۰۰ سال سے
صاف نہ ہوئی تھی، یہ شہر اب آئینہ کی طرح صاف ہیں اور یہ صفائی
خاک روبوں کی مرہون منت نہیں۔ یہ صفائی وکیلوں، استادوں،
طالب علموں، سیاست دانوں، دکان داروں کی مرہون منت ہے
یہ کام اسٹوڈنٹس یونینوں سے لیا گیا تھا اور وہ اس معاملے میں
مقدم اور پہل کرنے والی تھیں ۔

یہ صحیح ہے کہ چینی نظام شاید قایم اس لیے ہے کہ یہ مساویانہ نظام ہے
چینی وزیر سائیکل پر دفتر آئے گا ۔ سرکاری کار تب استعمال کرے گا جب
وہ آپ کا مہمان کی حیثیت سے خیر مقدم کرنے آئے گا۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہے کہ
قوم ایثار کرتی ہے لیکن یہ کہنے کے باوجود میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سسٹم کا
اس قوم کے اس عزم سے کہ ٹکنالوجی اور فن سیکھے جائیں گے، براہ راست کوئی تعلق
نہیں ہے۔ چین سے پہلے میں انگلستان اور جاپان کی مثالیں عرض کر چکا ہوں ۔

چین کے بیان میں میں اپنے موضوع سے بہت دور ہٹ گیا۔ میں عرض
کر رہا تھا کہ اگر انگریز نے انڈسٹریل ٹیکنک ایجاد کیے اور انھیں تعلیم کے ذریعے
اپنی قوم میں پھیلایا۔ اگر جاپان تعلیمی نظام کے ذریعے بغیر معدنی یا دیگر وسائل
رکھنے کے اپنی ساری قوم میں ہنرمندی پھیلا سکتا ہے، اگر چین والے اپنی
قوم کو ذہنی اپاہج نہیں سمجھتے اور ہر بچے سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی
قسم کی سائنس اور کوئی نہ کوئی skill سیکھے گا، اسے بڑھائے
گا۔ اگر یہ سب قومیں اپنی غربت کا علاج اس طرح کر رہی ہیں تو کیا اس
میں ہمارے لیے سبق نہیں ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ غریبی خود ایسی لعنت
ہے کہ اگر انسان بھوکا ہو، ننگا ہو تو اس کی دماغی صلاحیتیں کیسے بڑھانے

کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے جرمنی کا ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ ۱۹۴۷ء کی رات ہے۔ میں کیمبرج میں طالب علم تھا۔ جرمنی شکست کھا چکا تھا۔ جرمن قوم سرنگوں تھی۔ کیمبرج اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلبا کی ایک پارٹی کو امریکن کنٹرول کمیشن والوں نے جرمنوں کی حالت دیکھنے کے لیے دعوت دی۔ تقریباً ۵۰۰ کے قریب طالب علم سارے یورپ سے میونخ پہنچے۔ اس شہر میں ایک عمارت بھی ایسی نہ تھی جو صحیح وسالم ہو۔ اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ جرمن مکانوں میں نہیں بلوں میں رہ رہے ہیں۔

ہمارے لیے شہر کے ایک پارک میں خیمے لگائے گئے۔ ان خیموں کے شہر میں میں نے سنا کہ ایک جرمن میری تلاش کر رہا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ ایک ریسرچ اسکالر ہے۔ اس وقت کے لحاظ سے اسے شاید ۲۵ روپے ماہوار ملتے تھے۔ اس مشاہرہ سے شاید وہ ایک وقت کی روٹی کھا سکتا تھا۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ، جنگ کے دنوں میں وہ ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ملازم تھا جہاں بعض پنجابی قیدی بھی تھے۔ ان پنجابی قیدیوں سے اس نے پنجابی زبان کی تحصیل کی۔ ۱۹۴۷ء میں یہ جرمن ایک پنجابی جرمن ڈکشنری کی تالیف کر رہا تھا۔ پنجابی زبان میں اس کا کل سرمایہ میر وارث شاہ کی ایک کاپی اور ایک لاہور سے چھپی ہوئی اور انتہائی خستہ حالت میں پھٹی ہوئی ولا بھٹی کی کاپی تھی۔ یہ سن کر شہر میں ایک پنجابی وارد ہے وہ جرمن میری تلاش کر رہا تھا کہ ولا بھٹی میں بعض مشکل مقامات میں اسے سمجھا دوں۔ اس کی بدقسمتی سے یہ مقامات میرے لیے بھی بہت مشکل تھے اور اس بے چارے کی یہ خواہش تشنۂ تکمیل رہ گئی۔

اس واقعہ پر غور فرمایئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ ڈکشنری شائع ہوئی یا نہیں۔ اگر شائع ہوئی بھی تو اسے کتنے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک علم دوست قوم کی کہانی ہے۔ ایسی قوم جس کا سارا اثاثہ علم ہے۔ سائنس کا علم، ٹکنالوجی کا علم، زبانوں کا علم اور پھر ایسی قوم جس کے افراد میں یہ عزم ہے کہ جرمن پنجابی ڈکشنری کا لکھنا بے معنی ہی سہی لیکن اپنا وقت تاش کھیلنے میں نہیں گزاریں گے، اسٹرائیکیں نہیں کریں گے، فلمیں نہیں دیکھیں گے، اپنے یونیورسٹی کے وقت کو کھیل کا وقت نہیں سمجھیں گے۔ علم سیکھیں گے اور علم پیدا کریں گے۔ شاید اس میں ہمارے لیے بھی سبق ہو سکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک کہانی دہرانا چاہتا ہوں۔ یہ داستان چیرمین ماؤ نے بیان کی تھی اور اسے آپ ہر چینی کی زبان سے سنیں گے۔

"پرانے زمانے میں چین کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا اس کا نام "پیر کم عقل" تھا۔ اس بوڑھے کے مکان کی سمت جنوب کی طرف تھی لیکن اس کے دروازے کے سامنے تائیگ اور وانگ وو کے دو عظیم پہاڑ کھڑے تھے جن کی وجہ سے سورج کی کرنیں اس کے گھر میں کبھی نہ پہنچتی تھیں ایک دن اس بوڑھے نے اپنے جوان بیٹوں کو بلایا اور انھیں کہا کہ آؤ ہم اس پہاڑ کو کھود کر دور کر دیں۔ اس کے ہمسائے نے جس کا نام "پیر دانش ور" تھا، اس بے عقل بوڑھے سے کہا۔ میاں مجھے معلوم تھا کہ تم بیوقوف ہو لیکن اتنا گمان نہ تھا کہ اس قدر کم عقل ہو گے۔ تم کھودنے سے کس طرح ان دونوں پہاڑوں کو رفع کر سکو گے بے عقل بوڑھا بولا تمہارا کہنا درست ہے، لیکن اگر میں مر گیا تو اس کے بعد میرے بیٹے ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے، ان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ رہے گا۔ پہاڑ اور زیادہ طویل نہیں ہوں گے۔ ہر کھودنے کے ساتھ ان کی طوالت کم ہی ہوگی، بڑھے گی نہیں۔ ایک دن یہ لعنت ہمارے دروازے سے دور ہو ہی جائے گی۔

پیر کم عقل کی یہ بات سن کر پاک ذات کو ترس آیا۔ دو فرشتے آئے اور انھوں نے ان دونوں پہاڑوں کی لعنت کو دور کر دیا۔"

میری عرض یہی ہے سوسائٹی کی لعنتیں ان دو پہاڑوں کی مانند ہیں۔ انھیں اپنے حلقۂ اثر میں صبر کے ساتھ دور کرنے میں کوشاں ہو جایئے۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات کو آپ کی کوششوں پر بھی ترس آئے گا۔ آمین

یہ فکر نہ کیجیے کہ آپ کی کوشش کامیاب ہوگی یا نہیں۔ آپ اپنا فرض ادا کیجیے، خداوند تعالیٰ کی پاک ذات ان میں برکتیں ڈالے گی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۵ (مئی ۱۹۸۹ء)

سی۔ وی۔ رمن کی شخصیت اور ان کے کام کی ایک جھلک

محمد ظل الرحمٰن خاں*

یہاں سر چندر شیکھر وینکٹ رمن کے کام اور ان کی زندگی کے ان حالات کا ذکر اختصار سے کیا گیا ہے جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہیں۔ ہم نے دوسرے ایسے اہم پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جن پر معلومات زیادہ عام نہیں ہیں۔ بہت سی باتیں کتابوں میں نہیں ملتی ہیں۔ مجھے احباب سے ان باتوں کے بارے میں معلومات ہوئی ہیں اس کے لیے میں ان حضرات کا شکر گزار ہوں۔

رمن پر جی۔ ایچ۔ کیسوانی کی کتاب مفید ہے مگر اس میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے اور شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے نہیں آسکے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ حال میں رمن کے کسی شاگرد یا ساتھی نے ان پر کوئی مفصل کتاب لکھی ہے۔ جس میں بہت سی باتوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ مجھے علم نہیں کہ ابھی یہ کتاب چھپ کر آگئی ہے یا نہیں۔

اس صدی کے شروع میں رمن کلکتہ میں انڈین فائننس ڈپارٹمنٹ میں خاصے بڑے عہدے پر کافی عرصے تک رہے۔ وہاں وہ دفتر کے اوقات کے علاوہ اپنا زیادہ تر وقت انڈین ایسوسی ایشن فار دی کلٹیویشن آف سائنس کی تجربہ گاہ میں طبعیات میں تحقیق کا کام کرنے میں گزارتے تھے۔ مشہور دانشور سر اسوتوش مکرجی اس زمانے میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ وہ کبھی کبھی کلٹیویشن آف سائنس کی تجربہ گاہ میں آیا کرتے تھے اور وہاں رمن کو کام کرتے دیکھتے تھے قدرتی طور پر وہ رمن سے بہت متاثر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد وہ ہائی کورٹ کی ججی کے ساتھ ساتھ کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہو گئے۔ اس سے پہلے ہندوستان کی سب یونیورسٹیوں میں صرف پڑھائی ہوتی تھی تحقیق کے کام کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ حکومت وقت کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سر اسوتوش نے ذاتی دلچسپی لے کر اتنی بڑی رقم اکٹھا کر لی جس سے کہ کلکتہ کا سائنس کالج قائم ہو سکا۔ جہاں تحقیق کے کام کرنے کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ ویسے تو کئی لوگوں نے بڑی رقومات دیں لیکن دو حضرات کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ ہیں سر راش بہاری گھوش اور سر ترکھ ناتھ پالت۔ ان کے نام پر گھوش اور پالت چیرس سائنس کے کچھ شعبوں میں قائم ہوئیں۔

۱۹۱۷ء میں رمن نے پالت پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت کاغذ پر دکھلانے کو رمن کے پاس مغرب کے اچھے سائنسی رسالوں میں چھپے ہوئے صرف چند پرچے (Papers) تھے۔ ریسرچ کی کوئی ڈگری ان کے پاس نہیں تھی اور پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ سر اسوتوش کی جگہ کسی دوسرے وائس چانسلر کی ہمت ایسا تقرر کرنے کی نہیں پڑ سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید تقرر کے وقت سے ہی مخالفت کی بنیاد پڑ گئی اور لوگ موقعوں کی تلاش میں رہے۔

یونیورسٹی میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ رمن کلٹیویشن آف سائنس میں برابر کام کرتے رہے۔ اب اُن کو پہلے سے زیادہ موقع ملنے لگا

---

* پروفیسر فزکس ڈپارٹمنٹ، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

شاگرد ہاتھ بٹانے کے لیے مل گئے۔ ان کے شاگردوں میں کے۔ ایس
کرشنن کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بعد میں کرشنن کو سر کا
خطاب ملا اور وہ نیشنل فزیکل لیباریٹری کے ڈائرکٹر کے عہدے پر
فائز ہوے۔ لوگوں کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جس کام پر رمن
کو اکیلے نوبل انعام ملا اس میں کرشنن کا بہت نمایاں حصّہ ہے۔ اس
لیے انعام دونوں کو مشترکہ ملنا چاہیے تھا۔ گو کہ میرے خیال میں رمن
کو کچھ سبقت حاصل ہے۔

رمن اور کرشنن کے علاوہ دو سوویٹ سائنس داں جی لینڈ
سبرگ (G. Landsberg) اور ایل۔ منڈیلاشٹام
(L. Mandelstam) بھی نوبل انعام کی دوڑ میں تھے —
ہندوستانی اور سوویٹ سائنس دانوں کے کام میں وقت کا بہت
ہی تھوڑا فرق تھا۔ اگر ایک طریقے سے دیکھا جاتا تو یہ بھی کہا جا سکتا
تھا کہ سوویٹ سائنس دانوں نے کام پہلے کر لیا تھا۔ پھر ایک بات
یہ بھی تھی کہ جب کہ رمن کے گروپ نے رقیق اشیاء میں اثر کو
دیکھا تھا۔ سوویٹ سائنس دانوں نے سنگ مروہ (Quartz)
میں اثر پایا تھا لیکن فیصلہ کرنے والوں نے یہ طے کیا کہ رمن کو اور
سب لوگوں پر سبقت حاصل ہے۔ اور باتوں سے قطع نظر عام طور
پر بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سوویٹ سائنس داں اپنے کام کا اشتہار
اس طرح نہیں کر پاتے ہیں جس کی ضرورت ہے۔ متذکرہ بالا باتوں
کا ذکر کیسوانی نے کیا ہے۔ ممتاز ماہر طبیعیات میکس بارن
(Max Born) نے اپنی مشہور کتاب اٹامک فزکس۔ (Atomic
Physics) میں یہ صاف طور پر لکھا ہے کہ ہندوستانی اور سوویٹ
سائنس دانوں نے ایک ساتھ رمن اثر (Raman Effect)
دریافت کیا۔ تقریباً یہی بات جے۔ بی راجم نے اپنی کتابوں اٹامک
فزکس اور ماڈرن فزکس (Modern Physics)
میں کہی ہے۔ مشہور و معروف سوویٹ سائنس دانوں ایل۔ ڈی
لینڈاؤ (L. D. Landau) اور ای۔ ایم لفشٹز (E. M. Lifshitz)
نے اپنی کتاب میں رمن اثر کو رمن لینڈسبرگ۔ منڈیلاشٹام اثر کہا
ہے۔ مشہور برطانوی سائنس داں جے۔ ڈی برنال (J. D. Bernal)
نے بھی اپنی کتاب سائنس ان ہسٹری
میں رمن اثر کے لیے یہی نام استعمال کیا ہے۔

یہ سب باتیں تو نوبل کمیٹی کے دیکھنے کی تھیں۔ ذاتیات سے ہٹ
کر کچھ اصولوں پر غور کرنے اور ان کو طے کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً
یہ بات غور طلب ہے کہ آیا اگر کوئی کام مہینے دو مہینے آگے پیچھے ہوا
ہے تو ایسی صورت میں انعام کس طرح دینا چاہیے۔ میری اپنی رائے
یہ ہے کہ ان سب لوگوں کو انعام ملنا چاہیے جن کا اس دریافت
میں نمایاں حصّہ ہے۔ کسی شخص کو چاہیے کہ نوبل انعام کے معاملے میں
جو حق تلفیاں ہوئی ہیں ان پر تفصیل سے تحقیق کر کے نتائج کو منظر عام
پر لائے جس سے کہ آئندہ اصلاح ہو سکے۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے
کہ کئی لوگوں نے کام کیا ہوتا ہے مگر انعام کسی ایک یا دو ہی کو ملتا
ہے۔ پھر بھی دیکھنے کی بات ہے کہ انعام کی افادیت کیا ہے۔

کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے کہ رمن اثر کی خاص اہمیت
یہ ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نور (Light) ایک کوانٹم
(Quantum) شے ہے یہ بات صحیح نہیں ہے۔ رمن اثر کوانٹم اور
کلاسیکی طبیعیات دونوں کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ رمن اثر
کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس کو استعمال کر کے سالموں
(Molecules) کی ساخت کے بارے میں مفید معلومات
حاصل کی جا سکتی ہیں اور بڑے پیمانے پر یہ کام ہوا ہے۔

اس اثر کی پیشن گوئی تو ۱۹۲۳ء میں اسمیکل (Smekal)
نے کر دی تھی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں کریمرس (Kramers)
اور ہائیزنبرگ (Heisenberg) نے بھی یہی پیشن گوئی کی۔
لیکن اس کے باوجود عملی طور پر اس کی دریافت آسان نہیں ثابت
ہوئی۔ بہت سے لوگ دریافت کرنے میں ناکامیاب رہے۔ اس کی
ایک وجہ تو یہ ہے کہ کئی اور اثرات رمن اثر سے ملتے جلتے ہوے
ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری تھا کہ ثابت کیا جائے کہ جو چیز مشاہدے
میں آ رہی ہے۔ وہ کسی جانے پہچانے اثر کی وجہ سے نہیں ہے۔
دوسری دقت یہ تھی کہ شدت کی کمزوری کی وجہ سے رمن لائنوں
کا فوٹو لینا بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے بہت وقت درکار تھا

اور شروع میں لوگوں کو اس کا اتنا اچھا اندازہ نہیں تھا۔ ان باتوں کی روشنی میں ہم کو رمن کی قابلیت اور بڑائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سوچنا کہ اس کام میں رمن اور کرشنن کے علاوہ دو سوویٹ سائنس داں دوڑ میں بہت قریب چل رہے تھے۔ پھر اسمیکل وغیرہ کو بھی اس کا کچھ استحقاق پہنچتا ہے تو پھر رمن کی کیا ایسی بڑائی ہے، اس لیے غلط ہے کہ اگر دیکھا جائے تو بہت مشکل ہی سے کوئی دریافت ایسی نکلے گی جس میں ایک یا دو آدمی ہی اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ نوبل انعام بھلے ہی کسی کو ملا ہے البتہ چیزوں کے نام کیسے رکھے جائیں جس میں کسی کی حق تلفی بھی نہ ہو اور نام مختصر بھی رہے، اپنی جگہ پر ایک مسئلہ ہے۔

رمن کو نوبل انعام ۱۹۳۰ء میں ملا۔ اس کے علاوہ ان کو بیسوں انعامات اور اعزازات ملے۔ جس کام پر نوبل انعام ملا وہ سارا کام کلکتہ میں ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں وہ بنگلور چلے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے بہت کام کیا لیکن نہ صرف یہ کہ اس کی وقعت نہیں ہوئی بلکہ زیادہ تر وہ کام گمراہ کن سمجھا گیا۔

رمن نے تقریباً سارا کام دو میدانوں میں کیا ہے۔ یعنی نوریات (optics) اور علم آواز (Sound) یہ دو میدان ایسے تھے جن میں کام کرنے کی کچھ سہولتیں ہندوستان میں اس وقت بھی تھیں جب رمن مدراس میں طالب علم تھے۔ انھوں نے ان میدانوں میں ید طولیٰ حاصل کر لیا تھا۔ ان کا شروع کا کام ان دونوں میدانوں میں ہے لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد کا تقریباً سارا کام نوریات ہی میں ہے۔ علم آواز میں ان کا اہم کام یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی موسیقی کے کئی سازوں کا سائنسی تجزیہ کیا اور پایا کہ اسلاف سیکڑوں سال میں آزمائش و خطا سے صحیح بات پر پہنچ گئے تھے۔

رمن نے اپنے طالب علمی کے زمانے کی ایک دلچسپ بات یہ بتائی ہے کہ ان کے انگریز استاد پروفیسر جونز (Jones) نے سال بھر میں صرف ایک لکچر دیا تھا۔ اب اس بات پر توجہ دی جاتی ہے کہ اساتذہ بی ایس سی اور ایم ایس سی سب ہی کلاسوں میں اپنے لکچر پابندی سے لیں مگر پہلے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ وغیرہ میں بھی آنرز (Honours) کے بہت سے لکچر ہی نہیں لیے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اس زمانے میں اب کے مقابلے میں معیار کم تھا۔

کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ہونے کے بعد ان کے پاس کام کرنے والے جو طالب علم وہاں آئے ان میں جنوبی ہند کے لوگوں کا تناسب بنگالیوں سے کہیں زیادہ تھا۔ اس پر بنگالیوں میں بہت ناراضگی پیدا ہوئی۔ معاملات اخباروں تک پہنچ گئے۔ رمن نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان کی تجربہ گاہ میں داخلے کی بنیاد صرف قابلیت ہے۔ کون کس علاقے کا ہے اور کیا زبان بولتا ہے۔ اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اپنے نوبل لکچر میں جن دس شاگردوں اور ساتھیوں کا انھوں نے ذکر کیا اس میں کوئی بنگالی نہیں تھا جب کہ سارا کام کلکتہ میں ہوا تھا۔

جب رمن کو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس (I.I.S.) بنگلور کی ڈائرکٹرشپ پیش کی گئی تو انھوں نے وہاں جانے کے لیے یونیورسٹی سے چھٹی مانگی۔ چھٹی دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر وہ استعفیٰ دے کر بنگلور چلے گئے۔ کلکتہ میں کچھ اور بھی ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ ان باتوں کی وجہ سے آج تک بنگال اور جنوبی ہند کے سائنس والوں میں جو اختلافات پیدا ہوئے ابھی تک ختم نہیں ہو سکے ہیں۔

بنگلور میں چار سال کے اندر ہی ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کو ڈائرکٹرشپ سے ۱۹۳۷ء میں الگ ہونا پڑا لیکن وہ وہیں ایک خاص گریڈ میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ جب وہ انسٹی ٹیوٹ سے اکسٹھ سال کی عمر میں ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہوئے تو وہ رمن انسٹی ٹیوٹ کے، جو ان کے لیے ہی بنایا گیا تھا، ڈائرکٹر ہو گئے اور تادم آخر اس کے ڈائرکٹر رہے۔ جب بیاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے وی۔ رادھا کرشنن اس کے ڈائرکٹر بنے۔ رمن کی زندگی میں تو ان کا ادارہ ان کے نام کی وجہ سے تھوڑا بہت چلتا رہا لیکن ان کے بعد سے اس کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں ہے۔

بنگلور کے شروع زمانے کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۴ء میں رمن کی سرکردگی میں انڈین اکیڈمی آف سائنسز

قایم ہوئی۔ اس کا افتتاحی جلسہ بنگلور میں ۳۱ جولائی کو ہوا۔ افتتاحی تقریر اس وقت کے ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمٰعیل نے کی یہ تقریر لاجواب ہے۔ اس اکیڈمی کے بننے سے پہلے بنگال ہندوستان کی سائنس پر پوری طرح سے حاوی تھا۔ اب یہ ایک دوسرا مرکز بن گیا اور جو کچھ ہوا ہو رمن کے بنگلور جانے سے جنوبی ہند میں سائنس کو بڑا فروغ ملا۔

بہت سے لوگوں سے رمن کے سخت اختلافات رہے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو پنڈت نہرو نے چاہا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تشکیل نو رمن کی قیادت میں ہو لیکن رمن نہرو کی سائنس کی پالیسی سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ قومی سائنسی اداروں میں قیمتی ساز و سامان منگانے کی نہرو کی پالیسی کے سخت مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر قابلیت اور لگن ہو تو بہترین سائنس کے کے واسطے بڑے ساز و سامان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے نہرو کی پالیسی مہلک ہے۔ لیکن ساری دنیا کا تجربہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ تجرباتی سائنس (Experimental Science) بغیر اعلیٰ درجے کے قیمتی ساز و سامان کی مدد کے نہیں کی جا سکتی۔ رمن کے دور میں جو ممکن تھا وہ اب ممکن نہیں ہے اور اب رمن کا دور سائنس میں واپس آنے کو نہیں ہے۔ اب یہ کہنا پڑتا ہے کہ نہرو جی ان معاملات کو رمن سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ رمن کی عظیم شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے اور اپنی پالیسی پر مستعدی سے قایم رہے لیکن انہوں نے رمن کی عزت اور احترام میں کوئی کمی نہیں کی۔

نہرو جو کام رمن سے لینا چاہتے تھے وہ پھر انہوں نے سر شانتی سروپ بھٹناگر کے سپرد کیا۔ انہوں نے اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے کیا۔ دوسری طرف ایٹمی توانائی کا کام ہومی جہانگیر بھابھا کے سپرد شروع سے ہی تھا۔ اس کو جس خوش اسلوبی سے بھابھا نے کیا وہ خود اپنی ایک مثال ہے۔ دفاعی ریسرچ کا کام نہرو نے بھگونتم کے سپرد کیا۔ آزادی سے پہلے بھی جب کانگریس نے مستقبل کے ہندوستان کے لیے اپنی سائنس اور ٹکنالوجی کی پالیسی بنانے کے لیے رمن کی مدد چاہی تو ان کا تعاون نہیں ملا۔

۳۶ – ۱۹۳۵ء میں رمن کی دعوت پر میکس بارن بنگلور آئے ہوئے تھے۔ دونوں میں بڑا سخت جھگڑا ہوا۔ بعد میں جب یورپ میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو پھر جھگڑا ہوا۔ پوری تفصیل تو مجھے نہیں معلوم مگر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنگلور آنے کے بعد سے رمن اپنے سائنٹفک خیالات میں صحیح راستے سے بھٹک گئے تھے اور ان کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو صحیح سمجھتے تھے اور اپنی رائے کی نکتہ چینی کو اپنی ذات پر حملہ تصور کرتے تھے۔ اگر رمن کے ساتھیوں اور شاگردوں کو کبھی ان کی غلطی کا احساس بھی ہوا ہو تو ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ رمن کو ٹوک سکتے۔ وہ یقیناً رمن کے مزاج سے بخوبی واقف رہے ہوں گے۔ پھر رمن ہی کیوں ہندوستان کی پرانی روایات بھی یہ نہیں ہیں کہ استاد کی غلطی پکڑی جائے۔ پرانا اصول تو یہ تھا کہ

"خطائے بزرگاں گرفتن خطا است"

اس سلسلے میں رمن کا ہیروں کے اسپکٹرل تجزیے کا کام قابل ذکر ہے۔ اس کام کی بنیاد پر انھوں نے ہیروں کی درجہ بندی کر دی تھی جس کو سائنس کی دنیا نے نہیں مانا۔ بعد کو یہ معلوم ہوا کہ یہ نتائج غلط اور گمراہ کن تھے جو ہیروں میں ملاوٹ کی وجہ سے اخذ کر لیے گئے تھے۔ رمن کو اس کا شبہ بھی نہیں تھا اور وہ اپنے خود ساختہ خیالات میں مگن تھے۔ اگر کوئی جانتا بھی ہوتا تو وہ کیسے کہتا۔ نوبل انعام پانے سے ان کی خود اعتمادی اور انا جو پہلے ہی کیا کم تھی اب حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لہٰذا وہ آخر تک اپنے غلط نظریوں پر اڑے رہے اور لوگوں سے جھگڑتے رہے ہیروں کے علاوہ رمن نے رنگ بصیرت اور پھولوں کے رنگ پر بہت کام کیا۔ مگر ان سب کا بھی ویسا ہی حشر ہوا جو ہیروں پر کام کا ہوا۔ ماہرین نے یہ کوئی نتائج نہیں مانے۔

سائنس داں کو صحیح راستہ دکھانے میں اعلیٰ سائنسی رسالے

کا بہت دخل ہے۔ جب کوئی پرچہ اشاعت کے لیے بھیجا جاتا ہے
تو اسے ریفری (Referee) یا ریفریوں کے پاس روانہ
کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب کام خفیہ طریقے سے کیا جاتا ہے۔ ایسی
صورت میں ریفری پر کسی کی شخصیت کا کوئی رعب نہیں پڑتا۔
وہ اپنی آزادانہ رائے دے دیتا ہے جو ریفری کا بلا نام بتلائے
لکھنے والے کو بھیج دی جاتی ہے۔ اس سے لکھنے والے کو اپنی
غلطیوں کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ غلطیاں درست کر کے
پرچہ کو دوبارہ چھپنے کے لیے بھیج سکتا ہے۔ آخری فیصلہ ریفری کی
رائے سے ہی ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر صحیح بات انوکھی
ہو تو ریفری اس کو نہیں سمجھ پاتا اور وہ بیجا اعتراضات کرتا رہتا ہے
مگر اکثر وہ اپنی غلطی مان لیتا ہے۔ آخر کار پرچہ چھپ ہی جاتا ہے۔ اس
قسم کی خرابی کے باوجود اس طریقے کے فائدے اس کے نقصانات سے
بہت زیادہ ہیں۔

۱۹۳۴ء سے پہلے رمن کے نوے فیصدی سے زیادہ پرچے
باہر کے اعلیٰ سائنسی رسالوں میں چھپے ہیں۔ خال خال ہی کوئی پرچہ کسی
ہندوستانی سائنسی رسالے میں چھپا ہے لیکن ۱۹۳۴ء میں جب
اکیڈمی بنگلور میں قایم ہو گئی تو وہ اپنا قریب قریب سارا ہی کام اس
کی پروسیڈنگز (Proceedings) یا اس کے دوسرے رسالے
کرنٹ سائنس (Current Science) میں شایع کرنے
لگے۔ ۱۹۳۴ء سے ہی انھوں نے باہر شایع کرنا بہت کم کر دیا اور
۱۹۳۸ء کے بعد تو شاید ہی رمن کا کوئی پرچہ باہر چھپا ہو۔ یقیناً رمن نے
ایسا اس لیے کیا کہ دیسی رسالوں کی قدر پیدا ہو لیکن یہ بات صاف
ہے کہ ان دیسی رسالوں کے ریفری رمن کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے تھے۔
چنانچہ صحیح رائے جو عام لوگوں کو اپنے کام کے بارے میں ریفریوں
سے ملتی رہتی ہے، رمن کو ملنا بالکل بند ہو گئی۔ رمن جو کچھ لکھتے وہ
چھپتا رہتا۔ اسی وجہ سے رمن صحیح راستے سے بھٹک گئے اور اس کا
ان کو اندازہ بھی نہیں ہوا۔

یہ بات شاید درست نہیں ہے کہ نوبل انعام ملنے سے ہی ان
میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور آ گئی تھی۔ ان میں یہ چیزیں
اول دن سے موجود تھیں۔ جب ان کو پالت پروفیسر مقرر کیا گیا تو اس
کے ساتھ ایسی شرط تھی کہ پہلے ان کو یورپ یا امریکہ سے کوئی سند وغیرہ
حاصل کرنا ضروری تھا۔ رمن نے اس شرط کو قبول کرنے سے صاف
انکار کر دیا جس کی وجہ سے قاعدوں میں تبدیلی کرنا پڑی۔

اس رویے کی ایک اور مثال پیش ہے۔ ۱۹۶۸ء میں رمن
کو رایل سوسائٹی (Royal Society) کے فیلو (Fellow)
بنے ہوئے ۴۴ سال ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس سال دفعتاً فیلوشپ
سے استعفیٰ دے دیا جس میں کوئی وجہ نہیں بتائی۔ معلوم ہوا ہے کہ
رمن نے "بصیرت" پر کوئی پرچہ سوسائٹی کے رسالے میں چھپنے کے لیے
بھیجا تھا، اسے سوسائٹی نے معذرت کے ساتھ واپس کر دیا۔ لوگوں
کا خیال ہے کہ استعفیٰ کی وجہ اس بات پر ناراضگی تھی۔

اگر رمن ہندوستانی رسالوں میں اپنا کام شایع کرنے کے
ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک آدھ پرچہ باہر کے اعلیٰ رسالوں میں بھی
بھیجتے رہتے تو ان کو ہر موڑ پر صحیح راستہ معلوم ہوتا رہتا اور وہ
نہ بھٹکتے۔ بعد کے حالات کو جان کر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۳۴ء
کے بعد سے انھوں نے غالباً اعلیٰ سائنسی لٹریچر پڑھنا بھی بند کر دیا
ہوگا ورنہ ان کو صحیح راستہ پھر بھی معلوم ہوتا رہتا۔

رمن پر کچھ بے جا اعتراضات بھی کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ
آخری زمانے میں ان کو بہت سی چیزوں میں دلچسپی ہو گئی تھی۔ معترضین
یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ اپنی دلچسپیاں ذرا محدود رکھتے تو شاید ایک
آدھ اور اہم کام کر جاتے۔ یہ کہنے والے بھول جاتے ہیں کہ کسی کو
نہیں معلوم ہے کہ تخلیقی کام کرنے کے کیا قوانین ہیں جن کو اپنانا
چاہیے۔ ہر آدمی کا اپنا نرالا ڈھنگ ہوتا ہے

رمن پر اقربا پروری کا الزام بھی لگا ہے۔ میں معاملات
کو تفصیل سے تو نہیں جانتا مگر میں نے یہ سنا ہے کہ یہ بات تو صحیح ہے
کہ رمن نے اپنے رشتے داروں کو آگے بڑھایا مگر وہ اس کے مستحق
تھے تو یہ پھر کوئی بیجا بات نہیں ہے۔

رمن اپنے شاگردوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور سب
شاگرد ان کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔ چنانچہ رمن کا عہد کا کام مقبول

نہیں ہوا اس لیے ان کے آخری دور کے شاگردوں میں سے بہتوں کو وہ ٹریننگ شاید نہ مل سکی ہو جس کی توقع کی جاتی۔ ویسے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ رمن اثر کے میدان میں بعد کا تقریباً سارا نمایاں کام ہندوستان میں ہونے کے بجائے باہر کے ملکوں میں ہوا۔ اس میں رمن اور ان کے ساتھیوں کی کوئی غلطی نہیں ہے، یہ بات تو ناگزیر تھی۔

رمن اپنی زندگی کے آخری لمحے تک سائنس کے کام میں پورے انہماک سے لگے رہے۔ ان کی رگ رگ میں سائنس رچی بسی ہوئی تھی ان کے لیے سائنس ایک عقلی چیلنج سے کہیں زیادہ ایک جمالیاتی تقاضا تھی جو ان کے عقیدے کے مطابق ان کو خدا کے حسین سے حسین تر پہلو دکھلاتے چلی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک تجربہ گاہ کی حیثیت مندر کی اور سائنس داں کی پجاری کی تھی۔ رمن کے لیے سائنس ایک مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان میں غیر معمولی صلاحیتیں تھیں جن کو غیر معمولی محنت نے چوبالا کر دیا تھا۔ سائنس ان کی زندگی کا ماحصل تھا۔

بنیادی طور پر رمن روایتی اور عقلی دھاراؤں کا امتزاج تھے۔ وہ ایک خاص قسم کا مذہبی رویہ رکھتے تھے، گو کہ مذہبی رسوم ادا کرنے کے قایل نہیں تھے۔ خود برہمن تھے لیکن شادی انھوں نے ایک غیر برہمن خاتون سے کی تھی۔ ایک خاص قسم کے مذہبی رجحان کے باوجود ان کو روایتی انداز سے سوچنے والے لوگ ملحد سمجھتے تھے۔ اس بات کا رمن نے خود ذکر کیا ہے۔

بہت سے بڑے سائنس دانوں کی طرح رمن کو موسیقی سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ان کو طویل عمر اس لیے چاہیے ہے کیوں کہ ان کو بہت سی موسیقی سننا باقی ہے۔ رمن نے اپنی ذات سے باہر کی ایک خاتون سے شادی اس لیے کی کہ وہ موسیقی میں خاص دخل رکھتی تھیں اور کوئی ساز بہت اچھا بجاتی تھیں شاید موسیقی کے راگ رمن پر روح کی گہرائیوں تک پہنچ کر قدرت کے راز آشکارا کرتے تھے۔

"ہم ایک طرف قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی دنیوی کامرانیوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے قول و عمل سے اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ دنیوی کاموں سے دین کمزور ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی دنیوی کامرانیاں قابل فخر ہیں تو ہمارا یہ خیال کہ دنیادی کاموں سے دین کمزور ہوتا ہے، کیونکر صحیح ہوا۔"

سید ہاشم علی

نسیم انصاری *

سرسید نے جس دنیا میں آنکھیں کھولیں وہ ایسی تھی جس میں یورپ تہذیب اور سیاست کا مرکز بن چکا تھا اور یورپی طاقتیں ساری دنیا کو اپنے قبضے میں لے رہی تھیں۔ ایشیا کے شمال میں روس، مشرق اور جنوب مشرق میں انگریز، فرانسیسی، ولندیزی اور پرتگالی حملوں کے سامنے ایشیا کے ملک ایک کے بعد ایک سرنگوں ہو رہے تھے۔ یورپ میں گزشتہ تین سو برسوں میں ایک ایسے سماج نے جنم لیا تھا جس کی سائنس کی ترقی کے سامنے اس سے پہلے کا سارا علم وفضل حقیر معلوم ہونے لگا۔ فلسفہ کا بنیادی مسئلہ کہ علم کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے، ایسے حل ہوا کہ سماج نے پوری طرح یہ تسلیم کر لیا کہ علم کا حصول صرف مشاہدہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ وہ جو دوسرا خیال تھا کہ علم کے حصول کا ایک ذریعہ مراقبہ بھی ہے اب بالکل فضول معلوم ہونے لگا۔ سائنسی ترقی کا وہ دور شروع ہو چکا تھا جسے ہم میکانکی دور کہتے ہیں جس میں کائنات اور اس کے اندر کی ہر چیز کو ایک مشین تصور کر کے اس کا مطالعہ کیا جانے لگا۔ اس طریقۂ فکر سے فطرت کے ایسے راز معلوم کیے گئے کہ سب انگشت بدنداں رہ گئے اور بہت ہی جلد اس علم نے سماج کو بالکل بدل ڈالا۔

ہندوستان والے اس طوفان سے بالکل الگ بیٹھے تھے جب انگریزوں، فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے ذریعے انھیں اس کا احساس ہوا کہ ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے تو مسلمانوں کے علاوہ باقی لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ سب ہی ہندوستانیوں نے یورپی تہذیب کا خیر مقدم کیا ان میں بہت سے ایسے تھے کہ جو اس تہذیب کو اپنے رسم و رواج اور عقائد کے لیے سم قاتل جانتے تھے لیکن اونچی ذات کے ہندوؤں اور پارسیوں میں ایک جماعت ایسی بھی جس نے کھل کر اس تہذیب کا خیر مقدم کیا۔ مسلمان سمجھے کہ ملک پر تو فرنگیوں کا قبضہ ہو ہی رہا ہے، اب یہ علم کے ذریعے ہمارے مذہب کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے وہ فرنگیوں سے دور رہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ اصلی دنیا اس دنیا سے بالکل مختلف ہے جسے وہ اپنے علوم ہندسہ، ہیئت اور طب کے ذریعے جانتے تھے۔ یہ بات جب سرسید نے مسلمانوں کو سمجھانا شروع کی تو ان کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ پچھلے چھ سات سو برسوں میں مسلمانوں کے دلوں میں جیسے یہ بیٹھ گیا تھا کہ تمام علوم کا سرچشمہ تو صرف قرآن ہے اور انھیں علوم کا حاصل کرنا اچھا ہے جو معرفت الٰہی کے لیے ضروری ہوں۔ ان کا طریقۂ تعلیم ایسا تھا کہ قرآن تو ہر بچہ کو پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد اگر اعلیٰ تعلیم منظور ہوتا تو اسے علمائے دین کے مدرسوں میں بھیجا جاتا تھا

---

* پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف سرجری، جے۔ این۔ میڈیکل کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

جہاں وہ اسے اقلیدس کی جیومیٹری، بطلیموس کا جغرافیہ، بقراط
اور جالینوس کی طب، ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ پڑھاتے تھے
اور ان میدانوں میں ابن سینا، رازی، ابن بیطار اور ابن نفیس
کی تشریحات کا سبق دیتے تھے۔ یہ علماء ان سب باتوں سے بے خبر
تھے جو یورپ اور امریکہ میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہو رہی
تھیں۔ اس لیے سرسید کی زبردست مخالفت علماء کے طبقے سے ہوئی
انھیں ایسا لگا کہ اگر نئی تعلیم شروع ہوئی تو بچے نہ صرف ان سے
بے نیاز ہو جائیں گے بلکہ ان سب باتوں سے بھی ناآشنا رہیں گے جن کا
تعلق اسلام سے ہے۔

لیکن یہ مخالفت تاریخ کے بہاؤ کو نہ روک سکی۔ سرسید
کی آنکھیں بند ہوتے ہوتے مغربی تعلیم کی مخالفت بڑی حد تک ختم
ہو گئی۔ بیسویں صدی کے نصف ہونے تک اس مخالفت کا وجود
بالکل ہی ختم ہو گیا

ادھر انیسویں صدی کے یورپ میں ڈارون، مارکس اور
فرائڈ کے نظریات نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ دانشوروں کی
دنیا میں گویا کہ انھی کا راج ہو گیا۔ جب یہ طوفان ہندوستان
تک پہنچا تو اقبال نے ان نظریات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں
نے ان نظریات کو یک لخت رد نہیں کیا بلکہ اس طرز فکر میں سمونے
کی کوشش کی جسے وہ اسلامک تھاٹ کہتے تھے۔ خضر راہ میں
جمہوریت اور سرمایہ داری پر ان کی تنقید اس کمیونسٹ مینی فیسٹو
کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے جو مارکس اور اینگلز نے غالباً ۱۸۴۸ء
تیار کیا تھا۔

مارکسزم سے اوّل اوّل ہندوستانی مسلمانوں کی واقفیت
شاید ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی جب ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی
پہلی کانفرنس کانپور میں ہوئی۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر
مولانا حسرت موہانی تھے۔ جو پارٹی بنی اس کے سرگرم اراکین
میں مظفر احمد اور شوکت عثمانی بھی تھے جنھیں بدنام زمانہ میرٹھ
سازش کیس میں سخت سزائیں دی گئیں۔ اس صدی کی چوتھی
دہائی میں انجمن ترقی پسند مصنفین بنی اور اس میں بہت سے مسلمان
دانشور شامل تھے۔ یہ سب لوگ قدامت پسندوں کی نظر میں
معتوب تو ضرور ہوئے لیکن انھیں مسلمانوں نے سماج سے باہر
نہیں کیا۔ عام مسلمان ابھی تک اس خیال سے کمیونسٹ تحریک سے
اپنے کو علیحدہ رکھتے ہیں کہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کی شرط
یہ ہے کہ آدمی لامذہب ہو جائے۔ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ اس
لیے مسلمان دانشوروں کے ایک طبقہ میں یہ کہا جانے لگا کہ ہمارے
بزرگوں نے بقراط، افلاطون اور ارسطو کے فلسفوں کو ایسا
اپنایا کہ وہ ارسطو کو استاد اول کہنے لگے، لیکن اس کے باوجود
وہ اپنے مذہب پر قایم رہے۔ اگر آج سے ایک ہزار سال قبل
ارسطو کے ساتھ یہ ہو سکتا تھا تو پھر مارکس کا کیا قصور ہے؟

اسی زمانے میں یعنی بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں بہت
سی باتیں ایسی ہوئیں جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو
ذہنی اعتبار سے یورپ کے اور بھی قریب کر دیا۔ مصطفیٰ کمال
پاشا کی تحریک کو سمجھنے میں دیر تو لگی لیکن جب اصلیت معلوم
ہوئی تو سناٹے میں آ گئے۔ سنا ہے کہ جب خلافت کے خاتمہ
کا اعلان ہوا تو مولانا محمد علی نے اپنے اخبار میں لکھا کہ یہ سب
جھوٹ اور فریب رائٹرس نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کے
لیے پھیلایا ہے!

یہاں تک یعنی تیسری اور چوتھی دہائی تک آتے آتے جمال الدین
افغانی کی پین اسلامزم کی تحریک کا اثر بھی بہت کم ہو گیا ہجرت
کر کے جو لوگ ہندوستان سے افغانستان اور ترکی گئے تھے
انھیں ایسے تلخ تجربات ہوئے کہ پین اسلامزم کا جوش تقریباً
ٹھنڈا ہو گیا۔

ادھر اٹلی اور جرمنی کی نیشنل سوشلزم کی تحریکوں کا اثر بھی
ہندوستانی مسلمانوں پر پڑا۔ ایک طرف تو خاکسار تحریک شروع
ہوئی تو دوسری طرف جماعت اسلامی کا آغاز ہوا۔ مولانا ابوالاعلیٰ
مودودی نے نئے دور کی زبان میں وہ باتیں کہیں جو تیرہ سو برس
پہلے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلافات کے زمانے
میں کہی گئی تھیں۔ یعنی الحکم للہ۔ حکومت کا حق صرف اللہ کو

ہے اور باقی سب حکومتیں باطل ہیں اور اللہ کی مرضی صرف مسلمانوں کو معلوم ہے اور ان میں سے بھی صرف اسی جماعت کے لوگوں کو باقی سب مسلمان ناواقف اور گمراہ ہیں۔ اس تحریک میں بالکل ویسی ہی کوشش تھی جیسی کہ یورپ کی ان تحریکوں میں جن کی بنیاد اس تصور پر تھی کہ قدرت کی طرف سے حکومت کرنے کے لیے ایک خاص قوم مقرر کی گئی ہے۔

خاکسار تحریک تو ۴۷ء کے بعد دب سی گئی لیکن جماعت اسلامی کی سرگرمیاں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور برصغیر کے باہر کے ملکوں میں بھی جاری ہیں۔ سعودی عرب بھی ان کے بہت سے رہنما ہیں جنھیں وہاں تو کسی تبلیغ کی اجازت نہیں ہے لیکن دوسرے ملکوں میں اپنے نظریات کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے مگر اس جماعت کا اثر عوام پر بہت کم ہے۔ پاکستان کے الیکشن میں ان نظریات کے حامل لوگوں کو ہمیشہ ناکامی ہوئی اور مسلمانوں کے کسی ملک میں ان کو اقتدار حاصل نہیں ہے۔

ناکامی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کے نظریات مسلمانوں کی اس طرز فکر سے میل نہیں کھاتے جو گزشتہ چودہ سو برسوں میں بنی ہے۔ وہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور جہاں جہاں وہ ہیں ان کی ایک خاص تہذیب اپنے مقامی رنگ میں بنی ہے۔ سیاست پر بھی مقامی رنگ ہے۔ اس رنگ کو مٹا کر ایک نظریاتی اسلامی رنگ دینا ممکن نہیں ثابت ہوا۔

مسلمانوں نے ہر زمانے میں سیاست خالص دنیاوی قوانین کے مطابق چلائی۔ اسلام کا نام لیا ضرور لیکن ان لوگوں نے اپنے سیاسی اعمال کو کسی مذہبی قانون کے تابع نہیں ہونے دیا ضرورت پڑی تو اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو قتل اور ان کے بیٹوں کو آج کل کی زبان میں ڈرگس دے کر بالکل ناکارہ بنادیا۔ ان باتوں کا اس کے مذہبی اعتقادات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ذاتی زندگی میں پابند صوم وصلوٰۃ تھا لیکن سیاست میں اس نے وہ کیا جو اس کے تخت وتاج کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا۔

یہی آج بھی ہو رہا ہے۔ دنیا کے وہ تمام ممالک جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے آزاد ہو گئے ہیں۔ ان ملکوں میں جو حکومتیں بنی ہیں وہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سعودی عرب میں قبائلی حکومت ہے۔ الجیریا، لیبیا، عراق اور یمن کے ایک حصہ کی حکومتیں اپنے کو علی الاعلان سوشلسٹ حکومتیں کہتی ہیں۔ پاکستان میں آج کل جمہوری حکومت ہے۔ ترکی میں ایک خاص طرح کی جمہوریت ہے جو ویسٹ منسٹر کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہے۔ غرض ہر ملک کی سیاست وہاں کے حالات کے مطابق اور کسی ایک مذہبی قانون کے تابع نہیں ہے۔ حالانکہ زیادہ تر حکومتیں اپنے کو اسلامی کہتی اور کہلاتی ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کو اسلامی کہتی ہیں اور وہاں کے لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کے یہاں کوئی قانون شریعت کے خلاف نہیں ہے اور واقعہ بھی یہی ہے لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسلام میں کوئی ایسی بات فرض نہیں کی گئی ہے جس سے عوام کو نقصان پہنچے اور کسی ایسی بات کی ممانعت نہیں کی گئی ہے جس سے عوام کو فائدہ پہنچے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ لفظ اسلامی لگ جانے سے بہت سے لوگ چونکتے ضرور ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ ان ملکوں میں مذہب کی اہمیت ریاست میں ویسی ہی ہے جیسی کہ برطانیہ میں وہاں کی ملکہ کو عیسائیت کا محافظ کہا جاتا ہے لیکن مذہب کا کوئی اثر ان کی سیاست پر نہیں پڑتا۔

ادھر ایک اصطلاح مسلمانوں کے سلسلے میں عام طور پر استعمال کی جارہی ہے اور وہ ہے بنیاد پرستی یا فنڈامینٹلزم کی۔ اس اصطلاح کا اطلاق مسلمانوں پر کیا جاتا ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ وہ فطرتاً فنڈامینٹلسٹ ہیں اوپر سے چاہے جو بھی چادر اوڑھ لیں، یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ گزشتہ چودہ سو برسوں سے تو عام مسلمان اس کے گنہگار نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے یہاں کوئی چرچ نہیں بننے دیا۔ ان کے بہتر فرقے ہیں اور ان میں سے بعض کے عقاید تو ایسے ہیں جن کی وجہ سے اللہ سے متعلق فرقے والے انھیں

کافر سمجھتے ہیں لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود سب اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ آپس میں شادی بیاہ بھی ہوتا ہے اور لین دین بھی۔ نجی زندگی میں علما کی عزت سب ہی کرتے ہیں لیکن زندگی آزادانہ بسر ہوتی ہے۔ اپنے اشعار میں ان سب باتوں کا مذاق اُڑاتے ہیں جن کا تعلق مذہب کی ظاہری رسم و رواج سے ہے اور یہ باتیں وہ لوگ نہیں کرتے جنھیں ملحد کہا جاتا ہے بلکہ وہ شعرا بھی اس میں ملوث ہیں جن کی دین داری میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ مسلمانوں نے کبھی کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ ان کی زندگی کے ہر شعبے پر حکم لگائیں۔ عموماً وہ باتیں برسرِعام نہیں کرتے جن کی صراحتاً قرآن شریف میں ممانعت کی گئی ہے ورنہ اپنے غفور الرحیم پر بھروسہ کرکے اس کی تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

غرض تئو برس کے نسبتاً مختصر عرصے میں مسلمانوں نے ایک لمبا ذہنی سفر طے کیا ہے اور اب انہیں عالمی کلچر میں شامل ہونے پر کوئی ندامت نہیں ہے اور نہ ان کے ترقی پسند دانشمندوں کو اس میں کوئی شرم محسوس ہوتی ہے کہ لوگ انہیں مسلمان کہیں۔ جہاں جہاں ان کی حکومت ہے وہاں یہ کوشش ہے کہ جلد از جلد اس فاصلے کو طے کیا جائے جو انھیں ترقی یافتہ ملکوں سے دور رکھے ہوئے ہے سعودی عرب جیسے ملک میں جہاں ابھی تک قبائلی ڈھانچہ موجود ہے وہاں بھی نئی نئی یونیورسٹیاں کھل رہی ہیں جن میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

ایران میں جو تحریک ہے اس کے متعلق البتہ بہت سے سوال کیے جاسکتے ہیں۔ ابھی تک اس تحریک کے سب پہلو سامنے نہیں آئے ہیں اور جو سوالات ذہنوں میں آرہے ہیں ان کے جوابات غالباً کچھ دنوں بعد ہی دیے جاسکیں گے۔

البتہ ایک نئی تحریک ضرور شروع ہوئی ہے، اسے اسلامک سائنس کا نام دیا گیا ہے۔ عام سائنس والوں کے لیے اس کے کوئی معنیٰ نہیں ہوتے اس لیے کہ سائنس تو نام ہی ہے ان علوم کا جن سے فطرت کے قوانین دریافت کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فطرت کے قوانین کسی مذہب کے تابع نہیں ہیں۔ مذہبی زبان میں تو یہ کہا جائے گا کہ سب قوانین اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور یہ قانون کسی کے لیے تبدیل نہیں کیے جاتے۔ اسلامی سائنس کے کیا معنیٰ ہیں؟ فطرت کا مشاہدہ کرکے اگر کوئی نظریہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ کسی مذہبی کسوٹی پر کیسے پرکھا جاسکتا ہے؟ یہ تصور تو قرون وسطیٰ کے یورپ کا تصور معلوم ہوتا ہے جہاں گلیلیو کو صرف اس وجہ سے سزا دی گئی کہ اس کے نظریات اس زمانے میں مروج خیالات سے الگ تھے۔ اس قسم کی کوئی مثال مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں انھیں ان کے مذہبی خیالات کی وجہ سے سزا ملی جو حاکم وقت کے مذہب سے مختلف تھے۔ جیسے منصور یا امام حنبل کو۔ کسی سائنسی نظریے کی بنیاد پر کوئی سزا چودہ سو برس کی تاریخ میں کسی کو نہیں دی گئی۔ اب اسلامی سائنس کا نام لے کر شاید لوگ اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ اپنے اس ارادے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ عام مسلمانوں کا مزاج اس کے خلاف ہے۔

میں نے اس مضمون کا نام جہانِ نو رکھا ہے۔ یہ اس لیے کہ سرسیّد والی دنیا اب ختم ہو گئی جس میں مسلمان محکوم تھے، جاہل تھے، حقیر تھے اور اپنے حالات سے بے خبر غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ اب وہ آزاد ہیں اور اپنی جہالت پر قابو پانے میں مصروف ہیں۔ شہنشاہیت سے طویل اور بڑی صبر آزما جد و جہد کے بعد آزاد ہو کر اقوام متحدہ میں انھوں نے اپنے لیے ایک باعزت جگہ بنا لی ہے۔ اب تو اس مذہب کے ماننے والے نوبل پرائز پاتے ہیں۔ یورپ کی قابلِ احترام علمی تنظیموں میں جگہ پاتے ہیں اور ان کی تصنیف کردہ کتابیں اب ایک بار پھر مغرب میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔

آیئے ہم اس جہانِ نو کا خیر مقدم کریں۔

کاغذ کیسے بنتا ہے

کاغذ ہماری روزمرہ زندگی کا اہم حصّہ بن چکا ہے۔ کاغذ نہ ہوتا تو ہماری جیب سکوں سے بوجھل ہو جاتی؛ ہم باہم ربط وضبط کے بہت سے مواقع کھو دیتے۔ اخبار سے لے کر کمپیوٹر تک، سب کا کام ٹھپ ہو کر رہ جاتا۔

کاغذ ایک ہی نام ہے لیکن اس کی اقسام اور استعمالات کئی ہیں۔ کاغذ کی ایک قسم دوسری قسم سے مختلف ہوتی ہے۔ انھیں بنانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور ان کے خواص و استعمال جدا ہوتے ہیں۔

کاغذ سازی ایک سادہ عمل ہے۔ کاغذ ساز پودے کی باتوں یا ریشوں کو پانی میں لٹکا دیتے ہیں۔ بعد میں انھیں چھلنی کے ذریعے نکال لیتے ہیں۔ پانی میں اس طرح بھگو لیے جانے کے بعد جب یہ نباتی ریشے باہر نکلتے ہیں تو یہ ایک جالا سا بن چکے ہوتے ہیں۔ اس جالے کو دباؤ کے تحت پھیلا کر خشک کیا جاتا ہے تو کاغذ بننے لگتا ہے۔ یہ بنیادی عمل اس وقت سے اب تک تبدیل نہیں ہوا جب دو ہزار قبل مسیح میں پہلی کاغذی چادر بنائی گئی تھی۔

کاغذ کی ایجاد، دریافت یا پہلی تیاری کا اعزاز اہلِ چین کو حاصل ہے۔ ابتدائی کاغذ تقریباً سارے کا سارا جس پودے سے بنایا گیا تھا وہ "سن" کہلاتا ہے۔ یہ پودا بھارت اور پاکستان میں عام ہوتا ہے۔ اس کے ریشوں کو آج کل رسی اور کپڑے کے لیے عام استعمال کیا جا رہا ہے۔ نباتاتی اصطلاح میں اس کا نام "کینابس سیٹیوا" (Cannabis Sativa) ہے۔

مشرق سے کاغذی تکنیک مغرب نے سیکھی تو اس نے سن کے ساتھ پھٹے پرانے ریشمی کپڑوں کو بھی ملا کر ایک خام آمیزہ بنا لیا۔ برسوں اسی سے کاغذ بنتا رہا۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آغاز پر اس سوتی کپڑے کو سن کی جگہ دے دی گئی جو کپڑے کے کارخانوں سے "فالتو مال" سمجھ کر پھینکا جاتا۔ کپڑے کی صنعت تب سے اب تک فروغ پذیر رہی ہے۔ اس لیے کاغذ سازی کا خام مال بھی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرتا رہا۔ بعد میں ہر قسم کے گھاس پھوس اور نباتات کو آزمایا گیا لیکن بڑی تبدیلی لکڑی کے استعمال سے رونما ہو سکی۔

کاغذ کے لیے فراہم کی جانے والی نفیس لکڑی میں صنوبر اور اس کی مختلف قسمیں زیادہ استعمال ہوتی ہیں جب کہ سخت لکڑی کے لیے یوکلپٹس، برچ (شمالی یورپ کا درخت جس کی شاخیں پتلی اور چھال چکنی ہوتی ہے) بیچ (سفیدے کی قسم کا اونچا درخت جس کی چھال چکنی اور پتیاں چمکدار ہوتی ہیں) اور ریپلر (ایک لمبا درخت جو سروقامت بھی کہلا سکتا ہے) سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

کاغذ سازی کے لیے لکڑی کو منتخب کرنے کا انحصار معاشی حقائق پر ہے۔ اس لیے یہ کام معاشیات داں کرتے ہیں۔ نباتیات داں اس مقصد کے لیے مسلسل تحقیق و عمل کرتے رہتے ہیں کہ تیزی

سے بڑھنے والے نئے درخت اگائیں۔ خوشگوار موسم میں درخت بڑھنے کی زیادہ سے زیادہ رفتار یہ ہے کہ تیزی سے نشو و نما پانے والی انواع میں تیس میٹر بلندی ہر پانچ سال میں بڑھتی ہے۔ بلندی میں اضافے کی یہ شرح اس درخت کی ہوگی جس کا تنا پچھتر سینٹی میٹر قطر پر محیط ہو۔ انناس اور صنوبر کی بعض اقسام کو پختگی (یا بلوغت) حاصل کرنے میں نوّے سال لگ جاتے ہیں۔

ابتدا میں لکڑی کے ریشے صرف میکانکی طریقے سے حاصل کیے جاتے تھے۔ خراش دار پہیے (Abrasive wheel) کے ذریعے تنے کو ریزہ ریزہ کیا جاتا۔ بعد میں ان ریزوں کو اور زیادہ چھوٹا کرکے خام مال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ میکانیکی طریقہ آج بھی اس نسبتاً سستے کاغذ کو بنانے میں کام آتا ہے جو "اخباری" یا "نیوز پرنٹ" کہلاتا ہے لیکن کیمیائی طریقے سے بھی لکڑی کی لُبدی بنائی جاتی ہے۔ یہ لُبدی ان دو میں سے کسی بھی ایک طریقے سے بنائی جاتی ہے جن کا ذکر ہم اگلی سطور میں کر رہے ہیں۔

کاغذ سازی کے میکانی و کیمیاوی طریقے

میکانی طریقے سے، کاغذ کی تیاری کے لیے درختوں کی چھال کو پیسا جاتا ہے۔ پیسنے کے بعد لُبدی تیار کی جاتی ہے۔ اس عمل میں نمی کا تناسب اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یعنی اس بات کو اہمیت حاصل ہے کہ لُبدی میں کس قدر نمی ہے۔ لکڑی کے ان ٹکڑوں کو بھی علیحدہ کر لیا جاتا ہے جو نرم نہیں ہو سکے۔

اس میکانی طریقے میں لکڑی کے ریشے دوسری قسم کے ریشوں سے مکمل طور پر الگ نہیں ہو سکتے۔ خاص قسم کے پولی مر جو لگنن Lignin کہلاتے ہیں، لکڑی کے ریشوں کو باہم جوڑے رکھتے ہیں۔ ان پولی مر کے اس عمل سے ہی درختوں اور لکڑی میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ ریشوں کو بالکل الگ الگ کر دینے کے لیے ان پولی مر کا اثر زائل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ کام کیمیائی طور پر ہی ممکن ہے۔

کیمیائی طریقے سے بنائے جانے والے ایک کاغذ کو "سلفیٹ عمل" کے ذریعے بنایا جاتا ہے۔ کیمیائی طریقے میں لکڑی کے چپ ان محلولوں کے ساتھ گرم کیے جاتے ہیں جو لگنن پولی مر کو تحلیل کر سکیں۔ "سلفیٹ عمل کو کرافٹ" بھی کہا جاتا ہے۔ کرافٹ جرمن لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے طاقتور۔ ایک جرمن کیمیا داں کارل ڈھل نے یہ کیمیائی طریقہ ایک صدی پہلے دریافت کیا تھا۔ اس طریقے کے دوسرے نام "سلفیٹ" کو "سوڈیم سلفیٹ" کی نسبت سے اختیار کیا جاتا ہے۔

کیمیائی عمل سے لکڑی کے ریشے الگ الگ سیلولوز ریشوں میں بٹ جاتے ہیں۔ حالانکہ کاغذ کو سفید بنانے کے لیے بعد میں بلیچنگ سے گزارا جاتا ہے۔ تاہم اس سے پہلے کے مراحل میں بھی میکانی اور کیمیائی طریقے سے تیار کردہ کاغذ کو الگ الگ شناخت کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر کیمیائی طریقے سے بنایا جانے والا لُبدی۔ کاغذ نیوز پرنٹ کی نسبت بہت سفید ہوتا ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ میکانی طریقے سے لکڑی کے ناخالص اجزا الگ نہیں ہوتے۔ دوسرے لکڑی کے خالص ریشے بھی اس طرح الگ الگ نہیں ہوتے۔ تاہم میکانی طور پر تیار کردہ کاغذ چھپائی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس موزونیت کی وجہ یہ ہے کہ میکانی طریقے سے بنا ہوا کاغذ زیادہ شفاف نہیں ہوتا۔ اس لیے کاغذ کے ایک طرف چھپے ہوئے الفاظ، کاغذ کی دوسری طرف نظر نہیں آتے اور پڑھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ اس کاغذ میں ایک خامی یہ ہے کہ روشنی یا دھوپ پڑے رہنے پر یہ جلد ہی پیلا پڑ جاتا ہے۔ یہ اس طرح جلدی خراب ہو جاتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ لگنن پولی مر موجود ہوتے ہیں۔ کاغذ میں ان کی موجودگی قدرتی عمل کو جاری رکھتی ہے اور کاغذ میں پیلاہٹ یا باسی پن پیدا ہو جاتا ہے۔

میکانی طریقے سے کاغذ بنانے پر لاگت کم آتی ہے جب کہ کیمیائی طریقے سے بنایا گیا کاغذ مہنگا پڑتا ہے۔ روشنی اور دھوپ سے نیوز پرنٹ متاثر ہوتا ہے۔ چونکہ روزانہ اخبارات صرف اور صرف نیوز پرنٹ پر شائع ہوتا ہے، اس لیے ان کی عمر کم ہوتی ہے۔ اور بہت جلد اخباری کاغذ ضائع ہونے لگتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ رسائل کی نسبت سے اخبارات کی عمر کم ہوتی ہے اور یہ مناسب بھی ہے۔ اخبارات کا واسطہ عارضی باتوں سے ہوتا

ہے جو وقت کے ساتھ پرانی ہوجاتی ہیں۔ بہت کم لوگوں کو پرانی باتوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس رسائل کی توجہ مستقل اور دائمی باتوں پر ہوتی ہے۔ وقت کے اثرات ان باتوں کی اہمیت کو بھی متاثر کرتے ہیں اور کبھی کوئی بات کم اہم اور دوسری زیادہ اہم لگنے لگتی ہے تاہم ان باتوں کے اثرات تا دیر رہتے ہیں۔ اس لیے رسائل کا ایسے کاغذوں پر طبع ہونا بہتر ہے جو تا دیر جوں کے توں رہ سکیں۔ سرورق کے لیے عمدہ کاغذ استعمال کرنے سے رسائل میں کشش بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ ان کاغذوں پر رنگ زیادہ نکھرتا ہے۔ جب کہ نیوز پرنٹ پر یہی رنگ مدھم رہے گا۔

کیمیائی طریقے سے کاغذ بنانے کا ایک طریقہ ۱۸۷۰ء میں رائج ہوا۔ اسے "ایسڈ سلفائیٹ" طریقہ کہتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی لنز پولی مرکو تحلیل کرنے کا ایک اہم طریقہ ہے۔ اس طریقے میں لکڑی کے چپ کو کیلشیم ہائیڈروجن سلفائیٹ اور سلفیورک ایسڈ سے ۱۰۸ ڈگری سینٹی گریڈ تک گرم کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے جو لکڑی استعمال کی جاتی ہے اس میں ۴۵ تا ۵۰ فیصد حصہ نفیس ہوتا ہے۔ ان ریشوں کو بلیچنگ (رنگ کاٹ) عمل سے گزارنا نسبتاً آسان ہوتا ہے اور ان سے بننے والا کاغذ کثیف اور مضبوط ہوتا ہے لیکن اس میں ناشفاف ہونے کی خوبی زیادہ نہیں ہوتی۔

کیمیائی طریقے سے کاغذ سازی کا دوسرا طریقہ "نیوٹرل سلفائیٹ طریقہ" ہے۔ سوڈیم سلفائیٹ اور سوڈیم ہائیڈرو آکسائیڈ کا ایک آمیزہ، پولی مر کی تحلیل، ۶۵ تا ۱۸۵ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان کرتا ہے۔ جو خام مال اس طریقے میں استعمال ہوتا ہے اس کا صرف ۳۰ فیصد ضایع ہوتا ہے اور ۷۰ فیصد خام مال کاغذ بن جاتا ہے۔ کیمیائی آمیزے سے یا محلول میں خود اس قدر قوت ہوتی ہے کہ پولی مر کو بآسانی تحلیل کردے اس طرح حاصل ہونے والی لگدی سے سخت کاغذ بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً کارڈ بورڈ۔

کاغذ کے لیے لگدی سازی کی تکنیک

کاغذ کے لیے لکڑی کی مختلف اقسام میں سے انتخاب کرتے وقت اس بات کی بھی اہمیت ہوتی ہے کہ وہ کس قسم کے ریشوں پر مشتمل ہے

نفیس قسم استعمال کی جائے تو ایسے حاصل ہوتے ہیں۔ جو کیمیائی عمل سے گزر کر تقریباً تین میٹر لمبے رہ جاتے ہیں۔ لکڑی کے سخت قسم کے ریشے ایک تا دو ملی میٹر تک ہی رہتے ہیں۔ کاغذ کے لیے بنائی جانے والی لگدی ان دونوں قسم کے ریشوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ریشوں کے حصول کے بعد اگلا مرحلہ "فائبری لیشن" کا آتا ہے۔ یہ ایک تکنیک ہے جس کی مدد سے ریشے کی بیرونی سطح کو کھردرا بنایا جاتا ہے۔ اس مقصد سے ریشے کی سطحوں کو چھیلا جاتا ہے۔ اس طرح اور بھی باریک ریشے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ عمل ریشوں کے اس باہمی عمل کو مضبوط کرتا ہے جس کے نتیجے میں مضبوط اور عمدہ کاغذ حاصل ہو سکے۔

فائبری لیشن کا نتیجہ ہر قسم کے نباتات یا لکڑیوں کے لیے یکساں نہیں ہوتا۔ سن اس تکنیک سے بہترین نتائج فراہم کراتی ہے لیکن اس پر خرچ بہت آتا ہے۔ لہٰذا معاشی حقائق رکاوٹ بنتے ہیں۔

فائبری لیشن کی جگہ ابتدا میں جو تکنیک استعمال ہوئی تھی، اس میں سے ایک "ہولینڈر بیٹر (Holender Beater)" تھی۔ اس کا یہ نام نیدرلینڈ سے تعلق کے باعث تھا۔ نیدرلینڈ کا معروف نام ہالینڈ یا ہولینڈ ہے۔ یہ تکنیک سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں عام ہو چکی تھی۔ بیٹر سے مراد ایک سلنڈر ہوتا ہے جس میں دھاتی سلاخیں یا سلاخ اس طرح نصب ہوتی ہے کہ اسے گھمایا جاسکے۔ سلنڈر کے اوپر خراشیں یا ابھری ہوئی دھاتی دھاریاں ہوتی ہیں۔ سلنڈر کے نیچے بیضوی شکل کے برتن میں ایک پلیٹ ہوتی ہے۔ ریشے اس پلیٹ پر رکھ کر سلنڈر گھمایا جاتا ہے۔ ان کارخانوں میں جہاں ہاتھ سے مدد لی جاتی ہے، آج یہ بھی آلہ استعمال ہو رہا ہے لیکن بڑے کارخانوں میں اس کی جگہ ایک اور آلہ آگیا ہے۔ اس آلے کا نام "ہائیڈرا۔ پلپر" ہے۔

ہائیڈرا پلپر ایک بڑا سا پیالی نما برتن ہوتا ہے۔ اس برتن کی تہہ پر گھومنے والا کٹر نصب کرتے ہیں جو تیز رفتاری سے گھومتا ہے کٹر سے جب لگدی گزرتی ہے تو وہ مزید تقسیم ہوجاتی ہے۔ یہ کٹر جس پر تیز دھار بلیڈ ہوتے ہیں، نہ صرف لگدی پر مشتمل کسی تہہ یا چادر کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، بلکہ یہ ثابت و سالم ٹکڑے کو بھی توڑ سکتا ہے۔ اس

آلے میں شکست و ریخت اور فائبری لیشن کا عمل از خود تیزی سے ہوتا ہے۔ جدید ٹکنالوجی نے کئی ایسے تیز رفتار اور با اعتماد آلات متعارف کرائے ہیں جو ناخالص اجزاء، ریشوں کے گچھوں اور ذخیروں میں شامل ہوجانے والی ہر غیر ضروری شے کو الگ کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے آلات سے جہاں کاغذ سازی کی رفتار بڑھ گئی ہے وہاں اس کا معیار بھی بلند ہوا ہے۔ ان آلات کے تکنیکی مراحل سے گزرنے کے دوران ریشے پانی جذب کرتے ہیں۔ وہ ریشے بھی جو پانی جذب نہیں کرتے نسبتاً لچک دار ہوجاتے ہیں۔

کاغذ سازی میں ان ریشوں کی لمبائی کو بھی اہمیت حاصل ہے اور اس زمانے میں جو مشینیں کاغذ بنا رہی ہیں وہ ۵ء۰ تا ۳ء۰ ملی میٹر تک ریشے استعمال کرتی ہیں۔

ریشے سخت ہوں اور ان میں لچک کی کمی ہو تو کاغذ مضبوط نہیں بنتا۔ کاغذ پر دھبے نمودار ہوجاتے ہیں اور وہ بھدا لگتا ہے۔ ریشوں کی لمبائی زیادہ ہو تو مراحل سے گزرنے کے دوران وہ باہم الجھ جاتے ہیں۔ اس طرح کے الجھے ہوئے ریشے سے کاغذ بنایا جاتا ہے تو وہ بے داغ نہیں ہوتا۔ فائبری لیشن کا عمل بھی بڑی احتیاط سے کرنا پڑتا ہے۔ اس میں زیادتی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لگی کے بجائے جیلی بن جاتی ہے۔

کاغذ سازی کے آخری مراحل

انیسویں صدی کے آغاز تک کاغذ سازی کا سارا عمل ہاتھ سے ہوتا رہا۔ اس وجہ سے اس میں سادگی بھی تھی کہ چند ایک مراحل کے بعد کاغذ حاصل کرلیا جاتا تھا۔

کاغذ بنانے کے لیے جو جدید مشین استعمال ہوتی ہے اس کا نام "فور ڈرائنر (Fourdrinier) ہے۔ اس مشین کا یہ نام دو بھائیوں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ دونوں بھائی لندن میں کاغذ سازی کرتے تھے ان کے نام ہنری اور سیلی تھے۔

ہنری اور سیلی نے کاغذ سازی کی جدید مشین انیسویں صدی کی ابتدا میں ایجاد کی۔ یہ مشین ایک مسلسل چھلنی پر مشتمل ہے روایتی طور پر اس چھلنی کو فاسفور۔ کانسی کے تار سے بنایا جاتا تھا آج کل پلاسٹک سے بنتی ہے۔ ریشوں کا مائع (محلول) ایک ہیڈ بکس سے متحرک تار کی طرف بہنا شروع کرتا ہے۔ اس دوران ریشوں کی تہہ یکساں رہتی ہے۔ زائد پانی قدرتی طور پر از خود بہتا جاتا ہے اور جو پانی باقی رہ جاتا ہے، اسے متحرک تار کے نیچے لگے ہوئے ویکیوم بکس کھینچ لیتے ہیں۔ ریشوں کا خشک جالا اس سے اگلے مرحلے میں اور خشک کیا جاتا ہے۔ رہا سہا پانی بھی جذب کرلیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ جالا بھاپ کی حرارت سے گرم سلنڈروں سے گزرتا ہے تو اس میں نمی صرف چار تا چھ فیصد رہ جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں چھپائی کے لیے ناشفاف کاغذ بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کاغذ کے ایک طرف کا منظر دوسری طرف کے منظر میں منتقل نہیں ہوتا۔ ناشفاف پن کی یہ خصوصیت کچھ اضافی اجزاء سے بڑھ جاتی ہے ان اجزا کو "لوڈنگ" کہتے ہیں۔

اس سلسلے میں ابتدائی سال ۱۷۳۳ء تھا۔ اس سال کاغذ سازوں نے ریشوں میں مٹی ملائی۔ ازاں بعد ۱۸۲۰ء میں بیریم سلفیٹ آزمایا۔ ۱۹۲۰ء سے کیلشیم کاربونیٹ استعمال ہونے لگا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد سے ٹائٹینیم ڈائی آکسائیڈ کو استعمال کیا جا رہا ہے جو ناشفاف کاغذ کی بہترین فراہمی کرسکتا ہے اور معاشی طور پر بھی موزوں ہے۔

لوڈنگ کے مذکورہ بالا اجزاء، لگی میں اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ جب کاغذی چادر بن رہی ہو تو یہ معدنیات ریشوں کے درمیان بیٹھ جائیں۔ اس طرح کاغذ کی سطح یکساں اور ہموار رہتی ہے۔

بلیچنگ یعنی بے رنگی کے لیے جو کیمیا استعمال ہوتے ہیں ان میں کلورین سب سے پرانا کیمیا ہے لیکن چونکہ ابتدا میں اس کے اثرات کو احتیاط سے استعمال نہ کیا گیا، نتائج اچھے نہ رہے۔ کاغذ کی بلیچنگ کے لیے جو جدید اجزاء استعمال ہو رہے ہیں وہ بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کرلیتے ہیں اور صرف قابل مشاہدہ روشنی کی پیش کرتے ہیں۔

سیلولوز ریشے ہائگرواسکوپک ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں ہوا سے پانی جذب کرنے کی خاصیت ہوتی ہے۔ بلوٹنگ پیپر (Blotting Paper) کے لیے یہ خوبی مفید ہے لیکن باقی کاغذوں کے لیے نقصان دہ ان کاغذوں کو ہوا کی نمی سے بچانے کے لیے ایک اور

باقی صفحہ نمبر ۵۷ پر

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۵ (مئی ۸۹ء)

بجلی کا جھٹکا

سمیع الرحمٰن خاں*

موجودہ دور میں بجلی ہماری ضروریات میں سے ایک ہے جس کے بغیر گھر تاریک رہتا ہے، کارخانے بند ہو جاتے ہیں، گرمی کی تپش جھلسا دیتی ہے اور سردی کی شدت میں سکڑنا پڑتا ہے۔ بجلی سے شہر کا ہر گوشہ منور رہتا ہے۔ رات کی تاریکی میں چکاچوند کر دینے والی روشنی بجلی ہی کے دم سے ہے۔ جس گھر میں بجلی نہ ہو وہ نامکمل، تکلیف دہ اور موجودہ دور کی آسائشوں مثلاً ٹی۔وی، فرج، وی۔سی۔آر، کولر ریڈیئیٹر وغیرہ سے محروم ہوتا ہے۔

لیکن جہاں بجلی سے لاتعداد فوائد ہیں وہیں اس سے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ اگر بجلی کا تار ناقص ہو جائے تو آگ لگ جاتی ہے انسان اس کے استعمال میں ذرا سی بھی بداحتیاطی کرے تو بجلی کا جھٹکا (Electric shock) لگ جاتا ہے، جس سے ہر سال سیکڑوں لوگ مرجاتے ہیں۔

اگر بجلی کے ننگے تار جن میں برقی رو جاری ہو، بداحتیاطی سے جسم کے کسی حصّے سے تعلق میں آجائیں تو اس سے ہمارے جسم کو شدید نقصان پہنچتا ہے اور فوری موت بھی ہو سکتی ہے۔

بجلی ہمارے جسم کو تین طرح سے نقصان پہنچاتی ہے

۱۔ مرکزی نظام اعصاب یا دل پر اس کے اثر سے متاثر شخص چکرا کر گر پڑتا ہے۔ یا عارضی طور پر بے ہوش ہو جاتا ہے یا فوری موت واقع ہو جاتی ہے۔

۲۔ بجلی کی حرارت کے اثر سے انسجہ منجمد ہو جاتے اور انجام کار مردہ ہو جاتے ہیں۔ برقی رَو کا قوس یا تو جلد کو جلا دیتا ہے یا دھات جیسا سخت کر دیتا ہے یا کپڑوں کے جلنے سے آدمی جل جاتا ہے۔

۳۔ عضلات کے طاقت کے ساتھ سکڑنے سے نرم ساختیں مجروح ہو جاتی ہیں یا ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔

برقی رو کے جسم سے گزرنے پر جسم پر مختلف اثرات ہوتے ہیں جس کا انحصار برقی رو کی شدت پر ہے۔ بجلی کی شدت وولٹیج پر منحصر ہے اور جسم کا متاثر ہونا انسجہ خصوصاً جلد کی مزاحمت پر ہے جلد کی بجلی کے اثر سے مزاحمت جلد کی دبازت کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے اور نمی کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ گرمی کے دنوں میں پسینہ آنے کی وجہ سے برقی رو کے خلاف جسم کی مزاحمت کم ہو جانے کی وجہ سے بجلی کا جھٹکا لگنے سے زیادہ اموات ہوتی ہیں۔

جن گھروں میں بجلی کے ٹب میں نہانے کا رواج ہے، وہاں برقی رو کے خلاف پانی کی وجہ سے جلد کی مزاحمت تقریباً تین ہزار اوم (OHMS) سے کم ہو کر پانچ سو اوم رہ جانے کی وجہ سے بجلی سے موت واقع ہو جاتی ہے لیکن اگر جسم پر محافظت کے ذرائع اختیار کر لیے گئے ہوں تو شدید برقی رو یعنی ایک ہزار وولٹیج بھی جسم کو نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔

* ریڈر، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

بجلی کے بہت معمولی کرنٹ یعنی ایک ملی ایمپیر سے جسم میں معمولی جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے بجلی کے کرنٹ کی شدت بڑھتی جاتی ہے، عضلات میں سکڑن پیدا ہوتی ہے جو اتنی شدید ہو سکتی ہے کہ متاثر شخص اپنے کو بجلی کے کرنٹ سے آزاد نہیں کر سکتا۔ عموماً مرد بجلی کے نو ملی ایمپیر یا اس سے کم کرنٹ سے آزاد کر لیتا ہے جب کہ عورت اپنے کو صرف چھ ملی ایمپیر یا اس سے کم کرنٹ سے آزاد کر سکتی ہے۔ بجلی کے تاروں سے آزاد نہ کر سکنے کے نتیجے میں پسینہ آکر یا آبلہ پڑ کر جلد کی مزاحمت میں مزید کمی آجاتی ہے اور بجلی کے کرنٹ کی شدت مہلک حد تک بڑھ جاتی ہے۔

اگر اعشاریہ ایک ملی ایمپیر کا بجلی کا کرنٹ ہاتھ سے پاؤں تک گزارا جائے تو اس سے دل (بطون قلب) کی حرکت میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔

بجلی کے کرنٹ کا راستہ یا جھٹکے کی مدت ہی جسم پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ برقی رَو کا تغیر بھی اس کا ذمہ دار ہے۔ ساٹھ سائیکل فریکوئنسی کی خانگی بجلی کا کرنٹ بہت نقصان دہ ہوتا ہے پچیس واٹ کی اے۔سی بجلی کے جھٹکے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

اس کے برخلاف ڈایا تھرمی سے جو بجلی کا کرنٹ پیدا ہوتا ہے وہ دس لاکھ سائیکل فی سکنڈ کے حساب سے مرتعش رہتا ہے اور ایک تا دو ملی ایمپیر میں بیس ہزار تا چالیس ہزار وولٹ کے کرنٹ پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی جھٹکا نہیں لگتا ہے۔ براہ راست کرنٹ، متغیر کرنٹ کے مقابلے میں کم نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہائی ٹینشن کرنٹ سے متاثر اکثر ہلاک نہیں ہوتا ہے کیونکہ بجلی کا کرنٹ دھکا دے کر آزاد کر دیتا ہے۔

بجلی کا کرنٹ جسم میں داخل ہونے کے مقام سے لے کر خارج ہونے کے مقام (عموماً پاؤں) تک منتشر ہوتا ہے۔ داخلے اور خارجے کے نقاط مقامی طور پر جل جاتے ہیں۔ کیوں کہ جلد کرنٹ کے گزرنے میں مزاحمت پیدا کر کے برقی انرجی کو حرارت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ خارجے کے مقام پر کپڑوں یا جوتے میں چھید ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر برقی انرجی کو حرارت میں کے وسیع رقبے میں داخل اور خارج ہوتی ہے جیسے پانی یا زمین کی صورت میں حاصل ہوتا ہے تو کرنٹ لگنے یا جلنے کا کوئی بھی نشان نہیں ملتا ہے۔

اگر قلب پر بجلی کے نقصان رساں اثرات ہوتے ہیں تو یہ کرنٹ کے داخلے اور خارجے کی راہ میں حائل ہونے کی بنا پر ہوتے ہیں۔ جب بجلی کا کرنٹ ایک مرتبہ جلد سے اندر داخل ہو جاتا ہے تو جسم اس کرنٹ کی راہ میں برائے نام مزاحمت پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ مائی راستے جیسے خون کی نسیں (عروق دمویہ) اور نسوں کے اندر کی خلائیں (دوون عروقی خلائیں) بجلی کے کرنٹ کے گزرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہوتی ہیں۔

آسمانی بجلی کرنٹ کی ایک خاص شکل ہے، جس میں تیزی سے بہت زیادہ کرنٹ خارج ہوتا ہے۔ یہ کرنٹ ہزار دس ملین وولٹ کا ہوتا ہے اور اندازاً بیس ہزار ایمپیر جو اوسطاً تیس مائیکرو سکنڈ میں عمل کرتا ہے، بہت ہی طاقت ور تباہ کن ہوتا ہے۔

بجلی کا کرنٹ لگنے سے جل جانے کے علاوہ دماغ اور جسم میں دوسری جگہوں پر خون نکل کر نقطوں کی شکل میں جمع ہو جاتا ہے۔ یہی تبدیلی بجلی کے ذریعے سزائے موت دیے جانے کی صورت میں بھی دیکھی گئی ہے۔ اس لیے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ بجلی کا جھٹکا لگنے سے موت دل کی حرکت متغیر ہو جانے (بطون قلب کی حرکات کے تغیر) کی وجہ سے ہوتی ہے۔/

بجلی کا جھٹکا لگنے سے عضلات میں شدید تشنج پیدا ہو کر موت ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ بجلی کے فوری جھٹکے سے بچ جاتے ہیں لیکن جلنے یا طاقت کے ساتھ کم چوٹ لگنے سے بعد میں ان کی موت ہو جاتی ہے عموماً جلنا جلد تک محدود رہتا ہے لیکن شدید کرنٹ کی صورت میں گہرائی تک وسیع رقبہ جل سکتا ہے اور متاثرہ حصہ کو کاٹ کر نکال دینا پڑتا ہے۔

اکثر وہ لوگ جو بجلی کا جھٹکا لگنے سے بچ جاتے ہیں، بہت زیادہ خائف ہوتے ہیں، ان پر کپکپاہٹ طاری ہوتی ہے۔ رنگت زرد پڑ جاتی ہے اور پسینہ آتا ہے۔ متاثرہ ہاتھ یا پاؤں چار گھنٹے تک مفلوج رہتا ہے اور عضلات میں درد اور سختی ہفتوں یا مہینوں

قائم رہتی ہے۔ مریض کی شخصیت بدل جاتی ہے لیکن جو لوگ اس صدمے سے بحال ہو جاتے ہیں ان میں کوئی دائمی اثر باقی نہیں رہتا۔ الیکٹروکارڈیوگرام میں شاذ و نادر ہی کوئی تبدیلی ملتی ہے۔ شدید حالت میں بعض لوگوں میں اعصابی خلل اور بصارت میں نقص آجاتا ہے۔

اگر مریض بہت زیادہ جل گیا ہے تو ایسی صورت میں بعد میں خون بہنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کی آنکھوں میں موتیابند ہو جاتا ہے۔

جیسے ہی متاثر شخص کو بجلی کے کرنٹ سے آزادی حاصل ہو اور مریض کو سانس نہ آرہی ہو تو مصنوعی طریقے سے سانس دلائی جائے اور سینہ پر سے ہی دل کی مالش کی جائے اور یہ دونوں عمل اس وقت تک جاری رکھیں جب تک دل کی حرکت جاری نہ ہو جائے اور مریض کے اعصاب کام کرنا شروع نہ کر دیں۔ اگر مصنوعی سانس دلانے کا کوئی اور طریقہ معلوم نہ ہو تو مریض کے منہ سے منہ لگا کر سانس دلائیں اور یہ عمل ایک منٹ میں پندرہ سولہ بار کریں۔

جب مریض کے دل کی حرکات جاری ہو جائیں تو دل کو طاقت دینے والی دوائیں استعمال کرائیں اور اُن کا استعمال مریض کے بالکل تندرست ہو جانے تک جاری رکھیں۔

جلے ہوئے حصے کا علاج اس کی وسعت اور گہرائی کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اگر بجلی کا شدید جھٹکا لگا ہو اور جسم کا زیادہ حصہ جل گیا ہو تو ایسی دوائیں دینا چاہیں جس سے اس کے پیشاب کا ردعمل کھاری ہو جائے۔ جو لوگ ہوش میں ہوں ان کو ہر پندرہ منٹ پر کھانے کا سوڈا (سوڈیم بائیکاربونیٹ) چار سے چھ گرام کی مقدار میں تقریباً تین سو ملی لیٹر پانی میں گھول کر پلائیں اور یہ مریض کو اسپتال منتقل کرنے تک برابر دیتے رہیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں مریض کو پیشاب کا مقدار میں کم آنا یا پیشاب کا بالکل نہ آنا ایک عام پیچیدگی ہے جس کا علاج ضروری ہوتا ہے۔

بجلی کے کرنٹ سے متاثر کو آزاد کرانے کے لیے کبھی بھی برہنہ ہاتھ سے نہ چھونا چاہیے بلکہ اس مقصد کے لیے لکڑی کا ڈنڈا یا ربڑ کا استعمال کریں اور اگر ممکن ہو تو فوراً بجلی بند کر دیں۔

"ذہنی جمود اور جدید کی مخالفت کا مظاہرہ کم پڑھے لکھے لوگ نہیں بلکہ ماہرین کرتے ہیں جو اپنی اجارہ داری بنائے رکھنا چاہتے ہیں اور جنھیں روایتوں کے برقرار رہنے میں ہی اپنی 'کرسی' محفوظ نظر آتی ہے۔"

سید حامد

حفظان صحت سے متعلق ارشادات نبوی کا سائنسی مطالعہ

مختار احمد قاسمی*

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات اور ہدایات ہمیں دی ہیں اور جن کاموں کے کرنے اور جن چیزوں سے باز رہنے کا حکم دیا ہے، ان کی تعمیل ہمارے ایمان کا جز ہے۔ اس سے سرمو انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ رسول کی اطاعت اور فرمابرداری خدا کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالی نے بصیغۂ امر اس کی تاکید فرمائی کہ:

"جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لو اور جس چیز سے منع کردے اس سے رک جاؤ"۔

[الحشر - ۷]

ارشادات نبوی کی واجب التعمیل ہونے کی یہ حیثیت مذہبی اعتبار سے ہے لیکن آج کے سائنسی دور میں اگر ہم تجزیے سے کام لیں تو یہ ارشادات عالیہ ایسے عظیم الشان فوائد کے حامل ہیں کہ انتہائی حیرت ہوتی ہے اور ایمان میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ طب کے طالب علم کی حیثیت سے جب میں نے حفظان صحت سے متعلق ارشادات نبوی کا طبی معلومات کی روشنی میں مطالعہ کیا تو اُن کے حیرت انگیز فوائد آشکارا ہوئے اور اُن کی عجیب و غریب حکمتیں معلوم ہوئیں۔ یہ موضوع ایک طویل تحقیق کا متقاضی ہے۔ ارباب فن کو اس موضوع پر قلم اُٹھانا چاہیے اور مزید تحقیق و جستجو کرنی چاہیے۔ میں اس مقالے میں صرف چند ارشادات نبوی کا جو بظاہر عام احکام معلوم ہوتے ہیں، مطالعہ پیش کروں گا اور جدید طب کی روشنی میں ان کی معنویت آشکارا کرنے کی کوشش کروں گا۔

سنن ترمذی کی ایک روایت ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چھینک آتی تو آپؐ چہرے کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانپ لیتے اور آواز پست رکھتے"۔

چھینک جس منافع الاعضائی طریقے سے آتی ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ورنہ اس سے اس ارشاد نبوی کی حکمت آشکارا ہوتی کہ — "جب چھینک آئے تو الحمد للہ کہو"۔ لیکن چھینک آتے وقت حضورؐ کا یہ عمل بظاہر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور اس کا تعلق صرف آداب مجلس یا طرز معاشرت سے معلوم ہوتا ہے مگر جدید دور کی تحقیقات اس کیفیت کی اہمیت اور اس کے طبی فوائد واضح کرتی ہیں۔ الیکٹرونک مائکرواسکوپ سے معلوم ہوا ہے کہ چھینک میں ایک سکنڈ میں گیارہ لاکھ ذرات ہوا میں خارج ہوتے ہیں جو بارہ سے تیس فٹ فاصلے تک پھیل سکتے ہیں ان ذرات میں جراثیم نو آبادیات قایم ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ ذرات نصف گھنٹے ہوا میں تیرتے رہتے ہیں۔ چھینک اور کھانسی کے پھیلنے کا اہم ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعے متعدی امراض ایک سے

---

* اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

دوسرے میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ متعدد اطبا نے اس کی شہادت دی ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سیل کہتے ہیں کہ

"کھانسی چھینک اور بات چیت کے ذریعے متعدی امراض کے جراثیم ہوا میں پھیل جاتے ہیں جو کافی دیر تک موجود رہتے ہیں۔ اس طرح Droplet کے ذریعے اثر کرنے والی بیماریوں میں انفلوئنزہ، خسرہ خناق دماغی، شہقہ، نمونیہ اور ان کے وائرس شامل ہیں۔"

(سوشل میڈیسن۔ ص ۳۲۹)

اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو اختیار کریں تو امراض کے ان خطرات سے کس حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔

برتنوں کو نجاست سے پاک کرنے کے مختلف طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ تو آپ نے یہ بتلایا ہے کہ اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے سات مرتبہ دھویا جائے اور ان میں سے کم از کم ایک مرتبہ اس برتن کو مٹی سے صاف کیا جائے (بخاری) اس زمانے میں کون کہہ سکتا تھا کہ برتن کو "کتے" کے جھوٹے سے پاک کرنے کا اتنی شدت سے اتنے مبالغے سے اس لیے حکم دیا جا رہا ہے کہ کتے کے لعاب دہن میں مخصوص قسم کے جراثیم ہوتے ہیں جو داء الکلب جیسا موذی مرض پیدا کرتے ہیں لیکن ایک ہزار سال سے زائد عرصے کے بعد تحقیقات نے اس ارشاد کی حکمت عیاں کر دی اور اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ ایسے برتن کی تطہیر طبی نقطۂ نظر سے ازحد ضروری ہے۔ اس ارشاد نبوی کا یہ جز کہ "کم از کم ایک مرتبہ مٹی سے صاف کرو" مزید غور و فکر کا متقاضی ہے۔ طویل تحقیقات اور تجربات نے ثابت کیا ہے کہ مٹی میں دیگر اجزا کے ساتھ کثیر مقدار میں نوسادر (امونیم) اور چونا (کیلشیم آکسائڈ) شامل ہوتا ہے اور ان کے ذریعے —— Rabies virus کی تطہیر ہوتی ہے۔ نوسادر کو مفردات ادویہ کی کتب میں ہر قسم کے

زہروں کا تریاق بیان کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پیتے وقت برتن ہی میں سانس لینے یا پانی میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے"

[مستدرک۔ حاکم]

یہ ارشاد نبوی بھی آداب معاشرت کے قبیل کا ایک حکم معلوم ہوتا ہے لیکن غائرانہ نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر بھی بہت سے طبی رموز اور فوائد پوشیدہ ہیں۔ علم منافع الاعضاء سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سانس لیتے وقت جو ہوا پھیپھڑوں میں جاتی اس میں آکسیجن اور نائٹروجن کے ساتھ کاربن بھی ہوتا ہے اور اس کی مقدار ۰٫۴٪ ہوتی ہے لیکن جب وہی ہوا باہر نکلتی ہے تو کاربن کی مقدار تقریباً ۵٪ ہو جاتی ہے جو خطرے سے صرف ۲-۳ فیصد قریب ہوتی ہے۔ یہ چیز بھی معلوم ہے کہ گیس کسی سیال میں پھونکنے سے جب کہ وہ حل پذیر بھی ہو لازمی طور پر مضر صحت ہو سکتی ہے۔ یہ نقصان تو صرف اس صورت میں ہے جب سانس کے ساتھ مرضی جراثیم نہ ہوں جب کہ جدید سائنس سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ سانس میں بخارات ہوتے ہیں جو ناکارہ اور مضر ہوا کے ساتھ نکلتے ہیں اور ان میں مرض کے لاکھوں جراثیم جو مختلف بیماریاں پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں، موجود رہتے ہیں اس طرح تعدیہ کے امکانات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں

آنحضرتؐ کے کچھ ارشادات ایسے ہیں جن میں بظاہر کوئی حکمت معلوم نہیں ہوتی، زیادہ سے زیادہ ان کا تعلق نفاست سے جوڑا جا سکتا ہے لیکن اس میں بے شمار طبی فوائد پوشیدہ ہیں۔ مثلاً آپ نے کھانے سے قبل ہاتھ دھونے کا نمونہ پیش کیا۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ

"جب کوئی شخص سو کر اُٹھے تو ہاتھ دھونے سے قبل کسی (پانی کے) برتن میں ہاتھ نہ ڈالے پتہ نہیں سوتے وقت اس کا ہاتھ کہاں گیا ہو۔"

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

"مجذوم سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو۔"

یہ اور اس قسم کے دیگر ارشادات آج کے دور میں ہمارے سامنے آتے ہیں فوراً ہمارے ذہنوں میں تعدیہ (Infection) کا تصور آجاتا ہے۔ نبی معصوم نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل ایسی ہدایات دی تھیں جن میں تعدیہ سے حفاظت کا پورا پورا سامان موجود ہے۔

کھانے پینے کے طریقوں سے متعلق کتب حدیث میں آپؐ کے بہت سے ارشادات ملتے ہیں اور بہت سی عملی روایتیں بھی ہیں۔ کس ہیئت میں بیٹھ کر کھایا پیا جائے؟ کھانے پینے کے کیا طریقے ہوں؟ کھانے میں آپؐ کو کیا چیزیں زیادہ مرغوب تھیں؟ اس موضوع سے متعلق آپؐ کے تمام ارشادات کو یکجا کر کے ان کا طبی مطالعہ کیا جائے تو حفظان صحت کے بہت سے اصول برآمد ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں کھانے پینے کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ اسراف سے منع کیا گیا ہے

"کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔" (الاعراف)

آنحضرتؐ نے بھی اپنے ارشادات میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ

"اللہ تعالیٰ شکم سیری کے باوجود کھانے کو ناپسند کرتا ہے۔"

کھانے پینے میں بے اعتدالی کے کیا نقصانات ہیں؟ اس کی بہترین تمثیل ایک مختصر سی روایت میں ملتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ

"المعدۃ بیت الداء"

[معدہ بیماریوں کا گھر ہے۔]

قرآن میں مردار کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی حرمت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جانوروں کو ذبح کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مردار کا گوشت کیوں حرام ہے اور مخصوص طریقے پر جانور کے ذبح کرنے سے وہ کیوں حلال ہو جاتا ہے طبی نقطہ نظر سے اگر اس کا جائزہ [illegible] تو اس کی [illegible]

سمجھ میں آتی ہے۔ طبی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ دموی پرورشی کے تعطل کے نتیجے میں بین الخلیات مادے اندرون جسم اِدھر اُدھر جمع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مردار کا جسم ناکارہ سمی مادوں سے بھر جاتا ہے اور وہ مادے اس کی ہر ساخت میں جمع ہو جاتے ہیں مردار کا خون بھی جو اندرون جسم ہی رہ جاتا ہے، مختلف امراض، جراثیم اور سمی مادوں کا حامل ہوتا ہے اور ان میں ہر لحظہ عفونت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے خون کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ اس میں یورک ایسڈ اور دیگر تیزابی مادے موجود ہوتے ہیں جو مضر صحت ہوتے ہیں۔ طبی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ خون کا استعمال کیمیاوی طبی اور طبعی تمام اعتبارات سے انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔

ذبیحہ کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ جانور کو حلق کے نیچے سے ذبح کیا جائے لیکن احتیاط رکھی جائے کہ سر جدا نہ ہونے پائے اور نہ چھری حرام مغز تک پہنچے اگر سر جدا ہو جائے تو ذبیحہ مکروہ ہو جائے گا۔ طبی تحقیقات کی روشنی میں اس حکم کی حکمت جاننا چاہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر گردن کے   اور حرام مغز کو ذبح کرتے وقت کٹنے اور اور جسم سے جدا ہونے سے باز رکھا جائے تو اس کا کنٹرول نظام قلب و عروق پر باقی رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے جسم کی تمام عروق ضوارب سے مکمل طریقے پر خون کے اخراج میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ذبیحہ کے تمام جسم سے پورا خون نکل جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور جھٹکے سے جانور کو ذبح کیا جائے تو فوری موت سے جسم میں خون کی کچھ مقدار رہ جاتی ہے اور یورک ایسڈ اور دیگر جراثیمی وسمی مواد کی آمیزش سے گوشت مضر صحت ہو جاتا ہے۔ متعدد سائنس دانوں نے اس کی شہادت دی ہے۔ ارمنیا سائنس اکیڈمی کے عضویاتی انسٹیٹیوٹ کے سائنس دان دوران خون میں اعصابی بدنظمی کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ریڑھ کی ہڈی قلبی وعروقی نظام کی باقاعدگی پر اہم اثر ڈالتی ہے۔ (سوویت یونین میگزین ۸ ۔ ۳۰ ۔ ۱۹۶۲ء)

آنحضرتؐ نے ہمیشہ بیٹھ کر پانی نوش فرمایا ہے اور سعد بن [illegible] کو بھر مٹی [illegible]

سکتے میں آتی ہے کہ بیٹھنے کی صورت میں معدہ شکم کے عضلات اور حجاب حاجز پر مناسب دباؤ قائم رہتا ہے۔ کھڑے ہو کر پینے سے یہ دباؤ نہیں رہتا اور اس صورت میں اگر بے احتیاطی کے ساتھ زیادہ مقدار میں پانی پی لیا جائے تو ہوا کی مقررہ مقدار پھیپھڑوں میں نہیں جا سکتی۔

مسواک کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت تاکید فرمائی ہے۔ اس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے کہ

"اگر مجھ اپنی امت کے مشقت میں پڑ جانے
کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر ایک کے لیے مسواک
کرنا لازم قرار دے دیتا۔"

اس حدیث کو پیش نظر رکھیں اور اس کے طبی فوائد پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد نبوی پر عمل کے نتیجے میں انسان بے شمار بیماروں سے نجات پا سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات ہمارے لیے واجب التعمیل ہیں ان کی شرعی اور مذہبی حیثیت مسلمہ ہے لیکن طبی تحقیقات سے ان کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے اور انسان صدق دل سے بآسانی اس پر عمل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ ان فوائد کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید سائنٹفک تحقیقات اور ریسرچ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قبیل کے ارشادات کی طبی تحقیق کی جائے اور ان کے رموز و اسرار آشکارا کیے جائیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزوں میں قدرتی تبادلہ ہوتا رہتا ہے اور بجز انسان کے ایسی اور کوئی چیز نہیں جس کو اس تبادلہ میں کچھ دخل ہو۔ اگرچہ انسان کو کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے مگر اس میں اتنی قدرت ہے کہ بہت سی چیزوں کو اپنے اختیار اور قابو میں کر کر اس قدرتی تبادلہ میں شریک ہو۔ انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو تھوڑا بہت کارخانہ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا ہے وہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے کہ دنیا کی آئندہ رفتار کو روک سکتا ہے یا ترقی کر سکتا ہے یا ابتر و خراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔

سرسید احمد خاں۔

اینٹی بائیوٹک دواؤں کا استعمال

محمد فاروق اعظم *

میڈیکل سائنس کے جدید انکشافات سے اب یہ واضح ہوگیا ہے کہ تمام نباتات وحیوانات میں رونما ہونے والے امراض میں سے زیادہ تر امراض خوردبینی جرثوموں (Micro Orga-nisms) کے باعث ہوتے ہیں۔ ایسے جراثیم کو ہم ننگی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ جراثیم مختلف راستوں سے ہمارے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں اور خون کے ساتھ ہمارے مختلف اعضا میں پہنچ کر انفکشن پیدا کرتے ہیں۔ جس کے باعث ہمارا جسم بیمار ہو جاتا ہے ایسے امراض کو متعدی امراض (Infections Dooeanes) کہتے ہیں۔ آپ انہیں (Biotic Disease) کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان امراض کے علاج کے لیے جو دوائیں ایجاد ہوئی ہیں، انھیں مجموعی طور پر اینٹی بائیوٹک دوا کہتے ہیں۔

ٹائیفائیڈ، ٹی۔بی، کالرہ، پیچش، یرقان، سردی زکام اور نمونیا وغیرہ جو عام طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں، یہ سب متعدی امراض ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر امراض کے علاج کے لیے مختلف قسم کی اینٹی بائیوٹک دوائیاں انھیں جرثوں سے تیار کی جاتی ہیں جن کے باعث مرض ہوا ہے۔ مثلاً مرض سل ودق یعنی ٹی۔بی کی خاص دوا بشکل انجکشن streptomyceo ہے۔ یہ دوا اسی جراثیم سے تیار کی جاتی ہے جن کے سبب ٹی۔بی کی بیماری ہوتی ہے۔ یعنی Streptococcus Bacillus کچھ اینٹی بائیوٹک دوائیاں پھپھوندی سے تیار کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس گروپ کی دوسری بہت سی دوائیں مصنوعی طور پر بھی تیار کی جاتی ہیں۔ مثلاً ٹائیفائیڈ کے لیے کلورومائی سیٹین۔ اب تک سیکڑوں قسم کی اینٹی بائیوٹک دوائیاں ایجاد ہو چکی ہیں جن کی مدد سے جراثیم کے باعث ہونے والی تقریباً تمام ہی بیماریوں کا علاج ممکن ہو گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۴ء کے پہلے وبائی امراض کے باعث لاکھوں جانیں عبث میں چلی جاتی تھیں۔ خصوصاً ہیضہ اور کالرا سے تو گھر کا گھر صاف ہو جاتا تھا۔ ایسی بیماریوں کو لوگ آفات سماوی میں شمار کرتے تھے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دیوی دیوتاؤں نیز پیر بزرگوں کے مرقدوں پہ نذرانے اور مٹھائیاں چڑھاتے تھے۔ اس قسم کی ذہنیت کسی حد تک آج بھی موجود ہے۔ اگر کسی کو ٹی۔بی کا مرض لاحق ہو جاتا تھا تو وہ بستر مرض پر جا پڑتا تھا اور موت وحیات کی گھڑیاں گنتا تھا لیکن ۴۵-۱۹۴۴ء میں اسکندر فلیمنگ (Alexander Fleming) نے پنسلین جیسی اہم دوا دریافت کر کے اس مرض میں گرفتار ہزاروں ہزار افراد کو موت کے چنگل سے بچا لیا

آج کل کثرت سے استعمال ہونے والی اینٹی بائیوٹک دوائیوں میں سے کئی ایک اپنے ملک ہندوستان ہی میں تیار ہوتی ہیں۔ یہ سب کے سب انڈین فارماکوپیا میں درج ہیں۔

جیسے ٹٹراسائیکلین، کلوروما ئی سٹین، جنٹا مائی سین اور ڈھارسن وغیرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اینٹی بائیوٹک دوائیں ہمارے لیے ایک عظیم رحمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اینٹی بائیوٹک دوا ہمارے لیے ازحد مفید ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان اینٹی بائیوٹک دوائیوں کے اندھا دھند استعمال سے ہمارے جسم کو غیر معمولی نقصان پہنچ رہا ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ کہ ان کے بکثرت استعمال سے ہمارے جسم کی قوت مدافعت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آج سے بہت پہلے معمولی سردی زکام کا مقابلہ ہمارا جسم خود ہی کر لیتا تھا لیکن جب لوگ اس معمولی مرض کے لیے بھی دوائیاں کھانے لگے تو اب حال یہ ہو گیا ہے کہ معمولی سردی زکام سے شروع ہونے والے امراض کے لیے اونچی طاقت کی اینٹی بائیوٹک دوائیاں لینا ضروری ہی نہیں ناگزیر ہو گیا ہے کہ کچھ دنوں تک ایک قسم کی اینٹی بائیوٹک دوا کام کرتے کرتے بیکار ہو جاتی ہے، تب اس سے اونچی اینٹی بائیوٹک دوا کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ہمارے جسم کو یہ غیر معمولی نقصان اینٹی بائیوٹک دواؤں کے غلط اور بے جا استعمال کے باعث پہنچ رہا ہے۔ لہٰذا ان دواؤں کے استعمال سے پہلے مرض کی صحیح تشخیص ہو جانی چاہیے۔ پھر ان دواؤں کے استعمال کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ دوا اتنی ہی لینی چاہیے جس سے مرض دور ہو جائے اور جرثومے کا خاتمہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں کچھ ضروری ہدایات درج ذیل ہیں۔

ان دواؤں کے استعمال سے پہلے یہ پتا لگا لینا چاہیے کہ مرض کس قسم کے جراثیم سے ہوا ہے۔ اس کے لیے مریض کے خون، پیشاب اور بلغم وغیرہ کا کلچر کروانا چاہیے۔ یہ کلچر (Sensitivity Test) کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس ٹیسٹ سے یہ پتا چل جاتا ہے کہ کون سا جرثومہ کس دوا سے مارا جا سکتا ہے۔

کچھ دوائیں ایسی ہیں جو سب کے موافق نہیں ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو [illegible]

ہاتھ دھونے پڑ جاتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہوتی ہے کہ ایسی دوا کسی خاص مریض میں الرجی پیدا کرتی ہے۔ یہ الرجی معمولی بھی ہو سکتی ہے اور سنگین بھی۔ لہٰذا ایسی دواؤں کے استعمال سے پہلے یہ جانچ بھی کر لینی چاہیے کہ آیا یہ دوا مریض کے موافق بھی ہے یا نہیں۔ موافق ہونے پر ہی یہ دوا استعمال کی جانی چاہیے۔

ان دواؤں کے استعمال سے امراض اور اموات کی شرحوں میں بلاشبہ کمی آئی ہے۔ لیکن ان کے غلط، بے جا اور بکثرت استعمال سے ہمارے جسم پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ جیسے کلوروما ئیسٹن کے زیادہ استعمال سے کمی خون Agranulocytosis اور Anemia جیسی خطرناک بیماریاں ہو جاتی ہیں۔

بہت سے لوگ ڈاکٹروں سے صلاح و مشورہ کیے بغیر اونچی اینٹی بائیوٹک دوائیاں خود بھی کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے ہمارے جسم کو غیر معمولی نقصان پہنچتا ہے۔ بہت سی دوائیں ہمارے نظام ہاضمہ کو بگاڑ دیتی ہیں۔ منہ میں چھالے پڑ جاتے ہیں انھیں دور کرنے کے لیے وٹامن بی کمپلکس کی گولیاں بھی کھانی چاہییں۔ ان دواؤں کے بکثرت استعمال سے ہمارے جسم میں موجود بکٹیریا دواؤں کے خلاف قوت مدافعت پیدا کر لیتے ہیں جس کے باعث اب انھیں مارنا آسان نہیں رہ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے سے ہمیں بہت زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں جب بھی دوا کی ضرورت ہو کسی اچھے اور قابل ڈاکٹر سے ضرور ہی مل لینا چاہیے۔

سائنس داں کیسے ہوتے ہیں

اشرف نوشاہی *

ہم میں سے ہر ایک کو ریاضی میں "فیثاغورث" کا مسئلہ پڑھنا پڑتا ہے۔ ہمارے استاد ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قائمۃ الزاویہ مثلث کیا چیز ہوتی ہے اور اس کے تینوں ضلعوں میں کیا تعلق قایم رہتا ہے لیکن ہم میں سے بہت سے یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ کس مصیبت میں پھنس گئے۔ نہ جانے یہ فیثاغورث کون تھا جو ہمیں اس عذاب میں ڈال گیا۔

حقیقت میں یہ سوچ بے حد خطرناک ہے۔ جب ہم میں سے کوئی ایسی باتیں سوچتا ہے تو اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ فیثاغورث اور اس جیسے تمام انسان مدت ہوئی اس دنیا سے چلے گئے۔ انہیں معلوم بھی نہیں کہ ہم انہیں یاد کرتے ہیں یا بھول چکے ہیں۔ انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ ہم ان کی تعریف کریں یا ان کو برا بھلا کہیں، ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن ہم پر ہر بات کا اثر ہوتا ہے۔ اچھی بات کا اچھا اور بری بات کا برا۔ ہم اچھی باتیں سوچ کر زندگی کو اچھا اور بری باتیں سوچ کر زندگی کو برا بنا سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ نقصان ہمارا ہی ہوگا۔ اس طرح ہم اگر ان لوگوں کی باتوں سے فائدہ اٹھائیں تو فائدہ بھی ہمیں ہی ہوگا۔۔۔۔۔ وہ لوگ تو گزر گئے، لیکن انھوں نے زندگی بھر جو کام کیا وہ آج ہمارے لیے آرام سکون پیدا کر رہا ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم فیثاغورث کے متعلق زیادہ نہیں جانتے اور ایک فیثاغورث ہی کیا ہم تو انسانیت کے لیے کام کرنے والے بہت سے اچھے لوگوں کو نہیں جانتے۔ ایسے لوگ ماضی میں بھی تھے، آج بھی ہیں اور کل بھی ہوں گے۔ انہیں ہماری تعریف کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمیں ان کی تعریف کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں یاد رکھ کر ہم خود کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ ان کی طرح کوئی بڑا کام کر جائیں۔

ہماری زندگی پر سائنس اور سائنس دانوں کے بہت سے احسانات ہیں۔ آج ہمیں جو آرام حاصل ہیں وہ سائنس دانوں کی محنت کا نتیجہ ہیں اور اگر ہم سائنس دانوں کی محنت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان کے بلند مقام کو تسلیم کرلیں۔

ہمارے لیے یہ علم حاصل کرنا ضروری ہے کہ سائنس داں کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے؟ سائنس داں کون ہوتا ہے؟ اس سے ہمیں کس کام کی توقع ہوتی ہے؟ وہ کس طبقے، عہدے، تنظیم یا ادارے سے تعلق رکھتا ہے؟

ان باتوں کو جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ سائنس داں نے صدیوں کی مسلسل محنت سے معاشرے میں اپنا مقام بنایا ہے۔ آج کی دنیا میں ایسے بڑے بڑے سائنسی ادارے موجود ہیں جو سیکڑوں سال پہلے قایم ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر یورپ کی کئی یونیورسٹیاں اتنی ہی پرانی ہیں جتنی کی وہاں کی اسمبلی اور پارلیمنٹ۔ گویا کہ جمہوریت اور سائنس نے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت کی ہے۔ صنعتی ادارے اور کارخانے

---

* حسین آفندی روڈ، کراچی۔

یونیورسٹیوں سے بہت بعد میں بنتے ہیں۔ اس لیے کہ پہلے کسی بھی ملک میں سائنسی ادارے قایم ہوتے ہیں، پھر ان اداروں سے سائنس داں پیدا ہوتے ہیں اور صنعتیں قایم کرتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ صنعتیں تو کارخانے دار لوگ قایم کرتے ہیں۔ آپ کا یہ کہنا غلط ہے۔ یہ لوگ صرف صنعتیں چلاتے ہیں۔ صنعت قایم کرنے والا سائنس داں ہی ہوتا ہے۔

ہر سائنس داں کی زندگی پر تھوڑے وقت میں روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگ باوجود سائنس داں ہونے کے الگ الگ قوموں، زمانوں، مذاہب، نسلوں اور ممالک کے لوگ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا مزاج بھی مختلف تھا لیکن مقصد ایک ہی تھا انسانیت کی خدمت ۔

ہر سائنس داں نے اپنی زندگی کے بہت سے واقعات، تجربات، مشاہدات اور ایجادات ہمارے لیے ورثے میں چھوڑے ہیں۔ اب سائنس سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی فرد ان جواہرات کو کاغذی خزانوں میں سے حاصل کر سکتا ہے جو نیوٹن اور فیراڈے کی جائداد تھے۔

سائنس داں کو سمجھنے کے لیے ہم تاریخ کے خاص حصوں پر غور کریں تو بھی ہم پر اس کی شخصیت واضح ہو جائے گی اور ہم جان جائیں گے کہ سائنس دان کیسے ہوتے ہیں۔

سترھویں صدی عیسوی کے سائنس داں

(۱) رابرٹ بوائل (۱۶۲۷ تا ۱۶۹۱ء) اپنی ان دریافتوں کے لیے مشہور ہے جو اس نے گیسوں کی طبعیات میں کیں۔ اس نے کیمیا کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے اور کئی قیمتی دستاویزیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

رابرٹ بوائل ایک نواب "ارل آف کورک" کا بیٹا تھا۔ رابرٹ بوائل کے علاوہ اس نواب کے تیرہ لڑکے اور بھی تھے۔ نواب کا بیٹا ہونے کی رعایت سے بوائل نے ساری زندگی شہزادوں کی طرح گزاری۔ وہ جس محل میں رہتا تھا اس کے آثار تصویروں میں ملتے ہیں اور اس زمانے کے اعتبار سے وہ نہایت عالی شان محل ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں "نواب کا بیٹا" اس "شہزادے" کے لیے طنز میں بولا جاتا ہے جس کا جی کوئی اچھا کام کرنے کو نہ کرے۔ لیکن رابرٹ بوائل نے زندگی بھر اتنا کام کیا کہ اسے آج بھی "بابائے کیمیا" اور "ارل آف کورک کا انکل" کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب کا یہ بیٹا بچپن ہی سے ان بچوں میں شمار ہونے لگا جو "ذہانت کا عجوبہ" کہلاتے ہیں۔ بڑا ہو کر وہ بہترین سائنس داں بنا۔ اس نے اپنی آخری عمر عیسائیت پر غور و فکر میں گزاری۔

۲۔ مارسیلو مالپگی (۱۶۲۸ تا ۱۶۹۴ء) کو "بابائے خردیات" کہا جاتا ہے۔ خردیات کی اصطلاح انگریزی لفظ "مائکرو اسکوپی" کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ مارسلو کو یہ خطاب اس لیے دیا جاتا ہے کہ اس نے خوردبین (مائکرو اسکوپ) سے (جو حال ہی میں ایجاد ہوئی تھی) جانوروں اور پودوں پر اہم اور نازک تحقیق کی۔ اس نے طبیب (فزیشن) کی تعلیم و تربیت حاصل کر رکھی تھی اور زندگی کا اکثر حصہ طب کی تعلیم و تربیت دوسروں تک پہنچانے میں گزارا۔ یہ کام اس نے بولوگنا یونیورسٹی میں "پروفیسر آف میڈیسن" کی حیثیت سے کیا۔ طب میں اس کا مقام اتنا بلند تھا کہ ۱۶۹۱ء میں بارہویں پوپ نے اسے اپنا خصوصی طبیب مقرر کر دیا۔

مارسلو مالپگی کا تعلق اٹلی سے تھا اور وہ جس دور میں پیدا ہوا وہ اٹلی میں "عمل ترقی کا زمانہ" تھا۔ اٹلی اس وقت سائنس میں یورپ کی قیادت کر رہا تھا۔ اور اٹلی کی یونیورسٹیوں میں طب کی تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ دنیا بھر میں اس کی قدر و منزلت تھی۔ مارسلو مالپگی نے اس مقام کو اور بھی بلند کر دیا۔

۳۔ جون رے (۱۶۲۸ تا ۱۷۰۵ء) ان پہلی کتابوں میں سے ایک کا مصنف تھا جن میں پودوں کی درجہ بندی کی گئی تھی۔ وہ ایک لوہار کا بیٹا تھا لیکن اپنی محنت سے اس نے کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ٹرنیٹی کالج کا فیلو بن گیا۔ فیلو کے عہدے پر فائز ہونے سے اسے یہ آزادی مل گئی کہ وہ

اپنی سہولت سے اپنے شوق کو پورا کرے ۔ یہ شوق پودوں کا مطالعہ کرنا تھا لیکن یہ سہولت اس وقت چھن گئی جب ۱۶۶۲ء میں اسے فیلو کے اعزاز سے محروم کر دیا گیا۔ اعزاز سے اس کی محرومی کا سبب "خیالات کا اختلاف" تھا۔ خوش قسمتی سے ایسے وقت میں اس کا ایک دولت مند دوست کام آیا اور جون رے نے اپنے تحقیقی کام جاری رکھے۔

۴۔ کرسچن ہائجنز (۱۶۲۹ تا ۱۶۹۵ء)۔ اس سائنس داں کی زندگی بھی شاہانہ تھی۔ وہ ایک مشہور سفارت کار اور درباری کا بیٹا تھا۔ ہائجنز کے والد کی آج بھی ہالینڈ میں ہائجنز سے زیادہ شہرت ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہائجنز کے والد شاعر تھے جب کہ ہائجنز سائنس داں تھا۔

اس کے باوجود کہ ہائجنز نے ایک شاعر کے ہاں آنکھ کھولی اس نے ابتدا ہی سے ریاضی اور فلکیات میں دلچسپی لی۔ اس نے پہلی بار پنڈولم گھڑی بنائی۔

سائنس کی دنیا میں جب ہائجنز کی شہرت پھیلی تو ۱۶۶۶ء میں اسے پیرس بلایا گیا اور وہ رائل اکیڈمی پیرس کا رکن بنا لیا گیا۔ یہ ایک ایسا عہدہ تھا جس کی باقاعدہ اور اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ تاہم بعد میں فرانس کے حالات بگڑ گئے تو ۱۶۸۱ء میں ہائجنز اپنے وطن "ہالینڈ" واپس چلا گیا۔

۵۔ انتونیس لیوین ہوک (۱۶۳۲ء تا ۱۷۲۳ء) یہ سائنس داں اپنے زمانے کی پرکشش شخصیت تھا۔ ذاتی طور پر وہ ایک دکان دار تھا اور تعلیم بھی واجبی سی پائی تھی لیکن اس کا شوق اعلیٰ تھا۔ وہ قدرتی اشیاء کا علم حاصل کرنے کا بے حد شوقین تھا۔ اس شوق کی خاطر اس نے ایک معمولی سے عدسے کو استعمال کر کے چھوٹے چھوٹے جاندار دیکھے۔ اسی عدسے کی مدد سے اس نے یک خلوی جاندار دریافت کر لیے۔ اس کی علمی کامیابیوں نے باوجود عام آدمی ہونے اور کم تعلیم یافتہ ہونے کے اسے ٹاؤن ہال کا افسر بنا دیا۔ اس طرح اسے زیادہ وقت اور سہولت مل گئی۔ چنانچہ اس نے بہت سے مضامین لندن کی رائل سوسائٹی کو بھیجے۔ ان مضامین میں اس نے اپنے ذاتی مشاہدات لکھے۔

۶۔ روبرٹ ہک (۱۶۳۵ تا ۱۷۰۳ء) یہ سائنس داں ان لوگوں میں سے تھا جو ایک ساتھ بہت سے کام کر جاتے ہیں اس نے اپنی آمدنی کا ذریعہ عمارتیں بنانے یعنی سول انجینئرنگ کو بنایا۔ وہ ایک اچھا سروئیر بھی تھا۔ وہ روبرٹ بوائل کا تحقیقی ماتحت بھی رہا۔ اور اس نے حیاتیات اور طبعیات میں قابل قدر تحقیق کے ساتھ ساتھ اہم دریافتیں بھی کیں۔ اسی نے پودوں کے خلیات (سیل) دریافت کیے۔ موسمی پیش گوئیوں کے لیے ایک طریقہ نکالا لیکن چونکہ وہ مشہور سائنس داں نیوٹن سے جھگڑتا رہتا تھا اس لیے سائنس کی تاریخ میں اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ یہ تسلیم کرنے میں پھر بھی بخل نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنے وقت کا ایک ذہین اور سوشل آدمی تھا۔

۷۔ آئزک نیوٹن (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) اس عالم داں کا کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ ریاضی میں اسے جو خداداد صلاحیت حاصل تھی اس کی بنیاد پر وہ ٹرینٹی کالج کا فیلو بنا پھر کیمبرج یونیورسٹی میں جیومیٹری کا پروفیسر۔

نیوٹن بے حد حساس آدمی تھا اور ذرا سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ۱۶۵۷ء میں اس کی عظیم کتاب "پرنسپیا" شائع ہوئی تو اس کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ ۱۶۹۵ء میں اسے سکے ڈھالنے والے کارخانے کا افسر بنا دیا گیا جہاں اس نے چاندی کے سکوں کو نیا وقار دیا۔ اس نے زندگی کے آخری پچیس برس میں افسر ٹکسال اور صدر رائل سوسائٹی کی حیثیت سے قابل خدمات انجام دیں۔ اسے "سر آئزک" کا خطاب بھی حاصل اسے تمام برطانیہ اور یورپ میں اپنے دور کا بہت بڑا آدمی تسلیم کر لیا گیا تھا۔

(۸) گوٹ فرائڈ۔ لیبنیز (۱۶۴۶ء تا ۱۷۱۶ء) اسے نیوٹن کا مقابل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں نے اپنے اپنے طور ریاضی کی جدید شاخ احصاء قائم کی تھی۔

... لیبنیز کو بچپن ہی سے ذہانت کا مجسمہ تھا ایک

لیبنیز (جینیس) جس نے سائنس کے ساتھ ساتھ سفارت اور سیاست کی بھی خدمت کی چالیس سال تک وہ برنس وک کی شاہی لائبریری میں افسر اعلیٰ رہا۔ اس دوران ایک عالم اور قابل افسر کے طور پر اس کی شہرت برابر بڑھتی رہی۔

اس نے حساب کرنے والی ایک مشین بھی بنائی جس کو دیکھ کر رائل سوسائٹی لندن کے ارکان بے حد متاثر ہوئے۔ یہ مشین ۱۶۷۳ء میں انھیں دکھائی گئی تھی۔

(۹) جون فلیم سٹید (۱۶۴۶ تا ۱۷۱۹ء) یہ سائنس داں پہلا شاہی فلکیات داں تھا جو برطانوی بادشاہت نے مقرر کیا۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں صدیوں سے شاہی فلکیات داں کا عہدہ موجود تھا اور ایک اہم درباری حیثیت رکھتا تھا چنانچہ ڈنمارک کے ٹائکو ڈی براہے (۱۵۴۶ تا ۱۶۰۱ء) کی شہرت آج بھی قائم ہے۔ یورپی ممالک کی تقلید میں انگریز بادشاہ چارلس دوم نے ۱۶۷۶ء میں گرین وچ کی رصدگاہ (آبزرویٹری) قائم کی اور وہاں جون فلیم سٹید کو مقرر کیا۔ بادشاہ نے یہ زیادتی کی کہ اس سائنس داں کو بہت تھوڑی تنخواہ دیتا رہا۔ کم تنخواہ اور کمزور صحت کے باوجود جون نے محنت میں کمی نہ آنے دی۔ اس نے کئی طرح کے نئے فلکیاتی آلات بنائے اور ستاروں کے مستند اعداد و شمار جمع کیے۔ بہت سے دوسرے سائنس دانوں کی طرح وہ نظریات میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی زیادہ توجہ مشاہدے اور تجربے کی طرف رہی۔ یہی وجہ ہے کہ نیوٹن اسے صرف "مکینک" سمجھتا رہا اور اس کے اعداد و شمار پر اعتبار نہ کرتا تھا۔ اس کے فراہم کردہ اعداد و شمار کو نیوٹن پہلے خود جانچتا اور پھر ان کو کام میں لاتا تھا۔

برنولی	۱۷۰۰ء تا ۱۷۸۲ء	ریاضی	سوئس	
فرینکلن	۱۷۰۶ء تا ۱۷۹۰ء	بجلی	امریکی	پرنٹر
لینیئس	۱۷۰۷ء تا ۱۷۷۸ء	حیاتیات	سویڈش	پروفیسر
یولر	۱۷۰۷ء تا ۱۷۸۳ء	ریاضی	سوئس	ماہر تعلیم
بوفون	۱۷۰۷ء تا ۱۷۸۸ء	حیاتیات	فرانسیسی	ملکی کاروباری
ڈارون	۱۷۳۱ء تا ۱۸۰۲ء	حیاتیات	انگریز	طبیب
ہیلر	۱۷۰۸ء تا ۱۷۷۷ء	حیاتیات	سوئس	طبیب
ہٹن	۱۷۲۶ء تا ۱۷۹۷ء	ارضیات	اسکاٹش	صنعت کار
بلیک	۱۷۲۸ء تا ۱۷۹۹ء	کیمیا	اسکاٹش	پروفیسر
اسپلانزی	۱۷۲۹ء تا ۱۷۹۹ء	حیاتیات	اطالوی	پادری
میسیر	۱۷۳۰ء تا ۱۸۱۷ء	فلکیات	فرانسیسی	
لیمبرٹ	۱۷۲۸ء تا ۱۷۷۷ء	ریاضی	جرمن	ٹیوٹر
کیونڈش	۱۷۳۱ء تا ۱۸۱۰ء	طبعیات	انگریز	معزز آدمی
پریسٹلے	۱۷۳۳ء تا ۱۸۰۴ء	کیمیا	انگریز	وزیر
میسمر	۱۷۳۴ء تا ۱۸۱۵ء	حیاتیات	آسٹریائی	غیر مستند طبیب
لیگرینج	۱۷۳۶ء تا ۱۸۱۳ء	ریاضی	فرانسیسی	ماہر تعلیم
کولومب	۱۷۳۶ء تا ۱۸۰۶ء	طبعیات	فرانسیسی	انجینئر
گیلوانی	۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۸ء	اناٹومی	اطالوی	پروفیسر
وولف	۱۷۳۳ تا ۱۷۹۴ء	حیاتیات	جرمن	ماہر تعلیم
ہرشل	۱۷۳۸ء تا ۱۸۲۲ء	فلکیات	انگریز	ماہر موسیقی
شیلے	۱۷۴۲ء تا ۱۷۸۶ء	کیمیا	سویڈش	
بینکس	۱۷۴۳ء تا ۱۸۲۰ء	نباتات	انگریز	ذاتی کاروبار
ہائی	۱۷۴۳ء تا ۱۸۲۲ء	معدنیات	فرانسیسی	پادری
لیوازیے	۱۷۴۳ء تا ۱۷۹۴ء	کیمیا	فرانسیسی	ساہوکار

سترہویں صدی کے صرف نو ستاروں کا ذکر کر دینے سے اس دور کے سارے بڑے سائنس داں شمار میں نہیں آجاتے۔ بے شمار دوسرے سائنس دانوں نے بھی اس دور میں اہم کام کیے ہیں۔ اٹلی، فرانس، ہالینڈ اور برطانیہ اس زمانے کے یورپ میں سائنس کے گہوارہ تھے۔

سترہویں صدی میں سائنس دانوں کے لیے کام کے مواقع محدود تھے۔ چند ایک سیاسی عہدے تھے جن پر کام کرنے والے کو تنخواہ بھی بہت کم ملتی تھی چنانچہ روبرٹ ہک اور فلیم سٹید کو باوجود بڑے بڑے کام کرنے کے اچھی تنخواہ کبھی نہ مل سکی۔ صرف وہ سائنس داں اچھے حال میں رہے جو دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جیسے جون رے

یہ بات بھی اتفاقی ہے کہ نیوٹن اور مالتھس جیسے بڑے پروفیسروں نے شاندار دریافتیں کرلیں۔ اس لیے کہ اس زمانے میں یہ کام عالموں اور پروفیسروں کے نہیں تھے۔ تعلیمی اداروں اور یونیورسٹی میں تحقیق کو تعلیم وتربیت کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے کا رویہ یہ تھا کہ سائنس دانوں کو "قدرت کے فلسفی" کہہ کر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ عام لوگ انھیں دیوانہ اور مجنوں خیال کرتے تھے۔ کسی طبیب، پروفیسر، پادری، سرکاری افسر اور تاجر کے لیے یہ بات شان کے خلاف سمجھی جاتی تھی کہ وہ سائنس میں دلچسپی لے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کوئی "معزز آدمی" فٹ بال کھیلنے لگے تو لوگوں کا رویہ ناک بھوں چڑھانے کا سا ہوگا۔ اس لیے یہ بات حیران کرنے والی نہیں کہ چند ایک امیر لوگوں کو چھوڑ کر زیادہ تر آرام وسکون کے دیوانے تھے۔ غریب طبقے کے شوقین لوگوں نے دولت اور تعلیم کی کمی کے باوجود سائنس کے لیے کام کیا۔ تاہم یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ذہین اور قابل لوگ (خواہ ان کا تعلق کسی طبقے سے ہو) سائنس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کی وجہ وہ معاشرتی ماحول تھا جس سے ذہین لوگ بےزار تھے۔ بے مقصد شاعری، فضول افسانے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے، دولت کمانے کا جنون وہ معاشرتی خرابیاں تھیں جو ذہین افراد کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ سائنس سے دل لگائیں۔

ذہین افراد نے جب معاشرے کی حالت پر صرف افسوس اور ہائے ہائے کرنے کے بجائے کام کرنا شروع کر دیا تو ایک نئی قسم کی زندگی ان کو ملی۔ چھاپے خانے (پرنٹنگ پریس) جدید کان کنی اور بحری جہاز رانی کے ذریعے نئی فتوحات حاصل کی گئیں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے سائنس داں

اٹھارھویں صدی عیسوی میں پیدا ہونے والے ذہین لوگوں نے پچھلی صدی کے ذہین لوگوں کی قربانیوں سے فائدہ اٹھایا یہی وجہ ہے کہ اس دور کے سائنس دانوں کی فہرست طویل ہے پچھلے سو سالوں کے دوران یورپ بھر میں سائنس کا فروغ ہوا تھا۔ اب سائنس نے سوئٹزرلینڈ، سویڈن، اسکاٹ لینڈ اور امریکہ

میں بھی جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ ساری دنیا میں یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ سب انسان ایک ہیں اس لیے ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی کا دور اب ختم ہونا چاہیے۔ یہ احساس کمزور ضرور تھا لیکن ہر آنے والا دن اسے مضبوط بنا رہا تھا۔ "قدرتی فلسفی" اپنے نظریات، تجربات اور مشاہدات سے انسانیت کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے تھے چنانچہ اس دور کی نمایاں "قدرتی فلسفیوں" کی ایک فہرست یوں مرتب کی جاسکتی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کے سائنس داں

۱۸۷۰ء تک سائنسی برادری میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں سائنس ایک آزاد شوق سے نکل کر تعلیمی اداروں کا حصہ بن گئی تھی جس نے سائنس کو بہت زیادہ ترقی دی۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اس دور میں کتنے اور کون کون سے سائنس داں پیدا ہوئے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مشہور سائنس دانوں کے حالات زندگی سے جو نام ملتے ہیں وہ بہت تھوڑے ہیں کیوں کہ کبھی بھی سارے لوگوں کے نام کتابوں میں شایع اور محفوظ نہیں ہوتے چونکہ اس زمانے میں جو سائنسی رسالے اور کتابیں شایع ہو رہی تھیں ان کی پانچ ہزار سے دس ہزار تک اشاعت تھی اس لیے آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اتنے پڑھنے اور لکھنے والے بھی ہوں گے۔ اعداد وشمار دیکھے جائیں تو ہر پندرہ سال بعد سائنس سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد دوگنی ہو رہی تھی اور یہ اضافہ مسلسل جاری ہے۔ صرف تین سالوں کے اعداد وشمار یہ ہیں۔

۱۷۷۰ء میں ۱۰۰۰ افراد سائنس پڑھتے لکھتے تھے۔
۱۸۷۰ء میں ۱۰۰۰۰ افراد سائنس پڑھتے لکھتے تھے۔
۱۹۷۰ء میں ۱۰۰۰۰۰۰ افراد سائنس پڑھتے لکھتے تھے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ انیسویں صدی تک یونیورسٹیوں میں سائنس اتنی ترقی کرچکی تھی کہ کثرت سے سائنس داں پیدا ہونے لگے۔ وہ لوگ جو گہرے غور وفکر کا فن جانتے تھے "خالص سائنس" یا "بنیادی سائنس" سے منسلک ہوگئے — یونیورسٹیوں نے ایسے لوگوں کو "پروفیسر" کے عہدے پر قائم کیا۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے دولت مند جو سائنس کا شوق رکھتے تھے (مثلاً ڈارون) انہوں نے سائنس کو مشغلہ بنا لیا۔ کسی بھی طبیب کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ لوگوں کا علاج کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی توجہ رکھے کہ کون سی بیماریوں کا علاج اسے معلوم نہیں۔ اور یہ علاج کس طرح ہو سکتا ہے۔ حکومتوں نے بھی ایسے ادارے قائم کر دیے تھے جہاں فلکیات، ارضیات اور کیمیا جیسے شعبوں کا کام ہو رہا تھا لیکن ایسے اداروں کی تعداد بہت کم تھی۔

سائنس داں کا لفظ بھی پہلی بار اسی زمانے میں استعمال ہوا۔ یہ ۱۸۴۰ء میں ولیم ویول نے ایجاد کیا اور اپنے عہدے کو "سائنس داں" کا نام دیا۔

ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ یونیورسٹیوں میں وہ لوگ کیا کر رہے تھے جنھیں طبیعات، کیمیا اور حیاتیات کا پروفیسر کہا جاتا تھا؟

برطانیہ میں یہ لوگ کئی نئی یونیورسٹیوں میں طالب علموں کو تعلیم و تربیت دے رہے تھے۔ ان یونیورسٹیوں میں پہلے سائنسی مضامین نہیں پڑھائے جاتے تھے۔ بعد میں جب انہوں نے سائنس کی ڈگری یعنی سند جاری کرنا شروع کی تو نمایاں اور ذہین سائنس دانوں کو پروفیسر مقرر کیا۔ اس کے باوجود ۱۸۵۰ء تک یہ ممکن نہ تھا کہ تجرباتی سائنس کی تعلیم و تربیت باقاعدگی سے حاصل کی جا سکے۔ کوئی بھی نوجوان اور دولت مند آدمی چند ایک یونیورسٹی میں جا کر پروفیسروں کے لیکچر سن لیتا تھا اور سائنس داں بن جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک غریب لڑکا جس کا نام مائیکل فیراڈے تھا۔ پہلے پہل لیبارٹری میں کام کرنے والا خادم بنا اور پھر سائنسی دنیا میں داخل ہو گیا۔ وہ خوش قسمت تھا کیونکہ اس کے مالک ہمفری ڈیوی (۱۷۷۸ء تا ۱۸۲۹ء) نے جو کہ رائل انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر تھا، اپنے خادم کی "ذہانت" کو نہ صرف پہچان لیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی میں کسی حسد یا بخل سے کام نہ لیا۔ اس طرح یہ غریب لڑکا ہمفری ڈیوی کا سائنسی جانشین بن گیا اور اس قدر بلند مقام حاصل کر لیا کہ اب اسے زیادہ لوگ جانتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری حصے میں بیچلر آف سائنس یعنی بی ایس سی کی ڈگری نے سائنس داں ہونے کی سند کا مقام حاصل کر لیا۔ بی ایس سی کے مساوی کیمبرج یونیورسٹی نے این۔ ایس۔ ٹی (N.S.T.) کی ڈگری جاری کی۔ یہ دونوں ڈگریاں سائنس داں ہونے، سائنسی تحقیق کرنے اور سائنسی تعلیم دینے کی سند تھیں اور جو بھی شخص کوئی ایک ڈگری حاصل کر لیتا اسے یہ کام کرنے کا اختیار اور صلاحیت مل جاتی۔ چنانچہ ایک اور غریب لڑکا ایچ۔ جی۔ ویلز سائنس کی دنیا میں داخل ہو گیا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کی حوصلہ افزائی لندن یونیورسٹی کے پروفیسر حیاتیات نے کی۔ تاہم ایچ۔ جی۔ ویلز نے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پروفیسر بننے کے بجائے "سائنس داں ادیب" بننا پسند کیا۔ اس طرح وہ مستقبل کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ انسان ایک دن چاند پر قدم رکھے گا اور ایسا ہی ہوا۔

بدقسمتی سے ایچ۔ جی ویلز کے بعد بہت کم اچھے ادیب پیدا ہوئے جو سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سائنسی کہانیاں لکھ سکتے۔ بہت سے لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بے سر و پا باتیں لکھ کر ان کو سائنس فکشن کا نام دے دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خرابی بڑھتی گئی اور بغیر کسی سائنسی بنیاد کے جو جی چاہا لکھا اور پڑھا جانے لگا۔ اس نے سائنس کو نقصان پہنچایا۔

جرمن سائنس

برطانیہ میں سائنس نے باقاعدہ اور سند یافتہ علم کی حیثیت حاصل کر لی لیکن اسے صحیح معنوں میں باقاعدہ اور مستند جرمنی نے بنایا۔ انیسویں صدی کے جرمنی میں کئی نئی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور ان میں یہ مقابلہ شروع ہو گیا کہ ذہین اور قابل لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ کسی یونیورسٹی کے پروفیسر جتنے ذہین اور قابل ہوتے یونیورسٹی کا مقام اتنا ہی بلند ہوتا۔ اس مقابلہ کی وجہ سے پہلی بار واقعی ذہین اور قابل افراد کو ابھرنے کا موقع ملا۔ ذہانت اور قابلیت ہی اصل ڈگری تسلیم کر لی گئی۔

جرمنی میں سائنس کی بدقسمتی یہ رہی کہ صرف پروفیسروں کو ہی

تنخواہ ملتی تھی۔ اس سے نچلے عہدوں پر کام کرنے والوں کو معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔ سائنس اور فلسفے کے ڈگری یافتہ لوگوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے مضمون میں مزید پڑھ کر پی ایچ ڈی یا ڈی ایس سی کی ڈگری حاصل کریں تب انھیں پروفیسر بنایا جائے گا۔ اس دوران مالی ضروریات پوری کرنے میں سائنس دانوں کو بے حد تکالیف پیش آتی تھیں۔

بی ایس سی کے بعد آگے تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند سائنس دانوں کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ پرائیویٹ ٹیوشن پڑھائیں لیکن چونکہ یہ کام اچھی اور باقاعدہ آمدنی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا اس لیے سائنس دانوں کے مالی حالات برسوں ڈگریوں تک خراب ہی رہتے تھے اور سائنس دان جو زیادہ وقت ٹیوشن پڑھانے میں ہی لگا دیتے تھے تعلیم اور تحقیق پر توجہ دینے کے لیے وقت کی کمی کے شکار ہو جاتے تھے۔ اس طرح دونوں لحاظ سے سائنس دانوں کو شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ جو سائنس دان ان مشکلات کے باوجود بھی ڈی ایس سی کر لیتے تھے انہیں کڑے مقابلے سے گزرنا پڑتا تھا۔ تاہم ان سائنس دانوں کے لیے ترقی کی راہ کھل جاتی تھی جو پروفیسر بننے میں کامیاب ہو جاتے۔

عام طور پر اس دور میں ایک جرمن سائنس دان تیس سے چالیس سال کی عمر تک پروفیسر بن جاتا تھا۔ اس طرح اسے معاشرے میں ایک بلند مقام مل جاتا اور مالی حالات بھی اچھے ہو جاتے۔ اس کے بعد وہ یونیورسٹی میں اور بڑے عہدوں کے لیے کوشش کرتا رہتا۔

ان حالات نے سائنس دانوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ ہر پروفیسر کچھ تعلیم یافتہ سائنس دانوں کو ماتحت بناتا۔ ماتحتوں کے گروپ کو "سیمینار" کہا جاتا تھا۔ آج کل بھی ہر بڑے سائنسدان کے ایسے ماتحت ہوتے ہیں اور ان کے گروپ کو "تحقیقی گروپ" کہا جاتا ہے۔

سیمینار میں شامل چھوٹے اور ماتحت سائنس دانوں کا انحصار بڑے سائنس دان کی مہربانیوں پر ہوتا تھا۔ صرف پروفیسر کی سفارش پر ہی چھوٹے سائنس دانوں کی ترقی کا دارومدار تھا۔ اس نے چھوٹے سائنس دانوں میں خود کو سائنس کے لیے وقف کر دینے کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ دن رات اسے حل کرنے میں مصروف رہے

رفتہ رفتہ ہر یونیورسٹی ایسے گروپ

...کام کرنے لگے ہر جگہ سے سائنس کے طالب علم یہاں آ کر پروفیسروں

کے لیکچروں اور تجربات سے فائدہ اٹھانے لگے۔ اس طرح یونیورسٹیوں میں تحقیق، تعلیم و تربیت کا لازمی حصہ بن گئی۔

انیسویں صدی کے اہم سائنسی واقعات

اٹھارویں صدی عیسوی میں جن سائنسی خیالات، مضامین اور اداروں کو قایم کیا گیا تھا انہوں نے انیسویں صدی میں حیرت انگیز ترقی کی۔ اس بات کا ثبوت ان دو واقعات سے ملتا ہے۔ ۱۸۷۱ء۔ کیمبرج یونیورسٹی میں کیونڈش لیبارٹری قایم کر دی گئی۔ جیمز کلارک میکس ویل، جے۔ جے تھامسن اور ارنسٹ ردرفورڈ جیسے عظیم سائنس دان یہاں کیونڈش پروفیسر بنے۔

۱۸۸۸ء پیرس میں پاسچر انسٹی ٹیوٹ قایم کر دیا گیا۔ اسے لوئیس پاسچر کے لیے قایم کیا گیا تھا جس نے بیماریوں میں جراثیم کے کردار کو دریافت کیا۔ آج بھی یہ مالیکیول اور حیاتیات پر تحقیق کا بڑا اعلیٰ مرکز ہے۔

ان دو بہت بڑے اداروں کے علاوہ صرف لندن میں جو سائنسی ادارے اس دوران قایم ہوئے ان کے نام اور قیام کے سال یہ ہیں۔

۱۸۰۰ء	رائل کالج آف سرجن
۱۸۰۷ء	جیولوجیکل سوسائٹی (ارضیاتی انجمن)
۱۸۲۰ء	رائل آسٹرونومیکل سوسائٹی
۱۸۲۶ء	زولوجیکل سوسائٹی (حیاتیاتی انجمن)
۱۸۴۱ء	کیمیکل سوسائٹی (کیمیائی انجمن)
۱۸۴۷ء	انسٹی ٹیوٹ آف مکینکل انجینئرز
۱۸۶۳ء	انسٹی ٹیوٹ آف گیس انجینئرز
۱۸۷۱ء	انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل انجینئرز
۱۸۷۴ء	فزیکل سوسائٹی
۱۸۷۶ء	فزیالوجیکل سوسائٹی

اس طرح انیسویں صدی کے سو سالوں کے اندر سائنس کی دنیا میں بہار آ گئی اور جب انیسویں صدی ختم ہوئی تو بیسویں صدی میں آنکھ کھولنے والے بچے نے دیکھا کہ سائنس کا سنہری دور شروع ہو چکا ہے۔

پانی

زمین ایک ایسا کرّہ ہے جو ایک مرطوب غلاف یعنی کرۂ آبی سے گھرا ہوا ہے۔ یہ کرہ بہت سے بڑے اور چھوٹے سمندروں اور پانی کے دوسرے ذخائر پر مشتمل ہے۔ یوں بھی زندگی کی پہلی نمود سمندروں میں ہوئی اور سمندروں ہی سے زندگی نے صورت اختیار کی۔ آج کرۂ زمین پر زندگی کا انتہائی پیچیدہ عمل بغیر تازہ پانی کے ممکن نہیں۔ صاف پانی کی ایک تھوڑی سی مقدار ایسی ہے جس کی ہر سال بخارات بننے اور بارش ہونے سے تجدید ہوتی رہتی ہے۔

تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار مکعب کیلومیٹر پانی بارش کی صورت میں دنیا کے برّاعظموں کو مہیا ہوتا ہے۔ پانی کی یہ مقدار سطح زمین پر موجود پانی کا صرف ایک فیصد اور زیر زمین پانی کا ۰،۱ فیصد ہے۔ یہ پانی کرۂ ارض پر ہماری زندگی کا لازمی عنصر ہے۔ یہ زمین کی مٹی میں وہ نمی پیدا کرتا ہے جس کے بغیر زراعت ممکن نہیں۔ اس نمی کے سبب جنگلات محفوظ رہتے ہیں اور پھیلتے ہیں۔ یہ پانی زیر زمین ذخائر کی تکمیل کرتا ہے جن سے دنیا کی آبادی کے تقریباً پانچویں حصے کو پینے کا پانی دستیاب ہوتا ہے۔

بارش کے پانی کا تقریباً چالیس فیصد جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں میں حیاتیاتی توازن برقرار رکھتا ہے۔ یہ پانی دریاؤں اور سمندروں میں رہنے والی مختلف مچھلیوں مثلاً اسٹرجن، سالمن اور ایل وغیرہ کے حیاتیاتی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ خلیجوں، دریاؤں اور دلدلوں کا پانی ایسے جانوروں کی زندگی کا سبب بنتا ہے جو نوع انسانی کے لیے ضروری ہیں۔

دریاؤں میں بہنے والا تقریباً ۵۰۰۰ مکعب کیلومیٹر پانی کرہ ارض کے تازہ پانی کا تقریباً ۱۵، حصہ ہے۔ لیکن جغرافیائی اعتبار سے اس پانی کی تقسیم غیر مساوی ہے۔ اس پانی کا بیشتر حصہ شمالی علاقے تک محدود ہے جب کہ گرم ترین براعظمی علاقوں میں یا تو دریا موجود ہی نہیں اور اگر ہیں بھی تو بہت کم۔

دنیا میں انسانی تہذیب کا ارتقاء آبادی اور پیداوار میں اضافہ سب کچھ پانی ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ پیداوار کے نظاموں میں قدیم زرعی دور سے جدید ترین الیکٹرانک دور تک ہر دور کا ارتقاء پانی کا مرہون منت ہے۔ ہر چند پچھلی صدیوں سے پانی کو صاف کرنے کے بہت سے طریقے دریافت کیے گئے ہیں اور ان پر کامیابی سے عمل درآمد بھی ہوا ہے لیکن اس کے باوجود دنیا میں دریاؤں کے پانی کے استعمال کی مقدار مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۲۰ ویں صدی کے آغاز سے پانی کے استعمال میں تقریباً سات گنا اضافہ ہوا ہے اور آج بھی اس کی مقدار تقریباً ۳۰۰۰ مکعب کیلومیٹر سالانہ ہے اور آئندہ بیس تیس سال میں پانی کی ضرورت میں ۵۰ فیصد تک اضافے کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

جن علاقوں میں دریا سے فراہم ہونے والے پانی کی قلت ہے وہاں بہت جلد علاقے کی اقتصادی ضروریات کے تحت پانی کے جملہ وسائل صرف ہو جائیں گے۔ ان علاقوں میں دریائے نیل، دجلہ، کولوراڈو، سیر دریا اور آمو دریاؤں کی وادیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ آسٹریلیا اور بھارت کے کئی دریاؤں اور میکسیکو اور افریقہ کے دریاؤں کو

بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان علاقوں میں پینے کے پانی اور زرعی ضروریات کے پانی کی فراہمی کا مسئلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے

دنیا کے مختلف براعظموں میں دریاؤں کے پانی کی غیر مساویانہ تقسیم نے پانی کی فراہمی کے مسائل کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ پانی کی فراہمی کے سلسلے میں اوشینیا، جنوبی امریکہ، شمالی امریکہ میں کچھ اوپر ..... مکعب میٹر پانی سالانہ فی کس کے حساب سے استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ یورپ اور ایشیا میں یہ مقدار چند ہزار ہے۔ لیکن یہ فرق ان ملکوں میں اور بھی زیادہ ہے جہاں فراہمی آب فی کس کے حساب سے چند سو مکعب میٹر ہی ہے۔ پانی کی اس قلت کی وجہ سے ایسے علاقوں میں پینے کا پانی فراہم کرنا یا صحت و صفائی کا انتظام کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسے علاقوں میں رہنے والوں کے لیے فراہمی آب کا مسئلہ دوسرے تمام مسائل سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور ان کی تمام تر توجہ اسی مسئلے کی طرف منعطف ہے۔

ان تمام دشواریوں کے باوجود اگر فراہمی آب کا قدرتی سلسلہ اسی طرح برقرار رہتا ہے تو پانی کے مسائل کو حل کرنے کی کوششیں کامیاب ہو سکتی ہیں لیکن بدقسمتی سے معاملہ ایسا نہیں ہے کیونکہ نوع انسانی کی معاشی جدوجہد اور طریقۂ کار پانی کے موجودہ میکانکی نظام پانی کی مقدار اور اس کی تازگی و صفائی دونوں پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سلفر کے مرکبات کو لیجیے۔ اگر ان کو فضا میں چھوڑا جائے تو ماحول میں تیزابیت کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے جاندار مخلوق پر خطرناک اثرات پڑتے ہیں اور نباتات کی پیداوار میں کمی آجاتی ہے۔ اسی طرح شہری علاقوں کی مسلسل توسیع سے پانی کے کیمیائی اجزاء میں فرق آجاتا ہے۔ بالخصوص بڑے صنعتی شہروں میں پانی میں میل بڑھتی جارہی ہے اور اس طرح انسانی عمل سے بہت سے دریاؤں کی وادیاں مسلسل متاثر ہو رہی ہیں۔

اس کے نتیجے میں موسم بہار اور برسات میں پانی نہیں چڑھتا جس سے زرعی رقبہ متاثر ہو کر برابر کم ہوتا جارہا ہے اور پانی میں نمک اور شورہ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ کئی دریا ختم

بند اور ذخائر بنائے گئے ہیں، ان سے دریاؤں کی روانی میں کمی ہوئی ہے، پانی کی کوالٹی میں فرق پڑ گیا ہے اور پانی کے اس تبادلے میں بھی کمی آگئی ہے جو زمین اور سمندر کے درمیان ہوتا رہتا ہے۔

جیسا کہ سائنسی جائزوں سے واضح ہوتا ہے کہ کرۂ ارض کے موسم میں تبدیلی آ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو براعظموں میں پانی اور حرارت کے توازن اور پانی کے ذخائر میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

پچھلے دنوں گھریلو ضروریات اور صنعتی امور کے لیے پانی فراہم کرنے کی مقدور بھر کوششیں کی گئی ہیں، سمندر کے پانی کا کھارا پن دور کرنے کے علاوہ بہت سے ایسے منصوبے بھی تشکیل دیے گئے جن سے برف کے تودوں کو انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکے اور پانی کو بڑے بڑے ٹینکروں میں ایسے علاقوں میں پہنچایا جاسکے، جہاں پانی کی قلت ہے۔

اس سلسلے میں جس قدر کامیابی ہوئی ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ اس مسئلے کا کچھ نہ کچھ حل نکل آئے گا لیکن علاقائی پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے بھرپور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے اور آخر کار یہ کوششیں آبادی اور صنعتوں کی جغرافیائی تقسیم کو متاثر کریں گی۔

ہم جس عہد میں ہیں وہ سائنسی ترقی کا عہد ہے اور ایسے عہد میں ہم اپنے مسائل کا اندازہ قبل از وقت کر سکتے ہیں اور علامات کا اندازہ کرنے کے بعد متوقع مسائل کے حل کی صورتیں بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے عہد کے تمام ماہرین سائنس کا یہ سب سے اہم فریضہ ہے کہ وہ پانی کی قلت کے منصوبے پر بھرپور توجہ دے کر اس کا کوئی حل دریافت کریں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ شمارہ ۵ (مئی ۱۹۸۹ء)

سائنس اور بقائے انسانی

عشرت حسین عثمانی

" خدا نے انسان کو مظاہر فطرت مثلاً سمندروں، دریاؤں، بحر اعظموں، ہوا، چاند، سورج کے ماورا پھیلے ہوئے خلا اور دن رات کو مسخر کرنے کی حیرت ناک صلاحیت بخشی ہے، تاکہ وہ اپنی جنت کا ثمر کھائے۔ "

(قرآن مجید)

میں یہ مقالہ ایک سائنس داں کی حیثیت سے نہیں بلکہ سائنس کے ایک حامی اور خادم کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں لیکن یہ حمایت اور یہ خدمت ایک ایسے ملک میں مشکل ہے جہاں سائنس کو مذہب کا مخالف سمجھا جاتا ہو اور جہاں کے سائنس داں بھی تعلیمی نظام میں ادبیات کو سائنس پر فوقیت کا مستحق گردانتے ہوں۔ ان حقائق کی بنا پر میں سائنس پر کچھ لکھنے سے قبل تین بنیادی سوالات کا جواب دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱۔ سائنس کیا ہے ؟

۲۔ سائنس کا فائدہ کیا ہے ؟

۳۔ ہمارے معاملات میں سائنس کو کیوں اہمیت دی جانی چاہیے۔

سائنس اور مذہب

سائنس اصل میں انسان کی روح میں سموئی ہوئی وہ متحرک قوت ہے جس سے اس کا تجسس بیدار ہوتا ہے اور وہ اسباب و عوامل کی تہہ کو پہنچ کر نیز اسرار فطرت کو بے نقاب کر کے صداقت کا متلاشی ہوتا ہے انسان کو اپنے تئیں، اپنے ماحول اور اپنے خالق کو پہچاننے میں مدد دیتی ہے۔ وہ خالق جس نے اتنی بڑی کائنات پیدا کی۔ جس نے انسان کی بساط کچھ بھی نہیں۔ سائنس روح انسانی کی معراج ہے جو کبھی اسے دنیا کی بلند ترین چوٹی پر لے جاتی ہے۔ کبھی عمیق ترین سمندر کی سیر کراتی ہے۔ کبھی ننھے جوہر کے مرکز سے متعارف کراتی اور کبھی خلائے ناپیدا کنار میں آوارہ و سرگرداں کرتی ہے۔ انسان ہر جگہ صداقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ اس قسم کی مہمات میں انسان نے قوانین قدرت ہی دریافت نہیں کیے بلکہ پوری نوع انسانی کی فلاح کی غرض سے مظاہر قدرت کو مسخر کرنے کے لیے اپنا حق بھی قایم کیا ہے۔ الغرض سائنس نے انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ تمام اختلافات و تفریقات سے بالا ہو کر حق و صداقت کا متلاشی ہو۔ مذہب کا منتہائے مقصود بھی یہی ہے کہ خدا کے بتلائے ہوئے راستے پر چل کر حق و صداقت کی تحصیل کی جائے۔ جب یہ صورت ہو تو دو عظیم قوتیں جنھیں ہم مذہب اور سائنس کے نام سے جانتے ہیں اور جو ذہن و روح انسانی کا جزو لاینفک ہیں، ایک دوسرے کی مخالف کیسے ہو سکتی ہیں؟ اس مسئلے کا حل ہمارے دور کے سب سے بڑے سائنس داں آئن اسٹائن نے اپنے الفاظ میں کیا خوب پیش کیا ہے،

" مذہب کی اساس اس عقیدے پر ہے کہ جہاں ہست و بود کا دارومدار معقول خیالات پر ہے

مذہب دلائل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ میرے
خیال میں کوئی شخص بھی اس عقیدے کے بغیر اصلی
سائنس داں نہیں بن سکتا۔ ہم مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ
سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہوتی ہے اور مذہب
سائنس کے بغیر اندھا۔"

پاکستان میں تقریباً ہر پلیٹ فارم سے مذہب کی آواز ہمارے
کان تک پہنچائی جاتی ہے لیکن کیسے افسوس کا مقام ہے کہ اسی ملک
میں سائنس کی آواز اس قدر نحیف اور ہمارے ذہن میں اس کا عکس
اس قدر دھندلا ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ میں مذہب کے تمام واعظوں
اور ان تمام سیاسی جماعتوں سے جو مسلمان اور اسلام کے نام پر اہلِ
پاکستان سے رابطہ قائم کرتی ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ ساتھ ساتھ
سائنس کی ترویج و ترقی پر بھی توجہ دیں اور قومی مسائل کا حل تلاش کرتے
وقت جذباتی رجحانات کے بجائے سائنسی لائحہ عمل اختیار کریں۔ مسائل
باتوں کے بجائے سائنسی ترقی سے حل ہو سکتے ہیں۔ انھیں اپنے مواعظ اور
پند و نصائح کے ذریعے عوام کو سمجھانا چاہیے کہ اسلامی معاشرہ سائنس
کو نظر انداز کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ صرف مذہب ہماری نجات کا
ذریعہ نہیں بن سکتا۔

سائنس اور ادبیات

یہ تو تھا سائنس اور مذہب کا معاملہ۔ اب میں ایک اور اختلاف
کا ذکر کرتا ہوں جو ہماری زندگی میں سائنس اور ادبیات کے ظاہری تصادم
کی وجہ سے آیا ہے۔ یہ تعصب ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے، جنھیں میں
"پڑھے لکھے جاہل" کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔ گئے گزرے زمانے کی
بات اور تھی، جب ہمارے آبا و اجداد کی زندگی پر سائنس کسی قسم کا کوئی
اثر مرتب نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے ان کی تمام تر توجہ فنونِ لطیفہ اور ادبیات
ہی پر مرکوز رہی۔ لیکن بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں زندگی گزارتے
ہوئے کسی شخص کو معلوم نہ ہو کہ ایک ٹن وزنی دانے سے تاریکی پر روشنی
کیوں غالب آجاتی ہے۔ سائیکل ہی کو گھماتے ہی ہمارے کان ہزاروں
میل دور نشر ہونے والی موسیقی سے کیسے لطف اندوز ہونے لگتے
ہیں۔ ہوائی جہاز کشش ثقل کو مات دے کر کس طرح فضا کا سینہ
چیرتا آگے بڑھتا ہے۔ بیج مٹی میں پھوٹ کر کس طرح پودا بن جاتا
ہے یا خود ہماری زندگی منزل بہ منزل آگے بڑھتی ہے۔ وہ شخص
میرے نزدیک قابلِ معافی نہیں۔ میں یہاں یہ بتا دینا ضروری
سمجھتا ہوں کہ سائنس صرف کل پرزوں اور مشینوں کا نام نہیں
ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بلند اور پاکیزہ شے ہے جو مادے
اور حیات کے حسن اور ترتیب کو اجاگر کرتی ہے۔

بعض ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس کوئی غیر دلچسپ اور
روحانیت سے عاری نوع علم ہے، حقیقت میں ایسا نہیں۔ دیدہ بینا
کے لیے سائنس میں بھی فنی حسن کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ سائنس داں
بھی کسی شاعر یا مصور کی طرح فطرت کے تمام پہلو اجاگر کرتا ہے۔
اس میں بھی وہی تجسس اور خیالات کی پرواز موجود ہوتی ہے، لیکن
یک گونہ تنظیم کے ساتھ۔ وہ فن کار اور ادیب کا ہیولا اپنے اندر
سمو کر روح کے تار چھیڑتا ہے۔ ہمارے کانوں کو پیانو، بانسری یا
وائلن کے سُر اس لیے بھلے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے پس پشت جو
ترتیب کارفرما ہے وہ ماہرِ طبیعیات کی ودیعت کردہ ہے۔ جو رنگوں
سے کسی تصویر کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے، وہ ایک کیمیا داں کی برسوں
کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہیں۔ نور اور آواز کے جس طلسم نے دنیا
کے کروڑوں انسانوں کو ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے مسحور کر رکھا
ہے وہ سائنس کا عطا کردہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر
ناگل کے بقول، "اگر ادیب یا ماہرِ انسانیات بننے کے لیے حیاتِ
انسانی کے تمام پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے تو ارتقاے
سائنس کی واقفیت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی تعلیم مکمل
نہیں کہلائی جا سکتی ہے۔"

سائنس اور ٹکنالوجی

اب میں دوسرے سوال کا جواب دیتا ہوں، سائنس
کا کیا فائدہ ہے؟ قوانینِ قدرت معلوم کرنے کے لیے یہ تاریخ
ہے کہ اب تک تمام مفکروں اور فلسفیوں نے اپنے اپنے انداز
سے ہمدردی کی کوشش کی ہے لیکن جب نظریات کو تجربے کی
کسوٹی پر کسا جانے لگا اور مستند [illegible] کا اطلاق

تلاش کیا گیا تو ہم "ٹکنالوجی" سے متعارف ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ چین، برِاعظم پاک و ہند، روم اور مصر کی قدیم تہذیبوں میں زراعت آب پاشی اور فنِ تعمیر جیسے بعض شعبوں میں فنی کمال حاصل کر لیا گیا تھا۔ دیوارِ چین، موہنجوداڑو کا شہر، روم کا کولوسیم اور اہرامِ مصر قدیم فنِ تعمیر کے جیتے جاگتے نمونے ہیں لیکن یہ تہذیبیں ختم ہو گئیں۔ کیونکہ ان کی بنیاد سائنسی نہیں تھی۔ پھر عربوں نے سائنس کی درس و تدریس کی طرف توجہ دی اور نظریات کے ساتھ ساتھ تجرباتی سائنس نے ارتقا کی منازل طے کرنی شروع کیں۔ اب سائنسی مسائل حل کرنے کے لیے تجربات کیے جانے لگے۔

آٹھویں اور گیارھویں صدیوں کے دوران مسلمانوں نے اپنے تئیں مطالعۂ فطرت میں جذب کر دیا۔ انھوں نے ارسطو کے نظریۂ سائنس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، جس کی اساس خالص استقرائی منطق پر تھی۔ ریاضیات میں الخوارزمی نے الجبرا دریافت کیا اور ٹرگنومیٹری کی جدولیں تیار کیں۔ صفر سے ۹ تک کے ہندسے جو نظامِ اعشاریہ کی بنیاد ہیں اور آج کے جدید کمپیوٹر بھی انھی کی مدد سے کام کرتے ہیں۔۔۔ اگرچہ اہلِ ہند کی دریافت ہیں، لیکن الکندی اور اس کے پیروؤں نے انھیں اس کثرت سے استعمال کیا کہ وہ عربی ہندسے کہلانے لگے۔

عرب ماہرینِ طبیعیات وقت ناپنے کے لیے پنڈولم اور درجۂ حرارت معلوم کرنے کے لیے تھرمامیٹر کا استعمال جانتے تھے۔ فلکیات میں البطانی، ابوالوفا اور محمد بن موسیٰ نے ایسی راہیں نکالیں کہ کوپرنیکس اور نیوٹن نے ان پر چل کر نئے جہان پیدا کیے۔ اس میں کیا شک ہے کہ آج کی تمام ترطبی ترقی اس عظیم اور اچھوتے طبیب کی مرہونِ منت ہے، جسے دنیا الرازی کے نام سے جانتی ہے اور جس نے طب کی بنیاد استوار کی۔ ترقی کی یہ رفتاریں یوں ہی جاری رہ سکتی تھیں لیکن مذہبی تعصب، عدمِ مفاہمت اور تقلید پسندی کے غلط رجحانات نے مسلمانوں کا یہ زریں عہد ختم کر دیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور [illegible] نیز ٹکنالوجی کا ارتقا سراسر ان کی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ [illegible] سے چند خوشہ چینے۔ احیائے علوم کی

تحریک سے اب تک وہاں سائنس اور ٹکنالوجی نے غیر معمولی ترقی کی ہے جس کا ظہور مشرقِ بعید میں جاپان سے لے کر مغرب میں شمالی امریکہ تک نظر آتا ہے۔ رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب "دی میکنگ آف ہیومینٹی" میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ یورپین زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اسلامی ثقافت اثر انداز نہ ہوئی ہو لیکن یہ اثر جدید عالم کی اس عظیم قوت میں سب سے زیادہ جلوہ گر نظر آتا ہے، جسے ہم نیچرل سائنس کہتے ہیں۔"

مسلمانوں کے زریں دور کی طرح یورپ میں بھی سائنس فرمانرواؤں کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ تین سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ شاہِ انگلستان نے سائنس کی اہمیت جانی، پہچانی اور رائل سوسائٹی قائم کی۔ اس مقصد کے لیے ایک چارٹر جاری کیا گیا، جس نے سائنسدانوں کو اپنے اپنے شعبے میں تحقیقات کرنے کی پوری آزادی بخش دی۔ جیسے جیسے انسان کی واقفیت اور قوانینِ قدرت کی دانست میں اضافہ ہوا، سائنس رفتہ رفتہ ٹکنالوجی کی شکل اختیار کر گئی حتیٰ کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب آ گیا جس میں انگلستان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اس انقلاب نے مغرب کی صرف اقتصادیات ہی کی کایا پلٹ نہیں کی بلکہ تاریخ کا دھارا بدل ڈالا۔ لڑائیوں میں ہار جیت کا انحصار فوجوں اور سپاہیوں کی تعداد پر نہ رہا۔ بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی پر قرار پایا۔ صرف وہی ملک فاتح اور ظفریاب کہلائے جنھوں نے ٹکنالوجی اور سائنس میں ترقی کی اور اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے یورپین قوتوں کو بہتر سے بہتر اسلحہ دیا، جس کے سامنے ایشیا اور افریقہ کی قدیم سلطنتیں بے بس ہو گئیں۔ ان سلطنتوں کے نشان رفتہ رفتہ مٹتے چلے گئے۔ اہلِ یورپ نے بر اعظم اور زر و سیم کے نئے وسائل و ذرائع دریافت کیے۔ سائنس کا [illegible] عام ہوا تو غربت، بیماری اور بھوک کا قلع قمع ہونے لگا۔ تمام ممالک خواہ وہ بڑے تھے یا چھوٹے، خواہ ان کی آبادی کم تھی یا زیادہ، ان کے وسائل محدود تھے یا لامحدود۔۔۔ [illegible]

لگا اور ایسے معاشروں کی داغ بیل پڑی جو درجہ بندی کی لعنت سے پاک تھے۔ اکثریت پر اقلیت کا ظلم رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ تحریر و تقریر اور تخیل کی آزادی نے جمہوریت کو فروغ دیا اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں نمائندہ حکومتیں بننے لگیں۔

سائنس اور ترقی

صنعتی انقلاب کا سیلاب ایسی تندی و تیزی سے آگے بڑھا کہ جتنی سائنس اور ٹکنالوجی سے ہم اس وقت واقف ہیں، اس کا نوّے فیصد حصہ موجودہ صدی کے ساٹھ سال پر محیط ہے۔ سائنس نے ہمیں وہ دانش اور وہ آلات عطا کیے ہیں کہ ہم ان سے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے غذائیں تلاش کر سکتے ہیں۔ ہم دریاؤں کا رُخ موڑ سکتے ہیں اور ریگستانوں کو مسکراتے ہوئے نخلستانوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وبائی بیماریوں اور تکلیف دہ جراثیم اور کیڑے مکوڑوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ہمارے پاس نہایت موثر دوائیں اور کیمیائی اشیاء موجود ہیں۔

نہ صرف یہ بلکہ صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے قوت حاصل کرنے کی غرض سے ہم جوہری توانائی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہی توانائی ہمارے راکٹوں کو مائل پرواز کر کے ہمیں خلاء ناپید اکنار کی سیر بھی کرا سکتی ہے اور ہمیں دوسرے جہانوں پر اتار سکتی ہے۔ ہم ایک سکنڈ سے بھی کم وقفے میں سیکڑوں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت ہم چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز تیار کر سکتے ہیں۔ خواہ وہ ایک قلم ہو یا موٹر کار، چولہا ہو یا ریفریجریٹر، پلاسٹک کا پیالہ ہو یا نائیلون کے دل کش ملبوسات۔

چونکہ سائنس کے قوانین دنیا میں ایک ہی ہیں، اس لیے سائنس اور ٹکنالوجی پر کسی ایک ملک یا قوم کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جا سکتی مغرب میں یورپ، کناڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنے عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی سے خاطر خواہ مدد لی ہے۔ یہی صورت شمال میں روس اور جنوب میں آسٹریلیا میں ہے بلکہ مشرق میں صرف جاپان کو یہ شرف حاصل ہوا۔ کوئی وجہ نہیں کہ چین، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، افریقہ نیز لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ممالک ایسا نہ کر سکیں۔ چین نے جس طرح ترقی کی ہے، وہ محتاج تعارف نہیں۔ دوسرے ممالک بھی اس کی تقلید کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان ملکوں کو اپنی بقا منظور ہے تو ابھی خواب غفلت سے بیدار ہونا پڑے گا اور عالمی تغیر کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

کچھ عرصہ ہوا اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ دنیا کے کم ترقی یافتہ ملکوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کو کیسے استعمال کیا جائے اس کانفرنس میں مختلف ملکوں کے ممتاز سائنس داں، منتظمین، ماہرین اقتصادیات اور صنعت کار شریک ہوئے۔ بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد تمام شرکاء اس امر پر متفق ہوئے کہ سائنس کا اطلاق کم ترقی یافتہ ملکوں کے نہ صرف بس میں ہے، بلکہ وہ جدید ذرائع سے خوش حالی حاصل کرنے کے لیے مختصر راہ استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر کم ترقی یافتہ ملکوں کی حکومتیں سائنس کے استعمال پر زور دیں اور اسے اپنے پروگراموں میں اولیت بخشیں تو انہیں خرام روی سے نجات مل جائے گی اور وہ ایک ہی جست میں جدید دور میں داخل ہو جائیں گے۔

یہ لوگ چاہیں تو عام والو کی جگہ ٹرانزسسٹر اور زراعت کے دقیانوسی طریقوں کے بجائے بیجوں کو گاما شعاعوں کے ذریعے بہتر اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اپنی قدیم تہذیبوں کا عرصہ معلوم کرنے کے لیے اب انہیں شمسی نقوش پر بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ کاربن کے جدید طریقے سے مدد لے کر آثار قدیمہ کی عمر دریافت کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی ملک ایسا ہے کہ وہاں سڑکیں بنانا مشکل ہے تو ہوائی جہاز ذریعہ حمل و نقل بن سکتا ہے۔ اگر سیکڑوں میل تک تاروں کا جال نہیں بچھایا جا سکتا تو ٹیلی فون کے بجائے وائرلیس استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئلہ اور تیل جیسے روایتی ایندھن پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے تو جوہری توانائی سے مدد لی جا سکتی ہے۔

ترقی کے عبوری دور میں ان ملکوں کو قدیم و جدید دونوں طرح کے ذرائع سے مدد لینی پڑے گی۔ یعنی ایک ہی وقت میں ان کے یہاں بیل گاڑی بھی ہوگی اور ہوائی جہاز بھی! ایک ہی گاؤں میں ٹیوب ویل بھی ہوگا اور رہٹ بھی۔ گوبر گیس سے چلنے والا جنریٹر بھی ہوگا اور

لنٹی پلانٹ بھی اور ایک ہی زمین پر اپلوں کی کھاد بھی ڈالی جائے اور کیمیائی کھاد بھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک کو اپنے محدود ذرائع اور وسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے منصوبہ بندی کرنی پڑے گی اور مختلف پروگراموں کو ان کی اہمیت کے مطابق اولیت اور فوقیت دینی ہوگی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنیوا میں جس سائنس اور ٹکنالوجی کا ذکر ہوا، کیا ترقی پذیر ممالک اپنے داخلی مسائل کے باوجود اس سے مستفید ہو سکتے ہیں اور کیا وہ ایک معقول عرصے میں ایسا معیار زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، جو دنیا کی دو تہائی آبادی سے زیادہ ہیں، اس سوال سے براہ راست واسطہ رکھتے ہیں۔ ان ملکوں میں سالانہ آمدنی کا فی کس اوسط ۱۰۰ ڈالر سے بھی کم ہے۔ جب کہ شمالی امریکہ میں یہی اوسط ۲۰۰۰ ڈالر ہے۔ قحط، بیماری اور افلاس کا خنجر ان اول الذکر ممالک میں پیوست ہے۔ لہذا یہ کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ آج جب کہ فاصلوں نے اپنا مفہوم کھو دیا ہے اور زمان و مکان کی وسعتیں سمٹتی جا رہی ہیں، تمام ممالک ایک مختصر سی دنیا میں مرکوز ہو کر رہ گئے ہیں۔ دنیا بھر کی دولت صرف ایک تہائی حصۂ ارض کے ہاتھ میں ہے اور باقی دو تہائی حصہ افلاس کے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان میں پھیلے ہوئے حالات کے متعلق ڈیسرائیلی نے لکھا تھا۔ "

" دو طبقے ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔۔۔ ایک
وہ جو دولت میں کھیلتا ہے اور دوسرا وہ جو بے انتہا
غریب ہے۔"

آج ساری دنیا میں یہی حالات موجود ہیں۔ لہذا انہیں ایک عالمی مسئلے کی طرح سنبھالنا ہوگا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دنیا بھر کے مالی، مادی اور انسانی وسائل سے کام لینا ہوگا۔ سب مل کر ہی دنیا سے ناداری، بیماری اور قحط دور کر سکتے ہیں۔ آیئے سب سے پہلے مالی وسائل پر غور کریں جو اس بین الاقوامی سعی کے لیے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مرتب کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت دنیا کے ممالک ہر سال ۱۲۰ ارب ڈالر اسلحہ کی خرید پر صرف کرتے ہیں۔ یہ رقم تمام کم ترقی یافتہ ملکوں کی قومی آمدنی کے دو تہائی حصے کے برابر ہے۔ گزشتہ دس سال کے عرصے میں اسلحہ پر جتنی رقم خرچ کی گئی اتنی رقم پچھلے تین سو سال میں بھی تعلیم پر صرف نہیں کی گئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس فضول خرچی میں دنیا کے صرف سات ممالک ۸۵ فی صد تک ذمہ دار ہیں۔ یعنی کینیڈا، مغربی جرمنی، فرانس، چین، روس، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ اگر یہ غیر معمولی رقم اگلے دس سال کے دوران ترقی پذیر ممالک کی طرف بڑھا دی جائے تو ان کی فی کس آمدنی تین گنی ہو جائے اور افلاس کا یہ سلسلہ جو ہم اپنے گرد و پیش بڑھتا دیکھ رہے ہیں، مستقبل کے تاریخ دانوں کے لیے پیچھے رہ جائے۔

انسان نے تخریب کے کیا کیا ذرائع ایجاد کیے ہیں اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ میزائل اور ان کے ایٹمی ہتھیار ایک بٹن دباتے ہی چند منٹ کے اندر ساری دنیا کو ایک عظیم جہنم میں تبدیل کر دیں گے اور کوئی نہ ہوگا جو اس تماشے کو دیکھ سکے۔ الغرض دنیا کی متمول اقوام اپنے وسائل انسانیت کو تباہ کرنے کے لیے خرچ کرنے کو تو تیار رہتی ہیں لیکن اسے افلاس و ناداری کے قعر سے نکالنے کو آمادہ نظر نہیں آتیں۔ وہ ٹیکس ادا کرنے والے کی خون پسینے کی کمائی بغیر کسی حجت کے نصف گھنٹے کی دیوانگی پر تو صرف کر دیں گی لیکن خوشحالی کی ایک پوری صدی پر نہیں۔ وہ صرف اپنے وقار کی خاطر انسان کو چاند پر اتارنے کی دوڑ جیتنے کے لیے پورے تیس ارب ڈالر صرف کرنے کو تیار ہیں لیکن اس کا عشر عشیر بھی بیرونی امداد کے طور پر خرچ کرنا ہو تو اس پر بحث و مباحثہ شروع ہو جاتا ہے

جب تک ابھرتی اقوام کے دماغ اس فرق کو نہ سمجھیں گے اور انسان کے متعلق ان کی اخلاقی اقدار میں بہتری کے آثار پیدا نہیں ہوں گے، اس وقت تک اسلحہ کی دوڑ ختم نہیں ہوگی۔ ہمارے جیسے ممالک فنی امداد کے عوض ان اقوام کو روحانی درس دے سکتے ہیں مجھے اس میں کوئی شبہ نظر نہیں آتا کہ جیسے جیسے ہماری تہذیب میں روحانیت کے ساتھ ساتھ مادیت کا عنصر شامل ہوتا جائے گا اور دنیا کی اقوام کے مابین مفاہمت بڑھتی جائے گی۔ ایک پوری صدی تو

گزری ہے کہ ان ترقی یافتہ اقوام کے افراد ذاتی جھگڑا طے کرنے کے لیے ڈوئل لڑتے تھے۔ کیا اب ہم اس حماقت پر ہنستے نہیں ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پوتے پڑپوتے موجودہ رہبروں پر نہیں ہنسیں گے جو صرف یہ طے کرنے کے لیے کہ زندگی گزارنے کے واسطے یہ نظام بہتر ہے یا وہ ۔ ۔ ۔ ۔ کروڑوں ڈالر محض اسلحہ خریدنے پر صرف کر رہے ہیں کون نہیں جانتا کہ بات چیت سے کسی بھی قسم کے مسائل طے کرنا میدان جنگ میں لڑنے اور ایٹمی راکٹ استعمال کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان اور ارزاں طریقہ ہے۔ ممکن ہے آنے والی نسلیں باہمی اختلافات طے کرنے کے لیے اس سے بھی بہتر کوئی طریقہ تلاش کر لیں۔ امن و ترقی عالم کا دار و مدار اسی امید پر ہے۔

جب تک اسلحہ کی دوڑ ختم نہ ہو اس وقت تک متمول اقوام کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا انہیں چپ چاپ ہماری غربت کا تماشا دیکھنا چاہیے یا انسانیت کی لاج رکھنے کے لیے اسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ اگر دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک اپنی قومی آمدنی کا دس فیصد حصہ بچا کر نفع بخش منصوبوں میں لگائیں تو اس میں ہر سال ۲ فیصد کا اضافہ ہو سکتا ہے لیکن آبادی تو ہر سال ۲ فیصد سے بھی زیادہ شرح کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں ان غریبوں کو فی کس آمدنی کا اوسط ۱۰۰ ڈالر سے بھی کم ہے ... ۲ ڈالر تک لے جانے میں کتنا عرصہ لگے گا؟

ایک اور اقتصادی پہلو بھی قابل غور ہے۔ کم ترقی یافتہ ملکوں کی اکثریت خام مال پیدا کرتی ہے جسے برآمد کر کے زرمبادلہ کماتی ہے۔ بدقسمتی سے اس مال کی قیمت میں غیر معمولی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اگر ۲ فیصد کی بھی کمی واقع ہو جائے تو متعلقہ ملک کے کمائے ہوئے زرمبادلہ میں اتنا خسارہ آ جائے گا کہ بیرونی امداد یا قرضوں کا نصف حصہ بمشکل تمام اس کی تلافی کر سکے گا۔ اس کا تقابل اس رقم سے کیجیے جو متمول اقوام اسلحہ کے بھاری سودوں کے باوجود غریب اقوام کے لیے بچا سکتی ہیں۔ اگر مشرق و مغرب مل کر اپنی قومی آمدنی کے ایک فیصد حصے سے کچھ زیادہ رقم یکجا کریں تو ہر سال ۵ ارب ڈالر کا ایک فنڈ تعمیر ہو سکتا ہے جسے دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک میں لگایا جا سکتا ہے۔ یہ رقم ان مشینوں اور ساز و سامان کی قیمت کی دوگنی ہے جو دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک درآمد کرتے ہیں۔ اگر اتنی رقم ہر سال ان ملکوں میں لگتی رہے تو کہیں پچاس سال میں ان کی فی کس آمدنی اتنی ہو گی جتنی آج کے صنعتی ممالک کے باشندوں کے حصے میں آئی ہے اگر اسلحہ کی دوڑ ختم ہو جائے تو یہ عرصہ مزید کم ہو سکتا ہے اور ایک ہی صدی ہی میں دنیا کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک کا انسان احتیاج سے بے نیاز ہو جائے۔ کیا ہم دیوانگی ترک کر کے بین الاقوامی تعاون سے اس دنیا کو جو آج جہنم بنی ہوئی ہے، جنت نہیں بنا سکتے ہیں؟ کیا متمول اقوام دوسروں کی امداد کو اٹھیں گی یا اپنی مجرمانہ ذہنیت کے بوجھ تلے دبی رہیں گی اور یوں ہی مر جائیں گی۔ انھیں ٹھنڈے دل سے ان حقائق پر غور کرنا چاہیے اور اپنی پارلیمنٹ یا کانگریس میں اس تھوڑی سی رقم پر بحث نہیں کرنی چاہیے جو ایک شریفانہ مقصد کے لیے خرچ کرتی ہیں۔ یعنی سطح ارض سے افلاس، بھوک اور بیماری کا مٹانا سائنس اور ٹکنالوجی ہماری دسترس میں ہیں۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم انہیں تعمیر کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں یا تخریب کے لیے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود گھر کی صفائی فرما لیتے، اونٹ کو باندھ لیتے اور اپنے جانور کو چارہ بھی دیتے۔ اپنے خدمت گار کے ساتھ کھانا تناول فرماتے اور آٹا گوندھتے میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور بازار سے سودا بھی لے آتے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۵ (مئی ۸۹ء)

قومی پسماندگی اور اخلاقی کمزوری

سید ضیاء احمد رضوی *

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا ملک قومی پسماندگی کے لحاظ سے بہت بدنصیب ہے۔ ہمیں اپنی ان کوتاہیوں کا بھی شدید احساس ہے کہ حصول آزادی کے بعد بھی ہم وطنِ عزیز کی حسین پیشانی سے اس بدنما داغ کو نہیں مٹا سکے۔

قومیں کن حالات میں آگے بڑھتی ہیں اور کس ماحول کے سہارے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے ذمہ دار مصلحین نے دیانت داری کے ساتھ اپنا فرض نہیں نبھایا ورنہ آج صورت حال کچھ اور ہوتی۔ یہاں میرا مقصد کسی کی کوششوں کو جھٹلانا یا حکومت کے مجوزہ پروگراموں اور پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنا نہیں ہے بلکہ میں تو قوم کی قسمت بدلنے کا مقدس عزم رکھنے والوں کی کامیابی کے لیے دست بدعا ہوں کہ خدا انہیں فکر و نظر کی صداقت اور سچے عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری قومی پسماندگی میں مفید اور اعلیٰ تعلیم کا فقدان، معاشی وسائل کی کمی، سستی اور گندی سیاست، روایت پرستی اور تعصبانہ ذہنیت کو بڑا دخل حاصل ہے۔

آزادی سے قبل ہمارا خیال تھا کہ آزادی ملتے ہی ہندوستان "فردوس بر روے زمین" بن جائے گا لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی خوش گوار تبدیلی نہ ہوئی۔ انسانی زندگی کی تین شدید ضرورتیں یعنی روٹی، کپڑا اور مکان آج بھی ہماری قومی گتھیاں بنی ہوئی ہیں جن کو سلجھائے بغیر ہم قومی پسماندگی کو دور نہیں کر سکتے۔

کیا یہ صحیح ہے کہ ہماری تکالیف اور پریشانیوں کی افزائش کی تمام تر ذمہ داری حکومت کے سر ہے؟ کیا روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی، رشوت خوری، بے ایمانی اور ملاوٹ جیسی برائیوں میں عوام کا ہاتھ نہیں؟ یہ اجناس خوردنی چھپانے والے، روز بروز مہنگائی بڑھانے والے۔ ایک دوسرے کا گلا گھونٹ کر اپنی جیب گرم کرنے والے ہم اور آپ نہیں تو پھر کون ہے۔ حکومت ہمارے ہر فعل و قول میں دخل اندازی کرنے سے تو قاصر ہے اور جب تک افراد خود سنبھلنے کی کوشش نہ کریں، انہیں کوئی نہیں سنبھال سکتا۔

ہمارا ماحول بھائی چارے اور آپسی میل و محبت کے بجائے گھٹیا درجے کی سیاست خود غرضی اور لالچ سے بھرا ہوا ہے۔ جہاں تک ہمارے ذہنوں کا تعلق ہے، سوائے اپنے ذاتی مفاد کے قومی و سماجی سطح پر ہم کچھ سوچ بھی نہیں سکتے یا سوچنا نہیں چاہتے ہم میں جب تک خود غرضی، لالچ، بغض و حسد جیسے مہلک جراثیم موجود ہوں گے۔ اس وقت تک ہم قومی، معاشی، اخلاقی، سیاسی سماجی اور تعلیمی پسماندگی کے اندھیرے غار میں پڑے سسکتے رہیں گے۔

---

* ریسرچ اسکالر، شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یہ جھوٹ، فریب، دھوکا دہی، رشوت ستانی، کالا بازاری اور فرقہ پرستی کے کالے ناگ جو ہمارے دل و دماغ پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور جن کی وجہ سے نہ ہم میں جذبۂ رحم دلی ہے اور نہ انسانیت اور نہ ہی ہم ان برائیوں سے ہٹ کر سوچ سکتے ہیں۔ ان سے نجات اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ہم متحد ہو کر قومی سطح پران کا سدّباب نہیں کرتے۔ اس کا ایک اور بس ایک ہی واحد علاج ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے اور سوسائٹیاں اور تنظیمیں اور خود افراد بھی اخلاقی بلندی اور قومی و سماجی یکجہتی کی طرف توجہ دیں۔

اس سلسلے میں ہماری تعلیم اور تعلیمی ادارے بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ قومی پسماندگی سے نجات صرف جدید علوم اور معاشی استحکام حاصل کر کے نہیں بلکہ ایمان و اخلاق کی روشنی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا یہ ہمارے اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں میں مختلف علوم کی تدریس و تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں میں اخلاقی بلندی کی تربیت کو اپنے تدریسی پروگرام کا لازمی جزو قرار دیں تاکہ ہمارے طلبا جدید علوم کی روشنی کے ساتھ ساتھ ایمان و اخلاق کی روشنی سے منور ہو کر قومی پسماندگی کو دور کرنے میں اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ کیونکہ اخلاقی بلندی ہماری قومی یکجہتی کی بنیاد ہے۔ جس میں اخلاق ہوگا وہ اپنے آپ کو ایک اچھا انسان اور ایک اچھا شہری کہنے کا مستحق ہے۔

لہٰذا ہم خود بھی نجی طور پر اپنے خاندان میں، اپنے رشتہ داروں میں اپنے دوستوں میں اخلاقی بلندی کا پرچار کر سکتے ہیں اور اس طرح مستقبل میں ہم سب مل کر ایک دل، ایک آواز، ایک مقصد ہو کر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہوں گے اور وہ منزل ہماری اور آپ کی ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی کی منزل ہوگی اور تب ہم فخر سے کہہ سکیں گے کہ

"ہندوستان فردوس بر روے زمیں است!"

"اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں۔"

سر سید احمد خاںؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸، شمارہ ۵ (مئی ۸۹ء)

کیریر پلاننگ اور ترقی نسواں

مصدق جہاں*

کیریر پلاننگ سینٹر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام ترقی پذیر ممالک میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے جو اس سینٹر کے موجودہ ڈائرکٹر پروفیسر سلطان اختر صاحب کی کوششوں سے مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں ۱۹۸۴ء میں قایم ہوا۔

اس قسم کے سینٹر کے قیام کی ضرورت یہ عام مشاہدہ ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام ملک کی اور طلبا و طالبات کی امیدوں کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہے جس کا اظہار اکثر و بیشتر نظم و نسق کے معاملے میں اور امتحان میں طلبا کی معیار سے گری ہوئی کارکردگی سے ہوتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی وجہ سے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بیروزگاری کا مسئلہ برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

ان مسایل کی وجوہات یوں تو بے شمار ہیں لیکن ان میں سے چند اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ موجودہ نظام تعلیم میں ایک خرابی یہ ہے کہ مضامین کے انتخاب کے وقت کسی طالب علم کی ذاتی صلاحیتوں، دلچسپیوں اور ذہانت کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

۲۔ ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے طلبا کو اسکول اور کالج میں کس طرح کے مضامین لینے چاہیں یا ان کو کس طرح کے ہنر اور تجربے حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی خبر نہ تو تعلیمی اداروں کو ہوتی ہے اور نہ والدین اور طلبا کو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے لوگ بغیر سوچے سمجھے غلط سمتوں میں کوششیں کرتے رہتے ہیں اور انھیں اکثر ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ نجی کاروبار (Self Employment) کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی اور تعلیم یافتہ لوگ جب روزگاری کا شکار ہوتے ہیں، سرکار کے پروگراموں اور اسکیموں سے غافل رہتے ہیں۔

نتیجتاً لوگوں کے ذہن میں صرف یہ بات مرکوز ہو کر رہ گئی ہے کہ ملازمت حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ ڈگریاں حاصل کی جائیں یا سفارش اور رشوت کا سہارا لیا جائے۔ یہ نظریات کسی بھی قوم کے لیے نہایت مہلک ہیں۔ ڈگریاں حاصل کرنے کے علاوہ یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ طلبا کو ملازمتوں سے متعلق معلومات حاصل ہوں اور تعلیمی ادارے اس بات کی سہولت مہیا کریں کہ ان کو ملازمت سے متعلق جانکاری کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا موقع ملے۔

جہاں تک عورتوں کے مسایل کا تعلق ہے وہ نہایت پیچیدہ اور پریشان کن ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کے تعلق سے مسایل سامنے آتے رہتے ہیں۔ چند روز تک تو اخبار، رسالے، عوام اور سرکاری ذرائع ان پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں لیکن نہ تو ان مسایل کا کوئی حل نکلتا

* کاؤنسلر، کیریر پلاننگ سینٹر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہے اور نہ ان کے حل کے لیے کوئی ٹھوس قدم اُٹھایا جاتا ہے اور بات وہیں رہ جاتی ہے جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ ان مسایل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایک ایسی اسکیم مرتب کی جائے جس کے ذریعے ان میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ ان کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طرف متوجہ کرایا جائے اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی جائے کہ موجودہ سماج میں عورتوں کا بھی وہی مقام ہے جو مردوں کا ہے۔ انھیں خیالات کے پیش نظر ایک اسکیم مرتب کی گئی جو کیریر پلاننگ کے نام سے اُبھر کر سامنے آئی۔

عورتوں کی صلاحیتوں کی نشو و نما کے پیش نظر مندرجہ ذیل اہم نقطے اُبھر کر سامنے آئے:

(الف) عورتوں میں خود اعتمادی پیدا کرنا۔
(ب) ان کی صلاحیتوں کو ابھارنا۔
(ج) ان میں اقتصادی آزادی کا شعور پیدا کرنا
(د) ان کے سیکھنے کے عمل کو روزی کمانے کے ذریعے متحرک کرنا

یہ محسوس کیا گیا کہ اگر عورتوں میں معاشرتی بیداری پیدا کی جائے ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے اور مضامین کا انتخاب صلاحیتوں کے لحاظ سے کیا جائے تو ان کو روزی کمانے میں مدد ملے گی جس سے ان کے متعدد مسایل خود بخود حل ہو سکتے ہیں۔ اس سینٹر کا افتتاح ۲ / اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ہوا اور ۸۵-۱۹۸۴ء کے تعلیمی سال میں پانچ مختلف صنعتوں میں لڑکیوں کو چھ ہفتے کی ٹریننگ دی گئی جو درج ذیل ہیں:

۱۔ کوسمیٹک ٹیکنالوجی
۲۔ کوسٹیوم ڈزائننگ
۳۔ بزنس کریسپونڈنس
۴۔ انٹیریر ڈیکوریشن اور
۵۔ اسٹینو ٹائپنگ

۲۴۵ طالبات نے ان صنعتوں کی ٹریننگ کے لیے داخلہ لیا۔ اس کے علاوہ مختلف محکموں میں روزی کے مواقع سے متعلق معلومات فراہم کرنے کے لیے کیریر ٹاک (Career Talk) کا اہتمام کیا گیا۔

۸۶-۱۹۸۵ء کے تعلیمی سال میں جن صنعتوں میں پورے ایک سال کی ٹریننگ دی گئی وہ یہ ہیں:

۱۔ بیوٹی کلچر۔
۲۔ بزنس کریسپونڈینس اور اسپوکن انگلش
۳۔ کوسمیٹک ٹیکنالوجی۔
۴۔ فیشن گارمینٹس۔
۵۔ ڈول میکنگ۔
۶۔ اسٹینو ٹائپنگ۔
۷۔ ہینڈی کرافٹس۔
۸۔ انٹیریر ڈیکوریشن۔

سینٹر کی یہ سہولتیں شروع میں صرف ویمنس کالج کی طالبات کے لیے ہی محدود تھیں لیکن اب یونیورسٹی کی تمام یونائیٹڈ طالبات ان کورسز میں داخلہ لے سکتی ہیں اور امید ہے کہ آئندہ یہ پروگرام دوسرے لوگوں کے لیے بھی شروع کیا جا سکے گا۔

۸۷-۱۹۸۶ء کے سال میں کمپیوٹر کے دو کورسیز (کمپیوٹر پروگرامنگ بیسک اور الیکٹرانک ڈیٹا پروسیسنگ) کومرشیل کیمرہ اور ٹیکسٹائل ڈزائننگ کے کورسیز کا اضافہ کر کے دس صنعتوں میں ٹریننگ دی گئی۔

'سیکھنے کے ساتھ کماؤ' اس سینٹر کی ایک منفرد اور اہم خوبی ہے اور اس مقصد کو سینٹر نے بہت کامیابی کے ساتھ حاصل کیا ہے۔ طالبات سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ جو اشیا ان صنعتوں کی ٹریننگ کے دوران یہ طالبات تیار کرتی ہیں، ان کی نمایش اور فروخت (Sale-cum Exhibition) کا اہتمام کیا جاتا ہے جس کا منافع طالبات کو ہی ملتا ہے۔ پچھلے سالوں کے فروخت کے اعداد و شمار بہت ہمت افزا ہیں۔ ان مقاصد کے حصول میں بیگم جناب سید ہاشم علی نے کافی تعاون دیا ہے۔ انھوں نے دستکاری سینٹر تشریف لا کر اور لڑکیوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی اشیا

سید کرمان کی ہمت افزائی کی ہے۔

۸۸-۱۹۸۷ء میں مندرجہ ذیل صنعتوں میں ٹریننگ کے لیے یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی طالبات نے داخلہ لیا۔

۱۔	بیوٹی کلچر	۲۔	کمپیوٹر پروگرامنگ
۳۔	الیکٹرانک ڈیٹا پروسیسنگ	۴۔	کوسمیٹک ٹیکنالوجی
۵	فیشن گارمینٹس	۶۔	ہینڈی کرافٹس
۷۔	ڈول میکنگ	۸۔	نیڈل ورک (کڑھائی)
۹۔	کریشن کیئر	۱۰۔	ٹائپنگ
۱۱۔	شورٹ ہینڈ		

اس سینٹر کو شروع کرنے میں پروفیسر اختر صاحب کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے اس سینٹر کے قیام کی پرزور حمایت کی اور ابتدائی دور میں اس کو ان کی پوری سرپرستی حاصل رہی۔ اس وقت ویمنس کالج کی پرنسپل پروفیسر مس لوٹس صاحبہ نے دل وجان سے اس اسکیم کو سراہا اور اس کو شروع کرنے میں ہر طرح سے ہمت افزائی کی۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ جو سینٹر کو درپیش تھا وہ جگہ کا تھا۔ دوسرا مسئلہ لڑکیوں کے ذہنوں کو بدلنا اور ان کو ہنر سیکھنے کے لیے تیار کرنا تھا۔ کاؤنسلرس (Counsellors) نے لڑکیوں سے ملاقاتیں کیں اور اس اسکیم کے فوائد کو ان کے سامنے رکھا۔ یہ بات سینٹر کے لیے بڑی ہمت افزا ہے کہ ہر سال زیادہ سے زیادہ تعداد میں لڑکیاں ان کورسیز میں داخلے کے لیے درخواست دیتی ہیں۔

۱۹۸۵ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ریویو کمیٹی Review (Committee) اس سینٹر کا وزٹ کرنے آئی اور اس نے اس اسکیم کی کارکردگی اور اس سے مستقبل میں ہونے والے نتائج کا تجزیہ کیا۔ کمیٹی نے اس بات کی زوردار الفاظ میں سفارش کی کہ یہ اسکیم ایک مستقل شکل اختیار کرلے۔ کمیٹی کی سفارش پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے کیریر پلاننگ سینٹر کی عمارت کے لیے پانچ لاکھ روپیے ساز و سامان (Equipments) کے لیے تین لاکھ روپیے اور کتابوں کے لیے ایک لاکھ روپیے کی گرانٹ منظور کی۔

ہم لوگ موجودہ وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب کے بہت احسان مند اور مشکور ہیں کہ انھوں نے اس میں ذاتی دلچسپی لی جس کی وجہ سے کیریر پلاننگ سینٹر کو اتنی بڑی گرانٹ حاصل ہوسکی۔ وائس چانسلر موصوف کی سرپرستی کی وجہ سے ہی اس سینٹر نے خاطر خواہ ترقی کی اور اس کو فروغ حاصل ہوا۔ کیریر پلاننگ سینٹر کی عمارت زیر تعمیر ہے اور امید ہے کہ اب تک ہماری طالبات اور اساتذہ کو جگہ کی تنگی کی وجہ سے جو دشواریاں پیش آتی تھیں وہ کافی حد تک دور ہوجائیں گی۔

اس اسکیم کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ لڑکیاں یہ ٹریننگ اپنی جاری تعلیم کے ساتھ ساتھ حاصل کرسکتی ہیں۔ یونیورسٹی نے اس کے لیے تعلیمی آرڈیننس بنا دیے ہیں۔ یہ آرڈیننس ۸۸-۱۹۸۷ء کے تعلیمی سال سے لاگو ہوئے۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی امتحانات کے کنٹرولر جناب مؤید الدین صاحب نے سینٹر کو اپنا پورا تعاون دیا۔

ہندوستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس میدان میں ملازمتوں کے پیش نظر آئندہ سالوں میں ویڈیو فلمنگ، ٹیکسٹ وائنڈنگ اور ٹی.وی اور وی.سی.آر ریپیر کے کورسیز شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ کورسیز ابھی تک جگہ کی تنگی کی وجہ سے شروع نہیں کیے جاسکے تھے۔

اس کے علاوہ عورتوں میں نجی کاروبار کو فروغ دینے کے لیے پروگرام مرتب کیا جارہا ہے۔ سرکار بھی نجی کاروبار پر بہت زور دے رہی ہے۔ یہ تصور کیا جاتا ہے کہ کیریر پلاننگ سینٹر کے وجود سے لڑکیوں کو اپنا کاروبار شروع کرنے میں مدد ملے گی۔ اس سلسلے میں قرض دینے والی ایجنسیوں سے رابطہ قایم کیا جارہا ہے۔ تاکہ وہ اس سے متعلق معلومات لڑکیوں کو فراہم کریں۔ کیریر پلاننگ سینٹر سرکاری امداد حاصل کرنے میں طالبات کی مدد کرے گا۔

آئندہ یہ بھی ارادہ ہے کہ اس سینٹر کو پروڈکشن سینٹر میں تبدیل کیا جائے تاکہ اس ادارے سے ٹریننگ حاصل کرنے والی طالبات اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ایسی طالبات کے لیے کیمپس انٹرویو کی سہولت مہیا کرانے کا پروگرام بھی مرتب کیا جارہا ہے۔

ہندوستان کی ایک بہت بڑی آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے دیہاتوں کی ترقی کے پیش نظر وہاں رہنے والی عورتوں کے لیے کیریر پلاننگ کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔ اس پروگرام سے وہاں کی عورتوں کو ہنر حاصل کر کے اپنی زندگی کے معیار کو بلند کرنے میں مدد ملے گی۔

کیریر پلاننگ سینٹر کو ہندوستان اور بیرون ملک سے آنے والے لوگوں نے دیکھا اور اس کی اہمیت کو سمجھا جیسا کہ مندرجہ ذیل اقوال سے ظاہر ہوتا ہے۔

"جو کچھ میں نے اب تک دیکھا ہے، ایک بہت ہی اچھی کوشش ہے اور ہندوستان کے ماحول کے لیے بہت موزوں ہے۔"

پروفیسر رو برٹ اینڈرسن
کناڈا

"میں کیریر پلاننگ سینٹر کی کارکردگی سے متاثر ہوئی۔ کاش کہ ایسے بہت سے سینٹر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کھولے جائیں۔
میری نیک خواہشات اس کے ساتھ ہیں۔"

پروفیسر پورنیا ماتھر
آئی۔ آئی۔ ٹی
دہلی۔

"کیریر پلاننگ سینٹر جو اپنی نوعیت کا ہندوستان میں پہلا ادارہ ہے، بہت اچھی طرح منصوبہ بند ہے۔ میں اس سینٹر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"
نیک خواہشات کے ساتھ"

پروفیسر پی استھا کرشنن
مدراس

ان تمام اقوال سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیریر پلاننگ سینٹر انسانی وسایل کی ترقی اور خاص طور سے خواتین کی ترقی کے لیے ایک ایسا جامع قدم ہے جس کی تقلید دوسرے اداروں کو بھی کرنا چاہیے۔

بقیہ صفحہ نمبر ۲۷

عمل کیا جاتا ہے جو سائزنگ (Sizing) کہلاتا ہے۔ روایتی طور پر یہ عمل ایک آمیزے سے کیا جاتا ہے جو جلاٹین اور الونیم سلفیٹ سے بنتا ہے۔ الونیم سلفیٹ کو کاغذ ساز کا الونیم کہا جاتا ہے۔

مخصوص کاغذ (مثلاً گریز پروف کاغذ) اپنی مخصوص خصوصیات کے لیے مختلف مراحل اور اجزا سے بنتے ہیں۔ ان کے لیے استعمال ہونے والے اضافی اجزا زیادہ تر نامیاتی مرکبات "پولی ہائیڈروکسی" ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈائی ایتھائیل گلائی کول، سوربی ٹول، فرکٹوز، گلوکوز آمیز کاغذ سازی کے باطنی مراحل طے ہونے کے بعد کئی ایک ظاہری خصوصیات پیدا کرنے کے لیے بھی ایک سلسلہ مراحل طے کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۵ (مئی ۸۹ء)

عورت کا مقام

رخشندہ جبیں

سماج میں عورت کی حیثیت کیا ہو؟ مرد و عورت کے تعلقات اور اس کی باہمی سطح کیا ہونی چاہیے؟ یہ سوال کسی نہ کسی شکل میں انسانی ذہن کو جھنجوڑتا رہا ہے۔ لیکن مسئلہ تاحال اپنی جگہ پر ہے۔

زمانۂ قدیم میں عورت کو ایک پالتو جانور سے زیادہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ حالانکہ یہ بات اس وقت بھی قابل فراموش نہ تھی کہ نسل انسانی کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے میں اس کا اہم رول ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ مرد کے مدمقابل کھڑے ہونے کی مستحق نہ تھی۔

یونان اور روم جیسے ممالک میں جہاں کی تہذیب زمانۂ قدیم سے ہی خیالی ہے عورت کا تصور اس طرح پیش کیا ہے،

"آگ سے جل جانے اور سانپ سے ڈسنے کا علاج ممکن ہے لیکن عورت کے شر کا مداوا محال ہے۔"

یونان کے بعد جس قوم کو دنیا میں فروغ نصیب ہوا وہ اہل روم تھے یہاں پھر وہی افراط و تفریط کا سلسلہ نظر آتا ہے۔

نصرانیت کا شمار دنیا کے ان مذاہب میں ہوتا ہے جنھوں نے صرف چند حقائق و نظریات ہی پیش نہیں کیے بلکہ ان کی بنیاد پر زندگی کے عملی مسائل پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ ایسے مذہب نے بھی ہمارے سامنے یہ تصور پیش کیا ہے کہ مرد نیک سرشت اور نیک کردار ہے اور عورت بدنیت اور مکار ہے۔

دراصل مغرب نے بھی عورت کو مساوات کا درجہ عورت سمجھتے ہوئے نہیں بلکہ یہ مقام مرد بنا کر دیا ہے۔ ان کا ابتدائی اور بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عورت بدی کی جڑ ہے، مرد کے لیے معصیت کی تحریک کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ ہے۔ تمام انسانی مصائب کا آغاز اسی سے ہوا ہے۔ اس کا عورت ہونا ہی اس کے شرمناک ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس کو دائماً کفارہ ادا کرتے رہنا چاہیے کیوں کہ وہ دنیا اور دنیا والوں پر مصیبت اور لعنت لائی ہے۔

ترتولیان ، جو ابتدائی دور کے ائمہ مسیحیت میں سے تھا عورت کے بارے میں مسیحیت کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے۔

"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ وہ شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی، خدا کے قانون کو توڑنے والی، خدا کی معتوبہ، مرد کو غارت کرنے والی ہے۔"

ہندو مذہب کا نظریہ بھی عورت کے لیے کچھ زیادہ بہتر نظر نہیں آتا۔ منوراج نے عورت کے بارے میں لکھا ہے:

"عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں اور جوانی میں شوہر کے اختیار میں اور بیوہ ہونے کے بعد اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے، خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے۔"

یہاں بھی عورت کو غلامی اور محکومی سے نجات نہیں ملی —

---

* ایل ایل ایم (سال اول) شعبہ قانون، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

منو سمرتی ۔ جس کی تعلیمات ایک عرصے تک حکومت کا دستور عمل رہی ہیں، وہ عورت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

۱۔ جھوٹ بولنا، بغیر سوچے کام کرنا، فریب، حماقت، طمع، ناپاکی، بے رحمی۔ یہ عورت کے جبلی عیب ہیں۔

۲۔ آگ، پانی، جاہل مطلق، سانپ، خاندان شاہی اور عورت موجب ہلاکت ہوتے ہیں۔ ان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔

فارسی کے مشہور شاعر حکیم فردوسی نے اس معاشرے کی عکاسی اس طرح کی ہے

زن و اژدہا ہر دو در خاک با
جہاں پاک ازیں ہر دو ناپاک با
[عورت اور اژدہا دونوں زمین کے اندر ہوں تو بہتر ہے]

ایام جاہلیت میں عرب میں عورت کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا وہ زندہ رہنے کی مستحق بھی نہ تھی۔

وقت نے کروٹ بدلی اور زمانہ نیند سے بیدار ہوا ۔ مارچ ۱۹۹۰ء میں Liberation of Woman کا نعرہ بلند ہوا اور نتیجتاً عورت کو معاشرے کا ایک حصہ سمجھا جانے لگا۔

سب سے پہلے عورت نے مغربی ممالک میں "نجات" یعنی حصول حقائق کے لیے احتجاج کیا۔ اس نے دنیا کے ہر کام میں حصہ لینے کا قصد کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام ہونے کے سبب انھوں نے عورتوں اور چھوٹے بچوں کو بھی کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ محنت سے پیسہ کما کر عورت میں اعتماد پیدا ہوا اور وہ معاشی دوڑ میں حصہ لینے لگی اور اس نے مرد کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اسی دوران وہ معاشرے میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے بجائے اپنی راہوں سے بھٹک گئی اور صنفی مساوات کا نعرہ بلند کرنے میں مصروف ہو گئی۔ چنانچہ مردوں کے ظلم سہہ جانے کے بعد جب عورت بیدار ہوئی تو وہ بھی اس طرح کہ وہ اپنے عورت پن یعنی نسوانیت سے ہی دست بردار ہو گئی۔

عورت نے کام کرنے کا حق طلب کیا، اس کو ملا۔ وہ دفتروں اور کارخانوں میں بھی جانے لگی لیکن سماجی نظام کی وجہ سے اس کو یہ آزادی راس نہ آئی۔

اس طرح جس وقت ہندوستان نے آزادی حاصل کی تو ہمارا Constituent Assembly کے ممبران نے بھی اس بات پر غور کیا کہ ہندوستانی عورت نہایت پست ہے اس لیے اس کو اساسی دستور ہند اور حقوق بنیادی میں مقام دیا گیا۔ دستور اساسی ہند کا Act 14-15 مساوات کا نظریہ اس طرح پیش کرتا ہے۔

Equality Before the law and Equal Protection of the laws
Act 14.
The State shall not deny to any person equality before the law & equal protection of the laws within the territory of India."

یعنی سرزمین ہند میں قیام کرنے والا کوئی بھی شخص حق مساوات سے محروم نہ کیا جائے گا۔

Act 15 مساوات کا دوسرا نظریہ پیش کرتا ہے،

No discrimination on the grounds of religion, race, cast and sex etc.

یعنی کوئی بھی شخص خواہ مرد ہو یا عورت اپنی ذات، برادری، مذہب اور رنگ کی بنا پر حقوق مساوات سے محروم نہ کیا جائے گا ان آرٹیکل کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں آج کے اس ترقی پذیر دور میں بھی عورت کو زندہ جلا دیا جاتا ہے، آج بھی وہ ظلم اور تشدد

کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ آج بھی باپ اپنی بیٹیوں کے گلے کاٹ کر داماد کے قدموں میں ڈال دیا کرتے ہیں۔ لڑکیاں جہیز کے خوف سے خودکشی کر لیا کرتی ہیں۔ نہ جانے کتنی مانگیں سونی رہ جاتی ہیں اور آج بھی نہ جانے کتنی روپ کنواریاں اپنے پتی نہیں بلکہ پتا کی غربت و افلاس کی چتا پر جلا دی جاتی ہیں۔ یقیناً ایسے ملک میں عورت کے لیے مساوی حقوق کی بات ایک نہایت جرأت مندانہ قدم تھا۔

لیکن ہمیں غور اس بات پر کرنا ہے کہ اس مساوات کے معاملے میں ہم کس حد تک کامیاب ہیں اور جو مادی تصور ہمارے یہاں پیش کیا گیا ہے وہ کس حد تک درست ہے۔

عورت وہ شے ہے جو سماج کا ایک حصہ ہی نہیں بلکہ پورے سماج کی معمار ہے۔ بچوں کو جنم دینے سے لے کر ان کی پرورش، تعلیم و تربیت غرضکہ ان کو ایک مکمل انسان بنانے کی ذمہ داری عورت کے اوپر ہی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ وہ سماج جیسے ایک بڑے درخت کی اپنے خون سے آبیاری کرتی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن آج بھی ہم جب یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقتاً ہمارے سماج میں عورت کے ساتھ کس قسم کا رویہ اختیار کیا جا رہا ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج بھی اس صدیوں پرانی تہذیب میں سانس لے رہے ہیں جس میں عورت کو ناقص العقل اور مار توڑ کر درست کی جانے والی شے یا رشیوں اور منیوں کی تپسیا کو بھنگ کرنے والی استری سمجھا جاتا تھا اور ایک بار پھر ہمیں یہی محسوس ہوتا ہے کہ

"پھر آگئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم"

غور و فکر کا موضوع یہ ہے کہ عورت کی برابری ہمارے قانون میں کس قسم کی برابری ہے۔ برابری سے مراد یہاں برابر مواقع فراہم کرنے سے ہے اور ان کی (عورتوں) صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے سے ہے۔ یعنی وہ سماج کا کوئی کمزور جز نہیں، بلکہ ایک اہم حصہ ہیں۔

یہاں پر ہمیں اپنے قوانین کی روشنی میں عورت کے مساوی حقوق کا تعین کرنا ہے وہ یہ کہ قانون نے عورت کو برابری کا درجہ ضرور دیا لیکن وہ اس کے افعال میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کر سکا اور کر بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ یہ قانون قدرت میں مداخلت ہے۔ آج بھی عورت کے اوپر بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح پہلے تھی۔

کیا اس برابری کا مقصد یہ ہے کہ عورت کے وہ تمام حقوق چھین لیے جائیں جو سماج میں اس کے اہم ہونے کی پہچان کراتے ہیں

مساوات سے مراد مرد اور عورت کے مابین تعلقات میں خاندان اور کیریر کے بیچ توازن ہونا ہے اور حقوق مساوی سے مراد ہے کہ باعزت پیشوں میں عورت برابری سے کام کرنے کی مستحق ہے لیکن آج بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی عورت کی داستان اسی طرح قایم ہے کیونکہ ہمارے خودغرض اور نفس پرست سماجی علمبردار اس کو اصل مقام دینے سے منکر ہیں۔

قران کریم نے عورت کو مرد کے مقابل کھڑا کیا ہے لیکن عورت کے تحفظ کی ذمہ داری مرد کے سپرد کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دونوں ہی اس موضوع کے دو الگ عنوان ہیں۔ اس لیے ایک دوسرے کے واسطے دونوں کا تعاون ضروری ہے۔

بہت سے ایسے مسایل بھی پیش آتے ہیں جن سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ عورت کی آزادی سماجی نقطہ نظر سے اس کے لیے مضر ثابت ہوئی ہے۔ آج عورت اگر نوکری کرتی ہے تو ایسا تو نہیں ہوتا کہ وہ گھر کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی ہے۔ غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ذمہ داریاں اب کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں لیکن اتنی زیادہ ذمہ داریاں اٹھانے کے باوجود بھی وہ اپنے اصل مقام سے محروم ہے۔

دوسرے پہلو پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ مرد کسی بھی وقت عورت پر جبر کر سکتا ہے۔ جبر سے مراد یہاں یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد جبراً جرائم کاری کر سکتا ہے اور اس کی زندگی برباد کر سکتا ہے لیکن اس قسم کا کوئی ظلم عورت مرد کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ عورت کی برابری کا نعرہ بلند کرنے سے پہلے ہمیں اللہ کے نازل کردہ قانون کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے جو عورت کی جسمانی ساخت، ذمہ داریوں اور فطرت کے عین مطابق

اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی۔ دونوں کو برابری کا درجہ عطا کیا۔ دونوں پر ایک جیسے فرائض عائد کیے لیکن کچھ کام جن کو عورت اپنے جسم کی مخصوص بناوٹ کے سبب نہیں کر سکتی، ان کو مردوں کے سپرد کیا۔

اب ہم قرآن پاک کی روشنی میں دیکھیں گے کہ قانون قدرت نے عورت کو کس حد تک برابری کا درجہ عطا کیا۔

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

[الحجرات ۱۳]

ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی ایک صنف کی جانب رجوع نہیں کیا بلکہ "لوگو" سے مراد مرد اور عورت دونوں سے ہے اور ہمیں اس میں تفریق کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ قرآن کا پیغام مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے مساوی ہے اور اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ "تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے" خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

اسی طرح دوسری جگہ قرآن کریم میں ہم دیکھتے ہیں جس میں اللہ کا خطاب دونوں صنفوں سے ہے۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے دور رہتے ہیں۔ نماز قایم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔"

[التوبہ ۷۱]

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے تمام مومن مرد اور مومن عورتوں کو ایک جگہ

کا رفیق بتایا ہے۔ اس طرح مردوں اور عورتوں کو شانہ بشانہ کھڑا کر دیا ہے۔

ایک دوسری سورہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضایع نہیں کروں گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے جنس ہو۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ کی نظر میں دونوں ہی برابر ہیں۔ دونوں ہی پر عمل کی پابندی عاید کی گئی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کا جنس بتا کر ہر طرح کے فرق کو مٹا دیا ہے۔

مرد اور عورت کے مابین مساوات کا بہترین نمونہ ہمیں سورہ نحل میں ملتا ہے۔

جس مرد اور عورت نے بھی نیک عمل کیا اگر وہ مومن ہے تو ہم ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کا، جنھیں وہ کرتے تھے، اجر دیں گے۔"

[سورہ النحل ۹۷]

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"میں تمھیں نازک آبگینوں (خواتین) کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ تم میں سے بہتر وہ ہے جو ان کے ساتھ عزت و تکریم سے رہنے والا ہو اور تم میں سے بدبخت وہ ہے جو ان کے ساتھ اہانت سے پیش آتا ہے۔"

ایک دوسری جگہ حضور اکرمؐ نے فرمایا:

"دنیا کی نعمتوں میں بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔"

آنحضرتؐ کی اس حدیث سے بیوی کی قدر و قیمت کا علم ہوتا ہے۔

اسلام نے ماں کے قدموں میں جنت رکھ کر عورت کو ایک بلند و بالا مرتبہ عطا کیا۔ [illegible]

باعثِ تسکین قرار دیا۔

غرض کہ اسلام کے کسی گوشے میں عورت کو مساوی حقوق سے محروم نہیں کیا گیا ہے۔ اس کائنات میں عورت کی اہمیت اور افادیت کا ذکر اردو کے مشہور شاعر علامہ اقبالؒ نے اس طرح کیا ہے ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

اس طرح دنیا کا کوئی بھی دانشور عورت کی اہمیت اور منزلت سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن آزادیٔ نسواں کے نعرے بلند کرنے سے پہلے ہمیں قانونِ قدرت کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے کیونکہ عورت صنفِ نازک ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کائنات کو عطا کیا ہوا ایک بہترین تحفہ ہے اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری سماج پر ہے اور سماج کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی عظمت و عصمت اور وقار کا تحفظ کرے۔

یہ بات ناقابلِ فراموش ہے کہ عورت بھی اسی وقار اور تحفظ کی متمنی ہے۔ اس کی مثال ہم آزادیٔ نسواں کی مشہور علمبردار بے. ٹی. فریڈن کی اس تحریر میں دیکھتے ہیں۔

مرد ہمارے محبوب بھی ہمارے ہمدرد ہمارے معاون ہیں، ہمارے دوست، ہمارے بھائی ہیں، ہمارے بیٹے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی ہمارے دشمن بھی ہیں۔ جو ہمارے دشمن ہیں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا لیکن جو ہمارے ہمدرد و غمگسار ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر ایک ایسے سماج ایک ایسے ماحول ایک ایسے نظام کی صورت گری کرنی ہوگی جو سب کے لیے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رحمت ہو۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو تمام حقوق اس کی فطرت کے مطابق عطا کیے۔ اسلام نے عورت کو حقوق بھی دیے ہیں اور تحفظ بھی عطا کیا ہے۔ مساوی حقوق کی جو مثال ہمیں قرآن کریم اور احادیث نبی کریمؐ میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ جو قانون ہم کو قرآن کریم یعنی قانونِ الٰہی سے حاصل ہیں وہ کسی دوسرے قوانین سے ممکن نہیں اور موجودہ زمانے میں بیشتر قوانین پر بلا واسطہ قرآنی قوانین کی چھاپ ملتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ عورت کے حقوق کے علمبردار اور آزادیٔ نسواں کے پرستار اسلامی قوانین پر غور فرمائیں جو کہ ابدی مکمل اور عورت کی فطرت کے عین مطابق ہیں اور عورت کو اس کا حقیقی مقام عطا کرتے ہیں۔ ان قوانین کے نفاذ سے یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک منصفانہ معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔

"بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ ہے تو خیال میں آیا کہ وہ چیز علم ہے جس کے معنی دانستن ہیں۔ تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔"

سر سید احمد خاںؒ

اسلامی معاشرہ اور سالگرہ

سرفراز خان آصفی*

خوشی کے اظہار کے لیے جہاں مسلمانوں نے دوسرے مذاہب کے بہت سے طریقے اپنا رکھے ہیں، وہیں اب مسلم معاشرے میں ایک اور نئی لعنت "برتھ ڈے" یعنی سال گرہ کی تقریب کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ کل تک تو یہ بڑے بڑے لوگوں کا شیوہ تھا مگر اب پورا معاشرہ اس بیماری کا شکار ہے۔ اوروں کی طرح مسلمان بھی بڑھتی ہوئی عمر پر خوشیاں منانے لگے ہیں۔ جونہی بچہ سال بھر کا ہوا اس کی سال گرہ کا جشن منعقد کیا جاتا ہے۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں اور عزیز واقربا کو مدعو کیا جاتا ہے اور خوب دل کھول کر فضول خرچی کی جاتی ہے۔

اِسلام ایک ابدی و آفاقی دین ہے۔ یہ عام اصطلاحی زبان میں صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ابدی و کامل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ دین محض عقاید کی اصلاح تک محدود نہیں ہے بلکہ اصلاح عقاید سے لے کر زندگی کے تمام معاملات کی درستگی تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق مفصل ہدایات موجود ہیں۔ آیئے اِسلامی ہدایات کی روشنی میں مسلم معاشرہ کی نوزائیدہ لعنت "رسم سالگرہ" کا ایک سرسری جائزہ لیں۔

ہمارے اسلاف سے ہم کو ایک شاندار تہذیب وراثت میں ملی ہے۔ یہ ورثہ عقاید کا تعلیمات، روایات، رسوم، ایجادات، انکشافات، تحقیقات، افکار و خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے جو ایک نسل اپنی پیشرو نسل سے پاتی ہے اور آنے والی نسل کو منتقل کرتی ہے۔ مختلف ماحول میں اس کے عناصر میں تبدیلی، حک و اضافہ، تنسیخ و تجدید ہوتی رہتی ہے لیکن اگر کوئی معاشرہ اپنی انفرادیت اور اپنے تشخص کو قایم و برقرار رکھتا ہے تو اس کے تہذیبی ورثہ کے عناصر مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور انہیں سے اس معاشرے یا اس قوم کے تہذیبی ورثے کی پہچان ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی روزمرہ زندگی ان کی تہذیب و کلچر ان کی معاشرت، ان کی معاشی زندگی، ان کی سیاست مدن سب کا واحد سرچشمہ کتاب اللہ اور ان کے لیے دائمی نمونہ عمل اسوۂ رسول اللہؐ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا کہ:

"ایام جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں
اور جاہلیت کے تمام آثار و مفاخر ختم کیے جاتے ہیں۔"

لیکن افسوس اسی اِسلام کے ماننے والے اور چودہ سو سالہ شاندار ورثہ کے مالک، مغرب کی کورانہ تقلید میں دائمی نمونہ عمل سے انحراف کرتے ہیں۔

اِسلام اور اِسلام کے ماننے والوں نے ہمیشہ ہی لوگوں کو بے راہ روی اختیار کرنے سے منع کیا ہے اور برے راستوں اور فضول خرچی سے احتراز برتنے کا حکم دیا ہے۔ اِسلام اپنے ہر تہوار پر خواہ وہ خوشی کا ہو یا سوگواری کا دونوں ہی صورتوں

میں عبادت کو ترجیح دیتا ہے اور اللہ کی خوشنودی جو کہ انسان کا مقصدِ حیات ہے، حاصل کرنے کا بہترین طریقہ عبادت ہی ہے۔ انسان چوں کہ طبعاً معاشرت پسند ہے اور اس کی جبلت اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر مجبور کرتی ہے، اسی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے مستقل قیام کے بعد جہاں انہوں نے یہاں کے باشندوں کی تہذیب اور کلچر کو متاثر کیا وہیں برادرانِ وطن کی بہت سی رسوم مسلم معاشرے میں سرایت کر گئیں۔ ہندوستان کے بہت سے لوگوں نے قبولِ اسلام کے بعد جاہلیت کے دور کی بہت سی رسوم سے رشتہ جوڑے رکھا۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ نے اپنی پراثر تقاریر اور تصانیف کے ذریعہ ان مروجہ غیر اسلامی رسوم کا قلع قمع کیا۔ آپ کے مطبوعہ ملفوظات آج بھی مسلم معاشرے کی اصلاح کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

اسلام سے غیر مانوس لوگ جو حرکات کیا کرتے تھے، وہ ان کی جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ تھیں لیکن آج کے دور میں اسلامی تعلیمات پوری دنیا میں عام ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود آج بھی مسلمان پوری طرح سے اسوۂ رسول کی پیروی سے قاصر ہیں اور دوسرے مذاہب کے رسوم و اطوار انہوں نے اپنا رکھے ہیں۔ خوشی کے اظہار کے لیے ویڈیو و فلمی گانوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ تو وہ خرافات ہیں جو اچھائیوں کی شکل میں ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں سرایت کر چکی ہیں۔ مغرب کی اندھی تقلید میں "برتھ ڈے" منانا اور کچھ روشن خیال حضرات تو عقیقہ کو بھی سالگرہ کا نام دے کر مناتے ہیں۔ لیکن ہم کو حقیقت سے آگاہ ہونا چاہیے کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، ہم موت سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لیے اپنی بڑھتی ہوئی عمر پر خوشی کا اظہار نہیں بلکہ گھٹتی ہوئی عمر کا ماتم کرنا چاہیے اور یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس مختصر سی زندگی میں زیادہ تر وقت اللہ کی عبادت میں صرف ہو اور اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور سالگرہ جیسے ڈھکوسلوں پر فضول خرچ ہونے والے پیسے ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کریں یا کسی غریب انسان یا مستحق ادارے کو دیں جو ہمیں ثوابِ دارین کا مستحق بنا سکتا ہے ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

"حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک بکری زمین پر ذبح کرنے کے لیے لٹائی، اس کے بعد چھری تیز کرنا شروع کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ کیا تم اس کو دو بار مارنا چاہتے ہو۔ اس کو لٹانے سے پہلے تم نے چھری تیز کیوں نہ کرلی۔"

زادِ سفر۔

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T Road, Aligarh. Phone : 4185

ماہنامہ

تہذیب الاخلاق

...وا بیاں سے اٹھے گا

...ے سے جہاں پر برسے گا

جون ۸۹ء

"جب ہم ارسطو
اور افلاطون کی
تحقیقات کو اپنے
قدیم نصاب میں شامل
کر سکتے ہیں تو
آئن سٹائن اور
سی۔ وی۔ رمن کی جدید سائنسی
تحقیقات کو کیوں نہیں شامل کر سکتے؟

سید حامد علی
(... کے اساتذہ سے خطاب کا ایک اقتباس)

*

تین روپیہ

ادارۂ تہذیب الاخلاق
اینڈ
اشاعت
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

اغراض و مقاصد

۱ . جہل، رجعت پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد - ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء - ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔

۲ . مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت۔

۳ . ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔

۴ . ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵ . ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔

۶ . سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷ . علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کے لیے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر ہونے چاہئے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بلا وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ اشاعت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & AISHAAT.
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ
انڈیا Rs. 30·00
بیرونی ممالک US $ 20·00 ہوائی ڈاک
بحری ڈاک US $ 8·00

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ اشاعت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
انڈیا۔

مندرجات

اداریہ

جس طرح کسی فرد کا اپنے منھ سے اپنی تعریف کرنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے، اسی طرح کسی ادارے سے نکلنے والے رسالے میں اسی ادارے کی تعریف کا شایع ہونا بھی کوئی پسندیدہ بات نہیں، لیکن جب صورت حال یہ ہو کہ چند لوگ جان بوجھ کر یا انجانے میں حالات کا بذات خود جائزہ لیے بغیر محض سنی سنائی باتوں پر کسی ادارے کے روشن چہرے کو داغ دار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کریں، اور کچھ ناگزیدہ محض ذاتی پرخاش میں اس ادارے کے سربراہان کی محنت، لگن اور سوجھ بوجھ کی بدولت ہونے والی پیش رفت اور ترقی پر بے بنیاد افواہوں کا پردہ ڈالنے کی سعی کریں تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ حقیقت کو اجاگر کیا جائے۔ اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ کہیں لوگ اس میں خودستائی کا پہلو نہ نکال لیں یا اسے کسی اور چیز پر محمول کریں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں اخباروں میں اکثر ایسی باتیں شایع ہوتی رہتی ہیں جسے پڑھ کر بے ساختہ زبان پر یہ آجاتا ہے کہ یا خدا! یہ کون لوگ ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ رکھی ہیں؟ یہ کیسے لوگ ہیں جو یہ نہیں دیکھتے کہ آج ملک میں یہی ایک ایسی یونیورسٹی ہے جس کے نظم وضبط اور ڈسپلن کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ جہاں پورے سال پڑھائی ہوتی ہے، کورس مقررہ مدت میں ختم کر دیے جاتے ہیں، امتحانات وقت پر ہوتے ہیں اور نتائج وقت پر نکلتے ہیں۔ جہاں امتحان گاہ سے واک آوٹ نہیں ہوتا اور چاقو یا پستول دکھا کر نقل نہیں ہوتی۔ جہاں طلبا، اساتذہ اور انتظامیہ کے مابین خوش گوار تعلقات ہیں، جہاں طوفان بدتمیزی کی جگہ علمی شور وغوغا برپا ہے اور جہاں ہر ہفتے کوئی نہ کوئی کانفرنس کوئی نہ کوئی سمپوزیم، کوئی نہ کوئی سیمینار یا کوئی نہ کوئی ٹریننگ کورس منعقد ہوتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ہماری ان باتوں کو مبالغہ آرائی پر محمول کریں یا اسے غلط معنی پہنانے کی کوشش کریں، اس لیے ہم درج ذیل سطور میں ملک کی تین بڑی یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کے سربراہوں کے مشاہدات اور محسوسات پیش کر رہے ہیں جنھیں ان حضرات نے "لائبریری پبلیکیشن ان انڈیا" کے موضوع پر منعقد ہونے والے نیشنل سیمینار کے موقع پر ہمارے یہاں کے علمی ماحول سے متاثر ہو کر قلم بند کیا ہے۔

"یہ دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں طلبا، لائبریری سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ میں یہ بات نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی کسی اور یونیورسٹی کی لائبریری اتنی زیادہ استعمال میں نہیں لائی جاتی، جتنی یہاں کی۔ بلاشبہ یہ امر

علی گڑھ یونیورسٹی کے علمی ماحول کا پرتو ہے ۔"

جناب این ۔ بی ۔ انعام دار، لائبریرین عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

" جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے یہاں کا علمی ماحول اور علمی مزاج جو آج کل ملک میں منقا ہے ۔"

ڈاکٹر پی ۔ کے مہاپترا، ڈپارٹمنٹ آف لائبریری سائنس، کلکتہ یونیورسٹی ۔

" (یونیورسٹی کے) مختلف شعبوں اور لائبریری کے مابین جو خوش گوار تعلق ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ کاش! ہندوستانی یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے سبھی پروفیشنل یہاں کے لوگوں کے نقش قدم پر چلتے ۔"

ڈاکٹر پی ۔ اے ۔ موہن راجن ۔ یونیورسٹی لائبریرین، مدراس

اس سے کچھ ہی دنوں پہلے میرٹھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر رمیش موہن اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں پیش کر چکے ہیں:

" آج جب کہ ہمارے زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی ادارے ابتری کے سیلاب میں ڈوب رہے ہیں، یہ دیکھ کر بڑی تقویت ہوئی کہ ملک میں علی گڑھ جیسے شائستگی، تہذیب اور ڈسپلن کے چند جزیرے بھی موجود ہیں ۔"

ہم یہ نہیں کہتے کہ گزشتہ چھ سات برسوں میں مسلم یونیورسٹی نے تعلیمی میدان کے ہر محاذ پر کامیابی حاصل کر لی ہے، ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یونیورسٹی نے اس مدت میں اپنا مطلوبہ معیار حاصل کر لیا ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ سر سید نے جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو چکا ہے البتہ ہم اتنا ضرور کہیں گے اور زور دے کر کہیں گے کہ اس مدت میں ہماری یونیورسٹی سال بہ سال بالا ندہ ہوئی ہے اور یہ کہ تعلیم و تدریس کا جو ماحول آج کل یہاں ہے وہ کم سے کم شمالی ہند کی شاید ہی کسی یونیورسٹی میں دیکھنے کو ملے ۔

اسرار احمد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸ - شمارہ ۶ (جون ۸۹ء)

تہذیب

سر سید احمد خاںؒ

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن یا تہذیب کیا چیز ہے؟ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم، اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا ہے؟ اس امر کے تصفیے کے لیے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے، تو وحشیوں میں، شہریوں میں، سب میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں، الّا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے، اور کسی چیز کو بُرا اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے، جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسانوں کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اس تبادلے کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے؛ اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے۔ اچھا یا بُرا، اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہرا۔ مگر اچھا یا بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی او دخلقی، ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں، جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں، اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے، دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم متعلّمہ اشخاص میں نہیں ہوتا، یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے، تو اکثر ان کی ضرورتیں، ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں، اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں، سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک ہی ہوتی ہے؛ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں، تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی چیز ایسی بھی ہوگی جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

ملکی حالتیں، جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں، نہ فکر اور خیال اور دماغ سے، ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں، بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے اور جس باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے، جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں، جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ استعمال کروں گا، یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے، جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اس قسم کے

[illegible] جیسا کہ "مزاج یا مذاق" مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ [illegible] سے وہ معنی اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے؛ اس واسطے [illegible] کا ترجمہ پسند کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا، جو خیال کے صحیح ہونے کی غرض سے ہے، بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے [illegible] ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر، اور علم طبیعات [illegible] کے ماہر ہونے پر، منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانے کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب، یا یوں کہو کہ بری حالت سے اچھی حالت میں لانا، دنیا کی تمام چیزوں سے، اخلاق ہوں یا مادی، یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا، تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر یاقوت والماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے؛ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے، چاندی، مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں؛ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے؛ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات، نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں؛ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے گھونسلے، درختوں پر باندھے ہوئے مانند، زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی، تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں، تمدن کے قاعدے، عیش و عشرت کی مجلسیں، خاطر اور مدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں، دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں؛ بلکہ بعض چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری، جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے، ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی وخوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔

موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے، مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھاتی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت، اس کا گھٹاؤ اور بڑھاؤ، اس کا ٹھہراؤ اور اس کی اُپج، ہاتھوں کا بجاؤ اور پاؤں کی دھمک، زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں؛ وہ لے اور تال، راگ اور راگنی کو نہیں جانتے، مگر دل کی لہر، ان کے لے اور دل کی پھڑک، ان کا تال ہے، ان کا غول باندھ کر کھڑا ہونا، طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا، دل کی بے تابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آ کر سیدھا ہو جانا، گو نزاکت اور فن غنیاگری سے خالی ہو، مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔

دلی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا، تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں، اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں کہ ترقی، یعنی بھلائی سے اچھائی کی طرف رجوع، یا ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے کی طرف، تحریک ہو سکتی ہے، اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔

"بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کیسے بھی عذر کیوں نہ پیش کرے"

(سورہ القیٰمہ ۱۵-۱۴)

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذباتِ نفسانی کو اعتدال پر رکھنا؛ وقت کو عزیز سمجھنا؛ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا؛ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی، اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت۔ اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

اس تہذیب کے حاصل کرنے کے، بقول مسٹر ایچ۔ ٹی۔ بکل صاحب چار اصول ہیں۔

اوّل۔ جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا، ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا، اور ان کے علوم کو پھیلانا؛ پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی، اسی قدر انسان کی ترقی ہوگی۔

دوم۔ اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہیے، جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو تحقیقات سے اس کی استعانت ہوتی ہے۔

سوم۔ جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں، وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں، اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم؛ مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقل کی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں، اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔

چہارم۔ اس تحریک کا بڑا دشمن، جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے، یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو، تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی؛ یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلا دے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے اور مذہب یہ سکھلا دے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیے۔

پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ گورنمنٹ ہم کو بتادے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے؛ اور جس قدر کہ ہندوستان میں، بلکہ تمام ایشیا میں ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے، اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے؛ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہے۔ پس جب تک یہ خیال نہ جاوے گا اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لیے کیا کرنا چاہیے، اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت؛ نہ عزت ہوگی نہ منزلت، اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی۔

دوسرا جملہ جو مذہب سے متعلق ہے کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط؛ یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائل اجتہادیہ اور عقائد قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکام مذہبی میں اور ان میں کچھ تفرقہ اور تمیز نہ رہے، تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا، مثل مذہب غلط کے، مانع قوی ہے۔ الّا سچا مذہب، جیسا کہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے، وہ کبھی حارجِ ترقیٔ انسان نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

۸۸۵۵۵

"اور جھوٹ بولنے سے ہمیشہ بچے رہو، کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت بدی کی راہ دکھاتی ہے اور بدی دوزخ تک پہنچاتی ہے۔" (متفق علیہ)

دو خط

سید حامد*

اِن دو خطوں میں باہم کوئی مشابہت نہیں، نہ کوئی تعلق۔ نہ یہ خط کسی صاحب طرز نے کسی صاحب ذوق کو لکھے ہیں۔ یہ بڑے آدمیوں کی مراسلت کا جزو بھی نہیں۔ یہ سب کچھ سن کر قارئین یہ پوچھنے میں حق بہ جانب ہوں گے کہ پھر آخر ان خطوں کو سرنامۂ گفتگو کیوں بنایا جا رہا ہے؟ راقم سطور مہر بہ لب رہے گا۔ یہ مراسلے زبان حال سے خود جواب دیں گے۔ زبان حال کیوں کہیے زبان قال کہیے بلکہ زبان تحریر۔ پہلا خط راقم سطور کے نام علی گڑھ سے پروفیسر ایس سی بھٹناگر جی نے لکھا ہے، دوسرا خط بھی راقم سطور کے نام ہے۔ مراسلہ نگار ضلع جے پور (راجستھان) کے رہنے والے ہیں۔ پہلا خط انگریزی میں ہے۔ اس کا ترجمہ اقتباس پیش کروں گا؛ دوسرا اردو میں ہے اس کے چند اقتباسات قارئین کی نذر کیے جائیں گے۔

پروفیسر بھٹناگر جی یونیورسٹی کے حاشیہ پر نیلی چھتری کالج میں رہتے ہیں۔ یہ کالج اور وہ کوٹھی جس سے یہ متعلق ہے ظفر عمر صاحب مرحوم نے اپنے بہت بکنے والے جاسوسی ناول 'نیلی چھتری' کی آمدنی سے بنائی تھی۔ جملہ معترضہ یہاں ختم ہوتا ہے اور اقتباس شروع:

’’ ۸ - ۸۸ کا سال یونیورسٹی میں بغیر کسی ہنگامے کے گزر گیا لیکن صرف ایک طالب علم انڈین پولس سروس اور ایک الائیڈ سروسز کے لیے چنا گیا۔ حالانکہ عام طور پر اور جائز طور پر یہ امید کی جا سکتی تھی کہ کم سے کم ۲۰ امیدوار آئی۔ اے۔ ایس اور آئی۔ پی۔ ایس کے لیے منتخب ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ان امتحانوں کے لیے ۱۳۰ سے زیادہ طالب علموں نے اپنے آپ کو حلقۂ اہلیت میں داخل کر لیا۔ انجینئرنگ کی مرکزی ملازمتوں کے لیے ہمارے صرف دو امیدوار چنے گئے۔ وہ بھی صرف الیکٹریکل انجینئرنگ کے شعبے سے۔ سول اور میکینکل ڈپارٹمنٹ کا نتیجہ صفر تھا۔ کچھ نہ کچھ تو ہمیں ضرور کرنا چاہیے۔ تاکہ ہمارے طالب علموں کی ایک بڑی تعداد آئی۔ اے۔ ایس اور آئی۔ پی۔ ایس کے لیے منتخب ہو سکے۔ یونیورسٹی کے سینئر استاد پی ایچ۔ ڈی پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور مقابلے کے امتحانوں کی طرف وہ دھیان ہی نہیں دیتے۔‘‘

۱

آپ نے دیکھا ایک بوڑھا پروفیسر جس کی عمر ۸۰ منزلیں طے کر چکی ہے، بیماری اور ضعف کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی ناکامیابی پر مضطرب اور فکر مند ہے

---

* سابق وائس چانسلر، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ ہمدرد نگر۔ نئی دہلی۔

جب تک اس کے دَم میں واقعی دَم تھا وہ فی سبیل اللہ طالب علموں کو انجینئرنگ سروسز کے امتحان کے لیے تیار کرتا رہا۔ اس کے برعکس تقریباً ۱۸ سو اساتذہ کی فیکلٹی میں دو چار کو چھوڑ کر کسی کو کوئی فکر ہی نہیں۔ ان کا رُخ تو یہ ہے، انھیں آتے امتحانوں میں یہ لڑکے تو ہماری بلا سے۔ ہمارے فرائض میں یہ خدمت مذکور ہی نہیں۔ پہلے جب کوئی نذرانہ نہیں ملتا تھا تو بعض دردمند استاد دلسوزی کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ اُس زمانے میں نتائج بھی نسبتاً اچھے رہے۔ راقم سطور کی شومیِ قسمت کہ وہ تین سال تک مرکزی وزارتوں اور پلاننگ کمیشن سے بحث کرتا رہا اور علی گڑھ کے کوچنگ سینٹر کے لیے حکومت کی امداد بالآخر لے آیا جس کے تحت اعزازیہ ملنے لگا۔ بعد میں امداد کی یہ وضع ان مراکز کے لیے بھی منظور کر لی گئی جو یو۔جی سی نے آخر کار ہندوستان کے مزید ۳۵ اداروں (۲۰ یونیورسٹیوں اور ۱۶ کالجوں) میں مقابلے کے امتحانوں کی تربیت کے واسطے کھولے۔

نتائج ہر جگہ حوصلہ شکن ہیں۔ جامعہ ملیہ میں تو بظاہر کچھ ہوا ہی نہیں۔ انھوں نے خانہ پری کے لیے اپنے نامۂ اعمال میں ان طالب علموں کو درج کر دیا جنھیں ٹیچرس ٹریننگ کالج میں داخلہ ملا تھا۔ علی گڑھ کی کوشش نحیف اور نتائج مبہم رہے۔ ملّی غیرت اور استادوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کا تقاضا تو یہ تھا کہ سو دو سو استاد اس مہم میں جان و دل سے لگ جاتے رات دن ایک کر دیتے، تخمیں اور مہارت حاصل کرنے لڑکوں کے دلوں میں آرزو کی آگ فروزاں کر دیتے اور اس کا ذمہ لیتے کہ علی گڑھ سے ہر سال کوئی بیس طالب علم مرکزی سول سروسز امتحان میں کامیاب ہوں اور تقریباً دو سو طالب علم دوسرے بے شمار چھوٹے موٹے امتحانوں میں۔ یہ کام ہرگز مشکل نہیں تھا لیکن کسی کو محنت کرنے اور پسینہ بہانے سے کیا غرض۔ انھیں احساس ہی نہیں کہ مسلمانوں پہ کتنا نازک وقت پڑا ہے۔ اگر اب وہ نہیں سنبھلے تو پھر ان کو زندہ رہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہے گا۔

کام نہ کرنے کے بہت سے بہانے ہوتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اچھے لڑکے آتے ہی نہیں۔ یہ بات غلط ہے پچھلے نو دس برسوں سے یونیورسٹی کے داخلے میں سخت مقابلہ ہوتا ہے اور اچھے اچھے لڑکے ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے ہیں۔

استادوں کے علاوہ بہت کچھ کام والدین اور معاشرے کے کرنے کا بھی ہے۔ ہمارے بچے، ہمارے بیشتر بچے اپنے گھروں میں علمی ماحول اور تعلیمی امداد سے محروم رہتے ہیں۔ گھر میں جو کچھ نہیں ملتا، معاشرے کا فرض ہے کہ اسے فراہم کرے۔ ہمسایے میں اور اسکولوں میں اصلاحی اور ارتقائی کلاسوں کا اہتمام ہمارے بچوں کے ذہنی نشو و نما اور اعتماد اور صلاحیت کی بحالی کے لیے ناگزیر ہے لیکن ذمہ داری سب سے زیادہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، کشمیر یونیورسٹی اور ان کالجوں کے اساتذہ پہ ہے جہاں مذکورہ تربیتی مراکز قائم کیے گئے ہیں۔

سول سروسز میں ہر سال ۹۰۰ کے قریب امیدوار چنے جاتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا ان میں تناسب سو سے زیادہ ہونا چاہیے لیکن دس بارہ سے زیادہ نہیں ہوتا یعنی صحیح تناسب کا دسواں حصہ۔ ان امور کی طرف نہ اساتذہ توجہ دیتے ہیں نہ یونیورسٹی کے نظم سے وابستہ مسلمانوں کے رہنما۔ انھیں خانہ جنگی اور غیر ضروری باتوں اور شخصی اقتدار طلبی سے فرصت ہو تو اس طرف دھیان دیں۔

دوسرے مکتوب کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"روزنامہ "عوام" دہلی میں مجروح انگریزی اخبار کے سلسلے میں شایع شدہ ایک مختصر سے مضمون کے ذریعے قوم کی بے حسی کا مزید علم ہوا، دل درد سے بھر آیا۔۔۔۔ اس کے

بعد فاضل نادر نگار نے ان کوششوں کی داستان
دہرائی ہے جو اس سے پہلے اخبار نکالنے کے لیے
ہندوستانی مسلمانوں نے کی تھیں) ......
آپ حضرات نے اس عظیم منصوبے کی جانب پیش رفت
کی تو ــــ صدا بر نخاست، جمشید پور میں
فساد ہوا تو راجستھان میں بھی چندہ ہوا مظلومین
کی آباد کاری اور بحالی کے لیے۔ فتح پور ایک
چھوٹا سا قصبہ ہے شیخاواتی علاقے میں، وہاں
کے ایک مسلمان رئیس نے بہت زور دینے پر
پانچ روپے چندہ دیا ــــ اور چند یوم بعد ہی
اپنی لڑکی کی شادی کی تو پانچ لاکھ خرچ کیے۔
"عروج و زوال کا الٰہی نظام" غالباً مولانا تقی امینی
کی کتاب ہے، تو ہم زوال کے اسی الٰہی نظام سے
اس وقت دوچار ہیں... مسلم قوم تو محض (یہاں
تین اشتعال پیشہ اردو رسالوں کا ذکر ہے)
... پڑھتی ہے اور بغلیں بجاتی ہے۔ لوگ زخموں
کی تجارت کر رہے ہیں....
فسادات کے دوران ــ گولیاں ــ سنی
شیعہ، دیوبندی، بریلوی، وہابی، غیر مقلد، اہل قرآن
غرضیکہ کسی میں تمیز نہیں کرتیں۔ (اس کے بعد وہ
دلخراش جملے ہیں جو ایک گروہ دوسرے گروہ
کی تنقیص و تکفیر و تہدید کے لیے استعمال کرتا
ہے)... میں تو اس قوم سے مایوس ہو چکا
ہوں ....

اب کیا ہوگا ــــ یہ قوم کبھی بھی چار
کروڑ نہ دے پائے گی، سنیما دیکھے گی تو الٹنیں
نہائے گی، سگریٹ پیے گی، پان کھائے گی،
شادیوں پر کروڑوں خرچ کرے گی۔ اس کو
کوئی پرواہ نہیں۔ آپ اس قریب المرگ قوم
کی کیوں فکر کر رہے ہیں۔ یہ کسی کی نہ سنے گی،
میں نے تو اپنے علاقے میں اور اپنے قلم اور زبان
سے سب کچھ کر دیکھا۔ صدائے بر نہ خاست ــ
قبرستان کا سا سماں طاری ہے۔ میں تو تھک گیا
چور چور ہو گیا، لوٹ گیا اور اب بھی جب دیکھتا
ہوں کہ کوئی صاحب دل پکار رہا ہے اور بازگشت
نہیں تو بے حد بے حساب رنج ہوتا ہے...
تعمیری کام کرنے والوں کی کون سنتا ہے
عطاء اللہ شاہ بخاری بہترین مقرر تھے، رات رات
بھر تقریریں کیا کرتے تھے لیکن قوم کو کیا دیا؟
ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عالی شان مقبرے میں
محو خواب ہیں۔ ہم نے نعرے لگائے، اب بھی
لگاتے ہیں لیکن نہ ہمارے نعروں میں اثر ہے
نہ ہماری تقاریر میں ــــ یہ امت خرافات
میں کھو گئی ہے"

بظاہر دونوں خطوں میں صرف دو خارجی باتیں مشترک ہیں
دونوں کا مکتوب الیہ ایک ہے، دونوں آج سے کوئی نو مہینے
پہلے لکھے گئے تھے۔ غور کیجیے تو دو باطنی باتیں بھی یکساں ملیں گی
دونوں میں کرب کی چیخ سنائی دیتی ہے اور دونوں ہندوستانی
مسلمانوں کی دردناک بے حسی کا ماتم کر رہے ہیں۔ راجستھان
کے خط میں گویا یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ترجیحات الٹ
گئی ہیں۔ وہ شخصی مفاد اور واہ واہ اور نام و نمود کے پیچھے
دوڑ رہے ہیں۔ انھیں کسی ایسے کام سے سروکار نہیں جو ملت
کے دیرپا اور دور رس فائدہ کا ہو۔ زبان کے چٹخارے پر
وہ جان دیتے ہیں۔ انھیں اس کا شعور ہی نہیں کہ ضروری اور
غیر ضروری، مفید اور مضر میں فرق کر سکیں۔ انھیں تقریریں
سنوا لیجیے، ان سے تقریریں کرا لیجیے، کبھی جو کروٹ لیں
یا تھکیں یا بے کیف ہوں۔ تعمیر اور شیرازہ بندی کی بات کیجیے
تو بگڑنے اور بکھرنے لگتے ہیں۔ شاید یہ بے دلی اور بے حسی

کافی نہ تھی کہ انھوں نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے خانہ جنگی اور خود سوزی کے سارے سر و سامان فراہم کر لیے ہیں۔

ان کا شیرازہ بری طرح بکھر رہا ہے۔ آزادی کے بعد جو پیڑھیاں اُٹھیں بالعموم ان کا کوئی تعلق اپنی جڑوں سے نہیں رہا۔ میں پڑھے لکھے طبقے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ہندی دیومالائی اور انگریزی اثرات میں ڈوبا ہوا ہے۔ جو پیڑ جڑوں سے کٹ چکا ہو وہ بادِ مخالف کی تاب زیادہ دیر تک نہیں لا سکتا۔ ہم جماعت یا ملت سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ سفر دراصل فرد سے ملت اور ملک کی طرف اور پھر عالمگیر انسانیت کی جانب ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے دوسری سمت میں سفر شروع کیا۔ توسیع اور تکبیر کے بجائے ہم تحدید اور تصغیر کے عمل میں لگ گئے۔ نقطۂ نظر اور ہمدردیوں کے لحاظ سے بڑھنے اور پھیلنے کے بجائے ہم سمٹتے اور سکڑتے چلے گئے۔ چنانچہ پہلے ملک و ملت سے بے تعلق ہوئے پھر مشترک خاندان کو توڑا اور خود غرضی اور تنگ نظری اور بے مہری کے خول میں نیوکلر فیملی یا جوہری خاندان کو لے کر گھس گئے۔ نیوکلر خاندان تنگ دستی، کس مپرسی اور خود غرضی اور چھوٹے پن کی نشانی ہے۔ میاں، بیوی اور بچے، یہ کوئی خاندان ہوا۔ جب قریبی عزیزوں کو ہمدردی کے حلقے سے باہر کر دیا تو پھر ہمسایہ، معاشرہ، جماعت، ملک اور انسان کس شمار و قطار میں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح اور فلاح کی ہر مہم یہیں سرد مہری پاتی ہے اتنی موٹی سی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر جڑ سوکھ گئی تو شاخ سرسبز کیسے رہے گی۔ مسجدوں کے لیے تو ہم چندہ دے دیتے ہیں کہ یہ آخرت کا سودا ہے۔ مدرسوں کے لیے زکوٰۃ کی مد سے اور چرمِ قربانی سے کچھ نکال دیتے ہیں لیکن انھیں تھوڑا بہت جو کچھ دیتے ہیں، رُلا رُلا کر دیتے ہیں۔ معلموں کو کبھی کبھی مہینوں تک تنخواہ نہیں ملتی۔ ستم یہ کہ پھر مڑ کر ہم انھیں موردِ الزام بھی ٹھہراتے ہیں کہ ان کا معیارِ تعلیم اچھا نہیں۔ وسائل باقاعدگی اور نظم کے ساتھ فراہم کرتے تو معیار بھی سدھرتا اور ہمیں احتساب کا حق بھی ہوتا۔ مسجدوں اور مدرسوں کے علاوہ کسی اور فلاحی مد کو ہم اہلِ خیر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ غالب کو شکوہ تھا کہ چارہ ساز اور غمگسار ہونے کے بجائے دوست ناصح بن گئے ہیں۔ یہ انیسویں صدی کے نیمۂ اول کی بات تھی۔ بیسویں صدی کے نیمۂ آخر میں ہمارے دوست ناصح تو بنے رہے، ساتھ ہی ساتھ محتسب بھی بن گئے۔ روپیہ مانگنے جائیے، نصائح سے آپ کی جھولی بھر جائے گی۔ احتساب سے آپ کا ناطقہ بند کر دیں گے کتنے کھوکھلے اور بناوٹی ہیں یہ اطوار۔ ان میں کتنی ریاکاری اور سینہ زوری بھری ہوئی ہے۔

چنانچہ پرانے اوقاف کو ہم ابھی تک رو رہے ہیں۔ نئے اوقاف کا باب شمالی ہندوستان میں تو بند ہو ہی گیا ہے۔ اوقاف دراصل ایک ذریعہ تھے عزتِ نفس اور استمرار کے ساتھ دینی اور تعلیمی کام کرنے کا۔ اب تو کوئی مدرسہ، دراصل کوئی تعمیری کام، چندے کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ چندے سے چلنے والے کام کو ثبات کہاں؟ مصلین اور سفرا عزتِ نفس کو ہم سفر بنائیں تو راستہ کھوٹا ہو جائے۔

" کیا وقت نہیں آگیا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں جدید سائنس کے غیر متنازع فیہ حصوں کو شامل کر لیا جائے؟ مثلاً نیوٹن کے قوانین، ستاروں اور کہکشاؤں کی فلکی طبیعیات، قدرت کی بنیادی قوتوں کا علم، جینی کوڈ اور زمین کی ساخت وغیرہ۔"

ہسٹن اسمتھ

حقائق خیر اور فراخ دلی کے سوتے ایک اور جہت سے بھی سوکھ گئے ہیں۔ یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ تعلیمی اور تعمیری کاموں کی مدد کے فرائض ہندوستان کے غریب مسلمانوں سے منتقل ہو کر خاور میانہ کے خوشحال مسلمانوں تک منتقل ہو گئے ہیں۔ وہاں سے جو مدد ملتی ہے وہ کتنی مصیبت اور فضیحت کے بعد دستیاب ہوتی ہے اور کتنی کم۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا، یہ کوئی نہیں سوچتا اور نہ اس طرف کسی کا دھیان جاتا ہے۔ کہ زندگی کا زریں اصول ہے کہ

"اپنی مدد آپ کرو"

کاسۂ گدائی لے کر ملک کے باہر جانا بے غیرتی کا کام ہے۔ حکومتوں کے لیے یہ بھلا کی بات رہا ہو یا نہیں اداروں اور افراد کے سروں کو یہ شرم سے ضرور جھکا دیتی ہے۔

تعلیمی اور تعمیری کاموں کے لیے وسائل کو شخصی رحم و کرم اور تلون سے نکال کر اداراتی اور اجتماعی شکل دینی چاہیے، ورنہ اس طرح گاڑی زیادہ دیر تک نہیں چل پائے گی۔ دراصل چل بھی نہیں رہی ہے۔

خدا اور خدا شناسی

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:۔

"میں پاکیزگی بیان کرتا ہوں اس ذات کی جس نے اپنی مخلوق کے لیے کوئی راستہ اپنی معرفت کا نہیں رکھا سوا اِس کے کہ لوگ اس کی معرفت سے عاجز ہو جائیں"

جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت کا مزہ چکھ لیتا ہے پھر اُسے دُنیا حاصل کرنے کی مُہلت نہیں مِلتی اور اسے انسانوں سے گھبراہٹ اور وحشت ہوتی ہے"

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مُرتدوں کو فرمان لکھتے ہُوئے فرمایا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس جیسا کوئی دُوسرا نہیں۔ اُسے نہ نیند آتی ہے اور نہ جھپکی۔ وہ اپنے سب کاموں کا دھیان رکھتا ہے اور نافرمانوں کو سزا دیتا ہے۔

اسلامی درسگاہوں کے اسباب زوال اور ان کا علاج

مفتی نظام الدین رضوی*

بچپن سے سنتا آیا ہوں کہ دنیا میں صرف ایک چیز ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں اور وہ چیز ہے ''موت''

لیکن مسلم قوم کی مساعی جمیلہ سے ایک چیز اور دریافت ہو چکی ہے جس میں ارباب دانش کے مابین کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور وہ چیز ہے "مسلمانوں کا علمی زوال"

آج کے زمانے میں اس امر پر تقریباً سب کا اتفاق ہو چکا ہے کہ مسلم قوم تمام (قابل ذکر) اقوام عالم میں تعلیم کے میدان میں سب سے زیادہ پیچھے اور نہایت پسماندہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ''موت'' اور علمی زوال کے درمیان بڑی یگانگت پائی جاتی ہے۔ صحیح معنوں میں زندگی عبارت ہے علم سے۔ جب علم ہی نہیں تو زندگی بھی نہیں۔ اس لیے بڑی بھول ہو گی اگر ہم نے علمی زوال اور موت کو الگ الگ شے تصور کیا ؎

اخو العلم حیی خالدٌ بعد موتہ
واوصالہ تحت التراب رمیم
وذو الجھل میت وھو ماش علی الثری
یظن من الاحیاء وھو عدیم

[صاحب علم اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا، حالانکہ اس کے اعضاء مٹی میں بوسیدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور جاہل مردہ ہے، حالانکہ وہ زمین پر چلتا پھرتا ہے، لوگ تو اسے زندہ سمجھتے ہیں لیکن واقع میں اس کی کوئی ہستی نہیں ہوتی]۔

یہ اس قوم کی علمی زبوں حالی کا تذکرہ ہے جس کے فرزندوں نے کبھی علوم و فنون اور تحقیقات و اکتشافات کے میدان میں ساری دنیا میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا تھا اور جس کے ایک فرد کے متعلق پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لو کان العلم معلقا بالثریا لینالہ رجل من اھل فارس

[اگر علم ثریا پر ہوتا تو بھی اہل فارس کا ایک شخص (امام ابو حنیفہؒ) اسے حاصل کر لیتا]۔

مگر ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل

ہم تفصیل میں نہ جا کر صرف مدارس کے گرتے ہوئے تعلیمی معیار اور علل کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے۔

اسباب زوال

۱۔ سرمایے کی کمی ۲۔ انتظامیہ کے اختلافات اور ان کی گروہ بندی ۳۔ تعلیم کی طرف سے اساتذہ کی نااتفاقی یا

---

* جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

صرف تنخواہ کی حد تک لگاؤ۔ ۴۔ قابل و شفیق اساتذہ کی کمی ۵۔ اساتذہ کی قلت اور بعض بعض جماعتوں میں طلبہ کا ہجوم۔ ۶۔ مدارس کا غیر تعلیمی ماحول ۷۔ طلبہ کی تن آسانی، عیش پسندی محنت سے گریز اور تقریر سے حد درجہ دلچسپی۔ ۸۔ سخت امتحان سے غفلت اور نقل وچوری میں ڈھیل یا تعاون۔ ۹۔ کتابوں کی نافراہمی ۱۰۔ نصاب تعلیم ونظام درس کی خامیاں۔

چند اسباب کی وضاحت۔ ہم چند اہم اسباب کی قدرے وضاحت کرتے ہیں:

سرمایہ کی کمی مدرسے کے لیے ہو یا اساتذہ کے لیے، یا طلبہ کے لیے۔ یہ بہرحال اعلیٰ تعلیم کے انتظام و حصول کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

طلبہ کے لیے کمی کی صورت میں حصول علم کے لیے جتنا وقت درکار ہے وہ اتنا وقت نہیں دے سکتے، جب کہ علم کی وسعت کے لحاظ سے وقت کی وسعت لازم وضروری ہے لیکن اس کا علاج بایں طور سہل ہو جاتا ہے کہ مدرسے سے ان کے لیے وظیفہ کا انتظام ہو جائے۔

اساتذہ کے لیے سرمایہ کی کمی انھیں تدریس کے ساتھ دوسرے ذرائع معاش بالخصوص "خطابت" کی طرف متوجہ کرے گی۔ حالانکہ تدریس وخطابت باہم ایک دوسرے کی ضد ومنافی ہیں۔ یا کم از کم دونوں میں ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور تال میل کا کوئی گوشہ نہیں پایا جاتا۔ کسی بھی مدرسے میں اساتذہ کے زمرے میں "خطباء کرام" کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی تعلیم بھی اسی کے تناسب کے لحاظ سے کمزور سے کمزور تر ہوگی۔

مدرسے کے لیے سرمایے کی کمی درج بالا دونوں امور کا سبب ہونے کے ساتھ لائق اساتذہ اور کتابوں کی قلت کی بھی باعث ہوگی جو براہ راست تعلیمی ترقی پر اثر انداز ہوں گے لیکن اس کا علاج کوئی دشوار نہیں جیسا کہ ہم آئندہ واضح کریں گے۔

انتظامیہ کے باہمی مشاجرات واختلافات کا تعلیم پر دو طرح سے اثر پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اساتذہ إلا ما شاء اللہ کافی حد تک آلہ ہو جاتے ہیں کیونکہ ارکان ادارہ کو آپسی رقابتوں اور جھگڑوں سے ہٹ کر تعلیمی نظام کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہیں مل پاتی۔

اور دوسرا بھیانک اثر یہ ہوتا ہے کہ اساتذۂ کرام جو فی الواقع مدرسے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں، یہ بھی مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور انتظامیہ کی طرح یہ حضرات بھی زیادہ تر اپنی ذہنی توانائی، داؤ پیچ اور غیر تعلیمی امور میں صرف کرتے ہیں۔ یہ تعلیم کی بربادی کا نہایت خطرناک موڑ ہوتا ہے مگر ضد اور نفسانیت اس موڑ پر بھی فریقین کو راہ راست کی طرف مائل نہیں ہونے دیتی اور مدرسہ بتدریج تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے

اس کا علاج یہ ہے کہ انتظام نااہلوں کے سپرد نہ کیا جائے اور خدائے پاک سے اخلاص واصلاح کی دعا کی جائے۔

اساتذہ کی تعلیم کی طرف ناالتفاتی یا صرف تنخواہ کی حد تک وابستگی ہمارے علمی زوال کا ایک بڑا سبب ہے۔

بات تلخ ہے مگر حقیقت ہے کہ بہت سے اساتذۂ کرام اپنی دلچسپی کے مختلف مشاغل (تعویذ، گنڈا، خوش گپی اور اخبار بینی وغیرہ) کی مصروفیت کے باعث یا تو مطالعہ کی زحمت نہیں کرتے یا ناکافی مطالعہ کرتے ہیں، درس گاہوں میں چند منٹ پڑھا کر باقی اوقات غیر درسی گفتگو میں ضائع کرتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں فریضۂ درس سے سبکدوشی کے لیے ادنیٰ ما یطلق علیہ الدرس کافی ہے۔

جب اساتذہ کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہوگا تو طلبہ جیسے "بھلے مانسوں" کی آزادی کا کیا حال ہوگا ؎

قیاس کن زگلستان او، بہارش را

اس کی وجہ فرض ناشناسی، خدا ناترسی، صدر مدرس کی ڈھیل اور خواہ مخواہ اساتذہ کی رضا جوئی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب بھی بہت سے اساتذۂ کرام پوری محنت ولگن کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف رہتے ہیں اور رہی سہی تعلیم فی الواقع انھیں کی جاں فشانیوں اور انھیں کے خلوص کا ثمرہ ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ قابل و شفیق اساتذہ جن کی کاوشوں سے
شجرِ علم بار آور ہو سکتا ہے، اکثر مدارس میں نایاب نہیں تو کمیاب
ضرور ہیں۔ ایک اچھے و شفیق استاد کے بنیادی اوصاف یہ ہیں کہ
۱۔ وہ خود باصلاحیت ہو۔ ۲۔ مطالعہ کر کے بخوبی تدریس
کی تیاری کرے۔ ۳۔ اس کے اندر طلبہ کو بامقصد تعلیم کی طرف
آمادہ کرنے کے ساتھ انہیں اپنے فن میں لائق و فائق بنانے کا
جذبہ کارفرما ہو۔ ۴۔ ان کے شبہات و اعتراضات کا خوشدلی
کے ساتھ تشفی بخش جواب دے اور ان کی حوصلہ افزائی کرے
۵۔ پاکیزہ سیرت اور بلند اخلاق کا حامل ہو اور ساتھ ہی طلبہ کی
کردار سازی و تشکیلِ سیرت میں کوشاں بھی ہو ـــــ ہم میں کتنے
حضرات ان اوصاف کے حامل ہیں؟

ایک دانشور کا قول ہے کہ

"استاد کی شفقت اور توجہ کی نگاہ شاگرد کو
آسمان تک پہنچا سکتی ہے۔"[1]

تو کیا وجہ ہے کہ ہم آسمانِ فضل تک رسائی تو درکنار اس
کی بلندیوں کی طرف رخ بھی نہیں کر پاتے؟ اس کے ذمہ دار ہم
ہیں یا فقط سرمایہ؟

اکثر مدارس کے غیر تعلیمی ماحول کی زیادہ تر ذمہ داری
رئیس المدرسین اور اساتذہ کے ہی سر جاتی ہے۔ یہ ماحول تعلیم
کے ارتقاء کی راہ میں ایک "بحرِ ظلمات" ہے جس کی تاریکی میں
ایسے ایسے ذہن و دماغ بھی بے نور ہو کر رہ جاتے ہیں جنہیں اپنے
وقت میں سمائے علم و عرفان کا آفتاب و ماہتاب ہونا چاہیے تھا
سباع و بہائم سے ماحول کا تربیت یافتہ انسان اپنی قوتِ لطیفہ
بشری خصائل کو کھو سکتا ہے تو غیر تعلیمی ماحول کا پروردہ شخص کیا اپنی
فطری صلاحیتوں کے نور سے محروم نہیں ہو سکتا؟

یہ کتنا عظیم المیہ ہے کہ ایک تشنۂ علم "آبِ حیات کے چشمۂ
شیریں" کے قریب پہنچ کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے اور اپنی زندگی
کو "زندگیٔ جاوداں" بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں کر پاتا بلکہ

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اساتذہ و صدر المدرسین کے بعد تعلیم کی زبوں حالی کا سہرا
طالبانِ علم کے سر بندھتا ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ طلبہ پڑھنے میں سخت محنت، بلکہ صرف
محنت سے کتراتے ہیں۔ ان کے مسلک میں تن آسانی، عیش پسندی
اور تضیعِ اوقات کا ایک اہم مقام ہے جب کہ جد و جہد اور مشق و
مزاولت کا کوئی مقام اور کوئی وقار نہیں۔ حالانکہ انہیں اس دشوار
گزار مگر عظیم سفر کے آغاز میں ہی یہ درس دیا جاتا ہے۔

بقدر الکد تکتسب المعالی
ومن طلب العلی سہر اللیالی
یغوص البحر من طلب اللآلی
ویحظی بالسیادۃ والنوال
ومن طلب العلی من غیر کد
اضاع العمر فی طلب المحال

[بلندیاں محنت و ریاضت کی مقدار ہی سے حاصل ہوتی
ہیں اور بلندی کا طالب راتوں کو بھی جاگ جاگ کر
گزارتا ہے۔ موتی کا جویا سمندر میں غوطہ لگاتا ہے
اور سرداری اور انعامات سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔
اور جو شخص بغیر محنت و جانفشانی کے بلندی کا طالب
ہو وہ اپنی عمر کو محال کی جستجو میں ضائع و برباد
کرتا ہے]

انہیں اس بات کی بھی ہدایت کر دی جاتی ہے کہ:

لو کان هذا العلم یدرک بالمنی
ما کان یبقی فی البریۃ جاہل
فاجہد ولا تکسل ولا تک غافلا
فندامۃ العقبی لمن یتکاسل

---

[1] پروفیسر عبد السلام۔ نوبل انعام یافتہ، سربراہ عالمی مرکز فروغ سائنس۔ ٹریسٹے۔ اٹلی۔

"اگر آرزوؤں و تمناؤں سے علم حاصل ہو جاتا تو کائنات میں کوئی بھی انسان جاہل نہ رہتا۔ لہٰذا محنت کرو، کاہل مت ہو اور غفلت و لاپرواہی نہ برتو کہ کاہل کے لیے عقبیٰ کی شرمندگی ہوتی ہے"۔

مگر کم ایسے طلبہ ہیں جو اس درس یا ہدایت کو یاد رکھتے ہوئے اس پر کاربند ہوتے ہیں، جب کہ محنت و ریاضت حصول علم کے چھ بنیادی شرائط میں سے ایک ہے۔ اگر آج بھی طلبہ پوری لگن اور دلچسپی کے ساتھ حصول علم کے لیے جہد مسلسل و سعی پیہم میں منہمک ہو جائیں تو مذکورہ بالا اسباب میں سے کوئی بھی سبب ان کو علمی ترقی و حصول بلندی سے نہیں روک سکتا۔ مگر تعلّم کے میدان میں ان کے جہد و ریاضت کا حال اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہے جو تعلیم کے میدان میں عام اساتذۂ کرام کا ہے۔

طلبہ و مدرسین کی مشترکہ سستی و عیش پسندی نے اب ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ مغرب میں ہمارا اس طرح سے مذاق اڑایا جاتا ہے۔

"کسی خیالی بازار میں ایک صاحب انسان کا دماغ خریدنے گئے۔ دکان پر ہر مذہب کے ماننے والوں کے دماغ رکھے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر دکان دار نے انہیں بتایا کہ ایک یہودی کے دماغ کی قیمت ایک ڈالر، عیسائی دماغ کی چار ڈالر اور مسلمان دماغ کی قیمت سولہ ڈالر ہے۔ خریدار حیرت سے بولا: عجیب بات ہے یہودی جو اس وقت دنیا میں اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کے لیے مشہور ہیں، ان کا دماغ سب سے سستا اور مسلمانوں کا اتنا مہنگا! دکان دار نے جواب دیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں مسلمانوں نے الجبرا کی ایجاد کے بعد سے اپنے دماغ کو خرچ ہی کب کیا، ان کے دماغ کا سارا مغز محفوظ ہے"۔[۱]

تعجب ہے کہ ہم اس طرح کے طنز و طعن سن لیتے ہیں لیکن ہمیں اپنی پستی و انحطاط کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا ——— آخر تابکے!

طلبہ کے محنت سے گریز کی ایک وجہ تعلیم کے مقصد بلند اور اس کی افادیت سے صرف نظر ہے اور بڑی وجہ ہے سخت امتحان سے غفلت اور نقل و چوری میں ڈھیل یا چشم پوشی۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایک ناعاقبت اندیش طالب علم جب یہ جان لے گا کہ اسے امتحان میں کسی بھی طرح نقل کی رعایت یا گنجائش مل سکتی ہے تو وہ محنت یا شب بیداری کی تکلیف کیوں کر برداشت کرے گا؟ ——— کسی بھی مدرسے کے معیار تعلیم کا اندازہ وہاں کے معیار امتحان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ امتحان کی سختی معیارِ تعلیم کی بلندی کی اور نرمی و چھوٹ پستی کی دلیل ہوتی ہے۔

پستی کا ایک اہم اور بنیادی سبب قدیم نصاب تعلیم و نظام درس کا نقص ہے جو پورے طور سے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اس لیے جدید ذہن اس سے بمشکل ہم آہنگ ہو پاتے ہیں۔

کتب منطق و فلسفہ کا بوجھ، جدید علم کلام کا فقدان، سائنس جدید، ریاضی اور بین الاقوامی زبان انگریزی کا عدم شمول، بیشتر مشکل ترین اور پیچیدہ کتابوں کا انتخاب، سہل الحصول کتابوں سے تقریباً بالکلیہ اعراض، تاریخ و سیرت اور ادب عربی و انشا سے لاتعلقی و بیگانگی ——— حل عبارات کی غیر ضروری موشگافیاں، قیل و قال میں حد درجہ انہماک، اصل مسائل و مقاصد کے اجزاء سے بے توجہی، علوم و فنون کے مختلف و متنوع شعبہ جات کی عدم تقسیم ہمارے نصابِ تعلیم و نظام درس کی نمایاں خامیاں ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک خامی کی وضاحت کرتے ہیں۔

فلسفہ جس کے نظریات پہلے ہی سے لغو و لایعنی تھے جیسا کہ امام احمد رضا قدس سرہ کی کتاب الکلمۃ الملھمۃ کے مطالعہ سے عیاں ہے اور اب سائنس جدید کی تحقیقات و انکشافات نے بھی اس کا فرسودہ ہونا ثابت کر دیا ہے۔ ایسے پڑھنے و پڑھانے سے کیا فائدہ جب کہ اس کے بیشتر اصول نظریۂ اسلام سے متصادم بھی ہیں؟ چنانچہ ہم عنقریب اس کی تائید میں ایک مبتریِ اسلام کی رائے پیش کریں گے۔

---

[۱] ماہنامہ تہذیب الاخلاق ج ۶، ش ۵، ماہ مئی ۸۷ء، ص ۱۳ ——— مقالہ پروفیسر اسرار احمد، استاد دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اس حیثیت سے بھی غور فرمایئے کہ جس زمانے میں علمائے اسلام نے فلسفہ یا نام نہاد "حکمت" سے اشتغال کیا تھا، اس زمانے میں اسی "حکمت ضالہ" کے اصول و نظریات کی بنیاد پر براہِ راست اصولِ اسلام کے ڈھانے کی کوشش کی جا رہی تھی تو ضرورت تھی کہ ان کے "اصول مزخرفہ" کو دلائل کی روشنی میں باطل کیا جائے اور چمنستانِ اسلام کو فلسفہ کے بادِ سموم سے بچایا جائے۔ اس لیے متقدمین کے عہد میں فلسفہ کا درس اس زمانے کے مقتضیات کے عین موافق و مطابق تھا۔ لیکن اب زمانہ بدلا، کہ باطل نے اسلام پر اپنے حملے کا میدان و انداز بدل دیا۔ اب جدید طرزِ استدلال ہے، جدید اسلوب ہے، جدید اسلحہ اور جدید ساز و سامان ہیں مگر ہم ہیں کہ طرزِ کہن سے ایک انچ کھسکنے کو تیار نہیں ہیں ؎

سب باندھ چکے رختِ سفر اپنا سرِ شام
ہم ہیں کہ ابھی دستِ حنا دیکھ رہے ہیں

ضرورت تھی کہ وقت کے تقاضوں کے بدلنے کے ساتھ ہم بھی اپنے نصاب میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے مگر افسوس کہ اب تک ایسا نہ ہو سکا۔

مجھے اس بات کے خیال پر تعجب ہوتا ہے کہ سیکڑوں شرعی احکام میں زمانے کے بدلنے کے ساتھ اسلام نے تغییر و تبدیل کی اجازت دی ہے اور ہم بڑی فراخ دلی کے ساتھ یہ تغیر کرتے بھی رہتے ہیں مگر اپنے ہی بنائے ہوئے نصابِ تعلیم میں "تغیر" تو درکنار، ترمیم بھی گوارا نہیں کرتے۔ ہم اسے اپنے بزرگوں کا اتباع سمجھتے ہیں مگر یہ فی الواقع ان کا اتباع نہیں بلکہ فکر و تجدید کی خار دار وادی میں قدم رکھنے سے گریز کا بیجا عذر ہے۔

پھر یہاں یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ لائقِ غور رہے کہ علمِ کلام جو عقایدِ اسلام سے روشناس کراتا ہے اور اسی وجہ سے وہ "اشرف العلوم" ہے اس کی تو صرف ایک کتاب داخلِ درس ہے جبکہ فلسفہ جو عقایدِ اسلام کا ابطال کرتا ہے اس کی لگ بھگ نصف درجن کتابیں بڑے انہماک و شوق و ذوق کے ساتھ پڑھائی جاتی ہیں۔

فلسفہ عبقریِ اسلام کی نظر میں

اب فلسفہ کے متعلق عبقریِ اسلام کی رائے ملاحظہ کیجیے۔ امام احمد رضا قدس سرہ رقم طراز ہیں:

"اکثر طبعیات و عامۂ الٰہیاتِ فلاسفہ صدہا کفرِ صریح و شرکِ جلی پر مشتمل ہیں۔ مثلاً زمان و حرکت و افلاک و صورتِ جرمیہ و نوعیہ و عنصریات و انواعِ موالید و نفوس کا قدم اور خالقیتِ عقولِ مفارقہ و انکارِ فاعلِ مختار و علمِ جزئیات و حشرِ اجساد و جنت و نار و احالۂ خرقِ افلاک و اعادۂ معدوم و صدورِ کثیر من الواحد وغیرہا، اور ان کے سوا اور اجزاء و فروعِ فلسفہ بھی کفریاتِ صریحہ و محرماتِ قبیحہ سے مملو ہیں۔ انصافاً ان کی تعلیم و تعلم زہرِ مہلک ہے و نارِ محرق مگر بچند شروط"۔[۱]

پھر سات شرطیں بیان کر کے (جن میں اب بہت سی مفقود ہیں) لکھتے ہیں:

"ان شرائط کے لحاظ کے ساتھ بعونہٖ تعالیٰ اس کے ضرر سے تحفظ رہے گا اور اس تعلیم و تعلم سے انتفاع متوقع ہوگا کہ تشحیذِ اذہان ہو گی، ضلالاتِ فلسفہ کے رد پر قدرت ملے گی، بہت بدمذہب کہ مناظرات میں کفار فلاسفہ کا دامن پکڑتے ہیں ان کی دنداں شکنی ہو سکے گی۔ انھیں اغراض سے درسِ نظامی میں یہ کتب رکھی گئی تھیں کہ اب شدہ شدہ از کجا تا کجا نوبت پہنچی"۔[۲]

اس کے برخلاف عصری علوم کے متعلق آپ کا یہ نظریہ ہے:

"اسی طرح بہت سے اجزائے حکمت مثل ریاضی، ہندسہ و حساب و جبر و مقابلہ و ارثماطیقی و مساحت و مرایا و مناظر و جر اثقال و علم مثلث کروی و مثلث مسطح و سیاست مدن و تدبیرِ منزل و مکائد حروب و فراست و طب و تشریح و بیطرہ و بیزرہ و علم زیجات و اسطرلاب و آلات رصدیہ و مواقیت و معادن و نباتات و حیوانات و کائنات الجو و جغرافیہ وغیرہا بھی شریعتِ مطہرہ سے مضادت نہیں رکھتے بلکہ ان میں بعض بلا واسطہ اور بعض بالواسطہ امورِ دینیہ میں

---

[۱] فتاویٰ رضویہ جلد دہم نصف اول ص ۲۰۰

[۲] فتاویٰ رضویہ جلد دہم نصف آخر ص ۸

تانبے وغیرہ اور بعض دیگر دنیا میں کار آمد ہیں۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ شہید عمرو، پدر و پسر نے ایک تاریخ معین میں دو مختلف شہروں میں ٹھیک طلوع شمس کے ساتھ انتقال کیا ناواقف فرائض داں وقت موت کے ایک ہونے کے خیال سے مطلقاً ایک دوسرے کے وارث نہ ہونے کا حکم دے گا اور واقف اطوال و عروضِ بلاد و دقائق مرتبہ قطر شمس، و مطالع بلدیہ بروج بوامرہ زتج حکم صحیح دے گا۔" [1]

اس طرح مثالوں سے علوم مذکورہ کی افادیت کو واضح کرنے کے بعد لکھتے ہیں ؛

" غور کیجیے کتنا تفاوت احکام ہوگیا اور تعلیقات میں تو ہزارہا صورتیں نکلیں گی جن کا حکم بے ان علوم کے ہرگز نہ کھلے گا اور فقیہ کو ان کی طرف رجوع سے چارہ نہ ملے گا۔

تو مطلقاً علوم عقلیہ کے تعلیم و تعلم کو ناجائز بتانا، یہاں تک کہ بعض مسائل صحیحہ عقلیہ پر اشتمال کے باعث توضیح و تلویح جیسے کتب دینیہ کے پڑھانے سے منع کرنا جہالت شدیدہ و سفاہت بعیدہ ہے۔" [2]

علاج :۔ اوپر جن خامیوں کا ذکر ہوا ہے ان کی اصلاح ہمارے مدارس کی تعلیم کو بلندی تک پہنچا سکتی ہے۔ ہم اس اصلاح کی قدرے وضاحت کرتے ہیں۔

سو مالیے کی کمی کا مسئلہ ضرور بجائے خود اہم ہے لیکن موجودہ زمانے میں اس کا حل کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ اکثر مدارس اب اس قدر ضرور خوش حال ہیں کہ وہ اگر اپنی بساط کے مطابق ہی تعلیم کا نظم و نسق کریں تو وہ خود کفیل ہوں گے اور ساتھ ہی معیار تعلیم بھی اچھا مد تک بلند و مضبوط ہوگا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ چھوٹے، بڑے، نئے پرانے ہر مدرسے میں دورے (فضیلت) تک تعلیم ہو۔ اگرچہ اس کے لائق اساتذہ بھی فراہم نہ ہوں۔ پھر بھی اہل خیر کو مدارس کے تعاون کی طرف مزید توجہ کی ضرورت ہے ؎

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

باصلاحیت، غیر خطیب مدرس کا تقرر کیا جائے، کسی بھی مدرس کے درس میں ایسی کتاب نہ رکھی جائے جو اس کے پڑھانے کا اہل نہ ہو۔ مقدار تعلیم کا ایک اندازہ مقرر کر دیا جائے جس کی تکمیل متعینہ مدت میں لازمی ہو۔ اساتذہ درسی کتابوں اور ان کے متعلقات کا بالالتزام مطالعہ کریں۔ پوری گھنٹی درس جاری رکھیں۔ اساتذہ بالخصوص صدر مدرس ہفتہ عشرہ میں ایک دو بار طلبہ کی قیام گاہ یا دار المطالعہ میں تشریف لے جا کر ان کے مشاغل کی جانچ کرتے رہیں۔ کسی بھی قسم کی ناول کی کتاب پر تعلیم کے اوقات میں پابندی رکھی جائے، امتحان میں پوری سختی کی جائے اور کسی بھی قسم کی ڈھیل روا نہ رکھی جائے۔ ممتحنین کاپیوں کا باقاعدہ مطالعہ کریں اور کسی بھی طالب علم کو اتنے ہی نمبر دیں جتنے کا وہ حق دار ہے۔ داخلے کے وقت تمام امیدواروں کا مقابلہ جاتی امتحان (کمپیٹیشن) بھی لازمی قرار دیا جائے۔ یہ امتحان بھی پوری سختی کے ساتھ ہو اور کامیاب طلبہ کا داخلہ ہی منظور کیا جائے۔

نصاب تعلیم میں منطق و فلسفہ کا بوجھ کم کر کے ریاضی و سائنس کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ زبان کی حد تک انگریزی انٹرمیڈیٹ تک پڑھائی جائے۔ اصول فقہ اور نحو کی ایک ایک کتاب (مثلاً حسامی، شرح جامی) کم کر کے جدید علم کلام و جدید فقہی مسائل کو شامل نصاب کیا جائے (لیکن اس سے پہلے ان موضوعات پر دو جامع کتابیں مرتب کرنے کا انتظام بے حد

---

[1] فتاوی رضویہ جلد دہم نصف اخیر ص ۸۲

[2] فتاوی رضویہ ۔ جلد دہم ۔ نصف آخر ص ۸۳

ضروری ہے) کچھ تاریخ و سیرت کی کتابیں بھی شامل نصاب کرنا ضروری ہیں۔ نحو میر، کبریٰ میزان اور منشعب کی جگہ آسان اردو کی متعلقہ کتابیں بچوں کو پڑھائی جائیں کہ بچے غیر مانوس زبان کی بہ نسبت اپنی زبان میں قواعد کو سہولت کے ساتھ سمجھ کر محفوظ رکھ سکیں گے اور فارسی دانی کے لیے تو ادب فارسی کی بہت سی کتابیں ہیں۔

مختلف علوم و فنون کے شعبے تقسیم کر کے ہر شعبہ باذوق اور قابل اساتذہ کے سپرد کیا جائے۔ اپنے نصاب کو مختلف یونیورسٹیوں سے منظور کرایا جائے تاکہ ہمارے طلبہ وہاں عصری تعلیم حاصل کر کے زندگی کے دوسرے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے سکیں۔ ان کا دائرہ فکر صرف مسجد کا امام، جلسوں کا خطیب اور درس گاہوں کا استاد ہونے تک ہی محدود ہو کر نہ رہے بلکہ وقت کے تقاضوں اور عصر نو کے مسائل سے آشنا ہو کر وہ ملی قیادت کے صالح بھی بن سکیں۔ آخر کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کا خطبہ ہم پڑھتے ہیں تو اس کے تقاضوں کو پورا کون کرے گا کہ

الغرض کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

اور ان سب سے ضروری اور ناشد ضرورت یہ ہے کہ ہم تعلیم و تعلم اور علمی ارتقا کے لیے کامل دلچسپی و شوق و ذوق کے ساتھ جد و جہد اور محنت و ریاضت میں مشغول ہو جائیں اور اس کا تسلسل اس طور پر برقرار رکھیں کہ طلب کی پیاس آخر دم تک کم نہ ہونے پائے اور بڑی سے بڑی منزل پر پہنچنے کے بعد بھی ہم یہی محسوس کریں کہ ابھی ہماری ترقی کا آغاز ہوا ہے اور یہ ہمارے عروج کا ابھی پہلا زینہ ہے ؎

پے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتوان خدا را شناخت

پگھلنا علم کی خاطر مثال شمع زیبا ہے
بغیر اس کے نہیں پہچان سکتے ہم خدا کیا ہے

مسلمان اور سائنس

" جسے ہم لوگ سائنس کہتے ہیں اس کی بنیاد مشاہدات، تجربات اور ناپ تول پر ہے اور ان نئے طریقوں سے یورپ والوں کو مسلمانوں نے متعارف کرایا۔ اسلامی تہذیب کا سب سے گراں قدر عطیہ موجودہ دور کی سائنس ہے۔"

بریفالٹ

اعلان

کاغذ اور دیگر طباعتی اشیا کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے بادل ناخواستہ

تہذیب الاخلاق اور نشانات

کی قیمتوں میں یکم اگست ۱۹۸۹ء سے اضافہ کیا جاتا ہے

ہندوستان میں نئی شرح خریداری کی تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ سالانہ زرِ خریداری :	Rs 45-00
۲۔ سالانہ زرِ خریداری : (صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا کے لیے) :	Rs 30-00
۳۔ قیمت فی شمارہ :	Rs 4-50
۴۔ حیاتی خریداری :	Rs 450-00

تہذیب الاخلاق اور نشانات کے سرپرستوں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ مالی ایثار سے کام لیتے ہوئے اس تبدیلی کا خوش دلی سے خیر مقدم کریں گے۔

سرکولیشن انچارج

ایڈس کا سائنٹفک پہلو

بصیر لودی*

ایڈس کے نام سے سب ہی واقف ہیں اور سائنٹفک پہلو معلوم نہ ہونے کی وجہ سے لوگ خوف زدہ بھی ہیں۔ چنانچہ عوام کے سامنے اس مرض کی حقیقت لانا ضروری ہے۔ دراصل یہ انسان کے غیر فطری عمل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرض کی شکل میں عذاب ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے لواطت میں قوم لوط ملوث ہوئی، وہ قوم لواطت کی وجہ سے تباہ کردی گئی۔ حیرت ہے اس انسان پر کہ اس نے اس غیر فطری عمل کو نہ چھوڑا۔ آج کی سائنٹفک دنیا کے انسان کو آتشک، سوزاک جنسی امراض سے چھٹکارا نہ مل سکا تھا کہ ایڈس جیسے مہلک مرض میں ملوث ہوگیا۔

ایڈس ایک متعدی مہلک مرض ہے جس میں قوت مدافعت کسبی متاثر ہوتی ہے۔ اس کا سبب وائرس ہے جو (Retrovirus Group) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تحقیق ۱۹۰۹ء میں ہوگئی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں رابرٹ گیلو (امریکہ) نے HTLV III کا مطالعہ کیا اور ۱۹۸۳ء میں لیوی (سان فرانسسکو) (ARV) کی معلومات حاصل کیں یہی وائرس ایڈس کا سبب ہیں۔

اٹلانٹا میں امراض پر قابو پانے کا ایک مرکز ہے ۱۹۸۱ء میں اس مرکز کو یہ خبر موصول ہوئی کہ چند نوجوان جو اغلام بازی کے عادی ہیں، وہ پھیپھڑے کے امراض اور جلد کے ایسے کینسر میں مبتلا ہیں جو شاذ و نادر ملتے ہیں۔ ان نوجوانوں کے مختلف ٹیسٹ کیے گئے، معلوم ہوا کہ ان کی قوت مدافعت کسبی ناکام ہوگئی ہے۔ اس طرح ایک نئے مرض کی تحقیق ہوئی اور مرکز نے اس کا نام ایڈس رکھا۔

۱۹۷۷ء کے بعد کسی شخص نے ایک مرتبہ بھی اغلام بازی کی ہے، اس کے خون میں یہ وائرس مل سکتا ہے۔ یہ وائرس منی (semen) اور دودھ میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان ہی ذرائع سے تعدیہ پھیلتا ہے۔ جب کوئی شخص بدفعلی کا عمل کرتا ہے تو عضو مخصوص اور معا مستقیم کی دیوار میں ضرب ہو جاتی ہے اور اسی ضرب سے منی (semen) کی جذب ہو جاتی ہے یا حاملہ عورت میں مشیمہ (Placenta) کے ذریعے وائرس جنین میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایڈس کی مریضہ کسی بچے کو اپنا دودھ پلائے تو دودھ کے ذریعے وائرس بچے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان مریضوں پر استعمال ہونے والے آلات مثلاً انجکشن سوئی، بیوٹی پارلے میں استعمال ہونے والی سوئیاں یا [illegible] acupuncture - اس کے علاوہ انتقال الدم Blood [illegible] انتقال Transfusion [illegible]

---

* طبیہ کالج، بمبئی ۸

سے بھی یہ مرض منتقل ہوتا ہے۔ مدت حضانت Incuba-
ration Period چھ ماہ تا چھ سال ہے۔ ان وائرس
کا حملہ ان خلیات پر ہوتا ہے جن کا تعلق قوت مدافعت
کیمیا سے ہے۔ مثلاً T4 : T8 کے تناسب میں تبدیلی آنا،
B-Cells میں Anti Bodies پیدا کرنے کی
قوت کا ختم ہو جانا اور Macrophages میں کمی واقع ہونا
ایڈس کی مختلف علامات و نشانیاں ملتی ہیں۔ مثلاً
غدود متاثرہ میں بغیر درد کے ورم ہو جانا، بخار، تھکان،
وزن کم ہونا، بھوک کم ہونا، دو مہینہ میں ۱۰ فیصدی وزن
کم ہو جاتا ہے۔ اجابت ڈھیلی ہونا، سانس پھولنا،
کھانسی، جلد پہ بغیر کھجلی کے گلابی چکتے، زبان اور منہ
میں سفید تہہ جمع ہونا، جنسی اعضا پر سفید داغ، مقعد
اندام نہانی سے سفید پانی کا اخراج، درد سر، دیکھنے میں
دھندلاپن، ہیجانی کیفیت، ایسے مریضوں کا Screening
(Elisa Western Blot) Test کیا جاتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا میں ایسے مریضوں کی
تعداد ۳ لاکھ تک ہے۔ ویسے تو تقریباً سب ہی ممالک میں
یہ مرض پھیل چکا ہے لیکن سب سے زیادہ یہ مرض امریکہ میں
ہے اور ہر چھ مہینے بعد تعداد کی وجہ سے دوگنے ہو جاتے
ہیں۔

کمپیوٹر نے بھی تصدیق کی ہے کہ مغربی ممالک میں یہ مرض
تیزی سے پھیل رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں چند نکات جاننا
ضروری ہیں۔

یہ مرض صرف منی Semen خون Blood دودھ
کے ذریعے ہی پھیلتا ہے۔ ایڈس کے مریض سے بات کرنے
مصافحہ کرنے، اس کے ساتھ کھانے پینے، نہانے سے قطعی
نہیں پھیلتا۔

وہ لوگ جو بدفعلی کے عادی ہیں وہ اپنا Scree-
ning Tests کرائیں جن کی رپورٹ مثبت ہے
وہ اپنے خون، منی اور اعضا کا ہدیہ نہ کریں۔

حاملہ مریضائیں اپنے حمل ختم کروا دیں، اپنا دودھ
بھی نہ پلائیں۔

ایسے مریضوں کو چاہیے کہ اپنے فیملی معالج کو مطلع کر دیں
اور مستقل Observation میں رہیں۔ ایسے مریضوں
میں علامتیں ظاہر ہو گئیں ہوں ان کو فوراً علیحدہ کر دیا جائے،
ان سے متعلق تمام اشیاء کو Leak Proof Bag میں
Infection Risk کا لیبل لگا کر الگ کر دیا جائے۔

لیبارٹری میں کام کرنے والے حضرات ان مریضوں کا خون ٹیسٹ
کرتے وقت پیپیٹ منہ میں استعمال نہ کریں اور نہ ہی ایمرجنسی
میں Mouth to mouth Resuscitation مناسب
ہے۔ البتہ سرجن ایسے مریضوں پر چشمہ، دستانہ، گاؤن وغیرہ
کے ساتھ آپریشن کر سکتے ہیں۔ ان مریضوں پر جو آلات
استعمال ہوں بہتر ہے کہ ان کو دوبارہ استعمال نہ کیا جائے
البتہ قیمتی آلات کو بہتر طریقے سے تطہیر کیا جائے۔ ایڈس
وائرس کو 1:10 Bleaching Powder کے تناسب سے
ختم کیا جا سکتا ہے۔ یا 70% الکحل یا 56°C
پہ جانے پر بھی یہ وائرس تباہ ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے
ان وائرس پر Ultra-Violet اور Gama-
Radiation کا اثر نہیں ہوتا ہے۔

انشورنس کمپنی اور امیگریشن اتھارٹی کو چاہیے
کہ وہ Screening Test ضروری قرار دیں۔
Vaccine کا استعمال کریں۔ فی الحال کوئی
شافی علاج نہیں ہے Anti Cancer - Anti viral
ادویہ کا تجربہ جاری ہے۔

شافی علاج صرف یہ ہے کہ زناکاری اور اغلام
بازی کو قانوناً جرم قرار دے دیا جائے۔

عید یوم نشاط بھی ہے یوم احتساب بھی

محمد مسعود عالم قاسمی *

مذہبی اور سماجی زندگی میں عید اور تہوار خوشی اور مسرت کے اجتماعی اظہار کے اہم مواقع ہوتے ہیں، اسی لیے ہر شخص بے چینی سے اس موقع کی آمد کا انتظار کرتا ہے، اور جب وہ آجاتا ہے توجہ بھر کے اس کا اہتمام کرتا ہے۔ بقول اقبالؔ

غرہ شوال اے نور نگاہ روزدار
آکہ تجھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار
تیری پیشانی پہ تحریر پیام عید ہے
شام تیری کیا ہے صبح عیش کی تمہید ہے

عیدالفطر اسلامی نقطۂ نظر سے خوشی کے اجتماعی اظہار کا سب سے حسین اور عظیم موقع ہے بچے، جوان، بوڑھے جب نیا نیا لباس زیب تن کیے خوشبو میں رچے اپنے گھروں سے عیدگاہ کی طرف شاداں و فرحاں نکلتے ہیں تو پورا ماحول شگفتہ اور معطر ہوتا ہے۔ ہر طرف کیف نظر کا روح پرور منظر ہوتا ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ یہ ماحول دیرپا ہو اور یہ منظر بار بار دیکھنے کو ملے۔

ہاں اس میں کیا شک ہے کہ عید خوشی اور مسرت کا دن ہے مگر خوشی بلا سبب نہیں ہوتی جس طرح غم بلا وجہ نہیں ہوتا۔ عید کی خوشی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مومن ماہ صیام یعنی تزکیہ و تربیت کا تیس روزہ کورس مکمل کرتا ہے اور اس خوشی میں وہ عید مناتا ہے۔ عید قرباں تکمیل حج کی خوشی میں انجام پاتی ہے اور عیدالفطر تکمیل صیام کی خوشی میں منائی جاتی ہے۔ ماہ صیام میں مومن کی روحانی، اخلاقی اور سماجی تربیت کے لیے جو الٰہی کورس مقرر کیا گیا ہے، اس کے اہم عناصر چار ہیں ۔

۱۔ روزہ
۲۔ تلاوت قرآن
۳۔ اہتمام نوافل
۴۔ صدقہ اور زکوٰۃ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ ہدایت اور شرائط کے مطابق جس شخص نے رمضان المبارک کے مہینے میں دن کو روزہ رکھا۔ فرض نمازوں کے علاوہ رات میں تراویح و تہجد اور نوافل کا اہتمام کیا، قرآن کریم کی تلاوت کی، بشرط مال داری غریبوں، مسکینوں، محتاجوں اور ناداروں کا ضروریات زندگی کی فراہمی میں تعاون کیا تو بے شک عید کا دن اس کے لیے خوشی کا دن

---

* ناظم دینیات (سنی) اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

ہے۔ یہ خوشی اس کے لیے پائیدار ہے اور یہ منظر اس کے لیے سازگار ہے۔

مگر جس شخص نے دماغی و جسمانی صحت کی بحالی کے لیے باوجود روزہ نہیں رکھا، روزہ داروں کے درمیان رہتے ہوئے کافروں کی طرح کھاتا پیتا اور مزے اڑاتا رہا، فرائض و نوافل کی بجا آوری سے کتراتا اور لہو و لعب سے دل بہلاتا رہا، تلاوت قرآن سے جی چراتا رہا، غریبوں اور ناداروں سے آنکھ بچاتا رہا اور اپنی دولت کو ذاتی اکاؤنٹ کا سنہرا تماشہ بناتا رہا تو ایسے شخص کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ روزہ دار مسلمانوں کے ساتھ عید کی خوشی میں اس طرح شریک ہو جیسے اس نے بھی خوشی کا کوئی کام انجام دیا ہے۔ یہ عید اس کے لیے عارضی لطف اندوزی کا سامان تو فراہم کرسکتی ہے، دائمی خوشی ہرگز عطا نہیں کرسکتی اور یہ موقع اس کے لیے باعث انبساط نہیں بلکہ ساعت احتساب ہے۔ کیونکہ عید وقتی لطف اندوزی اور عارضی نشاط نہیں ہے بلکہ تکمیل بندگی کی توفیق کا سجدۂ شکر ہے۔ نفس اور اس کی منہ زور خواہشات پر فتح کی علامت ہے۔ قوت بہیمیہ پر قوت ملکیہ کے غلبہ کی شہادت ہے۔ یہ عید "یوم الحصاد" ہے۔ ماہ صیام میں نیکیوں کی جو فصل مومن نے لگائی ہے، آج اسے کاٹنے کا دن ہے اور جس نے کچھ بویا ہی نہیں اس کے لیے کاٹنے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

رمضان رحمت و مغفرت اور نار جہنم سے آزادی کا مہینہ تھا۔ جس نے اس ماہ مبارک کا اہتمام و احترام کیا اس کے لیے سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ اس نے رحمت و مغفرت اور نار جہنم سے آزادی کا پروانہ حاصل کرلیا اور جس نے رمضان کا اہتمام ہی نہیں کیا، اسے اچھا لباس پہننے، خوشبو لگانے روزہ داروں سے ہاتھ ملانے اور زردہ سفید سوئیاں کھانے کی خوشی تو ہوسکتی ہے، رحمت و مغفرت اور عتق من النار کے حاصل کرنے کی خوشی نہیں ہوسکتی۔ یعنی عارضی خوشی تو مل سکتی ہے دائمی خوشی نہیں ملتی۔

دائمی خوشی تو خدا کے دیدار اور اس کی رضا سے وابستہ ہے اور یہ صرف اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو دن میں بھوک و پیاس کی شدت اور ضبط نفس کی دقت برداشت کرتا ہے اور بوقت مغرب خدا کے حکم سے افطار کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ۔ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ (بخاری)

[روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت اور ایک خدا سے ملاقات کے وقت]۔

انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ قیامت کب آئے گی؟ یہ نماز کا وقت تھا۔ آپؐ نماز سے فارغ ہوئے اور سائل سے پوچھا تم نے اس دن کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ سائل نے کہا میں نے اس دن کے لیے کوئی بڑا کام تو انجام نہیں دیا ہے، بس اتنا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں تو آپؐ نے فرمایا تم اس کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت کرتے ہو۔ انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ

فما فرح المسلمون بشیء بعد الاسلام اشد مما فرحوا به (مسند احمد ۳/۱۶۸)

[مسلمانوں کو اسلام کے بعد کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی خوشی اس بات سے ہوئی]

مختلف قوموں میں جس طرح خوشی کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح خوشی کے اظہار کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بعض قومیں کھیل کود اور ناچ گانوں کے ذریعے خوشی کا اظہار کرتی ہیں۔ مثلاً مدینے کے باشندے طلوع اسلام سے پہلے عیدین کے ایام میں کھیل کود کیا کرتے تھے۔ جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدالفطر اور عید قرباں میں تبدیل کردیا۔ اور بعض قومیں کھانے پینے کے ذریعے خوشی کا اظہار

کرتی ہیں، مثلاً عیسائی حضرات کی خوشی کا بڑا موقع عشائے ربانی"
کا ہوتا ہے۔ خود عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی عید کے لیے
جو دعا کی تھی وہ یہ تھی۔

اللھم ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء
تکون لنا عیداً لاولنا وآخرنا وآیۃ
منک وارزقنا انک خیر الرازقین
(المائدہ ۱۱۴)

[اے ہمارے رب ہمارے اوپر آسمان سے دسترخوان
نازل کر جو ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید
ہو اور تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں رزق
دے، تو بہترین رزق دینے والا ہے۔"]

مگر مسلمانوں کے لیے اظہار خوشی کا جو طریقہ مسنون ہے، وہ
عبادت اور سجدۂ شکر ہے جو مقصد حیات اور حاصل زندگی
ہے، تقرب خداوندی کا ذریعہ ہے، مومن کی معراج اور
بندے اور خدا کے درمیان راز و نیاز ہے۔ اور یہی مومن
کی عید ہے۔

اظہار خوشی کا یہ روحانی طریقہ اگرچہ اپنے اثرات
اور تقاضے رکھتا ہے، مگر
مادی طریقۂ اظہار کی نفی
نہیں کرتا۔ یعنی عید کی خوشی
نماز کے علاوہ زیب و زینت
کھیل اور تفریح اور ناؤ نوش
کے منافی نہیں ہے۔ چنانچہ
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید
کے دن عمدہ سے عمدہ لباس
پہننے اور بہترین خوشبو
استعمال کرنے کا حکم دیا اور
خود آپؐ کا معمول یہ تھا کہ نماز عید الفطر سے پہلے میٹھی چیز کھاتے
اور پھر عید گاہ تشریف لے جاتے۔ عید کے دن حبشی لوگ
مسجد نبوی میں نیزہ بازی کا مظاہرہ کرتے اور آپؐ اپنی زوجۂ
مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اس کا معائنہ
کرتے اور فرماتے:

لیعلم یہود المدینہ ان فی دیننا
انی بعثت بحنفیہ سمحۃ"

[تاکہ مدینے کے یہود کو معلوم ہو جائے کہ
ہمارے دین میں کشادگی ہے تنگی نہیں
بے شک میں ایسی شریعت کے ساتھ بھیجا
گیا ہوں جو کہ سیدھی بھی ہے اور سادہ
بھی۔"]

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ ایک عید کے موقع پر
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دو بچیاں جنگ بعاث کے
مقتولوں کا مرثیہ گا رہی تھیں، اسی درمیان میں ابوبکر صدیقؓ
پہنچے تو ان بچیوں کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے
گھر میں شیطانی نغمے؟ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"یا ابا بکر لکل قوم عید وان الیوم
عیدنا" (بخاری)

[اے ابوبکر! ہر قوم
کی عید ہوتی ہے اور
یہ ہماری عید کا دن
ہے۔]

مختصر یہ کہ شریعت
خوشی کے مادی اور جمالیاتی
اظہار سے منع کرتی۔ وہ
تو یہ چاہتی ہے کہ ہر چیز اپنی
حدود میں اچھی رہتی ہے،
خوشی بھی پابند حدود رہے
خوشی کا دائرہ اگر مباحات سے بڑھ کر ممنوعات و محرمات
تک وسیع ہو جائے، فحش گانے سنے جائیں گندی فلم

"انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے
عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا، پھر
ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور
کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا۔
(بعض چیزیں) تمہارے اور (بعض چیزیں) تمہارے مویشیوں
کے فائدے کے لیے"۔

قرآن حکیم

دیکھی جائے، نشہ آور مشروبات کا استعمال کیا جائے تو ظاہر ہے یہ خوشی نہیں بلکہ خود کشی ہوگی۔ شریعت اس طرف بھی توجہ دلانا چاہتی ہے کہ آدمی خوشی میں اتنا مگن نہ ہو جائے کہ نادار پڑوسیوں اور فاقہ کش ہمسایوں کا خیال ہی نہ رہے اور ضروریات زندگی سے محروم انسانوں کے حقوق سے غافل ہو جائے۔ اسی لیے اسلام نے صلوٰۃ الفطر اور صدقۃ الفطر کا حکم دے کر خوشی کا رُخ بھی متعین کر دیا جس میں انسان نہ خدا سے غافل ہوتا ہے اور نہ بندوں سے بے نیاز۔ صلوٰۃ و صدقہ سے جس مزاج کی تخلیق و تشکیل ہوتی ہے، خوشی کے نام پر انجام پانے والی سرگرمیوں کو اس سے ہرگز متصادم نہیں ہونا چاہیے۔

عید خوشی اور شکر کے ساتھ شوکت اسلام کا مظاہرہ بھی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ :

بچوں، بچیوں اور پردہ نشین خواتین کو بھی عیدگاہ کی طرف لایا جائے تاکہ وہ بھی مسلمانوں کی دعوت اور خیر کا مشاہدہ کریں"۔

(بخاری و مسلم)

عیدگاہ کو ایک راستے سے جانے اور دوسرے راستے سے واپس آنے کا جو حکم ہے اس میں بھی یہی حکمت ہے۔ اسی شان عبودیت کے پر شکوہ اظہار کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عید کی نماز مسجد کے بجائے کھلے میدان میں پڑھی اور اسی کے پیش نظر آپؐ نے تکبیر کی صدا بلند کرنے کا حکم دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ جس وقت عمر تکبیر کہتے اور مسلمان تکبیریں اُن کا ساتھ دیتے تو صدائے تکبیر سے منیٰ گونج اٹھتا تھا۔ صدائے تکبیر اگر مومنوں کو قلبی راحت عطا کرتی تھی تو دشمنوں کے دل میں رعب اور دبدبہ قائم ہوتا تھا۔ لتکبروا اللہ علی ما ھداکم ولعلکم تشکرون

اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ
واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔

"ہندو اور مسلمان ہندوستان کی خاک سے اُٹھے ہیں اور اسی کی مٹی میں جا کر دم لیں گے۔ ان کی صورت حال کی منطق یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بھائی چارہ اور خیر سگالی کے انداز پر رہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے اور دونوں سے ہندوستان کو اور ہندوستان سے نوع انسانی کو تقویت ہو۔ شانہ سے شانہ ملا کر حال کی مشکلات سے (جن کی فہرست کوئی مختصر نہیں) نبرد آزما ہوں۔ بجائیکہ ماضی کے جھگڑوں اور جھمیلوں کے موجودہ اختلافات کو اور پُر پیچ بنانے کے لیے طلب کریں"۔

سید حامد

عادل آباد کے گونڈ

کرنل حمایت بیگ*

کوئی ۵۲ - ۵۳ برس کی بات ہے، سابق ریاست حیدرآباد کے اس علاقے میں جہاں گونڈ اب بھی بستے ہیں ایسا کال پڑا کہ لوگ فاقے سے مرنے لگے۔ دو سال سے بارش نہیں ہوئی اور جو کچھ تھوڑا بہت اناج کا ذخیرہ تھا وہ ختم ہوگیا۔ گونڈوں کا سردار بیچارہ مفلوج اپنی چارپائی پر پڑا تھا۔ اس کی دونوں بیویاں مرچکی تھیں۔ اور اس کی خدمت کے لیے صرف اس کی جوان ۲۰، ۲۲ برس کی لڑکی ننگا رہ گئی تھی۔ گونڈوں نے جب دیکھا کہ بھوکوں مرنے کی نوبت آگئی ہے تو وہ اپنے سردار کے پاس پہنچے۔ اس نے کہا کہ گھبراتے کیوں ہو اطراف کے گاؤں کے ساہوکاروں سے ہمارا صدیوں سے کاروبار رہا ہے، ان سے کھانے اور کاشت کرنے کے لیے اناج اور بیج قرض لے لو۔ ایک دو سال میں جب ہماری حالت ٹھیک ہو جائے گی تو ہم سود کے ساتھ واپس کردیں گے۔ ساہوکاروں نے جب گونڈوں کی ابتر حالت دیکھی تو قرض دینے سے انکار کردیا۔ گونڈ بیچارے مایوس ہوکر پھر اپنے سردار کے گھر پر جمع ہوئے۔ اپنی قوم کی بے بسی پر ننگا کا جوان خون کھولنے لگا۔ اس نے حکم دیا کہ پھر مانگنے پر اگر ساہوکار انکار کریں تو ان کی دکانیں اور گودام لوٹ لو۔ چنانچہ یہی ہوا اور باقاعدہ ایک دن کے نوٹس دینے کے بعد ساہوکاروں نے اناج نہ دیا تو ان کی دکانیں اور گودام لوٹنے لگے۔ یہ علاقہ تعلقے کے صدر مقام سے بھی دس بارہ میل دور گھنے جنگلوں میں پہاڑیوں میں تھا جہاں پہنچنے کے لیے ایک دشوار گزار پگڈنڈی کا راستہ تھا۔ بنیوں کی واویلا پر جب مقامی پولس نے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو ننگا کے حکم سے گونڈ پولس سے ٹکر لینے پر آمادہ ہوگئے۔ پولس کی تعداد بہت کم تھی۔ ان کے پاس چھ سات بھرمار بندوقوں کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھے۔ جب ان کا مقابلہ سو ڈیڑھ سو تیر کمان اور برچھیوں سے لیس گونڈوں سے ان گھنے جنگلوں میں ہوا تو پولس کچھ نہ کرسکی اور اس کے دو جوان مارے گئے۔ تحصیل دار صاحب کو جب اس کی خبر ملی تو وہ گھبرا گئے اور انھوں نے ضلع کو اطلاع کردی کہ مقامی گونڈ نہ صرف لوٹ مار پر اتر آئے ہیں بلکہ انھوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کردی ہے اور ان کی سرکوبی ضروری ہے۔ صاحب ضلع کلکٹر نے اس اطلاع پر یہ کام کیا کہ ایک سو پولس کے جوانوں کی جمیعت اچھے ہتھیاروں کے ساتھ ایک مددگار پولس کے تحت وہاں بھیجی۔ وہیں ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار دوم تعلقدار کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس علاقے میں پہنچیں اور بحیثیت مجسٹریٹ کے پولس کی مدد کریں۔ یہ دوم تعلقدار صاحب اس وقت اپنی بیوی اور اکلوتے سات برس کے لڑکے کے ساتھ تعلقہ بندھا کے دورے پر تھے۔ ان کو جب کلکٹر کا حکم ملا تو اپنے چھوٹے سے خاندان کو

---

* عادل آباد، حیدرآباد

کھاچ میں پیچھے آنے کے لیے چھوڑ کر گھوڑے پر تین دن کی مسافت ایک دن میں طے کر کے تحصیل کے صدر مقام پر پہنچ گئے۔ اس وقت تک وہاں پولس کی جمعیت پہنچ چکی تھی اور مددگار صاحب بے چین تھے کہ ان کو مجسٹریٹ کا حکم ملے اور وہ باغی گونڈوں کی مزاج پرسی شروع کریں۔ تیسرے روز جب دوم تعلقدار صاحب کی بیوی اور لڑکا ان کے پاس پہنچے اور رات کے کھانے پر دوم صاحب نے سارا قصہ سنایا۔

"یہ بغاوت کچھ بھی نہیں ہے۔ بیچارے بھوکے مر رہے ہیں اور مرتا کیا نہ کرتا والا معاملہ ہے۔ تعریف تو گونڈوں کے سردار کی لڑکی کی کرنا چاہیے جس نے اتنی ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ نام اس کا جو بھی ہو میں نے اس کا نام شہزادی رکھا ہے۔ مقامی پٹواریوں اور دوسرے ذمہ دار لوگوں سے حالات معلوم کرنے کے بعد میں نے اسی روز اپنے گھوڑے پر آدمی کو صاحب ضلع کے پاس بھیجا ہے میرا اندازہ ہے کہ اناج اور بیج سے لدی ہوئی بنڈیاں کل تک یہاں پہنچ جائیں گی۔ میری ذمہ داری پر کل گونڈ بھی یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ کل کا تماشہ دیکھنے کے قابل ہو گا۔

غرض دوسرے روز صبح کے نو بج رہے ہوں گے کہ اطراف کے جنگل سے گونڈ دو دو تین تین کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں جمع ہونا شروع ہوئے۔ وہ اس طرح آ رہے تھے جس طرح جنگل سے میدان میں نکلتے ہوئے چیتل اور سانبر پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ پولس کے مددگار صاحب دوم تعلقدار صاحب، تحصیل دار صاحب اور مقامی پٹیل پٹواری بھی اس میدان میں کھڑے تھے جہاں گونڈ جمع ہو رہے تھے۔ کوئی سو پون سو گونڈ جمع ہوئے ہوں گے کہ صاحب دوم نے مددگار صاحب کو اشارہ کیا اور مددگار صاحب کے خفیف سے اشارے پر پولس کا بگل بجا۔ بگل بجنے کے ساتھ ہی چو طرف سے مسلح پولس والوں نے آ کر گونڈوں کو گھیر لیا۔ اس وقت گونڈوں کے غم و غصہ کی حالت دیکھنے کے قابل تھی ان کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ان کو دھوکا دیا گیا ہے اور ان کا بس چلے تو وہ سارے سرکاری عہدے داروں کو، جو وہاں موجود تھے، کچا چبا جائیں۔ پہلے تو ذرا ہلچل ہوئی پھر سب طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اس وقت دوم تعلقدار صاحب نے چھوٹی سی تقریر کی جس کا ترجمہ مقامی پٹواری پٹیل کرتا جا رہا تھا۔ دوم صاحب نے کہا کہ اگر حکومت تم کو نقصان پہنچانا چاہے تو یہ کام بہت آسان ہے۔ اب اس وقت تم میں سے ایک بھی بچ کر نہیں جا سکتا۔ ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم کو کیا تکلیف ہے۔ اس کو دور کرنے کا انتظام کر دیا گیا ہے اور آج اناج اور بیج کی بنڈیاں آ جائیں گی۔

اب اس کو دوم صاحب کی نیک نیتی سمجھیے کہ ادھر کوئی بیاں بنڈیاں اناج سے لدی ہوئی میدان کی طرف آتی ہوئی نظر آئیں پھر بگل بجا اور پولس ہٹ گئی اور جہاں بغاوت ہو رہی تھی وہاں جشن ہونے لگا۔ بکرے کٹے، مرغیاں کٹیں، کھانا پکا اور جو گونڈوں کا ناچ شروع ہوا تو شام تک جاری رہا۔

دوسرے روز کھانے پر دوم صاحب نے شہزادی کو دعوت دی اور اپنی بیگم سے کہہ دیا کہ شہزادی کا استقبال اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح کسی رئیس کی لڑکی کا کیا جاتا ہے۔

جس چھوٹے سے مکان میں دوم صاحب ٹھہرے تھے اس کے دالان میں چاندنی کا فرش ہوا۔ ایک اچھی سوزنی بچھائی گئی۔ تکیوں کے غلاف لال سیاہی کے

"کیمیا میں سب سے ضروری بات تجربہ کرنا ہے۔ جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ پس اگر تم کیمیا کا صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو تجربوں کو لازم سمجھو اور صرف اسی علم کو صحیح جانو جو تجربے سے ثابت ہو جائے۔"

جابر بن حیان

پانی میں ملاکر رنگے گئے اور بڑی پرتکلف دعوت شہزادی کی ہوئی جب شہزادی خوش خوش کھانے سے فارغ ہوئی تو اس کے سامنے پان اور عطر پیش ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عطر کی شیشی کا کیا کرے۔ دوم صاحب کی بیوی نے اپنے ہاتھوں سے شہزادی کو عطر لگایا۔ جب وہ خوشبو سے مہکنے لگی تو دونوں ہاتھ جوڑ کر بار بار دوم صاحب کی بیگم کو سلام کیا۔ خوش شکل عورت تھی، بیگم صاحب نے بھی شہزادی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چوم لی۔

اب شہزادی کا اصرار تھا کہ دوسرے دن ان کے ہاں سب دعوت میں شریک ہوں۔ دوم صاحب نے کہا کہ وہ ضرور دعوت میں آئیں گے لیکن اس دفعہ نہیں۔ کیونکہ گونڈوں کے پاس جتنا اناج تھا وہ بہت مختصر تھا۔ ہاں آئندہ سال جب گونڈ کاشت کرکے خود اپنا اناج پیدا کرلیں گے، ضرور دعوت میں شریک ہوں گے۔

یہ سن کر شہزادی رونے لگی اور بڑی مشکل سے اسے سمجھایا گیا۔ دوسرے سال نہ صرف دوم صاحب مع اپنی بیوی اور لڑکے کے شہزادی کی دعوت میں شریک ہوئے بلکہ اپنے ساتھ اول تعلقدار صاحب اور ضلع کے چند دوسرے عہدے داروں کو لیتے گئے۔ اس دعوت کے روز شہزادی کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔

بغاوت کو جشن میں تبدیل کرنے والے دوم تعلقدار صاحب میرے والد مرزا غلام محمود بیگ صاحب (محمود نواز جنگ) مرحوم تھے اور ان کا سات سالہ اکلوتا لڑکا جو شہزادی کی دعوت میں شریک تھا، میں تھا۔

> "جو لوگ شوق میں خدا کی عبادت کرتے ہیں، ان کی عبادت تاجرانہ ہے۔
> جو خوف میں عبادت کرتے ہیں، ان کی عبادت غلامانہ ہے۔
> اور
> جو شکر نعمت کے طور پر عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت آزادانہ ہے۔"
>
> حضرت علیؓ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸، شمارہ ۶ (جون ۸۹ء)

توارث ماحول اور تعلیم

محمد اسحاق*

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کالج میں انگلش کی لکچرار ہیں اور ان کے شوہر ایک محکمہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ ان کی شادی ہوئے ۲۲ برس ہوگئے، تین لڑکے ہیں، لیکن میاں بیوی ایک دوسرے سے ناراض اور شاکی ہیں۔ ایک دوسرے کی شکایت کرنے میں دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ان صاحبہ نے کہا دیکھیے بھائی! میرا بڑا لڑکا بہت نیک فطرت اور خاموش طبیعت کا ہے۔ بی۔ اے کے فائنل میں پڑھتا ہے۔ ہمارے جھگڑوں سے تنگ آکر اب چند مہینوں سے کسی رشتہ دار کے ہاں جاکر رہ گیا ہے۔ سب سے چھوٹا مجھے بہت چاہتا ہے اور میں بھی اس کو عزیز رکھتی ہوں، لیکن دوسرا نمبر بڑا ضدی، پڑھنے لکھنے میں اڑیل اور غصیلا ہے۔ میں نے مذاقاً کہا —— "آخر باپ کے جیسا ایک تو نکلنا چاہیے۔" —— اس پر وہ خاتون مسکرا کر چپ ہوگئیں۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ ۲۲ برس بعد بھی میاں بیوی میں اَن بن کیوں ہے۔ یہاں کسی ماہر تعلیم کی بات یاد آتی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میاں بیوی دونوں کئی برس ساتھ ساتھ زندگی گزارتے ہیں لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی رہتے ہیں۔ ان کا حال کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دو معصوم بچے اندھیرے میں سہمے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

آپ اب بہت غصے میں ہیں۔ سامنے والے سے کہہ رہے ہیں، "تجھ جیسا دنیا میں نہ ہوگا!" "تیرے جیسا دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔" بات تو غصہ کی ہے لیکن آپ نے اپنی زبان سے فطرت کی ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ سچ مچ اس وقت روئے زمین پر نہ تو آپ جیسا اور نہ اس جیسا کوئی اور موجود ہی نہیں ہے۔ باوجود ناک نقشہ ایک سا ہونے، آپ کا ثانی کوئی نہیں۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ قدرت کا عجوبہ ہی نہیں بلکہ ہر نمونہ نیا، نرالا اور بے مثل ہوتا ہے۔ ایک وقت جو نمونہ ڈھل چکا ہے پھر اس کا اعادہ نہیں ہوتا۔ صورت شکل ہی میں نہیں، عادات واطوار فطرت و مزاج میں منفرد ہوتا ہے۔

کسی گھر میں اگر چار پانچ بچے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ لڑکی ماں کی جیسی ہے، لڑکا باپ کا سا، کوئی دادی کی طرف گیا ہے تو کوئی نانی کو پڑی ہے۔ کوئی دادا کی چال پہ آیا ہے تو کوئی نانا کی مسکین طبیعت پایا ہے۔ آخر ایسا کیوں؟

ماہرین حیاتیات نے اندازہ لگایا ہے کہ دنیا کی آبادی اگر چالیس گنا ہوجائے تو اس تمام آبادی کے جنگل میں صرف دو افراد ایسے مل سکیں گے جن کے انگشت کے نشان یکساں ہوں گے

---

* رٹائرڈ پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد۔

دو جڑواں بچے باوجود شکل و شباہت میں زبردست مماثلت رکھنے کے ان میں بھی ذہنی، جسمانی اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس لامحدود اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ ہر فرد کی نشو و نما میں دو عناصر پائے جاتے ہیں ایک تو ہے توارث اور دوسرا ماحول۔

توارث وہ سب کچھ ہے جو بچہ بوقت پیدائش اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اسے راست ماں باپ کا عطیہ کہا جا سکتا ہے۔ توارث وہ تمام قوتوں اور امکانات کا مجموعہ ہوتا ہے جو بوقت استقرار حمل عضویہ میں موجود رہتا ہے۔ یا کسی عضویہ کا کل ساز و سامان ہی توارث ہے۔ ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ بچے کی جسمانی ذہنی صلاحیتیں، ناک نقشہ، رنگ و روپ اور قد وغیرہ کا تعین سب اسی لمحہ ہو جاتا ہے جب کہ حمل قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں کسی قسم اور اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

ایمرسن (Emerson) کا خیال ہے کہ توارث صرف ماں باپ کا ہی عطیہ نہیں بلکہ اس کے خون میں ہمارے قریبی اور بعیدی دور دور تک کے بزرگ شامل ہیں — "ہم اس تمام کا جن سے ہمارا تعلق رہا ہے ایک جزو ہیں" — توارث کا ایک طویل سلسلہ ہمارے آبا و اجداد سے ملا ہوا ہے۔ ہمارے وجود کے لیے جن ہزاروں نسلوں نے کام کیا ہے ان کی جسمانی اور ذہنی خصوصیات بھی ہم کو ملتی ہیں۔ ماں باپ کی ساری خصوصیات بچوں میں نہیں ملتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہم صرف ۲۰ پشتوں کے بزرگوں کا شمار کریں جنھوں نے ہماری انفرادیت میں حصہ لیا ہے تو ان کی تعداد دس لاکھ ہوگی اور اگر ۳۰ پشتوں تک چلے جائیں تو ان کی تعداد ایک لاکھ کروڑ سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ ابتدائے آفرینش سے ہم اندازہ کرنے سے قاصر ہیں اس لیے ہر فرد دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک دفعہ جو نمونہ ڈھل چکا ہے دوبارہ اس کا اعادہ ہونے نہیں پاتا۔

ماحول ان مہیجات کے مجموعے کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کسی ذی حیات میں اس کی قدرتی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ کمبل ینگ [illegible] کے نزدیک ہر وہ قوت کا نام ہے جو ہماری شخصیت پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ہر لمحہ کوئی نہ کوئی قوت ہم پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ہم اپنے کام میں مشغول ہیں، گھڑی کی ٹک ٹک، بچے کے رونے کی آواز، چڑیا کے چہکنے کی آواز ہمارے کانوں میں آتی ہے لیکن ہم اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہ سب ہمارے ماحول سے خارج ہے۔ لیکن جب کوئی چیز میز سے گر جائے تو فوراً ہماری توجہ اس طرف جاتی ہے۔ یہ مہیج ہے۔ آب و ہوا، سردی گرمی، غذا، لباس، یہ سب ہمارے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح تعلیم، خیالات، عادتیں سب ہی مہیجات کی اثر پذیری کا نتیجہ ہیں۔

توارث کے اثرات:

توارث کے سلسلے میں چند بنیادی باتیں عام ہیں۔ بچے ماں باپ جیسے ہوتے ہیں۔ انسان سے انسان کے بچے پیدا ہوتے ہیں اور بلی سے بلی کے بچے پیدا ہوں گے۔ بلند قامت ماں باپ کے بچے بھی اونچے قد کے ہوں گے۔ پست قامت ماں باپ کے بچے بھی پست قد ہوتے ہیں۔ اسی طرح علاوہ اطوار اور ذہنی لحاظ سے توارث کا اثر دیکھنے میں آیا ہے۔ مسٹر فرانسس گالٹن نے کئی ایک تحقیقات کی ہیں۔ اس نے بعد تحقیق بتلایا ہے کہ ۹۷۷ قابل اشخاص کے خاندانوں میں ۵۳۵ قابل رشتہ دار پائے گئے۔ اسی طرح ۹۷۷ معمولی افراد کے خاندانوں میں صرف ۴ لائق افراد مل سکے۔ اچھے قابل گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچوں میں قابل بننے کے ۲۰۰ گنا زیادہ احتمال ہے۔ اسی طرح اخلاقی و معاشرتی خصوصیات کا تعلق توارث سے ہے یا ماحول سے، لیکن تعلیم و تربیت کا کتنا اثر ہوتا ہے، اس بحث میں گئے بغیر چند بنیادی چند دلچسپ مثالوں سے واضح ہو جائے گا کہ توارث کے کتنے دور رس اثرات ہو سکتے ہیں۔

JUKES'S FAMILY جیوکس کا خاندان

مسٹر ڈگ ڈیل نے ۱۸۷۷ء میں ایک خاندان جیوکس کی تحقیق کی۔ ۱۲۰۰ ... تک تقریباً ڈیڑھ سو برسوں کے

واقعات اور اعداد اس خاندان کے جمع کیے۔ اس خاندان کا مورث
اعلیٰ ایک آوارہ مزاج شخص Max Jukes تھا اس نے
اپنی جیسی ایک بدکار آوارہ عورت سے شادی کی ۱۰۰۰ ر
تک اس کی پانچ نسلیں ہوئیں جن میں ۱۲ سو افراد کا پتہ چلا۔ ان
میں ۳۰۰ جنابکاری کے قاتل، ۶۰ چور، ۵۰۰ حرام کاری میں مبتلا
۱۳۰ مجرم، ۴۴۰ عیاشی اور اوباشی میں مبتلا ہو کر اپنی جسمانی حالت
تباہ کر چکے تھے۔ ۳۰۰ کا زمانۂ شیرخوارگی میں انتقال ہو چکا تھا۔
صرف ۲۰ ایسے تھے جنہوں نے کچھ کاروباری پیشہ سیکھا تھا اور
ان میں بھی دس جیل میں کچھ ہنر سیکھنے والے تھے۔ اس ناکارہ خاندان
پر ریاست نیویارک کو دس لاکھ ڈالر سے زیادہ رقم برداشت
کرنی پڑی۔

ڈاکٹر گاڈرڈ نے خاندان کیلی کاکس (Calicax)
کا مطالعہ کر کے دلچسپ نتائج پیش کیے ہیں۔ ۱۷۷۵ء میں ایک نوجوان
شخص مارٹن کیلی کاکس، ۲۱ سالہ نوجوان انقلابی افواج میں شامل
تھا۔ وہ کسی سرائے میں ایک ناقص العقل لڑکی سے ملوث ہوا۔
اس لڑکی کے بطن سے ایک ناقص العقل لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے
کی آل اولاد سے ۴۸۰ افراد کا پتہ ملا۔ ان میں ۳۶ ناجائز
اولاد تھے، ۳۳ عیاش، ۲۴ شرابی، ۳ سزا یافتہ مجرم ۸ قحبہ
خانے چلانے والے، ۸۲ کا انتقال زمانۂ شیرخوارگی میں ہو چکا
تھا۔ ۱۴۳ ضعیف العقل اور ۳ مرگی کا شکار تھے۔

اس نوجوان نے کچھ دنوں بعد ایک شریف گھرانے کی ذہین
لڑکی سے شادی کی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔
اس لڑکے کے ۴۹۶ نام لیواؤں کا پتہ چلا جن میں سب کے سب
قابل تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد گورنر، یونیورسٹی کے پروفیسر
ادیب اور بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ ہو نا چاہیے کہ دورانِ حمل بعض
مائیں اپنی ہونے والی اولاد پر اثر ڈالنے کے لیے سوچتی ہیں بعض
او نچے گھرانے کی عورتوں کا خیال ہے کہ دورانِ حمل پڑھنے لکھنے
میں مشغول رہنے سے بچہ ذہین ہو گا، یا پھر خوب صورت تصویر
دیکھتے رہنے سے لڑکی حسین ہو گی۔ یہ سب خیال خام ہے۔ جیسا
کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں بچہ کی حقیقی فطرت کا تعین اسی وقت ہو چکتا
ہے جب کہ حمل قرار پاتا ہے۔

لیکن ہمیں ان باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت
نہیں۔ کیونکہ آئندہ بہت کچھ بچوں کی تعلیم و تربیت اور بچوں میں
اعلیٰ خصوصیات پیدا کرنے کے مواقع ہیں۔ اگر مجرم کا لڑکا مجرم
ہی ہوتا اور نیک شخص کا بیٹا نیک ہی نکلتا تو پھر ساری تعلیم و
تربیت بیکار ہی سمجھی جاتی۔ مقامِ شکر ہے کہ طفلِ انسانی پیدائش
کے وقت نہ تو نیک ہے نہ بد۔ اس کے والدین اور اس کا آئندہ
ماحول اس کو ایک خاص طریقے پر تیار کرتا ہے۔

کل مولود یولد علی الاسلام

ہر بچے کی فطرت پیدائش کے وقت سلیم یا نیک ہوتی ہے
اوپر کی چند مثالوں سے واضح ہو چکا ہو گا کہ ہر بچہ کچھ نہ کچھ طبعی
استعداد یا ذہانت لے کر دنیا میں آتا ہے۔ متعدد طلبا کو ایک
ہی قسم کی تعلیم دینے کے باوجود ان کی لیاقت اور قابلیت میں
بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یقیناً یہ بیج کی خاصیت
ہے۔ کیونکہ ماحول تو یکساں ہے اور "نیم کا درخت خواہ بہشت
میں بو یا جائے مگر اس کی کڑواہٹ میں کمی نہ ہو گی" ہٹلر یا
مصطفیٰ کمال کسی گمنام جزیرے میں پیدا ہوتے تو اپنی ذاتی
صلاحیت کی وجہ سے ان وحشی قبائل میں بھی سرداری حاصل
کر لیتے اور اپنی لیڈری اور جنگی صلاحیت کا ثبوت دیتے۔
تان سین کو اکبر کا دربار نہ ملتا تو شاید اس کو اتنی شہرت
نصیب نہ ہوتی۔ بعض کا خیال ہے کہ بچے کی نشو ونما میں ماحول
کا تین چوتھائی بلکہ ۹۰ فیصد حصہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ذہین بچے
کو مناسب ماحول مل جائے تو وہ زمانے کا قابل شخص بن
سکتا ہے اور ایسا ماحول نہ ملے تو وہ مرجھا کر اپنی جگہ رہ جاتا
ہے۔ آج بھی بہت سے غریب طلبا ایسے ہیں جنھیں مواقع ملتے تو
وہ بہت کچھ ترقی کر جاتے۔ سیکڑوں برس سے زمانہ اور
سماج نے ان کے ساتھ سخت بے اعتنائی اور ناانصافی برتی

جس کی وجہ سے وہ گوشۂ گمنامی میں رہ گئے۔

بہت سے گوہر شاہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک اذفر کی

(طبا طبائی)

یہاں پر یہ بتلانا مقصود ہے کہ توارث میں اب کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا لیکن قدرت نے بچے کو صلاحیتیں دینے میں جو فیاضی دکھائی ہے، اس کو زرخیز ماحول کے ذریعہ ہم ممکنہ حد تک نشو و نما دے سکتے ہیں۔ بیج کتنا ہی اچھا ہو اگر مناسب زمین، کھاد، روشنی، پانی، ہوا نہ ملے تو اس کی ساری صلاحیت رائیگاں جائے گی۔ فرد، توارث ماحول کا حاصل ضرب ہے نہ کہ توارث اور ماحول کا حاصل جمع۔ فرد کی مختلف صلاحیتوں کے نشو و نما کی اچھی مثال بائبل اور قرآن میں دی گئی ہے۔ آسمان سے بارش تو سب ہی زمین پر ہوئی، جہاں کی زمین زرخیز تھی وہاں کے پودے سرسبز و شاداب زوروں پر آئے، کم زرخیز زمین پر نشو و نما اوسط رہی، لیکن وہ بنجر پتھریلی زمین میں سارے بیج جل کر رہ گئے۔ یہی حال تعلیم کا بھی ہے۔ تعلیم وہ باران رحمت ہے جو ساری جماعت کے طلبا پر یکساں برستی ہے۔ کچھ طلبا بہت تیز ہوتے ہیں کچھ اوسط اور کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔

تعلیم کی اہمیت

۱۔ غریب گھروں میں بہتر ماحول نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اس لیے اسکول ہی ایک ایسا مقام ہے، جہاں پر بہت اچھا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ ہر بچہ اپنی ذاتی قابلیت کے مطابق سیکھ سکے اور ترقی کر سکے۔ بہت سے غریب گھرانے ایسے ہیں جہاں بچے کوئی اخبار، رسالہ یا کتاب برسوں میں بھی نہیں دیکھ پاتے، لیکن اسکول کی لائبریری، ریڈنگ روم، پارلیمنٹ کے ذریعے بہت ساری معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح غیر نصابی مصروفیات سے دوسرے طلبا کے ساتھ مل جل کر بڑا بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ گھرانے کے اور ذہین طلبا کے لیے الگ اسکول قایم نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں اچھے معیاری اسکول اور غیر معیاری اسکول الگ الگ ہوتے جا رہے ہیں جو جمہوری مزاج کے خلاف ہے۔ اس کے اثرات بہت پیچیدہ اور دور رس ہیں، جس کا معاشرے کو اندازہ نہیں ہے۔

۲۔ انفرادی توارث کے علاوہ اجتماعی توارث بھی پایا جاتا ہے جس کو Social Heredity کہتے ہیں۔ ہماری کئی نسلوں نے ہمیں فنونِ لطیفہ، ادب، عمارات، تاریخ، قانون، روایات، رسم و رواج مذہب و ثقافت کی شکل میں اجتماعی توارث دیا ہے۔ مشہور غار، قلعے، مندر، مسجد، ہمارے آباو اجداد کی شان و شوکت کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی طرح جغرافیائی ماحول میں دریا، پہاڑ، وادیاں، جنگل، جانور، وغیرہ شامل ہیں۔ میوزیم اجتماعی توارث کا خزانہ ہوتے ہیں۔ نمائش، آرٹ گیلری لائبریری وغیرہ ایک نسل سے دوسری نسل کے تسلسل کا بہترین ذریعہ بلکہ ورثہ ہیں۔ اس سماجی توارث سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ انھیں ان تمام ورثے سے سیر و تفریح، ریڈیو اور ٹی۔ وی کے ذریعے واقف کروانا ضروری ہے۔

۳۔ بچوں کی ذہنی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی

لیکن تعلیم کے دوران سب بچوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا جائے۔ کسی کو ہرگز نکما اور بے کام کا نہ سمجھا جائے۔ اس کی ذہنی استعداد کے مطابق تعلیم دی جائے۔ تعلیم کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہر سیکھنے اور سمجھنے کے بعد شخصیت میں تغیر آتا جائے گا اور ترقی کرتی جائے گی۔ جتنا ماحول زرخیز ہوگا، شخصیت کی نشو ونما بھی اسی انداز سے ہوگی۔

گھر پر والدین ہوں یا اساتذہ، اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ تعلیم کے دوران بچوں کو سزا دینے کا طریقہ، ڈانٹ ڈپٹ نہایت نقصان دہ ہے۔ تعلیم کا عین مقصد ہی اس سلوک سے فوت ہو جاتا ہے۔

۴۔ اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے وقت عام طور پر لوگ عہدہ، معیار اور دولت دیکھتے ہیں۔ دیکھنے اور پرکھنے کی چیز اس گھر کا ماحول تعلیم و تربیت، قابلیت و صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی لیے شادی کے وقت لڑکے یا لڑکی کی صحت جسمانی، تعلیمی معیار، سلیقہ اور صلاحیت اور مزاج کا میلان دیکھنا چاہیے۔ تاکہ ان کی آئندہ نسل اچھی ہو پھلے پھولے اور ترقی کرے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹکنالوجی کے باب میں بھی ہم زبردست صلاحیت کے مالک ہیں۔ جاپان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مہارت کا اطلاق جو انہیں اپنے فن کتابت سے ورثے میں ملی تھی، آج کی ٹکنالوجی پر کیا ہے۔ کیا ایسی قوم جو قرآن مجید کی پوری آیت چاول کے دانے پر لکھ سکتی ہے، جب وہ مائیکرو الیکٹرونکس کے میدان میں اترے گی تو کیا وہ جاپان جیسی ترقی حاصل نہیں کر سکتی۔"

پروفیسر عبدالسلام

نیوکلیائی کثافت

محمد اسلم پرویز*

ایٹمی یا نیوکلیائی توانائی کے بارے میں ایک عام تصور یہ پایا جاتا تھا کہ محض بم کی شکل اختیار کر لینے کے بعد ہی یہ تباہ کن ہوتی ہے۔ ورنہ پرامن مقاصد کے واسطے اس کا استعمال بالکل بے ضرر ہے۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل تک لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا رہے لیکن آج صورت حال مختلف ہے۔ ایٹمی بجلی گھر جو کہ پرامن ایٹمی توانائی کے علامتی نشان سمجھے جاتے تھے، ان میں یکے بعد دیگرے ہونے والے حادثات نے تصویر کا دوسرا رُخ عیاں کر دیا ہے یہ بھیانک رخ اپنی پوری تباہیوں کے ساتھ گزشتہ کچھ حادثوں کے بعد ہی ظاہر ہوا ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں لگاتار کئی ایسے حادثات ہوئے جنہوں نے ایٹمی بھٹیوں کا بھرم کھول دیا۔ رہی سہی کسر روس میں چرنوبل کے مقام پر ہوئے حادثے نے پوری کر دی۔ اس حادثے کے نتیجے میں اگرچہ موقعے پر صرف ۳۱ لوگ ہلاک ہوئے تھے لیکن اس ایٹمی بھٹی میں لگنے والی آگ نے فضا میں جو نیوکلیائی کثافت پھیلائی ہے، اس سے یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہزاروں افراد رفتہ رفتہ اور دور دراز کے علاقوں میں موت کا شکار ہوں گے۔

نیوکلیائی کثافت تمام جانداروں کے لیے مضر ہے۔ چاہے وہ پیڑ پودے ہوں یا کیڑے مکوڑے۔ چرند پرند ہوں یا انسان سبھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ کثافت محض کسی حادثے کی وجہ سے ہی ظاہر نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو بھی صبر تھا کہ چلو کسی حادثے کے بعد ہی فضا میں نیوکلیائی کثافت پھیلے گی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بنیادی عمل جس کے نتیجے میں ایٹمی توانائی پیدا ہوتی ہے وہی اس خطرناک کثافت کو پیدا کرتا ہے۔ جس طرح ایندھن کے جلنے سے دھواں پیدا ہوتا ہے بالکل اسی طرح ایٹمی ایندھن کے جلنے کے بعد جو فضلہ بنتا ہے وہ نیوکلیائی کثافت کا سب سے خطرناک ذخیرہ ہوتا ہے۔ نیوکلیائی کثافت پیدا کیسے ہوتی ہے؟ یہ جاننے کے لیے اس عمل کے متعلق کچھ بنیادی باتوں سے واقفیت ضروری ہے۔

ایٹم کے مرکز میں واقع نیوکلیس کو جب دو حصوں میں توڑا جاتا ہے تو اس عمل کے نتیجے میں کافی توانائی حاصل ہوتی ہے جو روشنی یا حدت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ نیوکلیس کو توڑنے کے لیے اس پر کچھ ننھے ننھے ذرّات کی بارش کی جاتی ہے جن کو نیوٹرون کہتے ہیں۔ نیوٹرون بھی ایٹم کا ہی ایک حصہ ہوتے ہیں اور عام حالات میں نیوکلیس کے اندر ہی پائے جاتے ہیں۔ ان کی ٹکر سے جب نیوکلیس ٹوٹتا ہے تو اس میں مقید اور نیوٹرون تیزی سے باہر نکلتے ہیں اور دوسرے کسی نیوکلیس پر حملہ کر کے اسے توڑتے ہیں اور اس طرح ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل بہت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر

* ذاکر حسین کالج۔ دہلی

ول نہ کیا جائے تو اس کے نتیجے میں جو بے پناہ توانائی، حدت، روشنی ردیگر شعاعوں کی شکل میں نکلتی ہے، وہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے ذہی تباہی ہے جو کہ ایک ایٹم بم پھیلا سکتا ہے۔ ایٹم بم میں ایک ردود جگہ میں یہی عمل کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے لامحدود توانائی عمل کر تباہی پھیلاتی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کا ماضی اسی تباہی کا چشم دید گواہ ہے۔

نیوٹران کے ذریعے نیوکلیس کو توڑنے کے اس عمل کو ۱۹۳۸ء میں جرمنی کے دو سائنس دانوں 'اوٹو ہان' اور 'فرز اسٹراسمان' نے دریافت کیا تھا۔ اس عمل سے وابستہ ایک خاص بات یہ ہے کہ نہ صرف اس عمل کے دوران کچھ خاص قسم کی ایٹمی شعاعیں نکلتی ہیں، بلکہ اس کے مکمل ہونے کے بعد بھی جو مادہ بچا رہ جاتا ہے جس کو اس عمل کا فضلہ کہا جا سکتا ہے، اس میں سے بھی یہ شعاعیں نکلتی رہتی ہیں اور ان کا اخراج دس بیس سال نہیں بلکہ اوسطاً ۲۰۰ سال سے ایک ہزار سال تک ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک اہم بنیاد ہے جو نیوکلیائی کثافت کو دیگر اقسام کی کثافتوں سے الگ کرتی ہے نیوکلیائی کثافت کی سب سے اہم وجہ یہی ایٹمی یا نیوکلیائی شعاعیں ہیں اور ان کی تباہ کاری اس بات میں پوشیدہ ہے کہ ان کے اخراج کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ نیز نسل در نسل چلتے ہیں۔ عموماً کثافت کسی بھی جاندار کو وقتی طور سے متاثر کرتی ہے۔ اگر یہ اثر دیرپا بھی ہو، جیسا کہ عموماً کثافت کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں دیکھا جاتا ہے تو بھی اس سے محض وہی جاندار اور اس کی زندگی کا تھوڑا سا حصہ متاثر ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے نیوکلیائی کثافت کا شکار اگر بالفرض زندہ رہ جاتا ہے تو وہ عموماً کسی نہ کسی اعتبار سے اپاہج کی زندگی گزارتا ہے یا کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں اس کی اگلی نسلیں بھی اس کثافت سے متاثر ہوتی ہیں۔ کیونکہ یا تو وہ جاندار افزائش نسل کے قابل ہی نہیں رہے گا یا پھر اگر اس کی نسل آگے چلی بھی تو ۸۰ فیصد امکان یہ ہوتا ہے کہ اس کی اولادیں پیدائشی نقص و امراض کے ساتھ پیدا ہوں گی۔

اس بات کا بین ثبوت اب بھی ہیروشیما اور ناگاساکی کے ان متاثرہ خاندانوں میں ملتا ہے جو ایٹم بم کا شکار بنے تھے۔ ان کی نسلیں آج بھی تھوڑی بہت مسخ ہیں۔ یہی خطرہ اس وقت چرنوبل حادثے سے متاثر لوگوں کو لاحق ہے۔ ان شعاعوں میں ایسا کیا ہے کہ یہ آنے والی نسلوں تک کو متاثر کر دیتی ہیں؟ اس کا سب سے آسان اور عام فہم جواب یہ ہے کہ یہ شعاعیں جاندار کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر جاندار کا جسم خلیوں سے بنا ہے جن کے اندر کروموزوم نامی عضلات ہوتے ہیں۔ ہر جاندار میں ان کروموزوموں کی تعداد اور ساخت مختلف ہوتی ہے جو کہ نسل بہ نسل محفوظ رہتی ہے۔ ان ہی کروموزوموں میں ہر جاندار کی تشکیل و ساخت اور حرکات کی تفصیل چھپی رہتی ہے۔ مثلاً انسان کے جسم کے ہر خلیے میں ۴۶ کروموزوم ہوتے ہیں۔ جب ماں باپ کے خلیے مل کر ایک نیا خلیہ بناتے ہیں تو اس سے بننے والا بچہ دونوں کی مشترکہ خصوصیات لے کر پیدا ہوتا ہے کیونکہ دونوں طرف کے کروموزوم مل کر اس کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایٹمی یا نیوکلیائی شعاعیں ان کروموزوموں میں ہی تبدیلی لاتی ہیں یا ان کے متاثرہ حصوں کو یکسر تباہ کر دیتی ہیں۔ چونکہ کروموزوم ایک نسل سے دوسری نسل تک سفر کرتے ہیں اس لیے ان میں آئی ہوئی خرابی بھی کئی نسلوں تک چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیوکلیائی کثافت کو سب سے تباہ کن کثافت تسلیم کیا گیا ہے۔

ستمبر ۸۶ء میں ویانا میں بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کی میٹنگ میں حکومت روس نے ۳۸۸ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ چرنوبل حادثے کے متعلق پیش کی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق چرنوبل حادثے کی وجہ سے پیدا شدہ نیوکلیائی کثافت کے باعث کم از کم ساڑھے چھ ہزار افراد کینسر کا شکار ہوں گے۔ یہ اثرات آج سے پانچ سال بعد سے لے کر آئندہ ستر سال تک موجود رہیں گے اور یہ تو شعاعوں کے سیدھے اثرات ہیں۔ ان شعاعوں سے متاثرہ پانی یا خوراک استعمال

کرنے والوں پر جو اثرات ہوں گے وہ الگ ہیں۔ چرنوبل حادثے نے یہ بات مزید واضح کردی ہے کہ نیوکلیائی کثافت صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ کیونکہ باوجود اس کے کہ یہ حادثہ روس میں ہوا تھا اس کے اثرات دنیا کے دور دراز ممالک میں مل رہے ہیں جہاں فصلیں، پھل، پانی اور دودھ وغیرہ ان شعاعوں سے آلودہ پایا گیا ہے۔ خود روس میں ہی ۱۰۰۰ مربع میل کے علاقے میں زمین کی اوپری مٹی کو اس خوف سے ہٹا دیا گیا ہے کہ یہ شعاعوں سے آلودہ ہوچکی ہوگی۔ اگرچہ یہ بات تعجب خیز لگتی ہے لیکن بہرحال حقیقت ہے کہ اس حادثے کے باعث پیدا شدہ کثافت نے بین الاقوامی تجارت کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ بیلجیم، جرمنی، ہالینڈ، ڈنمارک اور آئرلینڈ سے آئے دودھ کو، فرانس کے پنیر کو، برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ کے چاکلیٹوں کو اور اٹلی کے گیہوں کو مقررہ حد سے زیادہ آلودہ پایا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ ناقابل استعمال اور صحت کے لیے خطرناک قرار دیے گئے ہیں۔

شروع میں جب ایٹمی بھٹیاں بنائی گئی تھیں تو ان میں استعمال شدہ فضلے کو جمع رکھنے کی گنجائش رکھی گئی تھی لیکن یہ جگہ صرف اتنی تھی کہ حد سے حد تین یا پانچ سال کے دوران جمع شدہ فضلے کو ہی محفوظ کیا جاسکتا تھا۔ چونکہ اس فضلے سے بھی تباہ کن شعاعیں نکلتی ہیں اس لیے اس کے آس پاس بھی کسی انسان کا جانا موت کو دعوت دینا ہے۔ میکینکل طریقوں سے اس فضلے کو کنکریٹ کے بہت موٹے اور ٹھوس ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے جن کو پھر اسٹیل کے بڑے بڑے بکسوں میں بند کرکے پانی کے نیچے یا زمین کے اندر رکھا جاتا ہے تاکہ مہلک شعاعیں ان سے باہر نہ آسکیں۔ ان شعاعوں کو چیک کرنے کے لیے باقاعدہ آلات ہیں جن پر لگی ہوئی سوئی کسی میٹر کی طرح فضا میں ان شعاعوں کی مقدار بتاتی رہتی ہے۔ ایٹمی توانائی سے متعلق اداروں میں جگہ جگہ اور مختلف لوگوں کے پاس ایسے آلات ہوتے ہیں۔ کچھ آلات کو خودکار الارم سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ جیسے ہی فضا میں شعاعوں کی تعداد مقررہ محفوظ حد سے تجاوز کرتی ہے، یہ الارم خود بج اٹھتے ہیں۔

اب تک فضلے کو محفوظ کرنے کا طریقۂ کار یہ تھا کہ ایٹمی بھٹی کا استعمال شدہ ایندھن چار پانچ سال بعد وہاں سے اٹھا کر زمین میں بہت نیچے دفن کر دیا جاتا تھا یا کسی ریگستان کے تلے میں دبا دیا جاتا تھا۔ یا پھر سمندر کی گہرائیوں میں ڈال دیا جاتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد ہی سائنس دانوں کے مشاہدے میں یہ بات آگئی کہ اس فضلے سے نکلنے والی شعاعیں قدرتی وسائل کے ذخیروں کو آلودہ کرکے ان کو بھی زہریلا بنا سکتی ہیں۔ اس لیے اس طریقے میں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے عوام میں، خاص طور سے مغربی ممالک کے لوگوں میں جب اس مہلک کثافت کی جانکاری بڑھی تو انھوں نے احتجاج کرنا شروع کیا کہ ہمارے ملک کے سمندر یا زمین میں یہ مہلک زہر دفن نہیں ہوگا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے ترقی یافتہ مغربی ممالک نے معاشی طور پر کمزور کچھ ممالک کو بھاری قیمت دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ ان کے ممالک کے ویرانوں یا سمندروں میں یہ تباہ کن لیکن ظاہری طور سے بے ضرر مادے دبا دیے جائیں۔ کہیں کہیں خاموشی

"ہم نے ملک کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے کس طرح اس کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں جیسے یہ ملک کسی دشمن کے ہاتھ لگ گیا ہے اور وہ اچھی طرح اس سے انتقام لینا چاہتا ہے، اپنے دل کا بخار نکال رہا ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کو اجاڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں اور اس کو کسی قابل رہنے دینا نہیں چاہتے۔ اس ملک کے ساتھ ہمارا معاملہ ایک دشمن حریف قوم کا سا معاملہ ہے۔ ریلوں پر سفر کرکے آپ دیکھ لیجیے بسوں پر سفر کرکے آپ دیکھ لیجیے۔ آپ کسی شعبے میں جا کر دیکھ لیجیے انصاف کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہم خود اپنے ملک کو اپنے ہاتھ سے تباہ کر رہے ہیں۔ ریل کا حال یہ ہے کہ پنکھے، نلوں کی ٹونٹیاں، کھڑکیاں، سیٹوں کے چمڑے چرا لے جاتے ہیں۔ گلی میں بجلیوں کے ڈھکن چرائے جاتے ہیں۔ اس کی بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ معصوم بچوں کی اس میں جان چلی جائے گی" ــــــ مولانا علی میاں

سے بھی ان مادوں کو دفن کر دیا گیا۔ تاہم ان مادوں کی تباہی ان داستانیں ان ممالک میں بھی پہنچ گئیں۔ عوام میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی اور بالآخر یہ راستہ بھی بند ہو گیا۔ فی الوقت صورت حال یہ ہے کہ ہر ملک کے سامنے چاہے وہ امریکہ ہو یا روس، برازیل ہو یا ہندوستان۔ ایک ہی مسئلہ ہے کہ اس خطرناک ایندھن کا کیا کیا جائے تاکہ اس کی ہلاکت خیز کثافت کی شکل میں نہ پھیلے۔ ابھی تک اس کو محض جمع ہی کیا جا رہا ہے اور روز بروز ان ذخائر میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کبھی اگر موقع لگتا ہے تو چوری چھپے ان کو خرد برد کر دیا جاتا ہے اور انجانے میں ہزاروں معصوم افراد کی زندگی داؤں پر لگ جاتی ہے۔ ان مادوں کو خلاء میں لے جا کر ضائع کرنے کی بات بھی زیر غور ہے، لیکن یہ راستہ بھی پرخطر ہے۔

بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی (I. A. EA) کے تخمینے کے مطابق ۲۰۰۰ء تک دنیا میں ۲۰ لاکھ میٹرک ٹن استعمال شدہ ایٹمی ایندھن ہو گا۔ اس ممکنہ خطرے یا کثافت سے بچنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ نیوکلیائی توانائی کا استعمال ہی بند کر دیا جائے لیکن توانائی کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ ناممکن سا لگتا ہے کہ کوئی ملک نیوکلیائی توانائی کا راستہ ترک کر دے گا۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کچھ ممالک جن میں ہندوستان بھی شامل ہے نیوکلیائی توانائی کا استعمال ترک کر کے یا کم کر کے بھی اپنی ضروریات پوری کر سکتے ہیں بشرطیکہ توانائی کے دیگر ذرائع پر بھی اتنی ہی توجہ اور وسائل صرف کیے جائیں جتنے کہ نیوکلیائی توانائی پر کیے جا رہے ہیں۔

"آج کی زندگی میں ایک قانون اٹل ہے۔ جو قوم ذہانت کی قدر نہیں کرتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ آپ کی تمام تر دلاوری، معاشرتی بلندی تیز فہمی، خشکی اور تری پر برتری۔۔ غرض کہ کوئی امتیاز بھی وقت کے تقاضوں کو بدل نہیں سکتا۔ آج ہم یہاں ہیں کل سائنس اس سے بھی آگے ہو گی۔ اس دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے کو کہیں بھی جگہ نہیں ملے گی۔"

وہائٹ ہیڈ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ ۔ جلد ۸ ۔ شمارہ ۶ (جون ۸۹ء)
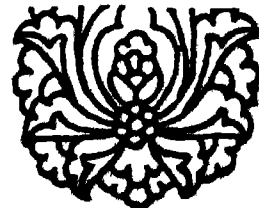
سائنس کی تاریخ ۔ اسلام کی آغوش میں

محمد افضال حسین قادری*

اسلام کے پیشوا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم ہے کہ:

"علم کے محقق بنو اور اس کے راوی نہ بنو۔"

یہ وہ بنیادی نظریہ ہے جس سے سائنس پیدا ہوتی ہے اور اسی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کیوں مسلمان سائنس کی تعلیم کو "علم" کا عظیم جزو سمجھتے رہے اور سائنس کے علم کی طلب میں کوشش اور جدوجہد کو انسان کی فلاح اور ترقی کا طریقہ قرار دیتے رہے۔

مسلمانوں نے سائنس کی تعلیم کو صرف بنیادی سائنس تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اخلاقی سائنس میں کمال پیدا کرنے کو علم اور ترقی کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ چنانچہ طب ناپ تول، مساحت اور پیمائش، جغرافیہ، زراعت و باغبانی، اسلحہ سازی، جہاز رانی، مشین سازی بار برداری، جانوروں اور مویشیوں کو پالنا اور نئی نسل کو پیدا کرنا بھی اتنی ہی عزت اور خدمت کے قابل کام سمجھے جاتے رہے ہیں جتنا کہ بنیادی علم اور ان کی قدر و منزلت علم کے برابر ہی کی جاتی رہی ہے۔

غرض کہ تعلیم اسلام کے ابتدائی دور ہی سے سائنس داں پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ اولین دور کے سائنس دانوں میں امام جعفر صادقؒ خالد بن یزیدؒ اور جابر بن حیانؒ شامل ہیں۔ جابر بن حیانؒ کا دور ۷۵۰ء تا ۸۰۰ء کا ہے۔ انہوں نے کیمیا کو بحیثیت سائنس، تجربہ اور تحقیق کی اور دنیا کے سامنے پیش کیا اور موجودہ کیمیائی تجزیہ ترکیب اور کیمیائی عمل کے طریقے اور عمل کو پہلی مرتبہ جدا جدا متعین کیا۔

اسلام کی دوسری صدی سائنس کی تاریخ "نشاۃ ثانیہ" کا رتبہ رکھتی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ خلفا، سلاطین، امراء اور لکھنے پڑھنے والے سب لوگ سائنس کی طرف ایک شوق اور بے تابی کے انداز میں متوجہ ہیں۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ یونان، مصر، چین، ہندوستان میں جو کچھ بھی علم سائنس کے میدان میں تین چار ہزار سال سے پیدا اور مرتب ہوا تھا اس کو فوراً ہی جمع اور محفوظ کر لیا جائے اور یہ اندازہ لگایا جائے کہ انسان نے اسلام سے پہلے کتنی سائنس حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ بیت الحکمت بغداد میں ایک فوج کی فوج ترجمہ کرنے والوں کی مقرر کی گئی جو ہر زبان سے سائنس کا ترجمہ کرتے تھے۔ ہارون رشید اور مامون رشید کے زمانے میں سارے علوم عربی میں داخل ہو گئے۔ پھر مسلمان سائنس کے میدان میں بہ حیثیت محققین کے اتر آئے اور پانچ سو برس تک دنیا کے عظیم ترین سائنس داں اسلام کے گہوارے ہی میں پیدا ہوتے رہے۔ تاریخ عالم میں اس انداز اور جوش اور ذوق و شوق سے سائنس کی طلب کی مثال نایاب ہے۔ جذباتی اعتبار سے شوق کی حد تک یہ کیفیت آج بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

مسلمانوں نے جو علمی کام انجام دیے ان کو چھپانے اور مٹانے کی جو کوشش یورپی اقوام نے کی ہے وہ انسانی بدخلقی

---

* پروفیسر، سابق صدر شعبہ سائنس، کراچی یونیورسٹی، کراچی

اور خود غرضی کی بدترین مثال ہے۔ مسلمانوں نے تو یہاں تک کیا تھا کہ جن یونانی، مصری، ہندوستانی سائنس دان سے علم حاصل کیا اس کا نام سرفہرست لکھتے رہے۔ بلکہ بہت سے علماء نے اپنے کارناموں کو انہیں کے نام سے منسوب کیا۔ کیا علمی قدردانی اور اعتراف کی ایسی مثال یورپ کی کوئی قوم پیش کر سکتی ہے؟ مغربی شہنشاہیت اور حکومت کے پیش نظر ایک منظم اور متفقہ کوشش کی گئی کہ عرب سائنس دانوں کا نام تاریخ کے صفحے سے مٹا دیا جائے۔ ہزاروں برطانوی درسی کتابیں یہ ظاہر اور بیان کرتی ہیں کہ ارسطو اور اقلیدس اور ارشمیدس کے بعد دنیا میں راجر بیکن، آئزک نیوٹن، مائیکل فراڈے وغیرہ ہی پیدا ہوئے اس خود غرضی کی انتہا تو یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ برطانوی کتابیں جرمن فرانسیسی اور اطالوی سائنس دانوں کے نام تک کو چھپا دیتی ہیں۔ پھر مسلمانوں اور خاص طور پر عرب سائنس دانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے اور یہ تو یورپ بھر کی عام پالیسی رہی ہے کہ اگر عرب حکیم یا سائنس دانوں کا نام بھی لیا جائے تو بارہویں صدی تک اس کے بعد سے مسلمانوں کے سارے علمی کارناموں کو تاریخ سے مٹا دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آٹھویں صدی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک یورپ کی قوموں کے پاس ایک بھی سائنس کی اعلیٰ کتاب موجود نہیں تھی۔ اندلس کے اسلامی گہوارے نے یعنی غرناطہ، اشبیلیہ، قرطبہ وغیرہ نے اپنی عالمگیر خدمت اور علم کی اشاعت کی خاطر ہزارہا اطالوی، برطانوی، فرانسیسی اور دیگر اقوام یورپ کے لوگوں کو تعلیم دی۔ پھر یہ سائنس دان اپنے ملکوں میں گئے، اور انہوں نے اپنے بادشاہوں کو سائنس اور علم کی عظمت سے آگاہ کیا۔ ان کی سرپرستی میں یورپی زبانوں میں کتابوں کا عربی سے ترجمہ کرایا گیا۔ ان ترجموں کے بعد سے یورپی زبانوں میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ جیسے ہی لاطینی زبانوں میں سائنس داخل ہوئی عربوں کی یاد مٹانے کی کوشش تیز کر دی گئی اور عرب دشمنی کی بنا پر مسلمانوں اور خاص طور پر عربوں کی تیرھویں صدی سے سولہویں صدی عیسوی تک اور اس کے بعد کے کارناموں کا ذکر نہیں کیا گیا، حالانکہ سائنس کی ترقی اور تحقیق کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ تمام تحقیق اور معلومات جو کسی کتاب کے لکھنے کے وقت تک موجود ہیں، بیان کر دی جائیں تاکہ طالب علم اس سے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ سولہویں صدی عیسوی سے جب یورپین اقوام نے اسلامی ملکوں پر قبضہ کر لیا اور حکومت چھا لی تو پہلی کوشش یہی کی گئی کہ ہمارے آباؤ اجداد کی کتابیں لندن، پیرس، لائڈن، روم، اسکوریال کی لائبریریوں میں بند کر دی جائیں اور ایک عالمگیر منظم کوشش کے ذریعے سے مسلمانوں سے نہ صرف سائنس کے علوم چھین لیے جائیں بلکہ ان کی یادیں بھی بھلا دی جائیں۔ اب بیسویں صدی عیسوی میں جب امریکہ اور دوسری قوموں نے یہ محسوس کیا کہ تاریخ سائنس پڑھانا ایک ضروری اور لازمی ضرورت ہے اور سائنس کے نئے خیالات اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتے جب تک کہ نوع انسان کی ساری کی ساری تاریخ نہ پڑھائی جائے تو اس صورت سے مجبور ہو کر یورپ اور امریکہ کی دوسری کتابوں میں کہیں کہیں عرب نام بھی نظر آنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی زور و شور سے لکھی جانے لگی کہ عربوں نے یہی خدمت کی ہے کہ یونان کی سائنس کو مٹنے سے بچا لیا، پھر مغرب نے اس یونانی ورثے کو سنبھال لیا۔ ایک ستم ظریف عالم ڈیمپیئر نے جن کی کتاب انگریزی زبان کی درسی کتاب ہے، یہاں تک لکھا ہے کہ یورپ نشاۃ ثانیہ کے جوش میں سائنس کے میدان میں بغیر عربی دور سے فائدہ اٹھائے اور بلا عربی سائنس کی کتابوں کے پڑھے وہی مرتبہ اور ترقی حاصل کر سکتا تھا جو عربوں سے سیکھنے کے بعد حاصل ہوئی حق ناشناسی کی اس سے بدتر مثال تاریخ سائنس میں نہیں مل سکتی۔ جن لوگوں نے اسکوریال، لندن، ویانا، پیرس، لائڈن، قسطنطنیہ، سمرقند میں عربی کتابوں کے نسخے دیکھے ہیں، وہ ایمان داری سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اتنے بڑے علمی ذخیرے کے پیدا کرنے والے کیا اس کے مستحق نہیں کہ دنیا اُن کو قدیم سائنس کا بانی نہیں تو سائنس کا بانی ضرور کہے؟ یہ تو ایک

مسلمہ حقیقت ہے کہ پیرس کی یونیورسٹی، جنوبی اطالیہ کی یونیورسٹیاں آکسفورڈ یونیورسٹی، غرناطہ اور قرطبہ ہی کے طالب علموں نے قایم کیں اور عربی زبان کی تعلیم تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی تک ان درس گاہوں میں جاری رہی۔

عرب یا مسلمان سائنس دانوں نے کیا کارنامے انجام دیے، ایک مختصر سے مضمون میں اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، وہ بھی اس حالت میں جب کہ بیشتر مواد عربی میں ہو اور یہ کتابیں بھی ہم کو میسر نہ ہوں بلکہ یورپ اور امریکہ کے مقفل کتب خانوں کی زینت ہوں۔ ایسے ہی علمی ذخیروں کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

سچی بات یہ ہے کہ ۷۵۰ء سے ۱۲۰۰ء تک جابر بن حیان سے ابن رشد تک عربی زبان اور عرب بلا استثناء دنیائے سائنس کے تنہا حکمراں تھے۔ پھر اسلامی رواداری، علم پروری اور انسانی خدمت کے نتیجے میں اور قوموں کی زبانوں میں بھی سائنس کی کچھ کتابیں شایع ہوئیں جن کا مبلغ علم اور تحقیق سطح عرب سائنس سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اسلامی سائنس کا دور ۱۵۰۰ء تک عالمگیر شہرت اور علمی کمال کا حامل ہے اور اس کے بعد کے سائنسی کارنامے ہیں اس وجہ سے نہیں معلوم ہو سکے کہ یورپین زبانوں میں دانستہ طور پر ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ سائنس کے معیار کے لحاظ سے وہ اس کے ضرور مستحق تھے ۔

مسلمانوں نے سائنس جس انداز سے شروع کی اس کا پہلا جزو تو یہ تھا کہ یونان، مصر، روم، چین اور ہند کے سارے علمی مواد کو ایک جگہ جمع کیا جائے اور ایک جامع اور موثر انداز سے سائنس کی ترقی اور تحقیق کی جائے۔ عربی تحقیق کا اسلوب یہ تھا کہ سارے کے سارے علوم کی حکمت عملی، طریقہ اور سالمیت کو ساتھ ساتھ بیان کیا جائے چنانچہ اسلام نے بہت سے ایسے علماء پیدا کیے جنہوں نے جامعیت کا یہ معیار حاصل کر لیا جو آج تک ان کے بعد انسانوں نے پیش نہیں کیا۔ ان کتابوں میں فارابی (۸۷۰ — ۹۵۱ء) کی احصار علوم ابن سینا (۱۰۳۸ء) کی "کتاب الشفا" جو ۲۰ ۵ لنا برن پر مشتمل ہے۔ غزالی (۱۱۱۱ء) کی "مقاصد الفلاسفہ" ابن حزم (۱۰۶۳ء) کی کتاب "الملل والنحل" ابن ماجہ (۱۱۳۶ء) کی "مجموع الفلسفہ الاسلامیہ" ابن طفیل (۱۱۸۵ء) کی کتاب "حی بن یقظان" ابن رشد کی کتاب "الشرح متوسط والشرح کبیر" اور ابن خلدون کا "مقدمہ" بلا کسی بحث واختلاف کے شامل ہیں۔

فارابی نے نہ صرف ارسطو کے علم کو زندہ کیا اور دنیا سے روشناس کرایا بلکہ سارے علوم کی ترقی کے لیے راستہ نکالا۔ شیخ الرئیس ابن سینا نے گیارہویں صدی عیسوی تک علوم و فکر میں جو بھی ترقی ہوئی اور اس میں ان کی اپنی تحقیقات بھی شامل تھی، وہ دنیا کو پیش کر دی۔ غزالی نے سائنس اور الہیات پر عالمگیر تبصرہ ایک تحقیق کے ذریعہ علم اور دین اور خدا پرستی کو مربوط علم بنا دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ارسطو کی مثال کو اختیار کیا اور طبعیات (سائنس) مابعد الطبعیات (میٹافزکس، تصوف وغیرہ) اور الہیات (علوم دینیہ) میں ایک رابطہ اور فکری یکسانیت پیدا کر دی۔ اگر غزالی یہ کام نہ کرتے تو عالم اسلام آج یورپ کی طرح ملحد اور بے دین ہو جاتا اور اخلاقی قدریں روحانیت اور انسانی محبت اور خدمت کا جذبہ دنیا سے نیست و نابود ہو جاتا۔

عالم اسلام میں ہر دور میں ایسی جامع اور بسیط کتابیں نکلتی رہیں جنھوں نے انسان کی فکر کو مربوط اور با مقصد بنا دیا اور سارے علوم کو یک جا طور پر پیش کیا۔ مغربی مفکر اسے انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف کہتے ہیں لیکن وہ کتابیں انسائیکلوپیڈیا ہی نہیں بلکہ نوع انسان کی بقا، فلاح اور مستقبل کے نسخہ کیمیا ہیں جنھوں نے انسانیت کو زوال سے بچا لیا۔ ابن طفیل اور ابن رشد نے سائنس کے میدان اور طریقہ کار کو الہیات سے متصادم ہونے سے ہمیشہ کے لیے بچا لیا۔ ابن رشد نے سائنس کی رسائی اور طرز فکر کو الہیات کے مطالعے اور تحقیق اور مقصد سے مختلف اور مخصوص حیثیت دے کر جدید سائنس کے دور کی ابتدا کی —

جاپان میں طریق امتحانات

فروری اور مارچ کے مہینوں میں جاپان میں تعلیمی اداروں میں داخلے کے امتحانوں کا موسم ہوتا ہے۔ ان دنوں جاپان میں سخت سردی ہوتی ہے چنانچہ ایک دن صبح سویرے جب کہ سردی اپنے جوبن پر تھی ٹوکیو کے نواح میں واقع چواؤ یونیورسٹی کا منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ طالب علموں سے بھری ہوئی بسیں یکے بعد دیگرے یونیورسٹی میں داخل ہو رہی تھیں۔ یہ طالب علم جن پر خاموشی طاری تھی، اس امتحان میں شرکت کی غرض سے آئے تھے جسے پاس کیے بغیر یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا۔ لہٰذا ان کے چہروں پر نظر آنے والی سنجیدگی اور اضطراب کا باعث محض سردی ہی نہیں تھی بلکہ اس کی بڑی وجہ امتحان کا اثر تھا۔

دوسرے ممالک کی طرح جاپان میں بھی اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کے لیے یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونا لازمی امر ہے اور پھر اگر کوئی طالب علم بڑی بڑی اور مشہور کمپنیوں میں ملازمت حاصل کرنے کا متمنی ہو تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی مشہور اور مستند یونیورسٹی سے سند یعنی ڈگری یافتہ ہو۔ اس نصب العین کے پیش نظر یونیورسٹی کا انتخاب ایک ایسا فیصلہ ہے جس کے نتائج ساری زندگی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

جاپان میں بارہویں جماعت تک کی تعلیم سینیئر اسکولوں میں دی جاتی ہے۔ ان ہائی اسکولوں سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علموں میں سے ۹۱ فیصد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلے کے امتحانوں میں شرکت کرتے ہیں جن میں سے ۳۰ فیصد سے زائد کو یونیورسٹیوں میں داخلہ مل جاتا ہے۔ اعداد و شمار کا یہ فرق ذہانت کے اس عظیم مقابلے کی عکاسی کرتا ہے جو جاپانی طالب علموں کے مابین ہوتا ہے۔ مشہور و معروف یونیورسٹیوں میں داخلے کے خواہش مند طالب علموں کی تعداد وہاں دستیاب نشستوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اس سخت مقابلے کی وجہ یہ ہے کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ اچھی سے اچھی درس گاہ سے تعلیم حاصل کرے۔ تاکہ بعد میں اس درس گاہ کے حوالے سے اسے اچھی سے اچھی ملازمت مل سکے۔ کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلے کا امتحان پاس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے کسی اچھے ہائی اسکول میں بارہویں جماعت تک پڑھا جائے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جونیئر ہائی اسکول میں بھی تین سال تک خوب محنت کی جائے۔ تاکہ اس کی بنیاد پر کسی اچھے سینیئر ہائی اسکول میں داخلہ مل سکے۔

سینیئر ہائی اسکول میں داخلے کے لیے بھی سخت مقابلہ ہوتا ہے لہٰذا بہت سے والدین اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ایسے پرائیویٹ یعنی نجی جونیئر ہائی اسکولوں کا انتخاب کرتے ہیں جو کسی ایسے مشہور سینیئر ہائی اسکول سے وابستہ ہو جس کے طالب علموں کی نسبتاً زیادہ تعداد معروف یونیورسٹیوں میں جاتی ہو یا پھر والدین ایسے جونیئر ہائی اسکولوں کو ترجیح دیتے ہیں جن کا الحاق بیک وقت سینیئر ہائی اسکول اور یونیورسٹی سے ہو۔ تاکہ اس کے بچوں کو اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دشواری یا رکاوٹ پیش نہ آئے۔ حصول تعلیم کی اس دوڑ کے نتیجے میں بچوں کو جونیئر ہائی اسکولوں میں داخلہ لیتے وقت بھی مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

- اچھی ملازمت کے لیے اچھی درس گاہ سے تعلیم پانے کی روایت نے مقابلے کے رجحان کو جنم دیا ہے۔ مختلف سطح پر پیش آنے والے ان مقابلوں کو جیتنے کے لیے جاپانی طالب علموں کو اپنی پوری تعلیمی زندگی کے دوران سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ جاپان کا تعلیمی ڈھانچہ اس طرح سے ہے کہ وہاں بچے چھ سال ایلیمنٹری اسکول میں، تین سال جونیئر ہائی اسکول میں، تین سال سینیئر ہائی اسکول میں اور پھر چار سال یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ ایلیمنٹری اسکول میں داخلے کے لیے بچے کی عمر چھ سال ہونی چاہیے۔ اس طرح ایلیمنٹری اسکول میں داخل ہونے والا طالب علم ۱۲ سال کی عمر میں ایلیمنٹری اسکول، ۱۵ سال کی عمر میں جونیئر ہائی اسکول، ۱۸ سال کی عمر میں سینیئر ہائی اسکول اور ۲۲ سال کی عمر میں یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر لیتا ہے۔ پہلے نو سال تک تعلیم لازمی ہے۔ ایلیمنٹری اسکول میں داخلہ لینے سے پہلے بہت سے بچے کنڈرگارٹن یا نرسری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

یونیورسٹی میں داخلے کا امتحان طالب علموں کے لیے اپنے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنے کی سمت میں ایک آخری موقع فراہم کرتا ہے۔ ان کے مستقبل کا دار و مدار اسی امتحان کو پاس کرنے پر ہوتا ہے۔ دو سالہ کورس پڑھانے والے کالجوں کے بشمول جاپان میں تقریباً ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کی درجہ بندی، شہرت اور نیک نامی کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ چنانچہ ان کا انتخاب کرتے وقت طالب علم اپنے ذہن میں تین ترجیحات متعین کرتے ہیں۔ اولاً ایسی یونیورسٹی جس میں انہیں بآسانی داخلہ مل جانے کا یقین ہوتا ہے دوئم وہ جہاں ذرا مشکل سے داخلہ مل سکتا ہے اور سوئم ایسی یونیورسٹی جہاں داخلہ ملنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اپنا مقدر آزمانے کے لیے وہ ایک سے زائد یونیورسٹیوں میں داخلے کا امتحان دیتے ہیں۔ اس تگ و دو میں والدین کو خاصے اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ پڑھائی پر اُٹھنے والے عمومی اخراجات کے علاوہ داخلے کے امتحان میں شرکت کے لیے تقریباً پچاس ہزار ین (۳۵۰۰ روپے) صرف ہوتے ہیں۔

داخلے کا امتحان دینے کے بعد طالب علم اسی روز نتیجے سے آگاہ کر دیے جاتے ہیں لہٰذا آپ ان کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ ان کی کوشش بار آور ثابت ہوئی ہے یا نہیں۔ جو طالب علم پاس ہو جاتے ہیں، بے حد مسرور نظر آتے ہیں، لیکن ان میں بعض نیم خوش دکھائی دیتے ہیں کیونکہ وہ اپنی اولین پسند کی یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہوتے یا پھر شاید اطمینان کا احساس ہی ان کے لیے باعثِ مسرت ہوتا ہے۔ ناکام ہونے والے سب کے سب طالب علم مایوسی کا اظہار نہیں کرتے کیونکہ ان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو داخلہ لینے کے لیے بے حد پر عزم ہوتے ہیں اور خواہ کتنی ہی بار ناکام رہیں، اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں۔ وہ فی الوقت یا تو کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر لیں گے یا کسی فنی تربیت کے اسکول میں داخلہ لے کر تعلیم جاری رکھیں گے۔ تاوقتیکہ اگلے برس داخلے کے امتحان کا وقت آ جائے۔

کچھ طالب علم جن کو اپنی پہلی پسند کی یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے وہ اس لیے بہت خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس دن کے لیے انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دی تھیں اور اب جبکہ وہ ابھی بیس برس کے بھی نہیں ہوئے انہیں ایک بہترین یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔

ایسی امتحانی معرکہ آرائی صرف اس طرح کے چاق و چوبند اور ہم پلہ معاشرتی ماحول میں ہی ممکن ہے جیسا کہ جاپان میں ہے۔

ماخذ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۶ (جون ۸۹ء)

اپنا منہ صاف رکھیے

ناصر بشیر موسانی*

تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح میں اہل بابل نے یہ سوچا کہ دانت کے خراب ہو جانے کی وجہ دانت کا کیڑا ہے۔ قدیم یونانیوں نے تسلیم کیا کہ دانت میں پھنسے رہ جانے والے غذائی ٹکڑے دانتوں کو خراب کر دیتے ہیں۔

موجودہ دنیا کے لحاظ سے انٹونی وان. لیون ہوک، وہ پہلا آدمی تھا جس نے دانت سے نکالے گئے مواد کو خردبین سے دیکھا۔ ۱۶۷۰ء کے عشرے میں اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی وجہ سے دانتوں میں خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں

انیسویں صدی کے دوران ڈبلو ڈی ملر نے کئی حیاتیات دانوں کی قیادت کرتے ہوئے دانتوں کی بوسیدگی کے متعلق "کیمیائی۔ جراثیمی نظریہ" پیش کیا۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ کسی بھی دانت کے اوپری مینا یا اینیمل (Enamel) میں بوسیدگی کی وجہ تیزاب ہوتا ہے۔ یہ تیزاب اس وقت پیدا ہوتا ہے جب منھ میں رہ جانے والے غذائی ریشوں میں خمیر پیدا ہوتا ہے، اس خمیر کو جراثیم ہی ممکن بناتے ہیں۔

یہ بات تو یقینی ہے کہ منہ میں جراثیم موجود ہیں تمام صحت مند جانوروں اور پودوں میں جراثیم موجود ہیں۔ انسان بھی جراثیم سے پاک نہیں۔ ہمارے جسم میں بھی جراثیم کے رہنے اور پھلنے پھولنے کے لیے بہت سی جگہیں ہیں۔ ایسی جگہوں میں سے ہر ایک میں جراثیم وائرس اور متعلقہ وجودوں کے معاشرے موجود ہیں منہ بھی ایک ایسی ہی جگہ ہے۔ تحقیق کرنے والوں نے جب زیادہ قریب سے منھ کا معائنہ کیا ہے تو انہیں معلوم ہوا ہے کہ منہ میں جراثیم کے رہنے کی ایک سے زیادہ جگہیں ہیں اور ہر جگہ میں جس قسم کے جراثیم رہتے ہیں وہ دوسری جگہ میں رہنے والے جراثیم سے تھوڑے بہت مختلف ضرور ہیں۔

منہ میں رہنے والے جراثیم کو جن چیزوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، ان میں سے ایک اہم چیز تھوک ہے تھوک کا بہاؤ ہے تھوک کا مائع جراثیم اور وائرس کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے جب انسان تھوک نگلتا ہے تو جراثیم اور وائرس معدے میں چلے جاتے ہیں اور وہاں مر جاتے ہیں۔

لوگوں میں تھوک پیدا کرنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے لیکن کم سے کم شرح بہاؤ کے باوجود بھی تھوک کا بہاؤ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ یا تو جراثیم کو کسی سطح سے پیوست رہنا پڑتا ہے، ورنہ وہ "ساکت جگہوں" تک محدود ہو جاتے ہیں۔ ان ساکت جگہوں کے گرد ہی دانت ہوتے ہیں۔

منہ میں کئی طرح کی سطحیں ہوتی ہیں۔ بعض جراثیم خاص جگہوں ہی میں نشوونما پاتے ہیں۔ زبان، رخسار، مسوڑھے، دانت، دانتوں اور مسوڑھوں کے درمیان۔ ان سب جگہوں

* ناظم آباد نارتھ، کراچی، پاکستان

میں الگ الگ قسموں کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ الگ الگ جگہوں کے لحاظ سے جراثیموں کی تعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر منہ کے اندر موجود مختلف درزوں، کاٹنے والی سطحوں، ہموار سطحوں اور دانتوں کے درمیان جگہوں میں اتنی زیادہ تعداد جراثیم کی ہوتی ہے کہ صرف دانت کا میل صاف کرانے ہی سے نجات ملتی ہے۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا منہ عام طور جراثیم سے پاک ہوتا ہے۔ پھر دوسرے لوگوں کے تھوک سے اسے جراثیم ملنا شروع ہوتے ہیں۔ جراثیم کی یہ فراہمی زیادہ تر ماؤں کے تھوک سے ہوتی ہے۔

منہ میں جراثیم کی کالونیاں بننے کا آغاز ایروبک جراثیم سے ہوتا ہے۔ اس قسم کے جراثیم وہ ہوتے ہیں جو آزاد آکسیجن کی موجودگی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ جلد ہی وہ جراثیم بھی کالونیاں بنانے لگتے ہیں جو آکسیجن کے بغیر بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔

منہ میں جراثیم کی ابتدائی کالونیوں کو مخاطی خلیات Noco- sal Cells سے وابستہ رہنا پڑتا ہے۔ تاہم بہت سے جراثیم تب ہی کالونیاں بساتے ہیں جب دانت نکل آتے ہیں۔ دانت کی سطحیں ایسے جراثیم کو رہنے کے لیے جگہ فراہم کرتی ہیں۔

جراثیم کے علاوہ وائرس بھی منہ میں موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے جراثیم، وائرس اور ان کے متعلقات کے لیے مائیکروب کا لفظ استعمال کرنا بہتر ہے۔

مائیکروب کی ایک تہہ تیزی سے دانتوں پر جمتی جاتی ہے اور ایسی مناسب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس میں وہ جراثیم پھلتے پھولتے ہیں۔ جنھیں آکسیجن نقصان پہنچاتی ہے۔ اس قسم کے جراثیم میں ویلونیلا (Vellonella) بیکٹرائڈز (Bacteroids) اور فیوزوبیکٹریم (Fusobacterium) شامل ہیں۔ زبان کے نیچے اور دانتوں پر جمی ہوئی میل (بالخصوص جب کہ کئی دن سے دانت صاف نہ کیے ہوں) ایسے جراثیم کے لیے بہت سازگار ماحول فراہم کرتی ہے۔ مسوڑھوں کے درمیان جو خالی جگہ ہوتی ہے وہ بھی جراثیم کی کالونیاں بسانے کے لیے اچھی جگہ ثابت ہوتی ہے۔

جب بھی ہم کھاتے ہیں یا چائے، کافی اور مشروبات پیتے ہیں تو ان جراثیم کو بھی غذا ملتی ہے جو ہمارے منہ میں رہتے ہیں۔ بہت سے جراثیم کے لیے تھوک بھی غذا ہے۔ اسی طرح وہ سیال بھی جو مسوڑھوں اور دانتوں کے درمیان شگافوں سے نکلتا ہے۔ (crevicu- lar Fluid) ایسے اجزا سے بھرپور ہوتا ہے جو خون سے آتے ہیں۔ مائیکروب خود بھی غذائی جالے بنا لیتے ہیں۔ ان جالوں میں ایک قسم کے جراثیم کے تیار کردہ مادے دوسری قسم کے جراثیم کھاتے ہیں۔

منہ کا ماحول

دانت ان مائیکروب کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں جو دانت پر براہ راست چپک جاتے ہیں یا میل میں موجود جراثیم سے مل جاتے ہیں یا شگافوں میں رہتے ہیں یا دانتوں کے درمیان ساکت جگہوں میں رہتے ہیں۔

دانت لمبے عرصے تک صاف نہ کیے جائیں تو ان پر جمنے والی تہہ یا میل پختہ ہو جاتی ہے۔ اس پختہ میل میں جراثیم کی بہت سی انواع ایک جالا سا بن دیتی ہیں۔ تقریباً ۲۰۰ قسم کے جراثیم اس پختہ میل میں رہتے ہیں ان میں سے بہت سے جراثیم نایاب بھی ہیں اور گندے منہ کے سوا اور کہیں نہیں ہوتے۔

پختہ میل میں جو جراثیم اور وائرس رہتے ہیں ان پر تھوک کے اندر موجود جراثیم مارنے والے اجزا کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ ماحول اُن کے لیے خوب سازگار ہوتا ہے۔ اس لیے اس حیاتیات داں کے لیے جو مائیکروب پر تحقیق کر رہا ہو، دانتوں کی میل ایک حیران کن شے ہے۔ وہ اس میں بے شمار قسم کے جراثیم کے معاملات دیکھتا ہے۔

بدقسمتی سے زیادہ تر لوگوں کو دانتوں پر پختہ میل جم جانے کا احساس تب ہوتا ہے جب ان کے دانت میں درد ہوتا ہے بعض اوقات اس بات کا انکشاف دانتوں کی ان بیماریوں سے ہوتا ہے جن میں دانت خراب ہو جاتے ہیں مسوڑھوں میں سوزش ہو جاتی ہے۔ دانتوں کی بنیادیں کمزور ہو جاتی

ہیں اور وہ گرنے لگتے ہیں۔

جراثیم کا دانتوں کو خراب کرنے میں جو کردار ہے وہ اس وقت زیادہ اور واضح طور پر نظر آیا جب جانوروں کی پرورش جراثیم سے پاک ماحول میں ممکن ہو گئی۔

اس سلسلے میں پہلا تجربہ ۱۹۵۵ء میں فرینک اور اس کے ساتھیوں نے کیا۔ ان سب کا تعلق شکاگو یونیورسٹی سے تھا۔

اس سے آگے کا قدم پال کینز اور روبرٹ فرجرالڈ نے اٹھایا۔ ان دونوں کا تعلق دانتوں پر تحقیق کے قومی انسٹی ٹیوٹ (بیتھسڈا) سے تھا۔

فرینک اور اس کے ساتھیوں نے یہ ثابت کیا کہ جن جانوروں کو جراثیم سے پاک ماحول میں رکھا گیا اور جراثیم سے پاک غذا دی گئی، انھیں دانتوں کی بیماریاں لاحق نہیں ہوئیں۔ پھر جیسے ہی انھیں جراثیم والی غذا دی گئی ان میں دانتوں کی بیماریاں پیدا ہو گئیں۔

پال اور روبرٹ نے یہ دکھایا کہ دانتوں کی بیماریاں تین وجوہات سے ہوتی ہیں۔

۱۔ جراثیم کے درمیان تعاملات

۲۔ غذا

۳۔ منہ کا ماحول

پال کینز اور روبرٹ فرجرالڈ نے اپنی تحقیق ۱۹۶۰ء میں شائع کی تھی۔

مشی گن یونیورسٹی (امریکہ) کے والٹر لوزک نے اس سلسلے میں خاص قسم کی میل کا مفروضہ" پیش کیا ہے۔ اس مفروضے کی بنیاد تجربات پر ہے اور اس کے مطابق دانتوں کی میل میں موجود جراثیم سوزشیں اور دانتوں کے درمیان خلا پیدا کرتے ہیں۔ بالخصوص ایک خاص جراثیم ایس میوٹانز S. Mutans اس کا باعث ہے۔ دانتوں کا خراب ہونا چھوت کی بیماری ہے اور اس سے بچاؤ کی تدابیر ایس میوٹانز کے خلاف مزاحمت ہے۔

والٹر لوزک کی بات کہ ایس میوٹانز سے دانت خراب ہوتے ہیں، جانوروں کی حد تک مسلم ہے لیکن انسان کے لیے ابھی یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ والٹر نے جن تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر مفروضہ قائم کیا ہے وہ جانوروں ہی میں دیکھے گئے ہیں۔ تاہم بہت سے تحقیق کرنے والوں نے انسانی منہ سے بھی میل حاصل کر کے اس پر تحقیق کی ہے۔ ان انسانوں میں بچے اور بالغ افراد دونوں شامل ہیں۔ اس تحقیق کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی خاص قسم کے جراثیم کا دانت خراب کرنے سے تعلق ہے یا نہیں۔

اس تحقیق کی ایک اچھی مثال ۱۹۶۹ء میں ڈوبکین اور اس کے ساتھیوں نے پیش کی۔ انھوں نے تیرہ برس کے ۱۲۹ بچوں کا معائنہ کیا۔ ان تمام بچوں کے معائنے کے ذریعے ایس میوٹانز اور ایس سینگوئس (S. Sanguis)

ونسنٹ کی بیماری :—— ونسنٹ کی بیماری (Vincent's Disease) ایک تکلیف دہ کیفیت ہے اور مختلف اسباب سے پیدا ہوتی ہے۔ ان اسباب میں منہ کو صاف نہ رکھنا، غذائی کمی، پریشانی، آرام میں کمی اور تمباکو پینا شامل ہے۔

اس بیماری میں بھی مسوڑھوں پر تھوڑا سا دباؤ پڑتے ہی خون بہنے لگتا ہے۔ مسوڑھوں میں ناسور (السر) پیدا ہو جاتا ہے۔ مسوڑھوں کے علاوہ بھی منہ کے کئی حصوں میں زخم بن جاتے ہیں۔ ان زخموں میں جراثیم کی بہت بڑی مقدار رہتی اور نشو و نما پاتی ہے۔

اس بیماری کے مریض کو بولنے اور نگلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ تھوک نا مناسب حد تک زیادہ نکلتا ہے منہ سے بدبو آتی ہے۔ سوزش بڑھتے بڑھتے گلے تک پہنچ جاتی ہے، ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگتا ہے۔

علاج۔ پہلا علاج تو یہی ہے کہ ماہر دنداں کے پاس جائیے۔ اپنا معائنہ کرلیے اور جو مشورے دیے جائیں ان پر عمل کیجے۔ عام طور پر اس کا علاج اینٹی بایوٹک دواؤں سے کیا جاتا ہے۔

اس کا ایک گھریلو علاج (جو ڈاکٹری علاج کی مدد کرے گا) یہ ہے کہ نمک کا ایک چمچہ اور کھانے والے سوڈے کا ایک چمچہ گرم پانی کے گلاس میں ڈال کر منہ کو صاف کرتے رہا کریں۔ ہر دو یا تین گھنٹے بعد اس طرح منہ صاف رکھنے کی کوشش کیجیے۔ دانتوں کو احتیاط سے برش کیجیے۔ تمباکو اور کولا مشروبات سے مکمل پرہیز کیجیے۔ ملٹی وٹامن (Multi Vitamin) استعمال کیجیے۔ بالخصوص وہ جن میں وٹامن سی اور بی کمپلکس کا تناسب زیادہ ہو۔

دانتوں اور منہ میں ان کے علاوہ اور بھی تکالیف پیدا ہو سکتی ہیں۔ مثلاً زبان کی سوزش منہ سے بدبو آنا، زبان پر میل جم جانا اور ہونٹوں کا کٹ پھٹ جانا۔

یاد رکھیے کہ اچھی صحت کے لیے دہن اور جسم دونوں کا صاف رکھنا ضروری ہے۔

۴

جراثیم کے تعلق کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔ دیکھا گیا کہ دانت کی کسی خاص جگہ پر اُن جراثیم کی موجودگی ہوتی ہے یا نہیں۔ چونکہ میل کے جراثیم پیچیدہ ہوتے ہیں، اس لیے زیادہ تر معائنوں میں صرف چند انواع ہی نظر آسکیں۔ عام طور پر جو جراثیم ملے وہ ایس میوٹانز نوع سے تھے۔

اس قسم کی تحقیق کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس بات میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ دانتوں کی خرابی میں ایس میوٹانز نامی جراثیم کے باعث ہے۔ مزید غور کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ایک قسم کا تیزابی سیال منہ میں موجود ہو تو ایس موٹانز کی کالونیاں زیادہ بنتی ہیں۔ ان کے علاوہ لیکٹو بیسیلی (Lactobacilli) اور کینڈیڈا۔ البکنز (Candida albicans) بھی منہ میں پائے جانے والے جراثیم ہیں اور ان کا بھی دانتوں کی خرابی بڑھانے میں حصہ ہے۔

پس دانتوں کی صفائی، یہ خیال رکھنا کہ ہم کس قسم کی خوراک کھا رہے ہیں اور منہ میں کس قسم کی خرابی ہو جانے سے پرہیز اور علاج پر توجہ کر کے دانتوں کی خرابیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

عام طور پر لمبے عرصے تک تحقیق کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بالخصوص صحت اور دانتوں کے حوالے سے کیفیات اتنی پیچیدہ ہوتی ہیں کہ اصل وجہ کو دریافت کرنا اور پھر دور کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک کیفیت کا دوسری کیفیت پر اس قدر اثر ہوتا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی کیفیت پہلے پیدا ہوتی ہے۔ وقت اور سرمائے کی کمی بھی آڑے آتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض لحاظ سے تحقیق کرنے میں اخلاقی اصولوں پر زد پڑتی ہے اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ اُن اصولوں کا احترام کیا جائے۔ تاہم ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ایک طویل المیعاد تحقیق جارج باؤڈن، جرمنی ہارڈی اور اُن کے ساتھیوں نے کی۔ ان سب کا تعلق لندن کے ہاسپٹل ڈینٹل اسکول سے تھا۔

جارج، جرمی اور ان کے ساتھیوں نے دو سال تک ۹۱ بچوں کے دانتوں کا تحقیقی معائنہ کیا۔ ان بچوں کی عمریں بارہ اور تیرہ کے درمیان تھیں۔ معائنہ چھ بار کیا گیا اور جو حقیقت دریافت کی گئی وہ یہی تھی کہ ایس میوٹانز سے دانت خراب ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ صرف انہی سے دانت خراب ہوتے ہوں ممکن ہے کہ لوگوں کے دانتوں پر ایس میوٹانز جراثیم چپکے ہوئے ہوں لیکن وہ پھر بھی صحت مند ہوں۔

ان مشاہدات سے ان تحقیق کرنے والوں کو تقویت ملی ہے جن کے خیال میں جراثیم کی کسی خاص نوع کو دانت خراب کرنے کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ ان مشاہدات کی بنیاد پر کچھ کا تو خیال یہ بھی ہے کہ دانت پر جمی ہوئی میل میں موجود تمام جراثیم دانت خراب کرتے ہیں۔

بہت سے تحقیق دانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ دانتوں پر جمی ہوئی میل میں ایس میوٹانز کا موجود ہونا غیر معمولی بات نہیں۔ یہ جراثیم اس میل میں بہر حال موجود ہوتا ہے۔

منہ اور دانتوں کو صحت مند رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ غذائی عادتوں کو سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ مثال کے طور پر کاربوہائیڈریٹ والی غذا کا زیادہ کھانا اور ٹافیاں یا میٹھی گولیاں چوستے رہنا دانتوں کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ بالخصوص کھانے سے الگ اوقات میں میٹھی چیزوں کا کھانا دانتوں کے لیے مضر ہے۔ ممکن ہو تو کھانے کے دوران ہی میٹھی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں۔

"جب تمہاری نیکی تمہیں خوش کر دے اور تمہاری برائی تمہیں بُری لگے تو تم مومن ہو۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸، شمارہ ۶ (جون ۸۹ء)

فطری ماحول کی سیاست

[یہ مقالہ انل اگروال اور سنیتا نرائن کی مرتب کردہ کتاب " دی اسٹیٹ آف انڈیاز انوائرمنٹ سے مستفاد ہے۔] [ادارہ]

انیل اگروال — ترجمہ ابوبکر شبیر احمد*

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماحول ایک تصور بن چکا ہے جس کو اخبارات بہت ہی بھیانک کہانی کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اداریے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قدرتی ذرائع کا ٹھیک استعمال ہو۔ سرکار بھی اس میں پیچھے نہیں ہے جو کہ نت نئے اعلانات کرتی رہتی ہے ماحول کی حفاظت کے لیے سرکار کے پروگرام میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مثال کے طور پر جنگلات لگانے کی ایک بڑی اسکیم مرتب کی گئی ہے گزشتہ چار سال میں تقریباً ایک ہزار تخمی پودوں کی تقسیم یا روپنا کی گئی۔ اب نئے قوانین بھی ہوا اور پانی کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جنگلات کی حفاظت کے لیے قوانین وضع کیے گئے ہیں۔ چیتے شیروں کو بچانے کے قانون کو دنیا بھر میں سراہا گیا ہے۔ ہندوستان کی کل زمین کے قریب ۳ فیصد زمین کے حصے میں نیشنل پارک اور وائلڈ لائف سنکچوئریز کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ ان کے رقبوں کو بڑھانے کی مانگ الگ ہے۔ منصوبے کی دستاویزات اور پارٹی کے مینی فیسٹو ماحول کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ لیکن ان سرگرمیوں اور فکر کے نتیجے میں بڑے مسئلے کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جس میں فطری ماحول اور ملک کی ترقی کی رفتار میں بے آہنگی کا نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ تمام پروگرام ایڈہاک شکل میں ہے جس میں یہ واضح نہیں ہے کہ فوقیت کس کو دی جاتی ہے اس میں کوتوالی جیسی پالیسی زیادہ نمایاں ہے۔ تمام پروگرام اس بات کے مظہر ہیں کہ فطری ماحول کے متعلق سوچنا ہی اس کی حفاظت کرنا ہے۔ اس میں اس بات کی کم گنجائش رکھی گئی ہے کہ ترقی کی رفتار اس نہج پر ہو کہ وہ لوگوں کی ضروریات سے مماثلت رکھتے ہوں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں سیاسی مباحث دو باتوں پر مرکوز رہے۔ برابری اور پیداوار۔ فطری ماحول پر نظر ڈالنے کا کام تیسرے درجے پر رکھا گیا ہے۔ یہ کام ایسا ہے جس پر تمام زندگی کا انحصار ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ ترقی کی رفتار کو اس طرح پہچانے اور لاگو کرے جس سے مساوات، پیداوار اور زندگی کا انحصار توازن پر رہے۔

فطری ماحول صرف چھوٹے درخت اور شہر یا خطرات سے گھیرے پودے اور ایکو سسٹم نہیں ہیں۔ یہ دراصل ایک ہستی ہے جس پر ہم سبھوں کی زندگی کا انحصار ہے۔ جن پر پوری کاشتکاری اور صنعتی ترقی کا دارومدار ہے۔ ترقی فطری ماحول کے اخراجات پر صرف ایک حد تک ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے ہٹ کر

* ڈپارٹمنٹ آف انگلش، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یہ ایسی ہی بات ہوگی کہ ایک بیوقوف آدمی اُسی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا جس کو وہ کاٹ رہا تھا۔ ترقی فطری ماحول کی فکر کے بغیر مختصر مدت کی ترقی ہو سکتی ہے۔ لمبی مدت میں یہ ترقی کے برخلاف ثابت ہو سکتی ہے، جس میں غربت میں اضافے کا اندیشہ اور جور و ستم آتا ہے۔ ہندوستان اس مقام پر بہت تیزی سے پہنچ سکتا ہے۔

بہت ہی سادے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب میں بڑے ماحولیاتی مسئلے خارجی مادّوں (Waste Disposal) کے نکاس کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس مسئلے کے اندر ہوا اور پانی میں آلودگی، زہر آلود چیزوں کی نکاس، صنعتی اور نیوکلیر خارجی مادے آتے ہیں۔ اگرچہ ایسیڈرین کے مسئلے میں صاف طور سے اضافہ ہوا ہے پھر بھی زہریلی چیزوں کے خارج مادّوں کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ یہ تو سچ ہے کہ کچھ شہر اور ندیاں بہت صاف ستھری نظر آتی ہیں۔

تیسری دنیا میں جیسا کہ اس کی اپنی صنعتی ترقی ہوتی جاتی ہے، ان خارج مادّوں کی نکاس میں دن بدن حالت خراب ہوتی جارہی ہے۔ لیکن انہیں ہی بڑے مسئلے یا ماحولیاتی مسئلے نہیں کہا جاسکتا۔

شہری دنیا میں بڑے ماحولیاتی مسئلے وہ ہیں جو کہ قدرتی ذرائع کے غلط استعمال کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً زمین کی مٹی، جنگلات اور پانی کے ذرائع کا غلط استعمال۔ یہ مسئلے جدید انڈسٹری کے خام مال کی فراہمی کے دباؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تیسری دنیا کا فطری ماحول صرف اپنی ہی صنعتوں کے لیے خام مال نہیں فراہم کرتی ہے بلکہ مغرب کی صنعتوں کے لیے بھی خام مال مہیا کرتی ہے۔

مثال کے طور پر جاپانی اور مغربی ٹمبر انڈسٹری (عمارتی لکڑیوں کی صنعت) جنوب مشرقی ایشیا میں جنگل کی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

جاپانی انڈسٹریز تھائی لینڈ کو، جو کہ لکڑی درآمد کرنے والا ملک سمجھا جاتا تھا، اب جس کا شمار درآمد کرنے والے ملک میں ہوتا ہے، کو کنگال بنا چکا۔ اب جاپان دنیا کی بڑی جنگلات کی سرحد دکھنی امریکہ کی امیزن بیسن پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

لیکن فطری ماحول کے استعمال کرنے کے طریقے بذریعہ صنعت وہی ہیں جس کو ہم عالمی پیمانے پر دیکھتے ہیں۔ ہندوستانی صنعت، ہندوستانی فطری ماحول کو اتنا ہی نقصان پہنچاتی ہے جتنا کہ مغربی صنعت تیسری دنیا کے فطری ماحول کو۔ موجودہ انڈسٹری فطری ماحول پر کتنا انحصار کرتی ہے، اس بات کو معلوم کرنے کے لیے یہ کہنا فائدہ مند ہو سکتا ہے کہ تقریباً ہندوستان کی آدھی صنعتی پیداوار اور حیاتیاتی ماس (Bio mass) کی انڈسٹریز سے ظہور میں آتی ہے۔ مثلاً سوتی کپڑے کے کارخانے، مصنوعی ریشم، کاغذ، پرت دار لکڑی، ربر، صابن، شکر، تمباکو، پٹ سن، چاکلیٹ غذائی تیار شدہ مال اور پیکنگ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک چیز کی صنعت ملک کی کاشت شدہ اور جنگلات کی زمین پر کافی دباؤ ڈالتی ہے۔ ان تمام صنعتوں کو فصل کی زمین، جنگلات انرجی اور سینچائی کی ضرورت پڑتی ہے۔

ہندوستانی پیپر انڈسٹریز ہندوستان کے جنگلات کو کافی نقصان پہنچا رہی ہے۔ کرناٹک کی پیپر کمپنیوں نے تمام بانس کے جنگلات کو ختم کر دیا ہے۔ اب ان کو خام مال شمال مشرق سے ملتا ہے اور یہ ہندوستان کی آخری جنگلات کی سرحد ہے۔ سرکار کی اپنی کاغذ کی کمپنیاں شمال مشرق کی طرف خام مال کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہیں۔ آندھرا پردیش کی حکومت جزائر انڈمان اور نکوبار کے جنگلات پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ حکومت کا کی ناڈہ میں کاغذ کی صنعت قائم کرنا چاہتی ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸ ۔ شمارہ ۶ (جون ۱۹۸۹ء)

گاندھی جی اور نہرو جی کی مختلف راہیں

احمد رشید (علیگ)*

ہندوستان کی تاریخ میں ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کا دن بڑی آزمائش کا تھا، جب کہ ہندوستان کا جواہر اچانک پوری دنیا کو رنجیدہ اور غمزدہ چھوڑ کر چلا گیا۔

WORDS OF GANDHI JI

" He was what his name signified a " JAWAHAR " That was a Jewel.

نہرو جی ایک انسان دوست، محب وطن، عالمی امن و اتحاد کے حامی اور انصاف پسند انسان تھے۔ وہ ہندوستانی عوام کے ایسے رہنما تھے جن سے کسی مذہب و ملت اور کسی فرقہ و نسل کو اختلاف نہ تھا۔ ان کو اپنے وطن سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اسی لیے ان کی آخری خواہش تھی:

> " میرے جسدِ خاکی کے ساتھ کوئی مذہبی رسم ادا نہ کی جائے۔ بلکہ اس کی راکھ کو آسمان کی بلندی پر لے جا کر ہوائی جہاز کے ذریعے ہندوستان کی سرزمین پر بکھیر دی جائے۔ تاکہ وہ راکھ ہندوستان کی مٹی میں مل جائے اور ہندوستان کا جدا نہ ہونے والا ایک حصہ بن جائے۔"

دنیا ان کو اس لیے عظیم اسٹیٹس مین تسلیم کرتی ہے کیوں کہ انھوں نے عالمی امن کی حمایت کی تھی۔ انھوں نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے ہولناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جنگ صرف تباہی و بربادی لاتی ہے۔ ان کا یقین تھا کہ اگر ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور علیحدگی پسندی کو نہ روکا گیا تو ہندوستان برباد ہو جائے گا اور اس کی تہذیبی شناخت مٹ جائے گی۔ دیگر تمام ترقی کے راستے نہ صرف محدود ہو جائیں گے بلکہ مسدود ہو جائیں گے۔ انھوں نے ملک کی سالمیت اور فلاح امن و اتحاد میں دیکھی اور قومی یک جہتی کو ہندوستان کی دیگر چیزوں کے مقابلے میں اولیت دی۔ ان کا خیال تھا " ہر ترقی کی تجاویز سے پہلے ہندوستان کا اتحاد اول ہے باقی سب دوئم ہیں۔

ان خصوصیات کی وجہ سے گاندھی جی نے ان کو اپنا قانونی وارث (Legal Heir) کہا تھا۔

نہرو جی ایسے گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو سماج میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، جہاں دولت و زر کی فراوانی تھی، جہاں علم و عقل کی دولت تھی۔

نہرو جی کی سیاسی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ دسمبر ۱۹۱۶ء کے کانگریس کے لکھنؤ اجلاس میں گاندھی جی سے پہلی ملاقات ہوئی لیکن ایک معمولی قد و قامت اور لباس کے اعتبار سے ایک " گجراتی بنیا " سے وہ قطعاً متاثر نہ ہوئے۔

---

* رسل گنج، علی گڑھ

یہ ایک قدرتی امر تھا کہ دونوں کی مختلف انداز کی زندگی تھی ۔ گھریلو ماحول، تعلیم، تجربات اور زندگی کو برتنے کے رویے بھی مختلف تھے ۔ گاندھی جی کا بچپن گھر کے سخت مذہبی ماحول میں گزرا۔ نہرو جی نے ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں عام طور سے مذہب سے بے توجہی برتی جاتی تھی۔ حالاں کہ ان کی والدہ ایک مذہبی ہندو عورت تھیں۔ نہرو جی نے اپنا پہلا سبق ایک انگریز گورنس سے لیا ۔ گاندھی جی نے پہلا حرف پوربندر کے ایک پرائمری اسکول کی مٹی پر اپنی انگلی سے لکھا ۔ اس کے بعد بھاؤنگر کے کالج میں ان کو انگریزی لکچرس سے واسطہ پڑا۔ نہرو جی ۱۹۰۵ء میں بنیادی تعلیم کے لیے Harrow بھیج دیے گئے۔ سات سال انگلینڈ میں رہے ۔ کیمبرج سے سائنس کی تعلیم حاصل کی لندن میں بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی ۔ گاندھی جی نے بھی قانون کی تعلیم لندن میں حاصل کی ۔ انگلینڈ میں ان کو ایسے ذہین انسانوں کی صحبت ملی جنھوں نے دنیا کے مذاہب کے بنیادی اصولوں کو سمجھنے میں مدد کی۔ نہرو جی زندگی کے ٹھوس مقاصد جاننے میں فخر محسوس کر رہے تھے اور آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کے زیر اثر زندگی کی خوبصورتی اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ گاندھی جی لندن میں شراب، عورت اور گوشت سے پرہیز کر رہے تھے ۔ نہرو جی کے پاس ایسی کوئی قید نہ تھی ۔ وہ زندہ دل، فیشن پرست، جدید طرز زندگی کے دلدادہ، خوش پوش اور قریب قریب مغرب زدہ تھے ۔ ان کی دلچسپیاں موسیقی، گولف، کوئین کلب میں ٹینس کرکٹ میں تھی ۔

۱۹۱۲ء میں جب وہ انگلینڈ سے واپس ہوئے تو ان کی عمر ۲۳ سال تھی اور الہ آباد ہائی کورٹ میں اپنے والد موتی لال نہرو کے جونیئر کی حیثیت سے وکالت کے پیشے میں دلچسپی لینے لگے ۔ تب ہی تلک اور اینی بیسنٹ کے انتہا پسند خیالات کی ... رول لیگ میں شامل ہوئے لیکن پھر بھی انہیں زندگی کا صحیح مقصد نہیں ملا ۔

بہرحال گاندھی جی کا چمپارن اور کھیرا (KHERA) کا آندولن اور Rowlatt Act. کے مخالف تحریک شروع ہو گئی تھی ۔ جب کانگریس کا سالانہ اجلاس ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں ہوا تو جلیانوالا باغ کا حادثہ رونما ہوا۔ انگریزوں کے ظلم و ستم، قتل عام اور مارشل لا کے پاگل پن کا ثبوت تھا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملے گی لیکن اس تحریک کی تاریخی اہمیت اس لیے ہے کہ گاندھی جی اور نہرو جی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے ۔ اس اجلاس کی حیثیت اس لیے بھی بلند ہے کہ گاندھی جی کو "مہاتما" کی شکل میں دیکھنے کے لیے عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اُمڈ آیا تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ آزادی کی جنگ نے عوامی شکل اختیار کر لی تھی اور ملک کے جاہل عوام میں بھی آزادی کی قدر و قیمت اور سیاسی شعور پیدا ہو چلا تھا ۔ دوسرے یہ کہ گاندھی جی کے سیاسی نظریات کے سلسلے میں نہرو جی کو مکمل یقین ہو گیا تھا اور بعد میں وہ اُن کے کام کرنے کے ڈھنگ سے بھی متاثر ہوئے تھے ۔

۲۲-۱۹۲۰ء میں عدم تعاون تحریک نے ان کو مشن دیا اور ان کے خیالات میں عجیب و غریب تبدیلی رونما ہوئی ۔ ان کی زندگی میں سادگی آئی، سبزی خوری کی طرف مائل ہوئے اور مستقل انہوں نے گیتا پڑھنی شروع کی ۔ اسی دوران ان کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ مہینے کے لیے جیل بھیج دیا گیا ۔

فروری ۱۹۲۲ء میں یونائیٹڈ پروونس (اتر پردیش) کے مقام چوری چورا میں تشدد ہو جانے کی وجہ سے جب اس عدم تعاون کی تحریک کو واپس لے لیا گیا تو نہرو جی کو اعتراض ہوا اور انھوں نے گاندھی جی کے خیالات اور سیاسی حرکات و سکنات کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیئے ۔

آزادی کی پچیس سال کی صحبت بھی طویل جد و جہد میں ان دونوں کے درمیان مستقل اختلافات بڑھے مگر بھارت کی جنگ آزادی کی تحریک میں مزید تیزی آ گئی تھی ۔ مستقل گفت و شنید کے ذریعے مختلف عوامی مسائل کے سدباب کے سلسلے میں معلومات کے دروازے کھلے جس سے لوگوں کی علمی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا ۔ دونوں کے درمیان تعلقات میں بھی فرق آیا ۔ کیوں کہ دونوں حضرات ملک کے حادثات اور مسائل کا اپنے اپنے ڈھنگ، اپنے اپنے تجربات اور اپنی اپنی ذہنی سطح کی کسوٹی میں جائزہ لے رہے تھے ۔ گو کہ نظریاتی اختلافات مزید پیدا ہوئے مگر مقصد کی یکسانیت نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب رکھا ۔

۱۹۲۷ء میں یورپ سے واپسی کے بعد نہرو جی جوش و خروش سے

بھرے ہوئے تھے اور "مکمل آزادی" کے متمنی تھے۔ دونوں رہنماؤں کے درمیان کلکتہ کے اجلاس میں گرما گرم بحث و مباحثہ ہوا اور تب ہی اتفاق رائے ہوا جب کانگریس نے مکمل آزادی کے اعلان کا فیصلہ لیا۔

گاندھی جی حقیقت میں نہرو جی کے اصل نظریات کے خلاف نہ تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ حالات کے تقاضے کے تحت صحیح اور مناسب طاقت کا استعمال کیا جائے۔

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کے نمک ستیہ گرہ نے بھی نہرو جی کے دماغ میں شکوک پیدا کر دیے تھے۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں اس طرح کا آندولن بہت معمولی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس تحریک کا جوش اور ولولہ پورے ملک میں دیکھ کر نہرو جی کو بہت تعجب ہوا اور وہ اس "معمولی جسامت" کے انسان کی طاقت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اسی طرح نہرو جی اروِن پیکٹ سے بھی ناخوش تھے جو سول نافرمانی تحریک کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جنگ سے متعلق عدم تشدد کے سوال پر اختلاف نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی لیکن یہ تمام اختلافات اس وقت صلح میں تبدیل ہو گئے جب کہ گاندھی جی نے اپنے خیالات کو کانگریس کی رہنمائی کے سلسلے میں نہ تھوپنے کا سوچ لیا۔

گاندھی جی نہرو جی سے اس لیے متاثر تھے کہ ان کی بین الاقوامی معاملات پر گہری نگاہ تھی اس لیے باوجود اختلاف رائے کے وہ ان کی سوچ اور ذہانت سے متاثر تھے۔ تقسیم ملک کے مسئلے پر نہرو جی اور گاندھی جی کے اختلافات کافی بڑھ گئے تھے۔ اس سے گاندھی جی دل برداشتہ اور غمزدہ ہو گئے تھے۔ دراصل گاندھی جی تقسیم ملک کے خلاف تھے اور جب وہ اپنی حمایت سے محروم ہو گئے تو انھوں نے فوج کے تبادلے کے مسئلے پر مباحثے سے اپنے آپ کو دور رکھا اور پٹیل اور نہرو جی کو کھلے میدان میں آنا چھوڑ دیا۔

جس طرح سیاسی مسائل اور معاملات میں ان کے خیالات مختلف تھے، ساتھ ہی ہندوستان کی تعمیر نو اور نئے سماج کی تشکیل میں بھی ان کے نظریات میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ لیکن دونوں نے اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں ملک کے نئے نئے مسائل کا سدباب کیا اور مل کر کام کیا باوجود یہ کہ ان کے افکار میں اختلاف تھا۔

یہ ایک عام خیال تھا کہ گاندھی جی ایک مذہبی انسان تھے اور نہرو جی کی نظر میں مذہب قابل اعتنا نہ تھا۔ ان کی نظر میں مذہب ایک رسمی تقلید پسندی تھی اور رواجی مذہبیت ایک بیکار کی چیز۔ ان کا نظریہ تھا کہ جب مذہب کے بےبنیاد اعتقادات کا استحصال کیا جاتا ہے تو "فراریت" اس کا ماحصل ہوتا ہے۔ لیکن گاندھی جی کی صحبت میں وہ مذہب کے پس پشت بہنے والی روحانی قوت سے آشنا ہوئے تب انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مذہب نے انسان کو بہترین اقدار دی ہیں اور مذہب انسان کے اطمینان قلب کا ذریعہ ہی نہیں ایک اہم ضرورت بھی ہے۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ پورے طور سے مادیت پسند نہ تھے۔ گاندھی جی کی نظر میں مذہب صرف ایک رواج کا ہی نام نہیں ہے بلکہ اس روئے زمین پر انسان کا بنیادی مقصد نجات (MOKSHA) ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان دنیا سے بیزار ہو جائے بلکہ انسان کو مکمل نجات تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب کہ وہ خدمت خلق کا قائل ہو اور جب گاندھی جی "خدا سچ ہے" سے "سچ خدا ہے" کے نظریے تک پہنچے ہیں۔ یعنی "سچ" خود اپنی عظیم اخلاقی اور روحانی قدر رکھتا ہے۔ اس طرح مذہب اخلاق سے جڑ جاتا ہے۔ اس طرح نہرو جی بھی سیاست کی روحانی طاقت کے قائل ہو گئے تھے۔ ایک موقع پر نہرو جی نے کہا کہ "وطن کی خدمت ایک مذہب ہے اور جو یہ کرتا ہے وہ مذہبی انسان ہے" تو گاندھی جی نے اس امر پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ دونوں عدم تشدد کی پالیسی پر بھی اختلاف رائے رکھتے تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ نظریۂ عدم تشدد ہی سماج کے اختلاف کو ختم کرنے اور سچائی کو پھیلانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ نہرو جی عدم تشدد کی پالیسی کو ہر وقت اور ہر حالت میں تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ صرف ایک پالیسی تھی جو کہ صرف برطانیہ کے خلاف جنگ آزادی میں استعمال ہو سکتی تھی لیکن بیرونی حملے کے خلاف بطور ہتھیار استعمال نہیں ہو سکتی۔ اس لیے

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب کہ جاپان نے حملہ کرنے کی دھمکی دی تو دونوں کے درمیان اختلاف کھڑا ہو گیا۔ لیکن دھیان رہے گاندھی جی کا نظریہ عدم تشدد حملہ آور کے خلاف مقابلہ کرنے کے سلسلے میں بزدلانہ رویّے کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک تشدد بُری چیز ہے لیکن بزدلی اور غلامی اس سے زیادہ بُری ہے۔ وہ کبھی نہیں سمجھتے تھے کہ حملہ آور کے مقابلہ میں عدم تشدد کا طریقہ بطور ہتھیار استعمال ہو سکتا ہے۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دونوں ملکوں کی معاشی ترقی کے سلسلے میں الگ الگ نظریات رکھتے تھے۔ نہرو جی، گاندھی جی کے Trusteeship کے اصول پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ایک سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے نہرو جی نے سرمایہ داری اور زمینداری کو ختم کرنے کے لیے حکومت کی طاقت استعمال کرنے میں کسی قسم کا کوئی ذہنی کرب محسوس نہیں کیا۔ چونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ سب ہی زمیندار اور سرمایہ دار اپنی دولت کی ٹرسٹی شپ Trusteeship کو پسند کریں گے۔

نہرو جی کے نزدیک ملک میں امیری اور غریبی کے درمیان کی خلیج اسی وقت دور ہو سکتی ہے جب کہ صنعتوں کو قومیا لیا جائے گا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ ملک سے غریبی زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعت سے دور ہو سکتی ہے۔ لیکن نہرو جی ملک کی ترقی میں "صنعت" پر یقین رکھتے تھے مگر دونوں کا مقصد ملک کی غریبی کو دور کرنا تھا۔

آزاد ہندوستان کا وزیرِاعظم بننے کے بعد ہندوستان جیسے عظیم ملک کے لیے زراعت کی ضرورت اور اہمیت کو انھوں نے محسوس کیا اور مختلف موقعوں پر زراعت کی ترقی کے لیے ٹھوس اقدامات کیے اور ساتھ ہی صنعت اور دفاعی طاقت پر بھی پوری پوری توجہ دی۔ اسی طرح بڑے پیمانوں کی صنعت کے ساتھ چھوٹے پیمانے کی صنعت کی ترقی کے لیے بھی زور دیا۔

۱۹۵۵ء میں انھوں نے کہا تھا:

"پنج سالہ پروگرام میں ہم نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں بڑے پیمانے کی صنعتوں اور دیہاتوں کے درمیان توازن برقرار رکھا ہے"!

دوسری طرف گاندھی جی نے جدید مشنری کے دور میں بھاری صنعت کی اہمیت کو محسوس کیا لیکن وہ زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعت کی جگہ پر اس کو بہتر خیال نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح سے شہروں کے ذریعے گاؤں کا استحصال شروع ہو جائے گا۔

ایک جگہ مورلیس زنکن نے اپنی کتاب "ایشیا اور مغرب" میں صحیح اشارہ کیا ہے کہ

"ساٹھ سال کی مادی پلاننگ نے جاپان کو جنرل توجو دیا اور ایک صدی کی انگریزی تعلیم نے ہندوستان میں پنڈت نہرو پیدا کیا۔"

"ذاتی نوک جھونک ہونے سے لوگوں کو مزا آتا ہے مگر درحقیقت نفرت کے لائق ہے، نہ اصل مضمون سے اس کو تعلق ہوتا ہے اور نہ اس دلیل کو تقویت ہوتی ہے، بجز اس کے کہ لوگ کہیں کہ بھیّے خوب کہی اور کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸، شمارہ ۶ (جون ۸۹ء)

پروفیسر عبدالسلام ــــــ نذرانۂ عقیدت

اختر حسین آفتاب*

پروفیسر عبدالسلام پر مجھ جیسا حقیر انسان اگر کچھ لکھے تو اُس کی اہمیت شاید آفتاب کو چراغ دکھانے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لیکن ان جذبات کو کیا کروں جو کہ امڈے چلے آتے ہیں اور رُکنے کے لیے تیار نہیں۔ ذہن سے لگاتار یہی صدا آتی رہی؛ صاحب علم کو سمجھو، صاحب علم کی صحبت اختیار کرو، صاحب علم کا احترام کرو۔ اس مضمون کے لکھنے میں یہی جذبہ محرک رہا ہے۔ تو پھر آئیے اور ملیے اُس عظیم ہستی سے جو کہ قطب تارے کی مانند موجودہ دنیائے سائنس کے فلک پر درخشاں ہے اور جس کی تابانی اور درخشانی فطرت کے رازہائے سربستہ کو اکثر و بیشتر بے نقاب کرتی رہتی ہے

پروفیسر عبدالسلام صاحب کی پیدائش برٹش انڈیا (British India) کے صوبۂ پنجاب کے ضلع لاہور کے ایک اہم قصبہ میں ہوئی جس کا نام جھنگ ہے اور جو کہ دورِ مغلیہ میں محلوں اور باغوں کی جنت تصور کیا جاتا تھا۔ انقلابِ زمانہ نے حکومتِ مغلیہ کو باقی تو نہ رکھا لیکن جھنگ کی اہمیت آج بھی باقی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں کہ عبدالسلام صاحب پیدا ہوئے اور جنہیں فزکس (Physics) میں ۱۹۷۹ء میں نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا۔ مرحبا اے سرزمین جھنگ کہ تو نے ایسی عظیم ہستی کو جنم دیا۔

عبدالسلام صاحب کی پیدائش ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔

آپ کے والد بزرگوار زراعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے بیچ ایک ممتاز سرکاری افسر تھے۔ بہرحال یہ تو پیشہ تھا لیکن انسان کے اصل جوہر کا مرکز تو اس کی شخصیت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے عبدالسلام صاحب کے والد انتہائی معزز شخص تھے۔ وہ لوگوں کو نیکی، صداقت، ایثار اور رواداری کی تعلیم دیا کرتے۔ عبدالسلام صاحب بھی اسکول سے گھر لوٹتے تو وہ ان سے ضرور پوچھتے کہ انھوں نے اسکول میں کیا سیکھا؟ حصول علم میں عبدالسلام صاحب کی ہمت افزائی ان کے ماموں جان بھی کیا کرتے تھے۔

انسان کی پہلی تعلیم گاہ تو ماں کی گود ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنے والد سے اور کنبہ کے ماحول سے سیکھتا ہے۔ عبدالسلام صاحب کا گھریلو ماحول نیکی، خاکساری، محبت اور خلوص کا سرچشمہ تھا۔ خلوص اور محبت کے اسی ماحول میں ان کی شخصیت کی بنیاد پڑی جو بعد میں اور بھی نکھری اور چمکی اور عبدالسلام صرف عبدالسلام نہ رہے بلکہ تیسری دنیا کی فلاح اور امن عالم کی سلامتی کے لیے ایک عظیم مجاہد بن گئے۔ اپنی تقریر اور تحریر میں وہ بار بار زور دیتے ہیں کہ جنگی اسلحوں پر جو اخراجات ہیں، انہیں رد کیا جائے اور ان پیسوں کو فلاح انسانی پر خرچ کیا جائے۔ ایسا ہی خیال ایک بار امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے ظاہر کیا تھا۔ آج روس کے صدر گورباچوف بھی اسی نظریے کو عالمی پیمانے پر عملاً نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

* صادق پور، پٹنہ، بہار۔

مندرجہ ذیل سطور میں ہم عبدالسلام صاحب کی پہلی شاندار کامیابی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء موسم گرما اور دوپہر کا وقت۔ عبدالسلام صاحب سائیکل پر سوار جھنگ میں داخل ہوتے ہیں۔ قصبہ کے لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل، لبوں پر تبسم اور زبان پر خوش آمدید۔ ایک عجیب منظر تھا۔ عبدالسلام صاحب نے میٹریکولیشن امتحان اول درجے میں پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی کے ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ یہ تھا ان کی غیر معمولی ذہانت کا پہلا ثبوت۔

میٹریکولیشن کا دور ختم ہوا۔ وقت نے انگڑائیاں لیں۔ کالج کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ان کا داخلہ پنجاب یونیورسٹی کے گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا۔ وقت کی رفتار آگے بڑھی۔ چھ سالوں کی مدت گزری۔ ۱۹۴۶ء آ گیا۔ اسی سال عبدالسلام صاحب نے ایم۔ اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ انھوں نے ماسٹر ڈگری ریاضی میں حاصل کی۔

ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد عبدالسلام صاحب کے دل میں ایک ہلکی سی خواہش پیدا ہوئی۔ ایڈمنسٹریٹو سروس کے امتحان میں شامل کیوں نہ ہوں! لیکن حالات نے انہیں ایسا کرنے کا موقع فراہم نہ کیا۔ قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے تو سلام صاحب کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ پھر وہ ایڈمنسٹریٹو سروس میں کیسے جاتے۔

۱۹۴۶ء کا دور تھا۔ دنیا کی دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ الائڈ پاورس (Allied Powers) فاتح ہوئے۔ ایکسس پاورس (Axis Powers) کی شکست ہوئی۔ اسی دوسری جنگ عظیم کے لیے ہندوستان میں وار فنڈ (War Fund) قایم کیا گیا تھا۔ چونکہ جنگ ختم ہو چکی تھی اس لیے وار فنڈ کی رقم کو اسکالرشپ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی اسکالرشپ میں سے ایک اسکالرشپ عبدالسلام صاحب کو ملی جس سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیمبرج گئے۔

عبدالسلام صاحب نے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک کی مدت سینٹ جان کالج، کیمبرج میں فاؤنڈیشن اسکالر (Foundation Scholar) کی حیثیت سے گزارا۔ کیمبرج یونیورسٹی نے انہیں رینگلر (Wrangler) کا امتیاز بخشا۔ ایسا امتیاز جو کہ روایتی طور پر صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو کہ ریاضی میں غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہوں۔ اس کے بعد عبدالسلام صاحب فریڈ ہوائل (Fred Hoyle) جو کہ ایک کاسمولوجسٹ تھے ان کے مشورے سے فزکس کی دنیا میں داخل ہوئے۔

عبدالسلام صاحب کو کونڈش لیباریٹری (Cavendish Laboratory) کیمبرج سے ۱۹۵۲ء میں تھیوریٹیکل فزکس (Theoretical Physics) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ بھی قابل تعریف ہے کہ پی ایچ۔ ڈی مکمل کرنے کے پہلے ہی اُن کا تحقیقی مقالہ اتنا مقبول ہوا کہ کیمبرج یونیورسٹی نے انھیں ۱۹۵۰ء میں اسمتھ پرائز (Smith Prize) سے نوازا۔

کیمبرج کا پہلا دور ختم ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں عبدالسلام صاحب پاکستان لوٹے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں یہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی کے صدر ہو گئے اور ۱۹۵۴ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔

عبدالسلام صاحب نے تین سال تک پاکستان میں ٹیچر کے فرائض انجام دیے پھر بھی انھیں پیشہ ورانہ آسودگی نہ مل سکی۔ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے جس کے مواقع پاکستان میں بہت مشکل تھے۔ درس و تدریس کی فضا سازگار نہ تھی۔ سائنس کی ارتقاء کی جانب بڑے بڑے رہنماؤں کا رویہ قابل ستایش نہ تھا۔ اسکا عدم توجہی کا اثر طلبا پر بھی تھا۔

فزکس کی دنیا میں یہ ضروری ہے کہ ایک ماہر طبیعیات جانے کہ دوسرے ماہرین کیا سوچ رہے ہیں۔ ان کا آپس میں تبادلہ خیال انتہائی مفید ثابت ہوتا ہے۔ لاہور میں عبدالسلام صاحب

تو ایسا ماحول نہ مل سکا۔ اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ ان کی صلاحیت
پھل نہ چڑھ سکے یا منجمد ہو جائے۔ اسی لیے انہوں نے ۱۹۵۴ء
تک پنجاب یونیورسٹی کو چھوڑ دیا اور کیمبرج یونیورسٹی میں ایک لکچرر
کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ایسا انہوں نے اس لیے کیا کیونکہ
کیمبرج میں لکچرر رہنا لاہور میں پروفیسر اور صدر شعبہ ہونے سے
زیادہ سود مند تھا۔ کیمبرج میں عبدالسلام صاحب لکچرر کے عہدے
پر ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء تک فائز رہے۔

۱۹۵۵ء میں جنیوا میں اقوام متحدہ کی جانب سے ایٹم فار پیس
کانفرنس (Atom for Peace Conference)
منعقد ہوئی۔ عبدالسلام صاحب اس کے سائنٹفک سکریٹری
مقرر ہوئے۔ اس کے دو سال بعد یعنی ۱۹۵۷ء میں ان کا انتخاب
ہوا کہ وہ امپیریل کالج لندن میں نظریاتی طبیعیات کا شعبہ قائم کریں۔
ایشیا جو کہ برس ہا برس یورپ کے نوآبادیاتی نظام کا شکار رہا،
اس کے ایک فرد کے لیے یہ بات بلاشبہ بڑی اہم تھی اور وہ بھی صرف
۳۱ سال کی عمر میں۔ اس سے پروفیسر عبدالسلام صاحب کی غیر معمولی
ذہانت اور صلاحیت کا علم ہوتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے
کہ پروفیسر عبدالسلام رائل سوسائٹی لندن کے سب سے کم سن
فیلو (Fellow) چنے گئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف
۳۳ سال کی تھی۔

آئیے اب آپ کو لندن سے ترسٹے (Trieste)
لے چلوں۔ یہ ترسٹے کیا ہے؟ آج کی دنیا میں یہ اٹلی کا بڑا ہی
اہم مقام ہے۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں
انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس (International
Centre for Theoretical Physics)
قائم ہے۔ اقوام متحدہ کے اس بین الاقوامی مرکز کو قائم کرنے
کا سہرا صرف پروفیسر عبدالسلام صاحب کے سر ہے۔ ترقی
یافتہ ممالک دل سے نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح کا بین الاقوامی
ادارہ قائم ہو لیکن پروفیسر عبدالسلام صاحب کی لگاتار کوشش
اور دیگر ممالک کے تعاون کے نتیجے میں یہ سینٹر وجود میں آسکا
اٹلی سے بھی اس مرکز کو قائم کرنے میں بڑا تعاون ملا۔

پروفیسر عبدالسلام صاحب انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل
فزکس [International Centre for Theoreti-
cal Physics (I.C.T.P.)] کے فاؤنڈر ڈائرکٹر،
۱۹۶۴ء سے ہیں۔ اٹلی میں یہ بین الاقوامی ادارہ انہیں کے
زیر نگرانی قائم ہوا۔ اس ادارے کو قائم کرنے کی پیش کش
کے پیچھے ان کا مقصد یہی تھا کہ تیسری دنیا کے سائنس داں
یہاں آکر سائنس کے میدان میں ذہنی آسودگی حاصل کر سکیں
اپنی تشنگی کو بجھا سکیں اور تھیوریٹیکل فزکس (Theoretical
Physics) کی دنیا میں جو بھی تازہ ترین معلومات ہیں
انھیں حاصل کر سکیں۔

پروفیسر عبدالسلام کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ
تیسری دنیا کے سائنس داں اپنے ملک کو چھوڑ کر مغربی
ممالک میں جا بسیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تیسری دنیا جو کہ بھوک
غربت اور افلاس کا شکار رہی ہے، وہ آگے بڑھے۔ وہ جانتے
ہیں کہ تیسری دنیا میں سائنس کی جتنی ترقی ہوگی اس کے نتیجے میں
ٹکنالوجی بھی اتنی ہی آگے بڑھے گی۔ اس طرح وہ اپنے مسائل
کو بہت حد تک حل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ان کی یہ پرخلوص
تمنا اور کوشش ہے کہ تیسری دنیا جو کہ طویل مدت سے نوآبادیاتی
نظام (Colonialism) کا شکار رہی ہے وہ
سائنس اور ٹکنالوجی کی دنیا میں خودکفیل ہو سکے۔ انٹرنیشنل
سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس کو قائم کرنے میں ان کا بنیادی مقصد
یہی تھا۔

انٹرنیشنل سینٹر فار تھیوریٹیکل فزکس میں ہر سال تقریباً
پوری دنیا کے پانچ سو مشہور و معروف ماہر طبیعیات جمع ہوتے
ہیں۔ یہاں پہنچ کر ان کا رابطہ دنیا کے عظیم ماہر طبیعیات کے
ساتھ ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ لوگ تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ پرچے
یا مضامین پڑھتے ہیں، سیمیناروں میں حصہ لیتے ہیں اور تھیوریٹیکل
فزکس کے میدان میں جو بھی تازہ ترین جانکاری ہے اسے حاصل

کرتے ہیں۔ تریستے (اٹلی) میں تیسری دنیا کے ماہرین فزکس کے لیے
مل بیٹھنے کا یہ موقع بڑا ہی اہم ہے۔
I.C.T.P. میں ایسی سوایٹ کا اصول بھی کارفرما ہے۔
اس ادارے کے ایسی سوایٹ کا یہ حق ہے کہ وہ پانچ سال میں
تین ماہ کے لیے اس مرکز میں آکر تجربات حاصل کریں۔
I.C.T.P کی خدمات بہت عظیم ہیں۔ اس ادارے
نے ۱۹۸۴ء میں ۲۰۸۲ اور ۱۹۸۵ء میں ۲۷۲۰ ماہر طبیعیات
کا استقبال کیا۔ ٹریننگ فار ریسرچ کورس۔ (Training for Research Course) کی تعداد جو کہ ۱۹۸۴ء
میں ۲۳ تھی، ۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ۳۰ ہو گئی۔ اس ادارے
نے ۱۹۸۵ء میں پانچ لاکھ ڈالر کی کتابیں اور پندرہ لاکھ ڈالر
کے سامان ترقی پذیر ممالک میں تقسیم کیے۔

اگر ہم یورپ کی ترقی پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں پتہ چلے
گا کہ وہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی جو ترقی ہوئی اس کے لیے انگلینڈ
کے نیوٹن، جرمنی کے کیپلر، پولینڈ کے کوپرنیکس اور اٹلی کے
گیلیلیو بہت حد تک ذمہ دار ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام کی بھی
خواہش ہے کہ تیسری دنیا میں بھی عظیم سائنس دان پیدا ہوں
یہاں سائنس اور ٹکنالوجی کی بھرپور ترقی ہو، یہاں کی غربت،
جہالت اور افلاس دور ہو اور کرۂ ارض کے اس حصے میں
رہنے والے لوگ اپنا مستقبل صحیح ڈھنگ سے اپنے ہاتھوں
سے خود سنوار سکیں۔

پروفیسر عبدالسلام کی ابتدائی زندگی، ان کا کیریئر، کیمبرج
میں ان کی تعلیم، ان کا پی ایچ ڈی کا ایوارڈ، امپیریل کالج لندن
میں ان کے ذریعے ۳۱ سال کی عمر میں نظریاتی طبیعیات کے شعبے کا
قایم کیا جانا، پھر ۱۹۶۴ء میں آئی سی ٹی پی کا قایم کیا جانا اور
اس کا ڈائرکٹر ہو جانا، ۳۳ سال کی عمر میں لندن کی رائل سوسائٹی
کا فیلو ہو جانا، ۱۹۷۱ء میں USSR Academy -
FOREIGN-K of Sciences (Moscow)
ہو جانا، MEMBER ۱۹۷۹ء میں واشنگٹن میں
واقع نیشنل اکادمی آف سائنس کا فارن ایسوسی ایٹ
ہو جانا اور پھر ۱۹۷۹ء میں فزکس میں نوبل پرائز حاصل
کرنا، بلاشبہ ان کے عبقری اور انتہائی صاحب عزم ہونے
کا ثبوت ہے۔

میں چاہوں گا کہ ہمارے بچے اور بچیاں، ہمارے اسکول
کالج اور یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے اساتذہ پروفیسر
عبدالسلام کی زندگی سے صحیح اور پُرخلوص INSPIR-
ATION حاصل کریں۔ وہ زندگی کے جس شعبے سے بھی
وابستہ ہوں، وہیں افضلیت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ افضلیت
اپنی انا (EGO) کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ خدا کے بندوں کی پُرخلوص
خدمت کے لیے۔ میرے خیال میں پروفیسر عبدالسلام سے محبت
کا بہترین اظہار یہی ہوگا۔

"ان اوراق کے پس پردہ یہ آرزو ہے کہ اس فاصلے
کو مٹایا جائے جس سے ہندوستانیوں کو پاکستانیوں
اور بنگلہ دیشیوں سے دور کر دیا ہے اور اعتماد و یقین
کو بھی مٹایا جائے جو بھارت کے ہندوؤں اور یہاں
کے مسلمانوں کے درمیان حائل ہیں۔"

راج موہن گاندھی

آبادی

عبدالستار انصاری*

آزادی کے بعد ملک کی ترقی کے لیے بڑھتی ہوئی آبادی ایک زبردست چیلنج ہے۔ اس کے روز افزوں اضافے پر قابو پائے بغیر ملک کی اقتصادی اور معاشی حالات سنبھالنے کا تصور ایک خیال خام ہے۔

دنیا کی کل آبادی قریب پانچ ارب ہے جس میں ہمارا ملک ہر سال ۱۳ لاکھ افراد کا اضافہ کر رہا ہے۔ ہماری آبادی جو ۱۹۸۱ء میں ساڑھے اڑسٹھ کروڑ تھی، اس کے اس صدی کے اختتام تک ایک ارب چھپتر لاکھ ہو جانے کی توقع ہے۔ یہ اضافہ آسٹریلیا، تائیوان اور سری لنکا کی مجموعی آبادی کے برابر ہے۔ اس طرح دنیا کا ہر ساتواں آدمی ہندوستانی ہے۔

ہمارے ملک کا مجموعی رقبہ دنیا کے رقبے کا ۲.۴ فیصد ہے لیکن اس کی آبادی کا تناسب دنیا کی آبادی کا ۱۵ فیصد ہے۔ اس کے برعکس روس کا مجموعی رقبہ دنیا کے رقبے کا ۱۶.۵ فی صد ہے مگر اس کی آبادی کا تناسب کا محض ۶ فیصد ہے۔ اس ملک میں آبادی فی کلومیٹر ۱۲ ہے جب کہ ہندوستان کے بعض صوبوں جیسے مغربی بنگال میں یہ تناسب ۶۵۴ اور ۶۱۴ فی کلومیٹر ہے۔

یہ بات اگرچہ بڑے اطمینان کی ہے کہ پچھلے چند سالوں شرح پیدائش میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہ ۴۱ فی صد تھی جو ۱۹۸۱ء میں گھٹ کر ۳۶ فی صد رہ گئی۔ یہ ہماری حفظان صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں کی کامیابی کی نشان دہی کرتی ہے۔ وبائی امراض پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا ہے اور عوام میں حفظان صحت کے اصول اپنانے کا رجحان بڑھنے لگا ہے۔

اوسط عمر جو ۱۹۲۱ء میں محض ۲۵ سال تھی وہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان ۲۷ سال اور ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان ۳۲ سال اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء کے درمیان ۴۵ سال ہو گئی ہے۔

بچوں کی شرح اموات میں بھی خاصی کمی آئی ہے۔ یہ ۱۹۷۰ء میں ۱۳۵ فی ہزار سے گھٹ کر ۱۹۸۱ء میں ۱۱۵ فی ہزار رہ گئی ہے۔ پھر بھی ہمارے ملک میں پیدائش اور اموات کی شرح سب سے زیادہ ہے اور عمر کا اوسط بھی سب سے کم پایا جاتا ہے مگر اس کے برعکس فی مربع زمین میں آبادی کا اوسط سب سے زائد ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی نے جو اقتصادی، معاشرتی، معاشی اور دیگر مسایل پیدا کر دیے ہیں اگر ان کا مختصر سا بھی جائزہ لیا جائے تو کئی کتابیں مرتب ہو جائیں گی اور پھر بھی اس کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔

---

* سابق او۔ ایس۔ ڈی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

زرعی آراضی ہی کو لے لیجیے، روزافزوں آبادی کی ترقی کے
ساتھ ساتھ اس کے رقبے میں کمی آتی جا رہی ہے۔ روزانہ سیکڑوں
مل اور کارخانے قایم ہونے، تعلیمی اداروں کے بننے، دفاتر اور
اسٹور کھلنے، سڑکوں اور رہایشی مکانات کی تعمیر اور دفاعی تعمیرات
کے اضافے سے مزروعہ اور قابل کاشت زمین کا رقبہ بہت بری طرح
متاثر ہو رہا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ خوردنی اجناس اور مویشیوں
کے چارے اور دیگر زمینی پیداوار کی قلت بڑھتی جا رہی ہے جس
کو غیر ممالک سے منگانا پڑتا ہے اور اس میں کثیر زرمبادلہ صرف
ہوتا ہے۔ اس کا ایک نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ جنگلات کٹ جانے سے
ماحولیات کا قدرتی نظام درہم برہم ہوتا جا رہا ہے، جس کے باعث
ایک طرف بارش کی کمی واقع ہو رہی ہے اور دوسری طرف سیلابوں
کی یورش بڑھ رہی ہے۔ جن پر قابو پانے کے لیے کثیر رقم صرف کرنا پڑتی
ہے۔ جان و مال کا نقصان برابر ہوتا ہے جس کی تلافی ممکن
نہیں۔

اس اضافۂ آبادی نے بیروزگاری کے مسئلے کو اور پیچیدہ
کر دیا ہے۔ روزگار کے مواقع آبادی کے اضافے کے تناسب سے
نہیں بڑھ پاتے ہیں۔ بیروزگاری اور بیکاری کے باعث جرایم
میں بھی روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ دیہات کے لوگ روزگار
کی تلاش میں شہروں کی طرف بھاگ رہے ہیں اور اچھے روزگار
نہ ملنے کی صورت میں وہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے چوری، ڈکیتی،
راہ زنی یہاں تک کہ قتل و غارت گری سے بھی گریز نہیں کرتے
جس سے امن عامہ پر اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بیروزگاری
سے قماربازی، نشیلی اشیاؤں کی فروخت کو بھی فروغ
ملتا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی نے رہایشی مکانوں کا مسئلہ بھی پیدا
کر دیا ہے۔ مکانوں کی قلت کے باعث جھگی جھونپڑیوں میں رہنے
والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جس سے شہروں
کی فضا مسموم اور گندی ہوتی ہے۔ فٹ پاتھ پر رہنے والوں
کی وجہ سے رسل و رسایل اور مختلف گاڑیوں کے چلنے میں
بھی رکاوٹ ہوتی ہے۔ حادثات کے امکانات اور واقعات
بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ہسپتالوں، شفاخانوں اور دیگر طبی اداروں کی
کمی کے باعث بیماریاں بڑھ رہی ہیں، جس سے شرح اموات
میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی
ہے، اس تناسب سے اسپتال قایم نہیں ہو پا رہے ہیں۔ اب
تو پینے کے پانی کی قلت بھی ہوتی جا رہی ہے اور بلدیاتی اداروں
رہایشی مقامات تک بھی صاف پینے کا پانی پہنچانے میں دشواری آ رہی
ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے
لیے سرکاری اور غیر سرکاری درس گاہیں بڑی تعداد میں کھلتی جا رہی
ہیں، پھر بھی ہزاروں بچے بنا اسکول کے تعلیم سے رہ جاتے ہیں۔
اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بڑی تعداد میں "تعلیمی دکانیں" کھل
رہی ہیں، جن کا الحاق ہی کسی سرکاری یا غیر سرکاری تعلیمی تنظیم سے
ہوتا ہے اور نہ جن کا نظم و نسق ہی کسی منظور شدہ تعلیمی تنظیم یا
سرکاری محکموں کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی دکانوں میں فیس کافی
لی جاتی ہے، مگر نہ تو بچوں کے بیٹھنے کا معقول انتظام ہوتا ہے
اور نہ ہی اچھے اساتذہ کا جو بہت کم شرح تنخواہ پر ملازم رکھ
لیے جاتے ہیں۔ ایسی تعلیمی دکانوں کے تعلیم یافتہ بچے کسی اچھی صلاحیت
کے مالک نہیں ہوتے اور ان کا تعلیمی معیار بہت پست ہوتا
ہے۔

بچوں کو درس گاہوں تک پہنچانے، کلرکوں اور افسران
کو دفاتر لے جانے، مزدوروں کو کارخانے، مسافروں
کو اسٹیشن، گاہکوں کو دکانوں تک، تفریح کے لیے لوگوں کو
سینماؤں اور دیگر تفریح گاہوں، کھلاڑیوں کو میدانِ کھیل
تک لانے لے جانے کے لیے بسیں، اسکوٹر، ٹیمپو، سائیکلیں
اور دیگر ذرایع رسل و رسایل استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان
سب کے سہولت اور قاعدہ قانون سے چلنے کے لیے اچھی چوڑی
سڑکوں کا فقدان ہے، جس کے باعث سڑکوں پر آئے دن

حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ سڑکوں پر پیدل چلنے کا تصور کرنا ہی بے سود ہے۔ فٹ پاتھ جہاں کہیں بھی ہیں وہاں لوگ رہتے بستے ہیں اور اپنے دھندے کرتے ہیں۔ خوانچے والے، ٹھیلے والے پھیری لگانے والے سب فٹ پاتھوں ہی پر اڈا جمائے رہتے ہیں بلدیاتی ادارے اگر چاہیں بھی تو انہیں ہٹا نہیں سکتے۔ کیوں کہ ان کو کسی دوسری جگہ آباد کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہوجاتا ہے۔

آبادی کے اضافے کو روکنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کے جو پروگرام اب تک چلائے گئے ہیں، ان سے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوسکی۔ جس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

۱۔ ان اسکیموں میں دیہی علاقوں کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔ اگرچہ آبادی میں اضافہ دیہی علاقوں میں زیادہ ہورہا ہے، شہروں میں تو پڑھے لکھے لوگوں نے خاندان کو محدود رکھنے کے پروگرام پر عمل شروع کردیا ہے۔

۲۔ ان اسکیموں میں مذہبی رہنما اور سماجی کارکنوں کا تعاون نہیں لیا جارہا ہے۔ اس قسم کے پروگرام جو مذہبی عقاید سے بہت تعلق رکھتے ہیں، بغیر مذہبی رہنماؤں اور سماجی کارکنوں کے کامیاب نہیں ہوسکتے۔ عوام پر ابھی تک مذہب اور اس کے رسومات کا کافی اثر ہے۔ حکومت وقت چاہے کتنا ہی پروپیگنڈہ کرے اور اس پر کتنی بھی کثیر رقم خرچ کرے مگر سرکاری مشنری ان اسکیموں کو کامیاب نہیں بنا سکتی۔ ضرورت یہ ہے کہ پہلے تو مذہبی رہنماؤں اور سماجی کارکنوں کو خود بھی اس اسکیم کی افادیت سے روشناس کرایا جائے اور پھر ان سے تعاون حاصل کیا جائے۔

۳۔ جو اسکیم اس پروگرام کو چلانے کے لیے سرکاری حکام واہل کاران کو انعام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرنے کی ہے، اس کو یکسر بند کردیا جائے۔ اس لیے کہ اس کا اثر عوام پر بُرا پڑرہا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ معلوم نہیں کیوں یہ اسکیم سرکاری مشنری کے ذریعے ان پر تھوپی جارہی ہے۔ یہ ان کے مفاد کی نہیں بلکہ سرکاری مفاد کی اسکیم ہے۔ اسی لیے تو سرکاری حکام واہل کاران کی ہمت افزائی کی جارہی ہے۔

۴۔ سرکاری حکام اور اہل کاران کبھی کبھی بلکہ بیشتر اپنے نشانات کو پورا کرنے کے لیے غلط طریقے بھی استعمال کرتے ہیں اور زور زبردستی سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ طریقہ کار اسکیم کو ناکامیاب بنانے کا ایک بڑا سبب ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانے کے لیے چند تجاویز پیش ہیں جن پر غور وخوض کے بعد عمل درآمد سے اچھے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

۱۔ لڑکے اور لڑکی کی شادی کی عمر میں ۲۱ سال اور ۱۸ سال مقرر کی گئی ہیں، ان کو بڑھا کر ۲۵ اور ۲۱ سال کردیا جائے اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ کم عمر کی شادی پر سخت سزائیں دی جائیں۔ اس کو دست اندازی پولس جرم قرار دیا جائے۔ جو افراد قانون شکنی کی اطلاعیں دیں ان کو انعامات دے جائیں۔

۲۔ مذہبی رہنماؤں، سماجی کارکنوں کے ساتھ ساتھ مستورات کی انجمنوں اور نوجوانوں کی تنظیمات کا بھی تعاون حاصل کیا جائے۔ یہ دونوں ادارے بہت بڑی حد تک اس اسکیم کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔

۳۔ زائد بچے پیدا کرنے والے والدین کو بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری مراعات سے محروم

کر دیا جائے۔ ان کو سرکاری ملازمت اور بینکوں سے مالی امداد کا مستحق نہ سمجھا جائے۔ جو لوگ ان اسکیموں پر عمل کریں ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ ان کے بچوں کو تعلیمی اداروں میں داخلے کی مراعات دی جائیں۔ ان کی فیسیں معاف کی جائیں ان کا علاج مفت کرایا جائے۔ ایسے والدین کو ملازمت حاصل کرنے اور ترقی پانے میں ترجیح دی جائے۔ ان کو روزگار چلانے کے لیے بینکوں سے قرض دلائے جائیں۔

۴۔ تعلیم کا فقدان بھی بڑی حد تک خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں کی ناکامیابی کا باعث ہے۔ ابھی دیہی علاقوں میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم تو قریب قریب نہ ہونے کے برابر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان علاقوں میں کافی تعداد میں تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں اور ہائی اسکول تک تعلیم مفت ہو۔

خاندانی منصوبہ بندی بحیثیت ایک ضروری مضمون کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے بڑے نتائج سے ان کو واقفیت بہم پہنچائی جائے تاکہ وہ بڑے ہو کر صحیح عمروں میں شادی کر سکیں اور کم بچے پیدا کریں۔

۵۔ طبی سہولیات کا ہونا بھی بہت ضروری ہے جو اس اسکیم کے لیے ہونا چاہئیں۔ اسپتالوں اور بنیادی حفظانِ صحت کے مراکز سے لوگوں کو صحیح راہنمائی مل سکے، ادویات مہیا ہو سکیں جس سے افزائش اولاد پر قابو پایا جا سکے جو لوگ آپریشن کا طریقہ اپنائیں، ان کا خاص طور سے خیال رکھا جائے تاکہ آپریشن کے بعد ان کو کوئی تکالیف نہ ہوں۔ ان کی طرف عدم توجہی سے بھی یہ اسکیم ناکامیاب ہو رہی ہے۔

محض قانون بنانے اور سرکاری مشنری کے ذریعے سے اس اسکیم کو نافذ کرانے سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، جیسا کہ اب تک ہوا ہے کہ کاغذوں پر آبادی کم ہو رہی ہے اور حقیقتاً بڑھ رہی ہے۔ جب تک عوام کے ہر طبقے کا تعاون حاصل نہیں کیا جائے گا، خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیموں کی کامیابی ممکن نہیں ہو سکے گی۔ عوام کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اس کو اپنے مفاد میں سمجھیں اور محض سرکاری کام نہ سمجھیں اور اس پر ایمانداری سے عمل کریں۔

"بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آگئی ہیں۔ پس جس قدر ان دونوں قوموں (مسلمانوں اور ہندوؤں) میں زیادہ تر محبت، زیادہ تر اخلاص، زیادہ تر ایک دوسرے کی امداد بڑھتی جاوے اور ایک دوسرے کو مثل بھائی کے سمجھیں، کیونکہ ہم وطنی بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں، اسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے۔"

سرسید

تجدید علاج بالعلق

ابو وارث جمیل*

کائنات عالم کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے باعتبار شکل حیوانات، نباتات اور جمادات و باعتبار کیفیات جامد سیال اور ہوائی مادوں کو مخلوق انسانی کی خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہاں پر موضوع بحث حیوانیات عالم کا ایک بہت ہی ادنیٰ سا جاندار علق یا جونک (LEECH) ہے جو کہ اپنی طبی افادیت و مقبولیت کی بنا پر ۲۱ ویں صدی میں داخل ہو چلا ہے غرضیکہ آج بھی انسانوں کے لیے موضوع تحقیق و جستجو بنا ہوا ہے۔ لہٰذا علق کی قدیم طبی افادیت کے پیش نظر جدید نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

علق کی ۳۰۰ سے زائد قسمیں پائی جاتی ہیں جو کہ ہیروڈینیریا (HIRUDINARIA) گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس کی خاص علامت یہ ہے کہ ان کے مقدم اور موخر جانب اعضائے جاذبہ (SUCKERS) ہوتے ہیں اور ان کا پورا جسم ۳۴ قطعات میں منقسم ہوتا ہے۔ یہ بحری، بری اور دریائی ہوتی ہیں اور خارجی طفیلی (ECTO PARASITE) ہونے کے سبب انسانوں، چوپایوں اور دیگر جانداروں کے خون سے تغذیہ حاصل کرتے ہیں یا پھر شکار خور ہونے کے سبب کیڑوں، پتنگوں وغیرہ کے لاروا وغیرہ کو کھا کر اپنا تغذیہ حاصل کرتے ہیں

طبی افادیت کے پیش نظر جو علق مستعمل ہے، اسے علم الحیوانیات کی زبان میں ہیروڈینیریا میڈیسینلس (HIRUDINARIA - MEDICINALIS) کہتے ہیں جس کا جائے وقوع دلدلی، پانی سے لبریز یا کیچ آلود گڑھے وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ پانچ سے دس انچ تک لمبی ہوتی ہے۔ ان کا منہ سہ شعاعی (TRIRADIATE) ہوتا ہے۔ ان کے جبڑوں پر چھوٹے چھوٹے دانت (DENTICLES) لگے ہوتے ہیں جو کہ شکار کے جسم پر سہ شعاعی سوراخ بنا دیتے ہیں۔ جس سے کہ خون بہنا جاری ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے لعاب (SALIVA) میں مانع انجماد الدم اجزاء علقین (HIRUDIN) ہوتا ہے جو کہ مجروح مقام سے خون کو جمنے نہیں دیتا جس کے نتیجے میں خون کا نکلنا جاری رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا لعاب دافع تعفن اور مخدر مقامی (LOCAL ANAESTHETIC) کا بھی کام کرتا ہے کیونکہ علق کے چپکنے پر جلد میں سوراخ کرنے کا جاندار کو احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ زخم متعفن ہوتا ہے۔

دور قدیم سے انسان ان کی طبی افادیت سے صرف اس حد ہی واقف تھا کہ کچھ جراح یا غیر سند یافتہ لوگ اسے تنقیہ مواد کی غرض سے عفونی زخم کے گرد یا زہریلے جانوروں کے ڈسے ہوئے مقام پر زہر کو خارج کرنے کی غرض سے استعمال کیا کرتے تھے لیکن جب اس کے اوپر تحقیق و جستجو اور تجربات کیے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسا واحد کرم (WORM) ہے جو طبی اعتبار سے مختلف الخواص

---

* ایم۔ ڈی اسکالر، اجمل خاں طبیہ کالج، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

اوام کا حامل ہے۔ تقریباً ۲۰ ویں صدی عیسوی کے شروع تک علق کو جسم کے ورمی یا مجروح حصہ کا ناقص خون یا مواد کے استفراغ (PUKING) کے لیے کثرت سے استعمال کیا گیا اور جو کہ عرب اطبا اور ہندی ویدوں کا ایک طریقۂ علاج رہا ہے کہ وہ عمل جراحی میں خراج یا ورم کے علاج کے لیے بجائے نشتر کے علق لگا دیا کرتے تھے۔ یہ علاج اتنا آسان اور غیر تکلیف دہ تھا کہ مریض کو اس کے مجروح حصے سے خون کے نکلنے کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی تکلیف ہوتی۔ اس کے لیے علق کو مٹی کے برتن میں رکھا جاتا اور مجروح حصے سے چسپاں کر دیا جاتا۔ تاکہ یہ ناقص خون کو چوس کر اپنا تغذیہ حاصل کر لے اور اس حصہ کو مضر مواد سے پاک کر دے۔ اس طرح ناقص خون یا مواد جو کہ ان کی مرغوب غذا ہے یہ اپنے وزن کے نو گنے سے بھی زائد حاصل کرنے کی استعداد رکھتی ہیں۔ اس طرح معالج جونکوں کو ان کے مقدم جانب سے پکڑ کر الگ کر دیتا ہے اور انگلیوں سے دبا کر آلات ہضم سے سارا مواد باہر نکال دیتا ہے۔ تاکہ یہ عمل دوبارہ اور سہ بارہ دوہرایا جا سکے اور مجروح حصے سے مکمل طور پر ناقص خون کا اخراج ہو جائے۔

علق کا استعمال نہ صرف کسی عضو کی صفائی یا ناقص خون اور مواد سے عضو کو پاک کرنے کے لیے کیا جاتا ہے بلکہ انھیں التہاب مفاصل (ARTHRITIS) جیسے نقرس (GOUT) اور وجع المفاصل (JOINT PAIN) میں ناقص خون کے اخراج کے لیے امراض جلد جیسے گنج (FAVUS) داد (RING WORM) جھائیں (PITYRIASIS) بالخورہ (Alopecia Areata) یا ایسے مریض جن میں فصد اور سنگی ممنوع ہے ان میں یا داء الفیل (ELEPHANTIASIS) خراج (ABCESS) اور ام چشم اور ڈسے ہوئے مقام سے زہر کو خارج کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

جراثیم کش اور دافع تعفن ادویہ کے بڑھتے ہوئے استعمال کے ساتھ ہی ساتھ جونکوں کے ذریعے مقام مرض کی صفائی کا طریقہ متروک سا ہو گیا ہے لیکن دوبارہ اب اس کی طرف تشویش شروع ہو گئی ہے کہ ان پر دوبارہ تحقیق کر کے ان کی افادیت کو سامنے لایا جائے اور ان کے لعاب میں وہ کون کون سے کیمیاوی اجزا موجود ہیں جن کا کہ استعمال ہم دوسرے ذرائع سے کر سکتے ہیں۔ غرضیکہ سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر یہ معلوم ہوا کہ اس کے لعاب کے اندر علقین (HIRUDIN) نام کا کیمیاوی جز موثرہ موجود ہے جو کہ خون کو جمنے نہیں دیتا۔ اب اگر اس جز کو عمل جراحی میں استعمال کریں تو جراحت تقویمی (PLASTIC SURGERY) کی ایک بہت بڑی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھایا جا سکتا ہے۔ پلاسٹک سرجری کے بعد اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب کسی انسجہ (TISSUE) کو پیوند کاری (GRAFTING) کے لیے منتقل (Transplant) کیا جاتا ہے تو اکثر خون کے انجماد کے نتیجہ میں گرافٹ میں دوران خون رک جانے سے عروق دمویہ وجود میں نہیں آتیں جس کے نتیجے میں نخرۃ (NECROSIS) ہو جاتی ہے اور گرافٹ بیکار ہو جاتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ اگر گرافٹ پر علق لگائی جائے تو یہ عروق دمویہ (Blood VESSELS) میں خون کو جمنے نہیں دیں گی اور گرافٹ میں دوران خون جاری رہنے سے عروق دمویہ وجود میں آ جائیں گی اور گرافٹ نکروز ہونے سے محفوظ رہے گا۔ علق لگانے سے یہ گرافٹ کے جمے ہوئے خون کا زائد حصہ ختم کر دیتی ہیں جس سے زخم پر طبعی طور پر عروق دمویہ پیدا ہو جاتی ہیں۔

> • حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ گورنر بصرہ کے نام ایک فرمان میں حضرت عمر رضؓ نے ہدایت دی۔
> "مسلمان مریضوں کی عیادت کیا کرو۔ ان کے جنازوں میں شریک ہوا کرو، ان کے لیے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھو اور ان کے معاملات سے ذاتی دلچسپی لو۔ تم ان ہی میں سے ایک ہو۔ فرق بس اتنا ہے کہ تمھارے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ رکھ دیا گیا ہے"

علق کے لعاب کی آج کے دور میں طبی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے کیونکہ اسے سرطان (CANCER) تخثر (THROMBOSIS) تصلب عصیدی (ATHROSCLEROSIS) وغیرہ میں بھی استعمال کیا جانے لگا ہے۔

لعاب علق کے اندر علقین نام کا جو مانع انجماد الدم جز پایا جاتا ہے وہ ۶۵ امینو پیپٹائیڈ (65 Amino Peptide) پر مشتمل ہے جو اینٹی تھرامبو کائی نیز (Anti Thrombo - kinase) کے طور پر کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے کیمیاوی اجزا بھی پائے جاتے ہیں جو ہایالیو رونیڈیز (Hyalu-ronidase) دو فائبری نیز (Two Fibrinase) اور ایک کولیجی نیز (Collagenase) انزائم پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک فائبری نیز انجماد الدم کو توڑتا ہے اور دوسرا صفحہ تصلب عصیدی (Athrosclerotic Plaques) کے بننے میں مانع ہے۔ ان کا خلاصہ لعاب (Salivary - پھیپھڑوں کی رسولیوں - Lungs extract) Tumours کے بڑھنے میں مانع ہے اور اس طرح سے یہ ٹیومر سیل کو لیجی نیز Tumour Cell - (Colleginase) کو بننے سے روکتی ہے۔

آئندہ بھی یہ امید کی جاتی ہے کہ اگر علق اور ان کے لعاب پر مزید تحقیق جاری رہی تو ان کا مختلف طریقوں سے استعمال نہ صرف پلاسٹک سرجری میں انسجہ کی پیوندکاری کے لیے ہی بلکہ کٹے اور الگ ہوئے اعضاء کو دوبارہ جوڑنے Reattachment of Limbs & Digits اور اس کے علاوہ بھی بہت سے امراض میں انتہائی مفید ثابت ہوگا۔

" اس دین کو مضبوط پکڑ لو جو خدا نے دیا ہے۔ بلاشبہ خدا جس کی حفاظت نہ کرے وہ بچ نہیں سکتا۔ خدا جس کی تصدیق نہ کرے وہ سچی نہیں ہو سکتا۔ وہ جس کو خوش قسمت نہ بنائے وہ بدنصیب ہے۔ جس کو رزق نہ دے محروم ہے اور جس کا دستگیر نہ ہو وہ خوار ہے۔ اس لیے اپنے مالک کی دی ہوئی ہدایت کو مانو اور اس دستورِ زندگی کو اختیار کرو جو تمھارا نبیؐ لایا ہے کیونکہ درحقیقت وہی سیدھی راہ پر ہے جس کی خدا رہنمائی کرے اور جس کو خدا سیدھی راہ سے ہٹا دے اس کو کوئی سیدھی راہ ہرگز نہیں دکھا سکتا "

حضرت ابوبکر صدیق رض

جولائی ۸۹

تہذیب الاخلاق

ماہنامہ

ادارۂ تہذیب الاخلاق ایمڈ لشانٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اغراض و مقاصد

۱۔ جہل، تعصب، توہم پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد۔ ذہنی بیداری، دانشوری اور مرکوز فکر کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔

۲۔ مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت۔

۳۔ ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔

۴۔ ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵۔ ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔

۶۔ سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷۔ علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلئے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر ہونے چاہئیں اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ صرف انہیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

سرپرست : جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : اسرار احمد ——— جوائنٹ ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : شباب الدین

تزئین : سوفران ——— انچارج سرکولیشن : مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ :	زر سالانہ	مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت	انڈیا Rs. 30·00	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔	بیرونی ممالک US $ 20·00 ہوائی ڈاک	ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,	US $ 8·00 عام ڈاک	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY		انڈیا۔

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو]

اداریہ

تہذیب الاخلاق کا یہ شمارہ جس وقت آپ تک پہنچے گا آپ عید قربان کی تیاریوں میں منہمک ہوں گے۔ یہ عید قربان جس 'ذبح عظیم' کی یاد میں منائی جاتی ہے اس کا ذکر کسی نہ کسی عنوان سے تفصیلات کے قدرے اختلاف کے ساتھ، دنیا کے تین بڑے مذہبوں کی مقدس کتابوں میں محفوظ ہے۔ دو مذہبوں کے پیروؤں نے تو اس 'ذبح عظیم' کو اس طرح فراموش کر دیا گویا کہ یہ واقعہ وقوع پذیر ہی نہ ہوا ہو مگر مسلمانوں نے اس کی یاد کو سینے سے لگائے رکھا ہے اور ہر سال ایک مقررہ مہینے اور مقررہ دنوں میں جانوروں کی قربانی کر کے اس واقعے کی یاد تازہ کرتے ہیں، جب ایک باپ نے اللہ کا اشارہ پاکر اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا عمل سرانجام دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو باپ کی یہ اطاعت گزاری اتنی پسند آئی کہ بیٹے کو کوئی گزند نہ پہنچا اور جب باپ نے اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی کو کھولا تو بیٹے کی جگہ پر ایک مینڈھے کو ذبح ہوا دیکھا۔ بیٹا صحیح سلامت رہا، پھر اس کی نسل میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی کہ وہ اپنے وطن اصلی سے نکل کر دنیا کے کئی دوسرے ملکوں میں آباد ہوئی۔ ایک عرصے تک اس 'ذبح عظیم' کو کسی نہ کسی عنوان سے یاد کیا جاتا رہا مگر اس کے اصل خدوخال، معنویت اور اہمیت، طریقہ اور مقصد ہمارے نبی برحق کے ذریعے دنیا کے سامنے واضح و روشن ہوا۔ آپؐ نے خود قربانی کی اور ہر صاحب نصاب مسلمان کو قربانی کا حکم دیا۔ یہ وہ فرض ہے جو دیگر فرائض ہی کی طرح مسلمانوں پر عاید کیا گیا ہے۔ فرائض کی ادائیگی آج ہم کس طرح کرتے ہیں اس کا حال تو سب پر اس طرح روشن ہے کہ اس سلسلے میں خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی لیکن پھر بھی یہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے کہ آج کا مسلمان قربانی کے فریضے سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے؟

ہم سے پہلے کے لوگ جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو فرض سمجھ کر ان سے عہدہ برآ ہوتے تھے اسی طرح سال میں ایک بار مقررہ مہینے اور اس کے مقررہ دنوں میں ذوق و شوق کے ساتھ جانوروں کو رضائے الٰہی اور صرف رضائے الٰہی کے لیے قربان کرتے تھے۔ قربانی تو آج بھی ہوتی ہے، شاید پہلے سے زیادہ بھی ہوتی ہو مگر آج کی قربانی ادائیگی فرض نہیں بلکہ 'علامت رتبہ' (STATUS SYMBOL) بن گئی ہے۔ آج کی قربانی اس لیے نہیں ہوتی کہ یہ ایک فریضہ ہے جس کا ادا کرنا صاحب نصاب مسلمان پر لازم ہے بلکہ اس لیے ہوتی ہے کہ اگر ہم قربانی نہ کریں گے تو لوگ ہماری مالی حالت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس کو آپ ہماری 'بدبینی' نہ سمجھیے، عید قربان کے دنوں میں صرف چند باتوں پر نظر ڈال لیجیے آپ خود ہمارے ہم خیال ہو جائیں گے کہ اس دور کی قربانی مذہبی فریضہ کی ادائیگی نہیں بلکہ علامت رتبہ ہے۔

جب لوگ اپنے اپنے گھروں میں قربانی سے فارغ ہو گئے اور دید و باز دید کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ کو بیشتر جگہوں پر یہ جملہ سننے کو ملے گا "کہو بھائی کتنے کاٹے؟" گویا کہ قربانی نہیں ہوئی جانور "کاٹے" گئے، مسلمانوں میں یوں بھی جانور کاٹے نہیں جاتے بلکہ ذبح کیے جاتے ہیں، چلیے آپ روز کے ذبیحے کو کاٹنا کہہ کر نئی زبان اور نئی اصطلاح ایجاد کر لیجیے

مگر خدارا قربانی کو تو کاٹنے سے موسوم نہ کیجیے۔ اگر قربانی واقعی وحقیقی مذہبی جذبے سے کی جاتی تو کیا وہ "کاٹنا" ہو سکتی تھی ؟

"کاٹنا" کو تو ہم زبان کا پھوہڑپن مان لیں اور کسی کی نیت پر شک وشبہ نہ کریں مگر اس عمل کی تاویل کیا کریں کہ جب ہم عید قربان کے دن قربانی کے گوشت کا ہدیہ لے کر کسی کے یہاں جاتے ہیں تو اگر یہ ہدیہ کسی بڑے جانور کے گوشت کا ہوا تو ہماری پیٹھ پھرتے ہی گھر کے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ حالانکہ عام دنوں میں سائیکل، موپیڈ اور اسکوٹر کا تو ذکر کیا ماروتی کاریں تک بڑے جانوروں کے گوشت کی دکانوں پر کھڑی دکھائی دیتی ہیں مگر عید قربان کے دن یہی گوشت زہر بن جاتا ہے۔ ہم نے مانا کہ آپ بڑے جانور کا گوشت نہیں کھاتے، یہ آپ کی مرضی ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو نرمی سے آپ یہ ہدیہ قبول کرنے سے انکار کر دیں، اگر تعلقات کی وجہ سے لب کشائی کی جرأت نہ ہو تو کسی نادار کو دے دیں اور اگر ہماری دنیا سے نادار مفقود ہو چکے ہوں تو تھوڑی سی زحمت فرما کر زمین میں ایک گڑھا کھود دیں اور تمام نامطلوبہ گوشت اس میں دبا دیں۔ آپ بڑے جانور کا گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں اس کا تو آپ کو پورا پورا حق ہے مگر یاد رکھیے آپ کو قربانی کے گوشت کی تذلیل کا کوئی حق نہیں ہے۔

دنیا جانتی ہے اور اس کا اعتراف کرتی ہے کہ اسلام پاکی، طہارت، لطافت اور نظافت کا مذہب ہے۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتایے کہ کیا یہ کسی مسلمان کو زیب دیتا ہے کہ وہ جہاں قربانی کرے وہاں سے گوشت تو اٹھا کر اپنے گھر لے جائے مگر جانور کے جسم سے نکلی ہوئی تمام نامطلوبہ چیزوں کو کھلے آسمان کے نیچے آوارہ کتوں کے نوچنے اور ادھر ادھر پھیلانے کے لیے چھوڑ جائے۔ کتے بھی کتنا کھائیں گے ؟ ممکن ہے اس انبار کو ختم کرنے کے لیے گدھ آ جائیں، لیکن گندگی تو گدھ بھی پھیلائیں گے اور اگر بارش ہو گئی تو سارے "پینے" غبارے کی طرح پانی پہ بہتے اور سڑتے رہیں گے۔ یہ کوئی خیالی یا افسانوی بات نہیں ہے، ابھی دو سال قبل سرسید نگر میں ہم نے اپنی آنکھوں سے ان "غباروں" کو فضا میں تعفن پھیلاتے دیکھا ہے۔ حقیقی مسلمان تو ادائگی فرض کے لیے جب بھی قربانی کرتا ہے، وہ جانور کے جسم کے نامطلوب حصے کو زمین میں گڑھا کھود کر دبا دیتا ہے تاکہ اس کے اردگرد کا ماحول صاف ستھرا رہے اور اس کی بستی میں کسی قسم کی گندگی اور تعفن کا دور دورہ نہ ہونے پائے۔ ان معروضات کے بعد کچھ دیر کے لیے سوچیے کہ ہماری قربانی کیا واقعی وحقیقی قربانی ہے یا علامتِ رتبہ ؟

کبیر احمد عباسی

نیک آدمی

مولوی محمد ذکاء اللہ مرحوم

نیک آدمی نیکی کو عزیز رکھتے ہیں، بدی سے پرہیز کرتے ہیں۔ اپنے بزرگانِ دین کی تعلیم کرتے ہیں۔ پاک علم کی تحصیل کرتے ہیں۔ اپنے ہمسایے کو پیار کرتے ہیں۔ ان کی خوبیوں کی قدر کرتے ہیں۔ اپنی خواہش ہائے نفسانی کو مارتے ہیں۔ خدا پر توکل کرتے ہیں۔ ادبار میں صبر و استقلال کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ اقبال میں آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ میدان جنگ کو شجاعت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ مجلس مشورہ میں تقریریں دلکش فصاحت سے کرتے ہیں۔ نیک نامی کا شوق دل سے رکھتے ہیں۔ پُن دان کرتے ہیں۔ وہ سنکلپ (قوتِ ارادی) کرتے ہیں جو رشی منی بھی نہیں کرتے۔ بے گھروں کے لیے گھر بناتے ہیں، رونے والوں کے ساتھ روتے ہیں۔ اپنی نیکیاں چھپاتے ہیں اور غیروں کی بھلائیوں کا اعلان کرتے ہیں۔ امیری میں مسکینی و غریبی اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا زیور سخاوت ہے، ان کے سر کا تاج ادب ہے۔ ان کے کان کا بالا کتب مقدس کا سننا ہے، ان کے بازوؤں کا جوش شجاعت ہے منہ کا خزانہ نیکی ہے۔ غرض سرتا پا وہ اپنی مفلسی کی حالت میں بھی ان زیوروں سے آراستہ پیراستہ ہیں۔

سچے بہادروں کا دل بزم میں کمل (کنول) کے پھولوں سے زیادہ نرم مگر میدان جنگ میں سنگ و آہن سے زیادہ سخت۔ نیک آدمی کی صحبت کا حال پانی کا سا ہوتا ہے کہ اگر اس کی بوند جلتے توے پر پڑی تو بخار بن کر اڑ گئی۔ کنول کے پتوں پر پڑی تو ہیرے کے ٹکڑوں کی طرح چمکنے لگی اور سمندر میں سیپ کے منہ میں گئی تو موتی بن گئی۔ غرض وہ اپنی صحبت کے رنگ اہل صحبت کی استعداد اور قابلیت کے موافق دکھاتے ہیں۔ دہقان گنواروں کے دلوں کو پاک صاف کرتے ہیں۔ جو لوگ شرافت کے ساتھ بلند مرتبہ ہوتے ہیں، اپنے بھلے اور جواں مردی کے کاموں کو اوروں کے ساتھ منسوب کر کے ان کی تعریف کرتے ہیں اور ساوروں کی لعنت ملامت کو صبر سے سنتے ہیں اور اس کے بدلے میں بُرا نہیں کہتے۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہیں ہوتے۔ غیروں کے ساتھ بھلائی کرنے کو اپنے ساتھ بھلائی کرنے سے زیادہ اچھا جانتے ہیں۔ جو ایسے نیک ہیں، دنیا ان کی عزت کرتی ہے۔ جو بادل زیادہ برستے ہیں وہ بہت نیچے آتے ہیں، جو درخت بہت پھل دیتے ہیں وہ نیچے جھکتے ہیں: مصرع

نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں

ایسے ہی ثروت و تونگری کے ساتھ نیک آدمیوں کی تواضع بڑھتی جاتی ہے۔ جتنے وہ دولت و امارت میں بڑھتے ہیں، اتنے ہی وہ جھکتے ہیں۔ جیسے پسے ہوئے صندل و بالچھڑ کی اور چھپے ہوئے پھولوں کی خوشبو پھیلتی ہے، ایسی ہی ان کی خوش اخلاقی کی شمیم دلوں کو معطر کرتی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو خوش کرتے ہیں، ان کے دشمنوں کو پامال۔ ان کے بھیدوں کو چھپاتے ہیں، ان کی تعریف کی باتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصیبت کے وقت میں ان کے کام آتے ہیں، ان کی ضرورتیں رفع کرتے ہیں۔ جیسے بن مانگے کنول کو سورج سوچیت کرتا ہے، چاند

نئے پیارے پھولوں کو رونق دیتا ہے، بادل مینہ برساتا ہے، ایسے ہی بن مانگے نیک آدمی بخشش و انعام کرتے ہیں اوروں کے فائدوں کے لیے اپنے فائدے کو چھوڑتے ہیں۔

بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے فائدے کے ساتھ اوروں کے فائدوں کو بھی مدّنظر رکھتے ہیں مگر بعض شریر النفس ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اپنے نفع کے لیے اوروں کا نقصان کرتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ کم بخت وہ لوگ ہیں جو بطیرا اپنے فائدے کے اپنے ہمسائے کے فائدوں کو روکتے ہیں۔ جیسے دودھ پانی کے ساتھ مل کر اپنی صفات کو دور کرتا ہے اور اس کے ساتھ جلتی بھٹی پر چڑھتا ہے اور اپنے تئیں بخار کی صورت میں اس کے ہمراہ اُڑتا ہے۔ پس ایسے ہی سچے نیک دوست کا حال ہوتا ہے کہ وہ کسی حال میں اپنے دوست سے جدا نہیں ہوتا۔ نہ وہ حسد کرتا ہے۔ دوست کے واسطے آتشیں داغ دل پر اُٹھاتا ہے مگر اس سے منہ نہیں پھیرتا۔ پس اے لوگو! تم نیک بننا چاہو تو اپنی خواہشہای نفسانی کو مارو، گھمنڈ کو چھوڑو، اوروں کی لعنت و ملامت کو سہو، برخود غلط ہونے سے خوش نہ ہو، سچ بولو، سیدھے راستے پر چلو، اوروں کی لیاقت کی قدر و منزلت کرو، دشمنوں سے محبت کرو، اپنے نیک کاموں کو چھپاؤ، غریب ضعیفوں کو خوش کرو، نیک نامی کے لیے جب تک جیو کوشش کرو۔ اگر یہ سب کام کرو تو تمہارے انسان کامل اور ولی ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔

مگر افسوس ہے کہ بہت تھوڑے آدمی ہوتے ہیں جن کے جسم عیوب سے خالی ہوں اور وہ اپنے فائدوں سے دنیا کو فائدے پہنچاتے ہوں۔ اوروں کی نیکیوں کے بیان کرنے میں ایسے ممسک (بخیل) نہ ہوں کہ پہاڑیوں پر ذروں کے بڑھانے میں دریغ نہ کرتے ہوں اور جن کے نفس علفی چمن بن رہے ہوں، اور ان کے اندر عاقبت بخیر کے پھول کھل رہے ہوں۔

نیک آدمی گو تھوڑے سے ہوتے ہیں مگر اُن میں یہ کرامت ہوتی ہے کہ اپنی مہربانی سے وہ برے دلوں کو بھلا، احمقوں کو عقل مند، دشمنوں کو دوست، زہر کو امرت بنا دیتے ہیں۔ وہ دور دور کے طلسمات کو پاس لاکر توڑ دیتے ہیں۔ وہ ایسے پیش بیں ہوتے ہیں کہ کام سے پہلے نتیجے کو سمجھ جاتے ہیں۔ وہ ناعاقبت اندیشی سے کام نہیں کرتے کہ ناکامی کے تیر اُن کے دل کو چھیدیں۔ وہ زمرد کے برتنوں میں چربی کو نہیں تلتے۔ وہ شمع کافوری کو لکڑی کی جگہ نہیں جلاتے۔ وہ سونے کے ہل چلا کے کودوں (باجرہ کی قسم کا ایک اناج) نہیں بوتے۔ ان کی عقل تو ایسی ہوتی ہے کہ زندگی آرمیدگی سے بسر کرتے ہیں۔ وہ بہادر ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے سینے پر دشمن کے غصّے کے تیروں کو نہیں لگنے دیتے۔ ان کو خواہشہای نفسانی ممکن نہیں کہ راہ مستقیم سے کسی دوسری طرف لے جائیں۔

وہ مردانہ وار میدان میں تینوں لوگ سے لڑنے کو موجود ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حسن خلق سے ایک عالم کو فریفتہ کر لیتے ہیں۔ دنیا میں گزند رساں چیزوں کو بے دست و پا کر دیتے ہیں۔ شعلوں کو پہاڑوں کی طرح سرد بنا دیتے ہیں۔ سمندروں کو گرمی کی جھیل، شیر کو ہرن میرو پہاڑ کو نیچی چوٹی، سانپ کو پھولوں کا ہار، زہر کے پیالے کو آب حیات بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنی عزت کو مال سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں کہ ادبار کے دنوں میں بھی اس کو نہیں چھوڑتے۔ بے عزت ہونے سے مرنے کو اچھا جانتے ہیں۔ وہ اُن سے عطا و بخشش کی خواہش نہیں کرتے جن میں بہت رنج و محنت اُٹھانی پڑے۔ وہ کچھ لوگوں کی حقارت سے اپنے ارادوں کے استقلال میں خلل نہیں ڈالتے۔ وہ اپنے انضباطِ نفس کو کسی حال میں نہیں چھوڑتے۔ ناحق ان سے جل کر اُن کی حقارت کے درپے ہونا ایسا ہے جیسے جلتی آگ

کو روندنا جس میں شعلے اٹھ رہے ہوں۔ وہ احمق یہ نہیں
سمجھتے ہیں کہ کہیں بہادر بھی مصیبت سے خوف کھاتے ہیں؟
کیا زمین کے زلزلوں سے پہاڑ اور سمندر اپنی جگہ سے ٹل
جاتے ہیں؟ وہ پہاڑ کی چوٹی سے گر کر پاش پاش ہو جائیں
گے، جلتے گڑھے میں گر پڑیں گے، سانپ سے کٹوائیں
گے مگر وہ نیکی کی راہِ مستقیم کو نہیں چھوڑیں گے، جس سے
بھٹک کر پھر اُس کو وہ نہیں پا سکتے۔

نیک آدمی سخت گیند کی طرح زمین پر گر
کر پھر اچھلتے ہیں اور بلندی پر چڑھتے ہیں، مگر بد آدمی
مٹی کی گیند کی طرح پچس دیئی رہ جاتے ہیں؛ پھر ان کو بلندی
کی طرف رخ کرنا نصیب نہیں ہوتا۔

یہ چھوٹے آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ
دوسرے آدمی کو پوچھتے ہیں کہ اس کی ذات کیا ہے؟
وہ کس خاندان کا ہے؟ جو اعلیٰ درجے کے آدمی
ہیں وہ سب انسانوں کو اپنا بھائی جانتے ہیں اور کچھ
نہیں پوچھتے کہ کون
ہے۔

"ایک دفعہ ایک مرغزار میں جہاں ایک بھیڑ اور
اس کا بچہ چر رہے تھے، ایک عقاب بچے پر بھوکی نظریں جمائے
فضا میں منڈلا رہا تھا اور جب وہ اپنے شکار پر جھپٹنے
اور اسے پکڑنے لگا تو ایک دوسرا عقاب نمودار ہوا
اور اس نے بھی بھیڑ اور اس کے بچے پر حریصانہ نگاہیں
ڈالیں۔

اب دونوں حریف آپس میں لڑنے لگے اور انھوں
نے اپنی خوفناک چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

بھیڑ نے آسمان کی طرف دیکھا، بہت حیران ہوئی اور
مڑ کر بچے سے کہا۔

میرے بچے کتنی عجیب بات ہے کہ یہ دو نجیب پرندے
ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ کیا ان دونوں کے
لیے یہ آسمان کی وسعت کم ہے۔ میرے ننھے بچے ——
میرے پیارے بچے دعا کر —— ہاں خلوص دل سے
دعا کر کہ خدا تیرے پردار بھائیوں میں صلح و آشتی کا جذبہ
پیدا کرے

اور بچے نے اپنے دل میں دعا کی۔"

خلیل جبران

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸، شمارہ ۷، (جولائی ۹۸ء)

ہمارے ادب کا ایک بڑا نقصان

سید حامد*

(پہلا حصہ)

جس طرح ہر زبان کا ایک ادب ہوتا ہے، اُسی طرح ہر ملک کا ایک ادب ہوتا ہے۔ خواہ اس ملک میں عرب، مصر، جاپان، فرانس اور انگلستان کی طرح صرف ایک زبان ہو، خواہ ہندوستان، پاکستان، روس اور چین کی طرح بہت سی زبانیں۔ ادب میں زمین کی سُگندھ ہوتی ہے، ہوا کی تاثیر ہوتی ہے، وہاں کا پانی ادب کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ وہاں کے رسوم و رواج، طورطریقے، خیالات، تصورات، توہمات ادب کی رگِ جاں سے پیوست ہوتے ہیں۔ بولیوں کا بھی ایک ادب ہوتا ہے۔ وہ برسات کے کٹ بدہن نالوں کی طرح اُن ندیوں میں جا کر گرتا ہے جنہیں زبان کا ادب کہتے ہیں اور یہ ندیاں اس سمندر سے جا کر ملتی ہیں جس کا نام ملک کا ادب ہے۔ کسی بڑے ملک کے مختلف جغرافیائی حصوں، وہاں کے رہنے والوں کے طورطریقوں اور سوچنے اور جینے کے ڈھنگ، وہاں کی زبانوں کے رسم خط، ان کے الفاظ، ان کے جملوں کی ساخت، ان کے لہجہ اور آہنگ سب میں فرق ہوتا ہے لیکن طرح طرح کے فرق اور فاصلے کے باوجود وہاں کی زبانوں میں جو ادب پیدا ہوتا ہے وہ سب مل کر ایک بڑا ادب بن جاتا ہے تیزنگاہ ناقدوں نے یورپ کے پورے برِّ اعظم کی ادبی روایات میں وحدت ڈھونڈھ نکالی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کے برصغیر کی طرح یورپ کے برِّاعظم میں زبانوں، زاویوں اور رسم خط کا ایک رنگ برنگا میلہ لگا ہوا ہے۔

جہاں تک اردو اور ہندی کا تعلق ہے یہ دونوں باہم بھارت کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ نزدیک ہیں اس سمندر میں جس کا نام بھارتی یا ہندوستانی ادب ہے گنگا، یمنا سے لے کر گوداوری، نرمدا، تاپتی اور کرشنا کاویری نام کی ندیاں گرتی ہیں، زبان کی ردیف میں جن کے نام بدل کر مراٹھی، گجراتی، تیلگو، تامل، کنڑ، ملیالم وغیرہ ہو جاتے ہیں تاہم وہ ایک بہت بڑے ادب کا جُزو ہیں۔ لیکن اردو اور ہندی کی حیثیت یمنا اور گنگا کی سی ہے جو پریاگ پہنچ کر اس طرح شیر و شکر ہو جاتی ہیں کہ سنگم سے ذرا آگے ان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا یا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے

(دوسرا حصہ)

ایسی حالت میں ہم جنیندر کمار جین کو ہلکا سا خراج ادا کر کے سرسری نہیں گزر سکتے۔ ہمارا ہر بڑا اہلِ قلم ہماری ادبی میراث ہے۔ کم پڑھے لکھے ہندی والے ایسے ہوں گے جو غالب، اقبال اور فیض سے ناواقف ہوں اور ان میں سے وہ لوگ جو ادب کا اچھا ذوق اور فراخ دل رکھتے ہیں اردو کے ان شاعروں کی بڑائی کو مانتے ہیں اور انھیں بھارتی ادب کے بلند قامتوں میں گنتے ہیں۔

ہندی کے ناول نگاروں اور مفکروں میں جنیندر کمار کا مقام

---

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ہمدرد نگر، دہلی۔

بہت اونچا ہے۔ جینیندر کمار ہر بڑے اہل قلم کی طرح اپنے وقت سے آگے تھے۔ ان میں روایت سے، خواہ ادبی ہو خواہ اخلاقی، انحراف کی جرأت تھی۔ مزاج کی اس جرأت نے انھیں انگریزوں کی حکومت کے خلاف عملی احتجاج پر اکسایا اور حکومت کا عتاب اُن پر نازل ہوا۔ وہ تین بار اسیر فرنگ رہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ء کو جینیندر کمار کے انتقال نے ہندی ادب کو تو ایک بڑا نقصان پہنچایا ہی، ہمارے وطنی ادب میں بھی ایک خلا پیدا کر دیا وہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جنگ آزادی کی خاطر انھوں نے تعلیم چھوڑ دی اور ترک موالات (نان کوآپریشن) میں شریک ہو گئے۔ اس وقت جینیندر کمار کی عمر صرف ۱۵ سال کی تھی۔ اس سے ان کی قومی حمیت اور آزادی کے لیے ان کی بے تابی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ان کی ملاقات منشی پریم چند سے ہوئی۔ منشی پریم چند کی اہمیت ان کی ادبی عظمت سے ماورا یہ بھی ہے کہ ان پر اردو اور ہندی دونوں کا دعویٰ ہے جیسے کبیر پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا دعویٰ تھا۔

منشی پریم چند نے جینیندر کمار کی مدد سے ۱۹۳۴ء میں لاہور میں "ہندوستانی سبھا" قایم کی جس کے رکن جوش ملیح آبادی بھی تھے۔ سنہ ۳۵ء میں جینیندر کمار نے پریم چند کے قایم کیے ہوئے رسالہ "ہنس" کی ادارت کا بار سنبھالا۔

جینیندر کمار کی بڑی تصانیف کی تعداد ۵۰ ہے جس میں ۱۳ ناول اور ۱۷ افسانوں کے مجموعے شامل ہیں۔ ان کا شاہکار ان کا چھوٹا ناول "تیاگ پتر" (استعفیٰ) ہے جس کا ترجمہ ۳۵ زبانوں میں چھپا ہے۔ ان کے دوسرے اہم ناول "پرکھ" "کلیانی" "سکھدا" "جے وردھن" ہیں۔

جینیندر کمار کے ناول انسانوں کے باہمی تعلقات کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان کے نسوانی کردار، اطوار اور سوچ کی آزادی کے لحاظ سے وقت سے کافی آگے ہیں۔ ناول نگار کے اس خیال کو قبول کرنا نظام اخلاق کے لیے پُر خطر ہو گا کہ بیرونی عقد صنفی روابط ضروری ہیں۔

ذکاوت جینیندر کمار کی طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے آثار ایک طاقتور فراست سے تاباں ہیں جو کبھی کسی ایک نظام فکر سے مرعوب نہ ہو پائی۔ ہندی زبان کے وہ پہلے مصنف ہیں جن کے ذہن نے روایتی بندشوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی وجہ سے ان کی تصانیف طمانیت کو برہم کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ پہلے ہندی مصنف ہیں جنھوں نے ہندوستانی عورت کے نہاں خانۂ دل میں جھانکا اور اس کی ستائی ہوئی روح کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

پریم چند نے ہندوستانی عورت کے سماجی المیہ کی تصویر کشی کی تھی۔ جینیندر اس سے آگے تک چلے گئے۔ انھوں نے اس کی نفسیات کے اندرونی گوشوں کو کرید کر دیکھا۔

جینیندر کے کئی ناولوں کا موضوع وہ عورتیں ہیں جو یا تو گر چکی ہیں یا گرنے والی ہیں، وہ عورتیں حقارت کا شکار ہو گئی ہیں یا جنھیں طیش یا طاقت کی سلگتی ہوئی آرزو نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے، پوری شدت کے ساتھ؛ وہ عورتیں جنھوں نے پے در پے سماج کے قانون کو توڑا ہے۔ جینیندر کی کتابیں ایک دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں انسانی روح کی آزادی کے لیے استدلال کرتی ہیں۔ ان دلائل میں تلوار کی سی کاٹ ہے۔ جینیندر نے تن تنہا نہ صرف ہندی ادب میں ایک چھوٹا سا انقلاب پیدا کر دیا، بلکہ اپنے قارئین کی نفسیات کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔

جینیندر کی نثر میں مفاہیم کی اپرتوں کی پرتیں جلوہ گر ہیں۔ ان کی زبان نرم لیکن مضبوط ہے اور اس لحاظ سے وہ پریم چند کی نثر

"جس نے تنگ حال مقروض کو مہلت دی یا اس کے لیے کچھ کمی (اصل قرض میں سے) کر دی اسے اللہ قیامت کے دن عرش پاک کے سایہ تلے لے لے گا جب کہ اس دن بجز اس کے سایہ کے کوئی سایہ میسر نہ ہوگا۔"

ترمذی۔

سے بہتر ہے جو ہمدردی کی طلب سے بوجھل اور جھکی ہوئی ہے۔ ان کی نثر اپنے عروج پر غیر افسانوی تصانیف میں ملتی ہے۔ وہاں شکوک بے یقینی، بے اعتباری نتائج کی طرف ٹھٹھکتے ہوئے بڑھنے کا سا انداز نظر آتا ہے۔ جینندر نے فرسودہ خیالات اور معقولون استدلال اور عقاید، تعصب اور ناروائی کو دھیمی چابک دستی کے ساتھ مسمار کر کے رکھ دیا۔ وہ کوئی شعلہ بار بت شکن نہیں تھے لیکن انھوں نے کسی کو چھوڑا نہیں۔ اپنی زد سے وہ خود بھی نہیں بچے۔ اُنھوں نے مقدرات اور محذوفات کی پُرفریب زبان کو اپنی بذلہ سنجیوں اور اجمال طرازیوں میں بڑی مہارت سے صرف کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے ہندی نثر کے امکانات کو بہت وسعت دے دی، اسے بے کراں بنا دیا۔

جینندر باوجود اپنی تصانیف کی طمانیت شکن اور انقلاب آفریں دھار اور کاٹ کے خود ایک بہت سادہ اور بے انا انسان تھے۔ ان کی عمر کے آخری بیس سال تخلیقات سے تقریباً خالی رہے لیکن اس سے پہلے ہی بہ حیثیت ہندی ادب کے ایک جدید قادر الکلام اہل قلم کے ان کا لوہا مان لیا گیا تھا اور انھوں نے ہندی مصنفوں کی دو پیڑھیوں کو متاثر کیا تھا۔ وتسارینا، اجینیا، دھرم ویر بھارتی موہن راکیش، نرمل ورما، کملیشور، کرشنا سوبتی، منو بھنڈاری مرنیل پانڈے اور دوسرے بہت سے مصنفین نے ان کی ٹھنڈی اور عہد ساز چھاؤں میں اپنی اونچائیوں کو پایا، ایسے امکانات کو تیز کیا

اردو کے اہل قلم اور قارئین اس بلند قامت ہندی مصنف کے اُٹھ جانے پر مغموم ہیں اور اس کی یاد میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

[اس مضمون کا دوسرا حصہ (۲) جینیدر پر انگریزی مضامین سے ماخوذ ہے]

"تم اس سے غافل ہو کہ تمہاری زندگی کا سفر آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے اور ہر لمحہ زندگی سے تمہارا رشتہ کم ہو رہا ہے غور کرو اور اپنی غفلت کو چھوڑ دو۔ جو سانحہ پیش آنے والا ہے، اس سے باخبر رہو۔ قاصد اجل کی پیشوائی کے لیے تیار رہو۔ کیوں کہ وہ ضرور آئے گا اور یہ کچھ خبر نہیں کہ موت کا قاصد تمہیں بہشت میں لے جائے گا یا دوزخ کے کسی گڑھے میں"۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
غنیۃ الطالبین۔ (ترجمہ اردو)

ارشادِ شاہانہ

[جناب میر عثمان علی خاں نظام ہفتم فرمانروائے حیدرآباد دکن کی درج ذیل تقریر اب سے پچاس برس پہلے کی ہے جو ۴ر دسمبر ۱۹۳۹ کو آرٹس کالج کے افتتاح کے موقع پر کی گئی تھی نصف صدی کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود اس تقریر کی معنویت آج بھی برقرار ہے اسی لیے اس کو تہذیب الاخلاق کے صفحات کی زینت بنایا جا رہا ہے۔] (ادارہ)

مجھے خوب یاد ہے کہ اب سے چار پانچ سال پہلے میں نے اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ اس بنیاد پر عالیشان عمارت قائم ہوگئی ہے جو اپنی وضع کی خوب صورتی شان اور عظمت میں غالباً ہندوستان بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی اور جس طرح جامعہ عثمانیہ میرے عہدِ حکومت کا ایک اعلیٰ کارنامہ ہے، اسی طرح یہ عمارت بھی میرے عہد کی ایک شاندار یادگار ہے جو صدیوں تک آئندہ نسلوں کو اس زمانے کی تہذیب و تمدن اور ذوقِ تعمیر کی یاد دلاتی رہے گی۔ لہٰذا اس عمارت کی تاسیس اور افتتاح دونوں یکساں میری مسرت کا باعث ہوئے ہیں۔

اس جامعہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلیم اردو زبان میں دی جاتی ہے جو ہندو و مسلم اقوام کے میل جول اور آپس کے دوستانہ تعلقات سے پیدا ہوئی اور جو مساوی طور پر دونوں قوموں کی مشترکہ میراث ہے اور جو ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پس یہ امر موجب امتنان ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے سبب سے اس زبان کو اتنا فروغ اور عروج حاصل ہوا کہ یہ علوم مشرقی و مغربی سے مالا مال ہو کر مشکل سے مشکل مطالب کے ادا کرنے اور اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین کی تعلیم دینے کے قابل ہوگئی۔ چنانچہ اس جامعہ میں گو کہ تعلیم اور امتحانات اردو میں ہوتے ہیں، تاہم اس کا معیار ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے کم نہیں ہے جہاں انگریزی میں تعلیم دی جاتی ہے۔

اب میں اس سلسلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس عمارت کا طرزِ تعمیر بھی اردو زبان کی طرح ہندو اور مسلمان قوموں کے طرز سے مرکب ہے اور اس کے ستونوں اور دیوار کے نقش و نگار میں دونوں قوموں کی کاریگری اور ان کے تمدن و تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے اس طرح یہ عمارت بھی ایک علامت ہے اس باہمی میل جول اور باہمی دوستانہ مراسم اور خوش گوار تعلقات کی جو صدیوں سے میری ریاست کے مختلف قوموں میں چلے آتے ہیں جس کی وجہ سے یہاں کے باشندے ہمیشہ آپس میں شیر و شکر ہو کر رہ رہے ہیں اور ایسے تعلقات کو قائم رکھنا میں اپنا اور اپنی رعیت نوازی کا فرض سمجھتا ہوں۔

چونکہ جامعہ عثمانیہ جیسے ریاست حیدرآباد کی بہترین روایات کا حامل اور یہاں کی اعلیٰ ثقافت کا نمونہ ہونا چاہیے، لہٰذا لازم ہے کہ فراخ دلی اور طلبا کی باہمی محبت اور اتحاد کو اپنا مطمح نظر

قرار دے کہ اس میں ملک کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔

القصہ میں اس موقع پر جامعہ کے عہدے داران اور اساتذہ کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ ایک طرف اساتذہ اور طلبا میں اور دوسری طرف مختلف اقوام اور مذاہب کے طلبا میں باہم دگر خوش گوار اور دوستانہ تعلقات قایم رکھیں کہ یہ فریضۂ انسانی کارگزاری میں خوب ہے۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چوں کہ یہ ایک اقامتی جامعہ ہے اس لیے یہاں کے اساتذہ اور طلبا کو مل کر ایک جگہ سکونت رکھنی چاہیے تاکہ ان دونوں میں ارتباط پیدا ہو کر علمی، اخلاقی اور معاشرتی فضا پیدا ہو جو کہ ہر جامعہ کے بہترین خصائل میں سے ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ جملہ طلبا اور اساتذہ کے لیے جامعہ کے حدود کے اندر اقامت کا انتظام کیا جائے گا۔

اب میں طبقۂ طلبائے جامعہ سے مخاطب ہو کر ان کے اڈریس کے جواب میں چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں جو یہ ہیں یعنی میں تمہارا اڈریس سن کر بہت مسرور ہوا اور تمہارے جذبات وفاداری کی قدر کرتا ہوں۔ تم نے میری تصویر "انجمن اتحاد" میں آویزاں کرنے کی جو خواہش کی ہے اس کی میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں اور تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ یہ تمہاری طالب علمی کا زمانہ ہے، اس کو غنیمت جانو۔ یعنی اس وقت جو سہولتیں تمہارے لیے مہیا کی گئی ہیں: مثلاً لائق اساتذہ، نفیس آرام دہ اقامت خانے، کتابوں سے معمور کتب خانے، جدید آلات سائنس سے مملو تجربہ خانے اور وسیع بازی گاہیں، ان سے پورا پورا استفادہ کرو کہ یہ سب سامان تمہاری ہی ترقی کے واسطے فراہم کیا گیا ہے۔

المختصر جو کچھ علم و کمال و نیک کردار تم حاصل کر سکتے ہو اس کا یہی وقت ہے۔ یعنی آئندہ زندگی کی کشمکش میں پھر یہ موقع نہیں ہاتھ آئے گا۔ تم کو نہ صرف امتحانوں کے لیے بلکہ زندگی کے مشکل مراحل طے کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے اور تم کو یہ بھی یاد رہے کہ ملک و ممالک کی خدمت کرنا آسان نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے لیے قابلیت اور عزم راسخ کی ضرورت ہے۔ اس لیے تم اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو۔ اقامتی یونیورسٹی کا سب سے بڑا فائدہ اس کی اجتماعی زندگی میں ہے۔ لہٰذا اس میں فراخ دلی، باہمی میل جول، وسعت نظر اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ رعایت اور مروت کا برتاؤ ضروری ہے کیونکہ یہ ایک شریفانہ جوہر ہے جو انسان کے کیرکٹر کو اعلیٰ بناتا ہے۔ بایں وجہ کہ اگر کردار اعلیٰ نہ بن سکے تو محض کتابوں کا پڑھنا فعلِ عبث ہے۔ پس یہ جاننا چاہیے کہ شریفانہ خصائل کا حاصل کرنا کتابی تعلیم سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور یہ یونیورسٹی کی تعلیم اور اجتماعی زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد ہے جس سے کسی ذی فہم کو انکار نہیں ہو سکتا۔

الحاصل اس کالج کی تعمیر پر اظہار خوشنودی کرتے ہوئے تمام کارکنوں اور خصوصاً ان عہدہ داروں (زین یار جنگ، علی رضا اور موسیو جاسپر) کی کارگزاری کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے اس کی تعمیر کا اہتمام کیا ہے اور موجودہ صدر اعظم سر اکبر حیدری جن کی مسلسل کوششوں کو اس یونیورسٹی کے قیام اور انتظام میں خاص دخل رہا ہے۔ ان کی بیش بہا خدمات کی بھی دل سے قدر کرتا ہوں۔ آخر میں میری دعا ہے کہ خلاقِ علم و فضل رب العالمین اس جامعہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا کرے اور مدتِ مدید تک میرا ملک اس کے فیض سے بہرہ اندوز ہوتا رہے۔

آمین

"حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت تمہارے جوتے کے تسمے سے زیادہ قریب ہے اور دوزخ بھی اسی طرح۔"

بخاری

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸۔ شمارہ ۷، (جولائی ۸۹ء)

محمد باقر مرزا — اپنے چمن کا ایک دیدہ ور

(نمبر ۱)

اطہر صدیقی *

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یوں تو اقبال کا یہ شعر کافی آسانی سے ایسے موقعوں پر پڑھ دیا جاتا ہے جہاں کسی کی تعریف یا توصیف مقصود ہو لیکن پروفیسر محمد باقر مرزا پر یہ شعر بے کم و کاست صادق آتا ہے مرزا صاحب استاد کی حیثیت سے ۱۹۳۰ء میں علی گڑھ آئے تھے اور گزشتہ ۵۶ سال کے عرصے میں اس درس گاہ میں کوئی دوسرا استاد ایسا نظر نہیں آتا جس نے اپنے زمانے میں اتنے کام کیے ہوں جتنے مرزا صاحب نے انجام دیے۔ زولاجی ڈپارٹمنٹ کی بنیاد کی پہلی اینٹ سے لے کر اس کو موجودہ پرشکوہ عمارت کی شکل دینا صرف مرزا صاحب کی دین ہے۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے میں ایک دیدہ ور کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ اب بھی ان کی اس حیثیت کو کوئی دوسرا ثانوی حیثیت نہیں دے سکا۔

۱۹۴۷ء کا دور مسلمانوں کے لیے خصوصی طور پر اور پورے ملک کے لیے عمومی طور پر نہایت ہنگامی دور تھا۔ یہ بندۂ پر تقصیر اسی پر آشوب دور میں علی گڑھ پہنچا تھا۔ شاید اس امر کا تعلق بظاہر نفس مضمون سے قریب کا نہ لگے لیکن میں اس مضمون کی ابتدا اس وقت سے کر رہا ہوں جب میں پہلی دفعہ علی گڑھ کی سرزمین پر پہنچا تھا لہٰذا مرزا صاحب کے متعلق مضمون کو قلم بند کرنے میں بہت سے کیا بلکہ زیادہ تر تاثرات ذاتی ہیں۔ اس لیے میرا ذکر بھی آئے گا ان کے ذکر کے ساتھ والی بات ہوگی۔ کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوگا کہ میں مرزا صاحب پر مضمون کم لکھ رہا ہوں اور خود انعکاسی زیادہ کر رہا ہوں۔ یہ بات میں دست بستہ معافی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جہاں جہاں بھی خود انعکاسی کا سا احساس ہو وہاں مقصد دراصل اس عظیم انسان کی عظمت کو صحیح روشنی میں دکھانا مقصود ہے۔ اب اس کی چکا چوند روشنی سے مجھ جیسے انسان پر بھی چمک پڑے تو اس سے مرزا صاحب کی بڑائی مقصود ہے نہ کہ اپنی تعریف۔ مضمون کے شروع میں اس امر کی وضاحت میں نے اس لیے کی ہے کہ قاری مجھے غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کا شکار نہ سمجھے۔ دراصل سورج کی کرنیں زمین پر پڑتی ہیں تو ریت کے ذرات بھی چمکنے لگتے ہیں۔ یہی مثال مجھ پر صادق آتی ہے۔

یوں تو میں ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ آگیا تھا لیکن مرزا صاحب سے براہ راست استفادہ ۱۹۵۰ء میں ہوا جب میں بی ایس سی (آنرز) کے فائنل سال میں پہنچا۔ مرزا صاحب ہمیشہ سے ایک

نوٹ:- یہ مضمون اختصار کے ساتھ فکر و نظر کے نمبر "نامورانِ علی گڑھ تیسرا کارواں" میں شائع ہو چکا ہے۔ طوالت کی وجہ سے تہذیب الاخلاق میں دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔

* [illegible]

کلاس انڈر گریجویٹ ضرور پڑھاتے تھے اور یہ رسم ان کی ملازمت کے آخری سال یعنی ۱۹۶۱ء تک جاری رہی۔ وہ آج کل کے استادوں کی طرح نہ تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے پوسٹ گریجویٹ کلاس پڑھانا شروع کردیتا ہے اور انڈر گریجویٹ سے جہاں تک ہو نجات ملی رہی۔ میں بھی ان کی تقلید میں اس عادت پر آج تک عمل پیرا ہوں۔

مرزا صاحب ۸ دسمبر ۱۹۰۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ان کے والد بزرگوار مولوی عزیز مرزا علی گڑھ کے پرانے طالب علم تھے اور علی گڑھ تحریک سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی خدمات پہلے ہی ناموران علی گڑھ کے دوسرے قافلے میں سراہی جا چکی ہیں۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ مرزا صاحب ایک بے حد اچھے تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور اپنی زندگی میں انھوں نے اپنی اس بیک گراؤنڈ کا ثبوت بھی دیا۔ گو کہ مرزا صاحب کی والدہ بدقسمتی سے اس وقت رحلت کر گئیں جب وہ بہت چھوٹے تھے اور والد صاحب اس وقت اس دنیا سے رخصت ہو گئے جب بابر مرزا صاحب کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ ماں اور باپ دونوں کے سائے سے محروم اس شخص نے جو کام آئندہ زندگی میں کیے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ محنت، ایمان داری، کارکردگی، فرض شناسی، تعلیمی اصلاحات اور یونیورسٹی اور قوم کی ترقی کے لیے جذبہ ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ مولوی عزیز مرزا کے بیٹے کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسے بابر مرزا صاحب تھے۔

بابر مرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم بھی علی گڑھ میں ہوئی۔ وہ آٹھ برس کی عمر یعنی بچپن ہی میں منٹو سرکل میں داخل کر دیے گئے اور علی گڑھ سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کی تیاری کرکے الہ آباد بورڈ سے ۱۹۲۱ء میں امتحان پاس کیا۔

بی ایس سی کے لیے بمبئی یونیورسٹی کے سینٹ زیویرس کالج (St. Xaviers College) بمبئی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۳ء میں بی۔ ایس سی پاس کیا۔ اس وقت وہ بمبئی یونیورسٹی کے پہلے مسلمان اور تیسرے گریجویٹ تھے۔ انھوں نے زولاجی میں امتیازی نمبر لیے عثمانیہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے دو سال پڑھا کر وہ ۱۹۲۶ء میں جرمنی چلے گئے۔ اس کے لیے انہیں نظام حکومت سے قرض لینا پڑا جو بعد میں نہایت ایمان داری سے سال بہ سال اپنی قلیل تنخواہ سے ادا کرتے رہے۔ جرمنی سے ۱۹۲۹ء میں مرزا صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال واپس آکر پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ زولاجی کے ہیڈ مقرر ہوئے لیکن جلد ہی سر راس مسعود کے دعوت نامے پر مرزا صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا اور ۲۴ جنوری ۱۹۳۰ء کو علی گڑھ کی خدمت قبول کرکے شعبہ زولاجی کی باگ ڈور سنبھال لی۔ ان کا تقرر پانچ سو روپیہ ماہوار ریڈر کی حیثیت سے ہوا جس پر وہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۳ء تک کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۳ء میں وہ پروفیسر بنائے گئے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۳ء تک ان کی تنخواہ میں صرف سو روپے کا اضافہ ہوا اور وہ اس لیے کہ مرزا صاحب کا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے ان کی ریڈر ہی کی تنخواہ پر ہوا تھا اور انہیں کوئی مالی منفعت نہ ملی تھی۔ رہنے سہنے کا ڈھنگ، جرمن شریک حیات اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی مہنگائی کے مدنظر مرزا صاحب نے ایک خط اگزیکیوٹو کونسل (E C) کو لکھا کہ ان کو گریڈ کے انتہا پر مقرر کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے پروفیسر کی تنخواہ 600 - 1250 روپے تک تھی، جب کہ زندگی اس قدر مہنگی نہ تھی۔ جنگ کے باوجود مہنگائی کے گریڈ 1000 تک کم کر دیا گیا اور ان کے وقت تک 800 روپے۔ زولاجی کی زبان میں لکھا کہ "اس کو Retrogressive Metamorphosis کہتے ہیں"۔

یونیورسٹی کی مالی مشکلات کی وجہ سے مرزا صاحب کی یہ درخواست E.C نے منظور نہ کی لیکن ان کے اچھے کام کو سراہا اور ریکارڈ کیا۔ مرزا صاحب اس فیصلے سے غیر مطمئن یا بددل نہ ہوئے اور یونیورسٹی کی خدمت میں اسی تندہی سے لگے رہے۔

شادی اور اولاد

دوران قیام جرمنی مرزا صاحب نے گندہ ٹاؤب مین سے شادی کی اور بیگم کا نام عطیہ مرزا رکھا۔ یہ شادی غالباً

۱۹۲۸ء میں ہوئی اور ۳۸-۳۹ سال تک دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ نہایت پرمسرت ازدواجی زندگی گزارتے رہے۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء تک عطیہ بیگم مرزا صاحب کے ساتھ علی گڑھ میں رہیں اور ۱۹۶۱ء میں وہ اور مرزا صاحب جرمنی چلے گئے اور سکونت وہیں اختیار کرلی۔

مرزا صاحب کے ایک ہی اولاد ہوئی رضیہ مرزا جو اب جرمنی میں ہیں اور انہوں نے ایک جرمن سے شادی کی ہے اور غالباً ان کے چار لڑکے ہیں۔

مرزا صاحب پتلے دبلے لمبے اور بے حد گورے رنگ کے انسان تھے۔ چہرے پر رخساروں کی ہڈیاں کچھ زیادہ نمایاں تھیں۔ نہایت صاف ستھرے باذوق کپڑے پہنتے تھے۔ انہیں کبھی کسی نے برے لباس میں نہیں دیکھا۔ زیادہ تر کپڑوں کے رنگ سنجیدہ ہوتے تھے۔ گرمیوں میں سفید پتلون، قمیص، فیلٹ ہیٹ، منہ میں سگریٹ ہولڈر، چہرے پر چشمہ اور ہاتھ میں بریف کیس۔ جس وقت ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوتے خاموشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ اتنی بارعب شخصیت پروفیسران میں کم دیکھی گئی ہے۔ جو انہیں نہ جانتا ہو وہ یہ سمجھتا کہ کوئی وزیٹنگ پروفیسر (Visiting Professor) ہے۔ کسی طرف سے ہندوستانی نہ لگتے تھے۔ وہ صرف مغل نہ تھے بلکہ مغل نظر بھی آتے تھے اور ان کے کردار میں بھی مغلوں کی خصوصیات تھیں۔ ہم لوگوں کا یہ حال تھا کہ کوریڈور سے ایڑیوں کے بل گزرتے تھے، اس ڈر کے مارے کہ دفتر میں مرزا صاحب بیٹھے ہیں کہیں ان کے کام میں ہمارا چلنا مخل نہ ہو۔ میں نے ان کو دور سے ۱۹۴۸ء میں اور قریب سے ۱۹۵۰ء میں دیکھا ان کو کبھی کسی لڑکے کو ڈانٹتے ڈپٹتے نہیں دیکھا۔ کلاس میں حاضری سو فیصد رہتی اور کلاس بھی بے حد محنت سے پڑھاتے شروع شروع میں ان کے پاس جانے کی ہمت نہ پڑتی لیکن ایم ایس سی میں جب کوئی مضمون وغیرہ لکھ کر دکھانے کے بہانے ان کے دفتر میں جاتے تو ہمیشہ بے حد مستعدی سے لڑکے کو وقت دیتے۔ جو بھی کام کرتے ہوتے چھوڑ دیتے اور فوراً لڑکوں کی طرف توجہ دیتے۔ ایم۔ ایس سی فائنل میں کبھی "لیب" میں کسی جانور کو دکھانا مقصود ہوتا تو سب کام چھوڑ کر آتے۔ میں نے ایک آدھ دفعہ کہا بھی کہ اس وقت آپ مشغول ہیں پھر دیکھ لیجیے گا تو کہتے —— "میری پہلی ڈیوٹی تم لوگوں کو اٹینڈ (attend) کرنا ہے باقی سب کچھ اس کے بعد ——" ہم لوگ اچھا کام کرتے۔ پرچے اچھے کرتے تو شاباشی دیتے میں نے ایم۔ ایس سی کے پہلے سال میں عملی امتحان بہت ہی اچھا کیا۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر بھاٹیا صاحب ممتحن خارجی تھے۔ ان کے سامنے بلا کر بے حد تعریف کی۔ وہ تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے۔ فرسٹ آنے والے لڑکوں کی ہمت افزائی کرتے اور اگر موقع ملتا تو انہیں فوراً لکچرر بنادیتے۔

۱۹۵۳ء کے مئی جون میں میرا ایم۔ ایس سی کا نتیجہ آیا اور زولاجی ڈپارٹمنٹ کی تاریخ میں پہلی بار میں نے پوری فیکلٹی میں ٹاپ کیا۔ یہ ریکارڈ شاید ابھی تک قائم ہے۔ بہرکیف ۱۴ رجولائی ۱۹۵۳ء کو میں نے اپنے وطن سے لوٹ کر مرزا صاحب کے کمرے میں حاضری دی۔ داخل ہونے پر بیٹھنے کو کہا۔ خیریت پوچھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے (اس لیے کہ اس قدر رعب دار شخصیت کے سامنے آزادی سے بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی) پوچھا کہ ایم۔ ایس سی تو کرلیا اب کیا کروں؟ بغیر کسی تامل کے بولے "کیا اس ڈپارٹمنٹ میں لکچرر بننا چاہو گے؟" ذرا سوچیے ایک طرف مرزا صاحب جیسی شخصیت اور دوسری طرف میں۔ بالکل "راجہ بھوج اور گنگوا تیلی والی مثل" دیر تک کانوں کو یقین نہیں آیا۔ پیروں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ میں مرزا صاحب کے دفتر میں داخل ہوا تھا تو ایک فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن ایم۔ ایس سی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ پانچ منٹ بعد ان کے دفتر سے نکلا تو اس ڈپارٹمنٹ کا لکچرر تھا۔ آج بھی جب سوچتا ہوں اور لوگوں کو یہ واقعہ سناتا ہوں تو اس سے اپنی بڑائی یا ذہانت یا استعداد کا اظہار مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس عظیم انسان کی عظمت کا اظہار پیش نظر ہوتا ہے۔

یکم نومبر ۱۹۸۰ء کو جب میں نے زولوجی ڈپارٹمنٹ کا چارج

پہلا دن مرزا صاحب کے اس کمرے میں ان کی کرسی پر بیٹھا تو اوپر بیان کیا ہوا واقعہ نظروں میں بار بار گھومتا رہا۔ ۲۳ سال پہلے اس کرسی پر مرزا صاحب بیٹھے تھے اور سامنے میں حاضر تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن میں اس عظیم شخص کا جانشین بنوں گا اور اسی کرسی پر اس جگہ بیٹھوں گا۔ پہلے تو سوچا کہ میں مرزا صاحب کی کرسی اٹھا کر کمرے میں ایک کونے میں رکھ دوں اور اس پر بیٹھنے کی جرأت بھی نہ کروں لیکن پھر خیال آیا کہ مرزا صاحب ہوتے تو اسے پسند نہ کرتے بلکہ یہ چاہتے کہ میں ان کی ہی کرسی پر بیٹھوں اور ان کے قائم کردہ طور طریق پر ڈپارٹمنٹ کو چلاؤں اور خود کو ان کا صحیح جانشین ثابت کروں۔

جہاں تک مرزا صاحب کی اس کرسی پر بیٹھنے اور نہ بیٹھنے کا سوال ہے اوپر والی بات میں نے اس لیے لکھی ہے کہ مرزا صاحب جب ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہوئے تو اپنے ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی اپنی جگہ مشتہر (Advertised) کرا کر سلیکشن کمیٹی کرادی اور اپنی نوکری کے آخری دن پروفیسر ایم۔ اے بصیر خاں صاحب مرحوم سے ہم لوگوں کی موجودگی میں کہا۔ — "بصیر اب یہ کرسی تمہاری ہے۔ آؤ ہم سب لوگوں کی موجودگی میں تم اس پر بیٹھو" کیا کشادہ قلبی تھی۔

مہلت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

سوال یہ ہے کہ اب ایسے لوگ کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ دراصل مرزا صاحب آج کل کے ہیڈ اور چیرمین نہ تھے جو پہلے پُرامید لوگوں سے خوشامد کراتے، گھر کے کام لیتے، دو چار چھ سال دوڑاتے اور پھر لکچرر بنانے کا احسان کرتے۔ وہ کوئی کام کسی پر احسان کرنے کے لیے نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کا کام جائز ہوتا تو وہ ضرور کر دیتے۔ خوشامد یا دربار داری ان کے یہاں ممنوع تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی طالب علمی کے زمانے میں ان کے گھر گیا ہوں۔ وہ کسی کا گھر آنا پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ بلا امتیاز لوگوں کی مدد کرتے۔ کسی کا کام نہ روکتے۔ کسی کو آگے کسی کو پیچھے نہ کرتے۔ ہر شخص کو اس کا حق دیتے۔ ممکن ہے میرے کچھ ساتھی اس بات سے متفق نہ ہوں لیکن مرزا صاحب کی ایمانداری اور انصاف پسندی کا مجھے یقین ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ کوئی کسی ترقی کو یک طرفہ طور پر اپنا حق مان لے تو اس میں مرزا صاحب کی کیا خطا؟ وہ ہر ایک کے ساتھ جائز اور برابری کا برتاؤ کرتے تھے۔ ہر شخص کو اس کا حق دینے کی کوشش کرتے تھے۔

طرزِ رہائش

جہاں تک مجھ کو یاد پڑتا ہے، مرزا صاحب ہمیشہ سے مال یونیورسٹی روڈ (جس میں اب کامرس فیکلٹی کا دفتر ہے) میں رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں اس کوٹھی پر چھپر یا پھونس کی چھت ہوتی تھی۔ سامنے پان کی شکل کے لان کے چاروں طرف پھولوں کی کیاریاں ہوتیں۔ پورچ میں مرزا صاحب کی کالی ہلمن گاڑی کھڑی ہوتی اور کبھی کبھی مرزا صاحب بیگم مرزا کے ساتھ اپنے کتے کو ٹہلاتے نظر آجایا کرتے۔ کوٹھی کا گیٹ ہمیشہ بند ہوتا اور ہم کبھی سامنے سے گزرتے تو اس کوٹھی کے مکینوں کو کسی اور دنیا کے باشندے سمجھتے۔

اسٹاف میں آنے کے بعد اس کوٹھی میں اندر جانے کا اتفاق ہوا۔ مرزا صاحب ہر سال سیشن کے آخر میں سارے اسٹاف کو چائے پر بلاتے تھے۔ بیگم مرزا اپنے ہاتھ سے سینڈوچ اور اپ سائڈ ڈاؤن کیک تیار کرتیں۔ نہایت جھلملاتی ہوئی جرمن سلور کٹلری سامنے رکھتیں جسے دیکھ کر احساس ہوتا کہ شاید آج ہی پہلی بار استعمال ہو رہی ہے۔ جرمن کمپنی روزن تھال کی کراکری میں چائے دیتیں اور نہایت عمدہ انڈے کی طرح سفید نیپکن جو کلف لگے اور استری شدہ ہوتے ہاتھ میں پکڑاتیں۔ یہ چائے پارٹی ہم میں سے بہت سوں کے لیے Alice in Wonder Land کی کیفیت رکھتی تھی۔ دراصل جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں مرزا صاحب کی یہ چائے پارٹی بھی ایک طرح کی ٹریننگ تھی۔ اس بات کی کہ پڑھے لکھے لوگوں کو کیسے رہنا چاہیے۔ مرزا صاحب کوئی بہت متمول شخص نہ تھے۔ برسوں ان کو بہت کم تنخواہ ملتی رہی اور اس میں سے بھی وہ قرض (advance) جو جرمنی جانے کے لیے لیا تھا ادا

کرتے رہے تھے۔ جرمن بیوی کے ساتھ کی وجہ سے معیارِ زندگی میں کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے بھشتی بھنگی کے علاوہ نوکر بھی ضرور ہوتے۔ ان کے گھر کے اندر کا ماحول نہایت سادہ لیکن بے حد صاف ستھرا ہوتا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان کے ڈرائنگ روم میں صوفہ سیٹ بھی تھا لیکن یہ یاد پڑتا ہے کہ جو کچھ بھی تھا وہ نہایت سلیقے سے خوش نما لگتا تھا۔ اس میں بیگم مرزا کی جرمن ٹریننگ کو بھی دخل تھا اور دونوں میاں بیوی کے خوش ذوق ہونے کی زندہ مثال تھا۔

کھانے میں مرزا صاحب ایک وقت ہندوستانی کھانا کھاتے اور ایک وقت یعنی شام کو ہلکا پھلکا سینڈوچ، کباب وغیرہ۔ اس پر ان کا ایک مقولہ یاد آتا ہے کہ

"دنیا میں ہر چیز پرائی ہوسکتی ہے لیکن کھانا اور گانا صرف اپنا"

میں جب ۱۹۷۴ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی گیا تو مرزا صاحب سے ملنے ان کے شہر بھی گیا۔ وہ لیبلار میں ایک نہایت عمدہ فلیٹ میں رہتے تھے۔ وہی صفائی ستھرائی خوب صورتی، سجاوٹ اور خوش ذوقی کی مثال تھا ان کا فلیٹ۔ بہت دیر تک ہم لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے اور بیگم مرزا کھانا پکاتی رہیں۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو میز پر کھانا لگا دیا گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دیسی ہندوستانی کھانا۔ چاول، کری وغیرہ۔ بیگم مرزا آخر وقت تک مرزا صاحب کے لیے ہندوستانی کھانا پکاتی رہیں۔ شام کو ٹھنڈے گوشت اور چیز کے سینڈوچ کھاے۔

طریقۂ تعلیم

لوگ آج کل Audio Visual Aids کا استعمال تعلیم میں افضل سمجھتے ہیں اور اس کی افادیت پر بڑا زور دیتے ہیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ سے VISUALS کا استعمال اپنی کلاس میں کرتے تھے۔ پروجیکٹر Epidiascope وغیرہ کی مدد سے وہ ہمیشہ اپنے لکچر کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے۔ آج بھی ۵۰ سال بعد ان کی میز اور المار ی کی درازوں میں [illegible] VIS کو پیش کرنے والے سلائیڈ اور تصاویر موجود ہیں جن کو خود انہوں نے اپنے آپ بنایا تھا۔ وہ پڑھانے کو عبادت کی حد تک اہمیت دیتے تھے۔ اس قدر محنت سے پڑھانا اور اس کے لیے اتنی محنت کرتا میں نے کسی اور استاد کو کرتے نہیں دیکھا۔ کلاس میں لکچر کے علاوہ مرزا صاحب Practical میں بھی خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ جب بھی کوئی مشکل آتی یا کوئی نیا کیڑا Nematode ملتا تو وہ فوراً آکر مائیکروسکوپ پر بیٹھ جاتے اور اس جانور کو پہچان کر بتاتے۔

مرزا صاحب کی ڈرائنگ اور فوٹوگرافی بے حد اچھی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے ہی ہاتھ سے ڈرائنگ بنانے کے قایل تھے۔ آج کل ریسرچ اسکالر students لوگوں سے اپنے تھیسس کی تصاویر بنوا لیتے ہیں۔ مرزا صاحب کے زمانے میں اس طرح کی کوئی چیز نہ تھی۔ ڈرائنگ کے بعد ان کی تصاویر کیمرے کے ذریعے لینا بھی سکھاتے تھے۔ نہ صرف میری تھیسس کے سارے فوٹو ان کی ہدایت میں بنائے گئے بلکہ اوروں کے ڈائی گرام جن کی ڈرائنگ اچھی نہ تھی وہ خود بناتے اور اس شاگرد کو برا بھلا کہتے جاتے۔ جن لوگوں کے تھیسس میں مرزا صاحب کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصاویر شامل ہیں وہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں اور میری اس بات کی صداقت پر گواہی دے سکتے ہیں۔ مرزا صاحب بے حد خوش خط لکھتے تھے اور اپنے سارے کام لکھائی پڑھائی، کلاس کے نوٹس اور لکچر وغیرہ بے حد قاعدے سے خوش خطی کے ساتھ لکھتے ــــ برا خط یا بُری طرح کام کرنا ان کو بالکل پسند نہ تھا۔ اپنے ایک شاگرد کی بدخطی کی ہمیشہ شکایت کرتے۔ ایک دفعہ اس شاگرد کا خط لکھا ہم لوگوں کی موجودگی میں آیا۔ جب پڑھنے میں بہت دقت ہوئی تو بولے "یہ خط ہے یا ایسا لگتا ہے کہ چونٹا دوات میں گر کر اس کاغذ پر رینگ گیا ہے۔"

مرزا صاحب کلاس ہمیشہ وقت سے لیتے تھے۔ گھنٹہ بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے اور گھنٹہ بجنے کے ساتھ کلاس چھوڑ

بیٹے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کبھی کلاس میں دو چار منٹ دیر سے داخل ہوئے ہوں اور دو چار منٹ پہلے کلاس چھوڑ دی ہو اور یہ پابندی نوکری کے آخر سال تک باقی رہی۔ کچھ اساتذہ ریٹائرمنٹ کے قریب پڑھانے میں دلچسپی بس کچھ معمولی سی رکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اپنے آخری سال کے آخری وقت تک کلاس لی۔

وقت کی پابندی کا یہ حال تھا کہ لوگ اپنی گھڑیاں ملا سکتے تھے۔ جب آفتاب ہال کے پرووسٹ تھے اور تین بجے سہ پہر وہاں دفتر کرنے جاتے اور ایس ایس ہال اور ممتاز ہاؤس کے بیچ سے جب ان کی کار گزرتی تو ایس۔ ایس۔ ہال کے کمروں سے آوازیں آتیں

"تین بج گئے، گھڑی ملا لو"[۲]

جب کبھی ڈپارٹمنٹ میں شام کو فنکشن یا پارٹی کے لیے پانچ یا چھ بجے کا وقت دیا جاتا تو مرزا صاحب ہمیشہ وقت سے پہنچ جاتے۔ جو لوگ دیر کرتے یا دیر سے آتے، ان سے اپنی ملایم ناراضگی کا اظہار ضرور کرتے۔ بشیر صاحب مرحوم ہمیشہ دیر سے آتے اور مرزا صاحب ہمیشہ کہتے "بشیر کبھی وقت سے نہیں آ سکتے۔" ۱۹۳۱ء میں جس وقت مرزا صاحب نے ڈپارٹمنٹ کی باگ ڈور سنبھالی تھی، اس وقت ڈپارٹمنٹ دو کمروں میں اس جگہ تھا، جہاں پہلے جغرافیہ اور اب کامرس ڈپارٹمنٹ ہے۔ اسٹاف میں بھی چار اساتذہ سے زیادہ نہ تھے۔

۱۹۵۶ء تک مرزا صاحب خود ہی اپنے ٹائپسٹ، میوزیم کیوریٹر، لائبریرین، پرچیز آفیسر اور فوٹو آرٹسٹ تھے اور بیچ بیچ میں مختلف مشینوں کی دیکھ بھال اور مرمت بھی کر لیتے تھے۔ موجودہ بلڈنگ اور اس کی ساخت وغیرہ سب ان کے ہاتھوں ہوئی۔ ایک زندگی میں ایک شخص تنہا اتنا کام کر سکتا ہے، یقین نہیں آتا۔ علی گڑھ میں زولاجی ڈپارٹمنٹ کا صحیح معمار اگر کسی کو کہا جا سکتا ہے تو صرف مرزا صاحب کو۔ اس ایک شخص نے جو کچھ اپنے ۲۴ سال کے عرصہ میں کیا اس کا عشر عشیر بھی گزشتہ ۲۶ سال میں نہیں ہوا۔

اپنے دور میں انہوں نے کون سی چیز ایسی تھی جو جمع نہ کر لی ہو۔ پکچر تھیٹر میں پروجیکشن کا سب سامان۔ جرمن رنگین سلائیڈ۔ فلم وغیرہ۔ ان کی الماری سے ۱۹۸۵ء میں میں نے ایسی ایسی چیزیں نکالی تھیں جو یقین نہیں آتا کہ ۱۹۳۰ء یا ۱۹۴۰ء کی دہائی میں ملتی تھیں اور مرزا صاحب نے خرید لی تھیں۔ مرزا صاحب اس زمانے میں جرمنی جا کر سامان خرید لاتے تھے گو کہ فنڈ بیحد کم ہوتے تھے لیکن ان کو ہر وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ جس طرح بھی ہو ڈپارٹمنٹ بہتر سے بہتر ہو جائے۔ جاتے وہ اپنی سسرال تھے لیکن کام وہ ڈپارٹمنٹ کا کرتے تھے۔ اپنے مضمون اور ڈپارٹمنٹ سے اس قدر دلچسپی اور لگاؤ میں نے کسی میں آج تک دیکھا ہی نہیں۔

ایک اچھے سائنس داں ہونے کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کو اردو زبان سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور اس معاملے میں بھی وہ Pioneer تھے۔ حیدر آباد میں زولاجی کی تعلیم اردو میں شروع کرنے میں ان کا ہاتھ تھا۔ علی گڑھ آ جانے کے بعد بھی وہ اردو میں سائنسی مضامین لکھ کر عام آدمی کو جانوروں سے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے قایل تھے۔ آکاش وانی سے تقاریر اور رسالۂ حیوانیات علی گڑھ سے جاری کر کے یہ کام انھوں نے بخوبی انجام دیا۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں ڈپارٹمنٹ کا چارج لیتے ہی مرزا صاحب نے اگست ۱۹۳۰ء میں زولاجیکل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ہر پندرہویں دن اس سوسائٹی کے تحت توسیعی لکچروں کا سلسلہ قایم کیا۔ کبھی لکچرار باہر سے مدعو کیے جاتے اور کبھی اسٹاف کے لوگ خود لکچر دیتے۔ ان کے اپنے توسیعی لکچر مدینہ ورم سانپوں کے رہن سہن پر بہت مقبول ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا باتوں سے ان کی محنت اور Devotion کا اتنا پتہ نہیں چلتا جتنا میوزیم دیکھ کر چل سکتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا میوزیم ہندوستان بھر کے زولاجی میوزیم میں سبقت رکھتا تھا اور شاید اب بھی رکھتا ہو۔ اس قدر

بڑے میوزیم کو جس میں لاتعداد شیشے اور لکڑی کی الماریاں ہیں، اور جن میں نہایت خوش اسلوبی سے شیشے کے جاروں میں مختلف جانوروں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ہر جار پر اندر رکھے ہوئے جانور کا نام، خاندان اور قسم وغیرہ مرزا صاحب کے اپنے ہاتھ کے تحریر شدہ لیبل پر لگی ہوئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ لیبل خراب ہوئے اور تبدیل کرنا پڑے، لیکن ذرا سوچیے اکیلے تنہا شخص نے کتنا کام کیا ہوگا جب جا کر میوزیم بنا ہوگا اور یہ سب ان کاموں سے علیحدہ کام تھا جو اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ میرے نزدیک اتنا کام کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ کاش مرزا صاحب کی مثال دیکھ کر ہی ہم اس میوزیم کو سدھار سکیں اور بہتر حالت میں رکھ سکیں۔ مرزا صاحب بے حد کھلے دماغ اور روشن ذہن کے مالک تھے۔ وہ نہ صرف اپنے وقت سے بہت آگے تک کی بات سوچتے تھے بلکہ کہیں بھی کوئی چھوٹا بڑا اچھی بات کہتا یا کر سکتا تو اس کی قدر کرتے۔ نئے کام یا نیا مضمون شروع کرنے میں ہمت افزائی کرتے۔ یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ جب میں ۱۹۵۹ء میں امریکا سے دوسری پی ایچ۔ ڈی (Ph.D.) لے کر لوٹا تو بی۔ ایس سی (آنرز) کے تین سالہ ڈگری کورس کے لیے ایک نئے مضمون Physiology کی شروعات کے لیے مجھ سے کہا اور ہر طرح کی مدد کی۔ اس وقت اس مضمون میں ڈپارٹمنٹ میں کوئی نہ تھا۔ یہ مرزا صاحب کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ میں نے بالکل ہی شروع سے فزیالوجی کی داغ بیل ڈالی، جس کا لیب کورس بعد میں میری کتاب Experimental Physiology کی شکل میں چھپا اور آج خاصی یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔

ایم۔ایس سی کی سطح پر بھی ایک نیا مضمون Endocrinology جس میں میں نے امریکہ کی Purdue University میں ایک Minor کی حیثیت سے ۳ کورس لیے تھے، شروع کیا اور اب ایک پرچے کے اہم حصے کی شکل میں پچھلے پچیس سال سے پڑھایا جا رہا ہے۔ اسی طرح ۱۹۵۷ء میں جب سید ظہور قاسم صاحب کارڈف ویلس سے مچھلیوں پر کام کرنے کے بعد پی ایچ۔ڈی لے کر لوٹے تو مرزا صاحب ہی نے Fisheries کے سیکشن کی ظہور قاسم صاحب کی قیادت میں داغ بیل ڈالی۔

ان کی کشادہ قلبی اور وسیع النظری کا ثبوت سب سے بہتر اس امر سے ملتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں بجائے اپنا مضمون شروع کرنے کے انھوں نے ایم۔ایس سی میں Entomology اسپیشل پرچے کی حیثیت سے پہلے Agricultural Entomology کو شروع کیا۔ کیونکہ نوکری ملنے اور زراعت کی اہمیت کے اعتبار سے Science بہتر تھا۔ لڑکوں کا اور ملک کا اسی میں فائدہ تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

حوالے

ے۱ مولوی عزیز مرزا — از یوسف چغتائی

ے۲ نامورانِ علی گڑھ — دوسرا قافلہ۔ فکر و نظر علی گڑھ۔

اِس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیا ہو گیا ہے۔ — سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸۔ شمارہ ۷ (جولائی ۸۹ء)

ریاضی کا جادوگر

اشرف نوشاہی*

کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور ریاضی دان جی ایچ ہارڈی کو جیسے ہی وہ خط ملا، اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ یہ خط کسی ہندوستانی کی طرف سے تھا جس کا نام سری نواس رام نوجن تھا۔

سری نواس رام نوجن جی ایچ ہارڈی کی رائے ان ہارہ نظریات کے بارے دریافت کی تھی جو اس نے خود ایجاد کرنے کا دعوٰی کیا تھا۔

ہارڈی کو اکثر ایسے خطوط ملا کرتے تھے۔ اس کے خیال میں یہ سب لوگ کریک تھے۔ یہ کریک لوگ اکثر و بیشتر "بڑبڑ" لکھ دیا کرتے تھے کہ میں نے ریاضی سے تمام مسائل حل کر لیے ہیں۔ میں نے یہ کر لیا ہے، میں نے وہ کر دیا۔

ہارڈی کا خیال تھا کہ یہ شخص بھی ایسا ہی کریک ہے۔ اس نے حقارت سے خط کو دیکھا اور ایک جانب اچھال دیا۔

ہارڈی نے خط کے مندرجات پہ سرسری نظر ڈالی تھی تو اس کا خیال تھا کہ رام نوجن نے جو نظریات پیش کیے تھے، ان میں سے اکثر بالکل فضول اور بے بنیاد تھے۔ کچھ ایسے نظریات بھی تھے جو پہلے ہی سے مشہور تھے اور ان کو از سر نو دریافت کرنے کا دعوٰی مضحکہ خیز تھا۔ یقیناً رام نوجن ان بڑبولے لوگوں میں سے تھا جنھیں نہ کوئی علم ہوتا ہے اور نہ ہنر جانتے ہیں سوائے بڑی بڑی ہونگیاں مارنے کے" یہی کچھ سوچ کر اس نے خط ایک جانب اچھال دیا تھا لیکن بعد میں سارا دن "خط" اس کے ذہن پر چھایا رہا۔ ممکن ہے ان فضول اور بے بنیاد نظریات میں کوئی کام کی بھی بات ہو۔ وہ بار بار سوچتا رہا۔

ہارڈی اس ہندوستانی کے خط کو ہاتھ سے جھٹک کر ذہن سے نہ جھٹک سکا۔ بے یقینی کی اس کیفیت سے نکلنے کے لیے اس نے اپنے ایک ساتھی سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ساتھی بھی کیمبرج یونیورسٹی کا نمایاں ریاضی داں تھا اور اس کا نام تھا۔ جے۔ ای۔ لٹل وڈ۔

ہارڈی اور لٹل وڈ کو گمنام سے ہندوستانی کا خط آدھی رات تک جگاتا رہا۔ آدھی رات کے قریب ان پہ سچائی کا انکشاف ہوا اور وہ سچائی یہ تھی کہ

"سری نواس رام نوجن ایک جینیس ہے

ہارڈی اور لٹل وڈ نے یہ سچائی اس بنیاد پہ مان لی تھی کہ سری نواس رام نوجن نے نئی سچائیاں "ایجاد" کی تھیں۔

یہ واقعہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا، جنوری ۱۳ ۱۹ء میں پیش آیا اور ریاضی کی تاریخ میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔

رام نوجن اس وقت ایک معمولی سا کلرک تھا جو مدراس کے پورٹ ٹرسٹ پر ملازم تھا لیکن ایک سال سے کچھ ہی دن بعد وہ کیمبرج یونیورسٹی میں تھا۔ تب ہی سے اس کے "عالمی کیریئر" کی ابتدا

---

* حسن علی آفندی روڈ، کراچی، پاکستان

ہوئی اور دنیاے ریاضی نے ایک نئے اور ذہین ریاضی داں کو اُبھرتے ہوے دیکھا۔

رام نوجن کتنا بڑا جینیس تھا، اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اس کے پیش کردہ نظریات اور خیالات کو سمجھنے کی ابتدا اب ہو رہی ہے۔ وہ اپنے وقت سے بہت آگے سوچ رہا تھا۔ حالانکہ وہ ۱۹۲۰ء میں اس دنیا سے چل بسا تھا لیکن اب جب کہ بیسویں صدی خاتمے کے قریب ہے، اس کے خیالات کو سمجھنے کی قابلیت سامنے آرہی ہے۔ اس نے بیسویں صدی کی ابتدا میں جو نظریات اخذ کیے تھے، ان سے کمپیوٹر سائنس اور طبعیات کی جدید کامیابیاں حاصل کی جارہی ہیں اور وہ مسائل جن کا اس وقت تصور بھی ممکن نہ تھا اب انہیں مساواتوں سے حل ہو رہے ہیں جو رام نوجن نے دریافت کی تھیں۔

رام نوجن کا زیادہ تر کام "نظریہ عدد یا نمبر تھیوری" سے متعلق ہے۔ نمبر تھیوری ریاضی کی ایک ایسی شاخ ہے جس میں اعداد سے متعلق قوانین اور مساواتوں پر غور کیا جاتا ہے۔ ریاضی دانوں کے لیے اس نظریے میں بڑی کشش ہے لیکن عام آدمی کے لیے یہ پیچیدہ چیز ہے۔

رام نوجن کی زندگی ان لوگوں کے لیے ایک مثال ہے جو صفر سے شروع ہوتے ہیں اور جن کی اپنے کام سے لگن انہیں ایک نہ ایک دن کوئی ایسا نمبر بنا دیتی ہے جس کی کوئی قیمت ہو۔ "غربت اور تنہائی" ایسے لوگوں کا نقطہ آغاز ہوتا ہے لیکن یہ دونوں زنجیریں ان کے ذہن کو جکڑ نہیں سکتیں۔

سری نواس رام نوجن کی زندگی ڈرامائی واقعات اور سوز و گداز سے بھرپور ہے۔ ریاضی کی رومانی داستانوں میں یہ بھی ایک ناقابل فراموش داستان ہے۔ ایک ایسی دل گداز داستان جو ثابت کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص واقعی جینیس ہے تو کیسے ہی ناخوشگوار حالات کیوں نہ ہوں وہ کبھی نہ کبھی ضرور اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

وہ دسمبر ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوا۔ اس نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ معاشی اعتبار سے غریب تھا لیکن برہمن ذات ہونے کے باعث قابل عزت سمجھا جاتا تھا۔ وہ جس شخص کا بڑا بیٹا تھا وہ ایک معمولی تنخواہ دار اکاؤنٹنٹ تھا۔ کپڑے کے ایک تاجر کے پاس ملازم اس شخص کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ رام نوجن کی ماں کو بھی چھوٹے موٹے کام کرنے پڑتے تھے۔

دنیا کے اکثر جینیس ایسے لوگ رہے ہیں جو اپنے والدین کی سب سے پہلی اولاد تھے۔ اس کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہے۔

ریاضی میں اس کی فطری دلچسپی چھوٹی عمر ہی میں آشکارا ہو گئی جب وہ محض بچہ تھا تو تب بھی ستاروں کی شکلوں اور فاصلوں پر غور کیا کرتا۔ بچپن ہی میں اس نے ذاتی دلچسپی سے خط استوا کی لمبائی تخمینہ کی۔ اس سے اساتذہ کو جلد ہی اس کی خوبیوں کا علم ہو گیا اور انہوں نے اسے "ٹائم ٹیبل" بنانے کا کام دے دیا۔ تعلیم سے وابستہ لوگ، بالخصوص ٹیچرز جانتے ہیں کہ ٹائم ٹیبل بنانا کس قدر محنت طلب اور نازک کام ہے۔

ریاضی میں اس کی بے پناہ دلچسپی اس حقیقت سے واضح ہوتی ہے کہ جب وہ پندرہ برس کا تھا اور کالج میں زیر تعلیم تھا تو اس نے کالج لائبریری سے ایک کتاب جاری کرائی۔ ریاضی کے متعلق یہ کوئی عمدہ کتاب نہ تھی۔ یہ محض سوال و جواب والی عام سی کتاب تھی۔ جوابات کو ثابت کرنے کے لیے مناسب ثبوت موجود نہ تھے۔ اس کے باوجود رام نوجن کو یہ کتاب بہت اچھی لگی اور اس سے اس میں ریاضیاتی تحقیق کا جذبہ اُبھرا۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اکثر جینیس لوگوں کی طرح وہ بھی روایتی تعلیم میں ناکام رہا۔ ۱۹۰۳ء میں اس نے اسکول کی تعلیم فرسٹ درجے سے مکمل کی اور وظیفہ پا کر کالج میں داخل ہوا لیکن وہ چونکہ ریاضی میں حد درجے غرق ہو چکا تھا، اس لیے اس کی توجہ دوسرے مضامین کی طرف بالکل نہ تھی۔ اس وجہ سے وہ تعلیمی طور پر ناکام قرار دے دیا گیا۔ اس نے دوبارہ امتحان دیا لیکن دونوں مرتبہ فیل ہو گیا۔

کالج کا امتحان پاس نہ کر سکنے کا عرصہ اس کی زندگی کا سب سے مشکل دور تھا۔ اس کے والدین باوجود غربت کے اسے تعلیم دلا رہے تھے۔ وہ ان کا اکلوتا بچہ بھی نہ تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی

اور گھر کا معاشی معاملہ کبیدہ تھا۔ والدین کو امید تھی کہ ان کا بڑا بیٹا بھی کالج کی تعلیم مکمل کرکے معقول روزگار پر لگ جائے گا لیکن جب وہ دوبارہ ناکام رہا تو انہوں نے اسے تعلیم چھوڑ کر کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے کو کہا۔ اس کے لیے تعلیم چھوڑنا بڑا تکلیف دہ فیصلہ تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ تعلیم سے قریب رہ کر روزگار حاصل کرنے کے خیال سے اس نے ریاضی کی ٹیوشن شروع کی تھی لیکن وہ "ناکام طالب علم" ہی نہیں "ناکام استاد" بھی ثابت ہوا۔ اس لیے کہ وہ اتنی اونچی باتیں کرتا تھا کہ ٹیوشن کے لیے آنے والے لڑکوں کے سر پر سے گزر جاتیں۔ جو بھی اس کے پاس پڑھنے آتا چند دن سے زیادہ نہ ٹکتا۔

اس کا اگر کوئی دوست تھا تو وہ علم ریاضی ہی تھا کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن درحقیقت اس نے ریاضی کی مروجہ اور درسی کتابوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اس کا ذہن ہر وقت ریاضیاتی حقیقتوں اور افسانوں سے بھرا رہتا اور وہ دیوانوں کی طرح ایک کے بعد ایک مساوات حل کرتا جاتا۔ بعض اوقات وہ ریاضی کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک جھونپڑی میں گوشہ نشین ہو جاتا کیونکہ بصورت دیگر اس کے والدین خفا ہو جاتے۔

اس کے والدین نے ۱۹۰۹ء میں اس کی شادی کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ ازدواجی زندگی کے بکھیڑے اسے ریاضی کے عشق سے چھٹکارا دلا دیں گے اور وہ ایک "معقول" آدمی بن جائے گا لیکن یہ نہ ہو سکا۔ البتہ اب وہ کوئی ملازمت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے ایسے لوگوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا جو ریاضی میں دلچسپی رکھتے ہوں اس طرح اسے معاوضے کی امید تھی۔ ایسے ہی ایک رام چندر راؤ نے جب اس کی نوٹ بکس دیکھیں تو باوجود کچھ نہ سمجھنے کے اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ یہی رام چندر راؤ بعد میں انڈین ریاضی سوسائٹی کا صدر بنا۔ اس نے نوجوان رام نوجن کے لیے ایک وظیفہ مقرر کر دیا اور یوں اس کو کچھ معاشی بے فکری میسر آ گئی۔

اس نے مجبوراً وظیفہ کو قبول کر لیا تھا لیکن وہ اس بات پر شرم محسوس کرتا تھا کہ خیرات پر زندہ رہے۔ چنانچہ اس نے ملازمت کی تلاش جاری رکھی۔ بالآخر مارچ ۱۹۱۲ء میں اسے ملازمت مل گئی ملازمت کے حصول میں بھی ریاضی نے اس کی مدد کی۔ مدراس پورٹ ٹرسٹ کے جس افسر نے رام نوجن کو ملازمت دی وہ خود بھی ریاضی کا بڑا شیدائی تھا۔

اسے ملازمت تو مل گئی مگر یہ محض اسٹنٹ نتوئی تھی۔ اس کی تنخواہ صرف پچیس روپیے ماہوار تھی۔ بہرحال کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔ اس نے کلرک کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ اسے جو ۲۵ روپیے ملتے تھے ان سے وہ گھر کا خرچ چلانے کے ساتھ ریاضی کے سوالات کے لیے کاغذ نہیں خرید سکتا تھا۔ اس لیے وہ ان کاغذوں کو جمع کر لیا کرتا جو بندرگاہ پر پیکٹ کھلنے کے بعد پھینک دیے جاتے۔

غربت کے باوجود یہ دور اس کی زندگی میں تیری تبدیلیاں لایا۔ جب وہ ریاضی میں مگن ہوتا تو اکثر اوقات کھانا بھی بھول جاتا اور گھنٹوں مساواتیں حل کرتا رہتا۔

اسی دوران اس کی کچھ ریاضیاتی تحریریں ایک رسالے میں شائع ہوئیں جس کا نام تھا جرنل اوف دی انڈین میتھا میٹیکل سوسائٹی" رسالے میں اس کی دریافتیں شائع ہونے سے اس کا تعارف مدراس ریاضیاتی حلقوں پر ہوا۔

حلیے اور خدوخال کے اعتبار سے وہ دل کش شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ چھوٹے قد کا اور موٹا تازہ ایک شخص جس کا سر نسبتاً بڑا تھا اور ماتھے کے نیچے چمک دار آنکھیں تھیں۔

وہ جس دور میں پیدا ہوا، وہ ہندوستان میں تعلیمی پسماندگی کا زمانہ تھا۔ ریاضی جیسے علم کی تو بات ہی نہ پوچھیے کیونکہ اس بے چارے پر تو سب ہی تہمت دھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاضی سے وابستہ ہونے والے کسی بھی شخص سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ رام نوجن اور اس کے مقام کا تعین کر سکے۔ کوئی ایسا ریاضی دان بھی موجود نہ تھا جو کسی حد تک اس کی ذہانت کے قریب ہو اور دانش ورانہ رفاقت مہیا کر سکے۔ اس لیے ان لوگوں نے جو اس جینیس کے خیر خواہ تھے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی تخلیقات انگلستان روانہ کرے اور یوں دنیائے ریاضی میں داخل ہو۔

رام نوجن نے نمایاں ریاضی دانوں سے تین بار رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایک نئی کوشش کے خیال سے اس کے ۱۶ جنوری ۱۹۱۳ء کو جی۔ ایچ۔ ہارڈی کے نام خط نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی اور اسے غیر معمولی دانش وروں کی رفاقت سے فیض یاب کر دیا۔

جیسے ہی ہارڈی نے اس کی قدر و قیمت معلوم کی اس نے اُسے خط لکھا کہ وہ کیمبرج آکر تحقیق کرے۔ اس کی ماں کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔

"وہ تمام لوگ جو اپنے استاد خود بنتے ہیں، ان کی سوچ کا سب سے اہم عنصر وجدان ہوتا ہے اور یہی وہ غیر معمولی خوبی ہوتی ہے جو مروجہ تعلیم پیدا نہیں کر پاتی۔" رام نوجن

قدامت پسندی کے باعث برہمنوں میں سمندر کا سفر ناپسندیدہ تھا۔ اس کے باوجود مئی ۱۹۱۳ء میں مدراس یونیورسٹی نے رام کو ایک دو سالہ ریسرچ اسکالرشپ دے دی۔ اس کے مطابق رام کو ہر ماہ ۷۵ روپیے ملنے تھے۔ ان ہی دنوں رام کی ماں نے ایک خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا بہت سے یورپی لوگوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ ایک دیوی نے خواب میں رام کی ماں سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی ترقی میں حائل نہ ہو۔ اس طرح رام کو اجازت مل گئی۔

اپریل ۱۹۱۴ء میں رام ٹرنٹی کالج کیمبرج پہنچ گیا۔ موجودہ رکارڈ سے علم نہیں ہوتا کہ ہارڈی کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات کیسی رہی لیکن ایک بات واضح ہے کہ یہ دو ایسے ریاضی دانوں کی ملاقات تھی جو بالکل متضاد شخصیات کے مالک تھے۔ ہارڈی کی عمر اس وقت ۳۷ برس تھی اور وہ ایک ایسا شخص تھا جو ہر بات میں شک کرنے کی عادت میں مبتلا ہو کر دہریت تک پہنچ چکا تھا۔ اسے کرکٹ سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی تھی جب کہ رام کو کھیلوں سے قطعاً لگاؤ نہ تھا۔ اسے مذہب سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ کہا کرتا تھا:

"کسی بھی مساوات کا کوئی مطلب نہیں، اگر وہ بھگوان کے کسی خیال کو ظاہر نہ کرتی۔"

ریاضی کے متعلق خیالات بھی اتنے ہی مختلف تھے۔ ہارڈی سے بالکل مختلف انداز میں، رام کی سوچ وجدانی تھی۔ وہ ریاضی کے ایک نتیجے سے دوسرا نتیجہ نکالنے کا پابند نہ تھا۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں

"وہ تمام لوگ جو اپنے استاد خود بنتے ہیں، ان کی سوچ کا سب سے اہم عنصر وجدان ہوتا ہے اور یہی وہ غیر معمولی خوبی ہوتی ہے جو مروجہ تعلیم پیدا نہیں کر پاتی۔"

بہت سے لوگ تعلیمی نظام کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ معیارِ تعلیم کا گرنا ہی معیارِ ذہانت کا گرنا ہے۔ رام جیسے لوگوں پر غور کیا جائے تو الزام بے بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح بیج میں اُگنے اور بڑھنے کی اپنی صلاحیت ہوتی ہے اور کھاد جیسی امداد سے صرف ظاہری مدد ملتی ہے اسی طرح انسانوں میں بھی ایک فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ تعلیم کا کام تو صرف کھاد کا ہے۔ اگر ذہانت کا بیج ہی موجود نہ ہو تو تعلیم کیا کر سکتی ہے؟ بالکل اسی طرح جیسے بیج ہی میں صلاحیت نہ ہو تو کھاد ڈالنا بے کار ہے۔

ہارڈی میں رام کے برعکس مکتبی تعلیم کی بنیاد پر سوچنے کی عادت پختہ ہو چکی تھی۔ بہت سی نئی باتیں اس کے علم میں تھیں لیکن ہارڈی نے کبھی بھی اس طرح رام سے گفتگو نہ کی کہ اسے یونیورسٹی میں تعلیم نہ پانے کا صدمہ ہوتا۔ اس نے رفتہ رفتہ نئے نظریات سے رام کو متعارف کرایا۔ اس کے بدلے میں اس نے وہ باتیں سیکھیں جو صرف رام ہی سوچ سکتا تھا۔

اس نے انگلستان میں پانچ برس گزارے۔ اس دوران رام نوجن اور ہارڈی نے کئی ایسے ریاضیاتی مقالے مل کر تیار کیے جو دنیائے ریاضی میں نئے باب کھولتے رہے۔

کیمبرج میں رام نے ریاضی داں کی حیثیت سے عروج پایا۔ وہ کس قدر تیز رفتار مفکر تھا اس کا احساس یوں کیجیے کہ ایک بار ہارڈی نے کہا تھا:

"رام نوجن مجھے ایک دن میں نصف درجن نئے تھیورم بتایا کرتا تھا۔"

رام کو انگلستان کی علمی فضا تو بھائی مگر موسم کبھی اچھا نہ لگا۔ اسے

سردی اور بارش سے چڑ تھی۔ کیمبرج کا ٹھنڈا موسم مدراس سے قطعاً مختلف تھا۔ بالخصوص جب پہلے پہل وہ وہاں پہنچا تو سردی اس کے لیے ناقابل برداشت رہی۔ خوراک بھی ایک مسئلہ تھی۔ رام صرف سبزی کھاتا تھا اور کسی دوسرے کے پکائے ہوئے کھانے پر اعتبار نہ کرتا تھا۔ ایک بار اس نے اوولٹین پی تو لی لیکن یہ معلوم کر کے سراسیمہ ہو گیا کہ اس میں انڈا بھی شامل تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا تو بارش ہو گئی۔ اس نے اسے بھگوان کی جانب سے سزا سمجھا۔

رام نوجن ۱۹۱۷ء میں بیمار پڑ گیا۔ بعض لوگوں نے شک ظاہر کیا کہ وہ ٹی۔بی میں مبتلا ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹروں نے بتایا کہ وٹامن کی کمی لاحق ہو گئی ہے۔ ان کے خیال میں رام اپنے وطن لوٹ جائے تو ٹھیک ہو سکتا تھا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم جاری تھی اور سفر خطرناک تھا۔ اس وجہ سے رام کو ۱۹۱۷ء کے بعد کافی مدت تک ہسپتالوں کے چکر لگانے پڑے۔ بیماری کے باعث وہ کمزور ہوتا چلا گیا لیکن اس کی ریاضیاتی صلاحیت متاثر نہ ہوئی۔ مثلاً ایک بار جب وہ ہارڈی کے ساتھ ہسپتال گیا تو جس ٹیکسی میں انہوں نے سفر کیا، اس کا نمبر موضوع گفتگو بن گیا۔

ٹیکسی کا نمبر "۱۷۲۹ تھا" ہارڈی نے کہا

"مجھے تو" یہ نمبر غیر دلچسپ لگا۔

"نہیں ہارڈی نہیں۔" رام نوجن نے کہا: "یہ بہت دلچسپ نمبر ہے۔ یہ وہ چھوٹے سے چھوٹا نمبر ہے جو دو مختلف طریقوں سے نکالے گئے مکعب کا مجموعہ ہے۔"

رام نوجن جس ریاضیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا تھا وہ یہ ہے۔

$$۱۷۲۹ = (۱۲ \times ۱۲ \times ۱۲) + (۱ \times ۱ \times ۱) = ۱۲^{۳} + ۱^{۳}$$

یا

$$۱۷۲۹ = (۹ \times ۹ \times ۹) + (۱۰ \times ۱۰ \times ۱۰) = ۹^{۳} + ۱۰^{۳}$$

بیماری کے ساتھ ساتھ رام نوجن ایک نئی پریشانی میں بھی مبتلا ہو گیا۔ اسے علم ہوا کہ جو کچھ اس نے ہندوستان میں رہ کر دریافت کیا تھا وہ یورپ میں پہلے ہی دریافت ہو چکا تھا۔ اس بات سے دل برداشتہ ہو کر وہ ایک بار لندن انڈر گراؤنڈ ریلوے لائن پر لیٹ گیا لیکن گاڑی بر وقت رُک گئی اور وہ بچ گیا۔ ہارڈی نے خودکشی کی اس کوشش پر مداخلت کر کے اسے پولس کے مقدمے سے بچا لیا۔

ناکامیوں اور مایوسیوں کے اس دور کے بعد ایک بار پھر خوشیوں نے اس کا رخ کیا۔ ۲۸ فروری ۱۹۱۸ء کو اسے رائل سوسائٹی لندن کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ وہ دوسرا ہندوستانی تھا جسے یہ اعزاز ملا۔ چند ماہ بعد اسے ٹرینٹی کالج کیمبرج کا فیلو منتخب کیا گیا اور وہ یہ اعزاز پانے والا پہلا ہندوستانی تھا۔

فروری ۱۹۱۹ء میں وہ ہندوستان واپس آ گیا۔ اسے ایک ہیرو کی طرح خوش آمدید کہا گیا لیکن اس کی صحت دن بہ دن گرتی چلی گئی۔ ریاضیاتی ساتھیوں اور ہارڈی سے اس کا رشتہ پھر بھی قایم رہا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو کسی پنڈت نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا کیونکہ اس نے سمندر پار سفر کیا تھا۔

"یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر قایم ہو جائیں۔ یہ امر تو قانون قدرت کے برخلاف ہے جو ہو نہیں سکتا۔ نہ تو پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔"

۔ سر سیّد ۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸۔ شمارہ ۷ (جولائی ۱۹۸۹ء)

سائنس کے آئینے میں ہمارا مستقبل

ابو تمزئین العزمی*

ہمارے ادب نے سائنس کا کبھی استقبال نہیں کیا۔ لیکن سائنس بغیر استقبال کے ہی ہمارے گھروں، دفتروں، کھیتوں، سڑکوں اور ہمارے آسمان پر دندناتی پھر رہی ہے۔ سائنس کی اپنی ایک طاقت ہے جو حکومتوں کی طاقت سے بھی زیادہ منہ زور ہے۔ بیسویں صدی میں تو گویا سائنس جوالامکھی کی طرح پھٹ پڑی ہے۔ انسانی تاریخ کے گزشتہ چار ہزار سال میں اتنی سائنسی ایجادات نہ ہوئی تھیں، جتنی بیسویں صدی کے اٹھاسی برسوں میں ہو چکی ہیں۔ یہ صدی ختم ہونے میں ابھی تقریباً بارہ سال باقی ہیں۔ ان بارہ برسوں میں ابھی بے شمار ایجادات کی توقع ہے۔ یہ متوقع ایجادیں کارخانوں میں زیرِ تشکیل ہیں۔ اس مضمون کے ساتھ آخر میں دیے گئے خاکے سے بآسانی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زراعت، طب، گھریلو زندگی، نقل و حمل، ابلاغ و مواصلات اور صنعت و حرفت کے شعبوں میں کیسی کیسی اہم سائنسی ایجادات اسی بیسویں صدی میں ہوئی ہیں۔

یاد رہے کہ کمپیوٹر، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، وی سی آر، آفسیٹ مشین، واشنگ مشین، ریفریجریٹر، ڈیجیٹل گھڑیاں، بال پوائنٹ پین، بجلی کے چولہے، جمبو جیٹ، گیس سے چلنے والی گاڑی، ٹریکٹر وغیرہ یہ سب سائنس نہیں ہیں، بلکہ ٹکنالوجی ہیں یہ تو سائنس کے ثمرات ہیں۔ سائنس نام ہے ایک نقطۂ نظر کا، ایک طرزِ فکر کا، ایک رویّے کا۔ حقیقت کے بارے میں تصوراتی یا خوش فہم ہونا سائنس نہیں ہے۔ حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا سائنس ہے۔ سائنس سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتی۔ بلکہ جب تک پہلے آزمائش اور تجربے کی کسوٹی پر بار بار نہ پرکھ لے اپنی آنکھوں دیکھی چیزوں پر بھی اعتبار نہیں کرتی۔ بعض لوگ محض ٹکنالوجی کو سائنس سمجھ کر اسے مادہ پرستی خیال کرنے لگتے ہیں اور اسی لیے سائنس کے خلاف مزاحمت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ سائنس سے فقط یہ مراد ہے کہ انسان کے عقائد اور خیالات عقل و حکمت پر مبنی رہیں — عقل و حکمت کے دائرے سے باہر نہ جانے پائیں۔ سائنس سے مراد صرف سائنسی فارمولے، سائنسی نظریے اور سائنسی کتابیں نہیں بلکہ اسلامیات اور دینیات کو بھی سائنٹفک ہونا چاہیے یعنی فوق البشری اور فوق الفطری کی بھی توجیہ سائنٹفک ہونی چاہیے تاکہ ہمارے بچے جن بھوت، پریت سے ڈرنا نہ سیکھیں بلکہ ان کو اپنے سے حقیر، کمزور اور چھوٹا سمجھنا سیکھیں۔

معاشرتی تبدیلی ایک ناگزیر اور فطری عمل ہے اور جب سے کرۂ ارض پر زندگی نے اپنا گھر بسایا ہے، زندگی نمو پذیر ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ انسان بھی ارتقاء پذیر ہے۔ قدیم زمانے میں تبدیلی کی رفتار بہت سست تھی۔ ازمنۂ وسطیٰ

---

* حال مقیم العین، متحدہ عرب امارات۔

میں کچھ تیز ہوئی۔ سائنسی ترقی کے باعث معاشرتی تبدیلی کی رفتار بڑھی۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی میں یہ رفتار انتہائی تیز ہو گئی۔ ۱۹۴۵ء میں "ایٹم بم" نے دوسری جنگ عظیم ہی کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ ایک معمولی ذرے میں بھی کتنی طاقت مخفی ہوتی ہے۔ ایٹمی توانائی کے انکشاف کے بعد معاشرتی تبدیلی کی رفتار اپنے عروج پر پہنچ گئی ہے۔ کوئی ایک نئی ایجاد ابھی معاشرے کا حصہ نہیں بننے پاتی کہ دوسری ایجاد رونما ہو کر انسان کو حیران اور ششدر کر دیتی ہے اور اپنے سے پہلی ایجاد کے اثرات کو دھندلا کر دیتی ہے۔ ہمارے گھروں میں پہلے اپلوں اور لکڑیوں کی مدد سے چولہے جلتے تھے، پھر مٹی کے تیل کے چولہے استعمال ہونے لگے۔ پھر گیس سلنڈر اور چولہے آئے اور بجلی کے چولہے عام ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے سل بٹے پر مسالہ پیستے پیستے ہاتھ تھک جاتے تھے، اب مسالا پیسنے کی مشینیں موجود ہے بلکہ پسا پسایا مسالہ پیکٹوں میں دستیاب ہے۔

آب پاشی اور بجلی کے حصول کے لیے تعمیر ہونے والا بند مکمل ہو گیا۔ جب پانی کی سطح بلند ہوئی تو بستیاں خالی کرائی جا چکی تھیں لیکن کچھ ضدی اور کوتاہ اندیش لوگ ایسے بھی تھے جو آخری وقت گھروں سے نکلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ پانی میں گھر گئے۔ پانی کی سطح بلند ہونے کی رفتار بہت کم تھی چنانچہ جب انہیں کوئی امید نہ رہی تو زندگی کی محبت غالب آگئی اور یہ لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر نکل آئے۔ سب لوگ پانی کے اس تالاب کو دیکھ رہے تھے جہاں نہ جانے کتنی بستیاں اور کتنی صدیوں کی تاریخ دفن ہو گئی تھی مگر زندگی اسی کا نام ہے کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔ وقت کے ساتھ آگے بڑھنا ارتقا کا عمل ہے۔ تعمیر کرنے والے اگر اپنا لہو نذر نہ کرتے تو اس بے رنگ دنیا کی تزئین و آرائش کون کرتا۔ قدرت کے رنگوں میں محنت کے خون پسینے کا رنگ شامل نہ ہوتا تو تشکیل و تعمیر میں حسن کہاں سے آتا؟ لاکھوں ایکڑ پر پھیلے ہوئے علاقے میں سبز انقلاب کیوں کر آتا؟ ہزاروں میگاواٹ بجلی کہاں سے آتی۔ چند برسوں بعد جب سبز انقلاب رنگ لایا اور فصلیں لہلہانے لگیں، گاؤں اور قصبے روشنیوں میں نہا گئے۔ شہروں میں بڑے بڑے کل کارخانے متحرک ہو اٹھے اور لوگ اپنی روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے خود کفیل ہو گئے" تو انہیں یاد بھی نہ رہا کہ ڈیم کے اس طرف کتنی بستیاں اور ان کی صدیوں کی تاریخ دفن ہے۔

سائنس یا ٹکنالوجی کے اس تیز رفتار سیلاب سے چند بستیاں تو ضرور ڈوبتی ہیں۔ کچھ دیرینہ روایات اور قدیم اقدار کا شیرازہ بکھرتا ہے، تب بڑے بوڑھے ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ تبدیلی کو زر پرستی اور مادہ پرستی قرار دیتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کی یہ خفگی صرف غیر موجد معاشروں میں ہی نہیں بلکہ جن معاشروں میں سائنس اور ٹکنالوجی اپنے عروج پر ہے، وہاں بھی ہر نئی ایجاد کو جذب و ہضم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہاں کے فلسفی، مفکر اور اہل مذہب اس فکر میں غلطاں رہتے ہیں کہ اپنی اقدار کو سائنس اور ٹکنالوجی کی دست برد سے کیوں کر بچایا جائے۔

ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ سائنس ہمارے معاشرے میں داخل ہو چکی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کا انقلاب ہماری زندگی میں آچکا ہے کمپیوٹر اور روبوٹ نیز دوسری الیکٹرونک چیزیں روزمرہ کے استعمال میں آرہی ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ پہلے کوئی چیز کسی ملک میں ایجاد ہوتی تھی تو وہاں سے چند ہزار میل دور پہنچتے پہنچتے اسے چالیس پچاس سال لگ جاتے تھے۔ اب کوئی ایجاد اپنے مقام سے نکل کر پانچ سات برسوں میں ہی پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ محض مادی تبدیلی ہے، اصل تبدیلی کچھ اور ہے جو میرے نزدیک زیادہ اہم ہے۔ خود زندگی بدل رہی ہے، زندگی کا مفہوم بدل رہا ہے، زندگی کی کیفیت بدل رہی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان بدل رہا ہے۔ انسان کے ساتھ انسانیت بدل رہی ہے۔ انسان ماضی میں جو کارنامے اپنی جس عظیم قوت یعنی "محنت" کے بل پر سرانجام دیتا تھا، اس محنت کا مفہوم اور نقشہ ہی بدل رہا ہے۔

کل شام تک جو زمانہ ایٹمی وخلائی زمانہ تھا وہ آج محض کمپیوٹر کا زمانہ بن چکا ہے۔ ایٹم کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر بھی چلنے لگا ہے وہ کاروبار اور پیشے جن کے بارے میں کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ بدل جائیں گے وہ بدلے ہی نہیں بلکہ ہمارے دیکھتے دیکھتے مٹ گئے

ان کی جگہ نئے کاروبار، نئے پیشے جو انسان کے خواب میں بھی نہ آسکتے تھے اب حقیقت کا روپ دھار کر پے بہ پے وجود میں آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر دس سال کے اندر اندر الیکٹرونکس کی دنیا میں زبردست انقلاب آگیا ہے۔ اب ڈاک کے ٹکٹ جتنے سلیکون پر کئی کئی ہزار سرکٹ آسانی سے چڑھائے جاسکتے ہیں۔ ابھی صحیح صحیح اندازہ کرنا تو بہت مشکل ہے کہ اس مائیکرو الیکٹرونک انقلاب کے اثرات ہماری معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر کیا کیا وارد ہوں گے۔ لیکن یہ بات سب کو نظر آرہی ہے کہ ہماری صنعت وحرفت، پیداوار اور مشینوں میں یہ سائنسی انقلاب داخل ہوچکا ہے۔

کمپیوٹر بنا، کمپیوٹر نے مائیکرو کمپیوٹر بنائے، مائیکرو کمپیوٹر نے روبوٹ بنالیا۔ ایک ایجاد میں سے کئی کئی ایجادوں کے شگوفے پھوٹ پڑے ہیں۔ ایک جہان تازہ کی نمود ہے۔ یہ سب ایجادیں مل کر کیا کیا گل کھلانے والی ہیں، ان کا ہم ابھی تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ایک بات واضح ہے کہ جس طرح آج ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ریفریجریٹر، ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں اسی طرح عن قریب مائیکرو کمپیوٹر ہمارے گھر اور دفتر کا لازمی اور مستقل حصہ بن جائیں گے۔ سوچنے سمجھنے والی مشینیں انسان کی جگہ لے لیں گی۔ انسان کی طرح منصوبے بنائیں گی اور ان پر عمل درآمد کروایا کریں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی حقیقی حکمرانی کا عہد مشینوں والی دنیا میں ہی شروع ہوگا۔ اب وہ کسی ایک مشین کا دم چھلا بن کر نہیں رہ جائے گا۔ اب وہ پورے کے پورے مشینی نظام کے عمل کا نگرانِ اعلیٰ اور حاکم مطلق بنے گا۔ انقلاب خیز مشینوں پر مکمل اقتدار اور حاکمیت حاصل کرنے کے لیے انسان کو زیادہ عقل، زیادہ علم، زیادہ حکمت، زیادہ تدبّر، زیادہ فراست، زیادہ ذمہ داری، زیادہ استعدادِ کار، زیادہ قوتِ فیصلہ، زیادہ پابندیٔ وقت، زیادہ ایمان داری، زیادہ مہارت زیادہ تجربے، زیادہ کام اور زیادہ محنت کی ضرورت پیش آئے گی۔

لگتا تو عجیب ہے لیکن وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ الیکٹرونکس کے دور میں انسان زیادہ مشغول ہوجائے گا۔ محنت اور کام کی مقدار شاید گھٹ جائے گی لیکن "معیار" یقیناً بڑھ جائے گا۔ بے ہنری

کوئی چیز نہ رہے گی۔ معمولی کارکن کو بھی ماہرِ خصوصی بننا پڑے گا۔ آنے والے وقتوں میں معیشت کے تقاضے بدل جائیں گے۔ ہر جگہ ایسے کارکن کی ضرورت پڑے گی جو بیک وقت اچھا کارکن بھی ہو، اچھا انجینیئر بھی، اچھا سائنس داں بھی اور اچھا فلسفی بھی۔ اپنے اپنے وسیع علم اور گہرے تجربوں کی بنا پر ہزاروں لاکھوں ماہرینِ خصوصی (جو آج حقارت سے مزدور کہلاتے ہیں) اس کرۂ ارض کے نقشے کو یکسر بدل دینے میں مشینوں سے بھی بڑا کردار ادا کریں گے۔

ایک بات طے ہے کہ آنے والے معاشرے میں ہر شخص جس چیز پر سب سے زیادہ توجہ دے گا وہ تعلیم ہے، جس چیز پر سب سے زیادہ سرمایہ لگائے گا وہ تعلیم ہے، جس چیز پر سب سے زیادہ وقت صرف کرے گا وہ تعلیم ہے، جس چیز پر سب سے زیادہ محنت کرے گا وہ تعلیم ہے۔ اس لیے کہ تعلیم اس کے لگائے ہوئے سرمائے، وقت اور محنت سے کئی گنا زیادہ اسے لوٹا دے گی۔ تعلیم کا مطلب روزگار یا ملازمت نہیں، تعلیم کا مطلب ہے سیکھنا۔ مشینوں پر اقتدار اور حاکمیت فقط سیکھنے سے ہی حاصل ہوگی تعلیم کے سوا اور کوئی چیز ہمیں مشینوں کا حاکم نہیں بنا سکتی۔

ایک ضروری بات گوش گزار کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے ادب کو سائنس سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ سائنس نے ہمیشہ ادب کا ساتھ دیا ہے۔ دنیا کے تمام عظیم سائنس داں، فنونِ لطیفہ یا ادب کے ذوق سے بہرہ ور رہے ہیں۔ ہر بڑا سائنس داں مصوری، موسیقی، شاعری یا ادب کا جنون کی حد تک دلدادہ ہوتا ہے۔ ہمارے ماہرینِ تعلیم، ہمارے ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور اہل الرائے کا فرض ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بڑھتی ہوئی ترقی کو اور اپنے معاشرے میں اس کی شمولیت کو ٹیڑھی آنکھ سے نہ دیکھیں، بلکہ آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کریں اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے اپنے معاشرے میں سائنسی ماحول اور سائنسی مزاج پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ دوسروں کی ایجادات، اختراعات کا محض "صارف" بنے رہنا خودداری ہے نہ خودداری، اب وقت آگیا ہے کہ ہم بھی اپنی تخلیقی صلاحیت اور قوتِ ایجاد کا مظاہرہ

کرنا کہ مستقبل کی طرف جانے کا یہ واحد راستہ ہے۔

بیسویں صدی کی ایجادات کا خاکہ

اول اول گھریلو زندگی میں

۱۹۰۱ء سیفٹی ریزر
۱۹۰۷ء بجلی سے چلنے والی واشنگ مشین
۱۹۱۳ء ریفریجریٹر
۱۹۲۳ء بغیر چابی کی کلائی گھڑی
۱۹۲۸ء بجلی کا شیور
۱۹۳۰ء ڈبوں میں بند خشک غذائیں
۱۹۳۸ء بال پوائنٹ پین
۱۹۴۵ء بجلی کا چولہا
۱۹۵۷ء بیٹری سے چلنے والی کلائی گھڑی
۱۹۵۸ء بجلی سے چلنے والا ٹائپ رائٹر
۱۹۶۱ء بجلی سے چلنے والا ٹوتھ برش
۱۹۶۷ء لیزر سے ٹی۔وی کی نشریات

اول اول صنعت وحرفت میں

۱۹۰۰ء ایرکنڈیشننگ کا آغاز
۱۹۰۸ء سلوفین کا آغاز
۱۹۰۹ پلاسٹک کا آغاز
۱۹۱۰ء نیو سائن کا آغاز
۱۹۳۷ نائیلون کا آغاز
۱۹۴۱ء ٹریلین (پولسٹر) کا آغاز
۱۹۴۲ء پہلا ایٹمی ری ایکٹر
۱۹۴۲ء فوٹو اسٹیٹ کی پہلی مشین
۱۹۴۶ء پہلا الیکٹرونک کمپیوٹر
۱۹۴۷ پہلا پولیرائڈ کیمرہ
۱۹۴۸ پہلا ٹرانزسٹر

اول اول نقل وحمل میں

۱۹۱۳ء بجلی اور ڈیزیل سے چلنے والی ریلیں
۱۹۲۳ء ڈیزیل سے چلنے والا ٹرک
۱۹۲۷ء بحراعظمی ایئر لائن سروس
۱۹۴۱ء گیس سے چلنے والی موٹر گاڑی
۱۹۶۱ء پہلی انسان بردار خلائی پرواز
۱۹۶۵ء خلا میں انسان کی پہلی چہل قدمی
۱۹۶۹ چاند پر انسان کا پہلا قدم

اول اول طب میں

۱۹۰۳ء انسانی قلب کے لیے پہلا ای۔سی۔جی
۱۹۰۵ء اسپرین
۱۹۱۳ء وٹامن "اے" کی دریافت
۱۹۱۸ء وٹامن "ڈی" کی دریافت
۱۹۲۲ء وٹامن "ای" کی دریافت
۱۹۲۲ء ذیابطیس کے لیے انسولین کا پہلا ٹیکہ
۱۹۲۳ء بہرے لوگوں کے لیے آلۂ سماعت
۱۹۲۸ پنسلین
۱۹۳۲ء قلب کے لیے مصنوعی پیس میکر
۱۹۴۴ء اسٹریپٹو مائی سین کی دریافت
۱۹۶۳ء سرجری سے مصنوعی دل کا پہلا استعمال
۱۹۶۴ء پھیپھڑوں کی پہلی منتقلی
۱۹۶۷ انسانی دل کی پہلی منتقلی
۱۹۷۳ سرطان کی تشخیص کے لیے پہلا برین اسکینر

اول اول ذرائع ابلاغ ومواصلات میں

۱۹۰۱ء ماورائے اوقیانوس پہلا وائرلیس سگنل

۱۹۰۶ء ریڈیو سے پہلی نشریات ۔

۱۹۲۰ء پہلا ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا ۔

۱۹۲۶ء ٹیلی ویژن سیٹ کا پہلا عوامی مظاہرہ ۔

۱۹۲۸ء پہلی ویڈیو ریکارڈنگ ۔

۱۹۲۹ء ٹی ۔ وی ٹیلی فون کا پہلا عوامی مظاہرہ ۔

۱۹۳۵ء پہلا ٹیپ ریکارڈ ۔

۱۹۴۲ء ساحل تا ساحل ٹیلی فون کی زمین دوز کیبل

۱۹۴۸ء گراموفون کے ایل ۔ پی ریکارڈ

۱۹۴۹ء پہلا پروگرام کمپیوٹر

۱۹۵۰ء پہلی تھری ڈائی منشنل فلم

۱۹۵۶ء پہلا ویڈیو ٹیپ ریکارڈ

۱۹۵۸ء اسٹریو ریکارڈ بازار میں آئے ۔

۱۹۶۳ء کیسٹ ٹیپ ریکارڈ بازار میں آئے ۔

۱۹۶۶ء وی ۔ سی ۔ آر بازار میں آئے ۔

اوّل اوّل زراعت میں

۱۹۰۸ء مصنوعی کھاد

۱۹۲۱ کھڑی فصلوں پر ہوائی جہاز سے جراثیم کش ادویہ کا چھڑکاؤ ۔

۱۹۲۴ء تین پہیوں والا ٹریکٹر

۱۹۳۰ء ڈیزل سے چلنے والا ٹریکٹر

۱۹۳۰ء ربر کے ٹائروں والا موجودہ ٹریکٹر

۱۹۳۹ جراثیم کش دوا کے طور پر ڈی ۔ ڈی ۔ ٹی کا استعمال

۱۹۵۷ جراثیم کشی کے لیے تاب کاری کا استعمال

"لوگو! میں تمھیں سختی سے ہدایت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرو اور اس خوش قسمتی اور انعام کے حق دار بنو جو خدا وند تعالیٰ تمھیں دینا چاہتا ہے۔ خدا کے دین کو مضبوط پکڑے رکھو کہ جس کی وہ رہبری نہ کرے وہ گمراہ ہے۔ خدا خود فرماتا ہے کہ جس کو خدا ہدایت دے وہ ہدایت پائے گا اور جس کو گمراہ کرے اس کا نہ کوئی مددگار ہو سکتا ہے نہ رہبر، اس لیے سوچو کیا اس گمراہ کا دنیا میں کوئی کام قبول ہو گا، جب تک کہ وہ خدا کا معترف نہ ہو۔ یاد رکھو کہ آخرت میں خدا فراموشی کی تلافی کے لیے کوئی معاوضہ یا بدل قبول نہیں کیا جائے گا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

احسنِ تقویم

ریاض الدین*

محاذِ جنگ:

کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے جسم کے اندر ایک زبردست محاذِ جنگ کھلا ہوا ہے۔ غیر محسوس دشمنوں کی فوج آپ پر حملہ آور ہے آپ کے جسم میں ایک نہ ختم ہونے والی لڑائی لڑی جا رہی ہے ۔ امراض کے جراثیم آپ پر حملہ کیے ہوئے ہیں۔ قاتل بکٹیریا کی فوج ہر وقت آپ کے جسم میں ہوا کے ساتھ داخل ہو رہی ہے۔ آپ کا جسم دفاعی انتظام سے اگر ذرا غافل ہو جائے تو دشمن کی فتح لازمی ہے۔ مگر قدرت نے آپ کے جسم کو ایسا چاق و چوبند بنایا ہے' کہ آپ کو خبر بھی نہ ہو اور مقابلہ جاری رہے ۔

بات یہ ہے کہ متعدی امراض کے جراثیم آپ کے جسم کے کھلے حصوں سے مثلاً ناک، کان' یا کھال کے راستوں سے جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور خون کی نالیوں میں گھس جاتے ہیں۔ آپ جب وضو کرتے ہیں اور پانچ بار جسم کے کھلے حصوں کو دھوتے ہیں تو لاکھوں جراثیم سے آپ کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جراثیم کا بڑا حملہ آپ کی کھال کے ذریعے ہوتا ہے اور اگر کہیں ذرا کھال کٹ گئی ہے یا خراش لگ گئی ہے تو اسے فوج کے اندر داخل ہونے کے لیے کھلا ہوا پھاٹک سمجھیے۔

مگر کھال کے محاذ کو سر کرنا بالکل آسان کام نہیں ہے، کیونکہ کھال کے نیچے ایک جھلی کا استر اور بھی ہے۔ اگر آپ کی کھال پر صرف خراش ہے تو جراثیم کو مایوس واپس آنا پڑے گا۔ ہاں اگر زخم ذرا گہرا ہے تو ضرور کچھ نہ کچھ راستہ پا لیں گے۔ اس لیے ان کے لیے زیادہ آسان یہ ہے کہ آنکھ اور منھ کے دروازے سے اندر داخل ہو جائیں یہاں بھی آنکھ کے آنسو مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ آنسو جراثیم کے زہریلے مادے کو ختم کر دیتے ہیں اور منھ کے اندر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے لعاب دہن موجود ہے۔ کیوں کہ اس لعاب میں جراثیم کش مادہ دفاع کی خدمت انجام دیتا ہے۔ ہوا اور غذا کے راستے سے کبھی جراثیم اندر داخل ہو جاتے ہیں مگر یہاں معدے اور انتڑیوں کا تیزاب ان کا قلع قمع کرنے کے لیے موجود ہے۔

ان تمام دفاعی انتظامات کے باوجود دشمن کا کوئی دستہ آپ کے جسم کے کسی نازک مقام سے اندر داخل ہی ہو جاتا ہے مگر یہاں خون کے خلیوں کی سفید فوج (Antibody Cells) تیار کھڑی ہے تیس ہزار ملین کی یہ فوج ہر وقت چوکس ہے۔ دشمن نظر آیا اور اس نے حملہ کر دیا۔ سفید خلیے جراثیم کو کھا کر ہضم کر لیتے ہیں۔

اس جنگ میں بہت سے سفید سپاہی خود بھی کام آ جاتے ہیں۔ حملہ آور جراثیم زہریلا مادہ نکالتے رہتے ہیں۔ یہ زہر سفید خلیوں میں پہنچ کر ایک ایک دوسرے قسم کا کیمیاوی مادہ پیدا کرتے ہیں جنھیں اینٹی باڈیز (Anti Bodies) کہتے ہیں۔ ان کا خاص کام زہر کے اثر کو زائل کرنا ہے۔ ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ اوسط انسانی زندگی کو ایک لاکھ اینٹی جینس (Antigenes) کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر فاتح فوج بے دخل نہیں ہو جاتی بلکہ کسی اچانک خطرناک حملے کا انتظار کرتی ہے۔ یہ سپاہی جنھیں اینٹی باڈیز (Anti Bodies) کہتے ہیں' خون کی نلیوں میں موجود رہتے ہیں۔ بلکہ پیپھڑوں کے ذریعے کمک بھی حاصل کرتے ہیں۔ تاکہ اگر کسی قسم کے جراثیم حملہ کر بیٹھیں تو ان کو دندان شکن جواب دیا جا سکے۔ یہ قدرتی سلسلۂ دفاع انسان کو بہت سے امراض سے مبرا کر دیتا ہے۔ مثلاً خسرہ اور چیچک۔

---

* ۸۲۲ اے/۲ نوراللہ روڈ، الہ آباد۔

فلکی زندگی کی تلاش میں

یوسف سعید*

کیا آپ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک خاموش اور اندھیری رات میں جب آپ کہیں اکیلے جا رہے ہوں، یکایک آسمان کی دوریوں سے کوئی عجیب و غریب غیر دنیاوی خلائی جہاز ایک زنلٹے کے ساتھ آپ کے سامنے آکر اترے، اس کا دروازہ کھلے اور ایک بے ڈھنگے جسم اور شکل و صورت والی مخلوق اس میں سے نکلے۔ ایک ایسی مخلوق جو نہ آپ کی زبان سمجھ سکے اور نہ آپ اس کی۔

یوں تو اس طرح کے ہزاروں واقعات دنیا بھر میں برسوں سے مشہور ہیں اور سینکڑوں چشم دید گواہ بھی موجود ہیں، مگر سائنس داں ابھی ان پر کم ہی یقین کرتے ہیں، کیونکہ ان کا کوئی ٹھوس ثبوت یا لامک نہیں ملتا۔ دراصل جب سے بیسویں صدی میں سائنسی معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، دنیا اور کائنات کے مزید رازوں کا پردہ فاش ہوا اور قدرت کے نئے نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ سائنس دانوں نے اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا ہے کہ کیا واقعی اس پوری کائنات میں زمین کے جانداروں کے علاوہ کہیں کسی دوسرے سیارے یا ستارے پر کسی اور مخلوق کا وجود ہے اور اگر ایسا ہے تو وہ مخلوق کہاں ہے کیسی ہے، وہ کیا زبان بولتی ہے، کیا اس نے ہم لوگوں سے زیادہ ترقی کر لی ہے اور کیا وہ ہم تک یا ہم اس تک پہنچ سکتے ہیں۔

فلکی زندگی کے وجود کا تذکرہ آج مغربی ممالک میں ایک سنجیدہ موضوع بن چکا ہے جس کو ایگزو بائیلوجی (EXOBIOLOGY) یعنی فلکی حیاتیات کا نام دیا گیا ہے۔ اس موضوع پر برسوں سے تحقیق جاری ہے۔ گو کہ ان تحقیقات سے کوئی ٹھوس نتائج سامنے نہیں آئے، بلکہ ایک اختلاف سا پیدا ہو گیا۔ یعنی کچھ سائنس داں تو اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ تمام کائنات میں زندگی کی بے شمار قسمیں موجود ہیں مگر کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم انسان پوری کائنات میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ آیئے کیوں نہ ہم ان سائنسی تحقیقات اور ان کے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے کائنات میں فلکی زندگی کی تلاش کریں۔

ہماری سب سے پہلی منزل ہمارا نظام شمسی ہے جو ظاہر ہے کہ اب ہمارے لیے زیادہ اجنبی جگہ نہیں رہ گئی ہے کیونکہ پچھلے ۲۰ سال کے عرصے میں خلائی علوم میں اتنی ترقی ہوئی کہ آج ہم اپنے نظام شمسی کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہیں جتنا آج سے پچاس سال پہلے خود اپنی زمین کے بارے میں بھی نہیں جانتے تھے۔ ان پچھلے برسوں میں خلائی تحقیق کے لیے زمین سے تقریباً آدھا درجن غیر انسانی خلائی جہاز بھیجے گئے جن میں میرینر ۱۰ (MARINER 10) وائکنگ (VIKING) پائنیر ۱۰ (PIONEER - 10) وائجر ۱ اور ۲ (VOYAGER 1 & 2) وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے ۲ راکٹ تو تمام سیاروں سے گزرتے ہوئے نظام شمسی سے

---

* ۱۵۵، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

،باہر نکل چکے ہیں اور ان ہی کی بدولت آج ہم زمین پر بیٹھے ہی
یہ عطارد کی کھردری وادیوں اور وینس کی پگھلا دینے والی گرم
پ دہوا سے لے کر مریخ کی سرخ مٹی اور جوپیٹر کے شعلوں اور
یبوں تک اور سیٹرن کے گرد بے شمار دائروں سے لے کر یورینس
ورنیپچون کے منجمد سمندروں تک پہنچ چکے ہیں۔

مگر اس طویل جدوجہد اور کھوج کے باوجود بھی دنیا کے
علاوہ نظام شمسی کے کسی بھی سیارے یا چاند پر زندگی کے آثار تو
کیا، کہیں ایسی مناسب آب و ہوا تک نہیں مل پائی جس میں زندگی کی
کوئی بھی شکل وجود میں آسکے اور فرض کیجیے اگر کوئی ایسی مخلوق ہوتی
بھی اور مزید یہ کہ وہ ہماری برابر یا ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی تو
وہ یقیناً ہمارے خلائی جہازوں کو آتا دیکھ کر روکنے کی کوشش
کرتی یا ختم کر دیتی ۔ یا یہ کہ زمینی انسانوں کی تصویریں اور زمین کی
نشان دہی کرنے والے نقشے جو ہمارے خلائی جہازوں میں نصب
کیے گئے تھے ان کو دیکھ کر ہماری طرف آنے یا کوئی پیغام بھیجنے کی
کوشش کرتی، مگر یقین کرنے کی حد تک ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے نظام شمسی میں شاید ہم اکیلے ہی ہیں۔

نظام شمسی کے بعد اب ہم اپنی کہکشاں (Milky Way)
میں آتے ہیں۔ اس کہکشاں کا قطر (DIAMETER) تقریباً ۱۰۰۰۰۰
نوری سال ہے اور سائنس دانوں کے ایک اندازے کے مطابق
ساری کہکشاں ہماری زمین سے تقریباً ۱۰ بلین سال پرانی ہے ۔
اب فرض کیجیے کہ کہکشاں کے کسی بھی ستارے پر اگر کوئی مخلوق موجود
ہے تو وہ ہم سے کم از کم ۴ بلین سال پرانی ہو سکتی ہے ۔ اگر اس
مخلوق کی نشوونما، نشوونما اور تکنیکی ترقی اسی رفتار سے ہوتی
ہے جیسی کہ ہماری ہوئی ہے، تب ظاہر ہے کہ ہم انسانوں کی
طرح اس طویل عرصے میں اس نے بھی سائنس اور ٹکنالوجی میں
ترقی کی ہوگی اور یقیناً ہم سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہوں گے کہکشاں
کی مزید کھوج کے لیے انھوں نے خلائی جہاز بھی بنائے ہوں گے جو
اب تک ہمارے جہازوں سے کئی گنا زیادہ تیز رفتار سے سفر کرتے
ہوں گے ۔ اب اگر ان کے جہاز روشنی کی رفتار کے دسویں حصے

کی رفتار سے بھی سفر کرتے ہیں تو وہ یقیناً ایک بلین سال میں
ساری کہکشاں کو دریافت کر لیں گے اور ظاہر ہے کہ
ہماری زمین سے بھی گزریں گے مگر ابھی تک ایسا بھی نہیں ہوا،
ویسے ایک خیال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ چوں کہ ہماری زمین پر زندگی
کا ارتقا صرف ۴ بلین سال پہلے ہی ہوا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ
وہ لوگ ہماری زمین سے اس وقت گزرے ہوں جب تک یہاں
زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے اور ناامید ہو کر واپس چلے گئے ہوں
لیکن پورے اعتماد کے ساتھ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے
بظاہر امکان یہی ہے کہ ہماری کہکشاں میں بھی زندگی کی کوئی شکل
موجود نہیں ہے۔

اپنی کہکشاں کے علاوہ باقی کائنات کے بارے میں ابھی
ہماری معلومات نسبتاً کم ہیں۔ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہر کہکشاں
میں تقریباً ۱۰۰ بلین ستارے ہوتے ہیں اور پوری کائنات میں
تقریباً ۱۰۰ بلین ہی کہکشائیں ہیں۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اس
حساب سے پوری کائنات میں ستاروں کی کتنی زبردست تعداد
ہے۔ ویسے اپنی کہکشاں کے ستاروں میں بظاہر صرف ایک
ہمارا سورج ہی ایسا ہے جس کے گرد مختلف سیاروں پر مشتمل
ایک مکمل شمسی نظام ہے اور اس میں کم از کم ایک سیارے (دنیا)
پر زندگی موجود ہے۔ چند ماہرین فلکیات کے مطابق کہکشاں کے
دو اور ستاروں "ویگا" اور "برنارڈ" کے گرد بھی سیارے
موجود ہیں مگر ابھی یہ بات صرف ایک تھیوری کی شکل میں ہی ہے
بہر حال اگر ہم یہ مان لیں کہ ہماری پوری کہکشاں میں صرف ایک
سیارے یعنی ہماری زمین پر ہی زندگی موجود ہے اور اس طرح اگر
ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کائنات کی ہر کہکشاں میں صرف ایک سیارے
پر زندگی موجود ہے تو اس طرح پوری کائنات میں لگ بھگ
۱۰۰ بلین سیاروں پر زندگی ہونے کا امکان ہے، مگر یہ بھی
صرف ایک اندازہ ہے، اس میں کہاں تک سچائی ہو سکتی ہے
ابھی کوئی نہیں جانتا۔

ابھی تک ہم نے یہ دیکھا کہ کائنات اور اس کے آگے

جہاں تک ہماری دوربینوں، خلا بازوں اور خلائی جہازوں کی نظریں جاتی ہیں وہاں پر کوئی فلکی مخلوق نہیں ہے۔ اب آیئے ذرا ان سائنس دانوں کی بات پر بھی غور کرتے ہیں جن کے مطابق کافی دور کے ستاروں پر زندگی کے آثار ہیں۔ اس کے لیے پہلے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ زندگی کی بنیاد کیا ہے۔ یعنی وہ کون سے کیمیاوی اجزا ہیں جن کا زندگی یعنی جاندار مخلوق کے ارتقا کے لیے ہونا ضروری ہے ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان اور دوسرے جانداروں کا تمام جسم بہت چھوٹے خوردبینی ذرات یعنی خلیوں (CELLS) پر مشتمل ہوتا ہے ہر خلیے کا ایک مرکز (NUCLEUS) ہوتا ہے جس میں DNA نام کا ایک کیمیاوی مرکب ہوتا ہے جس کو جسمانی زندگی کی بنیاد مانا گیا ہے۔ یہی DNA جانداروں کی ایک نسل سے دوسری نسل میں مختلف جسمانی خصوصیات کو منتقل کرنے کا ذمہ دار بھی ہے۔

زندگی کا یہ بیج یعنی DNA مختلف اجزا (Elements) مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، فاسفورس اور کاربن وغیرہ کا بنا ہوتا ہے۔ سائنسی تحقیقات کے مطابق آج سے چار بلین سال پہلے اپنی زمین پر زندگی کا وجود اس طرح ہوا تھا کہ سازگار ماحول کی موجودگی میں انھی کیمیاوی اجزا نے مل کر DNA مالیکیول بنایا۔ اس DNA نے زندگی کی بنیادی قسموں یعنی بیکٹیریا اور الگا جیسے خوردبینی جانداروں کو تشکیل دیا اور پھر لاکھوں سالوں کی تبدیلیوں سے یہ ذرات مختلف شکلیں بدلتے ہوئے آج کل کے بڑے اور پیچیدہ جانداروں اور انسانوں کے مرحلے تک پہنچے۔ اس بات کو مزید ثابت کرنے کے لیے چند سائنس دانوں نے تجربے کے طور پر ایک فلاسک میں وہی تمام اجزا لیے جو DNA میں شامل ہیں اور پانی کی موجودگی میں ان سے کچھ خاص شعاعیں گزاریں۔ نتیجے کے طور پر فلاسک میں ایک ایسا مرکب وجود میں آیا جو جسمانی زندگی کے خلیوں سے بالکل ملتا جلتا تھا۔ اس تجربے سے [illegible] ثابت ہو [illegible] کہ ہر جگہ یہ تمام عناصر ایک [illegible]

موجود ہوں تو وہاں زندگی کا وجود ممکن ہے۔

اب ہم اپنے موضوع پر آتے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ کائنات میں ہر سمت سے بھی مختلف کہکشاؤں اور ستاروں سے طرح طرح کی شعاعیں یا لہریں نکلتی ہیں جو ہم تک پہنچتی رہتی ہیں۔ تو ہوا یوں کہ سائنس دانوں نے کافی دور کے ستاروں اور کہکشاؤں کا کیمیاوی تجزیہ کیا تو پتہ چلا کہ جہاں سے یہ شعاعیں آرہی ہیں وہاں پر وہ تمام کیمیکلس موجود ہیں جن کے ذریعے زندگی کے بنیادی مادے یعنی DNA کی تشکیل ہوتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ستاروں پر زندگی موجود ہے۔

خلا سے آنے والی ان شعاعوں اور لہروں کو ریکارڈ کرنے اور سمجھنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ زمین کے مختلف خطوں میں ان کو موصول کرنے کے لیے کئی ریڈیو ٹیلسکوپ نصب کیے گئے ہیں۔ امریکہ کا ایک طاقت ور سیارچہ ایراس (IRAS) خلا میں ایسی لہروں کی تحقیق کر رہا ہے اور سائنس داں جلد ہی ایک بڑی خوردبین خلا میں نصب کرنے جا رہے ہیں جس کے ذریعے ان سگنلوں کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ کے کئی ممالک نے مل کر کائنات میں فلکی زندگی کی سنجیدگی سے تلاش کرنے کے لیے باقاعدہ ایک پراجکٹ شروع کیا ہے جس کو SETI یعنی Search for Extraterrestrial Intelligence کا نام دیا گیا ہے۔ اس پراجکٹ میں ہندوستانی سائنس داں بھی کافی دلچسپی دکھا رہے ہیں۔

اس مضمون کی ابتدا میں ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا تھا کہ دنیا میں فلکی مخلوق یا ان کے خلائی جہاز دیکھے گئے ہیں۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ ان میں کتنی حقیقت ہے۔ امریکہ، روس، جاپان، آسٹریلیا اور [illegible] پر [illegible] جن میں [illegible] کے مطابق [illegible] کئی بار مختلف علاقوں میں اڑن طشتریاں [illegible] [illegible]

[illegible] کیا اور پھر خود بخود غائب
ہو گئی تھیں۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ واقعات اس بارے میں
مشہور ہیں۔ مثلاً جنوبی امریکہ میں کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ چند
[illegible] عجیب و غریب خلائی جاندار ان کو اغوا کر کے اپنی اڑن طشتریوں
میں لے گئے تھے اور ان پر سائنسی تجربے کیے۔ بلکہ کچھ تو یہاں تک
کہتے ہیں کہ خلائی مخلوق نے ان کے ساتھ جنسی مباشرت بھی کی۔ مگر
ان تمام عجیب و غریب واقعات پر سائنس دان یقین کرنے کو تیار
نہیں۔ ان کا گمان ہے کہ لوگوں کو نظر آنے والی یہ اڑن طشتریاں
دراصل کسی قدرتی ردعمل کا نتیجہ ہی ہوں گی جیسے ہوا میں برفیلے
کرسٹل، موسم کے غبارے، پتنگ یا آتش بازی یا پھر سورج کی
تیز چمک سے نظر کا دھوکا ہی ہو یا رات کے وقت زمین پر موجود
کسی طاقتور سرچ لائٹ کا عکس ہو۔ جہاں تک خلائی مخلوق سے
ملاقات ہونے کا سوال ہے وہ یا تو اس بات کا دعویٰ کرنے والوں
کی دماغی اختراع ہے یا کسی نفسیاتی بیماری کی وجہ سے نظر کا دھوکا
یا خواب ہی ہو۔

بہرحال اگر وہ واقعی کسی فلکی مخلوق کی اڑن طشتریاں تھیں تو
ممکن ہے کہ وہ ہم سے دوبارہ ملنے کی کوشش کریں۔ یا کچھ دنوں
بعد ان کا خلائی جہاز زمین کے کسی پررونق شہر میں اترے۔ تو
جناب تیار رہیے فلکی مخلوق کے استقبال کے لیے اور آسمان میں
ان کے خلائی جہاز تلاش کرتے رہیے مگر اس بات کا خیال رکھیے
گا کہ کسی بھی اڑنے والی نامعلوم شے کو اس وقت تک اڑن طشتری
نہ سمجھ لیجیے گا جب تک کہ آپ کو اس پر مریخ یا جوپیٹر کی رجسٹریشن
پلیٹ نہ نظر آجائے ورنہ وہ اپنا ہی کوئی جہاز ہو سکتا ہے یا پھر
آپ کی نظر کا دھوکا۔

مسلمانو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو غلام
بنانا چاہتا ہوں۔ میں خود خدا کا غلام ہوں البتہ
خلافت کا بار میرے سر پر رکھا گیا ہے۔ اگر
میں اس طرح کام کروں کہ تم چین سے گھروں
میں سوؤ تو میری سعادت ہے اور اگر میری
خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو
تو میری بدبختی ہے۔ میں تم کو تعلیم دینا چاہتا
ہوں لیکن قول سے نہیں، عمل سے۔ (فتح
قادسیہ کے موقع پر)

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اعلان

کاغذ اور دیگر طباعتی اشیا کی ہوشربا گرانی کی وجہ سے
بادلِ ناخواستہ

تہذیب الاخلاق اور نشانت

کی قیمتوں میں یکم اگست ۱۹۸۹ء سے اضافہ کیا جاتا ہے

ہندوستان میں نئی شرح خریداری کی تفصیل درج ذیل ہے

۱	سالانہ زرِ خریداری	Rs 45/-
۲	سالانہ زرِ خریداری [صرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے لیے]	Rs 30/-
۳	قیمت فی شمارہ	Rs 4-50
۴	حیاتی خریداری	Rs 450/-

تہذیب الاخلاق اور نشانت کے سرپرستوں سے امید کی جاتی ہے کہ وہ مالی ایثار سے کام لیتے ہوئے اس تبدیلی کا خوش دلی سے خیر مقدم کریں گے۔

سرکولیشن انچارج

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۷ (جولائی ۱۹۸۹ء)

علامہ اقبال اور تعلیم

علی احمد *

علامہ اقبالؒ ایک بڑے شاعر اور فلسفی ہی نہ تھے بلکہ ایک ایسے بیدار مغز جہاں بیں تھے جنھوں نے زندگی کے ہر پہلو پر اظہارِ خیال فرمایا۔ ان کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اکثر مصنفین نے ان کی شاعری ہی کو اپنے مطالعے کا موضوع قرار دیا ہے، جس کی وجہ سے ان کی یک رخی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ حالانکہ ایک فلسفی کی حیثیت سے انھوں نے زندگی کے مختلف گوشوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اُن خیالات کا تجزیہ کیا جائے جو انہوں نے شاعری کے علاوہ دیگر موضوعات پر ظاہر کیے ہیں کیوں کہ اُن کی شاعری ان تمام موضوعات کا مکمل احاطہ نہیں کرتی جن پر وہ وقتاً فوقتاً نثر میں اظہارِ خیال کرتے رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے جن دیگر موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے ان میں سے ایک تعلیم کا موضوع بھی ہے۔ اس مقالے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے تعلیمی خیالات کا تجزیہ کیا جائے اور موجودہ زمانے میں ان کی معنویت کو واضح کیا جائے۔

علامہ اقبال کو دورِ جدید کے تقاضوں کا پورا احساس تھا اور وہ اس موضوع پر برابر غور و فکر کیا کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم زندگی کی چہار طرفہ ترقی کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بھی ان ہی خیالات کا اعادہ کیا ہے، لیکن ان کے تعلیمی خیالات کا تجزیہ صرف ان کی شاعری کو ہی بنیاد بنا کر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے ان کے بیانات، تقاریر، خطوط اور مقالوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اس میں دو رائے نہیں ہیں کہ علامہ اقبال بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے انھوں نے تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس کا مکمل احاطہ ایک مقالے میں دشوار ہے۔ اس لیے مقالہ نگار نے ان کے تعلیمی خیالات کے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے:

الف مقاصد تعلیم

ب پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم

مقاصد تعلیم

یہ تعلیم کا اصول ہے کہ تعلیم کسی مقصد کے تحت دینی چاہیے۔ بغیر مقصد کے تعلیم دینا یا حاصل کرنا ایسا ہے جیسے کہ ایک جہاز سمندر میں چل رہا ہے اور جہاز چلانے والے کو اپنی منزل کا پتہ نہیں ہے۔ جس طرح یہ جہاز اپنی منزل پر کبھی نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح بے مقصد تعلیم بھی کسی منزل پر پہنچنے سے قاصر ہے۔ تعلیمی نظام میں مقاصد تعلیم کی بہت اہمیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد پر تعلیم کا نصاب اور تدریس کے طریقے متعین کیے جاتے ہیں جو کسی بھی تعلیمی نظام کی جان ہوتے ہیں۔

* پروجیکٹ آفیسر، مرکز برائے تعلیم مسلسل اور بالغان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کا وفادار بندہ بن جاتا ہے اور دوسری طرف اس کا رشتہ مخلوقِ خدا سے بھی خوش گوار ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ایک مثالی سماج وجود میں آسکتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک تعلیم ہی انسان کی جسمانی اور روحانی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس لیے تعلیمی مقاصد ایسے ہونے چاہییں جن سے طلبا زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں اور ان فرائض کو انجام دے سکیں جو ان پر عاید کیے گئے ہیں — مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا مقصد تعلیم برائے تعلیم نہیں بلکہ طلبا کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔[1]

مغربی ماہرینِ تعلیم نے بھی انفرادیت (Individuality) کو ترقی دینا تعلیم کا اہم مقصد قرار دیا ہے۔ سر پرسی نن (Sir Percy Nunn) لکھتا ہے:

"تعلیم کا مقصد انسان کی انفرادیت (Individuality) کی مکمل نشو و نما ہے۔"[2]

ان کے مطابق تعلیم کے اولین مقاصد میں سے یہ ہے کہ وہ انفرادیت کو ترقی دے تاکہ ایک ترقی یافتہ سماج عالمِ وجود میں آسکے۔

انفرادیت کی ترقی پر زور دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ علامہ اقبال نے تعلیم کے سماجی مقاصد (Social aims) کو نظر انداز کیا ہے اور تعلیم کے انفرادی مقاصد (Individual aims) کے مقابلے میں سماجی مقاصد کو کم اہمیت دی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم کا سماجی مقصد سماج میں ایثار، ہمدردی، یک جہتی، تعاون اور عدل و انصاف جیسی اعلیٰ قدریں پیدا کرنے میں مدد کرتا ہے جس سے ایک مثالی سماج وجود میں آتا ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے کہ ہر شہری اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے اور اپنے فرائض کو صحیح طور پر انجام دے۔

علامہ اقبال نے تعلیم کے انفرادی اور سماجی مقاصد دونوں پر زور دیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ فرد اور سماج کے مفاد میں ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے۔ تعلیمی مقاصد ایسے ہونے چاہییں جن سے ایک طرف تو "خودی" کی ترقی ہو اور دوسری طرف سماجی ترقی بھی ہو۔ دوسرے الفاظ میں تعلیم کے انفرادی اور سماجی مقاصد دونوں میں تطابق ہونا چاہیے۔

تعلیم کا دوسرا مقصد جس پر علامہ اقبال نے زور دیا ہے وہ تہذیب و تمدن کا تحفظ اور اسے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانا ہے۔ اگر تعلیم اس مقصد کو پورا نہیں کرتی تو فرد اور سماج دونوں کا رشتہ ماضی سے منقطع ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں فرد اور سماج اپنے تاریخی تمدن کو فراموش کر دیں گے اور ان کی ساری پیشرفت رک جائے گی۔ اس لیے حقیقی تعلیم وہ ہے جو تہذیب و تمدن کی حفاظت کرے اور اسے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے۔ درج بالا باتوں کی مزید وضاحت علامہ اقبال کے درج ذیل اقتباس سے ہو جائے گی۔

"جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت و دفعِ مضرت، تعینِ عمل و ذوقِ حقائقِ عالیہ، احساسِ نفس کے تدریجی نشو و نما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے، اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے "قومی انا"

کے درمیانی تسلسل کو محفوظ و قایم رکھتی ہے۔"

علامہ اقبال کے اس خیال کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قومی زندگی کی ترقی کا دار و مدار بڑی حد تک تعلیم پر ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تمدنی ورثے کا تحفظ اور اسے آنے والی نسلوں تک پہنچانا قوموں کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ الفاظ خاص طور سے قابل غور ہیں:

"اگر غور سے دیکھا جائے تو اقوام کے لیے سب سے زیادہ مہتم بالشان عقدہ فقط یہ عقدہ ہے (خواہ اس کی نوعیت تمدنی قرار دی جائے، خواہ اقتصادی، خواہ سیاسی) کہ قومی ہستی کا سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قایم رکھا جائے۔ مٹنے یا معدوم ہو جانے کے خیال سے قومیں ویسے ہی خائف ہیں جیسے افراد۔"

پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ مادی وسائل کی کمی ملک کی ترقی میں مانع ہوتی ہے لیکن اس بات کو کم لوگ محسوس کرتے ہیں کہ معاشی اور صنعتی ترقی صرف قدرتی وسائل پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا زیادہ تر انحصار صنعت و حرفت پر ہوتا ہے جو تعلیم ہی کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔

ترقی پذیر ملکوں کے سامنے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ کس طرح سے طلبا کی پیداواری، تکنیکی اور پیشہ ورانہ استعداد کو بڑھائیں۔ یہ صرف ذہن بنانے کی بات نہیں ہے بلکہ طلبا کے اندر یہ استعداد پیدا کرنا مقصود ہے کہ وہ جسمانی کام کو حقیر نہ سمجھیں۔ چاہے وہ کام کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ علاوہ بریں ان کا یہ احساس بھی بیدار کرنا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ انسان جو بھی کام کرے گا وہ اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اچھے سے اچھے طریقے سے کرے گا۔

علامہ اقبال نے صنعت و حرفت کی تعلیم پر بہت زور دیا ہے اور کہا ہے کہ قوموں اور ملکوں کی ترقی کا دار و مدار لوگوں کی پیشہ ورانہ اور تکنیکی استعداد پر ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ خیال ہے کہ:

"اس وقت قومی زندگی کے شرائط میں جو حیرتناک انقلاب آیا ہے، میری رائے میں اس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت و تجارت ہے۔ ایشیائی قوموں میں سے جاپانیوں نے سب سے پہلے اس تغیر کے مفہوم کو سمجھا اور اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینے میں ایسی سرگرمی میں معروف ہوئے کہ آج یہ لوگ دنیا کی مہذب اقوام میں شمار ہوتے ہیں۔ اس امتیاز کی وجہ یہ نہیں ہے کہ جاپانیوں میں بڑے بڑے فلسفی یا شاعر یا ادیب پیدا ہوئے ہیں بلکہ جاپانیوں کی عظمت کا دار و مدار صنعت پر ہے۔"

علامہ اقبال کے مطابق قوموں اور ملکوں کی ترقی کی اصل ہتھیار اور اوزار نہیں ہیں بلکہ صنعت و حرفت میں کام آنے والی صلاحیتیں ہیں۔ انہوں نے پر زور انداز میں کہا ہے کہ جس طرح ملک کی حفاظت کے لیے فوج کی ضرورت ہے، اسی طرح اس مقابلے کے دور میں ملک کو ایسے افراد کی ضرورت ہے جو پیشہ ورانہ اور تکنیکی صلاحیتوں پر دسترس رکھتے ہیں اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"وہ مصاف زندگی جو آج کل اقوام عالم میں شروع ہے اور جس کے نتائج بعض اقوام کی صورت میں یقیناً خطرناک ہوں گے، ایک ایسی جنگ ہے جس کو مسلح سپاہیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے سپاہی وہ ہنرمند دستکار ہیں جو خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے ملک کے کارخانوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں اگر کسی قوم کی قوت کا اندازہ لگانا مطلوب ہو تو اس قوم کی توپوں اور بندوقوں کا معائنہ نہ کرو بلکہ

اس کے کارخانوں میں جاؤ اور دیکھو کہ وہ
قوم کہاں تک غیر قوموں کی محتاج ہے اور کہاں
تک اپنی ضروریات کو اپنی محنت سے حاصل
کرتی ہے۔۳۶

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں سے خصوصاً صنعت وحرفت کی تعلیم کو حاصل کرنے کی پرزور اپیل کی ہے۔ اس لیے کہ معاشی اور صنعتی ترقی کے لیے اس قسم کی تعلیم اشد ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ . . . . مسلمانوں
کو تعلیم کی تمام شاخوں سے زیادہ صنعت کی تعلیم پر
زور دینا چاہیے۔ واقعات کی رو سے میں یہ بات
وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو قوم تعلیم کی اس نہایت
ضروری شاخ کی طرف توجہ نہ کرے گی وہ یقیناً ذلیل و
خوار ہوتی جائے گی؛ یہاں تک کہ صفحۂ ہستی پر اس کا
نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا لیکن افسوس ہے کہ مسلمان
بالخصوص اس سے غافل ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ
وہ اپنی غفلت کا خمیازہ نہ اٹھائیں۔ میں صنعت وحرفت
کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا ہوں اور
اگر میرے دل سے پوچھو تو سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ
میں اس بڑھئی کے ہاتھ، جو تیشے کے متواتر استعمال سے
کھردرے ہوگئے ہیں، ان نرم نرم ہاتھوں کی بہ نسبت بدرجہا
خوب صورت اور مفید ہیں جنھوں نے قلم کے سوا کسی
اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس مضمون کے متعلق
تاثرات کا جو ہجوم میرے دل میں ہے، اسے الفاظ میں
ظاہر نہیں کرسکتا اور یقیناً ان ٹوٹی پھوٹی سطور سے
مافی الضمیر کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

از اشک پیر سید کہ در دل چہ خروش است
این قطرہ ز دریا چہ خبر داشتہ باشد"۳۷

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ نے صنعت وحرفت کی تعلیم پر بہت زیادہ زور دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس پر بھی زور دیا ہے کہ لوگ اسلامی قدروں پر عمل کریں اور وہ ان کی زندگی کا جز بن جائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمیں صنعتی تعلیم پر بھی ضرور اپنی توجہ صرف کرنی چاہیے
جو میری رائے میں اعلیٰ تعلیم سے بھی ضروری ہے۔ صنعتی
تعلیم سے عامۃ الخلائق کی اقتصادی حالت سدھرتی ہے
اور یہی طبقہ قوم کے لیے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہے۔
برخلاف اس کے اعلیٰ تعلیم صرف ان چند افراد کو نفع
پہنچاتی ہے جن کی دماغی قابلیت درجۂ اوسط سے بڑھی
ہوئی ہوتی ہے۔ ہمارے اغنیا کے بذل وجود کا مصرف
ایسا ہونا چاہیے کہ عام مسلمانوں کے بچے ارزاں صنعتی
تعلیم حاصل کرسکیں لیکن صنعتی اور تجارتی تعلیم بلا کسی
اخلاقی تربیت کے بجائے خود کافی و مکتفی نہیں ہے۔ اقتصادی
مقابلے میں تربیت کے اخلاقی عنصر کی کچھ کم ضرورت نہیں
پڑتی۔ اعتماد باہمی، دیانت داری، پابندیٔ اوقات
اور تعاون وہ اقتصادی اوصاف ہیں جو مہارتِ فن
کی برابری کی چوڑ ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے کارخانے
محض اس لیے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو نہ ایک
دوسرے پر بھروسہ تھا اور نہ اصول امداد باہمی ان کا
رہنما تھا۔ اگر ہم اچھے کاریگر، اچھے دکاندار، اچھے اہلِ
حرفہ (اور سب سے بڑھ کر یہ کہ) اچھے شہری پیدا
کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ انھیں اوّل پکا مسلمان
بنائیں۔"۳۸

عام طور سے علامہ اقبالؒ کی شہرت بحیثیت ایک بڑے شاعر کی ہے اور ماہرینِ تعلیم میں ان کا شمار نہیں کیا جاتا ہے حالانکہ ان کے تعلیمی خیالات کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے علامہ کو بحیثیت ماہر تعلیم گہری نگاہ سے نہیں دیکھا چونکہ علامہ اقبالؒ فلسفہ، مذہبی تعلیم اور اسلامی علوم میں ممتاز شخصیت کے حامل تھے انھوں نے تعلیمی مسائل کو اچھی طرح سمجھا تھا جن کو انھوں نے اپنی شاعری، تحریر و تقریر میں جا بجا ظاہر کیا

ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کے ان کارناموں کو اجاگر کرنے کی [illegible] کوشش کی جائے۔

علامہ اقبال کے تعلیمی خیالات کے تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ [illegible]۔ وہ خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم کے [illegible]۔ انھوں نے تعلیم کے مقاصد اور پیشہ ورانہ [illegible] تعلیم پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اگر انہیں عملی جامہ پہنایا جائے تو فرد اور سماج دونوں کی ترقی ہو سکتی ہے۔ ان کے تعلیمی نظریات و خیالات اس قدر سیر حاصل ہیں کہ ان کو بنیاد بنا کر مکمل نظامِ تعلیم بنایا جا سکتا ہے

[شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چہار روزہ "اقبال سیمینار" میں پڑھا گیا۔]

حوالے

۱۔ اس خیال کی ترجمانی انھوں نے اپنے ایک شعر میں کی ہے ؎

"آگہی از علم و فن مقصود نیست　　غنچہ و گل از چمن مقصود نیست"

۲۔ Nun, Sir Percy: "Education: Its Data and First Principles" London, 3rd Edition, 1949. P-13

۳۔ مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی، مطبوعہ اشرف پریس، لاہور، مئی ۱۹۶۳ء ص ۱۹۱-۱۹۲

۴۔ ایضاً　ایضاً　ایضاً　ایضاً　ص۔ ۱۱۹

۵۔ ایضاً　ایضاً　ایضاً　ایضاً　ص۔ ۶۰-۶۱

۶۔ ایضاً　ایضاً　ایضاً　ایضاً　ص۔ ۶۱

۷۔ ایضاً　ایضاً　ایضاً　ایضاً　ص۔ ۶۱-۶۲

۸۔ ایضاً　ایضاً　ایضاً　ایضاً　ص۔ ۱۴۱-۱۴۲

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ کے ڈر سے رونے والے کا دوزخ میں جانا اس طرح مشکل ہے جس طرح دوہے ہوئے دودھ کا تھن میں واپس ہونا اور اللہ کے راستے کا غبار اور جہنم کا دھواں جمع نہ ہوں گے۔"
بخاری

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸، شمارہ ۷، (جولائی ۱۹۸۹ء)

سلامتی کی سرحدیں

عبدالوہاب تسنیم*

فکرِ انسانی کی بلند پروازیاں، بے پایاں اور بے کنار ہی کہی جاسکتی ہیں۔ انسانی تخیل ہر پابندی سے اسی طرح آزاد ہے جس طرح صحرا کی ریت پر چلنے والی ہوائیں۔ انسانی ذہانت اور فطانت بھی آزاد ہے کہ وہ چاہے تو منطقی استدلال سے مستفید ہو یا چاہے تو غیر منطقی طرزِ عمل اختیار کرے۔ بالفاظِ دیگر ہر آدمی کا یہ حق ہے کہ وہ جب چاہے من موجی رویہ اختیار کرے۔ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار جس طرح چاہے کرے۔ وہ جب چاہے تعصب، تنگ نظری، فخر و کبر، حرص و آز، بے صبری، عیاشی اور خود غرضی کو اپنالے۔ اپنے نفسِ امارہ کو اپنا رہبر بنالے اور اپنی ہر طرح کی بھوک اپنے من مانے طریقوں سے مٹالے۔ امکانات کا ایک وسیع میدان ہے جو اس کے سامنے کھلا پڑا ہے۔ اسے اختیار ہے کہ جو طرزِ عمل چاہے اپنائے جہاں چاہے اپنا منہ مارے۔

اس کھلی آزادی پر اگر کوئی پابندی ہے تو بس ان نتائج کی پابندی ہے جو مذکورہ راہ و روش سے مستزاد ہوتے ہیں۔ آزادیٔ فکر و عمل اور اس کے نتائج کے درمیان جو سرحد ہے وہ کہیں واضح اور کہیں مبہم ہے۔ اس سرحد کے باعث [illegible] کے اس کارخانے کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ آزادیٔ فکر و عمل کا ہے اور دوسرا حصہ اُن چیزوں کے لازمی نتائج کے نمودار ہونے کا ہے۔

ہمارے اسلاف میں ایک روایتی ذہانت تھی جو تجربوں سے حاصل شدہ نتائج سے کام لیتی ہوئی مخدوش راہ و روش کی نشان دہی کرتی تھی۔ سدِّباب ذریعہ کے لیے مذہبی یا سماجی پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ آج اس ذہانت کو ہم نے عملاً بھلا دیا ہے۔ اس کی قائم کردہ ممنوع اور مباح کی درمیانی سرحد کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آج ہماری اکثریت اپنی آزادیٔ فکر و عمل کو تلخ تجرباتِ عمل سے عبرت کے بغیر استعمال کرنے سے یا تو ناواقفِ محض ہے، یا "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" میں مبتلا ہے۔

سائنس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اس سرحد کی نشاندہی کرے جس کے ادھر انسانی زندگی کے لیے امن اور سلامتی ہے اور ادھر تباہی اور بربادی۔ کیمسٹری اور فزکس کے اصول و ضوابط کی جانکاری سے اپنی سلامتی کی سرحد پہچان لینا ہر کسی کے لیے آسان ہے۔ ایک بچہ بھی صرف اپنے مشاہدے سے یہ حقیقت پالیتا ہے کہ وہ پانی پر، پانی کے بھونرے کی طرح چل نہیں سکتا۔ وہ ایک تنکے کی طرح ہوا میں اڑ نہیں سکتا۔ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی دوسروں کے تجربات سے یہ سبق حاصل کرلیتا ہے کہ آگ جلاتی ہے مگر [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

* لکچرر اردو، وی۔ آر کالج، نیلور ۵۲۴۰۰۱۔

... دیکھیے ہے۔ حالانکہ یہ بھی ایک سائنس ہے مگر یہاں ایک عام آدمی اس بات کا عرفان نہیں رکھتا کہ بجز گوشت یا کیک کے ... رکھنا بھی پانی پر چلنے کی کوشش کی طرح ایک عذاب جان ... عادت ہے۔

فزیالوجی کے اصول وضوابط سے بے اعتنائی عوام ہی میں نہیں خواص میں بھی پائی جاتی ہے۔ شراب اور سگریٹ کی عادتیں عورت کو اپنا کمزوری کا حیلہ بنا کر، ہر جگہ منہ کالا کرنے کی لت' کیا فزیالوجی کے اصولوں سے عملاً ایک مذاق نہیں ہے؟ عملاً اس مذاق کی عادت صرف اس لیے پھیلتی اور بڑھتی جارہی ہے کہ فزیالوجی کے اصولوں کو توڑنے والوں کو اس کی سزا فوری طور پر نہیں ملتی۔ جیسا کہ فزکس اور کیمسٹری سے عملاً مذاق کرنے والوں کو مل جاتی ہے۔ ہر کیے کی ایک سزا یا جزاء صرف مذہبی عقیدے تک محدود رکھو اہو۔ کیا سائنس کی دنیا میں ہم اس کا مشاہدہ نہیں کر رہے ہیں؟ یہ بات دوسری ہے کہ کہیں یہ معاملہ "اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" پر کاربند ہے۔ اور کہیں "آج نہیں تو کل سہی" کے جلوے دکھاتا ہے۔ فزیالوجی کے اصولوں کو توڑنے والوں کو اس کی سزا نسل در نسل بعد بھی مل سکتی ہے۔

قانون فطرت اور شخصی آزادی کے درمیان جاری جنگ میں آج کا ہر آدمی بُری طرح مبتلا ہو گیا ہے۔ آزادی۔ یعنی بے قید آزادی۔ ڈائنامیٹ کی طرح ایک خطرناک چیز ہے۔ غیر مقید اور غیر محتاط استعمال خود اس کے اپنے لیے ہی نہیں بلکہ اس کے اپنوں کے لیے بھی ہلاکت ثابت ہو سکتا ہے۔

فزیالوجی میں ممنوع اور مباح کے درمیان جو سرحد ہے وہ اکثر غیر محسوس رہتی ہے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ہم آزادی کے نام پر آوارگی کا شکار ہوں، اعتدال کے راستے پر گامزن ہیں اعتدال کا راستہ بقول کسے بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ اس لیے اکثر لوگ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں مگر انسانیت کی عافیت افراط و تفریط میں نہیں اعتدال ہی میں ہے۔ اسی لیے آزادئ فکر وعمل کو بھی اعتدال پر لانا از حد ضروری ہے۔

زندگی میں کامیابی کے لیے شخصی آزادی اور فطری قوانین کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے۔ اس ہم آہنگی یا یگانگت کے لیے بھی ہمیں اپنی بے قید آزادی پر لازمی پابندیاں عائد کرنی ہی ہوں گی۔ یعنی اپنی آزادی کی تھوڑی سی قربانی دینی ہی ہوگی۔

قربانی۔ دنیوی زندگی میں۔ چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اعتدال پیدا کرنے کا ایک موثر آلہ ہے۔ ایک ماں کے لیے بچوں کی پیدائش' ان کی دیکھ بھال۔ ان کی تعلیم وتربیت مسلسل قربانیوں کی ایک داستان ہے اسی طرح ایک آرٹسٹ، ایک فن کار۔ ایک کھلاڑی۔ ایک سائنس داں اپنی اپنی کامیابی کے لیے مسلسل ریاض اور سخت سے سخت امتحان سے گزرنا ہے۔ ریاض یا امتحان کا یہ دور۔ مسلسل قربانیوں کا متقاضی رہتا ہے۔ بعینہٖ صحت مند اور خوش حال زندگی کے لیے بھی ہمیں اپنے بہت سے مزخرفات اور مزعومات کی قربانی دینی ہی ہوگی۔

[ایک انگریزی مضمون سے آزاد استفادہ کے ساتھ]

"حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھتے ہوئے مرو۔"

(مسلم شریف)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۷ (جولائی ۸۹ء)

ادائیگیٔ فرض برائے ادائیگیٔ فرض

حبیب الحق انصاری

بے لوث عمل

قوموں کی تہذیب الاخلاق میں ادائیگیٔ فرض برائے ادائیگیٔ فرض کا تصور کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پانچ ہزار برس قبل گیتا میں جو پیش کردہ نشکام کرم کا تصور اسی ادائیگیٔ فرض برائے ادائیگیٔ فرض کے تصور کا ایک روپ تھا۔ شریمد بھگوت گیتا کے اپنے الفاظ میں

کرے فرض کو فرض اگر جان کر
تعلق ہو اس سے نہ فکر ثمر (۱۸/۹)

تو رکھ دل پہ قابو کیے جا عمل
کیے جا عمل، چھوڑ دے ان کے پھل (۱۲/۱۱)

ہے تیاگی وہی تارکِ باعمل
عمل جو کرے چھوڑ کر ان کے پھل (۱۱/۱۱)

وغیرہ۔

خلوص

بے لوث عمل کی اخلاقیات میں خلوص کی بڑی اہمیت ہے۔ خلوص وہی خاصیت ہے جسے مشہور جرمن فلسفی کانٹ ۱۷۲۴ تا ۱۸۰۴ء) 'گڈ ول (Good will) کا نام دیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ بے لوث عمل میں مسرت پانے یا افادیت مندی کی کوئی گنجائش ہی نا ہو لیکن بطورِ مقصد عمل مسرت صرف مشروط طور پر ہی ایک اچھائی ہوتی ہے۔ جب کہ اخلاصِ عمل ہر صورت میں ایک اچھی چیز ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جہاں کل خواہشیں اور کل مسرتیں اخلاقی طور پر متبادل ہوتی ہیں وہاں ادائیگیٔ فرض برائے ادائیگیٔ فرض کا بنیادی تعلق خلوص سے ہوتا ہے جس کے پس پردہ دراصل اخلاقی قانون کے تئیں قدر و منزلت کا وہ جذبہ ہوتا ہے جو بقول کانٹ انسانی وجود کا خاصہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے اخلاقی عمل کا تعلق منشا اور نیت سے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہم ایک بزنس مین کی ایمان داری کی کوئی تعریف اس وقت نہیں کرتے جب وہ محض اس لیے ایمان دار بن جاتا ہے کیونکہ ایسا کرنا ایک اچھی بزنس پالیسی ہوتی ہے، جب کہ اس کا اصل منشا زیادہ سے زیادہ نفع کمانا ہی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض ادبی طور پر اچھائی کا ہونا کسی عمل کے بے لوث عمل کہلانے کے لیے ناکافی ہے۔

خدا سے محبت

جہاں تک محبت کا تعلق ہے یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو اکثر نہایت بلند اخلاقی کاموں اور ذاتی قربانیوں کے کارنامے کی تحریک عمل کے طور پر سامنے آتا ہے لیکن محض کسی کی محبت تو آدمی سے بُرا کام بھی کروا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جسے ادبی اخلاقی قانون کی قدر و منزلت کے جذبے سے موسوم کیا گیا، عین ممکن ہے، بعض لوگوں کے نزدیک

ریسرچ آفیسر، ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

خداکی محبت ہی کا دوسرا نام ہوتا ہو۔ بالفاظ دیگر بے لوث عمل سے مراد عمل فی سبیل اللہ ہے۔ بھگوت گیتا اس خیال کو یوں ادا کرتی ہے:

وہ جو ذات حسین سے خدا کی ہوئی
جو سارے جہاں پر ہے چھائی ہوئی
اسی کی پرستش ہے تحصیل فرض
ہے تکمیل انساں کی تکمیل فرض ۱۸/۴

وہ جو بے تعلق کرے جب عمل
خدا ہی کی خاطر کرے سب عمل ۱۰/۵

یہ بھی ممکن ہے کہ تربیت کے ذریعے خلوص کے جذبے کو ابھارا جائے۔ چنانچہ حسرت موہانی کا شعر ہے

ذکر و فکر و ریاض و صوم و صلوٰۃ
سارے جھگڑے ہیں اک برائے خلوص

اور چونکہ خلوص کا مقصد حصول خوشنودی خداوندی ہے تو حسرت کہتے ہیں

اور حقیقت میں ان کے سب کے سوا
عشق ہے اصل مدعائے خلوص

آفاقیت اور افادیت

اخلاقیات کا بنیادی سوال یہ ہے کہ کون سے اعمال نیک افعال ہیں اور وہ کیوں نیک سمجھے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا امور کی روشنی میں ہم اس بات کا فیصلہ عمل کے اچھے یا برے نتائج دیکھ کر نہیں کر سکتے۔ مثلاً گیتا کہتا ہے:

جو ہو کامیاب تو خوش تو ناخوش نہ ہو
اگر کامیابی ہو ذرا خوش نہ ہو ۱۸/۲۰

اس سے جڑا ہوا ایک سوال یہ ہے کہ آیا اخلاقی اصول سائنس کے اصولوں کی طرح تجربی طور پر یا وجدان سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ جیسے [illegible] کہا جاتا ہے) یا یہ اصول تجربے اور مشاہدے سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ کانٹ کے مطابق اخلاقی اصول کا استنباط وجدانی طور پر ہوتا ہے تاکہ تجرباتی طور پر مشاہدے کو عمومی بنا کر۔ خود تصوف کے مطابق کشف کے وجدانی طریقہ ادراک کی مدد سے اخلاقی اصول بھی اخذ کیے جاتے ہیں اور اس دائرۂ فکر کو وجدانیات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک [illegible] معلومات کی سچائی کے ثبوت کا تعلق ہے تو یوں کہا جاتا ہے کہ ان کو آفاقی بنا دیا جائے تو کوئی منطقی تناقض نہیں ہوتا۔ اس بنا پر کانٹ کا مقولہ ہے:

"یوں عمل کرو کہ جیسے تمہاری قوت ارادہ سے تمہارے عمل کا ضابطہ ایک آفاقی قانون بننے جا رہا ہے۔"

چنانچہ جب ہم ایسے اصولوں کے مطابق عمل کرتے ہیں جنہیں سب کے لیے لاگو نہیں کیا جا سکتا تو ہم برائی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک چور یہ کبھی نہیں چاہتا کہ دوسرے اس کے پاس سے چوری کریں بلکہ وہ دراصل یہ چاہتا ہے کہ چوری نا کرنے کے اصول کے توڑنے کی حد تک اُسے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔ اس کی یہی خود غرضانہ طور پر خود کو مستثنیٰ بنا لینے کی چاہ ہی دراصل اس کی بدکاری کی دلیل ہوتی ہے۔

دیکھا جائے تو کسی بھی اخلاقی امر میں آفاقیت کا امکان موجود ہوتا ہے۔ البتہ لوگوں کی انفرادی نفسیات یا خارجی عوامل کے مختلف ہونے کی وجہ سے فرق آ سکتا ہے۔

گیتا کا قول ہے:

فرائض جُدا سب کی خصلت جُدا
کہ فطرت نے کی سب کی طینت جُدا ۱۸/۴۱

اس طرح اگر ایک ہی طبعی اور نفسیاتی حالتوں کو فرض کر لیا جائے تو اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ افعال کا ہر کسی کے لیے ہمیشہ نیک یا ہمیشہ بد ہونا ممکن ہے۔ چنانچہ کانٹ کہتا ہے کہ

"جھوٹ بولنا کبھی درست نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ایسا کرنے سے کسی قاتل سے کسی انسانی زندگی کا بچاؤ ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔"

غور کیجیے کہ اگر آپ اِس اصول کو نہیں مانتے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ آپ آفاقی اخلاقی اصولوں کو ان کے عملی نتائج کی روشنی میں بھی رد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اخلاقیات کی اساس اس درجہ وجدانی نہیں رہ جاتی، جتنا کہ اوپر فرض کر لیا گیا۔ کئی مفکر ایسے ہیں جن کے مطابق بعض مخصوص حالتوں میں سچ بولنے یا ہمیشہ پیار کرنے کے اصولوں سے انحراف جائز ہے لیکن کانٹ ایسی باتوں کے قطعی خلاف ہے۔ چنانچہ یہاں کانٹ سے مکمل اتفاق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک سفارت کار اگر ایک جھوٹ بول کر ایک ہولناک جنگ کے ہونے کو روک سکتا ہے تو یہاں یہ مانتے ہوئے بھی کہ جھوٹ بولنا بُرا کام ہے، اِسے بہر حال ایک غلط کام نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں ایک کم تر برائی سے ایک بڑی بُرائی کا سدِّ باب کیا جا رہا ہے لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ اس طرح کی عذر داری کو توڑ مروڑ کر تاریخ میں بڑے بڑے جرائم اور مظالم کا ارتکاب بھی کیا جاتا رہا۔

انسان دوستی

نیکی کی قدر و منزلت کو ایک آفاقی بدیہی اصولِ فطرت مانتے ہوئے جو ضابطۂ میات کانٹ تجویز کرتا ہے وہ اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> "یوں کرو کہ خود اپنے میں اور ہر کسی دوسرے انسان میں انسانیت کو ہمیشہ ایک مقصد کے طور پر نہ کہ محض ایک ذریعہ سمجھ کر روا رکھو۔"

یہ جملہ انسان دوستی کی بہتر تعریفوں میں سے ایک یاد کیا جاتا ہے اس کی رو سے انسان محض ایک ذریعہ نہیں بلکہ ایک نتیجۂ ایک مقصد نیز نتیجہ فطرت کا شاہکار اور اس کی عظمت کا نقیب ہے۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ادائیگیٔ فرض برائے ادائیگیٔ فرض میں ہم اپنے اعمال کے نتائج سے کلیتاً بے بہرہ نہیں رہ سکتے۔ اس کے برخلاف ہمیں انسان دوستی کی کسوٹی پر اپنے اعمال کو اُن کے نتائج کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جو عصرِ حاضر کی حریت پسندانہ اور جمہوریت نواز قدروں کا دور کہلاتا ہے۔ جہاں غلامی کے دستور، ایک فرد کا دوسرے یا ایک فرد کا ریاست یا حکومت سے استحصال، انسانی حقوق کی پامالی دوسروں کی قدر و منزلت سے انکار وغیرہ سب باتیں مذموم قرار پاتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انسانیت کے مفہوم کی مزید وضاحت بھی ممکن ہو جاتی ہے اور اس طرح ہم اپنے آپ کو نئے سانچوں میں ڈھال کر ارتقا کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کر سکنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر ہم پاتے ہیں کہ اخلاقی اصول کی صداقت کے لیے جہاں ہم وجدان اور تجریدی فکر پر انحصار کرتے ہیں تو وہاں ان کا افادیت کی کسوٹی پر پرکھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے اور اس طرح انسان دوستی وہ بنیادی فلسفہ بن کر سامنے آتا ہے جو دورِ حاضر کی اخلاقیات میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

حوالے

۱۔ گیتا (منظوم ترجمہ) از خواجہ دل محمد

۲۔ اے۔ سی۔ ایونگ A.C. Ewing "Ethics"

The English Universities Press Ltd. London (1964).

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ج ۸، ش ۷، (جولائی ۸۹)

تجرباتی سائنس میں مسلمانوں کی خدمات

عرفان احمد

آج سائنس کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ عقل وفکر ہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو ایک انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے اسی عقل وفکر کے سہارے انسان دنیوی اور اُخروی ترقی حاصل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار صراحتاً تفکر کا حکم دیا گیا ہے۔ مخلوقات میں غور وفکر کرکے کائنات کے مقصد تخلیق کو سمجھنے اور پھر خالق تک رسائی حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ انسان کائنات کے اندر کارفرما قوانین کا پتہ لگانے کے لیے اپنے دو بنیادی وسائل پر اعتماد کرتا ہے یعنی مشاہدہ اور تجربہ۔ صرف عقل کی بنیاد پر حقائق دریافت کرنے کو آج کی سائنس کی نگاہ میں بے وزن سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ آج کی اصطلاح میں سائنس اس مجموعہ علم کا نام ہے جو مشاہدات وتجربات پر مبنی ہو۔

مسلمانوں سے پہلے اہل یونان اور روم صرف قیاس کے ذریعے حقایق دریافت کیا کرتے تھے۔ آج کی سائنس پر مسلمانوں کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اسے تجربات پر استوار کیا۔ یونانی علما تجربات کے ذریعے حقایق دریافت کرنے کو معیوب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یونانیوں نے اس مجموعۂ علم کا نام فلسفہ رکھا تھا۔ جس کے لغوی معنیٰ عقل پسندی کے ہیں۔ یہ اصطلاح آج بھی سائنس دانوں کو اس قدر محبوب ہے کہ تحقیقی ڈگری کے لیے "ڈاکٹر آف سائنس" کے بجائے "ڈاکٹر آف فلاسفی" (Ph.D) ہی استعمال کرتے ہیں۔ بہرکیف یونانی سائنس دانوں نے عقل پسندی کے ایسے مہمل کرشمے دکھائے جن کو پڑھ کر آج ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ارسطو کا دعویٰ تھا کہ دریائے نیل کے کیچڑ میں چوہے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اس نے کبھی اس دعوے کی تصدیق کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ اسی طرح اس نے دعویٰ کیا کہ دو مختلف اوزان کے گولے ایک ہی بلندی سے گرانے پر بھاری گولا ہلکے گولے سے پہلے زمین پر آگرے گا لیکن اس کو کبھی تجربہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس نے کسی انسانی لاش یا اس سے ملتے جلتے جانور کے قلب کو چیر کر دیکھے بغیر یہ قیاس آرائی کی کہ انسانی دل کے دو بطینوں کے درمیان پائی جانے والی دیوار میں سوراخ ہوتا ہے یونانی سائنس دانوں کی ایک میٹنگ میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ گھوڑے کے کتنے دانت ہوتے ہیں۔ صرف عقلی گھوڑے دوڑائے جا رہے تھے جب کہ باہر ایک درجن سے زائد گھوڑے صرف ان سائنس دانوں کے ہی بندھے ہوئے تھے۔ شامت کے مارے ایک سائنس داں نے ڈرتے ڈرتے جب یہ پیش کش کی کہ باہر نکل کر دیکھ لیا جائے تو اسے ذلیل کرکے میٹنگ سے نکال دیا گیا۔ جب ہم تاریخ سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم کرکے حیرت ہوتی ہے کہ کسی یونانی سائنسداں نے کبھی کوئی لیبارٹیری قایم نہیں کی۔ ارسطو، جالینوس، ارشمیدس سب کے سب محض عقل کی بنیاد پر دریافتیں کیا کرتے تھے۔ اگر ان کی کوئی دریافت تجرباتی رہی بھی تو یہ محض اتفاق کا نتیجہ تھا۔ مثلاً ارشمیدس کا حوض میں غسل کرتے ہوئے جسم کو ہلکا محسوس کرنے پر قانون تفلز

* شعبۂ طبعیات، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ، یو۔پی

نوعی وزن (specific gravity [illegible]) کی دریافت یا اس قسم کی چندگنی چنی دریافتیں یا مشاہدات جو وہ ستاروں اور دیگر مظاہر قدرت کے سلسلے میں کیا کرتے تھے۔ مختصراً یہ کہ یونانیوں نے سائنس کی ترویج تو کر دی لیکن اس سے ان کی دلچسپی صرف منطق کی حد تک تھی۔ ان کے یہاں مشاہدات و تجربات کی کمی تھی۔ اسی طرح اہلِ روم صرف سائنس کی افادیت کے قایل رہے۔ اس کے برعکس چونکہ مسلمانوں نے سائنسی تحقیق کی بنیاد تجربے پر رکھی تھی؛ اس لیے تقریباً تمام مسلمان سائنسدانوں کے پاس ذاتی یا سرکاری تجربہ گاہیں یا رصدگاہیں تھیں۔ یہ صرف مسلمان تھے جنھوں نے سائنسی نظریات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھا اور جدید سائنس کے لیے راہ ہموار کی۔ بلاشبہ انھوں نے قیاسی باتیں بھی کیں لیکن صرف ان امور کے بارے میں جنھیں تجربہ گاہ میں پرکھنا اس زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ آج بھی ایسے امور میں جنھیں تجرباتی طور پر پرکھنا ممکن نہ ہو، قیاس کی بنیاد پر رائے دی جاتی ہے جسے جدید اصطلاح میں نظریہ کہا جاتا ہے۔ یورپ کا ایک بیدار مغز مفکر رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

> "سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے اور پیمایش و مشاہدے کے نئے ڈھنگ ہیں۔ تفصیلی مشاہدات اور تجرباتی تحقیقات یونانی مزاج کے بالکل ناموافق تھے۔ ۔ ۔ یورپ میں تجرباتی سائنس کا سہرا عربوں کے سر ہے۔"

یونانی سائنس کا محض نظریاتی طریقوں تک محدود رہنے کی اصل وجہ اس کا نجوم اور دیومالا کو بے جا اہمیت دینا تھا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے یہاں علم کا بنیادی ماخذ قرآن مجید اور تعلیمات نبوی ہیں۔ قرآن کریم نے یقین (علم) کے تین استقائی پیمانے مقرر کیے ہیں۔

۱۔ علم الیقین: یعنی استدلال کے ذریعے علم حاصل کرنا۔

۲۔ عین الیقین: یعنی [illegible] کے ذریعے [illegible] کرنا۔

۳۔ حق الیقین: یعنی تجربے کے ذریعے علم حاصل کرنا

اسلام نے علم صحیح (سائنس) کی بنیاد ہی حواس کی علامت پر رکھی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

> "کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو، جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب کی بازپرس ہونی ہے۔"

اس آیت کی رو سے آنکھ کان (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل ہوتی ہے اور پھر دل اس کی تصدیق کر کے مرتب شکل دیتا ہے۔ امام غزالیؒ نے علوم کے ان تین درجات میں دوسرا درجہ تجرباتی علم کو دیا ہے۔ جب اسلامی فکر شدید اختلاف کا شکار ہو کر دو گروہوں معتزلہ اور اشعریہ میں تقسیم ہوئی تو ان مسلمان مفکرین نے جو ارسطو کی عقلیت پسندی کے پیروکار تھے، ہر قسم کے علوم کو مشاہدے اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح صرف انھیں نظریات کو استنباطات کی اہمیت حاصل ہوئی جو [illegible] اور تجربات پر کھرے اترے۔ بقول سید حسین نصر مسلمانوں نے ارسطو کی قیاسی مابعد الطبیعیاتی علت کو تجرباتی علت میں بدل دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جس زمانے میں یورپ علم اور سائنس کے خلاف جنگ لڑنے میں معروف تھا تحصیل علم پر پابندیاں عاید تھیں۔ پوپ کی اجازت کے بغیر انجیل پڑھنے کی ممانعت تھی۔ شہنشاہ افلس اور اسکندریہ کے کتب خانے نذر آتش کیے جا رہے تھے. کلیسا کی طرف سے پاپائے روم کے اس نظریے کا پرچار کیا جا رہا تھا کہ "جہالت تقویٰ کی ماں ہے"، اسی زمانے میں بلاد اسلامیہ میں سائنس کی فروغ و ترقی کا کام ہو رہا تھا۔ جب یورپ میں طب کو حرام قرار دیا جا رہا تھا، مسلمان سائنسداں جراحی میں کلوروفارم استعمال کر رہے تھے۔ جس وقت یورپ [illegible] دیا روشن نہیں تھا اور وہاں کتاب تک رکھنا جرم قرار دیا جاتا تھا، اس وقت مسلمان مفکرین ارسطو [illegible] [illegible] کے [illegible]

[illegible] تحقیق کی [illegible]

اصلاح کی۔

مندرجہ ذیل سطور میں ہم مختصراً کچھ مسلمان سائنس دانوں کے سائنسی انکشافات اور ایجادات کا ذکر کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور کے عظیم الشان سائنسی کارناموں کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں جارج سارٹن کی مشہور کتاب "مقدمہ تاریخ سائنس" بہت اہم ہے جس میں مسلمانوں کے اس زریں عہد کی سائنس کا تعارف کرایا گیا ہے۔

علم جغرافیہ

مامون کے دور میں عرب جغرافیہ دانوں نے زمین کے گول ہونے کا اعلان کیا۔ انھوں نے پتہ لگایا کہ زمین سے اٹھادن میل بلندی تک ہوا ہے اور اس کے اوپر خلا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد بھی کئی یورپین مفکرین خلا کے وجود سے ہی انکار کرتے رہے۔ الکاتبی نے زمین کی روزانہ محوری گردش کو ممکن ثابت کیا۔ الحسن المراکشی نے ۱۲۲۹ء میں ۱۳۵ مقامات کے عرض بلد اور طول بلد معلوم کیے۔ البیرونی (۱۰۴۸ء) نے زمین کا محیط پکارد سے سات سو سال پہلے تقریباً پچیس ہزار میل معلوم کر لیا تھا۔ رباعیات کا شاعر عمر خیام (۱۱۳۱ء) نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا کہ سال میں ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے اور ۴۹ سکنڈ ہوتے ہیں۔ اب مدت ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے اور ۴۸.۷ سکنڈ مانی گئی ہے۔ اس نے لیپ ایر (Leap year) ایجاد کر کے شمسی کیلنڈر کی تصحیح بھی کی۔ موجودہ شمسی کیلنڈر میں ۳۳۰۰ سال بعد ایک دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔ جب کہ عمر خیام کے مرتب کردہ کیلنڈر کے مطابق ۳۳۰۰ سال بعد صرف چھ گھنٹے کا فرق پڑتا ہے اس لیے عمر خیام کا مرتب کردہ کیلنڈر مروجہ شمسی کیلنڈر سے زیادہ بہتر ہے۔ الفرغانی (۸۶۳ء) نے زمین کے قطر کی لمبائی ۶۵۰۰ میل معلوم کی اور سیاروں کے بیچ فاصلے اور ان کے قطر معلوم کیے۔

علوم ریاضی و ہیئت:

علوم ریاضی و ہیئت میں مسلمانوں نے خصوصی دلچسپی دکھائی۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی (۸۵۰ء) نے جو یورپ میں ریاضی اور ہیئت کا امام تسلیم کیا جاتا ہے، علم الحساب میں الجبرا کا اضافہ کیا اور اپنی مشہور کتاب "الجبر والمقابلہ" لکھی جو اٹھارویں صدی تک یورپین یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل رہی۔ اس نے الجبرا میں سہ درجی مساوات کا حل نکالا۔ البتانی (۹۲۹ء) نے علم مثلث (Trigonometry) کی ایجاد کی۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ سورج کے گرد زمین جس مدار (Orbit) پر گھومتی ہے وہ ایک دائرہ کی طرح گول نہیں بلکہ بیضوی شکل کا ہے، جس کے دو مرکز ہیں۔ سورج اُن میں سے ایک مرکز پر ساکن ہے۔ اس وجہ سے زمین کی گردش کے دوران ایک مقام ایسا آتا ہے، جہاں سورج زمین سے سب سے زیادہ فاصلے پر آجاتا ہے۔ ماہر فلکیات عبدالرحمٰن الصوفی (۱۰۰۹ء) نے اپنی مشہور کتاب "صورۃ الکواکب" لکھی جو اس کے مشاہدات پر مبنی ایک بالتصویر کتاب ہے۔ اس کی بعض حیرت انگیز دریافتیں آج بھی تسلیم کی گئی ہیں۔ نصیرالدین طوسی نے ۱۲۵۹ء میں اپنی کتاب "شکل القطاع" لکھی جس میں علوم ہندسہ اور مثلث کے جدید ترین مسائل ہیں۔ حجاج بن یوسف مطر (۸۳۳ء) نے ایک جامع کتاب "مقدمات اقلیدس" لکھی جس کا ترجمہ ۱۸۹۳ء میں ڈنمارک سے شائع ہوا۔ الخوارزمی نے ہندسوں میں صفر کا اضافہ کیا اور الجبرا میں منفی کی علامت شامل کی۔ اس نے کرۂ ارض اور اجرام فلکی کا سب سے پہلا نقشہ تیار کیا اور زمین کی جسامت معلوم کرنے کا نیا طریقہ معلوم کیا۔ حاسب (۸۳۰ء) نے ٹرگنو میٹریکل نقشہ (Trigonometrical Tables) تیار کیا جو آج بھی بنیادی طور پر کام آ رہا ہے۔

علم طب:

علم طب میں مسلمان سائنس داں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ابن سینا (۱۰۳۸ء) کی کتاب "القانون" بصری (۸۶۹ء) کی "الحیوان" اور ابوالقاسم الزہراوی (۱۰۰۴ء) کی کتاب "جراحی" سترھویں صدی تک یورپی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب رہیں۔ ابوالقاسم الزہراوی دنیا کا پہلا نامور سرجن تھا جس نے انسانی اعضا کی تحقیق کے لیے پوسٹ مارٹم پر زور دیا۔ پتھری

نکالنے کے لیے جسم کا جو مقام اس نے آپریشن کے لیے تجویز کیا تھا، اس پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "التصریف" میں ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے، اترے ہوئے جوڑوں کو چڑھانے ناکارہ عضو کو کاٹنے اور ہر قسم کے پھوڑوں کو چیرنے کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں دانت، آنکھ، حلق، مثانے، بواسیر کے آپریشن کے ساتھ ساتھ سر کے آپریشن کا بھی بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس نے سرطان (Cancer) پر بھی تحقیق کی اور بتایا کہ کینسر کے پھوڑے کو ہرگز نہیں چھیڑنا چاہیے، وہ خطرناک بن جاتا ہے۔ وہ جراثیم کے نظریے سے بھی واقف تھا اور جراثیم کش دواؤں کی اہمیت پر زور دیتا تھا۔ رازی (۹۲۵ء) نے چیچک کا ٹیکہ ایجاد کیا۔ چیچک اور خسرہ پر اپنا رسالہ "کتاب الجدری والحصبہ" لکھا جو دنیا میں وبائی امراض پر پہلی کتاب ہے اور جس کا ترجمہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے۔ تھرمامیٹر کے موجد اور طب کی بائبل "القانون" کے مصنف ابن سینا نے تپ دق کو متعدی مرض قرار دیا۔ اس نے جلدی اور جنسی امراض عصبی بیماریوں وغیرہ کے متعلق نئی باتیں دریافت کیں۔ اپنی کتاب میں اس نے انتڑیوں میں پیدا ہونے والے کیڑوں اور ان سے ظاہر ہونے والی بیماریوں کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ابن رشد (۱۱۹۸ء) نے اپنی مشہور کتاب "الکلیات فی الطب" میں تحقیق و تجربے کے بعد یہ ثابت کیا کہ اگر کسی شخص کو چیچک نکل آئے تو ہمیشہ کے لیے وہ اس مرض سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ابن بیطار (۱۲۴۸ء) نے کئی ملکوں کا سفر کر کے ہزاروں جڑی بوٹیاں جمع کیں اور ان کے خواص اپنی شہرہ آفاق کتاب "الجامع فی الادویہ المفردہ" میں لکھی جو علم نباتات پر اہم ترین تصنیف ہے۔ یعقوب الکندی (۸۷۳ء) نے اپنے زمانے کی مفرد دواؤں کی صحیح خوراک کا تعین کیا۔ ابوالحسن علی احمد نسوی (۱۰۳۰ء) آنکھ کا ایک ماہر سرجن تھا جس کی کتاب "تذکرۃ الکحلین" آنکھ کی انسائیکلوپیڈیا کہی جاتی ہے جس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

مسئلہ ارتقا جس کا بانی ڈارون سمجھا جاتا ہے اس کو سب سے پہلے عثمان امرالجیز (۸۶۹ء) نے پیش کیا تھا، پھر اخوان الصفا (۹۵۷ء) اور ابن مسکویہ (۱۰۳۲ء) نے اس نظریے کی تشریح کی۔ ابن مسکویہ کے نظریۂ ارتقا نے یورپ کو بہت متاثر کیا۔ ابن رشد نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ قانون ارتقا کا اثر جمادات، نباتات اور حیوانات پر یکساں ہوتا ہے۔ ڈارون نے اس نظریے سے متاثر ہو کر اپنی کتاب "اصل الانواع" (The Origin of Species) ۱۸۶۰ء میں شائع کی۔ ابن رشد نے سب سے پہلے بتایا کہ سورج کی سطح پر دھبے ہیں اور آنکھ میں اشیا کا عکس ریٹینا (Retina) پر پڑتا ہے۔

ابن الخطیب (۱۳۷۴ء) تحقیق کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچا کہ متعدی امراض جراثیم کے ذریعے پھیلتے ہیں۔ یہ جراثیم سانس کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ اس نے اس کا علاج بھی دریافت کر لیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب طاعون کے مرض کے بارے میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ جراثیم کی دریافت نے طب کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ دوران خون (Circulation of Blood) کی تحقیق کرنے والا پہلا محقق ابن النفیس (۱۲۸۹ء) ہے۔ آج اس دریافت کا سہرا ولیم ہاروے (William Harvey) کے سر باندھا جاتا ہے لیکن اب یہ بات دنیا کے سامنے کھل کر آ گئی ہے کہ ابن النفیس نے ولیم ہاروے سے کوئی تین سو برس پہلے اپنا نظریہ پیش کر چکا تھا اور اپنی کتاب میں اس پر تفصیل سے بحث کر چکا تھا۔

علم کیمیا:

خالد بن یزید بن معاویہؓ (۷۰۴ء) نے جنہیں مورخین "بابائے کیمیا" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ایک ایسا کیمیائی مسالہ دریافت کیا تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کا بحری بیڑہ بحر روم پر چھا گیا۔ خالد بن یزید کے بعد حضرت امام جعفر صادقؒ نے کیمیا پر تحقیقی کام کیا۔ امام صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جابر بن حیان (۸۱۷ء) جیسا شہرہ آفاق شاگرد پیدا کیا جو تجرباتی کیمیا کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نے

مادے کو تین گروہوں میں تقسیم کیا: نباتات، حیوانات اور معدنیات۔ اس نے الکحل، نائٹرک ایسڈ (Nitric acid)، ہائیڈروکلورک ایسڈ (Hydrochloric acid) اور فاسفورس سے دنیا کو پہلی بار روشناس کرایا اور آکسائڈ (Oxide) بنانے کی عمل دریافتیں بھی کیں۔

رازی نے کیمیا پر اپنی مشہور کتاب "کتاب الاسرار" لکھی جو عرصے تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب رہی۔ اس نے معدنیات کو جوہروں، اجسام، پتھروں، توتیا، سہاگہ اور نمک میں تقسیم کیا جو بلاشبہ اس کے تمام پیشروؤں سے کہیں بہتر تھی۔ ابن بیطار نے اپنی تصنیف میں بارود کا ذکر کیا اور حسن الرماح (۱۲۹۴ء) نے اپنی کتاب میں بارود بنانے کا نسخہ لکھا۔

علم طبیعیات

علم مناظر (Optics) کا امام ابن الہیثم (۱۰۲۱ء) نے بینائی کے عمل کے صحیح سائنسی تصور سے دنیا کو آگاہ کیا۔ انعکاس نور (Reflection of light) کے اصول وضع کیے اور ان کے عملی ثبوت فراہم کیے۔ اس کے علاوہ انعطاف نور (Refraction of Light) کے بارے میں بھی اصول وضع کیے جسے آج دنیا اسنیل کے اصول (Snell's Law) کے نام سے جانتی ہے۔ اس نے دریافت کیا کہ روشنی ایک قسم کی توانائی ہے، جس کی رفتار آواز کی رفتار سے بہت زیادہ ہے۔ اس نے انکشاف کیا کہ روشنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے لیے کم سے کم وقت لگنے والا راستہ منتخب کرتی ہے۔ اس اصول کو آج ہم فرما کے اصول (Fermat's Principle) کے نام سے جانتے ہیں۔

اس عظیم سائنس داں نے ہمیں مادی اجسام میں جمود (Inertia) کا تصور دیا جسے آج دنیا نیوٹن کے پہلے قانون حرکت (Newton's 1st Law of motion) کے نام سے جانتی ہے۔ ابن مسکویہ نے بتایا کہ مد و جزر چاند کی کشش ثقل کا نتیجہ ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ سیاروں کو گردش کرنے کے لیے کسی بیرونی قوت کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ سورج کی کشش ہی انھیں گردش پر مجبور کرتی ہے۔ اس نے عالمگیر کشش ثقل کا نظریہ پیش کیا جسے ہم نیوٹن کے قانون ثقل کے نام سے جانتے ہیں۔ البیرونی نے اٹھارہ مختلف قسم کی دھاتوں اور غیر دھاتوں کی کثافت اضافی (Specific gravity) کی نہایت صحیح پیمائش کی۔ ابو حاتم مظفر اسفرازی (۱۰۶۷ء) علم طبیعیات کی دو مشہور شاخوں میکانیات (Mechanics) اور ماسکونیات (Hydrostatics) میں دست گاہ کامل رکھتا تھا۔ رازی نے سب سے پہلے دنیا کو یہ بتایا کہ فضا میں زمینی کششِ باہمی کے سہارے معلق ہے۔ قطب الدین شیرازی نے تیرھویں صدی میں سب سے پہلے قوس قزح کی سائنسی توجیہ کی۔ رازی نے اشیا کی کثافت اضافی دریافت کرنے کے لیے ماسکونی میزان استعمال کیے۔ اس نے ارسطو کے نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ مادہ جوہروں پر مشتمل ہے جو مختلف تعداد میں آپس میں مل کر مختلف عناصر کی تشکیل کرتے ہیں۔

علم میکانکی

مسلمان سائنس دانوں نے عجیب و غریب تکنیکی ایجادات بھی کیں۔ اموی خلفا کے وقت میں چشموں کا پانی گھر گھر پہنچتا تھا۔ میکانکی کلاک مسلمانوں کی خاص ایجاد ہے۔ ہارون الرشید کے محل کے حوض میں مصنوعی چڑیاں بنی ہوئی تھیں جو ہوا چلنے پر گاتی تھیں۔ حکم بن ہاشم نے

> "اے مسلمانو! اس بات کو بھی تم خیال کرو کہ اگر اس وقت تم نے ہمت نہ کی اور سعی و کوشش میں کوتاہی کی اور خدانخواستہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو پھر کبھی تمہاری بھلائی اور تمہاری بہبودی کی توقع نہ ہوگی۔"
>
> ــــــ سر سیّد ــــــ

ایک چاند بنایا تھا جو سورج نکلتے ہی ڈوب جاتا اور سورج کے غروب ہوتے ہی نکل آتا۔ یہ نخشب نام کے ایک کنوئیں سے نکلتا تھا جس سے تقریباً دو سو میل کا علاقہ منور ہو جاتا تھا۔ اسپین میں ایک چھاپہ خانہ تھا جس میں عبدالرحمٰن اول (۷۸۸ء) کے احکام چھپتے تھے۔ احمد بن موسیٰ شاکر (۸۵۸ء) ایک اچھا سول انجینئر تھا۔ فرغانی (۸۶۳ء) نے دریا کی طغیانی ناپنے کا آلہ اور دھوپ گھڑی (Sun Dial) ایجاد کی۔ علی بن عیسیٰ اصطرلابی (۸۶۴ء) نے زمین سے سورج، چاند اور تاروں کے درمیان فاصلہ ناپنے کا طریقہ ایجاد کیا اور آلہ سدس (Sextant) بنایا۔ احمد بن موسیٰ شاکر کے بھائی ابوجعفر محمد بن موسیٰ شاکر (۸۷۲ء) نے ایک کیمیاوی ترازو (Chemical Balance) ایجاد کیا جو آج بھی لیبارٹری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ابن سینا کے استاد ابوالحسن نے پہلی دوربین ایجاد کی۔ ابوالقاسم ابن فرناس (۸۸۸ء) نے عینک کا شیشہ اور وقت ناپنے والی گھڑی بنائی۔ اس نے ایک اڑنے والی مشین بھی ایجاد کی تھی جس سے وہ کچھ دور تک اڑا تھا لیکن پھر نیچے گر پڑا تھا۔ ابن الہیثم نے سوئی چھید کیمرے (Pin Hole Camera) کا تصور پیش کیا اس نے دریائے نیل پر اسوان کے قریب بند باندھنے کی تجویز بھی پیش کی تھی مگر اس کو وہ عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

الغرض مسلمان سائنس دانوں نے شروع ہی سے عملی تطبیقی اور تجرباتی سائنس پر خصوصی زور دیا جس سے دنیا میں علم و تحقیق کی راہ ہموار ہوئی۔ ان کامیابی رجحان اسپین کی یونیورسٹیوں کے ذریعے یورپین سائنس دانوں کے ہاتھ لگا جس کے نتیجے میں موجودہ مغربی سائنس کے اولین دور کا آغاز ہوا لیکن یہ تاریخ کا عظیم سانحہ ہے کہ سولہویں صدی کے آتے آتے مسلمان سائنس سے بالکل بے تعلق ہو گئے۔ اجتہاد کا راستہ چھوڑ کر مقلدانہ اور روایتی ذہنیت کا شکار ہو گئے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ مسلمان اپنی بھولی ہوئی تحقیقی روش کو اپنا کر علوم حاضرہ تک رسائی کرتے اور علمی دنیا میں اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرتے لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ اور روایات سے ناواقفیت کی بنا پر ذہنی و فکری افلاس میں مبتلا ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ اور سائنس کی تمام نعمتیں محض یورپ کی رہین منت ہیں، ان میں ہمارا کوئی حصہ نہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی حقیقی نشاۃ ثانیہ عربوں کے اثر اور اسپین کی اسلامی ثقافت کے تجدیدی دور کی رہین منت ہیں۔ بقول بریفالٹ:

"نہ صرف سائنس نے یورپ کو نئی زندگی عطا کی بلکہ اسلامی تہذیب کے گوناگوں اثرات نے اس کی خوابیدہ روح کو گرمی حیات بخشی۔ یورپ کے تمدنی نشوونما میں کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں جس پر اسلامی تمدن کا فیصلہ کن اثر نہ پایا جاتا ہو۔ ہماری سائنس پر عربوں کا احسان نہ صرف انقلاب انگیز اور محیر العقول سائنسی نظریات و ایجادات نہیں بلکہ عرب تمدن کا ہماری سائنس پر اس سے کہیں عظیم ترین احسان ہے بہت ممکن ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو موجودہ یورپی تہذیب کبھی وہ ہیئت اختیار نہ کر پاتی جو آج اسے ارتقا کی تمام سابقہ منزلوں پر فوقیت بخش رہی ہے۔"

حوالہ جات

۱ علش درانی۔ سائنس میں مسلمانوں کی خدمات۔ فردوس پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۸۲ء۔ ص ۴

۲ القرآن سورہ ۱۷، آیت ۳۶

۳ مولانا عبدالباطن جونپوری، علوم عرب غیر مسلموں کی نظر میں۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۲۷

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ستر ہونہار طلباء و طالبات کو

شیروانی اسکالرشپ ۸۹-۱۹۸۸ء

۸۹-۱۹۸۸ء کے تعلیمی سال میں مسلم یونیورسٹی کے ستر منتخب طلبا و طالبات کو الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ، چیرمین جیب انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے اسکالرشپ پیش کیے گئے۔ ان ہونہار طلبا و طالبات کے نام حسب ذیل ہیں۔

بی۔ایس سی انجینئرنگ (پہلا سال)

۱۔ راجیش آنند صاحب
۲۔ شاہد اقبال صاحب
۳۔ انور شہزاد صدیقی صاحب
۴۔ درمیندر رتبلہ صاحب
۵۔ ارشد کمال صاحب
۶۔ منور الحق صاحب
۷۔ محمد واحد ضیاء صاحب
۸۔ علی احمد صاحب
۹۔ ریحان احمد وارثی صاحب
۱۰۔ ایم انظار الحق صاحب
۱۱۔ محمد شہزاد عالم صاحب
۱۲۔ قمر اعظم صاحب

بی۔ایس سی انجینئرنگ (دوسرا سال)

۱۔ عمر فاروق صاحب
۲۔ محمد افضال صاحب
۳۔ فاروق رضا صاحب
۴۔ آفتاب عالم صاحب
۵۔ اکرام خاں صاحب
۶۔ ذوالفقار احمد صاحب
۷۔ ثناء اللہ صاحب
۸۔ محمد اشفاق احمد صاحب

بی۔ایس سی انجینئرنگ (تیسرا سال)

۱۔ محمد اختر رضوی صاحب
۲۔ محبوب ثواب صاحب
۳۔ یوسف الزماں خاں صاحب
۴۔ خان عالم صاحب

بی۔ایس سی انجینئرنگ (فائنل)

۱۔ شیبا جیلانی صاحبہ
۲۔ اقبال احمد صاحب
۳۔ انتظار احمد صاحب
۴۔ محمد احمد صاحب
محمد خلیق الزماں صاحب
۶۔ ناصر حسین صاحب

ایم۔ایس سی انجینئرنگ۔

شہامت محمد خاں صاحب

بی۔اے۔آنرز (پہلا سال)

سید حامد اقبال صاحب

بی۔ اے آنرز (فائنل)

ایم سجاد حسن صاحب

بی۔ اے (پہلا سال)

نشاط زیدی صاحبہ

بی۔ ایس سی (پہلا سال)

نوشابہ عابدی صاحبہ

بی۔ ایس سی (دوسرا سال)

شاہ عالم صاحب

بی۔ ایس سی (دوسرا سال)

عالمہ ناز صاحبہ

بی۔ ایس سی (فائنل)

امتیاز ارشد صاحب

ایم۔ ایس سی (فائنل)

محمد محسن اللہ خاں صاحب

ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (پہلا سال)

ندیم ظفر جیلانی صاحب

ڈپلوما انجینئرنگ (فائنل)

حبیب رضا عثمانی صاحب

ڈپلوما انجینئرنگ (پہلا سال)

سہیل اختر صاحب

بارہواں کلاس

۱۔ ناہید راحت خان صاحبہ ۲۔ محمد اسلم صاحب
۳۔ نیاز الرحمٰن صاحب ۴۔ تصدیق خاں صاحب
۵۔ محی الدین رضا صاحب ۶۔ فاروق نیر صاحب
۷۔ محمد رضوان انصاری صاحب ۸۔ ثاقب ہارون صاحب
۹۔ محمد طارق صاحب ۱۰۔ نوید حسن صاحب
۱۱۔ سراج احمد محبوب علی صاحب

گیارھواں کلاس

۱۔ عثمانی افضل۔اے۔ شفیع الدین صاحب
۲۔ سیما شاداب صاحبہ ۳۔ ابرار الحق صاحب
۴۔ راشدہ سیما فرخ صاحبہ ۵۔ عارف اسلام صاحب
۶۔ خان نثار احمد صاحب ۷۔ عمر خالد صاحب
۸۔ محمد طیب خان صاحب ۹۔ آصف اختر صاحب
۱۰۔ تہمینہ صاحبہ ۱۱۔ شاداب ہارون صاحب
۱۲۔ شواہد الحق صاحب ۱۳۔ مختار علیم انصاری صاحب
۱۴۔ جاوید اقبال صاحب ۱۵۔ امتیاز احمد صاحب
۱۶۔ سیدہ تاباں حیدر رضوی صاحبہ
۱۷۔ رؤسہ فاطمہ صاحبہ

"ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ اُن میں سے
ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے،
مگر متعصب اپنی اس خصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور
علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۸ : شمارہ ۷ (جولائی ۸۹)

مسلم زیر انتظام اسکولوں میں سائنس کی تعلیم و تدریس

اعداد و شمار کی روشنی میں

شوکت علی خاں*

گزشتہ چند سالوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے عصری علوم کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے سلسلے میں جو اقدام کیے ہیں اُن میں سے ایک سینٹر فار پروموشن آف سائنس کا قیام ہے۔ اس سینٹر کو ۱۹۸۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کے سیکشن (c) (2) 5 کے تحت قائم کیا گیا ہے اور اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سائنسی تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی پسماندگی دور ہو اور مسلم معاشرے میں سائنسی طرز فکر عام ہو۔ اس سینٹر کے تحت کئی پروگرام چل رہے ہیں، جن میں سے ایک اہم پروگرام مسلم زیر انتظام اسکولوں کے سائنس کے اساتذہ کے لیے ریفریشر کورس کا انعقاد ہے۔ سینٹر نے سائنس کے مختلف مضامین میں اب تک ۱۰ ریفریشر کورسز کا انعقاد کیا ہے۔ ہر کورس بالعموم دو ہفتے کا ہوتا ہے اور ان کورسز کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ سائنس کے اساتذہ کو متعلقہ مضمون کے نئے دریافت شدہ پہلوؤں سے آگاہ کیا جائے ان کی تدریسی دشواریوں کو حل کرنے میں مدد پہنچائی جائے اور سائنسی تعلیم کے جدید طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ کورس کے دوران لکچر دیے جاتے ہیں۔ ٹیوٹوریلس TUTORIALS ہوتے ہیں تعلیمی فلمیں دکھائی جاتی ہیں، تجربہ گاہوں کو دکھایا جاتا ہے۔ بحث و مباحثے کا سیشن ہوتا ہے اور ٹیچنگ اینڈ میٹریل (Teaching and Material) کے استعمال کی بابت بتایا جاتا ہے۔ اِن ریفریشر کورسوں کے انعقاد کے سلسلے میں ہمیں مسلم زیر انتظام اداروں سے رابطہ قایم کرنا پڑتا ہے اور ہم اُن سے کچھ معلومات بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس مختصر مقالے میں مسلم زیر انتظام اسکولوں کی بابت ہم اپنے کچھ مشاہدات اور تجربات پیش کریں گے جو ہمیں اب تک ریفریشر کورسوں کے انعقاد سے ہوا ہے۔

ہمارا مرکز جب بھی کسی ریفریشر کورس کا اہتمام کرتا ہے تو طے شدہ تاریخ سے لگ بھگ تین ماہ قبل اسکولوں میں کورس سے متعلق سرکلر و درخواست فارم بھیجے جاتے ہیں، جس میں کورس کی نوعیت اور تاریخ کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ درخواست فارم ریفریشر کورس میں شرکت کے خواہش مند اساتذہ کو پُر کرکے ایک مقررہ تاریخ تک مرکز کو بھیجنا ہوتا ہے۔ فارم میں اساتذہ سے نام، پتہ، عمر، تعلیمی صلاحیت، تدریسی تجربہ وغیرہ کے متعلق اطلاعات دریافت کی جاتی ہیں۔ ہمارے اعداد و شمار انھیں فارم کی اطلاعات پر مبنی ہیں۔ ایک کورس کے لیے تقریباً ۳۰ اساتذہ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ منتخب اساتذہ کا سفر خرچ اور علی گڑھ میں ان کے قیام و طعام کے اخراجات مرکز برداشت کرتا ہے۔ یہاں یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مرکز صرف انھیں درخواستوں کو منظور کرتا ہے، جن پر اسکول کے پرنسپل

---

* سینٹر فار پروموشن آف سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

یا منیجر کی یہ تصدیق ہوتی ہے کہ متعلقہ کورس میں شرکت کے لیے اساتذہ کو با تنخواہ رخصت دی جائے گی۔

مسلم زیر انتظام اسکولوں میں بھیجے گئے سرکلر، موصول ہوئے جوابات منتخب کیے گئے اور شامل ہونے والے اساتذہ سے متعلق اطلاعات درج ذیل ہیں:

TABLE No.I

S.No.	Refresher Course & Duration	No.of forms sent	No. of Application received	No. of candidate selected	No. of Participants
1.	Refresher course for Physics teachers of class XI & XII Oct. 6-19, 1985	239	24 10.04%	19	15
2.	Refresher Course for Chemistry teachers of class XI & XII 23.12.85 to 4.1.1986	302	42 13.57%	41	25
3.	Refresher Course for Mathematics teachers of class XI & XII 23.6.86 to 5.7.86	333	40 12.01%	36	18
4.	Refresher Course for Biology teachers of class XI & XII 23.6.86 to 5.7.86	333	28 8.41%	26	15
5.	Refresher Course for Physics teachers of class IX & X 22.12.86 to 3.1.87	766	79 10.3%	37	21
6.	Refresher Course for Chemistry teachers of class IX & X 22.6.87 to 4.7.87	772	77 9.97%	45	21
7.	Refresher Course for Biology teachers of class IX & X 22.6.87 to 4.7.87	772	68 8.8%	43	28
8.	Refresher Course for Physics teachers of class XI & XII 21.12.87 to 2.1.88	199	27 13.56%	26	17
9.	Refresher for Biology teachers of class IX & X 20.6.88 to 2.7.88	777	90 11.58%	44	17
10.	Refresher Course for Mathematics teachers of class IX & X 20.6.88 to 2.7.88	777	128 16.47%	47	33
		5270	602 11.42%	365	210 57.5% = 4%

ان اعداد و شمار سے نتائج اخذ کرنے کے لیے ہم ٹیبل میں دیے گئے پہلے دو کالم کا موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر اب تک ہم نے ۵۲۷۰ سرکلر و فارم بھیجے ہیں اور ہمیں صرف ۶۰۲ درخواستیں موصول ہوئیں۔ اس طرح شرکت کی درخواستوں کا تناسب ۱۱.۴۲ فی صد ہے۔ یعنی اگر ۱۰۰ فارم بھیجے گئے ہیں تو تقریباً ۱۱ درخواستیں موصول ہوئیں۔

دوسرے دو کالم کو دیکھا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کورس میں شرکت کے لیے کل ۳۶۵ منتخب اساتذہ میں سے صرف ۲۱۰ اساتذہ نے شرکت کی۔ یہ تناسب 57.5 فی صد ہے۔

دوسرے اور تیسرے کالم یعنی موصول ہوئی درخواستیں اور منتخب کیے گئے اساتذہ کا تقابل کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کورس میں شمولیت کے لیے ۶۰۲ اساتذہ نے خواہش ظاہر کی مگر مرکز کے محدود ذرائع کی وجہ سے صرف ۳۶۵ اساتذہ کو ہی مدعو کیا جا سکا۔ یہ تناسب ۶۱ فی صد ہے۔

اب اگر بھیجے ہوئے سرکلر و فارم اور شرکت کیے ہوئے اساتذہ کا تناسب دیکھا جائے تو بہت ہی مایوس کن صورت سامنے آتی ہے۔ یعنی ۵۲۷۰ فارم بھیجے گئے اور کل ۲۱۰ اساتذہ نے شرکت کی جس کا تناسب 4 فیصد ہے۔

اس طرح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ۱۰۰ فارم بھیجے جاتے ہیں تو صرف چار اساتذہ ریفریشر کورس میں شامل ہوتے ہیں یہ تناسب ان اسکولوں کے منتظمین اور اساتذہ میں سائنس کی تعلیم و تدریس کو بہتر بنانے کی طرف ایک سرد رویے کا عکاس ہے مندرجہ بالا ٹیبل کے بغور مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سرد مہری زیادہ تر اسکولوں کے منتظمین اور سربراہوں میں پائی جاتی ہے۔ اساتذہ بذات خود کورس میں شرکت کے لیے کافی حد تک خواہش مند ہوتے ہیں۔ منتخب شدہ اساتذہ میں تقریباً

۵ فیصد کورس میں شرکت کرتے ہیں۔ بقیہ ۲/۶ فیصد میں کچھ ایسے ہیں
جو کو عین وقت پر کسی مجبوری کے تحت اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑا
ہے۔ اکثر بعد میں ہمیں اساتذہ کے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں
انھوں نے کورس میں شرکت نہ کر سکنے پر افسوس اور اپنی کسی وقتی
مجبوری کا عذر ظاہر کیا ہے۔ شرکت کرنے والے اساتذہ سے گفتگو
کے دوران بھی یہی بات سامنے آئی ہے۔ بیشتر اساتذہ اس بات
کے شاکی تھے کہ اسکولوں کے سربراہ کافی تگ و دو کے بعد چھٹی دینے
پر رضامند ہوئے ہیں۔ کچھ اساتذہ نے یہ بتایا کہ پرنسپل نے انھیں
کورس کی بابت اطلاع تک نہیں دی۔ دوسرے اسکولوں کے ساتھی
استاد یا کسی اور ذریعے سے انھیں علم ہوا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ سرکلر
آیا تھا مگر فائل میں دب گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کچھ اسکولوں
میں پرنسپل اور منیجر کے آپسی اختلافات کی وجہ سے بھی اساتذہ کو
چھٹی ملنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

اب اگر مندرجہ بالا ٹیبل میں پہلے ریفریشر کورس اور دسویں ریفریشر
کورس کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہم نے اپنے پہلے کورس کے لیے
جو اکتوبر ۱۹۸۵ میں ہوا تھا ۲۳۹ فارم بھیجے اور ۲۴ درخواستیں موصول
ہوئیں جب کہ دسویں ریفریشر کورس میں جو جولائی ۱۹۸۸ میں ہوا، ۲۱۱ فارم
بھیجے اور ۱۲۸ درخواستیں موصول ہوئیں۔ اتنے کم عرصے میں Response
میں ۵۶ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ پہلے میں Response تقریباً ۱۰ فیصد
تھا جب کہ دسویں کورس میں Response تقریباً ۶۰.۵ فیصد ہے۔
گو کہ Response اب بھی Poor ہے مگر اضافہ اپنی جگہ پر
قابل قدر ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لگن سے کی گئی سنجیدہ کوششیں
اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہیں۔

کسی اسکول کے تعلیمی معیار کا بڑی حد تک اندازہ وہاں کے
اساتذہ کی تعلیمی استعداد کی بنا پر لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں
بھی ہمارے پاس لگ بھگ ۱۰۰ مختلف اداروں کے ۶۰۲ اساتذہ
سے متعلق اعداد و شمار ہیں جو مندرجہ ذیل ٹیبل ۲ میں دیے گئے ہیں۔

TABLE No.2

Sr. No.	Refresher Course and duration	No. of Application Received	Age ≤35 yrs	Age >35 yrs	Qualifications −%	Qualifications 0%	Qualifications +%	Experience A%	Experience B%	Experience C%	Poor/Under-qualified in ≤5 yrs Experience (A)	%	Poor/Under-qualified in >5 yrs Experience (B&C)	%	Good and Excellent G/EX	%
1.	Physics XI & XII 6.10.85 to 19.10.85	24	9 37.5%	15 62.5%	0 0%	23 95.8%	1 4.2%	6 25%	3 12.5%	15 62.5%	0	0%	1	4.2%	11	45.8%
2.	Chemistry XI & XII 23.12.85 to 4.1.86	41	19 46.3%	22 53.7%	4 9.8%	36 87.8%	1 2.4%	13 31.7%	6 14.6%	22 53.1%	1	2.4%	7	17%	12	29.3%
3.	Mathematics XI & XII	40	22 55%	18 45%	1 2.5%	37 92.5%	2 5%	11 27.5%	9 22.5%	20 50%	1	2.5%	11	27.5%	11	27.5%
4.	Biology XI & XII	28	15 53.6%	13 46.4%	5 17.8%	22 78.6%	1 3.6%	6 21.4%	8 28.6%	14 50%	1	3.6%	7	25%	9	32.1%
5.	Physics IX & X 22.12.86 to 3.1.87	79	29 36.7%	50 63.3%	3 3.8%	76 96.2%	0 0%	12 15.2%	15 19%	52 65.8%	2	2.5%	16	20.3%	15	19%
6.	Chemistry IX & X 22.6.87 to 4.7.87	77	26 33.8%	51 66.2%	8 10.4%	69 89.6	0 0%	15 19.5%	15 19.5%	47 61%	7	9.1%	25	32.5%	13	16.9%
7.	Biology IX & X 22.6.87 to 4.7.87	68	27 39.7%	41 60.3%	2 2.9%	66 97.1%	0 0%	7 10.3%	19 27.9%	42 61.8%	2	2.9%	23	33.8%	9	13.2%
8.	Physics XI & XII 21.12.87 to 2.1.88	27	13 48.1%	14 51.9%	5 18.5%	18 66.7%	4 14.8%	8 29.6%	6 22.2%	13 48.2%	3	11.1%	3	11.1%	15	55.5%
9.	Biology IX & X [illegible]	90	34 37.8%	56 62.2%	13 14.9%	74 82.2%	3 3.3%	19 21.1%	26 28.9%	45 50%	10	11.1%	28	31.1%	22	24.4%
10.	Mathematics IX & X [illegible]	128	39 30.5%	89 69.5%	12 9.4%	115 89.8%	1 0.8%	27 21.1%	26 20.3%	75 58.6%	12	9.4%	34	26.6%	31	24.2%
		602	233 38.7%	369 61.3%	53 8.8%	536 89%	13 2.2%	124 20.6%	133 22.1%	345 57.3%	39	6.5%	157	26.1%	147	24.4%

− under qualified; A ≤ 5 years; G = Good
0 Q.Q.; B = 5 − 10 years; Ex=Excellent
+ Over qualified; C > 10 years

اوپر دی گئی ٹیبل نمبر ۲ سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں ۔

۱۔ اساتذہ جن کی عمر ۳۵ سال یا اس سے کم ہے، ان کی تعداد ۳۸ فیصد ہے اور اس سے زیادہ عمر والوں کی تعداد ۶۲ فیصد ہے ۔

۲۔ ایسے اساتذہ جو پانچ سال یا اس سے کم کا تدریسی تجربہ رکھتے ہیں، ۲۱ فیصد، ۵ سال سے ۱۰ سال تک تجربہ رکھنے والوں کی تعداد ۲۲ فیصد اور ۱۰ سال سے زیادہ تجربہ رکھنے والوں کی تعداد ۵۷ فیصد ہے ۔

۳۔ تعلیمی استعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ۹ فیصد ایسے اساتذہ کی ہے جو Minimum Qualification (ہائی اسکول کے لیے B.Ed, B.Sc اور انٹرمیڈیٹ کے لیے M.Sc) بھی پوری نہیں کرتے۔ صرف ۲ فیصد ایسے اساتذہ کی ہے، جو Minimum Qualification سے بہتر لیاقت (Qualification) کے ہیں۔

۴۔ اساتذہ کے تعلیمی ریکارڈ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو صورتِ حال اور بہتر طور پر سامنے آتی ہے ۔ ۲۴ فیصد اساتذہ کی تعداد ایسی ہے جو +B (۵۵ فیصد یا اس سے زیادہ) گریڈ کیے جا سکتے ہیں۔ لگ بھگ تہائی (۳۳ فیصد) اساتذہ ایسے ہیں جو Thirds out تھرڈ ڈویژن یا ملتا جلتا Academic Record رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ نئے اساتذہ یعنی ۵ سال یا اس سے کم تجربہ کار ہیں۔ اس میں ناکافی تعلیمی استعداد رکھنے والوں کی نسبت ۲ فیصد ہے۔ جب کہ سینئر اساتذہ میں یہ نسبت ۲۶ فیصد ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نئے Appointments میں صورتِ حال بہتر ہوتی جا رہی ہے۔

آگے ہوئے تو ان اساتذہ سے بات کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ بیشتر اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کی تعلیم کی باگ ڈور ایسے اساتذہ کے ہاتھ میں ہے جو تجربہ کار تو ہیں لیکن مناسب لیاقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا نئے اور بہتر تعلیمی استعداد رکھنے والے اساتذہ اگر طریقۂ تعلیم میں کچھ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں یا کوئی بہتر درسی کتاب منتخب کرتے ہیں تو ان کی رائے نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عمر اور تجربے کا لحاظ اپنی جگہ پر لیکن تعلیمی معاملات میں بہتر صلاحیت رکھنے والے اساتذہ کی بھی رائے لینی چاہیے۔

ہم حاضرین کو یہ بتانا چاہیں گے کہ ہر کورس میں ایک استاد کی شمولیت پر مرکز کا لگ بھگ ایک ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے سال میں تقریباً ایک لاکھ روپیہ جو کہ ہمارے بجٹ کا ۷۰ فیصد ہے، ان کورسوں پر خرچ ہوتا ہے۔ ہر کورس کی تیاری میں کم از کم دو مہینے لگتے ہیں۔ یونیورسٹی کے تقریباً دس اساتذہ اس میں شامل ہوتے ہیں۔ کورس کے آخر میں شرکا سے Reaction Sheet پُر کروانے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے لیے ان کورسز کو مفید بھی پاتے ہیں۔

ہم نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں ان کی بنیاد پر دو باتیں واضح طور پر کہی جا سکتی ہیں۔

اول۔ مسلم زیرِ انتظام اسکولوں کے سائنس کے اساتذہ اور پرنسپل صاحبان کی ایک بڑی بھاری اکثریت یا تو سائنس کے ریفریشر کورس کی اہمیت کو نہیں سمجھتی اور یا تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی تڑپ نہیں رکھتی

دوم۔ اسکول کے منیجر اور پرنسپل صاحبان کی اکثریت کو سائنس کے اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کو بہتر بنانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔

اس حقیقت کے مدِنظر کہ سائنسی مضامین کے نصاب میں ترمیم و تنسیخ کا عمل برابر جاری رہتا ہے، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسکولوں کے پرنسپل اور منیجر صاحبان کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ اچھی سائنس کی معیاری تعلیم کے لیے اساتذہ کی متعلقہ مضمون کے ریفریشر کورسوں میں شرکت نہایت ضروری ہے اور یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے اسکول کے اساتذہ کو ملک میں ہونے والے مختلف ریفریشر کورسوں کے لیے بھیجیں اور اس سلسلے کی معقول سہولتیں فراہم کریں۔

مسلم طلبہ کو ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے وظیفے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی ۶۲ نے ۹۱ - ۱۹۹۰ء تعلیمی سال کے دوران مسلم طلبہ کو وظیفے دینے کے لیے درخواست فارموں کی ترسیل شروع کردی ہے۔ یہ فارم، اسناد کی نقول کے ساتھ ۱۵ ستمبر ۸۹ء تک سوسائٹی کے دفتر میں جمع کیے جاسکتے ہیں۔ امیدوار کے لیے کم از کم میٹرک پاس ہونا ضروری ہے۔ جن مسلم طلبہ نے کم از کم نمبر ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری میں ۸۰ فی صد، 2+10 یا انٹر میں ۷۵ فی صد اور بی۔ اے یا ایم۔ اے میں ۷۰ فی صد حاصل کیے ہیں، وہی وظیفے کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ یہ وظیفہ جو پہلے عطیے کی صورت میں دیا جاتا تھا امسال سے قرض کی شکل میں دیا جائے گا۔ وظیفہ بالترتیب -/۲۵۰، -/۳۵۰ اور -/۵۰۰ روپے ماہانہ مقرر کیا گیا ہے۔ صرف وہی امیدوار وظیفے کے لیے فارم بھریں جن کا ارادہ تعلیم کے سلسلے کو کم از کم ۹۱ - ۱۹۹۰ء تعلیمی سال کے دوران تک جاری رکھنے کا ہے۔ فارموں کی جانچ کے بعد منتخب امیدواروں کو تحریری امتحان اور انٹرویو کے واسطے سوسائٹی کے خرچ پر دو دن کے لیے نومبر ۸۹ء میں کسی وقت دہلی بلایا جائے گا۔ یہ انتخاب "میرٹ" یا صلاحیت کی بنیاد پر ہوگا۔ لیکن اس خیال سے کہ زیادہ سے زیادہ ریاستوں کے مسلم طلبہ کو استفادے کا موقع ملے، تعلیمی اعتبار سے بعض پسماندہ ریاستوں کے امیدواروں کو نمبروں میں کچھ رعایت دی جائے گی۔

ٹیسٹ اور انٹرویو کے بعد جن امیدواروں کو قرض کی صورت میں وظیفہ منظور کیا جائے گا، انھیں یہ پابند ہونا ہوگا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرلینے کے دو سال بعد سے وظیفے کی رقم سوسائٹی کو ماہ بہ ماہ ان ہی قسطوں میں واپس کریں گے جن قسطوں میں انھیں وظیفے کی رقم ملی تھی۔ یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے وظیفوں کا سلسلہ اپنے صدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے ایما پر ۱۹۸۲ء میں شروع کیا تھا اور تب سے اب تک ۹۸ مسلم طلبا کو یا تو ماہانہ وظیفے جاری ہوچکے ہیں یا پھر کتابوں کے لیے یکمشت امداد دی جاچکی ہے۔ سوسائٹی اس مد میں اب تک سوا تین لاکھ روپوں سے زائد رقم خرچ کرچکی ہے اور جس طرح سال بہ سال وظیفہ پانے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ آمدنی کے محدود وسائل اس مفید اسکیم کو کہیں بند کردینے پر مجبور نہ کردیں۔ اسی لیے سوسائٹی نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس سال سے وظیفہ بجائے امداد کے آسان اور بلاسودی قرض کی صورت میں دیا جائے جس سے یہ مفید سلسلہ جاری رکھا جاسکے اور اس طرح مستقل طور سے زیادہ سے زیادہ مسلم طلبہ کو فیض یاب ہونے کا موقع مل سکے۔

حالیہ ترمیم کی بنیاد اس استدلال پر ہے کہ اسکیم کا مقصد ذہین، باصلاحیت اور مالی اعتبار سے کمزور طالب علموں کو اس قابل بنادینا ہے کہ وہ معقول روزگار سے لگ جائیں، عطیہ کا بار اپنے ذہن پر محسوس نہ کریں اور مشعل کو طالب علموں کی اگلی کھیپوں تک پہنچانے میں حصہ لیں۔

سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی،
ہمدرد نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۶۲

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸، شمارہ ۷، جولائی ۸۹ء

طب، فلسفہ سے معاشرت تک

مظفر بلخی ★

یہ دور سائنس کا ہے۔ تمام شعبۂ ہائے زندگی پر سائنس کی بالادستی ہے۔ جو بات تجربے کے میزان پر پوری نہیں اترتی قبول نہیں کی جاتی۔ بات کتنی ہی دل نشیں اور حقیقت پسند کیوں نہ ہو کیا وہ سائنس ہے یا کم از کم اس پر سائنسی فکر کی چھاپ۔ اس میں مشاہدات و تجربات کا احساس ہوتا ہے۔ حقائق کی تشریح میں وہ اسلوب ہے جو سائنسی طرز استدلال کا ہے اگر نہیں تو فلسفہ کی بہترین زبان اور ادب کی اعلیٰ نگارشات بھی مسابقت نہیں کر سکتیں۔

ایک دور فلسفہ کا تھا۔ تمدنی، سماجی اور سائنسی علوم پر بھی فلسفہ کی گرفت تھی۔ کسی حقیقت کو ثابت کرنے اور اسے مقبولِ عام بنانے کے لیے منطقی سہارے لیے جاتے۔ طبعی اور مابعد الطبعیاتی بحثیں ہوتیں۔ اس طرح ایک ایسا فلسفہ وجود میں آتا جس کے ہزاروں صفحات میں حقیقت کا سراغ نہ ملتا۔ کوئی ریاضی داں، کیمیا گر، ماہر طبعیات، فلکیات اور طب علم کے مرتبے کو نہ پہنچتا جب تک کہ وہ فلسفی نہ ہو۔ فلسفہ کے اثرات قدیم مصری دور سے فیثاغورس، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے یونانی دور تک رہے اور بعد میں فارابی، سینا، رازی، ہیثم اور ابن رشد جیسے فلسفیوں کے اسلامی دور تک۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی کے بعد فلسفہ نے دیگر علوم پر گرفت ڈھیلی کر دی۔ فلسفہ کے اس دور میں ابن الہیثم جیسے عظیم ماہر طبعیات و ریاضی، رازی جیسے کیمیا داں اور بو علی سینا جیسے ماہر طب کو بھی رواج زمانہ کے مطابق فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی پڑی۔ بو علی سینا نے ۱۸ جلدوں میں شفا جیسی فلسفہ کی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کر کے اپنی حذاقت علمی اور بالخصوص فلسفہ دانی کا سکہ رائج کیا اور ایک فلسفہ داں کی حیثیت سے طب میں القانون تصنیف کی جو یورپ میں سترھویں صدی کے اواخر تک درس گاہوں میں داخل نصاب رہی۔ شفا تو اب صرف لائبریریوں کی زینت بن چکی ہے اور اس کی قدر اسی حد تک ہے کہ وہ فلسفہ پر لکھی گئی بلند پایہ کتاب ہے۔ جب کہ القانون کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔ اگر اس پر فلسفہ کا داغ نہ لگتا تو اور بھی قابل استفادہ ہوتی۔ مگر بو علی سینا نے علمی وقار بخشنے کے لیے طب کی اس غیر معمولی کتاب کو بھی فلسفہ سے بوجھل بنا دیا کیونکہ وہ اپنے حالات میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

حالات کی جدید تبدیلیوں میں اب دنیا فلسفہ اور فنون اور سب سے زیادہ سائنس کی ہے — جواہر لال نہرو نے کسی موقع پر کہا تھا کہ:

> "سائنس نے زندگی کی جملہ سمتوں اور شعبوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مستقبل اب سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور اُن کے جو سائنس کے دوست ہیں۔"

دنیا بھر کی درس گاہوں میں دوسرے مضامین کی طرح اب فلسفہ کی بھی حیثیت پی۔ ایچ۔ ڈی اور دوسرے اختصاص تک محدود ہو چکی ہے۔ زندگی کے علمی شعبوں میں اس کا عمل دخل بھی

★ علم گنج، گلزار باغ، پٹنہ، بہار۔

وقت بھی نہیں تھا جب اس کی تعلیم رائج تھی۔ فلسفہ تمام شعبہ ہائے علم میں امتیازی اور آخری سند رکھتا تھا، آج سائنس کی موجودگی میں اپنی افادیت اور بھی ختم کر چکا ہے۔ سر علامہ محمد اقبال جنہوں نے اپنی زندگی کا طویل حصہ نہایت عرق ریزی سے فلسفہ کی تعلیم پر صرف کر دیا، جنہیں فلسفہ میں امامت کا درجہ حاصل تھا، وہ فلسفہ کو عقل و خرد کی دنیا میں گم کردہ راہ قرار دے کر بیزار ہو گئے اور علمی دنیا میں فلسفہ کو فتنہ و فساد قرار دیا۔

انہوں نے منطق اور تمام مابعد الطبعیاتی غیر نتیجہ بخش بحثوں کو جن کی نہ کوئی مستحکم فکری اساس تھی اور نہ اسے زندگی کے کسی عملی میدان پر منطبق کیا جا سکتا تھا، یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ یہ فطرت کے تجرباتی اور ناقابل تبدیل قوانین سے خالی ہیں۔ ان کی حیثیت کج فکری یا لفظی سجاوٹ سے زیادہ کی نہیں۔

ساتویں صدی میں عرب کی سرزمین پر معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنہیں اقبال نے دانائے راز کہا ہے، تجرباتی علوم کی ایسی تخم ریزی کی کہ تمام فلسفیانہ علوم اسلام کی ضیا باریوں سے ماند پڑ گئے۔ فیثا غورثی اور ارسطا طالیسی اثرات دنیا سے دیکھتے دیکھتے ختم ہونے لگے خالص تجرباتی اور سائنسی طرز فکر کی بنیاد پڑی۔ اسلام نے دنیا کو سائنسی فکر کی برکتوں سے نوازا۔ اس سے پہلے دنیا فلسفہ کے بوجھ تلے دبی ایسی منزل کی تلاش میں تھی جس کا پتہ نہیں تھا۔ دنیا کے دوسرے علوم کی طرح طب کو بھی سائنسی وقار ملا۔ وہ سینوں اور سفینوں سے باہر آئی۔ ایک طرف فلسفہ سے اس کا رشتہ کم ہوا تو دوسری طرف معاشرتی قوانین سے مربوط۔ لیکن اس کے بعد جب اسلامی گرفت کم ہونے لگی تو دبے فلسفیانہ اثرات پھر ابھر آئے علماء کی ایک تعداد فلسفیانہ بحثوں میں الجھ گئی۔ طب کی فلسفیانہ تشریحات بھی ہونے لگیں بلکہ کچھ زیادہ جدید شکل میں اسلامی فلسفہ وجود میں آیا جو بہتر ہونے کے باوجود قدیم غیر ضروری مباحث سے خالی نہیں تھا۔ فلسفیانہ انداز فکر ذہنوں پر حاوی ہو گیا۔ طب اور معاشرت کے تعلق پر امید افزا پیش رفت نہیں ہو سکی جب کہ علماء بہترین صلاحیت کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات کی اس طرح کی تدوین اب تک نہیں ہو سکی جس میں طب کا جائزہ اخلاقیات کی روشنی میں لیا گیا ہو۔ اس کمی کا احساس بسا اوقات طبی حلقوں سے کیا گیا ہے۔ کسی بھی طریقۂ علاج میں اخلاقیات طب کی باضابطہ شکل نہیں ملتی۔ یونانی طریقۂ علاج میں جو کتابیں ہیں بھی تو وہ اس خلا کو پر نہیں کرتیں۔ جدید طریقۂ علاج ایلوپیتھک میں اس کی ضرورت کا احساس اس وقت ہوا جب طبیب معاشرتی علوم کی گرفت میں آنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں عدلیہ سے متعلق قانونی شعبہ میں بہت معمولی پیش رفت ہو سکی جو معاشرتی علوم کا صرف ایک حصہ ہے اس طرح طب قانونی Medical Juris Prudence کے نام سے ایک مضمون جدید طریقۂ علاج میں داخل نصاب ہو گیا۔

دوسرے معاشرتی علوم کی نسبت علم طب کو مسلسل دشواریاں درپیش ہیں اور اب اس کا احساس ہونے لگا ہے کہ حفظانِ صحت اور معالجات کو معاشرتی قوانین سے مطلق علیحدہ نہیں رکھا جا سکتا اسے ایک باضابطہ شکل ملنی چاہیے۔ کوئی خطرناک بیماری کبھی وبائی شکل میں سامنے آتی ہے تو اخلاقیاتِ طب کی بازگشت بھی اسی دائرے میں سنی جاتی ہے۔ ان ہی کی ایک مثال ایڈز (AIDS) بھی ہے۔ جس کے علاج کے کچھ پہلو خالص معاشرتی ہیں جو اس سے پہلے طب کے لیے کبھی لائق اعتنا نہیں رہے لیکن اب وہ خود بخود طب کی ناگزیر ضرورت بن چکے ہیں۔

بیماری کا جہاں ایک پہلو طبی قوانین کی خلاف ورزی ہے وہاں اخلاقی معاشرتی برائیاں بھی۔ اخلاقی قیود سے آزادی معاشرتی انتظامی قوانین کی خلاف ورزی اور مثبت معاشرتی اصولوں کی ناپاسداری ہی بیماریوں کا اصل سبب ہیں۔ ان سے لیے العملیات اور تغیرات پیدا ہوتے ہیں جو بیماریوں کو دعوت دیں یا جن سے بیماری میں اضافہ ہو۔ ایڈز سمیت بہت سے وائرس ایسے ہیں جو خلیات کے جینس میں واقع RNA پر اثر انداز ہوتے ہیں جو موروثی اطلاعات کے حامل ہیں اور موروثیت (Heredity) کا اصل دائرہ بحث علم نفسیات ہے۔ پھر کسی بھی ماہر طب کا اس نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے کہ تعدیہ (Infection) پہلے ہوتا ہے

یا جسم میں تعدیہ کا موافق ماحول۔ ایڈز ہی سے متعلق — High Risk Group کی ایک اصطلاح چلتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے انسانی گروپ پر ایڈز کے حملے کا شدید اندیشہ ہے جب کہ جسم میں ایڈز وائرس HTLV III داخل بھی نہیں ہوا ہے۔

عادت، جذبات، خوف اور غم وغصہ سب علم نفسیات کی بحثیں ہیں لیکن یہی انسان میں عضویاتی تبدیلیوں کی محرک بنتے ہیں خلیاتی تبدیلی ہوتی اور خون متغیر ہوتا ہے۔ اس میں غیر طبعی اجزا شامل ہو جاتے ہیں۔ ان تبدیلیوں سے موت تک انسانی طبی دائرہ بحث میں چلا جاتا ہے تشریحی (Anatomical) نوعیت سے معدہ، جگر، امعاء وغیرہ کی متعدد بیماریاں دماغی بیماریاں، دماغی تغیرات پر موقوف ہیں۔ ایسے اعصاب جو اعضاء سے دماغ تک پہنچتے ہیں فکر و تردد سے بیماریاں قبول کرتے ہیں۔ ترہ معدی (Gastric Ulcers) میں انگریزی کے ہم وزن الفاظ (Hurry, worry, Curry) (عاجلہ پسندی، صدمہ وفکر، چرب اور مسالے دار غذائیں) غیر طبعی اسباب کے ثبوت ہیں۔ خون کے حرام ہونے کی وجہ سے انتقال الدم (Blood Transfusion) کا مسئلہ ماہرین سائنس اور علمائے دین کے پیش نظر شدید متنازعہ ہے۔ سنگین ضرورت میں فقہاء اس کے جواز کے قایل ہیں۔ جدید تحقیق میں بھی ان اندیشوں کا اظہار کیا گیا ہے کہ خون اخلاقی فضائل کے حامل ہیں۔ خون میں RhesusFactor اور گروپ کے اختلافات کی توجیہہ اب تک نہیں کی جا سکی جو والدین اور بچوں تک کے درمیان ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا معاشرتی حالت جسمانی ساخت اور افعال پر اثر انداز ہو یہ طب اور سماجی سائنس کے لیے قابل غور مسئلہ ہے۔

بیسویں صدی کے کئی سوویت سائنس دانوں نے پورے نظام جسمانی کو بیرونی ماحول پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سب سے نمایاں نام پاولو (Pavlov) (۱۸۴۹-۱۹۳۶ء) کا ہے جسے منافع الاعضا (Physiology) میں اپنے تمام سابقین پر اولیت حاصل ہے۔ وہ ۲۰۵ برس تک مسلسل اس تحقیق میں سرگرداں رہا کہ جسمانی افعال کے اسباب کیا ہیں۔ بالآخر اس نے یہ نظریہ دیا کہ نظام ہضم کا انحصار نظام عصبی پر ہے اور اعصابی نظام

تمام جاندار اجسام سمیت بیرونی ماحول کا انعکاسی عمل ہیں جسے اس نے (Reflexes) کا نام دیا ہے۔ اس عمل سے نظام عصب، انسان سمیت تمام خارجی اثرات قبول کر کے جسم کی تشریحی بناوٹ اور افعال کو تبدیل کر دیتے ہیں اور اس طرح بیماری کا موجب بنتے ہیں۔ اس نے اپنی تحقیق میں ثور مز منذرہ (Malignant Tumours) اور متعدد دیگر بیماریوں کا اس سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔ نیز اس پس منظر میں جسمانی خلیات پر وسیع تحقیق کی دعوت دی ہے۔ اس سے پہلے ایک سوویت ماہر سیچے نوو (Sechenov) (۱۸۲۹-۱۹۰۵ء) نے بھی اسی طرح کے اندیشے ظاہر کیے تھے لیکن وہ اپنے خیالات کے لیے زیادہ مستحکم ثبوت فراہم نہیں کر سکا۔ جن اندیشوں کا اس نے اظہار کیا ہے، اس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ ماہر طب تمام بیرونی حالات کو جسم کا ناقابل تقسیم حصہ تسلیم کرتا ہے۔ اپنی کتاب Reflexes of The brain میں اس نے لکھا ہے کہ

> "جاندار کا وجود بیرونی ماحول کے بغیر جس میں وہ قایم ہے، قابل فہم نہیں۔ اس لیے جاندار کی سائنسی تعریف میں اس ماحول کو بھی شامل ہونا چاہیے جس کے اثرات اس پر مرتسم ہوتے ہیں۔"

اسی بات کو Pavlov نے اور زیادہ وضاحت سے تمام جاندار اجسام کی ہم آہنگ حرکات وسکنات Integrated activity of the entire organism کو انسانی ساخت سے مربوط قرار دیا ہے۔

باہمی ربط اور ہم آہنگی کا دائرہ جب اتنا وسیع ہے تو ایک انسان کے افعال دوسرے پر اثر انداز کیوں نہیں ہو سکتے اور خود اس کا اپنا جسم ہی اس کے ذہنی سانچوں میں کیوں ڈھل نہیں سکتا جب کہ اثبات میں طبی ثبوت بھی فراہم ہوں۔ تحقیق کا یہ دائرہ ابھی محدود ہے لیکن نئے حالات اور تجربات کے واضح اشارات ہیں کہ صحت و مرض کی بیشتر توجیہات اب معاشرتی سائنس سے بھی کی جائیں گی۔ سوچنا یہ ہے کہ یہ رہنمائی ان حلقوں سے ہو جو کے پاس ... اور غیر یقینی معاشرتی رہنما اصول ہیں اور مسلم ماہرین سائنس و طب

کی رہنمائی اس لیے نہ کر سکیں کہ دنیا سے سائنس میں ان کی پیش رفت رک چکی ہے۔ وہ جدید تحقیقات سے ناواقف ہیں۔ اس لیے جسمانی تبدیلیوں کو بھی معاشرتی اور ماحولیاتی نقائص میں نہیں دیکھ سکتے جب کہ دنیا کے کسی مذہب میں سائنس اور معاشرت کے درمیان اتنی قربت اور ہم آہنگی نہیں پائی جاتی جتنی اسلام کے نظام حیات و کائنات میں ہے۔ اسلامی نظام زندگی میں سائنس اور معاشرت پہلو بہ پہلو پورے توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ مصروف سفر ہیں۔ قرآن کریم کی کئی آیتوں میں طب کے معاشرتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سائنسی شعبوں میں احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ طب نبوی کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کا ایک سبب طب اور معاشرت کا گہرا تعلق بھی ہے۔ مگر دنیا کی دوسری سائنسوں کی طرح مسلمانوں نے آج طب کو بھی نظر انداز کر دیا۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ جو مسلمان طب کو سمجھنے کے لیے فلسفہ کے دشت و بیابان اور دشوار گزار اُن گھاٹیوں کو طے کرے جن کی کوئی منزل نہیں، جس نے غیر نتیجہ بخش دقیق فلسفیانہ بحثوں میں صدیاں گزار دیں وہ آج طب کو ان معاشرتی رہنمائیوں میں بھی سمجھنے کی کوشش نہ کرے جو وقت کی ناگزیر ضرورت ہیں۔

"اگر مسلمان یہ چاہیں کہ صرف خیرسگالی اور اکثریت کی ہم نوائی سے کام چل جائے گا تو یہ ان کی بہت بڑی بھول ہوگی۔ خیراندیشی اور آشتی بہت ضروری ہے لیکن کافی نہیں ہے۔ اگر ہم خود کو لائق اور کارگزار اور ماہر شہری نہیں بنائیں گے تو ہماری خیرسگالی پہ لوگ مسکرائیں گے یہ ترقی کا قافلہ اور نہ برادرانِ وطن ہمیں ساتھ لے چلنے کے لیے ایک لمحہ بھی رکیں گے۔ انھیں ہم سے یہ شکایت ہوگی اور بجا ہوگی کہ ہم وطن عزیز کی ترقی کی راہ میں حایل ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ نوبت آجائے کہ وہ ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کریں لیکن وہ ان محدود وسایل اور امکانات کو جو ملک کو دستیاب ہیں ہمارے ساتھ بانٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ انھیں تو ہمیں خود بڑھ کر اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لینا ہوگا۔ ان محدود وسایل کے لیے سخت زہرہ گداز مقابلہ حالیہ ہندوستان کے مقدر میں لکھا ہوا ہے جو اس دوڑ میں کارواں کا ساتھ نہ دے پایا، وہ روندا جائے گا، کچلا جائے گا اور کوئی اس بیچارے پسماندہ کے لیے نہیں رکے گا۔ یہاں نہ میٹھی میٹھی باتیں کام آئیں گی، نہ نالہ و فریاد نہ ترحم کی درخواست"

سید حامد

اغراض و مقاصد

۱۔ جہل رجعت پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد۔ ذہنی بیداری، راست روی اور مرابط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگاہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔

۲۔ مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت۔

۳۔ ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی رابطۂ اتحاد کا فروغ اور ان کو ایک دوسرے کے قریب تر کرنے کی کوشش۔

۴۔ ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵۔ ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نقیب سائنسی علوم کی تحصیل اور تبلیغ کی اہمیت پر زور۔

۶۔ سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷۔ علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلئے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودے ٹائپ شدہ یا تقریباً 20 cm x 30 cm سائز کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں کی جگہ چھوڑ کر صاف صاف لکھے ہوئے ہوں اور ناصاف مسودے رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالوں کی وضاحت کے لئے کام کی تصویریں اور تختیاں الگ سے دی جائیں۔ تصویریں سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور صاف ستھری ہوں۔ تصویروں اور ٹیبلوں پر نمبر لگے ہوں اور نمبروں کا مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں ان کو لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

سرپرست : جناب سید ہاشم علی
وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : اسرار احمد ——— جوائنٹ ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : شباب الدین

تزئین : سرفراز ——— انچارج سرکولیشن : مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ اسسٹنٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ &
ASSISTANT.
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ
انڈیا Rs. 46.00
بیرونی ممالک US # 20.00 ہوائی ڈاک
عام US # 8.00 ڈاک

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق ایڈ اسسٹنٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انڈیا

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال اُن سے متفق ہو۔]

اداریہ

ایک ایسے معاشرے کا تصور کیجیے جس میں سب ہی لوگ ہم خیال ہوں، ایک جیسی پسند اور ناپسند رکھتے ہوں ان کے طرز فکر و عمل میں مکمل یکسانی ہو، احساس مسرت و غم، عمل اور ردعمل، جدوجہد اور تلاش و جستجو میں ایک دوسرے کے ہم خیال ہوں۔ کیا ایسا معاشرہ اصل انسانی فطرت اور نفسیات کا واقعی و حقیقی مظہر کہا جاسکتا ہے؟ ایسا معاشرہ تو اس وقت عالم وجود میں آسکتا ہے جب کسی آمر مطلق کی صرف دلوں پر نہیں بلکہ نگاہوں اور زبانوں پر بھی حکمرانی ہو اور اس نے تمام افراد کی ذہنی قوتوں کو سلب کر لیا ہو۔ ایسے معاشرے کے افراد ہمارے اور آپ کی طرح کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، روتے گاتے صبح کو شام کرتے اور شام کو صبح کرتے تو ضرور نظر آئیں گے مگر ہمارا انسان کا جو تصور ہے، اس سے یکسر مختلف اور متضاد ہوں گے۔

ہمارے نزدیک تو اصل اور حقیقی انسانی معاشرہ وہ ہے جس میں فکر و نظر کا اختلاف ہو، لوگوں کی تلاش و جستجو کی راہیں مختلف ہوں، ذاتی پسند اور ناپسند ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ہو، لوگوں کے مزاج میں رنگارنگی ہو، یعنی کہیں حلم کا مظاہرہ ہو تو کہیں سخاوت کا، کہیں رائے کی مضبوطی کا مظاہرہ ہو تو کہیں اپنی راہ سب سے الگ نکالنے کا جذبہ۔ کہیں ملکا سا کھردرا پن ہو تو کہیں ہر بات مصری کی ڈلی۔ کوئی خدا کی شان جباری کی یاد دلاتا ہو تو کوئی اس کی شان قہاری کی یاد، کوئی اس کی شان رحمانی کا پیرتو نظر آتا ہو تو کوئی اس کی شان ستاری کا عکس نظر آئے، لیکن اس تمام رنگارنگی اور اختلاف طبائع کے باوجود اگر ایسے معاشرے کے افراد کسی مقصد کے تحت زندگی بسر کرتے ہوں گے، ان کے پیش نظر زندگی کی پیش رفت کا مسئلہ ہوگا، اگر ان کا جذبہ یہ ہوگا کہ ان کا معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن کر لوگوں کے سامنے آئے تو وہ کثرت میں وحدت اور اختلاف میں اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اور کوئی ایسا نقطہ ضرور تلاش کر لیں گے جہاں آزادی فکر و نظر کی بقا کے ساتھ ساتھ اتحاد و اتفاق اور یک رنگی و یگانگی کے بکثرت مناظر حد نگاہ تک پھیلے نظر آئیں گے۔

اصل مقصود نہ تو اختلاف فکر و نظر پیدا کرنا ہے اور نہ ہی کامل اتحاد و اتفاق اور یک رنگی و یگانگی کو بزور مسلط کرنا ہے انسانی زندگی کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اس مجموعۂ اضداد دنیا کو کس طرح ایک وحدت کی شکل میں دیکھا جائے اور کس طرح اختلاف فکر و نظر کو رفع کر کے اس طرح ترقی کی راہوں پر گامزن ہوا جائے کہ ایک فرد کا سود و زیاں ہر شخص کے سود و زیاں کے پیکر میں ڈھل سکے۔

جو معاشرہ اس اصل مقصود سے ہٹ جاتا ہے وہ انتشار کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس وقت ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس انتشار سے دوچار ہیں، اس کا اصل اور حقیقی سبب یہ ہے کہ ہم ایک بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے علاوہ نہ تو کسی کو دانش مند سمجھتے ہیں اور نہ صائب الرائے، نہ ایمان دار سمجھتے ہیں اور نہ ہی اعلیٰ انسانی صفات کا حامل، نہ تو کسی کی فہم پر ہم کو بھروسہ ہے اور نہ ہی کسی کی فکر پر۔ ہم دوسروں کی اچھی باتوں میں بھی اپنی بدگمانی کی وجہ سے شک وشبہ کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں شکست وریخت کا عمل جاری وساری ہے۔ وہ کون سا شعبۂ حیات ہے جہاں شکست وریخت کے مناظر دیکھنے کو نہیں مل رہے ہیں، خاندانوں میں انتشار پیدا ہو چکا ہے، دیہات، قصبات اور شہروں کی فضا بھی انتشار سے گرد آلود ہوتی نظر آ رہی ہے، انتظامیہ کے اپنے الگ مسائل ہیں اور انتظامیہ ساز ادارے یعنی تعلیمی ادارے بھی اس روش عام سے محفوظ نہیں۔ یہاں بھی زلزلے کے سے آثار ہیں اور جن ستونوں پر یہ ادارے قائم ہیں، ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ وقت کے زلزلے کے جھٹکے کو برداشت بھی کر سکیں گے یا نہیں؟ ابھی چند دنوں پہلے یو۔پی کی راجدھانی لکھنؤ میں طلبا کے احتجاج نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور جس طرح آتش زنی ہوئی تھی کیا وہ مذکورہ انتشار کا مظہر نہیں ہے؟ کیا حصول علم کا فریضہ انجام دینے والوں کو اس بات کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ اس طرح ہلے ولے کرتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئیں اور سرکاری یا نجی املاک کو بلا ضرورت اور بلا مقصد صرف اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے تباہ وبرباد یا نیست ونابود کر دیں؟

تعلیمی اداروں میں اختلاف فکر ونظر کا ہونا ان کی پیش رفت کا ضامن ہوتا ہے لیکن جب یہی اختلاف ذاتی بغض وعناد، الزام تراشی اور جوابی الزام تراشی، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا دینے کے جذبے میں بدل جاتا ہے تو پھر یہ اختلاف فکر ونظر نہیں رہ جاتا بلکہ مخالفت یا یوں کہیے کہ اندھی مخالفت میں تبدیل ہو کر ایک ایسی گھناؤنی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے ہر اس شخص کو متنفر ہونا چاہیے جو اخلاقی اقدار کا پاس ولحاظ رکھتا ہے۔ اندھی مخالفت وہ برائی ہے جس کو جڑ سے ختم کرنے کی کوشش ہر ذی ہوش فرد کا فرض ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بہت مشہور حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان کسی برائی کو دیکھے تو اس کو اگر طاقت وقدرت ہو تو بزور ختم کر دے، اگر اس کی قدرت وطاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کو برا کہے اور اگر وہ ایسا بھی نہ کر سکے تو اس برائی کو دل سے ضرور برا سمجھے۔ تیسری بات کے سلسلے میں آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ مگر یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں، ان کو اپنا ہادی ورہنما مانتے ہیں، ان سے میدان حشر میں شفاعت کی امید رکھتے ہیں، ہم ان حضرات سے امید رکھتے ہیں کہ انتشار کی برائی کو ختم کرنے کے لیے ہم شانہ وہم گام ہو جائیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ذاتی بغض وکینہ، عناد ومخاصمت، اندھی مخالفت اور الزام تراشی کو بالائے طاق رکھ کر کثرت میں وحدت اور رنگارنگی میں یک رنگی دیکھنے اور دکھانے کے عمل میں خود کو ہمہ تن مصروف ومنہمک کر دیں گے۔ یہ صرف اخلاقی ہی نہیں بلکہ ہمارا مذہبی فریضہ بھی ہے۔

کبیر احمد جائسی

مکتوب شیخ الجامعہ

Aligarh Muslim University
OFFICE OF THE VICE CHANCELLOR
UNIVERSITY ROAD ALIGARH-202001
TELEPHONE OFF: 3994 RES: 3173 TLX 564-230 CEA-IN

SYED HASHIM ALI
VICE CHANCELLOR

عزیزو!

نیا تعلیمی سال مبارک۔ خدا کرے کہ آپ میں سے بہتوں کی زندگی میں یہ تعلیمی سال ناقابل فراموش سنگ میل بنے اور بہتوں کے لیے آغازِ سفر کا دشوار گزار مگر خوش کن مرحلہ۔ اس موقع پر پہلے میں اُن طلبا سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں جو پہلی بار اس عظیم تعلیمی ادارے میں داخلہ لے کر اس کی عظیم الشان تاریخ کا نہ صرف ایک جزو بن رہے ہیں بلکہ اُن پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہو رہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے ساتھ ساتھ اس ادارے کی صالح روایات کے پاسدار اور امین بھی رہیں۔ یوں تو ہندوستان میں بہت سے تعلیمی ادارے ہیں جن سے لاکھوں طلبا فیض یاب ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں اور ملک کی پیش رفت کے کاموں میں اپنا اپنی بساط کے مطابق حصہ لیتے ہیں، لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں ہے یہ ایک تربیت گاہ بھی ہے اور تہذیب کا گہوارہ بھی۔ اس کی یہ خصوصیت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک ہر تازہ وارد طالب علم اس کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالتا رہے گا۔ جس دن یہ عمل ختم ہوا، اُسی دن سے اس ادارے کی انفرادیت خاک میں مل جائے گی اور یہ دوسرے تعلیمی اداروں کی طرح ہو کر رہ جائے گا۔

زندگی کی معراج تو کسی مقصد کے تحت سرگرم عمل رہنا اور اس سے انحراف نہ کرنا ہے۔ اگر کسی مقصد کے تحت زندگی بسر کی جاتی ہے تو پھر شکست و فتح کے الفاظ اضافی بن جاتے ہیں اور زندگی کا اصل اور حقیقی محور مقصد ہی قرار پاتا ہے۔ بامقصد زندگی میں بھی شکست کے مراحل آتے ہیں مگر یہ عارضی اور لمحاتی ہوا کرتے ہیں۔ مقصدیت، احساس شکست سے انسان کو بد دل، بے عمل اور بے حوصلہ نہیں ہونے دیتی بلکہ اس کو اس بات کا جائزہ لینے پر مجبور کرتی ہے کہ اس عارضی شکست کے اسباب کیا ہیں اور اس شکست کو کس طرز فکر، طرز عمل کی تبدیلی اور عمل پیہم سے فتح میں بدلا جاسکتا ہے؟ اسی طرح بامقصد زندگی کی فتح انسان کو نہ خود رائے بناتی ہے اور نہ فرعون بے سامان، نہ دوسروں کا حق مارنے والا بناتی ہے اور نہ ہی اس کو غرور کے نشے میں چور کرتی ہے۔ بلکہ یہ فتح بامقصد انسان کو اس بات پر متنبہ کرتی رہتی ہے کہ اس کی ہر لمحہ اور ہر آن نگہداری کی جائے تاکہ کوئی فتح ذرا سی غفلت کی وجہ سے شکست میں تبدیل نہ ہو جائے۔ تعلیم بجائے خود مقصد ہے، تعلیمی دنیا میں شکست و فتح کے الفاظ صرف اضافی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اصل چیز تو مقصد ہے جس کی آپ کو نہ صرف پاسداری کرنی ہے بلکہ اس کی بقا کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بھی صرف کرنا ہے۔ یاد رکھیے! بامقصد زندگی کی شکست تو فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے مگر بے مقصد زندگی کی فتح ایک ایسا کھوٹا سکہ ہے جو دنیا کے کسی بازار میں چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کو صرف دیکھا جاسکتا ہے، اس سے اپنے پندار

اور نفس کو جھوٹی تسکین دی جاسکتی ہے، اس پر بے جا فخر و غرور بھی کیا جاسکتا ہے مگر زندگی کے اس بازار میں وہ صرف کھوٹا سکہ ہی رہے گی، سکۂ رائج الوقت نہ بن سکے گی۔ اس لیے میں اپنے طلبا کو یہ مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ بامقصد زندگی اپنائیں، اسی کے تحت اپنی زندگی گزاریں، وقتی شکست سے ملول و بددل نہ ہوں اور جب فتح حاصل کرلیں تو فرعون بے سامان یا اپنی انا کا پجاری بننے سے گریز کریں۔

میں امید کرتا ہوں کہ یونیورسٹی کے نئے طلبا اپنے آپ کو یہاں کی صالح روایات کے سانچے میں ڈھالیں گے اور اپنے آپ کو اس طرح کا بنائیں گے کہ جب وہ یہاں سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوں تو اس ادارے کے در و دیوار پکار پکار کر کہہ اٹھیں ؏

یہ شاہ سوار کسی کے نہیں ہمارے ہیں

اب میں چند باتیں سینیر طلبا سے کہنا چاہتا ہوں۔ گزشتہ چار برسوں سے یونیورسٹی میں جو امن و امان ہے، جس طرح سے تدریسی اور تحقیقی کام ہو رہا ہے، وقت پر امتحانات اور داخلے ہو رہے ہیں، ان چیزوں نے آپ کی مادر علمی کی نیک نامی میں اضافہ کیا ہے اور ملک کے سنجیدہ ماہرین تعلیم آپ کے ادارے کو شور و شر کی دنیا میں ایک ایسا پرسکون جزیرہ قرار دے رہے ہیں، جہاں شرافت، متانت، ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ ہی ساتھ علم کی شمع جلائے رکھنے کا مقدس عمل تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے علم کی عظمت اور تقدس کو پہچانا، اس کے فروغ میں سرگرم ہوئے اور کسی اندرونی یا بیرونی دباؤ کے اثر میں آکر ہنگامہ آرائی سے گریز کرتے رہے۔ امن و سکون کے اس ماحول کے لیے وہ سنجیدہ اور سمجھدار طلبا تعریف کے مستحق ہیں جنہوں نے جھوٹی افواہوں، غیر ذمہ دارانہ الزام تراشیوں، یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے خطرے میں ہونے کے بے بنیاد نعروں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا اور شر پسندوں کی فتنہ پردازیوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کے سماج میں بھی اس طرح کے لوگ ہیں جو یہ نہیں چاہتے کہ آپ سکون اور اطمینان کے ساتھ تعلیم حاصل کریں اور تحقیق کے میدان میں آگے بڑھتے جائیں۔ ان کی ساری کوشش تو اس بات پر مرکوز ہے کہ آپ کو ہنگامی یا وقتی مسائل میں الجھا کر اپنے مقاصد حاصل کریں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایسے "مہربانوں" کو خوب پہچان لیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آپ اپنے کو ایسے "مہربانوں" کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھیں گے۔ یاد رکھیے کہ اس ادارے کی ساری عظمت، شان و شوکت اور نیک نامی کے ضامن آپ ہیں۔ یہ یونیورسٹی آپ کی ہے، یہاں کی ایک ایک اینٹ بلکہ ذرہ ذرہ آپ کا ہے۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ اس کی حفاظت کریں اور اس کی عظمت شان و شوکت اور نیک نامی میں اپنی مسلسل محنت، دلسوزی اور اخلاص سے روز بروز اضافہ کرتے جائیں۔

زندگی کا کارواں بڑی تیز رفتاری سے رواں دواں ہے۔ قانون قدرت یہ ہے کہ جو ذرا سا بھی رکا پیچھے رہ گیا ہے اور پھر اس قابل نہیں رہ سکا ہے کہ اس تیز رفتار کارواں کا ساتھ دے۔ آپ قانون قدرت کے اس نکتہ کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلیں اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو یکجا کرکے کاروان زندگی کے راہی بنے رہیں۔ قومیں افراد سے بنتی ہیں، جس قوم کے افراد زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں، رفتہ رفتہ وہ قوم بھی پسماندہ ہو جاتی ہے۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ تیز رفتار کاروان زندگی کا ساتھ دیتے رہیں تاکہ آپ کی قوم پس ماندگی کا شکار نہ ہوسکے۔

میری آخری گزارش یہ ہے کہ آپ جو خاموش اکثریت کہلاتے ہیں اپنی یونیورسٹی کو ان لوگوں سے بچائیے جو سیاسی اغراض کے لیے ہمیشہ یونیورسٹی میں بدامنی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دعاگو

محبت

سر سید احمد خاںؒ

فرض کرو کہ کوئی شخص کسی سے محبت رکھتا ہے، ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ:

'تم اس سے کیوں محبت رکھتے ہو؟'

وہ اس کا جواب دیتا ہے کہ:

میرا بڑا محسن ہے۔ اس نے بڑے مشکل مشکل وقتوں میں مجھ پر احسان کیے ہیں تنگی کے وقت روپیہ سے مدد کی ہے۔ بیماری کی حالت میں میری تیمارداری کی ہے۔ دوا دارو، علاج معالجہ میں بڑی کوشش کی ہے۔"

یا وہ اس کا یوں جواب دیتا ہے کہ:

'ہم اور وہ مدت تک ساتھ رہے ہیں۔ دن رات آپس میں اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ساتھ رہا۔ روز روز کی ملاقات، بات چیت ہنسی مذاق، دل لگی، مزاج کی باہمی موافقت کے سبب آپس میں دوستی و محبت ہو گئی ہے۔"

یا وہ کہتا ہے کہ:

"جو فن کا مجھ کو شوق ہے، اس فن کا اس کو بدرجہ غایت کمال ہے۔ اس فن کے کمال کے سبب جس کا مجھ کو شوق ہے اس شخص سے دلی محبت اور جانی دوستی ہو گئی ہے۔"

یا اس کا سبب وہ یہ بتلاتا ہے کہ:

" وہ شخص نہایت خوب صورت ہے۔ اس کے حسن و جمال نے میرے دل میں اس کی محبت بلکہ اس کا عشق پیدا کر دیا ہے۔"

پھر ہم اس سے دوسرا سوال کرتے ہیں اور کسی بزرگ کا بزرگانِ دین میں سے نام لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ:

" تم ان بزرگ سے بھی محبت رکھتے ہو؟"

وہ جواب دیتا ہے کہ:

" ہاں کیوں نہیں؟"

تب ہم اس سے کہتے ہیں کہ:

" وہ بزرگ تو تم سے کئی سو برس پہلے گزر چکے ہیں۔ انھوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ کسی مشکل کے وقت تمہارے کام نہیں آتے۔ کبھی تنگی کے وقت میں تم کو کچھ نہیں دیا کبھی تمہاری تیمارداری نہیں کی۔ کبھی تمہاری دوا دارو اور علاج معالجہ میں کوشش نہیں کی۔ کبھی وہ اور تم ساتھ نہیں رہے، نہ کبھی ساتھ اٹھے بیٹھے، نہ کبھی آپس میں ملاقات بات چیت ہوئی نہ کبھی ہنسی مذاق ہوا، نہ کبھی باہم مزاجی موافقت ہوئی۔ جس فن کا تم کو شوق ہے، وہ اس کا

نام تک نہیں جانتے تھے۔ نہ تم نے ان کو دیکھا کہ اُن
کے حسن و جمال نے تم کو فریفتہ کر لیا ہو۔ پھر کیوں
تم اس سے محبت رکھتے ہو ؟"

اس سوال کا وہ نہایت ناراض ہو کر اور لال منہ کر کے غصہ
بھری آواز سے جواب دیتا ہے کہ :

" میاں! وہ بزرگان دین تھے۔ خدا کے ہاں ان
کا بڑا درجہ ہے۔ وہ دین داری میں یگانۂ وقت
تھے۔ ایمان کامل ان کو نصیب تھا۔ دین میں سب
کے سردار تھے۔ ہم اس لیے اُن سے محبت رکھتے
ہیں۔"

اب میں بتاتا ہوں کہ یہی پچھلی محبت، محبت من حیث الدین
ہے جس کو میں حبِّ ایمانی کہتا ہوں اور یہی محبت غیر مذہب
سے رکھنی شرعاً ممنوع اور حرام، بلکہ کفر ہے اور پہلی محبت
جس کو میں حبِ انسانی کہتا ہوں شرعاً ممنوع نہیں۔ دونوں قسم کی
محبت میں بالبداہت تفرقہ و تمیز موجود ہے کہ ایک قسم کی محبت
اُن اسباب ظاہری کے باعث تھی جو بمقتضائے فطرت انسانی ایک
کو دوسرے کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں اور دوسری قسم کی محبت
باوجود معدوم ہونے ان تمام اسباب ظاہری کے من حیث الدین تھی
اب کون شخص ہے جو ان دونوں قسم کی محبت میں تمیز نہیں کر سکتا ؟

پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے
سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے، یہ اُن کی غلطی ہے۔
جو چیز کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے وہ برحق
اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے خواہ وہ کسی مذہب
کے ہوں، سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیے مگر
وہ تمام محبت اور دوستی حبِ انسانی کے درجے میں ہو نہ حبِّ
ایمانی کے، کیونکہ حبِ ایمانی بلا اتحاد مذہب، بلکہ بلا اتحاد مشرب
ہونی غیر ممکن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے
سچے مذہب اسلام نے کی ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
" کامل ترین ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق
اچھے ہوں اور تم میں اچھا وہ ہے جو اپنی بیویوں سے
حسن سلوک سے پیش آئے۔"

[ترمذی]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸، شمارہ ۸ (اگست ۸۹ء)

اردو کی بقا، ترویج و ترقی کے مسایل

سید ہاشم علی اختر*

میری مادری زبان اردو ہے اور میری ساری تعلیم سائنس کی ماسٹر ڈگری تک جامعہ عثمانیہ کی بدولت ہوئی ہے۔ میرا ذہنی نشوونما حیدرآباد کے خالص اردو ماحول میں ہوا، جہاں سرکاری نظم و نسق، اعلیٰ جامعاتی تعلیم بشمول مضامین سائنس اور ہائی کورٹ کی زبان اردو تھی۔ آزادی کے وقت اردو ہندوستان کی وہ واحد زبان تھی جو جامعہ عثمانیہ کی وجہ سے اس قدر ترقی یافتہ حالت میں تھی کہ تمام عصری ضروریات کے لیے بغیر کسی مزید کوشش کے استعمال ہو سکتی تھی۔ اِس ماحول سے آزادی کے بعد اچانک سارا کام انگریزی یا علاقائی زبان میں ہونے لگا۔ میری زندگی کے پچھلے تیس سال نظم و نسق کے پیشے میں ملکی مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے علاوہ اردو کے مسلسل تنزل کو دیکھنے میں صرف ہوئے۔ لہٰذا اس مضمون میں میرا طرزِ فکر ایک ایڈمنسٹریٹر کا ہے کہ اگر میرے ذمے اردو کی بقا، ترویج اور ترقی کا کام سونپا جائے تو میں کیا کروں گا۔ اسی پس منظر میں میرے ذہن میں یہ سوالات آئے۔

۱۔ اردو کیا ہے؟ ۲۔ اردو والے کون ہیں؟
۳۔ اردو کا مسئلہ کیا ہے؟ ۴۔ کیا اردو والے اپنے مقصد کے تعین میں عقلی ہیں یا جذباتی اور کیا یہ مقصد خود ان پر واضح ہے؟ ۵۔ ان کے مطالبات کیا ہیں۔ ان کے مطالبات کی عدم تکمیل کی وجہ کیا ہے؟ ان کی شکایات کیا ہیں؟ مطالبات اور شکایات کی واجبیت کیا ہے؟
۶۔ مقصد کے حصول کے لیے خود ان کی طرف سے کیا کوشش ہوئی ہے اور کیا مقصد کا تعین اور حصول کی کوشش صحیح خطوط پر ہوئی ہے؟ (۷) کیا اردو والوں کی موجودہ پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور اگر ہے تو کن خطوط پر؟

میرا خیال اس بات پر بھی گیا کہ اردو کے بارے میں جدوجہد کرنے والوں میں اکثریت ان اصحاب کی ہے جو آزادی سے قبل کے ماحول میں پیدا ہوئے۔ جب کہ اردو (ہندوستانی۔ہندی) فارسی رسم خط میں (جس میں ہندی آوازوں کے بھی حروف بھی شامل کر لیے گئے تھے) ہندوستان کی عام زبان تھی اور ان میں بہت کم لوگ ایسے شامل ہیں جو آزادی کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ اِس وجہ سے جدوجہد کرنے والے ماضی کے نمائندہ ہیں حال اور مستقبل کے نہیں۔ میری دانست میں نوجوان دانش وروں کو بھی اس مسئلے کے تعین اور حل کی کوشش میں شامل کرنا چاہیے۔

اردو کے مسئلے پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اردو کیا ہے؟ اس بارے میں اردو داں اور غیر اردو داں عوام میں خدشہ پائی جاتی ہے۔ بعض اردو والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا ہندی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور بعض غیر اردو والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

* وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

میں نہ لسانیات کا ماہر ہوں نہ تاریخ ادب اردو کا۔ لہذا اگر میرے تجزیے سے ماہرین کو اختلاف ہو تو اس کی معافی ابھی سے مانگ لیتا ہوں۔

صدیوں سے شمالی ہند کی ایک عام زبان یا لنگوا فرینکا ہے جس کا نام ہیئت ترکیبی اور رسم خط بدلتے رہے ہیں۔ یہ مختلف ادوار اور علاقوں میں معمولی صرفی اختلاف کے ساتھ مختلف ناموں سے موسوم رہی ہے۔ جیسے برج میں برج بھاشا، راجستھان میں راجستھانی، دہلی اور اطراف دہلی میں ہریانوی کھڑی بولی، ہندی، ہندوی، دہلوی، ریختہ، اردو، عہد انگریزی میں ہندوستانی رومن اردو، گاندھی جی کی ہندی اتھوا ہندوستانی، دستور ہند کے بعد کی نئی سرکاری ہندی اور عوام کی آسان لوک ہندی یہی زبان پانچ سو سال پہلے دکن گئی تو دراوڑی زبانوں کے ماحول میں بہت کچھ اپنے ہندی خمیر پر قایم رہی اور ہندی، ہندوی اور زبان ہندوستان کہلائی۔ چند صدیوں کے بعد اسی کا نام پایا۔ گجرات گئی تو گجری کہلائی۔ اس پر مذہبی کتابوں اور سرکاری زبانوں کے اثرات ہوتے رہے اور سنسکرت، عربی، ترکی، فارسی، ڈچ انگریزی اور دوسری ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں کے بہت سے الفاظ اس میں شامل ہوتے رہے۔ اور اس کا مسلسل ارتقا ہوتا رہا۔ مغلوں سے پہلے کے سلطنت کے زمانے میں یہ زبان سرکاری زبان فارسی کے رسم خط میں بھی لکھی جانے لگی جس طرح پشتو، پنجابی اور سندھی آج بھی عربی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔ انگریزوں کے عہد میں اس کو فوجی اور سول عہدے داروں کی سہولت کے لیے رومن رسم خط میں رومن اردو کہا جانے لگا۔ یہ عوامی زبان کبھی سرکاری زبان نہیں رہی سوائے ایک مختصر مدت کے جب مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد انگریزوں نے فارسی کی جگہ اس کو استعمال کیا اور ریاست حیدرآباد میں ۱۸۸۴ سے ۱۹۴۸ تک یعنی صرف ۶۴ سال۔ آج بھی سرکاری ہندی کی ہیئت ترکیبی اور مقبول عام زبان میں جو فلموں، گیتوں اور بازاروں کی عام زبان ہے کافی فرق پایا جاتا ہے۔

۱۷۹۰ء میں شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے اردو کے پہلے ترجمۂ قرآن شریف کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ قرآن شریف کا پہلا ہندی ترجمہ ہے۔ حالانکہ رسم خط فارسی تھا" (صدق جدید)

شاید اسی سال جان گلکرائسٹ نے اسے ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا۔ اس لیے کہ اس نے یہ محسوس کیا کہ اُسے بعض ہندوستانی دیوناگری میں لکھنا پسند کرتے ہیں اور بعض فارسی رسم خط میں۔ چنانچہ اس نے فورٹ ولیم کالج میں دونوں رسم خط استعمال کیے اور کتابیں شایع کیں۔ ۱۸۴۴ء میں ہسٹری آف سنسکرت لٹریچر شایع ہوئی جس میں مرتب نے بتایا ہے کہ سنسکرت جب ہندوستان میں آئی تو سیدھی طرف سے لکھی جاتی تھی اور ایسے کتبے اب بھی افغانستان میں موجود ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں گاندھی جی نے اس عوامی زبان کی اس طرح تعریف کی

قومی زبان کل ہند بول چال کے لیے ہندوستانی زبانوں میں سے ایک زبان کی ضرورت ہے۔ جس کو ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ لوگ جانتے اور بولتے ہوں اور دوسرے آسانی سے سیکھ سکتے ہوں۔ یہ زبان بلاشبہ ہندی ہے۔ یہ شمالی ہندوؤں اور مسلمانوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جب اردو رسم خط میں لکھی جاتی ہے تو اردو کہلاتی ہے۔ کانگریس نے ۱۹۳۵ء کے کانپور سیشن کے مشہور ریزولیشن میں اس مروجہ زبان کو ہندوستانی کہا ہے۔۔۔۔ یہ قومی زبان ہم کو اس قابل بنائے گی کہ ہم اس میں گفتگو کر سکیں اور دونوں رسم خط میں لکھ سکیں۔

آزادی کے بعد ۲۴ر اگست ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم ہند کے بعد اپنے مضمون گورنروں اور وزیروں کے ضابطۂ عمل - Code of Conduct میں لکھتے ہیں ـــــ "وہ دونوں رسم خط سیکھیں (ہندی اور اردو) اور اپنے رفیقوں سے انگریزی میں بات کرنے سے بچیں" یا وہ اپنی ریاست کی زبان میں بات کریں جس کے وہ گورنر ہیں اور ہندوستانی میں جو ہندوستان کی عام زبان ہے اور ناگری اور اردو رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ یہ نہ سنسکرت آمیز ہندی ہے اور نہ فارسی آمیز اردو۔ بلاشبہ ہندوستانی وندھیا رینج کے شمال میں

کروڑوں کی زبان ہے۔"

پروفیسر رومیلا تھاپر نے لکھا ہے

ہندی دلی کے اطراف و اکناف اور موجودہ اتر پردیش میں بولی جاتی تھی۔ ۔ ۔ جب صوفی اس علاقے میں آباد ہوئے تو ابتدائی ہندی کو ہندوی کے نام سے موسوم کرکے عوام کے وسیع تر طبقے کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بعد میں یہ زبان بھکتی تحریک نے استعمال کی، جس میں کبیر، نانک، سورداس اور میرا بائی قابل ذکر ہیں۔ اس سے زبان کے رتبے میں مزید اضافہ ہوا۔ اس سے قبل دوسرے لکھنے والوں نے جن میں امیر خسرو جو سلطانوں کے شاعر تھے اور عام طور پر فارسی میں لکھتے تھے، اسی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ جس بات سے اس زبان کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی وہ یہ تھی کہ یہ زبان اردو کے والدین۔ CO PARENT میں سے ایک تھی۔ اردو یعنی لشکری زبان سلطانی کی لنگوا فرنیکا بنتی جارہی تھی۔ اس لیے کہ یہ ہندی قواعد اور فارسی عربی الفاظ کے اشتراک سے بنی تھی، روزمرہ جو لوگ اردو استعمال کرتے تھے وہ ہندی سے بھی واقف تھے۔

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری اپنے کلام کے مجموعے "پچھلی رات" کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے جس زمانے میں اردو شاعری نے جنم لیا اور پروان چڑھی اس وقت ہندوستان میں تعلیم کا معیار پست تھا اور ہماری علمی و فکری زندگی عام طور سے بےجان تھی۔ اس دوران میں ہماری زندگی بڑی حد تک انحطاط کا شکار رہی۔ ۔ ۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو داغ اور امیر کی مسموم شاعری ہندوستان پر چھائی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ نئی اور صالح زندگی کے آثار بھی نمودار ہوچکے تھے۔ آسی غازی پوری شاد عظیم آبادی، حالی پانی پتی اور ان کے بعد چکبست اور اقبال اور ان کے متعدد معاصرین ایک نئی جیتی جاگتی صوتیات کو جنم دے رہے تھے۔ یہ زمانہ اردو شاعری کے انحطاط اور آنکھ کھلتے ہوئے نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا تھوڑے دنوں بعد ایک نئی مصیبت بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ مصیبت جو اب تک دور نہیں ہوئی ہے، بلکہ بڑھتی جارہی ہے، اردو دشمنی کا طوفان ہے لیکن فکر و تامل کے قابل یہ امر بھی ہے کہ ہندی تحریک کو بھی سہارا لینا پڑا اسی مغربی ہندی کا جس کی بنیادوں پر اردو کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو ایک طوفان نفرت کے مظاہرے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ہندی داں عوام و خواص میں ناگری رسم خط میں چھپ کر اردو شاعری کے صدہا نمونے کروڑوں کی تعداد میں محض ہندی داں اہل وطن میں مقبول ہوتے گئے۔ دیکھیے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے میں نے اپنی غزلوں میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس مغربی اور مقبول اور عام ہندی کو جس کا نام اردو زبان و ادب ہے زیادہ ترما دوں اور اس میں گنگ و جمن کے دوآبے کی شادابی اور انسانی تہذیب کے رس جس کو سمو دوں۔"

"میں نے کچھ عرصے قبل بی بی سی کے اردو ہندی پروگرام میں ہندی کے مشہور ناول نگار گلشن نندہ کا ایک انٹرویو سنا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس زبان میں لکھتے ہیں تو ان کا جواب تھا۔

"میں پنجابی میں سوچتا ہوں اردو میں لکھتا ہوں اور ہندی میں چھاپتا ہوں۔"

فارسی کئی سو سال تک ہندوستان کے بڑے علاقے کی سرکاری زبان رہی ہے اور اس کا اثر ساری علاقائی زبانوں پر ہوا۔ چنانچہ جنوبی ہند کی زبانوں خصوصاً تلگو میں اس کے بہت سے الفاظ مروج ہیں۔ حالانکہ یہ ایک دراوڑین زبان ہے اور جیسا کہ ہندوستان کی ہر زبان میں اس وقت انگریزی کے الفاظ شامل ہوچکے ہیں، اسی طرح فارسی سے بھی نئے انداز، تصورات اور انداز بیان

کے انداز ہندی میں منتقل ہو گئے اور ہندی کے Base یا بنیاد پر فارسی اور دیگر زبانوں کے طویل لسانی اختلاط کے نتیجے میں اردو پیدا ہوئی جو اس زمانے کے سرکاری رسم خط فارسی میں بھی لکھی جانے لگی۔ لہٰذا اردو ایک روادار وسیع آغوش اور ترقی یافتہ ہندی ہے جو غیر زبانوں کے الفاظ شامل کرنے اور رسم خط اختیار کرنے میں کوئی تعصب نہیں برتتا اور جس کے دو اہم اجزا ہندی اور فارسی دونوں آرین ہیں۔

اردو کے بعد اردو والوں کا تعین بھی ضروری ہے تاکہ مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس مضمون میں اردو والوں سے میری مراد وہ لوگ ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ لوگ بھی جن کی مادری زبان اردو نہ ہونے کے باوجود اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔

اردو بولنے والوں سے میری مراد وہ لوگ ہیں جو اس عوامی زبان کو بولتے ہیں، ان کی حسب ذیل قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو اس کو اردو کہتے ہیں اور فارسی رسم خط پر معترض نہیں ہیں۔

دوسرے وہ جو اس زبان کو ہندی یا ہندوستانی بولتے ہیں اور اردو کو محض رسم خط کا فرق سمجھتے ہیں۔

تیسرے وہ جو اس کو ہندی بولتے ہیں اور اردو جاننے سے انکار کرتے ہیں۔

اردو اور اردو والوں کے تعین کے بعد اب اردو کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جدوجہد آزادی کے زمانے اور آزادی اور تقسیم ہند کے بعد سیاسی وجوہات کی بنا پر اردو کی مخالفت شروع ہوئی اور لسانی ریاستوں کے قیام کے بعد مزید مسائل پیدا ہوئے۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ اردو والے ہندی کو مقام نہیں دینا چاہتے تھے جس کے لیے وہ آج خود جدوجہد کر رہے ہیں اور گاندھی جی کے دو رسم خط والے فارمولے کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، جس کی بنا پر یہ ترقی یافتہ زبان سارے ملک کی مسلمہ زبان بن سکتی تھی۔ ان اختلافات کا ماحصل سردار پٹیل کے کاغذات میں جو کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے اس مروجہ زبان کو ہندوستانی کے نام اور دیوناگری رسم خط میں ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے کی پیش کش کی تھی لیکن لیاقت علی خاں نے جو تقسیم ہند چاہتے تھے، اس پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ یہ آفر دراصل تاریخ کو دہرا رہا تھا جس طرح چند صدیوں قبل عوامی زبان کو اس زمانے کے سرکاری رسم خط فارسی میں لکھا جانے لگا اسی طرح سردار پٹیل کی تجویز کی بنا پر آزادی کے زمانے کی فارسی آمیز عوامی زبان کو سرکاری زبان کے رسم خط میں جو شمالی ہند کی اکثریت کا رسم خط بھی تھا، لکھے جانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اردو والوں کے لیے دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ زبان کی موت یا ایک زائد رسم خط کا اختیار کر لینا اور یہ موقع ہاتھ سے چلا گیا۔

مجلس دستور ساز میں دو گروہ تھے جن میں سے ایک مروجہ عوامی زبان ہندوستانی کو سرکاری زبان بنانے کا حامی تھا اور دوسرا خالص ہندی کو۔ پنڈت نہرو مروجہ زبان کی تائید میں تھے۔ رائے شماری کے وقت دونوں گروہوں کو مساوی ووٹ ملے۔ اور صدر کے کاسٹنگ ووٹ سے ہندی سرکاری زبان بن گئی۔ اس فیصلے کی تعمیل میں حکومت کو مختلف اقدامات کرنے پڑے جو اس کے لیے ضروری تھے۔ حالانکہ اس وقت کے سارے لیڈر ہندوستانی بولتے تھے اور ان کو سرکاری زبان بولنے میں ابتدائی چند جملوں کی حد تک کامیابی ہوتی تھی اور پھر وہ مروجہ زبان بولنے لگتے تھے۔ ہندوستان کے چاروں وزیراعظم بڑی حد تک مروجہ زبان بولتے تھے اور آزادی کے تیس سال بعد ۱۹۷۸ء کے یوم آزادی کی لال قلعہ والی تقریر میں اس وقت کے وزیراعظم نے اسی سے زیادہ فارسی اور عربی الفاظ (بشمول تکرار الفاظ) استعمال کیے۔

مجلس دستور ساز کے فیصلے کی تعمیل میں سرکاری زبان سے بدیسی زبانوں کے مقبول و مروجہ الفاظ کو نکالا گیا۔ اس قسم کی کارروائی ترکی اور ایران میں بھی کسی زمانے میں ہوئی تھی، جب کہ

ان زبانوں سے عربی کے الفاظ نکالے گئے تھے۔ علاوہ اور اقدامات کے دو اقدام یہ بھی تھے کہ ریڈیو پر فلمی گانے بند کیے گئے، جو عوامی زبان میں ہوتے تھے اور تیس سال بعد آج بھی ہوتے ہیں۔ ہارمونیم کا استعمال بند کیا گیا جس کے ساتھ عوامی زبان کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔ یہ پالیسی تقریباً پچیس سال تک جاری رہی اور سارا ہندوستان دن بھر ریڈیو سیلون سنتا رہا، جہاں سے فلمی گانے اور غزلیں نشر ہوتی تھیں۔ چند سال قبل آل انڈیا ریڈیو نے پالیسی تبدیل کی اور اب وودھ بھارتی کے پنچ رنگی پروگرام میں فلمی گانے، غزلیں اور ڈرامے اُسی عوامی زبان میں نشر ہوتے ہیں جس کو گاندھی جی نے ہندی اتھوا ہندوستانی کا نام دیا تھا۔ یہ سب سے زیادہ پسندیدہ پروگرام سمجھا جاتا ہے اور ہر ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتا ہے جس میں اعلانات تو سرکاری زبان یا علاقائی زبانوں میں ہوتے ہیں لیکن پروگرام عام فہم زبان میں اور یہی گانے جو ہندی پروگرام میں سنائی دیتے ہیں۔ یہی اردو کے خصوصی پروگرام میں بھی ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اعلانات کی زبان مختلف ہوتی ہے اب ٹیلی ویژن کے عام ہونے کے بعد سے سارے پاپولر پروگرام جن میں سیریل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور سارے اشتہار جن کا مقصد زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچنا ہوتا ہے، سب اسی عام فہم زبان میں ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مروجہ فارسی رسم خط والی زبان نئی قایم ہونے والی مملکت کی ایک مسلّم زبان کی حیثیت سے قایم رہی۔ اس وجہ سے اور دوسری سیاسی وجوہات کی بنا پر بھی ہندوستان میں اس عام زبان کو ایک فرقہ کی زبان کہا جانے لگا۔ اور یہ غلط فہمی ابھی تک باقی ہے اور بد قسمتی سے اردو دوست اور اردو دشمن دونوں طبقوں میں ہے۔ لسانی ریاستوں کی تشکیل کے بعد سہ لسانی فارمولے میں ریاستی زبان، قومی سرکاری زبان اور بین الاقوامی زبان انگریزی کو شامل کیا گیا اور اس فارمولے کے باعث فارسی رسم خط والی عام زبان ہر ریاست میں اقلیتی زبان بن گئی۔ چند سال قبل السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں ایک ماہر لسانیات نے لکھا تھا کہ "اردو ہندوستان کی عام زبان ہے لیکن غلط رسم خط میں۔" اگر یہ ادعا صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عوام کی اکثریت کو اردو سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ البتہ ان کے پاس فارسی رسم خط سیکھنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ وقت۔ وہ اس عوامی زبان کو لشکری زبان کے محدود نام سے یاد نہیں کرنا چاہتے اور ہندی کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن گزشتہ تیس سال میں سرکاری اور درسی کتابوں کی ہندی اور اس عوامی ہندی میں اس قدر فرق آچکا ہے کہ گاندھی جی کے فارمولے کو موجودہ حالات کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اردو ہندوستانی عوام کی یک جہتی اور دو آرین زبانوں ہندی اور فارسی کے طویل لسانی اختلاط کی آئینہ دار زبان ہے اور جب ناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے تو لوگ ہندی کہلاتی ہے۔

اب میں اردو والوں کے مقصد کے تعین، مطالبات، شکایات اور موجودہ پالیسی میں (اگر کوئی ہے) تبدیلی کی ضرورت پر مزید لکھے بغیر آزادی اور لسانی ریاستوں کے قیام کے بعد اردو والوں کے لیے جو مسائل پیدا ہوئے ان کے حل کے لیے ایسے سوالات اُٹھانے کی کوشش کروں گا جن پر غور کر کے صحیح فیصلے کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے ان پر غور کرنے کے بعد کسی ایسی فعال اور دور اندیش پالیسی کا تعین ہو سکے، جس کی بنا پر وہ زبان جو عوامی زبان سے اقلیتی زبان کے درجے پر آچکی ہے، پھر سے عوامی زبان بن جائے۔

۱۔ کیا اردو والوں کو حکومت کی سرپرستی نہ ہونے سے مایوس ہونے کی ضرورت ہے جب کہ تاریخ ہند میں کئی سو سال سے عوام کی زبان کبھی سرکاری زبان نہیں رہی ہے اور اس کے باوجود ساری علاقائی زبانیں زندہ ہیں۔

۲۔ کیا اردو کو قومی سرکاری زبان اور کئی ریاستوں کی سرکاری زبان ہندی کا مدمقابل بنانے کی کوشش کی جائے یا اس کی دستوری حیثیت کو تقسیم کر کے دوسری لسانی اقلیتوں کی طرح اس کا جائز دستوری حق منوایا جائے۔

۳۔ کیا اردو والوں نے ہندوستان کی طرح کثیر زبانی ممالک مثلاً سودیت یونین، ممالک متحدہ امریکہ اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ کی لسانی اقلیتوں کے ساتھ حکومتوں کے سلوک کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں اور اگر نہیں تو کیا ایسا مطالعہ سودمند ثابت نہیں ہوگا تاکہ حکومت سے دوسرے روادار ممالک کی مثال پیش کر کے مناسب مطالبات کیے جاسکیں (امریکہ میں اگر پرائمری جماعتوں میں کسی لسانی اقلیت کا ایک بھی طالب علم ہو تو اسے مادری زبان میں تعلیم کے لیے اپنی زبان کے استاد کی فراہمی کا حق حاصل ہوتا ہے)

۴۔ کیا ایسی ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہو اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا جائے؟ ایسے مطالبے کے کیا عملی فوائد ہوں گے، یا ایسا مطالبہ متعصب افراد کی مخالفت میں مزید شدت پیدا کرے گا؟

۵۔ کیا اردو والے سہ لسانی فارمولے میں اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندی ریاستوں میں تو یہ ممکن ہے (لیکن یہیں اس کی شدید مخالفت بھی ہوتی ہے) لیکن دوسری لسانی ریاستوں میں چار زبانیں لازمی ہوں گی اگر اردو والے صرف تین زبانیں سیکھنا چاہیں تو کون سی زبان چھوڑ دی جائے گی اور اس کے کیا نتائج ہوں گے؟

۶۔ کیا اردو کو ابتدائی تعلیم کا ذریعہ تعلیم رکھا جائے اور بعد میں ریاستی، قومی یا انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے گی

۷۔ کیا اردو ذریعہ تعلیم کو تعلیم کے ہر اسٹیج کے لیے ضروری سمجھا جائے؟ اگر ایسا سمجھا جائے تو یہ سوال غور طلب ہو جاتا ہے کہ کیا زمانۂ حاضر میں علم برائے علم ہوتا ہے یا علم برائے روزگار؟ کیا علم اور معیشت میں کوئی تعلق نہیں ہے Management کے بین الاقوامی ماہر Pretury Drucker نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> آج تعلیم یافتہ لوگوں کی بڑی اکثریت کسی نہ کسی ادارے میں ملازمت کرتی ہے۔ چاہے وہ کوئی کمپنی ہو یا حکومتی ادارہ، ہسپتال ہو یا یونیورسٹی یہ وہ پہلا سماج ہے جہاں کوئی مالک نہیں ہے، بلکہ تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی ادارے کا ملازم ہے۔"

کیا اردو والے زمانۂ حاضر کی اس حقیقت سے مستثنیٰ ہیں؟

۸۔ کیا اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس اور کالجوں کے خراب نتائج کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟ کیا ان اداروں میں طلبا کی تعداد میں اضافہ یا کمی کا مطالعہ کیا گیا ہے؟ کیا ان اداروں کے فارغ التحصیل طلبا کے عملی زندگی میں کامیاب یا ناکام ہونے کے اعداد و شمار فراہم کیے گئے ہیں؟ کیا اس امر کی کوئی تحقیق کی گئی ہے کہ ایسے طلبا کو ملازمتوں کے حصول امتحانوں اور روزمرہ کے سرکاری کاروبار میں سہولت ہوئی یا نقصان؟

۹۔ کیا ہر اردو والے طالب علم کے لیے اسکولوں میں اردو لازمی زبان کی حیثیت سے پڑھانے کا انتظام کیا جائے چاہے ذریعہ تعلیم کوئی زبان ہو؟ کیا اس مطالبے سے سارے اردو والے طالب علم مستفید نہیں ہوں گے؟ چند مدرسوں میں زبان کا ذریعہ تعلیم ہونا یا ہر مدرسہ میں زبان کی عام تعلیم ہونے کے دو متبادل فیصلوں میں کون سا فیصلہ زیادہ تعداد کے لیے سودمند ہوگا؟

۱۰۔ کیا اردو رسم خط کا تحفظ کیا جائے اس لیے کہ سارا ادبی سرمایہ اسی رسم خط میں ہے اور اس تصفیے کے بعد کیا ہر مدرسہ میں لازمی اردو تعلیم کا مطالبہ ضروری نہیں ہے اور اگر نہیں تو اردو خاندانوں میں رسم خط کا تحفظ کیسے ہو سکے گا؟

۱۱۔ کیا اردو والوں نے اس تلخ تاریخی جبر پر بھی غور کیا ہے کہ ان کی نسلیں جو ہندی ریاستوں میں ہندی میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور غیر ہندی ریاستوں میں ہندی ثانوی زبان کی حیثیت سے سیکھ رہی ہیں، وہ اردو رسم خط سے کس حد تک واقف ہیں؟ کیا یہ نسل گھر کی اردو کو ہندی رسم خط میں نہیں لکھ رہی ہے؟ کیا کوئی شماریاتی جائزہ ہوا ہے کہ نئی نسل میں کتنے اردو رسم خط سے واقف ہیں؟ اگر اس تعداد میں تشویشناک حد تک کمی ہوئی ہے تو اردو والوں نے کون سے ایسے اقدامات کیے ہیں کہ اردو کا تہذیبی اثاثہ ان کو فراہم ہو سکے؟ اسی وقت

علی گڑھ میں اردو مادری زبان والے طلبا میں اکثریت ان کی ہے جو اردو کو ہندی رسم خط ہی میں لکھ سکتے ہیں۔

۱۲۔ کیا اردو کا رسم خط بدل دیا جائے؟ اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو کیا وہ رسم خط رومن ہو (جیسے شاید علیحدگی پسندی سمجھا جائے) کیا وہ ریاستی زبان کا رسم خط ہو (جس سے زبان کئی حصوں میں تقسیم ہو جائے) یا دیوناگری ہو (جس سے عوامی زبان اور سرکاری زبان کے قریب ہو جانے کے مواقع حاصل ہوں گے؟

۱۳ کیا اردو کا ایک زاید رسم خط دیوناگری ہو؟ اگر یہ ضروری سمجھا جائے تو اردو کی ساری آوازوں کے لیے دیوناگری رسم خط میں کن معمولی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ لوگ "مرجا گا لب کی گبل" نہ بولنے لگیں۔ کیا کسی نے فارسی اور دیوناگری حروف تہجی میں سے اکثر ایک دوسرے کے مشابہ اور محروف ہونے پر کام کیا ہے؟

۱۴ اگر اردو کی کتابیں ایک سے زاید رسم خط میں شایع ہونے لگیں (ہندی پریس اردو کی مقبول عام کتابوں کو اس طرح سے چھاپ رہے ہیں) تو کیا اس کا سرکاری ہندی پر اثر نہ ہوگا؟ کیا اردو والوں نے محسوس کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کی سرکاری ہندی اور اس وقت کی سرکاری ہندی میں (جو ریڈیو پر سنی جاتی ہے) کچھ فرق ہوا ہے؟ یقیناً وہ اب عوامی زبان سے نسبتاً زیادہ قریب ہو گئی ہے۔

۱۵۔ کیا اردو والوں نے ہندی نثر کے ارتقا کا مطالعہ کیا ہے کہ آزادی سے اب تک اس زبان کی ہیئت ترکیبی میں کچھ ارتقا ہوا ہے؟ کیا اس ارتقا سے دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو رہی ہیں؟ کیا اس حقیقت سے اس وہم کی تردید نہیں ہو جاتی کہ رسم خط کی تبدیلی یا ایک سے زیادہ رسم خط کا استعمال سے زبانوں کے مزاج بدل جاتے ہیں؟ ہندی کے موجودہ ارتقا سے ظاہر ہوتا ہے کہ بغیر اس تبدیلی کے بھی زبانوں کے مزاج بدل جاتے ہیں اور ایسی تبدیلی بعض حالات کے تابع ہوتی ہیں؟

۱۶۔ کیا اردو بولنے والوں نے اردو پڑھنے والوں یا لوک ہندی بولنے والوں کی مدد کی کوشش کی ہے کہ انہیں اپنی پسندیدہ کتابیں، اردو شاعروں کے مجموعے پڑھنے کے لیے مل سکیں۔ کیا عوامی زبان کو اکثریتی عوام کے رسم خط میں شایع کرنا زبان کی ترویج و ترقی میں معاون نہ ہوگا؟ کیا عوامی زبان کو نامانوس رسم خط میں (دوسروں کے لیے) مقید کر لینا اس زبان کی خدمت ہے؟ اور کیا کتابوں کی عدم دستیابی کی صورت میں یہ زبان موجودہ زبان کے بعد عوامی زبان کی حیثیت سے باقی رہ سکے گی؟

۱۷ کیا اردو والوں نے دوسری زبانوں کے جاننے والوں کے لیے "Under Self Taught" قسم کی کتابوں کی اشاعت کا کبھی خیال کیا ہے؟ کیا اس کی ضرورت نہیں کہ ہر ہندوستانی رسم خط میں اس قسم کی کتابیں شایع ہوں؟

۱۸۔ کیا Basic English کی طرح کسی نے Basic Urdu بنانے کی کوشش کی ہے تاکہ ثقیل اور مشکل الفاظ سے پاک ایک آسان زبان دوسری زبان بولنے والوں کے کام آسکے؟

۱۹۔ کیا اردو دشمنی کے محرکات کا تجزیہ کیا گیا ہے؟ کیا تعصب کا جواب تعصب سے دیا جانا چاہیے یا رواداری اور فراخ دلی کے اظہار سے؟

۲۰۔ کیا اردو کی جد و جہد سیکولر انداز میں نہیں ہونی چاہیے؟ کیا اس عوامی زبان کے لیے جد و جہد کرنے

> "کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا، وہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔
> (آل عمران ع ۴)

میں قول اور عمل کا تضاد کمزوری کا باعث نہیں ہے؟
میں نے اردو کے مسئلے پر بہت سے
Issues یا سوالات آپ کے سامنے پیش کرنے کی
جسارت کی ہے اگر اردو والے دانش وران پر غیر جذباتی
انداز میں غور کر سکیں اور غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ
سکیں تو اس عمل کے دوران شاید یہ بات بھی واضح ہو گی
کہ اردو والے اور حکومت شاید مساوی طور پر اس بات
کے ذمّہ دار ہیں کہ ہندوستانی تہذیب کی ایک مشترکہ
اور یک جہتی پیدا کرنے والی میراث کو اس طرح نظر انداز کیا جا رہا
ہے کہ اگر اس وقت مناسب حفاظتی تدابیر نہ اختیار کی جائیں تو بہت
ممکن ہے کہ جس طرح ہندوستان کی یہ عوامی زبان جس کے
ارتقا میں ہر فرقے کے لوگ شریک رہے ہیں، اب محض
ایک اقلیتی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ وہ ہندوستان میں
فارسی اور اسپین میں عربی کی طرح خود اردو والوں کی
کوتاہ اندیشی اور عدم توجہ کی بنا پر ہندوستان میں
ناپید ہو جائے، اور اگر ایسا
ہوا تو اس کی ذمہ داری
اردو والوں
کی موجودہ
نسل پر ہوگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
کا ارشاد ہے: جو میرے دوست سے دشمنی رکھے گا
میں نے اس سے لڑائی کا اعلان کر دیا اور میرے بندوں
کا میرے فرائض سے نزدیکی حاصل کرنا جس قدر مجھ کو محبوب
ہے اس قدر کسی نیکی کی نزدیکی مجھ کو محبوب نہیں اور میرا
بندہ مجھ سے نوافل کے ساتھ برابر قریب ہوتا رہتا ہے
یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور
جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کے کان بن جاتا ہوں
جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس
سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے
وہ حملہ کرتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے
وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اس
کو دیتا ہوں اگر وہ مجھ سے مدد چاہتا ہے تو میں اس
کی مدد کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے پناہ چاہتا ہے تو میں
اسے پناہ دیتا ہوں"۔

[بخاری]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸، ش ۸ (اگست ۸۹ء)

خطاب عیدالاضحیٰ

[یہ خطاب عید کے موقع پر مسلم یونیورسٹی میں پڑھا گیا]

محمد تقی امینی*

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر
اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد

حضرات! آج عید کا دن ہے۔ ملّت ابراہیمی کی عید، جس میں اللہ کی محبت کی خاطر ہر چیز قربان کرنے کا عہد بیان ہوتا اور بطور نمونہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یاد تازہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اسلام کی حقیقت بس یہی دو چیزیں ہیں:

۱۔ محبت اور ۲۔ قربانی

بزرگوں نے انسان کی بڑائی اور بلندی کا راز صرف اللہ کی محبت میں دیکھا ہے جس کے لیے ہر چیز کی قربانی لازمی ہے۔ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ محبت کے مکان یعنی دل کو ایک مکین کے لیے خالی کر دو۔ اس کے بعد میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھو۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سچ کہا ہے۔ "ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کر سکتا ہے۔" قرآن حکیم میں اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے

ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ (الاحزاب رکوع ۱)

[اللہ نے کسی شخص کے اندر دو دل نہیں رکھے]

دل صرف ایک ہے جو ایک ہی آستانہ پر جھک سکتا ہے۔ اس کو قوم و وطن، حکومت و اقتدار اور زن و فرزند کے آگے جھکاؤ یا صرف اللہ کے آگے جھکاؤ۔

محبت و قربانی کی یاد تازہ کرانے والی اس عید کا ایک "نغمہ" اور ایک ترانہ بھی ہے جو اس کی خصوصیت کا نمائندہ اور دل کشی میں اپنی مثال آپ ہے۔

نغمہ یہ ہے:

لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد
والنعمۃ لک والملک لاشریک لک

اے اللہ! آپ کے دربار میں حاضر ہوں، آپ کے حضور میں حاضر ہوں۔ آپ کا کوئی شریک نہیں۔ آپ کی نیاز میں حاضر ہوں۔ بے شک ساری تعریفیں اور ساری نعمتیں آپ ہی کی ہیں ملک اور اقتدار آپ ہی کا ہے۔ آپ کا کوئی شریک نہیں۔

نغمہ کی حقیقت سمجھنے کے لیے اس وقت کے منظر کو سامنے رکھنا ہوگا جب خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کی طرف سے حج کے اعلان کا حکم ہوا۔

ساری دنیا کے لیے حج کے اعلان کا حکم وہ بھی بیابان و سنسان میدان میں جس کے سننے والے باہر ملک کے تو کیا ہوتے خود اس ملک اور اس جگہ کے کتنے تھے؟ پھر دور دراز آواز پہنچانے کے لیے براڈ کاسٹنگ اسٹیشن و بجلی کے تار کے ذرائع جو اس وقت موجود ہیں ان میں سے کسی ایک کا تصور بھی اس وقت نہ کیا جا سکتا تھا۔ فطری طور پر سیدنا ابراہیمؑ کو اپنی بے بسی و بے چارگی کا احساس ہوا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

* پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف سنی تھیالوجی، اے۔ایم۔یو علی گڑھ

یارب کیف ابلغ الناس وصوتی لا ینفذہم

(تفسیر ابن کثیر ج آیت ۲۶)

[اے میرے رب! میں لوگوں تک آواز کس طرح پہنچاؤں جب کہ میری آواز ان تک نہ پہنچ سکے گی]

جواب میں ارشاد ہوا:

نادوا علینا البلاغ

[تم آواز لگادو، آواز پہنچانے کی ذمہ داری ہماری ہے]

یعنی اے ابراہیمؑ! تم اس مادی دنیا کی بے بسی و بے چارگی کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تم اس وقت براڈ کاسٹ کے لاہوتی اسٹیشن پر کھڑے ہو اور نورانی میٹر تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا کام صرف آواز لگا دینا ہے اور بس۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ان الفاظ میں حج کا اعلان کیا

ایہا الناس! ان ربکم اللہ قد اتخذ بیتاً فحجو۔

"[اے لوگو! تمہارا رب اللہ ہے، اس نے گھر بنایا ہے، اس کا حج کرو۔

حضرت ابراہیمؑ کا یہ اعلان و پیام ہر براعظم کے ایک ایک گوشہ، سمندر کے ایک ایک جزیرہ تک پہنچ گیا۔ یہاں تک روایتوں میں آتا ہے کہ رحم مادر کے ان بچوں نے بھی سن لیا جنھوں نے اس مکر و فریب کی دنیا میں ابھی قدم نہیں رکھا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہ "نغمہ" دراصل حضرت ابراہیمؑ کے اسی اعلان و پیام اور نورانی صدا کا جواب ہے جو ہر حاجی کی زبان پر ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اپنے مقبول ترین بندے سے آواز دلوا کر ہمیں بلوایا ہے۔ ہم آپ کے دربار میں دل و جان سے حاضر ہیں۔

دربار میں حاضری کی یہ بات تو اُن سے متعلق تھی جن کو اللہ نے حج و زیارت کی سعادت نصیب فرمائی لیکن جو لوگ وصال کی لذت سے محروم ہیں، ان کے دل کی بے تابی و بے قراری دربار کی حاضری سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ ؎

میکشو مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

ترانہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے حضرت ابراہیم کی اس آزمایش کو یاد کرنا ہوگا جس میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا مطالبہ ہے۔ حضرتؑ نے اپنے رب سے ایک سعادت مند و صالح فرزند کی دعا کی اور وہ قبول ہوئی۔ ان کو ایک ایسا فرزند عطا ہوا جو یگانۂ روزگار تھا، بوڑھے باپ کی ضعیفی کا سہارا تھا۔ یہ فرزند نالوں اور تمناؤں کے سایہ میں پروان چڑھتا رہا۔ جب وہ بڑا ہو کر کسی قابل ہوا تو باپ کو ارشاد ہوا کہ اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے۔ چنانچہ باپ حکم الٰہی بجالانے کے لیے تیار ہوگئے۔ جس وقت حضرت ابراہیمؑ حکم کی تعمیل میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بچھاڑے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ نور نظر کی گردن پر جلد چھری چلا دیں۔ ادھر یہ لختِ جگر پیشانی زمین پر رکھے ہوئے جلوۂ الٰہی میں مصروف تھا اور بزبان حال کہہ رہا تھا ؎

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

ایسی حالت میں حضرت جبریل امین تشریف لائے اور یہ منظر دیکھ کر بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

اللہ اکبر اللہ اکبر

ابراہیم خلیل اللہؑ نے یہ سن کر جواب میں فرمایا

لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر

پھر جبریلؑ و خلیلؑ کی زبان سے سن کر تسلیم و رضا کے پیکر ذبیح اللہ (حضرت اسماعیلؑ) کی زبان سے نکلا:

اللہ اکبر و للہ الحمد

اس طرح آج کا ہمارا ترانہ تینوں بزرگوں کی زبان سے خاص حالت و کیفیت میں نکلے ہوئے متبرک الفاظ کا مجموعہ ہے۔

ہزاروں ہزار سلام و رحمت ایسے باپ بیٹے پر
جنھوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں عزم و صبر اور تسلیم و رضا کے نمونے قائم کیے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۸ - اگست ۱۹۸۹ء

اذہانِ گریز پا

سید حامد*

برین ڈرین (Brain Drain) یا انتقالِ ذہن کا آج کل ہر طرف چرچا ہے۔ ترقی پذیر ممالک گلہ مند ہیں کہ اُن کے ذہین افراد، ان کے علوم کے منتہی، ان کے فضیلت یافتہ اشخاص، وسائل اور مواقع کی تلاش میں ترقی یافتہ ملکوں کو سدھار جاتے ہیں۔ سائنس کے پروں نے دنیا کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا ایک چھوٹا سا بازار بن گئی ہے جہاں دوسری چیزوں کے علاوہ دماغ بھی بکتے ہیں اور ایمان بھی۔ ایمان کی خرید و فروخت چھپ کر ہوتی ہے، اس لیے اس کا ثبوت قرائن سے آگے کم ہی بڑھ پاتا ہے۔ ذہن البتہ سرِ بازار بکتے ہیں۔

برین ڈرین کا ذکر کرتے وقت تصور یہ کیا جاتا ہے کہ غریب ملک اونچائی پر ہیں اور خوش حال ملک نشیب میں۔ وہاں سے ذہن ڈھلکتے ہوئے خوش حال ملکوں میں پہنچ جاتے ہیں، حالانکہ ان کی کہیں زیادہ ضرورت خود ان کے ملکوں میں تھی۔ جس طرح دولت دولت کو کھینچتی ہے اور صنعت کو صنعت، اسی طرح ذہنوں کو ذہن کھینچتے ہیں۔ ذہن کے ساتھ دولت بھی مل جائے تو سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ بہترین ذہن جب امریکہ کی طرف پرواز کرتے ہیں تو اُن کا مقصد مخلوط ہوتا ہے۔ جدید علوم میں درویشی، قناعت اور استغنا نام کی کوئی روایت نہیں ہے۔ ہمارے عالم اور محقق زر کی کشش سے بالاتر نہیں ہیں۔ ہاں اُن کے لیے ایک اضافی کشش جستجو اور آگے بڑھنے کے وہ امکانات ہیں جو امریکہ کی لیبارٹیریاں انھیں فراہم کرتی ہیں اور معلموں سے بھی زیادہ پرکشش جادۂ جستجو کے وہ ہم سفر ہیں جن سے ٹکرا کر ذہن دونوں طرف چمک اُٹھتے ہیں نئے نئے خیالات، نئے نئے تصورات ذہنوں کو بیدار اور بے تاب کر دیتے ہیں۔ چقماق کی طرح یہ ٹکر چنگاریاں بکھیرتی ہوئی چلتی ہے۔ چنگاریوں کی چمک سے دیدۂ بینا پر تحقیق کے بہت سے گوشے اور امکانات روشن ہو جاتے ہیں اور پھر بہ یک وقت مقابلہ اور ہمکاری کا وہ گنگا جمنی طلسم برپا ہوتا ہے علوم کی سواری جس کے دوش پر چلتی ہے۔

مذکورہ بالا اعلیٰ ترین ذہنوں کے علاوہ جو ذہن مغرب کی طرف جاتے ہیں وہ اکثر و بیشتر سحر سامری میں اسیر ہیں۔ ان کی زندگی کا پہلا مقصد روپیہ جمع کرنا ہے اور وہ آسایشیں، نمایشیں اور شہرتیں خریدنا ہے جن پر دنیا دار جان دیتے ہیں۔ انھیں یہ خیال کبھی ستاتا بھی نہیں کہ ان کی شدید ضرورت خود ان کے وطن کو ہے جو ذہن کے قحط میں مبتلا ہے۔

لیکن رہروان تحقیق کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جن پر عرصۂ حیات اور میدان فکر تنگ کر دیا جاتا ہے اور وہ وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کبھی جان بچانے کی خاطر، کبھی فکر اور اظہار اور تحقیق کی آزادی کے لیے۔ دوسری جنگ عظیم میں اہلِ فکر اور

---

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ ہمدرد نگر، تغلق آباد، دہلی۔

اہلِ جستجو نے، بالخصوص جرمنی سے، ہجرت کی۔ ان میں سب سے بڑی مثال آئن اسٹائن [illegible] لوہے کی چادر ہٹا کر بھی علما نے ہجرت کی ہے۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ ناقدری اور ماحول کی ناسازگاری نے عالموں اور سائنس دانوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ جیسے ہندوستان سے کھرانا، نارلیکر اور چندر شیکھر سبرامنیم۔ بعض مفکرین اور مصنفین نے اشتراکی دنیا کی گھٹن سے راہِ فرار اختیار کی ہے۔

ذہنوں کی ہجرت کے شواہد جا بجا ملیں گے۔ ذہنوں کے انتقال کی ایک اور شکل جس کی طرف دھیان شاید نہیں گیا ہے، ایک ہی ملک کے اندر، گاؤں سے شہر کو اور چھوٹے اور درمیانی شہروں سے بڑے شہروں کی طرف ذہنوں کا سفر ہے۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ دیہات سے لڑکے تعلیم کے لیے شہر آتے ہیں اور پھر یہیں کے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح دیہات کو اعلیٰ تعلیم کا فائدہ پہنچ ہی نہیں پاتا۔ گاؤں ہو کہ شہر، آج کل ہر شخص کو فکر اگر ہے تو اپنے ذاتی امکانات اور اکتسابات کی۔ گھر سے بے نیازی کا سبب اگر علم کی جستجو ہوتی تو کوئی ذی ہوش انسان اس پر اعتراض کی انگلی نہ اٹھاتا، لیکن یہاں تو سبب اور ہی ہے۔ چاندی، سونے اور کاغذ کے ٹکڑوں کے پیچھے لوگ زبانیں نکالے ہوئے دوڑتے ہیں؛ نئے مقصود کی خواہش میں ایک دوسرے پر دانت نکالتے ہیں، غراتے ہیں۔ چوہوں کی اس دوڑ میں گھر اور گاؤں کے ساتھ وفاداری پامال ہو جاتی ہے اور قدروں اور اچھی روایتوں کا کہیں ٹھکانا نہیں رہتا۔ بھلمنساہت شروع میں ہی کام آ جاتی ہے۔ شرافت، ہمدردی اور انسانیت راہ میں تھک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ آدمی کو جیب اور گھر بھرنے کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہتا۔ ضمیر بے چارہ فریاد کرتا ہے، خود غرضی اور ہوس کے نقار خانے میں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔

تہذیب کے ارتقا کے لحاظ سے تاریخ کو کئی ادوار یا زمانوں میں بانٹا گیا ہے۔ پتھر کا پرانا دور، پتھر کا نیا دور (قدیم اور جدید حجری ادوار) لوہے کا زمانہ (دورِ آہن) آغازِ تاریخ کے بعد قدیم، متوسط اور جدید ادوار۔ جدید دور میں زراعتی انقلاب آیا، صنعتی انقلاب آیا اور وہ انقلاب آیا جس کی گرفت میں اس وقت ہم ہیں اور جسے ٹکنولوجی کا انقلاب کہتے ہیں۔ صنعتیت اور مدنیت کے اس زمانے کو اگر دورِ ذہب یا سونے کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس زمانے میں زر کی پرستش اس تیزی سے عام ہوئی کہ انسانی قدروں کی پرانی عمارت مسمار ہو کر رہ گئی۔ حساب لگائیے بچا کیا؟ ایثار، اخلاص، ہمدردی، بے نفسی، راستی، سکون، حیا، ادب، لحاظ، رحم، انسانیت غرضکہ سب کچھ زر کے آستانے پر بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ صارفیت، ساہریت، مادیت، زرپرستی کے ہی دوسرے نام ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ جہاں زر کی جھلک نظر آئی انسان سب کام، سارے علائق، تمام ذمہ داریاں چھوڑ کر زر کی طرف دوڑنے لگا۔ الٰہی، سونے کے ٹکڑے میں مقناطیسی کشش تو کبھی نہ تھی۔

طب کا ایک نظریہ ہے "داخلی نظامِ دفاع" یا "اِمیونٹی"۔ ہر جسم یا نامیاتی وحدت ماحول کی آلودگیوں اور جراثیم کا مقابلہ کرنے کے لیے دفاع یا تحفظ کے سروسامان اپنے اندر پیدا کر لیتی ہے۔ اس ماحول میں اگر کوئی ایسا انسان داخل ہوتا ہے جو داخلی نظامِ دفاع سے محروم ہے تو وہ نہایت جلد ماحول کے مضر محرکات اور اثرات کا شکار ہو جاتا ہے۔ مسلمان چونکہ مذہباً اور عملاً طمعِ زر سے دور تھے، اس لیے ان کے اندر زرپرستی کے جراثیم کے خلاف داخلی دفاع کا سروسامان نہ تھا۔ چنانچہ دورِ حاضر کی اس وبائی بیماری نے مسلمانوں کو بُری طرح دبوچ لیا۔ مثال کے لیے ہندوستان کے ہندوؤں اور پاکستان کے مسلمانوں کو لیجیے۔ ہندوؤں نے دولت کی دیوی لکشمی کو ہمیشہ احترام اور آرزومندی کے ساتھ دیکھا، اس لیے زرپرستی کی عالمگیر بیماری ان کی مدافعتوں کو مسمار نہ کر سکی۔ اس کے برعکس پاکستان کے مسلمان زرپرستی اور صارفیت کے سیلاب میں اس طرح بہہ گئے کہ اب پہچاننے میں ہی نہیں آتے۔ وہاں خوشحالی کی نمائش کے مضحکہ خیز مظاہرے اور مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً مکان کا طول و عرض، قالینوں کی تعداد، رقبہ اور دبازت، کاروں اور ریفریجریٹروں کی گنتی، ساخت

اور ماڈل، غسلخانے کے مرمریں فرش اور اس کے زرنگار ساز و سامان، مہندی اور شادی کی متاعِ سوز، بے حس اور مساوات دشمن رہیں۔ غرضیکہ اول زر اور آخر زر؛ ظاہر میں زر کی نمائش، باطن میں زر کا سودا۔ ہندوستان کے مسلمان بھی زر کے دلدادہ ہیں لیکن پاکستانیوں سے کہیں کم، جن کے نقطۂ نظر کو استیلائے زر نے سطحی اور جن کے کام کرنے کی صلاحیت کو کمزور کر دیا ہے لیکن ہندوؤں سے زیادہ زر کی طمع ہندوستانی مسلمانوں کے اندر کارفرما ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، ان میں سے ایک اچھی تعداد یونیورسٹیوں سے وابستہ ہے۔ جن کی دوسرے ملکوں میں مانگ ہے۔ ان میں سے بہت سوں کا رخ باہر ہی کی طرف رہتا ہے۔ لڑکیوں کے جس طرح پیغام منگوائے جاتے ہیں اسی طرح یہ حضرات لاکھ جتن کر کے مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ سے ملازمت کی پیش کش منگواتے ہیں اور جیسے ہی پیش کش آئی سب کام چھوڑ کر دیارِ غیر کے لیے رہسپار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ نہیں دیکھتے کہ بیچ سال میں چلے گئے تو ان طالب علموں کا، جن کی تحقیق و تدریس کے ذمہ دار وہ ہیں، کیا حشر ہوگا۔ نہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ جس بڑے مشاہرہ والے چھوٹے منصب کی طرف وہ لپک رہے ہیں وہ اُن کے موجودہ منصب سے بہت نیچا ہے اور ان کی صلاحیتوں، تجربوں اور علمی امکانات کے لیے غیر موزوں ہے۔ طرہ یہ کہ جاتے وقت ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ وہاں جا کر رخصت کو بڑھائیں گے اور جہاں تک ممکن ہوگا اسے طول دیں گے۔ بلا تکلف ایسے طالبانِ زر کا شمار اذہان گریزپا میں ہونا چاہیے۔ ان کا انداز شاہدانِ بالانشیں جیسا ہے۔ آبرو کا سودا دونوں کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک ذہن سے دوسرا جسم سے۔ البتہ وہ غریب لوگ جو دست و بازو سے روپیہ کمانے باہر جاتے ہیں، وہ کسبِ حلال کے لیے نکلے ہیں؛ انھوں نے اپنی ذمہ داریوں سے گریز نہیں کیا ہے بلکہ انھیں انجام دینے کے لیے تکلیفیں اٹھائی ہیں۔

ان دونوں سے مختلف عالی دماغوں، انجینیروں، ڈاکٹروں اور پروفیسروں کا وہ طبقہ ہے جن کی صلاحیتیں اور جن کی کسبِ فضیلت کی طلب انھیں یورپ اور بالخصوص امریکہ لے جاتی ہے وہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں، ان کا لوہا مانا جاتا ہے۔ ان کے ذہن بین الاقوامی ذہنوں سے ٹکراتے ہیں اور تحقیق، اختراع تخلیق اور ایجاد کے چمن میں نئے نئے گل کھلاتے ہیں۔ ان کے سامنے بھی ایک مسئلہ ہے جو ان کی راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ وہ تو امریکہ جب آئے تھے جب اُن کی عادتیں اور روش پختہ اور ان کی طبیعت راسخ ہو چکی تھی۔ وہ اپنی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ انھیں اب ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ خدایا ان بچوں کا کیا ہوگا؟ سست عناں سماج اور اُن کے اخلاق کو تباہ کر کے نہ رکھ دے۔ وہ ماحول کے مضر اور حیا سوز اثرات سے کیسے بچیں گے۔ لڑکی سیانی ہونے لگتی ہے تو والدین کو یہ کھٹکا کھائے جاتا ہے کہ امریکن لڑکیوں کی طرح ایک روز اس کا کوئی ہم جماعت اسے 'ڈیٹنگ' کے لیے نہ لے جائے جس کے مشمولات میں اس کا ایک ہم وزن لفظ بھی ہے، اپنے تمام تشویش ناک پہلوؤں کے ساتھ۔ یہاں قدامت پسندی اور جدت آزمائی معرضِ بحث میں نہیں ہیں۔ جدت آزمائی اور خودسری، آزادہ روی، بے ضبطی، لذت کوشی، بے ادبی، بے حیائی کے نتیجے سب کی نگاہوں کے سامنے ہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ امریکہ جو کچھ آج کرتا ہے، باقی دنیا اسے کل کرتی ہے، یا پرسوں یا نرسوں۔ یہاں بھی زر ہی کی عملداری ہے۔ امریکہ نے زورِ بازو اور نیروے دماغ سے دولت حاصل کی اور دولت اور وسائل اور آسائشوں کے زور سے ایک جہاں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ جمہوریت اور جرأتِ فکر و اظہار نے بھی وہاں یک گونہ فروغ پایا۔ اب ساری دنیا امریکہ کی مقلد ہے یا تقلید کا ڈھکا چھپا ارادہ رکھتی ہے اور بے چارے غیر مقلد، جاہل، رجعت پسند اور دقیانوس اور تنگ نظر کہلاتے ہیں۔

بات موضوع کی حدود سے نکل گئی۔ ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اکثر ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں۔ وطن میں رہ کر وہ اپنے بھائیوں کا استحصال کرتے ہیں۔ استحصال شہرت اور مرتبہ کے بقدر ہوتا ہے۔ ہمارے بعض بہترین اذہان ہماری جہالت اور درماندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ خود کو بلاتکلف بازار میں رکھ دیتے ہیں اور اپنی رائے کو بازار بھاؤ کے مطابق بیچتے رہتے ہیں۔ ملت کی شناخت اور مفاد کے خلاف رائے دینے میں انہیں تامل نہیں ہوتا۔ اس کی قیمت وہ دولت، خوشنودی، ترقی اور مواقع کی شکل میں وصول کر لیتے ہیں۔ پیر کنعاں کے یہ نور دیدہ اپنی روشنیٔ طبع کو چشم زلیخا کے روشن کرنے کے لیے بے دریغ صرف کرتے ہیں۔ یہ حضرات کبھی حکومت کے تابع فرمان ہوتے ہیں، کبھی اکثریت کی حلقہ بگوشی پر کمر ہمت باندھ لیتے ہیں۔ اپنے ہم مذہبوں کی تحقیر اور تضحیک سے زیادہ محبوب اُن کے لیے کوئی مشغلہ نہیں ہوتا۔ ان دانشوروں کی نگاہ میں مسلمانوں کے بڑے سے بڑے مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ انھوں نے ملت سے اپنے آپ کو بالکل کاٹ لیا ہے اور پورس کے ہاتھیوں کی طرح وہ اپنی فوج کو کچلتے ہوئے چلتے ہیں۔ اُس ملت کی داستان کتنی دردناک ہو گی جس کے عوام جہالت کی تاریکی میں بھٹک رہے ہیں اور جس کے خواص نفع کی طمع میں دوسری اقلیتوں کو سدھار گئے ہیں، یا اپنے ہم وطن ہم مذہبوں کو جراحت پہنچانے یا ان کی تحقیر اور تذلیل کرنے پہ مامور ہیں۔

انتقال اذہان کی یہ شکل دراصل سب سے زیادہ نقصان دہ، سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ جو ذہن باہر چلے جاتے ہیں، وہ پسماندہ بھائیوں کو اوپر لانے کا کام جو انہیں کرنا چاہیے تھا، نہیں کرتے؛ جو ذہن ہندوستان میں رہ کر اس ملت کے خلاف کام کرنے لگتے ہیں، جس سے وہ اُٹھے ہیں، وہ لوگ وہ کام کرتے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے وطن عزیز کے مسلمان دانش وروں کا یہ عام شیوہ ہے کہ وہ جلد سے جلد خود کو عوام سے دور کر لیتے ہیں۔ عوام سے ان کو کوئی تعلق نہیں رہتا۔ عام مسلمانوں کے دکھ درد میں وہ کبھی شریک نہیں ہوتے۔ اگر تعلق باقی رہتا ہے تو یا تو حقارت کا تعلق، یا استحصال کا خود کو مسلمانوں کا نمائندہ بنا کر یا بتا کر وہ حکومت سے مراعات اور اکثریت سے تعریف وصول کرتے ہیں۔ ہمارے دانش وروں کا فرض منصبی یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو جب کوئی گہرا گھاؤ لگے اور بے حسی کے جامہ کو پھاڑ کر وہ متحد ہو جائیں اور حکومت سے شکایت یا ناانصافی کے خلاف احتجاج کریں تو یہ دانش ور چلا اُٹھیں کہ "جو لوگ حکومت یا اکثریت کے خلاف آواز اُٹھا رہے ہیں وہ تنگ نظر، قدامت پسند، رجعت پرست، بنیاد یئے یا احیا پسند ہیں۔ یہ ملک کے اتحاد اور ترقی کے دشمن ہیں۔" جب کبھی کوئی واقف کار درد مند مسلمان مطالبہ کرے کہ مسلمان اتنے پیچھے رہ گئے ہیں کہ مختلف مراحل میں اُن کے داخلوں کا خاص اہتمام ہونا چاہیے اور ان کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے کھلنے چاہئیں۔ یا عام اچھے اداروں میں انھیں کچھ عرصے تک رعایت دے کر داخلہ ملنا چاہیے تو ہمارے 'دانش وران' بے وفا حقیقت اور عملی امکانات سے قطع نظر کرتے ہوئے حکومت کے ہم نوا اور مسلمانوں سے بے نیاز ہو کر اپنے اور اپنوں کے لیے طرح طرح سے انعامات حاصل کرتے اور مواقع اور ترقیاں تراشتے رہتے ہیں؛ رہ گئے مسلمان عوام، سو وہ اسی لائق ہیں کہ ترقی کے کارواں کے پیچھے گھسٹتے ہوئے، ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے رہیں۔ ان دانش وروں سے سب سے بڑا نقصان اس لیے پہنچتا ہے کہ انہیں مسلمانوں کا ترجمان ان کا نمائندہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ جو گرد یہ اڑاتے ہیں، اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی اصل صورت، حالات اور ان کے احساس چھپ جاتے ہیں، دب جاتے ہیں۔

مسلم عوام کا استحصال ایک اور طبقہ بھی کرتا ہے جو دانش ور تو نہیں کہلاتا لیکن جو پڑھا لکھا ہوتا ہے اور اثر رکھتا ہے۔ اس کا ذہن اس کام میں صرف ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ایک خول کے اندر بند رکھا جائے، انہیں جہالت کے اندھیرے

سے نکلنے نہ دیا جائے، انھیں ہر موڑ پر بھڑکایا جائے، اشتعال دلایا جائے تاکہ خود ان حضرات کا کاروبار چلے، ان کی قیادت چمکے۔

آپ نے دیکھا، انتقالِ اذہان کے بہت سے مدارج ہیں۔ بعض صورتوں میں اُس ملک کو ایک عرصے کے لیے خیرباد کہنا جس کی کوکھ سے ہم اُٹھے ہیں اور جس نے ہمیں پروان چڑھایا ہے، جائز ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت وہ ہے جب زندگی، ملک یا آزادیٔ فکر کو خطرہ ہو، دوسری صورت جب تحصیلِ علم اور تکمیلِ تحقیق کے لیے انسان دوسرے ملکوں کا سفر کرے۔ غور کیجیے تو ہندوستان کے مسلمانوں پر پہلی صورت کا اطلاق سرے سے ہوتا ہی نہیں اور ان میں کم لوگ ایسے ہیں جو دوسرے خانے میں آتے ہیں۔ جو بات مسلمان ذہنوں کے لیے دیرپا ہجرت کے جواز کو کالعدم کر دیتی ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عبرتناک پسماندگی ہے۔ ان کے بہترین ذہن اگر ملک چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یورپ اور امریکہ میں جا بسیں گے تو اُن کے دکھ کا مداوا، اُن کی تعلیم کی سبیل، ان کی ترقی کا ساز و سامان، ان کے نقطۂ عروج کی اصلاح کون کرے گا۔ کیا ملّت کا اپنے افراد پر سرے سے کوئی حق ہے ہی نہیں ؟

یہ بات کہے بغیر ان سطور کو ختم کرنا مناسب نہ ہوگا کہ آگے چل کر دنیا ایک ہو کر رہے گی۔ ملکوں کی دیواریں آہستہ آہستہ گھٹنے لگی ہیں، گرنے لگی ہیں۔ انسانیت بالآخر وطن کی جگہ لے لے گی لیکن اس دن کے لیے جس سے بنی نوعِ انسان کی امیدیں وابستہ ہیں، تیاری کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ موجودہ پسماندہ ممالک وملل کے بہترین ذہن ان کی ترقی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں، بازاری ذہنیت سے خود کو بچائیں اور عارضی نفع پر دائمی فلاح کو قربان نہ کریں۔ ذہنوں کی گریز پائی کو جغرافیہ کی وسعتیں درکار نہیں ہیں۔ یہ بے وفائی کا دوسرا نام ہے۔

حضرت مقدادؓ بن اسودؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا،

اگر میں کفار کے کسی آدمی سے ملوں اور وہ ہم سے جنگ کرے اور میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے، پھر ایک درخت کی آڑ میں مجھ سے پناہ چاہے اور کہے کہ میں اللہ کے لیے اسلام لایا تو کیا میں اس کو قتل کر دوں ؟ فرمایا، نہیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! اس نے میرا ہاتھ کاٹ لیا، پھر یہ بات کہی۔ آپ نے فرمایا، قتل مت کرو۔ اگر تم اس کو قتل کرو گے تو جو مرتبہ تمہارا پہلے تھا اُس مرتبے کو وہ پہنچ جائے گا اور وہ اس کلمے کے کہنے سے پہلے جیسا تھا ویسے تم ہو جاؤ گے ؟

[بخاری و مسلم]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۸ (اگست ۸۹ء)

زمین کے پیٹ میں

محمد اعظم بٹ *

زمین کا نصف قطر چھ ہزار چار سو کلو میٹر (تقریباً چار ہزار میل) ہے۔ اگر آپ زمین میں سوراخ کرتے چلے جائیں تو اس کے مرکز میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں تہ در تہ جو کچھ بھی ہے تب ہی دریافت ہو سکے گا جب آپ وہاں پہنچ جائیں گے۔

فی الحال زمین کے پیٹ کا جو حال بیان کیا جاتا ہے، وہ محض مفروضوں پر مبنی ہے۔ زمین کے مرکز تک پہنچنا کل بھی ایک خواب تھا، آج بھی ایک خواب ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اب تک انسان نے کتنی گہرائی تک کھدائی کر لی ہے؟

صرف بارہ کلو میٹر۔ اتنی گہرائی تک روسی گئے ہیں اور وہ بھی قطب شمالی کے برفستان میں۔ یعنی زمین کے عین شمالی کونے میں۔

دنیا بھر کے ماہرین ارضیات زیادہ سے زیادہ گہرائی میں برمائی کرنا چاہتے ہیں تاکہ زمین کی باریک پرت کی طبعی حالت کا اندازہ کیا جا سکے۔

سائنسی مقاصد کے لیے اگر کم از کم دس کلو میٹر گہرائی میں بھی برماؤ کر لیا جائے تو کسی بھی خاص خطے میں زلزلے کے قدرتی مظاہر کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ مستقبل میں آنے والے زلزلوں کے بارے میں بھی ٹھیک ٹھیک پیش گوئی کرنا آسان ہو جائے گا۔ ایسے برماؤ کے لیے تقریباً پچاس ہزار ڈالر درکار ہوتے ہیں۔ اتنی رقم کہاں سے آئے۔

پھر بھی کچھ ملکوں میں پیش رفت ہو رہی ہے۔ روس کی جنوبی ریاست یوکرین میں پندرہ کلو میٹر تک برمائی ہو رہی ہے مغربی جرمنی نے چودہ کلو میٹر اور امریکا نے دس کلو میٹر تک برمائی کا منصوبہ بنایا ہے۔

اب تک کے تجربات سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین پیاز کی مانند ہے جس میں مادہ مختلف طبعی حالتوں میں تہ در تہ موجود ہے۔ سب سے اوپر کی تہ پپڑی کہلاتی ہے، جس میں تیل، معدنیات اور میٹھے پانی کے ذخائر موجود ہیں۔ اس کے باوجود یہ تہ زمین کا صرف ایک فی صد اندرونی رقبہ گھیرے ہوئے ہے۔ اسی تہ میں وہ راز پوشیدہ ہیں جن کی بدولت زمین پر زلزلے کسی علامت کے بغیر اچانک آجاتے ہیں لیکن باقی ننانوے فیصد اندرونی رقبے میں کیا ہے؟

پپڑی اوسطاً ستر کلو میٹر گہری ہے۔ زمین کے حجم کو پیش نظر رکھ کے تجزیہ کریں تو یہ انڈے کے چھلکے کی طرح پتلی اور باریک ہے جس نے زمین کے پورے اندرونی حجم کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

سائنس داں گہرے سوراخوں میں ہلکے دھماکوں کے ذریعے

---

* ناظم آباد ۲، کراچی، پاکستان۔

زلزلے جیسی لہریں بھیجتے ہیں اور زمین کے اندرونی حصوں کی اصلی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں جن کو وہ اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اب تک بھیجی ہوئی لہروں کے ذریعے جو بازگشت سنائی دی ہے اس کے مطالعے سے چند نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔

سب سے زیادہ چونکا دینے والی خبر یہ آئی ہے کہ زمین کی سب سے اوپری پرت (پپڑی) ایک وحدت کی شکل میں نہیں ہے بلکہ یہ سات بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ یہ حصے قدرتی توازن کی حالت میں ہیں اگرچہ یہ ساتوں حصے کھولتے ہوئے اور "پگھلے" ہوئے اندرونی حصے کے اوپر تیرتے رہتے ہیں۔

ان شکستہ سات حصوں کو پلیٹ کہتے ہیں۔ یہ پلیٹیں اپنے اوپر سمندروں اور خشکیوں کو سنبھالے پگھلے ہوئے مادّے پر تیرتی رہتی ہیں۔ یہ پلیٹیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ بھی ہوتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک دوسری سے متصل ان پلیٹوں کی ایک دوسری سے دور ہٹ جانے یا ایک دوسرے پر چڑھ جانے کی اس "حرکت" سے بڑے بڑے زلزلے آتے ہیں یہ زلزلے خشکی اور سمندر میں آتے ہیں۔ ان بڑے زلزلوں کے وقوع پذیر ہونے سے زمین پر پہاڑ بلند ہو جاتے ہیں یا سمندر میں جزیرے ابھر آتے ہیں۔

شکستہ پپڑی کا نظریہ ارضیات کی سائنس میں جدید ترین نظریہ ہے۔ اس کو نظریہ ساخت مانی یا پلیٹ ٹکٹونکس کا نام دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کی وجہ سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ پہاڑ کیوں کر رفتہ رفتہ بنے تھے اور برِّ اعظم کیوں کر کھسک رہے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ آج سے کئی لاکھ سال پہلے برِّ عظیم پاک و ہند جنوبی قطب کے قریب کہیں واقع تھا۔ یہ اس خطّے سے دراڑ پڑنے سے علیحدہ ہوا اور ہٹتے ہٹتے لاکھوں سال میں برِّ اعظم ایشیا کے ساتھ اس جگہ پہ آ گیا ہے جہاں آج یہ ہمیں نظر آ رہا ہے۔

"میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے تحقیق کر کے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ اور عمدہ اور سچّا یقین کیا ہے۔ اور اسی سچّے مذہب نے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ اور کرتا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ جن چیزوں میں ہم کو خدا سے شرم نہیں، اس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ شمارہ ۸ (اگست ۸۹ء)

داخلی تخمین

عتیق احمد صدیقی*

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجے

علامہ اقبال نے جب یہ اشعار لکھے تو دراصل وہ تعلیم کے نظامِ جدید سے اپنی بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ اس نظام میں تعلیم و تدریس بھی تجارتی شے بنتی جا رہی تھی۔ اس زمانے کا تصور کیجیے جب کوئی عالم تدریس کا سلسلہ شروع کرتا تھا، علم کے جویا دور دور سے جوق در جوق اس کی خدمت میں حاضر ہوتے، اس کی شرائط کے مطابق رہتے اور نہ صرف اکتساب علم کرتے بلکہ اخلاقی تربیت بھی حاصل کرتے۔ استاد کی نگرانی میں ان کی ذہنی تربیت ہوتی، ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی، اُن کے عادات و اطوار کو جلا ملتی۔ اس نظام میں توجہ کا مرکز تحصیل علم تھا، تدریس علم نہیں۔ طالب علم ذاتی شوق سے اکتساب کرتا اور استاد ذاتی توجہ سے تدریس کا کام انجام دیتا۔ وہ خود ہی طالب علموں کی جانچ پرکھ (تخمین) کرتا اور جب مطمئن ہو جاتا تو سند فضیلت عطا کرتا۔ تدریس و تحصیل کا یہ پورا عمل شخصی تھا، لیکن تعلیم عام ہونے کے ساتھ طالب علموں کی تعداد میں اضافہ ہوا، تعلیم کا تعلق درسگاہ سے قایم ہوا، درجہ بندی کا نظم بنا تو تعلیم تحصیل نہاد (Learning Oriented) ہونے کے بجائے تدریس نہاد (Teaching Oriented) ہو گئی۔ تخمین کے بجائے امتحان کا طریقہ کار رائج ہو گیا، جس میں تدریس کا کام انجام دینے والے کوئی اور تھے اور تخمین کرنے والے کوئی اور۔ ان تخمین کرنے والوں کا طالب علم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، نہ ان کو طالب علم کے اکتساب کا کوئی علم ہوتا ہے، نہ پورے زمانۂ تعلیم میں اس کی کارکردگی کا۔ بس امتحانی سوالات کے جوابات میں کاپی پر جو کچھ لکھا گیا، اسی پر تخمین کا مدار ہوتا ہے۔ اس طرح تدریس و تحصیل کا پورا نظام ہی غیر شخصی ہو گیا اور تدریس، تحصیل اور تخمین کے درمیان اجنبیت کے پردے حائل ہو گئے۔ آسانی کی خاطر پہلی شکل کو داخلی تخمین اور دوسری شکل کو خارجی تخمین کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے نظام تعلیم دوسری شکل کافی عرصے سے رائج ہے۔ اس کے نقائص کا احساس پہلے بھی تھا لیکن ادھر حال میں یہ احساس بڑھ گیا ہے اور اس میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ ۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں داخلی تخمین پر کافی زور دیا گیا ہے اور اس کو رائج کرنے کی پُرزور سفارش کی گئی ہے۔

قدیم روایات سے قطع نظر داخلی تخمین کی نئی صورت گری کی جا رہی ہے۔ اس کی دو بنیادی باتوں کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ استاد ہی اس تخمین کا ذمہ دار ہو اور یہ عمل مسلسل ہوتا رہے۔ جو استاد پڑھا رہا ہے وہ طالب علم کا برابر مشاہدہ بھی کر رہا ہے۔ ... دورانِ تدریس اس پر عمل اور ردعمل کیا ہوتا ہے، وہ [illegible]

* ڈین فیکلٹی آف آرٹس، پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سے روشناس ہوتا ہے تو اس پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کی تفہیمی سطح کیا ہے، قوتِ آخذہ کس قدر ہے، تحصیلِ علم میں اس کے ذوق و شوق کا کیا عالم ہے، وہ کتب خانہ یا تجربہ گاہ سے کتنا استفادہ کرتا ہے، کلاس کے مباحث میں کتنی دلچسپی لیتا ہے، تحریر و تقریر میں وہ اپنے خیالات کس طرح پیش کر سکتا ہے۔ اس مشاہدے سے استاد طالب علم کے اکتسابات، اس کی ذہنی سطح اور اس کے رجحانات کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ یہ رائے طالب علم کی مجموعی شخصیت کے بارے میں ہوتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس سے زیادہ سچی رائے نہیں ہو سکتی لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر اس رائے میں موضوعیت غالب آجاتی ہے اور بعض غیر متعلق وجوہ کی بنا پر اس کی شکل ایسی بن سکتی ہے کہ جس سے طالب علم کو نقصان ہو یا غیر استحقاقی فائدہ پہنچے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس طرح رائے سازی کی موضوعیت کے عنصر کو ختم یا کم کیا جائے اور ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جن سے معروضی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ فی زمانہ تعلیم پر بھی کاروباری تصورات غالب ہیں۔ تعلیمی سندات حصولِ ملازمت کے لیے پاسپورٹ بن جائیں اور یہ طالب علموں کے علمی اکتسابات کی تصدیق نامے نہ ہوں تو تعلیم و تدریس کے پورے نظام پر غیر علمی تصورات کی پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں اور طالب علموں اور ممتحنوں میں ہر طرح کا بگاڑ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک عرصے سے یہ صورتِ حال ہمارے تعلیمی نظام کو خراب کر رہی ہے۔ طالب علم غلط ذرائع سے کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ممتحنین نے امتحانات کو زرگری کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ یہاں تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ان کے بارے میں سبھی واقفیت رکھتے ہیں

ان خرابیوں کے تدارک کے لیے داخلی تعیین کی تجویز عرصے سے زیرِ غور ہے۔ خواہ ان خرابیوں کا مکمل تدارک نہ ہو سکے لیکن موجودہ نظام کے مقابلے میں اس میں یقیناً کچھ خوبیاں ہیں۔ مثلاً

۱۔ اس میں سال بھر میں صرف ایک مرتبہ طالب علم کی آزمائش نہیں ہوتی بلکہ دورانِ تدریس آزمائش کا عمل جاری رہتا ہے۔

۲۔ نصاب کے چھوٹے حصوں پر آزمائش ہوتی ہے اور طالب علم

کو اپنے اکتساب کا اندازہ ہوتا رہتا ہے

۳۔ اس میں صرف قوتِ حافظہ کی آزمائش نہیں ہوتی بلکہ مضمون کی تفہیم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۴۔ استاد اور طالب علم کی تدریس و تحصیل کے دوران براہِ راست رابطہ آزمائش کے دوران بھی قائم رہتا ہے۔

۵۔ استاد کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کیا اور کیسے پڑھایا اس لیے وہ آزمائش میں بھی ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھتا ہے۔

۶۔ چونکہ تدریس اور آزمائش کا عمل مسلسل رہتا ہے اس لیے تضیعِ اوقات کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۷۔ اس بات کی بھی گنجائش نہیں ہوتی کہ طالب علم چند منتخب حصے یاد کر کے امتحان سے گزر جائے۔

۸۔ طالب علم کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے جوابات کی غلطیوں پر مطلع ہو، ان کا محاسبہ کر سکے اور خود احتسابی سے ان غلطیوں پر قابو پا سکے۔

۹۔ ہر آزمائش کے بعد طالب علم کو اپنی تعلیمی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ توجہ کرے تو اس حیثیت کو بہتر بنا سکتا ہے۔

خیال ہو سکتا ہے کہ اس نظام میں اتنی خوبیاں ہیں تو اسے فوراً تمام دانش گاہوں میں نافذ کر دینا چاہیے لیکن اس کی خامیوں اور عملی دشواریوں پر بھی غور کر لینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ نفاذ کے وقت ان کا سدِ باب کیا جا سکے۔ اس بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ آج ہمارے معاشرے میں طلبا کی بڑی تعداد جویانِ علم و دانش کی نہیں ہے۔ وہ ملازمت یا کوئی اور نفع بخش کام نہ ہونے کی وجہ سے کالجوں یا یونیورسٹیوں میں وقت گزاری کرتے ہیں یا ملازمتوں کے لیے پاسپورٹ یعنی ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی استاد گاہ بہ گاہ کلاس چھوڑتا ہے، اور آج کل اساتذہ اسے اپنا حق تصور کرنے لگے ہیں لا طلبا خوش ہوتے ہیں۔ ان کو یا اسے کبھی نہیں ہوتا کہ یہ ان کا نقصان ہے۔ طلبا کی طرف سے [illegible]

میں آئے دن حقیقی یا مزعومہ مسائل پر احتجاج ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی کسی نے اس پر احتجاج نہیں کیا کہ ہماری پڑھائی مناسب انداز میں نہیں ہو رہی ہے، یا اساتذہ کلاس نہیں لے رہے ہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ امتحان نہیں ہوا کرے گا اور جو بھی داخلہ لے گا اسے ایک معینہ مدت کے بعد ڈگری دے دی جائے گی تو یونی ورسٹیوں / کالجوں میں کیا صورت نظر آئے گی۔

ایسی صورت میں اگر داخلی تعین کے نظام کو نافذ کر دیا گیا تو قوی امکان یہ ہے کہ مزید خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ مثلاً

۱۔ اساتذہ نصاب کا کچھ حصہ پڑھائیں گے اور اسی میں سے امتحان لیں گے، باقی نصاب خارج از بحث۔

۲۔ خود طلبا ان آزمائشوں کو بہت سنجیدگی سے نہیں دیکھیں گے اور محض خانہ پری کریں گے۔

۳۔ تعین کا انحصار اساتذہ کی ذاتی پسند و ناپسند پر رہ جائے گا۔

۴۔ تعین اور تدریس سب ذاتی صوابدید پر ہو گی۔

۵۔ اساتذہ پر خارجی دباؤ بڑھ جائے گا اور اس کے تحت وہ طلبا کی تدریج کریں گے۔

۶۔ طلبا کو زیادہ سے زیادہ نمبر دیے جائیں گے تاکہ یا تو طلبا کو خوش کیا جا سکے یا طلبا کی دوسرے اسباب کی بنا پر ناراضگیوں کو دور کیا جا سکے یا خود اپنی تدریسی خامیوں پر پردہ ڈالا جا سکے یا اپنی ساری خامیوں کے باوجود طلبا میں مقبولیت حاصل کی جا سکے۔

۷۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آزمائشیں نام چارے کو رہ جائیں یا اساتذہ اور طلبا کی ملی بھگت کے نتیجے میں بالکل ہی نہ ہوں اور نمبر دے دیے جائیں۔

لیکن ان خرابیوں پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ داخلی تعینی نظام کی خرابیاں نہیں ہیں بلکہ اس ماحول کی دین ہیں جس میں مقصدیت، محنت اور دیانت کے سب تصورات باطل ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس معاشرے میں سرتاسر بگاڑ ہی بگاڑ ہو، تعلیم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی۔ اس معاشرتی بگاڑ کی وجہ سے ہی تعلیمی نظام میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے اس نظام کو مسترد کرنے کے بجائے ان حالات کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہو گی۔ یہ تو شاید ممکن نہ ہو کہ تعلیمی میدان میں کام کرنے والے سارے معاشرے کو بدل ڈالیں لیکن کم از کم نظام تعلیم میں دیانت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ اساتذہ میں بھی اور طلبا میں بھی۔ ایک ایسا ماحول جس میں دونوں ہی خود کو جواب دہ محسوس کریں لیکن جب تک حصول ملازمت کا تعلق ڈگری سے رہے گا، طلبا کا اصل مقصد تو یہی رہے گا کہ وہ کسی نہ کسی طرح ڈگری حاصل کر لیں۔ اگرچہ ملازمتوں کے لیے مقابلے کے امتحانات نے اس رجحان کو کم کر دیا ہے لیکن اگر چند احتیاطی اور تنظیمی اقدامات کیے جائیں اور تمام متعلقین اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں تو داخلی تعینی نظام کو کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے۔ چند اقدامات ذیل میں تجویز کیے جاتے ہیں:

۱۔ اعلیٰ تعلیم میں داخلے پر پابندی عائد کی جائے۔ صرف ایسے ہی طلبا کو کالجوں / یونی ورسٹیوں میں داخلہ دیا جائے جو واقعی اعلیٰ تعلیم کا مزاج اور فہم و ذہانت رکھتے ہوں تاکہ وہ بامقصد طور پر اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکیں۔

۲۔ اساتذہ کی کارکردگی کی نگرانی ہو۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذمہ داری اور جواب دہی کے تصورات باہر سے لادے جانے کے بجائے خود اساتذہ میں پیدا ہوں، تب ہی کچھ مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں لیکن ذمہ داری سے فرار انسانی سرشت ہے اور جب تک اس پر نگرانی نہ ہو، اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ البتہ ایک بار نظام قائم ہو جائے اور اس کے بندھن میں بندھ جائیں تو پھر فرار ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں:

ا۔ ہر نصاب کو چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ (دس ماہ کے تعلیمی وقت کی مناسبت سے دس اکائیوں میں)۔

(ب) ہر اکائی کے ذیلی عنوانات کی تفصیل متعین کی جائے

(ج) ہر ذیلی عنوان کی تدریس کا وقت گھنٹوں کے اعتبار سے متعین ہو کہ اتنے وقت میں اساتذہ اسے پڑھائیں (ان تینوں باتوں کے بارے میں یونیورسٹی کا متعلقہ مضمون کا تعلیمی بورڈ فیصلہ کرے)۔

(د) ہر استاد اس کا حساب رکھے کہ اس نے کتنے لکچر دیے اور کون کون سے عنوانات کو ختم کیا۔ (اس کی نگرانی صدر شعبہ کی ذمہ داری ہو)۔

(ہ) ہر اکائی کے اختتام پر طلبا کی آزمائش ہو، جس کے لیے درج ذیل لائحہ عمل طے ہو:

۱۔ تعلیمی سال کے آغاز میں ہر استاد اپنے نصاب سے متعلق آزمائشی مشقیں تیار کرے اور اس جماعت کو پڑھانے والے جملہ اساتذہ پر مشتمل مجلس ان پر غور کر کے ان کی منظوری دے۔

۲۔ ہر آزمائش کے مابعد دو تین روز کے اندر استاد یا اس کا معاون طلبا کے جوابوں کو جانچ لے۔

۳۔ کاپیوں پر غلطیوں کی نشان دہی کی جائے اور انہیں طلبا کو دکھایا جائے تاکہ وہ ایک طرف اپنی غلطیوں سے آگاہ ہوں اور دوسری طرف اس کا بھی اطمینان کر سکیں کہ جو نمبر ان کو دیے گئے ہیں، وہ درست ہیں۔ ضرورت ہو تو استاد اپنی تخمین کی وضاحت بھی کر دے۔ طالب علم اس سے مطمئن نہ ہو تو مذکورہ مجلس اس پر غور کر کے فیصلہ کرے۔

(و) مذکورہ مجلس ہر ہفتے نشست کرے، تمام کاپیاں اور نتائج اس کے سامنے پیش ہوں اور ان کو مختتم شکل دی جائے۔

(ز) ہر کلاس کی تمام آزمائشوں کے نتائج ماہانہ صدر شعبہ کے سامنے پیش ہوں۔ ضرورت ہو تو وہ اساتذہ سے گفتگو کر کے ان کو مختتم صورت دے اور ان کی جمع بندی کا کر لے۔

(ح) صدر شعبہ یہ مختتم نتائج ہر ماہ ڈین کے توسط سے دفتر امتحانات کو بھیج دے جہاں ان کا ماہانہ اندراج ہوتا رہے۔ کسی شبہ یا ناہمواری کا احساس ہو تو ڈین صدر شعبہ سے نتائج پر گفتگو کرے۔

(ط) تمام آزمائشوں کے نتائج کی جمع بندی ہونے کے بعد دفتر امتحان آخری نتیجے کا اعلان کر دے اور اسی پر ڈگری اور ڈویژن تفویض ہو۔

اس نظام کو پہلے ان یونیورسٹیوں میں آزمایا جا سکتا ہے، جن کے ساتھ بہت سے کالج ملحق نہیں ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر اقدام تضیع اوقات کے بغیر ہوتا رہے اور ان تمام عوامل پر قابو پایا جائے جو ان میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ صرف رہنما خطوط ہیں۔ ان کی بہت سی تفصیلات ہو سکتی ہیں جن کا وقتاً فوقتاً اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر اس نظام کو چلانا ہے تو کم از کم ان خطوط پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔ ورنہ داخلی تخمین رہے سہے تعلیمی معیار کو بھی ختم کر دے گی۔

پولیٹکل امور میں کسی کالج کے طالب علموں کا کام نہیں ہے، بلکہ ان کو اپنے تحصیل علم میں مشغول رہنا چاہیے۔ پولیٹکل امور ایسے نازک اور باریک ہیں کہ علمی معلومات اور کافی علم اور بہت سے تجربوں کے بعد اس میں رائے لگانے کا موقع ملتا ہے جن کا ابھی [illegible] ہے وہ کیا رائے اس کی نسبت لگا سکتے ہیں۔

سرسید

محمد باقر مرزا — اپنے چمن کا ایک دیدہ ور

اطہر صدیقی٭

(۲)

مرزا صاحب اپنے اور پرائے لوگوں کے کام نہایت مستعدی سے کرتے تھے۔ کبھی کسی کو نہ ٹالتے۔ ٹالنا یا کام کو آج اور ابھی کے بجائے کل یا پرسوں پر چھوڑنا انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔

میں لکچرر رہتے ہی ۱۹۵۳ء میں اُن کے ساتھ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے رجسٹرڈ ہو گیا تھا۔ ریسرچ کا ٹاپک ملتے ہی میں نے تندہی سے کام شروع کر دیا اور جب جب مرزا صاحب کی مدد یا راہ نمائی کی ضرورت پڑتی تو وہ فوراً مدد کرتے۔ جب تھیسس لکھنا شروع کیا تو ایک ایک باب میں ٹائپ کر کے ان کی میز پر رکھ آتا۔ شاید کوئی مشکل سے یقین کرے گا کہ مرزا صاحب دوسرے ہی دن تک وہ باب اصلاح کے بعد میرے کمرے آکر لوٹا دیتے۔ اس مستعدی اور کام میں اتنی دلچسپی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں نے لکچررشپ کے فرائض کے ساتھ ۲½ سال کے اندر پہلی پی ایچ۔ ڈی کا کام ختم کر لیا۔ جیسے ہی تھیسس تحریر میں آیا اس کو Submit کرانا، ڈرائنگس سے فوٹو بنوانا اور بعد میں زبانی امتحان کرانا —— کسی بھی کام میں مرزا صاحب نے لیت و لعل سے کام نہ لیا۔ پڑھنے لکھنے کے کاموں کے لیے ان کے پاس ہمیشہ وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ باوجود ڈپارٹمنٹ کی ساری ذمہ داری کے انھوں نے ریسرچ کے کام کو شایع کرانے میں اور اس میں ایڈیٹنگ کا کام کرنے میں بے حد وقت دیا۔ ان کی قیادت ہی قادری صاحب، بصیر صاحب جیسے قابل لوگوں نے ڈاکٹریٹ کی اور تقریباً ۱۳۰ سے زیادہ پرچے اور ۷۰۰ کتابیں۔ Oriental Insect Types کے نام سے شایع ہوئیں۔ ایک جرمن ریسرچ اسکالر Klaus Saunders (جو اب ارلانگن یونیورسٹی میں پروفیسر ہے) نے مرزا صاحب کی قیادت میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ سب سے پہلی ڈی۔ ایس سی کی ڈگری بھی اس یونیورسٹی میں قادری صاحب نے مرزا صاحب کی قیادت میں کی اور دوسری بصیر صاحب نے۔ ۱۹۵۵ء ہی میں میں نے امریکہ کی کچھ یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے اپنی درخواست بھیجنا شروع کر دی تھی۔ ۱۹۵۶ء تک مجھے امریکہ سے ۳ یونیورسٹیوں سے داخلہ کے ساتھ مالی امداد مل گئی۔ مرزا صاحب نے فوراً میری درخواست اسٹڈی لیو (Study Leave) کے لیے C.A.S.R میں رکھ کر منظور کرائی اور باہر جانے کے لیے ہر طرح سے مدد کی۔ وہ باہر جانے اور وہاں سے تعلیم حاصل کرنے کو مذہبی فریضے کی حد تک اہمیت دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانے تک ہم میں سے ہر شخص کے لیے باہر جانا فرض تھا۔ ترقی کے لیے اور تعلیم کی افزائش کے لیے جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ جانا بالکل تعلیمی فریضہ سمجھتے تھے۔ ہم میں سے اگر کوئی اس

٭ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف زولوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سلسلے میں ٹال مٹول کرتا تو ترقی رو کے رہتے۔ گو کہ میرے ایک سینئر ساتھی اور استاد نے یہاں سے پی ایچ۔ ڈی کرلی تھی لیکن مرزا صاحب نے انہیں مجبور کیا اور باہر جانے پر راضی کرلیا جب تک وہ باہر سے دوسری پی ایچ۔ ڈی کرکے نہ آگئے، انہیں ریڈر نہ بنایا۔ آج اپنے چاروں طرف دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسٹینڈرڈ سب ختم ہوگئے۔ ہر شخص بے حد جلدی ریڈر اور پروفیسر ہونے کے خواب دیکھتا ہے۔ ملک سے باہر جانا تو کجا اپنے ملک ہی کی اچھی یونیورسٹیوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ اس طرح کے لوگ صرف کنویں کے مینڈک بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی کشادگی اور تعلیمی اعتماد کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

مرزا صاحب کی جس مستعدی کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے وہ عام طور پر ناپید ہے۔ انہیں کے شاگردوں نے اس سلسلے میں مرزا صاحب کے نقش قدم پر چل کر نہ دکھایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ریسرچ اسکالر کی کارکردگی پر اس کے گائیڈ کا بہت اثر پڑتا ہے اگر گائیڈ مستعد نہ ہوگا تو کتنا ہی اچھا ریسرچ اسکالر کیوں نہ ہو صحیح وقت سے کام ختم نہ کرسکے گا نہ اچھا کام کرسکے گا۔

ویسے آج کل کے زیادہ تر ریسرچ اسکالر سارا کریڈٹ [illegible]، خود ہی لے لیتے ہیں۔ اگر ریسرچ وقت سے ختم کریں تو سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی ذاتی قابلیت کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ ریسرچ اسکالر میرے نزدیک صرف ایک نوزائیدہ پودے کی طرح ہوتا ہے جس کی صحیح نشوونما اور گل بارآوری اس کے اپنے ذہن اور قابلیت سے زیادہ اس مالی کی نگہداشت پر مبنی ہوتی ہے جو اچھی مٹی کے ساتھ صحیح کھاد اور پانی وقت پر دیتا ہے۔ ہم اگر اچھے ریسرچ اسکالر ہیں یا تھے تو اس میں گائیڈ کا Contribution بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایک شخص کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، جب تک اس کا گائیڈ اچھا نہ ہوگا وہ کبھی بھی اچھا کام وقت سے نہ کرسکے گا۔ میری اپنی زندگی اور میرے سارے Achievements اس بات کے شاہد ہیں کہ اگر مرزا صاحب جیسا گائیڈ نہ ملتا تو میں کبھی بھی ۲۰ سال میں پہلی پی ایچ۔ ڈی نہ کرپاتا اور فوراً ہی امریکہ نہ چلا گیا ہوتا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں سب مرزا صاحب کی محبت، محنت اور تعلیمی تربیت کا فیض ہے۔ اگر کوئی سکنڈ ڈویژن اپنے کو بہتر بنالیتا تو اس کو فوراً قبول کرلیتے۔ میرے ایک استاد اور پھر بعد میں ساتھی جب امریکہ سے پی ایچ۔ ڈی کرکے لوٹے تو مرزا صاحب نے ان کو فوراً ہی ان کی اہلیتوں کا اندازہ کرکے سینئر لکچرر کا تقرر دے دیا۔ ان کے مدنظر ہمیشہ علمی Achievements رہے، ذات کو کبھی اہمیت نہ دیتے۔ اگر کوئی اچھا ہے تو اس کو فوراً اسٹاف پر لے لیتے۔

پڑھائی میں مدد کے علاوہ بھی مرزا صاحب لڑکوں کی قدر کرتے۔ ڈپارٹمنٹ میں ایک صاحب ریسرچ مکمل کرکے باہر کا اسکالرشپ پاگئے، لیکن ان کے پاس ٹکٹ تک کے پیسے نہیں تھے۔ مرزا صاحب نے نہ صرف ان کے ٹکٹ کے لیے مدد کی بلکہ کچھ گرم کپڑے بھی بنوا دیے کہ جہاں وہ جارہے تھے وہاں سردی بہت پڑتی تھی، جاتے ہی مشکل کا سامنا ہوتا کتنے چیرمین اس طرح اپنے شاگردوں کے کام آتے ہیں؟ کیا انسان دوست شخص تھے۔

سالم علی صاحب آج ہندوستان اور دنیا بھر کے قابل چڑیوں کے سائنس داں مانے جاتے ہیں۔ ان کو جتنے بھی اعزاز ملے وہ پچھلے دس برسوں میں عطا ہوئے ہوں گے۔ مرزا صاحب نے سالم علی صاحب کی قابلیت کو بہت پہلے تسلیم کرلیا تھا اور سب سے پہلے ڈی۔ ایس سی کی ڈگری ان کو ۱۹۵۸ء میں اس یونیورسٹی سے Confer کرائی۔ وہ جوہر شناس تھے اور اس میں بخل نہیں کرتے تھے۔ خود ان کو آنریری ڈی۔ ایس سی کی ڈگری اس یونیورسٹی نے ۱۹۷۵ء میں عطا کی۔ اس سلسلے میں بھی ایک بات کہنا چاہوں گا۔ مرزا صاحب اس یونیورسٹی سے ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہوکر جرمنی چلے گئے، اور وہیں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔ گو کہ اس ڈپارٹمنٹ کے ارباب حل و عقد مستقل اونچے عہدوں پر رہے لیکن کبھی کسی نے مرزا صاحب کا نام ذہن میں نہ

کبھی پیش نہیں کیا۔ خسرو صاحب کے زمانے میں جب کانووکیشن ہوا تو اسی وقت ایک میٹنگ میں مرزا صاحب کا نام پروفیسر مصباح الحسن (لا فیکلٹی) نے تجویز کیا۔ ہم لوگ مصباح صاحب کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ہمارے ایک محسن کو بروقت یاد رکھ کر ہم سب کو خوش ہونے کا موقع فراہم کیا اور علی گڑھ نے اپنے ایک بہت بڑے خادم اور نامور کو ان کے فوت ہونے سے ایک سال پہلے اس اعزاز سے نوازا۔

مرزا صاحب اپنی زندگی میں کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ وہ وائس چانسلر ہو یا کوئی اور۔ ان کے دور میں ڈاکٹر رادھا کرشنن آئے۔ پروفیسر ہالڈین آئے اور جانے کون کون لوگ یو۔ جی۔ سی کی کمیٹیوں پر آتے رہے۔ مرزا صاحب سب سے برابر کے ساتھ گفتگو کرتے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات کہتا تو فوراً جواب دے دیتے۔ ہالڈین کمیٹی نے کچھ خراب رپورٹ لکھی۔ مرزا صاحب نے اس کا جواب بہت سخت الفاظ میں دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کمیٹی میں کوئی صاحب بھی مضمون کے نہ تھے اور انہیں رائے دینے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہالڈین کمیٹی کی رپورٹ کی اہمیت ہی ختم ہو گئی۔

بذلہ سنجی

مرزا صاحب بظاہر بے حد سنجیدہ بارعب اور بے حد پر تکلف شخصیت کے حامل لگتے تھے، لیکن جہاں تین چار ساتھی چائے پر جمع ہوتے تو ان کا یہ reserve کر باریک چادر کی طرح اتر جاتا اور بے حد پر مذاق اور پُر مزاح باتیں کرتے۔ کبھی کبھی ان کے مذاق فحش ہو جاتے اور ان کی ذات کے اس پہلو کو پہلے پہل دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ لیکن چونکہ مرزا صاحب کی ذات میں کوئی چھل بٹ نہیں تھا۔ ان کے اس پہلو کو بھی ان کی ذات کی سچائی اور زبردستی کے سنجیدہ پن سے دور ہونا اُن کے کردار کی اچھائی کا ثبوت ہے۔

رضیہ کے شوہر مذہباً کیتھولک ہیں۔ رضیہ کے پاس ایک السیشن کتیا بھی تھی۔ ہر سال رضیہ کے یہاں بھی بچہ ہوتا اور کتیا کے بھی۔ مرزا صاحب چائے پر کہتے:

"وہ کیتھولک بچے پیدا کرلے جاتا ہے اور نام مجھے رکھنا پڑتے ہیں، کتیا کے بچوں کے نام رضیہ رکھتی ہے اور رضیہ کے بچوں کے نام مجھے رکھنا پڑتے ہیں اب میں کہاں تک نام تلاش کرتا پھروں۔"

حمید اللہ خاں صاحب سابق پرنسپل انجینئرنگ کالج مرزا صاحب کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ بلیرڈ کھیلتے کھیلتے کبھی آپس میں فحش مذاق پر اتر آتے اور کہیں بیگم مرزا جو جرمن نژاد تھیں لیکن تھوڑی بہت اردو سمجھتی تھیں فوراً مرزا صاحب کو ٹوکتیں۔ وہ اُن کو پیار میں "بابی" کہتی تھیں۔ ایسے وقت ان کے منہ سے نکلتا۔ " بابی بابی۔ نہیں، نہیں، نہیں"۔ اور مرزا صاحب ہنس کر چپ ہو جاتے۔ ڈپارٹمنٹ میں وہ اس طرح سے مذاق سب سے زیادہ معین فاروقی صاحب سے کرتے اب ہمارے معین صاحب بہ ایں ریش دراز زیر لب خاموشی سے سنا کرتے اور ہنسا کرتے۔

ڈسپلن

مرزا صاحب کی بڑی خوبی ان کا discipline تھا اس میں وہ کسی کی رعایت نہ کرتے۔ چاہے کوئی ان سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہوتا۔ جب ڈپارٹمنٹ کے ڈسپلن کا معاملہ ہوتا تو ساری قربت دھری رہ جاتی۔

میں اگست ۱۹۵۶ء میں پی ایچ۔ ڈی کرنے پرڈیو یونیورسٹی امریکہ چلا گیا تھا۔ اسی سال مرزا صاحب فل برائیٹ فیلوشپ پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے University of Illinois پہنچے۔ یہ یونیورسٹی پرڈیو (Purdue) سے تقریباً سو میل اربانا شہر میں ہے۔ نومبر کی تیسری جمعرات کو Thanksgiving کی چھٹی امریکہ میں خاصی اہم چھٹی ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے مجھے اربانا آنے کو کہا۔ میں بھی ابھی تک وطن کی یاد میں غمگین زیادہ اور امریکہ میں

رہنے کی خوشی میں کم فوراً ارباناجانے پر تیار ہو گیا۔ جب ٹرین سے پہنچا اس کی اطلاع مرزا صاحب کو دے دی۔ اسٹیشن پر مرزا صاحب اور وہاں کے پروفیسر Thomas Lyell موجود تھے۔ دوپہر کو Thanks giving کا بہت شاندار کھانا تھامس صاحب کے یہاں کھایا اور تیسرے پہر میں مرزا صاحب کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر پہنچا۔ وہاں ایک کمرہ خالی تھا، اس میں میرے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ برابر کے کمرے میں ایک نیگرو نژاد لڑکی رہتی تھی۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ شام کا کھانا بیگم لوٹے (Lotte) نام کی ایک پرانی جرمن دوست کے یہاں ہے۔ ہم تینوں لوگ سرِ شام ہی بیگم لوٹے کے یہاں پہنچ گئے۔ گو نومبر کا مہینہ تھا لیکن اس سال کچھ وقت سے پہلے ہی برف باری شروع ہو گئی۔ رات کو جب گھر سے باہر نکلے تو سڑک پر ہر طرف برف ہی برف پڑی ہوئی تھی۔ مرزا صاحب کو رات میں کچھ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے برف پر چلنے میں دشواری ہو رہی تھی قدم کہیں ڈالتے تھے اور پڑتا کہیں تھا۔ یہ ڈر لگنے لگا کہ اگر برف پر پھسل کر گر گئے، تو ہڈی پسلی پر چوٹ آجائے گی۔ یہ دیکھ کر ایک طرف سے میں نے بغل میں ہاتھ ڈالا اور دوسری طرف سے نیگرو لڑکی نے اور تینوں دوستوں کی طرح ہم اپنی قیام گاہ پہنچے جو زیادہ دور نہیں تھی۔ اس واقعہ کے بعد سے ہم تو یہ سمجھ بیٹھے کہ اب ہم مرزا صاحب سے خوب بے تکلف ہیں۔ وہ مجھ کو ویسے ہی پہلے سے بہت قریب رکھے ہوئے تھے۔ اب تو اپنا دماغ مرزا صاحب کی قربت سے چار آسمان پر پہنچ گیا۔ دو روز بعد میں واپس پہر ڈیو ([illegible]) چلا آیا۔

۱۹۵۹ء میں جب امریکہ سے واپس آیا تو اپنے آپ کو مرزا صاحب کا خاص الخاص اور بے تکلف شاگرد محسوس کرنے لگا۔ اسی سال بی ایس سی فائنل کو (Vertebrate) کا پرچہ پڑھانے کے لیے مرزا صاحب نے مجھ سے کہا۔ یہ میرا مضمون نہ تھا اور میں اپنی نادانی میں مرزا صاحب سے بولا: "میں نہیں پڑھاؤں گا یہ مضمون میرا مضمون نہیں ہے اور اس کا پڑھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" انھوں نے

اس وقت تو کچھ نہ کہا نہ ہی کسی ناراضگی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن جب کلاس میں پہنچا تو اپنی میز پر مرزا صاحب کا ایک نہایت مختصر خط جسے نوٹ کہنا مناسب ہوگا پایا۔ اس میں یہ حکم صادر تھا کہ اگلے دن سے فائنل کے کلاس پڑھائیے۔ خط کے مضمون اور انداز ہی سے اپنی جگہ کا احساس ہو گیا اور وہ دن اور آج کا دن چیئرمین کے حکم کو میں نے ہمیشہ وہی اہمیت دی جو دینا چاہیے پھر بعد میں ملاقات میں کسی ناراضگی کا اظہار مرزا صاحب نے نہ دکھایا اور خیر میری کیا ہمت تھی کہ اپنی کسی ناپسندیدگی تک کا اظہار کرتا۔ جو بھی لائن سے باہر نکلتا وہ فوراً اس کو لائن میں کھڑا کر دیتے اور پھر اس واقعے کو بھول جاتے۔ کسی اور سے بھی آپ کے رویے کی زیادتی یا حکم نہ بجالانے یا نافرمانی کا ذکر نہ کرتے۔ آج کل آپ کسی کے ساتھ کوئی اس طرح کا ایکشن لیجیے تو لوگ خفا بھی ہو جاتے ہیں اور گفتگو بھی بند کر دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کے یہاں روزانہ کے تعلقات میں چائے کے کمرے میں کوئی اثر ان باتوں کا نہ ہوتا۔ وہ روز کی طرح ہنسی مذاق کرتے۔ ان کے مدنظر صرف ایک بات ہوتی جو کام آپ کے سپرد ہے اس کو کرنا چاہیے۔ آنا کانی سے کام نہیں چلتا تھا۔ میں اس واقعہ سے مرزا صاحب سے کسی طرح بھی ناخوش گواری کے احساس تک میں مبتلا نہ ہوا، بلکہ اپنی غلطی کو مان کر حکم بجا لایا اور مرزا صاحب کی عزت میری نظروں میں اور بڑھ گئی۔ دوستی، شفقت اور خلوص کو ڈیوٹی سے وہ الگ رکھتے تھے اور دونوں کو [illegible] نہیں ہونے دیتے تھے۔

میرے ایک بزرگ ساتھی کا خیال ہے کہ مرزا صاحب ان سے ناراض ہو گئے تھے۔ گو کہ میں بھی اس وقت ڈپارٹمنٹ کا ایک فرد تھا مجھے آج تک اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ مرزا صاحب کسی سے ناراض تھے۔ کیا بھاری بھرکم پن تھا۔ اول تو میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ وہ ناراض تھے اور اگر واقعی تھے بھی تو اس کا اظہار کبھی بھی کسی کے سامنے نہیں کیا۔ خاص طور سے کم چھوٹے کے سامنے اور مجھے یقین ہے ان کے سامنے بھی نہیں۔

"۱۹۴۴ء سے پہلے سائنس کے ڈپارٹمنٹ کسی فیکلٹی کے تحت نہ تھے۔ مرزا صاحب پہلے آدمی تھے جنہوں نے فیکلٹی کی شروعات کی اور سائنس کے پہلے ڈین ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک رہے۔ ڈین کی حیثیت سے انہوں نے ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۵ء دوبارہ کام کیا۔ مرزا صاحب کو ڈپارٹمنٹ کے علاوہ کسی اور کام سے سروکار نہ تھا لیکن جس وقت وائس چانسلر نے ان کے کاندھوں پر پرووسٹ ہونے کی ذمہ داری ڈالی تو انہوں نے باوجود اپنی غیر دلچسپی کے آفتاب ہال کا پرووسٹ ہونا قبول کیا۔ آفتاب ہال ان ہالوں میں سے ایک تھا جس کی پرووسٹ شپ کوئی قبول کرنا پسند نہ کرتا تھا لیکن مرزا صاحب چیلنج قبول کرنے کے قایل تھے۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۴ء بے حد محنت اور کارکردگی سے یہ ذمہ داری نبھائی۔ ہال میں بھی انہوں نے اس قدر اچھے کام کیے کہ ہال کی حالت ہی بدل ڈالی۔ لڑکوں سے رابطہ قایم کرنے میں مرزا صاحب راست بازی اور شفقت سے کام لیتے تھے۔ برے اور بدمعاش لڑکوں کو ہال سے نکال کر اور اچھے لڑکوں سے بات چیت اور گفتگو کے ذریعے متاثر کر کے سارے ہال کو قابو میں کر لیا۔ ہال ڈنر وغیرہ میں وہ کبھی خصوصی میز پر بیٹھ کر کھانا نہ کھاتے بلکہ ہال کے لڑکوں کے ساتھ وہی کھانا کھاتے جو لڑکوں کے لیے پکا ہوتا تھا۔ آفتاب رسالہ پر جو مونوگرام ہے وہ مرزا صاحب ہی کا ڈیزائن کیا ہوا ہے۔ ڈسپلن کے معاملے میں دراصل مرزا صاحب کا اصول یہ تھا کہ وہ سختی کے ساتھ محبت اور شفقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ بقول ان کے

> اگر طلبا کا اٹھان اچھا نہیں تو یہ اساتذہ کا قصور ہے نہ کہ طلبا کا۔ طلبا ہمارے ہاتھ میں مثل موم کے ہیں۔ جس طرح ہم ان کو موڑیں وہ مڑ جاتے ہیں بعض اوقات موم بھی سخت ہوتا ہے اور اس کو موڑنے میں گرمی بھی پہنچانی پڑتی ہے۔ میں نے جو سختی کی اس کو آپ نے انتہائی خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور میری محبت اور ہمدردی روز بروز آپ کی طرف بڑھتی گئی۔"

وہ سزا اور جزا بھی لڑکوں کے معاملے میں سخت موم کو گرمی پہنچانے بھر کی حد تک ہی دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ۱۹۴۴ء میں پرووسٹ شپ چھوڑ کر ڈین فیکلٹی آف سائنس کے عہدے پر مامور ہوئے تو ۲۳ر جون کی شب میں جو سپاسنامہ الوداعی دعوت میں پیش کیا گیا وہ اس بات کا شاہد ہے کہ باوجود ان کے سخت ڈسپلن کے لڑکے ان کے ہال سے رخصت ہونے پر آبدیدہ تھے۔ مندرجہ ذیل الفاظ بھی ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں:

> "جناب والا! آپ کی علمیت کا آوازہ ہم نے پہلے بھی سنا تھا لیکن آپ کی شخصیت کے چند درخشندہ پہلو جو کہیں آئینہ ہیں اور کہیں شمشیر، اس وقت نظر کے سامنے آئے جب آپ اس ہال کے سرپرست مقرر ہوئے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ علم کا سایہ نہیں ہوتا عمل کا سایہ ہوتا ہے۔ علم ایک حجاب ہے عمل ایک پناہ ہے۔ علم مہمیز ہے اور عمل مرکب ہے۔ آپ میں علم و عمل دونوں کا امتزاج ہے آپ کی اصول پرستی، دیانت داری، اسلام سے لگاؤ، یہ سب باتیں آپ کو ورثہ میں ملی تھیں اب خدا کا شکر ہے کہ یہ سرمایہ آپ کے ہاتھوں سے ہم تک پہنچ رہا ہے۔" ۱۶

صاف گوئی:

مرزا صاحب کی ایک بڑی خوبی جو بعض لوگوں کی نظروں میں خوبی کم اور برائی زیادہ تھی وہ تھی صاف گوئی۔ کسی مسئلہ پر ان کی جو رائے ہوتی اس کا بے دھڑک اظہار کر دیتے۔ ساتھی پروفیسر تو کیا وائس چانسلر تک ان کی اس بات سے ڈرتے تھے۔ وہ کسی بھی معاملے میں لگی لپٹی نہ رکھتے تھے۔ ان کی اس عادت سے ان کے دوست کم اور نکتہ چیں زیادہ بنتے گئے۔ آج بھی اور غالباً کسی بھی زمانے میں صاف گوئی قابل اعتنا نہ سمجھی گئی۔

اکیڈمک کونسل، ایگزیکیٹو کونسل اور فیکلٹی کی میٹنگس میں وہ بے خوف اپنی بات کہہ جاتے۔ اس صاف گوئی کی انہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ صاف گوئی کے علاوہ خوشامد کرنا اور کرانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سب کی سزا انہیں یہ ملی کہ وہ علی گڑھ میں جرمنی سے ڈاکٹریٹ لے کر اسٹاف پر آئے تھے اور ۱۳ سال تک ریڈر رہے اور جب پروفیسر ہوئے تو اسی تنخواہ پر جس پر وہ ریڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان سے بے حد کم تعلیم یافتہ لوگ پروفیسر کے عہدے تک ان سے پہلے پہنچا دیے گئے تھے۔ مرزا صاحب کے ساتھ یہ زیادتی اور ناانصافی علی گڑھ کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس زیادتی اور ناانصافی اور اپنا حق نہ ملنے کے باوجود بھی مرزا صاحب نے اپنا عملی راستہ نہ بدلا۔ وہ اسی طرح صاف گوئی اور غیر خوشامدانہ رویے پر قائم رہے اور آخر وقت تک اس راہ پر گامزن رہے۔ آج کہاں اس طرح کی مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لوگ چھوٹے چھوٹے مفاد کے لیے ساتھیوں اور بزرگوں کے علاوہ اپنے سے کم درجے تک کے لوگوں کی خوشامد پر اتر آتے ہیں اور کام نکل جانے کے بعد اپنا رویہ بدل لیتے ہیں۔ مرزا صاحب اس کے برعکس تنقید مدعو کرتے تھے اور ان کے اپنے الفاظ میں:

"I have built myself upon criticism and I am also grateful to those who used to criticize me. My glory is indeed due to the Students of my University. They have made me what I am today[2]"

میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھ پر تنقید یا تبصرہ کیا۔ کیونکہ میں نے اپنے کو انہیں کی تنقید کی روشنی میں بنایا ہے۔ میری کامیابی کا سہرا میری یونیورسٹی کے طالب علموں کے سر ہے اور میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ انہیں طالب علموں کی وجہ سے ہوں۔"

سیاسی نقطۂ نظر:

مکمل مغربی طرزِ زندگی اور جرمن نژاد بیوی ہونے کے ناطے مرزا صاحب کے متعلق لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے اور کچھ لوگ ان کو نازی (Nazi) تک سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ جرمن بیوی ہونے کے علاوہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کلاس میں آنکھ سے متعلق لکچر دیتے ہوئے وہ پردے پر ہٹلر کی تصویر کا نگیٹو (negative) دکھایا کرتے تھے۔ کمرے میں بالکل اندھیرا کر دیا جاتا اور صرف تصویر نظر آتی۔ کچھ دیر کے بعد نگیٹو ہٹا لیا جاتا اور صرف روشنی پردے پر پڑتی رہتی۔ غور سے پردے پر دیکھتے رہنے سے ہٹلر کی positive تصویر نظر آ جاتی۔ ہٹلر کی تصویر دکھانے میں انہیں ہٹلر سے اظہارِ عقیدت مقصود نہ تھا بلکہ اس زمانے میں ہٹلر بے حد مشہور تھا اور سب اس کو پہچانتے تھے۔ سنا ہے برٹش حکومت نے مرزا صاحب کو جرمن ایجنٹ تک جانا اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران ان کے گھر کی تلاشی بھی ہوئی۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مرزا صاحب بے حد غیر سیاسی انسان تھے۔ ان کا مطمحِ نظر صرف اس یونیورسٹی کو بہتر بنانا تھا اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینا۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی میں کوئی اور شے اہمیت نہ رکھتی تھی۔

مرزا صاحب ۳۰ سال اس یونیورسٹی کی خدمت کر کے ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ علی گڑھ کو خیرباد کہنے سے بہت پہلے ہی انھوں نے جانے کے سب انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ یادگار کے طور پر ہم میں سے تقریباً ہر شخص کو بطور یادگار کچھ نہ کچھ تحفہ دیا۔ میرے گھر میں استری کرنے کی میز جو اب غالباً ۵۰ سال پرانی ہو گئی، انہیں کی دی ہوئی ہے۔

مرزا صاحب ۳۰ اپریل کو ریٹائر ہوئے اور یکم مئی ۱۹۶۱ء کو علی گڑھ کو خیرباد کہا۔ وہ شام چھ بجے کالکا میل سے علی گڑھ سے رخصت ہوئے۔ اسٹیشن پر پورا اسٹاف انہیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔ کچھ لوگ دور کھڑے تھے اور کچھ لوگ ٹرین کا ڈنڈا پکڑے کھڑے تھے لیکن تقریباً سب ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خود مرزا صاحب کی آنکھیں بھی اس وقت نمناک تھیں۔ ان کی زندگی کے ۶۰ سالوں میں سے صرف ۸ سال چھوڑ کر باقی ۵۲ سال اسی چمن میں گزرے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں علی گڑھ کے تھے اور آخر وقت تک علی گڑھ کے رہے۔

مرزا صاحب کئی دفعہ یورپ گئے اور وہاں سوربون اور ہامبرگ یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لیے مدعو کیے گئے۔[۵]

۱۹۵۷ء میں مرزا صاحب نے میڈاگاسکر میں Pan Indian Ocean Scientific Congress میں شرکت کی اور اسی زمانے میں UNESCO سے رابطہ قائم کرنے والی Indian National Commission for Co-operation with UNESCO کے ایگزیکیٹو بورڈ (Executive Board) کے ممبر رہے اور Helminthological Society of India کے فاؤنڈر ممبر تھے۔

۱۹۶۱ء میں ہجرت کر جانے کے بعد بھی مرزا صاحب کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ ۱۹۶۲ - ۶۴ء میں وہ فریڈرک الیگزانڈر یونیورسٹی ارلانگن میں جرمن کاؤنسل کے فیلو رہے۔

۱۹۶۴ - ۶۷ء تک وہ اسٹوٹ گارٹ کے اسٹیٹ میوزیم میں Conservator کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور آخر عمر تک جرمنی کے مختلف علمی اداروں میں Advisory Capacity میں کام کرتے رہے

علی گڑھ یونیورسٹی کا یہ نامور سائنس داں جس نے ۳۱ سال تین ماہ اس ادارے کی بے لوث خدمت کی، اس دار فانی سے ۲۱ جون ۱۹۷۶ء کو مغربی جرمنی میں رخصت ہو گیا لیکن ان کی خدمات اس یونیورسٹی میں تادم آخر ان کی یاد تازہ رکھیں گی۔

حواشی

---

۱ مولوی عزیز مرزا - یوسف چغتائی - ناموران علی گڑھ، دوسرا کارواں فکر و نظر - علی گڑھ

۲ My Experiences as Provost - Prof. M. B. Mirza - آفتاب ۱۹۶۹ء

۳ The fall of a Sparrow از سالم علی، آکسفورڈ پریس

۴ مسلم یونیورسٹی گزٹ - علی گڑھ جلد ۸ - نمبر ۱۳ - ۱۵ جولائی ۱۹۴۴ء

۵ Prof. M. B. Mirza and his work از اے۔ وہاب قیصری - مسلم یونیورسٹی گزٹ یکم نومبر ۱۹۴۳ء

اسکول بیگ

(THE SCHOOL BAG)

محمد اسحاق*

انگریزی زبان کے مشہور ناول نگار، کہانی نویس مسٹر آر۔ کے نارائن بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ راجیہ سبھا کے ممبر کی حیثیت سے دو سال تک خاموش تماشائی کی طرح بیٹھنے کے بعد بالآخر ان کی رگِ اظہار کو جنبش ہوئی اور پہلی مرتبہ ۲۵ر اپریل کو معصوم بچوں پر کتابوں اور نوٹ بکس کے بوجھ کے خلاف آواز بلند کر کے نہ صرف اراکین راجیہ سبھا بلکہ ملک کے ماہرینِ تعلیم، والدین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کو متوجہ کیا ہے۔ موصوف کا کہنا تھا کہ پہلی تا دسویں جماعت کے بچوں کو ۳ تا ½۵ کلو وزنی کتابیں، کاپیاں پیٹھ پر لاد کر لے جانا پڑتا ہے۔ بچوں پر تعلیم کا یہ بوجھ سراسر ظلم ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد سارے ہندوستان میں پہلی مرتبہ کم از کم ایک دانشور ایسا تو سامنے آیا جس نے بچوں کے ایک خاص مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بچے برسہا برس سے تعلیم کے اس بوجھ کو خاموشی سے اُٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اسکولوں کے پرنسپل، عہدہ داران تعلیمات نے اس بوجھ کو کم کرنے کے لیے چند اقدامات کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔

کوئی بارہ برس قبل دہلی میں ایک فوٹو تصاویر کی نمائش ہوئی تھی۔ فوٹو گرافرس کے لیے مقابلے کا عنوان تھا "بچے"۔ یہ نمائش بڑی دلچسپ تھی۔ اس تصویری مقابلے میں جس کو پہلا انعام ملا تھا، وہ ایک دس سالہ لڑکے کی تصویر تھی جو پیچھے سے لی گئی تھی۔ اس کا سر اطراف سے چکنا تھا اور درمیان میں خوب صورت بالوں کی چوٹی (جٹا یا جٹو) جس کے آخر میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی، اسکول بیگ کا تسمہ سر پر لگائے اور بیگ پیٹھ پر اُٹھائے بڑی بیزاری سے اسکول کی جانب قدم اُٹھائے جا رہا تھا۔ یہ تصویر ہمارے دیہات کے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی بہترین عکاسی کرتی تھی۔ آر۔ کے نارائن کی تقریر پڑھتے ہی یہ شاہکار تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے وزنی بیگ بچپن سے لے کر چلنے سے بچوں کے جسم کا فریم بگڑ جاتا ہے اور کوب نکل آتا ہے۔ یہاں پر ہمیں یہ بات عرض کرنی ہے کہ آج کل وزنی اسکول بیگ اعلیٰ اور معیاری تعلیم کی نشانی ہے چنانچہ خانگی پبلک اور مشن اسکولس کے طلبا کے بیگ کافی بھاری بھر کم ہوتے ہیں۔ صبح میں جب بچہ اسکول یونیفارم، بیلٹ، ٹائی، ہاتھ میں ٹفن، کاندھے سے لٹکتی ہوئی پانی کی بوتل اور سر یا کاندھوں سے لٹکائے ہوئے پیٹھ پر کتابوں و کاپیوں کا تھیلا لیے ہوئے نکلتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی

---

* ریٹائرڈ پرنسپل، کالج آف ایجوکیشن، حیدرآباد۔

سپاہی محاذ جنگ پر جا رہا ہے۔ یہ منظر ماں باپ کے لیے بڑا دل خوش کن ہوتا ہے۔ محبت کی اس خوشی میں بچے کی مصیبت کا انھیں احساس نہیں ہوتا۔

بچوں کی مصیبت اور بیزاری کا منظر دیکھنا ہو تو سر شام دیکھیے جب وہ رکشاؤں یا بسوں میں سفر کر کے گھر پہنچتے ہیں۔ ان کے بال بکھرے ہوئے، پوڈر تو کبھی کا صاف ہو چکا ہے، چہرے پر تکان اور چڑچڑے پن کے آثار نمایاں ہوتے ہیں وہ اس بیگ کے "بھاری بوجھ" کو فرش یا میز پر پٹک دیتے ہیں۔ ٹفن، پانی کی بوتل، یونیفارم، جوتے، بانا ہے ہمارے گھر میں بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ ماں کو اس زلزلے کا احساس پہلے ہی سے ہوتا ہے۔ یہ تو روز کا ہی قصہ ہے۔ وہ ہدایت پر ہدایات نشر کرتی جاتی ہیں لیکن کوئی ان کی نہیں سنتا۔ جب تک اس بکھرے ہوئے انبار کو یکجا کر کے رکھا نہیں جاتا دوسرے دن بچے اسکول کے لیے وقت پر روانہ نہیں ہو سکتے۔

وزنی اسکول بیگ کا مسئلہ ہمارے شہروں کے خانگی اور پبلک اسکولوں کے طلبا کا ہے۔ شہر کے غریب محلوں، قصبات اور دیہات کے ہزاروں سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے طلبا کے مسئلہ کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔ لاکھوں بچے ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ یہاں پر بیگ وزنی نہیں بلکہ ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ اکثر تو اس بیگ ہی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب شہر کے کسی سرکاری اسکول میں چلے جائیں اور کسی کلاس کو دیکھ لیں تو معلوم ہوگا کہ آدھی جماعت کے پاس کوئی نصابی کتاب ہی نہیں ہے۔ آدھی کلاس کے پاس کوئی نوٹ بک نہیں اور کچھ ایسے بھی بیٹھے ہوئے ہیں جن کے پاس نہ تو کوئی کتاب، کاپی یا پنسل ہی ہے۔ جب یہ اسکول کے لیے چلے تھے تو خالی ہاتھ تھے اور جب واپس ہوئے تو اُن کے دماغ پر بھی تعلیم کا کوئی بوجھ نہیں۔

اپنے بچپن کی بات ہے کہ مہتمم تعلیمات نے اپنے ہاتھوں سے انعام میں دو تاؤ کاغذ، ایک پتی قلم اور ایک چھوٹی سی شیشہ کی سیاہی کی دوات دی تھی۔ اس انعام کی کل مالیت دو آنے تھی اور اس انعام پر سارے خاندان والے واہ واہ کر رہے تھے اور لڑکا خوشی میں پاگل ہوا جاتا تھا۔

ہمارے اسکولوں کا اصل مسئلہ بچوں کے وزنی بیگ کا نہیں بلکہ اس ہلکے پھلکے بیگ کا ہے کہ کس طرح کتابوں اور کاپیوں سے اس کا وزن بڑھایا جائے۔ سستی تعلیم غیر معیاری ہوتی ہے۔ اعلیٰ معیاری اور خصوصی تعلیم ہمیشہ مہنگی ہوتی ہے ہمیں تو خوشی ہوتی کہ مسٹر آر۔ کے۔ نارائن یا پھر کوئی دانش ور یا ماہر تعلیم اسکول کے وزنی بیگ کے ساتھ "مالگڈی" (MALGUDI) جیسے دیہات کے ان غریب طلبا کے ہلکے پھلکے بیگ کا بھی تذکرہ کرتے جن کی تعداد سارے ملک میں لاکھوں نہیں کروڑوں تک جا پہنچی ہے۔

"جس زندگی میں امید ہے، اس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی نہیں ہے۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ - شمارہ ۸ (اگست ۸۹ء)

چین پر پہلی نظر (۱)

سعید الظفر چغتائی*

چین کی سرزمین پر عن قریب دو ہفتے گزار سکوں گا -

۲۰ مئی کی شام کو بیکنگ پہنچا، جسے اب اس کا پرانا نام بیجنگ دیا جا چکا ہے، تو لوگوں نے شہر میں داخل ہونا روک رکھا تھا اس لیے کہ ہڑتالی طلبا کے خلاف فوج کی مداخلت کا خطرہ تھا - ٹیکسی دو راستے بدل کے ایک زیر تعمیر سڑک سے ہو کر داخل ہوئی اور مجھے "دوستی ہوٹل" میں ٹھہرا دیا گیا، جو شاہراہ بائی شی کیاؤ پر باغوں میں واقع ایک پورا محلہ ہے۔ اس میں ۱۹۰۰ اکہرے، دُہرے اور تہرے کمرے ہیں۔ چار کمروں تک کے اقامتی انتظامات ہیں۔ متعدد ریستوراں، ڈاکخانہ اور ایک چھوٹا سا بند بازار یا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے جو ۱۹۵۴ء کی تعمیر ہے۔ سنا ہے کہ یہاں ٹھہرنے کا یومیہ خرچ ۱۵۰ ڈالر سے کم نہیں ہوتا ہے مگر میں چینی سائنس اکادمی کا سرکاری مہمان ہوں، اس لیے مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ہوئی -

دوسری صبح پروفیسر یاؤ، آدھ گھنٹہ سائیکل چلا کر مجھ سے ملنے آئے، کیونکہ بسیں بند تھیں - کئی گھنٹے میرے ساتھ رہے۔ مجھے شہر دکھلانے نہ لے جا سکے کیونکہ رسل و رسائل معطل تھے -

و النیئر سہ پہر کو خاصے وقت سے مجھے ٹیکسی میں ریلوے اسٹیشن پہنچا کر ساڑھے چھ بجے ٹرین میں بٹھا گئے۔ یہاں کے بالائی درجے میں ہمارے ایر کنڈیشنڈ سکنڈ جیسے چار چار بستروں کے کیبن ہوتے ہیں۔ دروازہ فرسٹ کلاس کی طرح کھینچ کر بند کیا جا سکتا ہے۔ 'بلند گو' پر اعلانات ہوتے رہتے ہیں یا ریڈیو موسیقی وقتاً فوقتاً نشر ہوتی رہتی ہے۔ صبح چھ بجے سے خاص طور پر بہت دلکش چینی گانے آتے رہے۔ ہمارے کیبن میں ہم سفر دو چینی تھے اور ایک فرانسیسی نوجوان لڑکی؛ جو فرانس کی دکانوں اور دفتروں میں کام کرنے والوں کو ہفتہ دس دن کے جز وقتی درس کمپیوٹر استعمال پر دیتی ہے۔ یہ کئی مہینے کے لیے آئی ہے۔ چین بھر میں ماری ماری پھرے گی اور ستمبر میں کہیں واپس ہو گی۔ کیبن میں کھولتے پانی کا تھرماس رکھا تھا۔ جسے ہر بارہ گھنٹہ پر بھر جاتے تھے۔ لوگ اس سے چینی چائے بناتے اور پیتے رہتے تھے - طریقہ یہ ہے کہ بڑی بڑی ہری پتیاں ذرا سی پیالی میں لیں —— جو ہماری پیالی سے تین گنی بڑی ضرور ہوتی ہو گی یا شیشے کی بشیشی میں اور پانی ڈال کر ڈھک کر رکھ دیا۔ دس پندرہ منٹ میں پتیاں نیچے بیٹھ گئیں۔ اب یہ جوشاندہ چوس چوس کے دھیرے دھیرے پی رہے ہیں -

۱۹ گھنٹے میں ہنے ئی پہنچے۔ ٹرین ہماری پرانی جنتا یا اپھانڈیا جیسے گاڑی تھی۔ زیادہ تیز ٹرینیں شاید ابھی یہاں نہیں؛ رکتے ہی منگ ہے اندر آ گئے اور سامان اٹھا کر ٹیکسی سے یونیورسٹی کے مہمان خانے لے آئے۔ یہ چار منزل کی چھوٹی سی عمارت ہے۔ ہر منزل

---

* پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف فزکس، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

پر آٹھ آٹھ دُہرے کمرے، جن میں کمرۂ ملاقات، پیچھے کمرۂ استراحت پردے پڑے، فرش پر معمولی قالین، دو صوفے، آرام دہ کرسیاں تین استولی، یورپی دُہرا بستر، میز، درازیں، رنگین ٹی۔ وی فرج، میز کا لیمپ، سنگ سیاہ اور شیشے کی بڑی بڑی قلموں کا خوب ترشا ہوا۔ غسل خانے میں فوارہ اور بیٹھ کر نہانے کا ٹب۔ اس مہمان خانے کو 'غیر ملکی ماہروں کی عمارت' کہتے ہیں۔ ریستوراں ساتھ ہے۔

اس وقت صبح و شام خنکی ہوتی تھی، اب دن گرم ہوتے جا رہے ہیں۔ رات دس بجے کے بعد ہی کمرہ خوش گوار ہوتا ہے، جس میں دروازے کھڑکیاں خوب ہیں، جالی اور شیشے کے دہرے۔ ایک ایر کنڈیشنر بھی ہے جسے ہم نے ابھی تک چلایا نہیں ہے۔

ہر روز ایک دو تجربہ گاہیں دیکھ رہا ہوں۔ جدید ساز و سامان سے لیس۔ ہندوستان میں صرف بڑے تحقیقی ادارے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کے سامنے ہماری چیزیں مدرسے یا عجائب خانے کی لگتی ہیں۔ بعض مشینیں ہمارے ملک میں ہیں بھی نہیں جیسے دیو قامت ... لیزر اور ... Cyclotron کل پچاس کلومیٹر پر ایک جھیل کے اندر جزیرے میں واقع سنٹریاتی حرفت کے ادارے میں پذیرائی تھی اور تقریر بھی ——— یہاں ترقیاتی منصوبے سائنس دانوں اور انجینئروں کے سپرد کیے جاتے ہیں کہ وہ ان کو دی ہوئی مدت میں پورے کریں۔ اس کے بعد ہی بنی ہوئی چیزیں، مشینیں، آلات ادارے ہی کے صنعتی حصے کو سونپ کے دوسری طرف دے دیے جاتے ہیں کہ انھیں بڑے پیمانے پر بناؤ اور بیچو۔ ساتھ ساتھ سائنس داں خالی وقت میں خاصی اچھی تحقیقات بھی انھیں آلات کو استعمال کر کے ذاتی طور پر کر لیتے ہیں اور طالب علموں کو انفرادی طور پر تربیت دیتے رہتے ہیں۔ پیکنگ میں طلبا کی ہڑتال ختم ہو چکی ہے، مگر کئی اور جگہوں سے اطلاع ملی ہے کہ تعلیم ہنوز معطل ہے۔ حکومت کا کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندرونی سیاست کی رسہ کشی ہے مگر مغربی دنیا کے مہمان اس سے بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحریک کی مقبولیت دیکھو —

اس سنٹریاتی حرفت کے ادارے میں اچھا خاصا سامان ہمارے سائنسی اور حرفتی کام کا بنتا ہے۔ شنگھائی اور پیکنگ میں بھی۔

میرے پروگرام میں ایک دو تجربے کرنے ہیں اور ابھی کئی اور اداروں کا معائنہ کرنا ہے۔ دو تین تقریریں بھی کرنا ہوں گی۔ جہاں کہیں جاتا ہوں، خاصی افہام و تفہیم کا موقع ملتا ہے اور کئی لوگوں کو میں نے مشورے دیے کہ اپنے آلات سے یہ مزید اور نئے کام کر سکتے ہو اور اس طرح ایک کسٹری کے پروفیسر میری تحقیقات کے نتائج کثرت سے اپنے کام میں استعمال کر رہے ہیں۔ مزید اعداد و شمار کی فرمائش کی ہے، جو میں واپسی پر انھیں فراہم کر دوں گا۔

یونیورسٹی کے دو کیمپس ابھی اور ہیں۔ ایک میں نئی طبعیات کے شعبے دیکھنے جاؤں گا، جہاں ہمارے میزبان نائب پروفیسر منگ ہے کی بیوی ایک صدر شعبہ بھی ہیں اور دوسرے میں سنکروٹرون تابکاری Radiation کا مرکز واقع ہے جو میری ذاتی دلچسپی کا بھی مرکز ہے۔ یونیورسٹی کے باہر ریشم کا کارخانہ دیکھنے کے لیے بھی یہ لوگ لے جائیں گے، جہاں سے کچھ نمونے خریدنے کا ارادہ ہے۔

یونیورسٹی کی تجربہ گاہوں میں خواتین کی بڑی تعداد ذمہ داری کے عہدے سنبھالے ہوئے ہے۔ چینی شہروں کا رہن سہن یورپی ہے، جس سے ان کی کارکردگی ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ کوئی شخص، کوئی بیکار چیز پڑی نظر نہیں آتی۔ ہر مشین استعمال میں ہے۔ جو ہے کام سے لگا ہے۔ غربت کا نام نہیں۔ سب لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں اور انسانوں کی طرح رہتے ہیں بعض شکایت یہ سنی کہ تجارت پیشہ کے پاس پیسہ زیادہ ہے جس کی تلافی عن قریب تنخواہیں بڑھا کر کی جانے والی ہے۔

چین میں صبح سات بجے ناشتہ ہوتا ہے، بارہ بجے دوپہر کو اور سات بجے شام کو کھانا۔ کام صبح ساڑھے سات بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک ہوتا ہے اور سہ پہر میں تین سے پانچ بجے تک۔

دوپہر کے کھانے کے بعد لوگ آرام کرتے ہیں مگر کوئی دن بھر کا پروگرام
بھی ہو سکتا ہے۔ جس میں دعوت گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چل جائے اور آرام
کا وقفہ ۵ امنٹ کا ہی رہ جائے۔ چینی چائے ہر وقت چل سکتی ہے
ایک پیالے میں پتیاں ڈال لیں اور گرم پانی بڑھاتے رہے۔

چینی معاشرے کو کئی اعتبار سے ہم پر فوقیت حاصل ہے۔
ہر چینی چینی ہے۔ ذات پات، مذہب، زبان، شمال، جنوب
اونچ نیچ میں بٹا نہیں ہے۔ ہر شخص، عورت، مرد اپنے ہاتھ سے
کام کرتا ہے۔ دوسروں کی کمائی پر پلنے والے ناکارے نہیں ہیں۔ اپنا
مستقبل، اپنی دنیا آپ پیدا کر رہے ہیں کہ زندہ ہیں یہ۔ شہروں میں
عام طور پر گھر پیچھے ایک ہی بچہ ہوتا ہے۔ لڑکا ہو یا لڑکی۔ خال خال دو
ہیں لیکن سنا ہے کہ گاؤں پر آبادی کے کنٹرول میں ابھی اتنا قابو
نہیں پایا ہے اور وہاں بڑے بڑے خاندان ملتے ہیں جن سے آبادی
ابھی تک ٹھہری ہوئی نہیں ہے اور اب ایک ارب بیس کروڑ تک پہنچ گئی
ہے۔

عام ترقی کی سطح ہماری ہی جیسی ہے۔ عام چیزوں کی قیمتیں بھی
ہمارے یہاں جتنی ہی ہیں مگر صفائی خوب ہے۔ ٹرین یا کار سے
سفر کرنے میں، یا پیدل آنے جانے میں، خال خال ہی کہیں دو چار
کاغذ پڑے دیکھے۔

چینی غذا ستھری ہے۔ چاول کا پیالہ۔ طرح طرح کی سبزیاں
طرح طرح کی مچھلیاں اور "پانی کی پھل" گوشت، دعوتوں میں دس
بارہ پندرہ تیاریاں سامنے آجاتی ہیں مگر لطف یہ کہ سب ہضم ہو جاتا
ہے۔ نہ معدے کی گرانی، نہ زکام، نہ دردسر۔ ماحول کی صفائی
بھی کیا نعمت ہے۔ غذا کا ہلکا پن اور تیل گھی سے پناہ! کھانا دو
چمچیوں سے ہوتا ہے اور ایک جوڑے چمچے سے۔ غیر ملکیوں کو چھری
کانٹا دے دیتے ہیں لیکن مجھے ضرورت نہیں پڑتی ہے اور زیادہ
تر سبھی مہمان چمچیاں ہی استعمال کر رہے ہیں، بغیر زیادہ زحمت
کے سارس اور لومڑی کی دعوتوں کی کہانی یاد آتی ہے۔

مہمان خانے غیر ملکی ماہروں سے بھرا رہتا ہے۔ لوگ
آتے جاتے بھی رہتے ہیں۔ دنوں، ہفتوں اور مہینوں کے لیے (کسی
زمانے میں ۱۹۶۹ء سے پہلے ایسا ہی ماحول میں نے پنجابی یونیورسٹی
پٹیالہ میں دیکھا تھا) مگر افسوس کہ اس کہانی کا ورق الٹ گیا!
امریکی، چینی اور جاپانیوں کی تعداد زیادہ رہی ہے، لیکن علاقہ
فرانسیسی، جرمن، سویڈش، ڈچ، انگریز، امریکی سبھی سے ہوئی
بعض لوگ بیویاں ساتھ لائے۔

چینی زبان کے بہت مشکل ہونے کے چرچے کس نے نہیں
سنے ہیں مگر مجھے سن کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبان ہے جو ہم
نہیں جانتے۔ تلفظ مشکل نہیں۔ ایک ایک لفظ کر کے کانوں سے
سیکھی جائے تو آسان ہے۔ مثلاً

نی ہا۔ آپ کا مزاج (سوال و جواب دونوں) ہنتی۔ خط
ہَن شیہان۔ لیٹر بکس۔ شیے شیے۔ شکریہ۔ شیہان۔ بکس۔

صرف رسم خط مشکل ہے، اس لیے کہ حروف تہجی نہیں۔ صرف
مصوری کے خطوط اور خطاطی کے نمونے ہیں۔ معلوم ہوا کہ چین
کا قومی نام (چینی زبان میں) "چنگوا" ہے جس کے معنی مرکزی
سلطنت ــــ دنیا کے وسط میں ہونے کا خبط سبھی کو تھا۔
ہندوستان کی قدیم تواریخ میں "جمبو دویپ" سے یہی تصور
وابستہ تھا ــــــــ چین میں چھپے
عالمی نقشے دیکھیے۔ ان میں بحرالکاہل کے یورپ میں شمالی و جنوبی
امریکہ دکھاتے ہیں اور چین سے یورپ اور افریقہ تک پچھم میں
بحر اٹلانٹک کو گول کر دیتے ہیں۔ جیسے ہم یورپ کے زیر اثر
بحرالکاہل کو فراموش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح چین دنیا کے
بیچ میں دکھائی دیتا ہے۔

اس سے یہ بات بھی یاد آتی ہے کہ آسٹریلیا میں عالمی
نقشہ الٹ کر بنتا ہے، جس میں قطب جنوبی اوپر ہوتا ہے اور
قطب شمالی نیچے۔ اس طرح آسٹریلیا بھی اوپر آجاتا ہے اور کیوں نہ
آئے۔ زمین کسی کی جاگیر نہیں۔ صرف جرمن ہی کیوں کہیں کہ
DEUTCH LAND
جرمنی سب کے اوپر۔
اور ہم بھی تو کہتے ہیں، زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ کہا آسٹریلیا

زبردست اور جیسا بھی چین کو مرکزی ہونے کا حق نہیں

چینی لی ۔ دن شام چھ بجے رات ۱۱ بجے تک چار پانچ چینلوں پر آتا ہے۔ رات آٹھ بجے چینیوں کو انگریزی پڑھانے کا ایک اونچا پروگرام ہفتے میں کئی دن نشر کرتے ہیں۔ جس کے بعض حصے ہم لوگوں کے لیے بھی دلچسپ ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ۱۰ بج کر دس منٹ پر انگریزی خبریں اور ایک بین الاقوامی معلومات کا پروگرام ہوتا ہے، جس کا معیار ہر طرح بلند ہوتا ہے۔ کیا خبروں کا انتخاب کیا تلفظ، کیا مواد۔ ایک دلچسپ اور مخصوص چیز موسم کی پیشن گوئی ہے۔ نہ صرف چین کے اہم شہروں اور صوبوں، بلکہ دنیا بھر کے شناسا بڑے شہروں کے درجۂ حرارت اور موسمی حالات پر یک لفظی اطلاع نقشے کے ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے برصغیر میں صرف کراچی کا نام آتا ہے۔ سبب ظاہر ہے۔

طلباء بڑی تعداد میں انگریزی پڑھ رہے ہیں، لیکن وہ یا استاد وہی سمجھتے اور بولتے ہیں، جن کا غیر ملکیوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ کئی پروفیسر بڑی محبت سے ملے۔ مگر بات چیت تیسرے شخص کے وسیلے سے ہوئی۔ عوام میں سے کوئی نہیں سمجھتا۔ مہمان خانے کے ملازموں میں صرف دو لڑکیاں کچھ سمجھ بول لیتی ہیں۔ بازار ایک دو بار گیا اور کوئی چھوٹی موٹی چیز خرید بھی لایا ذہانت سے کام لے کر اپنی بات سمجھادی اور قیمت کے معاملے میں اعتماد کیا مگر لوگ عزتِ نفس والے ہیں۔ کوئی گھٹیا کام کرنا جانتے ہی نہیں۔ چوری، جیب کتری کے شاید لفظ ہی جدید چینی میں نہ ہوں۔ جیسے سگے بھائی بہن کے۔ ایک بڑے جلتے میں نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا

"اے ایمان والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے
تو اللہ ایک ایسی قوم لائے گا جن سے اللہ محبت کرے
گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے، مومنوں پر نرمی کریں
گے اور کافروں پر سخت ہوں گے اور اللہ کے راستے میں
جہاد کریں گے اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے
نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے، دیتا
ہے اور اللہ وسیع علم والا ہے"!

(مائدہ ع ۸)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۸۔ (اگست ۸۹ء)

باریک نقطہ یا لمبوترے دھاگے

عظیم قدوائی *

میں اٹلی پہنچ چکا ہوں۔ اب میں یہاں بین الاقوامی مرکز برائے نظری طبعیات تریستے (اٹلی) کی شاندار عمارت کی دوسری منزل پر عین اس کمرے کے اوپر جہاں نوبل انعام یافتہ اور مرکز کے صدر پروفیسر عبدالسلام بیٹھتے ہیں، کچھ حیرت زدہ، کچھ سحر زدہ سا بیٹھا ہوا یہ مضمون لکھ رہا ہوں

مرکز کے مختلف حصوں میں بیک وقت تین اونچے درجے کے ورکشاپ اور تربیتی کورس چل رہے ہیں جن کے شرکا، زیادہ تر تیسری دنیا کے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں پاکستان اور انڈیا کے بھی امیدوار شامل ہیں۔ پڑھانے والوں میں دنیا بھر کے چوٹی کے سینئر اور مشہور سائنس داں ہیں اور فیض پانے والوں میں نوجوان نسل کے نمائندے، تو کیسا نقشہ بنتا ہوگا، اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

تریستے پہنچنے کے چند روز بعد ہی مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھا " سپر سٹرنگز پر سپرنگ اسکول اور سپر سٹرنگز پر تین روزہ ورکشاپ۔ یعنی سپر دھاگوں پر مذاکرہ بھی اور تربیتی درس بھی۔

موجودہ صدی کے اوائل میں نظریہ اضافیت اور نظریہ کوانٹم ہے۔ ان کے بعد میدانی نظریوں کا دور شروع ہوا جن میں پروفیسر سلام کا نظریۂ وحدت بھی شامل ہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۴ء میں اور اس کے بعد سے لے کر اب تک " سپر دھاگوں " کا زمانہ چل رہا ہے۔ یہ ماہرین طبعیات کی ایک ایسی کوشش ہے جو کامیاب ہو گئی تو ان بنیادی قوتوں کا علم ہو جائے گا، جن سے مل کر یہ کائنات بنی ہے یا کم از کم ان قوتوں کی تحقیق میں خاصی پیش رفت ہوگی۔

یہ ایک نیا انقلابی نظریہ ہے جو آج کے طبعیات کے بہترین دماغوں نے وضع کیا ہے۔ اگرچہ اس پر تنقید بھی بہترین دماغوں نے کی ہے۔ نقادوں کا کہنا ہے کہ اس نظریے کا کوئی تجرباتی ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

عام آدمی کے لیے ریاضی کے گہرے اور پیچیدہ ماڈل لایعنی ہوتے ہیں لیکن ان کو سادگی سے بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید معاملہ قابلِ فہم ہو جائے۔

جس آخری اور قطعی مادے سے کائنات بنی ہے وہ نقطے کی شکل کے بنیادی جوہری ذرات نہیں ہیں۔ جیسے الیکٹرون بلکہ یہ مادہ انتہائی باریک لمبوترے دھاگے کی شکل کا ہے۔ یہ دھاگے یا دھاگوں کے لچھے نو (یا دس یا گیارہ) سمتوں میں دھڑکتے پھر رہے ہیں۔

چونکہ پرانی معیاری طبعیات بظاہر ثابت کرنے سے قاصر رہی تھی کہ بنیادی قوتیں اور ذرات ویسے کیوں ہیں جیسے کہ

---

* حال مقیم تریستے، اٹلی

یہ ہیں، اس لیے جدید طبیعیات کے نوجوان ماہرین نے سپر دھاگوں کا انقلابی نظریہ پیش کیا، جس کی حمایت اب پچھلی نسل کے ماہرین طبیعیات بھی کرنے لگے ہیں۔ اس نظریے کے پیش کاروں نے اب تک جو تشریحات کی ہیں، ان سے کئی الجھنیں واقعی دور ہو گئی ہیں۔

علوم کی ملکہ، طبیعیات، نے دنیا کو انتہائی جاندار اور شاندار چیزیں دی ہیں۔ مثلاً جوہری توانائی، خلائی فتوحات ریڈیو، ٹی۔وی، ٹرانسسٹر، کمپیوٹر، ٹیلی فون، ٹیلیکس اور ہر وہ چیز جو حرکت کرتی ہے۔ موٹریں، کاریں، ہوائی جہاز، یہ سب طبیعیات کی پیداوار ہیں۔ اس کے باوجود بے چاری طبیعیات موجودہ صدی کے دوران ایک کشاکش اور اضطراب کے عالم میں رہی۔

پہلا اضطراب آئن اسٹائن اور ان کی اضافیت سے اس صدی کے آغاز ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ کئی مسئلے سلجھ گئے۔ کئی نئے سوالات پیدا ہوئے، کئی حل ہوئے، کئی حل نہ ہو سکے۔

دوسرا اضطراب کوانٹم نظریے نے پیدا کیا۔ کئی گرہیں کھل گئیں لیکن اس نظریے کو بنیادی طبعی اساس نہ مل سکی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے قطعیات (قطعی تشکیلی اجزاء) کی کوئی مربوط ہم آہنگ اور قابل یقین شکل سامنے نہ آئی۔

اس کے بعد چھٹے اور ساتویں عشرے میں میدانی نظریے وجود میں آئے جن میں پروفیسر سلام کا نظریۂ وحدت بھی شامل ہے جس کی رو سے چار مختلف و متضاد قوتوں یعنی تجاذب، برقاطیس، زبردست قوت اور زبردست قوت کے درمیان سلسلہ وحدت تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اب موجودہ آٹھویں عشرے میں سپر سٹرنگز (دھاگوں) کا نظریہ ایک بھونچال کی طرح آ گیا ہے۔

میں نے روس کے نوجوان سائنس داں مائک براؤن سے جو عارضی طور پر میسکرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، دریافت کیا "کیا آپ اور دوسرے نوجوان سائنس داں واقعی یہ خیال کرتے ہیں کہ سپر دھاگے طبعی طور پر وجود رکھتے ہیں اور یہ کہ کائنات جس مادے سے بنی ہے وہ نقطے کی شکل کے ذرّے نہیں ہیں بلکہ لرزاں اور لمبوترے دھاگوں کی شکل کا ہے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پھر پوچھا "کیا تجربہ گاہ میں اس کا کوئی ثبوت بھی ملا ہے کہ نہیں؟"

بولا: "نہیں"

اس نے وضاحت کی کہ ابھی تجربوں سے اس نظریے کو ثابت کرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ تاہم اسے ریاضی کی تائید حاصل ہے۔ ریاضی سے جو ماڈل بنتا ہے وہ حوصلہ افزا اور قابل یقین ہے۔

دوسری طرف طبیعیات کی روایت یہ چلی آئی ہے کہ تجرباتی شہادت کے بغیر ایک قدم نہیں چلتی۔ حتیٰ کہ عظیم آئن اسٹائن کی اضافیت بھی اس وقت تک مشکوک رہی، جب تک سورج گرہن کے وقت ستارے سے آتی ہوئی روشنی نے خمیدگی کا ثبوت فراہم نہیں کر دیا۔

سپر دھاگوں کا نظریہ آج کی طبعیات کا سب سے بڑا اور سب سے مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اس نظریے کی رو سے تجاذب کو باقی تین قوتوں سے متحد کرنے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوا تو ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا لیکن یہ بحث بھی جاری ہے کہ یہ نظریہ کبھی درست ثابت نہیں ہو سکتا۔

نظریے کو مشکوک سمجھنے والے بڑے سائنس دانوں میں امریکہ کے پروفیسر شیلڈون گلاشو بھی شامل ہیں جو پروفیسر سلام کے نوبل انعام میں شریک تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس نظریے کے حامیوں نے اب تک کوئی تجربہ تو کیا، کسی تجربے کی معمولی سی پیش گوئی تک نہیں کی۔ یہ نہ کوئی مفروضہ ہے نہ کسی مفروضے کا منطقی نتیجہ۔"

پروفیسر گلاشو کہتے ہیں "اس نظریے کا بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ طبیعیات کی دنیا میں نظریے اور تجربے کا تاریخی روایتی رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ جب تک یہ دھاگے والے حقیقی دنیا کے محسوس خواص کی تشریح نہیں کریں گے اس وقت تک وہ نظریہ بازی تو کرتے رہیں گے لیکن کوئی ٹھوس سائنسی خدمت نہیں کر پائیں گے۔"

یہ نظریہ قابل آزمائش اور لائق تجربہ نہیں ہے۔" اس نظریے کی بڑی کمزوری ہے۔

ترجمہ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۸ (اگست ۱۹۸۹ء)

زلیخا بیگم مولانا آزاد

محمد اسلم صدیقی *

زلیخا بیگم کے والدین بغداد کے ایک معزز اور علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زلیخا بیگم کے والد حضرت مولانا خیرالدینؒ مولانا آزاد کے والد گرامی سے رشتۂ عقیدت وارادت رکھتے تھے۔ اسی تعلق ارادت نے زلیخا بیگم اور مولانا آزاد کو کم عمری ہی میں رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا تھا۔ مولانا آزاد کی والدہ مکۂ معظمہ کے ایک باوقار اور دینی خاندان کی لڑکی تھیں۔ ان دونوں گھرانے کی علمی اور اسلامی روایات کی زلیخا بیگم حامل اور وارث تھیں۔ اسلامی تعلیم وتہذیب نے ان کو نہایت شائستہ ومہذب اور سنجیدہ ومتین بنا دیا تھا۔ وفاشعار اور مونس وغم گسار خاتون کی حیثیت سے زلیخا بیگم کو مولانا آزاد کی زندگی کی سوچی سمجھی منزل کا بہترین شریک سفر اور رفیق حیات کا روپ دے دیا تھا۔ وہ اسلامی اور مشرقی تہذیب کا بہترین مجموعہ تھیں۔ وہ بڑی باحیا اور باوقار بیوی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کی سیاسی اور علمی کارناموں کے متعلق جس قدر زیادہ لوگوں کو معلومات ہیں۔ اس نسبت سے زلیخا بیگم کے متعلق لوگوں کو بہت کم علم ہے۔ وہ نہ تو کبھی اسٹیج پر آئیں اور نہ کبھی پردے سے باہر ہوئیں اور نہ ہی اخبارات کے صفحات کی زینت بنیں۔ "ان کی پاکیزگی خیال کا یہ حال تھا کہ کبھی ٹیلی فون کا ریسیور اس لیے نہیں اٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری جانب کون اور کیسا شخص بات کر رہا ہے۔" اس زمانے میں ایسی محتاط اور پاکیزہ خیال اور عفت مآب خواتین کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا زیادہ تر وقت گھریلو مشغولیات میں گزرتا تھا اور اپنے محبوب شوہر کی جدّوجہد اور علمی کاموں میں سکون وراحت وطمانیت اور خدمت کا حق ادا کرنا ان کا اولین فریضہ تھا۔

مولانا آزاد کی زندگی کا ہر ساتواں دن جیل میں اور باقی دن بیشتر سیاسی تگ ودو میں گزرا مگر زلیخا بیگم ہر حال میں ان کی خاطر ودل جوئی کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھتی تھیں۔ جب مولانا رخصت ہوتے تو وہ ان کو ایک باوقار اور وفاشعار بیوی کی حیثیت سے مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہتی تھیں۔ ہمیشہ ان کا یہی معمول رہا۔ کبھی بھی اپنے دلی جذبات اور جدائی کے دکھ اور غم کا شائبہ اپنے چہرے یا کسی عمل سے ظاہر نہ ہونے دیتی تھیں اور جب بھی مولانا جیل سے یا طویل عرصے کے بعد واپس تشریف لاتے تو انتہائی مسرت اور خوش دلی کے ساتھ بڑھ کر ان کا استقبال کرتیں اور ان کی عدم موجودگی کے ایام میں جو ان کو کلفتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑتیں ان کا ذکر تک زبان پہ نہ لاتی تھیں۔ حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مولانا کی معاشی پوزیشن اطمینان بخش نہ رہی اور یہ مولانا آزاد کے پسندیدہ اور خود اختیار کردہ طرز زندگی کا نتیجہ تھا۔ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی لیکن زلیخا بیگم ہر حال میں خوش اور مطمئن تھیں۔ گھریلو کام کاج کا بار بھی پوری طرح ان کے نازک اور ناتواں

---

* غازی پور لاج، سرسید نگر، علی گڑھ

کاندھوں پر تھا حالانکہ وہ ایک آسودہ اور خوش حال خاندان کی فرد تھیں اور بڑے ناز و نعم کی پروردہ تھیں۔ ان ناساعد حالات سے انھوں نے اپنے کو پوری طرح ہم آہنگ کر لیا تھا۔ ان کی صحت اس سے متاثر ہو گئی اور روز بروز صحت گرنے لگی، لیکن اس وفاشعار اور بلند حوصلہ خاتون نے مولانا کو اس کی خبر نہ ہونے دی کہ اس سے ان کے معمولات اور مشغولیات متاثر ہوں گی۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ زلیخا بیگم نے اپنے طرز عمل اور وفاشعاری اور مولانا کے مسلک اور مشاغل سے ہم آہنگی کے ذریعے ان کی شخصیت کی تعمیر اور ان کے مشن میں یک سوئی کے ساتھ ان کو منہمک رہنے میں موثر مدد کی اور ایک اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں مولانا پوری طرح اپنے علمی مشاغل کے علاوہ جنگ آزادی میں سرفروشانہ اپنا حق اور فرض ادا کرتے رہے۔ مولانا آزاد نے خود اعتراف کیا ہے کہ

"وہ (زلیخا بیگم) دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق کار و مددگار۔ اس نے نہ صرف پوری زندگی میرے حالات کا ساتھ دیا، بلکہ پوری ہمت و استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔" [1]

اس اعتراف اور تعلق کے باوجود کہ مولانا آزاد کی زندگی، نصف صدی تک اس ملک میں صحافت، ادب و سیاست اور مذہب کا عنوان رہی لیکن زلیخا بیگم کی کوئی پرچھائیں، کبھی بکھرے الفاظ و اوراق میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ یہ زلیخا بیگم کے کردار و ایثار کی ایک درخشاں اور اعلیٰ مثال ہے۔

زلیخا بیگم کافی پڑھی لکھی اور کثرت مطالعہ کی دلدادہ تھیں حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر رہتی تھیں۔ وہ بڑی سادہ مزاج و سادہ لباس و سادہ خوراک اور بے حد خوش اخلاق و خوش اطوار اور منکسر المزاج، نہایت ہی حسین و جمیل اور نازک اندام خاتون تھیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ وہ بے حد نڈر دلیر و جری اور عالی ہمت و بلند حوصلہ رکھتی تھیں۔ وہ عزم و استقامت و استقلال و پامردی میں بھی نمایاں مقام رکھتی تھیں۔ اس کا ثبوت اُس خط سے ملتا ہے جو انھوں نے ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی کے نام اس تاریخی مقدمے کے فیصلے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا جو بغاوت بغاوت کے الزام میں مولانا آزاد کے خلاف' انگریزی حکومت نے کلکتہ میں ان پر چلایا تھا۔ اس مقدمۂ بغاوت میں مولانا آزاد کو ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ مولانا آزاد نے اس مقدمے میں جو تاریخی بیان دیا تھا اس کے متعلق چند جملے یہاں لکھنا شاید بے موقع نہ ہوگا۔ ان کا بیان' قانون' انصاف' آزادی اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ بیان "قول فیصل" کے نام سے شائع اور مشہور ہے۔ یہ بیان پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ گاندھی جی نے بھی اپنے اخبار ینگ انڈیا میں اس بیان کا ذکر نہایت احترام اور تعریف و توصیف کے ساتھ شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملۂ غیر متعلقہ تھا جو گفتگو کی مناسبت سے درمیان میں آگیا۔ زلیخا بیگم نے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ

"میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے کا آج فیصلہ سنا دیا گیا۔ انھیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی ہے۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اُس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی ہے یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔"

خط کا یہ تیور لائق صد تحسین و رشک ہے۔

شوہر کی سزا پر بجائے رنجیدہ اور ہراساں ہونے کے اُس کی کمی کا شکوہ کتنا دلنواز ہے۔ اس کو وہ مولانا کے رتبہ و وقار اور جرم بغاوت کی سنگینی کے پیش نظر کم تر اور مولانا کے ساتھ ناانصافی قرار دیتی ہیں۔ یہ بڑے حوصلے و استقامت اور

جراتِ عزم و استقلال کی بات ہے جو کمتر لوگوں میں ایسے مواقع پر پائی جاتی ہے۔ سچ پوچھیے تو "یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا" والی بات ہے جو ہر بوالہوس کے مقدر میں نہیں۔

آگے مزید تحریر فرماتی ہیں :

"میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانہ میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں۔ اس لیے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح محنت اور مشغولیت کے کام میں حصہ لوں لیکن میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان کی سزا یابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔"

وہ فرض کیا تھا جس کی ادائیگی کے لیے وہ اپنی ناچیز ہستی وقف کرنے کی دلی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں؟ اس کا جواب بھی انہی کی زبان سے سنیے۔

"میں آج سے بنگال صوبائی خلافت کمیٹی کے کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔" ؎۳

اس فرض کو انھوں نے کس طرح انجام دیا اس کا حوالہ خلافت تحریک کی تاریخ میں محفوظ ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے، ان کی صحت عرصۂ دراز سے مسلسل خراب رہنے لگی تھی اور پھر جب مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں اسیری کے دن گزار رہے تھے تو ان کی صحت بہت بگڑ گئی۔ کلکتہ کے بڑے مشہور اور تجربہ کار معالجوں نے پوری کوشش کی لیکن وقتِ موعود آ چکا تھا۔ کسی علاج اور تدبیر نے کام نہ دیا اور بالآخر بقول مولانا آزاد ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو زہر غم کا

پیالہ لبریز ہو گیا اور زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت نایافت کا غم لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں ؎

"خدا رحمت کند بر عاشقان پاک طینت را"

اس المناک روداد کا ذکر مولانا آزاد اپنے صدیق مکرم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی رئیس علی گڑھ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں۔

"گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر در پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں، میں نے اس درجہ افسردہ اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس پر غالب آ گئی تھی۔ میں نے تو اس وقت ایسا ہی خیال کیا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ وہ خود سفر کرنے والی ہے۔" ؎۴

اس سانحہ سے خود مولانا آزاد کے دل و دماغ پر کیا گزری اور کس طرح حالات سے مقابلہ کر کے انھوں نے اپنے جذبات اور دل و دماغ پر قابو پایا، غبار خاطر میں اس کا عکس قابل مطالعہ ہے۔

حواشی

۱۔ روزنامہ نئی دنیا دہلی۔ امام الہند نمبر، ۲۵ نومبر، ۱۹۵ ء، ثریا وحید صدیقی۔

۲۔ غبار خاطر

۳۔ روزنامہ نئی دنیا دہلی، امام الہند نمبر ۲۵ نومبر ۱۹۵۷ء

۴۔ غبار خاطر۔

نظریہ مزاج اور اخلاط[1]

الطاف احمد اعظمی *

مزاج، طب یونانی کا ایک بے حد اہم نظریہ ہے۔ اس کی تشریح و تعبیر میں متقدمین اور متاخرین اطباء نے معرکہ آرا بحثیں کی ہیں لیکن تمام لفظی اور معنوی موشگافیوں کے باوجود اس کا قطعی مفہوم متعین نہیں کیا جا سکا اور آج بھی یہ ایک لاینحل عقدہ بنا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی غیر واضح ہے کہ مزاج کی تخلیق میں اخلاط کا کچھ حصہ ہے یا نہیں؟ کبھی کہا جاتا ہے کہ عناصر (ارکان) کے فعل و انفعال سے مزاج کی تخلیق ہوتی ہے۔ یعنی مزاج مرکبات اور کبھی یہ کہ مزاج اخلاط کی آمیزش سے بنتا ہے۔ یعنی مزاج انسان میرے خیال میں ان متضاد بیانات کی واحد وجہ عناصر میں کیفیات اربعہ کا تصور ہے۔ اس کے علاوہ عناصر کے اجزائے ترکیبی، ان کی پوشیدہ قوتوں اور ان کے طرزِ عمل کے بارے میں اطباء متقدمین کی لاعلمی کا بھی اس میں دخل ہے۔ اس پس منظر میں پہلے ہم اطبائے متقدمین کے خیالات کا ایک جائزہ لیں گے اور پھر اس باب میں اپنے ناچیز خیالات پیش کریں گے۔

لغوی معنوی

مزاج کے لغوی معنی اختلاط اور آمیزش کے ہیں۔ علامہ ابن نفیس نے لکھا ہے کہ یہ مصدر ہے، لیکن اس کا اطلاق مجازی طور پر ممزوج پر کیا گیا ہے[1]۔ انگریزی میں اس کے مترادف کے طور پر Temperament کا لفظ مستعمل ہے۔ انگریزی کا یہ لفظ لاطینی لفظ tempero سے مشتق ہے۔ جس کے معنی باہم اختلاط (to mix together) کے ہیں۔ یونانی اطباء رطوبات (اخلاط) کی آمیزش کے لیے "Krasis" کا لفظ استعمال کرتے تھے جو "Kerannymi" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ملنے کے ہیں۔ اسی لفظ Krasis کا ترجمہ Tempera-ment کیا گیا ہے[2]۔

انگریزی لغت "چیمبرس ڈکشنری" (20th Century) میں بھی اس کے متعدد معانی میں سے ایک معنی اخلاط کے امتزاج یا غلبہ (combination or predominance of humours) کے بھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ Tempera-ment اور خلطی تصور لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے خلطی یا کیفی مزاج ہی مراد ہوتا ہے۔

دوسرا لفظ جو مزاج کے مرادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے constitution ہے جس کے ایک معنی جسم و دماغ کی طبعی حالت (Natural condition of body & mind) کے ہیں لیکن جب یہ لفظ علم کیمیا میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے جوہروں کی تعداد اور ان کا طریق اتحاد مراد ہوتا ہے۔ یہ آخری معنی مزاج کے اسطقسی یا عنصری مفہوم سے جس کا راقم السطور قائل

---

[1] یہ مقالہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے چودھویں اجلاس (کلکتہ ۲۷-۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ء) کے موقع پر پیش کیا گیا۔ اصل مقالہ انگریزی میں ہے (الطاف)

* سینیر ریسرچ آفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ سائنس، جامعہ ہمدرد، ہمدرد نگر، دہلی

ہے اور جیسا کہ آگے چل کر واضح کیا جائے گا، زیادہ مطابقت رکھتا ہے
لیکن چونکہ اب Temperament کا لفظ ہی عام طور پر مزاج
کے مرادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس لیے اس بحث میں اسے
برقرار رکھا گیا ہے۔

تعریف مزاج:

ابن سینا (متوفی ۱۰۳۷ء) نے مزاج کی تعریف میں
لکھا ہے:[3]

" مزاج وہ کیفیت ہے جو عناصر کی متضاد کیفیتوں
کے تفاعل (باہم فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر) سے پیدا
ہوتی ہے جو چھوٹے چھوٹے اجزا میں اس لیے منقسم
ہوتے ہیں کہ ہر ایک کے بیشتر اجزا
ایک دوسرے کے ساتھ مل سکیں (ایک دوسرے
کو مس کریں) چنانچہ جب یہ اجزائے صغیرہ اپنی قوتوں
(کیفیتوں) سے باہم فعل و انفعال کرتے ہیں تو ان
جملہ کیفیات سے ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے
جو عناصر کے تمام اجزا میں یکساں (متشابہ) ہوتی ہے
اسی کا نام مزاج ہے۔"

علی ابن عباس مجوسی (متوفی ۹۹۴ء) نے مزاج کی تعریف
اس طرح کی ہے:[4]

" اس عالم کون و فساد میں جتنے اجسام لطیفہ و غیر لطیفہ
پائے جاتے ہیں وہ چار اسطقسات (عناصر) کے حسب
ضرورت (بقدر) مختلف یا مساوی مقداروں میں امتزاج
سے بنے ہیں اور جب صورت واقعہ یہ ہے کہ بعض اجسام
کی ترکیب مساوی اجزا سے اور بعض کی غیر مساوی
اجزا سے ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں جسم (مرکب)
پر اسطقسات کی کیفیات میں سے ایک یا دو کیفیتیں
غالب ہوتی ہیں۔ انھیں کیفیات (غالبہ) کا نام
مزاج ہے اور یہ لفظ امتزاج سے نکلا ہے یعنی
اسطقسات کا ایک دوسرے سے ملنا:"

ایک دوسری جگہ امتزاج پر بحث کرتے ہوئے اس نے
لکھا ہے:[5]

" امتزاج کی دو صورتیں ہیں، امتزاج سادہ اور
امتزاج حقیقی۔ امتزاج سادہ وہ ہے جس میں ملنے
والی اشیا کی طبیعت (مزاج) اپنی جگہ قایم رہتی ہے
مثلاً پانی کو کسی شربت میں ملا دیا جائے تو اگرچہ وہ
مل جاتے ہیں اور آپس میں متحد ہو جاتے ہیں مگر ان
دونوں کا مزاج اپنی جگہ قایم رہتا ہے اور کوئی تیسری
چیز ان سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف امتزاج حقیقی وہ ہے کہ
جس میں ملنے والے اجزا ایک دوسرے سے اس طرح
متحد ہو جاتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مزاج
کو چھوڑ دیتا ہے اور ان کے ملنے سے جو مرکب بنتا
ہے اس میں ایک تیسرا مزاج پیدا ہو جاتا ہے یا
اس میں کیفیت واحدہ پیدا ہو جاتی ہے جو مرکب
پر غالب ہوتی ہے اسی کو طبعی مزاج کہا جاتا ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ ابن سینا اور ابن عباس
مجوسی تعریف مزاج میں مختلف الرائے ہیں۔ ابن سینا کے نزدیک
کیفیت متشابہ کا نام مزاج ہے۔ یعنی مرکب میں کیفیات اربعہ
موجود تو ہوتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کو غلبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ
ان میں ایک اعتدالی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی مزاج ہے
جب کہ مجوسی کے نزدیک مزاج نام ہے کیفیت یا کیفیات غالبہ کا۔
اس تعریف کے مطابق کیفیات متضادہ کے فعل و انفعال کے نتیجے میں
مرکب میں صرف ایک یا دو کیفیات غالبہ کا وجود ہوتا ہے۔ باقی
کیفیات معدوم ہو جاتی ہیں۔

مزاج اور کیفیات

ابن سینا اور مجوسی اگرچہ تعریف مزاج میں اختلاف
رکھتے ہیں لیکن اس امر میں دونوں متفق ہیں کہ مزاج کی تخلیق کیفیات
سے ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباسات سے بالکل واضح

ہے۔ مزاج کا یہ کیفیاتی تصور آج بھی طبی حلقوں میں مروج و مقبول ہے۔ ڈاکٹر اے جلیل نے جو اگرچہ طبیب نہیں لیکن طب یونانی کے حامی ہیں اپنے ایک معالجاتی جائزے میں مزاج کے کیفی تصور کی مشاہداتی شہادت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> It is evident from the figures mentioned above, most of the patients were young males, their temperament being hot.
>
> But it is also significant that in the older age group there was a higher percentage of patients with a cold or cold and moist temperament.
>
> In the youngest age group, the number of patients with cold and cold and moist temperament was negligible. Here, I would like to quote from Avicenna's Canon on temperament in different age groups.

راقم سطور کے نزدیک مزاج کا یہ کیفی تصور صحیح نہیں ہے ماضی میں اطبا اور حکما کو کیفیات اربعہ کے سہارے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ان کے بغیر عناصر کے فعل و انفعال اور ان سے مرکبات کی تشکیل کی وضاحت ممکن نہ تھی لیکن آج جدید علم کیمیا سے معلوم ہو چکا ہے کہ عناصر کس طرح باہم فعل و انفعال کرتے ہیں اور کس طرح ان سے مرکبات بنتے ہیں۔ اس لیے اب عناصر کے ساتھ کیفیات کو جوڑنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا

مزاج کا صحیح مفہوم

موجودہ علم کیمیا کے مطابق عناصر کے چھوٹے چھوٹے اجزا (جوہر) آپس میں جن اسباب سے ملتے ہیں وہ ان کی اندرونی ترکیب ہے۔ ہر جوہر کی ترکیب مختلف ذرّات سے مل کر ہوتی ہے اُن میں ایک مرکزہ (NUCLEUS) ہوتا ہے جس میں مثبت برق پارے (پروٹان) ہوتے ہیں اور اس کے گرد منفی برق پارے (الکٹران) دائروں کی شکل میں گردش کرتے ہیں ان میں سے جو منفی برق پارے، بیرونی دائرے میں گردش کرتے ہیں وہی مرکبات کے بنانے میں حصّہ لیتے ہیں اور جو منفی برق پارے اندرونی دائروں یا غلافوں میں ہوتے ہیں وہ جوہر کے خواص کو قایم رکھتے ہیں (اسی کو طب یونانی میں صورت نوعیہ کہتے ہیں) ہر جوہر میں منفی برق پاروں کی تعداد الگ الگ ہوتی ہے۔ جن جوہروں میں ان کی تعداد آٹھ سے کم ہوتی ہے وہ کمی تعداد کی وجہ سے مضطرب رہتے ہیں اور ان کا یہی اضطراب انھیں دوسرے عناصر کے جوہروں سے ملنے کا باعث ہوتا ہے۔ جب اس قسم کے جوہر دوسرے عناصر کے جوہروں سے منفی برق پارے لے کر کمی تعداد کو پورا کر لیتے ہیں یعنی آٹھ ہو جاتے ہیں تو اُن کا اضطراب ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح مرکبات وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً نمک (سوڈیم کلورائڈ) کو لے لیں۔ یہ دو عناصر یعنی سوڈیم اور کلورین کے جوہروں سے مرکب ہوتا ہے۔ کلورین کے خارجی منفی برق پاروں کی تعداد سات ہے۔ جب یہ سوڈیم کے ساتھ مرکب ہوتا ہے تو اس کے منفی برق پارے کو لے لیتا ہے اور اس طرح ان کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے اور باہیں طور ایک نیا مرکب سوڈیم کلورائڈ (نمک) وجود میں آتا ہے لیکن خواص کے اعتبار سے وہ سوڈیم اور کلورین کے خواص سے قطعاً مختلف ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس میں نہ سوڈیم کے خواص باقی رہتے ہیں اور نہ کلورین کے بلکہ نئے خواص کا حامل

کے اسطقس یعنی عنصر کا مزاج کو معلوم کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ جانا جا سکتا ہے کہ بدن میں کس اسطقس کو غلبہ حاصل ہے۔

مزاج اور اخلاط

گزشتہ صفحات میں ہم نے مزاج کے طبی مفہوم اور مزاج اور کیفیات میں تعلق کی نوعیت کی وضاحت کی ہے۔ اب ہم یہ بتائیں گے کہ انسانی مزاج کی تخلیق میں اخلاط کا کچھ حصہ ہے یا نہیں ؟ ہمارے اکثر اطبا نے تخلیق مزاج میں اخلاط کو اہم مقام دیا ہے اس سلسلے میں جالینوس لکھتا ہے:

> ... also ... ... according ... ... humours ... to the formation of normal character ... But one ... to start by demonstrating ... that the mental character ... depend on the bodily constitution. About this we have written elsewhere. Assuming it, therefore, ... proved, it follows that acuteness and inteligence

جالینوس نے اخلاط سے مزاج کی تشکیل کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں مزاج کا نفسیاتی مفہوم — Psychological sense غالب ہے اور اس کا طب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اکثر اطبا نے بحث مزاج میں اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

(الطاف)

> blood ... simplicity ... ... But ... does not ... to the formation of ... it evidently ... metabolic process.

ابن سینا نے القانون اور الادویہ القلبیہ دونوں میں صاف طور پر لکھا ہے کہ انسانی مزاج کی تخلیق مقادیر اخلاط کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر گرونر شارح کلیات قانون نے لکھا ہے:

> "One has, therefore, to use the word temperament in a psychological sense, in medical sense it should imply a blend of humours as in the Canon of Avicenna"

مقادیر اخلاط کے امتزاج سے جس خلط کو غلبہ حاصل ہوتا ہے وہی بدن کا مزاج ہوتا ہے۔ مثلاً اگر صفرا غالب ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا مزاج صفراوی ہے یعنی گرم و خشک اور اگر بلغم کو غلبہ حاصل ہے تو بلغمی مزاج کہلاتا ہے یعنی سرد و تر۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی مزاج کی تشکیل بھی مرکبات کی طرح کیفیات متضادہ ہی سے ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں عناصر کی جگہ اخلاط نے لے لی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مزاج کی تخلیق میں خواہ مزاج مرکبات کا ہو یا ابدان انسان کا۔ بالذات کیفیات کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس لیے ماننا ہوگا کہ مزاج کا غلط تصور صحیح نہیں ہے۔

ابھی جس طرح کیفیات اربعہ (کیفیات محسوسہ) سے

ایک تیسری چیز بن جاتی ہے جو اس کے مخصوص مزاج کے عین مطابق ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مزاج دراصل نام ہے عناصر یا اسطقسات کی ایک مخصوص ہیئت ترکیبی کا یعنی کسی مرکب کے مزاج کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس میں عناصر کس مقدار و تناسب اور جوہری ترتیب سے ممزوج ہوتے ہیں۔ اس امتزاج سے مرکب میں جو نئے خواص پیدا ہوتے ہیں وہ عناصر ممزوجہ کے خواص سے مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مرکب کے یہ خواص اس وقت تک اپنی اصلی حالت پر باقی رہتے ہیں جب تک اس میں عناصر کی مطلوبہ ہیئت ترکیبی قایم رہتا ہے لیکن جس وقت اس میں بگاڑ کا عمل شروع ہوتا ہے تو مرکب کے خواص و افعال میں بھی بگاڑ کی نسبت سے فرق آنا شروع ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہیئت ترکیبی مکمل طور پر بگڑ جائے تو اس کا وجود ختم ہوجائے گا۔

مزاج اور کیفیات میں تعلق کی صحیح نوعیت

میں یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ میں عناصر میں کیفیات کے وجود کا منکر ہوں۔ لیکن مرکبات میں اس کے حسی وجود (عوارضی) کو تسلیم کرتا ہوں۔ چنانچہ جب ہم کسی مرکب کو چھوتے ہیں تو لامحالہ وہ یا تو گرم محسوس ہوگا یا سرد، خشک یعنی سخت محسوس ہوگا یا تر یعنی نرم۔ مرکب کی یہ چاروں ظاہری حالتیں یا کیفیات ظاہرہ دراصل مرکب کی اندرونی یا باطنی حالت یا عصری انداز تعبیر میں عناصر کی ہیئت ترکیبی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اگر مرکب چھونے میں گرم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جزو ناری (اسطقس ناری) زیادہ ہے اور اگر سرد ہے تو یہ بارد جزو (اسطقس ارضی) کی زیادتی کی دلیل ہے۔ یہی معاملہ تر اور خشک کا بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کیفیات مرکب کے مخصوص مزاج یعنی عناصر کی ہیئت ترکیبی کی مظہر ہیں۔

اطباء متقدمین نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ بدن انسانی میں کس کیفیت کو غلبہ حاصل ہے، چند علامات متعین کی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔[۹۵]

افراط حرارت

حرارت کا غیر معمولی احساس ہوتا ہے۔ بخار جلد جلد آتے ہیں، جلد تکان آجاتی ہے، پیاس کی زیادتی ہوتی ہے۔ فم معدہ میں سوزش کا احساس ہوتا ہے، منہ کا مزا کڑوا ہوتا ہے۔ نبض ضعیف سریع اور متواتر ہوتی ہے۔ گرم غذاؤں سے تکلیف ہوتی ہے اور سرد چیزوں سے راحت ملتی ہے۔ موسم گرما باعثِ اذیت ہوتا ہے۔

افراط برودت

ضعف ہضم کی شکایت ہوتی ہے، پیاس کم لگتی ہے، مفاصل میں ڈھیلا پن ہوتا ہے۔ بلغمی بخار اور نزلہ و زکام کی کثرت ہوتی ہے۔ سرد چیزوں سے تکلیف اور گرم چیزوں سے راحت ملتی ہے۔ موسم سرما تکلیف دہ ہوتا ہے۔

افراط رطوبت

اس کی علامات افراط برودت کے مشابہ ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری علامات بھی ہیں۔ مثلاً بدن میں تہیج ہوتا ہے۔ لعابِ دہن کی کثرت اور ناک سے رطوبت کا اخراج زیادہ ہوتا ہے۔ ترا شیا طبیعت کو مرغوب ہوتی ہیں۔ نیند زیادہ آتی ہے۔ اسہال اور بدہضمی کی اکثر شکایت رہتی ہے۔ پپوٹوں پر تہیج ہوتا ہے

افراط یبوست

جلد خشک ہوتی ہے، نیند بہت کم آتی ہے۔ تحلل زیادہ ہوتا ہے۔ خشک چیزوں کے بجائے تر چیزوں کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہوتی ہے۔ موسم خزاں تکلیف دہ ہوتا ہے۔ گرم پانی اور ہلکے روغن جلد سے آسانی کے ساتھ جذب ہوجاتے ہیں۔

اگر مذکورہ عنوانات یعنی افراط حرارت، افراط یبوست افراط برودت اور افراط رطوبت کی جگہ افراط اسطقس ارضی اور افراط اسطقس مائی کی اصطلاحات استعمال کی جائیں تو مفہوم میں ذرا بھی فرق واقع نہ ہوگا اور ہم نہایت آسانی کے ساتھ بدن

بدن انسان کے اسطقسی یا عنصری مزاج کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح غلبہ اخلاط سے بھی انسان کے عنصری مزاج کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اطبا نے غلبۂ اخلاط کی بنیاد پر انسانوں کو چار درجات یا چار طرح کی مزاجی شخصیات میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی دموی المزاج، صفراوی المزاج، بلغمی المزاج اور سوداوی المزاج اور ان کی شناخت و امتیاز کے لیے درج ذیل علامات مقرر کی ہیں: [شلے]

دموی المزاج

موٹے، قوی اور فعّال ہوتے ہیں۔ چہرے کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ شہوت قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ بدن میں معمولی بھاری پن کا احساس ہوتا ہے۔ اشتہا اچھی ہوتی ہے۔ پیشاب کا رنگ ناری ہوتا ہے۔ نبض قوی اور عظیم ہوتی ہے۔

صفراوی المزاج

دبلے پتلے اور زرد رُو ہوتے ہیں۔ انھیں غصہ زیادہ آتا ہے۔ بدن پر بالوں کی کثرت ہوتی ہے۔ جری، باہمت اور دانا ہوتے ہیں۔ شہوت کی زیادتی ہوتی ہے پیشاب پیلا اور آتشی ہوتا ہے۔ عروق دمویہ نمایاں ہوتی ہیں۔ نبض قوی اور سریع ہوتی ہے۔

بلغمی المزاج

بدن ڈھیلا اور چربی دار ہوتا ہے۔ بدن کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ بال باریک اور نرم ہوتے ہیں۔ نیند کی زیادتی اور شہوت کی کمی ہوتی ہے۔ بطی الحرکات ہوتے ہیں۔ عروق دمویہ نمایاں نہیں ہوتیں پیشاب کا رنگ سفید یعنی بے رنگ ہوتا ہے۔ پیاس کم لگتی ہے۔ لعاب دہن زیادہ بنتا ہے۔

سوداوی المزاج

دبلے پتلے اور گہرے رنگ کے ہوتے ہیں قلیل الشہوت ہوتے ہیں۔ جلد خشک ہوتی ہے۔ نیند کم آتی ہے۔ پیشاب کا رنگ سیاہ یا سرخی مائل سیاہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا علامات کی روشنی میں مثلاً جب کہا جائے گا کہ فلاں شخص کا مزاج صفراوی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے اندر صفرا کی زیادتی ہے اور صفرا کی زیادتی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں جزو ناری یا اسطقس ناری کو غلبہ حاصل ہے جس کا اظہار صفرا کی زیادتی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اخلاط کا غلبہ بدن کے عنصری مزاج کے اظہار کا محض ایک ذریعہ ہے۔

اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ بعض اطبا نے لکھا ہے کہ تولید اخلاط انسانی مزاج کے تابع ہے۔ یعنی جس قسم کا مزاج ہوگا، اسی کے مطابق اخلاط کی پیدائش ہوگی۔ مثلاً جس شخص کا مزاج بارد رطب ہوگا اس میں بلغم کی پیدائش اور جس کا مزاج حار یابس ہوگا اس میں صفرا کی پیدائش زیادہ ہوگی اور یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اخلاط کی تولید غذاؤں سے ہوتی ہے اور غذائیں براہ راست یا بالواسطہ نباتات پر مشتمل ہوتی ہیں اور نباتات عناصر سے مرکب ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت اس بات کے حق میں ایک قوی دلیل ہے کہ مزاج کی تشکیل میں اخلاط کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

انہی سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ مزاج (طبی مفہوم میں) اسطقسات چہارگانہ کی نسبت ترکیب یا ہیئت ترکیبی کو کہتے ہیں اور جب

> "اگر تم خُدا کی رحمت کے امیدوار ہو تو اُس کی مخلوق پر رحم کرو۔"
>
> ---
>
> "اپنے جملہ کاموں میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ خُدا ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے، جو اُس سے ڈرتے اور اچھے کام کرتے ہیں۔"
>
> ---
>
> "لوگو! یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اپنے شکر گزار بندوں کو بہشت بہلد نیک بدلہ دے گا۔"
>
> حضرت ابوبکر صدیقؓ

اس ہیئت میں خواہ یہ بدن کے سیال حصے (اخلاط) خارجی یا داخلی سبب سے کوئی فساد لاحق ہوتا ہے، تو بدن کی کی ہو یا سخت حصے (اعضاء وغیرہ) کی یا ہوائی حصے کی کسی . تندرستی لازمًا متاثر ہوتی ہے۔

حواشی

لے ابن نفیس، کلیات نفیسی۔ حاشیہ مولانا عبدالحلیم۔ مطبوعہ مطبع یوسفی لکھنؤ، ۱۳۱۳ھ۔ ص ۱۷

ٹے روڈولف، ای سیگل، گیلنس سسٹم آف فزیالوجی اینڈ میڈیسن۔ نیویارک، ۱۹۶۸ء ص ۲۰۹

ٹے ابن سینا۔ القانون فی الطب۔ مطبوعہ نئی دہلی (ہمدرد نگر) ۱۴۰۲ھ ج ۱۔ ص ۳۸

کے علی ابن عباس مجوسی۔ کامل الصناعۃ۔ مطبوعہ قاہرہ۔ ج ۱۔ ص ۱۸۔ ۱۹

ھے ایضًا ایضًا ایضًا ص ۱۹

لے فلاسفی آف میڈیسن اینڈ سائنس (مجموعۂ مضامین) مرتبہ آئی۔ ایچ۔ ایم۔ ایم۔ آر۔ ہمدرد نگر دہلی، ۱۹۷۲ء ص ۱۴۲

ٹے ایضًا ایضًا ایضًا ص ۱۴۰، ۱۴۱

ٹے گیلنس سسٹم آف فزیالوجی اینڈ سائنس ص ۲۳۸، ۲۳۹

ٹے او۔ سی۔ گرونر۔ ہمدرد اسپیشل ایشو۔ کامنٹری آن دی کینن آف میڈیسن آف اوی سینا۔ جولائی و ستمبر ۱۹۶۷ء، ج ۱۱۔ ص ۱۴

نلہ سید اشتیاق احمد۔ کلیات عصری۔ مطبوعہ قرول باغ دہلی، ۱۹۸۳ء، ج ۱، ص ۶۸

"اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا، اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے، کیوں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے، پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۸ (اگست ۸۹ء)

چین کا سرسید

محمد اسلم *

ایک دن وائی ایم سی اے (کینڈا) کے سکریٹری میجر ہربوٹ کول لیبر کیمپ کے معائنے کے لیے تشریف لائے۔ میجر کول جمی ین کی شاندار کارکردگی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے جمی کو دعوت دی کہ وہ پیرس میں اس کے ہیڈ کوارٹر آئے۔ اور فرانس میں مقیم ایک لاکھ اسی ہزار چینی مزدوروں کی تعلیم کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کرے۔ جمی نے یہ دعوت قبول کرتے ہوئے میجر کول سے کہا کہ اس وقت امریکہ میں مختلف جامعات مثلاً ہارورڈ، کارنل، ییل وغیرہ میں سترسٹھ چینی طلبا تعلیم پا رہے ہیں۔ انھیں فرانس میں چینی لیبر کیمپوں کا رضاکارانہ دورہ کرنے کی دعوت دی جائے تاکہ اس تعلیمی پروگرام میں وہ بھی عملاً حصہ لے سکیں۔ میجر کول نے اس کام کے لیے فنڈ فراہم کرنے کی ہامی بھرلی۔

امریکہ میں زیر تعلیم چینی نوجوان طلبا نے فرانس آکر لیبر کیمپوں میں تعلیم کی یہ تحریک دیکھی تو وہ نہایت خوش ہوئے۔ اب نئی الجھن یہ پیدا ہوئی کہ جوں جوں زیر تعلیم طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا تعلیمی مواد کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے لوگوں کے لیے درسی کتابیں کون لکھے اور کون شائع کرے۔ جمی ین نے میجر کول سے مشورہ کیا۔ طے پایا کہ جمی صاحب ایک ہفت روزہ اخبار جاری کریں اور اپنے چینی شاگردوں میں ارزاں قیمت پر تقسیم کریں۔ اخبار میں تعلیمی سبق بھی ہوں اور معلوماتی خبریں اور مضامین بھی۔ اس اخبار کا نام انھوں نے "دی چائنیز لیبر ویکلی" رکھا۔

یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور اس تعلیمی ہفت روزہ نے بہت جلد غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی لیکن ایک روز یہ خبر آئی کہ اتحادیوں نے جاپان سے ایک خفیہ معاہدہ کرکے اسے چین پر قبضہ کرنے کی کھلی چھٹی دے دی ہے تو جمی کو بہت صدمہ ہوا۔ انھوں نے اپنے ہفت روزہ اخبار میں اتحادیوں کے خلاف سخت اداریے تحریر کیے۔ یہ گویا سیاست میں حصہ لینے کا اعلان تھا۔ اس پر ایک انگریز جنرل نے ان کا اخبار بند کرا دیا۔

اخبار بند ہونے کا اصل نقصان چینی مزدوروں کو تھا جو اب تعلیم حاصل کرنے کے لیے دل و جان سے آمادہ ہو چکے تھے۔ مثلاً جمی کے ایک سابق شاگرد نے خط لکھا:

> "میرے عظیم استاد! آپ کے پرچے کو میں کائنات میں اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ یہ اس لیے بند ہوا کہ یہ بہت ارزاں تھا اور اس کی لاگت بھی پوری نہیں ہوتی ہوگی۔ آپ کب تک محض اپنی جیب سے اسے جاری کیے رکھتے۔ اتنے ارزاں رسالے کو

---

* طارق روڈ، کراچی، پاکستان

معاشی لحاظ سے ایک نہ ایک دن بند ہونا تھا۔
میں نے اپنی تین سالہ بیگاری کے دوران تین سو ساٹھ[۳۶۰]
فرانک جمع کیے تھے، وہ آپ کی خدمت میں ارسال
کر رہا ہوں۔ تاکہ پرچہ دوبارہ شروع کرتے وقت
آپ کے کام آسکیں۔"

جمی ین ہر وقت یہ سوچتے رہتے تھے کہ کیا وہ چینیوں کے سیاسی حقوق کی خاطر عملی سیاست میں حصہ لیں یا خود کو صرف ان کی تعلیم کے لیے وقف رکھنا چاہیے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ زندگی چونکہ مختصر ہے اور عملی سیاست کے تقاضے عارضی ہوتے ہیں اور عملی سیاست کوئی مثبت انداز بھی اختیار نہیں کر سکتی، جب تک اہل چین تعلیم سے اور جدید تعلیم سے واقف نہ ہوں۔ پس انھوں نے صرف تعلیم پھیلانے کا فیصلہ کیا۔

چین میں کسانوں کی آبادی نوے فیصد کے قریب تھی۔ جو سب کی سب ناخواندہ تھی۔ چنانچہ اب انھوں نے دیہات پر توجہ دینی شروع کی۔ لیکن وہاں غربت، بھوک اور بیماریاں بہت تھیں ان سب چیزوں پر قابو پانے کے لیے واقعی ایک انقلاب کی ضرورت تھی۔ چین کے جنوبی علاقوں میں کمیونسٹ بھی کافی عرصے سے سرگرم عمل تھے۔ بہت برسوں کے بعد یہ افواہ بھی اُڑی تھی کہ جمی ین کے پہلے شاگرد ایک نوجوان ماؤ نے تنگ تھے۔

اس زمانے میں چین میں حکومت کی بنیاد "اکزیان" یا "ملتوں" کو سمجھا جاتا تھا جن کی تعداد انیس سو کے لگ بھگ تھی جمی کا خیال تھا کہ اگر انھوں نے اپنا تعلیمی ماڈل ایک اکزیان میں بھی قائم کر دیا تو دوسرے اکزیان بھی ان کی تقلید کریں گے۔

ڈنگ اکزیان کا رقبہ تقریباً پانچ سو مربع میل تھا۔ جب کہ آبادی چار لاکھ نفوس پر مشتمل تھی جو چار سو بہتر[۴۷۲] مختلف دیہات میں رہائش پذیر تھے۔

جمی کا پہلا انقلابی فیصلہ یہ تھا کہ جب تک ان دیہاتی لوگوں میں جا کر انہیں تعلیم کی طرف راغب نہ کیا جائے، بات نہ بنے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تیس بہترین تعلیم یافتہ ساتھیوں کو لے کر ڈنگ اکزیان کے دیہات کا رخ کیا۔ ان میں ڈاکٹر، ماہرین زراعت، دواساز حکومت کے کارندے وغیرہ بھی شامل تھے۔ ان کی رفیقہ حیات بھی اس عظیم مقصد میں ان کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے جھونپڑی میں قیام کیا اور وہیں ان کے پانچ بچوں کی پیدائش اور پرورش ہوئی۔ مسلسل نو سال کی محنت اور رہنمائی کے سبب ڈنگ اکزیان کے باسی تعلیم یافتہ اور باشعور ہو چکے تھے اور پورا حلقہ ایک تعلیم یافتہ معاشرے کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ ان نو سالوں میں انہیں دہقانوں کی روایات، فرسودہ کاشت کاری کے طریقوں اور غریب دیہاتیوں کی اوہام پرستی کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ مفلوک الحال دیہاتیوں کو باشعور بنانے کے لیے انہیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ انھوں نے دیہاتیوں میں تبدیلی لانے کے لیے ان کی ضروریات اور خواہشات کو سمجھا، تب کہیں جا کر ان میں شعور پیدا ہوا۔

جمی اور ان کی ٹیم ایک ایک گاؤں میں جاتے اور دیہاتی زندگی کا بغور مشاہدہ کر کے یہ اندازہ لگاتے کہ کسانوں میں خاطر خواہ تبدیلی لانے کے لیے انہیں کون کون سے طریقے استعمال کرنے چاہئیں۔ آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے پروگرام کو چار گنا توسیع دی۔ ۱۹۲۸ء میں جمی کو ییل کالج کی جانب سے ایک اعزازی ڈگری دی گئی۔ وہ ییل گئے اور وہاں پر پانچ لاکھ ڈالر جمع کیے کیونکہ اپنے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے انہیں سرمائے کی اشد ضرورت تھی۔ وطن واپسی پر جمی نے دیہات میں اسکول قائم کیے۔

پہلے پہل دہقان انہیں ماورائی مخلوق سمجھتے تھے۔ وہ پہلے ہی ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ ان ٹیکسوں کی نوعیت کچھ اس طرح تھی، زمین کا ٹیکس، پتنگ اُڑانے کا ٹیکس، سور ذبح کرنے کا ٹیکس، آتش بازی کا ٹیکس وغیرہ وغیرہ
وہ سمجھتے تھے کہ جمی کو ان پر نئے ٹیکس لگانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ پہلے جمی گاؤں کے کسی بزرگ کے پاس جاتے اور اسے بتاتے کہ بڑے شہروں میں کتنی تبدیلی آچکی ہے۔ پھر ایک نقیب سے سارے گاؤں میں عبادت گاہ میں ایک میٹنگ کا اعلان کروایا جاتا۔ کسان یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ مہمان نے

بالکل ان کے جیسے گندے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ انہیں یہ بتایا جاتا کہ وہ قریبی دیہات سے آئے ہیں اور بالکل ان کے جیسے گاؤں میں رہتے ہیں۔

جی ایک بزرگ کو سمجھاتے کہ اسے کیا کہنا ہے اور پھر بزرگ صاحب کھڑے ہو کر مجمع سے خطاب کرتے "کیا تمہاری آنکھیں ہیں؟ جن جن کی آنکھیں ہوں، وہ اپنے ہاتھ بلند کریں"۔ ظاہر ہے سب کسانوں کے ہاتھ خودبخود اُٹھ جاتے۔ پھر بزرگ ایک کتاب سب کے سامنے لہراتے ہوئے کہتے: "تم میں سے کتنوں نے اس کو دیکھا ہے؟" سب کے ہاتھ واپس اپنی جگہ پر چلے جاتے۔ بزرگ فرماتے "تم میں سے کس کس نے اس کو پڑھا ہے"؟ کسی کا ہاتھ بلند نہ ہوتا۔ پھر کہا جاتا: "تمہیں خدا نے آنکھیں دی ہیں مگر تم دیکھ نہیں سکتے ہو۔ یہاں جو مہمان تمہارے پاس آئے ہیں، وہ تمہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں چار ماہ میں علم سے روشناس کروائیں گے اور تم سے پھوٹی کوڑی تک بدلے میں نہیں لیں گے۔ بس تمہیں روزانہ رات کو ان سے ایک گھنٹہ درس لینا ہوگا۔ چار ماہ میں تم سب کچھ دیکھنے کے قابل ہو جاؤ گے"۔ ان غریب کسانوں کی توہم پرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ کیمروں کو شیطانی ڈبہ سمجھتے تھے، لیکن جی نے یہاں پہلی فرانس والا نسخہ آزمایا اور کسانوں سے رضاکارانہ معاونت کی اپیل کی جانے لگی۔

اس طرح تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں بہت سے دیہاتی رضاکارانہ ان کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جی نے ڈنگ اکزیان میں چھ اسکولوں کی بنیاد رکھی جن میں استاد پیدا کیے جاتے تھے اور جب یہ دیہاتی معلم بن جاتے تو انہیں ان کے گاؤں میں موجود "عوامی اسکولوں" میں بھیج دیا جاتا تھا۔

دوسرا اہم کام جی اور ان کے ساتھیوں نے "بھوک" کے سلسلے میں کیا۔ انہیں خوراک کی زیادہ افزائش کے جدید طریقے سکھائے۔ ان کی مرغیاں جو ایک سال میں پچاس انڈے دیتی تھیں اب سو انڈے دے رہی تھیں۔ جی نے انہیں حفظان صحت کے اصول بتائے اور انہیں زیادہ فصلیں پیدا کرنے کے گر سکھائے۔ اب وہ زیادہ گندم، چاول، سبزیاں اور کپاس پیدا کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اب وہ بکریوں سے بھی

زیادہ دودھ حاصل کر سکتے تھے، جو گایوں کے مقابلے میں کم چارہ کھاتی تھیں۔

ڈنگ اکزیان کے ایک فارمنگ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد بھی رکھی گئی جس نے کسانوں کو آب پاشی کے نئے اور آزمودہ طریقوں سے روشناس کرایا۔ کنوئیں بنوائے گئے۔ ایسے سہاگے استعمال کرائے گئے، جن میں ایک کے بجائے دو دانت لگے ہوئے تھے۔ ایسے ہل استعمال کیے جانے لگے جن میں کم گہرائی میں چلا جانے والا پہیہ لگا ہوا تھا۔

چنانچہ اب کسان ان سے ہر طرح کا تعاون کرنے پر تیار تھے۔ کپاس پیدا کرنے والے جو پہلے دھاگے بنانے میں اپنا کافی وقت برباد کرتے تھے اب براہ راست اپنا مال تیار کر کے ملوں میں بھیجنے لگے تھے۔ کارکنوں نے اندرون دیہات سڑکوں کے اردگرد درخت بھی لگانے شروع کر دیے جن سے ان کے کھیت اور ان میں کھڑی فصلیں ہولکے جھکڑوں سے محفوظ ہو گئی تھیں۔ اس اقدام سے شمالی چین کے میدان اپنی بھرپور پیداوار دینے لگے۔ اب جی صحت کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک بیمار کسان ہمیشہ غریب رہتا تھا۔ پورے حلقے میں ایک بھی ایسا طبی مرکز نہ تھا جو غریب کسانوں کو روز روز کی بیماریوں سے نجات دلاتا۔ دیہاتی ایسے کنوؤں کا پانی پیتے تھے جو بیت الخلاؤں کے قریب واقع تھے۔ دائیاں بچوں کو کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کپڑوں میں رکھتی تھیں۔ تشنج، چیچک اور دوسری بیماریاں بچوں میں عام تھیں۔

ایک چینی ڈاکٹر شی سی چن نے، جو بیجنگ کے ایک میڈیکل کالج سے تربیت لے کر آیا تھا، اس نے جی کی ٹیم میں رضاکارانہ شمولیت اختیار کر لی۔ اس نے دوسرے رضاکاروں کو حفظان صحت کے اصولوں کی اچھی خاصی تربیت دی۔ چنانچہ اب ہر رضاکار اس وقت کی جدید طب سے واقف ایک ڈاکٹر بن چکا تھا۔ انہیں ایک کٹ دی گئی جس کی قیمت ایک چینی ڈالر تھی۔ ہر کٹ میں اسپرین، آیوڈین، پٹرولیم جیلی، پٹیاں اور رقما کو ما کی بیماریوں میں کام آنے والی ایک دوائی کا پیم سلفیٹ موجود تھے۔ رضاکاروں کو بتایا گیا کہ کنوؤں کو کس طرح صاف رکھا جا سکتا ہے، نومولود بچوں کی حفاظت کس طرح کی جا سکتی ہے۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ چیچک اور ہیضے کی وباؤں سے بچنے کے

لیے کون کون سی حفاظتی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ جب ان رضاکاروں نے مختلف دیہاتوں میں صحت کے اوپر کام شروع کر دیا تو کسانوں کی صحتیں کسی قدر اچھی ہو چکی تھیں۔

۱۹۳۲ میں حکومت کے ایک کارندے نے جب ڈنگ اکزیان میں قیام کیا اور جمی ین اور ان کی ٹیم کو عوامی فلاح کے کاموں پر مرکوز دیکھا تو بے اختیار کہہ اٹھا "آپ کا پروگرام ایک ایسی چوکور میز کی طرح ہے جس کی صرف تین ٹانگیں ہیں یعنی تعلیم، معیشت اور صحت۔ اب تمہیں چوتھی ٹانگ یعنی سیاسی ٹانگ کی ضرورت نہیں ہے تاکہ یہ میز سیدھی ہو سکے"۔

ایک روایتی حلقہ جاتی حکومت کسی نہ کسی آمر مطلق کی ماتحتی میں ہوتی تھی۔ کسی اکزیان یا حلقے کا مجسٹریٹ عوام کا "سرکاری سرپرست" سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہ صرف ٹیکس وصول کرتے ہوئے یا غریب کسانوں کی معمولی معمولی غلطیوں پر انھیں سزائیں دیتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ زمینداروں کی دعوتیں کرتا رہتا تھا اور ان کے کارندے پورے حلقے میں پھیل کر غریب کسانوں کی خون پسینے کی کمائی اپنی جیبوں میں بھرتے تھے۔ غرض ہر طرف کرپشن پھیلی ہوئی تھی۔ جب دیہاتیوں نے اپنے اسکولوں کو چلانا سیکھ لیا تو ان کے دل میں حکومت بنانے کا خیال بھی پیدا ہوا۔ جمی کا بنیادی سیاسی نظریہ چینی خاندان کی اکائی پر مبنی تھا۔ چنانچہ جمی نے ہر گاؤں میں لوگوں کو یہ سمجھایا کہ وہ اپنے اپنے دیہات میں ایک ایک کو نسلر مقرر کریں جو ان کے طبقے سے ہی تعلق رکھتا ہو اور کرپٹ لوگوں کو اپنی صفوں سے نکال دیں۔ چنانچہ ڈنگ اکزیان کے لوگوں کو یہ شعور حاصل ہوا کہ اپنے مسائل وہ خود ہی حل کر سکتے ہیں۔ "اپنی مدد آپ اور آسمان تلے ایک خاندان" اس مقولے میں چینی عوام کے لیے اتحاد کا درس پنہاں تھا۔

شمالی چین میں کچھ شیطان قسم کے زمیندار بھی تھے جو ہر وقت زر، زن، زمین کے لیے لڑنے مرنے کو تیار رہتے تھے۔ ان ہی میں ایک ژوان اکزیو لیانگ بھی تھا جس نے جمی کو رشوت اور پھر دھونس دھمکی دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تاکہ انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر سکے، لیکن جمی نے اس کے ساتھ تعاون استوار کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ژوانگ نے انھیں گرفتار کرنے کے لیے اپنے چند مسلح کارندے بھیج دیے۔ جمی تو بچ گیا لیکن ان کی ٹیم کے بے شمار رضاکار ژوانگ کے کارندوں نے گرفتار کر لیے۔ ان میں ایک سابق کالج کا صدر چن بھی تھا۔

جمی سیدھے تھانے گئے اور اپنے اسٹاف کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ دو دن کی تگ و دو کے بعد ان کے اسٹاف کو رہائی ملی۔ جب جمی جیل پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ چن دو گارڈوں کو تعلیم کی طرف راغب کر رہا تھا۔ اس نے ان پڑھ قیدیوں کو بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ جب چن رہا ہوا تو تمام قیدی رو پڑے۔ واقعی وہ ان کا نجات دہندہ تھا۔

۱۹۴۶ میں جاپانیوں کی شکست کے بعد چیانگ کائی شیک کو تمام ملک کے لیے ایک تعلیمی پروگرام پیش کیا، جس سے چیانگ کائی شیک بہت متاثر ہوا لیکن اس کا کہنا تھا کہ اس پروگرام پر عمل ماؤزے تنگ کو کمیونسٹ فوجوں پر فتح پا لینے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ جمی ین نے چیانگ کائی شیک کو بہت سمجھایا کہ اگر ماؤزے تنگ کی فوجوں اور اشتراکیت کو شکست دینا چاہتے ہو تو کسانوں کی غربت اور نا امیدیوں کو دور کر دو، ورنہ کمیونزم کا زہر ان کے دلوں میں اتر جائے گا۔

۱۹۴۷ میں جمی نے ایک دفعہ پھر امریکہ کا سفر اختیار کیا تاکہ اپنے تعلیمی پروگرام کے سلسلے میں کچھ رقم جمع کی جا سکے۔ انہوں نے امریکی کانگریس سے امداد کی اپیل کی۔ ۱۹۴۸ میں کانگریس نے چائنا ایڈ ایکٹ کے تحت جمی کی دیہی ترقی کے لیے سینتالیس ملین ڈالر کی امداد دی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا چیانگ کائی شیک کی فوجیں شکست کھاتی چلی گئیں۔ چنانچہ صرف چار ملین ڈالر کی امداد دیہات میں خرچ کی جا سکی۔ جب ۱۹۴۹ میں چین میں کمیونسٹ انقلاب رونما ہو گیا تو جمی ین کو بھی ملک سے باہر نکال دیا گیا۔

ایک دفعہ پھر انھوں نے حالات کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کیا اور خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ وہ چالیس ان پڑھ قلیوں کو

تعلیم کی طرف آمادہ کرتے، پھر ایک انتظامی حلقے میں علم کی روشنی پھیلاتے، پھر ایک صوبے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے اور اس طرح پورے ملک کو علم سے منور کر دیتے تھے۔ ان کا کام صرف چین کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے تھا۔

امریکہ میں ایک انتظامی ڈھانچہ تیار کرنے اور فنڈز اکٹھے کرنے کے بعد جمی ین نے ایشیائی ملکوں کی زبوں حالی پر نگاہ دوڑائی اور اپنے عظیم کام کی ابتدا کے لیے فلپائن کو چنا۔ سب سے پہلے انہوں نے نیووا ایسیا صوبے میں تربین اور راننزال صوبے میں سولہ حلقوں میں ڈنگ اکزیان کے ماڈل پر پبلک اسکول قائم کیے۔ ہر تعلیمی ادارے میں انہوں نے طلبا کو ہی اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔

جمی ین نے طلبا کو یہ تحریک دی کہ وہ لوگوں سے ملیں ان کے ساتھ رہیں، ان سے کچھ سیکھیں اور کچھ انہیں سکھائیں اور تعلیم کی اہمیت کا احساس دلائیں۔ کچھ ہی عرصے میں تین ہزار فلپینی نوجوان ان کے ساتھ رضاکارانہ کام کرنے کو تیار ہو چکے تھے چند سال ہی میں ان کی ٹیم فلپائن کے سترہ صوبوں میں اپنے تعلیمی مراکز قائم کر چکی تھی۔

۱۹۵۵ء میں جمی کو ایک خوشی یہ ملی کہ فلپائن کی حکومت نے ایک قانون منظور کرتے ہوئے ہر تعلیمی ادارے کو اپنے کونسلر منتخب کرنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ طلبا کے لیے تعلیم، ذریعہ معاش اور صحت کے شعبوں کا خود ہی انتظام کر سکیں۔ ۷ ارجنوری ۱۹۵۶ء میں فلپائن کی تاریخ کا پہلا قومی الکشن ہوا۔ ان تمام مقاصد میں کامیابی کے بعد جمی کو "ووراموں ماگسے سے" ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۱۹۶۰ء میں جمی ین نے نوجوانوں، عورتوں اور مردوں کے لیے تعلیمی مشن کا ایک جال فلپائن میں پھیلا دیا۔ مردوں کی تنظیمیں کھیتی باڑی اور مارکیٹنگ کی کامیابیوں پر کام کر رہی تھیں جبکہ خواتین کی تنظیمیں صحت اور صفائی، گھریلو باغات، مرغبانی، بچوں کی پرورش اور ان کی دیکھ بھال کے جدید طریقوں کو اجاگر کرتی تھیں۔ نوجوانوں کی تنظیمیں نوجوانوں میں خواندگی، فرنیچر بنانا، پودوں کی نرسریاں اور اینٹوں اور کنکریٹ کے بلاک بنانے کے شعبوں میں ان کو راغب کرتی تھیں۔ چنانچہ چین کی طرح اب فلپائن کے کسان بھی باشعور ہوتے جا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج فلپائن کی خواندگی کی شرح نوّے فیصد ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں فلپائن میں عوامی اسکولوں کا ایک نیا نظام متعارف کروایا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں ہی جمی ین فلپائن میں بھی دیہی ترقیات کا ایک بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ قائم کر چکے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں اس کا کیمپس صوبے کیوانت کے شہر سیلانگ میں ۱۲۵ ایکڑ پر تعمیر کیا گیا جو منیلا سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اس ادارے میں بہت سی سہولیات موجود تھیں جن کی مدد سے تیسری دنیا کے طلبا کو بھی ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ہزاروں طلبا اس انسٹی ٹیوٹ سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے ملکوں میں گئے اور ان کی ترقی میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان ملکوں میں فلپائن، گوئٹے مالا، کولمبیا، گھانا، کینیا، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا شامل ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک نے جمی ین کی خدمات سے یہی سبق حاصل کیا ہے کہ اگر غریب آدمی خودداری کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے اپنے مسائل خود حل کرنے ہوں گے۔

اتنی کامیابیوں کے باوجود جمی ین کے مزاج میں یاس کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے نو آبادیاتی دور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ماؤزے تنگ کا انقلاب ان کی نظروں کے سامنے رونما ہوا۔ انھوں نے چینی معاشرے میں خواندگی بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن انقلاب نے ان کے تمام کام پر پانی پھیر دیا۔ حتیٰ کہ انہیں چینی شہریت سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اب ان کے پاس صرف امریکی شہریت رہ گئی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں امریکہ ہی میں ان کی رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔

ان کے تین لڑکے چین میں ہی رہ گئے تھے، جن میں

سے سب سے زیادہ ڈینگ ژیاؤ پنگ کا ندا ثقافتی انقلاب کے دوران زیرِ عتاب آ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ چین کی ہر قدیم روایت خراب نہیں تھی اور مغرب کی ہر چیز خراب نہیں ہے لیکن اسے خودکشی پر مجبور ہونا پڑا۔ اس نے اپنے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے خود ہی ایک ریل گاڑی کے نیچے آ کر اپنی جان دے دی۔ ۱۹۸۵ء میں نیشنل پیپلز کانگریس نے انہیں اپنے پڑانے گھر واقع ڈنگ اکزیان آنے کی دعوت دی۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ بیجنگ ایئرپورٹ پر اپنے بیٹے کی بیوہ سے ان کی ملاقات آنسوؤں میں ہوئی۔ ان کی بہو کے ساتھ ان کے دو پوتے اور دوسرے دو بیٹوں کی بیٹیاں اور بیٹے بھی ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اس وقت ین کی عمر بانوے برس ہو چکی تھی۔ انہیں چین میں ہیرو کا درجہ دیا گیا۔ سب سے پہلے صوبہ 'ہی بے ای' کے گورنر نے سلامی پیش کی اور ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی گئی۔ پھر انہیں ڈنگ اکزیان لے جایا گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کا پرانا گھر ان کے اعزاز میں ایک قومی عجائب گھر میں بدل دیا گیا تھا جس میں ان کی اور ان کے ساتھیوں کی تصویریں رکھی گئی تھیں۔

ایک گاؤں لی لنگ گو میں ایک بزرگ دہقان اکسوٹا نے ان کا استقبال کیا۔ یہ شخص ماؤ کے انقلاب سے پہلے ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اس وقت جمی ین کی عمر چھیانوے برس ہونے کو ہے لیکن چین کے باسی کہہ رہے ہیں کہ انہیں ڈنگ اکزیان جیسا کوئی تعلیمی پروجیکٹ شروع کر دینا چاہیے۔ وہ آج بھی چاق و چوبند ہیں، چست ہیں۔ اب بھی ان کی خواہش یہی ہے کہ وہ تعلیم کا فیض وہاں تک پہنچائیں، جہاں تک وہ اب تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ جمی کا کہنا ہے کہ

"عوام ہی کسی قوم کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر عوام باشعور ہوں تو اس کے ثمرات سے پوری قوم استفادہ کرتی ہے۔"

جب اُن سے پوچھا گیا کہ اپنے تعلیمی مقاصد کے دوران آپ کو بے شمار تکالیف سہنا پڑیں، دربدر بھی ہونا پڑا۔ کبھی آپ حوصلہ تو نہیں ہارے؟

جمی کا جواب تھا "کبھی نہیں۔"

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن بندے کی میزان میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ فحش بکنے والے بدزبان آدمی سے نفرت کرتا ہے۔"

[ترمذی]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۸ (اگست ۸۹ء)

مرادآباد کے چھ کالجوں سے انٹر میں فرسٹ ڈویژنر مسلم بچوں کی تعداد

صفر سے بڑھ کر چوبیس

احمد رشید شیروانی*

لوگ کہتے ہیں (اور بقول شاعر ع لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے) کہ یہ احمد رشید شیروانی جو برسہا برس سے مسلم اداروں کے نتائج کی بابت مضمون لکھ لکھ کر ڈھیر لگا رہا ہے تو آخر اس سے فائدہ کیا ؟ واقعی سوال تو اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے، مگر اس کا جواب ؟ بات یوں ہے کہ جہاں جہاں مسلمان کوشش کر رہے ہیں (یعنی جن جن مسلم اداروں کے طلبا و طالبات زیادہ محنت اور کوشش اور شوق سے پڑھ رہے ہیں اور ان کے ٹیچرز زیادہ محنت سے پڑھا رہے ہیں اور عہدیداران بھی اپنے اداروں کی خبرگیری رکھ رہے ہیں) وہاں وہاں فائدہ ہو رہا ہے باقی جگہوں پر نہیں ہو رہا۔

مثلاً ضلع مرادآباد کے چھ انٹر کالجوں میں مسلم بچوں کے ۱۹۷۶ء کے نتائج ملاحظہ فرمایئے (جب کہ ہماری اسکیم شروع ہوئی تھی) اور ان ہی چھ کالجوں میں مسلم بچوں کے ۱۹۸۸ء کے نتائج ملاحظہ فرمایئے تو پتہ چلے گا کہ بارہ سال میں کیا ہوا۔ سب سے ملا کر دو سو تراسی مسلم بچے انٹر بورڈ امتحان ۱۹۷۶ء میں شریک ہوئے تھے۔ ایک سو پینتیس یعنی اڑتالیس فی صد پاس ہوئے تھے بارہ سال کے بعد ۱۹۸۸ء میں چھ کالجوں سے ملا کر تین سو بانوے مسلم بچے شریک ہوئے اور تین سو نو یعنی اُناسی فیصد پاس ہوئے۔

گویا انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد بارہ سال میں دو سو تراسی سے بڑھ کر تین سو بانوے ہو گئی۔ ایک سو نو عدد کا یہ اضافہ انتالیس فی صد ہے۔ یہ اضافہ کوئی خاص نہیں۔ کیونکہ اس عرصے میں مسلمانوں کی آبادی بھی ماشاء اللہ اتنی ہی بڑھ گئی ہوگی۔ گویا اس اعتبار سے مسلمانوں نے اس سطح پر تعلیم میں قطعاً کوئی ترقی نہیں کی۔ مسلمان وہیں کے وہیں ہیں ع

زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد

لیکن جناب اوسط رزلٹ اڑتالیس فیصد سے بہتر ہو کر اناسی [۷۹] فیصد پاس ہو گیا اور اس کی وجہ سے پاس ہونے والے مسلم بچوں کی تعداد ۱۹۷۶ء میں ایک سو پینتیس [۱۳۵] سے بڑھ کر تین سو نو [۳۰۹] ہو گئی۔ دوگنی سے زیادہ بلکہ سوا دوگنی سے بھی کچھ زیادہ البتہ ڈھائی گنی سے کم۔ یعنی اوسط رزلٹ بہتر ہونے سے بہرحال ملت کا کچھ نہ کچھ فائدہ ہوا۔

سب سے زیادہ نمایاں بہتری اس اعتبار سے ہوئی کہ فرسٹ ڈویژن لانے والے مسلم بچوں کی تعداد بارہ سال یعنی ۱۹۷۶ء میں صفر تھی جو بڑھ کر ۱۹۸۸ء میں چوبیس ہو گئی ہے یعنی واہ وا۔

---

* ۱۴۳-اے کناٹ پلیس، نئی دہلی۔

بارہ سال میں کیا ہوا ؟

۱۹۷۶ شریک	پاس	فیصد	فرسٹ	انٹر کالج کا نام و مقام	۱۹۸۸ء شریک	پاس	فیصد	فرسٹ
۷۹	۴۲	ترپن	-	عبدالسلام مسلم - مراد آباد	۱۵۹	۱۴۷	بانوے	۱۶
۳۲	۱۶	پچاس	-	آل احمد امروہہ	۳۴	۳۰	اٹھاسی	۷
۱۱۱	۵۸	باون	-	دو میں مسلم لڑکیاں	۱۹۳	۱۷۷	بانوے	۲۳
۶۳	۲۹	چھیالیس	-	امام المدارس امروہہ	۶۲	۴۷	چھہتر	-
-	-	-	-	عبدالکریم خاں امروہہ	۳۱	۲۲	اکہتر	۱
۹۲	۳۴	سینتیس	-	ہند سنبھل	۷۵	۴۷	ترسٹھ	-
۱۷	۱۴	بیاسی	-	النسا مرادآباد	۳۱	۱۶	باون	-
۱۴۲	۷۷	پینتالیس	-	چار میں مسلم لڑکے	۱۹۹	۱۳۲	چھیاسٹھ	۱
۲۸۳	۱۳۵	اڑتالیس	-	چھ میں مسلم لڑکے اور لڑکیاں	۳۹۲	۳۰۹	اناسی	

کس نے زیادہ ترقی کی

لوگوں کو مقابلے میں بڑا مزا آتا ہے - ہے نا ؟
تو آیئے مسلم لڑکیوں کا مقابلہ یا موازنہ مسلم لڑکوں سے کرائیں ۱۹۷۶ء میں ایک سو گیارہ مسلم لڑکیاں انٹر بورڈ امتحان میں دو مسلم گرلز کالجوں سے شریک ہوئیں تھیں اور اٹھاون یعنی باون فیصد پاس ہوئی تھیں ۔ ۱۹۸۸ء میں ایک سو ترانوے شریک ہوئیں اور ایک سو ستتر یعنی بانوے فیصد پاس ہوئیں شریک ہونے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد ایک سو گیارہ سے بڑھ کر ایک سو ترانوے ہوئی ۔ بیاسی عدد کا یہ اضافہ چھہتر فیصد ہے البتہ چونکہ اوسط رزلٹ باون فیصد پاس سے بہتر ہو کر بانوے فیصد پاس ہو گیا۔ اس لیے پاس ہونے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد اٹھاون سے بڑھ کر ایک سو ستتر ہو گئی - یعنی تین گنی سے زیادہ

گویا مسلم لڑکیوں نے اس سطح پر خاطر خواہ ترقی کی ۔

اب آیئے دیکھیں کہ ملت کے لاڈلوں نے اسی اثنا میں کیا کیا - شریک ہونے والے لڑکوں کی تعداد ایک سو بیالیس سے بڑھ کر ایک سو ننانوے ہو گئی - سینتیس عدد کا یہ اضافہ صرف بائیس فیصد ہے - یعنی مسلمانوں کی آبادی میں جتنا اضافہ ہوا انٹر کی سطح پر امتحان میں شریک ہونے والے مسلم لڑکوں کی تعداد میں اتنا بھی اضافہ نہیں ہوا - گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اعتبار سے مسلم لڑکے تعلیم میں بارہ سال پہلے کی بہ نسبت مزید پیچھے چلے گئے ۔

ایک بات اور - فرسٹ ڈویژن لانے والی مسلم لڑکیوں کی تعداد بارہ سال میں صفر سے بڑھ کر تئیس ہو گئی۔ اور مسلم لڑکوں کی تعداد ؟ جی ہاں وہ بھی بڑھی - کتنی ؟ صفر سے

بڑھ کر ایک ہو گئی۔ یعنی کل ایک عدد فرزند توحید فرسٹ ڈویژن
لائے، عبدالکریم خان انٹر کالج امروہہ سے۔

الگ الگ دیکھ لیں

عبدالسلام مسلم گرلز کالج مرادآباد کا رزلٹ ترپن
فیصد پاس سے بہتر ہو کر بانوے فیصد پاس۔ فرسٹ ڈویژن
کی تعداد صفر سے بڑھ کر سولہ۔ مبارکباد۔ آل احمد گرلز کالج
امروہہ میں مسلم لڑکیوں کا رزلٹ پچاس فیصد پاس سے بہتر ہو کر
اٹھاسی فیصد پاس۔ فرسٹ ڈویژن صفر سے بڑھ کر سات،
مبارکباد۔ امام المدارس کالج امروہہ میں مسلم لڑکوں کا رزلٹ
چھیالیس فیصد پاس سے بہتر ہو کر چھہتر فیصد پاس۔ مبارک باد
مگر فرسٹ ڈویژن صفر کی صفر۔ عبدالکریم خاں کالج امروہہ
سے ۱۹۷۶ء میں انٹر بورڈ امتحان میں کوئی شریک نہیں ہوا تھا۔
۱۹۸۸ء میں اکہتر فیصد پاس۔ پاس فیصد کے اعتبار سے
یہ کالج چھ میں چوتھے نمبر پر ہے۔ مگر اسے یہ فخر و امتیاز حاصل
ہے کہ جو ایک عدد فرزند توحید فرسٹ ڈویژن لائے ہیں وہ
اس کالج سے لائے ہیں۔ ہند کالج سنبھل میں مسلم لڑکوں کا
رزلٹ سینتیس فیصد پاس سے بہتر ہو کر ترسٹھ فیصد پاس
ہو گیا۔ مبارکباد۔ مگر فرسٹ ڈویژن صفر کی صفر۔

گویا ایک کالج تو نیا ہے (یعنی ۱۹۷۶ء تک کالج
نہیں تھا) چار کالجوں میں رزلٹ بہتر ہوا۔ البتہ آخری اور چھٹے
کالج میں رزلٹ گر گیا۔ ۱۹۷۶ء میں انصار کالج مرادآباد سے
بیاسی فیصد مسلم لڑکے پاس ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں صرف
باون فیصد پاس اور فرسٹ ڈویژن صفر کی صفر۔ کیوں؟ اب
یہی اس کالج کے محترم ذمہ داروں کے دیکھنے کی بات ہے۔ صرف
دیکھنے کی؟ جی نہیں۔ دیکھ کر صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے
موثر و مفید قدم اٹھانے کی بات ہے۔

تعداد کیوں نہیں بڑھتی؟

مرادآباد کے مسلم گرلز انٹر کالج سے انٹر بورڈ امتحان
میں شریک ہونے والی مسلم طالبات کی تعداد اناسی سے بڑھ کر
ایک سو انسٹھ ہو گئی۔ یعنی ڈبل۔ بہت خوب۔ لیکن امروہہ کے مسلم
گرلز کالج میں بارہ سال میں تعداد بتیس سے بڑھ کر چونتیس ہوئی۔
دو عدد کا یہ اضافہ صرف چھ فیصد ہے اور نہ ہونے کے برابر
ہے۔ قریب چالیس فیصد کا اضافہ تو مسلمانوں کی آبادی میں
ہی ہو گیا ہوگا۔ لہٰذا ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ اس اعتبار سے
امروہہ کے مسلم کالج میں مسلم لڑکیاں بارہ سال میں قریب
چونتیس فیصد پیچھے رہ گئیں۔ آخر کیوں؟ اس کالج کے رزلٹ
میں بہتری لائق ستائش ہے۔ فرسٹ ڈویژن صفر سے بڑھ
سات ہو گئیں اور چونتیس میں سے سات یعنی قریب بیس فیصد
لڑکیاں فرسٹ ڈویژن لائی ہیں۔ بھئی واہ وا۔ مگر سوال
یہ ہے کہ انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والی مسلم لڑکیوں
کی تعداد آخر کیوں نہیں بڑھ رہی؟ دانش مندان امروہہ
(جی ہاں وہاں ایک پورا محلہ دانش مندان ہے) ذرا بتائیں۔
نوازش ہوگی۔

امروہہ کے امام المدارس کالج سے ۱۹۷۶ء میں
ترسٹھ مسلم لڑکے انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہوئے تھے۔
۱۹۸۸ء میں باسٹھ شریک ہوئے۔ گویا بارہ سال میں تعداد
ایک عدد یا قریب دو فیصد گھٹ گئی۔ بہرحال عبدالکریم
خاں کالج سے اکتیس مسلم لڑکے شریک ہوئے۔ اس طرح
دونوں کالجوں میں ملا کر بارہ سال میں تعداد تیس عدد یعنی
قریب اڑتالیس فیصد بڑھ گئی۔ یوں سمجھیے کہ قریب ڈیڑھ
گنی ہو گئی۔ چلیے غنیمت ہے۔

سنبھل کے ہند کالج سے ۱۹۷۶ء میں بانوے مسلم لڑکے
انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہوئے تھے۔ ۱۹۸۸ء میں یہ تعداد
صرف پچھتر رہ گئی۔ سترہ عدد کی یہ کمی اکیس فیصد ہے۔ آبادیا
تو میاں لوگ کی بارہ برس میں چالیس فیصد بڑھ گئی ہوگی مگر
انٹر بورڈ امتحان میں شریک ہونے والے مسلم لڑکوں کی تعداد
اکیس فیصد گھٹ گئی۔ تو یوں سمجھیے کہ اس اعتبار سے سنبھل کے
مسلمان اس سطح پر بارہ برس پہلے "اغیار" سے جتنے پیچھے تھے

اب اس سے مزید دوگنا اور پیچھے ہو گئے۔ کیوں؟ بتائیں سنبھل کے کوئی لیڈر المسلمین صاحب جلدی سے۔

مرادآباد کے انصار کالج میں تعداد سترہ سے بڑھ کر اکتیس ۳۱ ہو گئی۔ چودہ عدد کا یہ اضافہ قریب بیاسی فیصد ہے۔ غنیمت ہے۔ مگر مرادآباد کے ہیوٹ مسلم انٹر کالج سے ابھی تک ۱۹۸۰ء کا رزلٹ ہی نہیں آیا۔ اس لیے پتہ نہیں وہاں کیا ہوا۔

ناقص العقل کون؟

ضلع مرادآباد کے ان تمام چھ کالجوں میں ملاکر ایک سو ترانوے میں سے تئیس ۲۳ یعنی قریب تیرہ فیصد مسلم لڑکیاں فرسٹ ڈویژن لائیں۔ مسلم لڑکوں کو اللہ تعالیٰ نے مسلم لڑکیوں سے کم عقل تو نہیں دی ہو گی۔ تو پھر ایک سو ننانوے مسلم لڑکوں میں سے بھی قریب پچیس کو فرسٹ ڈویژن لانی چاہیے تھی۔ مگر صرف ایک عدد فرزندِ ارجمند ملتِ اسلامیہ فرسٹ ڈویژن لائے۔ یعنی اس اعتبار سے ان کالجوں میں مسلم لڑکے مسلم لڑکیوں سے پچیس گنا پیچھے رہے۔ کوئی وجہ؟ ضلع مرادآباد کے لیڈر المسلمین حضرات جو ہر ایک ملی مسئلہ پر چہکتے رہتے ہیں، کچھ اس بابت بھی فرمائیں۔ دیکھیں کون سے والے کچھ فرماتے ہیں اور کیا فرماتے ہیں۔

• لوگو! تم میرے ساتھی ہو اور میں تمھارا ساتھی۔ میں اپنے دونوں دوستوں کے بعد تم پر خلیفہ بنایا گیا ہوں۔ موجودہ لوگ اپنے نفسوں کے ساتھ ہم سے ملے ہوئے ہیں اور جو لوگ دور ہیں انھیں اور تمھیں، ہم امین اور طاقت ور تصور کر کے رعایا کے انتظامات کے لیے مامور کریں گے۔ اس لیے لوگو! اللہ سے ڈرو اور خیانت کو کام میں نہ لاؤ۔ جو اچھائی کرے گا۔

ہم اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے اور جو برائی کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔ اللہ ہمارے اور تمھارے گناہوں کو معاف کرے۔ (اوائلِ خلافت میں ایک خطبہ)

حضرت عمر بن خطابؓ

مالک: علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ • پرنٹر پبلشر: اسرار احمد • مقام اشاعت: ادارہ تصنیف الاؤ
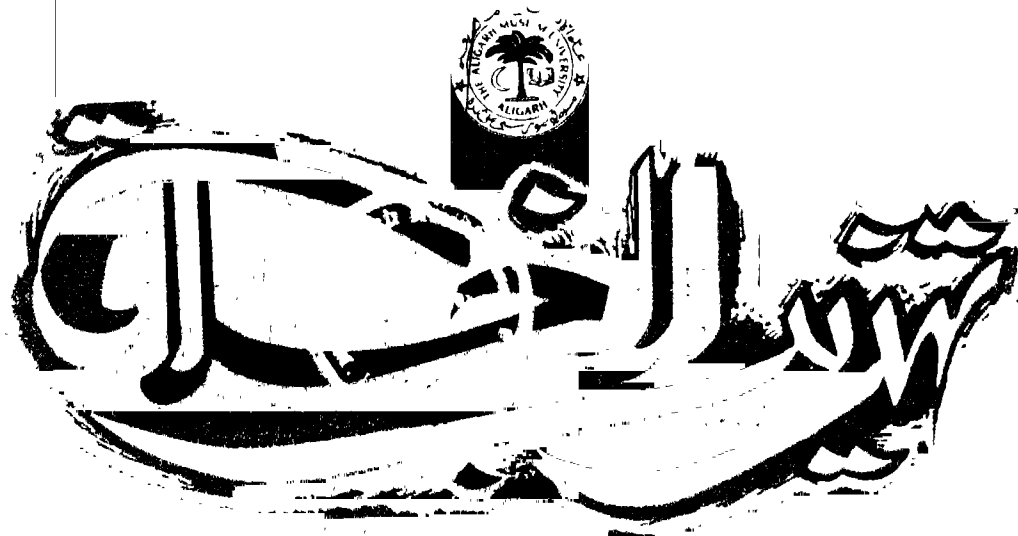
FOR PROMOTION OF SCIENCE
GIVING FUNCTION
PS TAHZIBUL AKHLAQ PRIZES
PROF. ABDUS SALAM
NOBEL LAUREATE

اغراض و مقاصد

۱. جہل، رجعت پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد۔ ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکر کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔

۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت۔

۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔

۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔

۶. سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷. علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلئے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالات کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، مزاح اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودے کاغذ کے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہونے چاہئے۔ پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنیوالے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

سرپرست : جناب سید ہاشم علی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

ایڈیٹر : اسرار احمد ——— جوائنٹ ایڈیٹر : کبیر احمد جائسی

اسسٹنٹ ایڈیٹر : شباب الدین

تزئین : سرفراز ——— انچارج سرکولیشن : مستقیم احمد

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ اسسٹنٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ & ASSISTANT,
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ
انڈیا Rs. 45.00
بیرونی ممالک ہوائی ڈاک US $ 20.00
عام ڈاک US $ 8.00

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ اسسٹنٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا)

مندرجات

اداریہ

نظامِ کائنات ہو یا انسانی زندگی دونوں کا مرکز اصلی قوانین کی پابندی ہے۔ یہ قوانین دو طرح کے ہیں خدائی قوانین اور انسانی قوانین۔ خدا، علیم مطلق ہے اس لیے خدائی قوانین میں تغیر و تبدّل نہیں ہوتا۔ دن کے بعد رات کا آنا، طفلی کا جوانی میں اور جوانی کا بوڑھاپے میں بدل جانا، زندگی کے بعد موت کا آنا، سخت تپش کے بعد آندھیوں کا چلنا، زمین اور سورج کے درمیان کے فاصلے کے گھٹنے بڑھنے سے موسموں کا تبدیل ہوتے رہنا، خدائی قوانین کے مظاہر ہیں۔ علیم مطلق نے جو قوانین وضع کر دیے ہیں زمان (TIME) مکان (SPACE) اور حالات کی تبدیلی کے باوجود ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ قوانین ازلی بھی ہیں اور ابدی بھی لیکن انسان کے وضع کردہ قوانین زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ خود بھی تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک قانون انصاف کا تقاضہ پورا کرنے والا ہوتا ہے تو دوسرے زمانے میں ناانصافی کی علامت بن جاتا ہے۔ انسان کی فکر و نظر دونوں ہی محدود ہے وہ ایک حد سے آگے نہ تو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی اس سے آگے کی اشیا اور مسائل کا ادراک کر سکتا ہے، اسی لیے اس کے وضع کردہ قوانین میں کوئی نہ کوئی ایسی کمی رہ جاتی ہے جس کی بنا پر حالات اور زمانے کے بدلتے ہی ان کی معنویت اور افادیت ختم ہو جاتی ہے اور انسان اپنے تجربات کی بنیاد پر دوسرے قوانین وضع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ قوانین ہوتے ہیں جو کبھی تو پرانے قوانین میں ترمیم کرتے ہیں یا ان کی توسیع اور کبھی حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ ان کی تنسیخ کرنی پڑتی ہے۔ انسانی زندگی کا یہ عمل روزِ اوّل سے جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔

گذشتہ سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ انسانی قوانین پر عمل نہ کرنا آزادیٔ فکر و نظر کی علامت ہے۔ آزادیٔ فکر و نظر کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم مگر یہ آزادی انسانی قوانین سے روگردانی کر کے نہیں بلکہ اس کی پابندی کر کے حاصل کی جاتی ہے۔ اگر انسانی قوانین کا احترام ہمارے دلوں سے نکل جائے گا تو ہمارا معاشرہ حیوانی بن کر رہ جائے گا، جہاں درندے چرندوں کو پھاڑ کھاتے ہیں اور چرندے حالتِ غیظ و غضب میں اپنے ہی ہم جنسوں کو مار مار کر ہلاک کر دیا کرتے ہیں جس کی نہ کوئی داد ہوتی ہے نہ فریاد، ایک کی ہلاکت کے

بعد توپا کا پورا گلا گھونٹنے میں معروف ہو جاتا ہے اور آپس میں ایسی گلیاں کرتا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہماری آزادیٔ فکر و نظر جن قوانین کی پابند ہے اُن میں مرکزی حکومت، صوبائی حکومت اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے قوانین خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ بریں ہر شخص کے محلِ کار کے بھی قوانین ہیں، اسپتال کے قوانین فیکٹری کے قوانین سے الگ ہیں اور فیکٹری کے قوانین تعلیمی اداروں کے قوانین سے بالکل مختلف۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ایک جگہ کا قانون دوسری جگہ لاگو کیا جائے مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی سماج حکومت اور ادارہ قوانین کے بغیر اپنے آپ کو باقی رکھ سکے۔

افراد ہوں یا جماعتیں، حکومتیں ہوں یا ادارے ([illegible]) سب ہی کی بقا خدائی اور انسانی قوانین کی پابندی سے جڑی ہوئی ہے۔ پابندی کی زنجیر کی ایک کڑی بھی اپنی جگہ اگر کمزور یا ڈھیلی ہو جاتی ہے تو اس کا اثر پوری زنجیر پر پڑتا ہے، زنجیر کی کمزوری سے خود اس پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا مگر آزادی بیشتر حالات میں مجروح ہوئے بغیر نہیں رہتی اس لیے ہمارا خیال ہے کہ آزادیٔ کامل حاصل کرنے کے لیے خدائی اور انسانی قوانین کی زنجیر میں جکڑ جانا ہی انسانیت کی معراج ہے۔ اس زنجیر سے رُوگردانی کر کے نہ تو دنیا ہی کا حصول ممکن ہے اور نہ ہی آخرت کا۔

انسانی زندگی مختلف اداروں کے گرد گھومتی ہے ان میں عدلیہ، انتظامیہ، مقننہ، رفاہی، تفریحی اور تعلیمی سب ہی ادارے شامل ہیں۔ یہ سارے کے سارے ادارے اپنے اپنے قوانین وضع کرنے میں تو آزاد ہیں مگر ان کو بھی ایک آئین کے دائرے میں رہ کر قوانین وضع کرنے ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ادارہ کسی مقام پر اور کسی زمانے میں اور کسی بھی حالت میں آئین کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اگر ان کو زمانہ، مقام اور حالات کے تحت کوئی قانون وضع کرنا ہوتا ہے تو پہلے آئین میں ترمیم کر کے اس قانون کو آئین کے دائرے میں لایا جاتا ہے تب کہیں جا کر اس کو نافذ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جہاں ووٹوں کی سیاست کارفرما ہوتی ہے وہاں آئین میں تبدیلی کا عمل برابر جاری رہتا ہے اور روز روز نئے قوانین بنا اور پرانے بگڑا کرتے ہیں۔ اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس تغیر و تبدل کا مقصد حالات میں اصلاح نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن ہمارے سارے کے سارے ادارے سیاست کے گرد گردش نہیں کرتے، اُن کا مقصد اور نصب العین سیاست کے مقصد اور نصب العین سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایسے ہی اداروں میں سب سے اہم ادارہ وہ ہے جس کو تعلیمی ادارہ کہا جاتا ہے۔ اس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سیاست کا فنی اور نظری مطالعہ تو ضرور کرتا ہے مگر عملی سیاست کی ریشہ دوانیوں سے اپنے آپ کو حتی الامکان محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں جو انسانی قوانین وضع کیے جاتے ہیں ان کا تعلق ووٹوں کی سیاست سے نہیں تعلیمی مقاصد سے ہوتا ہے اور یہ قوانین برسوں کے غور و فکر اور تجربات کے بعد وضع کیے جاتے ہیں جن میں تغیر و تبدل کی رفتار بہت سست ہوتی ہے۔ تعلیمی ادارے کی اکائی کو چند چھوٹی چھوٹی اکائیاں مل کر تشکیل دیتی ہیں جن کے الگ الگ اختیارات ہیں۔ ان اکائیوں میں یونیورسٹی کورٹ، ریاستی

مجلسِ انتظامیہ، مجلسِ تعلیمی، فیکلٹی اور شعبوں کی بورڈ آف اسٹڈیز سب ہی شامل ہیں۔ ان سب اکائیوں کے دائرۂ کار متعین ہیں اور کوئی بھی اکائی کسی دوسری اکائی کے کاموں میں آئین سے ہٹ کر دخل درمعقولات نہیں کرتی، اسی وجہ سے سیاسی شکست و ریخت کے باوجود تعلیمی اداروں کا وجود ابھی تک اپنی اپنی جگہ پر برقرار ہے اور ملک میں تعلیم و تدریس کا کام دوسرے اداروں (INSTI-TUTIONS) کے مقابلے میں بدرجہا بہتر انداز سے ہو رہا ہے، یہ سب کچھ ہے مگر اب جمہوریت کے نام پر ووٹوں کی سیاست ہماری زندگی میں اس طرح دخیل ہو گئی ہے کہ اس کے منحوس سایے تعلیمی اداروں پر بھی منڈلانے لگے ہیں۔ ووٹوں کی سیاست میں قوانین کی نہیں ووٹوں کی بالادستی ہوتی ہے اور قوانین کی خود ساختہ تعبیر ووٹوں کو حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ، لیکن اپنی ساخت اور مقصد کے اعتبار سے تعلیمی ادارے ووٹوں کی سیاست کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر بہ جبر و اکراہ تعلیمی اداروں کو ووٹوں کی سیاست سے پیوست کر دیا گیا تو وطنِ عزیز میں اگرچہ کسی چیز کی کوئی کمی نظر نہ آئے گی مگر حقیقی و واقعی تعلیم عنقا ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ تعلیمی اداروں کی اکائیاں ووٹوں کی سیاست کی ریشہ دوانیوں سے دور رہیں، ایک دوسرے کے کاموں میں آئین سے ہٹ کر مداخلت نہ کریں اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں رہ کر تعلیم اور صرف تعلیم کی پیش رفت کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ اسی میں خود مذکورہ اکائیوں کا بھلا ہے اور تعلیمی اداروں کا بھی۔ اگر خدانخواستہ سیاسی اداروں کے پروردہ ووٹوں کی سیاست کے عفریت نے تعلیمی اداروں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا تو بس سمجھ لیجیے کہ وطنِ عزیز سے دانش وری رخصت ہوئی اور وہ لوگ جو دانشوری کو عزیز رکھتے ہیں، اسی کے لیے جیتے اور مرتے ہیں، اُن کے لیے اب وقت آگیا ہے کہ میدانِ عمل میں مردانہ وار نکل آئیں اور اس عفریت سے اُن اداروں کو بچائیں جو آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت کے ضامن ہیں۔ یاد رکھیے اگر ایک بار بھی تعلیمی اداروں کا خون مروجہ ووٹوں کی سیاست کے عفریت کے منہ لگ گیا تو پھر یہ پوری کی پوری بستی بے چراغ ہو کر رہ جائے گی اور ترقی یافتہ ممالک کے تعلیم یافتہ افراد اس کو نمونۂ عبرت کے طور پر پیش کریں گے۔ ہم پیشرفت کی راہ پر گامزن ہونا چاہتے ہیں یا نمونۂ عبرت بننا پسند کرتے ہیں؟ یہ فیصلہ تو اب ہو ہی جانا چاہیے۔

رشک و حسد کی حقیقت

اور اس کا علاج

سر سید احمد خاںؒ

حسد کرنے کو جلنا کہتے ہیں اور وہ یہ ہوتا ہے کہ خدا
تعالیٰ جب کسی شخص کو کسی قسم کی نعمت مرحمت فرماوے دوسرا
شخص اس کو دیکھ کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاوے اور درپے
اس بات کے ہو کہ وہ نعمت اس کی جاتی رہے اور وہ شخص بھی اس
کی مانند بلکہ اس سے گھٹ کر ہو جاوے۔ اس خواہش کا نام
حسد ہے جو حسد سے زیادہ مذموم ہے۔ کیوں کہ کسی شخص
کی عظمت و دولت وغیرہ کو دیکھ کر جلنا اور اس کے زوال
کا خواہاں ہونا حقیقت میں خدا تعالیٰ کی حکمت اور مرضی سے
آزردہ ہونا اور اس کو بُرا سمجھنا ہے لیکن اگر بجائے اس
خواہش کے کہ دوسرے شخص کی نعمت جاتی رہے یہ آرزو ہو
کہ جیسی کچھ نعمت دوسرے کو حاصل ہے مجھ کو بھی حاصل ہو
اور اس کی اس کا نصیب ہے اس کو حسد نہیں کہتے بلکہ غبطہ
کہتے ہیں اور یہ خواہش اگر نیک کاموں کے کرنے میں ہو تو
نہایت عمدہ اور پسندیدہ ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کو خدا
تعالیٰ دولت اور علم دونوں مرحمت فرماوے اور وہ اپنی
دولت کو علم کی ہدایت کے موافق نیک کاموں میں لگاوے
اور ایک شخص کو جناب باری سے صرف دولت ملے اور
علم سے محروم رہے مگر اس عالم ذی دولت کے کاروبار
کو دیکھ کر جلے اور جی چاہے کہ اگر مجھ کو بھی اس کا سا
علم حاصل ہوتا تو میں بھی ایسے ہی اپنی دولت سے کام لیتا تو
یہ دونوں نیکی میں برابر ہوں گے۔ پس اس قسم کی خواہش مذموم
نہیں بلکہ از بس محمود ہے۔ ہاں ایک موقع ایسا بھی ہے کہ اس میں
ایک شخص کی دولت اور نعمت کا زوال چاہا جاوے اور وہ حسد
نہ ٹھہرے۔ یعنی اگر کوئی کسی ظالم کی دولت کا زوال چاہے جس
کے بل پر وہ ظلم و تعدی کرتا ہو تو یہ حسد نہ ہوگا۔ کیوں کہ حقیقت
میں اس کی دولت اور نعمت کا جاتا رہنا ظلم کا مٹ جانا ہے
جو ہمیشہ قابل خواہش ہے۔

اس مرض مہلک یعنی حسد کا علاج یہ ہے کہ اس کی
خرابیوں اور برائیوں میں غور کرے کہ اس کے کیا کیا نتیجے حاصل
ہوتے ہیں۔ جب یہ ظاہر اور ثابت ہووے کہ یہ ایک ایسا خیال
ہے جس سے سوائے مضرت کے کسی قسم کا تھوڑا یا بہت کچھ
کسی طرح کا فائدہ نہیں تو خواہ مخواہ آدمی کو اس سے نفرت
ہوگی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ حسد سے ایسا رنج و الم، غم و
غصہ ہر دم ہمیشہ رہتا ہے کہ اس سے کسی طرح چھٹکارا نہیں
یعنی اگر کسی کو بامراد پایا یا غم و اندوہ جی میں سمایا کہ اس کو کیوں
ایسی اور ایسی نعمتیں حاصل ہیں، یہ مجھ کو حاصل ہوتیں۔ کوئی
صورت ایسی ہو کہ اگر مجھ کو بھی نہ ملیں تو یہ ان سے ضرور محروم
ہو جاوے۔ اب غور سے دیکھا جاوے تو محسود بے کھٹکے
خوش و خرم ہے اور حاسد بلا وجہ مغموم اور ملول جو نعمت
دوسرے کے لیے چاہتا ہے وہ خود اسی کو حاصل ہے۔ اس سے

اس سے زیادہ اور کیا حقیقت ہوگی کہ دشمن کے لیے اپنا رنج اٹھاوے۔ ناحق اپنا دل جلاوے اور اس کا کچھ بھی ہرج نہ ہو۔ حسد سے اس کی نعمت میں کچھ بھی نہیں گھٹ سکتا۔ کیوں کہ خدائے تعالےٰ نے جو جس کا حصہ ٹھہرایا اور جس قدر مدت اس کی مقرر فرمائی ہے اس میں کسی طرح فرق نہیں آسکتا، بلکہ چاہ کن راہ چاہ درپیش ہو جاتا ہے۔ جو ناحق کسی کی برائی چاہے وہ اس کے ہی آگے آتی ہے۔ نقل ہے کہ ایک بادشاہ کا ایک شخص نیک بخت پاک دامن مصاحب تھا، ہر روز بادشاہ کی خدمت میں جاتا یہ نصیحت کرتا کہ نیکوں کے ساتھ نیکی کر اور بدوں سے ان کی بدی کا بدلہ مت لے۔ ان کو ان کی حالت پر چھوڑ کہ بدکردار کو اس کی بدکرداری کافی ہے۔ بادشاہ اس کی اس بات کو پسند رکھتا تھا۔ اتفاقاً ایک شخص کو اس سے حسد ہوا۔ حاسد اس کی تخریب کے درپے ہوا۔ بادشاہ سے موقع پاکر کہا کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ بادشاہ کے منہ میں بو آتی ہے۔ بادشاہ نے فرمایا، اس کا ثبوت کیا ہے اس نے کہا: اس کو اپنے قریب بلاؤ اور دیکھو کہ وہ اپنی ناک پر ہاتھ رکھتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ سے گفتگو کرنے میں ناک پر ہاتھ رکھے رہے تو یقین کیجیے۔ بادشاہ کے ذہن میں یہ بات بٹھا کر حاسد نے اس نیک نہاد کو کھانے میں لہسن کھلا دیا۔ بادشاہ نے جب اس کو اپنے پاس بلایا، وہ اس خیال سے منہ پر ہاتھ رکھ کر قریب کو آیا کہ بادشاہ کو اس کے منہ کی بو نہ پہنچے۔ بادشاہ کو یہ حالت دیکھ کر حاسد کے قول کا یقین آیا۔ بادشاہ کی عادت یہ تھی کہ جب کسی کو خلعت گراں بہا یا کوئی بڑی جاگیر عنایت فرماتا تو اس کی سند اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اس وقت اپنے خاصوں میں سے ایک شخص کے نام ایک رقعہ اس مضمون کا لکھا کہ حامل رقعہ کا فوراً سر قلم کرکے اور اس کی کھال میں بھس بھروا کر حضور میں بھیج دو۔ اور اس کو سربمہر کرکے اس بے چارہ بیگناہ کو دیا کہ فلاں شخص کے پاس پہنچا دو۔ وہ اس لفافے کو لے بادشاہ کے حضور سے رخصت ہو کر باہر آیا۔ اتفاقاً حاسد سے ملاقات ہوئی۔ اس نے فرمان شاہی دیکھ کر دریافت کیا کہ اس میں کیا حکم ہے۔ محسود نے جواب دیا کہ خلعت گراں بہا مرحمت ہوا ہے۔ اس نے درخواست کی کہ یہ مجھ کو بخش دو۔ اس نے دے دیا۔ جب وہ لفافہ لے کر مکتوب الیہ کے پاس پہونچا، اس نے پڑھ کر کہا، اس میں حکم ہے کہ حامل رقعہ کا سر قلم کرکے کھال میں بھس بھروا دو۔ یہ سن کر گھبرایا اور واویلا کی کہ یہ تو دوسرے شخص کی نسبت لکھا تھا۔ تم بادشاہ سے دریافت کر لو۔ اس نے کہا کہ مجھ کو اجازت نہیں کہ میں اس معاملہ میں بادشاہ سے کچھ عرض معروض کروں اور فوراً اس کو قتل کر ڈالا۔ دوسرے روز وہ شخص محسود بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا اور وہی معمولی نصیحت کی۔ بادشاہ کو تعجب ہوا۔ دریافت فرمایا کہ وہ لفافہ تم نے کیا کیا۔ اس نے جواب دیا کہ فلاں شخص نے مجھ سے مانگ لیا بادشاہ نے فرمایا کہ تم نے اس سے یہ کہا تھا کہ بادشاہ کے منہ میں بو آتی ہے۔ اس نے انکار کیا۔ بادشاہ نے ناک اور منہ پر ہاتھ رکھنے کا سبب پوچھا۔ اس نے بیان کیا کہ مجھ کو اس نے لہسن کھلا دیا تھا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ یہ قول تمہارا صادق آیا کہ بدکردار کو اس کا فعل ہی کفایت کرتا ہے۔ اس نے جیسا کیا ویسا پایا۔

تماشا یہ ہے کہ حسد سے محسود کو بجائے ضرر پہونچنے کے فائدہ ہوتا ہے۔ یعنی غور کرو تو اس کی خواہش اور خوشی یہ ہوگی کہ اس کا بدخواہ ہمیشہ تکلیف میں رہے۔ بس حسد کے رنج سے زیادہ اور کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ سوائے حاسد کے کوئی ظالم ایسا نہ دیکھا ہوگا جو بسبب اپنے ظلم کے آپ ہی مظلوم ہو اگر محسود کو حاسد کے مرنے کی خبر پہونچے تو وہ ضرور اس سبب سے ملول ہوگا کہ اس کا دشمن حسد کی بلا سے چھوٹ گیا۔ کیونکہ اس کی دلی خواہش یہ ہوگی کہ وہ نعمت میں ہمیشہ محسود رہے اور حاسد حسد کے رنج میں مبتلا رہے۔ عجیب لطف کی بات ہے کہ حاسد محسود کی دولت و نعمت کا زوال چاہتا ہے اور وہ زائل نہیں ہوتی بلکہ آپ ہی رنج میں گرفتار اور تمام لوگوں کی نظر میں ذلیل و خوار رہتا ہے اور اس صفت ذمیمہ

کے سبب سے کوئی شخص اس کی طرف التفات نہیں کرتا۔ سب کم حوصلہ اس کو سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتا تو یہ ہے کہ میں فلاں شخص کا دشمن ہوں اور حقیقت میں اپنا ہی دشمن ہوتا ہے اور اس کا دوست۔ حاسد کی وہی مثل ہے کہ ایک شخص اپنے دشمن کے پتھر پھینک کر مارے اور اس کے نہ لگے بلکہ کسی سخت چیز میں لگ کر الیا اوچٹ کر آوے کہ اس کی آنکھ پر لگے اور وہ اور زیادہ جھنجھلا کر پھر زور سے پتھر مارے اور وہ اُسی طرح اوچٹ کر اس کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دے اور وہ اور بھی زیادہ غصہ میں آکر پتھر مارے اور وہ بھی اوچٹ کر اسی کے سر میں ایسا لگے کہ سر پھٹ جاوے۔ دشمن تو سلامت رہے اور وہ چوٹ پر چوٹ کھاوے۔ پس جس کسی کو خدا تعالیٰ نے کچھ بھی عقل و تمیز عنایت کی ہوگی اور وہ حسد کی حقیقت کو سمجھ لے گا تو ضرور اس سے اجتناب کرے گا۔ علاوہ اس کے مرض حسد کا ایک علاج یہ ہے کہ حسد کے اسباب کی دل میں سے بیخ کنی کرے اور وہ کبر و عجب نخوت و عداوت اور جاہ و حشمت اور مال و دولت کی محبت وغیرہ ہیں اور جو کچھ حسد کا مقتضی ہوا کرے اس کے برخلاف عمل کرے۔ مثلاً حسد کی راہ سے کسی کو لعنت و ملامت کرنے کا خیال آوے تو اس کی صفت اور ثنا کرنے لگے۔ اگر تکبّر کا ارادہ ہو تو تواضع اور فروتنی جتاوے۔ کسی کی نعمت و دولت کے زوال کے درپے ہونے کو جی چاہے تو اس کی زیادتی میں کوشش کرے اور اس سے بہتر کوئی علاج نہیں کہ محسود کی غیبت میں اس کی تعریف کرے جس سے یہ حاصل ہوگا کہ وہ سن کر خوش ہوگا اور اس کے دل میں محبت پیدا ہوگی اور اس کی محبت کا اثر اس کے دل میں بھی ہوگا اور انجام کو دوستی ہو جاوے گی اور حاسد کو اس بات کا بھی خیال چاہیے کہ یہ حسد وہ چیز ہے جس کے سبب سے برادرانِ یوسف نے اپنے بھائی یوسف کے ساتھ حسد کر کر کیا نتیجہ اٹھایا اور قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو جو قتل کیا اور آخر کو ذلیل اور شرمندہ ہوا منشا اس کا یہی حسد تھا۔ شیطان نے جو حضرت آدم سے حسد کیا، مردود خلائق ہوا، کیا پھل پایا۔ ان باتوں کو غور کر کر اس صفت نکوہیدہ سے دل سے قرار ہوے اور سمجھے کہ وہ چیز کہ جو محض خوار و ذلیل کرے اور کسی طرح کا فائدہ اس پر مترتب نہ ہو عاقل کی شان سے اس کا ارتکاب بس نازیبا ہے۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے دور رہتے ہیں۔ نماز قایم کرتے ہیں، زکواۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔"

(سورہ توبہ ۷۱)

سی پی ایس ۔ تہذیب الاخلاق انعامات ۱۹۸۷ء

برائے

عام فہم سائنسی مضمون نگاری

کے

جلسہ تقسیم انعامات منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۸۹ء

کی

مکمل روداد

استقبالیہ اور تعارفی خطبہ	پروفیسر اسرار احمد
تہذیب الاخلاق اور سائنسی مضامین	جناب سید حامد
سائنس، ٹکنالوجی اور تیسری دنیا	پروفیسر عبدالسلام
صدارتی خطبہ	جناب سید ہاشم علی

رپورٹ

سی۔پی۔ایس تہذیب الاخلاق انعامات (۱۹۸۷ء) برائے عام فہم سائنسی مضمون نگاری کی تقسیم کا جلسہ ۱۳ مئی ۱۹۸۹ء کو یونیورسٹی کے کینڈی ہال میں منعقد ہوا۔ انعامات کو مہمان خصوصی اور اردو دنیا کے واحد نوبل انعام یافتہ سائنس داں پروفیسر عبدالسلام نے تقسیم کیے۔ اس موقع پر جناب حکیم عبدالحمید صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد اور تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کے بانی اور سابق وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب بھی موجود تھے۔ جلسے کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب نے کی۔ جلسے کا آغاز کلام پاک کی تلاوت سے ہوا۔ اس کے بعد سینٹر فار پروموشن آف سائنس کے ڈائرکٹر اور تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت کے ایڈیٹر پروفیسر اسرار احمد نے استقبالیہ اور تعارفی خطبہ پیش کیا۔ بعدازاں ڈاکٹر کبیر احمد جائسی جوائنٹ ایڈیٹر تہذیب الاخلاق نے پروفیسر عبدالسلام کو ماہنامہ تہذیب الاخلاق کا خصوصی شمارہ پیش کیا جو ان کی آمد کے موقع پر شائع کیا گیا تھا۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق صدر اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے پروفیسر عبدالسلام کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ سرور صاحب کی نظم خوانی کے بعد جناب سید حامد صاحب نے تہذیب الاخلاق اور سائنسی مضمون نگاری پر ایک پر اثر خطبہ دیا۔ اس کے بعد مہمان خصوصی پروفیسر عبدالسلام نے از راہِ کرم مختلف انعامات تقسیم کیے۔

انعامات کی تقسیم کے بعد پروفیسر موصوف نے سائنس و ٹکنالوجی اور تیسری دنیا کے موضوع پر اپنا معلوماتی اور "خواب گراں" سے بیدار کرنے والا لکچر دیا۔

صدارتی خطبہ وائس چانسلر صاحب نے دیا جو کافی اثر انگیز تھا۔

پروگرام کو ڈاکٹر فرحان مجیب، جوائنٹ ڈائرکٹر مرکز فروغ سائنس نے کنڈکٹ کیا جنھوں نے سارے معاونین اور مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔ آخر میں یونیورسٹی کے طلبا نے ہلکی موسیقی پر یونیورسٹی ترانہ اور قومی ترانہ پیش کیا۔

انعام یافتگان

سی پی ایس - تہذیب الاخلاق انعامات

اسمائے گرامی		انعامی رقم (روپیے میں)
جناب امتیاز احمد	علی گڑھ	1500/-
حکیم الطاف احمد اعظمی	دہلی	1500/-
جناب یوسف سعید	دہلی	1500/-
ڈاکٹر عبدالقیوم	علی گڑھ	1500/-
حکیم سمیع الرحمن خاں	علی گڑھ	1500/-
جناب فہیم نعمانی	کلکتہ	1500/-

(ب) خصوصی انعامات

جناب آصف نقوی	دہلی	500/-
جناب صغیر افراہیم	علی گڑھ	500/-
ڈاکٹر مختار احمد	علی گڑھ	500/-
جناب صفی اختر	دربھنگہ	500/-

(ھ) تشویقی انعامات

جناب اختر حسین آفتاب	پٹنہ	250/-
جناب ابراہیم خلیل جوہر	سنبھل	250/-
جناب اسرار حسین و جناب صغیر افراہیم	علی گڑھ	250/-
جناب نسیم اختر السادات و جناب مسرور خان	علی گڑھ	250/-

سی ۔ پی ۔ ایس ۔ تہذیب الاخلاق انعامات کے جلسۂ تقسیم انعامات کی ایک جھلک

نارتھ ایس۔ایس ہال کے طلبہ نے ایک فنکشن کا اہتمام کرکے مہمان خصوصی پروفیسر عبدالسلام پر پھولوں کی بارش کی۔

پروفیسر عبدالسلام مشہور مصوّر خطاط سرفراز کے ساتھ ان کی پینٹنگ کا معائنہ کرتے ہوئے۔

پروفیسر اسرار احمد ڈائرکٹر سنٹر فار پروموشن آف سائنس، ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات اور صدر شعبۂ طبیعیات نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔

سابق وائس چانسلر و بانی تہذیب الاخلاق ٹرسٹ جناب سید حامد سامعین سے خطاب کرتے ہوئے
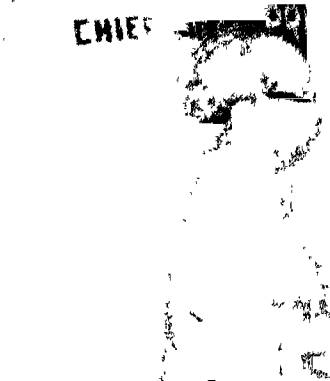
پروفیسر عبدالسلام نے سائنس ٹکنالوجی اور تیسری،
کے موضوع پر لکچر دیا۔

وائس چانسلر جناب سید هاشم علی صاحب۔ صدارتی خطبہ
پیش کرتے ہوئے۔

انعام یافتگان

سامعین

استقبالیہ اور تعارفی خطبہ

اسرار احمد*

محترم جناب پرو چانسلر صاحب، عالی جناب وائس چانسلر صاحب، جناب پرو وائس چانسلر صاحب، محترم مہمان خصوصی پروفیسر عبد السلام صاحب، جناب حکیم عبد الحمید صاحب، جناب سید حامد صاحب، دیگر معزز مہمان خواتین و حضرات۔

بلا شبہ میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ آج مجھے اس برصغیر کے ایک لائق ترین فرزند، عالمی شہرت کے ایک بڑے اور تیسری دنیا کے سب سے بڑے سائنس داں پروفیسر عبد السلام کے خیر مقدم کی سعادت ملی۔ مزید فخر کی بات یہ ہے کہ طب یونانی کے مسیحا جناب حکیم عبد الحمید صاحب کے خیر مقدم کا بھی موقع نصیب ہوا جن کی بالا قدری اپنی مثال آپ ہے۔ یہ بھی میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ اپنے سابق وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب کا خیر مقدم کروں جن کے خلوص، ایثار اور دردمندی نے اس یونیورسٹی کی مسیحائی کی، جن کے دور میں مسلمانان ہند کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کئی مفید پروگرام شروع ہوئے اور جنھوں نے سرسیدؒ کے تہذیب الاخلاق کو دوبارہ جاری کیا۔ میں ان تمام بزرگ و مقتدر ہستیوں، دوسرے معزز مہمانوں اور یہاں موجود تمام حضرات کو سینٹر فار پروموشن کی جانب سے اور اپنی جانب سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

مسلم دنیا کے واحد اور تیسری دنیا کی شہرت کے حامل واحد زندہ نوبل انعام یافتہ سائنس داں پروفیسر عبد السلام کے تعارف کا فریضہ ادا کرنا اور وہ بھی مسلم یونیورسٹی میں، ایک عجیب سی بات ہے، لیکن اس خیال سے کہ اس میں سائنس کے نوجوان طلبا کے لیے بڑا سبق ہے، میں پروفیسر عبد السلام کی مجاہدانہ زندگی کی کتاب کے چند تابندہ اوراق کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

پروفیسر عبد السلام کی پیدائش ۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء میں آج کے پاکستان میں واقع قصبہ جھنگ میں ہوئی۔ آپ نے ۱۹۴۶ء میں لاہور سے ریاضی میں ایم۔ ایس سی اور ۱۹۵۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے نظریاتی طبعیات میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ کا شاندار تعلیمی ریکارڈ اپنی مثال آپ ہے آپ نے تقریباً ہر امتحان میں اوّل مقام حاصل کیا۔ آپ پر انتہائی کم عمری سے ہی انعامات اور خطابات کی بارش شروع ہو گئی اور آپ نے اب تک ۲۵ سے زیادہ بین الاقوامی شہرت کے حامل علمی ایوارڈ حاصل کیے ہیں جن میں مشہور نوبل انعام

---

* چیرمین ڈپارٹمنٹ آف فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ (یو۔ پی)

بھی ہے۔ آپ کے اعلیٰ علمی کارناموں کے اعتراف میں دنیا کی تقریباً تیس بڑی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری آپ کی خدمت میں پیش کی ہے، جن میں سے ایک ہماری یونیورسٹی بھی ہے آپ کم عمری ہی میں رائل سوسائٹی آف لندن کے فیلو منتخب ہوگئے اور اب تک آپ کو دنیا کی تیس سے زیادہ اعلیٰ اکیڈمیوں اور سوسائٹیوں نے اپنا فیلو منتخب کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ اپنے ملک پاکستان اور اقوام متحدہ کے کئی اہم عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔

پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے ذہین افراد کی ترقی یافتہ مغربی ممالک کو ہجرت شروع ہی سے پروفیسر عبدالسلام کے لیے پریشان کن اور تشویش کی بات رہی ہے۔ آپ مستقل اس کوشش میں رہے کہ کسی طور ان اسباب کو دور کیا جائے جو ہجرت کے باعث ہیں۔ اس غرض سے آپ نے ۱۹۶۴ء میں اٹلی کے شہر ترییستے میں اقوام متحدہ کی مدد سے نظریاتی طبیعیات کا ایک بین الاقوامی مرکز قایم کیا۔ یہ ایک عام مرکز نہیں ہے بلکہ ذہین سائنس دانوں کا ایک جنکشن ہے، جہاں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے سائنس داں ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ اس مرکز کے قیام اور اس کی مفید کارکردگی سے پروفیسر عبدالسلام کو خصوصی شہرت ملی۔ تیسری دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کے سلسلے میں آپ کا ایک شاندار کارنامہ تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کا قیام بھی ہے۔ یہ اکیڈمی ۱۹۸۴ء میں قایم ہوئی اور مختصر عرصے میں اس نے تیسری دنیا میں سائنس کے لیے مسیحائی کا کام کیا ہے۔

پروفیسر عبدالسلام بنیادی طور پر ایک ایسے فلسفی ہیں جن کے فکر و عمل کا محور وحدت ہے۔ وہ خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں اور کائنات میں کارفرما قوتوں اور انسانیت کی وحدت میں یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے یہ تعجب کی بات نہیں کہ جب بھی انسانیت کے کسی گوشے پر ظلم ہوتا ہے تو وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ آپ دل سے شاعر، دماغ سے سائنس داں اور مزاج سے ایک صوفی ہیں۔

زمانے نے نہ جانے کتنی عظمتوں کو دیکھا ہے اور ابھی نہ جانے کتنی اور عظمتوں کو دیکھے گا لیکن عظمتوں کا وہ جمگھٹ جو پروفیسر عبدالسلام کی شخصیت میں ہے اسے شاید ہی پھر کبھی اور دیکھنے کو ملے۔ اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور رہیں گے کہ یہ آپ کی ہم پر بڑی نوازش ہے کہ آپ یہاں تیسری بار آئے۔

اب میں سینٹر فار پروموشن آف سائنس کا مختصر سا تعارف پیش کروں گا جس کے زیر اہتمام انعامات کی تقسیم کا یہ جلسہ ہو رہا ہے۔ یہ سینٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کے سیکشن 5(2)(r) کے تحت قایم کیا گیا ہے جس سے یونیورسٹی کو یہ اختیار ملا ہے کہ وہ بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و ثقافت کے میدان میں پیش رفت کو تیز تر کرے۔ اس مرکز کا قیام سابق وائس چانسلر جناب سید حامد کے دور کے آخری دنوں میں ہوا اور اسے موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی کی بھرپور سرپرستی اور موجودہ پرو وائس چانسلر پروفیسر ذکی الرحمن کا پورا تعاون حاصل ہے۔ اس سینٹر کا قیام ہماری سیکولر حکومت کی اس پالیسی کے سلسلے کی ایک کڑی بھی ہے جس کا مقصد مسلم اقلیت کو عصری علوم کے میدان میں آگے بڑھانا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے حوالے سے اس مرکز کے قیام کی غرض و غایت مختصراً یہ ہے کہ سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت سے لوگوں کو واقف کرایا جائے، سائنسی تعلیم کی ترویج کی جائے اور سائنسی طرز فکر کو عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس مرکز کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ مختلف اسباب کی بنا پر ملک میں سائنس کے میدان میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر یہ صورت حال زیادہ دنوں تک برقرار رہی تو اس سے ملک کی صحت مندانہ ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ آج کے دور میں جب سائنسی علوم برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں اور ان سے نئی نئی ٹکنالوجیاں وجود میں آرہی ہیں تو کوئی طبقہ اس [illegible]

[illegible] سائنس سے [illegible] ہے اور نہ ہی کوئی کمیونٹی سائنسی علوم کو [illegible] کے بغیر ایک باوقار [illegible] حاصل کر سکتی ہے۔

[illegible] ہمارے [illegible] میں مرکز نے مسلم اداروں کی ڈائرکٹری [illegible] اور سروے کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک درجن تجدیدی کورسوں کا اہتمام کیا ہے۔ یہ سارے کورس مسلم زیر انتظام اسکولوں کے سائنس اور ریاضی کے اساتذہ کے لیے سائنس کے تعارفی [illegible] کورسز کا اہتمام کرتا ہے جسے سینٹر نے ابھی حال میں ہی شروع کیا ہے۔

دینی مدارس میں سائنسی تعلیم کی ترویج کے ہمارے پروگرام کی ابتدا یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی کی ایک پُردرد اپیل سے ہوئی جسے خط کی شکل میں مدارس کے سربراہوں کے نام بھیجا گیا۔ اپنی اس پر اثر اپیل میں وائس چانسلر صاحب نے مدارس کے ارباب اختیار سے یہ کہا کہ وہ سائنس اور ریاضی کو مدارس کے نصاب میں داخل کرنے کی بابت غور کریں۔ انہوں نے یہ بھی یاد دلایا کہ ماضی میں مسلمان سائنسی علوم کے میدان میں دنیا کے امام تھے اور یہ کہ سائنس اور اسلام میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ عام توقع کے برخلاف اس خط کا بڑا اثر ہوا۔ ارباب مدارس کے درجنوں خطوط وائس چانسلر صاحب کے نام آئے جن میں انہیں اس نیک کام کو شروع کرنے کی مبارک باد پیش کی گئی تھی۔ ان خطوط میں وائس چانسلر صاحب سے یہ درخواست بھی کی گئی تھی کہ یونیورسٹی کو اس سمت میں کچھ عملی قدم بھی اٹھانا چاہیے۔ اہل مدارس کے اس رویے سے ہمیں بڑا حوصلہ ملا اور یہ طے کیا گیا کہ مدارس کے اساتذہ کے لیے سائنس کا ابتدائی و تعارفی کورس شروع کیا جائے۔ اب تک [illegible] ایسے تین کورسوں کا انعقاد کیا جا چکا ہے۔ یہ سارے کورس کافی کامیاب رہے ہیں [illegible]

آج کے فنکشن سے ہے، اردو داں طبقے میں سائنس کو عام کرنے کا ہے۔ یہ سبھی کو علم ہے کہ اردو زبان میں سائنسی مضمون نگاری تقریباً نہ کے برابر ہے۔ جس کی وجہ سے اردو داں طبقہ سائنس کی تاریخ اور اس کی ترقی سے ناواقف ہے۔ انہیں یہ علم ہی نہیں کہ سائنس کا معاشرے کی معاشی اور صنعتی ترقی سے ایک گہرا تعلق ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جدید سائنس نے انسانی فکر اور انسانی طرز زندگی پر ایک گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے اردو داں طبقہ جدید کی مخالفت، نئے حالات سے مفاہمت میں پس و پیش اور نئے افکار کو اپنے کلچر کا ایک جز بنانے میں تأمل کرتا ہے۔

سائنس کو اردو داں طبقے تک لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ایسے سائنس دانوں کی تعداد بہت کم ہے جو اردو زبان میں عام فہم سائنسی مضامین لکھ سکتے ہیں اور ان میں سے جو لکھ سکتے ہیں وہ بعض اسباب کی بنا پر لکھنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اس لیے اردو سائنسی مضمون نگاری کی حوصلہ افزائی کی غرض سے سینٹر نے تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کی مدد سے عام فہم سائنسی مضمون نگاری پر انعامات کا سلسلہ شروع کیا اور یہ اعلان کیا کہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں اشاعت کے لیے بھیجے گئے عام فہم سائنسی مضامین پر ۱۲۰۰۰/- روپے کے انعامات دیے جائیں گے۔ اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کثرت سے سائنسی مضامین اشاعت کے لیے آئے۔ اس تجربے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ذرا سی توجہ اور حوصلہ افزائی سے اردو میں عام فہم سائنسی مضمون نگاری کو کافی فروغ دیا جا سکتا ہے۔

اس جلسے میں تین خاص انعامات دیے جا رہے ہیں [illegible] انعامات کو [illegible] تہذیب الاخلاق [illegible] گیا ہے۔ ان میں سے ہر انعام کی رقم [illegible] جو درج ذیل موضوعات کے مضامین پر دیے گئے ہیں:

ا ہسٹری آف سائنس، سائنس اور سوسائٹی اور سائنس ایجوکیشن

ب فزیکل سائنس، کمپیوٹر سائنس اور ریاضی

ج بایو سائنس، ارضی سائنس اور ماحولیاتی سائنس۔

اسال درج بالا تینوں انعامات میں سے ہر ایک کو دو مقالہ نگاروں نے برابر برابر حاصل کیا ہے۔ ان انعامات کے علاوہ چار اسپیشل انعامات بھی دیے جا رہے ہیں جن میں سے ہر ایک مبلغ ۵۰۰/- روپیے کا ہے۔ کچھ تشویقی انعامات بھی دیے گئے ہیں۔

ان انعامات کا فیصلہ ۵ ممبروں پر مشتمل ایک کمیٹی نے کیا ہے۔ کمیٹی کے صدر وائس چانسلر صاحب تھے اور کمیٹی میں درج بالا تینوں موضوعات کے ماہرین بھی شامل تھے، جنھوں نے مقالے میں شامل مضامین پر اپنی ماہرانہ رائے دی اور ان کی گریڈنگ کی۔ ان ماہرین کو وائس چانسلر نے نامزد کیا تھا۔

ہمارے خیال میں اردو زبان کی تاریخ میں عام فہم سائنسی مضمون نگاری پر اتنے بڑے انعامات پہلی بار دیے جا رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اردو دنیا کے پہلے نوبل انعام یافتہ سائنس داں پروفیسر عبدالسلام نے ان انعامات کی تقسیم کے لیے ہمارے دعوت نامے کو قبول کیا۔ ہمیں پوری امید ہے کہ تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کی سرپرستی میں ان انعامات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

آخر میں ایک بار پھر میں آپ تمام حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس جلسے میں شریک ہونے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تہذیب الاخلاق اور سائنسی مضامین

سید حامد*

صدر محترم جناب پروفیسر عبدالسلام صاحب! جناب حکیم عبدالحمید صاحب! جناب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صاحب جناب وصی الرحمٰن صاحب! جناب اسرار احمد صاحب! جناب فرحان صاحب! حاضرین کرام!!

اب میرا یہ بڑا خوش گوار فریضہ ہے کہ میں تہذیب الاخلاق کے متعلق آپ سے چند باتیں کروں۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے تہذیب الاخلاق نے اپنی زندگی کے سات سال طے کر لیے ہیں اور یہ مدت کسی سنجیدہ رسالے کی حیات کے لیے وقیع گنی جاتی ہے۔ ابتدا میں جن حضرات نے تہذیب الاخلاق کی مالی اعانت کی، ان میں جناب جسٹس ہدایت اللہ صاحب، جنہوں نے تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچے کا اجرا کیا اور جناب حکیم عبدالحمید صاحب اور خود ہمارے معزز مہمان پروفیسر عبدالسلام صاحب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جناب سید ہاشم علی صاحب، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس رسالے کی ہمت افزائی کی اور یونیورسٹی کے سایۂ عاطفت میں لے کر تہذیب الاخلاق کو اُن مالی پریشانیوں سے یکسو کر دیا جو اس کے عظیم بانی کو درپیش رہی تھیں۔ تہذیب الاخلاق کا احیا ایک سنگ میل ضرور ہے اس لیے کہ اردو کے کسی رسالے یا کسی اخبار کو اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد یہ موقع نہیں ملا کہ اس کو دوبارہ جاری کیا جائے اور اس تسلسل میں جاری کیا جائے۔ ہم سب کو احساس ہے کہ ہم اس قدو قامت کے لکھنے والوں کو مہیا نہیں کر سکے، ہم ان کو فراہم شاید مستقبل قریب میں بھی نہ کر سکیں گے لیکن ہم انتہائی فروتنی کے ساتھ اس بات کو دہرانا چاہیں گے کہ جو مقصد سید والا گہر کا تھا تہذیب الاخلاق نکالنے میں، اُسی مقصد کو لے کر بہت چھوٹے آدمی چلے ہیں محض اس خیال سے کہ ہم اگر چھوٹے ہیں تو نسبت تو بہت بڑی ہے۔ اور یہ نسبت! سید والا گہر کی نسبت ہے اور آپ یہ بھی غور فرمائیں کہ ہم نے دوبارہ تہذیب الاخلاق کو اگر جاری کیا تو اس میں ایک پہلو

---

* سابق وائس چانسلر اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ہمدرد نگر، دہلی۔

ستائش کا ہے سرسید کی اور ایک پہلو عبرت کا۔ ستائش کا اس لیے کہ سرسید نے ملت کی نبض پر ہاتھ رکھا، اس کے امراض کی تشخیص کی اور امراض دور کرنے کے لیے تجویز بھی کی اور وہ بنیادی' وہ تشخیص ہنوز فرسودہ نہیں ہوئی، پارینہ نہیں ہوئی اور وہی تشخیص تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اب بھی ہم پر عاید ہوتی ہے، ہماری ملت پر عاید ہوتی ہے اور عبرت کی بات یہ ہے کہ اس طویل عرصے کے بعد بھی ہم اس دلدل سے نکل نہیں سکے جس دلدل سے نکالنے کی سرسید نے کوشش کی تھی، انھوں نے مسلمانوں کو تعلیم کے میدان میں کھڑا کر دیا اور جدید تعلیم اور سائنس کی طرف اُن کی افتادِ طبع کو منعطف کیا۔ جہاں تک کہ تعلیم کا تعلق ہے، سرسید نے ایسی کامیابی حاصل کی جس کی نظیر عام طور پر نہیں ملتی لیکن افتادِ طبع کو بدلنے کا کام، دوررس کام اور صبر آزما کام تھا اور اس میں شاید سرسیدؒ کو وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جو ان کا مقصود تھا جو اُن کا مدعا تھا' اور وہ اقلیت کی تحریک، علم کی جستجو کی تحریک جو سرسیدؒ نے شروع کی تھی وہ بیسویں صدی میں آکر بعض اور تحریکات کے اثر سے دب گئی۔ وہ تحریک دب گئی اور وہ اثرات بعض اوقات ظاہر نہ ہوئے اور وہ نتیجہ تھے ہمارے بعض اکابرین کی قیادت کا اور ہمارے بعض اکابرین کی افتادِ طبع کا۔ بہرکیف۔ ہم کو داستان میں نہیں جانا ہے۔

میں یہ اور عرض کروں گا کہ یہ بے محل نہ ہوگا کہ اگر اس موقع پر ان حضرات کے اسمائے گرامی لے لیے جائیں جنھوں نے کہ تہذیب الاخلاق کی ادارت کا بار سنبھالا۔ اس میں سب سے پہلے بزرگ قاضی معز الدین احمد صاحب ہیں جنھوں نے کئی سال تک اس رسالے کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا۔ اس کے بعد پروفیسر نورالحسن صاحب نقوی اس کے مدیر مقرر ہوئے اور انھوں نے اس میں بہت سی ایسی خصوصیات کا اضافہ کیا جن سے کہ تہذیب الاخلاق کی رونق اور وزن کو ترقی ہوئی۔ ان کے بعد پروفیسر اسرار احمد صاحب نے یہ بار گراں اپنے شانوں پر لیا اور ان کی قابلِ قدر رفاقت جناب کبیر احمد جائسی صاحب کی۔ یہ سب حضرات ہمارے تشکر کے ہماری تبریک کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ کسی رسالہ کو جاری کر دینا آسان کام ہے لیکن اس کو خوش اسلوبی اور ڈھنگ سے چلانا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہوگا جنھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا ہے اور صحافت بھی سنجیدہ صحافت، اصلاحی صحافت، ان حضرات کا ہم سب کو ممنون ہونا چاہیے۔

اگرچہ یہ میرا موضوع نہیں ہے لیکن یہ بات نا روا نہ ہوگی اگر میں جناب صدر کی اجازت سے اپنے معزز مہمان کے متعلق اپنے خیالات کا دو تین جملوں کے اندر اظہار کر دوں۔ سائنس کی دنیا میں ان کی جو عظمت ہے اس کا ذکر کرنے کا نہ مجھ کو حوصلہ ہے نہ مجھ میں اس کی صلاحیت ہے لیکن میں اُن کا عقیدت مند ہوں، اُن سے والہانہ عقیدت رکھتا ہوں صرف ایک وجہ سے کہ یہ شخص اگر اپنی تجربہ گاہ اور لائبریری میں کام کرتا رہتا تو دنیا میں اس نے جو امتیاز حاصل کیا ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ شخص بے چین رہا، بے خواب رہا، بے تاب رہا اس فکر میں کہ کس طرح مسلمانوں کو جو علوم سے بے بہرہ ہیں اور جو سائنس سے کئی صدیوں سے قطع تعلق کیے ہوئے ہیں، اُن کو کسی طرح سے سائنس کی دنیا سے روشناس کر دے اور ان کے اس تامل کو اس جھجک کو ان کی اس بے بہری کے طلسم کو توڑ کر رکھ دے۔ یہ شخص دن رات اس کوشش میں رہا جو آپ کسی نامور سائنس داں سے عام طور پر منسوب نہیں کرتے ہیں۔ میں عینی شاہد نہیں ہوں لیکن میں تصور کر سکتا ہوں کہ ہمارا جوان حوصلہ بوڑھا سائنس داں صبح کو اس کی داڑھی اشک سحر گاہی سے نم ہوتی ہوگی، جب یہ گڑگڑا کر رب العزت سے دعا کرتا ہوگا کہ یا رب اس قوم کو جہالت سے اور سائنس سے اور علوم سے تغافل سے نجات دلا۔ میں قیاس کرتا ہوں۔ لیکن یہ وہ قیاس ہے جس کے متعلق مجھ کو یقین ہے اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس شخص کے دل میں جو کرب، جو اضطراب اس جاہل ملت کو جہالت سے نجات دلانے کے لیے برپا ہے وہ اضطراب میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے اور ہم سب جو اس سے والہانہ عقیدت کرتے ہیں ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم بھی

ت شخص ایسا پیدا ہوا جس نے بے حسی کے اس دور میں اپنے
درد اور کرب کو بانٹنا شروع کیا جس نے سائنس اور علوم
شاعت میں اپنا ایک ایک لمحہ صرف کرنے سے دریغ نہیں
یا میں سائنس سے نا واقف ہوں، مگر میری عقیدت کی بنیاد
صرف یہ ہے کہ اس شخص کے دل میں بے انتہا درد ہے۔ میں
نے ایسا درد نہیں دیکھا۔ میں نے ان کو دور سے دیکھا ہے۔
بھی کبھی انھوں نے مجھ پر کرم بھی فرمایا ہے لیکن جن قیاسات
کے متعلق انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ قیاسات یقین کے مرتبے
تک پہنچتے ہیں اسی میں آپ اس قیاس کو گنیں۔

اب میں اپنے موضوع کی طرف واپس آتا ہوں اور میں
یہ عرض کروں گا کہ میں نے حساب لگایا کہ سائنس کا کیا جزو ہے
تہذیب الاخلاق کے رسالے میں اور ایک سال یعنی ۸۷ء
کے شمارے میں نے اپنے سامنے رکھے تو معلوم یہ ہوا کہ ۳۳ فیصد
مضامین تہذیب الاخلاق میں سائنس پر مبنی ہیں۔ ۳۳ فی صد
بہت بڑا تناسب ہے اور یہ موضوعات بھی مختلف النوع
ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی ایک موضوع کو لے لیا گیا۔ جنوری کے شمارے
کے چند موضوعات کے عنوانات میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں
جنوری میں یہ موضوعات تھے:

کمپیوٹر اور انسان۔ خلا کی تحقیق اور ہندوستانی
ٹیلی وژن کی کہانی۔ فزکس ایک سائنس۔ سورج
اور اس کی موت۔ ۱۵ میں سے ۵ مضامین خالص
سائنس کے تھے۔

فروری میں جو مضامین تھے اُن میں سے ایک عنوان تھا
"سقراط"۔ دوسرے کا "انسانی گردہ"، تیسرا "صنعتی
آلودگی اور اس کے مضر اثرات"، چوتھا "قدرتی وسائل
کا تحفظ"، پانچواں "ایک عالمی سوال" چھٹا "بیسویں صدی
کا عظیم سائنس داں راما نوجن"۔
آپ کو اس سے تنوع کا اندازہ ہوگا کہ ان مضامین
میں کتنا تنوع ہے۔ ۱۷ میں سے ۵ یا ۶ مضامین۔

مارچ میں 'راجر بیکن'، 'کائنات'، 'تخلیق اور زندگی'
'عہد منصور کے نامور اطبا اور منجمین'، 'ایلومینیم'،
اپریل میں 'مراقبہ کی نفسیات یا سائنس'، 'اجرام
فلکی کی ابتدا'، 'اوپن ہارٹ سرجری کیا ہے'، 'ہماری زمین
کتنی قدیم ہے'، 'زحل'، 'شور اور آلودگی'، 'سائنسی ترقی
اور تنزلی کے دوراہے پر'، 'دینی تعلیم اور سائنس'،
'مادی طاقت'۔

میں آپ کا اب مزید وقت نہیں لوں گا۔ میرے
پاس اس کی تفصیل ہے۔ میں نے اس کا ایک جائزہ لیا
تھا۔ یہ سائنس کا مزاج عام ہوا ہے یا نہیں اس کے متعلق
ہم ابھی فیصلہ نہیں کر سکتے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب
پروفیسر اسرار احمد صاحب کی کوششوں سے، جو اصرار
کرتے ہیں کہ اُن کے نام کو اِسرار ہی کہا جائے۔ یہ بات،
یہ مذاق عام ہو رہا ہے۔ اس رسالے کا لوگ انتظار کرتے
ہیں اور سنجیدگی کے ساتھ اور غور و فکر کے ساتھ اس کو
پڑھتے ہیں۔

میں آخر میں ایک بات ضمناً ذکر کر دوں کہ ذکر ہو رہا
ہے علوم کا اور اداروں کا۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس
وقت حکیم عبدالحمید صاحب آپ کے یہاں جو تشریف لائے
ہیں وہ ایک نئی مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے
تشریف لائے ہیں (تالیاں) اور اس یونیورسٹی کا نام
'جامعہ ہمدرد' ہے۔

میں آخر میں آپ سب حضرات سے گزارش کروں گا
کہ ہم بھی اپنی آہ سحر گاہی میں اِس بزرگ آدمی کو یاد رکھیں
اور ہماری دعا یہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اِن کو توانائی
اور صحت اور خدمت کے بیش تر مواقع عطا کرے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸۔ شمارہ ۹ (ستمبر ۸۹ء)

مہمان خصوصی کا خطبہ

سائنس ٹکنالوجی اور تیسری دنیا

عبدالسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد ان محمد الرسول اللہ

اپنی بات کہنے سے پہلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول پیش کروں گا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص انسان کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر گزار نہیں۔ اس ارشادِ گرامی کے پیش نظر اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے معزز اشخاص میں سے بائیں طرف سے شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے میں جناب سیّد حامد کا دلی شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے اپنے دور میں مجھے یہاں پہلی بار مدعو کرکے اس عظیم یونیورسٹی کو دیکھنے کا موقع عطا فرمایا اور اس یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری دے کر علیگ برادری میں شامل کیا۔ میں سید حامد صاحب کے ان مخلصانہ کلمات کے لیے بھی شکر گزار ہوں جو ابھی انہوں نے میرے بارے میں کہے ہیں۔ اسلامی سائنس کی بابت انھوں نے میرے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ اس کے بعد جناب پرو وائس چانسلر صاحب ہیں جن کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب ہے جنھوں نے وائس چانسلر صاحب کی عدم موجودگی میں مجھے یہاں مدعو کیا تھا اور میری بڑی عزت افزائی کی تھی۔ اب یہ جواں سال شیروانی صاحب ہیں جن کی مجھ پر بڑی کرم فرمائیاں ہیں۔ آپ نے مجھے ڈیوٹی سوسائٹی کے سرپرستوں میں شامل کیا اور ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے دعوت نامے بھیجے۔ مجھے یہ دیکھ کر دلی خوشی ہے کہ شیروانی صاحب آج بھی پرجوش اور رنجوان ہیں اور میرے مقابلے میں کم عمر دکھائی دیتے ہیں۔

یہ آپ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی صاحب ہیں جن کی اس لحاظ سے مجھ پر دیرینہ نوازشیں رہی ہیں کہ مجھے کئی موقعوں پر یاد کیا اور یہ انہیں کے اخلاص کی کشش ہے جو میں آج آپ کے درمیان موجود ہوں۔ میرے اعزاز میں اس جلسے اور دوسرے کئی پروگراموں کا اہتمام کرکے سید ہاشم علی صاحب نے جس طرح اپنی نوازشوں کی بوچھار کی ہے اس کے لیے میں تہ دل سے بہت بہت شکر گزار ہوں۔

اس کے بعد میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا دلی شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے سب سے پہلے مجھے ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے آگاہ کیا اور ان کی تعلیمی پسماندگی کی طرف متوجہ کیا۔ حکیم صاحب کی یہاں موجودگی سے میری عزت افزائی ہوئی ہے اور میں آپ تمام حضرات کے ساتھ مل کر حکیم صاحب کو ایک یونیورسٹی قائم کرلینے پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اب میں ڈاکٹر اسرار احمد کا شکریہ ادا کروں گا جو اکثر ٹریسٹے میں مجھے یہاں کے سائنسی پروگراموں کی پیش رفت سے ازراہ مہربانی آگاہ کرتے رہتے ہیں اور جنھوں نے میری پذیرائی میں ماہنامہ تہذیب الاخلاق کا یہ خوب صورت یادگار شمارہ نکالا ہے جس کے پہلے صفحے پر میرے اقوال نقل کیے ہیں۔ میں

ڈائرکٹر، انٹرنیشنل سینٹر فار تھیورٹیکل فزکس، ترییستے، اٹلی۔

ان کا اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے "سر سید" کے زریں اقوال کی ایک فہرست پیش کی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ تہذیب الاخلاق کو ایک مفید رسالہ بنانے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

یہ رہے میرے دوست انعام یافتگان جنھوں نے اردو زبان میں معیاری عام فہم سائنسی مضامین لکھ کر انعام حاصل کیا ہے۔ ان کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر اس لیے واجب ہے کہ انھوں نے سائنس کے فروغ میں دلچسپی لی جو میرا مشن ہے۔

آخر میں میں تمام معزز مہمانوں، اساتذہ اور طلباء کا شکریہ ادا کروں گا کہ اس جلسے میں بھاری تعداد میں شریک ہو کر میری بڑی عزت افزائی کی اور میری باتوں کو سننے کے لیے اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔

حضرات!

اب میں خصوصیت کے ساتھ تیسری دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حالت کے بارے میں گفتگو کروں گا۔ کل میں آپ کے وزیر اعظم سے ملا تھا اور انھیں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنس کے زیر اہتمام شایع ہونے والی اپنی کتاب 'Notes on Science, Technology and Science Education in The Development of South' کا تحفہ پیش کیا۔ اس کتاب کو ساؤتھ کمیشن کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا اس کمیشن کو قایم کرنے میں آپ کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس کمیشن کے تعلق سے میرا یہ کام رہا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے۔ میری درخواست پر آپ کے وزیر اعظم نے اس کتاب کے خلاصے کو دلچسپی سے پڑھا جسے میں یہاں دہرانا چاہوں گا:

"یہ کرۂ ارض دو مختلف قسم کے انسانوں سے آباد ہے۔ یو۔این۔ڈی۔پی کی ۱۹۸۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ایک ارب انسان یعنی دنیا کی چوتھائی آبادی ترقی یافتہ ہے جو زمین کے تقریباً ۲/۵ رقبہ پر بستی ہے اور جن کے قبضے میں تقریباً اسّی فیصد قدرتی ذخائر اور وسائل ہیں۔ اس کے مقابلے میں باقی تقریباً ساڑھے تین ارب انسان جو زمین کے ۳/۵ رقبہ پر بستے ہیں، غریب، پسماندہ اور مصیبتوں کے مارے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے ان دونوں گروہوں میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر گروہ کے پاس جوش، ولولہ، طاقت اور دولت ہے جو بنیادی طور پر اس دور کی سائنس اور ٹکنالوجی پر اس کی مہارت کی وجہ سے ہے۔ اب یہ ان لیڈروں کو طے کرنا ہے جن کے ہاتھوں میں پسماندہ انسانیت کی قسمت ہے کہ کیا وہ ان اقدامات کو کرنے کے لیے تیار ہیں جن سے تیسری دنیا کے لوگ اس قابل ہو سکیں کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کر کے تخلیقی کام کریں اور اسے ترقی کے لیے استعمال کریں۔"

یہی میرا پیغام ہے جسے میں ملک ملک پہنچا رہا ہوں۔ اس پیغام کی تفسیر اس کتاب میں ہے۔ ماہرین معاشیات کو شکایت یہ ہے کہ میں نے معاشی محرکات پر خاموشی اختیار کی ہے۔ میرے نزدیک معاشی محرکات کی بات دوسرے درجے میں آتی ہے۔ اول کام ان اقدامات کا کرنا ہے جن سے دولت کی تخلیق ہو سکے۔

اس دور کی سائنس اور ٹکنالوجی چار اقسام کی ہیں:

۱۔ بنیادی سائنس
۲۔ اطلاقی سائنس
۳۔ روایتی ادنیٰ ٹکنالوجی
۴۔ اعلیٰ ٹکنالوجی۔

۱ بنیادی سائنس: بنیادی سائنس کا منبع

تجسس، غور و فکر اور جاننے اور سمجھنے کی ہمک ہے۔ اس کی پانچ اہم شاخیں ہیں:

ا۔ فزکس ب۔ کیمسٹری ج۔ ریاضی

د۔ بایولوجی اور (۵) بنیادی میڈیکل سائنس

بنیادی سائنس کا تجسس سے کتنا گہرا تعلق ہے، اس کی خوب صورت تشریح وولف گانگ وائلڈ نے اس طرح کی ہے:

"قرونِ وسطیٰ میں جتنا کچھ گرجا گھروں کی تعمیر پر صرف کیا جاتا تھا، اس سے نسبتاً کہیں کم ہم بنیادی تحقیق پر صرف کر رہے ہیں۔ حقیقت کی تلاش اور علم میں ترقی ایک ایسا مقصد ہے جس کی عظمت کسی طرح سے بھی گرجا گھروں کی تعمیر سے کم نہیں۔ یہ سوچنا حقیقت کے خلاف نہیں کہ انسانی تاریخ کے اس دور کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ سائنسی علوم کی ترقی ہے اس لیے ہمیں مشہور ریاضی داں ڈیوڈ ہلبرٹ کے اس قول سے اتفاق ہونا چاہیے۔

"ہمیں ضرور جاننا چاہیے۔ ہم ضرور جانیں گے۔"

ڈیوڈ ہلبرٹ نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی۔ اس نے جو کچھ کہا وہ رسول اللہؐ کی تعلیمات کے زیرِ اثر صدیوں پہلے سے مسلمانوں کی تہذیب کا ایک جزو تھا، مگر افسوس ہے کہ دوسری اقوام نے اسے اپنی تہذیب کا ایک جزو بنالیا ہے اور ہم صدیوں سے اسے بھولے بیٹھے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں بنیادی سائنس میں ریسرچ اور تربیت یا تو یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے یا مخصوص تحقیقی مراکز میں۔ اس سلسلے کے اخراجات بالعموم نیشنل سائنس فاؤنڈیشنز یا سائنسی اکیڈیمیز برداشت کرتی ہیں۔

جہاں تک ترقی پذیر ممالک کا تعلق ہے، یہاں بنیادی سائنس پر کوئی زور نہیں ہے۔ کسی وجہ سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ غیر ضروری ہے اور یہ کہ دوسروں کی سائنسی تحقیقات سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ اس رجحان نے سائنس کے لیے سمِ قاتل کا کام کیا ہے۔ ایک مثال کافی ہوگی۔ ترقی پذیر ممالک کے حکمراں ٹولے کے اس رویّے کے سبب تیسری دنیا اپنے ان ذہین تخلیقی افراد سے محروم ہو رہی ہے جنھوں نے اپنے اپنے مخصوص علمی میدانوں میں مہارت حاصل کی تھی اور جو ملک کی ترقی میں سائنس کے استعمال کی بابت ماہرانہ صلاح و مشورہ دے سکتے تھے۔

۲۔ اطلاقی سائنس

اطلاقی سائنس کے درج ذیل پانچ بڑے میدان ہیں:-

(ا) زراعت (اس میں جنگلات، مچھلی کی پیداوار وغیرہ شامل ہیں)۔

(ب) صحتِ عامہ اور دواسازی

(ج) توانائی یا انرجی

(د) ماحولیات اور آلودگی

(۵) ارضی سائنس (سینچائی، مٹی، معدنیات وغیرہ بھی)

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ بنیادی اور اطلاقی سائنس کے درمیان فرق کی حتمی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی۔ یہی بات تی سائنس اور ٹکنالوجی کے لیے بھی صحیح ہے۔ ان کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ اس دور میں جب کسی خاص میدان میں سائنس آگے بڑھ رہی ہو تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی ریسرچ بنیادی ہے اور کون سی اطلاقی۔ سر جارج پورٹر کے بقول سائنس صرف دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جس کا اطلاق ہو چکا ہے۔ دوسری وہ جس کا اطلاق ہونا ابھی باقی ہے۔

۳۔ روایتی ادنیٰ ٹکنالوجی

روایتی ٹکنالوجی کی پانچ اہم شاخیں ہیں:

(ا) زیادہ مقدار کی بنیادی صنعتیں۔

(ب) لوہے، فولاد اور دوسری دھاتوں کی صنعتیں۔
(ج) کپاس، چمڑے وغیرہ سے متعلق صنعتیں
(د) پٹرولیم کی صنعتیں۔
(ہ) پاور کی پیداوار۔

کسی ملک کی صنعتی ترقی کے لیے روایتی ٹکنالوجی میں مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے سائنس کے نئے قوانین یا اصولوں میں مہارت کی ضرورت نہیں۔ یہاں ماضی کی سائنس کا استعمال ہے۔ البتہ ڈیزائن، کوالٹی، بدلتے زمانے کے ساتھ ضروری تبدیلیوں اور قیمتوں پر نگاہ ضروری ہے۔

۴۔ اعلیٰ ٹکنالوجی

یہ ٹکنالوجی کا وہ میدان ہے جس میں دولت ہی دولت ہے۔ آج کل اس زمرے میں درج ذیل ٹکنالوجیاں شامل ہیں؛

(ل) مصنوعی خام مال
(ب) مواصلاتی سائنس (۱۔ مائیکرو الکٹرانکس، ۲۔ فوٹانکس)۔
(ج) فضائی اور خلائی سائنس
(د) اعلیٰ درجے کی کیمیاوی اشیاء
(ہ) بایو ٹکنالوجی

آخرالذکر یعنی بایو ٹکنالوجی سے زراعت، توانائی اور میڈیسن میں زبردست انقلاب کی توقع ہے۔

ہائی ٹکنالوجی (اعلیٰ ٹکنالوجی) روایتی ٹکنالوجی سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں متعلقہ بنیادی سائنس جیسے فزکس، کیمسٹری، بایولوجی وغیرہ میں اعلیٰ سطح کے تربیت یافتہ سائنس دانوں کی ضرورت ہے۔ اس میں بہت کم مقدار میں خام مال کی ضرورت ہوتی ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں چند کو چھوڑ کر تقریباً سبھی ممالک کا یہ خیال ہے کہ اعلیٰ ٹکنالوجی ان کے بس کی چیز نہیں۔ آج اسی خیال کے بدلنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مستقبل اسی میدان میں ہے۔ یہ ممالک اگر یہ سوچتے ہیں کہ اعلیٰ ٹکنالوجی کو ترقی یافتہ ممالک سے منتقل کیا جا سکتا ہے تو یہ سوچنا سراسر غلطی ہے، کیونکہ کوئی ترقی یافتہ ملک اپنی تحقیقات سے بھرپور فائدہ اُٹھانے سے پہلے اسے ترقی پذیر ممالک کو منتقل کرنے سے رہا۔ اس لیے ترقی پذیر ممالک کے کرنے کا کام یہ ہے کہ شائع شدہ تحقیقی مقالوں کی مدد سے اعلیٰ ٹکنالوجی کی بنیاد خود ڈالیں۔

ترقی پذیر دنیا کا سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پیچھے رہنے کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ انہیں سائنسی علوم کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں۔ وہ شاید یہ نہیں جانتے کہ سائنس کو ترقی کے لیے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہونے سے کتنا فرق پڑ سکتا ہے اس کی مثال جاپان ہے۔ وہاں کے شہنشاہ نے ۱۸۶۸ء میں میجی انقلاب کے زمانے میں پانچ حلف اٹھائے تھے ان میں سے ایک حلف یہ تھا:

"جاپان کی عظمت اور تحفظ کے لیے علم کو دنیا کے کونے کونے اور ہر ممکن طریقے سے حاصل کیا جائے گا۔"

ترقی پذیر ممالک میں سائنس اور ٹکنالوجی کتنی پیچھے ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں سائنس دانوں کی تعداد کئی ہزار فی دس لاکھ ہے، جب کہ ترقی پذیر ممالک میں یہ تعداد ایک یا دو سو فی دس لاکھ ہے۔ اس پسماندگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک سائنسی ریسرچ اور متعلقہ امور پر قومی آمدنی کا بہت کم حصہ صرف کرتے ہیں۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ جبکہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک دونوں گروپ دفاع پر اپنی قومی آمدنی کا تقریباً ۶ ۔۵ فیصد برابر خرچ کرتے ہیں، سائنس اور ٹکنالوجی پر ترقی پذیر ممالک کا خرچ ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں قومی آمدنی کے لحاظ سے تقریباً دس گنا

کم ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پذیر ممالک کے لوگ
سائنس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی
کے میدان میں جتنی مدت میں ترقی پذیر ممالک دس قدم
آگے بڑھتے ہیں، ترقی یافتہ ممالک سو قدم آگے بڑھ
جاتے ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
میں نہ صرف یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر کافی زور
ہے بلکہ یہاں ایسے پروگرام شروع کیے گئے ہیں جس سے
ملک میں سائنس کا فروغ ہو۔ یہاں کے فروغ سائنس کے
پروگرام کافی غور و خوض کے بعد بنائے گئے ہیں اور ان کی
کامیابی کے اشارے بھی ملنا شروع ہو گئے ہیں۔ تیسری
دنیا میں شاید ہی کوئی دوسری یونیورسٹی ایسی ہو جہاں
سائنس کو عوام تک پہنچانے اور مذہبی طبقے کو سائنسی تعلیم
کی طرف راغب کرنے کا یہاں جیسا کوئی پروگرام چل
رہا ہو۔ اگر یہ کام اسی انہماک اور لگن سے چلتا رہا
تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سر سیدؒ نے جس امید پر
اس درس گاہ کی بنیاد ڈالی تھی اس کے پورے ہونے
کا وقت زیادہ دور نہیں۔

میں ایک بار پھر تمام انعام یافتگان کو دلی
مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ
لوگوں کی عام فہم زبان میں سائنس کی اشاعت کی کوششوں
کو کامیاب کرے۔

شکریہ

صدارتی خطبہ

سید ہاشم علی*

پروفیسر عبدالسلام صاحب، جناب الحاج عبیدالرحمن خاں شیروانی صاحب، جناب حکیم عبدالحمید صاحب، برادر بزرگ جناب سید حامد صاحب، جناب پرو وائس چانسلر صاحب، پروفیسر اسرار احمد صاحب، ڈاکٹر فرحان مجیب صاحب، دیگر معزز مہمانان، خواتین وحضرات اور عزیز طلباء۔

ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ آج ہمارے درمیان پروفیسر عبدالسلام صاحب موجود ہیں جن کے بارے میں ابھی ابھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ان باتوں کو دہرانا مناسب نہ ہوگا البتہ اتنا میں ضرور کہوں گا کہ پروفیسر عبدالسلام آج جو کام کر رہے ہیں وہ بنیادی طور پر وہی ہے جسے اس یونیورسٹی کے بانی سرسیدؒ نے غیر منقسم انڈیا کی ایک اقلیتی کمیونٹی کے لیے تقریباً ایک صدی پہلے کیا تھا۔ پروفیسر عبدالسلام کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سرسیدؒ کے مشن کو تمام دنیا کی تعلیمی طور پر پسماندہ اور غریب اکثریت تک پھیلا دیا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام سائنس کے میدان میں اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں، اس کے باوجود پسماندہ تیسری دنیا میں سائنس کے فروغ کے لیے در در مارے مارے پھرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عبدالسلام صاحب کی شخصیت کا سب سے تابناک پہلو ہے۔ اس لیے محترم! ہمیں بجا طور پر ناز ہے کہ آج آپ ہمارے درمیان ہیں۔ اس یونیورسٹی کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے میں آپ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں اور اس بات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے تیسری بار ہمیں اپنی آمد سے نوازا ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ ہمیں اسی طرح نوازتے رہیں گے۔

کل اور آج ان دو دنوں کی چھوٹی سی ملاقات سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ صحیح معنوں میں بڑے آدمی میں کتنی انکساری ہوتی ہے اور وہ کتنی اعلیٰ انسانی صفات کا حامل ہوتا ہے جس سے وہ سب کی نگاہ میں عزت کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کر لیتا ہے۔ پروفیسر عبدالسلام کی شخصیت میں میں نے ایک ایسا عظیم انسان پایا جس میں انکساری اپنی انتہا پر ہے جو مقابلتاً کافی چھوٹے انسانوں میں عنقا ہے۔ اس یونیورسٹی میں گزشتہ چار برسوں میں جب سے میں یہاں ہوں کئی بڑے بڑے وزیٹر آئے لیکن علم کے ناتے سے اس دانش کدہ میں آنے والے مہمانوں میں آپ عظیم ترین ہیں اور اس لیے آپ کے یہاں آنے کی کرم فرمائی پر میں دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں اپنی اور آپ تمام حضرات کی جانب سے جناب حکیم عبدالحمید صاحب کا خیر مقدم کرتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس جلسے میں شرکت کی زحمت فرمائی وہ قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے گزشتہ پچاس برسوں سے تن تنہا طب یونانی میں، جو ایک قسم کی سائنس ہی ہے، بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور اسے جدید طب سے قریب کیا ہے

---

* وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جناب حکیم صاحب نے علم کی بڑی خدمت کی ہے جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ایک تحقیقی ادارہ قایم کیا جو اُن کی کوششوں سے فروغ پاکر آج جامعہ ہمدرد بن گیا ہے جس کے وہ چانسلر ہیں۔ اس عظیم کارنامے پر حکیم صاحب ہم سب لوگوں کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

میں اپنے برادر بزرگ اور سابق وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے دلی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ جناب سید حامد صاحب نے جب بحیثیت وائس چانسلر یہاں کی ذمہ داری سنبھالی تھی تو حقیقتاً انھوں نے ایک کنفیوژن کا چارج لیا تھا۔ مگر جب تقریباً ساڑھے چار سال کے بعد انہوں نے مجھے یونیورسٹی سونپی تو ایک بہتر اور چلتی ہوئی یونیورسٹی سونپی۔ اپنے دور میں اس یونیورسٹی کو بہتری کی جانب لانے میں سید حامد صاحب کو بہت کچھ برداشت کرنا پڑا۔ گالیاں، بدنامیاں، رسوائیاں اور ملت کے نام نہاد لیڈروں کی بے جا تنقیدیں۔ پہلے میرا یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر جب سید حامد صاحب اور دوسروں کا دباؤ پڑا تو یہاں کی ذمہ داری سنبھالنی ہی پڑی۔ آج چار سال کے بعد اس بات کے لیے میں سید حامد صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ مجھے اس عظیم ادارے کی خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ میں نے حتی المقدور اس یونیورسٹی کو بہتر بنانے اور آگے بڑھانے کی کوشش کی اور شاید اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ آج کی مسلم یونیورسٹی کچھ اور ہی ہے۔ آج جب بھی باہر سے کوئی بڑا عالم یا معزز مہمان آتا ہے تو یہاں سے ایک اچھا تاثر لے کر جاتا ہے۔ باہر سے آنے والے یہاں کی تہذیب، شائستگی، علمی تگ و دو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ چند ماہ پہلے میرٹھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر رمیش موہن صاحب نے اس یونیورسٹی کا دورہ کیا تھا۔ یونیورسٹی کے بارے میں ان کے تاثرات ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج جب کہ ہمارے زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی ادارے ابتری کے سیلاب میں ڈوب رہے ہیں، یہ دیکھ کر بڑی تقویت ہوئی کہ ملک میں علی گڑھ جیسے شائستگی، تہذیب اور ڈسپلن کے چند جزیرے بھی موجود ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یونیورسٹی میں اس سدھار کا عمل سید حامد صاحب کے دور میں شروع ہوا جسے میں نے جاری رکھا۔ سید حامد صاحب قابل شکریہ ہیں اور وہ تمام لوگ قابل شکریہ ہیں جنھوں نے یونیورسٹی میں ایک علمی ماحول پیدا کرنے میں مدد دی اور آج یہ یونیورسٹی ملک کی بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔

جناب سید حامد صاحب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے تقریباً ستر سال کے عرصے کے بعد تہذیب الاخلاق کو دوبارہ جاری کیا۔ یہ وہ رسالہ ہے جسے سر سیدؒ نے جاری کیا تھا مگر قوم کی شدید مخالفت اور حالات کے ناسازگار رہنے کی وجہ سے بند کر دیا تھا۔ ماضی میں اس رسالے نے قوم کے شعور کو بیدار کیا تھا۔ آج کے دور میں بھی اس رسالے کی وہی اہمیت ہے جو سر سیدؒ کے دور میں تھی۔ یہ رسالہ وقت کی پکار ہے۔ میرے آنے سے پہلے اس رسالے کو مالی استحکام نہیں حاصل تھا جس کے باعث بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اس رسالے کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے وسائل کی فراہمی کی غرض سے یونیورسٹی کے بجٹ پر لے لیا۔ سید حامد صاحب کے دور کے آخری دنوں میں تہذیب الاخلاق کا ہندی روپ نشانت بھی جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اسے بھی بجٹ پر لے لیا اور یہ تبدیلی کی کہ نشانت جو پہلے شدھ ہندی میں نکلتا تھا اب لوک ہندی میں شایع ہو۔ لوک ہندی سے میری مراد دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی اردو زبان سے ہے۔ یہ اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ہمارے زیادہ تر طلبا جو اپنی مادری زبان اردو بتلاتے ہیں، فارسی رسم الخط سے ناواقف ہیں۔ اس لیے کم سے کم ایسے لوگوں کی حد تک زبان کو اس رسم الخط میں زندہ رکھا جائے جسے وہ جانتے ہیں۔ میرے اس موقف سے بعض لوگ متفق نہیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں جیسے میں فارسی رسم الخط کا مخالف

[illegible] میرے نزدیک ہندوستانی آبادی کے اس [illegible] جو فارسی رسم الخط سے واقف نہیں ہے، اردو زبان میں اپنی بات پہنچانے کا اس سے بہتر اور کون سا طریقہ ہو سکتا ہے۔ جب خدا کسی قوم میں اپنا پیغام بھیجتا ہے تو وہ اسی زبان میں ہوتا ہے جسے وہ قوم سمجھتی اور جانتی ہے۔ کیا خدا کی سنت ہمارے لیے مشعل راہ نہیں کہ آپ پیغام اس رسم خط میں دیں جو عوام جانتے ہیں۔

اس موقع پر یہ مناسب ہوگا کہ میں ان لوگوں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات پیش کروں جو ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات اور سینٹر فار پروموشن آف سائنس سے وابستہ ہیں۔ یہ ایک انتہائی مخلص اور ایثار پیشہ لوگوں کا گروپ ہے جن میں میں ان لوگوں کو بھی شامل کر رہا ہوں جنھوں نے تہذیب الاخلاق کو دوبارہ زندہ کیا اور ایک منزل تک پہنچا کر موجودہ گروپ کے سپرد کیا۔ جیسے قاضی معز الدین صاحب اور پروفیسر نورالحسن نقوی صاحب اور اُن کے ساتھی۔ یہاں میں خصوصیت کے ساتھ پروفیسر اسرار احمد، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، ڈاکٹر سید ابوالہاشم رضوی اور ڈاکٹر فرمان حبیب اور ان دونوں اداروں سے وابستہ ان تمام حضرات کا ذکر کروں گا جو خاموشی اور انتہائی خلوص کے ساتھ اتنا مفید کام کر رہے ہیں۔ اس طرح کہ انہیں نہ تو اپنے آرام کا خیال ہے اور نہ ہی کبھی کسی قسم کے معاوضے کی طلب۔ ان لوگوں کے لیے میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ یہ بات میں ریکارڈ میں لانا چاہوں گا کہ یہ اور ان جیسے اور لوگ جو معاوضے اور شہرت سے بے پروا ہو کر خاموشی سے تعمیری کام کر رہے ہیں یونیورسٹی کے شاندار مستقبل کے ضامن ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر میں پروفیسر عبدالسلام صاحب کا یہاں آنے کے لیے شکریہ ادا کروں گا۔ میں ان کا اس بات کے لیے بھی شکر گزار ہوں کہ انعامات کی تقسیم کرنے کی زحمت قبول فرمائی اور اپنی بصیرت افروز تقریر سے ہمیں نوازا جس سے ہم پر یہ واضح ہوا کہ تیسری دنیا کے لوگ بالخصوص مسلمان سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کتنے پسماندہ ہیں۔ اب ہماری یہ پوری کوشش ہونی چاہیے کہ پسماندگی کا یہ داغ ہماری پیشانی سے جلد از جلد دور ہو۔

شکریہ

جین

سمیع الرحمٰن خاں *

بہت سال پہلے جسمانی ساخت کی تمام تر معلومات عینی مشاہدے پر مبنی تھیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں خوردبین کی دریافت کے بعد ان معلومات میں اضافہ ہوتا گیا۔ جیسے جیسے خوردبین کی ساخت بہتر ہوتی گئی جسمانی ساخت کی باریکیوں کی معلومات بڑھتی گئیں۔ بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں الیکٹران مائیکرواسکوپ کی ایجاد نے تو ان معلومات میں چار چاند لگا دیے اور روز بروز باریک سے باریک تر ساخت کی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوتی گئیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں پہلی بار خوردبین کی مدد سے جسمانی ساخت کے چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کو انسان آنکھ سے دیکھنے میں کامیاب ہوا۔ شیوان (Schwann) نے ۱۸۳۹ء میں اس ذرے کو جسمانی ساخت کی اکائی کی حیثیت سے جان لیا جسمانی ساخت کے اس چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کو خلیہ کا نام دیا گیا۔ یہ خلیہ جسمانی ساخت کی اکائی مانا گیا۔ اس کی حیثیت جسم میں بالکل ایسی ہی قرار دی گئی جیسے کسی بہت وسیع قلعہ نما عمارت میں ایک اینٹ کی۔

مزید خوردبینی مشاہدے اور کیمیاوی تجربات سے اس کی ساخت کی تفصیلات روشنی میں آچکی ہیں۔ ایک اوسط جسم انسانی میں تقریباً پچھتر ٹریلین (75,000,000,000,000) خلیے ہوتے ہیں۔ ایک خلیہ کے مادۂ حیات میں ستر سے پچاسی فیصد پانی ہوتا ہے جو اس کی حیات کے لیے جزو لازم ہے۔ اگر خلیہ میں پانی کی مقدار گھٹ کر پچاس فی صد سے کم ہو جائے تو یہ مقدار خلیہ کی بقائے حیات کے لیے ناکافی ہوتی ہے اور خلیہ مردہ ہو جاتا ہے۔ خلیہ میں دس سے بیس فیصد لحمین اور دو فیصد لائی پائیڈ ہوتی ہے۔

ہر ایک خلیہ ایک ذی حیات ساخت ہے جسم میں کئی سو طرح کے بنیادی قسم کے خلیات موجود ہیں۔ اپنی قسم کی انفرادیت کے باوجود خلیہ میں کچھ افعال یکساں ہیں۔ مثلاً ان کا زندہ رہنا بڑھنا اور دوسرے خلیات پیدا کرنا۔ ان کے یہ افعال اُن میں موجود خوردبینی ساختیں انجام دیتی ہیں۔ ہلکی خوردبین سے معائنہ کرنے پر خلیہ میں مندرجہ ذیل ساختوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ (تصویر نمبر ۱)

غشاء خلیہ
انڈپلازمک ریٹیکولم
مائیٹو کونڈریا
اجسام انہضامی
اجسام ملونہ
نواۃ

* ریڈر اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نوات النوات

خلیہ کی خوردبینی ساخت (جسامت بہت زیادہ بڑھی ہوئی)

خلیہ کے اندر غلیظ مادہ بھرا ہوتا ہے جس کو مادۂ حیات کہتے ہیں۔ یہ مادہ دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہوتا ہے جن میں سے ایک اندرونی خانہ میں ہوتا ہے جس کو نوات کا مادۂ حیات اور سائیٹو پلازم کہتے ہیں۔ نوات کا مادۂ حیات اور سائیٹو پلازم ایک غشاء کے ذریعے جس کو غشاء النوات کہتے ہیں الگ ہوتا ہے سائیٹو پلازم اپنی حاشیہ کرنے والی رطوبت سے غشاء خلیہ کے ذریعہ الگ ہوتا ہے۔

غشاء خلیہ : خلیہ کے چاروں طرف ایک غلاف کی صورت میں ہوتی ہے۔ دبازت میں بہت مہین (تقریباً پچھتر سے سو اینگ اسٹروم) اور لچک دار ہوتی ہے۔ یہ غشاء لحمین اور لائپائیڈ سے بنی ہوتی ہے جس میں لحمین تقریباً ۵۵ فیصد لائپائیڈ تقریباً ۴۵ فیصد اور ریاتی سیکرائڈ تقریباً ۳ فیصد ہوتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس غشاء میں بہت سے چھوٹے چھوٹے رخنے ہوتے ہیں (جن کو الیکٹرون مائیکرواسکوپ سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا)۔ ان رخنوں سے لحمین کے سالمے ایک طرف سے دوسری طرف آجا سکتے ہیں۔

نواتی غشاء دو اکائی والی غشاء ہے جن کے درمیان کافی جگہ ہوتی ہے۔ ہر اکائی غشاء، خلیہ کی غشاء سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اس غشاء میں کافی بڑے بڑے رخنے ہوتے ہیں تاکہ تمام محلول نوات اور سائیٹو پلازم کی رطوبت میں آسانی سے حرکت کر سکے۔

انڈوپلازمک ریٹی کلم نالی دار اور حویصلی ساختوں کا جال ہوتا ہے جو اکائی غشاء کے نظام پہ بنا ہوتا ہے۔ ان نالیوں اور حویصلات کے اندر کی خلا میں انڈوپلازمک میٹرکس بھرا رہتا ہے جو انڈوپلازمک ریٹی کلم کے مادہ سے مختلف ہوتا ہے۔

انڈوپلازمک ریٹی کلم کی بیرونی سطح کے بہت سے حصوں پر چھوٹے چھوٹے ذرات بڑی تعداد میں چپکے ہوئے رہتے ہیں۔ ان ذرات کو رائبوسوم کہتے ہیں جہاں یہ ذرات موجود ہوتے ہیں تو ریٹی کلم کو اکثر ذراتی انڈوپلازمک ریٹی کلم کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ذرات خاص طور پر رائبو نیوکلیک ایسڈ (آر-این-اے) کے بنے ہوئے ہوتے ہیں جو خلیہ میں لحمین مرکب کرنے کا کام کرتا ہے۔

(تصویر نمبر ۲)

شمی کرہ
اجسام انہضامی
غیر ذراتی انڈوپلازمک ریٹی کلم
انڈوپلازم
مائیٹو کونڈریا
گالجی بوڈی
ایکٹوپلازم
غشاء النوات
غشاء خلیہ
ذراتی انڈوپلازمک ریٹی کلم
خلیہ کا شبکی

انڈو پلازمک ریٹی کلم کا بقایا حصہ جس پر ذرات چپکے ہوئے نہیں ہوتے غیر ذراتی انڈو پلازمک ریٹی کلم کہلاتا ہے۔ یہ لائپائیڈ کے مرکب کرنے کا کام کرتا ہے اور غالباً گلائیکوجن کے انجذاب میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

گولجائی کومپلکس:۔ انڈو پلازمک ریٹی کلم کا خصوصی حصہ ہے۔ اس میں غیر ذراتی انڈو پلازمک ریٹی کلم سے ملتی جلتی غشاء ہوتی ہے۔ یہ ان خلیات میں جن سے ترشح ہوتا ہے بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ان خلیات میں یہ خلیہ کے جانبی حصے میں ہوتا ہے جس سے مادے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس کا کام باہر خارج کرنے والے مادوں کو عارضی طور پر جمع کرنا اور ان کو باہر خارج کرنے کے لیے تیار کرنا ہے۔ مزید یہ کاربوہائیڈریٹ کو مرکب کر کے ان کو لحمین کے ساتھ ملا کر گلائیکو پروٹین بناتا ہے۔ گولجائی کومپلکس اجسام انہضامی اور سائیٹو پلازمک عضویہ بنانے میں بھی حصہ لیتا ہے جو درون خلوی مادوں کو ہضم کرنے میں حصہ لیتے ہیں۔

سائیٹو پلازم کا وہ حصہ جو غشاء خلیہ کے بالکل متصل ہوتا ہے، اکثر غلیظ ہوتا ہے اس کو قشر یا ایکٹو پلازم کہتے ہیں اور سائیٹو پلازم کا وہ حصہ جو قشر اور غشاء نوات کے درمیان ہوتا ہے، رقیق ہوتا ہے اس کو انڈو پلازم کہتے ہیں۔ سائیٹو پلازم میں چھوٹے چھوٹے ذرات بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، ان ذرات میں شحمی کرے ۔ گلائیکوجن کے ذرات ۔ رائبوسوم ۔ افرازی ذرات ۔ اور دو خاص چھوٹے چھوٹے عضویہ یعنی مائیٹو کونڈریا اور اجسام انہضامی ہوتے ہیں۔

مائیٹو کونڈریا غذا اور آکسیجن سے انرجی حاصل کر کے خلیہ میں جہاں کہیں بھی اس کے فعل کے لیے ضرورت ہوتی ہے، مہیا کرتے ہیں یہ ذرات تمام خلیات کے سائیٹو پلازم میں موجود ہوتے ہیں جن کی تعداد مختلف خلیات میں مختلف ہوتی ہے جو چند سو سے لے کر کئی ہزار تک ہو سکتی ہے جس کا انحصار خلیہ کی انرجی کی ضرورت پر ہے مائیٹو کونڈریا جسامت اور شکل میں بھی مختلف ہوتے ہیں جن میں سے بعض کا قطر صرف نصف مائیکرون ہوتا ہے اور شکل میں گول ہوتے ہیں جب کہ دوسرے جسامت میں ایک مائیکرون قطر اور سات مائیکرون لمبے اور شکل میں ریشہ دار ہوتے ہیں۔

جسم انہضامی ایک مدور عضویہ ہے جس کا قطر دو سو پچاس سے سات سو پچاس مائیکرون ہوتا ہے۔ یہ ایک اکائی غشاء سے گھرا رہتا ہے۔ اس میں کثیر تعداد میں چھوٹے چھوٹے ذرات بکھرے ہوتے ہیں جن کا قطر پچپن سے اسی اینگ اسٹروم ہوتا ہے۔

جسم انہضامی درون خلوی نظام انہضام کا کام کرتا ہے جو خلیہ میں ہضم کے بعد غیر ضروری مادوں خصوصاً برباد شدہ ساختوں، بیرونی مادوں جیسے جراثیم کو یا تو باہر خارج کر دیتا ہے یا یہ مادے سائیٹو پلازم میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

سائیٹو پلازم میں مذکورہ بالا ساختوں کے علاوہ مرکزیہ چھوٹے استوانہ نما ساخت ہوتی ہے اور خلیہ کی تقسیم میں بڑا حصہ لیتی ہے، ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر خلیات میں لائپائیڈ کے چھوٹے چھوٹے قطرے گلائیکوجن کے ذرات جو خلیہ کی انرجی کے استعمال میں خاص حصہ لیتے ہیں اور کچھ مخصوص خلیات میں اہداب اور عضلی لیفات ہوتے ہیں۔

نوات کی ساخت

نوات خلیہ کے اندر خصوصی ساخت ہے۔ یہ شکل میں مدور جس کا قطر تقریباً دس مائیکرون ہوتا ہے، اس کی ترکیب میں اس کا خمیرہ

پانی ہوتا ہے اور اس کے خشک ہونے کی حالت میں وزن کا اسی فیصد
لحمین ہوتا ہے اور خشک حالت کا تقریباً بیس فیصد میں سے اٹھارہ فیصد
ڈی-این-اے اور دو فیصد آر-این-اے ہوتا ہے۔ نوات کے
باقی حصے میں ڈی-این-اے ہوتا ہے۔ یہ جال دار ساخت کروماٹین
کہلاتی ہے جو کروموسوم بناتی ہے جس کو خلیے کی تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے
وقت میں پہچانا جا سکتا ہے۔

نوات خلیہ کے کنٹرول کا مرکز ہے۔ یہ خلیہ میں ہونے والے کیمیائی
ردعمل اور خلیہ کی پیدائش کو کنٹرول کرتا ہے۔ مختصراً نوات میں کثیر مقدار
میں ڈی اوکسی رائبو نیوکلئیک ایسڈ (ڈی۔ این۔ اے) ہوتا ہے جس کے
ایک جزو کو ہم جین (Gene) کہتے ہیں۔ یہ جین سائیٹو پلازم کے لحمی
خمیر کے بننے کو کنٹرول کرتا ہے اور اس طرح سے یہ سائیٹو پلازم میں ہونے
والے افعال کو کنٹرول کرتا ہے۔ پیدائش (Reproduction)
کو کنٹرول کرنے کے لیے اول جین خود کو پیدا کرتا ہے اور جب یہ
عمل مکمل ہو جاتا ہے تو خلیہ ایک مخصوص طریق سے ایک سے دو خلیوں
میں تقسیم ہو جاتا ہے اس کو مائٹوسس (Mitosis) کہتے
ہیں۔ ان ایک خلیہ سے دو میں تقسیم شدہ خلیوں میں سے ہر ایک میں
جین کا نیا سیٹ ہوتا ہے۔ نوات کو خوردبین میں دیکھنے پر اس کی
میکانیت کے بارے میں جس سے یہ خلیہ میں ہونے والی سرگرمیوں کو
کنٹرول کرتا ہے، کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ پورے نوات میں گہرا رنگ
قبول کیے ہوئے مادہ ملونہ نظر آتا ہے۔ خلیہ کی تقسیم کے وقت یہ مادہ
کروموسوم کے ایک حصہ کے طور پر پہچان لیا جاتا ہے (جس کو
اس وقت ہلکی خوردبین کی مدد سے بھی دیکھا جا سکتا ہے) یہ نوات
کے حصہ میں سب سے زیادہ کثیف ([illegible]) ہوتا ہے۔

خلیہ کے نوات میں ایک یا ایک سے زیادہ ہلکا رنگ
قبول کرنے والی ساخت جن کو نوات النوات کہتے ہیں موجود ہوتی
ہے۔ ان کے چاروں طرف کوئی محدود کرنے والی غشاء نہیں ہوتی۔ یہ
ایک سادہ سی لحمی ساخت ہوتی ہے جس میں کافی مقدار میں رائبو نیوکلئیک
ایسڈ جیسا کہ رائبو سوم میں ہوتا ہے پایا جاتا ہے۔ جب خلیہ میں لحمین
مرکب ہوتی ہے تو نوات النوات کافی بڑا ہو جاتا ہے۔ جس کا سبب
یہ ہے کہ ایک کروموسوم کا جین کثیر مقدار میں رائبو نیوکلئیک ایسڈ
مرکب کرتا ہے جو فوراً ہی نوات النوات میں جمع ہو جاتی ہے۔ یہ اولاً
ڈھیلا، ریشہ دار رائبو نیوکلئیک ایسڈ (آر-این-اے) ہوتا ہے
جو بعد میں غلیظ ہو کر دانہ دار رائبوسوم بنا دیتا ہے۔ یہ باری سے
سائیٹو پلازم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سے انڈو پلازمک
ریٹی کلم سے ملتصق ہو جاتے ہیں۔

(۲)

ذی حیات میں افزائش نسل کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک
حیوان اپنے ہی جیسے حیوان کو جنم دیتا ہے۔ ایک پودے کا بیج اپنی ہی
نسل کے دوسرے پودوں کی نسل کو جاری رکھتا ہے۔ مکا کا بیج
بونے پر مٹر کا پودا نہیں اگتا۔ بیگن کے پودے پر سیم کی بیل نہیں
لگتی۔ گیدڑ شیر کو جنم نہیں دیتا۔ گیدڑ کی آنے والی نسل گیدڑ ہی
ہوتی ہے اور شیر کی آنے والی نسل شیر ہی ہوتی ہے۔ ایک انسان
دوسرے اپنے ہی جیسے انسان کو جنم دیتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آنے
والی نسل میں والدین میں موجود جسمانی و کرداری خصایل اور عادتیں
موجود ہوتی ہیں۔ والدین سے آنے والی نسل میں مماثل خصوصیات
کا منتقل ہونا وراثت کہلاتا ہے۔

وراثت کا یہ سلسلہ عرصے سے انسان کی توجہ کا مرکز بنا رہا
یہاں تک کہ اس کا حل ڈھونڈ نکالنے میں کامیابی حاصل کرلی اور
ایک ایسی اکائی کا پتہ لگایا جو موروثی خصوصیات کے منتقل کرنے کی
ذمہ دار ہے۔ وراثت کی اس اکائی کو ساختی جین کا نام دیا گیا۔

ساختی جین (Structural Gene) ذی حیات
خلیہ میں وہ فعلی اکائی ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل میں تمام
موروثی خصوصیات کے منتقل ہونے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ کروموسوم
پر واقع ہوتی ہے اور پالی پیپٹائیڈ کو مرکب کرنے کی ذمہ دار ہے۔

۱۸۶۶ء میں گریگور مینڈل نے وراثت کا ایک قانون
مرتب کیا۔ یہ قانون مٹر کے دانوں پر کیے گئے تجربات پر مبنی تھا
اس نے اپنے اس قانون کی اشاعت برن (آسٹریا) میں ۱۸۶۶ء [illegible]
کی۔ ۱۹۰۰ء میں مینڈل کے کام کو از سر نو [illegible]

(Hugo De Vries) جرمنی میں کارل ارک (Carl Correns) اور آسٹریا میں ارمن سکورمک وان سے سینگ ـ (Erich Tschermak von Seysenegg) نے مینڈل کے انتقال کے سولہ سال بعد معلوم کیا ۔ ولہیم لڈوگ جان سین (Wilhelm Ludwig Johannsen) نے ۱۹۰۹ء میں ان اجزا کے لیے جین (Gene) کی اصطلاح وضع کی۔

جین نہ صرف والدین سے بچوں میں وراثت کے منتقل ہونے کی ذمہ دار ہے بلکہ یہ خلیات کے پیدا ہونے اور ان کے روزمرہ کے افعال کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ جین خلیہ کے فعل کو یہ طے کرنے کے لیے کنٹرول کرتا ہے کہ خلیے کے اندر کن مادوں مثلاً ساختوں، خمیر یا کیمیاوی مرکبات کو مرکب کرنا ہے۔

جین ایک نیوکلیئک ایسڈ جس کو ڈی اوکسی رائبونیوکلیئک ایسڈ (ڈی۔این۔اے) کہا جاتا ہے، کا ایک جز Segment ہے۔ یہ دوسرے کلیئک ایسڈ جس کو رائبونیوکلیئک ایسڈ (آر۔این۔اے) کہا جاتا ہے، کے مرکب ہونے کو کنٹرول کرتا ہے۔ رائبونیوکلیئک ایسڈ پورے خلیہ میں پھیل کر مختلف لحمین کے بننے کو کنٹرول کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ لحمین ساختی لحمین ہوتی ہیں (بال اور جلد ساختی لحمین ہیں) جو دوسرے مختلف لائپائیڈ کے ساتھ مل کر مختلف عضویہ کی ساختیں بناتی ہیں۔

لحمین کی زیادہ تعداد خمیر میں بہت سے کیمیاوی ردعمل کرتی ہیں۔ مثلاً خمیر خلیہ میں آکسیجن کے ملانے کے ردعمل کو بڑھاوا دیتی ہیں جس سے خلیہ کو انرجی ملتی ہے۔ مختلف کیمیاوی مرکبات کے مرکب ہونے کی اعانت کرتی ہے۔ جیسے لائپائیڈ، گلائیکوجن ریڈینوسین ٹرائی فاسفیٹ وغیرہ۔

جین ڈی اوکسی رائبونیوکلیئک ایسڈ (ڈی۔این۔اے) کی لمبی دوہری ڈوری کے مرغولی سالمہ ـ (Helical Molecule) جس کا سالمی وزن عموماً ملین میں ہوتا ہے، میں ہوتا ہے (۱۸۶۹ء میں خلیے کے نیوکلیئس سے ایک مادہ جس میں نائٹروجن اور فاسفیٹ تھے حاصل کیا گیا۔ اول اس کو نیوکلین (Nuclein) کہا گیا لیکن آج کل اس کو ڈی۔این۔اے کہا جاتا ہے۔ یہ سالمہ کئی سادہ کیمیاوی مرکب سے جو یکے بعد دیگرے ترتیب سے آراستہ ہوتے ہیں بنا ہوتا ہے۔ ان میں فاسفورک ایسڈ اور ایک شکری مادہ جس کو ڈی اوکسی رائبوز کہتے ہیں اور چار نائٹروجن کے قاعدے جن میں دو پیورین یعنی ایڈینین (Adenine) اور گوانین (Guanine) اور دو پائیریمیڈین یعنی تھائی مین (Thymine) اور سائیٹوسن (Cytosine) ہوتے ہیں۔

فاسفورک ایسڈ اور ڈی روکسی رائبوز ڈی۔این۔اے کی دو مرغولی ڈوریاں (Helical Strands) بناتے ہیں اور قاعدے (Bases) (ابتدا میں گوانین، تھائی مین اور سائٹوسن) ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کو ایک دوسرے سے جوڑے رہتے ہیں اور ان دونوں ڈوریوں کی درمیانی خلا میں ہائیڈروجن کی بندشیں ہوتی ہیں۔

(ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۴)

ہر ایک شکر کے شکر کے ساتھ ایک پیورین اور پائیریمیڈین لگی ہوتی ہے اور پورا فاسفیٹ شکر اور قاعدے کے تحت اکائی (Monomeric unit) نیوکلیوٹائیڈ (Nucleotide) کہلاتی ہے۔

ڈی۔این۔اے کی کیمیاوی ساخت

شکر۔ تھائی مین ـــ ہائیڈروجن ـــ ایڈینین ۔ شکر
فاسفیٹ　　　　　فاسفیٹ
شکر۔ سائٹوسن ـــ ہائیڈروجن ـــ گوانین ۔ شکر
فاسفیٹ　　　　　فاسفیٹ
شکر۔ ایڈینین ـــ ہائیڈروجن ـــ تھائی مین ۔ شکر
فاسفیٹ　　　　　فاسفیٹ
شکر۔ گوانین ـــ ہائیڈروجن ـــ سائٹوسن ۔ شکر
فاسفیٹ　　　　　فاسفیٹ
شکر۔ گوانین ـــ ہائیڈروجن ـــ سائٹوسن ۔ شکر

۱۹۵۳ء میں جیمس واٹسن James watson اور فرانسس کرک (Francis Crick) نے اپنا مشہور ماڈل پیش کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈی این اے دو محدب طور پر بل دی ہوئی مرغولی زنجیریں (Helical chains) ہیں جن میں ایک زنجیر کی ایڈینین دوسری زنجیر کی تھائی مین سے ہائیڈروجن کی بندش سے جڑی ہوتی ہیں اور ایک زنجیر کو گوانین دوسری زنجیر کی سائٹوسن سے ہائیڈروجن بندش سے جڑی ہوتی ہیں ان کا یہ ماڈل ایک بل دی ہوئی سیڑھی کے مانند ہے جس کی جانبین شکر اور فاسفیٹ سے بنی ہوئی ہیں جب کہ ڈنڈا (پائیدان) (Rung) جوڑدان نائٹروجنی قاعدے سے بنی ہیں۔

تصویر نمبر ۴
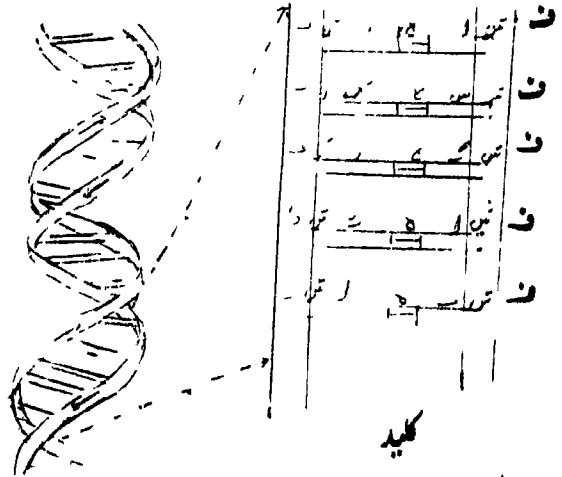
کلید

واٹسن اور کرک کا ڈی۔این۔اے سالمہ کا ماڈل بمعہ کلید

ف	فاسفیٹ
ش	شکر
ا	ایڈینین
ت	تھائی مین
س	سائٹوسن
گ	گوانین
ہ	ہائیڈروجن (بندشین)

ایک انسانی خلیہ کے ڈی۔این۔اے کو اگر لمبائی میں پھیلایا جائے تو یہ تقریباً دو میٹر لمبا ہوتا ہے اور یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اگر ایک انسانی جسم کے تمام خلیوں کے ڈی۔این۔اے کو پھیلا کر جوڑ دیا جائے تو اس کی لمبائی تقریباً اتنی ہوتی ہے کہ زمین سے سورج تک پہنچ جائے اور پھر لوٹ کر زمین تک آجائے لیکن اس پوری لمبائی کو احتیاط کے ساتھ کیسٹ کے ربن کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں پیک کر کے خلیات میں رکھا گیا ہے۔ ڈی این۔اے مرغولے کے تقریباً ایک سو چالیس قاعدی جوڑے کروموسوم لحمین (Chromosome Protein) کے جھنڈ کے گرد اگرد لپیٹ کر نیوکلیوسوم (Nucleosome) بناتے ہیں (جو ایک ایسی ڈوری جس میں موتی پرو دیے گئے ہوں کے مانند ساخت بناتی ہے)۔ یہ ساخت کافی لچکیلی ہوتی ہے اور ڈی۔این۔اے کو ضرورت کے مطابق خلیے کے نوات میں لپیٹ کر اور تہہ کر کے اس انداز پہ پیک کرتی ہے کہ جب اس کے جینی سرگرم (Genetically Active) ہونے کی ضرورت ہو تو آسانی سے مہیا ہو سکے۔

ڈی۔این۔اے بننے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ فاسفورک ایسڈ کا ایک سالمہ اور ڈی اوکسی رائبوز کا ایک سالمہ اور چاروں مذکورہ بالا قاعدوں یعنی ایڈینین۔ گوانین تھائی مین اور سائٹوسن میں سے ایک مل کر نیوکلیوٹائیڈ (Nucleo Tide) بناتے ہیں اور اس طرح سے چار الگ الگ نیوکلیوٹائیڈ بن جاتے ہیں (چاروں قاعدوں میں سے ہر ایک سے ایک یعنی ایڈی نیلک ایسڈ (Adenylic Acid) تھائی میڈلک ایسڈ (Thymidylic Acid) گوانی ڈی لک ایسڈ (Guanidylic Acid) اور سائٹی ڈی لک ایسڈ (Cytidylic Acid)۔ یہ نیوکلیوٹائیڈ دو دو جوڑوں میں الگ الگ ہو جاتے ہیں جن میں ایڈی نیلک ایسڈ اور تھائی میڈلک ایسڈ ایک جوڑ

بناتے ہیں اور گوانی ڈی لک ایسڈ اور سائیٹی ڈی لک ایسڈ دوسرا جوڑ بناتے ہیں اور ہر ایک جوڑ کے قاعدے ڈھیلے طور پر ہائیڈروجن کی بندش کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں اور اس طرح ڈی۔این۔اے مرغولے کی دو ڈوریاں ایک ساتھ بندھ جاتی ہیں ایک جوڑے کا ایک نیوکلیوٹائیڈ ڈی۔این۔اے کی ایک ڈوری پر اور دوسرے جوڑے کا دوسرا نیوکلیوٹائیڈ دوسری ڈوری پر اور یہ دونوں ڈوریاں ڈھیلے طور پر جڑی رہتی ہیں۔ نیوکلیوٹائیڈ کی یہ بندش ضرورت پڑنے پر الگ ہو جاتی ہے۔

اس کو آسانی سے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ دو ڈوریاں، جن میں چار الگ الگ رنگ کے موتی پروئے گئے ہوں، کے ایک سرے کو پکڑ کر بل دیا جائے تو ایک بٹی ہوئی ڈور بن جائے گی۔ بالکل اسی طرح فاسفیٹ اور شکر دو دو نائٹروجن قاعدوں کی بل دی ہوئی دو ڈوریاں ہیں جو ڈی۔این۔اے مرغولہ بناتی ہیں۔

ڈی۔این۔اے کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ خلیہ میں دوسرے مادوں کے بننے کو کنٹرول کرتا ہے۔ ڈی۔این۔اے کا یہ کنٹرول بھی خفیہ پیغام (Genetic Code) کے ذریعہ ہوتا ہے۔

جب ڈی۔این۔اے کی دونوں ڈوریوں کو الگ کر لیا جاتا ہے تو ہر ڈوری کے جانب سے باہر ابھرے ہوئے پیورین اور پائیریمیڈین قاعدے تواتر میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہی باہر کو ابھرے ہوئے قاعدے خفیہ پیغام (Code) بناتے ہیں۔ خفیہ پیغام کے یہ الفاظ جو الگ کی ہوئی ڈی۔این۔اے کی ایک ڈوری پر نمایاں ہوتے ہیں، قاعدے کی تین کڑیاں (Letters) ہوتے ہیں یعنی ہر ایک خفیہ لفظ میں تین قاعدے متواتر ہوتے ہیں جیسے ایڈینین، گوانین۔ ایڈینین یا گوانین۔ گوانین۔ سائیٹوسن جو ایک خفیہ لفظ بناتے ہیں۔ ہر ایک خفیہ لفظ ایک امائینو ایسڈ (Amino Acid) کو ظاہر کرتا ہے۔ ان خفیہ الفاظ کا تواتر خلیہ میں لحمین سالمہ (Protien Molecule) کے مرکب ہونے کے دوران امائینو ایسڈ کے تواتر کو کنٹرول کرتا ہے ہر ایک خفیہ لفظ ایک امائینو ایسڈ کو ظاہر کرتا ہے جیسے

س۔س۔گ۔ (سائیٹوسن۔ سائیٹوسن۔ گوانین) = پرولین

س۔س۔ی۔ (سائیٹوسن۔ سائیٹوسن۔ یوریسل) = سیرین (Serine)

گ۔ا۔ا (گوانین۔ ایڈینین۔ ایڈینین) = گلوٹامک ایسڈ (Glutamic Acid)

وغیرہ۔ کل بیس امائینو ایسڈ خلیہ میں لحمین کی ترکیب میں کام آتے ہیں

آر۔این۔اے

تقریباً کل ڈی۔این۔اے خلیہ کے نوات میں ہوتا ہے لیکن خلیہ کے بہت سے افعال سائیٹوپلازم میں واقع ہوتے ہیں۔ سائیٹوپلازم میں ان افعال کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے نوات کی جین کو کسی ذریعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آر۔این۔اے (رائبو نیوکلیئک ایسڈ) سائیٹوپلازم میں نوات کی جین کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے رابطہ کا کام کرتا ہے لیکن خود آر۔این۔اے کا بننا بھی نوات میں موجود ڈی۔این۔اے ہی کنٹرول کرتا ہے۔

آر۔این۔اے اور ڈی۔این۔اے میں درج ذیل فرق ہوتا ہے۔

۱۔ آر۔این۔اے ایک واحد ڈوری ہوتی ہے جب کہ ڈی۔این۔اے بل دی ہوئی دو ڈوریاں ہوتی ہیں۔

۲۔ آر۔این۔اے کی شکری بنیاد میں رائبوز ہوتی ہے جب کہ ڈی۔این۔اے کی شکری بنیاد ڈی اوکسی رائبوز ہوتی ہے۔

۳۔ ڈی۔این۔اے کے قاعدوں میں ایڈینین۔ گوانین۔ سائیٹوسن اور تھائیمین ہوتے ہیں۔ جب کہ آر۔این۔اے یوریسل (Uracil) تھائیمین کی جگہ لے لیتا ہے۔ یعنی آر۔این۔اے کے قاعدوں میں ایڈینین گوانین۔ سائیٹوسن اور یوریسل ہوتے ہیں۔

ڈی۔این۔اے اور آر۔این۔اے کی کیمیاوی ساخت

آر۔این۔اے کی ڈوری	ڈی۔این۔اے کی ڈوری	اکائی
اندرونی جانب رائبوز	اندرونی جانب ڈی اوکسی رائبوز	فاسفیٹ اکائی (پینٹوز)
گوانین، ایڈینین	گوانین، ایڈینین	قاعدے شکر سے جڑے ہوئے
ہائیڈروجن، ہائیڈروجن	ہائیڈروجن، ہائیڈروجن	پیورین قاعدے
سائیٹوسن، یوریسل	سائیٹوسن، تھائیمین	پائیریمیڈین قاعدے

نوٹ: ایڈینین پیورین اور پایریمیڈین قاعدوں کو جوڑتی ہے
آر۔این۔اے کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ پیغامبر آر۔این۔اے Messenger RNA وہ آر۔این۔اے ہے جو جینی خفیہ پیغام (Genetic Code) لحمین بنانے کے لیے سائیٹوپلازم تک لے جاتا ہے، پیغامبر آر۔این۔اے کہلاتا ہے۔

۲۔ انتقالی آر۔این۔اے (Transfer RNA) آر۔این۔اے کی دوسری قسم جو لحمین بنانے میں نمایاں کام انجام دیتی ہے، انتقالی آر۔این۔اے کہلاتی ہے۔ کیونکہ یہ لحمین کی ترکیب کے وقت ایمائینو ایسڈ کے سالمے کو لحمی سلسلے میں منتقل کر دیتا ہے۔

۳۔ آر۔این۔اے کی تیسری قسم رائیبوسومل آر۔این۔اے Ribosomal RNA ہے جو خلیہ میں رائیبوسوم میں پائی جاتی ہے۔ یہ رائیبوسوم کا چالیس تا پچاس فیصد حصہ بناتی ہے رائیبوسوم کا باقی حصہ لحمین ہوتا ہے۔

جب آر۔این۔اے کا ایک سالمہ رائیبوسوم کے تعلق میں آتا ہے تو یہ رائیبوسوم سے گزرتا ہے اور جیسے ہی یہ رائیبوسوم سے گزرتا تو لحمین کا ایک سالمہ بن جاتا ہے۔ اس عمل کو ترجمہ (Translation) کہتے ہیں۔ اس کی مثال ایک کیسٹ پلیر سے دی جاسکتی ہے۔ کیسٹ کے ٹیپ میں مختلف آوازیں موجود ہوتی ہیں جن کو سنا نہیں جاسکتا لیکن جیسے ہی کیسٹ کی ٹیپ کیسٹ پلیر کے ہیڈ سے گزرتی ہے تو یہ ہیڈ ان آوازوں کو پڑھ کر سنانا شروع کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح رائیبوسوم پیغامبر آر۔این۔اے میں موجود خفیہ پیغام کو جب یہ اس سے گزرتا ہے، پڑھ کر لحمی سالمہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

پیغامبر آر۔این۔اے کسی بھی رائیبوسوم میں لحمی سالمہ بنانے کا سبب بنتا ہے اور یہ کہ کسی خصوصی رائیبوسوم میں کسی خصوصی لحمین کے بنانے کی خصوصیت نہیں ہوتی۔ رائیبوسوم ایک ایسی طبی ساخت ہے جس میں یا جس پر کیمیاوی ردعمل ہوتے ہیں۔

جراثیم میں پیغامبر آر۔این۔اے کی نصف زندگی تقریباً دو منٹ ہوتی ہے اور اس دو منٹ میں لحمین کے دس تا بیس سلسلے بن جاتے ہیں۔ بڑے جانداروں میں پیغامبر آر۔این۔اے زیادہ پائیدار ہوتا ہے اور دو تا تین دن کام کرتا ہے اور کئی ہزار لحمی سالموں کو مرکب (Synthesize) کر دیتا ہے۔

حواشی

۱؎ شیلڈن Schleidon نے پہلی بار پودوں کی ساخت میں خوردبین کی مدد سے خلیہ کو دیکھا۔ شیوان Schwann نے ۱۸۳۹ء میں حیوانی السنجہ میں خلیہ کا مطالعہ کیا۔ ورکاؤ Virchow نے ۱۸۵۹ء میں خلیہ کی پیدائش کو پہلے سے موجود خلیہ کے مرہون منت نظریہ کی تصدیق کی۔

۲؎ آج کل اس کو بریوں کہتے ہیں جو زیکو سلواکیا میں ہے۔

۳؎ جس کی کیمیاوی ترکیب ۱۹۴۴ء تک معلوم نہیں تھی۔ ۱۹۴۴ء میں جب ایک Pneumonia کے کریات نمونیہ کے Geno Type سے Stable Effect حاصل کر کے دوسرے Geno Type کے کریات نمونیہ کے اگتے ہوئے کاشت میں شامل کرنے پر ایک قائم رہنے والے قابل وراثت تبدیلی پیدا کرتے ہوئے نہیں دیکھ لیا گیا۔

۴؎ پیورین میں ایڈینین اور گوانین ڈی این اے اور آر این اے دونوں میں ہوتے ہیں لیکن پائیریمیڈین میں سائیٹوسن اور تھائی مین ڈی این اے میں اور سائٹوسن اور یوریسل آر این اے میں ہوتی ہیں۔

۵؎ ہرگوبند کھرانہ (نوبل لاریٹ) نے قاعدے کے ان تین خفیہ الفاظ کی ترکیب سے بننے والے تمام خفیہ پیغام سے ظاہر ہونے والے ایمائینو ایسڈ کے عقدہ کو حل کر لیا۔ اس ترتیب سے کل ۶۴ الفاظ بنتے ہیں جن میں سے ہر ایک کسی ایمائینو ایسڈ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ایمائینو ایسڈ تعداد میں بیس ہوتے ہیں۔ دو خفیہ پیغام لحمین کے مرکب Synthesis ہونے کی ابتدا اور اختتام کو ظاہر کرتے ہیں۔

۶؎ جینٹک خفیہ پیغام کا ڈی۔این۔اے سے آر۔این۔اے میں منتقل ہونے کی طریق کو ٹرانس کرپشن (Transcription) کہتے ہیں۔

اقلیتوں کے لیے وزیر اعظم کا پندرہ نکاتی ہدایت نامہ

محمد اسحٰق *

ملک کی اقلیتوں کے لیے وزیر اعظم کا پندرہ نکاتی ہدایت نامہ ([illegible]) شایع ہو چکا ہے جو کسی غلط فہمی سے پروگرام کے نام سے شایع ہوتا رہا ہے۔ اس کے چند ایک اہم نکات سے بالخصوص مسلم اقلیت کا واقف ہونا ضروری ہے۔ ان رہنمایانہ اصولوں کے جاری کرنے کی چند ایک سیاسی وجوہات بھی ہو سکتی ہیں لیکن ہمیں ان وجوہات سے بحث نہیں۔ اتنی بات تو ضرور ہے کہ مرکزی حکومت نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ملک میں ایک بڑی اقلیت ایسی ہے جو غربت اور جہالت کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے اور ملک گیر ترقی کے دوران جو فوائد ہر شعبے میں اکثریتی طبقے نے حاصل کیے ہیں ان میں مسلم طبقہ کا حصہ برائے نام ہی رہا ہے خود اس ہدایت نامے کے جاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس طبقے کے ساتھ مسلسل ناانصافیاں ہوتی رہی ہیں۔ چند دن قبل ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے دہلی میں ابو الکلام آزاد صدی تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے اس حقیقت کا برملا اظہار کیا کہ آزادی کے بعد سے ملک میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ کھلا اعتراف وزیر اعظم کی وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔ آزادی کے چالیس برس بعد آج مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پستی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب اس کے لیے کوئی خاص سروے اور اعداد و شمار جمع کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

جدید قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کے ایکشن پروگرام کے چوتھے باب میں، جو اقلیتوں کے تعلیمی پروگرام سے متعلق ہے، یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ مسلمان اور نیو بدھسٹ تعلیمی لحاظ سے قومی سطح پر پسماندہ طبقات ہیں؛

"مساوات اور سماجی انصاف کا تقاضہ ہے کہ ان طبقات کی تعلیمی ترقی پر زیادہ توجہ دی جائے"

(صفحہ ۱۱۵)

سارے ہندوستان میں تعلیم کا فی صد ۳۷ ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فی صد (۲۰) کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اقلیتی طبقات پانچ ہیں جو کل آبادی کا ۱۷.۵ فی صد ہیں، ان میں مسلمان ۱۱.۳، عیسائی ۲.۴، سکھ ۲.۰، بدھسٹ ۰.۷ اور جین ۰.۵ فی صد ہیں۔ دوسری اقلیتوں کے افراد میں وہ تعلیمی پستی اور معاشی بدحالی نظر نہیں آتی جو مسلمانوں میں عام ہے۔

اہم نکات: اس پندرہ نکاتی ہدایت نامہ میں ۰ نکات فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام سے متعلق ہیں، ۵ ملازمتوں میں بھرتی، نمائندگی اور تعلیم سے متعلق ہیں اور باقی ۳ عام نوعیت کے ہیں۔ جہاں تک فرقہ وارانہ فسادات کا تعلق ہے، آزادی کے بعد سے ۱۶ ہزار فسادات ہوئے۔ اگر انھیں آزاد ہند کی مدت

* رٹائرڈ پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن، حیدر آباد

یہ پھیلا دیا جائے تو پھر دوسرے تیسرے روز ایک فساد ہوتا ہے۔
ان نکات میں خاص طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (کلکٹر) اور پولیس کے اعلیٰ عہدے داروں کو ان فسادات کی روک تھام کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے اور ہدایت دی گئی ہے کہ فسادات سے متاثرہ حساس علاقوں میں ایسے عہدہ داروں کو تعینات کیا جائے جن کا ریکارڈ ان فسادات کی روک تھام کے لیے اچھا رہا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر عہدہ دار اپنے فرائض منصبی سے کوتاہی کرتے ہیں جن عہدہ داروں کا ریکارڈ اچھا ہوگا ان کی ترقی کے وقت خاص خیال رکھا جائے گا۔ جب فسادات کی روک تھام ان کے فرائض میں داخل ہے تو پھر ان کی ترقی اور تقرر کس طرح پندرہ نکات کا جزو بن سکتے ہیں۔

گاندھی جی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ بہار میں اکثر ہندو مسلم فسادات عید اور تہوار کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ انگریز گورنر نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ جہاں کہیں فرقہ وارانہ فساد ہوگا اسی تاریخ سے وہاں حکام اپنے آپ کو معطل سمجھ لیں، احکام آتے رہیں گے اور تحقیقات ہوتی رہے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو برس تک وہ انگریز گورنر رہا اور کسی دن کوئی فساد کی اطلاع نہیں آئی۔ ہماری مرکزی حکومت بھی بجائے، نکات جاری کرنے کے صرف ایک بات یہ کہہ دیتی کہ جہاں کہیں جس ضلع میں فساد ہوگا وہاں کے متعلقہ عہدہ دار فوری معطل کر دیے جائیں گے۔ چاہے اس پر عمل ہوتا یا نہ ہوتا لیکن اس کا اثر دیکھنے کے لائق ہوتا۔

تعلیم کی پسماندگی کی جانب ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں اعلیٰ عہدوں میں مسلمانوں کی نمائندگی دراصل اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہی کی ہو سکتی ہے۔ ایسے تعلیم یافتہ مسلمانوں ۱۰۰ میں صرف ۲ ہیں۔ باقی ۲۰ فیصد میں ۱۸ افراد ایسے ہیں جنھیں 'نخواندہ' یا 'حرف شناس' کہا جا سکتا ہے جو شُد بُد پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ عہدوں کے لیے ان کا مسابقت میں آنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

خاص طور پر ریلوے، قومیائے ہوئے بینکوں اور پبلک سیکٹر کے تحت قائم شدہ صنعتوں میں اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی بھرتی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ان شعبوں میں ہر سال دس ہزار اسامیاں خالی ہوتی ہیں لیکن ملک کے ایک اہم شعبہ ڈیفنس یا فوج کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ دفاعی خدمات میں مسلمانوں کی نمائندگی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ صرف سکھ ایک ایسی اقلیت ہے جو آبادی کا صرف دو فیصد ہونے کے باوجود دفاعی خدمات میں ان کی نمائندگی ان کے فیصد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ جہاں تک پولیس اور دوسرے زمروں کا تعلق ہے ریاستی حکومتوں سے خواہش کی گئی ہے کہ اقلیتوں کا خیال رکھا جائے۔ ان نکات کے علاوہ اقلیتی امیدواروں کے لیے مسابقتی امتحانات میں شرکت کے لیے کوچنگ کا خاص انتظام کیا جائے۔ سلکشن کمیٹیوں میں اقلیت کو نمائندگی دی جائے اور مرکزی وزارت داخلہ میں ایک سیکشن ہوگا جو ہر سال' ان ہدایات پر کہاں تک عمل ہو پایا ہے،' اس پر نظر رکھے گا۔

ہمیں ان تمام نکات کی سنجیدگی اور اخلاص پر کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن جہاں تک ان کے نفاذ یا عمل آوری کا سوال ہے وہ نہایت مشکوک ہے۔ حال ہی میں حیدرآباد میں سب انسپکٹر پولس کی ۴۰۰ سے زائد جائیدادوں پر بھرتی ہوئی جن میں ۷ مسلم امیدواروں کو لیا گیا۔ پولس کے ذمہ دار عہدہ دار نے تنقیدوں کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ۳۸ فیصد مسلم امیدواروں کا تقرر کیا گیا۔ یہ فی صد مسلم آبادی کا نہیں بلکہ ان امیدواروں کا ہے جو اس امتحان اور ٹسٹ میں شریک رہے۔ یہ ایک خاص نکتہ ہے جس پر ہمارے لیڈروں اور دانشوروں کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک ہمارے اعلیٰ تعلیمی ادارے، فنی اور پیشہ ورانہ کالجوں کا تعلق ہے وہاں مسلم طلبا کی تعداد بڑی تشویشناک حد تک گر چکی ہے۔ بعض اعلیٰ کورسس میں چار پانچ برسوں میں ایک مسلم امیدوار بھی منتخب نہیں ہو سکا۔ ان سب باتوں کا طرف

ایک ہی حل رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے لحاظ سے کالجوں اور تعلیمی اداروں اور ریاستی و مرکزی حکومت کی سرکاری جائیدادوں میں دس فیصد نشستیں اور جائیدادیں مختص کر دی جائیں۔ بنگال کی حکومت نے مسلم امیدواروں کو دس فیصد کی حد تک اسامیاں دے کر سارے ملک کو مشعل راہ دکھائی ہے۔

جو کچھ اقلیتوں کی بھلائی و بہبود کے لیے ہدایت نامہ جاری کیا گیا ہے، ان پر عمل کروانا خود حکومت کے بس کی بات نہیں ہے۔ حکومت کی مشنری اتنی پیچیدہ ہے کہ ان نکات پر عمل کروانا آسان نہیں ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ مسلم لیڈرشپ اور دانش وران نکات پر غور کریں اور اس مطالبے کو منوانے کی کوشش کریں موجودہ حالات اور طویل تجربے کے بعد ہی ایک قابل عمل حل نظر آتا ہے ورنہ چند اور برسوں میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پستی کہاں تک پہنچ جائے گی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

"آپ نے تصور فرمایا کہ مدرسۃ العلوم کی تعلیم سے ہاتھ آنا سرکاری نوکریوں کا اصلی مقصود ہے۔ اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ سرکار میں اتنی نوکریاں کہاں ہیں جو مسلمانوں کو دے گی؟ جناب من آپ نے مقصود مدرسۃ العلوم پر غور نہیں فرمایا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پا جائیں کہ بلا ذریعہ نوکری خود اپنے بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور جو مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لیے مستقل مدرسے کے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔"

مکتوب سر سید بنام
مولوی عبد الحقؒ دہلوی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔شمارہ ۹ (ستمبر ۸۹ء)

اردو کی ابتدا سے متعلق ــــــ ایک نکتہ

محمد انصار اللہ*

زبان اردو کے بارے میں تواتر کے ساتھ ایک مدت سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اس کا تعلق زبانوں کے اُس خاندان سے ہے جس میں سنسکرت کو مرکزی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن اس قسم کے دعووں پر خیال کرنے سے پہلے لازم ہے کہ خود سنسکرت کی صحیح کیفیت اور حیثیت کا بھی اندازہ کر لیا جائے۔

مشہور ہے کہ زمانۂ قدیم میں آریوں نے ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جسے وہ "براہمی" کہتے تھے۔ دیوناگری اس خط کی جدید صورت ہے۔ یہ دونوں خط بائیں طرف سے شروع ہو کر داہنی طرف کو جاتے ہیں اور یہ دراوڑ تحریروں کی خصوصیت ہے۔ اناملائی یونیورسٹی کے جناب ایس۔ رتنا سوامی نے بہت مدلل بحث کے بعد یہ بتایا ہے کہ:

"براہمی (اور اس کی جدید صورت دیوناگری) خط اپنی مختلف خصوصیات کے سبب دراوڑی نظامِ تحریر سے ماخوذ ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت کا اپنا کوئی متعین خط نہیں ہے اور غور کریں تو ایسا ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ آریا خانہ بدوش لوگ تھے۔ وہ جہاں جاتے تھے، وہاں کے حالات کے مطابق خود کو ڈھال لیتے تھے۔ یہ اُن کا قومی مزاج بلکہ طرۂ امتیاز تھا۔ اُن کی تحریریں مختلف علاقوں میں مختلف خطوں میں دریافت ہوئی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے کتاب خانے میں سنسکرت کے جو مخطوطات محفوظ ہیں اُن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ دیوناگری، شاردا، نندی ناگری اور جنوبی ہند کے مختلف خطوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ دیوناگری خط کا رواج عموماً شمالی ہند میں ہے۔ شاردا خط کشمیر کے علاقے میں رائج تھا۔ نندی ناگری کا رواج جنوب میں وجے نگر میں تھا۔ دکن کے باقی خطوں میں تمل، تیلگو، ملایالم اور کنڑ وغیرہ زبانوں کے خط رائج تھے۔ تمل میں ایسی کئی آوازیں غیر موجود تھیں جو موجودہ سنسکرت میں ہیں، اس لیے سنسکرت کے برتنے والوں کو وہاں بعض علامتوں سے کام لینا پڑا تھا۔

اب یہ بات بھی تسلیم کر لی گئی ہے کہ ابتدائی زمانے میں شمال مغرب کے بعض مقاموں پر سنسکرت کسی ایسے خط میں بھی لکھی گئی تھی جو داہنی طرف سے شروع ہو کر بائیں طرف جاتا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد سنسکرت کے لیے فارسی خط کا بھی استعمال کیا گیا تھا۔

تفصیلات بالا سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سنسکرت کو کم سے کم تحریر کی حد تک ایک وحدت کی حیثیت حاصل نہیں تھی

* ریڈر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ یو۔پی

اور نتیجہ کے طور پر مختلف علاقوں میں اِس کا لب و لہجہ اور الفاظ کا تلفظ بھی مختلف رہا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض علاقوں میں لفظوں کے محلِ استعمال اور مفہوم میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہو۔

لغت میں کلمۂ سنسکرت کے معنی اعلا، محفوظ، مہذب اور شستہ وغیرہ آئے ہیں۔ یہ فاتح اور غالب آریوں کی زبان تھی۔ اسے دیو بانی کہا گیا تھا۔ اس لیے یہ ایک اعلا زبان تھی۔ اِس کے وقار کی حفاظت کی جاتی تھی اور ہر شخص کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اِس دیو بانی کو سیکھے اور سکھائے۔ ممکن ہے کہ اس باب میں اُس زمانے کے سیاسی تقاضوں کو بھی دخل رہا ہو۔ بہر نوع یہ ایک محفوظ زبان تھی۔

فاتح اور غالب آریا خود کو مہذب اور پُروقار سمجھتے تھے۔ پھر اُنھوں نے اِس بات کا بھی التزام کیا تھا کہ یہ زبان صرف شرفا کے استعمال میں رہے، اِس لیے یہ مہذب زبان ہوی۔
یہ زبان شستہ بھی تھی۔ عالموں نے بار بار اِس کی اصلاح کی تھی۔ باہر سے آئے ہوے لفظوں کو یا تو خارج کر دیا تھا یا اُنھیں اپنے اصولوں کے مطابق شُدھ کر لیا تھا۔

سنسکرت کو جس وقت سے شائستہ اور شستہ بنانے کا میلان شروع ہوا، اُس کا دایرۂ عمل محدود سے محدود تر ہوتا گیا بلکہ اسے محدود رکھنے کی شعوری کوشش بھی کی گئی تھی۔ اصلاح کی کوششیں اِس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ اُس زمانے میں مروّج مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ بول چال ہی نہیں تحریر کے واسطے سے بھی سنسکرت میں شامل ہو رہے تھے چنانچہ خود سنسکرت تصانیف میں جو الفاظ آئے ہیں اُن کے بارے میں بھی بغیر اچھی طرح غور و فکر کے کوی حکم لگانا احتیاط کے خلاف ہے ہندوستان کی مختلف زبانوں پر سنسکرت کے اثرات کے سلسلے میں درجِ ذیل حقایق پر نظر رہنی ضروری ہے۔

۱۔ سنسکرت آریوں کے ساتھ ہندوستان میں آی تھی اور یہ اپنی اصل اور مزاج کے اعتبار سے قدیم ہندوستانی (دراوڑی وغیرہ) زبانوں سے مختلف تھی۔

۲۔ ہندوستان میں آنے والے آریا تعداد میں یہاں کے قدیم باشندوں سے بہت کم تھے اور تاریخ میں ایسا کوی مذکور نہیں کہ انھوں نے اپنی زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے شعوری اور باضابطہ کوی کوشش کی تھی۔ برخلاف اس کے روایتیں البتہ موجود ہیں۔

۳۔ آریا لوگ ہندوستان میں خانہ بدوش کی حیثیت سے آئے تھے۔ اُن کی معاشرت بہت ابتدای نوعیت کی تھی۔ وہ جانوروں کے شکار اور جنگلوں کی پیداوار پر بسر کرتے تھے۔ کچے مکانوں اور جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ اُن کے مکانوں ہی کی طرح اُن کی زبان بھی خام اور ناپختہ تھی۔ وہ زبان اتنی توانا اور منضبط نہیں ہو سکتی تھی کہ پختہ عمارتوں کے رہنے والے اور اپنے وقت کے لحاظ سے نہایت متمدن ہندوستانی باشندوں کی زبان پر غالب آجاتی۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ قدیم آریای منظومات ایک مدّت تک محض سینہ بہ سینہ روایت کے طور پر چلی آتی رہی ہوں گی اور اُن کی منضبط صورت بہت بعد میں وجود میں آئی ہو گی۔ جناب رتنا سوامی کا کہنا ہے کہ:

"یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ آریا لوگ بنیادی طور سے خانہ بدوش تھے۔ وہ اپنے جانوروں کے لیے زرخیز چراگاہوں کی تلاش میں یہاں آئے تھے اُن کے پاس بالفرض کچھ ادبی سرمایہ رہا ہو تو بھی وہ اُسے لے کر یہاں نہیں آئے تھے۔"

یہ درست ہے کہ عیش و عشرت میں بسر کرنے والے ہندوستان کے قدیم باشندے جنگلوں اور پہاڑوں کی شدّتوں اور سختیوں کا سامنا کرنے والے سیر و شکار کے عادی سخت کوش آریوں کے مقابلے میں سیاسی طور سے مغلوب ہو گئے تھے لیکن اپنی ذہنی صلاحیت سے کام لے کر انھوں نے بہت جلد آریوں کی زبان کو سیکھ کر اس میں بعض ایسے علمی کارنامے انجام دیے جن پر خود سنسکرت کے شیدای آج تک فخر کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں قدیم ہندوستانی

شاعر بالمیکی کا نام خاص طور سے لیا جانا چاہیے۔ جنہوں نے سنسکرت زبان میں رامائن لکھی۔ بالمیکی کسی ایسی ذات سے تعلق نہیں رکھتے تھے جن کو بیدوں کی تعلیم حاصل کرنے یا تعلیم دینے کی اجازت تھی، اس کے باوجود، اُن کی یہ کتاب اِس زبان کے ادب میں نہ صرف بے مثال ہے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اِسی سے جدید سنسکرت شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ جناب رتنا سوامی نے رامائن وغیرہ ہندوستانی سنسکرت کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مسٹر اے بارتھ کی رائے ہے کہ راماین اور
مہابھارت دونوں پہلی مرتبہ ایک عوامی بولی میں
نظم کی گئی تھیں اور بعد میں اِن کو سنسکرت میں
منتقل کر لیا گیا تھا۔"

یہ دعوا غالبًا صحیح نہیں ہوگا کہ بالمیکی رامائن کے خالق تھے۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ قصہ کسی نہ کسی سے اِس کی ابتدائی صورت میں سُنا ہوگا۔ اِس سنے ہوئے قصے کو اپنے زورِ تخیّل سے آب و رنگ دے کر انھوں نے اپنے مخصوص حالات کے مطابق ڈھال کر اپنے زمانے کے شعری مزاج کے مطابق مروّجہ سنسکرت زبان میں نظم کر دیا ہوگا۔

رامائن اور مہابھارت کی داستانوں سے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو بہت دلچسپی تھی۔ تمل زبان میں یہ داستانیں بہت پہلے نظم کی جا چکی تھیں۔ بعد میں دوسری دراوڑی زبانوں میں بھی ان کو منتقل کر لیا گیا تھا۔ اِس قسم کی تصانیف میں جس اندازِ فکر کی عکاسی ہوتی تھی، اُس سے خود آریوں کے خیال بھی متاثر ہو رہے تھے۔ کچھ ہی مدت کے بعد یہاں کے قدیم دیبی دیوتاؤں کی پرستش بھی شروع ہو گئی اور بالآخر یہاں کی بول چال کے بہ کثرت الفاظ اور کئی آوازیں بھی اُن کی زبان میں داخل ہو گئیں۔ اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ایہرن فیلس نے لکھا ہے:

"آریائی تہذیب یعنی ان خانہ بدوش گلہ بانوں کی
تہذیب جنھوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور
آریائی زبانیں بولتے تھے آج کہیں بھی موجود نہیں۔ وہ
ہندوستان کی قبل آریائی تہذیبوں کے ساتھ گھُل
مل گئی ہے۔"

بعینہٖ یہی معاملہ آریوں کی زبان کے ساتھ بھی ہوا۔ بشپ کالڈول (REV. ROBERT CALDWELL) نے اس بارے میں لکھا ہے کہ:

"اگرچہ سنسکرت میں دراوڑی اصل کے الفاظ کی
بڑی تعداد موجود ہے، جب کوئی ایسا لفظ سامنے
آتا ہے، جو دراوڑی اور سنسکرت میں مشترک ہو
تو بلا سوچے سمجھے یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ وہ سنسکرت
اصل سے تعلق رکھتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی اثرات و عوامل کو قبول کر کے آریوں کی قدیم زبان نے نئی وسعت اور نئی صورت حاصل کر لی اور نتیجے کے طور پر وہ مرکب زبان وجود میں آئی جسے ہندوستانی سنسکرت کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ہوش مند آریوں نے حالات کے رخ کو پہچان کر اپنی انفرادیت اور قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اِس صاف، شستہ اور ترقی یافتہ زبان کی محافظت کی فکر کی اور اس مقصد سے انھوں نے قواعد سازی کے علاوہ بعض قوانین بھی وضع کیے جن کی رو سے اِس زبان کے اُس قدیم علمی سرمایے تک جو بیدوں کی صورت میں مدوّن کر لیا گیا تھا صرف خاص لوگوں کو رسائی حاصل ہو سکتی تھی اور صرف خاص الخاص کو اُس کی تعلیم دینے کا اختیار باقی رہ گیا تھا۔ اِس قسم کے ضوابط کا مرتّب کیا جانا غالب آریوں کی طرف سے ہندوستان کے قدیم باشندوں کی ذہانت، لیاقت اور فراست کا گویا بالواسطہ اعتراف تھا۔

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ زبانِ اردو مسلمانوں کی سرپرستی میں وجود میں آئی ہے اور اس کی ترقی و اشاعت تمام تر اُنھی کی کوششوں کا ثمر ہے۔ اِس میں شک نہیں

کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقے پر آریا لوگ چھائے ہوئے تھے لیکن اس بارے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ علاقے قدیم ہندوستانی باشندوں (دراوڑ وغیرہ) سے پوری طرح خالی نہیں ہو گیے تھے۔ یہ قدیم تر باشندے شمال کے خطوں میں موجود تھے۔ البتہ وہ بدحالی کا شکار تھے اور بہت تباہی میں بسر کر رہے تھے۔ یہاں جب مسلمان آئے تو اوّلاً ان کا سابقہ یہاں کے مقتدر اور مؤثر طبقے سے ہوا جو اپنے سیاسی تسلط اور علمی غلبے کی مدافعت اور محافظت کے خیال سے مقابلے اور مقاتلے پر آمادہ ہو گیا۔ اِن معرکوں کے نتیجے میں ابتداءً مسلمانوں کی توجہ کا مرکز اِسی طبقہ کی زبان بنی تھی لیکن کچھ ہی مدت کے بعد یہاں کے پست اور تباہ حال طبقوں نے ساری توقعات کے ساتھ مسلمانوں کو لبیک کہا۔ قدرتی طور پر حریفوں کے مقابلے میں یہی اُن کے زیادہ قریب اور زیادہ عزیز ہو گیے اور مسلمانوں نے بھی پورے خلوص کے ساتھ اِن کو اپنا لیا۔ اِسی طبقہ کی زبان کو اُنھوں نے ہندوئی (ہندووں کی زبان) پھر ہندیہ یا ہندی (ہندوستان کی زبان) اور ہندکی (جس کا تعلق ہند سے ہے) وغیرہ ناموں سے موسوم کیا اور یہی زبان ارتقائی مدارج سے گزر کر ملک گیر سطح پر رائج ہو کر اردو کہلائی۔

زبانِ اردو کی لغفیات پر نگاہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس نے بڑی تعداد میں عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی وغیرہ زبانوں کے الفاظ اصل صورت میں قبول کر لیے ہیں، لیکن سنسکرت کا شاید ہی کوئی لفظ ایسا ہو جو اپنے اصل تلفظ اور معنی کے ساتھ اردو لغت میں شامل ہو سکا ہو۔ یہ بہت بدیہی ثبوت ہے اِس کا کہ اردو کا سنسکرت کے ساتھ اتنا واسطہ بھی نہیں ہے جتنا دوسری غیر ملکی زبانوں سے ہے۔ اس کے باوجود اردو کو بالواسطہ ہی سہی سنسکرت تک پہنچانے کی کوشش ایک طرح کی خود فریبی ہی ہے۔

اِس مقام پر یہ ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اردو سے متعلق گھرانوں کے بچے اپنی والدہ کو اَماں اور والد کو آبا کہتے ہیں جب کہ جدید ہندی والے ماتا اور پِتا بولتے ہیں۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ تمِل میں بھی اماں اور آپا کہتے ہیں اور ماتا اور پِتا کا سلسلہ سنسکرت سے ملتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بنیادی رشتے یہی ہیں اور انسان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں اِن کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ اِن کو محض دو کلمے کہہ کر گزر جانا مناسب نہیں ہے۔ راقم کے خیال میں زبان اردو کے ارتقا اور اس کے شعری اور تہذیبی مراحل کو سمجھنے کی کوشش اِن حقائق کی روشنی میں بھی کی جانی چاہیے۔

حواشی

۱؎ مجموعۂ مقالات ۱۹۸۲ء ص ۲۶۸

۲؎ فہرستِ سنسکرت مخطوطات جلد ۱ ص ۵

۳؎ یہ مسئلہ ہنوز تحقیق طلب ہے کہ وِجے نگر کے دور افتادہ علاقے میں نندی ناگری خط کن حالات میں پہنچ کر رائج ہو سکا تھا۔

۴؎ اس زبان کا صحیح نام Tamizh تمِڑ (اس 'ڑ' میں 'ل' کی آواز بھی شامل ہے) انگریزی میں اسے Tamil لکھا گیا اور اسی کی اتباع میں اسے تامل یا تامِل کہا جانے لگا جو اصل سے بہت دور ہے۔

تبل زیادہ قرین صحت ہے۔

۶۔ فن تحریر کی تاریخ۔ ص ۳۰۹۔

۷۔ حضرت عبدالقدوس ردولوی کی فارسی تصنیف 'رشد نامہ' میں اُن کا کچھ سنسکرت کلام بھی فارسی خط میں مندرج ہے۔

۸۔ جس سنسکرت کی حفاظت کی گئی وہ ایک مخصوص خط میں لکھی جانے والی زبان تھی اور اُس کی حیثیت ایک بڑے ملک کے مختصر سے حصّہ سے زیادہ نہیں تھی۔

۹۔ بتایا گیا ہے کہ قانون یہ تھا کہ اگر کوئی سودر بید کے منتر جان بوجھ کر سنے تو اُس کے کانوں میں سیسہ پلا دینا چاہیے اور اگر وہ اسے اپنے حافظے میں محفوظ کرے تو اُس کی ٹانگیں چیر ڈالنی چاہئیں (فن تحریر کی تاریخ۔ ص ۲۹۴)

البیرونی نے مختلف طبقوں کے فرائض کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر سودر یا بیس کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے بید پڑھا ہے تو برہمن اس کی اطلاع حاکم کو دے اور حاکم اس کی زبان کاٹ لے۔ (کتاب الہند۔ جلد ۲۔ ص ۳۱۲)

۹۔ مجموعۂ مقالات ۱۹۸۲ء ص۔۲۷۳

۱۰۔ بالمیکی ذات کے کیرات یا بیادہ (ہڑپیار) بتائے گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اٹیرے تھے اور راہ زنی کا کام کرتے تھے پھر نیکی کی طرف مائل ہوئے تو ایسے ہوئے کہ آج بھی اُن کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ وہ اپنی قوم کے نہایت ذہین، باصلاحیت، جرأت مند اور جنگ باز شخص تھے۔

۱۱۔ مجموعۂ مقالات ۱۹۸۲ء ص ۲۷۵

۱۲۔ علم الاقوام جلد ۲ ص ۹۷

۱۳۔ بحوالہ اردو زبان ص ۲۱۹

۱۴۔ مولانا داؤد نے اپنی نظم چنداین میں کہا ہے ؎

پُن میں آکھر کی سُدھ پائی ترکی لکھ لکھو ہند کی گائی۔

مآخذ

اردو زبان کی قدیم تاریخ۔ عین الحق فرید کوٹی لاہور، ۱۹۸۸ء

علم الاقوام ۔ ڈاکٹر بیرن عمر رالف ایہرن فیلس (اردو ترجمہ) جلد ۲۔ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی۔

فن تحریر کی تاریخ۔ محمد اسحاق صدیقی۔ انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۲ء

فہرست سنسکرت مخطوطات جلد ۱۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۳۲ء

کتاب الہند۔ ابوریحان البیرونی (اردو ترجمہ) جلد ۲۔ انجمن ترقی اردو، ہند، دہلی ، ۱۹۴۲ء

مجموعہ مقالات آل انڈیا تمل ٹیچرز ایسوسی ایشن، چودھویں کانفرنس، اناملائی، ۱۹۸۲ء

آزمائش

ظہیر احمد صدیقی*

قرآن حکیم میں ہے کہ :

ہم تم کو ایک ایک شے سے آزمائیں گے۔ ڈر سے، بھوک سے، مال کی کمی سے، جانوں سے اور پھلوں سے۔"

افلاطون نے دلچسپ بات کہی ہے کہ :

" اہل علم کی آزمائش اس کے کثرت علم سے نہیں ہوتی بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ فتنہ انگیزیوں سے کس طرح بچتا ہے۔"

ایک عربی کہاوت ہے کہ :

"بہادر کی آزمائش میدان جنگ میں دوست کی مصیبت کے وقت اور عقل مند کی غصہ میں ہوتی ہے۔"

اس چھوٹے سے لفظ 'آزمائش' پر غور کیجیے کہ کتنے معنی پنہاں ہیں اور اس کی اہمیت زندگی کے کن کن مرحلوں پر محسوس ہوتی ہے۔ آزمائش ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ زبانی دعوا کرنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے

ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک جنگل میں دو دوست جا رہے تھے اچانک ایک جنگلی ریچھ سامنے آگیا۔ ان میں سے ایک دوست دوسرے کو چھوڑ کر درخت پر چڑھ گیا۔ دوسرے نے جب نجات کی کوئی راہ نہیں دیکھی تو مردہ بن کر زمین پر لیٹ گیا۔ ریچھ نے اس کو سونگھا اور مردہ خیال کر کے واپس چلا گیا۔ درخت سے اُتر کر دوست نے دریافت کیا کہ ریچھ تمہارے کان میں کیا کہہ رہا تھا؟ دوست نے جواب دیا کہ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ کبھی کسی پر بھروسہ نہ کرو، جب تک اس کو آزما نہ لو۔ اس کہانی سے جو سبق ملتا ہے اس کو فانی بدایونی نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی
ایمان زندگی پہ نہ لا، آزما کے دیکھ۔

آزمائش کا لفظ جس کو زبان سے ادا کر دینا آسان ہے اس کی سختی کا اندازہ حضرت عیسیٰؑ کی اس دعا سے کیا جاسکتا ہے کہ

"اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو آزمائش میں نہ ڈال۔"

مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب انسان دنیاوی آزمائشوں سے گزر جاتا ہے تو وہ اس سونے کی طرح ہوتا ہے جو آگ میں تپ کر کندن بن جاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اُٹھا کر دیکھیے تو پتہ چلے گا کہ دنیا میں آزمائشوں سے جن لوگوں کو زیادہ گزرنا پڑتا ہے وہ اسی قدر عظیم اور بہادر ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ آزمائشوں سے پیغمبر، اولیاء اللہ، سنت اور صوفیوں کو گزرنا پڑا ہے۔ ان کو دنیا کے بڑے عہدوں، مال و دولت، حسن جمال کا لالچ دیا

* پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

گیا۔ دنیا کے جتنے ہتھیار ممکن تھے، ان سے ان پہ وار کیا گیا مگر انھوں نے ہر آزمائش کے وقت ثابت قدمی سے کام لیا اور ہر قسم کے لالچ اور خوف سے بے نیاز رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انھوں نے دنیا سے منھ چھپا لیا ہے مگر ان کی تعلیمات اور کارنامے آج تک انسانیت کے لیے مشعل راہ ہیں۔

اس بحرِ بےکراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا

"ڈوبنا اور پار کر جانا" یہی دراصل زندگی کی آزمائشوں سے گزرنے کا نام ہے۔ جس کو پھر کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کسی نے فیثاغورث سے دریافت کیا کہ:

"مرد کی آزمائش کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا کہ:

"جب وہ عورت کے فریب سے نکل جائے۔"

پھر پوچھا گیا کہ

"عورت کی آزمائش کس طرح ممکن ہے؟"

اس نے جواب دیا کہ:

"جب وہ دولت اور پیسے کے جال میں نہ پھنسے۔"

انسان کی مستقل مزاجی کا امتحان سکون اور آرام کے وقت نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب آزمائش کے وقت اس کے قدموں میں لغزش نہ پیدا ہو۔ اور آزمائش کا سب سے بہتر محاسبہ اس کے نفس کا ہے کہ وہ اس کے کسی کام میں حائل تو نہیں ہوتا۔ آزمائش کے لمحات جن کو پیغمبری وقت بھی کہا جا سکتا ہے افراد اور قوموں پر پڑا ہے اور وہی افراد اور قومیں آج زندہ ہیں جنھوں نے پامردی سے ان حوادثات کا رُخ موڑ دیا۔

آزمائش کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک موقع دیا جائے بار بار آزمائش کرنا نادانی ہے۔ فارسی کہاوت ہے:

"آزمودہ را آزمودن جہل است"

[یعنی آزمائے ہوئے کو آزمانا جہالت ہے]

اس لیے کہ انسان کی عادت تو بدل سکتی ہے مگر اس کی سرشت کو بدلنا ممکن نہیں ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ لوگ جو آزمائشوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کر کے یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے وہ لوگ نادان بھی ہیں اور کم ہمت بھی۔ آزمائش زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ اس کا مقصد انسان کا امتحان بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ نادان اس لیے کہ وہ ایک حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا ہے اور کم ہمت اس لیے کہ ان سے آنکھیں ملا کر زندگی کو سنوارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ انسان کو بس یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ

"خداوندا! ہم کو آزمائشوں میں نہ ڈال اور اگر ڈال تو اس سے مقابلہ کرنے کی ہمت بھی عطا کر!"

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریے کے ساتھ)۔

• "جادۂ حق پر یک سو ہو کر چلتے رہو۔ ایسا کرنے سے خدا اہل حق کے منازل تم پر واضح کر دے گا۔ حق و انصاف کو نظر میں رکھو۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸، شمارہ ۹ (ستمبر ۸۹ء)

حصولِ توانائی کی سمت

ایک اور چھلانگ کا دعویٰ

کاشف الدین*

پٹرولیم کے محدود ذخیرے کو مدنظر رکھتے ہوئے حصولِ توانائی کے نئے طریقوں کی جستجو میں سائنس دانوں کا سرگرداں ہونا ایک فطری امر ہے۔ یوں تو اس سلسلے میں کئی نئی دریافتیں ہو چکی ہیں مگر حصول مقصد کے لیے نئی دریافتوں میں سے ایٹمی توانائی کے حصول کی دریافت بہت ہی کارآمد ثابت ہوئی ہے۔

ایٹمی توانائی حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں:

نیوکلیر فیوژن اور نیوکلیر فشن

دونوں ہی طریقے بہت موثر ہیں۔ یہاں ہم 'نیوکلیر فیوژن' سے عام حالات میں توانائی حاصل کیے جا سکنے کے امکانات پر کیے گئے ایک دعوے کی بابت گفتگو کریں گے۔

فیوژن ایک ایسا عمل ہے جس میں ہلکے ایٹم کے نیوکلیس (NUCLEUS) آپس میں ضم ہو کر بھاری ایٹم کے نیوکلیس کو جنم دیتے ہیں۔ اس عمل میں بڑی مقدار میں توانائی (ENERGY) خارج ہوتی ہے۔

ابھی تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ فیوژن کے عمل کے لیے کروڑوں ڈگری سیلسیس حرارت کا ہونا ضروری ہے واضح رہے کہ سورج سے اسی عمل کے باعث توانائی خارج ہوتی ہے۔

$${}_1H^2 + {}_1H^2 \rightarrow {}_2He^4 + \text{توانائی}$$
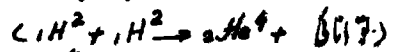
ہائیڈروجن بم بھی اسی اصول پر بنایا گیا ہے مگر حال میں کیے گئے تجربے کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ عام حالات میں بھی یہ عمل ہو سکتا ہے اور یہ کہ فیوژن کے لیے اونچے درجے کی حرارت درکار نہیں۔

امریکہ کی یوٹا یونیورسٹی کے کیمسٹ اسٹینلے پونس اور برطانیہ کی ساؤتھمپٹن یونیورسٹی کے کیمسٹ مارٹن فلیش مین نے اس قسم کے تجربے کا دعویٰ کیا ہے۔ انھوں نے ۲۳ر مارچ ۱۹۸۹ء کو ایک پریس کانفرنس میں اس سنسنی خیز تحقیق کا اعلان کیا۔ پھر اعلان کے کچھ دنوں بعد فلیش مین پونس کی جوڑی نے ۳۱ر مارچ کو یوٹا یونیورسٹی (امریکہ) میں لکچر دیا۔ اس میں انھوں نے اپنی دریافت کے بارے میں مفصل جانکاری دی۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'جرنل آف الیکٹرو اینالٹکل کیمسٹری اینڈ انٹرفیشل الیکٹرو کیمسٹری' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

فلیش مین پونس کے اس تجربے میں تعجب کی بات یہ بھی ہے کہ اس میں استعمال ہونے والی چیزیں بنیادی طور پر نئی نہیں ہیں اور انھیں اس تجربے کے لیے کوئی مالی امداد نہیں دی گئی انھوں نے اپنی ذاتی کمائی کے لاکھوں ڈالر خرچ کیے۔ اس طرح یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ انسان کے پاس اگر عزم، لگن اور ایثار کا جذبہ ہو تو ہر مشکل اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔

فلیش مین اور پونس نے اپنے اس تجربے کے لیے ایک

---

* صبرحد، ضلع جونپور (یو۔پی)

وولٹامیٹر (VOLTA METER) لیا۔ یہ ایک طرح کا شیشے کا برتن ہوتا ہے جو الیکٹرولسس کے عمل میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اس میں لیتھم ہائیڈرا کسائڈ ملا ہوا بھاری پانی بھرا۔ کمیاب دھات پیلیڈیم کا منفی برقی سرا (Cathode) اور اس کے چاروں طرف کوائل کی شکل میں لپٹے ہوئے پلیٹنم کا مثبت برقی سرا (Anode) لگایا۔ حرارت ناپنے کے لیے حرارت پیما بھی لگایا۔ (تصویر نمبر ایک)

(تصویر نمبر ایک)

۱۔ حرارت پیما۔ ۲۔ پیلیڈیم کا کیتھوڈ ۳۔ پلیٹنم کا اینوڈ۔ ۴۔ لیتھم ہائیڈرا کسائڈ ملا ہوا بھاری پانی (الیکٹرولائٹ) ۵۔ وولٹا میٹر۔

برقی سروں (الیکٹروڈوں) میں بجلی پہنچتے ہی اتنی زیادہ حرارت خارج ہوئی کہ نہ صرف پیلیڈیم دھات پگھل گئی بلکہ اس کا کچھ حصہ گیس بن کر اڑ بھی گیا۔ جب کہ پیلیڈیم کا نقطہ تقطیر۔ میلٹنگ (Melting Point) ۱۵۵۴ درجہ حرارت ہے

(تصویر نمبر دو)

اب تک معلوم کیمیائی ری ایکشن کی بنیاد پر اس مشاہدے کی یہی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ یہ نیوکلیر فیوژن کے عمل کا نتیجہ ہے۔ فلیشمین پونس کا بھی یہی خیال ہے۔ اُن کے مطابق یہ عمل دو اسٹیج پر ہوتا ہے۔ پہلے ہائیڈروجن کے آئسوٹوپ ڈیوٹیریم اور آکسیجن کے آئینوں میں الگاؤ ہوتا ہے۔ اس طرح کیتھوڈ یعنی پیلیڈیم پر ڈیوٹیریم آئن (ion) جمع ہوتے ہیں اور اینوڈ پر آکسیجن آئن جمع ہوتے ہیں۔

تصویر نمبر تین

۱۔ آکسیجن ۲۔ ہائیڈروجن کا آئسوٹوپ (Isotope) ڈیوٹیریم۔

ڈیوٹیریم فیوژن کا عمل کرتے ہیں۔ جس کے باعث حرارت۔ نیوٹران اور ہیلیم خارج ہوتا ہے۔ (تصویر نمبر ۴)
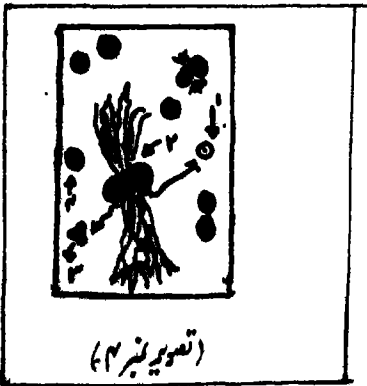
(تصویر نمبر ۴)

۱۔ نیوٹران ۲۔ فیوژن کے باعث خارج ۳۔ ہیلیم ۴۔ ڈیوٹیریم۔ جس نے فیوژن میں ابھی حصہ نہیں لیا۔

اس خیال کے منظر عام پر آتے ہی اس پر اعتراضات کی بارش ہونے لگی۔ ان میں سب سے موٹا اعتراض یہ ہے کہ اس طریقے میں جتنی حرارت نکل رہی ہے، اس حساب سے بہت کم نیوٹران مل رہے ہیں۔ اس اعتراض کی بنیاد پر مشہور سائنسی رسالہ "نیچر" میں انھیں بہت سخت وسست کہا گیا ہے۔ ان اعتراضات میں فلیشن مین پونس کے صرف اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ یہ عمل نیوکلیر فیوژن کا عمل ہے۔ اس موضوع پر سائنس دانوں میں گرما گرم بحث جاری ہے۔ مستقبل قریب میں اس کی صحیح وجہ دریافت ہونے کی امید کی جا رہی ہے۔

اس اعتراض کا اثر فلیشن مین پونس پر گہرا پڑا ہے۔ اب وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ممکن ہے اتنی زیادہ حرارت کا خارج ہونا اب تک نامعلوم کسی اور عمل کا نتیجہ ہو۔ ہندوستانی سائنس داں اس بارے میں کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ نیوکلیر فیوژن کے عمل کے ساتھ کوئی اور کیمیائی عمل ہوتا ہو۔

ایک اور سنسنی خیز بات یہ سننے میں آئی ہے کہ ہارویل تجربہ گاہ کے سائنس دانوں نے روزانہ ۱۲-۱۳ گھنٹہ کام کرکے ڈھائی تین مہینے میں ۱۰۰ سے زاید تجربے کیے۔ یہ تجربے فلیشن مین پونس کے تجربے کو دہرانے کی غرض سے کیے گئے، مگر اس کا نتیجہ ان کے مطابق کچھ نہیں ملا۔ نہ گاما شعاعیں (γ - Rays) نہ نیوٹران اور نہ حرارت۔

یہ معاملہ صرف ان کے ساتھ ہے ورنہ ہندوستانی تجربہ گاہوں میں بھی اس قسم کے تجربے کیے گئے، جس میں فلیشن مین پونس جیسے نتیجے برآمد ہوئے۔

اس کے علاوہ امریکہ کے سائنسی ادارے ایم آئی ٹی کے پروفیسر ہیگلسٹین نے یہ ثابت کیا ہے کہ فیوژن کے عمل میں بھی کم نیوٹران نکل سکتے ہیں۔

اس تجربے میں دلچسپی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس میں جتنی توانائی صرف کی جاتی ہے اس سے کئی گنا زیادہ توانائی خارج ہوتی ہے۔ اس لیے اگر یہ تجربہ حتمی طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا اور دوسری تجربہ گاہوں میں بھی وہی نتائج ملتے ہیں جس کا دعویٰ امریکی اور برطانوی سائنس دانوں نے کیا ہے تو اس سے انسان کی توانائی کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کافی مدد ملے گی۔

حواشی

۱ کسی سیال میں برقی سرے رکھنے پر وہ سیال اپنے اجزا میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو الیکٹرولی سس کا عمل کہا جاتا ہے۔

۲ ہائیڈروجن کے تین مختلف اوزان کے ایٹم ہوتے ہیں۔ ان تینوں قسم کے ایٹموں کی خصوصیات یکساں ہوتی ہیں۔ صرف وزن کا فرق ہوتا ہے۔ وزن کا یہ فرق نیوکلیس میں نیوٹرانوں کی تعداد میں فرق کے باعث ہوتا ہے۔ جو پانی بھاری والے ہائیڈروجن ایٹم اور آکسیجن کا مرکب ہوتا ہے وہ بھاری پانی کہا جاتا ہے۔ یہاں ڈیوٹیریم اور آکسیجن کا مرکب (پانی) استعمال ہوا۔

۳ مختلف اوزان رکھنے والے اُن ایٹموں کو جو ایک ہی جز کے ایٹم ہوتے ہیں آئسوٹوپ کہا جاتا ہے۔ ہائیڈروجن کے تین آئسوٹوپ ہیں: ۱۔ پروٹیم ۲۔ ڈیوٹیریم ۳۔ ٹرائی ٹیم۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۹ (ستمبر ۸۹ء)

کاغذ سازی کی صنعت کا ارتقا

ابوسعد خاں*

تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں کاغذ کی حیثیت مسلم ہے۔ علوم کی اشاعت و ترویج میں کاغذ سازی کی صنعت غیر معمولی طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ قدیم زمانے سے ہی انسانوں نے اپنے خیالات و جذبات کو تحریری شکل دینے کے لیے کاغذ کی ضرورت کو محسوس کیا۔ یوں تو کاغذ سازی کی صنعت قبل مسیح دنیا کے کئی ممالک میں اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی، لیکن چین اور مصر میں یہ صنعت کافی ترقی کر چکی تھی۔

ایک سو سال قبل مسیح چین میں کاغذ کی ایجاد ہوئی۔ وہاں سب سے پہلے ایک اولوالعزم چینی باشندے سائی لُن نے سڑے ہوئے ریشم کے ٹکڑوں، چیتھڑوں اور مچھلی پکڑنے کے پرانے جالوں سے کاغذ تیار کیا۔ چین میں کاغذ بنانے کا یہ فن بہت دنوں تک رائج رہا۔ مگر بیرونی دنیا اس سے بالکل ناواقف تھی لیکن جب ۷۵۱ء میں چینیوں نے سمرقند پر حملہ کیا تو عربوں نے ان کو بری طرح شکست دی اور سیکڑوں چینیوں کو گرفتار کر لیا۔ اِن گرفتار شدہ چینیوں میں کئی لوگ ایسے تھے جو ریشم سے کاغذ تیار کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ عربوں نے اِن قیدیوں سے کاغذ سازی کا فن سیکھا۔ سمرقند کے گورنر کی ترغیب و تشویق سے اِس شہر میں کاغذ سازی کی صنعت کا آغاز ہوا۔ سمرقند میں اس نئی صنعت کی خوب گرم بازاری ہوئی۔ عرب گورنر کی توجہ اور سرپرستی سے کاغذ کی صفائی، ساخت اور نفاست پر خوشگوار اثر پڑا۔ جلد ہی سمرقند کاغذ سازی کی صنعت کی وجہ سے بارونق اور دولت مند شہر بن گیا۔

کاغذ سازی کی صنعت نے سمرقند سے دھیرے دھیرے جنوب مغرب کی طرف رخ کیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں بغداد میں کاغذ بنانے کے کئی کارخانے قایم کیے گئے۔ شمالی عرب کے شہر تہامہ میں کاغذ سازی کا ایک کارخانہ لگایا گیا لیکن ان کارخانوں میں کاغذ تیار کرنے کے لیے ریشم کی جگہ روئی کا استعمال کیا گیا۔ روئی سے تیار کاغذ زیادہ سستے ہوتے تھے اور روئی آسانی سے کم قیمت میں میسر آ سکتی تھی۔ جلد ہی کاغذ سازی کے کارخانوں میں روئی کا استعمال عام ہو گیا اور مشرقی علاقوں کا ریشم سے تیار کاغذ مروّج نہ ہو سکا۔

فتح مصر کے بعد عربوں کو علم ہوا کہ مصر میں کاغذ سازی کی صنعت کافی ترقی یافتہ حالت میں ہے۔ مصر میں عربوں نے پے پی رس PAPYRUS سے کاغذ بنانے کی تراکیب سیکھیں۔ پے پی رس نیل ندی کے ڈیلٹائی علاقے میں بہ کثرت اُگنے والا پودا تھا۔ مصری اس پودے کی پتیوں سے چٹائی بن کر دبا دیتے تھے۔ خشک ہونے پر اسی چٹائی کو لکھنے کے لیے

---

* لکچرر شعبہ جغرافیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج کوٹ دوار، گڑھوال۔ یوپی۔

استعمال میں لاتے تھے۔ تین سو عیسوی قبل مسیح پرانی پے پی رس کی تحریر شدہ چادریں دریافت ہوئی ہیں۔ اسی پے پی رس پودے سے بننے والے کاغذ کو پیپر PAPER کہا گیا لیکن عربوں نے اس درخت سے جو کاغذ بنتا تھا، اس کے یونانی نام کو بدل کر 'قرطاس' کر دیا۔

عربوں نے شمالی افریقہ کے مفتوحہ علاقوں میں کاغذ سازی کی صنعت کو ترقی دی۔ گیارہویں صدی عیسوی میں مراکش میں کاغذ سازی کے کئی کارخانے قایم کیے گیے۔ جب عرب اسپین پہنچے تو روئی اور پے پی رس کے پودے بھی اس ملک میں داخل ہوے۔ اسپین میں کپاس کی کاشت نے خوب فروغ پایا۔ اسپین میں سب سے پہلا کاغذ کا کارخانہ زیتوا (JATIRA) میں قایم کیا گیا۔ مغربی یورپ کے ممالک میں اسی کارخانے کا کاغذ بھیجا جاتا تھا۔ اسپین میں قرطبہ اور ٹولیدو (TOLEDO) جیسے اہم شہروں میں کاغذ سازی کے کئی کارخانے قایم کیے گئے۔ یہ دونوں شہر مغربی یوروپ میں کاغذ سازی کی صنعت کے اہم مراکز تھے۔ مشرقی یوروپ میں کاغذ کی سپلائی اسپین سے نہ ہو کر شام اور فلسطین سے ہوتی تھی۔ اِن ممالک میں زیادہ تر دمشق کا بنا ہوا کاغذ استعمال کیا جاتا تھا اس طرح یہ صنعت مسلمانوں کے لیے ہی مخصوص ہو گئی تھی۔

کاغذ بنانے کا فن سسلی، اٹلی اور جنوبی فرانس وغیرہ ممالک میں عربوں کے ذریعے ہی پہنچا۔ سسلی میں [illegible] عیسوی میں کاغذ کے کارخانے کھلے گئے۔ ماہرین کے مطابق کاغذ پر اولین یوروپی دستاویز سسلی کے شاہ راجرس کا 'وصیت نامہ' ہے جو ۱۱۰۲ء میں لکھا گیا تھا۔ سسلی سے یہ صنعت اٹلی پہنچی۔ اٹلی میں پہلی کاغذ مل فیبریانو (FABRIANO) نامی مقام پر ۱۲۷۶ء میں قایم ہوئی۔ فرانس میں ٹرائے (TROY) میں ۱۳۴۸ء میں کاغذ سازی کا کارخانہ قایم ہوا۔ اس کے بعد جنوبی یورپ کے تمام بڑے شہروں میں کاغذ کی ملیں قایم ہو گئیں۔ چودھویں صدی عیسوی کے وسط تک سبھی یوروپی ممالک میں کاغذ کے کارخانے قایم ہو چکے تھے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے روئی کے ساتھ کتان کا کچھ حصہ ملا کر کاغذ تیار کیا۔ یہ کاغذ روئی سے بنے کاغذ سے کہیں زیادہ اچھا اور نفیس تھا۔ اس وقت کتان کی کاشت و پرداخت بھی مسلم قوم میں عروج پر تھی۔ اس طرح کتان سے کاغذ بنانا بھی عربوں نے ہی شروع کیا تھا۔

اٹلی سے کاغذ کی صنعت جرمنی پہنچی جہاں المان نامی ایک جوہری نے ۱۳۲۶ء میں یوریم برگ شہر میں کاغذ کا کارخانہ قایم کیا۔ انگلینڈ میں جان ٹامٹ نے ۱۴۹۳ء میں ہارٹ فورڈ میں کاغذ سازی کی پہلی مل قایم کی، جب کہ شمالی امریکہ میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ ولیم رٹن ہاؤس کے ذریعے ۱۶۹۰ء میں قایم کیا گیا۔

ہندوستان میں کاغذ سازی کی صنعت وسط ایشیا کے مسلم تاجروں کے ساتھ کشمیر پہنچی، جہاں اس صنعت نے خوب فروغ پایا۔ کشمیر سے یہ صنعت رفتہ رفتہ برصغیر کے تقریباً ہر علاقے میں پھیل گئی۔ اودھ، بنگال اور گجرات میں کاغذ سازی کے کارخانے قایم ہوے۔ پنجاب میں سیالکوٹ کاغذ سازی

"زیادہ تعجب یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ یہ سب ہو رہا ہے صرف اتحاد سے اور آپس میں لوگوں نے کیا ہے۔ گورنمنٹ سے علاقہ کچھ نہیں ہے اور یہ دیکھ کر آدمی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان میں اگر بہت سے آدمی متوجہ ہوں اور علوم و فنون اور سولیزیشن پر کوشش کریں تو وہ بلا اعانت گورنمنٹ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔"

سرسید

کا اہم ترین مرکز تھا، چونکہ سیالکوٹ کشمیر سے نزدیک واقع ہے، اس لیے کاغذ سازی کی صنعت نے کشمیر سے باہر نکلتے ہی سیالکوٹ میں اپنا قدم جمایا۔ مغل بادشاہوں کی دلچسپی اور سرپرستی کے باعث یہ صنعت ہندوستان میں کافی ترقی کر گئی تھی۔ سیالکوٹی کاغذ سفید، ملایم اور مضبوط ہوتا تھا۔ قدیم زمانے میں ہندوستانی ایک درخت کے چھلکے "بھوج پتر" پر لکھا کرتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں سے ہندوستانیوں نے کاغذ سازی کی تراکیب سیکھیں۔

عربوں نے دنیا کے مختلف علاقوں میں سستا کاغذ مہیا کروایا جس سے علم و فن کا دائرہ مفادِ عامہ بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ یوں علم و فن کی عام اشاعت اور اس کی ترویج کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ کاغذ سازی کی ترقی کے ساتھ تمدن کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ وہی دور ہے جس سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں۔

عربوں کا لگایا ہوا درخت صدیوں تک پھل دیتا رہا لیکن بعد کے دنوں میں اس درخت کی آبیاری مسلمانوں نے نہیں کی۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ ان کا لگایا ہوا درخت خشک ہو گیا لیکن اس کے بیج دوسری قوموں کو مل گئے۔ ان بیجوں سے اہلِ مغرب نے اچھے اور بہترین درخت تیار کیے اور دنیا کے مختلف علاقوں میں لگائے۔ یہ درخت آج بھی پھل دے رہے ہیں اور مستقبلِ قریب میں ان کے خشک ہونے کی قطعی امید نہیں ہے۔ آج دنیا کے تقریباً پچاس مسلم ممالک ہیں سے زیادہ تر ممالک کاغذ سازی کی صنعت میں خودکفیل نہیں ہیں۔ ترکی کے علاوہ سبھی مسلم ممالک کاغذ کی ضروریات غیر قوموں سے پوری کرتے ہیں۔ یہ وہی قومیں ہیں جنھوں نے کاغذ بنانے کا فن عربوں سے سیکھا تھا۔

"اگر کوئی سوسائٹی افواہوں، دروغ بافیوں، ہرزہ سرائیوں اور بہتانوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہے اور تہمت اور جھوٹ کے ماحول میں سانس لینے لگتی ہے تو اس کے افراد جھوٹ کو قبول اور بے بنیاد باتوں کو باور کرنے لگتے ہیں اور سچی باتیں ان کے ذہن کے تالو کو پھیکی، سیٹھی، بے کیف بے مزہ لگنے لگتی ہیں اور اگر سماج نے اپنے آپ کو کال کوٹھری میں بند کر لیا ہے، جہاں ہوا اور روشنی کا گزر بھی نہیں تو سچائی اور صحتِ فکر کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اب یہ کہنے کی شاید چنداں ضرورت نہیں کہ اس بات کا اطلاق ہمارے وطن اور اس کا انطباق ہماری ملت پر ہوتا ہے۔"

سید حامد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸- شمارہ ۹ (ستمبر ۸۹ء)

ایٹم اور ایٹمی مرکزہ

ہاشم دریادلہ*

ایٹوموس — یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ جو تقسیم نہ ہو سکے۔ جس طرح ایٹم کا لفظ یونانی لفظ سے نکلا ہے۔ اسی طرح ایٹمی نظریے کی بنیادی تلاش ہمیں قدیم یونان میں لے جاتی ہے۔

ایٹمی نظریہ کہتا ہے کہ تمام قسم کے مادے ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہیں جو مزید اور ذرات میں بانٹے نہیں جا سکتے۔ ان ذرات کا نام ایٹم ہے۔ چونکہ ایٹم بے شمار طریقوں سے مجموعے بنا سکتے ہیں اس لیے بے شمار قسم کی اشیا موجود ہیں۔

ایٹمی نظریے کے ابتدائی پیش کار لوسی پس اور ڈیموکرائٹس تھے۔ یہ آج سے کوئی ۲۵۰۰ سال پہلے کے آدمی تھے۔ ڈیموکرائٹس کہتا تھا کہ ایٹم ایسے ذرات ہیں جن میں خود مختاری سے حرکت کرنے یا شکل بدلنے کی خوبی موجود ہے۔ یعنی وہ خود سے حرکت کر لیتے ہیں اور کسی اور کے محتاج نہیں ہوتے۔

لوسی پس اور ڈیموکرائٹس کے نظریے اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل معنوں میں ایٹمی نظریے کے معمار، انیسویں صدی کے کیمیا داں تھے۔ ان کیمیا دانوں کے نام انٹونی لیوائزے، جوزف پروسٹ اور جان ڈالٹن ہیں۔

لیوائزے نے ۱۷۸۹ء میں اپنی کتاب "کیمیا کے عناصر" شائع کی۔ اس کتاب نے کیمیا کو الکیمیا (سونے کی سائنس) کے اندھیروں سے باہر نکالا اور کیمیا کو جدید، حقیقت پسندانہ اور مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ لیوائزے کا سب سے بڑا کارنامہ یہ اعلان تھا کہ کسی بھی عمل کے دوران، مادے کی کل مقدار تبدیل نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور کارنامہ یہ واضح کرنا بھی تھا کہ کیمیائی اشیا کو بنانے والے کیمیائی عناصر کی تعداد کم ہے، جب کہ کیمیائی مرکبات بے شمار ہیں۔

پروسٹ نے کیمیائی تناسبوں کا قانون پیش کیا۔ یہ قانون بیان کرتا ہے کہ کیمیائی عناصر صرف تب ہی کیمیائی مرکب بنائیں گے جب اُن کو وزن کے لحاظ سے خاص تناسب میں ملایا جائے گا۔ پروسٹ کو اپنے اس قانون کا کافی دفاع کرنا پڑا۔ اس لیے کہ اس وقت کا سب سے بڑا کیمیا داں، کلائیڈ برتھولٹ یہ کہتا تھا کہ کیمیائی عناصر کو کسی بھی نسبت سے ملا سکتے ہیں۔

جان ڈالٹن نے ۱۸۰۸ء میں تناسبوں کے قانون کی مدد سے ایٹم کے وجود کا نظریہ اخذ کیا۔ اسی نے ضعفی نسبتوں کا قانون پیش کیا۔ اس نے کہا کہ "مختلف گیسوں کے ایک جتنے حجم میں ذرات یا ایٹموں کی تعداد مختلف ہوتی ہے"۔ تعداد کے اس فرق کو اس نے ایٹموں کے وزن کی بنیاد پر پیمائش کیا۔ اس طرح اس نے "ایٹمی وزن" کا تصور پیش کیا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ایٹم مختلف تناسب سے مل کر مرکبات بناتے ہیں۔

---

* [illegible]

ایٹمی نظریے کی طرف ایک اور فیصلہ کن قدم فرانسیسی کیمیا داں جوزف لوئیس گے لوساک اور اطالوی نواب کاؤنٹ ایماڈیو ایوگاڈرو نے اٹھایا۔ گے لوساک نے دریافت کیا کہ دو گیسیں ایک دوسرے کا تعامل کرکے تیسری گیس بناتی ہیں۔ پہلی دو گیسیں مکمل عددی تناسب سے ملتی ہیں۔ ایوگاڈرو نے ایٹم اور مالیکیول کی اصطلاحوں کو مزید واضح کیا۔ اس نے عددی اور حجمی تناسب کو باہم مربوط کیا اسی نے یہ بنیادی مفروضہ بھی پیش کیا کہ ایک ہی دباؤ اور درجۂ حرارت پر گیسوں کے ایک جتنے حجم میں مالیکیولوں کی ایک جتنی تعداد موجود ہوتی ہے۔

ایوگاڈرو کے مفروضے کی تصدیق تو جلد ہی ہو گئی لیکن اسے پوری طرح سمجھنے میں نصف صدی یعنی ۵۰ سال کا عرصہ لگا اس مفروضے نے الگ الگ مالیکیولوں کی مختلف گیسوں میں شرح معلوم کرنے میں مدد دی۔ اس لیے کہ اگر کسی حجم میں مالیکیولوں کی تعداد معلوم ہو تو خود مالیکیولوں کا وزن بھی معلوم ہو سکتا ہے مختلف عناصر کا ایک جتنا حجم لیا جائے تو حجم مساوی ہونے کے باوجود، مالیکیولوں کی تعداد مختلف حاصل ہوگی۔ اس طرح عناصر کی ایک ایسی پیمائشی اکائی بنا سکتے ہیں جس میں ۶.۰۲۳×۱۰^{۲۳} مالیکیول ہوں۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑا عدد ہے۔ اسی عدد کو ایوگاڈرو کا عدد بھی کہتے ہیں۔

ایوگاڈرو کا عدد کسی بھی عنصر کے ایٹمی وزن کو بیان کرنے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایٹمی وزن معلوم کرنے کے کئی طریقے موجود ہیں۔ ان سب میں سے فرانسیسی طبیعیات داں جین پیرن کا طریقہ سب سے قابل اعتماد ہے۔

ایٹم کے بارے میں کی جانے والی مذکورہ بالا تحقیق کی اہمیت میں شبہہ نہیں لیکن اس تحقیق کو اس بات کا مکمل ثبوت نہیں کہہ سکتے کہ مادے کے بارے میں ایٹمی نظریہ درست ہے۔ ایٹمی نظریے کے متعلق آخری شکوک بیسویں صدی ہی میں دور ہو سکے۔ ان شکوک کو دو بنیادی دریافتوں نے دور کیا۔ ایک دریافت تھی "الیکٹرون" اور دوسری تھی "تاب کاری"۔

الیکٹرون اور تاب کاری کی دریافت کے بعد تیزی سے یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ الیکٹرون، مادے کے بنیادی اجزا ہیں اور یہ ایٹموں سے الگ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایٹم کو ناقابل تقسیم سمجھنے کا تصور ختم ہونے لگا۔ ایٹم کے اندرونی نمونے پر مشتمل ایٹمی ماڈل پیش ہونے لگے۔

۱۹۰۰ء میں یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ کسی بھی الیکٹرون کی کمیت ہائیڈروجن ایٹم سے ۱۸۳۷ گنا کم ہوتی ہے اور یہ کہ وہ بجلی کا منفی بار رکھتے ہیں۔ چونکہ ایٹم، برقی بار کے لحاظ سے اعتدال پر ہوتا ہے (نہ منفی نہ مثبت) اور ایٹم کے اندر منفی اجزا (الیکٹرون) ہوتے ہیں اس لیے ایٹم میں ضرور مثبت اجزا ہوں گے۔ جے۔ جے تھامسن نے جو الیکٹرون کو دریافت کرنے والا قرار دیا جاتا ہے، یہ خیال پیش کیا کہ ایٹم ایسے مثبت ذرّات ہیں جن کے اندر منفی ذرّات بھی موجود ہیں۔

جے جے تھامسن کا ایٹمی ماڈل، ردرفورڈ کے تجربات سے صحیح ثابت نہ ہو سکا۔ ردرفورڈ نے تجربات میں ایسی شعاعیں استعمال کیں جو اس زمانے میں دریافت ہوئی تھیں۔ ان شعاعوں کو اب الفا، بیٹا اور گاما شعاعیں کہا جاتا ہے اور تاب کار جسموں سے خارج ہوتی ہیں۔

ان شعاعوں کی دریافت ۱۸۹۶ء میں اتفاقاً ہوئی۔ فرانسیسی طبیعیات داں ہنری بیکورل نے ان کو دریافت کیا۔ پھر دوسرے طبیعیات داں بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں ماری کیوری اور اس کے شوہر پیری کیوری کا نام بالخصوص قابل ذکر ہے۔

یورینیم نمکیات کے کئی ٹن مادے پر تجربات سے ماری کیوری نے دو نئے تاب کار عناصر دریافت کیے۔ یہ عناصر ریڈیم اور تھوریم ہیں۔ یہ یورینیم سے بھی زیادہ تاب کار نکلے۔ ماری کیوری ہی وہ پہلی سائنس داں بھی تھی جو تاب کاری کا شکار ہوئی۔ وہ تاب کاری شعاعوں کی وجہ سے مرنے والی پہلی سائنس داں تھی۔

ماری کیوری اور تاب کار عناصر کے اس مختصر ذکر کے بعد ہم پھر ایٹمی ماڈل کی طرف آتے ہیں۔ ردرفورڈ نے تجربات سے دریافت کر لیا کہ الفا شعاعیں دراصل وہ ہیلیم کے ایٹم ہیں جو بہت تیز رفتاری سے سفر کرتے ہیں۔ [illegible]

کے ذریعے ایٹمی ساخت معلوم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۱۱ء میں ردرفورڈ نے الفا ذرّات خارج کرنے والی پتریوں کو سونے کی پتریوں کے اندر احتیاط سے رکھا۔ الفا ذرّات کے انحراف کے زاویے ناپنا اس کے لیے ممکن تھا۔ اگر تھامسن کا ایٹمی ماڈل حقیقی ہوتا تو انحراف بہت کم ہونا چاہیے تھا لیکن ردرفورڈ نے دیکھا کہ بعض جگہوں پہ انحراف بہت زیادہ رہا ہے۔ بہت سی جگہوں سے ذرّات واپس بھی لوٹ آئے تھے۔ اس تجربے سے حاصل کردہ مشاہدات کی بنیاد پہ اس نے ایٹم کے دل یا مرکز کا تصوّر پیش کیا جسے نیوکلیس کہا جاتا ہے۔

ردرفورڈ کے دریافت کردہ ایٹمی مرکزے میں ایٹم کی زیادہ تر کمیت 'مرتکز' ہوتی ہے۔ اس مرتکز کمیت کے گرد الیکٹرون یوں گردش کرتے تھے جیسے سورج کے گرد سیارے۔ ردرفورڈ کے ایٹمی ماڈل کو آج تسلیم شدہ ایٹمی ماڈل کی ابتدائی شکل تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ردرفورڈ ہی کے زمانے میں بلکہ ردرفورڈ سے بھی ذرا پہلے، ایک ایسا ہی ایٹمی ماڈل، جاپانی طبیعیات دان ناگاؤکا نے پیش کیا تھا لیکن چونکہ فیصلہ کن ثبوت ردرفورڈ نے پیش کیے اس لیے ردرفورڈ ہی کو اس ایٹمی ماڈل کا پیش کرنے والا قرار دیا گیا۔

ردرفورڈ کے ساتھ بہت سے پرجوش اور نوجوان طبیعیات دان بھی کیمبرج یونیورسٹی کی کیونڈش لیبارٹری میں کام کرتے تھے۔ کیونڈش لیبارٹری ہی دنیا میں ایٹمی تحقیق کا پہلا مرکز تھی۔ اہم دریافتوں میں سے ایک انتہائی اہم دریافت ۱۹۳۲ء میں جیمز چاڈوک نے کی۔ اس نے وضاحت کی کہ ایٹمی مرکزے میں صرف مثبت نہیں بلکہ معتدل اجزا کی موجودگی بھی تسلیم کر لی جائے تو کئی تجرباتی مشاہدات اور نظریاتی حقائق میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ ایٹمی مرکزے میں موجود یہ معتدل اجزا 'نیوٹرون' کہلائے۔ اس طرح ایٹم ایک ایسا ذرہ قرار پایا جس کے مرکز میں "نیوکلیس" نام کا خول ہے۔ یہ خول اندر سے [illegible] ہیں بلکہ [illegible]

ہیں۔ نیوکلیس سے بہت بڑے ایٹمی فاصلے پر موجود منفی ذرّات الیکٹرون مرکزے کے گرد گردش میں ہیں۔ بہت بڑے ایٹمی فاصلے سے مراد یہ ہے کہ نیوکلیس سے الیکٹرونوں کا فاصلہ نیوکلیس کے قطر سے کوئی دس ہزار گنا بڑا ہے۔

ایٹمی ساخت سے اس بات کی وضاحت بھی ممکن ہو گئی کہ قدرتی عناصر ایک دوسرے سے مختلف خوبیوں کے مالک کیوں ہوتے ہیں؟ عناصر کی خوبیوں کا انحصار ایٹمی ساخت پر ہوتا ہے۔ پروٹونوں یا الیکٹرونوں کی تعداد ان خصوصیات کا تعین کرتی ہے پروٹون یا الیکٹرون کی تعداد سے ہی ایٹمی عدد متعین ہوتا ہے جب کہ نیوٹران کی مختلف تعداد کی وجہ سے ہمجا عناصر (آئسوٹوپ) بنتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ردرفورڈ نے جو ایٹمی ماڈل پیش کیا اس سے الفا ذرات کے انحراف کی تشریح ممکن ہو گئی اسی طرح اور کئی ایٹمی مناظر کی وضاحت ممکن ہو گئی۔ اس کے باوجود یہ ایٹمی ماڈل ان خیالات کی وضاحت نہیں کر سکتا تھا جن پر روایتی برقناطیسیت قائم تھی۔

بوھر کا ایٹمی ماڈل

ردرفورڈ کے ایٹمی ماڈل کے مطابق الیکٹرون مرکزے کے باہر گردش کرتے ہیں۔ میکسویل کے قوانین کے مطابق انہیں مسلسل برق مقناطیسی موجوں کی صورت میں توانائی خارج کرنی چاہیے۔ توانائی کے اس اخراج کی وجہ سے منفی ذرات یعنی الیکٹرونوں کی توانائی کم ہو جانی چاہیے۔ منفی ذرات کمزور ہوں گے تو مثبت ذرّات کی طاقت بڑھ جائے گی اور وہ الیکٹرونوں کو اپنی طرف کشش کریں گے۔ اس کشش کی وجہ سے ایٹمی توازن بگڑ جائے گا۔ ایٹمی توازن بگڑ جائے گا تو دنیا کی مادی اشیا کا توازن بگڑ جائے گا۔ اس طرح ایٹم کی زندگی ایک سیکنڈ کا صرف دس لاکھواں حصہ رہ جائے گی۔ ردرفورڈ کے ایٹمی ماڈل کے سامنے آنے سے یہ سوالات [illegible]

...جرمنی کے طبیعیات داں نیلز بوہر نے کیا۔ نیلز بوہر کو رودرفورڈ کا شاگرد بھی کہا جاتا ہے اور انتہائی قریبی دوست بھی۔

بوہر کے نقطۂ نظر میں ایٹم کے اندر، الیکٹرونی گردش کے دوران توانائی خارج نہیں ہوتی۔ توانائی خارج یا جذب ہونے کا عمل صرف تب ہوتا ہے جب الیکٹرون ایک مدار سے دوسرے میں جاتے ہیں۔

بوہر کا ایٹمی ماڈل جسے بعد میں سمر فیلڈ نے بہتر بنایا، مختلف عناصر کی ایٹمی طیف کی تشریح میں کامیاب رہا۔ یہ ایٹمی طیف کافی عرصے سے دریافت ہو چکی تھیں لیکن ان کی تشریح کا کوئی آسان اور حقیقی نظریہ سامنے نہ آ رہا تھا۔

آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بوہر کا ایٹمی ماڈل ایک پرانا ایٹمی ماڈل ہے لیکن اس پرانے ایٹمی ماڈل کی مدد سے "کوانٹم میکانیات" کا ایک اہم حصہ تشکیل پاتا ہے جو زیادہ حقیقت پسندانہ ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوانٹم میکانیات ابھی پوری طرح نچلی سطح پر سمجھی نہیں جا سکی اس لیے نظریاتی طبیعیات اور کیمیا میں بوہر کا ایٹمی ماڈل آج بھی ایک کامیاب نظریہ ہے۔

بوہر کے ایٹمی ماڈل کا خلاصہ اگر چند فقروں میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو یوں ہے: ہر الیکٹرون ایک خاص مدار میں رہتا ہے یہ مدار دراصل توانائی کی سطح ہوتی ہے۔ جب الیکٹرون زیادہ توانائی والے مدار سے کم توانائی والے مدار میں جاتا ہے تو E_1 کی توانائی E_2 سے کم ہوتی ہے۔ کم توانائی والے مدار میں جانے کے لیے الیکٹرون کو بھی اپنی توانائی کم کرنا پڑتی ہے توانائی کم کرنے کے لیے الیکٹرون مختصر لمحے کے دوران توانائی خارج کرتا ہے۔ توانائی کا یہ اخراج روشنی کی شکل میں ہوتا ہے۔ روشنی کے ذرات یعنی فوٹون خارج ہوتے ہیں۔

پلانک کی مستقل شرح جو توانائی اور تعدد کے درمیان پائی جاتی ہے، ذہن میں رکھی جائے تو اخراجی طیف کی روشنی اور انجذابی طیف کی سیاہ دھاریوں کی وضاحت ممکن ہو جاتی ہے۔ اخراجی طیف میں روشنی کی وجہ فوٹون کا اخراج ہے جب کہ انجذابی طیف میں سیاہ دھاری کی وجہ فوٹون کا انجذاب ہے۔

بوہر کے ایٹمی ماڈل کی بنیاد پر ایک اور بڑی کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ عناصر کے جدول کی واضح حد بندی سامنے آ گئی۔ اس حد بندی کے ضمن میں اہم کردار جرمن طبیعیات داں وولف گنگ پالی نے ادا کیا۔ اس نے اصول استثنا - Exclusion Principle پیش کیا۔ اس اصول کے مطابق کسی بھی مدار میں دو سے زیادہ الیکٹرون (یا کوانٹم ذرات) نہیں ہو سکتے۔ جب ایک مدار مکمل طور سے پُر ہو جاتا ہے تو الیکٹرون دوسرے مدار میں ترتیب پانے لگتے ہیں۔ جب یہ مدار بھی پُر ہو جاتا ہے تو وہ اس سے اگلے مدار میں ترتیب پاتے ہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر یہ مفروضہ بھی سامنے آیا کہ الیکٹرون نہ صرف نیوکلیس کے گرد گھومتے رہتے ہیں بلکہ وہ اپنے محور پر بھی اس طرح گھومتے ہیں جیسے لٹو گھومتا ہے۔ اس لیے الیکٹرون کو منفی بار بردار نہیں بلکہ ایسا ذرہ سمجھنا جانا چاہیے جس کے اندر بھی کوئی ساخت موجود ہے۔

رودرفورڈ کے ایٹمی ماڈل اور پھر اس کی مدد سے بوہر کے زیادہ حقیقی ایٹمی ماڈل دونوں کی بنیاد تجربات پر تھی اور یہ کسی جامع نظریے کو پیش نہیں کرتے تھے

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنے نواسے حسنؓ کو پیار کر رہے تھے، وہاں ایک صحابی اقرع بن حابسؓ بھی موجود تھے۔ وہ بولے: میرے تو دس بچے ہیں میں نے تو کبھی کسی بچے کو بھی اس طرح پیار نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"

(بخاری)

اصل پیش رفت اروِن شروڈنگر نے کی۔ شروڈنگر نے بروگلی کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اور یہ تصور سامنے رکھتے ہوئے کہ ہر الیکٹرون کے ساتھ ایک موج وابستہ ہے۔ اس موج کی حرکت کو ایک مساوات سے ظاہر کیا۔ یہ مساوات اس مساوات سے ملتی جلتی ہے جو روایتی طبیعیات میں موجی حرکت واضح کرتی ہے۔

جس طرح روشنی میں موجی اور ذراتی خواص بیک وقت موجود ہیں، اسی طرح الیکٹرون میں بھی بیک وقت موجی و ذرّاتی خواص موجود ہیں۔ شروڈنگر کی پیش کردہ "مادی موجوں" کے اس بات کا بھی ثبوت ملا۔ ۱۹۳۰ء میں انگریز طبیعیات داں ڈائرک نے مکمل نظریاتی خیالات پیش کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ الیکٹرون کی حرکات سمجھنے کے لیے نظریۂ اضافیت سے مدد لی جا سکتی ہے اس بنیاد پر ڈائرک نے جو مساواتیں پیش کیں، ان سے ایک نئے ذرے "پوزی ٹران" کی موجودگی سامنے آئی۔ پوزی ٹران ایک "ضد" ذرہ ہے اور ذرّات کے ساتھ ساتھ ضد ذرات کی موجودگی بھی طبیعیات تسلیم کر چکی ہے۔

اِن مدارج سے گزرتے ہوئے ایٹم اب ایک اکائی اور بنیاد نہیں رہا۔ بالخصوص اس کے نیوکلیس پر تحقیقات ایک پیچیدہ عمل ہے۔ ان تحقیقات پر مامور طبیعیاتی شاخ جسے ایٹمی طبیعیات یا نیوکلیئر طبیعیات کہتے ہیں مسلسل معروف عمل ہے۔ پروٹون، الیکٹرون، نیوٹرینو، میزون، نیوٹرانو اور ہائی پرون جیسے بہت سے ذرّات پر تحقیق جاری ہے اور اس غرض سے خاص قسم کی مشینیں استعمال کی جا رہی ہیں۔

ایٹم کے متعلق ایک نسبتاً جدید ماڈل کوارک ماڈل ہے، جس سے ایٹمی ذرات کی کئی خصوصیات کی تشریح ممکن ہوئی ہے۔ چنانچہ اب یہ سمجھا جاتا ہے کہ تمام قسم کے بنیادی ذرّات تین قسم کے ذرات سے بنتے ہیں۔ یہ ذرّات کوارک اور ضد کوارک ہیں۔

بے علمی مفلسی کی ماں ہے۔ جس قوم میں علم و ہنر نہیں رہتا وہاں مفلسی آتی ہے اور جب مفلسی آتی ہے تو ہزاروں جرموں کے سرزد ہونے کی باعث ہوتی ہے۔ اب تم اپنی قوم کے حال پر غور کرو کہ یہ بدبخت لت ان پر آ گئے ہیں۔ بڑے بڑے قدیمی خاندان سب گر پڑے ہیں۔ تمام قوم پر مفلسی، محتاجی اور قرض داری اور ذلت چھا گئی ہے۔ اگر جیل خانوں کا خیال کرو گے تو مسلمانوں کو بلحاظ آبادی اور قوموں سے بہت زیادہ پاؤ گے۔"

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ، جلد ۸، شمارہ ۹ (ستمبر ۸۹ء)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منزل بہ منزل

راحت ابرار

بابائے تعلیم سر سید احمد خاں ؒ نے ۱۸۷۵ء میں جس ادارے کا آغاز صرف سات طلبا سے کیا تھا، آج وہی ادارہ برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کا ایک عظیم مرکز بن گیا ہے۔ قوم کے اس عظیم ورثے کو ہر وائس چانسلر نے اپنی بساط اور استعداد کے مطابق ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرایا مگر موجودہ وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی کی فعال قیادت میں یونیورسٹی نے ترقی کے مختلف مدارج طے کیے ہیں۔ ان چار برسوں میں یونیورسٹی میں کئی نئے شعبے قایم کیے گئے۔ نئی فیکلٹیاں وجود میں آئی ہیں اور نئے تحقیقی اداروں کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔ عمارتوں کے نئے سلسلے تعمیر ہوئے ہیں۔

جناب سید ہاشم علی نے ۸ر اپریل ۱۹۸۵ء کو اس ادارے کی سربراہی قبول کرنے کے بعد پُرامن ماحول اور تعلیمی اصلاحات کے لیے جو منصوبے مرتب کیے تھے، ان کے نتائج اب سامنے آنے لگے ہیں۔ ان چار برسوں میں طلبا اور اسٹاف کی ضروریات پر خاطر خواہ توجہ دی گئی اور ان کو ہر ممکنہ سہولیات بہم پہنچائی گئیں۔ طالب علموں اور ملازموں سے ٹکراؤ کی جگہ خوش گوار تعلقات کا ماحول پیدا کیا گیا۔ طلبا، اساتذہ اور یونیورسٹی انتظامیہ کے درمیان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا۔ ان دانش مندانہ پالیسیوں کی وجہ سے شرپسندوں کی ایک نہ چلی اور یونیورسٹی احتجاجی جلسے جلوسوں اور ہنگاموں سے محفوظ رہی۔ آج مسلم یونیورسٹی غالباً ہندوستان کی واحد یونیورسٹی ہے جہاں سال میں ۱۸۰ دن سے ۲۱۰ دن تک یکسوئی کے ساتھ پڑھائی ہو۔ شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہو جب کوئی نہ کوئی کانفرنس، سیمپوزیم، ورکشاپ یا تجدیدی کورس کا اہتمام نہ کیا گیا ہو۔ یونیورسٹی کا پرامن تعلیمی ماحول خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ادارے کی عظمت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور اب اس یونیورسٹی کو پورے ملک میں مسلمانوں کی علم دوستی کا نشان تصور کیا جانے لگا ہے۔

یونیورسٹی کی اس پرامن اور علمی فضا کو دیکھتے ہوئے دنیا کے ایک ممتاز سائنس داں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام نے جنھیں چالیس سے زائد یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریوں سے نوازا ہے، گزشتہ ماہ جب وہ علی گڑھ تشریف لائے تو یہاں کی علمی فضا سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ انھوں نے پاکستانی وزیر اعظم کو یہ لکھا کہ کراچی یونیورسٹی کے لیے جناب سید ہاشم علی جیسے وائس چانسلر کی ضرورت ہے۔

اپنوں کا تو ذکر ہی کیا بعض "غیروں" نے بھی جب یہاں کی پرامن تعلیمی فضا کو دیکھا تو وہ بھی بہت متاثر ہوئے۔ دو ماہ کی مدت میں جن دانش وروں نے اس یونیورسٹی سے

اسسٹنٹ پبلک ریلیشن آفیسر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

متعلق اپنے خیالات اور احساسات کو قلم بند کیا ہے، اس سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی نے تعلیمی میدان کے ہر محاذ پر کامیابی حاصل کرلی ہے۔

میرٹھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر رمیش موہن نے اپنے تاثرات کو ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے:

"آج جب کہ ہمارے زیادہ تر تعلیمی ادارے ابتری کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں، یہ دیکھ کر بڑی تقویت ہوئی کہ ملک میں علی گڑھ جیسے شائستگی، تہذیب اور ڈسپلن کے چند جزیرے بھی موجود ہیں"

کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر پی۔ کے۔ مہاپاترا کا خیال ہے کہ:

"جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ یہاں کا علمی ماحول اور علمی مزاج ہے جو آج کل ملک میں عنقا ہے"

مدراس یونیورسٹی کے لائبریرین ڈاکٹر پی۔ اے۔ موہن راجن کا کہنا ہے کہ:

"مسلم یونیورسٹی میں مختلف شعبوں کے مابین جو خوش گوار تعلق ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کاش ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے بھی علی گڑھ کے نقشِ قدم پر چلتے"

نامور صحافی خشونت سنگھ نے ابھی حال ہی میں اپنے ہفتہ وار کالم میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ جناب سید ہاشم علی کی وائس چانسلر شپ میں علی گڑھ میں جو پُرامن تعلیمی ماحول ہے وہ گزشتہ ۲۰ سالوں سے دیکھنے میں نہیں آیا۔

جناب سید ہاشم علی جو اب اپنی مدت پوری کر کے ۱۵ اکتوبر ۸۹ء کو اس عظیم دانش گاہ سے رخصت ہو رہے ہیں، ان کا دور اس اعتبار سے کافی اہمیت کا حامل ہے کہ اس عرصے میں انھوں نے انتھک محنت کی یہاں کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

انھوں نے اپنا جائزہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ یہاں کے فرزندوں میں جو احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ تاکہ ان کی ذہانت اور صلاحیتوں کا بھرپور استعمال ہو اور وہ آئندہ زندگی میں اونچے مقام حاصل کرنے کے لیے ابھی سے تیار ہو جائیں۔

وائس چانسلر صاحب کی کوششوں کا یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ بڑوں کا احترام، آرزومندی اور خوداعتمادی کی فضا چپے چپے پر نظر آنے لگی ہے۔

ان کے اس چار سال سے زائد عرصے میں یونیورسٹی نے ترقی کے جن مدارج کو طے کیا ہے ان کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

علمی اصلاحات

کسی بھی دانش گاہ کی ساکھ اور اس کی شہرت محض عظیم الشان عمارتوں سے نہیں بلکہ لائق اور قابل اساتذہ کی تحقیق اور ان کی علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں سے بنتی ہے جس کی بنا پر یونیورسٹی علمی دنیا میں وقار حاصل کرتی ہے۔

اسی خیال کے پیش نظر یہاں اکیڈمک مانیٹرنگ کمیشن (Academic Monitoring Commission) قایم کیا گیا جس میں مختلف شعبہ جات کے پندرہ سینئر اساتذہ کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ اس بات کا پتہ لگائیں کہ تعلیمی معیار کو بلند و بہتر بنانے کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے جائیں اس کے ساتھ ہی جو اساتذہ اپنے فرائض کی انجام دہی کما حقہ پوری نہیں کرتے ان کا بھی پتہ لگایا جائے کیونکہ دیگر یونیورسٹیوں کی طرح یہاں بھی اساتذہ کا ایک چھوٹا سا طبقہ ہے جو اپنی پرانی روش پر قایم ہے اور علمی تحقیق سے گریز کرنے کے علاوہ جو سبق پہلے خود انھوں نے پڑھا تھا بس اسی پر تکیہ کیے ہوئے تھا۔ پندرہ اساتذہ پر مشتمل اس کمیشن کو پانچ ٹیموں میں تقسیم کیا گیا اور پہلی بار اس کمیشن کی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا

جس میں علمی ترقی کے لیے مختلف تجاویز پر غور اور عمل کیا جاتا رہا۔ اس کمیشن کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ درس و تدریس کے کاموں میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، ان کا بروقت ازالہ کیا جا سکے۔

علمی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے اور علم کو تازہ دم کرنے کے لیے توسیعی خطبات کا جو سلسلہ ہے اس کو مزید فعال اور مستحکم بنایا گیا ہے۔ اس عرصے میں پچاس سے زائد دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو مختلف موضوعات پر منعقد ان خطبات کے لیے مدعو کیا گیا تاکہ یہاں کے اساتذہ اور طلبا اپنے علم کی پیاس بجھا سکیں اور ان دانش وروں کے خیالات اور تجربات سے استفادہ کر سکیں۔

علم کے عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح کی کانفرنسوں، سیمیناروں اور ورک شاپوں کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک اور بیرون ملک کے ممتاز دانشوروں کو مدعو کیا گیا۔ شاید ہی کوئی بدنصیب ہفتہ ایسا گزرتا ہو جب کوئی علمی مجلس منعقد نہ ہوئی ہو۔

یہی نہیں بلکہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی ایک بہت بڑی تعداد کو ملک اور بیرون ملک میں منعقد کانفرنسوں میں شرکت کے لیے ہر ممکن مواقع فراہم کرائے گئے اور ان کی مالی معاونت بھی کی گئی۔

نئے شعبہ جات اور کورسوں کا قیام

گزشتہ چار برس کی مدت میں دو درجن سے زائد شعبہ جات اور نئے کورسوں کا آغاز کیا گیا۔ کسی بھی وائس چانسلر کے دور میں غالباً اتنے شعبے قایم نہیں ہوئے جتنے کہ موجودہ وائس چانسلر کے عہد میں قایم ہوئے۔ لائف سائنس اور یونانی میڈیسن کی دو نئی فیکلٹیوں کا بھی اضافہ ہوا۔ جن نئے شعبہ جات کا اضافہ ہوا ان میں کمپیوٹر سائنس، الیکٹرونکس انجینئرنگ، بایوٹیکنالوجی، ڈینٹل سرجری، پلاسٹک سرجری، وائلڈ لائف، میوزولوجی، اکیڈمک اسٹاف کالج، ریموٹ سینسنگ، مرکز مسافتی تعلیم خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ شعبۂ سیاسیات، کامرس، ریاضی وغیرہ میں بھی نئے کورسوں کا آغاز کیا گیا تاکہ ۲۱ ویں صدی کے لیے نوجوان ابھی سے تیار ہو جائیں اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں ان کا بھی کچھ حصہ ہو۔

مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی فروغ پر خصوصی توجہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۱ء کی دفعہ پانچ (۲) (سی) کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی ترقی کو فروغ دینے کی خصوصی ذمہ داری اس کے شانوں پر رکھی گئی ہے۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے اپنی اس نئی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک جامع لائحہ عمل مرتب کیا ہے اور اب یہ ادارہ اپنی پوری توانائی اور قوت عمل کے ساتھ میدان عمل میں آیا ہے اور عزم یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی آگے بڑھے تو ہندوستان کے سارے مسلم ادارے اس کی آواز پر لبیک کہیں اور یہ ادارہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی تعلیمی رہنمائی کا کام انجام دے سکے۔

یونیورسٹی ایکٹ کی اس دفعہ کے صحیح نفاذ کے لیے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی نے تعلیمی مسائل کی نشاندہی کرنے اور ان کے ازالے کے لیے ملک بھر کے مسلم زیر انتظام اداروں کے سربراہوں سے مشورہ بھی کیا کہ یہ یونیورسٹی کن کن امور میں ان کی تعلیمی رہنمائی کا کام انجام دے سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع کی سربراہی میں ۴۲ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دی جس نے کئی مذاکروں اور مباحثوں کے بعد ایک سات نکاتی پروگرام وضع کیا۔

اس کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے پیشہ وارانہ تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے اور مزید کورس شروع کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ان اداروں سے بھی رابطہ قایم کیا جائے جو بڑی تعداد میں ملازمت کے لیے بھرتی کرتے ہیں۔ ان اداروں کے مراکز

بھی یہاں قایم کیے جائیں تاکہ مسلم امیدوار بڑی تعداد میں ان امتحانات میں شریک ہو سکیں۔

مسلم زیرِ انتظام تعلیمی اداروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے تجدیدی کورس اور قلیل المدتی کورس شروع کیے جائیں تاکہ ان اداروں کا معیارِ تعلیم بلند ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی ذہین اور لایق نوجوان جو اپنی معاشی بدحالی کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کی نعمتوں سے محروم ہیں انھیں اسکالر شپ دیے جائیں اور مرکزی و صوبائی سرکاروں سے بھی ان نادار طلبا کے لیے وظیفوں کا بندوبست کیا جائے تاکہ محض غربت کی وجہ سے وہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں۔

مسلم نوجوانوں کو داخلے کے لیے مقابلے کے امتحانات اور روزگار سے متعلق مقابلے کے امتحانات کے لیے کوچنگ اینڈ گائڈینس سینٹر کو مزید فعال بنایا جائے تاکہ یہ طلبا اپنی محنت اور لگن اور لیاقت سے ان امتحانات میں امتیازی حیثیت حاصل کر سکیں۔

اس کمیٹی کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلم طلبا کی اکثریت دینی مدارس سے ہی اپنے علم میں اضافہ کرتی ہے لہٰذا ان مدارس کے نصاب کو جدید ترین بنایا جائے تاکہ یہ طلبا موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبا کو یہاں داخلے کی مزید سہولیات بھی فراہم کرائی جائیں۔

مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ کے تحفظ کے لیے اردو زبان سے واقفیت بہت ضروری ہے۔ علی گڑھ تحریک کے فروغ میں اردو زبان نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے اور علی گڑھ نے بھی اردو کے گیسوؤں کو سنوارا لیکن آج اردو پڑھنے والوں کی تعداد تشویشناک حد تک ختم ہوتی جا رہی ہے، لہٰذا اردو میں مراسلاتی کورس شروع کرنے کی بھی تجویز منظور کی گئی ہے تاکہ خواتین اور دوسرے لوگ مراسلاتی کورس کے ذریعے گھر بیٹھے تعلیم حاصل کر سکیں اور اس طرح خواندگی کی شرح میں بھی اضافہ ممکن ہو سکے۔

مندرجہ بالا تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلمانوں کی تعلیمی و ثقافتی فروغ سے متعلق سینٹر — Centre for promotion of education and Cultural advancement of Muslim of India بھی قایم کر دیا گیا ہے اور پروفیسر عشرت حسین فاروقی کو اس کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ اس سینٹر کی مجلس انتظامیہ میں مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے ممتاز مسلم دانشوروں کو رکھا گیا ہے تاکہ ان کے مفید مشوروں سے مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی کے بارے میں عملی اقدامات اٹھائے جا سکیں۔

مرکز فروغ سائنس

Centre for promotion of Science

مسلمانوں میں سائنس کی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک مرکز کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ اس سینٹر کا بنیادی مقصد مسلمانوں پر سائنسی معلومات کی تحصیل و تخلیق کی اہمیت کو واضح کرنا اور اس ضمن میں انھیں علم و آگہی سے مستفید کرانا اور مسلمانوں کے زیرِ انتظام تعلیمی اداروں بشمول دینی مدارس میں اعلیٰ معیار کی سائنسی تعلیم کے نظریے کو فروغ دینا ہے۔ سینٹر کی یہ بھی کوشش ہے کہ سائنسی تحقیق بالخصوص طبقاتی سائنسی علوم کے لیے مسلمانوں میں باصلاحیت طلبا کو تلاش کرنا اور مطلوبہ سہولتوں کے لیے ان کی رہنمائی اور مدد کرنا۔ اس کے ساتھ ہی سائنس کے اعلیٰ تر مطالعات و تحقیقات کے فروغ کے لیے مناسب اور سازگار اقدامات کرنا۔ یہ سینٹر ہر تین ماہ کے عرصے میں دینی مدارس کے اساتذہ کی ورک شاپ منعقد کرتا ہے اور انھیں جدید سائنس سے روشناس کراتا ہے۔ اس سینٹر کی شاندار کارکردگی کو دیکھتے ہوئے تیسری دنیا کی سائنس اکاڈمی نے بھی اپنے گراں قدر عطیہ سے نوازا ہے۔

مرکز مسافتی تعلیم

نئی تعلیمی پالیسی میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیمی سطح پر سب سے زیادہ ناخواندہ ہیں۔ مسلمانوں کے تعلیمی فروغ کے لیے اس ادارے پر جو ذمہ داری عاید کی گئی

ہے۔ اسی کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو جو کسی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے اب اُن کو گھر بیٹھے مراسلاتی نظام کے ذریعے تعلیم حاصل کرائی جائے گی۔ دینی مدارس کے فارغ التحصیل جن کو ملازمت کے بہتر مواقع فراہم نہیں ہو پاتے اب اُن کو بھی بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کا موقع حاصل ہو جائے گا اور اس طرح وہ بھی ملازمتوں کے اہم دھارے میں شامل ہو جائیں گے۔ یونیورسٹی کے اس سینٹر کا ایک باقاعدہ ڈائرکٹر بھی مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کا ایک ریجنل سینٹر بھی یہاں قایم کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ہر سطح پر قوم کی ناخواندگی دور ہو سکے۔

کل ہند کردار کی بحالی کے لیے علاقائی مراکز

ملک بھر میں تعلیمی اداروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے اس ملی ادارے کا دامن بھی سمٹتا جا رہا تھا اور یہ یونیورسٹی بھی علاقائی یونیورسٹی کا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس ادارے کے کل ہند کردار کی بحالی کے لیے وائس چانسلر نے ملک کے دور دراز علاقوں میں سات مراکز بھی قایم کیے تاکہ دور دراز کی ان ریاستوں کے ذہین اور لایق طلبا کو یونیورسٹی میں داخلے کے لیے فارم اور دیگر معلومات مقررہ وقت پر فراہم ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے داخلوں کے امیدواروں کو کچھ خصوصی مراعات بھی دی گئی ہیں تاکہ اس یونیورسٹی کا کل ہند کردار محفوظ رہ سکے۔

عمارتوں کی تعمیرات

گزشتہ چار سال کے عرصے میں تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بہت سے شعبہ جات کی عمارتوں کے نئے سلسلے تعمیر ہوئے ہیں اور ساٹھ سے زائد کلاس روم کا اضافہ ہوا ہے اور بعض عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اتر پردیش حکومت کے مالی تعاون سے مولانا آزاد لائبریری میں ڈیڑھ سو طلبا کے لیے نئے ریڈنگ روم کا اضافہ ہوا ہے۔

ہاشم صاحب کے دور میں جن عمارتوں کی تعمیرات کا کام شروع ہوا ان میں سینئر سکنڈری اسکول کے لیے نئی عمارت قانون اور کامرس فیکلٹی، ڈینٹل کالج میں ورکنگ ویمنس ہوسٹل کیریر پلاننگ سینٹر کی دو منزلہ عمارت، کمپیوٹر سینٹر، الیکٹرانکس انجینیرنگ، بایوٹیکنالوجی، بزنس ایڈمنسٹریشن، سائنس فیکلٹی، انجینیرنگ فیکلٹی، پٹرولیم انسٹیٹیوٹ میں لیکچر تھیٹر کا قیام آرٹ فیکلٹی اور ایڈمنسٹریٹیو بلاک کی عمارتوں میں توسیع خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

غریب و نادار طلبا کو مالی امداد

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی ایک وجہ ان کی اقتصادی پسماندگی بھی ہے۔ بہت سے مسلم نوجوان پڑھنا تو چاہتے ہیں مگر افلاس اور غربت کی وجہ سے وہ اعلیٰ تعلیم کی نعمتوں سے محروم ہیں۔ اس ملی ضرورت کے پیش نظر موجودہ وائس چانسلر نے اسٹوڈنٹس ویلفیر سینٹر قایم کیا ہے جس میں اب تک پندرہ لاکھ روپیے سے زائد کے عطیات وصول کیے گئے ہیں۔ جو مخیر حضرات دس ہزار کی رقم اس فنڈ میں جمع کراتے ہیں ان کو یونیورسٹی کورٹ کی رکنیت کے لیے عطیہ دہندگان کی فہرست میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ جو عطیات اس فنڈ میں جمع کرائے جائیں گے وہ انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کی دفعہ ۸۰جی کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

اس کے علاوہ ڈیوٹی سوسائٹی کو بھی مزید فعال اور متحرک بنایا گیا ہے اور چار سال کے عرصے میں دس لاکھ روپے کے قریب چندہ وصول کیا گیا ہے تاکہ ہر اس نوجوان کو جو محض غربت کی وجہ سے تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کو مالی امداد فراہم ہو سکے۔

رسالہ تہذیب الاخلاق

سر سید احمد خاںؒ نے اپنی اصلاحی تحریک کے ترجمان کے طور پر ۱۸۷۰ء میں رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا تھا۔ اس رسالے نے مسلمانوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے انھیں ہر شخص واقف ہے۔ اس رسالہ کو سابق وائس چانسلر جناب سید حامد نے دوبارہ

شایع کرایا اور اس کا ہندی روپ "نشانت" کے نام سے جاری کیا جس کو اب موجودہ وائس چانسلر نے یونیورسٹی بجٹ پر لے لیا ہے اور ان دونوں رسالوں کی طباعت اور اشاعت پر جو خرچ آتا ہے وہ یونیورسٹی خزانے سے دیا جاتا ہے

طلبا کو تمام تر سہولیات

گزشتہ چار برسوں میں طلبا کی فلاح وبہبود اور ان کو تعلیم کے بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرانے کے لیے ہر ممکن سہولیات فراہم کرائی گئیں۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں طلبا کو اتنی سہولتیں فراہم نہیں کرائی گئیں جتنی کہ چار برس میں کرائی گئیں

ہاسٹل کے ہر کمرے میں پنکھا، ہر ہوسٹل میں واٹر کولر، ہر کامن روم میں ٹیلیویژن اور ہر ہال اور اسکول میں جنریٹر کی سہولت بہم پہنچائی گئی۔

ہر ہاسٹل کے ہر کمرے میں بجلی کے پنکھے لگوانے پر سولہ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا۔ اس سے قبل چند ہاسٹلوں میں ہی پنکھوں کی سہولیات حاصل تھیں۔ تمام اقامت گاہوں کے ریڈنگ روم میں اور ہر اسکول میں جنریٹر کی سہولت بھی فراہم کرادی گئی ہے تاکہ بجلی کی خرابی کے باعث ان طالب علموں کی پڑھائی کا حرج نہ ہو۔

مسلم یونیورسٹی کیمپس جو اپنی شاندار تاریخی عمارتوں کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے مگر اس یونیورسٹی میں کھانا کھانے اور چائے وغیرہ کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں تھا بلکہ قرب وجوار کے گندے ہوٹلوں اور ڈھابوں کی گندی سیاست بھی یونیورسٹی ہوسٹلوں میں داخل ہونے لگی تھی۔ اس کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے جناب سید ہاشم علی نے تھری اسٹار ہوٹل کے معیار کی ایک سینٹرل کینٹین ۲۰ لاکھ روپیے کی لاگت سے تعمیر کرائی ہے جہاں سستے داموں پر عمدہ کھانا مہیا کیا جا رہا ہے ہندوستان کی کسی بھی دانش گاہ میں اسی طرح کی شاید ہی کوئی کینٹین ہو۔

اس کے علاوہ عبداللہ ہال میں بھی طالبات کے لیے ۵۲ ہزار روپیے کی لاگت سے ایک کینٹین قایم کی گئی ہے تاکہ ان لڑکیوں کو ہاسٹل سے باہر نہ جانا پڑے۔ جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کی ہسپتال کینٹین کے لیے ۳۰ ہزار روپیے منظور کیے گئے تاکہ ہسپتال کے ملازمین اور مریضوں کے تیمار داروں کو اچھا کھانا مل سکے۔

یونیورسٹی کے طلبا اور اسٹاف کو ریلوے کے ٹکٹ مہیا کرانے کے لیے یونیورسٹی کیمپس میں ہی ایک ریلوے بکنگ دفتر قایم کرایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ٹیلیگرام کا بھی دفتر یونیورسٹی احاطہ میں کھلوایا گیا ہے۔

ایم بی بی ایس کی سیٹوں میں اضافہ

مسلم یونیورسٹی کے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں صرف پچاس طلبا کو ہی ایم۔بی بی ایس کے سالِ اول میں داخلے کی سہولت حاصل تھی۔ اب اس کورس میں داخلوں کے لیے سیٹوں میں دوگنا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرب وجوار کے مریضوں کو بہتر طبی امداد مہیا کرانے کے لیے اسپتال میں مزید پانچ سو بستروں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسپتال کے اندر دواؤں کی دوکانیں قایم کرائی گئی ہیں تاکہ بروقت طبی امداد فراہم ہو سکے۔

طلبا کے لیے ڈسپلن کوڈ

یونیورسٹی کیمپس میں امن وقانون کو برقرار رکھنے اور طالب علموں کو ڈسپلن شکنی کی کاروائیوں سے الگ رکھنے کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق بنایا گیا ہے۔ جس میں جرم کے لحاظ سے دس بارہ سزائیں ہیں۔ سزا دیتے وقت اس بات کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی طالب علم کا مستقبل خراب نہ ہو اور ہر غلطی پر نصیحت ہو جائے۔ طالب علموں کو اس طرح کی کوئی سزا نہیں دی گئی جس کا اثر ان کے مستقبل پر پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ چار برسوں میں کسی بھی طالب علم کا یونیورسٹی سے اخراج نہیں ہوا بلکہ اس کو ایسی سزا دی گئی جس سے تنبیہ بھی ہو جائے اور اس کا مستقبل بھی محفوظ رہے۔

ملازمین کی رہائش کے لیے مکانات: سر [illegible]

ایک اقامتی ادارہ ہے مگر یہاں کے ملازمین کی بڑی تعداد کو رہائش کی سہولیات فراہم نہیں تھیں - ایک اندازے کے مطابق صرف پندرہ فیصد کے قریب ملازمین کو ہی یونیورسٹی کے مکانوں میں رہنے کی جگہ نصیب ہو پاتی تھی۔ یونیورسٹی کے ملازمین کی اس پیچیدہ ترین دشواریوں کو دیکھتے ہوئے درجہ چہارم کے ملازم سے لے کر پروفیسر گریڈ تک کے ملازمین کے لیے وسیع پیمانے پر مکانات تعمیر کرائے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جو ملازم اپنا ذاتی مکان بنانا چاہتے ہیں ان کو آسان قسطوں پر قرضہ کی سہولیات بھی فراہم کرائی گئی ہیں۔

طبی امداد

یونیورسٹی کے تمام ملازمین کے لیے طبی امداد کی ایک اسکیم کو پہلی مرتبہ نافذ کیا گیا ہے۔ اس اسکیم سے یونیورسٹی کے تمام ملازمین اور اُن کے متعلقین کو جن کی تعداد تیس ہزار سے زائد ہے، کو طبی امداد فراہم کرائی جا رہی ہے۔ یونیورسٹی کے کسی ملازم یا اس کے متعلقین کو اگر کوئی مہلک بیماری ہو جاتی ہے جس کا علاج علی گڑھ میں ممکن نہیں ہے تو اس کے علاج و معالجہ پر جو رقم خرچ ہوتی ہے وہ بھی یونیورسٹی خود برداشت کرتی ہے۔ اس طبی اسکیم سے یونیورسٹی کے ملازمین کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں

طلبا کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ اقامت گاہوں میں مختلف مقابلے منعقد کیے گئے اور ہر ہال میں سالانہ تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ کل ہند سطح کے تقریری مقابلے میں مسلم یونیورسٹی کے لٹریری کلب نے پہلا انعام حاصل کیا۔ انٹر ورسٹی یوتھ فیسٹول کا اہتمام یونیورسٹی میں کیا گیا اور یہاں کے طالب علموں نے چیمپین شپ کی ٹرافی حاصل کی۔

یونیورسٹی کے ڈرامہ کلب نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیشنل چیمپین شپ کا خطاب حاصل کیا۔

طالب علموں کی ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ہال میگزین شائع کیے گئے۔

کھیل کود

کھیل کود کے میدان میں بھی یونیورسٹی نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ہاکی، ٹیبل ٹینس والی بال میں یونیورسٹی کے طلبا نے بہت سے خطابات اور اعزازات حاصل کیے۔ یونیورسٹی رائڈنگ کلب کی صد سالہ تقریبات کا اہتمام بھی بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔ یونیورسٹی کے گھڑ سواروں نے کل ہند سطح کے مقابلوں میں حصہ لیا اور بہت سے انعامات حاصل کیے۔

> "اگرچہ یورپین زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اسلامی ثقافت اثر انداز نہ ہوئی ہو لیکن یہ اثر جدید عالم کی اس عظیم قوت میں سب سے زیادہ جلوہ گر نظر آتا ہے جسے ہم نیچرل سائنس کہتے ہیں"
>
> [رابرٹ بریفالٹ]

Tahzibul Akhlaq September 1989 Regd. No. L/ALG 343/88 Ph. : 4827

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone : 4185

بانی : سرسید احمد خاںؒ

قومی ہمدردی؟

قوم کی حالت اور اسلام کی حرمت کیسی ہی خراب ہوتی جاوے اس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کو رفع کرنے کا کسی کو خیال نہیں ہے۔ اپنے خیال کے مطابق جو ثواب اور دوسرے جہان میں اپنے چین کرنے کا کام سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ پھر کس طرح خیال ہو سکتا ہے کہ وہ قومی ہمدردی کے کام ہیں بلکہ ٹھیٹ خود غرضی ہے اور امید ہے وہ بھی حاصل نہ ہوگی۔

—— سرسید احمد خاںؒ

آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سرسیدؒ کی فکر اور ان کی برپا کی ہوئی تعلیمی تحریک درست تھی اور ان کی مخالفت کرنے والے غلط..... لہٰذا ضرورت ہے کہ علی گڑھ تحریک کو دوبارہ بڑے زور و شور سے برپا کیا جائے اور اسے ہر ہر شہر اور ہر ہر گاؤں تک پہنچایا جائے۔

—— سید ہاشم علی

ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ لٹریری نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

اغراض و مقاصد

۱۔ جہل، رجعت پرستی اور خود فریبی کے خلاف جد و جہد۔ ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔

۲۔ مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت۔

۳۔ ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔

۴۔ ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵۔ ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا پرچار۔

۶۔ سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷۔ علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلئے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر ہو۔ کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنیوالے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا معہ ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

جلد ۸

شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۸۹ء

ترسیل زر کا پتہ :
ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

Editor : TANZIBUL AKHLAQ & NISHANT.
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زر سالانہ

انڈیا	Rs. 45.00
بیرونی ممالک ہوائی ڈاک	US $ 20.00
عام ڈاک	US $ 8.00

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ
پروفیسر کبیر احمد جائسی
ادارۂ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انڈیا

مندرجات

اداریہ

تہذیب الاخلاق کا یہ شمارہ جس وقت قارئین تک پہونچے گا فضا درود وسلام سے گونج رہی ہوگی اور ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد و لبشر اپنی اپنی وسعتِ فکر و نظر اور توفیق و تائیدِ الٰہی کے مطابق محسنِ انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ہدیۂ درود وسلام پیش کر رہا ہوگا۔ وہی درود وسلام جس کا حکم اللہ نے اِن الفاظ میں دیا ہے :

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ٥

[بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں اِن پیغمبر پر۔ اے ایمان والو تم بھی آپؐ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔]

یوں تو ہر مسلمان باعمل ہو یا بے عمل، عالم ہو یا جاہل، توانا ہو یا ناتواں، بینا ہو یا نابینا چوبیس گھنٹے میں متعدد بار محسن انسانیت کے حضور اپنا ہدیۂ درود وسلام پیش کرتا ہے مگر یہ عمل انفرادی ہوتا ہے۔ ربیع الاوّل کا بابرکت مہینہ آتے ہی یہ انفرادی عمل، اجتماعی عمل میں تبدیل ہوجاتا ہے اور دنیا کے کونے کونے میں محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادیٔ برحق ماننے والے اجتماعی طور پر ہدیۂ درود وسلام پیش کرنے کے لیے محفلیں آراستہ کرتے ہیں سیرت کے جلسے کرتے ہیں اور نعتیہ مشاعرے کرتے ہیں۔ مستورات اپنے اپنے طور پر اجتماعی نظم کرکے مَردوں ہی کی طرح اپنے ہادیٔ برحق کے حضور میں ہدیۂ درود وسلام پیش کرتی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب ہو جو کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی عنوان سے کسی نہ کسی مقام پر اپنے ہادی و رہنما کی خدمت میں ہدیۂ درود وسلام نہ پیش کرتا ہو۔

ربیع الاوّل کے بابرکت مہینے میں ہدیۂ درود وسلام پیش کرنے کا جو اجتماعی نظم کیا جاتا ہے وہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آج بھی مسلمان اللہ کے رسول اور اپنے ہادیٔ برحق محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر عقیدت رکھتا ہے اور اپنے آپ کو اس ذاتِ بابرکات سے جوڑے رکھنا چاہتا ہے۔

عقیدت کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جس شخصیت سے عقیدت رکھے اپنی زندگی کو اس کی سیرت کے سانچے میں اس طرح ڈھال لے کہ دیکھنے والے دور سے اس کو دیکھ کر پکار اٹھیں کہ یہ فلاں آستانے کا غلام ہے۔ عقیدت مند ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ہدیۂ سلام و درود پیش کرتے ہوئے ہم کو خود احتساب بھی کرتے رہنا چاہیے کہ ہم

کس حد تک اپنے ہادیٔ ورہ نما کی اتباع کر رہے ہیں اور کیا کوئی بیگانہ ہماری حالت، عمل و کردار دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم محسن انسانیت، سرورِ کونین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع اور ان کے آستانے کے غلام ہیں ؟

تلخ نوائی معاف! ہم انحطاط کی مختلف راہیں طے کرتے ہوئے اب اس مقام پر آ پہنچے ہیں جس کو اَنا گزیدگی کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ مسلمانوں کے زیر انتظام اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، مسجدیں، خانقاہیں اور مدرسے وہ کون سی جگہ ہے جہاں اَنا گزیدگی کے مناظر نگاہوں کے سامنے نہیں آتے ؟ دنیا کا وہ کون سا خطہ، گوشہ اور چپہ ہے جہاں واقعی اور حقیقی معنوں میں یتیم کے سر پر دستِ شفقت پھیرا جاتا ہو اور اس کے مال کی حفاظت اپنے مال کی طرح کی جاتی ہو ؟ ناداروں، مسکینوں، غریبوں اور بیواؤں کے ساتھ وہ حسن سلوک کیا جاتا ہو جس کے سبب ان کو اپنی کم مائگی اور فروتنی کا احساس تک نہ ہو ؟ لڑکیوں کو وراثت میں وہی حصّہ دیا جاتا ہو جس کا حکم ہمارے آقائے نامدار نے دیا ہے ؟ اکرام مومن کے وہ مناظر نظر کے سامنے آتے ہوں جو کسی زمانے میں غلامانِ بارگاہ نبوی کا خاصہ سمجھے جاتے تھے ؟

ظہورِ اسلام سے پہلے کے جاہل عربوں کا عالم تو حالیؔ کے الفاظ میں یہ تھا ؂

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا ؎ کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

یہ سارے جھگڑے اَنا گزیدہ ہونے کے سبب سے تھے۔ یہ تو درست ہے کہ ہم نہ تو گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا کرتے ہیں اور نہ ہی پانی پینے، پلانے پر مگر مسجدوں میں نماز کی امامت کے مسئلہ پر، اوقات نماز کی تبدیلی کے سلسلے میں، خالی ہوئی مسندِ رشد و ہدایت پر براجمان ہونے کے لیے، مدرسہ کا ناظم و مہتمم بننے کے لیے، خانقاہوں کی سجادہ نشینی کے لیے جو جھگڑے ہوتے ہیں کیا وہ اَنا گزیدگی کا مظہر نہیں ہیں ؟ انانیت اب ہماری قوم کی رگ رگ میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہمارا اپنا خون معلوم ہونے لگی ہے اسی لیے ہم کو اس کی مضرت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ محسن انسانیتؐ کا کوئی غلام کوئی پیرو اور کوئی امتی اَنا گزیدہ ہوسکتا ہے ؟ ہمارا خیال ہے کہ اَنا گزیدہ تو فرعونِ بے ساماں ہوتا ہے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی امتی نہیں۔ اس لیے اس بابرکت مہینے میں ہم کو خود احتسابی کے عمل میں مصروف ہونا چاہیے اور عہد کرنا چاہیے کہ ہم اپنی زندگی کو آپؐ کی سیرت کے مطابق ڈھالیں گے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اس کا صرف یہی مطلب ہے کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف زبانی محبت کرتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھلنے کے لیے قطعاً آمادہ نہیں۔ محبت کی دنیا میں زبانی محبت ایک کھوٹا سکّہ ہے حقیقی محبت تو یہ ہے کہ :

اُنہی کو سب پکار اُٹھیں گذر جاؤں جدھر ہو کر

کیا ہم میں آج بھی ایسے لوگ ملتے ہیں ؟

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی ماہ مبارک میں ۱۷ اکتوبر کی بھی تاریخ پڑرہی ہے جو خانوادۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے فرد کی تاریخ پیدائش ہے جس کا نام اس کے والدین نے سید احمد رکھا تھا اور جو بعد میں اپنے کارناموں کی وجہ سے سر سید احمد خاں کے نام سے معروف و مشہور ہوئے۔ اس حسینی سید کو یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سینتیسویں[۳۷] پشت میں پیدا کیا اور اس کا میدان عمل اسی

شمالی ہند کو مقرر کیا جو زوال و انحطاط کی منہ بولتی تصویر بن چکا تھا۔ ابھی وہ چالیس سال ہی کا ہوا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں وہ واقعہ رونما ہوا جسے اگر قیامتِ صغریٰ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی جس کو انگریزوں اور ان کے حواریوں نے غدر کا نام دیا، ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے سروں سے جوئے خون بن کر گذر گئی۔ ایسے حوصلہ شکن اور نازک وقت میں سید احمد نے اپنے جدِ امجد کی سیرت پاک کو مشعل راہ بنایا اور اللہ کا نام لے کر اپنی کشتی دنیا کے گرداب بلا میں ڈال دی۔ دوسروں نے تو کم ہی مگر اپنوں نے ان کی راہ میں نہ صرف تعصبات و تاملات کے کانٹے بچھائے بلکہ قلم اور زبان سے وہ سنگ باری کی کہ ان کے سارے وجود سے خون رسنے لگا مگر انھوں نے اپنے جد امجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر عمل کرنے کا عزم مصمم کر رکھا تھا اس لیے نہ تو تعصبات و تاملات کے کانٹے ہی ان کو ان کی راہ سے ہٹا پائے اور نہ ہی زبان و قلم کی سنگ باری ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کر سکی۔ انھوں نے کم علمی سے نفرت کی کم علموں سے نہیں، جہالت سے نبرد آزمائی کی جاہلوں سے نہیں، کاہلی کے خلاف صف آرا ہوئے کاہلوں کے نہیں۔ اپنے جد امجد کی سیرت مبارکہ پر عمل کرنے کا اللہ نے ان کو یہ انعام دیا اُن کے سارے کاموں میں اخلاص پیدا ہوا اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ جس کام میں اخلاص کی روح جاری و ساری ہوتی ہے اللہ کی طرف سے استحکام اور پائداری اُسی کو نصیب ہوتی ہے۔

ان کے رہبر و ہادیٔ برحق پر جب سر ولیم میور نے ناروا حملے کیے تو باوجود اس کے کہ خود اُن کی قوم ان کو کرسٹان اور نیچری کے القاب سے یاد کرتی تھی، انھوں نے اپنا اثاثہ بیچ کر لندن کے دیارِ ظلمت میں بیٹھ کر "خطبات احمدیہ" تصنیف کی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ ناموس رسول کے تحفظ کا علمی انداز یہ ہے کھوکھلی اور وقتی نعرہ بازی نہیں۔ انگریزوں کے استیلا کے بعد جب بہت سے مسلمان انگریزی تہذیب و تمدن اور عیسائی مشنریوں سے متاثر ہو کر اپنے مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے تو سر سید احمد خاں ہی آگے بڑھے اور انھوں نے کلام پاک کی تفسیر لکھنی شروع کی جو اگر چہ مکمل نہ ہو سکی مگر جس حد تک بھی لکھی گئی وہ اس زمانے کے بہت سے لوگوں کے لیے مشعل راہ بنی اور اسی کے ذریعہ نہ جانے کتنے افراد عیسائی مشنریوں کے سحر سامری سے نجات پا گئے۔ سر سید نے یہ تفسیر راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لیے نہیں لکھی تھی بلکہ ان کے مخاطب وہ جدید تعلیم یافتہ افراد تھے جو تشکیک کا شکار تھے اس لیے ان کی تفسیر کا مطالعہ کرتے وقت اس بنیادی بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اگر یہ بنیادی بات فراموش کر دی گئی تو نہ تو سر سید سے انصاف کیا جا سکے گا اور نہ ہی ان کی تحریر کردہ تفسیر سے۔

سر سید احمد خاں کی وفات سے لے کر اب تک دنیا کتنے انقلاب دیکھ چکی، کتنے جمے جمائے شہرۂ آفاق تعلیمی ادارے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے، بہت سے وہ تعلیمی ادارے جو ان کے عہد حیات میں عالمگیر شہرت کے حامل تھے آج مقامی شہرت کے حامل ادارے بن کر رہ گئے ہیں مگر سر سید نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو جس طرح اپنی زندگی کا جزو بنایا اس کا صلہ اللہ نے ان کو یہ دیا کہ ان کا قایم کردہ تعلیمی ادارہ روز افزوں ترقی کرتا جا رہا ہے اور دین و دنیا کا جو مطلوبہ امتزاج اس ادارے کے گوشے گوشے میں نظر آتا ہے شاید ہی وہ کسی اور ادارے میں نظر آئے۔

ہر سترہ اکتوبر کو علی گڑھ کے فرزندان خواہ وہ دنیا کے کسی ملک میں ہوں یوم سر سید مناتے ہیں۔ اپنے محسنوں اور بزرگوں کو یاد رکھنا زندہ قوموں کی نشانی ہے مگر ان کو یاد کرتے وقت یہ یاد کرنا بھی ضروری ہے کہ ان کو کس چیز نے

یہاں سے تک پہونچا یا۔ سرسید احمد کو جو بھی عزت، شہرت اور کامیابی ملی وہ صرف اتباع رسولؐ کا نتیجہ تھی۔ اس لیے جو سید کو یاد کرنے والوں کا یہ فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کو سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ڈھالنے کی سعی مسلسل کریں تاکہ اللہ ان کے کاموں میں برکت دیتا ہے اور چراغ سے چراغ جلنے کا عمل جاری رہے۔

اس سال اکتوبر ہی کے مہینے میں تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کے صدر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اپنے عہدے کی مدت کارکردگی پوری کر کے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ سید ہاشم علی صاحب نے تہذیب الاخلاق کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے اس کو یونیورسٹی بجٹ پر لیا جو اس کی بقا کا ضامن بن گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ادارہ تہذیب الاخلاق اور نشانات کے عملے کی جو بھرپور مدد کی اللہ اس پر جو اعتماد کیا اس کے لیے ادارے کے تمام ارکان ان کے شکرگزار ہیں۔ علاوہ بر ایں وہ اپنی مصروفیات کے باوجود تہذیب الاخلاق کو اپنے رشحات قلم سے بھی نوازتے رہے۔ ایک دن سب ہی کو اپنے اپنے عہدوں سے سبکدوش ہونا ہے مگر بعض سبکدوش ہونے والے ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو تا دیر اُن کی یاد کو قایم رکھتے ہیں۔ سید ہاشم علی صاحب بھی ان ہی افراد میں ہیں جو ہم کو تا دیر یاد آتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں عزت و وقار کی زندگی گذاریں اور ان کو اطمینان و سکون، صحت اور نفس مطمئنہ حاصل رہے۔ آمین

کبیر احمد جائسی

Aligarh Muslim University

OFFICE OF THE VICE CHANCELLOR
UNIVERSITY ROAD ALIGARH-202 002
TELEPHONE OFF 3994 RES 3173 TLX 564-230 AMU-IN

SYED HASHIM ALI
VICE CHANCELLOR

مکتوب شیخ الجامعہ

میرے عزیز بچو !

اس سے قبل میں تہذیب الاخلاق کے ذریعے آپ سے بار بار مخاطب ہوتا رہا ہوں اور یونیورسٹی کے مختلف مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتا رہا ہوں۔ اب جب کہ میں اپنے عہدے کی مدت کارکردگی پوری کرکے آپ سے رخصت ہو رہا ہوں جی چاہتا ہے کہ آپ سے پھر کچھ باتیں کرتا چلوں۔

میں جب ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو میرا دل خدا کے شکر سے لبریز ہو جاتا ہے کہ اس نے مجھے اتنی قوت، طاقت اور عملی اقدام کی ہمت و جرأت دی کہ اسلامیان ہند نے مجھ کو جو امانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شکل میں دی تھی اس کو میں پہلے سے بہتر حالت میں ملت کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نے اپنے علی گڑھ کے دوران قیام اس بات کی پوری کوشش کی کہ آپ کو سستی نعرہ بازی، وقتی ہنگامہ آرائی اور جذباتی نادانی سے بچائے رکھوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ آپ نے میرے اقدام کو نہ صرف سراہا بلکہ اسی کے مطابق عمل کرکے اپنی مادر علمی کو ہنگاموں اور خلفشار سے بچائے رکھا۔ میرے وائس چانسلری کے دور میں آپ کو نہ تو جلوس نکالنے کی ضرورت پڑی نہ جلسے کرنے کی، نہ اسٹرائک کی ضرورت محسوس ہوئی نہ امتحانات سے واک آؤٹ کی۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی مادر علمی میں وہ ماحول بنائے رکھا جس سے صرف آپ ہی کی نیک نامی نہیں ہوئی آپ کے بڑے بھی دنیا کی نگاہوں میں سرخ رو ہوئے۔

آپ کو معلوم ہی ہے کہ سر سید احمد خاںؒ نے کن نامساعد حالات میں اس تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی تھی اور اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی حالت کیا تھی ؟ آپ کی مادر علمی ایک منارۂ نور بنی اور اس کی ضیا پاشیوں سے ہندوستان ہی نہیں بہت سے ممالک جگمگا اٹھے۔ آپ جب یونیورسٹی کا ترانہ پڑھتے ہیں تو یہاں کی شام کو شام مصر اور رات کو شب شیراز کہتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ سارے جہاں کا سوز و ساز آپ کی مادر علمی میں موجود ہے۔ کیا کبھی آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ آپ کی شام مصر کو دھندلی اور شب شیراز کو تاریک کر دینے کی کیسی پُر فن کوششیں ہو رہی ہیں ؟ کیا آپ نے کبھی اس بات کو محسوس کیا ہے کہ بے بنیاد افواہیں پھیلا کر آپ کو کس طرح اضطراب میں مبتلا کیا جا رہا ہے اور اس بات کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں کہ آپ کا اضطراب اجتماعی غصہ کی شکل اختیار کرکے آپ کی نیک نامی کو بدنامی سے بدل دے ؟ آپ صرف مستقبل اور کل ہی کے امین نہیں ہیں آپ اپنی مادر علمی کے بھی امین ہیں۔ میں نے ایک بار کہا تھا اور آج پھر کہہ رہا ہوں کہ یہ درس گاہ آپ کی ہے یہاں کی ایک ایک اینٹ بلکہ ذرہ ذرہ آپ کا ہے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنی مادر علمی کی عزت و وقار کی اسی طرح حفاظت کریں جس طرح مادر حقیقی کی عزت و وقار کے لئے آپ سینہ سپر رہتے ہیں۔

آپ کو شاید یاد ہو میں نے علی گڑھ میں اپنے عہدے کا جائزہ لینے کے بعد بڑے واضح الفاظ میں یہ

اعلان کیا تھا کہ میں یہاں کے کسی گروپ کا ہو کر نہ رہوں گا۔ آج جبکہ میری مدت کارکردگی ختم ہونے میں صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں میں بڑے فخر کے ساتھ اُسی بات کو دُہرا رہا ہوں کہ میں علی گڑھ میں کسی گروپ کا ہو کر نہیں رہا۔ میں نے سب کی بات سنی، سب کو ساتھ لے کر کام کیا، ہر صاحب صلاحیت کی طرف میں نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ طلبہ، اساتذہ اور انتظامیہ کے اراکین نے مجھ سے ہر ممکن تعاون کیا جس کی وجہ سے میں خوش اسلوبی کے ساتھ انتظامی اور تعلیمی امور کی نگرانی کرتا رہا۔

یہاں میں ان لوگوں کا بھی تھوڑا سا ذکر کر دینا چاہتا ہوں جن کا کام صرف افواہیں پھیلانا اور دوسروں کی پگڑی اچھالنا ہے۔ اگرچہ علی گڑھ میں ایسے لوگوں کی تعداد نسبتاً کم ہے مگر میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ ان کے مکر و فریب سے بچے رہیں اور اِن دوست نما دشمنوں کو خوب اچھی طرح پہچان لیں، یہ آپ کو جذبات کے سمندر میں ڈھکیل کر خود ساحل سے نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ آپ کی مادر علمی کے نہ تو کبھی بہی خواہ تھے اور نہ ہو سکتے ہیں اس لئے آپ کو کمال دانش مندی سے ایسے افراد سے نہ صرف کنارہ کش رہنا ہے بلکہ ان پر نظر بھی رکھنی ہے کہ وہ آپ کی مادر علمی کو اپنی کم نظری کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہونچا سکیں۔ آپ کے لیڈر موجودہ طلبا میں سے ہونے چاہئیں نہ کہ ایسے لوگ جو جامعہ سے بد اطواری فتنہ پردازی اور بد تمیزی کی بنا پر نکال دئے گئے تھے۔ ان لوگوں کا مقصد زندگی آپ کی نا تجربہ کاری اور شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانا ہے تاکہ یونیورسٹی میں بدامنی پھیلے اور پھر سے ان کا راج ہو جائے۔ اب آپ کی یونیورسٹی کے بارے میں اتنی اچھی شہرت سارے ہندوستان میں ہے کہ اس کا شمار ہندوستان کی پندرہ بہترین جامعات میں ہونے لگا ہے۔ خدا را اس شہرت کو قائم رکھیے اور اپنے مستقبل اور قوم کی نیک نامی کو دوسری تمام باتوں پر ترجیح دیجئے۔

آج کی دنیا سخت مقابلے کی دنیا ہو چکی ہے میری خواہش ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ہر طالب علم اس مقابلے کی دنیا میں کامیاب و کامران ہو، ایسا صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو تعلیم اور صرف تعلیم کے لیے وقف کر دیں اور اپنے آپ کو اس قابل بنائیں کہ ہر مقابلے میں سرخرو ہوں۔ کل کی دنیا کی قیادت آپ کے ہاتھوں میں آنے والی ہے آپ جس حد تک اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کریں گے اس حد تک کامیابی و کامرانی آپ کے قدم چومے گی۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نادانوں کی نادانیوں سے بچنے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مَیں ایک بار پھر آپ کا اس بات کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ ہر ہر قدم پر تعاون کیا جس کی وجہ سے آپ کی مادر علمی کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہوا۔ میں آپ سب کی خوش گوار یادیں لے کر علی گڑھ سے رخصت ہو رہا ہوں اور آپ سب کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اس کی رحمت آپ پر سایہ فگن رہے۔

خدا حافظ

[illegible]

۲ - ۱۰ - ۹۶ء

دیباچہ

خطباتِ احمدیہ

عجائباتِ دنیا میں سب سے زیادہ عجیب وہ خیال ہے جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں مذہب اُس امتیاز کا نام ہے جو انسانوں کے افعال سے علاقہ رکھتا ہے اور جس کے سبب انسانوں کے افعال اچھے یا بُرے یا نہ اچھے نہ بُرے خیال کئے جاتے ہیں کیونکہ اگر انسان کے افعال میں یہ تمیز نہ ٹھہرائی جائے تو کسی مذہب کا وجود باقی نہیں رہتا۔

تمام خیالات جو انسان میں پیدا ہوتے ہیں اور تمام یقین جو انسان کسی چیز پر رکھتا ہے اُس کا منشا اُن خیالات اور یقین کے سوا کچھ اور چیزیں ہوتی ہیں جو اُن خیالات اور یقین کے اسباب سمجھی جاتی ہیں مگر تعجب یہ ہے کہ وہ خیال جس کو مذہب کہتے ہیں بغیر کسی خارجی اسباب کے اور بغیر تجربہ اور امتحان کے اور بدون کسی معقول ثبوت کے یکایک دل سے اٹھتا ہے اور اس لیے وہی اس کا مخرج سمجھا جاتا ہے اور پھر اُس پر ایسا یقین ہوتا ہے کہ کسی آنکھ دیکھی چیز پر بھی نہیں۔

اس تعجب پر اور تعجب یہ ہے کہ اُس ان دیکھی چیز اور اَن سمجھی بات اور بے دلیل خیال کا لوگوں کی طبیعت پر ایسا سخت اثر ہوتا ہے کہ وہ اثر انسان کے تمام افعال پر اور قدرتی جذبات پر جو انسان میں خدا نے پیدا کئے ہیں غالب ہو جاتا ہے اور جو جوش و ولولہ اس از خود پیدا ہوئے خیال سے انسانوں کی طبیعتوں پر ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا گو کہ اُس دوسری چیز کے صحیح اور یقینی ہونے کے لیے کیسی ہی عمدہ عمدہ دلیلیں اور کیسے ہی قطعی ثبوت موجود ہوں۔

اگر وہ خیال تمام انسانوں میں مختلف نہ ہوتا تو شاید یہ کہا جا سکتا کہ تمام عالم کا اُس پر یقین رکھنا ہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے مگر تعجب تو یہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر قوم اور ہر ملک اور ہر فرقہ بلکہ ہر فرد بشر میں وہ خیال ایسا مختلف رہا ہے کہ کسی ایک پر بھی یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور اس پر تعجب یہ ہے کہ ہر شخص کو یہ یقین ہے کہ جس طرح یونانی اپنے خدا اور دیوتا پر اور مسلمان و یہودی اپنے ایک خدا پر اعتقاد اور یقین کامل رکھتے ہیں اسی طرح ہندو اور مصری اپنے تینتیس کروڑ دیوتاؤں پر اعتقاد و یقین کامل رکھتے ہیں۔

کیا یہ مسئلہ کہ تمام چیزیں ایک ہی کل کے جزو یا اُس کی عین یا وہ بمنزلۂ جان اور یہ بمنزلۂ جسم کے ہیں صحیح ہے کیا یہ سب مختلف چیزیں جو ہم کو دکھائی دیتی ہیں سب ایک ہیں کیا نور و ظلمت اور کالا اور سفید دونوں یکساں مفید ہیں جیسا کہ ایک عارف باللہ کہتا ہے ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یا یہ مسئلہ صحیح ہے کہ تمام چیزوں کا اسی سے ظہور ہے
وہی ظلمت کا باعث اور وہی نور کے ظہور کا سبب ہے
وہی آسمانوں پر کڑکتا ہے اور وہی زمینوں پر برساتا ہے
وہی ستاروں کو چمکاتا ہے اور وہی پھولوں کی کلیوں کو کھلاتا
ہے اسی کا جلوہ بہشتوں کی بہار اور اسی کا بردہ دوزخوں
کی آفت ہے غمگین دل کا غم اور شادان دل کی شادی
اسی سے ہے وہ کسی جگہ نہیں اور سب جگہ ہے وہ کسی میں
نہیں اور سب میں ہے عابد کے نورانی سینے اور فاسق کے
بریاں دل اور معشوق کے عاشق کش ابرو اور عاشق کی گریاں
چشم سب میں اس کی یکساں جگہ ہے جس طرح وہ آسمانوں
اور زمینوں میں ہے اسی طرح سے وہ باریک سے باریک
بال میں بھی ہے وہ سب کو دیکھتا ہے اور ہر چیز کو جانتا
ہے مگر اس کا جاننا یا علم ہم سے دو درجہ الگ ہے کیونکہ وہاں
ماضی اور استقبال نہیں ہے بہرحال اس بن دیکھی جناب
اور ان سمجھی ذات کو جو کہو سو کہو مگر ان تمام مشکلوں پر ہم کو یہ
مسلمانی مسئلہ کہ "انا عند ظن عبدی بی" اور بھی مشکل
میں ڈالتا ہے۔

ربی انت عند ظنی رحیم فارحم علی

پھر ہم کو اور زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ
یہ تمام مختلف خیالات جو لوگوں کے دلوں میں ہیں اور جو
مذہب کہلاتے ہیں وہ ایک ہی مخرج سے یعنی دل سے نکلے
ہیں اور دل کے اس فعل کا جس سے یہ خیالات پیدا ہوتے
ہیں اعتقاد نام رکھا جاتا ہے پس اگر مدار مذہب کا اعتقاد
ہو تو ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط ٹھہرانے کی کوئی وجہ
نہیں ہو سکتی۔

کیا وجہ تمیز کی ہے اس سچی دلی پرستش میں جو ابراہیم کے
باپ نے ایک بت کی کی اور اس سچے دل کے خیال میں جس سے
ابراہیم نے اپنے باپ کے اس بت کو توڑا۔

ایک ہی واقعہ حضرت مسیح کے قتل کا ہے جو کالوری
کی پہاڑی میں بیت المقدس کے پاس گذرا ان بے رحم
قاتلوں نے اپنی دانست میں جو کچھ کیا مذہبی نہایت سچے اور
مستحکم اعتقاد اور دل کے کپکپا دینے والے ایمانی جوش
سے کیا پس ان دو گروہوں میں سے جو نہایت سچے دل سے
اس کو نہایت ہی نیک کام سمجھتے ہیں اور جو نہایت پاک دلی
سے اس کو نہایت ہی بدکام جانتے ہیں کونسی چیز تفرقہ
کرنے والی ہے۔

کیا وجہ تمیز کی ہے سینٹ پال کی اس حالت میں جب
کہ وہ دلی اعتقاد اور ایمان کے جوش سے ان لوگوں کا
ساتھی تھا جنہوں نے سینٹ اسٹیفن شہید کو سنگسار کیا اور
اس حالت میں جب کہ اس نے اپنے سچے دلی اعتقاد سے
حضرت مسیح کو مانا۔

کیا چیز ہے جس سے ہم عمرؓ کی اس حالت میں تمیز کریں
جب کہ اس نے لات و منات پر سچا دلی اعتقاد رکھ کر
امینؐ عرب کے قتل پر کمر باندھی اور اس حالت میں جب
کہ اس نے نہایت سچی دلی تصدیق سے کہا کہ اشھد ان
محمداً رسول اللہ۔

یہ وہی عجیب خیال ہے جو دونوں طرف برابر نسبت
رکھتا ہے اور جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں پس ایسی ذوجہتین
چیز کی جو ضدین میں برابر نسبت رکھتی ہو کسی جہت پر یقین
کرنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ ان تمام خیالوں میں سچا خیال
یا تمام مذہبوں میں سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو ضدین
میں برابر نسبت رکھنے کے نقص سے پاک ہو۔

مذہب کیا چیز ہے وہ ایک ایسا سچا اصول ہے کہ
جب تک انسان اپنے قوائے جسمانی اور عقلی پر قادر ہے
اس کے تمام افعال ارادی، جوارح نفسانی و روحانی کا
اسی اصول کے مطابق ہونا چاہیئے پھر اگر وہ اصول ایسے ہیں
کہ صرف کسی قسم کے اعتقاد پر مبنی ہیں تو اگر متعدد لوگوں کا
متضاد اصولوں پر کسی وجہ سے اعتقاد ہے تو ایک کو سچا یا

صحیح اور دوسرے کو جھوٹا یا غلط کہنے کی بجز تحکم کے اور کوئی وجہ نہیں سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے جس کی سچائی نہ کسی اعتقاد پر بلکہ حقیقی سچائی پر مبنی ہو کیونکہ مذہب اعتقاد کی فرع نہیں ہے۔ بلکہ سچائی مذہب کی اصل یعنی عین مذہب ہے اور اعتقاد اس کی فرع ہے پس جبکہ ہم مختلف مذہبوں میں سے سچے مذہب کو پرکھنا چاہیں تو دیکھیں کہ وہ سچے اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔

سچا اصول کیا ہے؟ جہاں تک کہ انسان اپنے قوائے عقلی سے جان سکتا ہے وہ بجز قدرت یا قانون قدرت کے اور کچھ نہیں جس کی نسبت اسلام کے بانی نے یہ فرمایا کہ "مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ط ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝"

قدرت یا قانون قدرت کیا ہے وہ وہ ہے جس کے بموجب اُن تمام چیزوں مادی یا غیر مادی کا جو ہمارے اردگرد ہیں ایک عجیب سلسلۂ انتظام سے وجود ہے اور ہمیشہ انہی کی ذات میں پایا جاتا ہے اور کبھی اُن سے جدا نہیں ہوتا قدرت نے جس طرح پر جس کا ہونا بنا دیا ہے بغیر خطا کے اسی طرح پر ہوتا ہے۔ اور اُسی طرح پر ہوگا۔ پس وہی سچ ہے اور جو اصول اُس کے مطابق ہیں وہی سچے اصول ہیں نہ وہ جن کی بنا ایک فانی قابل سہو و خطا وجود یعنی انسان کے اعتقاد پر منحصر ہو۔

قدرت ہم کو صرف اپنے وجود اور اپنے سلسلۂ انتظام اور اپنے تعلقات ہی کے جو بے انتہا مخلوق میں پایا جاتا ہے سچائی نہیں دکھلاتی بلکہ اُس سے ایسے بھی اصول پائے جاتے ہیں جن سے ہم اپنے افعال ارادی جسمانی اور روحانی کی بھلائی اور برائی بھی جان سکتے ہیں اور جبکہ قدرت سچی اور کامل ہے تو ضرور ہے کہ وہ اصول بھی سچا اور کامل ہو اور [illegible] سچا اور کامل اصول یا قانون ہو کہ وہ مذہب جس کے اصول اُس کے مطابق ہیں وہی سچا مذہب ہونے کا مستحق ہے۔

یہ مت سمجھو کہ ہم قدرت یا قانون قدرت ہی کو سبب یا اخیر سبب اس تمام کارخانے کا سمجھتے ہیں جس کا کوئی خالق نہ ہو جیسے کہ دہریوں کا مذہب ہے نعوذ باللہ منہا بلکہ قدرت کو تو ہم ایک قانون کہتے ہیں جس کا کوئی بنانے والا ہے اور اسی لیے ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ تمام سلسلہ ایک ہی مسبب اور ایک ہی اخیر سبب پر ختم ہوتا ہے جس پر تمام چیزوں کی ہستی منحصر ہے وہ جس کی اَن پہچان ذات کو ہزاروں لاکھوں کروڑوں ناموں سے لوگ پکارتے ہیں۔ "او میرے پیارے خدا تم پردے میں تو ہو پر سب پر ظاہر ہوا ایسے جھوٹ موٹ کے پردے سے کیا فائدہ۔"

رشک آیدم وگرنہ نقابت کشودمے
دستِ ترا گرفتہ بہ عالم نمودمے

معاذ اللہ توبہ توبہ میں نے کیا کہا کہیں کافر تو نہیں ہوگیا "الٰهی انت عبدی وانا ربك استغفر الله انت ربی و انا عبدك" پس آدمی کو چاہیے کہ اس کارخانۂ قدرت سے اس کے بنانے والے کو اور اُس کی راہ کو یا اُس کی راہ بتانے والے کو تلاش کرے کہ یہی سیدھی سڑک سیدھا راستہ چلنے کا ہے۔

مذہب کی تمثیل میں علماء اسلام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے کیسی کیسی غلطیاں کی ہیں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں بعضوں نے مالک اور غلام کی تمثیل دی ہے اور فرمایا ہے کہ مذہب اور شریعت کو مصالح قدرت اور اعمال کو اس کے بدلے یعنی جزا اور سزا سے کچھ مناسبت نہیں اور اس کے اوامر و نواہی میں بجز اس کے کہ مالک کا حکم بجا لانا ہے اور کچھ فائدہ نہیں شاید ان لوگوں کا خدا ایسا ہو جو لغو کام کرے لیکن میرا تو خدا ایسا نہیں وہ تو نہایت دانا اور سب سے بڑا حکیم مطلق ہے اُس کی تو کوئی بات بھی حکمت اور منفعت سے خالی نہیں۔

اس رائے کو تو شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی غلط ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ "قد یظن ان احکام الشریعۃ غیر متضمنہ لشی من المصالح وانہ لیس بین الاعمال وبین ما جعل اللہ جزاء لہا مناسبۃ وان مثل التکلیف بالشرائع کمثل سید اراد ان یختبر طاعۃ عبدہ فامرہ برفع حجر اولمس شجر مما لا فائدۃ فیہ غیر الاختبار فلما اطاع او عصی جوزی بعلمہ وھذا ظن فاسد تکذبہ السنۃ واجماع القرون المشہود لہا بالخیر

بعض عالموں نے مالک اور بیمار غلام سے مذہب کی تمثیل دی ہے جس پر مالک نے اُس کے علاج کے لیے اپنا مصاحب مقرر کیا ہو اور اس مصاحب کے حکم کو ماننا باعث نجات اور نہ ماننا باعث درکات ٹھیرایا ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب بھی حجۃ البلاغہ میں اسی رائے کو صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ وَظہرِ ہما ذکرنا ان الحق فی التکلیف بالشرائع ان مثلہ کمثل سید مرض عبیدہ فسلط علیھم رجلا من خاصتہ لیستقیم دواء فان اطاعواہ السید ورضی عنھم سبین ھم واثابھم خیرا ونجوا من المرض وان عصوہ عصوا السید واحاط بھم غضبہ وجازھم اسوء الجزاء وھلکوا من المرض۔

مگر میں اس کو نہیں مانتا اور پوچھتا ہوں کہ دوا کا کرنا باعث نجات کا تھا یا مصاحب کے حکم کا ماننا تھا اگر بے حکم مصاحب کے بھی وہ دوا کرتا تو نجات پاتا یا نہیں ضرور پاتا اس لئے کہ اس دوا سے نجات پانا قدرت کا قانون تھا جو کسی طرح بدل نہیں سکتا۔

بعضے عالموں نے مذہب کی تمثیل ایسے طبیب سے دی ہے جو نہ تو خود کسی چیز کو امرت بتاتا ہو اور نہ کسی کو ہلاہل ٹھیراتا ہو بلکہ ہر چیز میں قدرت نے جو اثر رکھا ہے اُسی کو بتاتا ہو۔ تاکہ جو لوگ صحیح ہیں اپنے حفظ صحت کے اصول جانیں اور جو بیمار ہیں وہ اصول صحت کی دوا کو پہچانیں اور مذہب بہ نسبت اس کے کہ صرف بیمار غلاموں ہی کے لیے ہو سب کے لیے عام ہو جائے۔

افسوس کہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں اس رائے کو نہیں مانتے چنانچہ وہ لکھتے ہیں " وانہ لیس الامر علی ما ظن من احسن الاعمال وقبحہا بمعنی استحقاق العامل الثواب والعقاب عقلیان من کل وجہہ وان الشرع وظیفۃ الاخبار عن خواص الاعمال علی ما ھی علیہ دون النشاء الایجاب والتحریم بمنزلۃ طبیب یصف خواص الادویۃ وانواع المرض فانہ ظن فاسد تمجہ السنۃ بادی الرائے۔

مگر میں اسی کو مانتا ہوں اور اسی کو سچا اصول سمجھتا ہوں جو قانون قدرت کے بالکل مطابق ہے اور کتاب و سنت دونوں کو اسی کا مؤید پاتا ہوں جو علم مذہب اسلام کی بنیاد ہیں۔ پس جہاں تک کہ میں سچے مذہب کی تحقیق کر سکا میں نے اسلام ہی کو سچا مذہب پایا اور امید ہے کہ جو لوگ سچائی کو دوست رکھتے ہیں وہ ہمیشہ صفائی اور سچائی سے اسلام کی سچائی کی تحقیقات کریں گے۔

مگر ایک مشکل یہ پیش ہے کہ جب اسلام کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ اس مجموعہ احکام کو جو اب احکام مذہبی سمجھے جاتے ہیں مذہب اسلام خیال کرتے ہیں۔ ہاں مجازاً تو اُن پر مذہب اسلام کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر حقیقتاً وہ مجموع من حیث المجموع یعنے حقیقی مذہب اسلام کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ موجودہ مسائل مذہب اسلام میں دو قسم کے اصول و احکام شامل ہیں۔ ایک وہ جن کو خود شارع نے صاف صاف بیان کیا ہے۔ جو احکام منصوصہ کہلاتے ہیں اور ایک وہ جن کو عالموں اور مجتہدوں نے اپنے

ذہن کی خوبی اور اپنے علم کی روشنی سے باستدلال
دلالت النص یا اشارۃ النص یا قیاس کے قایم کیا ہے جو اجتہادیات
کہلاتے ہیں اور جو بجز ایک قابل سہو و خطار وجود کی رائے کے
اور کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے۔ پس ان دونو قسم کے مسائل
میں تمیز نہ کرنے سے آدمی طرح طرح کی سخت غلطیوں میں
پڑ جاتے ہیں اور یہ وہی ترک امتیاز ہے کہ جب مسلمان اس
کو اختیار کرتے ہیں تو اُس کا نام تقلید رکھتے ہیں اور جب
غیر مذہب کے لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں تو اُس کو ایک
حقیر نام تعصب یا جہل مرکب یا ضلالت سے موسوم کرتے
ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

پہلی قسم کے احکام بھی جن کا نام احکام منصوصہ ہے۔
دو قسم کے احکام ہیں ایک وہ جو اصلی احکام ہیں اور بلا شبہ
وہ بالکل قانون قدرت کے مطابق بلکہ اس کی جان ہیں اور
دوسرے وہ جو ان اصلی احکام کی حفاظت اور اُن کے
بقار اور قیام کے لئے ہیں۔ پس جو کوئی مذہب اسلام کی
سچائی اُن سچے قدرتی اصولوں سے پرکھنی چاہے تو اُس کو
اُن دونوں قسم کے احکام اور اُن میں سے ہر ایک کے
درجے اور رُتبے کی تمیز کرنی لازم ہے۔

علاوہ مذکورہ بالا دونوں قسموں کے ایک تیسری قسم
بھی احکام مذہب اسلام میں ہے جو ذو معنیین عبارتوں
یا ناکامل سند یا مشتبہ سندوں سے قائم ہوئے ہیں ان
میں سے پہلی قسم تو اجتہادیات میں داخل ہے اور دوسری
قسم مذہب اسلام میں کچھ وقعت اور اعتبار نہیں رکھتی۔
گو اُس پر اس وجہ سے کہ اُس میں کچھ نقصان نہیں ہے
عمل ہوتا رہا۔

پس یہ سچا مذہب اور وہ شخص جس کی معرفت
ہم کو اس کی تعلیم ہوئی ہمارے بے انتہا ادب اور
نامحدود ثنا و صفت کا مستحق ہے اور بلا شبہ اسی خطاب
کے لائق ہے کہ انت احب الی یا رسول اللہ من

نفسی التی بین جنبی، چنانچہ ہم کو بہت بڑی خوشی
اور مبارکی اسی بات کی ہے کہ ہم نے اُس کو نہ خدا سمجھا
اور نہ خدا کا بیٹا۔ نہ کوئی فرشتہ بلکہ ایک وحی بھیجا ہوا
انسان جانا مگر اپنی جانوں سے زیادہ عزیز جانا بابی
انت و امی یا رسول اللہ

دل و جانم فدایت یا محمد
سر من خاک پایت یا محمد

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

آنحضرت کی زندگی کے حالات جن کو مسلمان سیر
اور انگریز لائف کہتے ہیں صرف دیندار مسلمان عالموں نے
ہی نہیں بلکہ غیر مذہب کے علمار اور مؤرخین نے بھی بہت
کچھ لکھا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ دونوں افراط و تفریط
میں پڑ گئے۔ پہلوں کی آنکھوں میں تو کمال روشنی کے سبب
چکا چوند آگئی اور پچھلوں کی آنکھیں بجلی کی چمک سے بند
ہو گئیں۔ پہلے تو شراب محبت کی سرشاری میں باٹ سے
بھٹک گئے اور پچھلے اُس راستے کی ناواقفی سے منزل
تک نہ پہنچے۔ پہلے تو یہ بھولے کہ وہ کس کا بیان کرتے ہیں
اور پچھلوں نے اُسی کو نہ جانا جس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔

کسی مشہور محدث نے بجز ایک کے جس کا ہم ابھی
ذکر کریں گے کوئی خاص کتاب آنحضرت کی زندگی کے
حالات میں نہیں لکھی لیکن تمام محدثین نے جن کی سعی اور
کوشش کا دنیا پر بہت بڑا احسان ہے اپنی اپنی کتابوں
میں ان حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے جو آنحضرت کی زندگی
کے حالات سے متعلق ہیں پس وہی حدیث کی کتابیں ہیں
جن سے کم و بیش آنحضرت کی زندگی کے حالات صحیح صحیح
دریافت ہو سکتے ہیں اور جن کو معقول طور پر ترتیب دینے
سے اور صحیح کو غلط سے تمیز کرنے سے ایک معتبر تذکرہ
آپ کی زندگی کا جمع ہو سکتا ہے۔

ابو عیسیٰ ترمذی نے جو [illegible] مطابق [illegible] میں

[illegible] اور [illegible] ہجری مطابق [illegible]۲۹ء میں انتقال کیا اپنی کتاب جامع ترمذی کے سوا ایک اور کتاب بھی آنحضرت کے حالات میں لکھی ہے جو "شمائل ترمذی" کے نام سے مشہور ہے مگر اس میں آپ کی زندگی کے تمام حالات مندرج نہیں ہیں بلکہ وہ خاص خاص باتیں اور عادتیں جو بالتخصیص نفس نفیس آنحضرت سے متعلق تھیں مذکور ہیں باایں ہمہ جس قدر حدیثیں آنحضرت کے حالات سے متعلق ان مشہور حدیث کی کتابوں میں مندرج ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ جن کو ہم مثل کتاب اللہ کے بے غور اور بلا تحقیقات اندھا دھندی سے مان لیں بلکہ ہم پر واجب ہے کہ اُن تمام حدیثوں کو خواہ وہ بخاری کی ہوں یا مسلم کی اور جامع ترمذی کی ہوں یا شمائل ترمذی کی قبل ان کے سچا قبول کرنے کے اُن کی سچائی اور صحت کی تحقیقات اُن اصول و قواعد کے ساتھ کرلیں جو اس کے لئے مقرر ہیں اور جن کو ہم نے ایک مجداگانہ خطبے میں بیان کیا ہے۔ اور اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو سخت غلطیوں میں پڑیں گے کیونکہ بے سند حدیث مسلمانوں کے مذہب میں کوئی وقعت اور اعتبار نہیں رکھتی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی کتاب تحفہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں "حدیث بے سند گوز شتر مست" مگر افسوس ہے کہ بہت ہی کم مصنف ہیں جنھوں نے اُس ضروری اور نہایت ضروری اصول کی پیروی کی ہو۔

ان حدیث کی کتابوں کے سوا جن کا ابھی ذکر ہوا اور بہت سی کتابیں ہیں جو خاص آنحضرت کے حالات کے لئے لکھی گئی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں اُس کے سوا اور بھی حالات ہیں اور یہ تمام کتابیں عموماً کتب سِیَر کے نام سے موسوم ہیں اور جن میں سے کتب مفصلۂ ذیل زیادہ مشہور ہیں۔

ابن اسحاق، ابن ہشام، طبقات کثیر المشہور بواقدی، طبری، سیرت شامی، ابوالفدا، مسعودی، مواہب لدنیہ، ان کے سوا عربی اور فارسی زبان میں اور بھی کتابیں ہیں جو انہی سے بنائی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں سے پہلی چار کتابیں بہت قدیم ہیں اور باقی بہت پچھلی۔

یہ سب کتابیں تمام سچی اور جھوٹی روایتوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مختلط مجموعہ ہیں جن میں صحیح اور غلط مشتبہ اور درست اور جھوٹی اور سچی کسی کا کچھ امتیاز نہیں اور جو کتابیں زیادہ قدیم ہیں اُن میں اس قسم کا اختلاط اور زیادہ ہے۔ قدیم مصنفوں اور اگلے زمانے کے مورخوں کو تصنیفات سے زیادہ غرض یہ تھی کہ ہر ایک قسم کی روایتوں اور افواہوں کو جو ان کے زمانے میں پھیل رہی تھیں ایک جگہ جمع کرلیں اور اس بات کی تحقیقات اور تصحیح کہ کون سی ان میں کی بالکل صحیح ہے اور کونسی غلط، اور کس میں زیادتی یا کمی ہوئی ہے اور کس میں مضمون کے سمجھنے اور واقعہ کے بیان میں غلط فہمی ہوئی ہے آئندہ وقت یا آئندہ نسلوں پر منحصر رکھیں مگر افسوس یہ ہے کہ پچھلی نسلوں نے بعوض اُس کے کہ تحقیقات مطلوبہ کرنے سے اپنے بزرگوں کے مقاصد کی تکمیل کرتے انہی کتابوں کو اپنی تصنیفات جدید کا ماخذ ٹھہرایا اور اس لئے ان پچھلے مصنفوں کی تصنیفوں میں بھی وہی نقص پیدا ہوا جو اُن قدیم مصنفوں کی تصنیفوں میں تھا۔ غرض کہ اب فن سیر کی تمام کتابیں کیا قدیم کیا جدید مثل ایسے غلّے کے انبار کے ہیں جس میں سے کنکر، پتھر، کوڑا، کرکٹ کچھ چنا نہیں گیا اور اُن میں تمام صحیح و موضوع اور جھوٹی سچی سند اور بے سند ضعیف و قوی، مشکوک و مشتبہ روایتیں مخلوط اور گڈمڈ ہیں۔

سر ولیم میور صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ آنحضرت کے حالات زندگی کی تین کتابیں ہشامی، واقدی، طبری ایسی ہیں کہ جو شخص دانشمندی سے آنحضرت کے [illegible]

لکھے گا تو اپنی تحریر کے لئے اُنھی کتابوں کو سند گردانے گا"
مگر صاحب ممدوح نے اس بات کو بیان نہیں فرمایا کہ اُن
کتابوں میں کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ ٹوٹا
ہوا ہے اور کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کی خصلت
نہ کسی مذہبی مسئلہ کے سبب بلکہ اخلاقی نقصانوں کے سبب
مشتبہ اور اُن کی راست بیانی مشکوک یا مطعون ہے اور
کس قدر ایسی ہیں جن کے بیان کرنے والے بالکل
لامعلوم شخص ہیں۔ اور کس قدر ایسی ہیں جن کی تحقیق یا
یا تصدیق نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے نہایت گرم جوشی سے
واقدی کی قدر و منزلت کو اُس کی اصلی حقیقت سے
بہت بڑھا دیا۔ جس کی نسبت سر ولیم میور صاحب یہ
ارقام فرماتے ہیں کہ "ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتاب کی
تعریف اُس کی حد سے زیادہ کی ہے" مگر افسوس ہے کہ
باوجود اس کے صاحب ممدوح نے بھی واقدی کی کم قدر
نہیں کی اور اوروں پر ترجیح دینے میں کچھ کوتاہی نہیں
کی۔ اس لئے کہ انھوں نے آنحضرت کی زندگی کے تمام
حالات کو اسی کتاب سے لکھا ہے اور اُسی کی سند پر
مذہب اسلام کے برخلاف تمام رائوں کو قائم کیا ہے۔

واقدی کچھ بڑا معتبر شخص نہیں ہے وہ حاطب اللیل
یعنی اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا ہے۔ اُس کی
غلط روایتوں اور جھوٹے قصے کہانیوں اور بے سند
باتوں سے تمام علماء نے اُس کو نامعتبر ٹھیرایا ہے۔

محمد بن عبدالباقی زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں میزان
سے واقدی کی نسبت یہ جملہ نقل کیا ہے الواقدی محمد
بن عمر بن الواقدی الاسلمی المدنی الذی
استقر الاجماع علی وهنه (کذا فی المیزان)
کسی کے کہنے اور سننے پر کیا موقوف ہے خود اس کی
کتابیں موجود ہیں جو کچھ بھی قدر و قیمت کے لائق نہیں

بجز اس کے کہ جو افواہا اُس نے سُنا اور جو آواز چڑیا کی
خواہ کوّے کی اس کان میں آئی وہ اُس نے لکھ دی کوئی
طریقہ تحقیق کا اور کوئی رستہ تنقیح کا اُس نے اختیار نہیں
کیا پس کیا وہ کتابیں ایسی ہیں جو مذہب اسلام کی بنیاد
سمجھی جا سکتی ہیں اور کیا کوئی مخالف مذہب اسلام کا
ان کتابوں کی سند پر مذہب اسلام یا اس کے واعظ
میں عیب نکال کر اور اپنے آپ کو فتح مند سمجھ کر خوش
ہو سکے گا۔ ان هذا الشیٔ عجاب۔

البتہ ابوالفدا کی کتاب کسی قدر اچھی ہے اور جہاں
تک ہو سکے اعتبار کے لائق ہے۔ اُس نے اپنی کتاب
احتیاط سے لکھی ہے اگرچہ تحقیق و تنقیح کے رستے کو اس
نے اختیار نہیں کیا اِلّا اس بات پر کوشش کی ہے کہ کوئی
موضوع یا مشتبہ یا لغو روایت اُس میں نہ داخل ہونے
پاوے مگر با ایں ہمہ یہ کہنا کہ اس کی کوششیں کامیاب ہوئیں
اور اس میں کوئی روایت موضوع یا مشتبہ نہیں ہے
حد اعتدال سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

مسلمان مورخوں کے سوا جن کا اوپر ذکر ہوا عیسائی
مورخوں نے بھی اسلام اور اس کے واعظ کی نسبت
بہت سی کتابیں لکھیں مگر افسوس ہے کہ ابتدائی زمانے
کی تصنیف شدہ کتابیں مثل کتب مصنفہ وبیلی، لوتھر،
ملانکتھن۔ سیبال ہیم۔ وی ہربی لاٹ مجھ کو دستیاب
نہیں ہوئیں مگر جو کچھ اور کتابوں سے اُن کا حال
معلوم ہوا وہ اسی قدر ہے کہ ان کتابوں میں بجز سخت
کلامی اور بدزبانی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

ان مصنفوں کے سوا مراکشی صاحب کا ذکر نہایت
حیرت انگیز ہے وہ ایک ایسا سخت متعصب مصنف ہے
کہ اس کا دل اپنے بغض دکھلانے کے اظہار اور لعنت اور
جھوٹے طعن و تشنیع اور بدزبانی سے کبھی نہیں بھرا۔
مگر مجھ کو جو حیرت ہوئی وہ اس بات سے ہوئی کہ

کوارٹرلی ریویو کے ایک آرٹیکل کے مصنف نے اُس کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "مراکشی پر جو یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ باطن میں اسلام کا معتقد ہوگیا تھا وہ الزام کچھ بے وجہ نہ تھا" کیا مراکشی باوصف اس قدر تعصب کے مثل "برہرخورد" صاحب کے آخر کو مسلمان ہوگیا تھا؟ اگر ایسا ہوا تو میں ذمہ وار ہوں کہ اُس سے پہلے جو کچھ اُس نے اسلام اور واعظ اسلام کی نسبت کہا سُنا سب نسیًا و منسیًا ہوگیا لان الاسلام یھدم ما کان قبلہ من معصیۃ اللہ۔

ڈین پریڈی صاحب بھی اُنہی مورخوں میں سے ہیں جن پر مذہب اسلام نہایت شاق گزرتا تھا جب کوئی مسلمان اتفاقًا اُن صاحب کی کتاب پڑھتا ہے تو مذہب اسلام سے اُن کی ناواقفیت پر جو اُن کی کتاب کے ہر ورق سے ٹپکتی ہے بن ہنسے رہ نہیں سکتا۔

ان مورخوں کے سوا ہاتنجر گیگنر ری لنڈاو کلی صاحب نے بھی مذہب اسلام اور آنحضرت کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں مگر افسوس ہے کہ میں اُن کی محنتوں سے مستفید نہ ہوسکا۔

گوتھ صاحب اور اماری صاحب اور نالڈانگ صاحب اور دواری صاحب نے جو کتابیں اس مضمون پر لکھی ہیں ان کی نسبت مذہب اسلام کے آرٹیکل کا مصنف جو "کوارٹرلی ریویو" میں چھپا ہے یہ لکھتا ہے کہ "اُن مورخوں نے بہت سی دنیا کو یہ بات سکھلا دی کہ مذہب اسلام ایک شگفتہ اور تر و تازہ چیز ہے اور ہزاروں ثمرور جوہروں سے بھرپور ہے اور محمد (ص) نے گو اُن کی خصلت کو کیسا ہی سمجھا جاوے انسانیت کی سنہری کتاب میں اپنے لئے جگہ حاصل کی ہے۔"

مشہور عیسائی مورخوں میں جنھوں نے آنحضرت کے حالات لکھے ہیں ڈاکٹر اسپرنگر صاحب ہیں ان کی کتاب انگریزی زبان میں بمقام الہ آباد ۱۸۵۱ء میں چھپی ہے مگر وہ کتاب بسبب غلطیوں کے جو اُس کے مضمون کی صحت میں ہیں کچھ اعتبار کے لائق نہیں ہے۔ علاوہ اس کے ایک اور خرابی انھوں نے اس کتاب میں یہ کی ہے کہ اُس کا طرز بیان نہایت مبالغہ آمیز اختیار کیا ہے ان کی طبیعت پہلے ہی سے ایسے تعصبات اور یک طرفہ رائے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی قسم کے مصنف کو اور بالتخصیص ایک مورخ کو کسی طرح زیبا نہیں ہے۔ اپنے اس کلام کی تصدیق کے لیے اُن کی کتاب میں سے ایک فقرہ نقل کرتا ہوں جس سے اُن کے تعصب کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس فن میں انھوں نے کتاب لکھی ہے۔ اُس سے بھی ماشاءاللہ وہ بہت ہی خوب واقف تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ، "اسلام محمد (ص) کا ایجاد نہیں ہے وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہوسکتا مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مکار نے اپنی بداخلاقی اور طبیعت کی بُرائی سے اُس کو بگاڑا اور جو بہت سے مسائل اس میں قابل اعتراض ہیں وہ اُسی کے ایجاد ہیں" نعوذ باللہ من ھذہ الاقاویل۔ کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

اسی کتاب کی نسبت سر ولیم میور صاحب یہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کی کتاب ایسے وقت میں میرے پاس پہونچی جبکہ میں اس مضمون کی تحصیل اور تلاش کر رہا تھا اور جیسا کہ میں نے اپنی کتاب کے بعض مقامات میں ثابت کیا ہے اُس کے مضامین کی بنیاد غلطی پر معلوم ہوتی ہے چنانچہ انھوں نے محمد (ص) کے قبل زمانہ کے عرب کا اور خاص محمد کا اور اُن کی خصلت کا جو حال لکھا ہے وہ سب غلط راویوں پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے ایک اور کتاب جرمنی زبان میں آنحضرت کے حالات میں لکھی ہے جو چھ جلدوں میں ہے مگر افسوس ہے کہ جرمنی زبان نہ جاننے کے سبب اُس کتاب سے جس قدر قدرے قلیل فائدہ حاصل کر سکتا تھا اس سے بھی محروم رہا۔ صرف اس قدر ہوا کہ میرے ایک جرمن دوست نے مجھ کو اطلاع دی کہ اس کے مصنف نے ابن اسحاق اور واقدی سے زیادہ تر مطالب اخذ کیے ہیں اور چونکہ میں اُن مصنفوں کی کتابوں سے واقف ہوں جن سے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مطالب اخذ کئے اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ کتاب بھی مثل اور کتابوں کے جن کو عیسائی مؤرخوں نے تصنیف کیا ہے اس تحقیق اور تلاش سے معریٰ ہوگی جو صفائی دل سے کی جاتی ہے اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب اُنہی کتابوں سے لکھی ہے جن میں صحیح اور غلط اور مشتبہ اور لغو روایتیں سب گڈمڈ ہیں۔

مگر کوارٹرلی ریویو کے آرٹیکل کا مصنف جو غالباً جرمن ہے اس کتاب کی نسبت یہ رائے لکھتا ہے کہ "جن لوگوں نے اسلام کی نسبت لکھا ہے اُن میں سے ڈاکٹر اسپرنگر کی کتاب کو جو مصنفوں میں اول درجہ رکھتا ہے ہم نے اس لیے سب سے افضل قرار دیا ہے کہ وہ بہ نسبت اور سب کے نہایت جامع ہے اور بڑی قابلیت سے لکھی گئی ہے اس لئے کہ اس کتاب میں وہ تمام مطالب ناظرین کے سامنے موجود کر دیے گئے ہیں جن سے پڑھنے والا اپنی رائے آپ قائم کر سکے۔"

عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ وہ کتاب ہے جو سر ولیم میور صاحب نے نہایت لیاقت اور قابلیت اور کمال خوبی کے ساتھ لکھی ہے۔ یہ کتاب چار موٹی موٹی جلدوں میں ہے اور بہت خوب صورت ٹیپ اور خوش وضع تقطیع میں چھپی ہے اس لائق اور فائق مصنف کو مثل مغربی علوم کے مشرقی علموں میں بھی بڑی واقفیت ہے اور اس لئے ان کی اس کتاب کی تمام تربیت یافتہ یورپ کے ملکوں میں بڑی قدر و منزلت کی گئی ہے جو اسی قدر و منزلت کے لائق ہے اور یورپ کے عالموں اور عالموں کی مجلسوں نے بھی اس کتاب کے سبب اُن کی ایسی قدر کی ہے جس کے درحقیقت وہ مستحق تھے مگر قطع نظر اس نقص کے جو اس کتاب میں ہے کہ اس کی بنیاد گویا بالکل واقدی پر ہے جو مسلمانوں میں درجہ اعتبار نہیں رکھتا اور اس کی روایتیں زیادہ معتبر اور ایسی محقق نہیں ہیں کہ مسلمان اُن پر یقین لاویں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں ایک اور بڑا نقص یہ ہے کہ جس منشاء اور مطلب سے سر ولیم میور صاحب نے یہ کتاب لکھی وہ اس لئے پسندیدہ نہیں ہے کہ وہ منشاء اس کتاب میں نقصان رہ جانے کا اور واقعات کا اصلی تحقیقات تک نہ پہنچنے کا بہت بڑا سبب ہوا ہے چنانچہ سر ولیم میور صاحب خود ارقام فرماتے ہیں کہ اس کتاب کا لکھنا اور مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کی تحقیق اول اس غرض سے اختیار کی گئی کہ پادری پی فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے مباحثے میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیرووں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جاوے جن کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہیں۔ چنانچہ اسی منشاء سے مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کو پڑھا اور اس کتاب کو لکھا۔

* یہ ایک ہمشانی رسالہ ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے جو لندن میں چھپتا ہے اس میں ہندوستانی دیسی عالموں کے مضامین لکھے ہیں۔ ۱۲

لیکن میں نہایت افسوس سے یہ بات کہتا ہوں کہ باوجود
کہ سر ولیم میور صاحب نہایت نیک طبیعت ہیں اور بڑی
عمدہ توصیف کی لیاقتیں رکھتے ہیں۔ اس پر بھی ان کی طبیعت
پر اس غرض اور منشا کا جس سے وہ کتاب لکھنی شروع کی
ایسا اثر پیدا ہوا جیسا کہ ایسی حالت میں اوروں کی طبیعت
پر پیدا ہونا قیاس کا مقتضا ہے اور اسی سبب سے
اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی
اُن کو بُری اور بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں اور یہ
اثر ان کی طبیعت کا ایسا تھا کہ اُس کے سبب سے اُن کی
کتاب پڑھنے والے اپنے ذہن میں اُن کی تحریر کو ایک
زیادتی سمجھتے تھے لیکن جیسا اکثر ہوتا ہے ویسا ہی اس میں
بھی ہوا کہ اُس حد اعتدال سے متجاوز تحریر نے خود اپنے مقصود
کو کھو دیا اور وہ مطلب حاصل نہ ہوا جس کے لئے پادری
فنڈر صاحب نے سر ولیم میور صاحب سے اس کتاب کے
لکھنے کی خواہش کی تھی بلکہ برعکس اس کے یہ نتیجہ ہوا کہ جس
شخص کو پادری پی فنڈر صاحب نے تاریکی کا فرشتہ بنانا چاہا
تھا وہ روشنی کا فرشتہ نکل آیا۔

جب یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہنچی تو
لوگوں نے اس کو نہایت شوق و ذوق سے پڑھا مگر جب ان
کو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آنحضرت کے
حالات کی نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ
کر اس وضع پر ڈھالا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ
پہلے ہی سے اس کتاب کا اس طرح پر لکھنا مقصود اور
مرکوز خاطر تھا تو اُن کا وہ شوق بالکل ٹھنڈا ہو گیا مگر جو
نوجوان مسلمان طالب علم انگریزی علم کی تحصیل کرتے تھے
اور اپنے دینیات اور الہیات سے محض ناواقف تھے اُن
میں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگر سر ولیم میور صاحب نے
سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی بُرے پہلو پر لے جا کر
لکھا ہے تو فی الواقع اُن کی اصلیت کیا ہے۔

میرے دل پر جو اس کتاب سے اثر پیدا ہوا وہ یہ
تھا کہ اُسی زمانے میں میں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت کے
متعلق حالات میں ایک کتاب اس طرح پر لکھی جاوے کہ
جو جو باتیں صحیح اور اصلی اور واقعی اور منقح ہیں اور معتبر
روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے بخوبی ثابت ہیں اُن
کو بخوبی چھان بین کر اور امتحان کر کر ترتیب سے لکھا جاوے
اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور اُن کا ثبوت معتبر
یا کافی نہیں ہے اُن کو جداگانہ اسی ترتیب سے جمع کیا
جاوے اور جو محض جھوٹ اور افترا و بہتان یا خود غرض
یا احمق واعظوں اور حمقاء کو دام تزویر میں پھنسانے والے
لوگوں یا احمق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی
بنائی ہوئی باتیں ہیں اُن کو علیحدہ بہ ترتیب لکھا جاوے
اور ساتھ ہی کے ساتھ اُن کے غلط اور اُن کے نامعتبر ہونے
کا ثبوت اور اُن کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان
کی جاویں مگر میں اپنے اس ارادے کو بہت سے موانعات
کے سبب سے جن میں سب سے بڑا اپنی فکر معاش میں
مبتلا رہنا اور اس سے بڑا کسی کا میرے ارادے کے
ممد و معاون نہ ہونا تھا پورا نہ کر سکا، اور علاوہ اس کے
اس کام کے لئے بہت سی پرانی کتابیں جن کو قدیم مصنفوں
نے تصنیف کیا ہے درکار تھیں جو مجھ کو بسبب برباد ہو جانے
قدیم کتب خانوں کے دست یاب نہ ہو سکیں اور یہ بھی
ایک قوی سبب اس ارادے کے پورا نہ ہونے کا ہوا مگر
اس پر بھی مختلف اوقات میں مختصر طور سے مختلف مضامین
اور مسائل مذہب اسلام اور آنحضرت کے حالات
پر کچھ کچھ لکھا چنانچہ انھیں تحریروں میں یہ بارہ مضمون
ہیں جو بہ عنوان بارہ خطبوں کے لکھے گئے ہیں اور جن کو
اِس ایک جلد میں جمع کر دیا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ
باقی مضامین اور جلدوں میں جمع کئے جاویں گے۔
اگرچہ میں نے اس [illegible]

مورخوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے آنحضرت کے حالات
اور اصول مذہب اسلام کا انصاف سے فیصلہ نہیں کیا مگر
اُن لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مورخوں
کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جنھوں نے نہایت انصاف
سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت کے حالات اور
مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی
ہے بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلے میں
مذہب اسلام کی حمایت کی ہے اگرچہ بعض مقامات میں
اُنھوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کئے ہیں لیکن
صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن کا بیان کسی تعصب پر
مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اس مسئلے کی حقیقت وہ نہیں سمجھے
یا غلط سمجھ گئے۔ پس یہ ایک غلطی سمجھ کی ہے الّا وہ عیب
جو تعصب اور تنگ حوصلہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے
وہ نہیں ہے۔ بہرحال یہ قابل ادب شخص ایڈورڈ گبن
قدیم روم کی سلطنت کا مشہور مورخ اور گاڈفری ہیگنز
رحمہما اللہ تعالیٰ اور ٹامس کارلیل اور جان ڈیون پورٹ
سلمہما اللہ تعالیٰ ہیں جن کے علم اور لیاقتوں کی تعظیم وقدر
ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ اب میں ان صاحبوں میں سے تین
صاحبوں کی رائے جو انھوں نے آنحضرت اور مذہب اسلام
کی نسبت لکھی ہے اپنے اس دیباچہ میں لکھتا ہوں اور
گاڈفری ہیگنز کی رائے خطبات میں متعدد جگہ لکھی گئی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ لکھتے ہیں "کیا یہ بات
خیال میں آسکتی ہے کہ جس شخص نے اُس نہایت ناپسند
اور حقیر بُت پرستی کے بدلے جس میں اُس کے ہم وطن
(یعنی اہل عرب) مدت سے ڈوبے ہوئے تھے خدائے برحق
کی پرستش کرنے سے بڑی بڑی دائم الاثر اصلاحیں
کیں [illegible] کو موقوف کیا لٹنے کی چیزوں کے
استعمال [illegible] سے اخلاق کو بہت نقصان
[illegible]

وقت میں رواج تھا اس کو بہت کچھ گھٹا کر محدود کیا غرضکہ
ایسے بڑے اور سرگرم مُصلح کو ہم فریبی ٹھہرا سکتے ہیں؟ یا
یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائی مکر پر مبنی
تھی۔ نہیں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ بیشک محمد (ص) بجز دلی
نیک نیتی اور ایمانداری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال
کے ساتھ اپنی کارروائی پر ابتداے نزول وحی سے جو
خدیجہ سے بیان کی آخیر دم تک جب کہ عائشہ کی گود میں
شدتِ مرض میں وفات پائی مستعد نہیں رہ سکتے تھے۔ جو
لوگ ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور جو اُن سے
بہت ربط ضبط رکھتے تھے اُن کو بھی کبھی اُن کی ریاکاری
کا شُبہ نہیں ہوا اور کبھی انھوں نے اپنے نیک برتاؤ
سے تجاوز نہیں کیا۔

بیشک ایک نیک اور صادق طبیعت شخص جس کو
اپنے خالق پر بھروسا ہو اور جو ایمان اور رسم و رواج میں
بہت بڑی اصلاح کرے حقیقت میں صاف صاف خدا کا
ایک آلہ ہوتا ہے۔ اُس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہے
جس طرح خدا تعالیٰ کے اور وفادار خادم گزرے ہیں
اگرچہ اُن کی خدمتیں کامل نہ تھیں اُسی طرح محمدؐ کو بھی
ہم خدا کا ایسا خادم کیوں نہ سمجھیں جس نے خدا تعالیٰ
کی خدمت ایسی ہی وفاداری سے کی جیسی اوروں نے
جو مثل اوروں کی خدمت کے پوری اور کامل نہ تھی۔ اس
بات پہ کیوں یقین نہ کیا جاوے کہ اُس کو زمانہ اور اپنے
ملک میں اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت اور تعظیم سکھلانے
کے لئے اور ان کی حالت کے مناسب اُن کو نیکی اور اخلاق
امور میں نصیحت کرنے کے لئے خدا نے بھیجا تھا اور
وہ راست بازی اور نیک کرداری کا واعظ تھا۔

ایڈورڈ گبن صاحب لکھتے ہیں کہ "محمدؐ کا مذہب
شکوک اور شبہات سے پاک صاف ہے قرآن خدا کی
وحدانیت [illegible] شہادت ہے [illegible]

جھوں کی، انسانوں کی، ستاروں اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا کہ جو شے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہوتی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ اُس نے اپنی معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا نہ وہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں اور نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے جس سے اُس کو تشبیہ دے سکیں۔ وہ ہمارے نہایت خفیہ ارادوں پر بھی آگاہ رہتا ہے۔ بغیر کسی اسباب کے موجود ہے۔ اخلاق اور عقل کا جو کمال اس کو حاصل ہے وہ اس کو اپنی ہی ذات سے حاصل ہے۔ اُن بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا اور اُس کے پیروؤں نے نہایت مستحکم طور سے قبول کیا اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعے سے بہت درستی کے ساتھ اُن کی تشریح اور تصریح کی۔ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اُس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے مذکورہ بالا عقیدے کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بہت بڑھ کر ہے اس لئے کہ جب ہم نے اُس نامعلوم چیز (یعنی خدا) کو زمان اور مکان اور حرکت مادہ اور حس اور تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لئے کیا چیز باقی رہی، وہ اصل اول (یعنی ذات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہنچی چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھنے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا ہے۔"

مسٹر ٹامس کارلیل صاحب لکھتے ہیں کہ "ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو یہ بات مشہور ہے کہ محمد ایک پُر فن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے اوتار تھے اور اُن کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک تودہ ہے اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرتی جاتی ہیں جو جو جھوٹ باتیں دور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں (یعنی عیسائیوں) نے اُس انسان (یعنی محمد صلعم) کی نسبت قائم کی تھیں اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کے باعث ہیں چنانچہ ایک یہ بات مشہور ہے کہ پاکرک صاحب نے جب گروٹیس صاحب سے پوچھا کہ یہ قصہ جو تم نے لکھا ہے کہ محمدؐ نے ایک کبوتر کو تعلیم کیا تھا کہ وہ اُن کے کان میں سے میل نکالا کرتا تھا اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ ہے جو اُن کے پاس وحی لایا کرتا ہے تو اس قصّے کی کیا سند ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ "اس قصّے کی کوئی سند اور کچھ ثبوت نہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ایسے ایسے قصّوں کو بالکل چھوڑ دیا جاوے۔ جو جو باتیں اس انسان (یعنی محمد صلعم) نے اپنی زبان سے نکالیں بارہ سو برس سے ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیے بمنزلہ ہدایت کے قائم ہیں ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو بھی اُسی طرح خدا نے پیدا کیا ہے جس طرح ہم کو پیدا کیا اس وقت جتنے آدمی محمدؐ کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اُس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر اس زمانے کے لوگ یقین نہیں رکھتے پھر کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں جس کلام پر خدائے قادر مطلق کی اس قدر مخلوق زندگی بسر کر گئی اور اُسی پر مر گئی۔ کیا وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے۔ جیسا ایک بازی گر کا ہو سکتا ہے[1] میں اپنے نزدیک ہرگز ایسا خیال نہیں کر سکتا بلکہ میں بہ نسبت اور چیزوں کے اس پر جلد یقین کرتا ہوں اگر جھوٹی اور فریب کی باتیں دنیا میں اس قدر زور آور ہوں اور رواج پکڑ جاویں اور مسلم ٹھہر جاویں تو پھر اس دنیا کی نسبت کوئی کیا سمجھے گا۔ اس قسم کے خیالات جو بہت پھیلے ہوئے ہیں بہت

[1] حاشیہ صفحہ ۲۱ پر

ہی افسوس کے قابل ہیں اگر ہم کو خدا کی سچی مخلوقات کا علم کچھ حاصل کرنا منظور ہو تو ہم کو ایسی باتوں پر یقین کرنا ہرگز نہیں چاہیے۔ وہ باتیں ایسے زمانے میں پھیلی تھیں۔ جب کہ توہمات کو بہت دخل تھا اور انھیں توہمات کے سبب خیال تھا کہ آدمی کی روحیں غمگین خرابی میں پڑی ہوئی ہیں جو اُن کی ہلاکت کا سبب ہے۔ میرے نزدیک اس خیال سے کہ ایک جھوٹے آدمی نے ایک مذہب قائم کیا اور کوئی اس سے زیادہ بد اور ناخدا پرست خیال دنیا میں نہیں پھیلا۔ بھلا یہ کب ہوسکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو چونہ اور اینٹ اور مصالح کی حقیقت کو سچ نہ جانے اور پختہ مکان بنالے وہ پختہ مکان کاہے کو ہوگا بلکہ خاک کا ایک ڈھیر ہوگا۔ بارہ سو برس تک اس کو کب قیام ہوسکتا ہے اور اٹھارہ کروڑ آدمی اس میں کب رہ سکتے ہیں بلکہ اب تک وہ مکان کبھی کا سر کے بل گر پڑا ہوتا۔ ضرور ہے کہ ایک آدمی اپنے طریقوں کو قانون قدرت کے مطابق کرے اور قدرت کے سامانوں کی حقیقت کو سمجھے اور اُس پر عمل کرے ورنہ قدرت سے اس کو یہ جواب ملے گا کہ نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا جو قانون اور قاعدے خاص ہیں وہ خاص ہی رہتے ہیں عام نہیں ہوجاتے افسوس ہے کہ کوئی شخص مثل کانگ سٹر دیا اور ایسے ہی بہت سے دنیا کے سربرآوردہ لوگوں کے چند روز کے لئے اپنے فریب فطرت سے کامیاب ہوجاتے ہیں مگر ان کی کامیابی ایک جعلی ہنڈوی کی مانند ہوتی ہے جس کو وہ اپنے نالائق ہاتھوں سے جاری کرتے ہیں اور خود الگ تھلگ رہتے ہیں اور اوروں کو اُس کے سبب سے نقصان پہنچاتے ہیں مگر قدرت آگ کے شعلوں اور فرانسیسی ہنگاموں اور اسی قسم کے اور غضب ناک ظہور سے ظاہر ہو کر یہ بات بہت غضب اور قہر سے دنیا پر ظاہر کر دیتی ہے کہ جعلی ہنڈویاں جعلی ہی ہیں۔"

راقم

سید احمد

بمقام لنڈن محلہ میکلن برگ اسکوئیر مکان نمبر ۲۱
سنہ ۱۸۷۰ء مطابق سنہ ۱۲[illegible]ھ

---

۱ میں اس قدر اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ کروڑوں آدمی اس وقت بھی اُسی پر نہایت مستحکم اعتقاد سے زندگی بسر کرتے ہیں اور جن ملکوں میں اسلامی سلطنت کبھی نہیں گئی اُن ملکوں کے لوگوں نے بھی ان کی باتیں سن کر ان کو قبول کیا۔ اور جب بھی کہ اس کے بانی کو دنیا سے گئے ہوئے بارہ سو برس ہو گئے ہر ایک ملک میں اور اُن ملکوں میں بھی جہاں اسلامی سلطنت نہیں ہے ہزاروں نئے لوگ اس پر بغیر کسی لالچ اور دھوکے کے اور بغیر کسی تدبیر کرنے والوں کی تدبیر و حکمت کے ایمان لاتے جاتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں [illegible]

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد ۸ - شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۸۹ء)

دینِ اسلام میں رسول اللہؐ کی دستوری و شرعی حیثیتیں

محمد بدیع الزمان*

اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کے چند مستقل اصولوں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اطاعت رسولؐ سب سے اہم اصول قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی "اولی الامر" کی اطاعت، چند شرائط کے ساتھ لازمی قرار دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس لیے مقدم قرار دی گئی ہے چونکہ اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ہر مسلمان پہلے بندۂ خدا ہے اُس کے بعد ہی وہ کچھ اور ہے۔

جہاں تک اطاعت رسولؐ کا سوال ہے یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں بلکہ اطاعتِ خدا کی واحد عملی صورت ہے۔ رسول اللہ اس لیے مطاع ہیں چونکہ آپؐ ہی ایک مستند ذریعہ ہیں جن سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت بغیر رسولؐ کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے کیونکہ اطاعتِ خدا رسولؐ کی سند کے بغیر معتبر ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں رسولؐ کی پیروی سے مُنہ موڑنا خدا کے خلاف سرکشی و بغاوت ہے۔ آپؐ کی پیروی اللہ کی محبت کا عین تقاضا ہے۔ اسی نکتے کو اور رسول اللہؐ کی دستوری و شرعی حیثیتوں کو ایک موقع پر بہت صاف اور صریح الفاظ میں اس طرح فرمایا گیا ہے کہ:

" اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ، اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اِن سے کہو کہ: اللہ اور رسولؐ کی اطاعت قبول کرو"۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اُس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔

(سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۴)

الغرض اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسولؐ کا طریقہ بنیادی قانون اور سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ تمام

* ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، ہارون نگر۔ فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف، پٹنہ ۸۰۱۵۰۵

مسائل زندگی میں کتاب وسنتِ رسول اللہ کو سند اور مرجع
اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت
ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے ممیّز کرتی ہے۔

اطاعت کا تعلق قرآن کی رو سے براہِ راست ایمان
سے ہے۔ کسی کی اطاعت یا بندگی اسی وقت کی جاتی ہے
جب اُسے اس کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اطاعتِ خداوندی
اسی استحقاق کی بنا پر ایک مومن کے دل میں جاگزیں ہوتی
ہے مگر صرف خدا پر ایمان لانا بذاتِ خود کوئی معنی نہیں
رکھتا جب تک وہ بیک وقت رسول اللہؐ کو اللہ تعالیٰ کا
مامور کیا ہوا ہادی و رہنما نہ مانے اور یہ نہ سمجھے کہ جو قرآن
آپؐ ساتھ لائے اور جس چیز کی تعلیم آپؐ نے دی وہ
اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور برحق اور واجب التسلیم
ہے۔ یہی ہے ایمان بالرسالت اور اسی میں ملائکہ، انبیاء
اور کتبِ الٰہیہ پر اور خود قرآن پر بھی ایمان لانا شامل ہے۔
اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ آخرت پر ایمان اخلاق
اور سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا
ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہے
ورنہ انسان کی زندگی خواہ کتنی ہی خوش نما کیوں نہ ہو اُس
کا حال ایک بے لنگر جہاز کا سا ہو گا جو موجوں کے ساتھ
بہتا چلا جا رہا ہو اور کہیں قرار نہیں پکڑتا۔ ایمان کے اِن
ہی اجزاء پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ،

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ
پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر
جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے
اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ
نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس
کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اُس کے
رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا وہ
گمراہی میں بھٹک کر بہت دور
نکل گیا۔" (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۱۳۶)

اس آیت سے اطاعتِ رسول کی دستوری اور شرعی
اہمیت یہ قرار پاتی ہے کہ زندگی کا جو قانون آپ لے کر
آئے تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور
خدا کی طرف سے جو تعلیم آپؐ نے دی اور جو احکام لوگوں
تک پہنچائے اُنہی پر تمام دیگر تعلیمات اور احکامات کو چھوڑ
کر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہیں کیا تو پھر اُس کا
نہ تو خدا کی خدائی پر ایمان ہے اور نہ محض رسول اللہؐ کو
رسول مان لینا ہی کوئی معنی رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں کے لیے مختلف زمانوں
اور مختلف حالات میں مختلف شریعتیں مقرر فرمائیں مگر
ان تمام شرائع سے اصل مقصود نیکیوں اور بھلائیوں کو
پانا تھا اور جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں وہ شرائع
کے اختلافات اور مناہج کے فرق کو پس پشت ڈال کر مقصد
کی طرف اس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی
منظوری حاصل ہو۔ اسی لیے شریعتِ محمدیؐ کے ماخذ اور
سرچشموں اور رسول اللہؐ کی دستوری و شرعی حیثیتوں
کو ایک موقع پر اس طرح ذہن نشین کرایا گیا ہے:-

"پھر اے نبیؐ! ہم نے تمہاری طرف یہ
کتاب (قرآن) بھیجی ہے جو حق لے کر آئی
ہے اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے
آگے موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے والی
اور اُس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم
خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں
کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے
پاس آیا ہے اُس سے مُنہ موڑ کر ان کی خواہشات
کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم (انسانوں)
میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور

ایک راہ عمل مقرر کی۔ اگر تمہارا خدا
چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا سکتا
تھا، لیکن یہ اس نے اس لیے کیا کہ جو کچھ
اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری
آزمائش کرے۔ ...... پس اے
نبیؐ، تم اللہ کے نازل کردہ قانون کے
مطابق ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ
کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

(سورۃ المائدہ ۵۔ رکوع ۷)

اسلامی آئین کی یہ بنیادی بات قرآن مجید میں بار
بار ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ دین اسلام میں شریعت
محمدیؐ کی پیروی ایمان کا اولین اور بنیادی تقاضا ہے۔ ایک
مومن کہلائے جانے کی شرط، قرآن کی رو سے، شریعتِ
محمدیؐ کی پابندی میں مضمر ہے۔ چند ایسی آیات جو مختلف
مواقع پر قرآن میں وارد ہوئی ہیں اُن کے ترجمے ذیل میں
درج کیے جا رہے ہیں:۔

"نہیں، اے محمدؐ، تمہارے رب کی قسم
یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی
اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ
مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر
اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں،
بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔"

(سورۃ النساء ۴۔ آیت ۶۵)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ
اور رسولؐ پر اور ہم نے اطاعت قبول کی
مگر اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ
(اطاعت سے) منہ موڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ
ہرگز مومن نہیں ہیں۔"

(سورۃ النور ۲۴۔ آیت ۴۷)

"حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور
اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھوں
نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور
مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی
سچے لوگ ہیں"۔

(سورۃ الحجرات ۴۹۔ آیت ۱۵)

"مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور
اس کے رسول کو دل سے مانیں۔"

(سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۹)

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے رسول اللہؐ پر ایمان
لانے سے مراد اس چیز پر بھی ایمان لانا ہے جو آپ پر
نازل ہوئی۔ اسی لیے فرمایا گیا:

"اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے
نیک عمل کیے اور اُس چیز کو مان لیا جو محمدؐ
پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر
حق اُن کے رب کی طرف سے۔ اللہ نے
ان کی برائیاں اُن سے دور کر دیں اور اُن
کا حال درست کر دیا۔"

(سورۃ محمد ۴۷۔ آیت ۲)

گرچہ ایمان لانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپؐ پر نازل ہونے والی تعلیمات پر ایمان لانا آپ سے
آپ شامل ہے، لیکن اس کا الگ ذکر خاص طور پر
واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے مبعوث ہو جانے کے بعد کسی شخص کا خدا اور آخرت
اور پچھلے رسولوں اور پچھلی کتابوں کو ماننا بھی اس وقت
تک نافع نہیں ہے جب تک وہ آپؐ اور آپ کی لائی
ہوئی تعلیمات کو نہ مان لے۔

رسول اللہ کی دستوری اور شرعی حیثیتوں کے متعلق
یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق
نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ
کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اُسے
اپنے اُس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا
اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور
اس کے رسول کی نا فرمانی کرے تو وہ صریح
گمراہی میں پڑ گیا۔"

(سورۃ الاحزاب ۳۳۔ آیت ۳۶)

بلکہ اس سے بھی سخت تاکید سورۃ الحجرات ۴۹ کی
اوّل آیت میں اس طرح کی گئی ہے:۔

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور
اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو
اور اللہ سے ڈرو۔ اللہ سب کچھ سُننے
اور جاننے والا ہے۔"

سورۃ الحجرات کی یہ آیت سورۃ الاحزاب کی مندرجہ بالا
آیت سے رسول اللہ کی دین اسلام میں دستوری اور
شرعی حیثیتوں کو اور بھی صریح طور پر واضح کرنے میں
ایک قدم آگے ہے۔ کیونکہ یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ اہلِ
ایمان کو اپنے معاملات میں پیش قدمی کرکے بطور خود
فیصلہ نہیں کر لینا چاہیئے بلکہ پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ
اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنّت میں ان کے
متعلق کیا ہدایات ملتی ہیں۔ جب کہ سورۃ الاحزاب کی
آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور
اس کے رسول نے کر دیا ہو اس کے بارے میں کسی مومن
کو خود کوئی الگ فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

سورۃ الحجرات کی متذکرہ بالا آیت کے آخری فقرے
میں یہ تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ اگر کبھی تم نے اللہ اور اس
کے رسول سے بے نیاز ہو کر خود مختاری کی روش اختیار کی
[illegible]

جان رکھو کہ تمہارا سابقہ روزِ حشر اُس خدا سے ہے جو
تمہاری سب باتیں سُن رہا ہے اور تمہاری نیتوں تک
سے واقف ہے۔

خدا تعالیٰ کے یہ احکام رسول اللہ کی دستوری اور
شرعی حیثیتوں پر مسلمانوں کے محض انفرادی معاملات
تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اُن کے جملہ اجتماعی معاملات
پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ اسلامی آئین
کی بنیادی دفعہ ہے جس کی پابندی سے نہ مسلمانوں کی
حکومت آزاد ہو سکتی ہے، نہ اُن کی عدالت، نہ اُن کی
قانون ساز مجلس اور نہ کوئی فرد۔ رسول اللہؐ کی یہ دونوں
حیثیتیں صرف حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ قیامت
تک کے لیے ہیں۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ
وسلم لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ کی ہدایت و رہنمائی
کے تحت آپ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن سند ہے اور اس سند
کو ماننے یا نہ ماننے پر ہی آدمی کے مومن ہونے اور
نہ ہونے کا انحصار ہے۔ حدیث میں اسی بات کو
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا
ہے کہ:

" تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا
جب تک کہ اُس کی خواہش نفس اُس طریقہ
کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر
آیا ہوں۔"

رسول اللہ کی دستوری و شرعی حیثیتوں سے انکار
کرنے والوں کو یہ بھی خبردار کیا گیا ہے کہ:

" رسول اللہ کے حکم کی خلاف ورزی
کرنے والوں کو ڈرنا چاہیئے کہ وہ کسی
فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا اُن پر
درد ناک عذاب نہ آ جائے [illegible]

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ تم جس روش پر ہو اللہ اس کو جانتا ہے جس روز لوگ اس کی طرف پلٹائے جائیں گے وہ انھیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

(سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۹)

"اے نبیؐ، کہو، "اللہ کے مطیع بنو اور رسول کے تابع بن کر رہو۔ لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اُس کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اُس کے ذمہ دار تم۔ اس کی اطاعت کرو گے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسولؐ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔" (سورۃ النور ۲۴۔ رکوع ۷)

"اللہ اور اس کے رسول پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔"

(سورۃ الفتح ۴۸۔ آیت ۱۳)

جہاں تک رسول اللہؐ کی شرعی حیثیت کا سوال ہے آپؐ نہ کسی نئے مذہب کے بانی تھے اور نہ پچھلے انبیاء میں سے کوئی کسی الگ مذہب کا بانی رہا ہے۔ اللہ کی طرف سے دین ہمیشہ ایک ہی رہا یعنی اسلام جسے شروع سے تمام انبیاء پیش کرتے چلے آ رہے تھے اور آپؐ نے بھی اُسی دین کو پیش کیا۔ اِسی لیے فرمایا گیا:۔

"اُس (خدا) نے تمہارے (رسول اللہؐ کے) لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار گزرتی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے۔"

(سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۳)

متذکرہ بالا آیت میں فرمایا گیا ہے کہ "دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے (شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ) تو شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مُراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ اِسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون کا اور شارع کا لفظ واضع قانون کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ اسی فقرے میں "شَرَعَ لَكُمْ" کے بعد "مِنَ الدِّيْنِ" فرمایا گیا ہے۔ تو دین کے معنی ہی کسی کی سیادت و حاکمیت تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں اور جب یہ لفظ طریقے کے معنی میں بولا جاتا ہے تو اس سے مُراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کو مقرر کرنے والے کو مطاع مانے۔ یعنی اس کی حیثیت محض سفارش اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے بلکہ یہ بندوں کے لیے اُن کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی نہ کرنے کے معنی بغاوت کے ہیں یعنی در اصل وہ اللہ کی سیادت و حاکمیت اور اپنی بندگی کا انکار کرتا ہے۔ دین سے مُراد وہ نظام زندگی یا طریق زندگی ہے جس کے قائم

کرنے والے کو سند اور مطاع تسلیم کرکے اس کا اتباع کیا جائے۔ اسی دینِ اسلام کو شریعتِ الٰہی کی بنیادوں پر مضبوطی سے قایم کرنے کے لیے رسول اللہ پر قرآن نازل فرمایا گیا جس کی دستوری اور شرعی دو حیثیتیں ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ :

" وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے۔ اور تمہیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو۔

(سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۷)

اس آیت میں میزان سے مُراد اللہ کی شریعت اور کتاب پاک سے مُراد دستور ہے جس کے نازل کرنے کی ایک وجہ اتمام حجت بھی تھی۔ اسی پس منظر میں درج ذیل آیات بھی وارد ہوئی ہیں :-

" (اے نبیؐ) یہ کتاب (قرآن) ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے، لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو دین کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے۔

سورۃ الزمر ۳۹۔ رکوع ۱)

" اے محمدؐ، اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اُسی پر مضبوطی کے ساتھ قایم ہو جاؤ۔

(سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۲)

" وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اُسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔"

(سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۳۳)

رسول اللہ کی شرعی حیثیت میں آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ خدا نے اس دین کو حضور صلعم کے دور میں مکمل کر دیا اور آپ کو یہ خوشخبری دی گئی کہ :

" آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

(سورۃ المائدۃ۔ ۵۔ رکوع ۱)

دین کو مکمل کر دینے سے مُراد اس کو ایک مستقل نظام فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے نعمت تمام کرنے سے مُراد نعمت ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے اور اسلام کو دین کی حیثیت سے کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ اب میرے قانون کی حدود پر قایم رہنے میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔

آپؐ کی شرعی حیثیت میں آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ کی بعثت ساری دنیا کے لیے تھی۔

" نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان (قرآن) اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہاں والوں کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔"

(سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۱)

رسول اللہؐ کی دینِ اسلام میں دستوری حیثیت پر دنیوی زندگی میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ آپؐ کی روزِ آخرت کی اس حیثیت کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ :

" پھر سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر تمہیں (یعنی محمدؐ) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اس وقت وہ سب لوگ

جنھوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اُس کی نافرمانی کرتے رہے تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے۔

(سورۃ النسآء ۴۔ رکوع ۶)

"(اے نبیؐ) انھیں اس دن سے خبردار کردو) جب کہ ہم ہر اُمت میں خود اُسی کے اندر سے گواہ اُٹھا کر کھڑا کریں گے جو اُس کے مقابلے میں شہادت دے گا اور ان لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لیے ہم تمھیں لائیں گے۔ اور یہ اسی شہادت کی تیاری ہے کہ ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کو صاف صاف وضاحت کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت و بشارت ہے اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔"

(سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۸۹)

حیثیتوں کے پیشِ نظر، جس کا مختصر تجزیہ پیش کیا گیا، ارشادِ ربانی ہے کہ:

"(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبیِ اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور اُن پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اُس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

(سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۹)

آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سرسیدؒ کی فکر اور ان کی برپا کی ہوئی تعلیمی تحریک درست تھی اور ان کی مخالفت کرنے والے غلط۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ علی گڑھ تحریک کو دوبارہ بڑے زور و شور سے برپا کیا جائے اور اسے ہر ہر شہر اور ہر ہر گاؤں تک پہنچایا جائے۔

سید ہاشم علی

کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو بھی ذریعۂ تعلیم ہو!

آل احمد سرور*

استاذ الاساتذہ پروفیسر آل احمد سرور کا درج ذیل مقالہ علی گڑھ تحریک کے ایک بھولے ہوئے خواب کو نہ صرف یاد دلاتا ہے بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت بھی واضح کرتا ہے۔ اس لیے یہ مقالہ اکتوبر کے تہذیب الاخلاق میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ علی گڑھ تحریک کے ایک گم شدہ پہلو کی بازیافت کے عمل کا آغاز ہو سکے۔
(ادارہ)

اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ ضرور ہونی چاہیے اور اس نیک کام میں کسی استخارے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہیں یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ صرف اردو ذریعۂ تعلیم نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ انگریزی کے علاوہ اردو بھی ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ انگریزی کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم کا سارا انتظام ایک عرصہ دراز تک بدستور چلتا رہے۔ ہاں اس کے علاوہ جلد سے جلد اردو کے ذریعے سے آرٹس، سوشل سائنس، سائنس اور کامرس کی فیکلٹیوں میں پہلی ڈگری تک اردو ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان ہو اور جب یہ تجربہ کامیاب اور مستحکم ہو جائے تو اس کے بعد پوسٹ گریجویٹ مرحلے کے لیے تیاری کر کے اس منزل پر بھی اعلیٰ تعلیم کا مناسب انتظام اردو کے ذریعے سے کیا جائے۔

اس اقدام کی خالص علمی اور تہذیبی، تعلیمی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے اہمیت کے متعلق میرے نزدیک اہل نظر میں اتفاق ہے اور تفصیل سے ہر پہلو پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جن لوگوں کے ذہنوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں اور جن کے ذہن پر تالے پڑے ہوئے ہیں اُن کو چھوڑ کر ہر صاحب بصیرت اس حقیقت سے واقف ہے کہ خیال اور زبان کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اور کوئی ذہن نہ اپنی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان میں سوچ سکتا ہے نہ ایک خیال کے چراغ سے دوسرے خیال کا چراغ جلا سکتا ہے۔ کسی دوسری زبان کے ذریعے سے تعلیم پانے والا کتاب خواں تو ہو سکتا ہے صاحب کتاب نہیں ہو سکتا۔ وہ مانگے کے اجالے سے اپنے گھر میں کچھ روشنی کر سکتا ہے مگر اپنی محفل میں چراغاں نہیں کر سکتا۔ وہ ساری عمر تقلید کرتا رہے گا۔ کبھی اجتہاد نہ کر سکے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ترجمانی کا حق ادا کر سکے گا مگر وہ اجتہاد نہیں کر سکے گا جو حقیقی تخلیق کے لیے فضا ہموار کرتی ہے۔ وہ قدروں کا کاسۂ گدائی لیے ...

---

* سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہو سکے گا کہ جیتی ہوئی چیزوں اور بگاڑ کو مال کو مقبول بنائے۔
اس میں [illegible] فکر، اخلاق تخیل اور بے باک نظر نہ پیدا
ہو سکے گی۔ وہ علم کو معلومات کا انبار سمجھتا رہے گا۔ اور
دوسری کے الفاظ میں [illegible] سے ہی اس کے علم کا رشتہ رہے گا
اور [illegible] یہ علم سانپ بن جائے گا۔ مگر چونکہ دل سے اس
کا تعلق نہ ہوگا اس لیے علم کی یاری کی نعمت اُسے حاصل
نہ ہو سکے گی۔ پھر چونکہ زبان تہذیب کا آلہ ہوتی ہے اس لیے
اپنی زبان میں علم نہ حاصل کرنے کی وجہ سے اس کی اپنی
تہذیب کی حیات بخش اور حیات آفریں بنیاد اسے نہ مل سکے
گی۔ وہ ہمیشہ خلا میں معلق رہے گا۔ اپنی دھرتی اور اپنی فضا
سے اس کا وہ تعلق نہ ہوگا جس کے رس اور جس کے فیض سے
اس کو اپنی سیرت و شخصیت کو پورے قد تک پہنچانے کا
موقع ملتا ہے۔ مالی نوسکی کے وقت سے یہ بات اب سماجی
علوم کے ماہرین ماننے لگے ہیں کہ ہر زبان میں خواہ وہ کسی
وجہ سے آگے نہ بڑھی ہو، یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی
اُن زبانوں کی تخلیق میں ہمسری کر سکے جو ترقی یافتہ کہلاتی ہیں
بشرطیکہ اُن کو مواقع ملتے رہیں۔ آج کی تہذیب کو 'PRIMTIVE'
(وحشیانہ) کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک اردو کا
تعلق ہے اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ
یہ خاصی ترقی یافتہ زبان ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب
کی کمائی ہوئی ساری دولت اس کے پاس ہے۔ ہندوستان
کی تاریخ کے ہر موڑ کا اس نے ساتھ دیا ہے اور یہ اس کے
درد و داغ اور آرزو و جستجو کی ہر منزل سے زادِ راہ لیتی
رہی ہے اور "انقلاب زندہ باد" سے لے "آرام حرام ہے"
اور "غریبی ہٹاؤ" تک کے ہر نعرے میں اسی کا سہارا لیا گیا ہے۔
پھر دلی کالج، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ
عثمانیہ یونیورسٹی، انجمن ترقی اردو ہند اور اب ترقی اردو
بورڈ کے ذریعے سے جدید ترین علمی افکار و مسائل، نظریات و
نگارشات کے اظہار پر قادر ہو رہی ہے۔ آزادی کے بعد

بھی جب مختلف سیاسی اسباب کی بنا پر اس کے چلن اور تعلیم پر
پابندیاں عاید کی گئیں، بہار میں یہ دوسری سرکاری زبان ہے
اور اب اتر پردیش میں بھی حکومت اس غرض کے لیے ایک
بل لائی ہے۔ آندھرا پردیش میں نہ صرف ثانوی تعلیم بلکہ
اعلیٰ تعلیم بھی اس کے ذریعے سے دی جا رہی ہے اور تلنگانہ
میں یہ دوسری سرکاری زبان ہے۔ مہاراشٹر میں اس کے
ذریعے سے ثانوی تعلیم کا ایک اچھا اور خاصا کارآمد نظام
چل رہا ہے۔ ہندی ریاستوں میں بھی ابتدائی تعلیم کے
علاوہ کہیں کہیں ثانوی تعلیم کا کچھ انتظام ہے۔ جموں و کشمیر
کی یہ سرکاری زبان ہے اور اس کے تین علاقوں کشمیر، جموں
اور لداخ میں لنک لینگویج یا تینوں حصوں کو ایک دوسرے
سے منسلک کرنے والی زبان ہے۔ آزادی کے بعد بھی
اس کا ادب ہندوستان کی دوسری قومی زبانوں کے مقابلے
میں کسی طرح کم مایہ نہیں کہا جا سکتا۔ ملک کی ایک تہائی
یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قایم ہیں۔ ہندی کے بعد
سب سے زیادہ اخبارات اس زبان میں شایع ہوتے ہیں
اور جس طرح ازمنہ وسطیٰ کی کلیدی زبان فارسی ہے اور
کوئی ازمنہ وسطیٰ کا طالب علم فارسی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا
اسی طرح اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ذہن، سماج،
مزاج اور مسائل کو سمجھنے کے لیے اردو میں جتنا مواد ہے
وہ کسی اور زبان میں مشکل سے ملے گا۔ کیونکہ دوسری سب
زبانیں علاقائی تھیں۔ اس زمانے میں یہی ملک گیر زبان
تھی۔ آخری بات نفسیاتی ہے۔ کسی دوسری زبان کے ذریعہ
سے تعلیم حاصل کی جائے تو تعلیم کے ساتھ اس زبان کی
تہذیب بھی مزاج اور شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔
آدمی ہمیشہ محتاج رہتا ہے۔ کسی ذہنی سہارے کسی نظریاتی
لاٹھی کا جو زبان کے ذریعے سے غیر شعوری طور پر در آتی
ہے۔ وہ غنی نہیں ہو سکتا۔ اپنی زبان پر کامل عبور کے بعد
دوسری زبان بھی سیکھے گا تو تجربے سے پیوستہ رہے گا۔ اپنی

زبان پر عبور کے بغیر دوسری زبان سیکھے گا تو اس کی شخصیت خانوں میں تقسیم ہوجائے گی اور وہ ساری عمر ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے گا۔ اپنی دھرتی، اپنے ماحول، اپنی تہذیب کی غذا کے بغیر اس کی کیفیت وہ ہوگی جس کی طرف جگر نے ایک مصرع میں اشارہ کیا ہے۔

سینہ خالی آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیے

ہماری آخری تعلیمی کمیشن یعنی کوٹھاری کمیشن نے نہ صرف علاقائی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کی منزل تک ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش کی تھی بلکہ خاص طور پر دو جگہ اس پر زور دیا تھا کہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دو مرکز ایک شمالی ہند میں، ایک جنوبی ہند میں قایم کیے جائیں۔ قومی تعلیمی پالیسی کی قرارداد میں جو پارلیمنٹ نے ۱۹۶۷ء میں منظور کی علاقائی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے اصول کی توثیق کردی گئی۔ گویا اگر ہم اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیں تو وہ اس پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور ہم خاموش بیٹھے رہیں تو یہ ہماری ہی کوتاہی ہوگی۔ حکومت بہرحال ہر قومی زبان اور علاقائی زبان میں اعلیٰ تعلیم دینے کی پالیسی پر گامزن ہے۔ ریاستی حکومتیں اپنے اپنے علاقے میں جدید ترین معیاروں کے مطابق کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمے میں مصروف ہیں۔ اور چونکہ حکومت ہر قومی زبان کے لیے سہولت دینی چاہتی ہے اس لیے مرکزی ترقی اردو بورڈ اسی غرض سے ۱۹۶۹ء میں وجود میں آیا۔ اس وقت کے وزیر تعلیم نے بورڈ کا مقصد خاص طور سے یونیورسٹی کی تعلیم کے لیے اردو میں مناسب لٹریچر تیار کرنا اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے اردو داں طبقے میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کے لیے سائنسی عام فہم لٹریچر تیار کرنا قرار دیا تھا۔ اس خاکے کے مطابق بورڈ اپنا کام کر رہا ہے، ہاں اردو داں طبقے کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے لغات، حوالے کی کتابوں اور بچوں کے ادب پر بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔

یہ بات بورڈ سے تعلق کی وجہ سے میرے ذاتی علم میں ہے کہ علی گڑھ کے ۱۴۵ استاد کسی نہ کسی طرح ترجمے یا تصنیف و تالیف کے کاموں میں بورڈ کی مدد کر رہے ہیں۔ اور اصطلاح سازی کے کاموں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نمایندگی دوسرے تمام اداروں سے زیادہ ہے۔

ان امید افزا حالات کے باوجود نہ معلوم مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کیا سوچ رہے ہیں؟ میں نے ۱۹۷۳ء میں اکیڈمک کونسل کو اردو کو بھی ذریعۂ تعلیم بنانے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء کے آخر میں وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں اپنی تجویز کی ایک نقل اور اس کے ساتھ ایک نوٹ دیا تھا۔ اور انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد اس سلسلے میں مناسب قدم اٹھائیں گے مگر ابھی تک معاملہ سرد خانے میں ہی ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ حیدرآباد میں اردو کے چند خادموں نے پہلے آرٹس میں اور پھر سائنس اور کامرس میں بی۔ اے تک تعلیم کا انتظام کر دیا ہے۔ اور اس کے لیے ترقی اردو بورڈ کی مدد سے انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ حیدرآباد نے کتابیں بھی تیار کر دی ہیں۔ ان طلبا کو عثمانیہ یونیورسٹی ڈگری بھی دے رہی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بی۔ اے کی منزل تک اردو ذریعہ تعلیم عرصے سے ہے۔ سرتیج بہادر سپرو اور دوسرے اہل بصیرت عثمانیہ یونیورسٹی کے تجربے کی صحت اور معنویت پر پہلے ہی مہر توثیق ثبت کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، میر ولی الدین اور درجنوں مستند اساتذہ کی علمی خدمات ایسی نہیں ہیں کہ ملک انھیں فراموش کر دے۔ مگر یہ بات بڑے رنج سے کہنی پڑتی ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جس سے اس معاملے میں آزادی کے بعد پہل کرنے کی توقع تھی وہ حالات کے دریا میں تنکے کی طرح بہہ رہی ہے۔ اسے نہ یہ خیال ہے کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں جانا ہے۔ نہ اس نے سرسید کے

حقیقی پیغام کو ذہن میں رکھا ہے۔ مسلمانانِ ہند کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز رہنے کے لیے جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ اسے اسلامیات، عربی، فارسی میں ماہرین پیدا کرنے ہیں جو نہ صرف ملکی بلکہ عالمی معیاروں پر پورے اتر سکیں اور اُن سے دوسروں کو روشنی مل سکے۔ نیز اسے اردو کے ذریعے سے جو ہماری مشترک تہذیب کی سب سے شاندار اور جاندار میراث ہے جدید علوم کی تعلیم دے کر ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے جو ابن الوقت نہ ہو بلکہ وقت پر حکمرانی کر سکے۔ اردو کا شعبہ تو بجا طور پر اردو زبان وادب کی تعلیم دے رہا ہے مگر اردو زبان کے ذریعے سے تعلیم دینا اور اردو میں اس کے لیے علمی ادب کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ کرنا بھی اس کا فرض ہے جس کی طرف سے یہ ابھی تک غافل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ کچھ نوجوان سائنس دانوں نے جن میں سعید الظفر چغتائی پیش پیش ہیں ایک سائنٹی فک سوسائٹی بنائی جس نے گذشتہ چند سال تک جلسے بھی کیے اور مختلف علوم پر اردو میں مقالے پیش کیے مگر اب یہ بھی خاموش ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یونیورسٹی اس سلسلے میں کیا کر رہی ہے۔ ۱۹۸۱ء کے ایکٹ کے مطابق یونیورسٹی کو اب اقلیتی ادارے کا درجہ بھی مل گیا ہے۔ گویا اب اس کی یہ ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے کہ وہ عربی، فارسی اور اسلامیات کے فروغ کے علاوہ اردو کے ذریعہ سے دانش وری کے فرائض انجام دے۔ اگر ہمارا مطالبہ یہ ہوتا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صرف اردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے تو اس کی مخالفت سمجھ میں آسکتی تھی کیونکہ آج ہمارے نام نہاد دانش ور دانش وری کے بجائے ابن الوقتی کا شکار ہو گئے ہیں، اور ان میں حریت فکر، حرارت اندیشہ اور بے دھڑک آتش نمرود میں کود پڑنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ مگر ہم تو یہ نہیں کہتے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم اور ذریعۂ تعلیم کو ترک کر دیا جائے۔ فلسفے کی دنیا میں بھی اب یہ یا وہ either/or کا نظریہ مقبول نہیں رہا ہم تو یہ بھی اور وہ بھی کے علمبردار ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔ ہاں اس کے ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے اور جلد سے جلد کیا جائے۔

جب سرسید نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی تھی تو وہ تین قسم کے مدرسے یا شعبے قائم کرنا چاہتے تھے ایک وہ مدرسہ جس میں انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ دوسرے وہ مدرسہ جس میں اردو کے ذریعے تعلیم دی جائے۔ تیسرے وہ مدرسہ جس میں عربی فارسی کے طلبا کو مذہبی تعلیم دی جائے۔ پہلے دو مدرسے کھلے ضرور مگر صرف انگریزی کا مدرسہ چلتا رہا۔ اردو کا مدرسہ طلبا کی کمی اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے سات برس کے بعد بند کر دیا گیا۔ انگریزی مدرسے کا مقصد صرف ملازمتوں کے لیے تیار کرنا نہیں تھا۔ ایسے طلبا بھی تیار کرنا تھا جو اردو میں جدید علوم کو منتقل کر سکیں۔ مگر انیسویں صدی کی نوآبادیاتی فضا کی وجہ سے اور انگریز پرنسپلوں اور پروفیسروں کے سرسید کے مزاج میں دخیل ہونے کی وجہ سے ملازمتوں کا حصول اور جنٹلمین کا تصور ہی ایم۔ اے۔ او کالج کا مطمحِ نظر رہا۔ اگر کچھ اچھے اردو مصنف کالج سے نکلے تو یہ کالج کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے باوجود ورنہ ایم۔ اے۔ او کالج میں تو بیسویں صدی کے شروع تک مغرب اور مغربیت سے اس قدر مرعوبیت تھی کہ ایک طالب علم نے ایم اے میں فارسی لی تو ساتھیوں کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں لٹریچر میں ایم۔ اے کر رہا ہوں۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں مقرر صرف انگریزی کا جانا جاتا تھا۔ اردو کا مقرر، ادیب یا شاعر بس برداشت کر لیا جاتا تھا۔ ایم۔ اے۔ او کالج کی لطیف حکایت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پہلو کی حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ایم۔ اے۔ او کالج میں سرسید کی عظیم اصلاحی اور

انقلابی تحریک جس طرح سکڑ اور سمٹ گئی اس کے تاریخی اسباب تھے۔ سرسید خود اردو کے ذریعے سے تعلیم کے حامی تھے۔ بعد میں انھوں نے انگریزی کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم کی حمایت کی اور اردو کے ذریعہ تعلیم کی مخالفت کی۔ مگر سرسید کے سامنے دو مجبوریاں تھیں۔ ایک تو وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں جدید ذہن پیدا ہو جو قدیم لٹریچر سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جلد سے جلد ملازمتوں میں اپنا جائز حصہ لے لیں اور حکومت کی نظرِ عتاب اُن پر نہ رہے۔ لیکن آج جب کہ ہم آزاد ہندوستان میں سانس لے رہے ہیں ہماری آزادی کو تقریباً چالیس سال اور ہماری جمہوریت کو اُنتالیس سال گزر چکے ہیں۔ ملک میں جمہوریت کی بنیاد مضبوط ہو رہی ہے اور ہم سیکولرازم اور سوشلزم کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں خواص کے لیے تعلیم کے بجائے سارے سماج کے لیے تعلیم کے مواقع فراہم کرنا اور چند افراد کے ذریعے سے علم اور تہذیب کے تقاطر (Filteration) کے بجائے عوامی اور جمہوری نظام تعلیم ہی ہمارا النصب العین ہو سکتا ہے۔ جب نہ صرف یہ حقیقت مانی جا چکی ہے کہ قومی زبانوں کے ذریعے سے اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے بلکہ دوسری زبانوں میں اور علاقوں میں ایسا ہو بھی رہا ہے۔ جب یہ اصول تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ہمیں ساری دنیا سے تازہ فکر، تازہ ذہن، نئی غذا لینا چاہیے۔ مگر اپنی فطرت اپنی جینیس، اپنی تہذیب تاریخ، اجتماعی لاشعور، اپنی دھرتی کے احساس اور اپنی چیزوں پر اعتماد کی بنیاد پر، تو علی گڑھ کو اردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم دینے میں اب دیر نہ کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں کتابوں کی تیاری اور مناسب اور موزوں استادوں کے تقرر کے علاوہ یہ مسئلہ بھی قابلِ توجہ ہوگا کہ جو لوگ اردو کے ذریعے بی۔ اے، بی۔ ایس سی، پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کریں گے وہ آئندہ کیا کریں گے۔ ان کے لیے روزگار کہاں

سے آئے گا۔ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہ روزگار کا مسئلہ اس قدر بھیانک طریقے پر اس لیے پیش کیا جاتا ہے کہ لوگ اس کی ہیبت کی وجہ سے سوچنا اور سمجھنا چھوڑ دیں۔ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے یہاں سے ہر سال جو گریجویٹ نکلتے ہیں ان میں کیا سب کو ملازمت مل جاتی ہے۔ دوسرے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ آج بھی کچھ لوگ پرائیوٹ اسکولوں اور کالجوں میں استاد ہوتے ہیں یا اخباروں اور رسالوں کے دفتر میں کام کرتے ہیں یا اپنا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں جس کا ان کی ڈگری سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اردو کے یہ گریجویٹ انگریزی اتنی ہی جانتے ہوں گے اور ہندی یا کسی علاقائی زبان سے اتنے ہی واقف ہوں گے جتنے دوسرے گریجویٹ اور چونکہ ہمارے دعوے کے مطابق اردو ذریعہ تعلیم کی وجہ سے وہ اپنے مضمون کی روح سے اور دوسرے مضامین سے اس کے تعلق سے اور اپنی سیرت و شخصیت کی پختگی اور ذہن کی بیداری کی وجہ سے اُن طلبا سے جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے ہیں زیادہ جاندار اور متناسب شخصیت رکھتے ہوں گے اس لیے وہ ان راستوں سے جو پامال ہو چکے ہیں ہٹ کر اپنے لیے نئی نئی راہیں نکالنے کے زیادہ قابل ہوں گے۔ بہرحال یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد میں روزگار کی فراہمی نہیں ہے۔ تعلیم اور ہنر میں فرق ہے۔ ہاں ہر اچھی یونیورسٹی کو اپنے طالب علم کو اس قابل بنانا چاہیے کہ وہ خواہ مقابلے کے امتحان ہوں یا دوسری ملازمتوں کے ذرائع، کاروبار کے دھندے ہوں یا ملک و قوم کی فلاح کے دوسرے راستے ان میں کسی نہ کسی پر گامزن ہو سکے۔ ان نوجوانوں کو جو آج ہماری قومی طاقت کا خزانہ ہیں خدا کے لیے صرف مصلحت میں نہ بنا بیٹھے [illegible] آہستہ خرامی بلکہ خرامی تو دے [illegible]

زندگی کے لاتعداد امکانات دریافت کرنے، ان کو کھونے اور پانے، کچھ کرنے اور کچھ کرانے کا موقع دیجئے ورنہ صنعتی تہذیب کا سمندر ویسے ہی اُن کی ساری انرجی اور حرارت کو پی جانے کے لیے بیتاب ہے۔

پہلے میرا خیال یہ تھا کہ ہر فیکلٹی ان مضامین میں جن کے سربراہ اس کے لیے تیار ہوں موجودہ درجوں کے متوازی اردو کے درجے قایم کرے۔ جن میں اردو ذریعہ تعلیم ہو۔ اب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک اس سے بہتر صورت بھی ہے۔ کیونکہ اس تجویز میں کچھ انتشار اور کچھ انتظامی دشواریوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ اب غور کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کے لیے حسب ذیل طریقۂ کار بہتر ہوگا۔

۱۔ سب سے پہلے اکیڈمک کونسل ایک نمائندہ کمیٹی بنائے جس میں آرٹس سوشل سائنس، اور کامرس کی فیکلٹیوں میں سے دو دو اساتذہ چاروں فیکلٹیوں کے ڈین، ہر فیکلٹی سے ایک ایک طالب علم اور اس کے علاوہ یونیورسٹی کا ایک پروفیسر اور ایک ریڈر اور ایک لیکچرر اور یونین کے تین عہدہ دار مزید ہوں۔ ان ۲۲ ممبروں کی کمیٹی کے صدر وائس چانسلر اور نائب صدر پرو وائس چانسلر ہوں۔ پرو وائس چانسلر کمیٹی کا جلسہ طلب کریں جو جلد سے جلد حسب ذیل باتوں کے سلسلے میں اپنی سفارش اکیڈمک کونسل کو پیش کر دے۔

۱۔ کیا اصولی طور پر اردو ذریعۂ تعلیم سے اتفاق ہے؟

۲۔ اگر ہے تو اس کے لیے عملی ڈھانچہ کیا مناسب ہوگا؟ متوازی درجوں کا یا ایک علیٰحدہ کالج کا۔

۳۔ اگر متوازی درجوں کا انتظام کرنا ہے تو ڈین صاحبان اپنے اپنے طور پر یہ انتظامات کریں گے۔ ہر شعبے کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہے تو اگلے تعلیمی سال سے اردو میں تعلیم کا انتظام کرے اور چاہے تو دوسرے شعبوں میں اس کا تجربہ دیکھ لے مگر یہ نہ ہونا چاہیے کہ چند شعبوں کی مخالفت کی وجہ سے جو شعبے یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں وہ بھی ایسا نہ کر سکیں۔

۴۔ اکیڈمک کونسل کی رپورٹ فیکلٹیوں کو بھیجی جائے اور وہ شعبوں سے رائے لے کر ایک مہینے کے اندر عملی تجاویز اکیڈمک کونسل کے سامنے رکھیں۔

۵۔ اکیڈمک کونسل کی منظوری کے بعد اگزکٹو کونسل میں یہ معاملہ پیش کیا جائے اور قواعد و ضوابط میں ضروری ترامیم اس سشن کے ختم ہونے سے پہلے ہو جائیں۔

۶۔ اگر کالج کی تجویز منظور ہو جائے تو پہلے سال آرٹس اور سوشل سائنس میں اور دوسرے سال سائنس اور کامرس میں اردو کے ذریعے تعلیم شروع کی جائے۔

۷۔ اساتذہ کو اس کالج میں تعلیم دینے کے لیے ۲۰ فیصدی الاؤنس دیا جائے۔ اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام علی گڑھ میں ضروری بھی ہے اور قابلِ عمل بھی، اب دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ کے نوجوان اپنے بزرگوں کی سرد مصلحت پسندی اور سایۂ دیوار کے سہارے میں چلنا پسند کرتے ہیں یا زندگی کے تقاضوں کی کڑی دھوپ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ جب تک قانون باغبانی صحرا نہ آئے توسیع کاروبار چمن نہیں ہو سکتی۔

اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا ایک تہذیبی اور قومی مقصد بھی ہے۔ اردو ہماری مشترک تہذیب کی بڑی شاندار اور جاندار میراث ہے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے ذریعہ سے زندگی میں قدم رکھنے والے نوجوان مشترک تہذیب کی قدروں سے آشنا ہونے کی وجہ سے قومی

نقطۂ نظر کے حامل ہوں گے۔ علی گڑھ اِدھر صرف تقلید کرنے پر قانع رہا ہے۔ اسے رہ نمائی کا فرض کب یاد آئے گا۔ وقت اور زمانہ اُس سے کہہ رہا ہے ۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرسِ کارواں رہے

جمہوریت کے لیے ضروری ہے کہ شہریوں کی جان و مال سے زیادہ اخلاقی قدروں کی پاسبانی کرے۔ کیوں کہ جب یہ قدریں کمزور پڑ جاتی ہیں تو جنگل کا قانون لاگو ہو جاتا ہے جس کے ہاتھ جو کچھ آجاتا ہے اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ بھینس اسی کی ہو جاتی ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو، دولت اسی کے پاس کھنچ کر پہنچ جاتی ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہو۔ جمہوریت کامیاب جبھی ہوتی ہے اور لوگوں کی آزادی اور عزّت، اُن کا اعتماد اور اُن کا ضمیر بحال جبھی ہوتا ہے جب اُن میں جرأت ہو برائی کے خلاف آواز اُٹھانے کی۔ بُرائی کو انگیز کرنے والے بُرائی کو پروان چڑھاتے ہیں۔

سیّد حامد

سر سیّد کی یاد

محمد اشتیاق حسین قریشی*

مسلم حکمرانوں کے زوال کے بعد سرسید کی شخصیت سب سے زیادہ قد آور نظر آتی ہے جن کی کوششوں کے نتیجہ میں ملتِ اسلامیہ ایک بار پھر اپنا اثر و رسوخ قائم کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ سرسید کی تحریک کے اثرات صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہے جہاں بھی اس تحریک کے تربیت یافتہ پہنچے انھوں نے اپنی اہلیت کا ثبوت دیا۔ سرسید نے ذاتی طور پر علوم اسلامیہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں جو بھی خدمت کی اضطراری طور پر کی، انھوں نے مفسر اور محدث ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔

انھوں نے اپنے مشن میں اعلیٰ ترین صلاحیت کی ایسی شخصیتوں کو شریک کیا جو دینی علوم کے ماہر تھے۔ انھوں نے کردار سازی کے کام میں بھی ایسے تمام لوگوں کا تعاون حاصل کرنے میں ادنیٰ درجہ کا بخل نہیں کیا اور اُن کے ساتھ ہمیشہ اعزاز و اکرام کا معاملہ رکھا۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی تلخی سے نہیں پیش آئے جنھوں نے سرسید کو تنقید کا نشانہ بنایا یا ان کے مشن کے خلاف بھرپور تحریک چلائی، سرسید کی تحریک اور ان کے قائم کیے ہوئے ادارہ کا سب سے بڑا وصف جو آج بھی موجود ہے کہ اس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں اور کہیں دور دور تک اس میں کسی قسم کی عصبیت نہیں ہے۔ نہ ذات برادری کی نہ عقیدہ و مسلک کی اور نہ تعلیمی ادارہ کی نسبت کی، ہندوستان کے تمام بڑے دینی اداروں میں آج بھی عصبیت نمایاں ہے۔ ایک ادارے سے نسبت رکھنے والے، دوسرے دینی ادارے کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، حالانکہ وہاں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ سب مشترک ہیں اور پڑھانے والے بھی مشترک نسبت رکھتے ہیں، اس کے برعکس علیگ برادری سب کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ رکھتی ہے اور سب کو تعاون دینے کیلئے تیار رہتی ہے سرسید تحریک کا تنہا یہ وصف ایسا ہے جو انکو اپنے دور میں اور آنے والے دور کی تمام شخصیتوں میں ممتاز رکھنے کیلئے کافی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کام کو جو قبولِ عام حاصل ہوا اور جاں نثاروں کی جو فوج تیار ہوئی اُس نے زندگی کے ہر محاذ پر جس طرح محنت مشقت، ایثار و قربانی، اپنی ذہانت اور بروقت عملی اقدام، جو نقش قائم کئے اس کی نظیر نہیں ملتی۔

سرسید کی تحریک نے جرأت و ہمت مساوات اور بڑی بڑی طاقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا جوہر کیا، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ اثرات آج بھی نمایاں ہیں سرسید کے کردار میں دانش مندی، دلسوزی، دینی حمیت اور ڈسپلن کا ایسا حسین امتزاج ہے جس کی کوئی نظیر دور دور تک نظر نہیں آتی۔ سرسید کی شخصیت کو لوگوں نے گھٹانے کی کوشش کی لیکن آج انھیں گھرانوں کے بچوں کی وہ پناہ گاہ ہے جہاں سے ان پر کفر کے فتوے صادر کئے گئے۔

سرسید کی تحریک اور ان کے مشن کی مخالفت میں یقیناً [illegible] نے کوتاہی کی اور اکثریت نے تو صرف [illegible] رکھا

* گوئن روڈ، لکھنؤ

صرف فائدہ اٹھایا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے کام کو ایسی قبولیت عطا فرمائی کہ وہ آج بھی روشنی کے مینار کی طرح آندھی اور طوفان میں گھرے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کا فرض انجام دے رہا ہے۔
سرسید کی روح یونیورسٹی کی فضا اور در و دیوار میں اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ وہاں جانے والا اُسے محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرسید کے مشن اور مسلم یونیورسٹی کو تحلیل کر دینے کی کوشش کے راستہ میں دراصل یہی روح مزاحم ہے اگر ذراسی آنچ بھی آتی ہے تو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی علیگ برادری تڑپ اٹھتی ہے اور صرف علیگ برادری نہیں ہر صاحب ایمان تڑپ جاتا ہے اور سینہ سپر ہونے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے یہ حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ سرسید کے خلوص کی برکت ہے۔

سرسید نے اپنے مشن پر کوئی ملمع نہیں چڑھایا نہ قوم کو دھوکا دیا اور نہ حکومت وقت کے آگے سر جھکایا یہاں تک کہ لندن جاکر عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کے خلاف زور دار مہم چلائی انھوں نے اس کی خاطر اپنے گھر کا اثاثہ فروخت کر دیا، ان کے دور میں کوئی شخصیت اسی مسئلہ میں اتنی نمایاں نظر نہیں آئی۔
تعلیم کے مسئلہ میں اُنکا نقطۂ نظر بالکل واضح تھا انھوں نے صاف الفاظ میں اعلان کیا۔

"اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی۔ اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے کوئی قوم جن کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ ہوئے۔ اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔ میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لےلیں۔ گورنمنٹ کے قدرت سے خارج ہے کیا وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کریگی مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں وہ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا ان کو غیرت نہیں آتی۔"
سرسید کو خراج عقیدت پیش کرنے کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ان کے تعلیمی مشن کو جاری رکھنے کا عزم کیا جائے اور ہر سال ۱۷ اکتوبر کو اس کی تجدید کی جائے اور طے کیا جائے کہ ہم اس مشن کی خاطر اپنی ایک دن کی آمدنی دیں گے کم سے کم ایک طالب علم کی تعلیم کے مصارف کا انتظام کریں گے اور کسی ایک تعلیمی ادارے کے قیام یا استحکام میں مدد کریں گے اگر اتنا بھی کر لیا جائے تو چند برسوں میں عظیم انقلاب آسکتا ہے۔

"سید احمد خاں اپنے پروردگار کے جوار رحمت
میں چلے گئے" دیکھو ہماری قومی عمارت کے ستون
گر رہے ہیں، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن
اس وقت طاقت گویائی کہاں سے لاؤں"

علامہ شبلی نعمانی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)

علیحدگی پسندی کا افسانہ : شاہ ولی اللہ اور سرسید

محمد اعظم قاسمی*

آج کل بار بار ہندوستان کے غیر مسلم صحافی اور مبصر حلقوں
[...] ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلے میں علیحدگی پسندانہ رجحان کی بات
[...]زور دیا جاتا ہے۔ ان مبصروں میں قومی پریس کے نامور
[...]نامہ نگار اور ایڈیٹر بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ بات اگر سیاسی
[...]یا انفرادی رائے ہوتی تو بے محل اور خلاف واقعہ ہونے کے
[...]جود زیادہ اہم قرار نہ پاتی۔ لیکن جب انفرادی رائے کو تاریخ کی
[...]شنی میں اور دلائل سے مزین کر کے عوامی ذرائع ابلاغ کی راہ سے
[...]سطح پر پیش کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ بھی اس طرح کہ
[...]حقائق کو اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق توڑ مروڑ کے
[...]مسخ کر کے کام میں لایا جائے تو اپنے دور رس اثرات کے لحاظ
[...] ایسی رائے کو شخصی اور انفرادی رائے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا
[...] رائے عامہ کو اپنی رائے کے حق میں ہموار کرنے کی ایک منظم کوشش
ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے اس وضع کی غیر تاریخی آراء میں غیر
[...]م زعماء اور علماء کا تو ذکر کیا شاہ ولی اللہ اور سرسید جیسی
[...] آفریں اور آفاقی شخصیات کو بھی اس کوشش میں خاص [illegible]
گیا ہے۔ ہم سطور ذیل میں انھیں دو شخصیات کو سامنے رکھ کر
[...]غیر مبصرانہ رائے کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔

[...] ولی اللہ پر عربیت زدگی کا الزام : اس کی تمام جہاد
علمی تنقید میں اس
[...] پسندانہ رجحان کا اولین بانی شاہ ولی اللہ کو قرار دیا گیا

ہے کہ انھوں نے مسلمانوں میں دین اور مذہب کی اصلاح کے
نام پر ہندوستانیت کی بجائے عربیت کے جذبے کو فروغ دینے
کی کوشش کی اور مسلمانوں میں اس حلقے کی اصطلاح کے مطابق
بنیاد پرستی کی داغ بیل ڈالی ہے۔ ایسا کہنے والے تھوڑی دیر کے لئے
اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں
اسلامی احیائیت کے سامنے آنے سے بہت پہلے شنکر آچاریہ، رامانج
چیتنیہ وغیرہ کی احیائی کوششوں کے طفیل ہندوستان کے طول و عرض
میں بنیاد پرستی اور احیائیت کا آغاز ہو چکا تھا اور سرسید کے زمانے
تک پہنچتے پہنچتے آریہ سماج اور بعد ازاں شدھی سنگٹھن جیسی خالص
بنیاد پرستانہ تحریکات سامنے آچکی تھیں۔ خیر یہ تو ایک الزامی جواب
ہے جو محض ایک جملۂ معترضہ ہے اور ہمارا مقصود کلام نہیں۔
یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کا تعلق ایک ایسے
دور سے ہے جو ہزار خرابیاں پیدا ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان میں
مسلم اقتدار اور حکومت کا زمانہ تھا اس لئے شاہ ولی اللہ پر بنیاد
پرستی اور عربیت زدگی کا الزام لگا کر یہ ثابت کرنا تو لاحاصل سی
بات ہے کہ وہ مسلم اقتدار اور حکومت کو قائم کرنے کے لئے کوشاں
رہے۔ اس کے برعکس امر واقعہ یہ ہے کہ وہ تو سرے ہی سے ہندوستان
میں مسلمانوں کی بادشاہت اور کسی غیر اسلامی حکومت کے مخالف تھے
اور وہ بھی اس حد تک کہ انھوں نے اس پورے نظام حکومت اور
نظام معیشت کو توڑ ڈالنے کا برملا اعلان کیا۔ ان کی تمام سیاسی

* [...] آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اور اقتصادی تنقید کا ماحصل یہ جملہ ہے "فکِّ کل نظام" یعنی اگر کوئی تعمیر اور ترقی مقصود ہے تو پہلے اس تمام نظامِ حکومت کو توڑ ڈالو۔

اب رہا شاہ ولی اللہ کی "عربیت زدگی" کا معاملہ۔ تو یہ صرف شاہ صاحب تک محدود نہیں اور کبھی کسی فرد یا مت تک محدود رہا ہے بلکہ تمام مسلمان علماء اور مصلحین جب بھی مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لئے ذہنی یا عملی طور پر مستعد ہو کر اٹھے ہیں تو انھوں نے عربیت ہی کا راستہ اختیار کیا ہے یہ اس لئے کہ اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں ہے جس کا آغاز اور جس کی اصل تعلیمات تاریخ کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی ہوں بلکہ یہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی آسمانی کتاب یعنی "قرآن کریم" اور جس کے قائدِ اعظم کی تیئیس ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی کے شب و روز کی تفصیلات یعنی احادیث آج بھی اپنی پوری اصلیت اور الفاظ کے ساتھ عربی زبان میں محفوظ ہیں اور اس حقیقت سے مسلمان ہو یا غیر مسلم کوئی مورخ منکر نہیں ہے۔ چنانچہ جب بھی اسلام کی تاریخ، تعلیمات یا اس کے طریقۂ زندگی کی بات آئیگی تو عربی زبان، ماحول اور عربی اصطلاحات کا ذکر اور اعادہ ناگزیر ہے، لیکن ظاہر ہے اس عربیت کا کسی نسلی یا تہذیبی عربیت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اسلامی عربیت سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان اٹھنے والی کوئی تحریک خواہ اس کا تعلق کسی زمانے یا کسی بھی ملک سے ہو، اس "اسلامی عربیت" سے جو اس کی اسناد و اصلیت کا پیمانہ ہے، انحراف نہیں کر سکتی اور جہاں جہاں بھی کوئی انحراف عمل میں آیا ہے اس کو انحراف ہی کہنا پڑے گا۔

دوسرے الفاظ میں عربیت کا نام لے کر عرب پرستی یا ہندوستان سے منافرت کا مغالطہ پیدا کرنے والے لوگ تھوڑی دیر کے لئے واقف عوام کے بعض حلقوں میں ایک غلط تاثر تو ضرور پیدا کر سکتے ہیں لیکن تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر اسلامی عربیت کو علیحدگی یا منافرت پسندی یا دیگر "پرستی" کے ہم معنی ثابت نہیں کر سکتے۔ اسی بھی زیادہ تاریخ ناشناسی کا ثبوت اس طرح کے قلم

صحافی مورخ یا سیاسی مبصر اس وقت پیش کرتے ہیں جب علیحدگی پسندی کا الزام سرسید جیسے روشن نگاہ، مخلص اور محبِ قوم و وطن کے سر منڈھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس دعوے کی واحد دلیل ان مبصر صحافی دانشوروں کے پاس اس کے سوا دوسری نہیں کہ سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی اور مسلم عوام کو اس میں شریک ہونے سے روکنے کی کوشش کی اور اس طرح قومی ترقی اور جمہوری حقوق کی کوششوں میں شرکت و تعاون کی بجائے علیحدگی کے رجحان کی طرح ڈالی اور ہندو مسلم اتحاد کے بجائے فرقہ واریت کو ہوا دی۔

یہاں بھی ایک محدود دلیل کی آڑ میں درحقیقت ایک زیادہ وسیع المعنی مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش موجود ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ سرسید کی مخالفت علیحدگی پسندی کے جذبے کی عکاس تھی بلکہ اس کے پردے میں یہ بھی کہ سرسید کا پورا نقطۂ نظر علیحدگی پسندی کے رجحان پر مبنی تھا کیونکہ اس کا ماحصل صرف مسلمانوں کی تعلیم و تربیت ہی تھا۔

ہندوستانی تاریخ کے یہ حقائق ابھی اتنے دھندلے نہیں پڑے ہیں کہ انھیں توڑ مروڑ کر خلافِ واقعہ تعبیرات کے لئے بآسانی استعمال کیا جا سکے یا ان کے ذریعہ سے غیر حقیقی تاریخ نکال کر پیش کئے جا سکیں جن کا تاریخی شہادتوں کے سیاق و سباق سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

آئیے پہلے ان سارے تاریخی حقائق پر ایک نظر ڈالی جائے جنھوں نے سرسید جیسے وسیع النظر عالی ظرف اور قوم پرور مصلح کے افکار کو ڈھالنے میں اہم حصہ لیا۔ سرسید نے جس ماحول میں پرورش پائی اور ہوش سنبھالا وہ آلِ تیمور کے آخری زوال شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی انتہائی پست حالی اور انگریزی اقتدار کے عین عروج کا دور تھا۔ اور ۱۸۵۷ء کے بعد تو منتقمانہ پالیسیوں کے نتیجہ میں ہندی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ سرسید نے اپنی قوم کے اس ابتلا اور نکبت کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ جس آخری نتیجہ پر پہنچے وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی پست حالی کا اصل سبب انگریزی

نہیں بلکہ خود ان کی [illegible] ماندگی اور تعلیمی پسماندگی ہے۔
"اسی طرح جس طرح [illegible] اور یورپین اقوام کی ترقی
کا حقیقی سبب انکی طاقت یا سیاست نہیں بلکہ بنیادی طور
بیداری اور ذہنی کاوشیں ہیں جن کے نتیجہ میں ابھرنے والا
نیا نقطۂ نظر ہے جس کے طفیل یورپ میں تمام نو ترقیات ہوری
دنیا میں انکو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ اس حقیقت کو محسوس کر
سرسید نے اپنی علمی تحریک کا آغاز کیا اور سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی
حقیقت کو براہ راست قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے سلسلے میں وہ
ولایت گئے۔ علی گڑھ کالج قائم کیا، ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ
بیل ڈالی اور زندگی کے آخری لمحوں تک انھیں کوششوں میں سرگرم
رہے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس پوری تحریک کے درمیان انکا
مدعا اپنی قوم کی زبوں حالی اور پسماندگی کو دور کرنا تھا اس
وقت ہندوستان میں سب سے زیادہ مقہور، بدحال ملّت مسلمانوں
کی تھی جن کو حکومتِ وقت نے اپنا خاص حریف اور مقابل قرار دے
کر ہر قسم کے ظلم و ستم اور جبر و قہر کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اس لئے قدرتی
طور پر سرسید کی اس تحریک کے اوّلین مخاطب مسلمانانِ ہند تھے، لیکن
انہوں نے اپنی تحریر و تقریر یا اس پوری تحریک میں ہندو مسلم
تفریق کا کوئی عنوان کبھی نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ سرسید کے
یہاں قوم سے مراد تنہا مسلمان نہیں بلکہ تمام ہندوستانی باشندے
تھے خواہ کسی مذہب و ملّت سے انکا تعلق ہو۔ ۴

جب ۱۸۸۴ء میں انڈین ایسوسی ایشن لاہور کی جانب سے
صدر دیال سنگھ نے ان کی خدمت میں ایک سپاس نامہ
پیش کیا تو سرسید نے اس کے جواب میں کہا:

"لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے
ہے یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن (قوم) کی
تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک امر چنداں لحاظ کے
لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ
ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں لیکن جو بات ہم
دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان
ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں اور ایک ہی حاکم کے زیرِ حکومت
ہیں۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔ ہم سب
قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی
مختلف وجوہات ہیں جن کی بناء پر میں ان دونوں قوموں
کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا
ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان میں رہنے والی
قوم"۔ ۵

یہاں تک تو سرسید کی اس خاص وسیع النظری کا ذکر تھا جو
ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ آیئے اب سرسید پر لگائے جانے والے علیحدگی
پسندانہ رجحان والے الزام کا بھی ایک جائزہ لیا جائے جس کی سب سے
بڑی دلیل اس حقیقت کو بنا کر پیش کیا جاتا ہے کہ سرسید نے انڈین
نیشنل کانگریس کی مخالفت کی اور اس میں مسلمانوں کو شمولیت سے
روکا۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اس حقیقت کو بڑھا چڑھا کر اور دلیل
بنا کر پیش کرنے والے درحقیقت ایک عام قاری کے ذہن میں یہ
مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا سرسید نے مسلمانوں
کو آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں شریک ہونے سے باز رکھا اور اس
طرح ان میں علیحدگی پسندی کے رجحان کی داغ بیل ڈالی جو آخرکار
تقسیمِ ملک کی صورت میں ظاہر ہوا۔ نیز آج بھی اور مسلمانوں کے ذہن
اس رجحان سے خالی نہیں ہیں۔

یہاں سب سے پہلی قابلِ لحاظ حقیقت تو یہ ہے انڈین نیشنل کانگریس
کے ۱۸۸۵ء میں قیام کے وقت اور بعد میں بھی کچھ دہائیوں تک
ہندوستان کی مکمل سیاسی آزادی کا کوئی تصور نہیں ابھرا تھا اور
کانگریس کو برطانوی اقتدار کے ماتحت قومی نمائندگی کے احتجاجی پلیٹ
فارم کے طور پر ہی استعمال کیا گیا تھا لہٰذا آزادیٔ ہند کی جدوجہد
سے علیحدگی کا کوئی امکان یا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ کانگریس کے قیام کے وقت حکومت
برطانیہ کا رویہ اس کے ساتھ حد درجہ دوستانہ اور سرپرستانہ تھا
لارڈ ڈفرن نے خود ایک موقع پر کہا کہ یہ وفادار رعایا کی جماعت کا

وجود جو بچاؤ کے لئے کام کرے یہ بہت ضروری"۔ ؎

حقیقت یہ ہے کہ کاؤنسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا مطالبہ سب سے پہلے خود سرسید نے کیا تھا اور تین دھائی پہلے یعنی ۱۸۵۸ء ہی میں وہ حکومتِ برطانیہ سے یہ مطالبہ کر چکے تھے پھر وقتاً فوقتاً اس کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ لیکن تیس سال بعد وہی سرسید اپنے اس مطالبے سے خود پیچھے ہٹ گئے اور اس وقت کہ جب کانگریس نے قومی نمائندگی اور حقوق کے مسئلے کو اٹھایا تو سرسید نے خود کانگریس ہی میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کو بھی شمولیت سے باز رکھا۔ لالہ لاجپت رائے نے جن کا خاندان سرسید کا عقیدت مند تھا بڑی حیرت و دردمندی سے لکھا ہے "کیا یہ منظر افسوس ناک نہیں ہے کہ ایک پیر جہاں دیدہ اپنے ان پودوں کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کر رہا ہے جو کبھی خود اس نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے"۔ ؎

بعض لوگوں نے قومی نمائندگی کے اس مسئلہ پر سرسید کی رائے کی تبدیلی پر سخت حیرت کا اظہار کیا ہے اور اس کو لالہ لاجپت رائے کی طرح افسوس ناک اور ناقابل توجیہ قرار دیا ہے لیکن کانگریس میں شامل ہونے سے سرسید کا انکار اور مسلم عوام کو اس سے الگ رہنے کی نصیحت درحقیقت اس وقت کی کانگریسی سیاست کی ایک تشریح کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ سرسید کی اس باہمی تلخی کا ایک بہت بڑا سبب ہندی اور اردو کا جھگڑا اور سوال بھی تھا جو سرسید جیسے وسیع القلب منصف مزاج انسان کیلئے ضرور بہ افسوس ناک تھا۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ فکرمندی اور پریشانی کی بات جس نے سرسید کو آخر کانگریس کا مخالف بنا دیا۔ وہ یہ حقیقت ہے کہ جمہوری طرز کے اس کانگریسی پلیٹ فارم کو سرسید مسلمانوں کے لئے کئی وجوہ سے بے محل اور قبل از وقت سمجھتے تھے۔ اول اس لئے کہ اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے دوران انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ابھی پچاس برس تک بھی مسلمانوں کو کسی سیاست میں ہرگز حصہ نہیں لینا چاہیے اس لئے کہ ان کی معاشی پست حالی اور معاشرتی زبوں حالی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ انکی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ سرسید کی نظر میں کوئی سیاست اور جہاد مسلمانوں کو اس ہلاکت اور بربادی سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ صرف تعلیم اور روشن دماغی سے ہی ان کے حالات بدل سکتے تھے۔ کسی طرح کی بھی سیاست میں شریک ہونے کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہیں نکل سکتا تھا اور اس طرح کی مصروفیات ان کی تعلیمی سرگرمی کے لئے سم قاتل سے کم نہیں تھی۔ ؎

دوسرے اس لئے سرسید اب کانگریس کی مخالفت پر مجبور ہو گئے تھے انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ جمہوری انداز کی سیاست میں کانگریس کا پلیٹ فارم عددی تناسب کے لحاظ سے مسلمانوں کے لئے فائدہ بخش نہیں بلکہ نقصان دہ ہوگا اور چاہے اردو ہندی کا سوال ہو چاہے جمہوری اقدار کی نمائندگی کے مسائل ہوں مسلمان ایک طرف اپنی اقلیت کے لحاظ سے پیچھے رہ جائیں گے دوسرے اپنی تعلیمی پسماندگی اور بے شعوری کی وجہ سے مفید اور مناسب نمائندگی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ؎

سرسید کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندوؤں کے لئے بھی اس طرح کی نمائندگی کو غلط سمجھتے تھے اگرچہ سرسید کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ ہندوؤں کا سیاسی شعور مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ گہرا ہے جس کی وجہ ان کا تعلیمی تفوق اور برتری ہے کیونکہ وہ اس میدان میں مسلمانوں سے بہت پہلے قدم اٹھا چکے تھے۔

سرسید کا خیال تھا کہ جمہوری طریقے میں کامیابی کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ ملک کی سبھی اقوام کی علمی سطح برابر ہو اور ایسا نہیں ہے اور جمہوریت کے تمام فائدے چند گروہوں ہی میں محدود ہو کر رہ جائیں گے یہاں کی پسماندہ قومیں ترقی یافتہ قوموں کی مطیع بن کر رہ جائیں گی۔ نیز یہ عدم مساوات اور سماجی نابرابری اقوام ہندوستان کے درمیان ظلم و تشدد کا ذریعہ بھی بن سکتی ہے۔ چنانچہ ان وجوہ سے قومی نمائندگی کا جمہوری طریق سیاست اور سول سروس میں شریک ہونا ہندوستانیوں بالخصوص

مسلمانوں کے لیے جو سمجھا جاتا ہے سب سے زیادہ پسماندہ ہیں
طرح مفید نہیں ہو گی ۔۔۔ کہ اسی طرز فکر کا نتیجہ تھا کہ
انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی اور مسلم عوام کو اس
تحریک سے باز رہنے ۔۔۔ کے بجائے تعلیم اور عصری
کے حصول کی طرف تمام توجہ مرکوز رکھنے کی تلقین کی ۔
سرسید اپنے خیالات و نظریات پر نظر ثانی کرنے میں کچھ تامل
نہیں رکھتے تھے قومی نمائندگی کا مسئلہ جس پر وہ خود پہلے
زور دے چکے تھے سرسید کے ان نظریات میں سے ہے جن کو
کے حالات یا اپنے غور و تفکر میں انھوں نے غیر مفید سمجھ کر
رک کر دیا ۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں انگریزی
کتب کا اردو زبان میں ترجمہ و تشریح بھی شامل تھا ۔ ابتدا میں
انھوں نے اتنی محنت سے کام لیا لیکن بعد ازاں جب انھیں
محسوس ہوا کہ مغربی علوم کو اہل مغرب کی زبان میں حاصل کرنا ہی زیادہ
مفید ہو گا تو انھوں نے بلا تامل اپنا خیال بدل دیا ۔ ایک زمانے
میں انھوں نے کلکتہ میں علوم مشرقیہ کی ایک یونیورسٹی قائم کرنے
کا خیال بڑی قوت سے پیش کیا تھا مگر ۱۸۸۸ء کے بعد بدلتے
ہوئے حالات میں اس تجویز و تحریک کی پُر زور مخالفت کی ہے
۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جو کچھ تباہی اور بربادی آئی وہ
شمالی ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو جھیلنا پڑی تھی ۔ اس کے
برخلاف گجرات اور بنگال کے ہندو اور مسلمان انگریزوں سے
اپنے تجارتی اور دیگر تعلقات کی وجہ سے سیاسی سطح پر زیادہ مستحکم
اور مضبوط تھے ۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی سیاسی
تحریک میں حصہ لینا ان کے لئے کہیں زیادہ آسان تھا جب کہ
شمالی ہندوستان کے لوگوں اور خاص طور پر مسلمانوں کیلئے
نہایت مشکل اور غیر موزوں تھا ۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور بیداری
خیالی کے لحاظ سے بھی بمبئی گجرات اور بنگال کے تعلیم یافتہ لوگ
شمالی ہندوستان کے باشندوں سے زیادہ آگے تھے ۔ یہی وجہ ہے
کہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد اگلے ۳۲ سال تک کسی
شمالی ہند کے رہنے والے کا نام کانگریس کی صدارت میں نظر نہیں
آتا جب کہ اس مدت میں کئی بنگالی، کئی پارسی اور گجراتی، چار
مدراسی اور چار انگریز کانگریس کی صدارت کے عہدے پر فائز رہ
چکے تھے ۔ شمالی ہند میں کانگریس کی صدارت میں پہلا نام پنڈت
مدن موہن مالویا کا ہے جو ۱۹۰۹ء میں اس منصب پر فائز ہوئے
اس کے علاوہ اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ۱۸۸۸ء
اور ۱۸۸۹ء کے دوران جب سرسید کانگریس کی مخالفت میں
پیش پیش تھے اس وقت کانگریس کے صدر ہندوستانی نہیں بلکہ دو
انگریز تھے ۔ جارج یول (1888) George Youl اور
ڈبلیو ویڈر برن (1889) W-Wedderburn[^5]
سرسید انگریزی حکومت کی مکمل وفاداری اور حمایت کے باوجود
نہایت تلخی کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کرنے اور کہنے پر مجبور ہوئے کہ

"میرا خیال ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے اور شاید نہ
کبھی آئے گا کہ جب ہمارے یوروپی دوست جو اس ملک
میں فاتح بھی ہیں اور فطری طور پر اس پر فتح کا غرور
بھی رکھتے ہیں کبھی نیچے اتر کر اپنے مفتوح اور نفرت کے
مارے ہوئے ہندوستانیوں کے ساتھ ایک ہی بنچ پر
ایک ساتھ بیٹھے نظر آئیں ۔ اگر کوئی ہندوستانی اپنی
عزت و وقار کو باقی رکھنا چاہتا ہے تو اسے سخت مصیبت
اور عقوبت سے گزرنا پڑتا ہے ۔ بہت سے لوگ اس بات
سے اختلاف کریں گے اور اس کو لغو بتائیں گے لیکن ہر
سمجھدار آدمی حقیقت حال کو سمجھتا ہے"[^6]

سرسید نے قومی سیاست کے کانگریسی پلیٹ فارم
کی مخالفت کیوں کی ۔ اس بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا
تجزیہ نہایت حقیقت انگیز ہے "سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام
کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف
کر دینی چاہیئں یقیناً صحیح تھا بغیر اس کے ۔۔ کے میرا خیال ہے کہ مسلمان
جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے"
ان کا یقین تھا کہ اگر کانگریس کے مطالبات پورے ہو گئے
تو اس سے مضر نتائج برآمد ہوں گے کیونکہ ہندوستان کے مختلف

فرقوں کی تعلیمی سطح ناہموار ہے اس لئے ملک میں ایک غیر متوازن فضا پیدا ہو جائے گی۔ کانگریس کو اس مخالفت میں ان کا ساتھ بعض ہندوؤں نے بھی دیا تھا۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید نے تمام عمر ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رفاقت اور دوستی کے جذبے سے کام کیا اور ہندوؤں نے بھی ہمیشہ ہر طرح ان کے کاموں میں عملی حصّہ لیا اور کبھی کسی مدد سے دریغ نہیں کی۔ معاملہ صرف ہندوؤں کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام اقوام کے ساتھ ان کا یہی رُخ اور رویّہ تھا۔ سرسید نے دینی تعلیمی اور سماجی اصلاح کی کوششوں میں کبھی کسی تنگ نظری کو قریب نہیں آنے دیا۔ ان کی بے تعصبی کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ علی گڑھ کالج کا پہلا گریجوئٹ ایک ہندو تھا۔ ایجوکیشن کمیشن کے صدر سر ولیم ہنٹر نے ایک موقع پر کہا: "اس مدرسے کے مسلمان بانیوں نے جو ٹھیک ٹھیک ایک مسلمانی مدرسہ قائم کیا ہے اپنا دروازہ تمام اقوام اور مذاہب کے لڑکوں کے لئے کھول دیا ہے۔ مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ 259 طالبعلم کے 57 ہندو ہیں یا کل میں سے قریباً 1/4 ہندو ہیں۔ عیسائی اور پارسیوں کے لڑکوں نے بھی اس ادارے سے تعلیم حاصل کی ہے اور طبیعت کی یہ فیاضی صرف اس کے قائدوں اور اس کی تعلیم ہی میں نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اس مقام کے تمام انتظامات میں پائی جاتی ہے۔"

جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "ہندوستان کی دریافت" میں سرسید کے متعلق لکھا ہے: "وہ اس لئے کانگریس کے مخالف نہیں تھے کہ وہ اس کو کوئی ہندو غلبے والی تنظیم سمجھتے تھے بلکہ انھوں نے اسلئے اس کی مخالفت کی کہ ان کی رائے میں کانگریس کی سیاست جارحانہ تھی جب کہ وہ خود برطانوی حکومت کی مدد اور تعاون کے خواہاں تھے ۔۔۔ وہ کسی معنی میں بھی نہ ہندوؤں کے مخالف تھے اور نہ علیحدگی پسند تھے۔"

ہم اس مضمون کو پاکستان کے پروفیسر نور الحق کے اس اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔

"سرسید پر ان کے بعض غیر مسلم نقادوں نے اور بعض اہل سیاست مسلمانوں نے ہندوستان کی آزادی کی جد وجہد کے لحاظ سے الزام لگایا ہے۔ ہم اس بات کی ذرا سی بھی واقفیت نہیں رکھتے کہ سرسید ہندوستان کی آزادی نہیں چاہتے تھے یا وہ ملک کو تقسیم کرانا چاہتے تھے۔ سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء میں ہو چکی تھی جبکہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ان حالات کے نتیجہ میں ابھرا جو سرسید کی وفات کے ایک طویل مدت بعد سامنے آئے جو شواہد اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان کی بنیاد پر یہ واضح ہے کہ انھوں نے ملک کی تقسیم کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔ ان کی خواہش ہندوستان کی ایسی آزادی کے سوا کچھ نہیں تھی جس میں ملک کی تمام اقلیتیں مسلمان سکھ عیسائی اور دیگر اپنا اپنا جائز حصّہ حاصل کر سکیں۔"

* * * *

"سرسید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سا پتھر [illegible] کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں خواہ وہ اس سمت میں نہ ہوں جو سرسید پسند کرتے۔"

خالدہ ادیب خانم

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، جلد ۸، شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)

سر سیّد احمد خاں

چند بکھرے خیالات

مسعود عالم*

۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ء (۵ر ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ) کا دن بڑا مبارک دن تھا۔ خستہ حال دلی کی ایک حویلی میں ایک نومولود کا ورود ہوا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کا مسیحا بنے گا۔ سید احمد کی تعلیم و تربیت دستور کے مطابق مشرقی انداز میں ہوئی لیکن عملی زندگی کی منزل اوّلیں میں قدم رکھتے ہی وہ زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ کو پہچان گئے اور سمجھ لیا کہ جب تک ہم محنت، لگن اور خلوص کے ساتھ اپنے کام کو انجام نہیں دیں گے اپنی بگڑی ہوئی حالت کو نہیں سدھار سکتے۔ قبل اس کے اس سلسلے میں وہ کوئی عملی اقدام کریں ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت نے ہندوستان کی تاریخ کے دھارے کو ہی موڑ کر رکھ دیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے سر سید کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان ہنگاموں کے دوران سر سید نے جس دل سوزی اور غم گساری کے ساتھ اپنے شب و روز کے آرام کو تج کر کے ایک طرف بعض بے گناہ انگریزوں، ان کے بچوں اور عورتوں کی جان بچائی تو دوسری طرف ہندوستانیوں کو بے جا قتل و غارت گری سے باز رکھنے کی انتھک کوششیں کیں۔ ان کی دوربین نظر نے دیکھ لیا تھا کہ غیر منظم ہندوستانی انگریزوں پر غلبہ نہ پا سکیں گے اور آخر کار یہی ہوا کہ انگریزوں کی گرفت از سر نو ہندوستان پر ایسی مضبوط ہوئی کہ سوائے پسپائی کے ہندوستانیوں کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ یہ موقع نہیں کہ ہم ان واقعات کی تفصیل میں جائیں، انگریزوں نے ہنگاموں کے فرو ہونے کے بعد سر سید کی خدمات کا صلہ ایک بڑی جاگیر کی شکل میں دینا چاہا لیکن ان کی قومی غیرت نے اسے قبول نہیں کیا۔ سر سید نے اپنی اس حالت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ”میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقدار بنوں، میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی، میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت

---

* ... علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز اسی خیال اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڑھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دئے، جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک غم کدۂ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا اس غم کو کسی قدر ترقی ہوئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

اسی خیال کے تحت انھوں نے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" تحریر کیا، جو ان کی جرأت، بے خوفی اور حق گوئی کا عدیم المثال کارنامہ ہے۔ انھوں نے قومی ترقی اور فلاح کا بیڑا اٹھایا، ان کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ جب تک مسلمان تعلیم کے حصول کی طرف مائل نہ ہوں گے اس وقت تک ان کی پریشانیوں اور مصیبتوں کا دور ختم نہ ہوگا، انھوں نے مسلمانوں کو نئے علوم کی رغبت دلانے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، انگلستان سے واپسی پر رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا اور اپنے بعض قریبی ساتھیوں سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرز پر علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ قوم کے سامنے پیش کیا اس سلسلے میں انھوں نے ۱۸۷۳ء کو جالندھر میں ایک لکچر دیتے ہوئے کہا کہ:

"آپ کلکتہ سے پشاور تک بنگالے سے لگا دکن تک کوئی جگہ بتلایئے جہاں لڑکے تربیت و تعلیم پا سکتے ہوں گو میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ جیسا چاہیئے تعلیم بھی نہیں پا سکتے لیکن بغرض تعلیم کے تربیت تو ہرگز نہیں پا سکتے، کوئی رئیس کیسا ہی بڑا رئیس کیوں نہ ہو کوئی سامان کافی اپنے گھر پر تعلیم و تربیت کا نہیں کر سکتا اس تعلیم کے واسطے یہ ضروری ہے کہ عمدہ خاندان، عمدہ اخلاق، عمدہ تعلیم کے معلم اور پروفیسر ہوں اور لڑکے جو آپس میں ساتھ پڑھتے اور رہتے ہوں اسی طرح اچھے خاندان اور اچھی عادتوں کے خوگر ہوں، یہ امور ہر جگہ مہیا ہونے ناممکن ہیں.....

..... یہی خیالات میرے دل میں تھے جب کہ میں نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا، جس میں کافی تعداد ہماری قوم یعنی ملک کے باشندوں ہندو اور مسلمان دونوں کی گنجائش ہو اور دونوں گروہ عمدہ طور سے وہاں تعلیم و تربیت پاویں۔ جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو میں لندن گیا وہاں کے کالجوں، بورڈنگ ہاؤسوں، کیمبرج کے طلبا کے رہنے کا حال دیکھا اور سمجھا کہ حقیقت میں جب تک اپنے ملک کے بچوں کے لیے ایسی جگہ نہ بناویں تو تعلیم و تربیت ناممکن ہے۔"

سر سید نے طلبا کی تربیت اور ان کی کردار سازی پر بڑا زور دیا، گورداسپور میں ایک لکچر کے دوران انھوں نے کہا کہ:

"اے دوستو! تربیت اور تعلیم دو چیزیں ہیں، صرف تعلیم سے انسان نہیں بنتا جب تک

میں یوں آتا ہے کہ تعلیم اور تربیت لیکن
تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔"

سرسید کو قوم کے نوجوانوں کے مستقبل کی بڑی فکر تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ان نوجوانوں کے اخلاق وعادات کی درستی سے قوم کا مستقبل سنور جائے۔ مذکورہ بالا اقتباسات میں سرسید نے نوجوانوں کی تربیت پر بڑا زور دیا ہے۔ وہ ان کی صرف انفرادی تربیت کے زیادہ قائل نہ تھے بلکہ اجتماعی تربیت کو بڑی اہمیت دیتے تھے جس کا اظہار ان کے ان الفاظ سے ہوتا ہے :

"بورڈنگ ہاؤس ایک کل ہے قوم کو قوم
بنانے کی، اگر اس کے پرزے درستی سے چلتے
ہیں تو وہ اپنا کام کرے گی ورنہ کسی کام کی
نہیں، تم اس کل کے پرزے ہو اس سے
فائدہ اٹھانے کے لیے تمہارا درست اور کام
کے قابل رہنا سب سے مقدم ہے، تمہارا
کھانا پینا، رہنا سہنا، آپس میں ہر وقت ملنا
سوسائٹی میں شریک رہنا، کھیلوں کو آپس میں
مل کر کھیلنا، لٹریری جلسوں میں شریک رہنا یہ
سب باتیں اسی لیے ہیں کہ آپس میں محبت
اور دوستی ایک دوسرے کی ہمدردی پیدا
ہو، جو بنیاد قوم کے بننے کی ہے پھر اگر تم نے
اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظلمہ تمہارے
سر ہوگا اور تم پر افسوس ہوگا کہ جس عمارت
کی تم خود ایک اینٹ ہو اسی عمارت کو تم برباد
کرنا چاہتے ہو۔"

یہ اس لکچر کا اقتباس ہے جو انھوں نے عمر کے آخری حصے (۱۸۹۴ء) میں کالج کے طالب علموں کو دیا تھا اس لکچر میں آگے چل کر انھوں نے کہا۔

"بڑے بڑے مہذب ملکوں کے کالجوں
میں ایک قسم کا متحد لباس طالب علموں کے
لیے مقرر ہے ...... میں یقین کرتا ہوں کہ
آپس میں دوستی اور یک جہتی پیدا کرنے
کو یہ بھی ایک عمدہ طریقہ ہے۔"

ان کو اس کی بھی بڑی فکر رہتی تھی کہ طالب علموں کی رہائش کا معقول بندوبست کیا جائے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے نویں اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں انھوں نے کہا کہ :

"قوم کو اگر ترقی اس طرح کی منظور ہو تو یہ بھی
لازم ہوگا کہ جو مسلمان نوجوان کالج میں رکھے جاویں
وہ عمدہ اور اگر عمدہ نہ ہوں تو متوسط حالت
میں رکھے جاویں، ان کے رہنے کے مکانات
صاف اور درست ہوں، ان کو صاف اور
پاکیزہ لباس پہننے کی عادت ڈالی جاوے،
سلیقے سے رہنا، اپنے مکان کو درست کرنا
ان پر لازم کیا جاوے سب کو اگر ممکن ہو
ایک سی حالت میں رہنے کی تدبیر کی جاوے،
کھانے کا انتظام ایسی طرح پر ہو کہ جس سے
ان کو کھانے کا آپس میں دوستانہ اور برادرانہ
طریقے سے مل کر کھانا آجاوے، جو ایک
بڑی تدبیر قومی موانست، قومی یگانگت کی ہے۔"

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دسویں اجلاس منعقدہ شاہجہاں پور (۱۸۹۵ء) میں لکچر دیتے ہوئے انھوں نے طلبار کی صحت جسمانی قایم رکھنے کے لیے کھیلوں اور ورزشوں سے رغبت دلانے پر زور دیا اور کہا :

"ان کے لیے تفریح کے سامان مہیا رکھنا
چاہئیں تاکہ ان کی طبیعت پژمردہ نہ ہونے
پاوے اور ان کی امنگیں ہٹ کر معدوم
نہ ہو جاویں، صرف ان پر اس قدر بندش
رہے کہ ان کی امنگیں بدراہ نہ چلنے پاویں۔"

اب سے ایک سو تیرہ سو سال پہلے ہمارے اس ادارے کی بنیاد سرسید نے اس لیے رکھی تھی کہ مسلمانوں کو ہندوستانی سماج میں ایک باوقار مقام حاصل ہو سکے، ان کی جہالت عقل صالح کے نور سے منور ہو جائے، قومی غیرت اور حمیت جس سے وہ محروم ہو چکے ہیں ان میں پھر پیدا ہو۔ یہ ادارہ اس لیے قائم نہیں کیا گیا تھا کہ صرف یہاں اسناد بانٹی جائیں تاکہ اس ملت کے کچھ افراد چند سرکاری اسامیاں حاصل کریں، سرسید کا مشن یہ تھا کہ وہ ایسی درس گاہ قائم کریں کہ جہاں سے ایسے نوجوان نکلیں جو نہ صرف علم کی روشنی لے کر ملک کے کونے کونے میں پھیل جائیں بلکہ اپنے کردار کی مضبوطی اور کارکردگی سے ان تمام لوگوں کو متاثر کریں جن سے ان کا واسطہ پڑے اور وہ یہ کہہ اٹھیں کہ کردار و گفتار کے غازی ہوں تو ایسے ہوں۔

ہندوستان کی ساری یونیورسٹیوں پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اگر کسی ایک خاص سبب سے فوقیت حاصل ہے تو وہ اس کا اقامتی کردار ہے، اس سلسلے میں ہماری یونیورسٹی جن عظیم الشان روایات کی حامل رہی ہے اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ہم نے اقامتی زندگی کا جو معیار قائم کیا تھا اس میں کسی حد تک گراوٹ آ گئی ہے۔ بعض وقت تبدیلیاں ایسے دبے پاؤں آتی ہیں کہ ہم کو ان کا احساس تک نہیں ہونے پاتا، اس سو سال کے عرصہ میں ہماری ملکی سیاست، معاشرت اور معیشت میں بڑی زبردست تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، ان تبدیلیوں کے اثرات معاشرے پر پڑنے لازمی تھے۔ چنانچہ کچھ ہم بدلے، کچھ ہماری قدریں بدلیں، یہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں لیکن سرسید نے جن اقدار کو اپنانے کا پیغام دیا ہے وہ آج بھی اپنی جگہ پر ابدی اور ازلی حقیقت کی طرح با معنی و برمحل ہیں۔ ان میں نہ تو کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی زمانے کی اخلاقیات اس میں تبدیلی کرنے کی ہمت کر سکتی ہے۔ راست بازی، خوش کلامی، خوش سلیقگی، حصول علم کی سچی لگن، خوش لباسی اور تندرستی کی اہمیت جتنی اس وقت تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔ میں چاہوں گا کہ یوم سرسید جس کو ہم جشن کی صورت میں مناتے ہیں اس میں ایک مخصوص جلسہ بہ سلسلۂ احتساب بھی رکھا جائے تاکہ ہم ہر سال بیش و کم اور سود و زیاں کا بھی حساب چکتا کریں۔ ہم کو بہت سنجیدگی سے موجودہ صورت حال پر غور کرنا چاہیے۔

۱۔ صورت حال یہ ہے کہ طلباء اکثر یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے کبھی شبہات کی بنا پر اور کبھی امکانات کی بنا پر خائف رہتے ہیں، انتظامیہ بھی کبھی کبھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوتی ہے۔

۲۔ ادھر چند برسوں سے یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ طلباء کی بڑی تعداد اس یونیورسٹی کی روایات سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے۔

۳۔ اساتذہ اور طلباء میں وہ پہلا سا ربط نہیں پایا جاتا۔

۴۔ ڈیبیٹ، مباحثوں اور دیگر ثقافتی سرگرمیوں سے عام طلباء کی دلچسپی برائے نام رہ گئی ہے۔

۵۔ علمی کارکردگی، مقابلے کے امتحانات اور معلومات عامہ سے دلچسپی میں بھی کمی نظر آتی ہے۔

۶۔ کھیل کود میں حصہ لینے والے تو نظر آتے ہیں لیکن دیکھنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔ بیس سال پہلے ہالوں کے مقابلوں میں شائقین کی جو بڑی تعداد دیکھنے میں آتی تھی اب اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتی۔

۷۔ اس موقع پر میں خاص طور سے این سی سی اور این ایس ایس کا ذکر کروں گا، ان میں حصہ لینے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور نہ کچھ ایسے

علامت نہیں ہے۔
بذلہ سنجی اور خوش گفتاری جس کے لیے ہم
مشہور تھے اٹھتی جا رہی ہے۔
جذب باہمی اور اتحاد و یگانگت کی بھی خاصی
کمی نظر آتی ہے۔

علی گڑھ تحریک کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے
لیے امور مذکورہ بالا پر توجہ کرنا ضروری ہے تاکہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پیش رفت سرسید
کے خوابوں کے مطابق ہوتی رہے۔

"سرسید مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ قائم کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالہ نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ "تہذیب الاخلاق" سے مرتب ہوئے۔ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں ان کے حلقے کے رفیقوں کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالے نے استوار کیں اور اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی اور ادبی مطلب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)

سرسیّد کا تصوّرِ شعر و ادب

قمر الہدیٰ فریدی*

سرسیّد نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے دیگر مسائل پر غور و فکر کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کی ضرورت محسوس کی۔ اس وقت تک شمالی ہند میں زبان کو نکھارنے سنوارنے کی کئی انفرادی اور اجتماعی کوششیں عمل میں آچکی تھیں۔ ۱۷۵۵ء میں شاہ حاتم بعض اصولوں کی روشنی میں اپنا دیوان زادہ مرتب کر چکے تھے۔ اور لکھنؤ میں انیسویں صدی کے اوائل میں ناسخ کی اصلاحِ زبان کی تحریک بھی پروان چڑھ چکی تھی۔ اردو شاعری ترقی کے کئی منازل طے کر چکی تھی۔ متقدمین میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، میر حسنؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی دادِ سخن دے چکے تھے۔ اور معاصرین میں انیسؔ، دبیرؔ، غالبؔ اور مومنؔ جیسے شاعر موجود تھے ان حضرات کے پیشِ نظر ایک مشرقی معیارِ نقد تھا جس کی روشنی میں وہ شعر کہہ رہے تھے اور اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح دے رہے تھے۔ میرؔ سادگی میں پرکاری کے قائل تھے۔ انیسؔ کو اپنی فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی پر ناز تھا۔ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا کمالِ فن سمجھتے تھے غالبؔ کا زور قافیہ پیمائی کے بجائے معنی آفرینی پر تھا۔ شعرائے لکھنؤ نازک خیالی کو شاعری کی شرطِ اولین مانتے تھے۔ یعنی فنِ شاعری کے باب میں انفرادی نقطۂ نظر کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ بکھرے ہوئے خیالات کسی گہرے غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھے۔ زیادہ تر ان کا تعلق ذوق اور وجدان سے تھا۔ لیکن سرسیّد کے تصورات کی نوعیت جداگانہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عصری تقاضوں کی روشنی میں افادی نقطۂ نظر سے ماضی و حال کے شعری سرمائے پر نظر ڈالی، خامیوں اور کمیوں کی نشاندہی کی، بہتری کی تدبیریں بتائیں۔ وہ اپنے خیالات، مشورے اور تجاویز کو مرتب انداز میں تو پیش نہ کر سکے، تاہم سرسری طور سے ہی سہی، انھوں نے جو کچھ کہا، اس سے اختلاف کی خاصی گنجائش کے باوجود، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سرسیّد اردو شاعری سے بدظن تھے۔ انھوں نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"فنِ شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب و ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "جب کبھی کسی زبان کی فصاحت و بلاغت اور اس زبان کے فصحا و بلغا کی تفتیش کی جاتی ہے تو ہمیشہ اس باب میں اس زبان کا نظم کلام معتبر ہوتا ہے۔ اور ناظموں کے ہی محاورات اور نازک خیالوں اور باریک باتوں سے سند لی جاتی ہے۔ اور ہر ایک قوم کے ناظموں کی قوت اور ان کی طبیعتوں کے زور اور ان کے دلوں کے میلان اور ان کے رسم و رواج اور اخلاق خیال کا اندازہ صرف اس ملک کی نظم سے کیا جاتا ہے یہاں تک کہ جب کسی گزشتہ قوم کے خیالات ہم کو جاننے منظور ہوتے ہیں تو ہم اب بھی ہر قوم کے کلام کو ہی تلاش کرتے ہیں۔ اور اس کے فنِ ادب کا تخمینہ ہم اس کی

---

* سینئر ریسرچ فیلو، شعبۂ اردو، اے ایم یو، علی گڑھ

نظم سے ہی ملتا ہے۔ دیکھو جب کسی ملک میں ہندوستان کے قدیمی لوگوں کے فن ادب کا ذکر آتا ہے تو یہاں کے ادیب لوگوں میں کالی داس اور والمیک کا ہی خیال آتا ہے۔ ملک عرب کی زبان کی خوبیاں تلاش کی جاتی ہیں تو، سبعہ معلقہ اور حماسۃ العرب ہی پر نظر جاتی ہے۔ ایران کا ذکر کرتے وقت فردوسی ہی کا نام لیتے ہیں، انگلستان میں شکسپیر ہی مشہور ہے۔ اور حقیقت میں بھی ان ہی لوگوں کا ذکر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ہر زبان میں جو قدرت خداوند پاک نے شعرا کو عطا فرمائی ہے وہ ایک ناثر کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک شاعر ہی کا کام ہے کہ ایک مصرع سے دفعتہً پتھر سے دل کو بھڑکا دیتا ہے۔ ایک شعر کے ذریعہ خدا کی قدرت کاملہ کو عیاناً آنکھ سے دکھلاتا ہے۔ ایک شاعرانہ خیال میں معشوقان طناز کی شوخیاں اور کرشمہ سب پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اور خیالی باتوں سے سچے امر دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ دیکھو جو کام آج اس وقت میدان کارزار میں ایک اعلیٰ قسم کی شراب کی ایک بوتل کرتی ہے اس سے دس حصہ زیادہ مرہٹے میدانوں میں رجو کا ایک شعر کرتا تھا جو جوش اور ولولہ ایک سچے معشوق کا ناز میں معشوق پیدا کر دیتا ہے، اس سے ہزار حصہ زیادہ وہ خیالی معشوق پیدا کرتا ہے جن کا خیالی سراپا شاعر لکھتے ہیں۔ جو شوق ذوق بڑے بڑے صوفیوں کو اپنے مرشدوں کے ملفوظات سے دس برس میں پیدا ہوتا ہے وہ حافظ کے ایک عارفانہ شعر سے آن کی آن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ توحید کے جو مضامین علم الٰہی کے بڑے بڑے کامل سالہا برس میں سمجھاتے ہیں، وہ موحد شاعر کے ایک شعر سے دم کے دم میں ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ اور مرے ہوئے دلوں کو یوں ہی زندہ کر دیتے ہیں غرض کہ انسان کے خیالی بوستاں کے یہ شگفتہ گل کچھ عجیب رنگ و روپ کے ہیں کہ جو شگفتگی طبیعت کو ان سے ہوتی ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتی۔ اور شمشیر بیان کے جوہر بغیر اس کے نہیں کھلتے۔ پس جب فصاحت و بلاغت کا اصل الاصول ہر زبان میں نظم ہو، خیالات کی صفائی اور خوبی میں اس کا یہ حال ہو، اثر کے لحاظ سے اس کو یہ قوت ہو تو پھر جو زبان اس سے خالی ہے، وہ اجڑا ہوا باغ ہے۔ باغ بھی نہیں ایک ڈراؤنا جنگل ہے۔ پھر بھلا اس کی سیر کیا ہو گی، اس سے تفریح کی کیا توقع ہو گی۔ اس کے پھل بوٹے کی کیا کوئی تعریف کرے گا۔ اس کے سبزوں سے دلوں میں کیا اثر ہو گا۔ پس اس لحاظ ہمارے ملک کی دیسی زبان کا اس سے خالی ہونا اور فن نظم کی طرف سے لوگوں کے دلوں کا جوش گھٹ جانا گویا اس بات کا سامان ہے کہ اگر آئندہ ہماری زبان پر بھی وہ زمانہ آوے جو اور زبانوں پر آیا ہے تو شاید اس کی فصاحت و بلاغت دریافت کرنے اور ہماری قوم کے خیالات پر مطلع ہونے کا کسی قوم کو کوئی ذریعہ نہ ملے گا۔ اور یہ ایک نہایت افسوس کے لائق چیز ہو گی!"

گویا وہ نظم کی اہمیت سے واقف اور اس کی تاثیر کے قائل تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہماری شاعری ترقی کرے۔ مگر کس قسم کی ترقی؟ مروجہ اصناف سخن اور شعرا کی کاوشیں ان کے سامنے تھیں۔ اس کے باوجود اردو زبان کو اجڑا ہوا باغ بلکہ ڈراؤنا جنگل کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ آخر ان کا مطمح نظر کیا تھا؟ اس کا جواب ان کے ہی لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"کلام میں جس چیز کی نہایت توصیف کی جاتی ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ پیچیدہ مضامین بیان کیے جاویں اور آدمی کو پہاڑ اور پہاڑ کو آدمی بنایا جاوے اور جھوٹے مبالغہ سے اصل مطلب کو بھی خبط کر دیا جائے۔ بلکہ حقیقت خوبی یہ ہے کہ غم کا ذکر ہو تو سننے والوں کے دل پُر غم اور چشم پُر نم ہو جاوے۔ خوشی کا ذکر ہو تو روتے ہوئے ہنس پڑیں۔ اگر میدان کارزار کا ذکر ہو تو نامرد بھی مرد بن جاویں۔ اور اگر سخاوت کا ذکر ہو تو بخیل بھی دریادل ہو جاویں۔ غرض کہ ہر مضمون کی صورت بن جاوے۔ کیوں کہ حقیقت میں فصاحت جس چیز سے عبارت ہے صرف ایسے مناسب اور نرم الفاظ کے استعمال کرنے کا نام ہے جو خود سننے والے کے دل میں بیٹھ جاویں۔ اور بلاغت جو چیز ہے وہ صرف مقتضائے حال کے موافق کلام کرنے کا نام ہے۔ اور جب ان دونوں باتوں کو ایک کلام میں جمع کیا جاوے، تو پھر یقیناً یہ بات میسر ہو گی کہ ذکر غم بصورت غم اور ذکر خوشی بہ صورت خوشی معلوم ہونے لگے گا۔"[۲]

یہاں تین نکتوں پر زور دیا گیا ہے۔ ایسا مبالغہ نہ ہو کہ مطلب ہاتھ سے جاتا رہے، جو بات کہی جائے اس کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے کھینچ دی جائے اور کلام میں فصاحت و بلاغت ہو۔ ہماری شاعری میں ایسے بہت سے اشعار مل جائیں گے جو ان شرائط پر پورے اترتے ہیں لیکن سید کی تسکین کے لیے صرف یہ شرطیں ہی کافی نہ تھیں بلکہ ان کے نزدیک شعر میں باندھے گئے مضامین اور مقصد شعر گوئی کو بھی بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ وہ غزل سے اسی لیے نالاں تھے کہ:

"مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ بھی ٹھیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب اخلاق کے ہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خلاف و ناقص

پڑ گیا ہے کہ جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں
یا خصلت میں یا اس انسانی جذبے میں جس سے وہ متعلق ہے، کچھ بھی نہیں ہوتا
شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ فطرتی جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان
کی اصلی حالت کا کسی پیرایے یا کنایے یا اشارے یا تشبیہ و استعارے میں بیان
کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔"[۲۴]

اس اقتباس کا تجزیہ کیجیے تو چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ وہ فرسودہ
موضوعات کے بجائے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کے خواہش مند تھے۔
غزل اس دور کی محبوب ترین صنف سخن تھی اور حسن و عشق اس کے پسندیدہ
موضوع تھے۔ اگرچہ یہ صنف گل و بلبل کی داستان تک ہی محدود نہ تھی بلکہ
رمز و ایما کے پردے میں اور بھی بہت کچھ کہا جا رہا تھا۔ لیکن بدلے ہوئے حالات
اور وقت کا تقاضا تھا کہ نئے موضوعات اور مسائل پر توجہ دی جائے۔ سرسید
کو اس کا احساس تھا اور اسی احساس نے انہیں مروجہ موضوعات کے
خلاف لب کشائی پر آمادہ کیا تھا۔ پھر انہیں صرف حسن و عشق کے موضوعات
سے ہی شکایت نہ تھی بلکہ یہ بھی شکوہ تھا کہ وہ ان جذبات کو ظاہر کرتے ہیں
جو مخرب اخلاق ہیں۔ یعنی وہ ایسے موضوعات کے حق میں تھے جو تہذیب و شائستگی
کے مظہر ہوں اور اخلاق کو سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کر سکیں۔ یہ تو تھا
موضوع سے متعلق ان کا نقطۂ نظر۔ اب آیئے انداز بیان کی طرف۔ یہاں بھی
ان کے نزدیک صورت حال اطمینان بخش نہیں۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ
واستعارے کا قاعدہ انہیں اس لیے خراب و ناقص نظر آیا کہ اس سے تعجب تو پیدا
ہوتا ہے لیکن اثر نہیں؛

"شاعری جو مدت سے ہندوستان میں جاری ہے وہ، سب لوگ،
یقین کریں گے کہ ان کے مضامین کے بیان کرنے سے کوئی خوشی شاید کانوں
کو ہوتی ہو مگر دل پر اثر کرنے والی نہیں۔"[۲۵]

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ اردو شاعری میں تاثیر کے فقدان
کے شاکی ہیں۔ اور بھی کئی موقعوں پر انھوں نے ایسا کہا ہے۔ ان کی شکایت
کہاں تک درست ہے، اس سے بحث کرنے کی فی الحال گنجائش نہیں۔
ظاہر ان کا یہ اصرار کہ شاعری ایسی ہو جو سننے والے کے دل پر اثر کرے، اس بات
کا ثبوت ہے کہ وہ فن پارے میں قاری کو متاثر و متحرک کرنے کی صلاحیت
ضروری خیال کرتے ہیں۔ شعرائے متقدمین بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ
میر تقی میر نے اقرار کیا تھا۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

مرزا غالب نے اگرچہ جھنجھلا کر کہہ دیا تھا۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

یا

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یا

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

مگر یہ وقتی رد عمل تھا۔ ورنہ انھوں نے تو قدردانوں کو اس طرح
آواز دی تھی۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مرزا نے مشکل شعروں کی خود تشریح بھی کی۔
اور جو شعر نہایت گنجلک معلوم ہوئے انہیں متداول دیوان میں شامل
ہی نہیں کیا۔ یہ باتیں اپنی جگہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فن پارے میں
قاری کی شمولیت کے مسئلہ پر سرسید نے اپنے پیش روؤں کی بہ نسبت
زیادہ واضح لفظوں میں زور دیا۔

انہوں نے مدحیہ شاعری میں ممدوح کی جھوٹی تعریف کو بھی ناپسند
کیا۔

"لیاقت شاعری کی یہ ہے کہ وہ نہایت بڑے استاد مصور کی مانند
ہے کہ وہ اصل صورت اور رنگ اور خال و خط کو بھی قائم رکھتا ہے۔ اور پھر
بھی تصویر ایسی بناتا ہے کہ خوش نما معلوم ہو۔ ایشیا کے شاعروں میں ایک بڑا
نقص یہی ہے کہ وہ اس بات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جس کی تعریف کرتے ہیں
اس کے اوصاف ایسے جھوٹے اور ناممکن بیان کرتے ہیں جن کے سبب سے
وہ تعریف تعریف نہیں رہتی، بلکہ غرضی خیالات ہو جاتے ہیں۔"[۲۶]

قاری تک رسائی پانے یا بالفاظ دیگر ترسیل [illegible]

عہدہ برآ ہونے کے لیے ان کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ سادہ زبان استعمال کی جائے اور فطری جذبات کو فطری انداز میں پیش کیا جائے۔ حالی کی مثنوی "حب وطن" اور "مناظرہ رحم و انصاف" کو انھوں نے اس لیے "آب زلال سے زیادہ خوش گوار" قرار دیا کہ یہ مثنویاں: "بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں، سادگی و صفائی میں ایسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں"۔۹ انھوں نے ایک اور موقع پر کہا: "جذباتِ انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے مولانا حالی ہی کا کام ہے"۔۱۰

سنتے ہی دل میں اتر جانے والی شاعری بہر حال ایک عمومی کشش رکھتی ہے۔ لیکن اسے ہی سب کچھ سمجھ لینا اور معیار شاعری قرار دینا مناسب نہیں۔ اقبال نے اعتراف کیا تھا کہ:

"آرٹ غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے"۔۱۱ اس کی دنیا وسیع، بیکراں اور بے حد و حساب ہے۔ یہاں پیچیدہ جذبوں، کیفیات اور تجربات کے اظہار کے لیے شاعر کو بعض اوقات پیچیدہ انداز بیان اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ قصداً ابہام پیدا کرتا ہے۔ اور کبھی اپنی بات کو گنجلگ بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے بلکہ بسا اوقات ناگزیر بھی۔ راست انداز بیان علمی نثر کے لیے تو ضروری ہے لیکن شعری مزاج اس سے مناسبت نہیں رکھتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے لفظوں میں: "شاعر اپنے قاری کے ذہن سے لامحدود دوری لگانے کا اظہار کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ شعر قاری کے ذہن کی تگ و تاز سے متناسب ہو"۔ مگر سرسید کے نقطۂ نظر سے شاعری میں ابہام کی گنجائش نہیں، محذوفات کی اجازت نہیں، پیچیدگیٔ بیان کا سوال نہیں!

وہ شاعری کے لیے عام بول چال کی زبان کے حق میں تھے۔ حالانکہ شعر کی زبان روزمرہ کے قریب ہوتے ہوئے بھی، ایک حد تک الگ ہوتی ہے۔ الفاظ کی بہ ظاہر آسان اور سادہ ترتیب بھی سادہ نہیں ہوتی۔ بہ قول کلیم الدین احمد: "اس معمولی بول چال میں انتخاب، نئی ترتیب و ترکیب، رنگ آمیزی، جلا اور اسی قسم کی، فنی کارروائیاں، نئی جان ڈال دیتی ہیں"۔ میر کے بیسیوں ایسے شعر ہیں جو پہلی نظر میں کسی فنی کاوش کے مظہر نہیں معلوم ہوتے لیکن غور کرنے سے ان کی سادگی میں پرکاری کا احساس ہوتا ہے۔

میر جب آسان زبان میں کہتے ہیں۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

تو یہ بیان محض امر واقعہ کا بیان نہیں رہتا۔ اسی طرح جب ہم غالب کا درج ذیل شعر پڑھتے ہیں تو معنی کی تہیں روشن ہو جاتی ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

سرسید شاعر سے حقیقت بیانی کے طالب تھے۔ لیکن شاعر سے دو اور دو چار قسم کی حقیقت نگاری کی توقع اس کے فن کے ساتھ ناانصافی ہے۔ منطق کی کسوٹی پر میر کے اس شعر کی کیا وقعت رہ جائے گی۔

وہ میر کو وادی کی مائل نہ ہوا ورنہ
آنکھوں کو غزالوں کی پیروں تلے مل جاتا

بھلا ایسا کیوں کر ممکن ہے۔ لیکن یہ کہ کہ شاعر نے محبوب کی حیران حیران سی آنکھوں کی کیسی مکمل تصویر کھینچ دی ہے۔ غالب کا یہ شعر دیکھیے۔

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

یہاں بھی خیال کو اغراق کی حد تک پہنچا دیا گیا۔ مگر کیا اس بنیاد پر شعر کے حسن سے انکار کیا جا سکتا ہے؟

ظاہر ہے۔ سرسید جس قسم کی شاعری کے مداح تھے، وہی کل شاعری نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ شاعری کا صرف ایک پہلو ہے۔ وہ اسے ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے کیوں کہ ان کے ذہن میں یہ خیال جم گیا تھا کہ سیدھے سادے انداز میں کی گئی سیدھی اور سچی بات ہی دل پر اثر کرتی ہے۔

سرسید کا معاملہ یہ تھا کہ جب کوئی بات ان کی سمجھ میں آجاتی تو وہ اس کے تحت کام کرنے اور دوسروں کو اپنا ہم نوا بنانے میں سارا زور صرف کر دیتے۔ غزل کے عشقیہ مضامین اور قصیدہ نگاروں کی مدحت طرازیوں سے اکتا کر انھوں نے اردو شاعری میں اصلاح چاہی۔ بعض انگریزی شعرا کے کلام اور انداز بیان سے متعلق سرسری معلومات نے انھیں ایک نئی راہ دکھائی۔ اور انھوں نے "نیچرل شاعری" کی وکالت شروع کر دی۔ نیچرل شاعری سے ان کی کیا مراد تھی ان ہی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"مضامین بیان واقع اور مضامین نیچر ایسے پاس پاس ہیں کہ ان میں دھوکہ پڑ جاتا ہے۔ مگر درحقیقت پہلا دوسرے سے علیحدہ ہے۔ پہلا تو ایک بیرونی حالت ہے۔ اور دوسرا اندرونی۔ اسی پچھلے میں وہ طاقت ہے جو دل میں اثر رکھتی ہے۔ ابھی تک ہماری قوم کا کلام بیرونی حالت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مگر ہم کو امید ہے کہ بہت جلد اندرونی حالت تک بھی پہنچ جائے گا۔"[11]

انہی دنوں ہالرائیڈ کے ایما پر محمد حسین آزاد نے، انجمن پنجاب کے تحت ایک نئے انداز کے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس میں مصرع طرح کے بجائے شاعروں کو طبع آزمائی کے لیے کوئی عنوان دیا جاتا تھا۔ اور انہیں آزادی ہوتی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے خیالات نظم کریں۔ سرسید نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے لکھا: "اردو زبان کے علم ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئیٹری کا مشاعرہ قائم ہوا ہمیشہ یادگار رہے گا۔"[12] انہیں امید بندھی کہ اب اردو شاعری کے نئے امکانات روشن ہوا چاہتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی 'خواب امن' پہنچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ درحقیقت شاعری اور سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔" آزاد کی کوششوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی توقع رکھتے تھے کہ: "ہمارے ان باعث افتخار شاعروں کو بھی نیچر کے میدان میں پہنچنے کے لیے آگے قدم اٹھانا ہے۔ اور اپنے اشعار کو نیچرل پوئیٹری کے ہم سر کرنے میں بہت کچھ کرنا ہے۔"[13]

اس سمت میں مزید پیش رفت کے لیے ان کی تجویز تھی کہ انگریزی شعرا سے خیالات مستعار لے کر انہیں اپنی زبان میں ادا کیا جائے "یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی تو کر دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں ہم بیان کیا کر سکتے ہیں۔"[14] ایک دوسرے موقع پر انھوں نے امید ظاہر کی کہ "اگر ہماری قوم اس عمدہ مضمون نیچر کی طرف متوجہ ہو اور ملٹن اور شیکسپیئر کے خیالات کی طرف توجہ کرے اور مضامین مشتبہ اور مضامین خیالیہ اور مضامین واقع اور مضامین نیچر میں جو تفرقہ ہے، اس کو دل میں بٹھا لے تو ان بزرگوں کے سبب ہماری قوم کی لٹریچر کیسی عمدہ ہو جائے گی۔ اور ضرور وہ دن آئے گا کہ ہم بھی اپنے قوم کے کسی نہ کسی شاعر پر ایسا ہی فخر کریں گے جیسا کہ یورپ کے لوگ ملٹن اور شیکسپیئر پر ناز کرتے ہیں۔"[15]

سرسید کے آخری ایام میں نظم جدید کا چلن ہو چلا تھا۔ یہ بات ان کے لیے باعث مسرت تھی۔ چنانچہ انھوں نے تہذیب الاخلاق کے ایک شمارے میں لکھا: "ہم نے جو نیچر کی بہت ہائے پکار کی تو اب اس کا قافیہ کچھ تو نہیں رہا بلکہ شاعروں نے اس کی طرف توجہ کی۔ ہماری زبان کے علم ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدہ اور ہجو کے قطعوں اور قصہ و کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان مضامین کو چھونا نہیں چاہیے تھا۔ نہیں، وہ بھی نہایت عمدہ مضامین ہیں۔ اور جودت طبع اور تلاش مضمون کے لیے نہایت عمدہ مفید ہیں۔ مگر نقصان یہ تھا کہ ہماری زبان میں صرف یہی تھے۔ دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقت وہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہیں، نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف و قافیہ کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہیں تھا۔ اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ مگر نہایت خوشی کا مقام ہے کہ زمانے نے اس کو بھی رفادم کیا۔ اور اہل پنجاب اس نقص کے رفع کرنے پر متوجہ ہوئے۔"[16]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں بھی انھوں نے اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا تھا: "لٹریچر ایک ایسا علم ہے جو ہر ایک زبان کے ساتھ مخصوص ہے۔ مگر اس زمانے میں اس میں بھی طریق بیان اور طرز ادائے مضمون نے ایسی ترقی کی ہے کہ ہم اپنی قدیم طرز تحریر اور طریق ادائے مضمون کے چھوڑنے اور اس جدید طرز کے اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ لفاظی اور ہجر و وصل کی شاعری، مبالغہ اور ان نیچرل مدح سرائی، صنائع و بدائع جو ایک زمانے میں حسن تحریر سمجھے جاتے تھے اب حد سے زیادہ معیوب ہیں۔"[17]

وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی نظم لکھی جائے جو قوم کی زبوں حالی کی

آئینہ دار اور اس کے شاندار ماضی کی عکاس ہو۔ تاکہ مسلمانانِ ہند اس سے عبرت حاصل کر سکیں۔ ان کی اس تمنا کو حالی نے "مسدس مدوجزرِ اسلام" لکھ کر پورا کر دیا۔[۲۲] اور جواباً سر سید سے بھرپور داد وصول کی:

"مگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے نظم تحریر ہوئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے، بالکل مبرّا ہے کیوں کر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اڑایا ہے یا اڑایا گیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف ان ہی الفاظ میں ہے، جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوا۔ اور اس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں، اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔"[۲۳]

قوم کو فائدہ پہنچے، اس آرزو کا سر سید کے تصورِ شعر سے گہرا تعلق ہے۔ وہ شاعری سے تعمیری کام لینا چاہتے تھے۔ مسدس مدوجزرِ اسلام، اس کسوٹی پر پورا اترتا تھا، اس لیے ان کی تمنا تھی کہ یہ زیادہ سے زیادہ چھپے اور مشہور ہو، "لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں۔ اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں۔ قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس پچھے حال پر حال لاویں۔"[۲۴]

شاعری کے بارے میں سر سید کے جو خیالات تھے آج ہم ان میں سے بیشتر سے اتفاق نہیں کرتے۔ لیکن اس دور کے سماجی، سیاسی حالات اور فکری و ذہنی پس منظر کے تناظر میں دیکھیے تو ان خیالات کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس دور کا ایک بڑا دانش ور طبقہ اسی انداز میں سوچ رہا تھا، سر سید نے اس سوچ کو اظہار بخشا۔

سر سید نے مروجہ نثر کی خامیوں پر بھی روشنی ڈالی۔ نثر میں شعری عناصر کے دخل در معقولات کے سبب ابلاغِ خیال میں جو دشواریاں پیش آتی تھیں، ان کی نظر میں یہ ایک بڑا عیب تھا۔ انھوں نے مقفّیٰ و مسجع عبارت کو آورد بتاتے ہوئے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی وزنی لٹھے کو رسّی سے باندھ کر زوردار آواز کے ساتھ گھسیٹتا لیے چلا جا رہا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں سادہ نثر برجستہ ہوتی ہے۔ جیسے صاف و شفاف پانی رواں دواں ہو۔ "پُر تکلف جملے دو چار صفحات لکھ دینا کچھ بڑی بات نہیں ہے، مشکل کام مطلب نگاری ہے۔"[۲۵]

ان کا اصرار تھا: "جو لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے۔"[۲۶]

انھیں شکایت تھی کہ "ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرزِ بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتے بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو نون مرچ لگا دینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلافِ واقع الفاظ شامل کر دینا اور جھوٹی تعریف کرنا سکھاتے ہیں۔"[۲۷]

وہ بھاری بھرکم الفاظ و تراکیب کے کثرتِ استعمال کو بھی نثر کی ترقی میں رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے سادہ، عام فہم اور دل نشین زبان کی سفارش کی اور فارسی زدہ اردو سے بچنے کا مشورہ دیا:

"اس زمانے میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کی لغت بہت ملا دیتے ہیں، اور یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اچھی نہیں۔ ان سے اردو پن نہیں رہتا۔ اور ظاہر ہے کہ اس بات کے لیے کہ کس قدر فارسی کی ترکیب دی جائے اور کون کون سی لغت اور زبانوں کی نہ بولی جاویں، کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہو سکتا۔ یہ بات صرف اہلِ زبانوں کی صحت پر منحصر ہے۔"[۲۸]

درج بالا اقتباس میں کئی کام کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ اول یہ کہ فارسی ترکیبوں سے تحریر کو اتنا بوجھل بنانا مناسب نہیں کہ، اردو پن رخصت

ہوجائے۔ دوم یہ کہ فارسی اور دیگر زبانوں کے الفاظ و تراکیب سے
مکمل اجتناب ضروری نہیں، ایک حد تک ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا
ہے۔ لیکن وہ حد کیا ہے، اس کی تعین نہیں کی جا سکتی، اس کا انحصار
اہل زبان کے ذوق، ضرورت اور مضمون میں لفظ و ترکیب کے محل
استعمال پر ہے، یہ تیسرا اہم نکتہ ہے۔

عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار سے کیوں کر زبان،
غیر فطری ہو جاتی ہے۔ اور ان کے مناسب استعمال سے کس طرح اردو
کا بنیادی مزاج برقرار رہتا ہے، اس کی وضاحت کے لیے ہم رجب علی بیگ
سرور کی کتاب "فسانہ عجائب" سے ایک ایسی عبارت نقل کرتے ہیں
جو متذکرہ صدر دونوں صورتوں کو محیط ہے:

بادیہ پیمایان مرحلہ محبت و صحرا نوردان منازل مودت، رہ روان
دشت اشتیاق و طے کنندگان جادہ فراق، مسافران بار ناکامی،
بردوش، بجز راہ کوچہ یار، دین و دنیا فراموش، عشق سر پر سوار،
خود پیادہ، زیست سے دل سیر، مرگ کے آمادہ لکھتے ہیں کہ جب
باایں ہیئت کذائی، بسے ہوئے شہر کو بہ نظر پریشانی دیکھ آہ سرد
کھینچی۔ غریب الوطنی پر کمر ہمت چست کی۔ اور فراق یاران وطن میں
دل کھول کے خوب رویا۔ پھر فاتحہ خیر پڑھ کر آگے بڑھا، توتے کو پنجرے
سے کھول دیا۔ گھوڑوں پر شہزادہ اور وزیر زادہ، سمند صبا پر میاں
مٹھو پیادہ، نیا دانا کھاتے، نیا پانی پیتے روانہ ہوئے"۔[۲۹]

محولہ اقتباس کو انداز بیان کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا
سکتا ہے۔ 'بادیہ پیمایان مرحلہ محبت' سے لے کر 'باایں ہیئت کذائی' تک
یکے بعد دیگرے فارسی ترکیبوں سے ہی کام لیا گیا ہے۔ 'پر' 'سے' 'کے'، جیسے
گنتی کے چند الفاظ سے قطع نظر کریں تو کیسی اردو اور کہاں کی اردو؟ البتہ
اس طویل جملہ کا آخری ٹکڑا کسی قدر گوارا ہے: بسے ہوئے شہر کو بہ نظر
پریشانی دیکھ آہ سرد کھینچی۔ لیکن یہ ٹکڑا بھی کچھ بے جوڑ سا لگتا ہے۔
سرسید کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں 'اردو پن' نہیں ہے۔ لیکن
یہی بات منتخبہ اقتباس کے باقی ماندہ جملوں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔
حالانکہ وہ بھی عربی و فارسی ترکیبوں سے خالی نہیں۔ 'غریب الوطنی'، 'فراق یاران
وطن'، 'فاتحہ خیر'، 'سمند صبا' وغیرہ۔ مگر یہ الفاظ اس لیے گراں نہیں گزرتے کہ مناسب
طور پر اور ضرورتاً استعمال ہوئے ہیں۔ مختلف موقعوں پر یہ ضرورت گھٹتی
بڑھتی رہتی ہے۔ نثر نگار کا فرض ہے کہ وہ اس ضرورت کو محسوس کرے اور
اس کا لحاظ رکھے۔

الفاظ، انداز بیان اور زبان کے بنیادی مزاج کے ربط باہمی
سے ناواقفیت کے سبب انیسویں صدی کے وسط تک بالخصوص، اور اس
کے بعد بھی ایک مدت تک بعض حضرات فارسی و عربی، الفاظ و تراکیب اور
فقروں کے زیادہ سے زیادہ استعمال کو ہی انشا پردازی کا کمال سمجھتے اور
اس نہج پر خامہ فرسائی کرتے رہے۔ پختہ مشق تو کسی طرح اس طرز کو نباہ
لیتے تھے۔ مگر نومشقوں کی تحریر مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتی۔ مثلاً،

"۲۲ رجون سنہ الیہ کو بعد بارش دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اراضی جو ریان کہ
حسب سان کاشتکاری تخمیناً ہزار روپیہ کی بالیدہ (طیار) مگر قدم بوسی
سیلاب پر دراندازہ سے سخت مظلوم و مغموم۔ علی العموم یہ سیلاب،
پودر کا دیدہ و دانستہ ہوا۔ اور کل پودر مدعا علیہم نے تعمیر مکان میں
تصرف کیا۔ جس میں کثرت پانی سے خود بہ خود ہی جب نکاس نہیں
تو ڈوب جاوے۔ انسداد نقصان پانی یک غار عمیق جو متصل مکان
مدعا علیہم ہے برآمد کیا گیا کہ اس کو بند کر دیا۔
آج کا واقعہ یہ .... ہے کہ دروازہ مقبوضہ کثرت غلاظت کہ جس
کی صفائی وانسداد و عفونت وغیرہ مساۃ خوش وقتی پر ایں کہ
ازاں جملہ زنار داروں سے ہے۔ دروازہ بند کر کے ہزاروں گالی دیا
کی۔ چونکہ میں ایک معقول آدمی ہوں ہر چند بہ شیریں زبانی در
طیب اللسانی نہمائش کی۔ اور چند شعر جو بہار جاجا لالہ خیرتلال
نے نور چشم بلند اقبال بھیا جیالال کی کتخدائی کی تقریب سامانی
البدیہہ موزوں فرمائیں تھا وہ میرے کیسہ خاطر میں پنہاں تھے،
پڑھ کر سنائی مگر اس ستمگار نے تلخ کامی سے شیریں زبانی
کی طرف گردش نہ دی"۔[۳۰]

یہ تحریر سنہ ۱۸۹۱ء کی ہے، جب کہ سید کے سادے انداز بیان کو خاصا فروغ
مل چکا تھا۔ اودھ پنچ کے جس شمارے میں اس کی اشاعت ہوئی، خود اس
شمارے کے دیگر مندرجات کی زبان عام فہم ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا
سکتا ہے کہ مندرجہ بالا عبارت آرائی بالارادہ کی گئی۔ اور شوق فضول نے

تحریک کو تقویت بخشا اور دراصل اس وقت تک نثر کے تقاضوں کا صحیح احساس عام نہ ہوسکا تھا۔ غالب جیسے شخص نے بھی ابتدا اپنے خطوط کی اشاعت میں اس خیال سے تامل کیا تھا کہ ان میں وہ ادبی شان نہیں جس کی اس زمانے میں کسی اعلیٰ درجے کے نثر نگار سے توقع کی جاسکتی تھی۔ سرسید کے تنقیدی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ انھیں مروجہ نثر کے عیوب کا جلد ہی احساس ہو گیا اور انھوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔

وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اردو والے حسب ضرورت غیر زبانوں بالخصوص انگریزی کے الفاظ کا استعمال کریں۔ ان کی رائے میں انشا پرداز دوسری زبان کے الفاظ کو کبھی تو تحریر کے حسن میں اضافہ کے لیے لاتا ہے، کبھی اپنی زبان کے دامن کو وسیع کرنے کے لیے اور کبھی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے۔ بعض اوقات خیال کی ترسیل میں مادری زبان کے مترادف لفظ کو ناکافی پاکر بھی غیر زبان سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً جنٹلمین کی جگہ شریف کہا جائے تو وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو اول الذکر سے ہوتا ہے۔ اس لیے قلم کار لامحالہ اپنے مطلب کا لفظ مستعار لینے پر مجبور رہے اور یہ کوئی بری بات نہیں۔ کیونکہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور بنتے رہتے ہیں:

"اہل زبان غیر زبان کے لفظ کو ایسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضے میں سنگ مرمر پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچی کاری ہے۔ بے شک وہ دوسرا پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ اسی میں سے پیدا معلوم ہوتا ہے۔"[۴۱]

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ بعض اوقات غیر زبان کے الفاظ اور اصطلاحات کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا۔ مثلاً علوم و فنون پر لکھی جانے والی کتابوں میں دوسری زبان کے الفاظ و اصطلاحات سے مفر نہیں۔

وہ دوسری زبانوں کے اہل قلم کے عمدہ خیالات اور مضامین کو اپنی زبان میں منتقل کرنا بھی ادب اور انشا کی ترقی کے لیے مفید خیال کرتے تھے۔ انھوں نے خود بھی انگریزی کے کئی مضامین کے مواد کو آزادانہ طور پر اردو میں پیش کیا۔ اور بار ہا اس خیال کا اعادہ کیا کہ ابھی ہمیں انگریز انشا پردازوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

سرسید اردو کے قدیم ادبی سرمائے سے مطمئن نہ تھے۔ ان کی رائے میں "میر امن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی ہو، جو اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہوگی جو ایک پوپلی بڑھیا بچوں کو سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی، جو اب حد سے زیادہ اجیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی بیکالے اور ایڈیشن کی سی ہو جائیں گی۔"[۴۲]

اقتباس کا پہلا حصہ محل نظر ہے۔ میر امن کی داستان کو فصاحت و بلاغت میں دادی اماں کی زبان سے سنائی گئی کہانی کے مقابل، ٹھہرانا کسی طرح مناسب نہیں۔ لیکن اب اسے کیا کیجیے کہ وہ علمی نثر اور معلوماتی و اصلاحی مضامین ہی کی اہمیت کے قائل تھے۔ اور اسی کو اصلی ترقی سمجھتے تھے۔ انھوں نے محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "جو تبدیلی کہ اس زمانہ میں اردو زبان میں ہوئی درحقیقت اردو زبان کے علم ادب میں واقعہ عظیم ہے۔ میر امن، انشاء اللہ خاں، جرأت وغیرہ وغیرہ نے اردو زبان میں نثریں لکھی ہیں۔ حال کی طرز تحریر اور طریقہ ادائے خیالات کو اس سے کچھ نسبت نہیں ہے۔ وہ صرف ایک ڈھکوسلے تھے۔ زمانہ حال کی اردو نثر مضامین مفید اور ترقی مسائل اور علمی اور اصلی واقعات کے بیان سے مالامال ہے۔"[۴۳]

اس میں شبہ نہیں کہ سرسید کا تصور شعر و ادب از اول تا آخر افادی ہے اور محدود بھی۔ لیکن مسائل پر ان کی نظر تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے غور و فکر سے بھی کام لیا تھا۔ ان کا شمار اردو کے باقاعدہ ناقدوں میں نہ ہو یہ اور بات ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ایک خاص قسم کے تنقیدی شعور اور خیالات کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ثبوت میں حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو پیش کیا جاسکتا ہے جس پر سرسید کے انداز فکر کی گہری چھاپ ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸ ۔ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)

سرسیّد اور محمد عبدہ کے افکار و نظریات کا تقابلی مُطالعہ

فیضان احمد*

سرسید (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸) اور محمد عبدہ (۱۸۴۹ - ۱۹۰۵) کی نشو و نما تقریباً ایک ہی عہد میں ہوئی، دونوں نے ایک ہی طرح کے ماحول میں پرورش پائی، اور ایک ہی طرح کے سیاسی اور معاشی حالات سے دوچار ہوئے، دونوں نے ایک ہی حکومت کے زیر اقتدار عمر کے مراحل طے کیے، دونوں کے طریق کار اصلاحی مشن اور اغراض و مقاصد میں بُعد مکانی کے باوجود بڑی حد تک مماثلت اور مشابہت نظر آتی ہے۔

سرسید اور عبدہ کی پرورش و پرداخت دینی گھرانے میں ہوئی، ان کی ابتدائی سے لیکر اعلیٰ تعلیم دینی نہج اور علماء کی صحبت میں ہوئی[1] یہی وجہ ہے کہ دونوں کی فکری نشو و نما بھی دینی اور مذہبی رنگ میں ہوئی، یہ اور وجہ ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ مشابہت نہ رہ پائی جو ابتدا میں تھی، کیونکہ دونوں نے حالات و زمانہ اور تجربات و مشاہدات کی بنا پر اپنا لائحہ عمل اور نقطۂ نظر متعین کیا، لیکن اس کے باوجود دونوں کے مابین بے شمار امور میں یگانگت اور یکسانیت پائی جاتی ہے البتہ نقطۂ نظر کی توضیح و تشریح اور مقاصد کے حصول کے ذرائع میں کچھ اختلاف ضرور نظر آتا ہے۔

عبدہ اور سرسید دونوں کی تحریروں میں معقولیت و تعقل اور اجتہادی عمل اختیار کرنے پر زیادہ زور ملتا ہے، دونوں سماج و معاشرہ کے فرسودہ رسم و رواج اور ان اقدار و روایات کی اصلاح چاہتے تھے جن کا مذہب سے کوئی رشتہ نہیں مگر اسی کے نام پر جڑ جاتے ہوئے تھیں، دونوں کا خیال تھا کہ قدیم مذہبی نقطۂ نظر میں تبدیلی لائی جائے اور اسلام اور اس کے معتقدات کی توضیح و تشریح ایسے اسلوب فکر میں کی جائے جو جدید زمانہ اور حالات کے مناسب حال ہو، دونوں کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی دینی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی دنیاوی اور مادی ترقی ناگزیر ہے اور اس کے لیے جدید علوم و فنون کا حصول ضروری ہے، اس مقصد کے حصول کے لیے دونوں قدیم مناہج تعلیم میں اصلاح اور نئے طرز اور عصری تقاضوں کے مطابق تعلیمی اداروں کا قیام چاہتے تھے۔ مصلحین کی عام روش کے مطابق دونوں نے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے ایک ایسے اسلوب نگارش کی بنیاد رکھی جس کو ہم سائنٹفک اسلوب بیان کہہ سکتے ہیں، جو جدید تقاضوں کے عین مطابق اور خالصتاً سائنٹفک انداز فکر کی پیداوار ہے، دونوں نے تفسیر قرآن کی ابتدا کی اور نامکمل حالت میں اسے چھوڑ دیا۔

دونوں مصلحین کے تقابلی موازنہ سے قبل ہم ان کے افکار و نظریات کا مختصراً خاکہ پیش کرتے ہیں۔ سرسید کی تحریک کے بنیادی مقاصد پر ڈاکٹر سید عابد حسین نے یوں روشنی ڈالی ہے:

۱۔ مذہب اسلام کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانا اور یہ ثابت کرنا کہ وہ سچا مذہب ہے اور اصول عقل و قوانین فطرت کے عین مطابق ہے۔

۲۔ مسلمانوں اور انگریزوں میں جو عداوت مذہبی اور سیاسی وجوہ سے پیدا ہو گئی ہے اسے دور کر کے ان دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا کرنا۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کی نئی تعبیر کرنا اور جدید علم طبعی اور مذہب اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنا تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے معقول پسند اور روشن خیال ہوں اور نئے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیں۔

---

* شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۴۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان اور جدید علوم کو سیکھنے پر آمادہ کرنا تاکہ وہ انگریزوں سے برابری کی سطح پر مل سکیں، اور ملک کے نظم و نسق میں معقول حصّہ لے سکیں۔

۵۔ اردو زبان کو انگریزی کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی کوشش کرنا اور اسے ترقی دے کر اس قابل بنانا کہ اس کے اندر ترجمہ و تصنیف کے ذریعہ جدید علوم و فنون کا معقول ذخیرہ فراہم ہوجائے[۱۲]

ٹھیک اسی طرح کے مقاصد کو لے کر محمد عبدہ نے مصر میں اپنی تحریک کی ابتدا کی، ان کی تحریک کے بنیادی مقاصد کو چند لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ دین اور عقل کے مابین موافقت :۔ عبدہ کا کہنا ہے کہ قرآن کی بے شمار آیات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ دین کا صحیح شعور اور ادراک عقل و تعقل کے بغیر ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ کائنات کے مظاہر پر غور و فکر کی دعوت ملتی ہے۔

۲۔ عقل اور نقل کے مابین تعارض کی صورت میں عقل کو برتری حاصل ہوگی :۔ عبدہ نے عام رجحانات کے برعکس منقولات اور ماثورات کی جانچ پڑتال کے لیے عقل و دانش کو کسوٹی کے طور پر تسلیم کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اسلام نے عقل کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔ اور کسی بھی چیز کی تقلید اور پیروی اس کے نزدیک اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک کہ عقل و خرد اس کی صحت اور سالمیت کو تسلیم نہ کرے، قرآن کی آیت "مثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع إلا دعاء ونداء صم بکم عمی فھم لا یعقلون[۱۳]" (وہ لوگ جنہوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ان کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے ہیں۔ گونگے ہیں، اندھے ہیں اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی) کی تفسیر میں عبدہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس امر میں واضح ہے کہ تقلید بغیر عقل کے کافروں کا شعار ہے اسی طرح وہ شخص حقیقی معنوں میں مسلم نہیں ہوسکتا ہے جس کو اپنے دین کا ادراک عقل کی روشنی میں نہ ہو اور اس پر اس کو شرح صدر حاصل نہ ہو[۱۴]

۳۔ علم اور دین میں تطابق :۔ محمد عبدہ کا کہنا ہے کہ جدید علوم و فنون اور علمی ایجادات و اختراعات کا دین کے اصول و مبادی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ یہ اس کے معتقدات اور تعلیمات کے بہترین شارح ہیں اسی طرح ان کے نزدیک دینی علوم اور دنیوی علوم کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا دینی دیانت کے خلاف ہے بلکہ دونوں علوم ایک دوسرے کی تکمیل اور تفسیر ہیں۔

۴۔ سماج و معاشرہ کے فرسودہ رسم و رواج اور بدعات و خرافات کے خلاف جنگ کرنا اور ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا جہاں حقیقی اسلام کی حکمرانی ہو۔

۵۔ اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینا اور اہل کتاب کے درمیان رابطہ پیدا کرنا[۱۵]

سرسید اور عبدہ حالات و زمانہ کے پیداوار تھے، دونوں نے اپنی تحریک کے مقاصد اور اس کے خطوط کو حالات و زمانہ کے زیر اثر رہ کر متعین کیا اور دونوں نے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق اس میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرسید کا ابتدائی رجحان علمی، مذہبی اور تاریخی چیزوں کی طرف رہا ہے، ان کی ابتدائی کتابیں آثار الصنادید، جام جم، تاریخ ضلع بجنور، قول متین اور ابطال حرکت زمین، وغیرہ ان کے مخصوص رجحانات کی غماز ہیں، لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جو نئی سیاسی صورتحال پیدا ہوئی، اس نے ان کے ذہن و فکر کو تبدیل کر دیا جس کی وجہ سے ان کے رجحانات اور میلانات میں زبردست تبدیلی آئی[۱۶]

اسی طرح محمد عبدہ کا تعلق ابتدا میں تصوف و سلوک سے تھا لیکن ان کی زندگی میں سب سے اہم موڑ جس نے ان کی ساری ذہنی اور روحانی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی اس وقت آیا جب ۱۸۶۹ء میں ان کی ملاقات سید جمال الدین افغانی سے ہوئی، مردم شناس استاد نے نوجوان شاگرد کے دل میں تصوف کے والہانہ شوق کو دھیما کیا اور معقولات کی تحصیل میں ہمت افزائی کی، ۱۸۷۱ء میں محمد عبدہ نے

سید صاحب سے باقاعدہ درس لینا شروع کیا، فاضل استاد نے ایک تو انھیں علوم منقولہ نئے انداز سے پڑھائے جس سے ان پر نئے مطالب اور معانی کا انکشاف ہوا، دوسرے انھیں علوم جدیدہ سے متعلق مغربی زبانوں کی کتابوں سے (عربی ترجموں کے ذریعہ) آشنا کیا، اور اس طرح ان کے لیے ایک نئی دنیا کا دروازہ کھول دیا، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے دل کو اپنے جوش عمل اور جذبہ اصلاح سے گرما دیا۔

*

حالات و زمانہ کی اس تبدیلی کی وجہ سے دونوں مصلحین کے بنیادی مقاصد میں تو کوئی اختلاف رونما نہیں ہوتا ہے مگر مقاصد کی توضیح و تشریح اور ان کے حصول کے ذرائع کے سلسلے میں اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ دونوں جگہ کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات ہیں۔ سرسید ایک ایسے ملک میں رہتے تھے جہاں ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے دو محاذ تھے ایک حکمراں طبقہ دوسرا ملک کا اکثریتی طبقہ، اور ان کے لیے دونوں محاذ پر جنگ کرنی مشکل تھی اس وجہ سے انھوں نے قومی اور ملی مفادات کے حصول کے لیے ایک محاذ کو صلح آشتی سے رام کر لیا اور دوسرے پر چشم پوشی اور تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ اس کے مقابلے میں عبدہ کے مصر میں، ۱۸۵۷ء جیسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا کہ اس کے اثرات ان کے ملک پر اتنے دور رس ثابت ہوتے جتنے کہ ہندوستان پر ہوئے۔ دوسرے عبدہ کا مصر ان کے عہد میں عالم عرب کا سب سے متمدن اور اقتصادی لحاظ سے خوش حال ترین ملک تصور کیا جاتا تھا، اس کے برخلاف سرسید کا ہندوستان اس وقت معاشی لحاظ سے کچھ ہو، مگر اس وقت کے ہندوستانی مسلمان اقتصادی، تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے مردہ بدست زندہ تھے، لیکن اس سے زیادہ خطرناک جو صورت حال رونما ہوئی وہ یہ کہ آگے بڑھنے کا عزم و حوصلہ، مصائب سے لڑنے کی امنگ اور روشن مستقبل کی امید و رجا، جن پر قوموں کی بقا کا انحصار ہوتا ہے ان سب کا چراغ ان کے اندر گل ہو چکا تھا۔

عبدہ کے مصر میں بے شمار تعلیمی ادارے قائم تھے عالم اسلام کی سب سے بڑی درس گاہ جامعہ ازہر وہیں پر ہے۔ وہاں صرف قدیم مناہج تعلیم و تدریس میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ افغانی کی تحریک اور ان کی تقاریر نے لوگوں کو سیاسی طور پر بیدار کر دیا تھا، لوگوں میں تعقل پسندی اور اجتہادی میلان پیدا ہو گیا تھا۔ لوگ سماج و سوسائٹی میں تبدیلی چاہتے تھے، نیا زمانہ اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، نئے علوم و فنون کے حصول کے لیے بیرونی ممالک کا سفر کر رہے تھے، خود ملک میں نپولین اور اس کے بعد کے لوگوں نے جدید طرز کے ادارے اور درس گاہوں کی بنا رکھ دی تھی۔

اس کے برعکس ہندوستان میں افغانی جیسی کوئی تحریک نہیں چلی، افغانی ہندوستان میں بھی آئے۔ مگر جس خاموشی کے ساتھ آئے اسی خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ سرسید کو افغانی اور عبدہ دونوں کا کام تنہا کرنا پڑا۔ اسی طرح سرسید کو نپولین اور محمد علی جیسا کوئی ایسا حکمراں نہیں ملا جو حکومتی سطح پر تعلیمی محاذ کو سنبھالتا، سرسید کے ہندوستان میں مصر کی طرح ایسے تعمیر شدہ تعلیمی ادارے بھی ناپید تھے جہاں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا نظم و نسق ہو سکے، ان سب کے باوجود سرسید نے اپنے عزم و حوصلے کو مجتمع کیا اور تن تنہا عوام الناس میں تعلیم کی نشر و اشاعت اور سماجی و معاشرتی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کے ساتھ تعلیمی اداروں اور درس گاہوں کے قیام کے لیے عملی جد و جہد کا آغاز کیا، یعنی فکری اور عملی دونوں میدانوں میں اکیلے جہاد کیا، یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جو شخص جو بھی لڑائی لڑتا ہے اور جس کے میدان عمل میں، تنوع ہوتا ہے اسی کے اعتبار سے اس کے دوست اور دشمن ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ میدان عمل کے تنوع کی وجہ سے اس کے نقطۂ نظر میں ہر جگہ یکسانیت برقرار نہیں رہ پاتی، اس کی بعض چیزیں محل نظر ہوتی ہیں اور بعض قابل اعتراض و تنقید۔

سرسید بھی اس صورت حال سے دوچار ہوئے بعضوں نے ان پر تنقید کی اور بعض لوگوں نے ان کے کاموں کو سراہا مگر یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دونوں فریقوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیا اور افراط و تفریط کا شکار ہو گئے۔ ہمارا خیال ہے کہ کسی عظیم المرتبت شخصیت کے چند نقائص اس کی بشریت کے تقاضے ہیں ذکر اس کی

عظمت و مرتبت کے لیے باعث جنگ و عار ، سرسید کے نقطۂ نظر میں دوبارہ تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جبکہ لندن سے ان کی واپسی ہوئی ، گزرتے ہوئے وقت کے تجربات اور لندن کے مشاہدات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ مختلف النوع میدان عمل اختیار کرنے کے بجائے دائرہ کار کو بنیادی مقاصد تک محدود کر دیں اور بقیہ میدانوں کو دوسروں کے حوالہ کر دیں کیونکہ دائرہ کار کے وسعت نے فوائد کے بجائے ان کے بنیادی مقاصد کو کافی نقصان پہونچایا، شیخ اکرام کے بقول «تفسیر کی اشاعت نے سرسید کے دوسرے کاموں کو کافی نقصان پہونچایا اور اس سے فائدہ کم ہوا ، ان کا اصل مقصد مسلمانوں میں تعلیم عام کرنا اور ان کی دنیوی ترقی کا انتظام کرنا تھا۔ اسلام اور تفسیر قرآن کے متعلق ، بالخصوص ان مسائل کے متعلق جن کا نہ تعلیم سے خاص تعلق ہے نہ دنیوی ترقی سے ، عام مسلمانوں سے گہرا اختلاف پیدا کر کے سرسید نے اپنی مخالفت کا سامان پیدا کر لیا اور بعض لوگوں کو انگریزی تعلیم سے عقائد متزلزل ہو جانے کا جو ڈر تھا ، اس کا بدیہی ثبوت خود بہم پہونچا دیا [8] یہی وجہ ہے کہ ان کے قریبی رفقاء جن میں حالی ، وقار الملک ، شبلی اور محسن الملک وغیرہ شامل ہیں ان کے بعض مذہبی نظریات سے متفق نہ تھے [9] سرسید نے اب اپنے دائرہ کار کو صرف مسلمانوں کی مادی ترقی تک محدود کر لیا اور اس کے حصول کے لیے انھوں نے جدید علوم و فنون کو عام کرنے کی مہم شروع کر دی ، سید عابد حسین کے بقول یہی ان کا بنیادی مقصد بھی تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ "سرسید کو جس چیز سے حقیقی دلچسپی تھی وہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد و اعمال کی اصلاح نہ تھی بلکہ انھیں اس بات کا شوق دلانا کہ وہ انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل کے ذریعہ مغربی تمدن کو جسے سرسید "نہایت مکمل تمدن" کہتے تھے اپنائیں [10]

پیچھے گزر چکا ہے کہ ابتدا میں عبدہ تصوف و سلوک کی پرسکون زندگی گزار رہے تھے مگر افغانی نے ان کو ایک پرشور اور انقلابی زندگی میں داخل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پوری سرگرمی کیساتھ عملی سیاست میں داخل ہو گئے۔ افغانی کے زیر اثر وہ بھی مصر میں انقلاب کے خواہاں تھے ، اور اس کو عجلت پسندانہ تدابیر اور سیاسی زور آزمائی سے حاصل کرنا چاہتے تھے ، اس کے لیے وہ ہر اس قدم کو مستحسن سمجھتے تھے جو افغانی اٹھا رہے تھے ، اگر نقطۂ نظر یا طریق کار میں کچھ اختلاف بھی ہوتا تو اس کے اظہار کے لیے ان کے اندر ہمت موجود نہ تھی کیونکہ وہ افغانی سے نہ صرف یہ کہ عقیدت و ارادت رکھتے تھے بلکہ ان کی شخصیت سے غایت درجہ مرعوب بھی تھے ، لیکن ان کے اندر اس وقت تبدیلی رونما ہونی شروع ہوئی جب پیرس میں رسالہ العروۃ الوثقیٰ کے بند ہو جانے کے بعد ان کی واپسی بیروت میں ہوئی ، بیروت کے قیام کے بعد جب ان کی آمد مصر میں ہوئی تو وہ سیاسی طور پر بالکل تبدیل ہو چکے تھے ، کیونکہ بدلتے ہوئے سیاسی احوال و کوائف اور خود ان کے ذاتی تجربات و مشاہدات نے ان کو نئی حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ دوسرے سیاسی ہمہمی ان کے مذاق و فطرت سے تعلق بھی نہ رکھتی تھی ، اب وہ انقلابی اور عجلت پسندانہ تدابیر کے بجائے پائیدار اور مستحکم منصوبے اور پروگرام پر یقین رکھتے تھے اب وہ سیاسی زور آزمائی اور کشمکش پر قوم کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کو مقدم سمجھتے تھے ، ان کا خیال تھا کہ سیاسی جنگ بھی جاری رہے مگر ساتھ ہی قوم کی اصلاح بھی ہو ، اور اس کی تعلیمی اور اقتصادی صورتحال کی بہتری کے لیے اقدامات بھی کیے جائیں ، تاکہ ہار اور جیت دونوں صورتوں میں قوم کی عام زندگی بیدار اور متحرک رہے [11]

سرسید کی طرح محمد عبدہ بھی قومی مفادات کے حصول اور اس کے تحفظ کے لیے انگریزوں سے معاونت اور تعاون کو ضروری سمجھتے تھے اسی کے پیش نظر انھوں نے مصر میں تحریک آزادی کی اس تنظیم کا ساتھ نہیں دیا جس کی قیادت مصطفیٰ کامل کر رہے تھے ۔ اور جو انگریزوں کے انخلاء کے لیے ہر قسم کے اقدامات خواہ سیاسی تشدد کیوں نہ ہو ، جائز سمجھ رہے تھے [12]

انگریزوں کے سلسلے میں عبدہ اور سرسید کے نقطہ نظر میں اس حد تک تو اتفاق ہے کہ قومی مسائل کے حل اور ملی مفادات کے حصول کے لیے ان سے صلح و صفائی اور نرم روی اختیار کی جا سکتی ہے لیکن ان کے اقتدار کی بحالی و بقا اور ان کے سیاسی اقدامات کی تعریف و توصیف کے سلسلے میں دونوں کے مابین شدید اختلاف ہے ، سرسید انگریزوں کی بلا مشروط حمایت کے قائل تھے ان کے نزدیک ان کے سیاسی اقدامات ان کا غلبہ و اقتدار دونوں قابل تحسین ہے لیکن اس کے برخلاف عبدہ ملک سے ان کا انخلاء چاہتے تھے لیکن اس انخلاء کے لیے وہ سیاسی تشدد

کے بالکل خلاف تھے کیونکہ ایسی صورت میں قوم وملت کی پوری توانائی اسی کے حوالے ہو جائے گی اور قوم وملت کی ہمہ جہت ترقی پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ افغانی اور محمد عبدہ دونوں کو سرسید سے جو بنیادی اختلاف تھا وہ صرف سیاسی نوعیت کا تھا مگر بعد میں اس کا دائرہ دوسرے امور تک وسیع ہوگیا اور وہ یہ تھا کہ ترکی خلافت کے مقابلے میں سرسید نے عام مسلمانوں کے برخلاف انگریزوں کی حمایت کی، اسی طرح ۱۸۸۲ء میں جب باقاعدہ مصر پر انگریزوں کی حکومت ہوئی تو سرسید نے اس کی حمایت کی[۱۲]

سرسید اور عبدہ دونوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اہل کتاب کے باہمی تعلقات کو استوار کیا اور باہمی غلط فہمیاں جو دونوں فرقوں میں رواج پاچکی ہیں ان کا ازالہ ہونا چاہیے۔ سرسید نے اسی کے پیش نظر ایک کتاب "تبیین الکلام" اور دوسری "لفظ نصاریٰ" کی تحقیق میں لکھی۔ ان دونوں کتابوں کے علاوہ تہذیب الاخلاق میں بے شمار مضامین لکھے بالخصوص ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے جواب میں جو مضامین لکھے ہیں، وہ قابل ذکر ہیں[۱۳] محمد عبدہ نے اس مقصد کے حصول کے لیے "الاسلام والنصرانیہ" نامی کتاب اور علمی جرائد میں مضامین لکھا، اس کے علاوہ انھوں نے باقاعدہ ایک تنظیم "جمعیۃ التالیف والتقریب" نام کی قائم کی جس کا بنیادی مقصد اہل کتاب کے درمیان تعلقات کا استحکام اور آپسی قربت کو بڑھانا تھا[۱۸] اس تنظیم سے ہر مسلک اور مذہب کے لوگ منسلک ہوئے جس میں مسلمان، ہندو، انگریز اور یہودی شامل تھے۔ اس کا دائرہ عمل بہت جلد مصر کے علاوہ دوسرے ممالک تک وسیع ہوگیا، مگر یہ تنظیم مختلف وجوہات کی بنا پر زیادہ دیر قائم نہ رہ پائی[۱۹]

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں مصلحین نے صرف اہل کتاب سے تعلقات کی استواری پر کیوں زور دیا؟ کیونکہ دونوں جگہ مذہبی، سیاسی اور تاریخی حیثیت سے مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات زیادہ خراب تھے اور اس کی اہمیت کا احساس دونوں جگہ اہل کتاب کی حکومت کی وجہ سے زیادہ ابھر آیا تھا، آج ہندوستان میں پہلی جیسی صورتحال نہیں رہی، اس وجہ سے آج مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کی زیادہ اہمیت ہے اور سرسید کی ہدایت کے مطابق ان سے تعلقات کی استواری اور باہمی غلط فہمیوں کا ازالہ ناگزیر ہوگیا ہے۔

*

دونوں مصلحین کا مطالعہ جب ہم تصانیف اور اسلوب بیان کے لحاظ سے کرتے ہیں تو دونوں کی کتابوں کے موضوعات اور اسالیب بیان میں کچھ نظری اور فکری اختلاف کے باوجود بڑی حد تک مماثلت پاتے ہیں۔

سرسید کے عہد میں مستشرقین اور عیسائی مشنریاں اسلام اور اسلامی معتقدات کو نشانہ تنقید بنائے ہوئے تھیں، اس کے اصول ومبادی کو متزلزل اور غلط ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کی سازشیں ہو رہی تھیں، حضورؐ اور ان کی ذات اقدس پر حملے ہو رہے تھے، سرسید نے ان اعتراضات کے جواب میں کتابیں اور مضامین لکھا اور اسلام کی حقانیت اور برتری ثابت کرنے کی کوشش کی یہ اور بات ہے کہ ان کی تحریروں میں بعض جگہ حالات کے پیش نظر معذرتی رنگ آگیا ہے، ان میں قابل ذکر "تبیین الکلام" ہے جس میں قرآن و انجیل کی وحدت ثابت کی گئی ہے۔ "تحقیق لفظ نصاریٰ" جس میں قرآن کے لفظ نصاریٰ کے استعمال کی وجہ سے عیسائیوں میں جو غلط فہمیاں رواج پاچکی تھی ان کا ازالہ کیا گیا ہے۔ رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ ان کے طور طریقے کے مطابق کھانا کھا سکتے ہیں اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں، "خطبات احمدیہ" یہ سر ولیم کی کتاب "لائف آف محمد" کا جواب ہے اس میں حضورؐ کی ذات اقدس پر ہونے والے حملوں کا بھرپور جواب دیا گیا ہے[۲۰]

ٹھیک اسی طرح محمد عبدہ کی بیشتر کتابیں اسلام پر ہونے والے اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں چند قابل ذکر اس طرح ہیں "الاسلام بین العلم والمدنیۃ" اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام علوم وفنون کا مخالف نہیں بلکہ اس کے حصول کو فرض قرار دیتا ہے، اسی طرح اسلام کی افادیت اور اہمیت میں مرور زمانہ اور سائنسی ایجادات و اختراعات کی بنیادوں کی وجہ سے کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ وہ ہر دور اور ہر قوم کے لیے یکساں اہمیت کا حامل اور قابل عمل ہے۔

"الاسلام والنصرانیۃ مع العلم والمدنیۃ" اس میں اسلام اور نصرانیت کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور اسلامی تعلیمات اور معتقدات کو نصرانیت کے اصول ومبادی سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

" الاسلام والرد علی منتقدیہ " اس میں اسلام پر ہونے والے اعتراضات بالخصوص جو عیسائی مشینریاں اور مستشرقین کی جانب سے ہو رہے تھے، ان کا مدلل اور مسکت جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ " رسالہ توحید " میں اسلامی عقائد کی حقیقت اور حقانیت پر بحث و مباحثہ ملتا ہے [۱۸]

اسی طرح سرسید نے تہذیب الاخلاق میں جو مضامین لکھے ہیں اور شیخ محمد عبدہ نے رسالہ " العروۃ الوثقیٰ " سے لے کر مصر کے دوسرے علمی جرائد میں جو مضامین لکھا ہے ان میں موضوعات کے اعتبار سے دونوں مصلحین کے درمیان کافی یکسانیت پائی جاتی ہیں، البتہ نقطہ نظر حالات اور ملک کے اختلاف کی وجہ سے جداگانہ نوعیت کے ہیں۔

اسی طرح اسالیب بیان میں بھی دونوں کے مابین یگانگت پائی جاتی ہے، دونوں نے مروجہ اور قدیم اسالیب بیان کے برخلاف ایک نئے اسلوب بیان اور طرز نگارش کی بنیاد رکھی جس میں تکلف و تصنع کے بجائے سادگی، برجستگی اور اثر آفرینی ہے۔ سرسید کو اردو کے اساطین ادب میں شمار کیا گیا ان کے اسلوب بیان کی تقلید کی گئی شبلی کے بقول " سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کرسکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو یہ بات آج تک نصیب نہیں ہوئی، ملک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے مخصوص دائرۂ مضمون کے حکمراں ہیں لیکن ان میں ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے باراحسان سے گردن اٹھا سکتا ہو " [۱۹]

سرسید کی طرح محمد عبدہ کو عربی ادب میں جدید اسلوب بیان کا بانی مبانی تسلیم کیا گیا ہے، سرسید کی طرح انہوں نے بھی عام مروج طرز نگارش جس میں قافیہ آرائی اور مترادفات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ایک نئے اسلوب بیان کی بنا رکھی، جس کی تقلید ان کے بعد کے ادبا نے کر کے زبان عربی کو ترقی یافتہ عالمی زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

حوالہ جات:

۱۔ موج کوثر، شیخ اکرام، تاج کمپنی، دہلی ۱۹۸۸ء ص ۸۰ - ۸۳

۲۔ اسلام اور عصر جدید ۱۹۶۹ء ج ۱ شمارہ ۳ ص ۶۹ - ۷۰

۳۔ قرآن، سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۱

۴۔ تفسیر المنار ج ۲، رشید رضا، مصر ۱۳۵۰ھ ص ۹۳ - ۹۴

۵۔ سلسلۃ بحوث و محاضرات، الشیخ محمد عبدہ، عبد الجواد سلیمان قاہرہ - ص ۴۴ - ۳۸

۶۔ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ دہلی ۱۹۶۰ء ص ۱۴ - ۲۰۔

۷۔ تاریخ الاستاذ ج ۱، رشید رضا، مصر ۱۹۳۱ء ص ۱۲۶ - ۱۲۸

۸۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرام۔ ص ۱۶۳ - ۱۰۳

۹۔ موج کوثر، " " ص ۹۰ - ۹۳

۱۰۔ اسلام اور عصر جدید ۱۹۶۹ء ج ۱ شمارہ ۳ ص ۷۳

۱۱۔ محمد عبدہ - عباس محمود عقاد، مصر - ص ۱۰۶ - ۱۱۱

۱۲۔ الاسلام والتجدید فی مصر، عقاد، مصر ص ۴۸ - ۶۵

۱۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل منگلوری، دہلی ۱۹۴۵ء، ص ۲۶۲ - ۲۷۴

۱۴۔ ایضاً، ۲۰۱

۱۵۔ تاریخ الاستاذ ج ۱، ص ۸۱۸

۱۶۔ محمد عبدہ، بطل الثورۃ والفکریہ، قدری قلعجی، مصر ص ۲۳ - ۲۴

۱۷۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۷ - ۴۰ مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ محسن الملک۔ ص ۳۰۶

۱۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، تاریخ الاستاذ ج ۱ ص ۷۷۹ - ۷۸۶

۱۹۔ موج کوثر ص ۱۴۰ - ۱۴۱، مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے کے لیے ملاحظہ ہو، خطبہ تقسیم اسناد علی گڑھ (۲۰ فروری ۱۹۴۹ء)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)

سرسیّد احمد - اپنی شہرہ آفاق تصنیف کے آئینے میں

توقیر عالم فلاحی*

قوموں کے عروج و زوال کے نقشۂ حیات کی تشکیل میں کچھ نمایاں ترین شخصیتیں ہی میدان مقابلہ میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط آخر میں مسلم قوم کی تباہی و بربادی کا نظارہ کرنے والوں میں سرسید وہ واحد مرد میدان ہیں جنہوں نے قوم کو زوال و ادبار کی لعنتوں سے نکال کھڑا کرنے کا عزم مصمم کیا اور اس علمی جد وجہد میں شب و روز ایک کر دیا۔ سرسید ایک مصلح، مدبّر، مورّخ، ادیب اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمہ گیر ترقی کے لئے سرسید نے نسخۂ شفا کے طور پر نئی تعلیم کو ہی تجویز کیا لیکن سرسید کے ہم عصروں نے ان کی مخلصانہ کوششوں کو نشانۂ تعریض بناتے ہوئے کرسٹان، نیچری اور عقل پرست تک کہنے سے گریز نہ کیا۔

یہ تو درست ہے کہ دینی لحاظ سے سرسید کی متنازعہ فیہ شخصیت کا محور ان کی تفسیر قرآن ہے۔ اس سے بھی انکار مشکل ہے کہ مغرب میں عقل اور نیچر کی حکمرانی دیکھ کر سرسیّد متاثر ہوئے اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کو عقل کے مطابق دیکھنے اور سمجھنے کی بنیاد ڈالی۔ سرسیّد نے اسی عقلیت پسندی کے سبب کچھ ایسے مباحث بھی چھیڑے ہیں جن کے سلسلے میں امت کا سواد اعظم فکری لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔ انہیں افکار و خیالات کی بنا پر خاص حلقے میں سرسید کی ملی زندگی مشکوک و مشتبہ قرار دی گئی یا کم از کم وہ متنازعہ فیہ شخصیت بن کر سامنے آئے۔ اس مختصر سے مقالے میں خطبات احمدیہ کی روشنی میں سرسید کی دینی زندگی کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حق و باطل کی کشمکش کی تاریخ میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ تخلیق کائنات کے آغاز سے ہی صدائے حق کو دبانے کی منظم کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ اس دور جدید میں بھی ذرائع و اسباب کی فراوانی کی بنا پر حق کو دبانے کے لیے مختلف حربے اختیار کئے جاتے ہیں نوع بہ نوع کی تحریکیں اور تنظیمیں نیز طرح طرح کی مشنریاں اس سعی و عمل میں سرگرم نظر آتی ہیں۔ چونکہ قرآن پاک کتاب ہدایت اور پوری انسانیت کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ اور حدیث اسی ضابطۂ زندگی کی عملی تفسیر ہے اس لئے معاندین اسلام نے بالواسطہ بھی اور بلا واسطہ بھی قرآن و حدیث کی تعلیمات کو اپنے مذموم خیالات اور ناپاک عزائم کا نشانہ بنایا ہے۔ مستشرقین میں سر ولیم میور، گولڈ زیہر اور ڈاکٹر اسپرنگر اس سلسلے میں کارواں کے نمائندے نظر آتے ہیں۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے کہ تنکے کو شہتیر قرار دینے اور رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرنے سے بھی انہوں نے گریز نہ کیا۔ مستشرقین کے میر کارواں سر ولیم میوڑ کی مذموم اور متعصبانہ ذہنیت پر سرسید کا قلم حرکت میں آتا ہے۔

"سر ولیم میور نے کسی قدر طوالت کے ساتھ اسلام کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بحث کی ہے مگر ہم بافسوس بیان کرتے ہیں کہ ان کی طرز تحریر سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ ایک غیر متعصبانہ اور آزادانہ تحقیق، جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ مستخرج کریں اس کے

---

* ریسرچ اسکالر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دل میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ یہ سب روایتیں جھوٹی اور لوگوں کی محض بناوٹی ایجادیں ہیں اور اول ہی سے اس بات کا قصد کرلیا ہے کہ ان سب واقعات کو ایسا ہی ثابت کریں وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے گو وہ امر حق کچھ ہی کیوں نہ ہو جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصل منشا ہوتا ہے یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیئے۔ ان کے طرز استدلال ہی سے ان کی غرض ظاہر ہو جاتی ہے"

مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لئے بالخصوص عیسائی مشینریاں زوروں پر کام کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر فنڈر ہندوستان میں سرگرم عیسائی مشینریوں کا روح رواں تھا۔ اسی کے اصرار پر سر ولیم میور نے چار جلدوں میں لائف آف محمد کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جب یہ کتاب ہندوستان آئی تو لوگوں نے کھلے ذہن و دماغ سے مطالعہ کرنا شروع کیا۔ جب لوگوں کو اس بات کا علم ہوا کہ مصنف نے یہ کتاب ایک خاص مقصد کے تحت لکھی ہے تو ان کے ذہن و دماغ غلط اور بے بنیاد باتوں کے ادراک سے قاصر نہ رہے۔ عام افراد ملت نے تو اس کتاب کے مطالعہ کے بعد رنج و الم کا اظہار کیا ہی ہاں نوجوان تعلیم یافتہ نسل پر جو دین و مذہب سے صحیح طور سے واقف نہیں تھی کچھ دوسرے ہی ردعمل کا اظہار ہوا۔ ان کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ولیم میور کی باتیں بے بنیاد اور غلط ہیں تو آخر صحیح اور صداقت کیا ہے۔ نوجوانوں کا یہی وہ طبقہ ہے جن کے شعور کو جلا بخشنے میں سرسید نے اہم رول ادا کیا۔ بالآخر انہوں نے ایک کتاب لکھی جس میں ولیم میور کے اعتراضات اور الزامات کا دندان شکن جواب دیا اور دوسری طرف قرآن اور سیرت نبوی سے متعلق صداقتوں کو دلائل و براہین سے واشگاف کیا۔ بایں طور یہ کہا جاسکتا ہے کہ الخطبات الاحمدیہ سر ولیم میور کے الزامات کی صرف تنقید یا جواب ہی نہیں بلکہ یہ سید احمد کی ایک ایسی کوشش ہے جس کے ذریعہ انہوں نے انیسویں صدی کے میلانات کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تفسیر عقلی دلائل اور ثبوت کے ساتھ پیش کی ہے۔ چونکہ لائف آف محمد میں ولیم میور نے سیرت طیبہ کو ہدف خاص بناتے ہوئے قرآن پاک، احادیث نبوی، روایات اور دوسرے خالص اسلامی موضوعات کو اپنے جارحانہ عزائم کا نشانہ بنایا تھا۔ ان گستاخیوں کو دیکھ کر سرسید کا دل مضطرب و بیقرار ہو اٹھا اور انہوں نے اپنے رفیق کار سید مہدی علی کو ایک خط میں لکھا۔

"ان دنوں قدرے دل کو سوزش ہے۔ ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیوں کو دیکھ کر دل کباب ہوگیا۔ اسی ضمن میں لکھا "کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے"

بالآخر انہوں نے "الخطبات الاحمدیہ" نام کی کتاب لکھی جو ایک طرف تو سر ولیم میور کے اعتراضات اور الزامات کی دندان شکن جواب ہے اور دوسری طرف اس میں قرآن وحدیث سے متعلق صداقتوں کو دلائل و براہین کے ذریعہ واشگاف کیا گیا ہے۔ بایں طور یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب سر ولیم میور کے الزامات کی تحقیق و تنقید یا جواب ہی نہیں بلکہ سید احمد کی ایسی کوشش ہے جس کے ذریعہ انہوں نے انیسویں صدی کے میلانات کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تفسیر عقلی دلائل اور ثبوت کے ساتھ پیش کی ہے۔"

خطبات احمدیہ کی تصنیف میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں کھلے چھپے تمام اسلام دشمن جماعتیں سرگرمی عمل کا مظاہرہ کررہی تھیں بالخصوص عیسائی مشینریاں اسلام سے برگشتہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی تھیں۔ سر ولیم میور جو اسلام دشمنی کی کمان سنبھالے تھا وہ اس وقت صوبے کا حاکم اعلیٰ تھا۔ سرسید کے اس جرأت مندانہ اقدام پر وہ نوٹس لے سکتے تھے اور ان کے ساتھ جارحانہ سلوک بھی کئے جا سکتے تھے لیکن حب نبوی اور عقیدت رسول میں سرسید نے کسی خوف و ہراس کی پرواہ نہ کی اور اس کتاب کو منظر عام پر لانے کے لئے تمام عیش و آرام تج دیئے۔ ڈاکٹر عبداللہ کا یہ کہنا بجا ہے "خطبات کی تالیف میں خدمت علم کا مقصد کم ہے ضمیر اور عقیدت کی اطاعت زیادہ ہے۔ اسی صمیمیت اور خلوص کے سبب ہم اس کتاب کو ان کی سب تصانیف میں بلند ترین درجہ دینے پر مجبور ہیں۔

اس کتاب کو خالص تحقیقی کام نہیں قرار دیا جاسکتا اور نہ ہی مصنف کو دعوی ہے کہ اس تصنیف میں فکر و اجتہاد اور تحقیق و تفتیش کا پہلو بلندیوں تک پہنچا ہوا ہے۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ اسباب و وسائل کی فراہمی کے مطابق سر ولیم میور کی دشنام طرازیوں کا جواب مدلل طریقے سے

دیاگیا ہے۔ اس لئے اس کے علم و تحقیق کو کالعدم قرار دے کر بے اعتنائی بھی نہیں برتی جا سکتی اور نہ ہی شبہ کیا جا سکتا ہے۔ جدید زمانے میں سرسید نے اس کتاب تصنیف کے ذریعہ کچھ علمی اصولوں کی بنیاد رکھی ہے اور نئے رجحانات کو فروغ دیا ہے۔

۱ سیرت کے واقعات کے مرجع و مصادر کیا ہیں سیرت کی کما حقّہٗ عظمت کو واضح کرنے کے لئے ان کی تحقیق و تفتیش ضروری ہے۔

۲ قرآن کی حقانیت تو خود قرآن سے واضح ہے لیکن اس کے ثبوت میں دوسری کتب مقدسہ کو پیش کیا جائے۔

۳ عرب کے جغرافیائی حالات اور نسلی معلومات کی چھان بین

۴۔ واقعات کی حقیقت تک پہونچنے کے لئے تحقیق و تفتیش کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس راہ میں تعصب اور تنگ نظری کو جگہ نہ دی جائے اس باب میں مغربی مصنفین کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔

۵۔ اسلام کی تمدنی حیثیت کا مطالعہ۔

خطبات احمدیہ کے مطالعہ سے ماخوذ ان علمی اصولوں کی واقعی بڑی قیمت ہے لیکن ان اصول و رجحانات سے قطع نظر اس کتاب کی عظمت کا راز اس امر میں مخفی ہے کہ سرسید نے ذاتی، خاندانی اور گروہی مفادات سے بالا ہو کر حبّ رسول میں قلم کا زور صرف کیا ہے۔ بے پناہ عقیدت رسول کے سرچشمہ تحریک کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر اس تصنیف کو سرسید کی دیگر تمام تصنیفات میں سرفہرست رکھا جائے تو بیجا نہیں۔

قرآن پاک خدائی کتاب ہے۔ ہر شعبہ حیات اور ہر معاملۂ زندگی میں قیامت تک کے لئے راہنما کتاب ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ ترجمہ۔ ہم نے اس کتاب مقدس کو اتارا ہے اور ہم ہی اسکی حفاظت کرنے والے ہیں۔ قرآن کے سلسلے میں حقانیت و صداقت کا دعویٰ اور اس کے تحفظ کی ضمانت جو آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل خالق کائنات نے لی ہے وہ بالکل برحق ہے اور سچ تو یہ ہے کہ صدیاں بیت گئیں لیکن ایک حرف کی تبدیلی بھی اس الٰہی کلام میں وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ چونکہ قرآن ہی سرچشمہ ہدایت اور اسلام کا اصل الاصول ہے۔ اس لئے گھٹیا ذہنی کردار رکھنے والے مستشرقین نے قرآن کو اپنا مذموم سرگرمیوں کا محور بنا لیا ہے۔ سر ولیم میور لکھتے ہیں۔

" IT IS VEREY CERTAIN THAT WHEN MOHAMMED DIED THERE WAS NO WHERE ANY DEPOSIT OF THE COMPLETE SERIES, AND IT MAY BE DOUBTED WHETHER THE ORIGINAL TRANSCRIPTS THEMSELVES WERE ANY WHERE PRESERVED ..... WE MUST EVEN DOUBT WHETHER THE NUMBER OF THE SURAS WAS DETER- -MINED BY MOHAMMED AS WE NOW HAVE THEM "

(یہ بڑی یقینی بات ہے کہ جب محمد صلعم رفیق اعلیٰ سے جا ملے تو مکمل سلسلے کی کوئی تحویل کہیں موجود نہیں تھی اور یہ بھی مشتبہ ہے کہ خود اس کی اصل نقلیں کہیں محفوظ ہیں یا نہیں ہیں اس پر بھی شک ہے کہ کیا سورتوں کی تعداد نبی اکرم کے ذریعہ متعین کی گئی ہے جیسا کہ ہم موجودہ شکل میں اپنے پاس رکھتے ہیں)

سر ولیم میور کے مذکورہ بالا بیانات میں قرآن کے پایہ استناد پر شک کرتے ہوئے زہر افشانی کی ہے۔ حالانکہ اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ قرآن مجید جس شکل میں الفاظ و معانی کے ساتھ نبی اکرم صلعم کی ذات پر اترا اور اس کی ترتیب بھی وحی الٰہی کے مطابق عمل میں آئی۔ سر ولیم میور صاحب کہنا کہ جو قرآن ہمارے زمانہ تک چلا آیا ہے اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے اور یقین میں نہیں آتا کہ محمد صلعم نے اس کے ہمیشہ اسی تسلسل میں پڑھنے کے واسطے فرمایا ہو بعض امین کی اہتر ملاوٹ، زمانہ اور معانی کے لحاظ سے جا بجا ہے یعنی کسی جزء کا جو مدینے میں نازل ہوا بعض اوقات اس آیت سے پیشتر واقع ہونا جو بہت عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہوا کسی احکام کا ایسے احکام کے پیچھے ملحق ہونا جو ان کی تنسیخ یا ترمیم کرتا ہو وغیرہ اس امر کے یقین سے باز رکھتے ہیں۔

ولیم میور کی اس خیانت پر سرسید فرماتے ہیں: "ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اس طرز میں جس میں قرآن مجید ہے بالکل ٹھیک ہے اور بہ لحاظ معنی کے ایسے طرز سے اس میں ایسی منظوم ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ قرآن مجید کی عبارت ایسی معجزانہ مختصر ہے کہ حد نہیں

کے حالات باہمی کی جن کے معنی بادی النظر میں ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے ہیں کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہیں گو سمجھنے والی، سامعہ خراشی سے بری ہو کر بیانی طول کلام الحادث، نہایت خام اور مہمل جیسا کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معلوم ہوتی ہے۔"

سر سید نے اپنے اس جواب میں ایک طرف تو ایجاز و اختصار کے لحاظ سے اعجاز قرآن کی وضاحت کی ہے اور پھر اسی سیاق میں سر ولیم میور اور ان جیسے دوسرے حضرات جو تحقیق کا علم لیکر اپنا سفر طے کرنا چاہتے ہیں دعوت دی ہے کہ تدبر و تفکر اور تحقیق و تفتیش کے مرحلے سے گذرنے کے بعد ہی کسی امر کے سلسلے میں کوئی حتمی اور قطعی بات کہیں نیز یہ کہ جہالت، تعصب اور تنگ نظری حقیقت کی یافت سے دور رکھنے کی محرک ہوا کرتی ہے۔ ولیم میور کے مذکورہ بالا اعتراض پر ہی سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے گویا ہوتے ہیں۔

"اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی کی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ وہ خدائی کلام ہے اور بجنسہ وہی الفاظ لکھ لئے گئے ہیں۔ کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سے ان کو محذوف رکھتا ہے مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا۔ عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ ہی آیتوں کی شان نزول ان کے ذہن میں ہوتی ہے اس لئے ان کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے مگر مسلمانوں کو ایسا نہیں ہوتا۔"

لائف آف محمد میں ولیم میور نے یہ لکھنے کے بعد کہ "قرآن ہی چال چلن کا نافذ قانون تھا" پھر یہ بیان کرتے ہیں۔ "پھر وہ اپنی غرض اصلی کے واسطے مکتفی نہ ہوا اور اس نقص کی تلافی سنت یعنی پیغمبر کے احکام اور اعمال سے کی گئی" اسکے بعد تحریر کرتے ہیں کہ انھوں نے یعنی پیغمبر خدا نے کبھی اپنے آپ کو خطا سے مبرا نہیں قرار دیا بجز اس صورت کے کہ اس کی نسبت ہی اللہ عز و جل کی طرف سے ہو جاتی تھی مگر اس نئے عقیدے نے یہ بات تراش لی کہ پیغمبر صاحب کے ہر قول و فعل میں ایک الہی اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔

مذکورہ بالا اعتراض کئی شقوں پر مشتمل ہیں۔ اول یہ کہ ولیم میور نے حدیث کو اولاً غیر متعلق قرار دیا جس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں اس نے یہ بتلایا کہ معاشرے میں نافذ قانون کیا تھا وہاں حدیث نبوی اور سیرت رسول کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ حالانکہ حدیث نبوی قرآن مجید کی تفسیر بھی ہے اور عملی تعبیر بھی۔ قرآن کا منشا احادیث نبوی کے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ ولیم میور کی گندی ذہنیت اس فقرے سے بھی واضح ہے جس میں سنت کی طرف رجوع کرنے کو قرآنی نقص سے تعبیر کیا ہے۔

اعتراض کی دوسری شق یہ ہے کہ میور صاحب نے مسلمانوں کی طرف رسول اکرم ؐ سے متعلق ایک غلط عقیدے کا انتساب کیا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہر قول و فعل میں ایک الہی اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خالص دنیوی امور میں لوگوں کو بسا اوقات مشورے دیکر آپؐ یہ واضح نہ فرماتے کہ اللہ کے نبی ہونے کی حیثیت سے یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں اور نہ ہی کبھی دوسروں کے مشوروں پر عمل فرماتے۔ جنگ بدر کے سلسلے میں آپ نے مہاجرین و انصار دونوں سے مشورے لئے غزوہ خندق میں خندق کھودے جانے کے سلسلے میں آپؐ نے حضرت سلمانؓ فارسی کے مشورے کو مناسب سمجھا۔ یہ اور اسی طرح کی بہتیری شہادتیں ہیں جن کی روشنی میں سر ولیم میور کے غلط انتساب کی حقیقت واہو جاتی ہے۔

سر سید علیہ الرحمۃ ولیم میور کے اس اعتراض پر اپنی تصنیف میں فرماتے ہیں معاملات دین و دنیا میں رسول اکرمؐ کی قدر مہوسی کرنا خواہ امور دین سے متعلق ہوں یا امور دنیا سے یہ ایک الگ چیز ہے اور اس بات کا جھگڑا کہ پیغمبر خدا کا کونسا قول اور فعل از روئے وحی غیر قابل خطا تھا اور کون سے افعال صحابہ کے مشورے سے کئے گئے تھے دوسری چیز ہے۔ ولیم میور نے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے خواہ خود غلطی میں پڑکر ہماری نسبت ناانصافی سے یہ اعتقاد منسوب کردیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کے ہر قول و فعل میں ایک الہی اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ ہم مسلمان تمام قول و فعل میں اپنے پیغمبر کو اسی ادب اور عظمت سے دیکھتے ہیں جیسے کہ نبی اولوالعزم کے اقوال و افعال ادب اور عظمت کے مستحق ہیں۔

امام زہری کو بدعت اول قرار دے کر عام علمائے استشراق نے بھی حدیث کی سند کو مردود قرار دیا ہے۔ سر ولیم میور بھی اس خیال کو فروغ دینے میں پیش پیش رہے ہیں کہ تحریری تدوین کا کام حضرت کی وفات کے

انتقال کے ایک لمبے عرصے کے بعد شروع ہوا۔ دی لائف آف محمدؐ میں اس نے اپنے معاندانہ اور متعصبانہ خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

IT IS NOT, INDEED, ASSERTED THAT SOME OF MOHAMMED'S SAYINGS MAY NOT HAVEBEEN NOTED DOWN IN WRITING DURIND HIS LIFE TIME, AND FROM THAT SOURCE COPIED AND PROPAGATED AFTERWARDS. BUT THE EVIDE-NCE IN FAVOUR OF ANY SUCH RECORD IS MAGGER, SUPICIOUS AND CONTRADICTORY.

[بلاشبہ یہ دعوی تو نہیں کیا جاسکتا کہ محمدؐ صلعم کے کچھ اقوال آپ کی حیات طیبہ کے دوران ضبط تحریر میں نہ آسکے تھے اور پھر بعد میں چیزیں اسی ماخذ سے نقل کی گئیں یا ان کی نشر و اشاعت ہوئی لیکن کسی ایسے دستاویزی ثبوت کی موافقت میں شہادت ناکافی، شک آمیز اور تردیدی ہے۔]

سچ تو یہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ اور صحابہ کرام کے مقدس دور سے ہی لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ سر ولیم میور نے بھی اپنی اس تصنیف میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ حضرت محمدؐ کے دعوی نبوت سے قبل مکہ میں فن تحریر رائج تھا اور مدینہ میں جاکر تو خود پیغمبر خدا نے اپنے مراسلات لکھوانے کے لئے کئی صحابہ مقرر کئے تھے جو لوگ مدینہ میں گرفتار ہو کر آئے تھے انہیں اس شرط پر وعدۂ رہائی دیا گیا تھا کہ وہ بعض مدنی آدمیوں کو لکھنا سکھلادیں اور اگرچہ اہل مدینہ مکہ کے برابر تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن وہاں بھی بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو اسلام سے پہلے لکھنا جانتے تھے۔[1]

حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو ولیم میور فن تحریر کے رائج ہونے کا اعتراف کرتے ہیں لیکن دوسری طرف حضور اکرمؐ کے اقوال و افعال کے ضبط تحریر میں آنے کو مستبعد قرار دیتے ہیں۔ مستشرقین کا یہ موثر حربہ ہے کہ بہت سے حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی ایسی بات کہی جائے جو معروف یا قابل قبول نہ ہو۔ ولیم میور اس فن میں اور بھی حذاقت و مہارت رکھتے ہیں۔ اگر ولیم میور نے تعصب اور جانبداری ترک کر کے استشراقی ذہنیت سے دور رہ کر بعض احادیث کی تحریر و تدوین کے محرکات پر غور کیا ہوتا تو انہیں یہ کہنے میں مشکل پیش نہ آتی کہ حیات طیبہ اور اس کے بعد صحابہ کرام کے دور سے ہی یہ کام شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ پہلے لوگوں نے ذاتی معلومات فراہم کئے دوسرے دور میں پورے شہر کی معلومات یکجا کی گئیں اور تیسرے دور میں دنیائے اسلام کی معلومات بڑی شفقت کے ساتھ فراہم کی گئیں۔ امام بخاری اپنی رائے میں برحق ہیں کہ امام زہری کو تمام اسلامی شہروں اور مختلف ابواب کی روایات جمع کرنے کے لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل ہے۔

سر سید نے ولیم میور کی اس خیانت پر بھی گرفت کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ چار قسم کے اقوال آنحضرتؐ کے ایسے ہیں جن پر ہم کو غور کرنا لازمی ہے۔ اول جو ہمارے دین سے متعلق ہیں۔ دوم وہ معاملات جو پیغمبر خدا کے مخصوص حالات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ سوم ایسے اقوال جو تمام لوگوں کے حالات موثر ہیں اور چہارم وہ احکام جو سیاست ملکی اور انتظام ملکی سے متعلق ہیں۔ جہیں نبی کریمؐ کے اقوال و افعال سے جتنا تعلق ہوگا اسی کے مطابق ہم شیدایان رسول ہو سکتے ہیں اس کے بعد حیات طیبہ میں ہی احادیث کے لکھے جانے کی ضرورت پر لکھتے ہیں۔

جناب پیغمبر خدا کی حیات ہی میں اسلام کی سلطنت جزیرہ عرب میں وسیع ہو گئی تھی اور بے شمار لوگوں نے دین اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہر مسلمان کی جناب پیغمبر خدا تک رسائی محال تھی اس لئے جناب پیغمبر خدا کے اقوال و افعال ان مسلمانوں تک پہنچانا جو اقطاع دور دراز میں رہتے تھے لازم ہوا اور اسی وجہ سے پیغمبر خدا نے اس بات کو پسند کیا۔

سر سید کے ان چند مخصوص آرا و افکار سے قطع نظر جو قرآن کے تفسیری مباحث میں پیش کئے گئے ہیں کسی مفروضہ کے بغیر اگر سر سید کی اس تصنیف کا جائزہ لیا جائے تو تقریباً اس کے ہر ہر صفحہ پر عاشق رسول ہونے کی مرکزی حیثیت جھلکتی ہے۔ حب رسول کے جذبۂ صادق سے معمور ہو کر سر سید معاندین اسلام بالخصوص مستشرق سر ولیم میور کے خانہ ساز نظریات اور تراشیدہ الزامات کو دلائل کی روشنی میں بے حقیقت ثابت کرتے ہیں۔ اور سچ مصنف کی وضاحت میں عقل و فکر کا سرمایہ لٹا کر عاشق رسول اور مناظر اسلام ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں نیز اپنے طرز تحریر اور طریقۂ بحث سے جدید رجحانات اور علمی اسلوب کی ترویج و اشاعت کا علم بھی خود اپنے ہاتھوں میں لئے آگے بڑھتے ہیں۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۸۔ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۸۹ء)

عزیز النساء بیگم
والدہ محترمہ سرسید احمد خاں

حکیم محمد اسلم صدیقی*

عزیز النساء بیگم، دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد وزیر، بادشاہ اکبر شاہ کی سب سے بڑی صاحبزادی اور نواب مختار الدولہ خواجہ وحید الدین کی بہن تھیں۔ آپ کے شوہر میر متقی ایک آزاد منش انسان تھے۔ حضرت شاہ غلام علیؒ سے مرید ہونے کے بعد طبیعت میں اور بھی زیادہ دُنیا سے بے رغبتی اور بے تعلقی پیدا ہوگئی تھی، اس لیے اولاد کی تعلیم و تربیت کا انحصار زیادہ تر بلکہ بالکل ہی سرسید کی والدہ پر تھا۔ وہ قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ مگر اولاد کی تربیت کا ان میں خداداد ملکہ تھا۔ اس معاملہ میں ان کی قابلیت و استعداد و صلاحیت عام عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔

اس کے متعلق ایک واقعہ سرسید نے خود بیان فرمایا ہے کہ

"جس زمانہ میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی، میں نے ایک نوکر کو جو پُرانا اور بوڑھا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ والدہ کو خبر ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر آیا تو انھوں نے نہایت ناراض ہو کر کہا۔ "اس کو گھر سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا۔" چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور سڑک پر لاکر چھوڑ دیا۔ اسی وقت میری خالہ کے گھر سے جو بہت قریب تھا، دوسری ماما نکلی اور خالہ کے پاس لے گئی۔ انھوں نے کہا۔ "دیکھو۔ آپا جی تم سے بہت ناراض ہیں۔ میں تم کو کوٹھے پر ایک مکان میں چھپا دیتی ہوں۔ وہاں سے باہر نہ نکلنا ورنہ وہ ہم سے ناراض ہوجائیں گی۔" میں تین دن تک وہاں چھپا رہا۔ تیسرے دن خالہ صاحبہ مجھے والدہ کے پاس لے گئیں تاکہ قصور معاف کرائیں۔ تو انھوں نے کہا۔ "اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے گا تو میں بھی معاف کردوں گی۔" جب میں نے ڈیوڑھی میں جاکر نوکر کے آگے ہاتھ جوڑے تب قصور معاف ہوا۔"

عزیز النساء بیگم کی تربیت کا یہ انداز تھا کہ بیٹے کو جو سب سے زیادہ چہیتا تھا مگر اس قصور پر اس کو وہ سزا دی جو اس کے لیے سبق اور دوسروں کے لئے مثال اور عبرت بھی

---

* غازی پور لاج۔ سرسید نگر۔ علی گڑھ

عزیز النساء بیگم بڑی دوراندیش اور دانش مند تھیں۔ ان کی دوراندیشی اور دانش مندی کے متعلق سرسید فرماتے ہیں کہ۔

"جب (ان کے نانا) دبیر الدولہ نے دوسری بار بادشاہ کی وزارت سے استعفا دے دیا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنا معتمد اور ایک معقول رقم سفر خرچ کے لیے ان کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سارا کنبہ چاہتا تھا کہ وہ منظور کرلیں مگر ان کی بڑی لڑکی یعنی میری والدہ نے کہا۔ "خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ ہر طرح آپ آرام سے بسر کر سکتے ہیں۔ اور اس سے کچھ اور زیادہ ہو جائے تو بھی آپ کے آرام و آسائش میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عمل داری میں جانا اور اس سلطنت کے اختیارات لینے اور ہم سب کو انگریزی عمل داری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں تو ہرگز صلاح نہیں دیتی کہ اس ضعیفی کے زمانہ میں کہ آپ کی طبیعت بھی اکثر علیل رہتی ہے، آپ لاہور کا ارادہ کریں۔"
دبیر الدولہ کے دل پر ان کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ لاہور جانے سے انکار اور سفر خرچ واپس کر دیا اور پھر کبھی کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔"[۱۲]

عزیز النساء بیگم نے اس قدر مدلل اور موثر پیرایہ میں لاہور نہ جانے کا جو مشورہ اور صلاح دی وہ حد درجہ دانش مندی اور دوراندیشی پر مبنی تھی۔

سرسید کی والدہ بہت ہی صابر و شاکر، عبادت گذار اور ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی رہنے والی خاتون تھیں۔ سرسید نے ان کا ایک لائق تقلید و مثال واقعہ بیان کیا ہے کہ

"میرے بڑے بھائی (جو آگرہ میں منصف اور جوان العمر تھے) کے مرض الموت میں والدہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ ایک مہینہ تک یہی حال رہا۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔ اتنے میں صبح کی نماز کا وقت ہو گیا۔ انھوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور اشراق تک مصلے پر ہی بیٹھی رہیں۔ انھیں دنوں ایک رشتہ دار کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ تمام سامان شادی کا ہو چکا تھا۔ صرف پانچ دن عقد کو باقی رہے تھے۔ جب یہ حادثہ ہم پر گذرا تو ان لوگوں نے دستور کے موافق شادی ملتوی کرنی چاہی۔ میری والدہ نے جب یہ سنا تو اس واقعہ کے تیسرے دن ان کے گھر گئیں اور کہا کہ "میں شادی میں آئی ہوں۔ ماتم تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہوگا۔ جو خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ تم شادی کو ہرگز ملتوی مت کرو۔ جب کہ میں خود تمہارے گھر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں، تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"[۱۳]

سرسید کی والدہ کا یہ ایک مثالی کردار تھا اور دوسروں کے لیے درس عمل بھی کہ ایسے ہونہار اور جوان و برسر روزگار بیٹے کی وفات پر صبر و شکر کا انھوں نے مظاہرہ کیا اور دستور و رواج کے خلاف تین دن سے زیادہ سوگ

نہ ملتا یا جس کی ہدایت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمائی ہے۔

سرسید کی والدہ بہت مخیر تھیں وہ بہت زیادہ
انفاق و خیرات کیا کرتی تھیں اور معاشرتی معاملات میں
پوری دلچسپی لیا کرتی تھیں اور اس میں شریک ہوتی تھیں۔
اس بارے میں بھی سرسید نے ایک روداد بیان کی ہے کہ:

جو کچھ آمدنی ہوتی تھی اس میں سے پانچ
فیصدی کے حساب سے میری والدہ ہمیشہ
الگ رکھتی جاتی تھیں۔ اور اس سرمایہ کو
حسنِ انتظام کے ساتھ نیک کاموں میں صرف
کرتی تھیں۔ کئی نوجوان لڑکیوں کا ان کی
امداد سے نکاح ہوا۔ اکثر پردہ نشین عورتیں
جو معاش سے تنگ ہوتیں، ان کی پوشیدہ
خبرگیری کرتیں۔ غریب خاندانوں کی جوان
لڑکیاں جو بیوہ ہو جاتیں ان کو دوسرا نکاح
کرنے کی نصیحت کرتیں اور دوسرے نکاح
کو برا سمجھنے والوں سے نفرت کرتی تھیں غریب
رشتہ داروں کے گھر جاتیں اور خفیہ کسی حیلہ سے ان
کی امداد کرتیں۔ بعض رشتہ دار مردوں
نے ایسی عورتوں سے نکاح کر لیا تھا جن
سے ملنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہ ان
کے گھر برابر جاتیں۔ اور ان کی اولاد کے
ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔" ۵؎

یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضاجوئی اور رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی اتباع کے جذبے کے
تحت تھا۔ وہ معاشرہ میں رائج فرسودہ اور رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی اور واضح ہدایات کے خلاف جن
باتوں کو معیوب سمجھا جاتا تھا، اس کی پرواہ نہیں کرتی تھیں۔
نکاح بیوگان تو شرفاء ہی نہیں بلکہ علماء کے طبقہ میں بھی
معیوب اور ناپسندیدہ عمل سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں
شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ کے ذاتی عمل اور وعظ و تبلیغ کے
اثر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مردہ سنت دوبارہ
زندہ اور جاری ہوئی تھی۔ یقین کیا جاتا ہے کہ حضرت
شہیدؒ کی جدوجہد اور وعظ و تبلیغ ہی کا یہ اثر تھا کہ سرسید کی
والدہ اس پر عمل پیرا ہوتیں اور اس کی مبلغ بھی بن
گئیں۔ اس کے لیے وہ لوگوں کو تلقین و نصیحت کرتیں اور
اس پر آمادہ کرتیں اور ضرورت مندوں کی مالی اعانت کر کے
مشکل کو دور فرماتی تھیں۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھیں
کہ نکاح بیوگاں ایک بڑا اہم دینی اور معاشرتی معاملہ ہے
اور اس میں خاندانی دستور و رواج اور شرم و حیا کے علاوہ
سوسائٹی میں انگشت نمائی بھی مانع تھی۔ وہ ترکِ نکاح
بیوگان کے مفاسد اور اخلاقی خرابیوں اور برے اثرات
سے پوری طرح باخبر تھیں۔ اس دور میں نہ صرف دہلی بلکہ
معلوم حد تک پورے ملک میں وہ پہلی واحد خاتون ہیں جنھوں
نے اس معاشرتی اور دینی معاملہ میں عملاً حصہ لیا۔

عزیز النسا بیگم بڑی فیاض اور ایثار پیشہ خاتون
تھیں۔ اپنی ضرورت و حاجت کے آگے دوسرے کمزور اور
حاجت مندوں کی ضرورت کو مقدم اور ترجیح دیتی تھیں۔ اور
یہ وہ وصف ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں بڑی تعریف
کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

ترجمہ: "اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو
اگرچہ خود انھیں سخت بھوک ہو" یعنی ضرورت
اور حاجت (سورہ حشر۔ رکوع ۱)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کے متعلق یہ
آیت شریف نازل ہوئی تھی۔ عزیز النساء بیگم کے ایثار
کے سلسلہ میں سرسید نے ایک واقعہ بطور خاص پیش کیا
ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

"مسماۃ زینب ایک لاوارث بڑھیا تھی۔ اس

کی خبرگیری والدہ کرتی تھیں۔ دہلی میں ان کی
منصفی کے زمانہ میں اتفاق سے والدہ اور
وہ بڑھیا دونوں ایک ساتھ بیمار ہوگئیں۔
دونوں کو مرض بھی ایک ہی تشخیص ہوا۔ والدہ
کو کچھ افاقہ ہوا تو معالج طبیب نے ایک قیمتی
نسخہ کا معجون ان کے لیے تجویز کیا۔ وہ تیار
ہوا تو وہ بس اس قدر تھا کہ صرف ایک ہی
مریض کے لیے کافی ہوتا۔ والدہ نے اس
معجون کو خود نہیں استعمال کیا اور سوچا کہ
یہ قیمتی معجون زیبن کے لیے مفید اور ضروری
ہے لیکن اتنا قیمتی معجون کون بنوا کر اس کو
دے گا۔ چنانچہ وہ معجون زیبن کو برابر کھلاتی
رہیں۔ چند روز میں اس معجون سے زیبن کو
بڑا فائدہ ہوا اور والدہ بھی بغیر معجون کھائے
اچھی ہوگئیں۔ چند دن بعد والدہ سے کہا کہ
"معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا" یہ سن کر
وہ ہنسیں اور کہا "کیا بغیر دوا کے خدا صحت
نہیں دے سکتا" (خلاصہ، ۵۰۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے ایثار و قربانی کو پسند
فرمایا ہوگا اور بغیر معجون کھائے ان کو بھی اسی طرح صحت
عطا فرمائی جس طرح زیبن کو معجون کھانے پر عطا فرمائی تھی۔
اوپر جو ارشاد ربانی بیان کیا گیا ہے، اس سے آپ کے ایثار
کا یہ واقعہ کس قدر مطابقت رکھتا ہے۔

ان کی دور اندیشی کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔
سرسید فرماتے ہیں کہ:

"جب میں دہلی میں منصف تھا تو میری والدہ
کی یہ نصیحت تھی کہ "جہاں تم کو ہمیشہ جانا
ضروری ہے وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور
کبھی پیادہ جایا کرو، زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں۔
کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت
رکھو کہ ہمیشہ اس کو نباہ سکو۔" چنانچہ میں نے
جامع مسجد اور خانقاہ میں جانے کا یہی
طریقہ رکھا تھا کہ اکثر پیدل اور کبھی سواری پر
جاتا تھا۔" [۶]

ان کی یہ دور اندیشانہ نصیحت ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ
میں بالکل درست اور کارآمد ثابت ہوئی اور
سرسید کے کردار کے ایک خاص پہلو پر بھی اس سے روشنی
پڑتی ہے کہ انھوں نے اپنی ماں کی نصیحت پر کس خوش دلی
کے ساتھ بے چون و چرا عمل کیا۔

۱۸۳۸ء میں سرسید کے والد کا انتقال ہوا تو اس
وقت ان کی عمر ۲۱ یا ۲۲ برس کی تھی۔ چند سال پہلے ان
کی شادی ہو چکی تھی۔ قلعہ (دربار شاہی) سے ان کے والد
کو کئی جگہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ چونکہ ان کے والد اور دربار
کے دیوان راجہ سوہن لال میں بوجوہ اَن بَن تھی اور ان کی
زندگی ہی میں ان کی تنخواہ میں کاٹ چھانٹ ہونے لگی تھی۔
اب ان کے بعد قلعہ کی آمدنی سے صرف کچھ قدر قلیل تو
سرسید کی والدہ کے نام جاری رہا۔ باقی سب تنخواہیں بند
ہوگئیں اور چند ملکیت جو معافی کی تھیں وہ بھی بہ سبب
حین حیات ہونے کے ضبط ہوگئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت
میں اتنی قلیل آمدنی خاندان کی کفالت اور معاشی ضروریات
کے لیے بے حد ناکافی تھی۔ اس معاشی تنگی اور بدحالی کے
باوجود عزیز النساء بیگم نے بڑے عزم و حوصلہ اور ثابت قدمی
کے ساتھ ان شدائد و مصائب کو جھیلا۔ حالانکہ اس سے
پہلے ان کی زندگی بڑے آرام اور آسائش اور کشادگی کے
ساتھ بسر ہوئی تھی۔ اللہ کی دی ہوئی گھر میں ہر طرح کی
آسودگی اور فارغ البالی تھی۔ لیکن اس عسرت اور تنگ دستی
کے زمانہ میں بھی انھوں نے اہل حق کی مدارات اور حقوق
کی ادائیگی میں کمی نہیں کی۔ اسی کا یہ فیض تھا کہ سرسید نے

اپنی ماں کی تمام خوبیوں اور محاسن کو اپنایا اور اس کا بیش بہا ثمرہ پایا۔ وہ ماں کی تعلیم و تربیت سے زندۂ جاوید ہوگئے۔ اور ان کے کارناموں میں سب سے عظیم کارنامہ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔

آخر میں عزیز النساء بیگم کی یہ دردناک داستان بھی سُن لیجئے:

۱۸۵۷ء کی شورش میں سرکاری فوج نے ان کا مکان اور سب سامان لوٹ لیا۔ بھائی نواب مختار الدولہ اور بھتیجے سرکاری فوج کی گولیوں کا نشانہ بنے اور ان کا بھی سارا مال ومتاع اور گھر لُٹ گیا تھا۔ عزیز النساء بیگم بالکل بے آسرا اور لُٹی پٹی اپنے گھر سے نکل کر زینن نامی ایک بوڑھیا غریب کی کوٹھری میں پناہ گزیں ہوگئیں۔ یہ وہی بوڑھی اور غریب زینن تھیں جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں ہوچکا ہے کہ خیر النساء بیگم ان کی دستگیری فرماتی تھیں اور ان کے لیے بیماری میں جو قیمتی معجون تیار ہوئی تھی وہ خود نہ کھا کر اس کو کھلا دی تھی۔ اُسی زینن کی کوٹھری میں وہ پناہ گزیں ہوئیں۔ وہ خود فاقہ زدہ تھی۔ خیر النساء بیگم کو کہاں سے کھلاتی۔ نوبت فاقوں پر فاقے تک پہونچ گئی لیکن وہ صبر وشکر کے ساتھ اس کو جھیلتی رہیں۔ آٹھ دن نہایت تکلیف سے اس کوٹھری میں بسر کئے۔ اس عرصے میں سرسید بھی میرٹھ سے وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اس کو کھاتی رہیں۔ اس پر ستم یہ کہ دو دن سے پانی بھی ختم ہوچکا تھا۔ اور پیاس کی نہایت تکلیف اٹھائی۔ پھر بہ ہزار دشواری سرسید اپنی والدہ کو میرٹھ لائے۔ اور یہیں وہ ان مصائب و آلام سے خستہ ہوکر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ کیسے ناز و نعم کی پروردہ اور انجام اس قدر المناک۔ لیکن آخر وقت تک ہاتھ سے صبر وشکر اور عزم و استقامت کا دامن نہ چھوٹا۔

حواشی

۱ تا ۶ — حیات جاوید

> میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوگا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لیے کہتا ہوں۔ تم انہی پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔
>
> سرسید۔ لیکچر بہ مقام لدھیانہ ۲۳ر جنوری ۱۸۸۳ء
> لیکچروں کا مجموعہ ص۱۵۹

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۱۹۸۹ء)

سرسیّد : ایک عظیم شخصیت

شبانہ حفیظ*

سچے اور صحیح انسان کی پہچان ہے کہ وہ حق بات کے لئے اپنی جان کی بازی لگادے اور دنیا کی لعن طعن کی پرواہ نہ کرے اپنے کو اپنی قوم کی بھلائی اور بہبودی کے لئے وقف کردے۔ اللہ پر بھروسہ رکھے اور ہر کام کو نیک نیتی، خلوص اور لگن سے کرے۔ سرسید اسی قسم کے انسان تھے ان کی زندگی کے اوراق الٹئے ہر صفحہ پر ایسی ہی تصویریں ابھرتی نظر آئیں گی۔ سرسید جیسے دیدور ہزاروں سال کی تاریکی میں نور کی کرنیں بکھیرنے اور اجالے پھیلانے کے لئے آتے ہیں۔ اور چونکہ ایسے لوگ اپنی قوم کو بیدار کرنے اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی مخالفت بھی ہوتی ہے ان سے بدگمانی بھی ہوتی ہے اور ان کے خلاف تحریکیں بھی چلائی جاتی ہیں۔

سرسیّد کی پیدائش اور پرورش ایسے دنوں میں ہوئی جب مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ نزع کی اس کیفیت کو سرسید نے اپنے ہوش وحواس میں نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اس کے اسباب وعلل کو اچھی طرح سمجھا۔ پھر غدر اور اس کے اثرات نے مسلمانوں کو جن حالات سے دوچار کیا اور جس کسمپرسی میں مبتلا کیا وہ سرسیّد کے ذہن پر برابر تازیانے لگاتا رہتا تھا، سرسید ایک کھلے ذہن و دماغ کے مالک تھے۔ مذہبی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں پر ان کی نظر تھی۔ ایک مفکر، مدبر اور مصلح کی حیثیت سے انہوں نے اپنی قوم کی درماندگی کی وجوہ کو سمجھ لیا تھا اور اس کے علاج کے طریقوں کا بھی ان کو پورا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پوری مستعدی، استقلال اور جانفشانی سے اپنے کو مذہبی تعلیمی اور سماجی اصلاحوں کے لئے وقف کردیا۔

سرسیّد نے غدر کی تباہی اور مسلمانوں پر اس کے اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، ان کو احساس تھا کہ جو کل تک حاکم تھے آج محکوم ہو گئے ہیں جن کا سکّہ چلتا تھا اب وہ خود سکّوں کے محتاج ہیں۔ اگر کسی کے گھر میں آگ لگ جائے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ جو سامان بھی ممکن ہو بچالے یہی حال سرسید کا تھا ان کی کوشش یہی تھی کہ بچے کھچے سامان سے زندگی کو از سر نو استوار کیا جائے اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے اپنی قوم کی تعلیم کی طرف توجہ کی، ان کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ اگر مسلمان وہ تعلیم حاصل کریں جو موجودہ زمانہ میں ایک طرف ان کو علمی دنیا میں ممتاز کرسکے اور دوسری طرف دورِ جدید کے تقاضوں کو سمجھ سکیں تو وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے انگریزی زبان کو بنیادی حیثیت دیتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جب تک ہم انگریزی اور علوم جدیدہ میں پوری دسترس حاصل، نہ کریں گے ہمارا شمار پسماندہ قوموں ہی میں ہوتا رہے گا اور نہ ہم آگے بڑھ سکیں گے اور نہ اپنی حیثیت کو تسلیم کراسکیں گے۔

سرسید مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانا چاہتے تھے وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے ہیں، دوسری قومیں ان سے قریب ہو رہی ہیں اور آگے بڑھ رہی ہیں، مسلمان چونکہ حاکم رہ چکے ہیں اس لئے ان کو انگریزوں سے ایک طرح کی کدورت اور بے اعتباری

* ریسرچ اسکالر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہے۔ یہی [illegible] کرنے کے لئے سرسید نے بائبل کا ترجمہ کیا اور یہ دکھایا کہ عیسائیت اور اسلام بہت قریب ہیں اور جس طرح عیسائیت میں امن و آشتی مذہب کی [illegible] ہیں اسلام میں بھی انہیں اصولوں کو سب سے اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کرنے کے لیے اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ مرتب کیا جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ غدر کا ہنگامہ بہت سی غلط فہمیوں پر مبنی تھا اور جن کی زیادہ تر ذمہ داری انگریزوں پر ہی تھی۔ اس دور میں ایسی بات لکھنا سرسید کی غیر معمولی جرأت ہمت کی دلیل تھی۔ اسی زمانہ میں سرسید نے کئی ایسے مضامین بھی لکھے جن سے انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے میں مدد ملے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو انگریزی تعلیم اور سائنسی علوم کو سیکھنے کی ترغیب ہو۔ لیکن اسکا اثر مسلمانوں پر خاص طور سے مذہبی حلقوں میں ایسا ہوا کہ سرسید کی مخالفت شروع ہو گئی اور کہا جانے لگا کہ وہ انگریزوں سے مل گئے ہیں۔ مسلمانوں کو لامذہب اور بے عقیدہ بنانا چاہتے ہیں وہ خود کرسٹان ہو گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے فتوے بھی لگائے گئے۔ لیکن سرسید سمجھتے تھے کہ اس مخالفت کی وجہ محض ان چیزوں سے ناواقفیت ہے اور انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے اور زور لگانے لگے۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اسلام نے ہر قسم کے علم کو حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ اسلام اور سائنس میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیمات عقل اور سائنس کی روشنی میں زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھی جا سکتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور اس کے ذریعہ سے علوم جدیدہ کی ترویج کی کئی رسالے نکالے جن میں برابر ایسے مضامین لکھے جاتے تھے جن سے ان غلط فہمیوں کو دور کیا جاتا تھا کہ اسلام اور سائنس ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ سرسید اسی بات پر زور دیتے تھے کہ اسلام کو مضبوطی سے پکڑ کر جدید علوم اور سائنس سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے انہوں نے بہت سے ایسے مدرسے قائم کئے جن میں نئے علوم کی تعلیم کا انتظام تھا انہیں میں سے ایم۔ اے۔ او کالج بھی تھا جو ہماری یونیورسٹی کی شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ سرسید کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس کی نظیر کہیں اور مشکل سے ملے گی۔

سرسید پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں کی گئیں۔ ملحد و کافر بے دین ہونے کے طعنے دئے گئے، مگر انہوں نے کسی کی پرواہ نہ کی اپنے مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور تن من دھن سے مسلمانوں کی اصلاح کی فکر کرتے رہے۔ ایک مرتبہ مخالفت کرنے والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:-

"میں عرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کافر آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے۔ آپ کے لئے دولت سرا بنائے جن میں آپ آرام فرماتے ہیں۔ اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں اور آپ کے لئے مسجد بناتے ہیں جن میں آپ خدائے واحد و ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں جو بڑے چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کیا کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں پس آپ مجھکو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند بقدر کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔ اور اس کی وجہ سے اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو نہ ڈھا لیجیے کیا آپ مجھ ایک بدبخت نامہ سیاہ کی شفاعت اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو ڈبونا اور خراب و خستہ حالت میں ڈالنا چاہتے ہیں"

اگر اس وقت کے حالات کا غور سے مطالعہ کیا جائے کہ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے۔ جو حالات ان کی نظر سے گزرے اور جن حوصلہ شکن حالات پر انہوں نے کام کیا تو شاید کسی کو پھر نکتہ چینی کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

سرسید خود جب کبھی اپنی قوم کی طرف سے افسردہ ہوتے تو کہتے۔

"شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں۔"

وہ ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ انہوں نے غدر سے پہلے کے حالات بھی دیکھے تھے اور غدر کے بعد ناکامی کے حالات بھی۔ خطبات سرسید کے مرتب لکھتے ہیں

"۱۸۵۷ء کے غدر نے سرسید احمد خاں پر وہ اثر کیا جو بجلی گرنے کے واقعہ سے کے ساتھ کیا تھا"

آپ کے ایک ہمعصر لکھتے ہیں۔ "وہ عظیم قومیں جو گزشتہ چالیس سال

کے اندر رخاموشی سے ہندستان کے حالات میں تبدیلی لارہی تھیں ان میں سرسید بھی تھے۔ اور ان کا نام آنے والی نسلوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہوگا"

سرسید نے تعلیم کے سلسلے میں ایک بار یوں خطاب کیا

یاد رکھو! تعلیم و تربیت کی مثال کمہار کے آوے کی سی ہے کہ جب تک تمام کچے برتن بہ ترتیب ایک جگہ نہیں چنے جاتے اور باقاعدہ کمہار کے ہاتھ سے نہیں پکائے جاتے کبھی نہیں پکتے تم اگر چاہو کہ ایک ہانڈی کو آوے میں رکھ کر پکالو تو وہ ہرگز درستی سے نہیں پک سکتی۔ ایک تم میں سے کوئی شخص یہ سوچتا ہے کہ اپنی اولاد کی تعلیم اپنے اہتمام اور ہر ایک علم کے عالم کو نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں یا یہ کوئی خیال کرتا ہے کہ تم کو اپنی ہی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے تو وہ سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ ایسی غلطی خود اپنی اولاد کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے جب تک تمام شہر اس بدہوا سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں بچ نہیں سکتا۔

سرسیّد بنیادی طور پر ایک مخلص اور مذہبی انسان تھے۔ ان کے اس جذبہ نے ان کو قوم کی اصلاح و بہبودی کی طرف اکسایا تھا۔ کٹر مذہبی علماء نے اسلام کو ایک جامد اور دنیاوی معاملات سے بالکل الگ تھلگ مذہب بنا دیا تھا۔ جسکا مقصد محض یہ تھا کہ مذہب پر ان کی اجارہ داری باقی رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکل رہا تھا کہ لوگ بندش اور تکلیف کی زنجیروں میں جکڑتے جا رہے تھے اور نئے اور ترقی پذیر علوم کو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف لوٹ رہے تھے سرسیّد نے اپنا مشن بنایا کہ لوگوں کی اس بدگمانی کو دور کریں اور علوم جدیدہ کو مذہب کا حریف نہیں بلکہ اس کا موید ثابت کریں۔

سرسیّد نے اسلام کو ایک متحرک اور ترقی پسند تصویر پیش کیا جس میں بنیادی بات یہ تھی کہ اسلام سائنس اور عقل کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ شائستگی، ترقی، اجتہاد اور ہر میدان میں آگے بڑھنے کی تاکید کرتا ہے اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو ہر زمانہ میں اور ہر قسم کے حالات میں انسان کی نہ صرف مدد کرتا ہے۔ بلکہ ان کو آگے بڑھانے اور صف اول میں کھڑا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ سرسیّد کے خیالات اُن کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ تھے۔ وہ بڑے پکے اور کھرے مسلمان تھے۔ انہوں نے اسلام اور اس کے اصولوں کو اچھی طرح سے سمجھا اور پرکھا تھا اور اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب انسانیت، اخلاق اور روحانی تربیت کی تعلیم نہیں دے سکتا اور نہ زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ چل سکتا ہے۔ یہی یقین کامل تھا جس نے سرسیّد کو بے خوف خطر تمام مشکلات اور پریشانیوں کے سامنے سینہ سپر کر دیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات پر عمل انسان کو ہر قسم کی ترقی اور ہر طرح کا سکون اطمنان مہیا کر سکتا ہے۔ وہ قرآن و حدیث پر پوری طرح ایمان رکھتے تھے اور ان تمام احکامات کو ماننا ضروری قرار دیتے تھے۔ لیکن اس کے آگے جو باتیں انہوں نے کہی ہیں یا مذہبی امور اور قرآنی آیات کی جو تشریح کی ہے۔ وہ محض ان کی اپنی فہم و فراست کا نتیجہ ہیں۔ اور اس ماحول اور اس طرح کا ردعمل ہیں جو سرسیّد کو ہر اچھے کام سے روکنے اور بات پر بُرا بھلا کہنے میں کسی قسم کی رعائت نہیں کرتا تھا۔ ان کے بہت سے خیالات ایک وقتی جذبہ اور جوش کا نتیجہ تھے۔ لیکن ان سب میں جو قدر مشترک تھی وہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش اور تمنا۔ سرسیّد کو رسوا کرنے کے لئے جس کا جو جی چاہے کہے لیکن کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اس زمانے کے حالات اور تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات کو ضرور نظر کے سامنے رکھنا چاہیئے۔ فیصلہ کبھی یک طرفہ نہیں ہونا چاہیئے۔ سرسیّد نے جو کچھ کہا یا جو کچھ کیا اس کے پس منظر میں کیا چیزیں تھیں۔ اس پر ضرور توجہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ایمانداری سے جائزہ لیں اور دیانت داری کا دامن پکڑے رہیں۔ تو ان کی تمام باتیں ہمیں حق بہ جانب نظر آئیں گی۔ ان کی قوم پروری، دردمندی، دلسوزی، وطن پرستی اور اپنوں کے لئے کچھ کر گذرنے کا جذبہ ان کے مرتبہ کو بلند کرے گا ان کے خیالات یا اندازِ فکر سے ممکن ہے کچھ لوگوں کو اختلاف ہو لیکن ان کے مشن سے شاید ہی کوئی متفق نہ ہو۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت علم و فن کا لگایا ہوا ان کا پودا ہے جو ہر اہر ترقی شاہ راہوں پر گامزن ہے۔ اور ان گنت لوگوں کو ان کی منزلوں سے ہمکنار کر رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹی کے معمار اول کو خراج عقیدت پیش کریں اور ان کی یاد میں محبت و خلوص کے پھول نچھاور کریں۔

**

ضرورت اساتذہ

جامعۃ الہدایۃ رام گڑھ روڈ جے پور میں مندرجہ ذیل آسامیوں کی ضرورت ہے، خواہش مند حضرات اپنی درخواستیں مندرجہ ذیل فارم پر اسناد کی مصدقہ نقول کے ساتھ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۹ء تک دستی دفتر جامعہ میں جمع کردیں یا پھر ڈاک سے اس طرح ارسال کریں کہ وہ متعینہ تاریخ تک دفتر جامعہ میں پہونچ جائیں۔ تاخیر سے آنے والی اور نامکمل درخواستوں پر کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ انتخاب انٹرویو اور ٹیسٹ کی بنیاد پر ہوگا۔ انٹرویو کے لیے آنے والے حضرات کو کوئی سفر خرچ وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔

۱۔ استاد انگریزی و ہندی

۲ر آسامی۔ ۱۳۸۰-۲۶۰۰ کے اسکیل آف پے میں بروقت ابتدائی تقرر۔ کل مجموعی مشاعرہ ۱۱۷۰/- ماہانہ ہوگا۔

مطلوبہ قابلیت:۔ ایم، اے (انگریزی) بی، ایڈ۔ اردو کم ازکم انٹر تک پڑھی ہو یا اس کے مساوی صلاحیت ہو۔ تدریسی تجربہ ۳ر سال کا ہو۔

۲۔ لائبریری کلرک

ایک آسامی، ۹۴۰-۱۴۲۵ کے اسکیل آف پے میں بروقت ابتدائی تقرر مجموعی تنخواہ ۸۲۸/- ہوگی۔

مطلوبہ قابلیت: (۱) ہائر سیکنڈری اردو کے ساتھ (۲) لائبریری سائنس میں کسی تسلیم شدہ ادارہ سے ڈپلوما اور کم ازکم تین سال کا تجربہ

فارم درخواست:۔ نام امیدوار، ولدیت، تاریخ پیدائش ہندسوں اور الفاظ دونوں میں، مستقل پتہ، موجودہ پتہ برائے مراسلت، تفصیل قابلیت، نام امتحان، سال ڈویزن اور ادارہ جس سے امتحان پاس کیا۔ مضامین جن میں امتحان پاس کیا۔ تجربہ کی تفصیل کہاں کس پوسٹ پر اور کتنی مدت کام کیا۔ دیگر امور جن کی وضاحت ضروری اور مفید ہو۔ دستخط امیدوار مع تاریخ

نوٹ: (۱) انٹرویو کے وقت تمام اصل اسناد لانا ساتھ لائیں (۲) تقرر کلیتاً عارضی ہوگا بہتر کارکردگی پر مستقل کیا جاسکے گا۔

امیر جامعۃ الہدایۃ پوسٹ بکس ۲، جے پور ۳۰۲۰۰۱ راجستھان

AMEER, JAMEA-TUL-HIDAYA
POST BOX NO.2, JAIPUR-302001(RAJ.)

بہار نو بے بی ٹانک
دماغین
شربت
نزلہ
کھانسی
زکام. نزلہ کے لئے
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
خون صفا
داد وغیرہ کی
دوا
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Tahzibul Akhlaq October 1989 Regd. No. L/ALG 343/88 Ph. : 4827

Litho Colour Printers, Achal Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone : 4185

نومبر ۸۹ء

ایک دور وہ تھا
جب مسلمان عالمی تجارت کے امام تھے اور ایک مسلمان عالم
ابوالقاسم مسلمہ بن مجریطی (متوفی ۱۰۰۷ء) نے تجارتی حساب
پر ایک گرانقدر کتاب " المعاملات " لکھی تھی جس کا کئی
یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا

ایک دور یہ ہے
جب مسلمان عالمی تجارت کے میدان
میں نہیں اور تجارتی امور میں ان کی تخلیقی
صلاحیتوں کے سوتے بند ہیں۔

کہاں کل کی بلندی کہاں آج کا زوال

دفتر تہذیب الاخلاق
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

4.50

مجلس ادارت

اغراض و مقاصد

۱. جہل رجعت پسندی اور خود سری کے خلاف جدوجہد، ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت

۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت

۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش

۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔

۶. سائنسی علوم، فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷. علوم، فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف

مقالہ نگاروں کیلیے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو کٹے پھٹے اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے باہر سے آنے والے صرف انہیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا ہوا ٹکٹ لگا لفافہ بھی ہو۔

* *

* *

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہر حال ان سے متفق ہو]

اداریہ

ہم میں سے تقریباً ہر شخص "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" کہہ کر نہ صرف اپنی "بیدار مغزی" کا اظہار کرتا ہے بلکہ وقت کے انمول ہونے کا بھی اقرار کرتا ہے لیکن اس کے باوجود من حیث القوم ہندوستانی جس قدر اپنا وقت برباد کرتے ہیں، اتنا وقت شاید ہی دنیا کی کوئی متمدن کا تو ذکر ہی کیا نیم متمدن قوم بھی برباد کرتی ہو۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں متعدد مذہبوں کے ماننے والے آباد ہیں اس لیے ان تمام مذہبوں کی مناسبت سے جو جائز تعطیلات ملک میں ہوتی ہیں ان کی تعداد دوسرے ملکوں کی تعطیلات سے ویسے بھی زیادہ ہے اس پر مستزاد تقریباً ہر بڑے "آدمی" کے مرنے پر اس کی برسی کے موقع پر تعطیل کرنے کی بھی روایت ہمارے تمدن کا ایک حصہ بن چکی ہے جس کو منسوخ کرنے کی ہمت بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہے اسی لیے اس طرح کی تعطیلات پر کڑھتے تو بہت سے لوگ ہیں مگر اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ کام کرنے کے دنوں کی تعداد گھٹتی اور تعطیلوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

ہمارے معاشرے کے وہ ادارے جو مختلف کاموں کے لیے وقف ہیں اور جن کے کام کرنے کے اوقات مقرر ہیں ان میں بھی ہم جی کھول کر وقت ضایع کرنے کے عادی ہیں، اپنی متعین جگہ پر جم کر نہ بیٹھنا، مقررہ کام کو مقررہ وقت میں نہ کرنا، جس کام کو نہ کرنے کا ارادہ ہو اس پر اینڈے بینڈے اعتراضات کر کے ایک دن کے کام کو دس دن کے لیے ٹال دینا، ہماری قومی خصوصیات بن چکے ہیں جن کے مضر نتائج کا شکار تو ہم میں سے تقریباً ہر شخص ہوتا ہے۔ مگر ہم میں سے شاید ہی چند لوگ ایسے ہوں جن کو اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہو اور اس لعنت کو اپنے معاشرے سے ختم کرنے کے ذرایع پر غور و فکر کرتے ہوں۔ سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں میں کام کرنے کا یہ انداز روز کا معمول بن چکا ہے اور اب یہی ہمارے یہاں کام کرنے کا معیار ٹھہرا ہے۔

خیر سے ہم "مردہ پرست" بھی واقع ہوئے ہیں۔ اس صداقت کا احساس ہم کو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی "بڑا آدمی" کہلانے والا شخص اس دنیا سے منہ موڑتا ہے۔ اِدھر اس کی آنکھیں بند ہوئیں اُدھر قومی یا صوبائی یا مقامی سطح پر کام کاج ٹھپ ہوا۔ مرنے والے کا فانی جسم سجا بنا کر دیدار عام کے لیے رکھ دیا گیا۔ بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں مرد اپنا اپنا کام کاج چھوڑ کر "بھاؤ بھینی شردھانجلی ارپت" کرنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔ ایک دن یوں گزر گیا تو دوسرے دن مرنے والے کو اس کی آخری منزل پہنچانے کے لیے پھر سارا کام کاج ٹھپ ہوا اور انسانوں کا ایک ہجوم ہر مرنے والے کے لیے ایک ہی نعرہ لگاتا یعنی "جب تک سورج چاند رہے گا فلانے تیرا نام رہے گا" چیختا چلاتا مردے کو اس کی آخری منزل تک پہنچا کر پھر اس کو اس طرح بھول جاتا ہے جیسے کہ اس نام کا کوئی شخص کبھی اس کے درمیان رہا ہی نہ ہو۔ "مردہ پرستی" کے اس رجحان سے جس چیز کو سب سے زیادہ نقصان ہوتا ہے وہ وقت اور صرف وقت ہے مگر اس نسیان کا احساس نہ این جناب کو ہے نہ آں جناب کو نہ ہمارے جیسے عوام کالانعام کو۔

اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو شاید ہمارا وقت پھر بھی کچھ نہ کچھ بچ جاتا اور ہم کچھ نہ کچھ تو تعمیری کام کر ہی لیتے مگر ہمارے معاشرے کا ایک اور روگ وقت پر اکثر و بیشتر دھاوے مارتا رہتا ہے۔ اس روگ کا نام ہڑتال یا اسٹرائک ہے۔ ہڑتال یا اسٹرائک کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ حزب مخالف کی نظروں میں نہ صرف جائز بلکہ ایک حد تک واجب "عمل" ہے لیکن حزب اقتدار اسے "حرام مطلق"

قرار دیتی ہے۔ لیکن دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ جب حزب مخالف کو اقتدار مل جاتا ہے اور حزب اقتدار خود حزب اختلاف کا "فریضہ" انجام دیتی ہے تو بلا کسی فلسفیانہ اور اخلاقی تاویل و توجیہ کے "واجب" عمل "حرام مطلق" اور "حرام مطلق" "واجب" بن جاتا ہے۔ یہ گورکھ دھندا آزادی کے بعد سے ہمارے ملک میں چل رہا ہے۔ اگر معروضی انداز سے اس بات کا مطالعہ کیا جائے کہ اس گورکھ دھندے کے ہاتھوں ہم نے کتنا وقت ضایع کیا ہے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ جو وقت ہڑتالوں، تالا اور نعرہ بازیوں کے ہاتھوں ضایع ہوا ہے اُس کا عرصہ اتنا طویل ہے کہ اس میں کم از کم دس بھاکڑہ ڈیم ملک میں تعمیر کر کے ملک کو پیش رفت کی راہوں پر گامزن کیا جا سکتا تھا۔

متمدن زندگی نے جہاں بہت سے روگ پال رکھے ہیں اُن میں سے ایک کھیلوں سے بڑھی ہوئی دلچسپی کا مظاہرہ ہے۔ ابھی ڈیڑھ دو سو سال پہلے کے "متمدن" ہندوستانی افراد اور "پیٹ بھرا اشرافیہ" طبقہ مرغ بازی، بٹیر بازی، چوسر، چوگان، شطرنج کا روگ اپنی زندگی کے ساتھ لگائے ہوئے تھے جس کے ہاتھوں اس کی عزت، وقار، بیدار مغزی، شجاعت حتیٰ کہ اقتدار و حکومت تک کا خاتمہ ہو گیا مگر ہم ہندوستانیوں کو اس متعدی مرض سے نجات نہ مل سکی۔ اب آزادی کے بعد اس روگ نے ایک نیا روپ بہروپ اختیار کر کے ہماری اجتماعی زندگی کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا ہے۔ اب بٹیر بازی کی جگہ کرکٹ بازی" اور "شطرنج" کی جگہ "ہاکی" اور "فٹ بال" میچوں نے لے لی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی ان میچوں کا "موسم" آتا ہے، محنت کش طبقے کے علاوہ ہر طبقے کا معمول نہ صرف بگڑ جاتا ہے بلکہ اس سے وقت کا جو بے اندازہ نقصان ہوتا ہے وہ انتہائی پریشان کن ہے۔

سائنس کی ایجادات اور انکشافات کا اصل مقصد انسانی زندگی کو آسائش کے ساتھ ساتھ نفع پہنچانا بھی تھا مگر ہمارے غلط ہاتھوں میں پڑ کر سائنس کے ان "تحفوں" کی بھی "عاقبت خراب" ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمارے دور میں اس کے جیتے جاگتے نمونے ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہیں۔ اِدھر دنیا کے کسی کونے میں کوئی تفریحی بالخصوص کھیل کود کا اہتمام ہوا اُدھر ہندوستانی ریڈیو اور ٹیلی ویژن چوبیس گھنٹے کام کرنے لگے۔ اس میں ان اداروں کی جو افرادی قوت ضایع ہوتی ہے وہ تو ہوتی ہی ہے پوری قوم کی قوم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ جو لوگ کرکٹ، ہاکی، ٹینس، فٹ بال اور والی بال کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے وہ بھی ہر وقت ٹرانزسٹر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے چپکے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ دفتروں میں کام کاج چھوڑ کر ٹرانزسٹر کان سے لگائے نہ جانے کتنے "بابو لوگ" ان کھیلوں سے اپنی "دلچسپی" کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ "بڑے گھروں" کے لوگ ٹی۔وی کے ارد گرد ڈیرا جمائے رہتے ہیں۔ وہ طبقہ جو عوام کے نام سے موسوم ہے وہ اپنی "دلچسپی" کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ وہ "قدرت کے بلاوے" پر کسی میدان میں بیٹھا ہوا ہے، فطری حاجت بھی پوری کر رہا ہے اور پاس ہی ٹرانزسٹر اس کو رننگ کمنٹری بھی سنا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی ستم ظریف کہہ اُٹھے کہ یہ وقت ضایع کرنا کہاں ہوا، وہ غریب تو ایک وقت میں دو دو "کام" کر رہا ہے ہنسنے ہنسانے کے لیے تو یہ تبصرہ درست ہے لیکن کیا واقعی کمنٹری سننا بھی کوئی کام ہے؟ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی تفریح سے دست بردار ہو جائے۔ تفریح انسانی زندگی کی ایک ضرورت اور ہر انسان کا "حق" ہے مگر ہر حق کو حاصل کرنے کے لیے کچھ "فرض" بھی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ ہم "حق" کا نعرہ تو ہر وقت لگاتے رہتے ہیں مگر "فرض" بے چارے کا نام لیوا کوئی نہیں۔ کیا یہ صورت حال ملک معاشرے اور ملت کی پیش رفت کی ضامن ہو سکتی ہے؟

کبیر احمد جائسی

سولزیشن یا تہذیب

سرسید احمد خاںؒ

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن کیا چیز ہے اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے قانون قدرت میں پایا جاتا ہے۔ اس امر کے تصفیے کے لیے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے تو وحشیوں میں، شہریوں میں، سب میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں الا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی چیز کو بُرا اور اس کی طبیعت اس طرف مایل ہے کہ اس بُری چیز کی حالت کو ایسے حالت سے تبدیل کرے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اسی تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطری ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے موافق اصل یہی ہے کہ اچھا اور بُرا ٹھہرے۔ اور بُرے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی و خُلقی، ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے، دوسری قوم اسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے۔ اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے جبکہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں، ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں۔ ان کی معلومات اور ان کے خیالات، ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لیے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے مگر جب کہ مختلف گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں تو ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور اسی سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

ملکی حالتیں، جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں نہ فکر اور خیال اور دماغ سے ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اس سے تعلق ہے جس کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرتا ہے اور جس بات سے خواہش تبادلہ کی تحریک

میں آتی ہے اور تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولزیشن کہلاتا ہے۔ پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور بُرے کی جگہ میں اور لفظ کا استعمال کروں گا یعنی پسند اور ناپسند۔ انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع معنوں میں استعمل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں جیسے کہ مزا یا مذاق مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ ان سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے۔ اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ "پسند" کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر اور علم طبعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانے کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے، اخلاقی ہو یا مادّی، یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر وجواہر یاقوت والماس سے نہایت نفیس نفیس خوب صورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے آسائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آسائش میں سونے چاندی، مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوب صورت اور رنگین پروں کو تیلیوں سے چھلے ہوئے ستھری پوست اور زمرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے گھونسے درختوں پر باندھے ہوئے، ناندہ زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں، تمدن کے قاعدے عیش وعشرت کی مجلسیں، خاطر ومدارات کے کام اور اخلاق و محبت کی علامتیں دونوں جگہ پائی جاتی ہیں۔ علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں بلکہ بعض چیزیں ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے، ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی وخوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت، اس کا گھٹاؤ اور اس کا بڑھاؤ، اس کا ٹھہراؤ اور اُس کی اُپج، ہاتھوں کا بھاؤ اور پیر کی دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لے اور تال، راگ اور راگنی کو نہیں جانتے مگر دل کی لہر ان کی لے اور دل کی پھڑک ان کا تال ہے۔ ان کا غول باندھ کر کھڑا ہونا، طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا، دل کی بےتابی سے جھکنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو نزاکت اور فن خنیاگری سے خالی ہو مگر قدرتی جذبوں کا روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے۔ پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح ان کا تعلق عقلی اور مادّی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں۔ جس چیز میں کہ ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یعنی ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے کی طرف تحریک ہو سکتی ہے۔ اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔ پس سولزیشن

یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی
کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو
ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلے میں لانا۔ اخلاق اور معاملات
اور معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی
خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے
برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے۔ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور
اصلی تمکین اور حقیقی وقار، خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت
یہی پچھلی ایک بات ہے۔ جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں
تمیز ہوتی ہے۔

اس تہذیب کے حاصل کرنے کے بقول مسٹر ایچ
ٹی۔ بکل صاحب چار اصول ہیں:

اول: جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں اور جن کا سبب
ہم کو معلوم نہیں ہوتا، ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت
کرنا اور ان کے علوم کو پھیلانا۔ پس جس قدر کامیابی اس
میں ہوگی اسی قدر انسانوں کی ترقی ہوگی۔"

دوم: "اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہیے۔
جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے اور بعد کو
تحقیقات سے اس کی اعانت ہوتی ہے۔"

سوم: "جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں وہ عقلی باتوں
کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر
کم۔ مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقلی باتوں کے زیادہ مستقل
ہیں اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔"

چہارم: اس تحریک کا بڑا دشمن جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت
دشمن ہے یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی
ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو تب تک انسان کے
گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلا دے کہ
ان کو کیا کرنا چاہیے اور مذہب یہ سکھلا دے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیے۔"

پچھلی بات میں مسٹر بکل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے۔ اس میں کچھ
شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ گورنمنٹ ہم کو بتا دے کہ ہم کو کیا کیا کرنا چاہیے
انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے اور جس قدر
کہ ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا میں اور ٹرکی اور ایجپٹ میں بھی
ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے، اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے اور
ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد
کیا ہے اور یہی خیال ہے جو ہندوستان کی رعایا کو عموماً اور
مسلمانوں کو خصوصاً گورنمنٹ سے ناراض رکھتا ہے۔ پس جب
تک یہ خیال نہ جاوے گا اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں
کہ ہم کو اپنے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت ہندوستان کے
مسلمانوں میں نہ دولت ہوگی نہ حشمت۔ نہ عزت ہوگی نہ منزلت۔
اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی۔ مگر دوسرا جملہ جو
مذہب سے متعلق ہے وہ کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط
یعنی مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے اور اگر سچے مذہب
میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائل اجتہادیہ اور
عقائد قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی
احکام مذہبی میں اور ان میں کچھ تفرقہ و تمیز نہ رہے جیسے کہ مذہب
اسلام کی موجودہ حالت ہے اور جو تقلید کی تاریکی میں آنکھوں
سے بالکل چھپ گیا ہے تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب
کا مثل مذہب غلط کے مانع قوی ہے۔ الا کہ سچا مذہب جیسا
کہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے وہ کبھی حارج ترقی انسان نہیں ہو سکتا
کیوں کہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب و شائستگی کے
کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

[سلامتی اس شخص پر جس نے سیدھے راستے
کی پیروی کی]۔

یہ ہندوستانی مسلمان

سید حامد*

زوال کے بھنور میں پھنس گئے۔ ان میں سے جو پڑھ لکھ جاتے ہیں انھیں بڑا مزا آتا ہے انھیں الزام دینے میں، ان میں ہر طرح کے کیڑے ڈالنے میں بلکہ انھیں اس نظر سے دیکھتے ہیں گویا کیڑے مکوڑے ہیں۔ مسلمانوں ہی سے جو غیرت کش، دانش ور اٹھتے ہیں اپنے بھائیوں کو ساری آفات ارضی وسماوی کے لیے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اس عمل میں انھیں بہت لذت آتی ہے، کہ اس طرح ان کی اور خود ہم عصروں کی نگاہ خود اپنی غفلت اور مجرمانہ کنارہ کشی کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ بعض لوگ مسلمانوں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی اصلاح کی نیت سے بھی کرتے ہیں۔ لیکن نیت چاہے استحصال کی ہو، چاہے خود غرضی اور خود اپنی پردہ پوشی، چاہے مقصد برائیوں کو دور کرنا ہو، نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا اعتماد گھائل ہوتا ہے اور ان کے اہلِ وطن انھیں گہری تحقیر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ مسلمان اہلِ علم اہلِ ثروت اور اہلِ دانش کی یہ حرکت اس اعتبار سے مذموم ہے کہ وہ ساحل پر کھڑے ہو کر ان لوگوں پر استہزا کر رہے ہیں جن پر موجوں کی ہر طرف سے یورش ہو رہی ہے، اور گمان ہو رہا ہے کہ وہ اب ڈوبے، اب ڈوبے۔ سُبکسارانِ ساحل اس منظر کو طمانیت کے ساتھ دیکھتے ہیں اور ہمدردی کے طور پر کہتے ہیں کہ ان تیرہ بختوں نے موجوں سے لڑنے اور طوفان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا کیوں نہیں کی۔ کوئی ان سے پوچھے کہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے تو صرف یہی کیا کہ موجوں سے گھبرا کر کنارے پر پناہ لی۔ آپ نے پانی میں کود کر ڈوبتوں کو تیرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ آپ نے کبھی اپنے گریبان میں منھ ڈال کر یہ سوچا کہ عوام کی مؤثر اور دردمندانہ رہنمائی اہلِ علم و دانش کا فرض ہے۔ وہ گلہ بانی نہیں کریں گے تو ریوڑ بکھر جائے گا ہی۔

لیکن ان سطور کا خطاب دانشوروں سے نہیں ہے۔ ان کا روئے سخن تو ان غریب، پسماندہ اور جاہل مسلمانوں کی طرف ہے جن کی حالتِ زار کو دیکھ کر ہمارے آسودہ حال اہلِ دانش حظ اندوز ہوتے ہیں۔

تو سنئے؛ ہندوستانی مسلمانوں میں یعنی ان کے

---

* سابق وائس چانسلر اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ۔ ہمدرد نگر دہلی

عوام میں صدیوں کی لائی ہوئی کمزوریوں کے باوجود (جس کے لیے ان کی موجودہ نسل ذمہ دار نہیں ہے) بہت سی خوبیاں ہیں، اور بعض خوبیاں ایسی بھی ہیں جنھیں نئی دنیا کمزوری سمجھتی ہے۔ اس قدیم اور رنگا رنگ ملک میں کوئی فرقہ یا کوئی جماعت ایسی نہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کی طرح فراخ دل ہو۔ ہر اچھے کام کی دعوت پر ان غریب مسلمانوں کا ہاتھ جس طرح کھل جاتا ہے، اس کی مثالیں آپ کو اور کہیں نہ ملیں گی۔ خود غریب ہونے کے باوجود وہ محتاجوں کی مدد دل کھول کر کرتے ہیں۔ ان سے ملّی کاموں کے لیے چندے کی اپیل کیجیے، اپنی بساط سے کہیں بڑھ کر، سکڑے ہوئے پیٹ کو اور کاٹ کر چندہ دیں گے۔ حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اُن کی طرح اُن کے چندہ مانگنے والے بھائیوں اور رہنماؤں کا حساب کمزور ہے اور اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ ذاتی اور ملّی اخراجات کس مرحلہ پر شیر وشکر ہو جائیں۔ اور بعض لوگ انھیں دھوکہ دے کر بھی چندہ لے گئے ہیں۔ ایک سوراخ سے وہ کئی بار ڈسے گئے ہیں لیکن اپنی گاڑھی کمائی کو طالع آزماؤں کی نذر کرنے میں وہ کبھی ہچکچاتے نہیں۔ اللہ اللہ کیا فراخ دلی ہے، کیا سادہ لوحی ہے کیا اعتبار ہے۔

ان کا ایمان ہے کہ رزق دینے والا اللہ ہے۔ اس لئے وہ اسے سینت کر رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ اسے خود پر اور اپنے بھائیوں پر بلا دریغ خرچ کرتے ہیں۔ آئندہ کے لیے بچا کر رکھنا انھوں نے سیکھا ہی نہیں کہ یہ بات ان کی افتاد طبع اور طرز فکر کے خلاف ہے۔ ان کے توکّل کا مرکز دل ہے، نہ کہ زبان۔ ماننا پڑے گا کہ موجودہ پیچیدہ دنیا کے لئے جہاں ارتقا کا انحصار منصوبہ بندی اور بجٹ پر ہے اور جہاں مضبوط اور ہمدرد مشترک خاندان حوادث کے لیے سپر کا کام اب نہیں کر پاتا، یہ افتاد طبع ناموزوں ہے۔ اس سے آپ یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ عام ہندوستانی مسلمان جدید پیچیدہ اور حسابی دنیا کے طرز فکر سے ہم آہنگ نہیں۔ لیکن بہ حیثیت انسان کے وہ ان لوگوں سے جو سدا تقسیم پر ضرب اور جوڑ کو ترجیح دیتے چلے آئے ہیں، یقیناً بہتر ہیں۔ عام ہندوستانی مسلمان کا انداز توکل، بے حسابی اور بے نیازی کا ہے۔ وہ اپنی قلیل آمدنی میں اپنے بھائیوں کے حق کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہے۔

وہ آپ کی پذیرائی کرتا ہے تو کلیجہ نکال کر رکھ دیتا ہے۔ آپ کی خدمت میں بچھ جاتا ہے۔

اس کی فراخ دلی جب وفا شعاری کے ساتھ مل جاتی ہے تو نئے گل کھلاتی ہے۔ مسلمانوں کو امتیاز اور ناموری فی زمانہ نصیب ہی کب ہوتی ہے لیکن اگر ان میں سے کسی کو میسّر ہو جائے تو ان غریبوں کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے، ان کا سینہ فخر سے پھیل جاتا ہے اور ان کی زبان اپنے اس خوش قسمت بھائی کی تعریف کرتے نہیں تھکتی۔ ایسی وفا شعار فراخ دلی اور کہاں دیکھنے کو ملے گی؟

غریب مسلمان جانتے ہیں کہ خوش حال اور پڑھا لکھا اور اہل ثروت مسلمان خود کو ان سے اوّلین فرصت میں کاٹ لیتا ہے۔ فارغ البالی کی بیماری میں مبتلا ہوا تو اُن کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھتا۔ لیکن اس کی نسبت سے اُن کی خوش عقیدگی اور خیر سگالی میں کبھی کوئی کمی نہیں آتی۔

اور یہ غریب مسلمان مصیبتوں اور تکلیفوں کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو خوب پھیلاتے ہیں۔ تیوہاروں میں ان کے بچّوں کو دیکھئے۔ زرق برق لباس میں دولہا بنے ہوئے، معصوم خوشیوں سے کلیوں کی طرح کھلے ہوئے۔ یہ منظر ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کے دِل شادماں اور آنکھیں پُرنم ہو جائیں۔ زندگی سارے تکلفات اور آلائشوں اور بندشوں سے بَری، سادہ دلکش،

ولولہ انگیز زندگی ۔

ان کے بچوں کو قرآن پڑھتے ہوئے دیکھئے ۔ جو کچھ پڑھ رہے ہیں، اس کا مطلب وہ نہیں سمجھتے لیکن پاکیزہ عقیدت کے ساتھ جھوم رہے ہیں۔ معترض کہتا ہے کہ ایسے پڑھنے سے کیا فائدہ کہ عبارت کا مطلب ہی سمجھ میں نہ آئے تسلیم کہ مفہوم جاننا چاہیے لیکن کچی عمر میں بغیر سمجھے جس انداز سے یہ پیارے بچے اور بچیاں اپنا سر ڈھانکے ہوئے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ قرآن پاک کو پڑھتے ہیں اُس کی دل انگیز سادگی پر بڑے بڑے مفسرین قرآن کی موشگافیاں قربان۔

رمضان شریف میں انھیں دیکھئے۔ گرمی اپنے شباب پر ہے ۔ خوش حال لوگ روزہ رکھتے ہیں تو ایرکنڈیشنڈ اور کولر کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ بعض لوگ روزہ رکھنے کے لئے چھٹی لے لیتے ہیں۔ اور یہ غریب مسلمان ہیں کہ دھوپ اور لو میں محنت کر رہے ہیں، ٹھیلا چلا رہے ہیں، بوجھ ڈھو رہے ہیں۔ سر سے پاؤں تک پسینہ بہ رہا ہے۔ خالی پیٹ میں ہر قدم لو لگنے کا امکان ہے لیکن یہ اللہ کے بندے صبر اور شکر، عزم اور حوصلے کے ساتھ روزہ رکھ رہے ہیں اور مشقت بھی کئے جا رہے ہیں۔ افطار کی تیاریوں اور ضیا باریوں کو دیکھئے۔ عجیب سماں ہے، نرالی چہل پہل ہے۔ ہر بُن مو اور ہر شگوفۂ زبان سے اس خدا کا شکر ادا کیا جا رہا ہے جس نے انھیں اپنی راہ میں محنت کرنے اور تکلیف اٹھانے کی توفیق دی اور جس نے روزہ کو ان پر آسان کیا اور جس نے انھیں نعمتوں: کھجور، کچالو، پھلکی، گھگنی اور ٹھنڈے شربت سے نوازا۔

یہ غریب ہندوستانی مسلمان ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھیں چمک اٹھیں اور دل بھر آئے ۔ بار بار یہ خیال آتا ہے کہ اُن کو اچھے رہنما مل جاتے تو یہ وطن عزیز کے لیے سرمایۂ افتخار بن جاتے اس کی کلاہ میں ٹانکنے کے لئے یہ وفا پیشہ جماعت آسمان سے تارے توڑ لاتی۔ اس کی ریاضت ہندوستان کے مقدر کو بدل دیتی۔ ان کی جمال آفریں انگلیاں، جو حسین صناعی کے جوہر دکھاتی ہیں، ہندوستان کو دُلہن کی طرح سجا دیتیں، بنا دیتیں۔ لیکن انھیں اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ گودڑ میں رہ کر وہ لعل پیدا کرتے رہے، لعل پر کسی نے نگاہ نہ کی، گودڑ کو البتہ حقارت کا ہدف بنایا، بار بار بنایا، بے حسی اور بے دلی کے ساتھ بنایا، اُن کو اپنوں نے روندا، پرایوں نے کچلا۔

یہ سادہ دل اور ایثار پیشہ گروہ اپنے آپ کو بغیر سوچے سمجھے پرائی آگ میں جھونک دیتا ہے۔ اردو کے لالے پڑے تو یہ جان پر کھیل گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اقلیتی کردار کا مطالبہ کیا تو یہ سرفروش گروہ جان ہتھیلی میں لے کر سڑکوں پر نکل آیا، پرسنل لا کے ساتھ اس نے اپنی عافیت کو بھی خطرہ میں ڈال دیا ۔ بیسویں صدی کے پہلے ربع میں اس نے خلافت کے لئے سرفروشی کی اور گرفتاریاں دیں۔ ان تمام امور سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا، یہ سمجھتا بھی نہیں تھا کہ اس کا مفہوم کیا ہے، اس کے مضمرات کیا ہیں، لیکن چونکہ واسطہ اسلام کا دیا گیا چونکہ اس کے لیڈروں نے صلا دی اس لئے یہ کفن باندھ کر میدان میں اُتر آیا۔ ایسے وفادار اور ایثار پیشہ اور اعتبار آمادہ لوگوں کو اگر تعلیم، تنظیم اور تعمیر کی راہ پر ڈال دیا جاتا تو ملک و ملت کو کتنی زبردست کمک ملتی۔ لیکن اسے ہمیشہ کھلونوں میں الجھایا گیا، اسے ٹکراؤ کے لئے تیار کیا گیا اور ہمیشہ اس کے سامنے ایسے مسائل رکھ دئے گئے کہ اس کا ناطہ پیش رفت کے بجائے بازگشت سے جڑ گیا۔ اس کی سادہ لوحی کا فائدہ اپنوں اور پرایوں دونوں نے اٹھایا، اور اسے رجعت قہقری کا خوگر بنا دیا۔ اس کی تازہ مثال بابری مسجد کا واقعہ ہے۔

ایک ریاست کی حکومت اور اس کے ایک ضلع کی عدالت نے مسلمانوں کے خلاف کھلی ہوئی سازش کی اور ایک ایسے نزاع کو جو مہر بند ہوچکا تھا پھر سے کھڑا کردیا۔ یہ تو پرایوں کا کرم تھا۔ اپنوں نے کچھ اس سے بھی بڑھ کر ستم ڈھایا۔ انھوں نے بہت بڑا جلوس دلی میں نکالا اور طاقت کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے اعلان کیا، غیر دانش مندانہ اور بے معنی اعلان، کہ مسلمان جشنِ جمہوریت کا بائیکاٹ بطور احتجاج کریں گے اور گیارھویں گھنٹے میں اس اعلان کو اس انداز سے واپس لے لیا کہ ملت واپسی اور ناواپسی اور گومگو میں معلق ہوکر رہ گئی۔ اس کے بعد انھیں ہدایت ہوئی کہ دلی سے جلوس لے کر نکلو اور اتر پردیش کے بیشتر حصہ کو طے کرتے ہوئے بابری مسجد میں جاکر نماز پڑھو۔ آخری لمحہ میں روشنی نظر آئی تو یہ ہدایت واپس لے لی گئی۔ ورنہ ہر شہر میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔

بابری مسجد کے بارے میں ان کارروائیوں یا ان میں سے کچھ کے نتائج کیا ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی کا درجۂ حرارت اس قدر بڑھ گیا جیسا کہ وہ ملک کی تقسیم کے وقت تھا اور مسلمان اکثریت کے ایک بڑے حصہ کی ہمدردی سے جو اقلیت کا ایک بڑا اثاثہ ہوتا ہے محروم ہوگئے۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور بے شمار مسلمانوں کی جانیں گئیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سادہ لوحی اور ناعاقبت اندیشی سے اُسے بار بار نقصان پہنچا ہے؛ یہ اس کی قیادت کا قصور ہے۔ لیکن یہ بات پھر بھی اپنی جگہ پر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا غریب طبقہ فریب، تنگ دلی اور تنگ ظرفی اور بخل اور سازش اور موقع پرستی سے ہمیشہ پاک دامن رہا ہے۔

یہ مٹی کتنی ملایم اور لچکدار ہے! کاش اسے اچھے کوزہ گر مل جاتے۔

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیوں کہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا کیوں کہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

سر سید

مدارس اسلامیہ کا تعلیمی معیار

انحطاط کے اسباب وعلل اور ان کا علاج

محمد احمد مصباحی*

عربی مدارس کسی بھی جماعت کے ہوں سب کا حال یکساں ہے. بعض ایسے ہیں جن کا معیار تعلیم بڑی حد تک قابل تحسین وستائش ہے اور زیادہ تر وہ ہیں جن کا حال خراب ہے اور مدارس عربیہ سے ابتر حال کالجوں اور اسکولوں کا ہے جس کے نتیجے میں پورے ملک کے طول وعرض میں سند یافتہ نا اہلوں کی بہت بڑی بھیڑ جمع ہوتی جا رہی ہے جب کہ ہماری حکومت کا کثیر سرمایہ بھی ان کے اوپر خرچ ہوتا ہے لیکن صورت حال نے دانش وروں کو محو حیرت بنا رکھا ہے۔

یہ وقت ہمارا موضوع صرف مدارس اسلامیہ سے متعلق ہے۔ اس لیے ان ہی کے حالات پر اپنی گفتگو محدود رکھنا ضروری ہے۔ معیار تعلیم کی بلندی اور پستی میں نصاب تعلیم اور نظام تعلیم دونوں کا دخل ہوتا ہے لیکن بعض حضرات پستی معیار کے سلسلے میں سب سے زیادہ قصوروار نصاب تعلیم کو ٹھہراتے ہیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ موجودہ نصاب قابل ترمیم و اصلاح ہے۔ اس کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ نظام تعلیم اگر ابتری و پراگندگی کا شکار ہو تو اچھے سے اچھا نصاب بھی بے ثمر اور بے سود ہے اور تعلیم وتربیت کا نظام بہتر ہے تو موجودہ نصاب سے کچھ زیادہ قدیم اور فرسودہ نصاب بھی حیرت انگیز اور افادیت سے بھرپور ثمرات ونتائج قوم کے سامنے پیش کر چکا ہے اور اس نے ایسے ایسے سلاطین علم وفن پیدا کیے ہیں جن کا تذکرہ بھی آج دنیا کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

تعلیمی مراحل

مدارس کی تعلیم چند مراحل میں تقسیم ہوتی ہے:

۱۔ ابتدائی (پرائمری) تعلیم ۲۔ عربی وفارسی درجۂ اعدادیہ سے متوسطات (درجہ رابعہ) تک ۳۔ درجۂ عالمیت و فضلیت (درجۂ حفظ وقرأت سے سردست اغماض کیا جاتا ہے۔ اس کی بہتری وابتری کے اسباب معمولی غور وخوض یا دیگر درجات کے احوال سے دریافت کیے جا سکتے ہیں):

مدارس بھی تین قسم کے ہیں۔

۱۔ بعض میں صرف ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔

۲۔ بعض میں متوسطات تک۔

۳۔ بعض میں فضلیت تک۔

اجمالی حال۔ تینوں ہی اقسام میں کچھ معیاری اور عمدہ ہیں اور زیادہ تر غیر معیاری اور پراگندہ حال۔ قصور طریق تعلیم کا ہے جس کی ذمہ داری اساتذہ پر عاید ہوتی ہے اور ناتجربہ کار اساتذہ کے تقرر کا جرم انتظامیہ پر عاید ہوتا ہے اور انتظامیہ کی بعض مجبوریوں کی ذمہ داری مسلم عوام کے سر جاتی ہے۔

---

* رکن المجمع الاسلامی، استاد الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور

تفصیل وتمثیل:

اس اجمال کی تفصیل کے لیے چند مثالیں درکار ہیں:

الف۔ ناظرہ کی تعلیم کے لیے بچہ میں حرف شناسی اور حروف کی صحیح ادائیگی پیدا کرنا پہلا کام ہے۔ پھر حروف کی ترکیب اور ان کے صحیح تلفظ اور روانی کے ساتھ از خود پڑھنے کی لیاقت پیدا کرنا دوسرا کام ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بچہ زندگی بھر قرآن غلط پڑھتا رہے گا۔ یا اس میں خود سے پڑھنے کی صلاحیت نہ آسکے گی اور خام کا خام ہی رہ جائے گا۔ اسی طرح اردو قاعدہ، اردو زبان، اردو املا ونقل اور حساب وغیرہ جملہ مضامین کو مختصر طور پر سمجھیں کہ اگر معلم نے ہر جگہ صرف بنانے یا رٹانے کی کوشش کی اور طالب علم میں سمجھنے اور خود لکھنے پڑھنے درست کرنے کا ذہن نہیں پیدا کیا تو وہ وقتی امتحانات اگرچہ ادنیٰ یا اوسط نمبروں سے پاس کرلے جائے مگر اگلے معلم کے لیے دردِ سر بنے گا۔

ب۔ عربی گرامر اور ابتدائی زبان وادب کا بھی یہی حال ہے کہ اگر قواعد کا اجرا، نہ ہوا اور زبان کی کتاب میں الگ الگ ہر لفظ اور اس کے معنیٰ کی شناخت پھر ترکیب کی معرفت اور ترجمہ کی مشق طالب علم کے اندر پیدا نہ ہوئی اور معلم نے صرف قواعد رٹا کر اور اپنی زبان سے عبارت وترجمہ سب کچھ بتا کر چھٹی کر دی تو متعلم کورا ہی رہ جائے گا اور اگلے درجات میں جاکر دردِ سر بنے گا۔

(ج) منطق کی تعلیم میں اصول وقوانین یاد کرانے کے ساتھ کلیات خمسہ کا اجراء، دو کلیوں اور ان کی نقیضوں کے درمیان نسبتوں کی شناخت کے لیے کافی مثالوں کے ذریعے مشق، اسی طرح قضایا مطلقہ وموجہہ، تناقض وعکوس، پھر اشکال اربعہ یا ثلثہ کی عملی مشق، اسی طرح مواد اقیسہ پر مثالوں کے ذریعہ بحث اور استدلال کی خوب خوب تمرین ضروری ہے۔ ورنہ قاضی مبارک تک پڑھ لینے کے بعد بھی طالب علم کسی دلیل کے اندر صغریٰ و کبریٰ کی تعیین اور شکل کی تعیین ۔۔۔ اسی طرح دلیل کی صورت یا مادہ میں پائے جانے والے سقم کی تعیین سے قاصر رہے گا۔ اس کام کے لیے مروجہ نصابی کتابوں کو تبدیل کرکے ایسی کتابیں لائیں جو ان سب تمرینات پر خود ہی مشتمل ہوں یا ان ہی کتابوں سے کام چلائیں۔ بہرحال یہ کام ضروری ہے۔ اسی طرح بلاغت، عروض وغیرہ فنون کو بھی سمجھنا چاہیے کہ صرف کتاب کی شاندار اور دلچسپ تقریر کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ فنی ملکہ پیدا کرنا بھی ضروری ہے۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم عموماً نوآموز اور غیر تربیت یافتہ (اَن ٹرینڈ) معلمین کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ جن کے لیے کتاب سمجھ لینے کے بعد اسے سمجھا دینا ہی بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے طالب علم کے نفسیات کو سمجھنا۔ اس کی غلطیوں کے پس پشت خطائے ذہنی کا ادراک کرنا۔ پھر اس کی اصلاح اور اس میں فنی لیاقت پیدا کرنا ایسے معلم کے لیے تو محال عادی کا درجہ رکھتا ہے۔ اب خطا معلم تک محدود نہ رہی بلکہ انتظامیہ کے سر بھی آئی جس نے نہ تو ابتدائی تعلیم کی اہمیت کا ادراک کیا نہ اس کے مطابق مدرس کا تقرر کیا ۔۔ رہا سوال تنخواہ کی زیادتی اور اچھے معلم کے لیے کافی سرمایہ کی فراہمی کا، تو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مدراس کے ارکان تعمیر کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور قوم کو یہ اہمیت سمجھا کر اس سے کافی سرمایہ حاصل کرتے اور تعمیری کام میں لگاتے ہیں۔ اگر قابل مدرس کی قدر وقیمت اور اس کے لیے سہولیات فراہم کرنے کی اہمیت بھی انتظامیہ سمجھ لے تو اسے سمجھا کر اس کے لیے بھی سرمایہ حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن ہم نے اب تک نہ سنا کہ کسی صاحب خیر کو یہ بتایا گیا ہو کہ تعلیمی نظام کے استحکام وارتقا کے لیے اعلیٰ ذہن ودماغ کی بھی ضرورت ہے اور اس کی خدمات پر ہم کافی سرمایہ صرف کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ بیس سال بعد از کار رفتہ ہونے کے بجائے چالیس سال تک ہمارے ادارے کا

ساتھ دے سکے اور قوم کے لایق و فایق افراد پیدا کرتا ہے
اگر انتظامیہ یہ اہمیت اپنے معاونین کو ذہن نشین کرائے اور وہ
اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو یقیناً یہ خطا انتظامیہ سے
منتقل ہو کر ہمارے سرمایہ دار طبقے کے سر ہو جائے گی۔ جس کی
اصلاح سب کی ذمہ داری ہوگی۔

ذمہ داروں کا فرض

ارکان ہی نہیں مقررین، علما، اہل علم سب کا یہ فرض
ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو اس کا صحیح منصب و مقام دلائیں اور
قوم کا فکری معیار ظاہر کی دل کشی سے بلند کرکے باطن کی ہمہ گیر
افادیت کی طرف بھی منتقل کریں ــــ دوسری جنگ عظیم
کے بعد جاپان کے عظیم انقلاب و ارتقا کا اصل راز یہ ہے کہ اس
نے تعلیم اور ماہرین کی تخریج پر پوری قوت صرف کر دی۔ مدرس
کے لیے ڈپٹی کمشنر کی صلاحیت اور وزیروں کی برابر سہولیات
لازم کر دیں جس کے حیرت انگیز نتائج پوری دنیا کے سامنے ہیں۔

تفصیلی مشکلات

امراض و علاج اتنے ہی پر بس نہیں، بہت ہیں

۱۔ ان میں سے درجاتی ترقی اور امتحانی نظام کی بے قاعدگی
بھی ہے۔ بہت سے مدارس کا امتحانی نظام بالکل ڈھیلا اور
محض رسمی ہے۔ جس سے طالب علم کی صحیح صلاحیت اور مدارس کی
اصل کارکردگی کا بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد بھی
ترقی کے لیے ۳۳٪ نمبر حاصل کرنے کی شرط پوری ہو یا نہ
ہو ترقی مل جاتی ہے۔ جب کہ راقم الحروف کا نظریہ یہ ہے کہ پرائمری
سے عربی و فارسی کی طرف منتقل ہونے والا طالب علم اگر ۵۰٪
سے کم نمبر لایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی وہ اردو،
حساب وغیرہ میں بھی بہت کمزور ہے اور آگے چل کر عربی درجات
میں بھی وہ پریشان کن ہوگا ــــ اسی طرح درجہ اعدادیہ، اولی
ثانیہ کے اندر ابتدائی زبانوں اور قواعد کے پرچوں میں ۶۰٪ نمبر
لانے پر طالب علم کو کامیاب اور لایق ترقی تصور کیا جاتا ہے
[illegible] سے زیادہ قواعد جو کم پڑھا ہو، وہ ہرگز اگلی
کتابوں میں چلنے کے لائق نہیں ــــ اس لیے ابتدائی زبان و
قواعد کے پرچوں میں کم از کم ۶۰٪ نمبر حاصل کرنا ترقی کے لیے لازم
ہونا چاہیے۔ کیونکہ بنیاد کمزور ہو جاتی ہے تو آخر تک عمارت
کمزور ہی رہتی ہے۔

۲۔ مقدار تعلیم کی کمی بھی پستی معیار کا باعث ہے۔ ابتدائی
کتب خصوصاً قواعد کی کتابیں مکمل پڑھانا اور ان کا اجراء کرانا
ضروری ہے ــــ ہدایۃ النحو اگر آدھی، تہائی، دو تہائی
پڑھا دی گئی اور طالب علم نے خوب یاد بھی کر لی، جب بھی اگلی سیکڑوں
باتیں اس کی نظر سے اوجھل ہی رہیں اگلی کتابوں میں جہاں ان سے
سابقہ پڑے گا۔ طالب علم الجھن میں پڑے گا۔ اس لیے نحو میر
اور ہدایۃ النحو اجرا کے ساتھ مکمل ازبر کرانا ضروری ہے۔
اسی طرح علم الصیغہ بھی مکمل ہونی چاہیے تاکہ قواعد کے ساتھ اجرا
کا کام بھی ہو جائے۔ ورنہ قواعد میں پختگی بھی نہ ہوگی اور الفاظ
کی اصل و مادہ اور تعلیل و تغیر کے فہم میں تیزی بھی نہ آ سکے گی۔
جب کہ دونوں کے بغیر سخت دشواریاں ہوتی ہیں اور فضیلت
تک پہنچ جانے کے بعد بھی اس بنائے خام کے اثرات نمایاں طور
پر نظر آتے رہتے ہیں۔

ارکان و اساتذہ مذکورہ امور کی طرف بلند ہمتی اور
ثابت قدمی کے ساتھ متوجہ ہوں تو معیار تعلیم بڑی حد تک بہتر
ہو سکتا ہے ــ کچھ خرابیاں اور رہ جاتی ہیں جن میں بہت سے
مدارس مبتلا ہیں۔ ان کی صرف فہرست گنا دیتا ہوں علاج کچھ
بھی نہیں۔ سوا اس کے کہ مزاج تبدیل ہو اور علم و تعلیم کی قدر و
قیمت سے دل و دماغ میں غیر معمولی جرأت و ثبات اور حوصلہ
مندی پیدا ہو، کیوں کہ ان خرابیوں کا سرچشمہ بھی پست فکری
اور کم ہمتی ہے۔ جب تک یہ برقرار رہے گی کوئی دوا نہ استعمال
میں آئے گی، نہ اثر انداز ہوگی۔

اب فہرست ملاحظہ ہو:

۱۔ بعض مدارس میں طلبا کو غیر تعلیمی امور میں مشغول [illegible]
مثلاً قرآن خوانی وغیرہ کے لیے [illegible]

صرف ہو جائیں۔ فصل کٹنے کے مواقع پر مہینوں یا کم و بیش طلبا و
مدرسین کا تعلیم و تعلّم چھوڑ کر غلّے کی وصولی میں لگنا۔ اسی طرح
کسی بھی غیر تعلیمی کام میں مدرس کا وقت یا طالب علم کا وقت قابلِ
لحاظ مدت تک مصروف کرنا یقیناً غیر معمولی انحطاط و پستی کا سبب
ہو گا۔ انتظامیہ کی اس قسم کی حرکتوں کا مقصد ادارہ چلانے کے
لیے روابط قایم کرنا، رقم حاصل کرنا یا اخراجات کا بچانا ہوتا ہے
بلاشبہ یہ چیزیں ضروری ہیں لیکن تعلیم کی ترقی کے لیے اگر ان وسائل
کو اس طرح حاصل کیا جائے کہ مقاصد نظرانداز ہو جائیں تو یہی
ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل رقم فراہم کرنا یا بچانا ہی اصل مقصود
ہے اور تعلیم محض بہانہ و وسیلہ۔

۲۔ نظامِ تعلیم کا ڈھیلا پن اور حد سے زیادہ نرمی و
رواداری اور تعلقات و محبت کی پاسداری بھی تعلیم کو پستی
کی طرف بڑھانے والی چیزیں ہیں۔ اس خصوص میں طلبا کی کثرت
سے غیر حاضری، مدرسین کی رخصتوں کی زیادتی اور ان سب سے
ذمہ داروں کی بے اعتنائی اور بہت سی چیزیں سامنے آتی ہیں
مدرسہ میں حاضر ہونے کے باوجود بھی درس سے مدرس یا
طالب علم کی غیر حاضری، طلبا کی آزاد روی، سیر و سفر، لہو و لعب
کی طرف غیر معمولی میلان، نماز و جماعت سے غفلت، مطالعہ و
محنت سے دوری، جلسوں اور قسم قسم کے پروگراموں میں
روز بروز طلبا کی شرکت یہ سب خرابیاں کمیِ نصاب کی نہیں،
بلکہ ضعفِ نظام کی پیداوار ہیں۔

۳۔ لائبریری، دار المطالعہ اور تعلیمی ترغیب کے اسباب
سے دوری بھی بہت سے طلبا کو بے راہ بنا دیتی ہے اور بہت سے
طلبا کی فکری بلندی و ترقی کی راہ میں حایل ہوتی ہے۔ اگر لکھنے پڑھنے کا
سامان طلبا کے گرد و پیش جمع ہو، اخبارات و رسایل اور دلچسپ
مصالح کتابوں کی کثرت ہو تو کم استعداد طالب علم بھی دوسرے
لہو و لعب کی طرف جانے کے بجائے ان ہی میں مشغول ہوگا اور
[illegible] اور اچھی صلاحیت والا [illegible] استعداد کو
[illegible] سکے گا۔ ادارہ اور قوم و ملت [illegible]

لیے مفید ہو گا۔

مذکورہ اسباب انحطاط کے پیچھے بھی کچھ اسباب کارفرما
ہیں جس کا خواہی نخواہی ارکان و مدرسین کو شکار ہونا پڑتا ہے۔
ان سب کا مختصر جائزہ اور حل پیش کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۔ بہت سے مدارس دوہرے نصاب تعلیم سے زیر بار
ہیں۔ گورنمنٹ سے الحاق کی وجہ سے انہیں درس عالیہ کا نصاب
بھی پڑھانا پڑتا ہے اور درس نظامی کا بھی۔ اور دونوں کا
امتحان، پھر ہر امتحان کی تیاری بھی الگ الگ ہوتی ہے۔ جب
امتحانِ عالیہ کا وقت آتا ہے تو درس نظامی چھوڑ کر طلبا و مدرسین
اس امتحان کی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ نتیجہ کوئی نصاب مکمل نہیں
ہوتا اور استعداد بھی ناقص رہ جاتی ہے۔

۲۔ مدارس اسلامیہ صرف تعلیم و تدریس کا مرکز نہیں ہوتے
بلکہ مسلمانوں کی دینی و ملّی زندگی کا مرجع اور ان کے رہنما بھی ہوتے
ہیں۔ اس لیے مسلمان اپنے تبلیغی جلسوں، فاتحہ، نکاح، جنازہ
حتیٰ کہ جادو آسیب وغیرہ ضرورتوں اور پریشانیوں کے وقت
بھی مدارس ہی کا رُخ کرتے ہیں۔ اگر ان اوقات میں ان کی
دست گیری نہ کی جائے تو عوام کی بددلی اور روابط کی کمی کے
ساتھ یہ بھی خطرہ ہوتا ہے کہ دین اور دینی رہنماؤں سے دور
ہو کر بے راہ ہو جائیں۔ ان اندیشوں کے تحت انتظامیہ جیسے
بھی ہو عوامی ضرورت پوری کرنے کی طرف توجہ کرتی ہے اور اپنے
مدرسین و طلبا کو اسی میں لگا دیتی ہے جس کا نمایاں اثر تعلیم پر
پڑتا ہے اور کام نکل جانے کے بعد کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ
انتظامیہ نے کس مجبوری اور خطرہ کے پیش نظر اس عمل کا انتخاب
کیا۔ بلکہ لوگ اسے سند کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اسے
ہمیشہ کے لیے اپنی حاجت روائی کا لائحہ عمل قرار دیتے ہیں۔
بعض مدرسین اپنے ذاتی تعلقات اور علاقہ گیر یا ہمہ گیر شہرت
و حیثیت کے باعث براہ راست بھی اس طرح کے حالات کا
شکار ہوتے ہیں اور ملی ضرورت کے پیش نظر ان کا [illegible]
تعلیمی خسارہ سے دوچار [illegible]

بھی نہیں ہو سکتی۔ ... مدرسین اپنی تنخواہوں کی کمی اور ضروریات کی زیادتی کے باعث بھی تدریس کے ساتھ تقریری یا تجارتی میدان کا رُخ کرتے ہیں۔ کبھی اپنی غربت و کم مائیگی کی صعوبتیں دور کرنے سے زیادہ عوام کی نظر میں ایک دولت مند سی عزت پیدا کرنے یا معیارِ زندگی بلند کرنے کا جذبہ بھی غیر تعلیمی مصروفیات کا محرک ہوتا ہے۔ پھر ایسے مدرسین کو یہ پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ ادارے نے ہمارے اوپر کوئی کارروائی کی تو ہم کیا کریں گے۔ کیونکہ ان کا منفعت بخش اور تابناک مستقبل" ان کے سامنے ہوتا ہے۔ جب کہ انتظامیہ کے لیے کسی لائق مدرس کا حصول ایک اہم مسئلہ ہے۔

۴۔ اسی طرح کسی ہنگامی ضرورت یا خسارہ کو پورا کرنے کے لیے غلّہ کی وصولی اور چندے وغیرہ میں انتظامیہ کے لیے مدرسین و طلبا کو لگانا بھی بعض اوقات ناگزیر ہو جاتا ہے اور اس کی قیمت تعلیمی نقصان کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔

۵۔ طلبا کی علمی بے رغبتی کے پیچھے بھی بہت سے اسباب و عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

اوّلاً ـــــ مسلمانوں کا سرمایہ دار طبقہ دینی تعلیم کی طرف میلان ہی نہیں رکھتا، وہ اپنی دولت سے دوسرے مسلم بچوں کی مذہبی تعلیم کا ذمہ لے سکتا ہے لیکن خود اپنی اولاد کے لیے اس تعلیم کو پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ بیشتر ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو خود دین دار ہیں لیکن اپنی اولاد کو پرائمری تک بھی دینی تعلیم دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور اپنی عزیز نسل کو غیروں کے زرق برق ماحول میں ڈال کر اس کے لیے الحاد و لادینیت کے سارے وسایل بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ فراہم کر کے خوش رہتے ہیں کہ ؎

"شادم از زندگی خویش کہ کارے دارم"

ثانیاً ـــــ متوسط اور معمولی طبقہ جو اونچی دنیاوی تعلیم دلانے سے قاصر ہے یا دین دار ہونے کے ساتھ دینی تعلیم کی ضرورت کا شدید احساس بھی رکھتا ہے۔ اس لیے اپنی اولاد کو مدارس اسلامیہ کے حوالے کرتا ہے۔ ان میں بعض یا نصف کُند ذہن پائے جاتے ہیں اور اکثر تعلیم کی اہمیت سے نابلد ہوتے ہیں۔ سرپرستوں یا اساتذہ کے دباؤ کی وجہ سے مجبوراً تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی منصوبہ اور کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ اب ان کے فکر و مزاج کی تبدیلی و ترقی کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

لیکن پرائمری یا ابتدائی عربی درجات کے سستے اور ازکاررفتہ مدرسین بھی اگر لاپروا اور کام چلاؤ قسم کے مل گئے تو پھر ان طلبا کی آزادی، بے راہ روی اور تباہی کا پورا ہی سامان فراہم ہو گیا۔ ان میں جو ذہین ہوئے اور اپنے مادی مستقبل پر غور کیا تو ان کو تقریر کا میدان یا کوئی دوسرا میدان زیادہ منفعت بخش نظر آیا، اسی میں کوشش کی اور تعلیم ہی امتحان پاس کرنے سے زیادہ محنت کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ بہت قلیل تعداد ایسی بچتی ہے جو علم کی جویا اور خدمت دین کی شایق ہو اسے بھی اگر محنتی، ماہر اور پابند اوقات مدرسین نہ ملے یا محنت و مطالعے کی سہولتیں اور تعلیمی ترقی کے وسایل فراہم نہ ہوئے تو بھی یہ خام اور ناقص ہی رہ جاتی ہے۔

ثالثاً ـــــ بیشتر مدارس میں لاپروا، کھلاڑی اور شریر طلبا جمع ہو جاتے ہیں اور وہ اپنا ایک غالب گروہ اور حاوی ماحول بنا لیتے ہیں۔ جس سے سبھی متاثر اور خراب ہوتے ہیں۔ پھر ادارے کے ذمہ داروں کی اس ماحول سے بے اعتنائی اسے اور زیادہ مہلک اور تباہ کن بنا دیتی ہے۔

رابعاً ـــــ مدارس میں رہائش، غذا اور دیگر ضروریاتِ زندگی سبھی کا انتظام فروتر ہوتا ہے جس میں انتظامیہ اور متعلقہ ملازمین دونوں ہی ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔ اسی کے سبب بھی اونچا طبقہ مدارس کا رُخ نہیں کرتا۔ اور بہت سے مدرسین بھی اس سے کنارہ کش ہونے کی فکر کرتے ہیں بہت سے جھگڑے اور ہنگامے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کا بھی تعلیم پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔

خامسًا ـــــ عموماً مدارس میں یہ منظر بھی سامنے آتا ہے کہ مالداروں یا حکام میں سے کوئی متوسط قسم کا بھی انسان آگیا تو اس کے لیے سارا عملہ حرکت میں آجاتا ہے اور اگر کوئی عالم بلکہ بڑے سے بڑا عالم بھی آگیا تو اس کا وہ اعزاز واحترام نہیں ہوتا جو اول الذکر کے لیے ہوتا ہے بلکہ اگر اس کا عشر عشیر بھی ہو جائے تو بہت غنیمت ہے۔ کردار کے اس نمایاں فرق کے بعد مذہبی تعلیم اور علم وفن کی جو قدر ومنزلت کسی معلم یا متعلم کے ذہن میں پیدا ہوگی وہ محتاج بیان نہیں۔

سادسًا ـــــ انتظامیہ کے اختلافات یا رکن وعہدیدار بننے کی ہوس اور اس کے تحت محاذ آرائی کام کرنے والوں کے کام میں بلاوجہ رخنہ اندازی، عوامی گروہ بندی اور مدارس کی فیلڈ میں آکر ذاتی انتقام جوئی ـــــ یہ وہ لاعلاج امراض ہیں جو اکثر مذہبی اور غیر مذہبی تعلیمی اداروں کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے جاہ پسندی، مفاد پرستی اور ملی و قومی علمی و تعلیمی نصب العین سے بے اعتنائی کا جو سنگین مرض کارفرما ہوتا ہے، جب تک اس کا علاج نہ ہو، اس سے پیدا ہونے والے مہلک امراض کا علاج ممکن نہیں۔

حل وعلاج :- میرے خیال میں عزم وحوصلہ اور نظم وضبط سے بیشتر دشواریوں اور خرابیوں پر بڑی حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے اور ہر طرح کی دینی وملی ضروریات سے عہدہ برا ہونے کے ساتھ تعلیمی ارتقا کا منصوبہ بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

۱- (الف) بہتر تو یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ گورنمنٹ سے اپنا الحاق ختم کریں۔ اس کے اندر نسبتاً زیادہ سلامتی ہے۔

(ب) درس عالیہ کا نصاب ہی مکمل طور سے نافذ کر دیں وہ درس نظامی سے کم نہیں۔ بلکہ اب تک یو۔ پی میں جو نصاب ہے وہ بعض جہتوں سے درس نظامی سے زیادہ جامع اور بہتر ہے۔

۲- علاقہ اور ملک کی تبلیغی ضرورت کے لیے ہر مدرسہ دو تین ایسے اچھے اور لائق عالموں کا تقرر لازم کرے جنھیں تقریروں کے لیے باہر بھیجا جا سکے۔ تدریس سے ان کا تعلق جوڑا ہو اور ان کی غیر حاضری میں دیگر مدرسین کی خالی گھنٹیوں کے ذریعے متبادل انتظام ابتدا ہی سے نظام الاوقات میں شامل ہو ضرورت ہو تو ایسے مقبول مقررین کو صرف مبلغ کے طور پر بھی رکھا جا سکتا ہے۔

۳- جو مدرسین اپنے طور پر پروگرام کرتے ہیں وہ اسے ملحوظ رکھیں کہ تعلیمی نقصان کے بغیر لوگوں کی ضروریات یا اپنی ضروریات پوری کی جائیں۔ جس ادارے سے وابستہ ہوں اس کی تعلیمی ترقی سے ہمدردی ایک وفا پیشہ ضمیر کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ تقریر کے لیے ایام تعطیل ہی کو خاص کریں اور مزید چاہیں تو رخصتِ اتفاقیہ پر مستزاد نہ ہونے دیں۔ بلکہ ایسے علما پیدا کریں جو اسی میدان کے لیے خاص ہوں یا جو لوگ اس کے لیے خاص ہوں، ان کی طرف رجوع کرا دیں۔ ان سب سے بھی اگر ضرورت یا شوق کی تکمیل نہ ہو سکے تو اپنی جگہ کسی لائق اور غیر خطیب مدرس کو لانے کا انتظام کریں۔ اپنی ذات، اپنے ادارے اور اپنی قوم تینوں ہی کا مفاد ملحوظ خاطر رہنا چاہیے۔

انسان کا ضمیر اگر انصاف پسند ہو اور اس کا ذہن اگر نظم وتدبر کا حامل ہو تو مشکلات کی بہت سی زنجیریں کاٹ سکتا ہے۔ ورنہ خود ہزاروں مصائب کی چٹانیں راہ میں حائل کر سکتا ہے۔

۴- انتظامیہ کا وسیع النظر، بلند حوصلہ اور باتدبیر ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اپنی خرابیاں اور ان کا علاج کوئی از خود انتظامیہ کو بتانے کی زحمت کیوں کرے گا تعمیری ترقی، مدرسین وطلبہ کے معیاری انتظام زندگی اور تعلیمی ترقی کے لیے ساری سہولتوں کی فراہمی، ہر سمت، ہر گوشے میں واقع ہونے والی کوتاہی پر نظر اور ان سب کی معقول تدابیر عمل میں لانا انتظامیہ کا فریضہ ہے۔ جبھی دوسرا طبقہ بھی ہمارے مدارس کا رُخ کر سکے گا اور جو طبقہ زیر تعلیم وتعلّم ہے، وہ

کارآمد اور مفید بن سکے گا۔ شخصی جاہ و منزلت اور مال و زر کی قیمت، علم و فن اور بلند تعلیم و تربیت سے زیادہ کبھی نہ سمجھنا چاہیے۔ علم و عمل کی بلندی کے لیے جان و مال کو قربان کیا جاسکتا ہے۔ لیکن محض مال و زر کی تحصیل یا صرف مالی بچت کے لیے تعلیم و تربیت کو انحطاط و پستی کے تنور میں جھونکا نہیں جاسکتا۔

حسنِ تدبیر اور ہمت و استقامت کے ذریعے، مالیات فراہم کرنے والا عملہ، صحیح تعلیم اور اچھی تربیت دینے والے مدرسین و اتالیق، عمدہ لائبریری نظام، علم و فن سے شغف رکھنے والا ماحول بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے کوشش بھی کرنی ہوگی۔ سختی بھی۔ نرمی بھی۔ قانون سازی بھی۔ قوانین کی تنفیذ اور ان کی نگرانی بھی۔ مدرسین و طلبا اور ملازمین کے ذہنوں کی صالح تعمیر بھی۔ اصلاح پذیر نہ ہونے والوں کی حسب حال سخت سے سخت تادیب بھی۔ عوام اور معاونین کی ذہن سازی بھی۔ کہ وہ ادارے کے تعلیمی و انتظامی معاملات کو بے جا سفارشات و خواہشات سے پیچیدہ نہ بنائیں اور پوری قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے بنائے ہوئے پروگرام کو اپنی ضد اور انا کی تسکین کے لیے ضرر نہ پہنچائیں۔

سب سے مشکل کام ذہنوں کی تعمیر و اصلاح ہے۔ حالات اور ماحول کی رَو میں تیزی کے ساتھ بہنے کا فن تو سب کو آتا ہے لیکن قائدین ملت اور مصلحین امت کو اپنے منصب و مقام سے کسی لمحہ غافل نہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے بھی اگر بُرے حالات سے مصالحت کرلی یا ماحول کی رَو میں بہنا سیکھ لیا تو پھر سفینۂ ملت کی ناخدائی کے لیے کوئی آسمان سے نازل نہ ہوگا۔

نصابِ تعلیم: نصاب تعلیم کے متعلق اب تک میں نے کوئی خاص نشان دہی نہ کی۔ چونکہ میرا نظریہ یہ ہے کہ نظام تعلیم میں اگر اصلاح و ترقی کی اسپرٹ کارفرما ہے تو نصاب تعلیم کی اصلاح و ترقی ایک ضمنی اور جزوی مسئلہ ہے۔ جس پر خود ہی توجہ مبذول ہو گی۔ تاہم عمومی حالات کے پیش نظر چند معروضات قلم بند کی جاتی ہیں۔

نصاب تعلیم سے متعلق پہلا ذہن یہ طے کرنا ہوگا کہ عصری حالات کس طرح کے علما کے متقاضی ہیں۔ پھر یہ کہ ان کے لیے موجودہ نصاب کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں تین نظریے سامنے آتے ہیں۔

۱- ایک یہ کہ عالم کو قدیم عربی نصابِ تعلیم ہی تک محدود رکھا جائے۔ اگر وہ معقولات و منقولات پر حاوی نہ ہوا تو فقہ و کلام کی باریکیوں کو حل نہ کر سکے گا اور جدید کلامی و فقہی سوالات کا بھی شافی جواب نہ دے سکے گا۔

۲- دوسرا یہ کہ دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کو بھی شامل کیا جائے تاکہ ہمارا طالب علم مدرسوں سے نکل کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرف بھی جا سکے اور معاش کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہو کر ہماری نمائندگی اور اپنی کفالت کا فریضہ انجام دے سکے۔

۳- تیسرا یہ کہ آج مستشرقین اور بد مذہب فرقوں کی طرف سے بہت سے ایسے شکوک و شبہات اور سوالات و اعتراضات سامنے آتے رہتے ہیں جن کے جوابات سے ہماری نصابی کتابیں خالی ہیں اور یہ بے شمار ایسے نظریات اور ان کے ردّ و ابطال سے بھری ہوئی ہیں جن سے آج ہمارا مقابلہ نہیں۔

اسی طرح آج اسلام کے خلاف پہلے انگریزی اور فرنچ وغیرہ زبانوں میں لکھا جاتا ہے۔ علما ان زبانوں سے واقف نہیں ہوتے اور جو طبقہ واقف ہوتا ہے وہ جوابات سے مکمل طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آج کے نصاب میں جدید علم کلام اور بہت معیاری انگریزی یا فرنچ زبان کا شامل ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح جغرافیہ، سائنس، سیاست، تاریخ عام، تاریخ علوم، تاریخ مذاہب، وغیرہ کی ضروری حد تک تعلیم یا اُن کا مطالعہ و امتحان ہونا چاہیے ورنہ فکر و نظر میں وہ وسعت نہ آسکے گی جس کی قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے۔

میرے خیال سے یہ تینوں ہی نظریے اپنے اندر کچھ اہمیت

رکھتے ہیں اور ان سب کی رعایت کرتے ہوئے ایک جامع نصاب کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے پہلا کام یہ ہوگا کہ دنیا بھر کی مسلم جامعات کے نصاب ہائے تعلیم اور نصابی کتابیں مکمل فراہم کی جائیں۔ پھر ماہرین کا ایک بورڈ یہ تعیین کرے کہ قدیم نصاب کی کون سی کتابیں باقی رکھی جائیں اور دیگر نصابوں سے کون سی کتابیں ہمارے لیے بعینہٖ کارآمد ہیں اور کون سی قدیم وجدید کتابوں کا متبادل اپنے ملک اور طلبا کے مطابق ہمیں خود تیار کرنا ہوگا پھر ایک تصنیفی بورڈ ہو جس کے لیے تمام سہولیات فراہم کی جائیں اور وہ ضرورت کے مطابق کتابیں مرتب کرکے پیش کرے اور ماہرین کی نظر ثانی کے بعد وہ شائع اور شامل نصاب ہوں۔

تربیتی کورس

اسی طرح ایک تربیتی کورس بھی تیار کرنا ہوگا جس کے ذریعے فارغین کے لیے تعلیم وتدریس کی ٹریننگ کا کام سرانجام ہو اور بعض مدارس کو یہ کورس پڑھانے کے لیے اپنے یہاں اساتذہ کا بھی باقاعدہ بندوبست کرنا ہوگا تاکہ مدارس کو تجربہ کار اور وسیع النظر مدرسین فراہم کیے جاسکیں۔

تدوین نصاب کے سلسلے میں کثیر اخراجات کا مسئلہ درپیش ہوگا جو چند باحوصلہ اور ہم مزاج مدارس کے اشتراک عمل سے حل ہوسکتا ہے۔ پیش قدمی اور نمائندگی ونگرانی کے لیے کسی ایک ادارے کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد عملی اقدام فوراً کسی ایک شخص، پھر متعدد اشخاص کے سپرد کرنا ہوگا۔

نئے نصاب میں علمی وفنی اور تحریری وقلمی ترقیوں کا لحاظ بہرحال ضروری ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ فکر وفن اور تحریر و قلم کا زیادہ متقاضی ہے۔ تقریر ہو تو وہ بھی ایسی جو افادیت میں تحریر کے ہم پلہ یا اس سے بالاتر ہو۔ سطحی اور کمزور باتوں کا جادو تعلیم یافتہ دنیا کو زیر نہیں کرسکتا۔

خلاصۂ مضمون

یہ مضمون متعدد مصروفیات اور مختلف اوقات میں قلم بند ہوا۔ پھر بھی تقریباً سبھی ضروری باتیں تفصیلاً یا اجمالاً واشارۃً قید تحریر میں آگئی ہیں۔ جن کا خلاصہ عنوانات کی شکل میں ایک بار پھر ذہن میں تازہ کرلیں۔

۱۔ نظام تعلیم کی ابتری

۱۔ مدرسین کی بے اعتنائی یا نااہلی اور اس سے انتظامیہ کی غفلت
۲۔ طلبا کی صالح تربیت کا فقدان یا کمی
۳۔ نظام امتحان کی بے قاعدگی
۴۔ ترقی درجات اور داخلہ کی بے ضابطگی
۵۔ مقدار تعلیم کی کمی اور اکثر مسائل فن سے طلبا کی بے خبری۔
۶۔ غیر تعلیمی امور میں طلبا اور مدرسین کی مشغولیت
۷۔ لائبریری سسٹم اور دار المطالعہ کا فقدان یا کمی۔

۲۔ طلبہ کی بے رغبتی

۱۔ بہت سے ذہین اور بلند ہمت بچوں کی تعلیم یا دینی تعلیم سے دوری۔
۲۔ متوسط قسم کے داخل مدارس طلبا کی مقصد سے لاپرواہی۔
۳۔ شریر طلبا کا غلبہ اور ان سے ذمہ داروں کی عاجزی یا بے اعتنائی۔
۴۔ مدارس میں غذا اور رہائش کے انتظام کی پستی۔
۵۔ اہل ثروت اور اہل اقتدار کی پذیرائی اور اہل علم کی ناقدری۔

۳۔ مدرسین کی بے رغبتی اور دشواری

۱۔ تنخواہوں کی کمی، ضروریات زندگی کی زیادتی۔
۲۔ تجارتی اور تقریری میدانوں کی نفع بخشی وعزت افزائی، تعلیمی ماحول کی صعوبتیں اور علم وفن کی بے وقعتی۔
۳۔ انتظامیہ سے متعلق نااہل یا فرائض تدریس سے غافل مدرسین کا غلبہ اور ان کا پاس ولحاظ۔
۴۔ تعلیمی مسائل اور مدرسین وطلبا کی دشواریوں کے

حل سے انتظامیہ کی غفلت

۵۔ لائق، مقصد میں مخلص اور بلند ہمت طلبا کا فقدان یا انتہائی کمی۔

۴۔ انتظامیہ کے حالات و مشکلات

۱۔ اختلافات، گروہ بندی، تعلیمی فکر و ذہن سے دوری۔

۲۔ سرمایہ کی کمی۔

۳۔ مسلم عوام کی دین، علمائے دین اور دینی تعلیم بلکہ مطلق تعلیم سے لاپرواہی۔

۴۔ عوامی دلجوئی۔

۵۔ دوہرے نصاب تعلیم سے نباہ

۶۔ لائق مدرسین کی کمی۔

۷۔ ماحول کی ناسازگاری۔

۵ ۔ علاج

۱۔ دین و علم سے الفت، مقصد سے اخلاص، فرض شناسی عزم و حوصلہ، ثابت قدمی، فکر و تدبر۔

۲۔ تمام دانش وروں، قائدوں، عالموں کا دین اور علم کے فروغ کے لیے عوامی فکر و ذہن کی اصلاح اور ماحول میں انقلاب و تبدیلی کی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلسل حرکت و عمل۔

۳۔ قومی و ملی، دینی و علمی مفاد کے لیے ذاتی خواہشات و مفادات کی قربانی۔ اختلافات سے کنارہ کشی۔

امراض و علاج کے بیان پر مضمون نگار کی ڈیوٹی بحیثیت مضمون نگار ختم ہو جاتی ہے۔ آگے کا کام ان بے شمار معالجوں کا ہے، جو بیمار مدارس کو موت سے بچانے کے واقعی ذمہ دار ہیں۔

و اللہ المستعان و علیہ التکلان

"جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے اور چاندی کو جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیاں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا تو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔"

(سورہ توبہ)

حقیقی اور مصنوعی دین

علامہ احمد امین مصری* ترجمہ محمد اعظم قاسمی**

کیا آپ حقیقی ریشم اور مصنوعی ریشم کے فرق کو سمجھتے ہیں؟ اور کیا آپ شیر اور شیر کی تصویر کے فرق کو جانتے ہیں؟ نیز آپ اپنے سامنے پھیلی ہوئی دنیا اور نقشے پر بنی ہوئی دنیا کے فرق سے واقف ہیں؟ اور کیا آپ بیداری میں اپنے عمل اور حالتِ خواب میں اپنے عمل کے فرق کو سمجھتے ہیں؟ نیز کیا آپ کارزارِ حیات میں کوشاں انسان اور مٹی کے بنائے ہوئے اس آدمی کے فرق کو سمجھتے ہیں جس کو ملبوسات کی نمائش کے لیے دکانوں میں رکھ دیا جاتا ہے؟ اور کیا آپ اپنے بچّے سے محروم ہو جانے والی ماں کی آہ و بکا اور کرائے پر بلائی ہوئی نوحہ خوانوں میں جو فرق ہے، اس سے واقف ہیں؟ نیز کیا آپ آنکھوں کی فطری سیاہی اور کاجل کے فرق کو جانتے ہیں؟ اور کیا آپ اس تلوار کے جو معروف جنگ مجاہد کے ہاتھ میں ہے اور لکڑی کی اس تلوار کے فرق کو سمجھتے ہیں جو یوم جمعہ خطیب کے ہاتھ میں ہوتی ہے؟ نیز کیا آپ میدان جنگ میں نظر آنے والے اور پردۂ سیمیں پر نظر آنے والے لوگوں کے فرق کو جانتے ہیں؟

اگر آپ اس فرق سے واقف ہیں تو بعینہٖ یہی فرق دینِ حقیقی اور دینِ مصنوعی کے درمیان ہے۔ محققین نے بہت کچھ دماغ سوزیاں کیں اور مورخین نے بڑی کاوشیں اور کوششیں کیں کہ کسی طرح ان اسباب کو سمجھ سکیں کہ جن کی وجہ سے ابتدا میں مسلمانوں نے عجیب و غریب کارنامے انجام دیے، سرفرازیاں کیں، فتوحات حاصل کیں اور زمانے پر چھا گئے۔ پھر آخر میں بھی عجیب و غریب بات ہوئی کہ وہ کمزور ہوتے چلے گئے اور ذلیل و خوار ہو گئے۔ جب کہ قرآن وہی قرآن ہے۔ اسلامی تعلیمات وہی تعلیمات ہیں۔ 'لا الٰہ الاّ اللہ' وہی لا الٰہ الا اللہ ہے۔

---

* علامہ احمد امین ۱۸۷۸ء میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ ازہر اور مدرسہ قضاء شرعی سے تکمیل کی۔ پھر انگریزی زبان سیکھی۔ اپنے ادبی اور علمی مقالات کی بنا پر جلد ہی مشہور ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں جامعہ مصریہ میں مدرس ہوئے اور فیکلٹی آف آرٹس میں مشغول تدریس رہے۔ کچھ ہی مدت بعد فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ملی اور جامعہ عربیہ میں ادارۂ ثقافت کے صدر منتخب ہوئے۔ اور تالیف و اشاعت و ترجمہ کی کمیٹی کے نگراں تقریباً بیس سال رہے اور متعدد کتابوں کی تالیف و طباعت کی نگرانی کی اور اس میں معاون بنے۔ ۱۹۵۴ء میں وفات ہوئی۔ اس دور کے مشاہیر مولفین میں سے ہیں۔ آپ کی مشہور ترین کتاب 'تاریخ اسلام' ہے جو آٹھ جلدوں میں فجر الاسلام، ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام کے ناموں سے چھپی ہے۔ آپ کا اسلوب سلیس اور پر تاثیر ہے۔

** استاد شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، اے ایم یو علی گڑھ

اور سب کچھ وہی [illegible] ہے جو کبھی تھا۔ اس بات کی توجیہ میں لوگوں نے مختلف [illegible] اختیار کیں اور متعدد اسباب تلاش کیے لیکن مجھے اس کا ایک [illegible] سبب نظر آتا ہے اور وہ ہے حقیقی دین داری اور مصنوعی دین داری کا فرق۔

مصنوعی دین داری میں حرکات و سکنات اور الفاظ ہیں لیکن اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔ جب کہ حقیقی دین داری روح اور قلب اور حرارت سے عبارت ہے۔

مصنوعی دین میں نماز صرف ورزش اور کسرت کا کھیل ہے اور حج ایک مشینی حرکت اور جسمانی سفر ہے۔ نیز دینی مظاہر صرف ایک ڈرامے کے افعال اور کرتب بن جاتے ہیں۔ اس غیر حقیقی دین میں لا الٰہ الا اللہ ایک ایسا قول جمیل ہے جس کا مصداق اور مدلول کوئی نہیں مگر جہاں تک دین حقیقی کا تعلق ہے تو اس میں یہی کلمہ سب کچھ ہے۔ مال و دولت کی عبادت کے خلاف یہ کلمہ ایک بغاوت ہے۔ اسی طرح شہوانی خواہشات جاہ طلبی اور طاقت کی پرستش کے خلاف بھی یہ کلمہ ایک کھلی بغاوت ہے۔ غرض خدائے واحد کے علاوہ ہر معبود کے خلاف یہ کلمہ بغاوت کا نعرہ ہے۔

مصنوعی دین داری میں لا الٰہ الا اللہ سر تسلیم خم کرنے اور جسمانی لذتوں کے سامنے سر جھکا دینے کے لیے راضی رہتا ہے اور ہر ذلت اور مسکنت پر مطمئن ہو جاتا ہے لیکن حقیقی دین داری میں کلمہ لا الٰہ الا اللہ حق کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہوتا۔ مصنوعی دین میں یہ کلمہ ہوا کے رُخ پر چلتا ہے جب کہ حقیقی دین داری میں یہ کلمہ پہاڑوں کو بھی ہلا ڈالتا ہے۔

مصنوعی دین داری تجارت و حیاکت کی صنعتوں کی طرح ایک صنعت ہے جس میں اس کے ماہرین مہارت تامہ رکھتے ہیں مگر دین حقیقی ایک روح اور قلب اور عقیدہ ہے نہ کہ کوئی عمل۔ لیکن عمل نیک اور عمل جلیل خود بخود اس سے پیدا ہوتے ہیں۔

دین حقیقی ایسی اکسیر ہے کہ وہ مردہ دلوں میں پہنچے تو ان میں زندگی دوڑ جائے اور کمزور میں پہنچے تو وہ توانا ہو جائے اور یہ اہل دانش کا وہ پتھر (عقل) ہے کہ پیتل، چاندی یا سونے سے چھو جائے تو وہ سونا بن جائے۔ وہ ایسا معجزہ نما عقیدہ ہے کہ علم تاریخ اور قلم بھی اس کے سامنے حیرت زدہ نظر آتے ہیں کہ کس طرح اس کی تحلیل و توجیہ کریں اور کیسے اس کی تشریح کریں۔ وہ ایسا تریاق ہے کہ اگر تھوڑا سا بھی مل جائے تو زندگی کا سارا زہر غائب ہو جاتا ہے اور وہ ایسا کیمیاوی عنصر ہے کہ دینی شعائر کے ساتھ مل کر خدا تک پرواز کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ امور دنیا سے آمیز ہو تو جملہ مشکلات کتنی ہی سخت ہوں، زیر ہو جاتی ہیں اور وہ آپ کو منزل مقصود تک پہنچا کر ہی رہتا ہے۔

اسی کو پا کر ہر کامران کامیاب ہوا اور اسی کو کھو کر ہر نامراد ناکام ہوا۔ سچی دین داری ایک ایسی برق ہے کہ جس کے رواں ہوتے ہی ہر پہیہ حرکت میں آ جاتا ہے اور ہر کام چل پڑتا ہے اور اس کے رکتے ہی حرکت و عمل کا سلسلہ موقوف ہو جاتا ہے۔ وہی ہے جس کے ہر ساز میں اترتے ہی سُر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے ان ساز کے تاروں اور کسی رسی میں کیا فرق تھا۔ یہی آواز میں شامل ہو تو تمنا کا جادو جاگ اٹھتا ہے ورنہ وہی آواز اس سے پہلے ہوا سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔

دین حق جس کے پاس ہے وہ اسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ انسان اپنا جینا اور مرنا اسی کے لیے وقف کر دے جب کہ مصنوعی دین انسان کو اس طرف دھکیلتا ہے کہ انسان اس غیر حقیقی دین کی خاطر زندگی گزارے، اسی کو تجارت کا ذریعہ بنائے اور اسی کو اپنی ذہانت و مکاری کا وسیلہ بنائے حقیقی دین رکھنے والا ہر قوت سے برتر اور ہر سیاست سے بالا ہوتا ہے اور مصنوعی دین رکھنے والا ہر سیاست کی خدمت کے لیے اس کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

دین حقیقی قلب اور کردار ہے اور مصنوعی دین صرف دکھو۔

عبارت واعراب اور گفتگو اور تاویل ہے۔ دین حق نام ہے اس
امتزاج کا جو لہو اور روح اور حق کی خاطر غضب اور ظلم سے نفرت
اور انصاف وعدل کی خاطر موت کو بھی گوارا کرنے پر تیار رہتا
ہے۔ جب کہ بناوٹی یا بے روح دین داری صرف ایک چمکتا ہوا
عمامہ یا قبا یا بڑی سی پگڑی ہے۔

حقیقی دین داری میں "شہادت" ہے جیسے قرآن کریم
یوں بیان کرتا ہے:

"اللہ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور اموال
کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ یہ لوگ
اللہ کی راہ میں قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے
بھی ہیں۔"

لیکن بناوٹی دین داری کی شہادت جملہ کے اعراب، متن کی تخریج
یا کسی حاشیہ یا شرح کی تفسیر یا کسی مولف کے اقوال کی تصحیح یا
اس پر کسی اعتراض کا نام ہے۔ دین حقیقی خدا اور بندے کے
درمیان رشتے کو نیز انسان اور انسان کے درمیان رشتے
کو بہتر اور خوب تر بنانے کا نام ہے۔ تاکہ تمام بندوں کا
رشتہ اللہ سے استوار ہو سکے۔ لیکن بناوٹی دین داری
میں کسی انسان سے تعلق بڑھانا صرف روزی کو باقی رکھنے، کسب
جاہ یا حصول دولت یا مصیبت سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے:

"یہ ایسا دین ہے جس کا انجام اس وقت
تک درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کا
آغاز درست نہ ہو۔"

تو کیا اس دین کا سر آغاز روح دین نہیں ہے اور یہ نہ ہو
تو اس کا سر انجام محض بناوٹی دین داری نہیں ہو گا؟ ہر
مذہب کے لوگ آخر کار جس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں وہ
یہ ہے کہ رفتہ رفتہ وہ اس دین کی روح سے دور ہوتے
چلے جاتے ہیں اور اس کے خارجی مظاہر اور اشکال اور رسوم
کی حفاظت میں لگ جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں تمام صورت حال
اور پیمانے بدل جاتے ہیں اور ایمان میں عشق اور لگن کی [illegible]
باقی نہیں رہتی ہے۔ برودت کو حرارت، سستی شہرت
اور رسوائی کو سربلندی اور نیک نامی۔ پست حرکات کو
فضیلت اور خود غرضی کو ایثار کا درجہ دیا جانے لگتا ہے

حقیقی ایمان دوسری طرف ایک ایسا عصا ہے
کہ جس شے کو چھو گیا اس کو شعلہ زن کر دیتا ہے۔ جامد
قلوب کو پگھلا دیتا ہے اور مردہ دلوں میں زندگی کی
لہر دوڑا دیتا ہے۔

کون ہے جو میری اس بناوٹی دین داری
کو سمیٹ کر اس کے بدلے میں مجھے حقیقی دین داری کا اس
کے اعلیٰ ترین معانی کے ساتھ ایک ذرہ ہی عنایت
کر سکے۔

ولی کبد مقروحة من يبيعني
بها كبداً ليست بذات قروح

[میرے پاس ایک ایسا جگر ہے جو زخموں
سے چور ہے۔ کون ہے جو اس کے بدلے
میں مجھے ایسا جگر دے جو زخموں سے
پاک وصاف ہو]۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جنت تمہارے جوتے کے تسمے سے
زیادہ قریب ہے اور دوزخ بھی
اسی طرح۔"

[بخاری]

مسلمان اور تعلیمی منصوبہ بندی

محمد اسحاق *

آدمی کا صحت مند رہنا اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا بوجھ خود اپنے پیروں پر لاد کر لے جا سکے۔ جب وہ بیمار پڑ جاتا ہے تو دوسروں پر بوجھ ہو جاتا ہے۔ خود چل نہیں سکتا دوسروں کو سہارا دینا پڑتا ہے۔ اس طرح آدمی کا صحت مند رہنا نہ صرف اس کی شخصی ذمہ داری ہے بلکہ اخلاقی، سماجی اور قومی ذمہ داری بھی ہے۔ اس کی بیماری نہ صرف گھر والوں کو پریشان رکھتی ہے بلکہ حکومت کو اس کے علاج معالجہ کے لیے قومی آمدنی سے روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ یہی حال اس ان پڑھ اور ناخواندہ کا ہے جو نہ صرف اپنا نقصان کر لیتا ہے، بلکہ خاندان، قوم و ملت کے لیے بھی مسئلہ بن جاتا ہے۔

ملک کی آزادی کے بعد سے ہندوستانی مسلمان چار اہم مسایل سے دو چار ہیں۔ معاشی پسماندگی، تعلیمی پسماندگی، مذہبی و ثقافتی شناخت کی حفاظت اور برقراری، جمہوری حکومت میں مسلمانوں کی غیر متناسب نمائندگی۔ ان سب مسایل کے حل کا جذبہ عام طور پر پایا جاتا ہے لیکن مسایل اور بھی پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ان سب میں اہم ترین بنیادی مسئلہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی ہے کیوں کہ یہ وہ شاہ کلید ہے جو ہر مسئلے کے حل کے لیے کافی ہے۔ جب تک مسلمانوں میں تعلیم عام نہ ہو نہ تو وہ غربت کے شکنجے سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنی زبان، مذہب اور ثقافت کی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ وہ جمہوری حکومت میں کسی حساب و کتاب میں آ سکتے ہیں۔ پنڈت نہرو نے اپنی سوانح حیات میں کوئی ساٹھ برس پہلے ہی لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ عام تعلیم سے دوری ہے۔ سرسیدؒ کی علی گڑھ تعلیمی تحریک شروع ہوئے ایک سو برس سے زائد ہو گئے لیکن مسلمانوں میں عام تعلیم کا فیصد ۲۵ سے بڑھ نہ سکا۔ اگر ہم اس حقیقت کو حسابی زبان میں وقت اور فاصلے کے لحاظ سے جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے سو برس میں تعلیم کے میدان میں صرف ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہے۔ باقی فاصلہ طے کرنے کے لیے اس رفتار سے مزید تین سو برس لگیں گے۔ یہ کوئی شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے۔

یہ بات بھی نہیں ہے کہ اس مسئلے سے ہمارے سیاسی لیڈر، مذہبی رہنما اور دانش ور لاعلم ہیں۔ وہ اس مسئلے سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن آج تک نہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے اور نہ کوئی عملی قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس صورت حال کی چند وجوہات سمجھ میں آتی ہیں۔

---

* رٹائرڈ پرنسپل سلطان العلوم کالج آف حیدر آباد۔

۱۔ ایک زمانے سے ہمارا سماج ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ پڑھنا، لکھنا خود بچہ کی انفرادی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی بچہ پڑھ لکھ لیتا ہے تو خود اس کا ذاتی ذوق و شوق ہے یا پھر والدین کی توجہ کا سبب ہو سکتا ہے ۔۔ یہ انفرادی ذمہ داری اس بچے پر ہے جو خود اپنی ذمہ داری سمجھنے کے قابل نہیں ہے افسوس ہے ماں باپ اس روایتی غلط فہمی سے نکلتے نہیں اور بچہ کا مستقبل تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔

۲۔ اس کام کا پھیلاؤ وسیع اور دیرپا ہے۔ تعلیم میں جو وقت، پیسہ اور محنت صرف ہوتی ہے اس کے نتائج بہت دیر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ ایک طویل مدتی کام ہے جو دس تا پندرہ برس پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ایسا کام سیاستدانوں کے جذباتی مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کام برائے نام ہو اور جلد سے اپنا نام ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عام تعلیم (جنرل ایجوکیشن) کے پروگرام کا تذکرہ آپ نہ تو کسی ایجوکیشن سوسائٹی، مذہبی جماعت یا سیاسی جماعت کے دستور یا منشور میں پائیں گے اور اگر کہیں ہے بھی تو وہ بھی برائے نام ہوگا۔

رسول اکرمؐ کی دوراندیشی

جنگ بدر میں اہل مکہ کے جو لوگ گرفتار ہو کر جنگی قیدیوں کی حیثیت سے سامنے لائے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آزادی کی ایک شرط یہ رکھی کہ جو پڑھا لکھا ہو وہ دس صحابیوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔ یہ پڑھانے والے مسلمان نہیں کافر تھے اور پڑھنے والے معمولی مسلمان نہیں صحابۂ کرامؓ تھے اور اس کی اہمیت کو جاننے والے خود رسول کریمؐ تھے جو خود پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے مگر عام بنیادی تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ بعد میں ان ہی صحابۂ کرامؓ کی وجہ سے مدینہ میں تعلیم عام ہوئی۔ قرآن حکیم کی آیات کو لکھ لینا اور احادیث نبوی کے لفظ لفظ کو محفوظ کر لینا اسی کے بعد آسان ہو سکا۔

منصوبہ بندی کا عام مفہوم

عام طور پر منصوبہ بندی کے چار مراحل ہوتے ہیں مقصد کا تعین جس کے لیے نقشے اور پلان بنانا ہے۔ دوسرے مرحلے پر ضروری وسایل اور سرمایہ مہیا کرنا، تیسرے مرحلے پر اصل کام شروع کرنا جس میں سارے عوامل ایک ساتھ حرکت میں آجاتے ہیں۔ اور جب منصوبہ مکمل ہو جائے تو یہ جانچ پڑتال کرنا کہ آیا وقت پر کام ہوا کہ نہیں۔ کہاں کہاں خامیاں رہ گئیں اور کس ڈھنگ اور معیار کا کام ہوا ہے۔ یہ جانچ اس لیے ضروری ہے کہ آئندہ کام کرنے میں آسانیاں پیدا ہوں۔

تعلیمی منصوبہ بندی کی ضرورت

ہمیں جس منصوبہ کا خاکہ پیش کرنا ہے وہ "جنرل ایجوکیشن" پرائمری تا سکنڈری ایجوکیشن سے متعلق ہے۔ دستور ہند کی دفعہ ۴۵ کے تحت اس کو "لازمی جبری تعلیم" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ۶ تا ۱۴ سال کی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کو مفت ابتدائی تعلیم دیں تاکہ وہ ۱۴ سال کی عمر تک ساتویں جماعت کامیاب کر لیں۔ گو یہ بات دستور ہند میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری بتلائی گئی ہے لیکن اب تک دو تین مرتبہ حکومت کو ناکامی ہو چکی ہے۔ اب نیا ٹارگٹ ۱۹۹۵ رکھا گیا ہے لیکن یہ بھی ناکام ہو جائے گا۔

یہاں ایک بات کہنے کی یہ ہے کہ اگر ہم اپنے تعلیمی منصوبہ بندی کے پروگرام پر عمل کریں تو دستور ہند کی لازمی جبری تعلیم کی ایک اہم دفعہ کا مقصد پورا کرنے میں مسلمان بحیثیت قوم اپنا حصہ ادا کر سکیں گے۔

۳۔ ملک میں عام تعلیم کا اوسط ۳۶ فی صد ہے اور مسلمانوں کا ۲۵ فیصد کے لگ بھگ ہے۔ مسلم عورتوں میں تعلیم کا فی صد برائے نام ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سو میں ۷۵ آدمی پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ ان پڑھے لکھے افراد

میں غالب اکثریت ایسی ہی ہے جن کی تعلیم چوتھی یا پانچویں جماعت تک ہوتی ہے یا پھر حرف شناس ہیں یا جو شُد بُد لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔

۳۔ اکثر شہروں میں مسلم ایجوکیشنل سوسائیٹیز کی جانب سے کھولے گئے پیشہ ورانہ کالجوں میں اب یہ شکایت عام ہو چکی ہے حکومت کی جانب سے منظور شدہ نشستوں میں پچاس فی صد بھی مسلم امیدوار دستیاب نہیں ہوتے۔ یہی حال جامعہ ہمدرد کے بعض کورسس کا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک جگہ پر ۲۰ نشستوں میں صرف ایک مسلم امیدوار شریک ہو سکا۔

اس کا سبب عام طور پر یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ مسلم طلبا میں مسابقت کا جذبہ نہیں، ان کا معیار تعلیم پست ہے، طلبا کو زیادہ فکر باہر جانے کی رہتی ہے، عام بے حسی وغیرہ۔ بے شک یہ تمام باتیں کسی حد تک صحیح ہیں لیکن ۹۰ فیصدی اصلی سبب ہماری پرائمری اور سکنڈری ایجوکیشن کی طرف سے لاپرواہی اور بے حسی ہے۔ جب تک بنیادی پرائمری اور سکنڈری تعلیم کا پھیلاؤ وسیع نہ ہوگا، یہ تعلیمی اہرام" کبھی بلند نہیں ہو سکتا۔

۴۔ ہندوستان کے مزاج کے مطابق جمہوریت اور سیکولرزم یہ دونوں ایسی نعمتیں ہیں کہ مسلمان پوری طرح ان سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ بھی وہی تعلیم سے محرومی ہے۔ جمہوریت ایسا نظام حکومت ہے جس میں سب شہریوں کو اپنا حق پانے، اپنا حق منوانے، اپنا حق لینے کا حق ہے مگر اس کے لیے تعلیم اہم شرط ہے۔

تعلیمی منصوبہ بندی کے اہم خد و خال

یہ پہلا پنج سالہ منصوبہ جنرل ایجوکیشن ساتویں جماعت تک تعلیم دلوانے کے پروگرام سے متعلق ہوگا۔ دس سال تک ہماری توجہ اسی ایک بنیادی مقصد پر مرکوز رہے تو اچھا ہے۔ البتہ خود طلبا اور والدین میٹرک تک طلبا کو لے جانا چاہیں گے جب انھیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

اس کام کے لیے منڈل، سیٹی، تعلقہ، ضلع اور ریاستی سطح پر جنرل ایجوکیشن کمیٹیاں قایم کی جا سکتی ہیں چونکہ تعلیم کا کام سب ہی کا ہے اس لیے مقامی سیاسی سماجی، مذہبی، ادبی انجمنوں کے کارکن آگے آ سکتے ہیں۔ اس کمیٹی کا کام یہ ہوگا کہ بڑے شہروں میں محلہ داری اور چھوٹے قصبات میں پوری آبادی کا گھر گھر جا کر ایسے بچوں کا نام رجسٹر کریں جو کسی اسکول میں نہیں پڑھتے ہیں۔ یہ کام ایک مرتبہ کرلیں تو پھر بھی اعداد و شمار ۵ برس تک کام آ سکتے ہیں۔ یہ کمیٹی کوشش کرے کہ ان بچوں کو جن کی عمریں ۵، ۶ سال ہو چکی ہیں کسی نہ کسی سرکاری مدرسے یا پھر خانگی مکتب میں شریک کروادیں۔ اس کے لیے والدین کو بھی سمجھانا بجھانا ہوگا۔ جب یہ بچے شریک ہو جائیں تو "ڈراپ اوٹ" کو روکنے کے لیے ان پر مسلسل نگرانی کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ مسلم طلباء اگر ۱۰۰ پہلی جماعت میں داخلہ لیں تو میٹرک تک پہنچنے تک صرف دس رہ جاتے ہیں۔ باقی درمیان ہی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کمیٹی کا کام یہ بھی ہو کہ مقامی جمع شدہ سرمائے سے غریب طلباء کی مدد کرے۔ شہر میں ایسے بہت سے ادارے ہیں جو اُن کی مدد کر سکتے ہیں۔

> "غیر قوموں نے ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ جیسا کچھ خیال کیا ہے اور لکھا ہے اس میں یقینی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں ہیں مگر جو اصلی حالت عورتوں کی بلاشبہ ترقی کے لائق ہے اور ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔"
>
> (سر سید احمد خاں)

فوائد :-

ایسے مقامی افراد جنھیں اس کام سے دلچسپی ہوگی، ان کا تعلق گھر گھر سے ہو جائے گا۔ جو مواد جمع کیا جائے گا، وہ مردم شماری، مادری زبان، پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط اور ان غریب لوگوں کے مسایل سے واقفیت پیدا ہو جائے گی جن کی یہ کمیٹی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اگر پانچ سال یہ کام مسلسل جاری رہے تو اس مقام یا قصبہ کی آبادی میں کوئی بچہ بغیر ابتدائی تعلیم کے نہ رہ جائے گا۔

اس اسکیم کی خوبی یہ ہے کہ یہ کام کسی سطح پر شروع کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی ریاستی مرکزی تنظیم اس کام کو سنجیدگی سے شروع کرے اور چھوٹے بڑے مقامات پر اس قسم کی جنرل ایجوکیشن کمیٹیاں قایم کرے تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ اس کام کو شروع کرنے کے لیے آپ کو کسی سیمینار، سمپوزیم یا کانفرنس کے رزولیوشن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ تین دو روپے کا رجسٹر خرید لیجیے، اٹھ کھڑے ہو جاؤ، دیکھیے کام شروع ہو گیا۔

"بے شک یہ پہلا قدم ہی بہت بڑے انقلاب
کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔" (مولانا آزاد)

ع وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی (حالی)

آپ شاید اس راز سے واقف نہیں کہ بھلائی کے چھوٹے کام سے بھی آدمی کتنا بڑا ہو جاتا ہے اور پھر یہ کام ایسا ہے جو ہر قسم کے سیاسی، مذہبی، سماجی، معاشی، معاشرتی، دینی و دنیوی کام کے لیے بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ کام آج بھی نہ ہوا تو پھر ملت کی قسمت میں حرمان نصیبی کے سوا کچھ نہیں۔

"جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہو تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو، کیوں کہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو ختم کر دو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔"

سرسید

انقلاب

ظہیر احمد صدیقی*

ارسطو نے لکھا ہے کہ:

"انقلاب چھوٹی چھوٹی باتوں سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔"

نپولین کا قول ہے کہ:

انقلاب تو کھاد اور کوڑے کے بدبو دار ڈھیر کی طرح ہے جس میں سے اعلیٰ ترین پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔"

لٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"اصلاح تو خامیوں کی ہوتی ہے، انقلاب کا مطلب ہے تبدیلیٔ قوت۔"

"انقلاب" ایک بہت چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس کے اندر معانی کا ذخیرہ پوشیدہ ہے۔ بعض لوگ انقلاب اور بغاوت کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ انقلاب تعمیرِ نو کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور بغاوت چیزوں کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ انقلاب اگر عمارت کو مسمار کرتا ہے تو اس لیے کہ ایک نئی تعمیر ممکن ہو سکے اور بغاوت صرف تبدیلی کی قایل ہے۔ خواہ تخریبی ہو یا تباہی سے۔ انقلاب محض سیاست کا لفظ نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی ضرورت خود انسان کے اندر ہوتی ہے۔

ارسطو نے لکھا ہے کہ:

"انسان کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کر کے اس میں انقلاب پیدا کرے۔"

ایک کہاوت ہے:

"ذہنی یک سوئی انسانی زندگی کی تمام طاقتوں کو مرکوز کر کے ذہنی انقلاب پیدا کرتی ہے۔"

یہ ذہنی انقلاب اگر انسان کے اندر لتنے دبے پاؤں داخل ہو جاتا ہے جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی زندگی کا چھوٹا سا واقعہ انسانی زندگی کے رویے کو بدل دیتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ ہم ایک قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ہم نے جنگل کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور سو گئے۔ ایک مجذوب جو ہمارے ساتھ تھا ابھی تھوڑی ہی رات گزری تھی کہ اس نے چیخ ماری اور جنگل کی طرف نکل گیا۔ دن میں جب وہ واپس آیا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ رات کیا بات تھی جس نے آپ کو سونے نہیں دیا۔ مجذوب نے جواب دیا

---

* پروفیسر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

رات میں نے پرندوں کو خدا کی یاد میں مصروف دیکھا تو انصاف کے خلاف سمجھا کہ میں انسان ہو کر اس کی یاد سے غافل رہوں اور بے زبان خدا کی تسبیح کریں۔ یہی جذبہ تھا جس نے مجھ میں انقلاب پیدا کر دیا۔

صوفیوں نے بھی نفس کی تبدیلی پر زور دیا ہے۔ ان کی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور اس اندرونی انقلاب پر ہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ باہر کے تمام انقلاب اور ان کا اچھا بُرا ہونا اسی اندرونی انقلاب سے وابستہ ہیں۔

اکسیر پر مہوس اتنا نہ ناز کرنا
بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا

عربی ادب میں یہ فقرہ تسلی کے لیے اکثر دہرایا جاتا ہے کہ:

"مصائب اور شدائد سے نہ گھبراؤ۔ اس لیے کہ
زمانے میں انقلاب تو آتے ہی رہتے ہیں"۔

اس سے مراد یہ ہے کہ قلب کی جلا کے لیے حادثات زمانہ اسی طرح ضروری ہیں جس طرح سونے کو کندن بنانے کے لیے اس کو آگ میں تپانا لازمی ہے۔

گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ ہم ایسا انقلاب چاہتے ہیں جس میں ہر شخص کو اس کی ضرورت کی چیز فراہم ہو سکے ان کا عقیدہ تھا کہ اگرچہ انقلاب جنگ کے ذریعے بھی لایا جاتا ہے مگر یہ راستہ خطرناک بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ اس لیے اہنسا اور صبر ہی وہ طریق کار ہیں جو انسانی دل میں زبردست تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر یہاں اس خطرے سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے کہ بقول برنارڈ شا "بڑی سوسائٹیاں اور سرمایہ دار غریبوں کو صبر اور تحمل کی تلقین سے ان کے انقلابی جذبات کو ٹھنڈا کرتی رہتی ہیں تاکہ سرمایہ دار بے خوف و خطر ان کا خون چوستے رہیں"۔ مگر دانش ور اس فرق سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ کبھی جادۂ اعتدال سے باہر قدم نہیں نکالتے۔

اقبال نے انقلاب کی اہمیت اور ضرورت پر جس طرح زور دیا ہے وہ انسانی زندگی کا منشور بن گیا ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

[آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ]

بقیہ مضمون مائیکرو الیکٹرانکس۔ متعلقہ صفحہ نمبر

گیا ہے۔ یہ کارخانہ ہندوستان میں جدید طریقہ کے مائکرو پروسیسر وغیرہ بنانے اور دیگر نئے نئے ICs بنانے کے لئے کھولا گیا ہے۔ ان سرکٹ کا استعمال دفاعی امور میں کافی ہوتا ہے لیکن اس سال اس کامپلیکس میں آگ لگ جانے سے کافی نقصان ہوا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ جلد ہی یہ پورے پیمانے پر کام کرنے لگے گا اور ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرے گا۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق [illegible] - ج ۸ - ش ۱۱ (نومبر ۱۹۸۹ء)

روشنی

ہارون الرشید خاں*

دورِ حاضر میں مادیت پرستی کی وجہ سے جہاں قوموں کے مزاج بدلے ہیں، اعلیٰ قدریں مجروح ہوئی ہیں۔ بدعنوانیوں نے جڑیں پکڑی ہیں، استحصال عام بھی رونما ہوا ہے وہیں نیک شریف النفس انسانوں کا فقدان نہیں رہا ہے۔ آج ہم راکھ میں سونے کی تلاش نہ کرکے سونے میں راکھ کی تلاش کرتے ہیں۔ ضرورت ہنر بینی کی ہے۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس حقیقت پر مبنی ہے۔

جھری تلیا ضلع ہزاری باغ (بہار) میں واقع ہے۔ یہاں ملک میں سب سے زیادہ کثیر ابرک کی کانیں ہیں۔ ملک گیر پیمانے پر نغموں کی فرمائش کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد یہاں ہے۔ یہیں صوبہ بہار کا مشہور 'تلاڈیم' ہے جس کی بنیاد آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈالی تھی۔ جھیل کئی مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کی دو جانب اونچے پہاڑ دیوار کا کام کرتے ہیں۔ قدرتی مناظر اور جنگل سے گھرا ہوا ہے۔ دور دراز علاقوں میں آبادی بھی ملے گی۔ آدی واسی تو نہیں لیکن مخلوط قسم کی ذاتیں رہتی ہیں جو غریب لیکن سادہ لوح اور صاف ستھرے ملیں گے۔ اسی ڈیم کے قریب ایک مشہور باوقار تعلیمی ادارہ 'سینک اسکول' ہے جس میں '2 + 10' کی تعلیم انگریزی زبان سے دی جاتی ہے۔ اس طرح کے لگ بھگ بیس ادارے ہندوستان میں صوبائی سطح پر ہوں گے جس میں ہندوستان کی افواج کے لئے افسر تیار کئے جاتے ہیں۔

مجھے کیا پتہ کہ ایک روز اس علاقہ کا سفر برائے معاش کرنا پڑے گا۔ اس تعلیم گاہ کا وجود قدیم ہندوستان کے 'گرو کل طریقہ تعلیم' کی یاد تازہ کرتا ہے۔ یہ رہائشی ادارہ ہے، قدرتی مناظر کے دامن میں یہ ادارہ بھلا لگتا ہے۔

مجھے شروع سے ہی سیاحت کا شوق رہا ہے۔ ہندوستان کے خوبصورت علاقوں کو دیکھنا اور مختلف علاقوں کے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے لیکن اس جذبہ کی تکمیل میں غربت اکثر آڑے آتی۔ میں نے ۱۹۷۹ء میں اپنے بچوں کے ساتھ صوبہ پنجاب کے سفر کا ارادہ کیا۔ تعلیم کا اس سے بڑھ کر اور کوئی ذریعہ نہیں جو بچوں میں بھروسہ اعتماد اور حب الوطنی کی قوتیں پیدا کرتا ہے۔ تنخواہ تو کم ملتی تھی لیکن دیگر مراعات اچھی خاصی تھیں، اسکول جاڑے کی تعطیل میں بند ہو گیا۔ بچے اور زیادہ تر اسٹاف بھی۔ اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ اگر میں کبھی ان چھٹیوں میں نہ جاتا تو لوگ پیٹھ پیچھے یہ کہتے کہ اس کا کوئی نہیں۔ حالانکہ اندر اندر گھٹن ہوتی، بیوی اور بچوں کو اس کا احساس نہ ہونے دیتا۔ خطرہ مول لے کر کوئی نہ کوئی مشغلہ تلاش کرلیتا۔ دریں اثناء تھوڑا تھوڑا کرکے سفر کے اخراجات کے

---

* پرنسپل کریم کالج آف ایجوکیشن جمشید پور (بہار)

لئے تنگی کے باوجود اسکول کے احاطہ میں واقع اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں، کچھ رقم جمع کرنا شروع کر دیا تھا جو میری گاڑھی حلال کمائی کی جمع کردہ پونجی تھی۔

سفر کی تمام ضروری تیاریاں کر لی گئیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے کچھ رقم لدھیانہ سے اون لانے کے لیے دی۔ ۱۳ر دسمبر کو بینک سے قریب ایک ہزار روپے نکلوایا۔ سامان پہلے ہی پیک ہو چکا تھا۔ صندوق میں بیگم نے قفل لگا دیا تھا لہذا اس رقم کو میں نے اپنے کالے پرس میں رکھ لیا۔ بینک کی پاس بک کو بیگم صاحبہ کے پرس میں ڈال دیا ــــ شام کو قریب سات بجے 'کوڈرما' ریلوے اسٹیشن سے 'سیالدہ جموں تاوی' سے سفر کرنا تھا۔ لہذا شام کو اسکول کی گاڑی دروازے پر آکر لگ گئی۔ گھر کو مقفل کیا گیا اور مکان کی کنجی بھی مسز نے اسی پرس میں رکھ لی۔ عموماً یوں ہی مزاج کی خواتین دوران سفر اپنے پرس کو اچھا خاصا گٹھری کا روپ دے دیتی ہیں۔ بناؤ سنگار کے سامان سے لے کر روزمرہ کی کچھ اشیاء رکھ لینا کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی۔

کچھ ہی گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم سبھی اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ قلی نے تمام سامان ایک جگہ پلیٹ فارم پر رکھ دیا۔ میں نے سمر سوٹ پہن رکھا تھا جس کا استر ریشمی تھا۔ یکایک ذہن میں یہ بات نہ جانے کیسے آئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سامان ڈبے میں چڑھاتے وقت پرس جس میں رقم رکھی گئی ہے گاڑی کے نیچے نہ کھسک جائے لہذا اسی خدشہ سے پرس کو اور ریلوے ٹکٹوں کو بیگم کے حوالہ کر دیا جنھوں نے اسے اپنے پرس میں رکھ لیا۔

گاڑی آدھے گھنٹے لیٹ تھی۔ بچے ادھر اُدھر ہنگامہ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ٹرین کے آنے کا اعلان ہوا پھر تو قلی بھی آگیا۔ سبھی سامان لے کر ٹرین کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ گاڑی دندناتی ہوئی آپہنچی۔ ڈبے کھچا کھچ مسافروں سے بھرے تھے۔ ہمارا سامان کوچ نمبر ۲ کے ۴۳ اور ۴۴ نمبر کی برتھوں پر رکھ دیا گیا۔ یہ برتھیں کھڑکی کے سامنے تھیں۔ بیگم نے ہولڈال پھیلا دیا اور سبھی بیٹھ گئے اور جب گاڑی چل ہی پڑی تھی کہ کسی کے رونے کی آواز آئی۔ آواز کسی اور کی نہیں دھنباد سے سسرال سے اپنے دولہا کے ساتھ میکے کے لئے واپس جانے والی ایک دلہن کی تھی۔ اس کا سوٹ کیس جس میں زیورات بھی تھے غائب ہو چکا تھا۔ پھر کیا تھا جھوٹی ہمدردی اور کیوں، کہاں اور کس نے جیسے تمام سوالات مسافروں کی جانب سے آنے لگے۔ بے بس دلہن کو مجبوراً صبر ہی کرنا پڑا۔ کچھ لمحوں کے بعد ہماری ایک بیٹی کو پیاس محسوس ہوئی تو گلاس کی تلاش ہونے لگی معلوم ہوا وہ بھی غائب ہو چکا ہے۔ یہ حادثات بڑے خطرے کی پہلی گھنٹی تھے۔ شام آہستہ آہستہ تاریک رات میں بدل چکی تھی اور زیادہ تر مسافر سو چکے تھے اور صرف میل ٹرین کی سنسناہٹ ہی مجھے نیم بیداری میں سنائی دے رہی تھی۔

ٹرین دوسرے دن صوبہ اتر پردیش کے اکبرپور (فیض آباد) پہنچی اور ضلع بستی پہنچتے پہنچتے صبح ہو چکی تھی۔ ریزرویشن کے ڈبہ کو عام مسافر کے ڈبے میں تبدیل ہونے میں دیر نہ لگی۔ نوجوان اور نہ جانے کتنی طرح اور کس کس قسم کے مسافر گھس پڑے۔ جہاں کہیں مستورات بیٹھی تھیں وہاں کچھ زیادہ ہی ریل پیل تھی۔ یہ اودھ کا مرکزی علاقہ تھا اور لکھنو یہاں سے دور نہ تھا۔ نئے آنے والے مسافروں کی گندی زبانوں نے ہمیں سہما کر رکھ دیا تھا۔ کسی طرح سفر جلدی طے ہو اور یہ منحوس صورتیں کچھ کہہ اور کر نہ بیٹھیں اسی قسم کی کس مپرسی کے عالم میں دیکھتا ہوں کہ دو تین بیہودے نوجوان ہماری اوپر کی برتھ پر لیٹ گئے ہیں۔ میں نے انھیں چھیڑنا بہتر نہیں سمجھا لیکن دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا کہ حکومت اتنی ناکارہ ہو گئی ہے کہ معصوم مسافروں کو یہ خونخوار اور خود غرض لوگ تنگ کر رہے ہیں۔

یہ گاڑی صبح ساڑھے آٹھ بجے چار باغ لکھنو ریلوے جنکشن

پہلیٹ فارم نمبر ایک پر جیسوں ہی رکی ایک طرف مسافروں کا اندر داخل ہونے کا ریلا اور دوسری طرف اندر سے باہر جانے کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ صبح کا وقت ہے، بیشتر مسافر ناشتہ وغیرہ کے لیے لائن میں لگ جاتے ہیں۔ مجھے لکھنو دیکھے قریب چار یا پانچ سال گزر چکے تھے۔ ہمارے صوبہ کی راجدھانی بھی تھی اور بچوں کا چائے پانی کا بہانہ بھی۔ بیگم صاحبہ سے کچھ پیسوں کی مانگ کی اور بیگم صاحبہ نے اپنے پرس کو اپنے بستر کے نیچے سے نکال کر ہلکی رقم عطا کی اور میں چائے کے لیے لپک پڑا اور تھوڑی ہی دیر میں چائے کے پیالوں کے ساتھ کھڑکی کی جانب سے چائے کا پیالہ لے کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ میری نظر بیگم کی طرف پڑی وہ بے حد مضطرب اور بستروں کو ادھر اُدھر الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ فوراً پوچھا آخر کیا ہوا ؟ ان کا جواب سُن کر جھٹکا لگا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ ادھر بیگم پیلی پڑ گئیں۔ ان کا پرس تمام اشیاء سمیت اچکا جا چکا تھا۔ ہائے رے لکھنو تہذیب کا گہوارہ کہ چوراچکوں کا ......! اتنی مشکل سے دھن اکٹھا کیا جو سرعام دن دہاڑے اٹھا لیا گیا۔ اب سفر کے لیے دو دن اور ایک رات باقی تھی۔ آخر ان ننھے بچوں نے اس نگری کے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ انھیں ناشتہ لنچ وغیرہ کون دے گا۔ کس سے مدد کی فریاد کروں۔ کیا محکمہ پولیس کی مدد لوں۔ سفر جاری رکھوں یا یہیں سے ترک کر کے اپنے وطن واپس چلا جاؤں۔ لکھنو میں رشتہ داروں یا دوستوں کے پاس چلوں۔ وہ یقین بھی کریں گے یا نہیں۔ یہ تمام سوالات بہت ہی تند رفتاری کے ساتھ ایک ایک کر کے ذہن میں آرہے تھے۔ آخر میں یہ طے کیا کہ اترنا ہی بہتر ہوگا۔ بیگم سے بستر سمیٹنے کے لیے کہا۔ وہ جلدی جلدی سمیٹنے میں مصروف ہوگئیں۔ ادھر ٹرین نے بھی سیٹی دے دی۔ آس پاس کے مسافر یہ سب نظارے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔

ادھر ہم نیچے اترنے کی تیاری میں سرگرم تھے کہ یکایک اس ناامیدی کے لمحات میں مکاری، چور بازاری، خودغرضی نفرت اور فرقہ پرستی کے دور میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جیسے انسانی ہمدردی کا دریا امنڈ پڑا ہو۔ اور اس ہمدردی کا پیکر اوّل ایک ماں نکلی جو صوبہ پنجاب کی چندی گڑھ کی رہنے والی تھی اور جن کا مذہب اسلام نہ تھا۔ انھوں نے ایک پچاس روپے کا نوٹ نکال کر میرے حوالہ کیا اور کہا کہ اسے اپنے بچوں کے لیے لو اور سفر جاری رکھو۔ گاڑی بھی رینگنے والی تھی کہ کنڈکٹر جو ایک لمحہ سے ان واقعات کا جائزہ لے رہا تھا کہا کہ بھائی سفر جاری رکھیں جہاں تک جاؤں گا لیتا چلوں گا اور جو بھائی مجھے ریلیو کرنے آئیں گے ان سے آگے لے جانے کی درخواست کروں گا۔ فوراً ہی بغل میں تشریف فرما ایک بزرگ جنھیں بریلی تک جانا تھا جن کے سر پر صافہ اور کرتا صدری اور لنگی پہنے تھے اور ہاتھ میں چھڑی تھی نے اپنے رومال کا کونا کھولا پچاس روپے کا نوٹ پکڑا دیا۔ "حضور پتہ ڈائری میں درج کرا دیں" میں نے گزارش کی۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے نیکی کی اطلاع تک نہیں دیتے" انھوں نے کہا۔ آپ مسلمان تھے۔

ٹرین نے اپنا راستہ ناپنا شروع کر دیا۔ ان سے بات ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ دھنباد ضلع کے شرما گارڈ صاحب جو اپنی فیملی کے ساتھ اسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے کہا "ارے بھئی، میرے پاس صرف ۲۵ روپے ہیں اسے لے لیں۔ پوری رقم ایک سو پچیس روپے ہو چکی تھی جو سفر کے اخراجات کے لیے کافی تھی۔ اسی بیچ بھٹنڈا جانے والے ایک مسافر نے ایک دوسری پیش کش کی۔ دیکھئے بھائی صاحب میری ماں میرے ساتھ ہیں میرے پاس پیسے تو نہیں ہیں آپ میرے ساتھ چلیں کیا پتہ جہاں آپ جا رہے ہیں وہ عزیز وہاں نہ ہوں یا کوئی اور حادثہ پیش آ جائے۔

میں اپنے گھر سے اُن کی موجودگی کی خبر لے کر مع خرچ وہاں پہنچا دوں گا۔ اگر وہ ظہیر حاضر ہوں گے تو آپ کو با قاعدہ تمام خرچے کے ساتھ جھری تلیا پہنچا دوں گا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس خود غرض زمانے میں بھی نیک لوگوں کی کمی نہیں۔ میں نے ان سب کو دل سے دُعائیں دیں۔

اس طرح دوسرے دن لدھیانہ گاڑی علی الصباح چار بجے پہنچی اور سردار جو آخری کنڈکٹر تھے قلی کو آواز دی اور کہا کہ صاحب کا سامان لے کر مدراس اکسپریس جو سنگرور کے لیے جاتی ہے بٹھا دو۔ قلی نے بھی محنتانہ نہیں لیا اور تھوڑی دیر میں سردار جی ہم سب کا ٹکٹ لے کر آ گئے جس کا بھگتان انھوں نے خود کیا تھا اور اس طرح ہم سب کا سفر سنگرور کے لیے شروع ہوا اور دوپہر کو گاڑی اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ یہاں سے اپنے عزیز کے یہاں ٹیلی فون کیا۔ ان کی اہلیہ جیپ کے ساتھ آ گئیں۔ ادھر میں نے بیگم سے اس بات کی سخت تاکید کر دی تھی کہ اس واقعہ کا ذکر نہ خود کریں اور نہ ہی بچوں کو کرنے دیں۔ مجھے بے جا ہمدردی لینا قطعی پسند نہ تھا۔ مجھے وہاں پہنچے ہوئے قریب تین دن ہو چکے تھے۔ بیگم اور خود میرے چہرے پر بھی مایوسی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ چونکہ سفر کے تمام مقصد پر پانی پھر چکا تھا۔ اس سوچ نے کہ کیسے گھوما پھرا جائے اور واپس کس طرح جاؤں گا۔ تیسرے دن جب مکان مالک آفس جا چکے تھے۔ دونوں بہنیں اور تمام بچے کھیلنے میں مصروف تھے میں نے ایک پوسٹ کارڈ میں تمام واقعات کو قلم بند کر دیا اور گھر کے آرڈرلی (اردلی) سے پوسٹ کرنے کی درخواست کی۔ یہ خط اپنے دوست کو لکھا تھا کہ وہ ہماری فوراً امداد کرے۔ اس خط میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔

قدرت کو شاید اچھا ہی منظور تھا اُردلی جیوں ہی یہ کارڈ لے کر بازار کی جانب سے ایس پی صاحب کے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ میم صاحب کی نظر خط پر پڑ گئی۔ بغیر تامل اُس کو لے کر پڑھ ڈالا۔ ان کا حق بھی تو تھا کیوں کہ رشتہ میں سالی ہوتی تھیں۔ بہن کو بُرا بھلا کہنے لگیں کہ تم نے اس کی اطلاع پہلے کیوں نہ دی۔ خیر فکرمند نہ ہو۔ اس کی اطلاع انھوں نے شام کو اپنے شوہر کو بھی دی۔ انھیں بھی اس بات کی حیرت ہوئی۔ خیر ضرورت سے زیادہ ہمدرد اور مہربان ہو گئے۔ کافی سیر کرنے کا موقع ملا۔ ایک ماہ تک رہنے کے بعد ایک ایک کے لیے اون کا لباس اور ڈھیر ساری رقم اور امرتسر ہوڑہ میل میں فرسٹ کلاس ڈبہ میں بٹھا کر رخصت کیا۔

وقت کے ساتھ سانحے کا بھول جانا لازمی تھا لیکن اس بات کا صدمہ رہا کر تا کہ میں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کی سزا ملی "حلال روزی کی چوری نہیں ہوتی" یہ تو سنا تھا لیکن اب لگا کہ جھوٹا ہے۔ اس قسم کا عقیدہ مجروح ہونے لگا لیکن اکثر و بیشتر یہ سوچتا رہا کہ محنت کی کمائی کی چوری ممکن نہیں اور آدمی خواہ کسی مذہب و فرقہ کا ہو۔ بنیادی طور پر انسان ہے اور جب بھی آزمائش کی گھڑی آتی ہے اس کا انسانی جذبہ ابھر آتا ہے جس کو بنائے رکھنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

۳۰ رجون ۱۹۸۰ء کو جمشید پور اپنی نئی تقرری کے انتظار میں تھا اور ادھر سینک اسکول میں گرمی کے انتظار کے بعد طلبا، اپنی واپسی کی رپورٹ کر رہے تھے۔ اس رپورٹ کو اسکول کے دیگر عہدیداران کے حوالہ کرنا تھا۔ صبح سے سہ پہر تک بچوں کے والدین و گارجین کے ملنے ملانے کی وجہ سے مصروف رہا اور لنچ بھی نہیں لے سکا۔ ٹھیک اسی وقت بیگم صاحبہ اپنی رہائش گاہ سے سڑک کو لانگھتی ہوئی میرے آفس میں آئیں۔ بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ " دیکھئے نا ہمارا سامان مل گیا! یہ خط آیا ہے۔" یہ بات میری سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔ فوراً انھوں نے ایک ان لینڈ خط حوالہ کیا اور سامان

ملنے کا جملہ دُہراتی رہیں۔ جب میں نے خط کی عبارت پر نظر ڈالی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"محترمی! یہ خط تو آپ کے پاس چھ مہینے پہلے پہنچنا چاہیے تھا۔ امید ہے آپ اس اخلاقی جرم کو معاف فرمائیں گے۔ اللہ بہتر جاننے والا ہے کہ ہر لمحہ یہ خیال رہا کہ بس ابھی خط لکھ دوں اور جس قدر جلد ممکن ہو یہ امانت حقدار کو پہنچ جائے لیکن کچھ تو مصروفیات۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بیماری آڑے آئی۔"

آپ حیران نہ ہوں۔ آپ کا یہ پتہ آپ کے پاس بک سے لیا ہے۔ اب یہ لکھ بھیجیں کہ پرس کس رنگ کا اور اس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ یہ اس لیے لکھ رہی ہوں کہ یہ امانت صحیح حقدار کو پہنچ جائے۔ یہ پرس میرے ماموں جان کو ملا تھا۔ چالیس گاؤں جاتے ہوئے میرے ماموں پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ملنے ملانے کی وجہ سے مصروف رہے اور ہم سب بھی پاکستانی مہمانوں میں الجھے رہے، جاتے ہوئے وہ یہ ذمہ داری مجھے سونپ گئے تھے۔ میرے شوہر بھی خط لکھنے میں کاہل ہیں حالانکہ ان کا کام درس وتدریس کا ہے۔ ایک بار پھر معافی چاہوں گی۔ اس تاخیر کی نیت کا حال اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے۔ اس معصوم بچہ کو پیار جس کے فوٹو اس میں رکھے ہیں۔ اس کی ماں کو سلام۔

میرا گھر کانپور میں ہے۔ وہیں سے میرے ماموں اورنگ آباد جا رہے تھے۔ پاس بک میں جتنا پتہ ہے لکھ رہی ہوں۔ اللہ جانے یہ خط صحیح جگہ پہنچے گا یا نہیں۔ اللہ حافظ

فقط والسلام

"ایک نہایت عاجز ومسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اس شخص کا اس زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیوں کہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

(سرسید احمدؒ)

علی گڑھ — چند یادیں

سید بہار الحق رضوی *

۱۹۴۷ء کا پر آشوب زمانہ تھا کہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوا ۔ طالب علموں کی زیادتی کی وجہ سے مجھے ممتاز ہوسٹل کی انیکسی میں جگہ ملی جو ایک کوٹھی تھی اور ظہیر الدین صاحب علوی استاد شعبۂ اردو کے مکان ' علوی لاج ' کے مقابل تھی۔ اس میں کئی طالب علم مقیم ہوے۔ اس جگہ کی یہ خصوصیت تھی کہ ہوسٹل کی سی پابندی ممکن نہ تھی ۔ ہر طالب علم جس وقت چاہتا جہاں دل چاہے جا سکتا تھا اور جب چاہے واپس آسکتا تھا لیکن ہوسٹل کی اقامت کی زندگی کی بعض خوبیوں سے سبھی طلبا محروم رہتے تھے سامنے رمضانی کی دکان تھی جو مٹھائی بناتا تھا اور دودھ فروخت کرتا تھا ۔ یہ دکان ہمارے لیے رحمت اور زحمت دونوں کا باعث تھی۔ رحمت اس لیے کہ ضروریات کی چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں اور زحمت اس لیے کہ اس دکان کی وجہ سے ہمارے ماہانہ مصارف میں کافی زیادتی ہو جاتی تھی اور کھانے کی کمی اور خرابی کو دور کرنے میں رمضانی کی یہ دکان ہماری مددگار ہوا کرتی تھی۔ آرٹس کے تمام ڈپارٹمنٹس ایس۔ ایس ہال میں تھے ۔ لہذا مجھے کلاسوں کے لیے ایس۔ ایس۔ ہال میں جانا ہوتا اور دوپہر کو دیر میں آنا ہوتا۔ حالانکہ ایس۔ ایس۔ ہال قریب تھا لیکن ایس ایس ہال کے مقیم طلبا کی سہولتیں ہمیں حاصل نہ ہو پاتیں ۔

علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کی پرانی خواہش تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی خواہش علامہ عبدالعزیز المیمنی (مرحوم) کو دیکھنے کی بھی تھی اور اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ رامپور میں میرے ایک استاد مولانا سیّد شجاعت علی صاحب (مرحوم) تھے جو مجھ سے علامہ موصوف کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ مولانا نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ رام پور میں ہم تین طالب علم مولانا عرب طیب مکی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ۔ ایک مولانا عبدالعزیز المیمنی دوسرے مولانا محمد سورتی اور تیسرے وہ خود ۔ کبھی کبھی یہ بھی فرماتے تھے کہ مولانا محمد سورتی قرآن اور حدیث میں طاق تھے ۔ میمن صاحب ادب اور زبان میں اور اپنے بارے میں دعویٰ کرتے کہ وہ دونوں میں طاق ہیں ۔

ایک مرتبہ مولانا شجاعت علی صاحب نے جب کہ میں ان سے پڑھا کرتا تھا مجھ سے ایک خط علامہ میمن صاحب کو لکھوایا تھا جس میں اپنے بیٹے کی تاریخ انتقال لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ جس کا جواب بھی علامہ نے مولوی شجاعت علی صاحب کو بھیجا تھا ۔

میرے پاس اختیاری مضامین میں عربی بھی تھی۔ لہذا میری بہت زیادہ امیدیں وابستہ تھیں کہ مجھے موصوف کی شاگردی کا شرف حاصل ہو جائے گا اور ان سے قرب حاصل ہو گا

---

* ایڈوکیٹ ، ڈسٹرک کورٹ ، رام پور ، یو۔پی :

لیکن جب میں علی گڑھ گیا اور طلبا سے ملاقات ہوئی تو پتہ
چلا کہ علامہ صرف ایم۔اے کے کلاس لیتے ہیں اور ریسرچ کے طلبا
کو ہدایات دیتے ہیں اور نگرانی فرماتے ہیں۔ بی۔اے کے طلبا کو دوسرے
اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ ہمارے استاد مولانا بدرالدین صاحب
علوی ہوے جو جگت استاد مولانا لطف اللہؒ کے شاگرد رشید
تھے۔ مولانا بدرالدین صاحب علوی ایک نہایت مستند استاد
تھے۔ اپنے شاگردوں پر شفقت اور محبت فرماتے اور ہمارے
سبق کو نہایت آسان طریقے سے پڑھاتے تھے۔ عربی ڈپارٹمنٹ
اس زمانے میں ایس۔ ایس۔ ویسٹ کے ایک کونے میں تھا
جس پر قاعاۃ العربیہ اور ملّا طاہر سیف الدین کا نام کندہ تھا۔
یہ عمارت ملّا طاہر سیف الدین کے عطیے سے تعمیر ہوئی تھی۔ اسی
کے ایک حصے پر کامرس ڈپارٹمنٹ کے چند کمرے تھے۔ میں روزانہ
ڈپارٹمنٹ جا کر اس بات کی کوشش کرتا کہ علامہ موصوف کی زیارت
ہو جائے لیکن مجھے یہی معلوم ہوتا کہ ابھی تشریف نہیں لاے ہیں یا
واپس تشریف لے جا چکے ہیں۔ دو تین روز کے بعد مجھے ساتھیوں
نے اشارہ سے بتایا کہ پروفیسر میمن صاحب تشریف لا رہے ہیں
میں نے ایک تندرست و توانا غالب نما ٹوپی اوڑھے ایک
صاحب کو اونچی سی سائیکل پر آتے ہوے دیکھا۔ میں نے پہلی
نظر میں ان کو علامہ عبدالعزیز المیمنی تسلیم کرنے سے انکار
کر دیا۔ سائیکل جیسی غیر عالمانہ سواری کو علامہ کے علم و فضل سے
ملانے کے لیے میرا ذہن تیار نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ جو
تصور تھا کہ مولانا ایک خمیدہ کمر، کمزور، موٹے شیشوں کا چشمہ
لگائے کوئی بزرگ ہوں گے اور ان کی لمبی داڑھی ہوگی۔ سب
پاش پاش ہو گیا۔ میں نے سلام کیا اشتیاق ظاہر کیا۔ انھوں
نے بہت اچھی طرح جواب دیا۔ میں نے مولانا شجاعت علی صاحب
کا تذکرہ کیا مگر ان کے ذکر میں موصوف نے کوئی خاص دلچسپی نہیں
لی۔ اس طرح یہ میری موصوف سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔
اس کے بعد یونیورسٹی میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ عربی ڈپارٹمنٹ
میں روزانہ جانا ہوتا۔ ساتھیوں اور سینئر طالب علموں سے ملاقاتیں
ہوتیں۔ ڈاکٹر مختارالدین آرزو (سابق صدر شعبۂ عربی اور
اسلامیات) اور مسعود صدیقی صاحبان ایم۔اے کے طالب علم
تھے اور علامہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ وہ میمن صاحب (مرحوم)
کی تعریف میں رطب اللسان رہتے۔ ہم لوگ ان کی قابلیت کے
قصے سنتے اور طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ جس کا بیشتر حصہ علامہ
(مرحوم) کے ذکر سے وابستہ ہوتا۔ اقبال احمد انصاری (پروفیسر
شعبۂ اسلامیات) قمر احمد نقوی (ایڈوکیٹ بدایوں)، وحید الزماں
اور فخرالدین علوی میرے ساتھی طلبا تھے۔ دو سال گزر گئے۔
میمن صاحب کی شاگردی کی خواہش میرے دل میں پروان چڑھتی
رہی۔ حتّٰی کہ وہ وقت آ گیا کہ میں نے ایم۔اے عربی میں داخلہ
لے لیا۔ ضیاء الاسلام جعفری اور اقبال احمد انصاری ایم۔اے
میں میرے ہم سبق ہوے اور میمن صاحب کو قریب سے دیکھنے
کا موقع ملا۔ وہ فاضل اجل تھے۔ ان کی قابلیت اور فضیلت سے
ہم لوگ متاثر ہو سکتے تھے لیکن ان کے صحیح مقام کا تعین کرنا ہمارے
لیے مشکل تھا۔ مستشرقین ڈاکٹر کرنکو وغیرہ کی راے میں وہ
عربی علم و ادب اور زبان کی معلومات کے سلسلہ میں سب سے
اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ زبان اور ادب کی کوئی گتھی جب کسی
سے نہیں سلجھتی تو مولانا میمن (مرحوم) اس کو اشاروں میں
کھول دیتے۔ اپنے بارے میں بھی ان کی راے بہت اعلیٰ تھی
ایک مرتبہ فرمانے لگے: "عربی زبان کے جس لفظ کو میمن نہیں
جانتا اس کو عربی زبان نہیں جانتی۔" وہ کثیر تصانیف کے مصنف
تھے۔ سمط اللآلی اور ابو العلاء المعری کے مصنف تھے۔ ابوالعلا
المعری پر دنیا میں سب سے اہم کتاب ان ہی کی شمار کی جاتی
ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین سے ملاقات کے ذکر میں فرمانے لگے کہ
ڈاکٹر موصوف ابوالعلا پر سند کا درجہ رکھتے تھے لیکن میں
نے ان سے کہا کہ اگر آپ نے میری کتاب نہیں دیکھی تو آپ نے
ابوالعلا پر کچھ نہیں پڑھا۔

میمن صاحب کی باتیں دلچسپ ہوتیں۔ یونیورسٹی کے
اوقات کے بعد لائبریری تشریف لے جاتے۔ بشیرالدین صاحب

لائبریرین سے ملاقات فرماتے، کتابیں دیکھتے اور بازار تشریف لے
جاتے۔ بازار جانے کے سلسلے میں تھیلے پاس ہوتے جن میں تمام
سامان خود خرید کر لاتے اور کسی نہ کسی طالب علم کو ساتھ لے لیتے اور
جوتے اور کپڑے بازار کے لیے مناسب نہ ہونے کی بنا پر اگر وہ
عذر کرتا تو ہمیشہ یہ جملہ فرماتے۔ " ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟ ان
ہی باتوں نے تو علی گڑھ کو تباہ کیا ہے"۔ اکثر موقعوں پر ان کی زبان
سے یہ جملہ نکلتا اور علی گڑھ کی زندگی پر یہ ایک بہت بڑا طنز تھا۔
تین بجے کے وقت دوبارہ سے ریسرچ کے طلبا ان سے مدد
لینے کے لیے اور ہم لوگ ملاقات کے لیے ان کے مکان میمن منزل
پہنچ جاتے اور چائے پیتے جو بڑی بڑی پیالیوں میں ہوتی تھی۔
ہر چیز نفیس اور عمدہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی قیصر علی خاں (ایڈوکیٹ)
بھی میرے ساتھ جاتے اور مولانا سے دلچسپ باتیں ہم لوگ
سنتے جس میں مصر، عراق اور دوسرے مقامات کا تذکرہ بہت
عمدہ پیرایہ میں ہوتا تھا۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ انڈونیشیا کے
ایک فاضل علی گڑھ تشریف لائے۔ عربی سوسائٹی میں جلسہ ہوا
انھوں نے اپنے تھیسس پر تقریر فرمائی جس کا موضوع یہ تھا کہ
انڈونیشیا میں اسلام عرب سے نہیں پہنچا بلکہ ہندوستان کی
راہ سے پہنچا ہے۔ اپنے دعووں کو انھوں نے مدلل طریقے پر ثابت
کر دیا۔ یہ تھیسس ان کی زندگی کا تنہا عظیم کارنامہ تھا۔ تقریر کے
بعد شکریہ ادا کرتے ہوئے میمن صاحب نے ان کے دلائل کا
جواب دیا اور زیادہ وزنی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ یہ
بات غلط ہے۔ انڈونیشیا میں اسلام بلا واسطہ عرب سے پہنچا ہے
ڈاکٹر صاحب موصوف نے میمن صاحب کی تقریر کا پھر جواب دیا
اور میمن صاحب نے دوبارہ دوسرے دلائل سے ان کی تردید کی
ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ڈاکٹریٹ کی بنیاد ان کے
مقالے پر تھی۔ اس لیے ان کو بھی میمن صاحب کی تردید کرنا پڑی۔
تھوڑی دیر میں عربی سوسائٹی کا یہ جلسہ ڈبیٹنگ سوسائٹی میں
تبدیل ہو گیا۔ یہاں تک کہ موقع دیکھتے ہی سکریٹری سوسائٹی نے
یکدم شکریہ ادا کرتے ہوئے مہمانوں کو جلسے کے لیے مدعو کر دیا۔

مولانا عربی زبان و ادب کے بین الاقوامی ادارے
لجنۃ العربیہ کے رکن تھے، جس کے ممبر غیر عرب مشکل سے ہوا کرتے
تھے۔ ایک مرتبہ ابوالعلا المعری کی جبلی کے موقع پر موصوف کو ایک
اجلاس کی صدارت کے لیے مدعو کیا گیا لیکن جنگ عظیم دوم کے
بادل فضا پر چھائے تھے اس لیے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے
ان کو چھٹی نہیں دی کہ مولانا کی ذات گرامی کو کسی خطرہ میں مبتلا نہیں
کیا جا سکتا۔

میں ایم۔اے کے پہلے سال میں تھا۔ علامہ کی توسیع
ایک سال پہلے ہو چکی تھی۔ اس مرتبہ ریٹائرمنٹ ہونے والا تھا
کہ پی ایچ۔ ڈی کے طلبا میں سے مختار الدین آرزو، ریاض
الرحمن شیروانی اور ہم لوگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم
کی کوٹھی پر گئے اور مزید توسیع کے لیے درخواست کی
کی یہ بھی گزارش کی کہ ہم نے میمن صاحب کی شہرت اور عظمت
کی وجہ سے عربی میں داخلہ حاصل کیا ہے۔ ہمارا نقصان ہوگا
اور مولانا کے علم و فضل کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا
"آپ کیا جانتے ہیں میمن صاحب کو۔ میمن صاحب کو میں جانتا
ہوں۔ وہ ادب کے امام ہیں لیکن یونیورسٹی اپنے قواعد
سے مجبور رہے"۔ ہم لوگ بے نیل و مرام واپس آئے اور
مولانا کا ریٹائرمنٹ ہو گیا۔ ان کی جگہ پر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب
صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے (جو بعد کو وائس چانسلر ہوئے)
فائنل میں ہمارے استاد ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب اور مولانا
بدرالدین علوی صاحب تھے۔ بدرالدین صاحب تو شروع
سے ہی ہمارے استاد رہے تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب
بیشتر خاموش رہتے۔ سگار پینے کے عادی تھے جو اکثر پیتے رہتے
تھے۔ نہایت شریف، متین اور انسان دوست تھے۔ ان کی
شرافت اور عظمت کو الفاظ کے پیکر میں نہیں ڈھالا جا سکتا ہے
ایک مرتبہ ان کی تقریر ہم لوگوں نے سرسید ہال کی لٹریری
سوسائٹی میں کرانے کا انتظام کیا۔ اتفاقاً ان کو کسی ضرورت سے

باہر جانا پڑ گیا اور [illegible] کرنے کے لیے تشریف نہیں لا سکتے تھے۔
اس لیے وقت سے قبل میرے کمرے پر اطلاع دینے کے لیے
خود تشریف لائے اور نہایت انکساری اور تواضع نفس کا ثبوت
دیا جس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ اس اطلاع کے لیے
ملازم یا کسی دوسرے شخص کو ذریعہ نہیں بنایا۔ موصوف کا شمار
ترقی پسند مصنفین میں تھا اور اسی وجہ سے یونیورسٹی میں ان کی
تقاریر بھی ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ پروفیسر حبیب صاحب نے بھی
"آسمان منزل" میں انقلاب روس کے سلسلے میں بہت اہم تقریر
کرائی تھی۔

علی گڑھ میں رواج یہ تھا کہ ایم۔اے فائنل کے
طلبا کو امتحان سے قبل چیرمین شعبہ اپنی جانب سے اپنے مکان
پر چائے کی دعوت دیتے تھے۔ عربی میں ایم۔اے فائنل کے
طلبا صرف تین تھے۔ اس لیے پی ایچ۔ ڈی کے اسکالرس ایم۔اے
فائنل اور پریویس کے طلبا کو ڈاکٹر صاحب نے دعوت دی اور
نہایت پرتکلف اور نفیس چائے سے تواضع فرمائی چلتے وقت
طلبا سے مصافحہ بھی کیا جو پہلی مرتبہ ہوا۔ مولانا میمن صاحب اور
ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب میں عجیب فرق تھا۔ میمن صاحب پڑھاتے
پڑھاتے سر دلچسپ بات پر کسی نہ کسی طالب علم کی طرف ہاتھ بڑھاتے
اور مصافحہ کر لیتے اور علیم صاحب فنکشن اور ملاقات میں
بھی کسی طالب علم سے کبھی مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم
صاحب کے آنے سے قبل ہمارے استاد ڈاکٹر عابد احمد علی صاحب
بھی تھے جو نہایت عمدہ اور لائق استاد تھے۔ سر راس مسعود
مرحوم کے قریبی دوست تھے۔ کسی زمانے میں میمن صاحب اور
اُن کے درمیان چیرمینی کے سلسلے میں سنا ہے کہ نزاع رہ
چکا ہے لیکن یہ مسئلہ آخری طور پر طے ہو چکا تھا اور پروفیسر
میمن صاحب کو مستقل طور پر چیرمین مقرر کر دیا گیا تھا۔ عربی
کے شعبہ میں میمن صاحب سب سے پہلے ہندوستانی چیرمین
ہوئے۔ ان سے پہلے تمام چیرمین یوروپین مستشرق ہوتے
تھے۔ غالباً شعبہ کے قیام پر یہی بات طے ہوئی تھی۔ عابد احمد علی صاحب
پاکستان تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے یونیورسٹی چھوڑ دی
تھی۔ ایک چھوٹا سا واقعہ عابد احمد علی صاحب کا یاد رہا ہے۔
علی گڑھ میں عید کے موقع پر تین مرتبہ گلے ملنے کا عام رواج تھا
جو عابد احمد علی صاحب جو لوگ جاتے ان سے ایک مرتبہ عید ملتے
اور فرماتے "میں موحد ہوں۔ تثلیث کا قایل نہیں۔" دوسرے
جب کوئی آپ جناب اور زائد شائستگی گفتگو میں ظاہر کرتا
تو فرماتے "میں نے ہمیشہ عربی پڑھی ہے۔ میں بدو ہوں
مجھ سے بدوؤں کی طرح باتیں کیا کرو۔"

انگریزی ڈپارٹمنٹ میں ہمیں روزانہ کئی گھنٹے صرف
کرنا پڑتے تھے۔ اس وقت چیرمین غلام سرور صاحب تھے
پروفیسر ایف جے فیلڈن یورپ واپس جا چکے تھے اور پروفیسر
خواجہ منظور حسین صاحب پاکستان واپس چلے گئے تھے۔ میں
نے خواجہ منظور حسین صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ آڑا پاجامہ اور
شیروانی میں ملبوس ہوتے۔ ان کی شخصیت نہایت دلکش
تھی۔ ان کو دیکھتے ہی آدمی ان کی شخصیت سے متاثر ہو جاتا
تھا۔ ہمارے استاد پروفیسر محمود حسین صاحب، مختار حامد
علی صاحب، غلام سرور صاحب اور اسلوب احمد صاحب
انصاری تھے (جو بعد کو پروفیسر ہو کر رٹائر ہوئے) ہمارے
اساتذہ انگریزی زبان اور ادب کے ماہرین اور فاضل
تھے اور ان کا شمار یونیورسٹی کے اہم اساتذہ میں ہوتا تھا
جب میں فائنل کا طالب علم ہوا تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب
نے بنگال کے ایک فاضل استاد ڈاکٹر باسو کا تقرر فرمایا
اور خود ہی ان کو یونیورسٹی میں لانے کے موجب ہوئے۔
پروفیسر باسو صاحب بھی انگریزی زبان اور ادب میں ماہر
تھے۔ محمود حسین صاحب شیکسپیر اور برنارڈ شا کے ڈرامے
پڑھاتے تھے اور مختار حامد علی صاحب انگریزی نظم کے استاد
تھے۔ کچھ دن کے بعد محمود حسین صاحب یونیورسٹی کے رجسٹرار
ہوئے۔ وہ شیخ عبداللہ (وزیر اعلیٰ کشمیر) اور مرزا
افضل بیگ کے قریبی دوست تھے۔ مرزا افضل بیگ جب

علی گڑھ تشریف لاتے تو پروفیسر حبیب صاحب ان کی تقریر "آسمان منزل" میں کراتے تھے اور محمود صاحب تعارفی تقریر کرتے تھے۔

جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر مولانا آزاد ایک مرتبہ تشریف لائے تھے اور ان کو اعزازی ڈگری ایل۔ ایل۔ ڈی (دینیات) کی ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو دی گئی تھی۔ جب مولانا آزاد کانووکیشن میں تشریف لائے تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر نے ڈین اور چیرمین سے اور اہم اساتذہ سے ان کا تعارف کرایا۔ ڈین کی اسی قطار میں مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کھڑے تھے۔ جب ذاکر صاحب نے حبیب الرحمن خاں شیروانی کے بارے میں فرمایا: "مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شیروانی جن کی بنا پر ادب عالیہ کی اہم کتاب 'غبار خاطر' عالم وجود میں آئی" مولانا آزاد نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مولانا شیروانی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ مولانا آزاد فوراً گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ کانووکیشن ایڈریس میں مولانا نے سرسید مرحوم کی بہت شاندار الفاظ میں تعریف کی تھی اور ان الفاظ میں یاد کیا تھا کہ اس صدی کی دماغی رفتار پر اور علم و ادب کی تاریخ پر سب سے گہری چھاپ اس شخص کی ہے جو یونیورسٹی کی جامع مسجد کے ایک گوشہ میں محو خواب ہے اور اس کے بعد کے مصنفین خواہ وہ سرسید کے سخت ترین مخالف ہوں اس کے تاثر کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ ایسا شخص صدیوں میں کسی قوم کو حاصل ہوتا ہے۔

کانووکیشن کے بعد سہ پہر کو یونین حامد ہال میں (جو نواب حامد علی خاں آف رام پور کے نام سے منسوب تھا) حسب رواج تقریر ہوئی۔ شاہ حسن عطا صدر جلسہ تھے اور ریاض احمد سکریٹری۔ ریاض احمد نے خوش آمدید کہتے ہوئے یہ کہا کہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے درمیان امام الہند موجود ہیں، جو قرآن کریم کے ایک بین الاقوامی مفسر بھی ہیں ہمیں امید ہے کہ وہ بھی قرآنی سیاست کے بارے میں اپنی رائے سے مستفیض فرمائیں گے۔ مولانا نے ان جملوں کو اپنے اوپر طنز سمجھا اور مسلم لیگ کی سیاست اور قیادت پر نہایت برافروختہ ہو کر مسلسل حملے کیے اور اپنے قومی اور سیکولر نقطہ نظر کی وضاحت فرمائی۔ انھوں نے فرمایا کہ وہ قیادت جو تمہاری رہبری کر رہی تھی اور جس کو تم اسلامی اور قرآنی سیاست سمجھتے تھے، وہ خس و خاشاک کی طرح ہوا کے ساتھ اڑ گئی اور تم کو اکیلا اور تنہا چھوڑ گئی۔ وہ نہ اسلامی سیاست تھی اور نہ قرآنی سیاست وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال مولانا نے اس جلسہ میں اپنے مخصوص انداز میں اپنے غم و غصہ کا اظہار فرمایا۔ دوسرے روز شیخ عبد اللہ شیر کشمیر کی یونین ہال میں تقریر ہوئی اور انھوں نے علی گڑھ میں اپنے قیام اور میکڈانل ہوسٹل میں اپنی رہائش کا تذکرہ کیا اور ہمارے استاد محترم پروفیسر محمود الحسن صاحب سے اپنی دوستی اور تعلقات کا اظہار فرمایا۔ شیخ عبد اللہ نے اپنی تقریر میں یہ بات خصوصی طور پر بیان کی کہ جب وہ تعلیم کے بعد کشمیر پہنچے اور عملی سیاست میں حصہ لیا تو انھوں نے یہ محسوس کیا کہ کشمیر میں ہندو مسلم اختلاف کا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ در اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو سرمایہ دار ایک طرح سوچتا ہے اور ہندو اور مسلمان مزدور اور غریب پر ظلم و زیادتی کرنے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ لہذا اصل مسئلہ کشمیر یہ تھا کہ ہندو اور مسلم سرمایہ دار کو غریب عوام کے استحصال اور [illegible] سے روکا جائے اور جب تک یہ نہ ہوگا، ریاست کی ترقی اور عوام کی فلاح ممکن نہیں ہے۔ اس جلسہ میں شیخ عبد اللہ نے اپنی سیاسی زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا اور اپنی حکمت عملی کی پوری پوری وضاحت کی تھی۔ اس جلسہ کے بعد علی گڑھ میں شیخ عبد اللہ کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اس زمانے میں جن مشاہیر کی تقریریں علی گڑھ میں ہوئیں ان میں سب سے پہلے مسز سروجنی نائیڈو کی تقریر ہوئی تھی۔ وہ اس وقت یوپی کی گورنر تھیں اور علی گڑھ میں یونین ہال میں ان

کی تقریر ہوئی تھی۔ اس تقریر کا خلاصہ تو مجھے اب یاد نہیں رہا لیکن ان کی آواز اس قدر پرکشش اور دلفریب تھی کہ مجھے بھرپور احساس ہوا کہ ان کو صحیح طور پر 'بلبلِ ہند' کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان بھی کانووکیشن میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے کانووکیشن ایڈریس بھی پڑھا تھا جو نہایت فاضلانہ تھا۔ انھوں نے ملک کے سیاسی اور سماجی حالات پر تبصرہ کیا تھا اور ملک کی ترقی کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کی ضرورت کا احساس دلایا تھا۔ اس پر بھی تبصرہ کیا تھا کہ ملک کی سیکولر طاقتیں فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری کے ماحول کو ختم کریں اور چھوٹے چھوٹے اختلافات سے بلند ہو کر عالمی سطح پر ہندوستان کو ایک اونچے مقام تک پہنچانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہیں۔

راج گوپال اچاریہ گورنر جنرل ہندوستان کو بھی علی گڑھ میں اسپیشل کانووکیشن میں ایل۔ ایل۔ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ اسپیشل کانووکیشن اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ پوسٹ گریجویٹ طلبا کو اسٹریچی ہال میں نشست دی گئی تھی اور باقی طالب علم اسٹریچی ہال کے سامنے لان میں بٹھائے گئے تھے۔ شری راج گوپال اچاریہ کو سیدھے اسٹریچی ہال میں جانا تھا لیکن پہلے وہ ان لان کے سامنے سے گزرے جن میں طلبا بیٹھے ہوئے تھے اور وکٹوریہ گیٹ تک تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس اسٹریچی ہال تشریف لے گئے۔

میں نے جب داخلہ لیا تھا تو نواب اسمٰعیل خاں وائس چانسلر تھے اور چند ہی ماہ کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب وائس چانسلر ہو گئے تھے۔ میرے دوران قیام وہی وائس چانسلر رہے۔ وہ ایک درویش صفت اور نفیس منش انسان تھے جب وہ یونیورسٹی میں اپنی کار میں گزرتے تو کار سے باہر رُخ کر کے سلام کرنے میں سبقت کر کے اور ہر جگہ طلباء سے کچھ نہ کچھ تفریح کی بات کرتے تھے۔ اس وقت وائس چانسلر کا کمرہ ایس۔ ایس ویسٹ کی چھت پر تھا۔ جب وہ اپنے آفس میں تشریف لے جاتے تو ایس۔ ایس۔ ویسٹ کے پہلے اس کمرے کے پاس سے گزرتے جس میں ان کا دوران طالب علمی قیام رہا تھا۔ یہ ذاکر صاحب کا روزانہ کا معمول تھا اور اس بات کی خصوصی نشاندہی کرتا تھا کہ ان کو اپنی طالب علمی کا زمانہ کس قدر عزیز تھا اور کس قدر یاد تھا۔

میں یونین کے اس جلسہ میں شریک تھا جو نواب اسمٰعیل خاں کو الوداع کہنے اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو خوش آمدید کہنے کے لیے منعقد ہوا تھا۔ شاہ حسن عطا نے جلسہ کی صدارت کی تھی اور سکریٹری شپ کے فرائض ریاض احمد نے انجام دیے تھے۔ شاہ حسن عطا ننگے سر تقریر کرنے پر اصرار کر رہے تھے سامعین نے ان سے ٹوپی اوڑھنے پر اصرار کیا۔ اس لیے کہ اس وقت کی یہ روایت تھی کہ یونین میں کوئی طالب علم بغیر ٹوپی اوڑھے تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ طالب علموں کے اصرار نے شور و پکار کی شکل اختیار کی اور بالآخر ذاکر صاحب کے چٹکلے لطیفے اور تقریروں میں سنائے ہوئے نصیحت آمیز واقعات نے جلسہ کو ناکام ہونے سے بچا لیا۔ اُن کے ان لطیفوں اور واقعات کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ وہ ایک صاحب بصیرت انسان تھے اور ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق بات کرتے تھے اور تائید فرماتے تھے، تردید نہیں کرتے تھے۔ وہ معاشیات کے استاد تھے اور ماہر تعلیم تھے۔ اکثر لوگ تعلیم کے سلسلے میں کوئی بات یا معاشیات کے سلسلے ہی کوئی نکتہ بتانے لگتے اور وہ اس کو سنتے اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے۔ نواب اسمٰعیل خاں کے زمانے میں اور میرے علی گڑھ کے قیام کے پہلے سال میں سب سے اہم واقعہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی تدفین کا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کا یورپ میں انتقال ہو گیا تھا اور اُن کا جنازہ علی گڑھ آیا تھا۔ ان کی تدفین کے لیے یونیورسٹی نے جامع مسجد میں نواب زین العابدین خاں مرحوم کے برابر کی خالی جگہ تجویز کر دی تھی۔ کچھ دنوں تک یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ ان کے دفن کے لیے وہ جگہ مقرر کی گئی ہے۔ جنازہ کے علی گڑھ پہنچنے

سے چند روز قبل طلبا کو یہ بات معلوم ہوگئی اور اس پر یونیورسٹی میں ہنگامہ ہوگیا۔ سرسید مرحوم کے برابر دفن کے لیے ایک جگہ اور باقی تھی۔ طلبا کا اصرار ہوا کہ اس جگہ کے لیے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم سے زیادہ کوئی شخص مستحق نہیں ہو سکتا۔ یونیورسٹی کے اصحاب حل و عقد کا کہنا تھا کہ کورٹ کے فیصلے کی تعمیل ضروری ہے۔ اس پر دونوں طرف سے کوششیں ہوئیں۔ یونیورسٹی کے حکام نے پہلے نواب زین العابدین خاں کے برابر قبر کھدوائی۔ اس پر کافی شورش یونیورسٹی میں ہوگئی۔ طلبا اور اسٹاف میں بدمزگی ہوئی۔ اسٹاف کا ایک حصہ اندرونی طور پر طلبا کے ساتھ تھا۔ لیکن ظاہرہ طور پر کورٹ کے فیصلے کی مخالفت نہیں کرتا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے دوستوں اور مخالفوں میں اندرونی طور پر اختلاف ہوگیا۔ اسٹریچی ہال میں پروفیسر حبیب اور پروفیسر ہادی حسن اور دیگر مقررین کی تقریریں ہوئیں اور انھوں نے طلبا کو کورٹ کے فیصلے کا احترام کرنے کی بھرپور ترغیب دی۔ طلبا میں بھی تھوڑا بہت اختلاف تھا لیکن اکثریت اسی طرف تھی کہ سرسید کے برابر ہی ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کو دفن کیا جائے۔ یونیورسٹی کے مخالفین کو دشمنی کرنے کا کافی موقع ملا۔ پولس اور انتظامیہ کی مداخلت بھی ضروری خیال کی گئی لیکن نواب اسمٰعیل خاں مرحوم وائس چانسلر نے نہایت دانشمندی اور لڑکوں سے محبت اور یونیورسٹی کے مفاد کے تحت کسی طرح بھی انتظامیہ اور پولس کو دخیل نہیں کیا اور یونیورسٹی کو ایک بڑے ہنگامے سے بچا لیا۔ ان کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ نماز جنازہ کے بعد وائس چانسلر، اسٹاف کے اہم لوگ واپس چلے گئے، اور طلبا نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کو سرسید کے برابر دفن کر دیا۔ اس واقعے کے بعد اسٹاف کے ایک طبقے نے ان تمام طلبا، کے لیڈروں کے یونیورسٹی سے اخراج کا مطالبہ کیا کہ جنھوں نے اس ہنگامے کی قیادت کی تھی اور کورٹ کے فیصلے کی خلاف ورزی کی تھی۔ ایک گروہ قانونی پوزیشن کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے گروہ پر طلبا کے مفاد اور خیر خواہی کا جذبہ حاوی تھا۔ نتیجے میں یہ فیصلہ ہوا کہ جو طلبا اس کے ذمہ دار ہیں ان کا اخراج نہ کیا جائے لیکن آئندہ سال ان کو داخلہ نہ دیا جائے۔ یہ سانحہ یونیورسٹی کی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتا ہے اور اس طرف نشاندہی کرتا ہے کہ طلبا سے محبت کا جذبہ کس طرح بڑے سے بڑے ہنگامے کو فرو کر سکتا ہے۔

میرے زمانۂ قیام میں دو مرتبہ سر رادھا کرشنن علی گڑھ تشریف لائے۔ ایک مرتبہ کسی کانفرنس کی صدارت کے سلسلے میں اور دوسری مرتبہ توسیعی لکچرس پروگرام کے سلسلے میں۔ ظاہر ہے کہ سر رادھا کرشنن دنیا کے مانے ہوئے فلسفی اور اہل علم تھے اور ان کا نام علمی دنیا میں بڑی عظمت کا حامل تھا۔ میں نے کبھی کسی مقرر کو اس قدر بے تکلف اور آزادانہ انگریزی بولتے ہوئے نہیں سنا ہے۔ جس وقت وہ تقریر کرتے تھے تو موضوع کی اہمیت اپنے مقام پر ہے لیکن اس کی روانی کو بلا مبالغہ دریا کی روانی سے مثال دی جا سکتی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی ہندوستان کے ایک اہم مقرر اس زمانے میں پروفیسر ہادی حسن تھے جو اردو، فارسی اور انگریزی میں بے پناہ قابلیت رکھتے تھے اور تینوں زبانوں میں ان کی تقریر اہم ہوتی تھی اور پسند کی جاتی تھی۔ بذات خود اپنے بارے میں ان کی رائے تھی کہ اردو تقریر ان کی دوسرے درجے کی تقریر ہوتی ہے۔ فارسی اور انگریزی تقریر کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ میں خود امتیاز نہیں کر سکتا کہ کس زبان میں میں زیادہ اچھی تقریر کرتا ہوں۔ اگر حالات اجازت دیتے توہمیشہ انگریزی یا فارسی میں ہی تقریر فرماتے تھے۔ جب انگریزی میں Adverbs بولنے پر آتے؛ مثلاً Morally, Socially, Politically تو اتنی تعداد میں اور اس وقت تک بولتے رہتے جب تک کہ مجمع بے اختیار ہنسنے نہ لگے۔ ان کی تقریر لطیفوں سے بھرپور ہوتی تھی اور ہر لطیفہ اپنی نوعیت کا عجیب و غریب نیا اور

اچھوتا ہوتا تھا۔ ان کی ہر تقریر کے دوران خواہ کتنا ہی سنجیدہ مسئلہ ہو، سامعین کا ہنس پڑنا ضروری ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے تعزیتی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اور ان کی تعریف کرتے ہوئے عجب انداز سے یہ بات کہی جس کا تعلق صرف انداز بیان سے ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم پر کس طرح موت نے قابو پایا ہوگا، تعجب کی بات ہے۔ اس لیے کہ ان پر تو اُن کا بڑے سے بڑا دشمن بھی کبھی قابو نہ پا سکا۔ یہ بیان کرنا اتنا دلچسپ نہیں جتنا وہ انداز بیان جو پروفیسر موصوف کا تھا کہ پورا مجمع تعزیت کے موقع پر بھی ہنسنے لگا۔ اسی میں بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم اور وہ ہم سفر تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کو کسی جلسہ میں صدارتی ایڈریس پڑھنا تھا۔ ٹرین میں صدارتی ایڈریس ڈاکٹر ضیاء الدین بول رہے تھے اور ہادی حسن صاحب لکھ رہے تھے۔ ٹرین کے منزل مقصود پر پہنچنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا:

"اب تو صرف آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ اب کیسے سوئیے گا۔"

انھوں نے کہا:

"پندرہ منٹ سوؤں گا۔"

ہادی صاحب کے قول کے بموجب ڈاکٹر صاحب فوراً سو گئے اور ہادی صاحب گھڑی دیکھتے رہے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نیند سے اُٹھ گئے اور جس جگہ ایڈریس چھوڑا تھا اسی جگہ سے ایڈریس کی عبارت بولنے لگے۔ پچھلا جملہ یا کوئی لفظ بھی دوبارہ نہیں سنا۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے کی جائے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جائے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔

سر سید

وھیل

تحیتہ انصاری*

وہیل کا نام سنتے ہی ایک خیال ذہن میں آتا ہے کہ یہ بڑا موذی جانور ہوگا اور کبھی سامنا ہوئے گا تو کھڑا ہی نگل جائے گا۔ آیئے دیکھتے ہیں حقیقت کیا ہے۔

لوگوں کو سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وھیل اور ڈولفن مچھلیاں نہیں ہیں اور یہ سمجھانا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ دودھ پلانے والے جانوروں کی جتنی اہم خصوصیات ہیں ان میں موجود ہیں مثلاً وہ پھیپھڑے کی مدد سے سانس لیتے ہیں اور وہ بھی اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ وہ صرف اوپری طور پر مچھلیوں سے ملتے ہیں۔ مچھلیوں کی طرح کا جسم ہونے سے پانی میں تیرنے میں آسانی ہوتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اُن کے نتھنے جسم کے سب سے اونچائی والے حصّہ پر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہیل کا جسم پانی میں ہونے کے باوجود نتھنے پانی کی سطح سے اوپر ہوتے ہیں۔ اکثر نتھنوں پر تھوڑا پانی رہ جانے کی وجہ سے جب وہ سانس لے کر سانس چھوڑتا ہے تو یہ پانی چھوڑی ہوئی سانس کے ذریعہ ہوا میں اوپر تک لے جاتا ہے جو کہ فوارہ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ وہیل پانی کی سطح کے نیچے بھی رہ سکتی ہے لیکن صرف ۱۵۔ ۲۰ منٹ تک۔

وھیل کی کھال بالوں سے عاری ہوتی ہے بالوں کے بجائے کھال کے نیچے ایک دبیز چربی کی تہہ ہوتی ہے جس کو (BLUBBER) بلابر کہا جاتا ہے جو کہ وہیل کو پانی کی سطح پر رکھنے اور جسم کو گرم رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ اسی چربی کی وجہ سے وھیل کا شکار کیا جاتا ہے۔

وھیل کی بھاری بھرکم جسامت نے انسان کو ہمیشہ متجسس رکھا ہے اور اُس کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتا رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے وھیل کے ساتھ سنسنی خیز داستانیں جوڑ رکھی ہیں مثلاً یہ داستان جو کہ بہت مشہور ہے اس میں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے جہازراں سوتی ہوئی وھیل کو دھوکہ سے جزیرہ سمجھ کر لنگرانداز ہو جاتے ہیں اور بعد میں اُن کو ناراض وھیل نگل جاتی ہے اور اُن سب کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ اُن کے ساتھ کیا ہوا۔ اسی طرح کشتیوں کو اُلٹ دیئے جانے کی بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔

وہیل کی دو نمایاں قسمیں ہیں۔ دانت والے اور بغیر دانت والے۔ بغیر دانت والوں کو BALEEN یا WHALE BONE کہا جاتا ہے۔ ہم آپ کو بغیر دانت والوں کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں بتائیں گے۔

جس طرح ہاتھی زمین پر عظیم شحیم جانور مانا جاتا ہے اسی طرح وہیل سمندر کی دنیا میں لیکن یہ ہاتھی سے کئی گنا

* لکچرر بی۔ این۔ این کالج۔ بھیونڈی ضلع تھانہ مہاراشٹر

بڑا ہوتا ہے۔ آپ ہاتھی کو سیدھا سادھا مانیں گے بہ نسبت وھیل کے۔ پُرانی کہانیوں سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وھیل سے بحری راستوں سے سفر کرنے والے بہت خوف زدہ رہتے تھے اور اُس کو بہت بڑا آسیب مانتے تھے۔
ہاں وھیل بہت ہی طاقتور جانور ہے آپ اُس کی لمبائی اور وزن سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کتنا طاقتور ہو سکتا ہے۔
بلو وھیل۔ (BLUE WHALE) جو ایک بغیر دانت والا وہیل ہے کی لمبائی تقریباً ۳۰ میٹر اور وزن ۱۵۰ ٹن کے قریب ہوتا ہے۔ جو کہ سب سے بڑا زندہ جانوروں میں سے ہے یا جو کبھی زندہ تھے۔ آپ حیران رہ گئے ہوں گے لمبائی اور وزن پڑھ کر اور سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیا کھاتا ہے جو اتنا بڑا ہو جاتا ہے تو آپ کو فوراً یہ خیال آئے گا کہ یہ ضرور اپنے اطراف کی جتنی بڑی اور چھوٹی مچھلیاں ہوتی ہوں گی اُن کو چٹ کر جاتا ہوگا اور کھاتا ہی رہتا ہوگا تو آپ بالکل غلط سوچ رہے ہیں۔ دانت والے وھیل کو چھوڑ کر باقی کی غذا ایسی چیز ہے جس میں سے کچھ کو دیکھنے کے لیے آپ کو خوردبین کی ضرورت ہوگی جن کو Plankton کہا جاتا ہے جو کہ یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے "کوئی شے جو کہ لہروں کے رحم و کرم پر وہاں تیرتی ہو" یہ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو نباتاتی اور دوسرا حیوانی
حیوانی Plankton ہیں سے کچھ زندگی بھر Plankton کی شکل میں رہتے ہیں۔ اور کچھ جو مختلف مچھلیوں کے بچے ہوتے ہیں جو بلوغت تک پہنچنے کے لیے مختلف مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ اتنے بڑے ہوتے ہیں جن کو بغیر خوردبین کے دیکھا جا سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اتنے چھوٹے جانوروں کو اتنی بڑی وھیل اپنے منہ سے کیسے کھاتی ہے جبکہ اُن کے منہ میں ایک دانت بھی نہیں ہوتا ہے۔ تو یہ بھی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ وھیل کے منہ میں تالو سے لگی ہوئی مثلث نما پلیٹوں کی قطار ہوتی ہے جن پر سخت روئیں Baleen ہوتے ہیں جو آپس میں مل کر چھلنی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ وھیل کھلے منہ سے پانی میں تیرتی ہے پانی چھلنی سے گزر جاتا ہے اور Plankton چھلنی میں ہی رہ جاتے ہیں جن کو وھیل اپنی زبان سے کھرچ کھرچ کر کھاتی ہے' بلو وھیل دن میں تقریباً تین ٹن Plankton کھا جاتی ہے۔
وھیل سے کئی قیمتی اشیاء حاصل ہوتی ہیں مثلاً اُس کے Blubber کو گلا کر چربی نکالی جاتی ہے۔ یہ مشین میں ڈالا جانے والا بہت مفید تیل ہے جو بہت سی انڈسٹری وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے مثلاً گھڑی بنانے والی انڈسٹری۔ چینی اور جاپانی صدیوں سے وھیل کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے رہے ہیں جو کہ بکرے اور مچھلی کے گوشت کے برابر مانا جاتا ہے۔ کئی دانت والے وہیل سے IVORY حاصل کی جاتی ہے جو کہ بہت قیمتی ہوتی ہے۔ وہیل کے مرنے کے بعد اُس کے پیٹ میں ایک موم کی طرح نرم مادہ پایا جاتا ہے جو کالا' بھورا یا پیلے رنگ کا ہوتا ہے جس کو ایمبر گریس Ambergris کہا جاتا ہے۔ یہ مادہ پرفیوم کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ وھیل کی جگر سے تیل نکالا جاتا ہے جس میں Vit A بہت مقدار میں ہوتا ہے جو کہ دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ وہیل کے غدودوں سے بہت سے ہارمون نکالے جاتے ہیں۔ وھیل کی جلد بھی استعمال ہوتی ہے۔ اُن کی ہڈیوں سے کھاد بنائی جاتی ہے۔
یہ سب جان کر دو اہم نکتے سامنے آتے ہیں ایک تو یہ کہ اُس کی غذا Plankton جس کو وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کتنی مقوی غذا ہے جس کو کھا کر یہ اتنا بڑا اور طاقتور ہو جاتا ہے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کچھ وھیلوں کو چھوڑ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتنا بے ضرر جانور ہے مرنے کے بعد بھی یہ ہمارے کتنے کام آتا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق جلد ۸ شمارہ ۱۱ (نومبر ۸۹ء)

امریکی نظام تعلیم

سرفراز عالم*

طالب علم جب بھی امریکی نظام کا برصغیر کے نظام تعلیم سے موازنہ کرتا ہے تو ایک احساس شرمندگی دامن گیر ہو جاتا ہے۔ طالب علم نے اپنی ابتدائی تعلیم وطن عزیز کے ایک ایسے اسکول میں حاصل کی ہے جہاں ابتدائی کلاسوں کے طلبا ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ گرمی کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لیے سایہ دار درختوں کی پناہ لی جاتی تھی اور موسم سرما میں ادھر ادھر سے اکٹھی کی گئی جھاڑ جھنکار اور خشک لکڑیوں کو جلا کر ٹھٹھرتی انگلیوں کو سینکنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس وقت کے نصابی مواد اور اساتذہ کی محنت نے لالٹین کی روشنی میں اسکول کا کام کرنے والے طالب علموں میں حصول علم کی لگن پیدا کی اور ان کے دلوں میں طلب علم کی جو جوت جگائی وہ انہیں کشاں کشاں اس دنیا کے کونے کونے میں لیے پھرتی ہے اور اگرچہ اب بھی وطن عزیز کے کئی اسکول مادی طور پر کس مپرسی کی اسی حالت میں ہیں، نصاب، اساتذہ اور معاشرے کے باہمی اشتراک نے طالب علموں کی ایک بڑی اکثریت کو وہ ذوق و شوق عطا نہیں کیا جس کی ہمارے ملک کو ضرورت ہے گزشتہ بیس پچیس برس میں جہاں دوسرے ممالک کے تعلیمی اداروں میں آنے والے انقلابوں نے ان ملکوں کی معاشرت کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے، وہاں ہمارے اداروں میں پیدا ہونے والے انحطاط نے طالب علموں کی توانائیوں کا رُخ ان سرگرمیوں کی طرف موڑ دیا ہے جن کے نتائج ہمارے جیسے ممالک کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ وہ ادارے جہاں وطن کے مستقبل کو سنہرا اور روشن بنانے کے منصوبے تشکیل پانا تھے جہاں ہمیں اپنے مستقبل کے تابندہ خوابوں کی تعبیر کے حصول کی کوشش کرنا تھی، جہاں وطن کے نوجوانوں کو ستاروں پہ کمند ڈالنے اور وطن کی باگ ڈور سنبھالنے کی تربیت دی جانا تھی، وہاں ان سپوتوں کو سیاسی چال بازیاں سکھانے کا اہتمام کر دیا گیا ہے ان کے ہاتھ اپنے بھائیوں کے خون میں رنگنے کے لیے ان کے کندھوں پر کلاشنکوفیں سجا دی گئی ہیں۔ شاہین بچوں کو وطن عزیز کے مستقبل کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کا خوب صورت جھانسہ دے کر اصل راہ سے بھٹکا دیا گیا ہے اور ہماری دربدری اور دست نگری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ہمیں اپنے وطن کے لیے پالیسیاں مرتب کرتے وقت دوسرے ملکوں کے مالیاتی اداروں کی اعانت حاصل کرنا پڑتی ہے۔

ہمارے یہاں کے تعلیمی اداروں کے ماحول سے آنے والے طلبا کے لیے امریکی اداروں کا ماحول انتہائی حیرت انگیز کیفیت کا باعث بنتا ہے۔ امریکہ میں تعلیمی ادارے اپنے نظام الاوقات نصاب اور دیگر سرگرمیوں کا سال بھر پہلے سے اعلان کر دیتے ہیں اور بنیادی طور پر اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہوتا۔ ادھر اپنے وطن کے تعلیمی ادارے ہیں جو اپنے آنے والے کل کے نظام الاوقات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ امریکی ادارے صرف پہلے سے اعلان شدہ چھٹی کے روز بند ہوتے ہیں۔ وطنِ عزیز کے تعلیمی اداروں کی طرح اپنی

---

* یونیورسٹی آف شکاگو، شکاگو، امریکہ

خواہش کی تکمیل یا اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً بند نہیں کرائے جاسکتے اور چھٹی کے دن بھی تجربہ گاہوں میں کام کرنے کے خواہش مند افراد کو کام سے متعلق تمام [illegible] دستیاب ہوتی ہیں یہاں طالب علموں سے بھاری فیسیں تو ضرور وصول کی جاتی ہیں لیکن اس کے عوض انہیں ہر طرح کی تعلیمی و تحقیقی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دنیا میں جمہوریت کے سب سے بڑے نمائندہ ملک میں طالب علموں کی سیاسی تنظیموں کا کوئی وجود نہیں — طلبا اپنے اپنے میلان کے مطابق ملکی سیاسی تنظیموں سے دلچسپی اور وابستگی ضرور رکھتے ہیں لیکن ان وابستگیوں کی بنا پر قتل و غارت گری تو دور کی بات ہے ہاتھاپائی تک کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آتا — طلبا ایک دوسرے کے سامنے اپنے پسندیدہ امیدواروں کی حمایت میں بولتے نظر آتے ہیں تو اپنے ہی امیدواروں پر تنقید کرتے بھی نظر آجاتے ہیں اور اپنی پسند کے امیدوار پر تنقید سنتے وقت برداشت اور بردباری کا جو مظاہرہ امریکی طلبا بالعموم اور امریکی افراد بالخصوص کرتے ہیں وہ قابل رشک ہے اور غالباً اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں امیدواروں کو آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق نہیں سمجھا جاتا۔ ان امیدواروں کو ایک انسان کی حیثیت سے تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کیا جاتا ہے اور جہاں اپنے امیدوار کی خوبیوں اور حریف امیدوار کی خامیوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں اپنے امیدوار کی خامیوں اور حریف امیدوار کی خوبیوں کو بھی سنا جاتا ہے۔

ان کے انتخابات انتہائی خاموشی اور سکون سے انجام پاتے ہیں۔ نہ ہڑتال، نہ نعرے بازی، نہ ہلّہ گلّہ نہ کلاسوں کا بائیکاٹ تدریس و تحقیق کا کام کسی قسم کی رخنہ اندازی کے بغیر جاری رہتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ یہاں کے طالب علم ان یونینوں اور شعبہ جاتی سوسائٹیوں میں کسی عہدے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا تو کجا اس سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے اس ضمن میں امریکی طلبا مسلمان ہوئے بغیر اسلام کے اصولوں پر عمل کر رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک شعبہ جاتی سوسائٹی کے انتخابات کے موقع پر جب اپنے ہم عصروں کو اپنے وطن کے تعلیمی اداروں میں انتخابی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا تو اکثر کا ردعمل "یقین نہیں آتا" تھا ہمارا وطن تعمیر و ترقی کی جن منزلوں کی تلاش میں ہے اس کی طرف ایک ہی راستہ جاتا ہے۔ ہمت، محنت اور جرأت کا راستہ۔ لیکن اس راستہ پر صحیح رہنمائی کا فرض ہمارے تعلیمی اداروں پر عاید ہوتا ہے اور اگر ہم فی الواقعی ان منزلوں تک پہنچنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے تعلیمی اداروں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ ان اداروں سے ان کالی بھیڑوں کو نکالنا ہوگا جو محض ذاتی مفادات کی خاطر ملکی مفادات کو داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کرتے۔ ہمیں اپنے طلبا میں صحیح ملی شعور پیدا کرنا ہوگا تاکہ جب ملک و ملت کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آئے تو وہ اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کریں کہ معاشرے کی مجموعی فلاح کا مطلب ہے معاشرے کے ہر رکن کی فلاح اور یہی ہماری منزل مقصود ہے۔

یونیورسٹی یونین یا شعبہ جاتی سوسائٹیوں کے عہدوں سے امریکی طلبا کے گریز کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان عہدوں کے لیے منتخب ہوجانے والے طلبا و طالبات ان اداروں کے مختار نہیں بن سکتے۔ اس کے برعکس ہر عہدے دار کے لیے فرائض کا ایک دائرۂ کار متعین ہے اور اسے ان فرائض کو بہرصورت ادا کرنا پڑتا ہے۔ طلبا کے نمائندے اپنے شعبے کی نصابی کمیٹی میں نصاب کے بارے میں مثبت تجاویز پیش کرتے ہیں اور شعبہ جات ان کی روشنی میں اپنے نصاب کو بہتر بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن تعلیمی سال کے آغاز، اختتام، امتحانات کی تواریخ وغیرہ طے کرنے میں طالب علموں کا کوئی حصہ نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان اداروں میں تعلیمی سرگرمیاں کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر جاری رہتی ہیں۔ ۱۹۸۸ء امریکہ کا انتخابی سال تھا۔ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں، ری پبلکن پارٹی اور ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنے اپنے صدارتی و نائب صدارتی امیدواروں کا اعلان کر دیا تھا۔ امیدواروں کی انتخابی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور جیسے جیسے انتخابات کی تاریخ [illegible]

میں جوش و خروش بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اخبارات اور نشریاتی ادارے امیدواروں کی تقاریر، ان کی سرگرمیوں، ان پر ہونے والے اعتراضات اور ان کے جیتنے کے امکانات کے بارے میں عوام کو مسلسل باخبر رکھنے میں پسندیدہ امیدوار کی خامیاں بھی نظر میں رکھتے تھے اور اس کے بارے میں اعتراضات سننے کا حوصلہ بھی۔

امریکی ریاست رہوڈ آئی لینڈ کے صدر مقام پراویڈنس میں واقع براؤن یونیورسٹی ایک نجی تعلیمی ادارہ ہے اور دوسرے امریکی تعلیمی اداروں کی طرح اس کا بھی اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ ہے جس میں ایک عہدہ براؤن یونیورسٹی کے صدر کا بھی ہے۔ اس صدر کا چناؤ یونیورسٹی کی ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کرتی ہے۔ اس چناؤ کی منظوری یونیورسٹی کی گورننگ باڈی سے لی جاتی ہے، جسے یہاں کارپوریشن کہا جاتا ہے۔ براؤن یونیورسٹی کی اس مجلس نے اپنے ۳۱ر اگست کے اجلاس میں اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی کے فیصلے کی منظوری دی ہے اور یوں نیویارک پبلک لائبریری کے چیف ایگزیکیٹو افسر وارٹن گریگورین کو یونیورسٹی کے چانسلر کا سولہواں صدر منتخب کیا ہے۔ اس فیصلے کا اعلان یونیورسٹی کے چانسلر اے۔ او۔ دے نے کیا جو اس چناؤ کے لیے تشکیل دی گئی کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ براؤن یونیورسٹی کے اس نئے صدر کا انتخاب گزشتہ اکتوبر میں فی الوقت کام کرنے والے صدر ہورڈ سویٹر کے استعفیٰ اور اس اعلان کے نتیجے میں کیا گیا کہ وہ اپنی مصروفیات کے باعث اس عہدے کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔ البتہ وہ نئے صدر کے انتخاب تک اپنے فرائض ادا کرتے رہیں گے مگر کسی بھی صورت میں اس عہدے پر ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۸ء ان کا آخری دن ہوگا۔ یونیورسٹی کی صدارتی انتخابی کمیٹی نے اس مقصد کے لیے تقریباً دو سو شخصیات کے بارے میں غور کیا، اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کام کرنے والے اور ان اداروں سے باہر کی دنیا کے سیکڑوں لوگوں سے ان شخصیت کے بارے میں ان کی رائے پوچھی، ان سے مشورے اور ان کی سفارشات اکٹھی کیں۔ اپنے مشیروں سے کئی رسمی اور غیر رسمی ملاقاتیں کیں۔ امیدواروں سے براہ راست رابطہ قائم کیا اور اس قدر طویل چھان پھٹک کے بعد وارٹن گریگورین کو اس عہدے کے لیے منتخب کیا۔

وارٹن گریگورین کی عمر چوّن برس ہے۔ ایران کے شہر تبریز میں پیدا ہونے والے گریگورین کا تعلق آرمینی نسل سے ہے اور وہ براؤن یونیورسٹی کے پہلے ایسے صدر ہوں گے جن کی پیدائش امریکہ کے علاوہ کسی اور ملک میں ہوئی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز پندرہ برس کی عمر میں بیروت کے کالج آرمینین سے ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں انہوں نے اسٹینفورڈ یونیورسٹی امریکہ سے بی۔ اے اور ۱۹۶۴ء میں تاریخ و عمرانیات میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں ہی گریگورین سٹینفورڈ یونیورسٹی میں ٹیچنگ فیلو بنے اور پھر اسی یونیورسٹی میں ہی مدرس منتخب ہوگئے۔ گریگورین ۱۹۸۱ء میں نیویارک پبلک لائبریری سے وابستہ ہوئے اور اس کے بہترین منتظم کے طور پر سامنے آئے۔ انہوں نے اس ادارے کے لیے بڑی رقوم جمع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی عزت و احترام کا مقام حاصل کیا۔ ۱۹۸۱ء سے اب تک اس لائبریری کی وقف املاک چورانوے ملین ڈالر تک جا پہنچی ہیں۔ علاوہ ازیں ۱۹۸۶ء میں اس ادارے کے لیے تین سو سات ملین ڈالر کا فنڈ اکٹھا کرنے کی جس مہم کا آغاز کیا گیا تھا اس کے تحت اب تک اور پبلک لائبریری میں آنے سے پہلے گریگورین پنسلوانیہ یونیورسٹی میں کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ یونیورسٹی کے

"حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے آتیں تو آپ بڑھ کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔"

[ابو داؤد]

پرووسٹ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک کلیہ فنون وسائنس کے پہلے ڈین، ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۴ء تک تاریخ کے پروفیسر آرمینین وکاکیشن تاریخ کے پروفیسر اور تاریخ جنوب ایشیا کے پروفیسر رہے۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء تک ٹیکساس یونیورسٹی آسٹن میں تاریخ کے پروفیسر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۸ء تک سان فرانسسکو اسٹیٹ کالج اور ۱۹۶۰ء میں کیلیفورنیا یونیورسٹی برکلے میں مدرس کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ گریگورین تین کتابوں اور بے شمار مضامین کے مصنف ہونے کے علاوہ سات مختلف زبانوں، آرمینین، ترکی، عربی روسی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی پر بھی عبور رکھتے ہیں۔ گریگورین کو ان کی علمی وانتظامی سرگرمیوں کے صلے میں اب تک بائیس اعزازی ڈگریاں اور بے شمار ایوارڈ مل چکے ہیں، جن میں فرانس اور آسٹریا کے ۲ دو اعلیٰ ترین اعزازات بھی شامل ہیں۔ براؤن کی کارپوریشن کو امید ہے کہ کئی اعلیٰ بورڈوں میں فعال کردار ادا کرنے والی یہ نامور شخصیت —— جب براؤن کے صدر کا عہدہ سنبھال لے گی تو یونیورسٹی کے نام اور وقار میں اضافے کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی علمی سرگرمیوں کو مزید بہتر بنانے میں بھی مدد ملے گی۔

"تجارت جو بڑا وسیلہ دولت اور سیاحت کا ہے وہ ہماری قوم میں بالکل نہیں ہے۔ کل ہندوستان کے مسلمان تجارت پیشوں کی اگر تعداد بمشکل حاصل کی جاوے تو وہ ایسی قلیل اور ذلیل ہوگی کہ جس کو بیان کرتے ہوئے بھی شرم آوے گی۔ چند معدود مسلمان جو تجارت کرتے ہیں ان کی بڑی سے بڑی تجارت یہ ہے کہ غیر ملک اور قوم کے لوگ جو کلکتہ اور بمبئی میں مال لاتے ہیں ان کو نفع دے کر خریدتے ہیں اور پھر اپنے ہی ملک میں اپنے بھائی ہندوں کے ہاتھ نفع پر بیچتے ہیں۔ پس ان سے بعوض اس کے کہ قوم کو فائدہ پہنچے الٹا نقصان پہنچتا ہے۔"

سرسید

مائکروالیکٹرانکس

مختار احمد*

آج جس دور میں ہم رہتے ہیں وہ اپنی اہم سائنسی دریافتوں کی وجہ سے سائنس کا دور کہلاتا ہے۔ بیسویں صدی کے دوران سائنس نے بہت سی اہم ترقیات کی منازل طے کی ہیں۔ اس صدی کی آخری ہم دہائیاں الیکٹرانکس کی ترقی کے لیے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی اس دور کی سب سے اہم دریافت الیکٹرانک کمپیوٹر کا ایجاد ہونا اور پھر اس کا استعمال ہونا ہے۔ آج چھوٹے بہت چھوٹے اور ذاتی کمپیوٹر زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس دور کی دوسری اہم اور قابل رشک ترقی مواصلاتی نظام میں واقع ہوئی ہے۔ آج ساری دنیا ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیویژن وغیرہ کے ذریعہ اس طرح جڑ چکی ہے کہ ان کے بغیر دنیا میں رہنے کا تصور بھی محال ہے۔ لیکن ان دونوں ہی نظام کا پاپولر ہونا اور پھر ان کا استعمال بڑھنا جس وجہ سے ممکن ہوا وہ ہے مائکروالیکٹرانکس۔

مائکروالیکٹرانکس انجینیرنگ کی وہ شاخ ہے جس کے ذریعہ الیکٹرانکس کے سامان کا سائز چھوٹے سے چھوٹا کرنے کے متعلق جانکاری حاصل کی جاتی ہے۔ آج مائکروالیکٹرانکس کی ترقی کے باعث ہم لوگ چھوٹے سے کیلکولیٹر کے ذریعہ عام حساب کتاب کے کام کو بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح الیکٹرانک گھڑیاں، چھوٹے چھوٹے ریڈیو اور بہت سارے سامان آج کل ہر گھر کی زینت ہیں۔

مائکروالیکٹرانکس کی ترقی نے مستقل سامان کا سائز چھوٹا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قیمت کی کمی اور بجلی کے خرچ کو بھی بے حد کم کر دیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ صرف اس مقابلہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس بائے کا انقلاب موٹر کار کی صنعت میں آیا ہوتا تو آج ماروتی کار کی قیمت صرف ۸۰ روپے ہوتی۔ اس لئے آج کل جہاں پر سامان کی قیمت برابر بڑھتی ہی رہتی ہے الیکٹرونکس کے سامان کی قیمت برابر بڑھتی ہی رہتی ہے الیکٹرونکس کے سامان کی قیمتیں برابر کم ہوتی رہی ہیں۔ ایک کمپیوٹر کی قیمت جہاں دس سال پہلے ۱۵-۲۰ لاکھ روپے ہوتی تھی آج صرف ۵۰-۴۰ ہزار روپے میں بہ آسانی دستیاب ہے۔

یہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ الیکٹرانکس کی ابتدا ۱۹۴۸ء میں ٹرانسسٹر کی ایجاد سے ہوئی لیکن اس کی اصل ترقی ۱۹۵۹ء میں انٹیگریٹیڈ سرکٹ یا I.C. کی ایجاد سے شروع ہوئی۔ ایک I.C. کے اندر بہت سے ٹرانزسسٹر، رزسسٹر اور کپیسیٹر capacitor ہوتے ہیں اور یہ سب ایک ہی عمل کے

* ریڈر شعبہ الیکٹریکل انجنیرنگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اندر جس کا سائز بہت چھوٹا ہوتا ہے بند ہوتے ہیں۔ IC
ٹیکنالوجی کی ترقی نے پھر LSI یا Large
Scale Integrated Circuit زمانہ دیا جس کے
ذریعہ ہزاروں ٹرانزسٹر وغیرہ ایک ہی چھوٹے سے خول
کے اندر مجتمع کرنا ممکن ہوسکا۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں V.L.S.I.
یا Very Large Scale IC ایجاد ہوا۔ اس کے ساتھ
پورے کے پورے سرکٹس CIRCIUTS ایک چپ
CHIP کے اندر بنائے جانے لگے۔ اس دور کی سب
سے اہم دریافت مائکرو پروسیسر Micro ProcessoR
کی CHIP ہے جس کے اندر ایک کمپیوٹر کی طرح کام
کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ دراصل VLSI کی
دریافت کی وجہ سے ہی چھوٹے اور ذاتی کمپیوٹر کم قیمت
پر دستیاب کرنا ممکن ہوسکا۔ یہ چھوٹے کمپیوٹر بڑے کمپیوٹر
سے زیادہ باصلاحیت ہوتے ہوئے بھی بہت کم قیمت پر
ملتے ہیں۔ ان کا وزن صرف چند کلوگرام ہے جب کہ پرانے
کمپیوٹر کئی کئی ٹن کے ہوتے تھے۔ ان میں بجلی کا خرچ بھی
بہت کم ہوتا ہے اور یہ جگہ بھی کم گھیرتے ہیں۔

مائکرو الیکٹرانکس کے سرکٹ جس خول کے اندر
ہوتے ہیں اس کو چپ CHIP کہتے ہیں۔ ان چپ کو بنانے
کے لیے سیمی کنڈکٹر Semi Conductor کا استعمال
کیا جاتا ہے۔ سیمی کنڈکٹر اس مادہ کو کہتے ہیں جن میں بجلی
کو ایصال کرنے کی قوت ایک موصل Conductor اور
حاجز INSULATOR کے درمیان ہوتی ہے۔ ویسے تو
قدرت میں کئی طرح کے سیمی کنڈکٹر موجود ہیں لیکن مائکرو
الیکٹرانکس کے لئے صرف جرمینیم Germanium
اور سلیکان Silicon کا ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اہم
وجہ یہ ہے کہ جرمینیم اور سلیکان کو ہی اعلا پیمانہ تک خالص
بنایا جاسکتا ہے جو کہ الیکٹرانکس کے کام کے لئے بے حد
ضروری ہے۔ سیمی کنڈکٹر سے مائکرو الیکٹرانکس چپ بنانے کے

تین طریقے رائج ہیں۔ ان کو بالترتیب ہمہ گیر یعنی Monolithic
پتلی فلم Thin Film اور موٹی فلم THICK
FILM تکنیک کہتے ہیں۔ ہمہ گیر ICs بنانے کے
لئے سیمی کنڈکٹر کی ایک پتلی سی پرت کو ایک گولے کی شکل
میں جس کا قطر تقریباً ½ انچ سے لے کر ۵ انچ تک ہوتا
ہے کاٹ لیتے ہیں۔ پھر اس سیمی کنڈکٹر کی پرت میں مختلف
عملوں کے ذریعہ ٹرانزسٹر، ڈایوڈ، ریزسٹر اور کیپیسٹر
وغیرہ جو بھی سرکٹ میں ضرورت ہوتے ہیں بنائے جاتے
ہیں۔ پھر سلیکان کی پرت سے مختلف چپ کاٹ کر الگ
کر لئے جاتے ہیں۔ ہر چپ کا سائز 50 mil×50 mil
کا ہوتا ہے
(inch 1/1000 = 1 mil) یعنی کہ ایک انچ لمبی جگہ میں
20 ICs کو ایک لائن سے رکھا جاسکتا ہے۔ اور ہر ایک
چپ ہزاروں سرکٹ کے جز جیسے کہ ٹرانزسٹر وغیرہ کو آپس
میں جوڑ کر اصل سرکٹ بناتا ہے۔ یہ سرکٹ کمپیوٹر کا پروسیسر
ProcessoR ہوسکتا ہے یا کوئی بھی الیکٹرانک سرکٹ
جس سے کہ اور دوسرے سرکٹ والے چپ آپس میں
جوڑ کر کوئی بھی الیکٹرانک آلہ بنایا جاسکتا ہے۔

پتلی فلم یا موٹی فلم تکنیک سے ICs بنانے کا طریقہ
ہمہ گیر طریقہ سے IC بنانے سے کافی مختلف ہے۔ اس
میں سیمی کنڈکٹر کی پتلی پرت کے بجائے کسی حاجز جیسے
کہ شیشہ یا سرامک Ceramic کی پرت استعمال کی
جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک فرق یہ بھی ہے کہ ان تکنیک
کے ذریعہ صرف ریزسٹر Resistor یا کیپیسٹر
capacitor بھی بنائے جاتے ہیں۔ اگر سرکٹ میں
ٹرانزسٹر یا ڈایوڈ وغیرہ بھی ضروری ہوں تو پھر ہمہ گیر تکنیک
کا ہی استعمال کرنا پڑے گا۔

ہندوستان میں VLSI بنانے کا کارخانہ
چنڈی گڑھ میں سیمی کنڈکٹر کامپلکس کے نام سے شروع کیا

باقی صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ

زندگی کیا ہے؟

اسلم پرویز*

ہمیں اپنے چاروں طرف زندگی مختلف شکلوں میں رواں دواں نظر آتی ہے۔ اِن میں سے کچھ شکلیں ایسی ہیں جن کو دیکھتے ہی ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ جاندار ہیں۔ جب کہ کچھ جاندار ایسے ہیں جن کو ایک عام آدمی بے جان سمجھتا ہے۔ عموماً زندگی کا تصور حرکت اور نشو و نما سے وابستہ ہوتا ہے۔ چلتی پھرتی چیزیں جو حساس ہوں (یعنی دیکھنے سننے، بولنے اور پہچاننے کی سمجھ رکھتی ہوں)، وقت کے ساتھ عمر رسیدہ ہوں اور اپنے جیسے بچے پیدا کر سکیں، اُن کو زندہ تصور کیا جاتا ہے۔ ان ظاہری صفات کے علاوہ سائنس دانوں نے زندگی کی کچھ اور خصوصیات بھی بیان کی ہیں جن میں اہم ترین خاصیت سالمات سازی ہے۔ یعنی ہر جاندار کے جسم میں ہزارہا اقسام کے کیمیائی عملات ہوتے رہتے ہیں، جن کے نتیجے میں انواع و اقسام کے کیمیائی مادّے بنتے ہیں ان ہی عملات کے نتیجے میں جانداروں کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے تمام حیاتی عملات کو میٹابولزم کہا جاتا ہے۔ ان کیمیائی عملات کو دو اقسام میں بانٹا گیا ہے۔ ایسے کیمیائی عملات جن کے نتیجے میں نئے نئے کیمیائی مادے بنتے ہیں ان کو اینابولزم کہا جاتا ہے۔ یہ کیمیائی عملات تعمیری ہوتے ہیں اور ان کے دوران مختلف مادّے اور سالمے بنتے ہیں۔ نیز ان کو چلانے اور جاری رکھنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ توانائی جاندار کو اس کی خوراک سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسری قسم میں وہ کیمیائی عملات آتے ہیں جو کہ تخریبی ہوتے ہیں یعنی جن کے دوران مختلف مادّے اور سالمے (مالیکیول) توڑے جاتے ہیں، بڑے بڑے مادے حصہ بہ حصہ نیز رفتہ رفتہ چھوٹے چھوٹے مادوں اور پھر سالموں میں تحلیل کیے جاتے ہیں۔ ان عملات کے دوران جو توانائی خارج ہوتی ہے اسے جاندار دیگر کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان عملات کو کیٹابولزم کہا جاتا کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جاندار ماحول اور حالات کے تئیں ایک ردّ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ نیز حالات کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی چیزیں جو کہ کسی زندہ چیز کی وجہ سے وجود میں آئی ہوں، نشو و نما دکھاتی ہوں، جن میں سانس لینے کا عمل ہوتا ہو، سالمات سازی ہوتی ہو، حساس ہوں، اپنے جیسے بچے دیتی ہوں، حرکت کرتی ہوں، ماحول کے مطابق ردّ عمل کا اظہار کرتی ہوں نیز ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکیں، ان کو ہم زندہ کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جاندار شے یہ تمام صفات رکھتی ہو۔ مثال کے طور پر پیڑ پودے، اگرچہ حرکت نہیں کرتے اور ظاہری طور پر حساس بھی نہیں لگتے یعنی دیکھنے سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے لیکن وہ

بھی زندہ ہیں اور زندہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ زندگی کی
دیگر تمام صفات رکھتے ہیں اور اگر آپ پودوں کا مطالعہ کریں تو
آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ حساس بھی ہیں۔ خاص طور سے
ماحول اور اپنے ارد گرد کی چیزوں سے پودے بخوبی واقف رہتے
ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ پودوں میں صبح کے وقت پھول کھلتے
ہیں اور شام کو بند ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ صبح اور شام کی تمیز کر سکتے
ہیں، اسی لیے صبح ہوتے ہی کھل جاتے ہیں۔ کچھ پھول صرف گرمی
کے موسم میں کھلتے ہیں جب کہ کچھ پودوں پر سردیوں میں پھول آتے
آتے ہیں۔ یعنی وہ موسم بھی پہچان سکتے ہیں۔ گرمیوں میں پھول
دینے والے پودے کو اگر آپ سردیوں میں لگا دیں تو اس کی
بڑھوار بھی مشکل ہوگی اور اگر وہ بڑھنے بھی لگا تو بھی اس میں پھول
نہیں آئیں گے۔ پھول اپنے وقت سے اور اسی موسم میں آئیں گے
کوئی پودا اگر اندھیری جگہ پر ہو تو وہ روشنی کی سمت از خود مڑ جائے
گا۔ یعنی وہ روشنی کو پہچان کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ پودے
زمین سے نکل کر آسمان کی طرف بڑھتے ہیں۔ گملے میں لگے ہوئے
پودے اوپر کی طرف سیدھے بڑھتے ہیں۔ اگر آپ ایک گملے کو اس
طرح لٹا دیں یا گرا دیں کہ پورا پودا زمین کے متوازی ہو جائے
تو آپ دیکھیں گے کہ پودے کا تنا مڑ کر اوپر کی طرف چلا جائے
گا یعنی زمین کے متوازی نہیں چلے گا۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے
کہ پودے زمین کی کشش کو پہچاننے کی حس رکھتے ہیں اور ان
کے تنے کشش کی مخالف سمت میں چلتے ہیں۔ یہ تمام مشاہدات اس
بات کا ثبوت ہیں کہ پودے بھی حساس ہوتے ہیں۔ اگر چہ پودوں کی
اکثریت ساکت اور ایک جگہ قائم رہنے والی ہوتی ہے لیکن کچھ
خوردبینی پودے ہمہ وقت ہر طرف پھرتے رہتے ہیں۔ مثال کے
طور پر بیکٹریا ایک پودا ہے لیکن وہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ ہوا
کے دوش پر یا پانی میں ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ کچھ خوردبینی
پودے ایسے بھی ہیں جو باقاعدہ حرکت کرنے والے اعضا رکھتے
ہیں اور ان کی مدد سے مستقل گھومتے رہتے ہیں۔ اس کے
برخلاف جانوروں کو ہم ہمیشہ چلتے پھرتے دیکھتے ہیں یعنی جانوروں
میں حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن کچھ جانور ایسے بھی ہیں
جو پودوں کی طرح ایک جگہ چپکے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر پانی
میں پائے جانے والے اسفنج جانور ہوتے ہیں لیکن یہ ہمیشہ
دریاؤں اور سمندروں کی تہہ میں موجود چٹانوں پر چپکے رہتے
ہیں اور دیکھنے میں پودے جیسے لگتے ہیں۔

جانداروں کی اقسام

جانداروں کو بنیادی طور پر دو اقسام میں بانٹا جاتا
ہے یعنی پودے اور جانور۔ اگر چہ ان دونوں اقسام کے درمیان
بہت سے ظاہری خواص مختلف ہیں اور وہ اتنے واضح ہوتے
ہیں کہ ہر آدمی آسانی سے پودوں اور جانوروں کے بیچ تفریق
کر سکتا ہے لیکن کچھ ایسے بنیادی خواص بھی ہیں جو کہ آنکھ سے
تو نظر نہیں آتے لیکن ان کی اہمیت بہت ہے۔ خوردبینی جانداروں
میں ان ہی خواص کی مدد سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ یہ جرثومہ
پودوں کے زمرے میں آتا ہے یا کہ جانور ہے۔ ہم جانتے
ہیں کہ ہر جاندار کی بنیادی اکائی خلیہ (سیل) ہے۔ جانوروں
کے خلیے کے گرد محض ایک باریک سی جھلی ہوتی ہے جو کہ خلیے کے
اندر جانے والی نیز اندر سے باہر آنے والی چیزوں کو کنٹرول
کرتی ہے لیکن پودوں کے خلیے میں اس جھلی کے باہر ایک اور
نسبتاً موٹی جھلی ہوتی ہے جو کافی مضبوط اور بے جان ہوتی
ہے۔ اس کا بنیادی مقصد خلیے کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ یہ
ایک ایسا بنیادی فرق ہے جو ہمیشہ پودوں اور جانوروں
کے خلیوں میں نظر آتا ہے۔ اگر کسی جاندار کو ظاہری طور پر
پہچاننا مشکل ہوتا ہے تو اس کے خلیے کی جانچ کر کے یہ طے
کیا جاتا ہے کہ یہ پودا ہے یا جانور۔ دوسرا بنیادی فرق
جو ان دونوں اقسام کے بیچ نظر آتا ہے وہ خوراک سے
متعلق ہے۔ پودوں کی اکثریت اپنی خوراک اپنے آپ
تیار کرتی ہے جب کہ جانور اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے
بیرونی ذرائع پر انحصار کرتے ہیں۔ پودے اپنی خوراک سورج
کی روشنی، زمین سے حاصل کیے ہوئے پانی اور ہوا میں

موجود کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کی مدد سے بناتے ہیں۔ ان
کی خوراک سازی کا عمل ایک خاص قسم کے عضلے میں ہوتا ہے
جس کو کلوروپلاسٹ کہا جاتا ہے۔ ہر پودے کے خلیے میں کلورو
پلاسٹ نظر آتے ہیں جن کے اندر ہرے رنگ کا ایک کیمیائی مادہ
ہوتا ہے جس کو کلوروفل کہا جاتا ہے۔ اسی ہرے مادے کی وجہ
سے پودے ہم کو ہرے نظر آتے ہیں۔

جانداروں کی ان دونوں بڑی اقسام یعنی پودوں اور
جانوروں نے اس دنیا پر مکمل قبضہ کیا ہوا ہے۔ ان دو خاندانوں
کے افراد کو ان کی ساخت، جسامت اور دیگر خواص کی بنیاد
پر بہت سے چھوٹے چھوٹے خاندانوں اور نسلوں میں تقسیم کیا
گیا ہے۔ دونوں ہی خاندانوں میں بھی انواع و اقسام کے
جاندار نظر آتے ہیں۔ وہ ہر قسم کے ماحول اور موسم میں پائے
جاتے ہیں۔ اگر جانوروں کے خاندانوں پر نظر ڈالیے تو سمندروں
میں وہیل مچھلی جیسے عظیم الشان جانور سے لے کر چھوٹی مچھلیوں تک
جھینگوں، کیکڑوں اور آکٹوپس سے لے کر کینچوؤں اور خوردبینی
جانوروں تک جسامت اور اقسام کا پھیلاؤ نظر آئے گا۔ ریگستانوں
میں اونٹ سے لے کر ننھے چیونٹوں تک جانور نظر آتے ہیں
ہمارے اردگرد ہاتھی گھوڑوں سے لے کر مکھی، مچھر اور ہوا
میں پائے جانے والے خوردبینی جانوروں تک ایک دنیا آباد
ہے۔ سرسبز و شاداب میدان ہوں یا بنجر علاقے، جنگلات ہوں
یا ویرانے، ہری پہاڑیاں ہوں یا برف سے ڈھکے پہاڑ، ندی نالے
ہوں یا دریا سمندر ہر جگہ کسی نہ کسی قسم کے جانور پائے جاتے ہیں
جس نئی سرزمین پر انسان نے قدم رکھا وہاں جانوروں نے
اس کا استقبال کیا (کبھی کبھی مخالفت بھی کی)۔ قطب جنوبی جیسے سرد
اور منجمد علاقے میں جب انسان وارد ہوا تو وہاں بھی اسے جانور
ملے۔ جب اس نے خط استوا پر سفر کیا تو وہاں بھی جاندار
نظر آئے۔ یہی حال پودوں کا بھی ہے۔ پانی میں پائی جانے والی
مختلف اقسام کی کائی سے لے کر پھپھوندی تک خوردبینی بکٹیریا
سے لے کر چیڑ، دیودار، ساگوان، نیم اور پیپل کے بلند درختوں
تک سب پودوں کی ہی اقسام ہیں۔ بیکٹیریا کے لیے تو کہا جاتا ہے
کہ آگ کے سوا ہر جگہ یہ پائے جاتے ہیں۔ گرم کھولتے ہوئے پانی
کے قدرتی چشموں میں، جن کو گندھک کے چشمے کہا جاتا ہے، بیکٹیریا
پائے جاتے ہیں، زمین کے اندر کی تہوں میں، چاروں طرف ہوا
میں، ہر قسم کے پانی میں غرض ہر جگہ یہ خوردبینی پودے موجود ہیں
زندگی کے اس زبردست پھیلاؤ اور اقسام کا اگر تفصیلی جائزہ
لیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جیومیٹری کی کوئی شکل ایسی نہیں
ہے جس ساخت کا کوئی جاندار یا اس کا کوئی عضو نہ ہو۔ کوئی
رنگ ایسا نہیں ہے جو جانداروں کی دنیا میں نہ ملے۔ سچ تو یہ ہے
کہ اس کائنات کو رنگ و بو دیے ہی جانداروں نے ہیں۔ قدرت
کی یہ کھیتی جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں ایک دن کی
پیداوار نہیں ہے۔ کروڑوں سال کے ارتقا اور اختلاط و تفریق
کے بعد زندگی کا یہ پھیلاؤ وجود میں آیا ہے جس میں ہر ایک
جاندار دوسرے سے مختلف ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے
کہ اتنے الگ الگ نظر آنے والے جانوروں کی بنیادی اکائی
یعنی ان کو بنانے والے خلیے یکساں ہیں کسی بھی جانور سے لیا
ہوا خلیہ یکساں ہی ہوگا۔ چاہے وہ کسی ہاتھی کے جسم کا ہو یا مچھر
کے جسم کا۔ اسی طرح پودوں کے خلیے بھی سب ایک جیسے ہوتے
ہیں چاہے وہ کائی کے پودے کے ہوں یا برگد کے درخت کے
اور خود جانوروں اور پودوں کے خلیے بھی بالکل ایک جیسے ہوتے
ہیں سوائے دو ایک فرق کے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ جانداروں میں
خلیے کی وہی بنیادی حیثیت ہے جو کہ ایک عمارت میں اینٹ کی ہوتی ہے
ہم طرح طرح کی شکلوں کی عمارتیں دیکھتے ہیں لیکن ان سب کے اندر اینٹ
ایک سی ہی ملتی ہے۔ یہی نظام قدرت ہے کہ بظاہر اتنے مختلف نظر آنے
والے جانداروں کی بنیاد میں ایک سی بناوٹ کا خلیہ ہے۔ اس حقیقت سے
یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کی بنیادی اکائی یعنی خلیہ
زبردست صفات کا مالک ہے جو مختلف حالات اور ضروریات
کے تحت مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔

سرسید احمد خاں

تحریر:۔ سر عبدالقادر —— ترجمہ:۔ محمد علی جوہر*

انیسویں صدی کے اواخر میں ایک مصلح قوم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے سید احمد خاں دہلوی نے ہندوستان کو عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کو خصوصاً بیحد متاثر کیا۔ شاید اسی وجہ سے یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی کہ وہ پہلے ایک عظیم الشان ادیب تھے اور باقی سب کچھ بعد میں تھے۔ ایک اعتبار سے جدید اردو ادب ان کے ہم عصروں سے زیادہ انھیں کا رہین منت ہے۔ اردو کے ایک اہم نثر نگار ہونے کی حیثیت سے ان کی تصانیف کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ یوں تو اردو ادب سے متعلق ان کی براہِ راست خدمات ان کے کسی ہم عصر سے کم نہیں۔ لیکن جو چیز ان کو ہمارے شکریہ کا مستحق بناتی ہے وہ خدمت یہ ہے جو انھوں نے بالواسطہ طور پر ایسے ممتاز عالموں کو اپنے گرد جمع کرکے انجام دی جو ان کی مشفقانہ اور حوصلہ مندانہ رہنمائی میں اردو نثر و نظم میں ممتاز ہوگئے گویا وہ درحقیقت ادیب ساز اور اردو ادب کے ایک نئے دبستان کے بانی تھے۔

انھوں (سرسید) نے اردو ادب کے لہجے کو سنوارنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ چونکہ دلی میں پلے بڑھے تھے اس لئے وہاں کی ٹکسالی زبان بولتے تھے۔ جب انھوں نے لکھنا شروع کیا تو سادہ اور بے تکلف اسلوب اپنایا جو قارئین کو اپنی برجستگی اور تاثیر کی بنا پر بہت متاثر کرتی ہے۔ سادہ اور بے تکلف اردو نثر کو رواج دینے اور مروجہ تکلف اور تصنع سے گریز اختیار کرنے کا جو کام غالب نے شروع کیا تھا سرسید نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔

اس موقع پر ان کی دلچسپ داستانِ حیات کی تفصیلات پیش کرنی ضروری ہیں۔ سرسید کی دو شاندار سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں۔ انگریزی میں کرنل گریہم اور اردو میں حالی کے قلم سے۔ حالی نے بجا طور پر اس کتاب کو "حیات جاوید" کہا ہے جس کے معنی ہیں لافانی زندگی۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ وہ لوگ جو سرسید جیسی زندگی گزارتے ہیں، شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ پاتے ہیں۔ یہ کتاب ان کے بہت ہی مخلص مداح اور دوست کی جانب سے سید مرحوم کی یاد میں خراجِ عقیدت ہے جس کو ان سے ذاتی تعلقات کی بنا پر بے شمار مواقع ملے تھے۔ اگر کسی کو سرسید کے حالات زندگی کی پوری تفصیلات معلوم کرنی ہو تو اسے "حیات جاوید" پڑھنی چاہیئے۔

اس خاکے کے لئے اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ سرسید ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے اس گھرانے میں پیدا ہوئے جو علم و فضل کی بنا پر مشہور تھا۔ ان کے نانا خواجہ فریدالدین احمد مشہور و معروف آدمی تھے۔ وہ علم ریاضی میں بڑی مہارت

* ریسرچ اسکالر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رکھتے تھے اور کئی حیثیتوں سے اپنی عملی زندگی میں متعدد
کارنامے انجام دینے کے بعد ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی
کے وزیر مقرر ہوئے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے مغلوں
کی ٹوٹتے بکھرتے مالیاتی نظام کو سنوارنے کی کوشش کی لیکن
سازشوں کے شکار ہو کر بدنام ہوئے اور انھیں اپنے
عہدے سے دست بردار ہونا پڑا۔ سید احمد خاں کی والدہ
خواجہ فرید الدین کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ والد کی
طرف سے سید احمد خاں کا تعلق اس خاندان سادات سے
تھا جو مدتوں ہرات میں سکونت پذیر رہ چکے تھے۔ وہاں سے
ان کے آباؤ اجداد غالباً شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان
منتقل ہوئے۔ ان کے دادا سید ہادی عالم گیر ثانی کے
عہد میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ گرچہ سید احمد خاں
کے والد میر متقی نے مغل دربار کی ملازمت قبول نہیں کی لیکن
دربار تک ہمیشہ ان کی رسائی رہی وہ تیراندازی اور
تیراکی میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور اس زمانے میں یہ
دونوں فنون دہلی کے شرفاء اور رؤسا کے یہاں بڑی قدر
کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد
تھے جنھوں نے ان سے نشانہ بازی اور تیراکی کی تربیت
حاصل کی تھی۔ سید احمد خاں نے بھی اِن کی تربیت اپنے
والد سے پائی تھی۔ سید احمد خاں کی ابتدائی تعلیم رائج الوقت
معیاروں کے مطابق پوری طرح باضابطگی سے نہیں ہوئی
لیکن اس میں بڑی وسعت تھی۔ انھوں نے ایک استانی
سے قرآن پڑھنا شروع کیا، بعد ازاں مولوی حامد الدین
نام کے استاد سے فارسی کی کتابوں کا درس لیا اور کچھ
عرصے عربی کی بھی تعلیم حاصل کی۔ ریاضی انھوں نے اپنے
ایک ماموں سے سیکھی جنھیں یہ ذوق اپنے والد خواجہ
فرید الدین سے ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے کچھ دنوں
تک علم نجوم کا بھی مطالعہ کیا تھا اور کچھ عرصے تک اپنے
دور کے مشہور و معروف حکیم غلام حیدر سے طب یونانی
درس بھی لیا۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کی تعلیمی
زندگی کا اٹھارہ یا انیس سال کی عمر میں خاتمہ ہو گیا اگرچہ وہ
مرتے وقت تک طالب علم رہے اور اپنے ذخیرۂ علم میں
ذاتی مطالعے سے اضافے کرتے رہے۔ نوجوانی میں انھیں دلی
کے بعض مشہور شعراء مثلاً غالبؔ آزردہ، صہبائی کا قرب
حاصل رہا اور اکثر ان کی محفلوں میں شریک رہے۔

اس ماحول نے انھیں مختلف قسم کے علوم سے متعارف
کرایا۔ جو آئندہ زندگی میں ان کے لیے بہت سود مند
ثابت ہوا۔ ۱۸۳۸ء میں دہلی کے دفتر صدر امینی میں ریڈر
کی حیثیت سے انھوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔
۱۸۳۹ء میں نائب منشی کی حیثیت سے وہ آگرہ کمشنری
میں ملازم ہو گئے۔ مختلف مقامات پر منصف کی حیثیت سے
کام کرنے کے بعد ۱۸۴۶ء میں اسی عہدے پر ان کا تبادلہ
دلی کو ہو گیا۔ یہاں انھیں باقاعدہ طور پر کسی اچھے استاد
سے اپنے مطالعے کی تکمیل کا موقع ملا اور انھوں نے عربی
کی تعلیم حاصل کی اور اس طرح یہی وہ چیز ہے جس نے
ان میں قرآن کی تفسیر لکھنے اور اسلام پر جو حملے ہو رہے
تھے ان سے بچاؤ کی صلاحیت پیدا کی۔ انھیں یہ معلوم کرنے
میں زیادہ دیر نہ لگی کہ قدرت نے ان کو تحریر و تقریر کی
صلاحیت ودیعت کی ہے۔ قسمت سے انھیں ایک تنومند جسم
ملا تھا جو ہر طرح کی سختی برداشت کر سکتا تھا جس کی
وجہ سے ان میں محنت شاقہ کی حیرت انگیز صلاحیت تھی۔
۱۸۴۰ء میں جب وہ صرف تئیس سال کے نوجوان تھے
اور کمشنر کے دفتر میں دیانت کے ساتھ کام کر رہے تھے
"جام جم" کے نام سے ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی جو
فارسی زبان میں تھی جس میں انھوں نے تیمور لنگ سے
بہادر شاہ تک مختلف شاہی خاندانوں کی فہرست اور
ان کے مختصر حالات زندگی پیش کیے تھے۔ یہ کتاب تاریخ
سے ان کی واقفیت اور تحقیقی ذوق کی مظہر تھی۔ ان کی

دوسری تصنیف ذرا مختلف انداز کی تھی۔ یہ سول لاز (LAWS) [illegible] منصفوں کے کام کی کتاب تھی۔ یہ کتاب اردو میں تھی اور سرکاری حلقے میں پسند کی گئی تھی اور اس کتاب کی بدولت انھیں منصف کے امتحان میں شرکت کا مجاز قرار دیا گیا تھا۔ بعد ازاں ان کی ابتدائی مذہبی تعلیم نے اپنا رنگ دکھایا تو انھوں نے "جلاء القلوب" کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا جس میں پیغمبر اسلامؐ کی ولادت اور وفات تک کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

ان کی ذہانت کا اظہار ۱۸۴۴ء میں شائع ہونے والے اس ترجمہ سے بھی ہوتا ہے جو میکینکس کے موضوع پر تھا۔ دہلی کے زمانۂ قیام ہی میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی کے جاری کردہ اخبار "سید الاخبار" میں بکثرت مضامین لکھ کر مستقبل کے اس کام کی بنیاد ڈال دی جو بحیثیت صحافی انھیں انجام دینا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے قابلِ ذکر کتاب جو ان کے قلم سے نکلی وہ آثار الصنادید تھی جس میں قدیم دلی اور اس کے نواح میں پھیلی ہوئی تاریخی عمارتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ زمانۂ دراز تک انھوں نے اپنے فرصت کے اوقات کو پوری طرح اس تحقیقی کام کے لیے مواد اکٹھا کرنے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ سر سید احمد خاں نے یہ کام کس لگن سے کیا تھا اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض بہت بلندی پر لکھے ہوئے کتبوں کو پڑھنے کے لیے انھوں نے ایک چھینکا بنوایا تھا جو دو بلیوں کی مدد سے ان کتبے کے متوازن لٹکایا جاتا تھا جس کا چربہ اتارنا چاہتے تھے۔ انھوں نے خود ہی اس پرخطر طریقۂ کار کا ذکر کرتے ہوئے کہ اس تجربے نے ان کے دوست مولانا صہبائی کو کتنا خوفزدہ کر دیا تھا۔ لکھا ہے:

"قطب صاحب کی لاٹ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے۔ ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر ہر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔"

۱۸۴۷ء میں اس کتاب کے منظرِ عام پر آتے ہی مصنف کو بلند مقام حاصل ہو گیا۔ مصنف کے ایک یورپین دوست مسٹر رابرٹس اس کی ایک کاپی انگلستان لے گئے اور لندن کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کی۔ سوسائٹی نے اس کتاب کو بہت پسند کیا اور انگریزی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ سید احمد خاں نے نظر ثانی کے بعد پھر اس کتاب کو نئی اور بہتر تصاویر اور نقشوں کے اضافے کے ساتھ ۱۸۵۴ء میں شائع کیا لیکن اس اشاعت کے بیش تر نسخے مع نقشوں کے ایامِ غدر میں تلف ہو گئے۔ لیکن جو نقشے دریافت ہوئے وہ ایم، اے او کالج علی گڑھ کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ دوسری اشاعت پہلی اشاعت کے مقابلے میں نہ صرف ظاہری اعتبار سے اچھی تھی بلکہ مواد کے اعتبار سے بہتر ہو گئی تھی۔ بہرحال یہ کتاب قدیم مرصع اردو میں لکھی گئی تھی اور ایک اعتبار سے اسی مصنف کی دوسری تصانیف کے سادہ اور سلیس نثری اسلوب کا کوئی موازنہ نہیں ہے۔ سید احمد خاں کی دوسری ادبی تخلیقات کی جانب متوجہ ہونے سے پہلے یہ بیان کرنا لازمی ہوگا کہ فرانس کے مشہور مستشرق ایم گارسیں دتاسی نے آثار الصنادید کو فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیے جانے کا شرف بخشا جو ۱۸۶۱ء میں شائع کیا گیا۔ اس ترجمے کا ایک نسخہ مصنف کو بھی بھیجا۔ جب

لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے یہ ترجمہ دیکھا تو اس
نے سید احمد خاں کو ۱۸۶۴ء میں سوسائٹی کا آنریری
فیلو مقرر کیا۔ بعد ازاں جب اڈنبرا یونیورسٹی نے سید احمد خاں
کو ان کی عدم موجودگی میں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری
۱۸۵۹ء میں عطا کی تو خطبات احمدیہ کے ساتھ اس کتاب
کو امتیاز کا باعث قرار دیا۔

مصنف کی حیثیت سے آٹھ سال دہلی میں گزارنے
کے بعد سید احمد خاں ترقی پاکر بجنور میں صدر امین مقرر
ہوئے، دوران قیام انھوں نے بجنور کی تاریخ مرتب کی۔
انھوں نے اشاعت کی غرض سے ابو الفضل کی (تصنیف)
آئین اکبری کی تصحیح و تدوین بھی کی۔ یہ اڈیشن تین حصوں
میں تھا اور مؤلف نے اس میں اس کتاب سے متعلق تفصیلی
ریویو پر مشتمل تعارف کا اضافہ کیا تھا۔ پہلا اور تیسرا
حصہ شائع ہو چکا تھا اور دوسرا حصہ جس میں متعدد نقشے
اور قلمی تصاویر بھی شامل کی گئی تھیں، پریس میں جانے ہی
والا تھا کہ غدر چھڑ گیا جس میں یہ بیش قیمت مسودہ ضائع
ہو گیا۔

۱۸۵۸ء میں سید احمد خاں کا تبادلہ بجنور سے
مراد آباد کو صدر الصدور کی حیثیت سے ہوا۔ اس کے
فوراً ہی بعد انھوں نے اپنی کتاب "تاریخ سرکشی ضلع بجنور"
شائع کی جس میں انھوں نے اس شہر کے بغاوت کے حالات
قلم بند کئے تھے۔ یہ کتاب مقامی دلچسپی کی حامل تھی لیکن
غدر سے پہلے کے متعلق دوسری مختصر کتاب جو ۱۸۵۹ء
میں شائع ہوئی نسبتاً زیادہ قدر و قیمت اور عام دلچسپی
رکھتی تھی اس کا نام "اسباب بغاوت ہند" یا "دی کاز
آف دی انڈین ریوولٹ" تھا۔ یہ کتاب جتنی مختصر تھی بلاشبہ
اتنی ہی معرکہ خیز بھی تھی۔ غدر کے کچھ ہی دنوں بعد جس
جرأت و بے باکی کے ساتھ سید احمد خاں نے یہ رسالہ
تحریر کیا یقیناً غیر معمولی جرأت کا متقاضی تھا اور اس اقدام
میں ان کے لیے ذاتی نقصان کا قوی امکان تھا۔ انھوں نے
اس کتاب کی پانچ سو جلدیں چھپوائیں لیکن اسے ہندوستان
میں مشتہر نہیں کیا تاکہ اس کی اشاعت سے کسی طرح کی
برانگیختگی پیدا نہ ہو یا اسے غلط معنی نہ پہنایا جائے۔ انھوں
نے ایک نسخہ اپنے پاس رکھا، دوسرا گورنمنٹ آف انڈیا کو
بھیجا۔ باقی نسخوں کا پارسل انگلینڈ بھیج دیا تاکہ جو لوگ غدر
سے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں ان میں
تقسیم کر دی جائے۔ وائسرائے کی کونسل میں جب اس
کتاب پر بحث ہوئی تو لارڈ کیننگ اور جناب بارٹل فریر
نے اس کتاب کی اشاعت کو گورنمنٹ کی خیر خواہی پر
محمول کیا۔ مسٹر سیسل بیڈن نے اس کتاب کی پرزور مخالفت
کی اور اسے باغیانہ تصنیف قرار دیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ
۱۸۷۳ء میں کرنل گراہم کے قلم سے ظہور پذیر ہوا۔ دو
نسخوں کے علاوہ اس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں دستیاب
نہیں ہے۔ لیکن مولانا حالی نے اس کتاب کو یا اس کے
بیشتر حصے کو از سر نو حیات جاوید کے ضمیمے کے طور پر
دوبارہ شائع کیا اور ملک فضل الدین، لاہور کے ایک
بک سیلر نے اس کتاب کی ایک نئی طباعت پیش کی۔

یہ کتاب ہمارے لئے محض تاریخی دلچسپی ہی
نہیں رکھتی بلکہ کئی نقطہ ہائے نظر سے بھی بجا طور پر اہم
ہے۔ اس کا اسلوب گرچہ سادہ اور متاثر کن ہے لیکن
اسلوب کی جو صفائی مصنف کے یہاں ان کے ہم عصروں
کے یہاں جو ان کے گرد اکٹھا ہو گئے تھے ظاہر ہوئی اس
تصنیف میں وہ مفقود نظر آتی ہے۔ اس میں جہاں جہاں
قدیم اردو نثر کی خصوصیات نظر آتی ہیں اور اس پر
عربی کے لفظی ترجمے کا گمان ہوتا ہے مثلاً ہم دیکھتے ہیں:

"واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائیداری گورنمنٹ
کے مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں واجبات
سے ہے" یا

"بادشاہانِ ملک غیر بھی کمال اعتبار رکھتے تھے ہماری [illegible]"

یا

"مثل نابود کر دینے سے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے۔"

لیکن ایسے اقتباسات بہرحال کمیاب ہیں اور خال خال نظر آتے ہیں اور باقی ماندہ کتاب آسان اور رواں اسلوب میں لکھی گئی ہے جس کی بنا پر اسے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔

کتاب کی دوسری وہ سحور کن بے تکلفی ہے جس کی مدد سے مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں سے کچھ آج کے دور میں بھی اتنے ہی کارآمد ہیں جتنا کہ ۱۸۵۹ء میں۔

بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کے لئے سید احمد خاں نے تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح و تالیف کی جسے سوسائٹی کے ذریعہ سنہ ۱۸۶۲ء میں شائع کیا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے بائبل کے ابتدائی ابواب کی اردو میں تفسیر لکھنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ۔ انھوں نے اس تفسیر کا قابلِ ذکر حصہ تحریر کیا لیکن بحیثیت مجموعی یہ کام نامکمل رہا۔ اس تصنیف کو گارساں دتاسی نے ۱۸۸۳ء میں اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

سر سید احمد خاں کو سنہ ۱۸۶۱ء میں اپنی شریک حیات کی وفات کے زبردست صدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے تین بچوں کو چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کیا ان میں دو لڑکے تھے جن میں سید محمود جو بعد میں مسٹر جسٹس محمود کہلائے ایک تھے۔ سید احمد کو ان کے متعدد دوستوں نے دوسری شادی کا مشورہ دیا تاکہ وہ آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں لیکن وہ اپنی بقیہ زندگی اکیلے گذارنے کے فیصلے پر جمے رہے اور انھوں نے اپنے ہم قوموں کی خدمت اور ہم مذہبوں کے درمیان اور ان میں تعلیم کی ترویج پر کوشش کرنے کو اپنا شریک حیات سمجھا۔

جن تصانیف پر ہم غور کر چکے ہیں در اصل وہ سنجیدہ تصانیف تھیں اور ان کا تعلق غور و فکر سے تھا۔ میدان ادب میں ان کے مخصوص کارناموں کا آغاز ابھی صحیح معنوں میں ہو نہیں پایا تھا کہ علم و فن کے مسائل نے ان کے پسندیدہ مشغلے کی حد سے آگے بڑھ کر سید احمد خاں کے دماغ میں جذب دروں کی صورت اختیار کر لیا۔

اردو نثر کو ترقی دینے اور اسے سنجیدہ خیالات اور گفتگو کا متحمل بنانے والے کی حیثیت سے سر سید احمد کا نام ہمیشہ لیا جاتا رہے گا۔ ان کا حقیقت پسند مزاج اس کردار کی ادائیگی سے متعلق قابلِ حد تک مناسبت رکھتا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایک شخص جس کی جوانی دلّی کے خوش گوار ماحول میں گزری ہو جو غالبؔ جیسے شاعر کے ساتھ رہا ہو اور جو متعدد مشاعروں میں شریک ہوا ہو، وہ شعر گوئی کی حقیقی تحریک سے آزاد رہ جائے۔ وہ وقتاً فوقتاً اچھی شاعری کا مطالعہ کیا کرتے اور جب اچھے شعر سنتے تو داد بھی دیتے لیکن زندگی کا مقصد ان کے نزدیک اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ اسے الفاظ کے تانے بانے بننے تیار کرنے میں صرف کرنے کے قائل نہ تھے۔ ان کے توانا شعور نے شاعری کو اپنا مقصدِ حیات بنانے کے خلاف بغاوت کی۔ نثر سے انھیں زندگی بھر وہی رغبت رہی جیسی کہ لوگوں کو شاعری سے تھی۔ نوجوانی میں غالباً انھیں بھی شعر گوئی کا چسکا لگا تھا لیکن اسں میلان کو انھوں نے اپنی آئندہ زندگی میں اس کامیابی کے ساتھ نثر نگاری کی جہت میں موڑ دیا کہ مشکل ہی سے کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ شاعری سے ان کا کوئی واسطہ رہا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ انھیں اپنی تحریر و تقریر میں بھی اشعار نقل کرتے ہوئے زیادہ نہ پائیں گے۔

یہ خصوصیت ان مصنفین میں بھی تھی جو ان کے قریب آئے یا جن کا ذوق ان کے زیر اثر پروان چڑھا تھا مثلاً حالی

نذیر احمد، مولوی شبلی و مولوی ذکاء اللہ اور سید مہدی علی جو نواب محسن الملک کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ ان چند اشخاص میں سے تھے جنھیں بجا طور پر عظیم اہل قلم کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے مصنّفوں کی ایک لمبی قطار جن کی تحریروں پر سر سیّد کی تصانیف یا دبستان سر سید کے اثرات واضح ہیں۔

جن قد آور مصنّفوں کا نام اوپر لیا گیا ہے ان میں صرف حالیؔ ایسے شخص تھے جو شاعری اور نثر نگاری دونوں میں مشہور ہیں۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ وہی اصلاح پسندی کی روح جاری وساری ہے جو سر سید کی نثر نگاری کا امتیازی وصف ہے۔ اور کہیں نہ کہیں آپ کو یہ ضرور گمان ہوگا کہ بیشتر خیالات جو حالیؔ نے اپنی نظموں میں پیش کئے ہیں بالواسطہ طور پر سید احمد خاں سے مستعار ہیں۔ مدوجزر اسلام (The Tide and Ebb of Islam) جو حالیؔ کی مشہور ترین نظموں میں سے ایک ہے اس کا تصور سر سیّد ہی نے انھیں دیا تھا۔

یہ توضیح تھی اس طریقۂ کار کی جس کی شکل میں اس دور کی ادبی شخصیتیں شعوری یا غیر شعوری طور پر سید اعظم کا اثر قبول کر رہی تھیں۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں لیکن ہمیں سر سیّد کی ذاتی ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لینا ہے۔

ان کی کچھ تصانیف پر غور کرنے سے پہلے لازم ہو جاتا ہے کہ آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی جائے کہ سید احمد خاں جب اپنے ہم عصروں کو شدید طور پر متاثر کر رہے تھے، قابلِ ذکر حد تک خود بھی مغربی بالخصوص انگریزی تمدن سے متاثر تھے۔ غالبًا یہ حیرت انگیز بات ہے کہ بذات خود وہ انگریزی سے ناآشنا تھے۔ ان کے یہاں پختہ عمر میں انگریزی کی معمولی سی شد بد پیدا ہوئی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ

ماخذوں سے کس طرح وہ اپنی تصانیف کے لیے خام مواد جمع کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں نہ صرف انگریزی الفاظ استعمال کرتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے بہت سے انگریزی خیالات کو بھی اردو کا جامہ پہنایا اور اظہار کے متعدد طریقے انگریزی سے مستعار لئے جو اب پوری طرح اردو زبان میں رچ بس گئے ہیں۔ انھوں نے مابعد کے لکھنے والوں کے لیے بیرونی ماخذوں سے اسالیب و خیالات مستعار لے کر زبان کو مزید وسعت دینے کی طرح ڈالی۔ مشرق و مغرب کے خیالات کے امتزاج سے پیدا ہونے والے خوشگوار نتائج کے سہرا انھیں کے سر جاتا ہے۔ ان کی ذہنی نشوو نما اور ابتدائی تربیت کا انداز وہی تھا جو ایک سچے مستشرق کا ہوتا ہے تاہم اخذ و قبول کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی بنا پر انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن سے وہ ساری چیزیں اپنا لیں جو انھیں اچھی اور قابلِ تقلید نظر آئیں یعنی اپنے تمام ہم عصروں کی طرح جن کی تعلیم و تربیت لبرل انداز سے ہوئی تھی اور وسیع النظری جن کا خاصہ تھا انھوں نے بھی اپنے آپ کو غیر محسوس طور پر ان علوم کی طرف کھینچتا ہوا محسوس کیا جو مغرب سے حاصل کئے جاتے تھے۔

۱۸۶۶ء میں سر سید احمد خاں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا جو ان کے آخری زمانے تک جاری رہا اور اس اخبار میں انھوں نے مدتوں مدیر اعزازی کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ اخبار بیک وقت آئے دن کے مسائل پر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے دیانت دارانہ اظہار خیال کی ضمانت دینے والا ایک آرگن بھی تھا اور اس نے اردو ادب کو اپنی بیش بہا خدمات بھی پیش کی تھیں۔ اس اخبار میں بکھری ہوئی سید احمد خاں کی تحریریں اگر جمع کی جائیں تو کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں اور ان میں پیش کئے گئے مواد کا اچھا خاصا ذخیرہ

ایسا ضرور ہوگا جو وقیع تحریروں میں شمار کیا جائے گا۔
جہاں تک [illegible] کی زندگی کے ابتدائی سالوں کا تعلق ہے بجا طور پر یہ رسالہ حالی کی پیش کردہ خراج تحسین کا مستحق ہے۔ حیات جاوید کے ایک اقتباس کا جس میں حالی نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی تعریف کی ہے۔ ذیل کے سطور میں ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔ اس اقتباس سے اس رسالے کے اغراض ومقاصد سے متعلق حالی کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے جو نہایت حسن وخوبی سے نکلتا تھا۔ آپ رقم طراز ہیں :۔

"اس رسالے کا امتیازی وصف یہ تھا کہ اپنے ہم عصر (اخبار ورسائل) سے قطع نظر اس رسالے نے کبھی کسی فرقے یا قوم کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی اس نے لہجے کی متانت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور نہ کبھی بے جا طور پر قارئین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے من گھڑت قصّوں اور افواہوں کو اپنے صفحات پر جگہ دی۔ اس نے کبھی ہندو یا مسلم اسٹیٹ کے خلاف کچھ نہ لکھا۔ یہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی تنازعوں میں شریک نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ان کے کاموں میں دخل اندازی بھی کی گئی پھر بھی اس نے آپس میں مصالحت کی ہی کوشش کی۔"

سید احمد خاں نے ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا دورہ کیا اور سال بھر مقیم رہے یہاں انکی جلا توانائیوں کو کوئی جہت میں بار آور ہونے کا موقع ملا۔ اس مضمون سے جو چیز خصوصیت کے ساتھ متعلق ہے وہ خطبات احمدیہ کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت ہے۔ یہ کتاب پیغمبر اسلام کی سیرت پاک سے متعلق ہے۔ اور اس میں آپ کی سیرت طیبہ پر مغربی ناقدوں کی طرف سے کیے گئے اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے طور پر اردو میں مواد اکٹھا کیا اور انگلینڈ میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد مصنف کے کچھ اضافوں کے ساتھ خطبات احمدیہ کی اردو اشاعت منظر عام پر آئی۔ انھوں نے اپنے سفر کے احوال نقشوں کے ساتھ تحریر کیے جسے انھوں نے علی گڑھ میں اپنی سوسائٹی کے روبرو پیش کیا اور یہ کتاب دلچسپ رہ نمائے سفر ثابت ہوئی۔

۱۸۷۰ء میں انگلستان سے واپسی کے بعد سید احمد خاں نے اپنا مشہور ومعروف رسالہ "تہذیب اخلاق" جاری کیا جس نے اپنے زمانے میں مختلف سماجی، مذہبی اور ادبی حلقوں میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ یوں تو اس رسالے کا وجود ۱۸۷۶ء میں ختم ہوگیا لیکن یہ مسلم معاشرہ اور اردو وادب پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ گیا۔ اس رسالے کے متعدد مضامین جو سر سید احمد خاں کے قلم سے وجود میں آئے تھے لافانی قدر وقیمت کے حامل ہیں، ملک فضل الدین لاہور نے انھیں انتخاب تہذیب الاخلاق کی جلد دوم میں کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ یہ جلد پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے کچھ اجزاء غیر دلچسپ ہو سکتے ہیں اس بنا پر کہ ان کی معنویت اب باقی نہیں رہی یا جن امور سے ان کا تعلق ہے ان کے بارے میں رائے عامہ خاصی حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ دیگر مضامین ممکن ہے تکنیکی اور مذہبی اعتبار سے کچھ لوگوں کے لیے قابل اعتنا نہ ہوں لیکن ایسے حصوں کو حذف کر دینے کے باوجود بھی خاصی مقدار ایسی ضرور باقی رہ جاتی ہے جس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ تہذیب الاخلاق کے بہت سے مضامین کی روشنی میں آپ کو سر سید احمد خاں کو اردو کے افضل ترین انشا پرداز کی حیثیت سے تسلیم کر لینے میں کوئی تامّل نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر میں یہ اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں سر سید احمد خاں امید کی خوشی کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"اونورانی چہرے والی یقین کی اکلوتی بیٹی
امید، یہ خدائی روشنی تیرے ساتھ ہے۔
تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو
تسلی دیتی ہے۔ تو ہی ہمارے آڑے
وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے۔ تیری ہی
بدولت دور دراز خوشیاں ہمارے پاس
نظر آتی ہیں ـــ تیری ہی برکت سے خوشی
خوشی کے لیے نام آوری۔ نام آوری کے
لیے بہادری۔ بہادری کے لیے فیاضی،
فیاضی کے لیے محبت۔ محبت کے لیے نیکی
تیار ہے "

بڑی مسرت کی بات ہے کہ سیّد احمد خاں کے خطبات تقاریر کو بھی جمع کر کے عام ناظرین کے لیے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت کو اوّل ہم مولوی امام الدین گجرات اور بعد ازاں ملک فضل الدین کے ادارے کا رہونِ منّت قرار دیتے ہیں۔ یہ تقاریر غور و فکر اور مفید مشوروں سے بھری پڑی ہیں اور ان میں سے کچھ تو ایسی ہیں کہ وہ آج بھی اتنی ہی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ جتنی کہ مدتوں پہلے جب یہ تقریریں کی گئی تھیں، مفید مطلب تھیں۔ مثال کے طور پر جو عالمانہ اور فکر انگیز تقریر مرزاپور میں ۱۸۷۳ء میں کی گئی تھی اس سے سطور مندرجہ ذیل میں اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

"یہ خیال ہے کہ ہماری رسموں میں تبدیلی
کی ضرورت نہیں ہے اگرچہ وہ کیسے ہی
مضبوط یقین سے دل میں بیٹھا ہو، بھروسے
اور اعتماد کے لائق نہیں ہے کیونکہ ممکن
ہے کہ صرف عادت نے یہ خیال ہمارے
دل میں جما دیا ہے "

سر سید کی ایک اور تصنیف جس کا جائزہ حاصل بحث کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اردو میں قرآن کریم کی تفسیر لکھنی شروع کی جسے پایۂ تکمیل تک لے جانے سے قبل ہی چھوڑ دیا گیا لیکن جو حصہ لکھا جا چکا تھا اُسے شائع کر دیا گیا۔ اس تصنیف کا تعلق مذہبی معاملات سے ہے اور چونکہ یہاں خاص طور پر سر سید کی ادبی خدمات سے بحث مقصود ہے لہٰذا کسی لمبے چوڑے حوالے کی ضرورت نہیں۔ تفسیر کی افادیت سے متعلق زبردست اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ قدامت پسند مسلمانوں نے اسے قرآن پاک کی تفسیر بالرائے قرار دیا جبکہ اُن بہت سارے مسلمانوں نے جن کی تعلیم و تربیت جدید انداز سے ہوئی ہے انھوں نے سر سید کو اس پُرخلوص کاوش کے حوالے سے بے حساب مدح و ستائش کا مستحق سمجھا۔ اس کا مقصد مادیت اور لادینیت کے بڑھتے ہوئے سیلابِ عظیم کا سدِ باب کرنا تھا جو جدید تعلیم کے ردِ عمل کے طور پر مسلسل بڑھتا چلا آ رہا تھا جس سے اکثر مسلمانوں کو مذہبی عقائد سے محرومی کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس باب میں انھیں قابلِ ذکر حد تک کامیابی ملی۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ مذہب اور سائنس میں اتحاد پیدا کرنے کی خواہش میں انھیں بارہا غلط تاویل کرنی پڑی اور وہ معقولیت سے دور جا پڑے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آزادیٔ فکر و خیال کی ترویج کے باب میں ان کی جرأت مندانہ کوشش کے لئے اور اپنی تمام تر لیاقت کے ساتھ قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کے لیے خود کو وقف کر دینے کے سلسلے میں آنے والی نسلیں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتی رہیں گی۔

صفحات کی تنگی کی وجہ سے اس مضمون میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ اور سر سید کی متفرق تحریروں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں کیا جا سکا ہے البتہ جنھیں سر سید کی ادبی خدمات کا تفصیلی مطالعہ کی خواہش ہو وہ

حیاتِ جاوید حوالے کی کتاب (Reference Book) کے طور پر ساری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب سے یہ ثابت ہے کہ ان کی ادبی خدمات ان بہت ساری خدمات میں سے ایک خدمت تھی جن کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ہم سے ہمیشہ خراجِ عقیدت حاصل کرتے رہنے کے لیے ان کی دیگر بڑی بڑی خدمات سے قطع نظر ان کی ادبی خدمات ہی کافی ہیں۔

انھوں نے ایک شریفانہ زندگی بسر کی اور پروقار موت پائی۔ انھوں نے اس مشن پر جس سے انھیں لگاؤ تھا ایک ایک پیسہ خرچ کر ڈالا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انھوں نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا تو ان کے گھر میں تجہیز و تکفین کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ اس کا خرچ ان کے مخلص دوستوں کو برداشت کرنا پڑا تھا۔

ان کے انتقال کی خبر سن کر ملک بھر میں خاص طور پر مسلمانوں میں غم و یاس کا بادل چھا گیا اور ان کی وفات پر متعدد مرثیے لکھے گئے۔ ملک بھر میں ہزاروں جلسے ہوئے جس میں اس قومی خسارے پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔ ان کو فوت ہوئے گرچہ ایک چوتھائی صدی گزر چکی ہے لیکن وہ اب بھی ہزاروں مداحوں کے دل میں بستے ہیں۔

سرسید کا جسدِ خاکی ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کے وسیع احاطے میں ان کی تعمیر کردہ لمبی چوڑی مسجد کے ایک گوشہ میں اب آرام کر رہا ہے۔ یہ وہی شخص آرام کر رہا ہے جس کا دل ساری زندگی قومی محبت اور اور اپنے ملک کے ہم مذہبوں کی خدمت کی خواہش کی آگ میں جلتا رہا۔ ایک سادہ اور ناقابلِ یقین مقبرہ جو اب ان کی آخری آرام گاہ ہے زبانِ حال سے پکار پکار کر ان سے کہہ رہا ہے جنھوں نے ان کی زندگی میں ان کی مخالفت کی تھی اور جدید خیالات رکھنے کی وجہ سے ان سے کتراتے تھے کہ وہ ان کی قبر پر آئیں۔ ان کے کاموں پر غور کریں اور اچھی طرح انھیں پہچانیں۔ بقول شخصے ؎

زمن بہ جرم طپیدن کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

"تم میری زندگی میں میری آبلہ پائی کی وجہ سے گھبراتے تھے۔ اب میری قبر پر آؤ اور دیکھو کہ میں کیسی گہری نیند سو رہا ہوں۔"

"اللہ ہی نے تم کو اس قابل بنایا کہ تم سمندروں پر قابو حاصل کرو تاکہ اللہ کے حکم سے تمہارے سفینے اس پر چل سکیں۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین اور آسمان کی ہر شے پر حکمرانی عطا کی ہے۔ یہی ہیں وہ نشانیاں جن میں اصحابِ فکر کے لیے اللہ کے اشارے موجود ہیں۔"

(قرآن حکیم ۴۵۔ ۱۲/۱۳)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ج ۸ ش ۱۱ (نومبر ۹۸۹ء)

خدائے زندہ ''زندوں کا خدا ہے''

وہاب تسنیم*

اس کائنات میں انسانی اعمال و افعال کے اصول و ضوابط زندگی کے بنیادی فطری قوانین سے اخذ کیے جاتے ہیں زندگی کے پُرخطر سفر کے لیے یہی اصول ایک نظامِ عمل کی شکل میں زادِ راہ کا کام دیتے ہیں۔ یہاں حصولِ منزلِ مقصود کے لیے کمال ذہانت اور مصلحت سے حادثاتِ سفر سے محفوظ و مامون رہنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ وداعِ مہر سے پہلے ہی راستہ طے کر لینا ضروری ہے۔ تحفظِ حیات ہی مقصدِ حیات نہیں ہے افزائشِ حیات بھی ہمارا مطمحِ نظر ہے۔

انسانی زندگی میں کار فرما ہر اصول اپنے اندر دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ چند رجحانات کی تائید کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ وہ چند کی تردید کرتا ہے۔ اس ضمن میں یہ حقیقت عملاً پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ زندگی کے فطری بہاؤ کے مخالف سمت نگراں، خیالات، خواہشات اور رجحانات سے گریزاں رہنا زندگی کی بیش رفت کے لیے بہت ضروری ہے۔

جس طرح رقم پس انداز کرنے سے لوگ دولت مند نہیں بن جاتے، بلکہ سرمایہ کو، مناسب کاروبار میں لگانے اور اس میں ترقی کرنے سے دولت مند ہوتے ہیں، اسی طرح بُرے خیالات کو دور کر دینے یا غلط کاریوں سے اجتناب سے لوگ نیک نہیں بن جاتے۔ اس کے لیے بہتر زندگی کی کیفیت اور کمیت کو وسیع سے وسیع تر کرنا لازمی ہے۔ ہمسایہ سے نفرت نہ کرنا اچھی بات ہے مگر اس سے محبت رکھنا بدرجہا بہتر ہے۔

جنگل میں گم شدہ بچے کی طرح آج کا جدید انسان بھی اپنے تخلیق کردہ جنگلات میں کھو گیا ہے۔ ممنوع علاقوں کی نشان دہی کرنے والی علامتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ عین ممکن ہے کہ بھٹکا ہوا راہی ممنوعہ علاقے میں قدم رکھ دے اور اپنے آپ کو نقصان پہنچائے۔ زندگی کو ایسے خطرات سے بچانے کے لیے شاہراہ حیات کے مسافروں کو سخت ڈسپلن اپنانے کی ضرورت ہے۔ دلدلوں کے خطرے سے، ریگ رواں کی تباہ کاریوں سے، یا خطرناک چٹانوں سے۔ زندگی کو بچا لانے کی کوئی اور صورت بجز اس کے نظر نہیں آتی کہ ہم اپنے سفرِ حیات میں رہ نما اصولوں اور نقشوں کو اپنے ساتھ رکھیں اور ان کی رہنمائی قبول کر لیں۔

جہد للبقا کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اپنی اس زندگی کا احترام کریں۔ احترام کا تقاضا یہ ہے کہ نہ ہم اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں بربادی کے راستے پر ڈالیں اور نہ ہم اپنی زندگی کی تخریب کا آپ باعث بنیں۔ اسی لیے ہر مذہب نے خودکشی کو حرام قرار دیا ہے۔ خودکشی یا قتل کے بہت سے ذریعے ہیں۔ آج کے مہذب انسان نے قتل کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔

---

* لیکچرر (اردو)، ڈی۔ آر کالج نیولا

وہ نفع خور سود اگر جو اجناس کو مارکیٹ میں آنے سے روک کر
ان کی قیمتوں میں من مانی اضافہ کرتا ہے۔ وہ سرمایہ کار
جو غریبوں کی قسط وار پس انداز رقم کو دھوکے سے ہڑپ
کر لیتا ہے۔ وہ صنعت کار جو اپنے مزدوروں کو کارخانے
کی زہر آلود فضا میں کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ عورت
جو اسقاطِ حمل سے گزرتی ہے۔ وہ ڈاکٹر جو اس میں اس کا
شریک کار ہوتا ہے۔۔۔ بالواسطہ۔۔۔ یہ سب قاتل ہیں۔
اور وہ بھی جو شراب کا دھندا کرتا ہے۔ اس دھندے کی
ترقی میں سیاست والوں سے سازباز کرتا ہے اور خودکشی
کے راستے پر گامزن وہ نشہ باز بھی قاتل ہے جو اپنے دوستوں
کو نشہ کی چاٹ لگا دیتا ہے اور وہ بھی جو کھانے پینے کی چیزوں
میں ملاوٹ کرتا ہے اور جو نقلی دوائیں بناتا اور بیچتا ہے۔
خدائے زندہ و پائندہ کی بخشی ہوئی زندگی کا احترام
جو زندہ دل لوگ برضا و رغبت کرتے ہیں وہ کسی قیمت پر
کوئی ایسا عمل نہیں کرتے جو زندگی کے لیے نقصان دہ ہو۔
خود غرض، جاہل اور کاہل ماں باپ کی بود و باش کو دیکھتے
دیکھتے، ان کی اولاد۔۔۔ زندگی کے احترام سے انحراف کرنے
لگتی ہے۔۔۔ وہ شوہر جو
بات بات پر اپنی بیوی کو
مارتا اور پیٹتا ہے۔۔۔ یا
بلا فضول جھڑکیوں سے اُسے
ایک زندہ لاش بنا دیتا
ہے۔۔۔ یا بلا وجہ طلاق
سے اس کی زندگی اجیرن
کر دیتا ہے۔ وہ بیوی
جو اپنے پھوہڑپن سے یا
اپنی بے قید آزادی سے اپنے
شوہر کی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ وہ ماہرین تعلیم جو اپنی
تمناؤں کو نصابات کی شکل میں بچوں پر لاگو کر دیتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
"میں نے ایک آدمی کو جنت میں گھومتے اور پھرتے
ہوئے دیکھا ہے اور یہ مرتبہ اس کو اس وجہ سے
حاصل ہوا کہ اس نے ایک ایسے درخت کو اکھاڑ دیا تھا
جس سے راستہ چلنے والوں کو تکلیف ہوتی تھی"
[مسلم]

یہ تحقیق کیے بغیر کہ بچوں کی جسمانی اور ذہنی نشوونما میں یہ کہاں
تک معاون ہو سکتے ہیں۔۔۔۔ یہ سب احترامِ زندگی کے
بنیادی اصولوں سے بھی نابلد ہیں۔ یہ تمام لوگ اپنے عمل سے
قتلِ حیات کا باب بن جاتے ہیں اور بھی باب ذریعہ قتل ہیں
جو ہمارے سماج میں کھلے پڑے ہیں۔ کسی کا خاکہ اڑاتے رہنا،
کسی کی غیبت کرتے رہنا۔۔ کسی پر افترا پردازیوں سے
کام لینا۔ آپس میں نفرت کا لین دین کرنا۔ بزرگوں کی
توہین۔۔۔ یہ وہ کرتوت ہیں جن سے ان کے نشانہ ملامت
کا دلی چین اور ذہنی سکون ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی
کی بات یہ کہ ان سیاہ اعمال کو لوگ بری نظر سے بھی
نہیں دیکھتے۔ حالاں کہ یہ بھی ایسے ہی مجرمانہ فعل ہیں جیسا
کہ اپنے بھائی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا۔
"بے اعتدالی" جدید انسان کی اصل دشمن ہے
اعمال و اخلاق کی بے اعتدالی اسے قسط وار خودکشی کی راہ
پر ڈال چکی ہے۔ اکثر و بیشتر قوموں کے زوال کی تاریخ کا
تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اخلاقی زوال بھی قوموں کے زوال میں
اپنا وافر حصہ رکھتا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے فرانس شراب خوری
میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا
شراب، نکوٹین، سموم مشروبات
نشیلی دواؤں کی چاٹ اور
جنسی آوارگی نے اصولِ حیات
کی مضبوط دیواروں میں
غیر معمولی دراڑیں پیدا کر دی
تھیں۔ قومی شکست نے
فرانس کو اجڈ، بے سلیقہ،
گندہ اور جنسی بھوکا بنا دیا۔
ہونٹوں میں سگریٹ دبائے
۔۔۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، نشے میں سڑکوں سڑکوں
پر آوارہ پھرتے ہوئے فرانسیسی۔ دراصل ناقابلِ معافی

گناہوں کے ارتکاب کی سزا بھگت رہے تھے۔ فطرت ان کو نظرانداز کر دیتی ہے جو زندگی کی فطرت کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ، اُن کو تباہی کے گڑھوں میں گرا دیتی ہے، جو زندگی کا سفر بصیرت اور بصارت سے طے نہیں کرتے

جہاں لوگ زندگی کے احترام میں زندگی کا ثبوت نہیں دیتے وہاں خودکشی دلکش اور پُر لطف راستوں سے سماج میں چلی آتی ہے۔ نفس کشی کے نام پر۔ زندگی سے فرار۔ احترام زندگی سے فرار ہے۔ شیشۂ دل کو شکستگی سے بچانے کے ۔ ۔ ۔ ۔ خانقاہی زندگی۔ بھی زندگی سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ تن آسانی، آرام پسندی، اور عیاشی اگر کسی قوم کا وطیرہ بن جائے تو وہ قوم جہد للبقا میں بچھڑ کر رہ جاتی ہے۔ اطمینان بھری زندگی کی تلاش میں پانوں پر پانوں رکھ کر بیٹھ رہنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مسابقت کی اس دنیا میں اطمینان سے بیٹھنا، اس طرح خطرناک ہے جس طرح نشیلی دواؤں سے ملنے والا اطمینان۔

انسانیت کی سماجی تاریخ کا سبق یہی ہے کہ خدائے زندہ۔ زندوں کا خدا ۔ ۔ ۔ ہوتا ہے۔ اسی لیے مذہب اور سائنس دونوں ان خیالات اور ان نظریات کی نفی کرتے ہیں جو ہمیں زندگی کے صحیح احترام سے باز رکھتے ہیں۔

[ایک انگریزی مضمون سے آزاد استفادہ کے ساتھ]

"مطلب پورا ہوگیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے کچھ جھنجھلائے، ادھر بات جھٹک دیا، ادھر پیر پٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے۔ اگرچہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیئے۔ بچّے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤگے تو ہم اور پڑے رہیں گے تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت مُنہ بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا پی لے پی لے۔ تم چپ رہو میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو اٹھو پی لو پی لو"

سرسیدؒ

مالک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹرس: ایس۔ کے۔ آفسیٹ پریس دہلی۔

Tahzibul Akhlaq November 1989 Regd. No. L/ALG 343/88 Ph. : 4827

Lit. o Colour Print... Ac... I Tal, G. T. Road, Aligarh. Phone : 4185

دسمبر ۸۹ء

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھدار
آدمی موجود ہیں جو پرانی بیہودہ رسموں کو
برا جانتے ہیں۔ شادی اور غمی میں جو بیدریغ
روپیہ صرف ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو
بلکہ گناہ اور معصیت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ
ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ
کرتے ہیں، ان پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ
ملتے ہیں۔ مگر جب ویسا ہی موقع خود ان کو
پیش آتا ہے تو آنکھیں بند کرکے اسی اندھے
کنوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں
اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔

اغراض و مقاصد

۱. جہل، رجعت پسندی اور خود سری کے خلاف جد و جہد، ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء، ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت

۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع، زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت

۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش

۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔

۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔

۶. سائنسی علوم، فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔

۷. علوم، فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلیے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے

مسودہ بڑے سائز 20cm x 30cm کے سفید کاغذ پر ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر ہو سکے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انہیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

✳ ✳

✳ ✳

دسمبر ۱۹۸۹ء

ترسیل زر کا پتہ :

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

Editor : TAHZIBUL AKHLAQ

& NISHANT

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

زرِ سالانہ

انڈیا	______	Rs. 45·00
بیرونی ممالک ـ	ہوائی ڈاک	US $ 20·00
	عام ڈاک	US $ 8·00

مقالہ و خط بھیجنے کا پتہ :

پروفیسر کبیر احمد جائسی

اطاقِ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انڈیا۔

مندرجات

[تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بہرحال ان سے متفق ہو۔]

اداریہ

جس اعصابی تناؤ میں ہندوستان کا ہر بیدار مغز، صاحب ضمیر اور انسانیت کا درد رکھنے والا مبتلا تھا، خدا کا شکر ہے کہ وہ اب ختم ہوا یعنی الیکشن ہوگیا۔ جتنی جانوں کو الیکشن کی بھینٹ چڑھنا تھا، چڑھ چکیں، املاک کو نقصان پہنچ چکا جس کا براہ راست اثر عوام ہی پر پڑے گا کسی سیاسی پارٹی پر نہیں، جتنے لوگوں کو زخمی اور ناکارہ ہونا تھے وہ بھی ہو چکے۔ کسی کا سر پھوٹا، کسی کا ہاتھ ٹوٹا کسی کا پیر مضروب ہوا اور کسی کی ناک کٹی۔ الیکشن تو ختم ہوا لیکن الیکشن کی یہ یادگاریں بہت دنوں تک باقی رہیں گی۔ اس الیکشن نے یہ بات بھی ثابت کردی کہ ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ ان کو آسانی سے اکھاڑ پھینکنا کسی بھی طاقت کے لیے ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ عوام نے اپنا فیصلہ سنادیا۔ یہ فیصلہ جن لوگوں کے حق میں گیا ہے اب یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدوں کو کر دکھائیں اور عوام کی توقعات پر پورے اتریں۔ اگر انھوں نے فتح اور کامیابی کے نشے میں اس بات کو فراموش کردیا تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو ان لوگوں کا ہوا ہے جن کو ہندوستان کے عوام نے بساطِ شطرنج کا پٹا ہوا مہرہ بنا دیا ہے۔

وہ لوگ جن کے بلند بانگ دعووں کو عوام نے حقارت سے ٹھکرا کر ان کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کیا ہے، ان کو بھی اپنی کارکردگی اور رویے پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور تمام کمیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے تاکہ وہ دوبارہ عوام کی عدالت میں وقار، سچائی اور استحکام کے ساتھ اپنا مقدمہ پیش کر سکیں۔ ان کا ردّ عمل ہاری ہوئی ایک پارٹی کے اُس رہنما کی طرح نہ ہونا چاہیے جس نے انتہائی غصّے کے عالم میں ایک ٹیلی ویژن ٹیم سے کہا تھا کہ جو فلاں مسئلے میں مسئلے کے اس پہلو کے ساتھ تھے انھوں نے فلاں پارٹی کو ووٹ دیا اور جو لوگ اس پہلو کے ساتھ تھے انھوں نے فلاں پارٹی کو اور جو لوگ سیکولر تھے انھوں نے ہماری پارٹی کو ووٹ دیا۔ اس طرح کی باتیں کرنا ہندوستان کے تمام سیکولر لوگوں کی توہین کے مترادف ہے، ہندوستان کے سیکولر عوام اپنی اس توہین کو کسی طرح برداشت نہ کریں گے اور ایسے تمام رہنماؤں کو از کار رفتہ بنا کر چھوڑیں گے۔ حقیقت پسندانہ بات تو وہ ہے جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، اتنا اعلیٰ تعلیم یافتہ شاید ہی کوئی دوسرا سیاسی رہنما ہو، مگر وہ ابھی سیاست کے داؤں پیچ اور دروغ بافیوں سے واقف نہیں ہے، نے کہی ہے؛ اس کا کہنا تھا کہ جن جن حکومتوں نے عوام سے اپنے کیے ہوئے وعدوں کو پورا نہیں کیا، ان کو عوام نے اقتدار سے محروم کردیا۔ اب بھی اگر منتخب حکومتیں ایسا ہی کریں گی تو عوام کا ردعمل وہی ہوگا جو اس الیکشن میں ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بات انتہائی معقول ہے اور اس پر انتہائی سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہر سیاسی پارٹی کو ہے خواہ وہ حزب اقتدار ہو یا حزب اختلاف۔

یہ انتخاب آزاد ہندوستان کے گزشتہ تمام الیکشنوں سے بہت مختلف تھا، مختلف ان معنوں میں کہ الیکشن کے دوران لاتعداد جگہوں

پر جس طرح مقامی مافیا نے دخل اندازی کی اُس کی نظیر کسی دوسرے الکشن میں نہیں ملتی۔ یہ مقامی مافیا کی دخل اندازی ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک صوبے کے ایک وزیر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ایک رہنما قاتلانہ حملے سے بال بال بچے اور دوسرے اس شدید طور پر زخمی ہوے کہ کئی دنوں تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ یہ تو اُن بڑے لوگوں کی کہانی ہے جو اخباروں میں چھپ جاتی ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہو جاتی ہے۔ مقامی مافیا کے ہاتھوں "عوامی" جانوں کا جو اتلاف ہوتا ہے اس کا علم شاید ہی ہو پاتا ہو سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس دخل اندازی کی سنگینی کا احساس کسی بھی پارٹی کو اجتماعی طور سے آج بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ سیاسی شکست و فتح کا تجزیہ کرتے وقت دنیا جہان کے مسایل پر تو طول و طویل گفتگو کی جاتی ہے مگر مقامی مافیا کی سیاسی سرپرستی اور اس کے الیکشن میں دخل انداز ہونے پر کسی جبیں پر شکن نہیں دکھائی دی۔

اس مسئلے کی سنگینی کی طرف ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں پروفیسر رومیلا تھاپر نے بجا طور پر توجہ دلائی ہے۔ ہمارے لیے یہ بات بڑی مسرت کی ہے کہ جس اخلاقی زوال کو مرد کی خود غرض و حریص نگاہیں نہ دیکھ سکیں اس کو ایک خاتون کی ممتا بھری دوربین نگاہوں نے نہ صرف دیکھ لیا بلکہ اس کی سنگینی کی طرف عوام کی توجہ بھی مبذول کرائی۔ ابھی کچھ دنوں قبل جب لوکل سلف گورنمنٹ کے انتخابات ہوے تھے تو مقامی مافیا کا مسئلہ ابھر کر سامنے آیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے پیدا ہونے والے بہت سے معمر رہنماؤں نے اس سلسلے میں اپنی تشویش کا بھی اظہار کیا تھا اور چند دنوں تک اخبارات و جرایدمیں بھی اس کا چرچا ہوتا رہا مگر پھر لوگ اس مسئلے کی سنگینی کو بھول گئے اور جب جنرل الیکشن کا زمانہ آیا تو چونکہ مقامی مافیا کا قلع قمع نہیں کیا گیا تھا، اس لیے سیاسی پارٹیوں نے ان کو اپنی فتح کا وسیلہ بنایا، جس کے نتیجے میں اتنے سارے انتخابی مرکزوں پر دوبارہ ووٹ ڈلوانے پڑے جتنے آزاد ہندوستان کے کسی بھی الیکشن میں نہیں ڈلوائے گئے تھے۔ ہم کو کسی بھی سیاسی پارٹی سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اُن تمام سیاسی پارٹیوں کی کھل کر مذمت ہونی چاہیے اور عوامی غم و غصہ کا بھی اظہار ہونا چاہیے جنھوں نے اپنے اپنے الیکشن جیتنے کے لیے مقامی مافیا کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مقامی مافیا کا استعمال وہ "ارجن بان" ہے جو الٹ کر چلانے والے پر بھی آ سکتا ہے اور آتا ہے۔ آئندہ اس بان کا استعمال صرف وہی پارٹیاں کریں جو سیاسی خودکشی کرنا چاہتی ہوں، زندہ رہنے کی خواہش رکھنے والی سیاسی پارٹیوں کو بہر حال اس اسلحہ کے استعمال سے احتراز ہی کرنا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ پروفیسر رومیلا تھاپر نے جس مسئلے کی سنگینی کا احساس دلایا ہے اس پر انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور و فکر کیا جاے اور اس بات کی پیش بندی کر لی جاے کہ وطن عزیز کے کسی بھی انتخاب میں کسی بھی قسم کی، کسی بھی سطح کی اور کوئی بھی مافیا اثر انداز نہ ہونے پاے۔ ہماری جمہوریت کی بقا اور استحکام اسی پر منحصر ہے اور ہم کو ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ اس کا انجام تو اتنا واضح و روشن ہے کہ رات کی تاریکی میں بھی اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

کبیر احمد جائسی

۲۹ر ۱۱ر ۱۹۸۹

مسلمانوں کی قسمت

سر سید احمد خاںؒ

یہ سچ ہے کہ زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا۔ کبھی خوش نصیبوں کو بد نصیب کر دیتا ہے اور کبھی بد نصیبوں کو خوش نصیب۔ مگر ہر ایک تغیر و تبدل کے آثار شروع ہو جاتے ہیں جس سے آئندہ کے نتیجہ کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

اس زمانے میں ہم مسلمانوں کی قسمت کو دیکھتے ہیں کہ تقدیر اُن کی قسمت کو کچھ بلند کرتی ہے یا ایسا کراتی ہے جس کے سنبھلنے کی پھر کچھ تدبیر نہ ہو۔

اس وقت ہم دیکھتے ہیں تمام مسلمان تمام ہندوستان کے اس بات کو دل سے قبول کرتے ہیں کہ ترقی دولت و حشمت و عزت و مذہب سب عمدہ تعلیم پر منحصر ہے اور اس بات کو بھی تمام ہندوستان کے مسلمان قبول کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی اور ان کی اولاد کی تربیت کے لیے کسی عمدہ طریقہ تعلیم کے قائم کرنے اور اس کے اسباب و لوازم کے بہم پہنچانے کی نہایت اشد ضرورت ہے اور اس بات کا بھی سب کو یقین ہے کہ اگر ایسا ہی زمانہ چلا گیا اور کچھ تدبیر نہ کی گئی تو یہ مرض لاعلاج ہو جاوے گا اور اس بات پر بھی سب کی رائے متفق ہے کہ اس کا علاج صرف یہی ہے کہ ایک بہت بڑا مدرسۃ العلوم خاص مسلمانوں کے لیے قائم کیا جاوے جس میں جمیع علوم و فنون دینی اور دنیوی کی بدرجۂ کمال تعلیم ہو۔

اس دوائے جاں بخش کی خواہش سب کو تھی اور اب بھی ہے مگر اس خیال سے کہ کیوں کر حاصل ہو ایک مایوسی ہوتی تھی۔ اس دوا کا حاصل ہونا چنداں مشکل نہ تھا۔ ہاں البتہ اس کے حاصل کرنے کو سعی اور کوشش اور ہمت درکار تھی۔ پس اس زمانے میں اس کام پر کوشش شروع ہوئی ہے اور بلاشبہ اس کا کامیاب ہونا یا نہ ہونا پوری نشانی خوش نصیبی یا بدنصیبی مسلمانوں کی ہوگی۔

پس اے مسلمانو تم اس بات پر غور کرو کہ ہمیشہ موقع اور وقت ہاتھ نہیں آتا۔ جیسی کوشش اس وقت تک مدرسہ کے لیے ہو رہی ہے کبھی ایسی کوشش ہونے کی توقع تھی۔ دیکھو خدا کی مہربانی سے کیسے اچھے سامان نظر آتے ہیں حضور جناب لارڈ نارتھ بروک صاحب وائسرائے و گورنر جنرل بہادر نے اپنی جیب خاص سے ہم مسلمانوں کی تعلیم کے لیے دس ہزار روپیہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضور نواب لفٹننٹ گورنر بہادر نے اپنی جیب خاص سے عطیہ فرمانے کے علاوہ گورنمنٹ کی جانب سے گرینٹ ان ایڈ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

یہ وعدہ کچھ کم نہیں ہے بلکہ ہمارے سرمایہ کو یک لخت دوگنا کر دیتا ہے۔ اگر ہم پانچ لاکھ روپیہ جمع کر لیں تو وہ اس عطیہ گرینٹ ان ایڈ سے حقیقت میں دس لاکھ ہو جاتے ہیں اور اگر دس لاکھ روپیہ جمع کر لیں تو بیس لاکھ ہو جاتے ہیں۔ پس ایسی بڑھتی دولت کی ہم کو کب توقع تھی۔

دور دور کے مسلمان بھی اپنی قوم کی ترقی کے سامان
دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور چندہ وصول کرنے اور دینے
میں کوشش و فیاضی دونوں کو کام میں لا رہے ہیں۔

ہندوؤں نے بھی ہمارے ساتھ ہمدردی و فیاضی
کی ہے۔ چند غریب آدمیوں اور بعض بڑے آدمیوں نے بھی
چندہ دیا ہے۔ پس اس وقت جو کوشش ہو رہی ہے وہ
ایسی کوشش ہے جس کی توقع ہرگز نہ تھی۔ پس اب سب مسلمانوں
کو زیادہ ہمت اور زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ یہ سعی
حسبِ مراد کامیاب ہو۔

اے مسلمانو! اس بات کو بھی تم خیال کرو کہ اگر
اس وقت تم نے ہمت نہ کی اور سعی و کوشش میں کوتاہی کی
اور خدانخواستہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی تو پھر کبھی تمہاری
بھلائی اور تمہاری بہبودی کی توقع نہ ہوگی۔

کہاں سے یہ وقت پھر ہاتھ آوے گا جو اس وقت
ہاتھ میں ہے؟

کہاں سے یہ موقع باقی رہے گا جو اس وقت ہے؟

کون تمہارے لیے اپنی جان اپنا مال اپنا وقت اپنا
آرام تم پر فدا کرنے والا پیدا ہوگا جو پھر تمہارے لیے کوشش و
سعی کرے گا؟

کسی کو ایسی ہمت و جرأت ہوگی کہ اس کوشش کو
خدانخواستہ ناکامیاب دیکھ کر پھر آئندہ کسی قسم کی
سعی و کوشش کرنے کی ہمت کرے؟

اے مسلمان بھائیو! میں خوب جانتا ہوں کہ تم
میری حرکات و افعال ناشائستہ سے اس وقت ناراض
ہو۔ میرے افعال و اقوال کو تو خدا پر چھوڑ دو اور میرے
حق میں یہ شعر حافظ کا پڑھو ؎

یکے از عقل می لافد دگر طامات می بافد
بیا کین داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم
[ایک عقل پہ نازاں ہے، دوسرا ڈینگیں
مارتا ہے۔ تو آؤ ان داد رسیوں کو منصفِ
اعلیٰ کے سامنے رکھیں]۔

مگر اس بات کو سوچو کہ جس کوشش و سعی سے مسلمانوں
کے دینی و دنیوی علوم کی تعلیم کے لیے مدرسہ قایم کیا جاتا
ہے، اس سے اور میری ان باتوں سے کیا تعلق ہے۔

مدرسہ کے لیے جو تم چندہ دیتے ہو میرے
لیے نہیں ہے بلکہ ان کے لیے ہے جن کو تم عزیز رکھتے
ہو۔ پس کیا تم میرے لیے اپنی قوم کو اور اپنی اولاد
کو ڈوبنے اور مرنے دو گے۔

اے ناصحانِ شفیق! میں آپ کی نصیحتوں
کا بڑا احسان مند ہوں مگر اس دفتر کو اس وقت
رہنے دو اور اپنی قوم اور اپنے اہلِ مذہب کی خبر
لو اور جو کوشش ان کی بھلائی کے لیے ہو رہی ہے
اس میں مدد کرو۔

اے مجھ پر طعنہ کرنے والے بھائیو!
تم ذرا سوچو اور انصاف کرو مجھ کو تو اتنی بھی توقع
نہیں ہے کہ اگر یہ کوشش کامیاب بھی ہو جاوے
اور مدرسہ قایم بھی ہو جاوے تو بھی اس کے نتیجے
دیکھنے تک میں زندہ رہوں۔ پھر کیا میری ذات
کو اس مدرسے سے کچھ تعلق ہے۔ میں تو صرف انہی
لوگوں کی بھلائی کے لیے جن کو تم اچھا اور اپنا پیارا
جانتے ہو کوشش کرتا ہوں۔ میں تمہارا دوکارا
سہی مگر تم اپنے پیاروں کے لیے کوشش کرو۔

اے بھائی مسلمانو! تم خوب جان لو
کہ یہ وقت میں تمہاری قسمت آزمائی کا ہے۔ اگر تم
ہوشیار نہ ہوگے اور اس مدرسے کے قایم ہونے میں
دل و جان سے مدد نہ کرو گے تو تم یقین جان لینا
کہ کیا کیا مصیبتیں نہ ہوں گی جو تم پر اور تمہاری اولاد
پر نہ پڑیں گی۔ گو ہم اس وقت نہ ہوں گے، مگر

ہمارے یہ جو چند کلمے محبت و درد آمیز تمہارے
سامنے موجود ہوں گے۔

الٰہی تو اپنے بندوں اور مسلمانوں کو توفیق
نیک دے اور ان کے دل کی آنکھوں کو روشن
کر۔ تاکہ وہ موجودہ حالت کو دیکھیں اور آئندہ کی
حالت کو سمجھیں۔

سچ ہے

تعز من تشاء و تذل من
تشاء بیدک الخیر انک
علیٰ کل شئ قدیر

[(اے خدا) تو جسے چاہے عزت
بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے
بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بیشک
تو ہر چیز پر قادر ہے]۔

"اسلام جو ایک بڑا عظیم الشان مذہب ہے اور
جس نے دنیا پر گہرے اثرات ڈالے ہیں، ہندوستان
میں پُر امن دوستانہ طریقے سے داخل ہوا۔ وہ اپنے
ساتھ امن و صلح کا پیغام لایا۔ ہندوستان نے بھی
اپنی روایات کے مطابق اس کا خیر مقدم کیا اور یوں
ہندوستان میں اسلام کو قایم ہونے کا موقع
ملا۔ اس کے بعد مختلف لوگوں نے زور آزمائیاں
شروع کیں مگر وہ سیاسی میدان تک محدود رہیں۔
بعض لوگ غلطی سے آپس کی لڑائیوں کو مذہبی لڑائیاں
تصور کرنے لگے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس وقت بھی
مذہب کو استعمال کیا گیا ہو مگر مجموعی حیثیت سے
یہ تمام لڑائیاں محض سیاسی تھیں۔"

جواہر لال نہرو

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ شمارہ ۱۲ (دسمبر ۸۹ء)

کرسی نشینی

سید حامد*

موقع ہوتا تو کرسی کا قصیدہ پڑھتا اور قصیدہ بھی اتنا طویل کہ خلائے سخن خاقانی کے قصاید سے باتیں کرتا ہوا۔ لیکن اس کا نہ موقع ہے، نہ ضرورت کہ اب تو ساری دنیا کرسی کی ستائش کرتی ہوئی اور اس سے آس لگائے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ کرسی آخر زر اور اقتدار دونوں کی نشانی ٹھہری۔ اس کے لیے کبھی کبھی ضمیر کا سودا کیا جاتا ہے، کبھی گھریلو خوشیوں اور خانگی ہم آہنگی کا اور کبھی قلب و نظر کی تازگی اور حوصلہ اور طالع آزمائی اور مہم جوئی کا، اور کبھی اس وصف کا جسے انسانیت کہتے ہیں۔

کرسی پر شاید لاسہ لگا ہوتا ہے جو بیٹھا وہ چپک گیا۔ دن کے خاتمہ پر بہ مشکل اُٹھ پاتا ہے اور ملازمت کے خاتمے پر تو اسے چھوٹتے ہوئے قیامت گزر جاتی ہے جو لوگ طوعاً و کرہاً اُٹھتے ہیں ان کی پتلون کا ایک حصّہ کرسی کے ساتھ چپکا رہ جاتا ہے۔ انسان کی شناخت کے لیے اکثر یہ دریافت کافی ہوتی ہے کہ وہ کرسی سے بڑا ہے یا کرسی اس سے بڑی ہے زیادہ تر مخلوق ثانی الذکر قبیل میں آتی ہے۔

لیکن یہاں تو کرسی کا استعمال اس کے لفظی معنیٰ میں ہوگا اور جائزہ لیا جائے گا جسم کی صحت پر کرسی نشینی کے اثرات کا۔ کرسی پر بیٹھنا بظاہر آرام دہ ہے لیکن ہے یہ فطرت کے خلاف، انسان چلنے کے لیے بنا ہے یا کھڑے ہونے یا لیٹنے کے لیے۔ یہاں تک تو بات قدرت کے ہاتھوں میں تھی؛ انسان نے اس پر بیٹھنے کا اضافہ کر دیا اور جب تک کرسی کی ایجاد نہیں ہوئی تھی وہ زیادہ دیر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا یعنی قدرت کے ارادہ سے انحراف کی مدت محدود رہتی تھی، لیکن جب سے کرسی ایجاد ہوئی لوگ گھنٹوں اس میں بیٹھنے لگے۔ لگاتار کرسی پر بیٹھے رہنا تندرستی کے لیے مضر ہے۔ یہی عادت ہمارے دور کی بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اگر آپ خوش حال ہیں تو دفتر چلتی پھرتی کرسی پر بیٹھ کر جائیں گے، دن بھر دفتر میں کرسی توڑتے رہیں گے۔ واپس اسی طرح آئیں گے جیسے دفتر گئے تھے۔ ٹی۔ وی دیکھیں گے تو کرسی پر بیٹھ کر اور کھانا بھی کرسی پر بیٹھ کر کھائیں گے۔ جس کسی نے کرسی ایجاد کی اس کا ایک ہی مقصد رہا ہوگا: اس پر بیٹھنے والے کے بدن اور اعضا کے لیے کسی قسم کی ورزش اور حرکت کا امکان باقی نہ رہے۔ باور نہ آئے تو اُکڑوں بیٹھ کر کھانا کھائیے یا فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھیے۔ اول الذکر میں مصلحت یہ تھی کہ پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا جائے۔ تھوڑی سی جگہ رہ جائے۔ بہرکیف اول الذکر اور آخر الذکر دونوں میں اعضا اور پٹھوں پر دباؤ پڑتا ہے۔ کرسی پر بیٹھیے تو آرام ہی

* سابق وائس چانسلر، اے ایم یو علی گڑھ ——— ہمدرد نگر، نئی دہلی۔

آرام ہے، شروع سے آخر تک بے حرکتی اور بے ورزشی کیفیت کرسی دوران خون کی رفتار کو تیز ہونے ہی نہیں دیتی۔ یہ رفتار برابر دھیمی رہے تو بھر کے ہر کارے اپنے فرائض منصبی کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے نہیں پاتے اور بدن میں فساد راہ پا جاتا ہے۔ جسم کی دفاعی طاقتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور بیماریوں کے لشکر بے روک ٹوک قلعے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

کرسی پر متواتر بیٹھنے والے بھول جاتے ہیں کہ انسان کا سپہ سالار دل ہے اور جو اعضا اسے کمک پہنچاتے ہیں وہ پانو ہیں اسی لیے ٹانگوں کو دوسرا دل کہا جاتا ہے۔ ٹانگیں متحرک رہتی ہیں تو دل کو مدد ملتی ہے، بدن کے ہر حصے تک ہو دوڑانے میں۔ لوگ دوڑنے اسی لیے ہیں، 'جوگنگ' اسی لیے کرتے ہیں اور منھ اندھیرے چہل قدمی کے واسطے اسی لیے نکلتے ہیں۔ کرسی پر لگاتار بیٹھنے والے کا دل ٹانگوں کی صحت آفریں کمک سے محروم رہتا ہے۔ اس کے قوائے جسمانی میں زنگ لگنے لگتا ہے۔ جسمانی قوتیں تھک کر شل نہیں ہوتیں، نہ کثرتِ استعمال سے ہتھیار ڈالتی ہیں، ان کو جراحت پہنچتی ہے عدم استعمال اور قلت استعمال سے۔

پھر تعجب ہی کیوں ہو اگر وابستگان کرسی کی نیند اُڑ جائے اور بھوک ان سے دُور دور رہنے لگے۔ سادہ صحت بخش غذائیں انھیں پھیکی سیٹھی اور اشتہا رُبا لگیں اور ان کی طبیعت مرچ مسالہ چٹنی اچار کی طرف راغب ہو جائے اور بالآخر اس کا خمیازہ بھگتے۔

اس سے بڑی محرومی کیا ہوگی کہ انسان کھانا دیکھ کر منھ بنائے اور بستر پر گھنٹوں کروٹیں لے۔

ہم بہت سی گردنوں میں کالر پڑا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہ بھونڈا پٹکا، شخصیت کے تناسب کو ختم کر دیتا ہے اور معذوری کے نقش بٹھا دیتا ہے۔ عام طور پر نصیحت کی جاتی ہے کہ جان بوجھ کر گردن پھندے میں نہ ڈالو۔ ہم ایسے نادان ہیں کہ بالقصد گردن کو حلقہ میں ڈال دیتے ہیں۔ کرسی پر متواتر بیٹھے رہنے اور میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو پڑھنے یا ان پر لکھنے کا اثر غریب گردن پر پڑتا ہے۔ وہ جواب دے جاتی ہے اس خاموش جواب کو "اسپانڈولوسس" کہتے ہیں۔ دیکھا آپ نے کرسی نشینی اپنا تاوان جسم سے لے کر رہتی ہے ؟ جلد یا بدیر۔

لیکن بڑھاپے کی اس مصیبت سے بچا جا سکتا ہے، تواتر میں دراڑیں ڈال کر، تھکن کو توڑ کر۔ کرسی پر بیٹھ کر کام کرنے میں وقفے دے کر۔ اس طرح گردن ہی کو نہیں آنکھوں کو بھی راحت ملے گی، فائدہ پہنچے گا۔ پروردگار نے ہمیں بدن جو دیا ہے، اعضا جو عنایت کیے ہیں، توتیں جو بخشی ہیں، یہ سب اس کا بڑا احسان ہے۔ اس احسان کا جن لوگوں کو احساس ہے وہ ان عطیات کو بگڑنے اور برباد ہونے نہیں دیتے۔ انھیں سلیقہ، ڈھنگ اور خوش اسلوبی سے استعمال کرتے ہیں اور یہی دراصل سب سے موزوں طریقہ شکر کرنے کا ہے۔ انسان کے جسم کو دیکھیے، اس کے متناسب جسم کو دیکھیے جسے غفلت اور استعمال کی کجی نے بگاڑا نہیں ہے۔ اس سے بہتر، موزوں تر، کامل تر، جمیل تر کوئی شے روئے زمین پر نظر نہ آئے گی۔

یونانیوں نے جن کی ذہنی فضیلت کو آج تک کوئی قوم پہنچ نہیں پائی، جسم کے جمال و کمال کا بھید پا لیا تھا۔ اس دور میں انسانی جسم کی یکتائی زیبائی اور صلاحیت کو نظرانداز کرنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے ورزشیں کرنے، جسم بنانے دوڑنے کھیلنے اور مقابلہ آرائی کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اہل یونان نے ہمہ وقت یہ احتیاط برتی کہ جسمانی ورزشیں، بلند پروازیاں، سرعت طرازیاں، صلاحیت افزائیاں اور جمال آفرینیاں زر کی طمع کے ساتھ نہ جڑ جائیں جیتنے والوں کا اعتراف لاریل کی پتیوں کی شکل میں ہوتا تھا۔ صحت، جسم اور مقابلے پر بعد میں آنے والے ادوار

بھی زور دیتے رہے اور بیسویں صدی میں تو کھیلوں اور
مسابقتوں نے اپنے عروج کو چھو لیا لیکن پیشہ ورانہ اختصاص
کی طلب اور ہوسِ زر نے مقابلے کے ذوق کو آلودہ کر دیا۔
مقصد اس طرح بگڑا، ذرائع دوسری طرح۔ چھپ کر وہ دوائیں
استعمال کی جانے لگیں جو وقتی طور پر جسمانی صلاحیتوں کو مہمیز
دے دیتی ہیں۔ لالچ کا دھبہ کھیلوں کی پاک دامنی پر لگ
گیا۔ مقابلہ کرنے والوں میں سے کچھ نے، جنہیں چالاکی،
بے اطمینانی، جھوٹ سے پہلے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا، دروغ
بافی اور فریب دہی کا کاروبار شروع کر دیا۔ گزشتہ اولمپک
کھیلوں میں بین جانسن کی رسوائی نے ڈرگ آشامی کو
طشت از بام کیا۔ اس نے ڈرگ لے کر قواعد کی خلاف ورزی
کی اور پھر اسے چھپانے کے لیے جھوٹ بولا۔ یعنی مقصد اور
ذریعہ دونوں ملیامیٹ ہو گئے۔

صحت کو برقرار رکھنے کے لیے صرف ورزش ہی کافی نہیں
ہے۔ پُرخوری تندرستی کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ کھانا
صرف اتنا کھانا چاہیے جتنا جسم کو اپنی ضرورتوں کے لیے
درکار ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ کھایا تو متعلقہ اعضا پر
غیر ضروری بوجھ ڈالے گا اور وزن کو بڑھائے گا۔ ایسی حالت
میں جب کروڑوں انسانوں کو اتنا کھانا بھی نہیں ملتا کہ وہ
اپنے جسم کی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ یہ بات بے حسی
کی ہے کہ خوشحال طبقہ ضرورت سے زیادہ خوراک کو اپنے
صرف میں لائے۔ ایک کی صحت خوراک کی زیادتی سے برباد
ہو رہی ہے اور دوسرے کی اس کی کمی سے۔ خدایا دہی
خوراک جو کنگالوں کے لیے زندگی بخش ہوتی ہے، خوشحالوں کے لیے
جان لیوا بنائی جا رہی ہے۔ وزن کا اثر دل کی مشقت پر
براہِ راست پڑتا ہے اور جسم کے بوجھ سے عاجز آ کر دل
سپر انداز ہو جاتا ہے۔ فربہی سے پھرتی اور چابکی سے ہاتھ
دھونا پڑتا ہے اور مہم جوئی کا حوصلہ باقی نہیں رہتا۔ زندگی
کی پہچان اور اس کا نشان حرکت ہے اور ہر وہ شے جو
حرکت میں سدِ راہ ہو، زندگی کے ذوق اور اس کی مدت
کو کم کرتی ہے۔

کھانے کی بات میں کم و کیف دونوں آ جاتے ہیں، زبان
کے چٹخارے کے لیے صحت کو مشتبہ اور جسم کو بدقطع کرنا کہاں
کی دانائی ہے۔ کھانا سادہ اور صاف ستھرا اور متوازن
ہونا چاہیے۔ ہمارے یہاں چٹپٹے کھانوں کا چلن ہے جن میں گھی
اور مرچ مسالے کا غلبہ ہوتا ہے۔ سبزیوں سے نہ جانے کیوں
ہم گھبراتے ہیں، پھلوں سے اور دودھ سے دامن بچاتے
ہیں، حالاں کہ چشمۂ حیواں ان کے حصار میں ہے۔

کاش کہ دل دادگانِ کرسی اور وارفتگانِ ذائقہ یہ سمجھ
لیتے کہ زندگی کی خوشیوں، کامیابیوں، امتیازوں اور
سربلندیوں کا انحصار بڑی حد تک تندرستی پر ہے۔ جینے کا
ذوق اور آگے بڑھنے کا ولولہ اور خدمتِ خلق کا حوصلہ اور
امتیاز کی طلب۔ ان سب کو تندرستی سے شہ ملتی ہے۔
تندرستی نہ ہو تو صلاحیتیں، خواہشیں اور لطف اندوزیاں اور
کوششیں مرجھا کر رہ جاتی ہیں۔ جو لوگ صحت سے غفلت
برتتے ہیں وہ زندگی کو جوئے کم آب بنا دیتے ہیں۔ ان
کو جینا اجیرن ہو جاتا ہے، ان کے لیے کسی بات میں کوئی لطف
نہیں رہتا۔ ساری کامیابیاں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔

اپنے ہاتھوں اپنی صحت وہی لوگ برباد نہیں کرتے
جو پیٹ کو اناڑی کی بندوق کی طرح بھر لیتے ہیں، جو زندگی
کے سفر میں دم لے کر کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ تندرستی کی حالت
اور آثار کیا ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ انسان جو اتنا خود غرض
ہے، اپنی صحت کے ساتھ اتنی بے گانگی کیوں برتتا ہے۔ برسات
میں مکان کی چھت ٹپکنے لگے، دیوار کا پلاسٹر اکھڑ جائے
دروازوں کا رنگ و روغن اُترنے لگے تو دھیان خود
بخود اُدھر جاتا ہے لیکن صحت کی دیوار میں کجی آ جائے تو
اٹھنے بیٹھنے میں تکلف ہونے لگے، سیڑھیاں چڑھنے پہ
ہانپنا پڑے تو اُن کے لیے بلا تکلف کوئی اطمینان بخش تاویل

ڈھونڈھ لی جاتی ہے اور یہ اس زمانے میں ہو رہا ہے جب اس طرح کے آلات موجود ہیں جو پلک جھپکتے جسم کا سُراغ لگالیتے ہیں۔ اس بے رُخی پر اعتراض کیجیے تو جواب ملے گا "ڈاکٹروں کے چنگل سے خدا بچائے۔ ان کے پاس جاکر دیکھیے تو اچھے بھلے آدمی میں کتنی بیماریاں نکال دیں گے اور جانچیں کروا کروا کے اسے رُلا دیں گے۔ قرض لینے کی نوبت آجائے گی"۔ یہ سب کچھ تسلیم، واقعی اس دور حرص و آز میں بہت سے جدید اطبا نے مسیحائی کی جگہ قزاقی کو پیشہ بنالیا ہے لیکن سب کے سب تو ایسے نہیں ہیں اور پھر دوسروں کی طماعی سے ڈر کر ہم اپنی صحت کو کیوں برباد ہونے دیں۔ نامساعد حالات کا مقابلہ ہمیں ہر قدم پر کرنا ہے، جم کر کرنا ہے، کہ زندگی نام ہی اسی کا ہے۔

ان لوگوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جو صحت سوزی کے مشغلہ میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ روپیے کو تندرستی بنانے میں صرف نہیں کرتے، صحت بگاڑنے کے لیے بلا دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اپنے گھر کو اپنے ہاتھوں سے پھونک کر بغلیں بجاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو سیلاب کا رُخ اپنے مکان کی طرف موڑ دیتے ہیں، اور ایک نیا طبقہ ایسا بھی رُونما ہوا ہے جو دیمک کو اس بات پر مامور کرتا ہے کہ ان کے گھر کو چاٹ جائے۔ قارئین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون کون سے گروہ ہیں۔

پہلا طبقہ تو سگریٹ، بیڑی، سگار، پائپ پینے والوں کا ہے جو پھیپھڑے کو جلا کر حظ اندوز ہوتے ہیں اور کینسر اور دل کے دورے کو دل گرمی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔

دوسرا گروہ ان انسانوں کا ہے جو ام الخبائث سے پینگ بڑھاتے ہیں، جو شراب کے سیلاب کا دہانہ اپنی تندرستی کی طرف کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ہوش و حواس بچتے ہیں، نہ صحت۔ سب کچھ بہہ جاتا ہے۔

تیسری جماعت ان افراد کی ہے جو کوکین، ایل۔ ایس۔ ڈی، براؤن شوگر اور دوسرے ڈرگ اپنے جسم میں حلق یا سوئی کے ذریعے اُتار لیتے ہیں۔ ان کا مقصد ہوتا ہے یک گونہ بےخودی؛ فرحت و نشاط اور پرواز۔ تشیلی اور زہریلی دواؤں کے بازوؤں پر اُڑ کر یہ فلک ہفتم تک پہنچ جاتے ہیں اور گرتے ہیں تو اسفل سافلین بن کر۔ اُن کی حالت پہلے دو گروہوں سے زیادہ غیر ہوتی ہے، خود شراب جو بُرائیوں کی جڑ ہے، ماری جونا، براؤن شوگر اور ایل۔ ایس۔ ڈی کے آگے پانی بھرتی ہے۔ براؤن شوگر کا ذکر آیا ہے تو ایک نگاہِ غلط انداز وہائٹ شوگر یا سفید شکر پر ڈالیے جسے لوگوں نے چینی کہنا شروع کر دیا ہے۔ اسے ہم کس چاؤ کے ساتھ کھاتے ہیں، براہ راست اور حلووں اور مٹھائیوں کی شکل میں۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ جدید اطبا نے اس کو وہائٹ پوائزن یا سفید زہر کا نام دیا ہے۔ یہ بہرحال مضر ہے۔ جتنی زیادہ کھائی جائے اتنی زیادہ مضر۔ اور اپنے ساتھ اگر یہ ذیابطیس کو لے آئی تو سمجھ لیجیے کہ تندرستی کا قلعہ ٹوٹ گیا۔ بات سے بات نکلتی ہے لیکن اب جو کچھ کہا جائے گا وہ کوئی دقیق نکتہ نہیں ہے۔

انسان ایک جزو ہے نظامِ کائنات کا۔ اس کی عافیت نظامِ قدرت کے قریب رہنے میں ہے۔ اس سے وہ جس قدر بھی صلہ بڑھائے گا، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ بنائے گا، اسی قدر ٹوٹے میں رہے گا۔ اس کے اوقات و اوراد نظامِ قدرت سے جتنے قریب ہوں گے اتنا ہی وہ صحت مند اور خوش و خرم رہے گا۔ تصنع اور تکلف اس کی زندگی کے شعبوں میں جس قدر دخیل ہو گا، جتنی تہ در تہ پیچیدگیاں اور غیر معتدل نزاکتیں اور نفاستیں اس کے اطوار و کردار میں راہ پائیں گی اتنی ہی شکست آمادہ اس کی تندرستی ہو جائے گی۔ صحت کے لیے سفید شکر سے

کہیں بہتر باداری گڑ ہوتا ہے اور گڑ سے بہتر گنے کا رس۔ چاول کا بھی یہی حال ہے۔ لوگ دسترخوان پر سفید اور براق کھلے ہوئے چاولوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں حالانکہ یہ صبیح اور خوبرو چاول اس منزل تک پہنچنے میں اپنی بیشتر غذائیت کھو بیٹھتے ہیں۔ حیوان ناطق عمل ارتقا کے تحت انسانیت کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ اچانک وہ راستے سے بھٹک گیا اور انسانیت نے جس کا مفہوم تھا انسان بلکہ خدا کی ساری مخلوق کے ساتھ بھلمنساہت کا برتاؤ، تکلف، نفاست، لطافت اور آرائش ظواہر کا روپ اختیار کر لیا۔ تہذیب نے حسن اخلاق کی جگہ نفاست، لطافت اور تصنع سے ناتہ جوڑ لیا۔ آٹے کو میدہ کیا بنایا، انسان فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کے محاذ سے پسپا ہو گیا۔ بہترین اور سود مند ترین نظام تجارت بارٹر یا تبادلۂ اشیا کا تھا۔ انسان اپنی سہولت کے لیے زر کو درمیان میں لایا اور زر کا غلام بن گیا۔ اس نے ذریعہ کو مقصد، خادم کو مخدوم بنا لیا۔ تبادلۂ احساس کا چلن قایم رہتا تو ہر شخص محنت کرتا اور طبقاتی ناانصافی صفحۂ ہستی پر اپنا منحوس سایہ ڈال ہی نہ پاتی۔ شراب سے بھی زیادہ مہلک شے انسانیت اور خوشی کے لیے زر ہے، لیکن ہم اپنے موضوع سے دور جا رہے ہیں۔

ساری گفتگو کا ما حصل یہ ہے کہ صحت بلکہ خوشی اور خوشحالی کا راز ایک تو اعتدال اور توازن میں ہے، دوسرے فطرت سے قرب اور ہم آہنگی میں، تیسرے اس سب سے بڑی دولت کی نگہداری میں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو ودیعت کی ہے، یعنی ایک تندرست اور توانا اور مہم جو اور متحرک بدن۔ حیرت اس بات کی ہے کہ کرسی پر بیٹھنے والے ان تینوں آداب کو اکثر بھلا بیٹھتے ہیں۔ کرسی نشینی سراپا حضر ہے لیکن سفر سے زیادہ پر خطر ہے۔

یہاں تک ذکر فرد کا تھا لیکن بات لامحالہ جماعت تک پہنچتی ہے۔ افرادی طاقت دو چیزوں سے بنتی ہے صحت سے اور تعلیم سے۔ کوئی جماعت جو طاقت اور عزت نفس کو عزیز رکھتی ہے نہ صحت کو نظرانداز کر سکتی ہے نہ تعلیم کو۔

> " اگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے کیوں کہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی بربادی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا محکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جائے گی اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی
>
> سید احمد

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ ج ۸۔ ش ۱۲ (دسمبر ۸۹ء)

اپنا حق مانگیے

عتیق احمد صدیقی *

شاید چھٹی کا دن ہے اور شاید چھٹی بھی نہ ہو۔ آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ کچھ احباب بھی موجود ہیں۔ گپ شپ ہو رہی ہے کبھی کسی سیاسی مسئلے پر گفتگو ہے اور کبھی کبھی کوئی سنجیدہ علمی مسئلہ بھی زیر بحث آجاتا ہے۔ لطیفے اور چٹکلے بھی سنائے جا رہے ہیں خوشی و خرمی کا ماحول ہے۔ کسی کو کوئی ضروری کام بھی ہے تو وہ اس کو لمحہ بہ لمحہ ٹال رہا ہے۔ آپ میں سے کسی کا بھی جی نہیں چاہتا کہ اس پر لطف محفل سے اُٹھے۔ کوئی اُٹھنا بھی چاہتا ہے تو دوسرے دوست اُس کو اُٹھنے نہیں دیتے۔ " ارے یار بیٹھو! ایسی بھی کیا جلدی! کام! کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

باہر خوش گوار دھوپ ہے۔ آپ کے کچھ کپڑے الگنی پر لٹک رہے ہیں۔ کوئی اچکا ادھر سے گزرتا ہے اور ایک بنیان اُتار کر چل دیتا ہے۔ آپ اس کو دیکھتے ہیں۔ خوش گپیاں اور محفل آرائی سب بھول کر آپ اس کے پیچھے لپکتے ہیں، چلاتے بھی ہیں۔ سب دوست بھی آپ کے پیچھے پیچھے آتے ہیں اور اس اچکے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خوف زدہ ہو کر آپ کا بنیان پھینک دیتا ہے اور اپنی جان بچانے کو دیوار پھاند کر غائب ہو جاتا ہے۔ شاید بنیان پاکر آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو لیکن آپ کے بعض ساتھی اس بات پر متاسف ہوتے ہیں کہ وہ اچکا ہاتھ کیوں نہیں آیا اگر ہاتھ آجاتا تو اس کی اچھی طرح کندی کی جاتی۔ آپ بازار جاتے ہیں دکان دار سے کچھ سودا خریدتے ہیں۔ اس کو پچاس روپے کا نوٹ دیتے ہیں۔ وہ کچھ روپے آپ کو واپس دیتا ہے۔ آپ گنتے ہیں اور پچھتر پیسے کم پاتے ہیں۔ کیا اس پر آپ خاموش رہ جاتے ہیں نہیں؟ بلکہ دکان دار سے ان پیسوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر اس نے واپس کر دیے تو فبہا ورنہ آپ جھگڑنے پر آمادہ ہوتے ہیں اور اس سے پچھتر پیسے وصول کر کے چھوڑتے ہیں۔

آپ ریل گاڑی کا ٹکٹ لینے کے لیے قطار میں کھڑے ہیں۔ گاڑی کے آنے میں کچھ وقت بھی ہے۔ قطار دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔ آپ سے آگے بھی کچھ لوگ ہیں اور آپ سے پیچھے بھی بڑی تعداد ہے۔ یکایک ایک مضطرب نوجوان آپ سے آگے قطار میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ اس کو ٹوکتے ہیں۔ وہ نہیں مانتا۔ آپ خفا ہونا شروع ہوتے ہیں اور اس کو ایک طرف ہٹا دیتے ہیں۔ وہ پھر بھی نہیں مانتا۔ آپ اور ناراض ہوتے ہیں۔ کچھ کہا سنی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ پولس کا سپاہی اس کو دھکیل دیتا ہے اور پیچھے اپنی باری کی جگہ پر کھڑا ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ مطمئن ہونے کے باوجود دیر تک جھنجھلاتے رہتے ہیں کہ اس نے آپ کی باری کا حق مارنے کی کوشش کیوں کی

آپ سڑک پر چلے جا رہے ہیں، آپ کا کوئی خرد سامنے

---

* ڈین فیکلٹی آف آرٹس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سے گزرتا ہے اور آپ کو سلام کیے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ آپ کو ملال ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ تعلق ہو تو آپ کو غصہ آتا ہے۔ آپ شاید اس کو روک لیتے ہیں اور اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ شاید اس صورت حال کی تلافی بھی نہیں کی جاسکتی۔

یہ سب یا ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کو جھنجھلا دیتی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے نا کہ آپ اپنا نقصان برداشت نہیں کرسکتے آپ اپنے چھوٹے سے چھوٹے حق سے بھی دست بردار ہونا نہیں چاہتے اور نہ کسی کو اپنے حق پر دست اندازی کرنے کی اجازت دینا چاہتے ہیں۔۔ یہ بالکل فطری امر ہے اور انسانی سرشت کے عین مطابق۔ مگر سرشت اور فطرت کا یہ حصہ بیدار اور کار فرما اسی وقت ہوتا ہے جب آپ کو اپنے حق کا احساس ہو۔ وہ حق مادی ہو یا غیر مادی یا محض خیالی۔ پہلی دو مثالوں میں آپ کا مادی نقصان ہے۔ یعنی مادی طور پر آپ کی حق تلفی ہوتی ہے۔ تیسری مثال میں آپ کے وقت کے زیاں کا خطرہ ہے جو غیر مادی ہے مگر یہ حق تلفی بھی آپ کے لیے قابل برداشت نہیں چوتھی مثال محض ایک خیالی امر ہے کہ چھوٹوں کو بڑوں کا ادب کرنا چاہیے اور سلام کرنا بھی اس ادب کا ایک مظہر ہے۔ آپ کے خیال میں کہ آپ بڑے ہیں یہ آپ کا حق ہے کہ آپ کے خرد آپ کو سلام کریں۔ نہیں کرتے تو آپ کو اپنی حق تلفی کا احساس ہوتا ہے اور آپ خفا ہوتے ہیں خواہ اس کا اظہار کبھی نہ بھی کریں۔

ایسی چھوٹی بڑی حق تلفیوں سے آپ ہمیشہ دوچار رہتے ہیں اور ہمیشہ ان کے تدارک کے لیے تیار رہتے ہیں۔ کبھی کبھی آمادۂ پیکار بھی۔ مگر اسی وقت جب یہ حق تلفی آپ کے علم میں ہو اور آپ کو اس کا احساس ہو۔ آپ کی لاعلمی میں کچھ ہو جائے تو آپ کیا کریں، مگر ہاں وقوع کے بعد بھی جب آپ کو معلوم ہوتا ہے تو آپ خفا ضرور ہوتے ہیں۔ مگر چیں بہ جبیں ہونے کی حد تک اور کبھی اشتعال کی حد تک اور تدارک کی بھی کوشش کرتے ہیں اور اگر آپ کے علم میں نہ ہو یا حق تلفی کا احساس ہی نہ ہو تو اس کی تلافی کا خیال آئے گا نہ تدارک کا۔ اس لیے کسی حق کو حاصل کرنے کے لیے پہلی شرط تو یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ یہ ہمارا حق ہے۔ ورنہ دوسرے ہماری حق تلفی کرتے رہیں گے اور ہم مطمئن رہیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے کسی نے ہمارا نقصان نہیں کیا اور جب یہ صورت حال ہو تو نہ اشتعال، نہ خفگی، نہ احساس زیاں!

ذرا تعلیمی درس گاہوں کی طرف آیئے۔ خواہ وہ اسکول ہوں یا کالج یا یونیورسٹیاں۔ اسکولوں کو چھوڑ کر جہاں نوعمر اور ناسمجھ بچے زیر تعلیم ہوتے ہیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہمارے نوخیز نوجوان ہوتے ہیں۔ ان نوجوانوں میں نوعمری کی خون کی گرمی بھی ہوتی ہے، جوش و جذبہ بھی ہوتا ہے، مخالف قوتوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے، کچھ خواب ہوتے ہیں اور ان خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کی شدید آرزو بھی، اچھی باتوں کے کان میں پڑنے سے ان کے کچھ آدرش بھی ہوتے ہیں اور اُن آدرشوں کو پورا کرنے کے لیے قوت عمل بھی۔ انھیں آدرشوں کی وجہ سے وہ سماج میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں، ناہمواریوں اور نامعقول رویوں کو برداشت نہیں کرپاتے۔ جمہوریت کے تصورات عام ہونے کے ساتھ ان کو اپنے حقوق کا احساس بھی بڑھ گیا ہے اور (قطع نظر اس کے ہمارے سیاست دانوں نے کبھی کبھی طلبا کی قوت کو اپنے مقاصد کے لیے غلط یا صحیح استعمال کیا)۔ اسی باعث ہمارے تعلیمی اداروں میں آئے دن ہنگامے ابھرتے رہتے ہیں۔ ان ہنگاموں میں کبھی کبھی گروہی تصادم بھی ہوتے ہیں، ان کو چھوڑ دیجیے اکثر و بیشتر احتجاج، ہنگامے اور ہڑتالیں انھیں امور پر ہوتی ہیں جن کو طلبا صحیح یا غلط اپنی حق تلفی سمجھتے ہیں۔ فیس بڑھائے جانے پر، یونین توڑنے پر، کسی طالب کے خلاف تادیبی کارروائی ہونے پر، امتحانات کے منشا کے مطابق نہ ہونے پر، سربراہ ادارہ کے طلبا میں نامقبول ہونے پر، کسی استاد کے کسی ایسے عمل پر جو طلبا کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے۔ کسی کالج کے گریجویٹ سطح سے پوسٹ گریجویٹ نہ کرنے پر، چائے خانہ یا ایسی کسی دوسری سہولت کے نہ ہونے پر۔ یہ یا اسی طرح کے بہت سے چھوٹے بڑے مسائل

جن پر احتجاج ہوتے رہتے ہیں، بالکل عارضی، وقتی اور مقامی ہوتے ہیں اور اسی طرح سے ان کے حل بھی تلاش کر لیے جاتے ہیں

آپ کالج یا یونیورسٹی میں کیوں جاتے ہیں؟ وقت گزاری کے لیے؟ جی نہیں! تفریح کے لیے؟ جی نہیں! تعلیم و تربیت کے لیے؟ جی ہاں! اور بعض لوگوں کا تو خیال یہ ہے، جن میں سر سید بھی شامل ہیں کہ تعلیم سے بھی زیادہ اہمیت تربیت کی ہے مگر اس بحث میں جائے بغیر کہ ان میں سے کس کی اہمیت زیادہ ہے، فی الحال دونوں کو ایک ساتھ رکھیے۔ اگرچہ ہم نے اپنے جدید نظامِ تعلیم سے اپنی سہل پسندی کے باعث تربیت کے حصے کو تقریباً خارج کر دیا ہے کہ اس کی نگرانی والدین یا دوسرے اہلِ خاندان کریں اور صرف تعلیم کو ان اداروں کا مقصد قرار دیا ہے۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ تعلیم تو فی زمانہ کتابوں کے ذریعے گھر بیٹھے حاصل ہو سکتی ہے مگر ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ یہ تعلیم ادھوری اور ناقص ہوتی ہے (اگرچہ مراسلاتی اور فاصلاتی تعلیم کا نیا نظام اس تصور کو باطل قرار دینے پر تلا ہوا ہے) اور اساتذہ کے بغیر اس کا تکملہ نہیں ہو سکتا اس مقصد کے حصول کے لیے آپ کالج / یونیورسٹی جاتے ہیں اس کے لیے قیمت ادا کرتے ہیں، فیس اور دوسرے اخراجات کی شکل میں اور آپ ہی نہیں بلکہ پورا معاشرہ اس کے لیے زیر بار ہوتا ہے مگر اس کو نظر انداز کیجیے کہ اس کا اثر راست آپ کے اوپر نہیں پڑتا۔ لیکن ذرا سوچیے تو سہی کہ خود آپ کو بھی کیا کچھ دینا پڑتا ہے۔ اپنی نوجوان عمرِ عزیز کا اتنا وقت جتنا اس کے لیے درکار ہو (سال، دو سال، تین سال یا اس سے بھی زیادہ) وہ وقت جو آپ اسکول / کالج / یونیورسٹی میں گزارتے ہیں، کسی دوسری پیداواری مصروفیت میں صرف کرتے تو شاید ہزارہا روپیہ خود پیدا کرتے۔ آپ نے اپنی خوشی سے خود کو اس سے محروم رکھا۔ اگر آپ اپنا وقت دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ خوش فعلی میں گزار کر محظوظ ہونے کے آرزومند تھے تو اس سے بھی محروم ہونا پڑا۔

لیکن کیا اسکولوں / کالجوں / یونیورسٹیوں میں آپ کو وہ سب کچھ حاصل ہو رہا ہے، جس کی آپ اتنی بھاری قیمت دیتے ہیں؟ اگر نہیں (اور بڑی حد تک جواب نفی میں ہی ہوتا ہے) تو کیا کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کی کتنی بڑی حق تلفی ہو رہی ہے؟ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کہیں اس پر احتجاج ہوا ہو کہ تجربہ گاہ کی مناسب سہولتیں نہیں ہیں۔ کبھی اور کہیں بھی احتجاج نہیں ہوا کہ اساتذہ کلاس وقت پر نہیں لیتے یا بالکل نہیں لیتے یا کلاس لیتے ہیں تو گنڈے دار۔ کہیں احتجاج نہیں ہوا کہ دورانِ سال جتنا پڑھایا جانا چاہیے تھا، نہیں پڑھایا گیا (ہاں یہ کہ امتحان میں اور وہ بھی اس صورت میں جب کسی ایسے حصے سے جو پڑھایا نہ گیا ہو کوئی سوال پوچھ لیا جائے)۔ کبھی اور کہیں احتجاج نہیں سننے میں آیا۔ اس بات پر کہ کسی استاد نے اپنے متعلقہ کورس کے ساتھ انصاف نہیں کیا (اس بات کو چھوڑ دیجیے کہ طلبا کسی استاد سے کسی اور بات پر خفا ہوں اور پھر ان الزامات میں بھی اسے دھر گھسیٹیں) ہاں احتجاجوں کی تاریخ میں شاید ہی کبھی اس پر احتجاج ہوا ہو کہ نصاب کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔

استاد اور طالب علموں کے رشتے میں خفگی اس بات پر ضرور ہوتی ہے کہ کوئی استاد طالب علم کے کلاس میں آئے بغیر حاضری کیوں نہیں دیتا۔ نہ آنے والوں کو غیر حاضر لکھتا ہے اور پھر سال کے آخر میں کسی طالب علم کی حاضری کم ہونے کی وجہ سے اسے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ملتی۔ خفگی اس بات پر ہوتی ہے کہ کوئی استاد سخاوت سے امتحان کے نمبر کیوں نہیں دیتا، خواہ جواب میں کچھ بھی لکھا گیا ہو۔ ناگواری ہوتی ہے تو اس بات پر کہ کسی استاد نے کسی طالب علم کی ناکارکردگی پر اس کو سرزنش کی۔ تلخی کبھی اس بات پر بھی پیدا ہوتی ہے کہ کسی استاد نے کسی طالب علم کو وہ "احترام" نہیں دیا جس کا وہ خود کو مستحق سمجھتا تھا۔ ناراضگی کا سبب کبھی یہ بات بھی بنتی ہے کہ کسی استاد نے کسی طالب علم کو کسی نامناسب حرکت سے روکنے کی کوشش کی۔ ہم سب نے

ان اور انہیں جیسے بہت سے امور پر انفرادی اور اجتماعی احتجاج
ہوتے دیکھے ہیں۔ احتجاج اس لیے ہوتا ہے کہ ایک یا کچھ طالب علموں
کو ان باتوں میں اپنا نقصان محسوس ہوتا ہے، یا ان کا خاطر خواہ
فائدہ نہیں ہوتا یا اُن کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے مگر حقیقی نقصان تو
ان امور میں ہے جن کا سابقہ پارے میں ذکر ہوا۔ اس کا شاید
کسی کو احساس نہیں۔

عام تجربہ یہ ہے کہ استاد کلاس نہ لے تو طلبا
خوش ہوتے ہیں۔ ان کو ایک طرح کے چھٹکارے کا احساس
ہوتا ہے۔ یوں نہیں کہ جب استاد باضابطہ رخصت پر ہو، بلکہ
اس وقت جب وہ رخصت پر نہیں ہے اور رخصت پر نہ ہو کر جو
کلاس نہیں لے گا وہ طلبا کی حاضری تو ضرور درج کر دے گا تاکہ
ایک طرف اس کے کلاس لینے کا ثبوت بھی فراہم ہو جائے
اور دوسری طرف طلبا کو بھی شکایت کا موقع نہ ملے کیوں کہ ان
کو بھی کچھ سیکھنے یا حاصل کرنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، ہاں
مگر یہ کہ وہ امتحان کی شمولیت سے نہ روکے جائیں۔ گویا ناکارکردگی
پر ایک خاموش سمجھوتہ دونوں کے درمیان ہو گیا ہے۔ یہی
نے بڑھتے بڑھتے کبھی یہاں تک پہنچی ہے کہ اساتذہ ہفتوں کلاس
نہیں لیتے۔ جاننے والے جانتے بھی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتے گویا
یہاں بھی ایک مصالحانہ خاموشی ہے۔ اچھے طالب علم کڑھتے
ہیں مگر کچھ نہیں کر پاتے۔ انفرادی طور پر احتجاج کی ہمت نہیں
ان مسایل پر اجتماعی احتجاج کی کسی کو ضرورت محسوس نہیں ہوتی
مگر کیا طالب علموں کی اس سے زیادہ کوئی اور حق تلفی ہو سکتی
ہے؟ اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس بات کا کسی کو احساس
بھی نہیں کہ یہ سراسر ہماری حق تلفی ہو رہی ہے۔

اب اس صورت حال کا ایک اور پہلو! ایک استاد
جو اپنی خوش بیانی اور طلاقت لسانی کے لیے مشہور تھے،
کلاس کی بھی عموماً پابندی کرتے تھے اور طلبا میں بھی خاصے مقبول
تھے۔ گھنٹہ شروع ہوا تو وہ کلاس کے کمرے میں پہنچ گئے۔
طلبا سے گفتگو کرتے رہے۔ باہر شخص (اگر کوئی دیکھنے والا
ہو) مطمئن کہ کلاس ہو رہی ہے۔ گھنٹہ بجی، دوسرا گھنٹہ شروع ہوا
دوسرے استاد آ گئے۔ وہ کمرے سے باہر انتظار کرتے رہے۔
کبھی ہوتا ہے کہ کسی اہم موضوع پر گفتگو جاری ہے تو استاد اس
کو ختم کر دینا چاہتا ہے مگر یہاں تو اتنی تاخیر ہوئی کہ آدھے سے
زیادہ گھنٹہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے اپنی موجودگی کا احساس
دلایا تو پڑھانے والے استاد نے اپنی بات ختم کی۔ دوسرے
استاد کلاس میں پہنچے اور بولے کہ شاید آج کوئی بہت اہم
موضوع تھا جس کی وجہ سے اتنا انہماک ہوا کہ گھنٹہ ختم ہونے کا
بھی احساس نہیں ہوا۔ طلبا کچھ خاموش ہوئے، کچھ مسکرائے، پھر
ان میں سے ایک "شوخ سر" بول اُٹھا کہ آج پرتھوی راج کی
فلمیں زیر بحث آ گئی تھیں۔ یعنی شاید ان کو پڑھانا تھا "نظریہ
منظریت" اور "شعور کی رو" کی ایک مست لہر ان کے ذہن
کو فلم کی طرف لے گئی اور اب فلم پر گفتگو شروع، نصاب کتاب سب
غائب! طلبا بھی خوش اور مطمئن کہ وہ خشک موضوع کی گفتگو سننے
اور اپنے ذہن کو تکلیف میں ڈالنے سے بچے۔ فلموں پر اور ان
کے فن پر گفتگو کرنا کوئی بری بات نہ ہو، لیکن کلاس روم اس کی
مناسب جگہ یقیناً نہیں ہے۔ کیا ایسا کر کے استاد نے طلبا کی
حق تلفی نہیں کی؟ لیکن کس کو اس کا احساس ہے؟

امریکی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم نہایت گراں ہے۔
وہاں کے متوسط طبقے کے والدین اپنے بچوں کی تعلیم کی کفالت
نہیں کر پاتے۔ جن کو اعلیٰ تعلیم کا شوق ہوتا ہے، محنت کرتے
ہیں، خود کچھ روپیہ پیدا کرتے ہیں اور اپنے تعلیمی اخراجات کی
کفالت کرتے ہیں وہ قلیل ترین وقت سے زیادہ کالجوں/
یونیورسٹیوں میں ٹھہرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے وہ اس
کے بھی روادار نہیں ہو سکتے کہ ان کے وقت کا کوئی بھی لمحہ کسی طرح بھی
ضایع ہو۔ وہ جلد از جلد اپنی تعلیم پوری کر کے معاش زندگی
میں داخل ہو جانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کو اساتذہ کی تحقیق
کا حق حاصل ہے۔ اساتذہ کی کارکردگی پر اُن سے برابر رپورٹ
حاصل کی جاتی ہے اور ان رپورٹوں پر اساتذہ کی ترقی بلکہ تقرر

کے باقی اور جاری رہنے کا انحصار ہوتا ہے اور یہ ایسی قدغن ہے کہ اس کے باعث کوئی استاد نہ کلاس چھوڑنے کی ہمت کر سکتا ہے، نہ کلاس میں گپ شپ کرنے کی، نہ طوطا مینا کی کہانیاں سنانے کی۔

یہاں صورت حال برعکس ہے۔ ننانوے فیصد طلبا والدین کے بل بوتے پر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جب تک وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ان کے قیام، طعام، لباس، فیس، کتابوں، سیر و تفریح سب کے اخراجات برداشت کرنا والدین کی ذمّہ داری ہے۔ والدین اپنی محبت میں خیال کرتے ہیں کہ تعلیم کے دوران بچّے کے ذہن پر کسی طرح کا معاشی بوجھ نہ ہو تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کرے۔ ذرا سوچیے آج کے ہوش ربا گرانی کے دور میں ایسے کتنے والدین ہیں جو بغیر کسی تنگی ترشی برداشت کیے ایک بچّے کی تعلیم کے اخراجات کی کفالت کر سکتے ہوں۔ وہ اپنا تن پیٹ کاٹتے ہیں اپنے عیش و آرام کو خیرباد کہتے ہیں، کبھی شاید اپنے ہی دوسرے بچّوں کا حق کاٹتے ہیں، کہ زیر تعلیم بچے / بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے ہو جائیں، کیا طلبا کبھی اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ ان کی نہ سہی ان کے والدین کے خون پسینے کی کمائی کا پورا یا کم از کم مناسب بدل ان کو مل رہا ہے؟ اور اگر نہیں مل رہا ہے تو کیا کبھی اس پر احتجاج ہوا؟ کبھی نہیں۔

پیسہ آنی جانی چیز ہے۔ وہ خواہ محنت شاقہ سے ہی کمایا گیا ہو لیکن آتا ہے اور جاتا ہے اور جاتا ہے اور پھر آجاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کے پیدا کرنے میں ہمارا خون پسینہ صرف نہیں ہوا (والدین کے خون پسینے کی فکر کس کو ہے) پیسے کے آنے جانے کے وصف کی وجہ سے ہم اس کو بھلے ہی ناقابل اعتنا قرار دے لیں لیکن آپ کی تو ایک اور بڑی دولت کی پامالی ہو رہی ہے اور وہ ہے آپ کی عمر عزیز۔ جو آپ کی اور صرف آپ کی ہے، آپ کی والدین کی بھی نہیں! اور جس کا جو لمحہ گزر جاتا ہے، واپس نہیں آتا اور جس کو دولت کے کسی پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ اس کے جس حصے کو آپ نے مفید طور پر استعمال کیا، اس کی قیمت گویا آپ نے وصول کر لی اور اس کے بقدر آپ دولت مند ہو گئے اور جو حصہ مفید طور پر استعمال نہیں ہوا، ضایع ہوا اور اب وہ کبھی آپ کو میسر نہیں آسکتا۔ آپ اپنے ایک پیسے کے نقصان کے روادار نہیں ہوتے، اس بے بہا وقت کے زیاں کو کتنی آسانی بلکہ خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ خوش لطفی سے وقت گزار دینا بھلے ہی اچھا معلوم ہوتا ہو لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ آپ کو اس کی کیا قیمت چکانی پڑتی ہے؟ کبھی آپ کو احساس ہوا کہ جو آپ کا وقت ضایع کر رہا ہے، وہ آپ کی کتنی بڑی حق تلفی کر رہا ہے۔ اس حق تلفی پر آپ نے کبھی صدائے احتجاج بلند کی؟ نہیں، کبھی نہیں!

حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ آپ جو اپنے چھوٹے بڑے، مادّی غیر مادّی، حقیقی اور خیالی نقصانات پر ہمیشہ احتجاج کرتے رہتے ہیں اس کی لے بڑھتی ہے تو ہڑتالیں کرتے ہیں توڑ پھوڑ کرتے ہیں، مار دھاڑ کرتے ہیں، کبھی شاید سوچتے بھی نہیں کہ خود اندرونی محاذ پر آپ کا روز کتنا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کی کس طرح حق تلفی کی جا رہی ہے، جب آپ اسکول / کالج / یونیورسٹی میں آے ہیں تو آپ کی یہ ذمہ داری، آپ کا یہ فرض اور آپ کا یہ حق ہے کہ آپ کے وقت کا ایک ایک لمحہ اکتساب و تحصیل علمی میں صرف ہو اگر آپ اس میں کوتاہی کرتے ہیں تو آپ اپنے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ خدارا اس دشمنی سے باز آیے کم از کم اپنی ذات سے تو دشمنی نہ کیجیے اگر کوئی دوسرا شخص اس میں رکاوٹ بنتا ہے، آپ کے والدین کے خون پسینے کی کمائی ضایع کرتا ہے، آپ کی عمر عزیز کے قیمتی لمحات کو برباد کرتا ہے تو اس کے خلاف آواز بلند کیجیے۔ اگر آپ اپنی مفید ترین شے کے نقصان کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس نقصان عظیم کو بھی برداشت نہ کیجیے اس کے خلاف احتجاج کیجیے۔ اپنی حق تلفی نہ ہونے دیجیے۔ اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنا حق مانگیے کہ حق طلب کرنے والوں کو ہی ان کا حق ملتا ہے۔

دینی مدارس میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم

ظفر احمد صدیقی ★

اصل موضوع پر کچھ عرض کرنے سے پیشتر یہ اعتراف کرلینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ ایسا کم سواد فرد یقیناً اس قابل نہیں کہ اس اہم اور سنجیدہ مسئلہ پر کوئی عالمانہ اور ماہرانہ گفتگو تو کجا لب کشائی کا بھی حق رکھتا ہو اور وہ بھی بہ ایں خوف کہ اس کی جرأت رندانہ کہیں کسی کے علمی ذائقہ میں تلخی گھولنے یا کسی کی قیادت و سیادت پر چوٹ کا بہانہ نہ بن جائے لیکن بر ایں ہمہ ایک عام حاجت مند اور متلاشی حق کی حیثیت سے اگر میں اپنی گزارشات بزرگان ملت اور مسند نشینان جامعات کے سامنے پیش کر دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان افراد ملت کی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون حد سے تجاوز کر چکا ہے کہ جو اپنے جگر گوشوں کو دین کے سایۂ عاطفت میں اپنے دور کے جدید ترین علوم کی تعلیم دلانے کا خواب دیکھتے دیکھتے ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو جاتے ہیں مگر ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا کیوں کہ آج امت مسلمہ کے لیے بھی دین کی علامتی تقسیم حقیقی تقسیم بن چکی ہے

یہ مسئلہ درحقیقت امت مسلمہ کے نظام تعلیم کا مسئلہ ہے محض دینی مدارس کا نہیں اس لیے زیر غور عنوان پر اسی نقطۂ نظر سے گفتگو کی جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ یہ حقیقت ہماری خوش قسمتی کی لیکن ساتھ ہی بد نصیبی کی بھی مظہر ہے۔ اگر ایک طرف ہمارے اکابر کو نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس روز اوّل سے ہی رہا ہے اور انھوں نے اس پر کھل کر اور بھرپور طریقے سے اظہار رائے بھی کیا ہے تو دوسری طرف وہ اس کا کوئی قطعی حل بھی بروئے کار لانے میں ناکام رہے ہیں۔ اس میں جو ثنویت روز اوّل پیدا ہوگئی تھی وہ آج بھی نہ صرف یہ کہ قایم ہے بلکہ روز افزوں ترقی پذیر اور مستحکم تر ہوتی جارہی ہے۔ اگر اس موقع پر یہ کہا جائے تو تلخ ترین ہونے کے باوجود صحیح ہوگا کہ یہ کیفیت دو باتوں کی غمازی کرتی ہے۔ یا تو ہم اپنے نظریات اور مسالک میں محض متشدد ہوکر رہ گئے ہیں یا پھر ہم میں حقائق کا سامنا کرنے اور ان کا جواب عمل سے دینے کی ہمت و جرأت ہی مفقود ہو چکی ہے۔ اس لیے میری اولین گذارش یہی ہے اور دست بستہ ہے کہ اگر میری تجاویز کوئی علمی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی نوک پلک درست کرکے انھیں عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے تو ان کو اپنا لیجئے اور ان کے نفاذ کی کوئی راہ نکالیے یہ آپ کا بڑا احسان ہوگا امت مسلمہ پر بھی اور اپنے آپ پر بھی۔

اس عنوان کے سامنے آتے ہی جو سوال سب سے پہلے ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں ہی علوم دینیہ کے ساتھ سائنس اور ریاضی کی تعلیم کیوں یا عصری تعلیم گاہوں میں سائنسی علوم کے ساتھ دینی علوم کی تعلیم کیوں نہیں؟ جب کہ ان علوم جدیدہ ہی کو اسلام اور مسلم کے درمیان دوری کا ایک بڑا اور موثر ذریعہ کہا جاتا ہو اور ساتھ ہی یہ

★ محلہ بارہ موری۔ برہم پوری۔ جے پور (راجستھان)

حقیقت بھی عریاں ہو کہ طب کا کوئی طالب علم سائنس نہیں پڑھتا۔ آرٹ کا طالب علم فزکس اور کیمسٹری کا علم حاصل نہیں کرتا اور فنون لطیفہ کا طالب علم۔ بیالوجی کی فکر نہیں کرتا تو پھر علوم دینیہ ہی میں سائنس اور ریاضی کی پیوندکاری کی ستم ظریفی کس لیے۔
تعلیم کو روزی روٹی کے ساتھ جوڑ دیئے جانے کے بعد کم از کم عوام کے ذہنوں میں خواہ وہ کسی بھی طبقہ کے ہوں یہ بات اس حد تک راسخ ہو چکی ہے کہ طب ایسے پیشوں کی تعلیم بھی جو کبھی فارغ البال اصحاب کے لیے مخصوص تھی آج ایک بہترین وسیلہ روزگار بن چکی ہے۔
اب کوئی بھی باپ اپنی اولاد کو ایسی تعلیم دلانے کے لیے آمادہ نہیں کہ جس کے بعد اس کے لاڈلے اور لاڈلیاں کوئی اچھا روزگار حاصل نہ کر سکیں۔

حد یہ ہے کہ اس رجحان نے ہمارے علمائے کرام کو بھی اس قدر متاثر کیا ہے کہ اب وہ بھی دینی تعلیم کے ساتھ پیشہ وارانہ تعلیم اور وہ بھی باہم دگر غیر متوازن سطح کی قلم لگانے کی کوشش کرنے لگے ہیں کچھ ناکام ہو کر اپنی اس ان مل بے جوڑ کوششوں سے دست بردار ہو چکے ہیں تو کچھ نئی امیدوں اور نئے منصوبوں کے ساتھ میدان میں اتر رہے ہیں۔ خدا انھیں کامیابی عطا کرے لیکن حیرت ہے کہ وہ اس حقیقت کو کیوں اور کس طرح نظر انداز کر رہے ہیں کہ علماء کی معاشی پس ماندگی کا سبب ان کی دینی تعلیم نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے مسلم معاشرہ کی بے حسی اور بدبختی کی علامت ہے کہ وہ نہ تو دینی تعلیم کو اور نہ ہی اس کے حاملین کو اتنی قدر و قیمت بھی دینے کو تیار نہیں کہ جتنی وہ اپنے کار صفائی انجام دینے والوں کو ادا کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ تو ممکن ہے کہ کچھ علماء کو روزگار مل جائے لیکن آج جب کہ ایک فرد کا پیشہ ہی اس کی شخصیت کو کوئی رنگ روپ دینے والا بن چکا ہے تو ہمارے اسکلڈ لیبر کے زمرہ میں شمار ہونے والے عالم کو کیا مقام ملے گا وہ اپنی حقیقی حیثیت اور قدر و قیمت اس بگڑے ہوئے سماج سے کس طرح منوائے گا در اصل مولوی کے لیے مسئلہ روزگار کا نہیں اس کی حیثیت منوانے کا ہے۔ حالانکہ ہمارے بھی قابل احترام علماء دینی علوم کے ساتھ عصری علوم خصوصاً سائنسی علوم کی شمولیت کے روادار ہنوز نہیں بن سکے ہیں۔ اور پوری قوت کے ساتھ کہتے ہیں کہ دینی مدارس کی بنیادی ذمہ داری صرف کتاب و سنت کی تعلیم۔ ترویج اور اسی کے مطابق دین کی تفہیم و تشریح ہے۔

بعینہ نئی تعلیم اور نئی روشنی کے دلدادہ جو خوش قسمتی سے مسند اقتدار پر قابض یا اس کے شریک ہیں بڑے طمطراق سے یہ سوال تو کرتے ہیں کہ کوئی عاقل و فرزانہ جو اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات سے آگاہ ہو یہ کہ سکتا ہے کہ علوم جدیدہ سے بے خبر مولوی اسلام کی سچی خدمات انجام دینے کا کیسے اہل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کیا جائے کہ یہ کرم فرمایان ملت اپنی حدود میں علوم دینیہ کو کوئی ایسا مقام دیتے نظر نہیں آتے کہ جس کی بدولت اسلام ہماری زندگیوں میں۔ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ جاری و ساری ہو سکے۔

میں سوچتا ہوں۔ کیا ہمارے ذہنوں میں تعلیم کا کوئی واضح متعین اور متفقہ تصور بھی ہے کہ نہیں؟ احوال و ظروف کے تنوع اور دین و دنیا کے متضاد تقاضوں کی پرورش نے کہیں اس کی صورت ہی تو مسخ نہیں کر دی ہے۔

اگر ذرا بھی صبر و تحمل سے سوچا جائے تو ہمیں یہ تسلیم کر لینا ہوگا کہ یہ صورتِ حال آج سے زیادہ کل کے لیے مہلک ہے۔
اس کے لیے ہم جواب دہ بھی ہیں۔ ہمارا یہی ذہنی تضاد مسلکی تشدد اور کورانہ تقلید، خواہ قدیم کی ہو یا جدید کی موجودہ نسلوں کی بے راہ روی، تعلیمی معیار میں روز افزوں ابتری، دین سے ناواقفیت اور عدم دل چسپی، تہذیبی، سیاسی، اقتصادی میدانوں میں شکستگی و ناقدری فطری نتیجہ کے طور پر معاشرے کے کم از کم پس ماندہ یا اس کے قریب تر طبقات میں خود حصول تعلیم سے ہی بے رغبتی اور اس روزی روٹی سے بھی محرومی کا ایک اہم ترین محرک بن چکی ہے کہ جس کے لیے ہم اپنا سب کچھ قربان کیے بیٹھے ہیں۔
طولانی تمہید اور بحث سے بچتے ہوئے عرض کروں گا کہ اگر میری

گفتگو اور حقیقت حال کا جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ہمیں اپنے نظام ہائے تعلیم۔ قدیم و جدید۔ ہر دو کی کمیوں کا احساس ہے۔

۲۔ ہم ان میں تبدیلی کے آرزو مند بھی ہیں۔

۳۔ موجودہ صورت حال کی سنگینی کا اپنے اپنے طور پر ہی سہی احساس ضرور ہے۔

۴۔ ہر مکتبہ فکر کے نظریات بنیادی طور پر صحیح ہیں۔

۵۔ لیکن ہم ان میں مطلوب توازن اور تطابق قایم نہیں کر پا رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسئلہ ہنوز کشمکش کے دائرہ سے باہر نہیں آسکا ہے اس کی کچھ حقیقی وجوہ بھی ہیں لیکن وہ ناقابل عبور نہیں ہیں ان وجوہ کے منجملہ اولین اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کا مطلوب مقصود متعین نہیں کر پائے ہیں۔

علماء کی اکثریت کی یہ رائے کہ دینی مدارس کا مقصود اصلی محض کتاب وسنت کی تعلیم و ترویج ہی ہے اور صرف ان ہی کی روشنی میں دین کی تفہیم و تشریح کی جاسکتی ہے صحیح ہے اور ان کا یہ خوف بھی غلط نہیں معلوم ہوتا ہے کہ عصری علوم خصوصاً سائنسی علوم دین کی تعبیر اور تشریح پر غلط طریقہ سے اثر انداز ہو سکتے ہیں اور اس کی افہام و تفہیم کا رخ غلط سمت میں موڑ سکتے ہیں اور اسی لیے وہ دینی نصاب تعلیم میں تبدیلی کو خارج از بحث سمجھتے ہیں۔ لیکن اولاً نصاب تعلیم میں تبدیلی کی یہ مراد ہی غیر حقیقی ہے۔ کیوں کہ یہ صورت حال غیر متوازن تبدیلی بے ربط طریقہ تعلیم اور علوم جدیدہ کو من وعن قبول کرنے پر ہی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اگر سائنس کی تعلیم اسلامی نظریات کے پس منظر میں اور خود اس کے اتار چڑھاؤ کو سامنے رکھ کر دی اور لی جائے تو پھر یہ مسئلہ پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کیوں کہ سائنس اور تہذیب موضوع بحث اور ان کے مسائل و حدود کلیتہً جدا جدا ہیں لیکن یہ حیات انسانی کو کیا رخ دیتے ہیں اس کا انحصار اس پر ہی ہے کہ ہم انھیں کیسے استعمال کرتے ہیں اور ثانیاً دینی

تعلیم کے یہ معنی لینا کہ اس کا منتہا و مقصود۔ صرف دینی علوم کے عالم فاضل تیار کرنا ہے ایک غلط اور تباہ کن نظریہ ہے۔ کبھی یہ ممکن تھا اور کافی بھی مگر آج کے بدلے ہوئے حالات میں یہ قطعاً ناکافی ہے کیوں کہ آج تعلیم عام ہو چکی ہے ہر ملک اپنے شہریوں کو صد فی صد تعلیم یافتہ بنانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے اور بقدر ہمت دکوشش اس میں کامیابی حاصل کر رہا ہے۔

اگر مروجہ تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی شامل رہتی اور مذہب کو عبادت گاہوں میں مقید کرنے کی منصوبہ بند مہم آرائی کا سامنا بھی نہ کرنا ہوتا تو یہ صورت حال ہمارے لیے نہ تو اتنی شدید مضرت رساں ہوتی کہ جتنی آج ہے اور نہ ہی دینی مدارس کی موجودہ ذمہ داریوں میں کسی انقلابی اضافہ یا تبدیلی کی صورت درپیش ہوتی کہ جس سے ہم آج دوچار ہیں۔ اس لیے کہ آج ہمارے نظام تعلیم کی بنیادی ضرورت اور ذمہ داری یہ ہے کہ اگر ایک جانب یہ مدارس دینی علوم کے علماء اور فضلا تیار کریں تو دوسری جانب اس کا بند و بست بھی کریں کہ امت مسلمہ کا ہر وہ بچہ جو تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے اور صرف عالم دین بننے کی بجائے سائنٹسٹ، ٹیکنولوجسٹ، ریاضی داں، سیاست داں یا ماہر اقتصادیات یا اور جو کچھ بھی بننا چاہتا ہے وہ دینی مدرسہ، دینی ماحول اور دینی تعلیم کے سایہ میں ہی یا ان کے توسل سے ہی بنے ان کے باہر نہیں۔ ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ گلاس کے سانچے میں پلیٹ ڈھل جائے گی اور شور زمین میں گلاب پیدا ہو جائے گا۔

ایک سوال یہ بھی قابل غور ہے کہ کیا کسی بھی علوم کی تعلیم کا اور خصوصاً دینی علوم کی تعلیم کا مقصد صرف اس کے ماہر و منتہی بنانا ہی ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں؟ کیوں کہ وقت ماحول اور فرد کی خود اپنی صلاحیتوں اور حیثیت کے پس منظر میں یہ اس کی تعلیم مشکل ہوتی ہے۔ ماہر بننے کے اہل کم ہی ہوتے ہیں اور بن بھی کم ہی پاتے ہیں۔ اس لیے ان نونہالان ملت کو کہ جو عالم دین نہیں بن سکتے یا نہیں بننا چاہتے دین سے محض بے بہرہ چھوڑ دینا

با معمول شدہ بدیہا اکتفا کر لینا غلط ہی نہیں بلکہ صریح ظلم ہے بعینہٖ
محض دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کا معاملہ ہے دنیا تو ان کی
کھیتی ہے اگر وہ اس کو کانا ہی نہیں چاہتے تو وہ فناؤ ہی اٹھا کر رہ
جائیں گے۔ یہ بات بھی بنیادی طور پر غلط نہیں ہے کہ اگر ایک عالم
دین عصری علوم سے ناواقف رہتا ہے تو وہ واقعی وقت کے
چیلنجوں کا مقابلہ کرنے، وقت کی زبان میں، عصری سانچوں
میں ڈھلے ذہنوں سے اور وہ بھی ان کے پیمانوں کے مطابق
مسائلِ حیات پر کوئی مؤثر گفتگو کرنے اور نت نئے اٹھنے والے
مسائل کو حل کرنے کا اہل نہ ہوگا دین کی تشریح اور تعبیر تو بہت
دور کی بات ہے وہ تو اس کارزارِ حیات میں مقابلہ کا اہل ہی نہ بن
سکے گا اگر ہم اپنے آپ کو میاں مٹھو کہلوانا پسند نہیں کرتے تو ہمیں
یہ مان لینا ہوگا کہ اگر کتاب و سنت کی تشریح و ترویج کے لیے
عصری علوم کی آگاہی درکار ہے تو عصری علوم کے لیے بھی دین کا علم
حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس طرح اگر ہم بنام اسلام آج کے انسان کو ذہنی سکون
سے ہم کنار کرنے اور انسانی معاشرے کو خلفشار سے نجات دلانے
کے اور ان کی عاقبت کو سدھارنے کے دعویدار ہیں (اور یہ کوئی
غلط دعویٰ بھی نہیں ہے) تو ہمیں وہ دینی نظام تعلیم قایم اور
رائج کرنا ہوگا کہ جو ہر طالب علم کے سر پر ابرِ رحمت اور ہر معاشرہ
پر سکینت کی چادر بن کر چھا جائے۔

دوسری بڑی وجہ کہ جس کا تدارک پہلی سے بھی زیادہ ضروری
اور مشکل ہے وہ ہے ہمارا انتشار اور افتراق۔ اسی کے طفیل
ہماری تعلیمی دنیا میں بھی آج تک جتنی کوششیں ہوئی ہیں وہ کوئی
اجتماعی ہمہ جہتی اور متحدہ شکل اختیار نہیں کر سکی ہیں۔ اس نے
ہمارے نظام تعلیم کی ثنویت کو قایم اور دایم بنا دیا ہے۔ اگر
ہم ایک نام نہاد مذہبی گروہ کی بجائے ایک داعی اور ہمہ دم
متحرک ملت کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر
وقت پر اپنے کو بدلنا ہوگا۔ یہ ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور وقت
کا تقاضا بھی۔

ایک تیسری اور اہم وجہ یہ ہے کہ صلاحیتوں کی قیمت، ان کو مستند
تسلیم کئے جانے پر ہی منحصر ہے یہ سند منظوری سماج اور قانون ہر دو
کی جانب سے ملنا ضروری ہے۔ جدید تعلیم گاہوں کی مقبولیت اور
ان میں دن دونی رات چوگنی وسعت اسی کی مرہونِ منت ہے۔
جب کہ ہمارے دینی حلقوں نے اپنے نظام تعلیم کی تربیت میں اس
زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مذہبی جذبات کے سہارے
کچھ تعلیم گاہیں قایم کر لینا آسان تو ہے مگر انھیں سوسائٹی میں ایسا
فعال اور موثر بنانا کہ جو ہمارے طرزِ فکر و عمل کے رخ کو واقعتاً
اور حتماً بدل سکے تقریباً ناممکن ہی ہے کیوں کہ جب تک ہم وقت
کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اپنے نظام تعلیم میں پیدا
نہیں کرتے اسے سند قبولیت بھی نہیں دلا سکتے۔ ابتلائے
خوش فہمی کا علاج اپنے خول سے باہر نکلنے کے ماسوا کچھ نہیں۔

اس لیے ہمیں کچھ کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے
لیے ایک فعال، منظم اور ہمہ جہتی جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا، مدافعانہ
اور پسپائی کے طریقوں کو چھوڑ کر اقدامی پوزیشن سنبھالنا ہوگی۔

یہ ایک ایسا وسیع موضوع ہے کہ اس پر ایک مختصر سے
مضمون میں کوئی سیر حاصل بات کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے
اب میں اپنی گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے نصاب تعلیم میں ممکنہ تبدیلیوں
اور ان کے لیے قابل نفاذ ایک تجویزی خاکہ پیش کرتا ہوں۔

اس میں کمیاں اور خامیاں ممکن ہیں لیکن انھیں باہمی
افہام و تفہیم اور نقد و نظر کے بعد دور کیا جا سکتا ہے تاہم مجھے
امید ہے کہ میرے خاکہ کو بنیادی طور پر انشاء اللہ شرفِ قبولیت
حاصل ہوگا۔ میرے ناقص علم میں کم از کم اردو میں کوئی ایسا
منضبط خاکہ۔ ہنوز پیش نہیں کیا گیا ہے کہ جسے علمی نقطۂ نظر
سے دیکھا اور پرکھا جا سکے۔ میں نے اس کی ترتیب میں مندرجہ
ذیل امور کو مدِ نظر رکھنے کی اپنی بساط بھر امکانی کوشش کی ہے
خدا کرے یہ محض خوش فہمی نہ ہو۔ آمین۔

۱۔ دینی اور عصری علوم کا تناسب اس طرح قایم کیا جائے کہ
ہر دو کا حق ادا ہو سکے اور ان کا مطلوب معیار بھی کسی ایک کی

خاطر مجروح نہ ہونے پائے۔
۲۔ مدت تعلیم میں کوئی اضافہ نہ ہو۔
۳۔ طلبا اور اساتذہ پر بے جا بار کا اضافہ بھی نہ ہو۔
۴۔ عوام و خواص ہر دو اسے بخوشی اپنانے کے لیے تیار ہوں۔
۵۔ قانون وقت بھی اسے قبول کرنے کے لیے راضی ہو سکے۔
۶۔ تعلیمی سطح بندی اس طرح ہو کہ ہر سطح اپنی جگہ کامل ہو اور اپنی ایک مخصوص افادیت کی حامل بھی۔
۷۔ ہر سطح اس معیار اور نوعیت کی ہو کہ اس کے بعد ہر خواہشمند طالب علم کو اس کی قابلیت اور رجحان کے مطابق کوئی ایک پیشہ ورانہ تعلیم بھی دی جا سکے۔
۸۔ مضامین کا تنوع طلبا کے رجحان طبع اور سماجی ضرورتوں کے مطابق قایم رکھا جا سکے۔

میں نے بالفعل اپنی تجویز میں ابتدائی تعلیم (درجہ اوّل تا درجہ ہشتم) کو نظر انداز کر دیا ہے میری رائے میں ابتدائی تعلیم کے بعد پہلا کورس تین سال کا ہونا چاہیئے اسے میں قابل کے نام سے موسوم کروں گا۔ یہ علوم عصری میں نویں جماعت سے گیارہویں جماعت تک کے مساوی ہوگا اور علوم دینیہ میں مولوی کے مساوی۔

اس کے بعد دوسرا کورس بارہویں درجہ کی سطح سے ۱۴ ویں درجہ کی سطح تک کا ہوگا۔ یہ عصری علوم میں گریجویشن کے ہم معیار اور علوم دینیہ میں عالم کے برابر۔ اسے میں عالم کے نام سے موسوم کروں گا۔

ان دونوں کورسوں کو چار چار گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں پہلا گروپ سائنٹفک گروپ۔ دوسرا لٹریری گروپ تیسرا کمرشیل گروپ اور چوتھا آرٹسٹکل گروپ ہوگا۔

ان کے مضامین اور سال وار فی ہفتہ پیریڈس کی تفصیل ہمرشتہ ہذا نقشہ کے مطابق ہوگی۔ مختصراً ہر کورس کی کل مدت تعلیم اور ان کے دینی و عصری علوم کے لیے دورکا وقت مندرجہ ذیل ہوگی ...

۱۔ کورس کا نام	قابل	عالم
۲۔ کل مدت	۳ سال	۲ سال
۳۔ عربی اور علوم دینیہ کیلئے متعین کل مدت	۵-۷ ہفتہ	۶-۷ ہفتہ (اوسطاً)
۴۔ عصری علوم کیلئے متعین کل مدت	۶-۷ ہفتہ	۶-۷ ہفتہ (اوسطاً)
۵۔ دینی مضامین کی کل تعداد	۴	۴ لیکن یہ تعداد عالم کے
۶۔ عصری " " "	۴	۴ آخری دو سالوں میں نسک...
۷۔ مضامین کی کل مجموعی تعداد	۸	۸ نقشہ اوقات کے مطابق کم ہوجائیگی۔

دینی علوم کے مضامین اور ان کی مدت کا تعین نصاب عالی کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ اور انھیں مندرجہ بالا دو کورسوں میں تقسیم کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی مدت میں کوئی قابل شکایت کمی بھی نہیں کی گئی ہے ان دونوں نصابات کی تکمیل کے بعد خواہشمند طلبا اپنے نصاب "عالم" کے مضامین میں سے کسی ایک مضمون میں فضیلت حاصل کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اس کورس کو میں "فاضل" کا نام دوں گا اور یہ ماسٹرس ڈگری کے ہم پلہ ہوگا۔ فضیلت کا امتحان دینے والوں کے لیے لازمی ہوگا کہ۔

۱۔ تمام جدید علوم میں فضیلت حاصل کرنے کے لیے ایک پرچہ "اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ" کے عنوان سے رکھا جائے۔
۲۔ اسی طرح دینی علوم میں فضیلت حاصل کرنے کے لیے ایک پرچہ "دینی اور عصری علوم کا تقابلی مطالعہ" کے نام سے رکھا جائے۔
۳۔ الفقہ میں فضیلت کا نصاب دو سال کی بجائے تین سال رکھا جائے اور اس میں انڈین لا کا مطالعہ بھی لازمی طور سے شامل کیا جائے۔

مندرجہ بالا ہر سہ نصابات کی تکمیل کے بعد اپنی اپنی سطح پر تمام مروجہ پیشہ ورانہ تربیتی نصابات (خواہ وہ تکنیکی ہوں یا غیر تکنیکی) کے حصول کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور اس طرح دینی و تکنیکی تعلیم کی آمیزش کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم اگر کوئی ادارہ اس قسم کے تربیتی کورس ہمارے مجوزہ نصابات کے ساتھ رکھنا چاہے تو اپنی دسترس اور حیثیت کے مطابق ان کا انتخاب کر سکتا ہے۔ مثلاً قابل کا امتحان پاس کرنے والوں کے لیے کوئی ایک یا ایک

سے ناظم مندرجہ ذیل سرٹیفکیٹ کورس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ٹیچرس ٹریننگ کا ۲ سالہ کورس
۲۔ لائبریری سائنس " " "
۳۔ آفس مینجمنٹ " " "
۴۔ بزنس مینجمنٹ " " "
۵۔ موٹر میکانک کا ۲ سالہ کورس۔
۶۔ الیکٹرانکس کا دو سالہ کورس۔
۷۔ ڈرافٹس میں سول اور میکانکس کا ۲-۲ سال کا کورس۔
۸۔ ریفریجریشن اور ایرکنڈیشنگ کا ۲ سالہ کورس۔
۹۔ ریڈیو اینڈ ٹی وی کا ۲ سالہ کورس۔
۱۰۔ فارمیسسٹ کا دو سالہ کورس۔

اس طرح "عالم" کے بعد مندرجہ بالا کورسوں میں سے کوئی ایک کورس ڈگری سطح کا یا ڈپلوما کے معیار کا کیا جانا ممکن ہے۔ ان میں خاص طور پر وکالت کمپیوٹر سائنس اور میڈیکل سائنسز کے کورسیز کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

اس اسکیم کے نفاذ کے لیے کوئی عملی شکل پیش کرنے سے پیشتر "عالم" کی تعلیم کے سلسلے میں دو باتوں کی طرف آپ کی خصوصی توجہ چاہوں گا۔

ایک تو یہ کہ کثرت معلومات کے نام پر مضامین کی جزوی اور فروعی تفصیلات پر زیادہ زور نہ دیا جائے بلکہ مضمون کے بنیادی کردار کو واضح اور مستحکم تر بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ طلبا اس کو پوری طرح اپنا سکیں۔

دوسری یہ کہ میری ناقص رائے میں معیار تعلیم کی پستی کا ایک خاص سبب نصابی کتاب کا تعین بھی ہے اس کی وجہ سے ایک جانب طلبا میں سہل انگاری اور محدودیت پیدا ہوتی ہے تو دوسری جانب تحقیقی رغبت پیدا نہیں ہو پاتی ہے اور نتیجتاً طلبا امتحان میں کامیابی کے لیے ناپسندیدہ طریقے اپنانے پر اتر آتے ہیں اور اپنا کوئی خاص علمی مقام بنانے کے لیے تیار نہیں ہو پاتے۔ جب کہ اعلیٰ معیار حاصل کرنے کے لیے مشغلہ صفت لگاؤ پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کورس کی تکمیل کے لیے دیئے گئے اسباق، اور ان کے لیے مجوزہ امدادی کتب کے مطالعہ اور ان کی افہام و تفہیم کو بنیاد بنایا جائے تو بہتر نتائج کی امید کی جاسکتی ہے البتہ اساتذہ کے لیے مطلوبہ معیار کی کتب کا تعین ضرور کردیا جانا چاہیئے تاکہ وہ متعینہ حدود و معیار کے مطابق تعلیم دے سکیں۔ ابھی میں نے جو کچھ عرض کیا وہ بہ اعتبار مسئلہ خواہ کتنا ہی پیچیدہ اور مشکل کیوں نہ ہو مگر گفتن آسان کی مد میں ہی آتا ہے لیکن اگلا مرحلہ کردن بقول شخصے بھینس کے انڈے کی خواہش سے کچھ کم نہیں تاہم آپ جانتے ہیں کہ پانے کی شرط بھی خواہش ہی ہے۔

میری اسکیم کو اگر کوئی دینی ادارہ کلیتاً، جزواً یا مرحلہ وار اپنانے کے لیے تیار ہو سکے تو زہے نصیب لیکن اولاً تو اس کی فی الحال امید کرنا ہی قبل از وقت ہوگا کیوں کہ اس تبدیلی یا اضافے کے لیے تیار اداروں کو بھی اس کی عمل آوری میں کئی انتظامی اور مالی امور مانع آسکتے ہیں۔ ثانیاً محض کسی ایک ادارے کا اس کو اپنا لینا مفید تر ہو سکتا ہے مگر ضرورت کے اعتبار سے قطعاً ناکافی ہوگا اس لیے ضروری ہے کہ اس نظام تعلیم کو قائم کرنے اور ملک گیر پیمانے پر چلانے کے لیے ایک مرکزی بورڈ قائم کیا جائے۔

اس کا نام "اسلامک اینڈ سائنٹفک ایجوکیشن بورڈ" ہو۔ اس کا بنیادی مقصد مسلمانان ہند میں عموماً اور دینی حلقوں میں خصوصاً جدید عصری علوم کی ترویج و توسیع، اور علوم دینیہ کا استحکام اور اس کے عصری اسلوب کو مقبول بنانا ہو تاکہ موجودہ نظام تعلیم کی دوری اور اس کے تحت خود مسلمانوں میں اور بیرون وطن میں پیدا شدہ باہمی بعد اور تنگ نظری کو دور کیا جاسکے اور مسلمان بھی من حیث الملت اپنے اسلامی کردار کے جلو میں دیگر اقوام کے شانہ بہ شانہ ترقی کی دوڑ میں بھرپور طریقہ پر شریک ہو سکیں۔ یہ بورڈ اس مقصد کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل چار فرائض انجام دے۔

۱۔ ایسے تعلیمی اداروں، مرکزوں، اور امتحانات کا قیام وانتظام کہ جو باعتبار سطح پوسٹ گریجویشن اور انڈر گریجویشن معیار کے مساوی ہوں۔
۲۔ حسب ضرورت ان کے لیے نصابات کا تعین اور ان کے لیے نصابی کتب کی تیاری۔
۳۔ اپنے زیرِ انتظام اداروں اور مرکزوں کی نگرانی، معائنہ اور مالی امداد کی فراہمی
۴۔ ان اداروں، مرکزوں اور امتحانات کی مرکزی، ریاستی سرکاروں جامعات، اور ملک میں حسب ضابطہ قائم مختلف ایجوکیشنل بورڈس سے منظوری حاصل کرنا۔

اس بورڈ کی ریاستی، اور ریاستوں میں کمشنری سطح کی شاخیں بھی قایم کی جائیں اس بورڈ کی تشکیل، اس کے طریقہ کار اصول وضوابط اور وسائل آمدنی کے تعین وترتیب کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جائے۔

بورڈ کی تشکیل کے بعد بعد اس کمیٹی توڑ دیا جائے اور اس کے عہدہ داران اور اراکین کو ضروری سمجھا جائے تو بورڈ میں شامل کر لیا جائے۔ بورڈ میں ان کی حیثیت کا تعین خود بورڈ کرے۔

اس اسکیم کو بورڈ کے قیام تک ملتوی نہ کیا جائے بلکہ یہ انصب ہوگا کہ اسے بروئے کار لانے کے لیے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی یا جامعہ اردو اپنے یہاں ایک فیکلٹی یا کالج اسلامی عصری تعلیم کے نام سے قائم کرے یا اس ذمہ داری کو خود سینٹر فار پروموشن آف سائنس اپنے ذمہ لے اور بتدریج قابل، عالم، فاضل کے نصابات کی تعلیم کا مراسلاتی بنیاد پر انتظام کرے۔ سائنٹیفک گروپ کے پریکٹیکلس کے لیے ہر ششماہی کے آخری ماہ میں قلیل المدت تربیتی کورسوں کا اور ساتھ ہی ششماہی امتحانوں کا اہتمام بھی۔ سالانہ امتحان کی ضرورت نہیں۔

اس طریقے سے کئی فوائد کا حصول ممکن ہوگا مثلاً صحیح اور ذمہ دارانہ طریقہ پر تعارف وتشہیر، ممکنہ مشکلات وپیچیدگیوں کا تجرباتی حل، اور مستقبل کے لیے نصاب ونصابی کتب کی بہتر ترتیب وتدوین نیز مستقبل میں اس بار کو اٹھانے والوں کی بہترین رہنمائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علی گڑھ کی روایتوں کے شایان شان بھی ہوگا۔

اس ضمن میں ایک اور قابل غور تجویز کہ ان کورسوں کیلئے سیشنز کے ابتدائی اور اختتامی مہینوں کا تعین نہ کیا جائے بلکہ ہر تیسرے ماہ ایک معینہ تعداد مثلاً۔۔ اطلبا کا رجسٹریشن لگاتار کیا جاتا رہے تاکہ ششماہی علمی مشقوں اور امتحانات کا انتظام بھی بآسانی ہوتا رہے اور طلبا کی تعداد میں بتدریج اضافہ بھی۔ اس طرح تین بیج بغیر کسی دقت کے ہر سال چلائے جاسکیں گے۔

بعد میں کسی وقت اگر مناسب سمجھا جائے اور کچھ اسکول وکالج اپنے یہاں سائنس وغیرہ کی علمی تعلیم اور امتحانات کے سنٹر قایم کرنے پر رضامند ہو جائیں تو اس کام کو ضلعی سطح پر بھی چلایا جاسکتا ہے اور اس طرح زائد سے زائد طلبا کو اس اسکیم سے استفادہ کا موقع مل سکے گا۔ اور اگر یہ امید کی جائے تو بعید از قیاس نہ ہوگی کہ اس نظام تعلیم کے تحت جس قدر اور جس رفتار سے اوسط تعلیم بڑھے گا اسی قدر اور اسی رفتار سے ہماری نئی نسلوں میں دین سے قرب اور دین خالص کی افہام وتفہیم میں بھی اضافہ ہوگا۔ ہر کس وناکس کو دین کے نام پر مسلم عوام کا استحصال کرنے اور انھیں گمراہ کرنے کے امکانات بھی مسلسل کم سے کمتر ہوتے چلے جائیں گے۔ اور یہی وہ وقت ہوگا کہ جب ایک عالم دین اپنا صحیح مقام حاصل کر سکیگا۔

اس طرح بچنے والے پیریڈس کو گروپ کے سبجیکٹس کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کام یقیناً انتہائی مشکل اور صبر آزما ہیں لیکن ان کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہیں معلوم ہوتا خدا ہماری مدد کرے۔ آمین۔

نمبر شمار نام مضمون	قابل سال اول	قابل دوم	قابل سوم	عالم اول	عالم دوم	عالم سوم	
سائنٹیفک گروپ: ہفتہ وار پیریڈس:							
۱- عربی ادب	۹	۸	۸	۶	۶	۶	۱۸
۲- الفقہ واصولہ	۵	۵	۵	۴	۴	۴	۱۲
۳- الحدیث وعلومہ	۵	۶	۷	۷	۷	۷	۲۱
۴- التفسیر واصولہ	-	۳	۴	۵	۵	۵	۱۵
۵- انگریزی یا ہندی	۵	۵	۳	۴	۴	۴	۱۲
۶- ریاضی	۶	۶	۵	۵	۵	۵	۱۵
۷- فزکس	۶	۶	۵	۶	۶	۶	۱۸
۸- کیمسٹری یا بیالوجی / اگریکلچرل سائنس	۶	۶	۵	۵	۵	۵	۱۵
	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	
لٹریری گروپ							
۱- تا ۴ مندرجہ بالا علوم دینیہ و عربی	۱۹	۱۹	۲۴	۲۲	۲۲	۲۲	
۵- انگریزی	۶	۶	۶	۶	۶	۶	
۶- جغرافیہ / ریاست / سماجیات / اقتصادیات یا نفسیات	۶	۶	۴	۵	۵	۵	
۷- تاریخ	۶	۶	۴	۶	۶	۴	
۸- ہندی یا فارسی	۵	۵	۴	۵	۵	۴	
	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	
کمرشیل گروپ							
۱ تا ۴ عربی ادب اور علوم دینیہ	۱۹	۱۹	۲۴	۲۲	۲۲	۲۲	
۵- انگریزی / ہندی	۵	۵	۳	۴	۴	۴	
۶- بک کیپنگ اینڈ اکاؤنٹنسی	۶	۶	۵	۵	۵	۵	
۷ بزنس میتھڈ کمرشیل پریکٹس	۶	۶	۵	۵	۵	۵	
۸- کرنسی، بینکنگ اور ایکسچینج یا ہندی، انگریزی، اردو اور عربی میں سے کسی ایک کا ٹائپ یا شارٹ ہینڈ	۶	۶	۵	۶	۶	۶	
	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	
آرٹسٹیکل گروپ							
۱ تا ۴ حسب بالا علوم دینیہ اور عربی ادب	۲۰	۱۹	۲۴	۲۲	۲۲	۲۲	
۵- انگریزی / ہندی	۷	۷	۶	۵	۵	۵	
۶- اردو یا فارسی	۵	۶	۴	۴	۴	۴	
۷،۸- خوش نویسی / خطاطی اور کوئی ایک آرٹ	۱۰	۱۰	۸	۱۱	۱۱	۱۱	
	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	

احسن تقویم

جیون دھارا

محمد ریاض الدین احمد *

خون آپ کا جیون دھارا ہے۔ جسم کا کوئی حصّہ خون کی نالیوں سے خالی نہیں ہے۔ چھوٹی بڑی خون کی نالیوں کا ایک جال آپ کے پورے جسم میں بچھا ہوا ہے۔ خون کی نالیوں کو اگر ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دیا جائے تو وہ ایک لاکھ میل لمبائی گھیر سکتی ہیں۔ ایک نوجوان جس کا وزن ۳، کلوگرام ہو اس کے جسم میں خون کی مقدار ، ۴، لیٹر ہوتی ہے۔ یہ خون ایک منٹ سے کم میں آپ کے سارے جسم میں ہزاروں بار چکر لگا لیتا ہے۔

آپ کے جسم میں خون کے سفر کی راہیں متعین ہیں۔ جن نالیوں سے خون گزرتا ہے انھیں خون بردار نالی یعنی Blood Vessels کہتے ہیں۔ ان کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ شریان یعنی Arteries وہ نسیں جو دل سے بدن میں خون پہنچاتی ہیں۔

۲۔ ورید (Veins) جو جھلی دار ہوتی ہیں۔

۳۔ عروق شعریہ یعنی (Capillaries) یہ بال کی طرح باریک ہوتی ہیں اور رگوں اور نسوں کے درمیان پل کا کام کرتی ہیں۔ یہ اتنی باریک ہوتی ہیں کہ بغیر خوردبین کے دیکھی نہیں جاسکتیں۔ اگر ان Capillaries کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک جوڑیں تو لمبائی ۱۶ ہزار میل بنے گی۔

خون کی اصلی آماجگاہ دل ہے۔ وہاں سے نکل کر وہ عروق شعریہ میں داخل ہوتا ہے۔ آگے چل کر چھوٹی بڑی نسوں میں ہوتا ہوا سب سے بڑی نالیوں میں پہنچ کر دل میں واپس پہنچ جاتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی محسوس کیا کہ آپ کا جسم ایسی طول طویل خون کی نالیوں میں لپٹا ہوا ہے؟ اور خون اُن میں ایسی تیز رفتاری سے دوڑ رہا ہے کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ شاید اپنے خون کے بارے میں آپ کو سوچنے کی ضرورت اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب اتفاقاً کوئی نس کٹ جائے اور اس سے خون جاری ہو جائے۔ اکثر خون کا بہنا اپنے آپ ہی بند ہو جاتا ہے، لیکن یہ کیسے ہوتا ہے، شاید اس کے متعلق آپ کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شگاف سے خون جاری ہوتے ہی آپ کا جسم مدد کے لیے دوڑ پڑتا ہے اور کٹے ہوئے دہانے پر خون کو منجمد کر دیتا

* ۸۲۲۔ ۲/۸۱ نوراللہ روڈ، الہ آباد، ۲۱۱۰۰۳

ہے۔ تاایں کہ بہنے کا راستہ بند ہو جائے۔

خون آپ کا بہت بڑا خدمت گار ہے۔ یہ خلیوں کو غذا اور آکسیجن فراہم کر کے انھیں تندرست رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ اس کا ایک کام فضلے کو برآمد کرنا بھی ہے۔

فضلے کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک کو یوریا [Urea] کہتے ہیں جو پانی میں مل کر پیشاب کی شکل میں نکل جاتا ہے دوسرے کو کاربن ڈائی آکسائڈ (Carbon Dioxide) کہتے ہیں۔ یہ خون کے ذریعے پھیپھڑوں میں گیس بن کر پہنچتا ہے اور سانس کے ذریعہ باہر نکل جاتا ہے۔

خون جراثیم کے خلاف آپ کا پہرے دار بھی ہے اور جنگ جو سپاہی بھی۔

آپ کے جسم میں جراثیم کے داخل ہوتے ہی خون کے سفید خلیے (White Cells) آمادہ بہ پیکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک فوج بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور معز جراثیم کو مار ڈالتے ہیں۔ اگر جراثیم بڑی تعداد میں حملہ کرتے ہیں تو سفید خلیے بھی بڑی تعداد میں مقابلے کی تیاری کرتے ہیں۔ بہت سے خلیے کام آتے ہیں اور جراثیم کی بڑی تعداد ختم کر دی جاتی ہے۔ استعمال شدہ خلیے اور مردہ جراثیم آپ کے جسم سے مولد بن کر پھوڑے پھنسی کے راستے سے نکل جاتے ہیں۔

خون کے سفید خلیوں کے علاوہ آپ کے جسم میں بڑی تعداد سرخ خلیوں (Red Cells) کی بھی ہے۔ ان کی تعداد جسم انسانی میں ۱۸ ارب (18,000,000,000) کے قریب ہوتی ہے۔ سرخ خلیے خون کی دھار میں رہتے ہیں، جو ان کو جسم کے تمام حصوں تک پہنچا دیتی ہے۔ ان کا خاص کام زندہ خلیوں کو آکسیجن پہنچانا ہے۔

اشارے

۱۔ چارلی براؤن کی انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۲۔

۲۔ سائنس ان ڈیلی لائف۔ فرانسس کرٹس۔

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

تمھارے ہر جوڑ پر صدقہ ہے۔ ہر تسبیح (سبحان اللہ کہنا) صدقہ ہے۔ ہر تہلیل (لا الٰہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے۔ ہر تحمید (الحمد للہ کہنا) صدقہ ہے۔ ہر تکبیر (اللہ اکبر کہنا) صدقہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے۔ برائی سے روکنا صدقہ ہے اور چاشت کی دو رکعتیں ان چیزوں کا بدل ہو سکتی ہیں۔"

(مسلم شریف)

چونا ــــ ہماری ایک جسمانی ضرورت

سمیع الرحمٰن خاں*

چونا ہمارے جسم کی ایک اہم ضرورت ہے۔ بعض مخصوص حالتوں مثلاً حمل، بچوں کی بڑھتی ہوئی عمر میں جسم کو چونے کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اگر یہ بڑھتی ہوئی ضرورت غذائی اجزا سے پوری نہ ہو تو جسم کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے طبیعت ان چیزوں کی طرف مائل ہو جاتی ہے جن سے چونا زیادہ ملے اور اس طرح بعض بری عادتیں مثلاً عورتوں کا دوران حمل مٹی یا کنکر کھانے کی عادت یا بچوں میں مٹی کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔

اگر چونے کی یہ ضرورت پوری نہ ہو تو مختلف بیماریاں مثلاً بچوں میں ہڈیوں کا ٹیڑھا ہو جانا، دانت دیر سے نکلنا یا عورتوں میں دوران حمل ہڈیوں کا ملایم ہو جانا لاحق ہوتی ہیں۔

ایک اوسط جسم میں تقریباً ایک تا ڈیڑھ کلو گرام چونا موجود ہوتا ہے (یعنی ہمارے جسمانی وزن کا تقریباً دو فیصد) جس کا ننانوے فیصد حصہ ہڈیوں اور دانت میں اور ایک فیصد ہڈیوں کے علاوہ پورے جسم میں ہوتا ہے۔

یوں تو قدرتی طور پر چونا نامیاتی اور غیر نامیاتی دونوں حالتوں میں ملتا ہے لیکن ہمارے جسم میں اس کا انجذاب صرف غیر نامیاتی نمک کی صورت میں ہوتا ہے، جو چھوٹی آنت سے جذب ہو کر جسم کے دوسرے حصوں تک پہنچتا ہے۔

جسمانی ضرورت کی کم و بیش کل مقدار غذا سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر نس میں چونا انجکشن کے ذریعے داخل کیا جائے تو اس کی بیشتر مقدار خون سے جلد غائب ہو جاتی ہے۔ اگر غذا میں چونے کی مقدار کم ہو جو جسمانی ضرورت کو پورا نہ کر رہی ہو یا کسی وجہ سے چونا آنتوں سے جذب ہو کر جسم میں نہ پہنچ رہا ہو تو ایسی صورت میں ہڈیوں کا چونا گھل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور ہڈیاں ملایم ہو جاتی ہیں۔

چونے کی جتنی مقدار ہم غذا میں کھاتے ہیں، شاذ و نادر ہی مکمل طور پر جذب ہوتی ہے جس کا انحصار بہت سی باتوں پر ہے۔

اگر ہمارے جسم کو چونے کی ضرورت نہیں ہے تو اس کا بیشتر حصہ (تقریباً ستر فی صد) براز کے ساتھ خارج ہو جاتا ہے۔ بصورت دیگر اگر جسم میں چونے کی کمی ہے تو اس کی زیادہ مقدار جذب ہو کر جسم میں پہنچ جاتی ہے۔

غذا میں فاسفورس کی مقدار زیادہ ہونے کی صورت میں چونا فاسفورس کے ساتھ مل کر حل نہ ہونے والے نمک (کیلشیم فاسفیٹ) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس طرح چونے کی زیادہ مقدار جذب ہونے کے بجائے ضائع ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر فاسفورس کی مقدار غذا میں کم ہے تو چونا زیادہ مقدار میں آنتوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح غذا میں میگنیشیم کی زیادہ مقدار

* ریڈر، اجمل خاں طبیہ کالج، اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ۔ یو۔ پی۔

بھی چونے کے جذب ہونے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔

آنتوں کے اندر کی خلا کا ردعمل بھی چونے کے جذب ہونے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر آنتوں میں ردعمل کھاری ہے تو چونا حل ہونے والے نمک میں تبدیل ہو کر جذب ہو جائے گا۔ لیکٹوز اور کچھ دوسرے شکریلے اجزا آنتوں میں خمیر ہونے پر نامیاتی تیزاب پیدا کرتے ہیں، جس سے چونے کے جذب ہونے میں مدد ملتی ہے۔ شحم (چربی) فاسفورس کی موجودگی میں چونے کے ساتھ مل کر اس کو حل نہ ہونے والے صابن جیسے محلول میں تبدیل کر دیتی ہے جو جذب نہیں ہوتا اور جب شحم کی زیادہ مقدار براز کے ساتھ خارج ہوتی ہے تو چونا بھی اس کے ساتھ خارج ہو جاتا ہے لیکن اگر فاسفورس کی مقدار کم ہے تو ایسی صورت میں چونا چربی کے ساتھ مل کر جذب ہونے والے تیزابی محلول میں تبدیل ہو کر جذب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لحمین (گوشت کے اجزا) چونے کے ساتھ مل کر اس کو حل کرنے والے تیزابی نمک میں تبدیل کر کے اس کے جذب ہونے میں مددگار ہوتے ہیں۔ غذا میں لحمی اجزا کی زیادہ مقدار ہونے کی صورت میں تقریباً پندرہ فی صد چونا جذب ہو جاتا ہے اور لحمی اجزا کے غذا میں کم ہونے کی صورت میں صرف پانچ فیصد چونا ہی جذب ہو پاتا ہے۔

وٹامن ڈی چونے کے جذب ہونے میں خاص طور پر مددگار ہوتا ہے۔ اگر وٹامن ڈی دستیاب نہ ہو تو پیرا تھورمون (غدہ مقابل درقیہ کا ہارمون) چونے کے جمع ہونے میں مددگار ہوتا ہے۔

کچھ سبزیوں جیسے پالک میں موجود اوکزیلک ایسڈ (Oxalic Acid) چونے کو حل نہ ہونے والے نمک میں کیلشیم اوکزیلیٹ (Calcium Oxalate) میں تبدیل کر کے اس کے جذب ہونے میں حایل ہوتا ہے اور اناج میں پایا جانے والا فائٹک ایسڈ (Phytic Acid) چونے کے ساتھ مل کر اس کو حل نہ ہونے والے نمک میں تبدیل کر کے جذب ہونے میں رکاوٹ ڈالتا ہے لیکن گیہوں میں پائے جانے والے غذائی اجزا اس سے مستثنیٰ ہیں کیوں کہ گیہوں میں ایک خمیر جس کو فائٹیز (Phytase) کہتے ہیں، ہوتا ہے، یہ خمیر چونے کو حل نہ ہونے والے نمک میں تبدیل نہیں ہونے دیتا اور اس طرح اس کے جذب ہونے میں پیدا ہونے والی رکاوٹ وجود میں نہیں آتی۔ آنتیں بھی ایک خمیر پیدا کر کے چونے کے جذب ہونے میں پیدا ہونے والی اس رکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اگر ضرورتاً چونے کے مرکبات استعمال کرائے جائیں تو حل ہونے والے نمکیات جیسے کیلشیم کلورائیڈ، کیلشیم کاربونیٹ، کیلشیم لیکٹیٹ یا کیلشیم گلوکونیٹ استعمال کرائے جائیں جو آسانی سے جذب ہو جاتے ہیں لیکن کیلشیم فاسفیٹ کم حل پذیر ہونے کی بنا پر مقابلتاً کم جذب ہوتا ہے۔

تقریباً ننانوے فیصد چونا ہڈیوں میں جمع ہوتا ہے۔ یہ بچے میں ماں کے پیٹ سے ہی ساتویں مہینے سے جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ پیدائش کے بعد بھی جاری رہتا ہے اسی لیے ماں کو دورانِ حمل اور دودھ پلانے کے زمانے میں چونے کی زیادہ مقدار میں ضرورت ہوتی ہے۔ جسم میں چونے کی مقدار کا انحصار چونے کے توازن پر ہے۔ چونے کا توازن اس کے کھانے اور جسم سے اس کے اخراج پر ہے۔ اگر غذا کے ذریعے جسم میں داخل ہونے اور جسم کی ضرورت سے زائد مقدار مختلف راستوں سے جسم سے باہر خارج ہونے کی مقدار برابر ہے، تو یہ متوازن حالت ہے لیکن اگر جسم میں داخل ہونے والی مقدار زاید اور خارج ہونے والی مقدار کم ہے تو اس حالت کو مثبت توازن (Positive Balance) اور اگر اس کے برعکس ہے یعنی جسم سے خارج ہونے والی مقدار جسم میں داخل ہونے والی مقدار سے زیادہ ہے تو اس حالت کو منفی توازن (Negative Balance) کہتے ہیں۔ دورانِ حمل بڑھنے کے

دوران (تین سے تیرہ سال کی عمر تک) یا جسم میں چونے کی کمی کے بعد جسم میں چونا ٹھہرتا ہے لیکن کساح (Rickets) وہ بیماری جس میں ہڈیاں ٹیڑھی ہو جاتی ہیں) لین العظام -Osteo malacia (وہ حالت جس میں ہڈیاں ملایم ہو جاتی ہیں) غدہ مقابل درقیہ کے فعل کی زیادتی سنگرہنی وغیرہ میں جسم میں چونے کی کمی ہوتی ہے

چونے کی زیادہ تر مقدار براز کے ساتھ مل کر آنتوں سے بھی خارج ہو جاتی ہے (تقریباً اعشاریہ چار گرام سے اعشاریہ آٹھ گرام چونے کی مقدار روزانہ خارج ہو جاتی ہے اور یہ اخراج جسم میں چونے کی کمی ہونے کی حالت میں بھی جاری رہتا ہے) آنتوں سے خارج ہونے والی چونے کی اس مقدار کا جسم میں پائی جانے والی چونے کی مقدار سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ آنتوں سے خارج ہونے والا وہ چونا ہوتا ہے جو غذا میں کھایا جاتا ہے۔ آنتوں کی ترشحات سے چونے کی برائے نام مقدار بھی آ کر اس میں شامل ہوتی ہے۔

گردے کی راہ پیشاب کے ذریعے چونے کی بہت کم مقدار خارج ہوتی ہے۔ چوبیس گھنٹے میں ایک سو بیس ملی گرام چونا گردوں سے پیشاب کے ساتھ مل کر خارج ہوتا ہے لیکن چونے کی گردوں کی راہ خارج ہونے والی اس مقدار کا تعلق براہ راست خون سے ہوتا ہے جس کا انحصار بہت سی باتوں پر ہے۔

اگر جسم میں چونے کی مقدار متوازن ہے تو پیشاب کی راہ کم مقدار میں خارج ہوگا لیکن اگر جسم میں چونا کافی مقدار میں موجود ہے اور زیادہ مقدار میں چونا جسم میں پہنچے تو پیشاب کی راہ زیادہ مقدار میں خارج ہو جائے گا (چوبیس گھنٹے میں تقریباً ڈیڑھ سو ملی گرام)۔ وٹامن ڈی اور غدہ مقابل درقیہ کی رسائیں (Parathormone) جسم میں چونے کے ذخیرے پر کافی اثر انداز ہوتے ہیں۔

پیشاب میں چونے کے خارج ہونے کا انحصار خون کی مائیت میں موجود چونے کی مقدار پر بھی ہے۔ اگر خون کی مائیت میں چونے کی مقدار سات سے آٹھ ملی گرام فی صد ہے تو پیشاب میں چونا خارج نہیں ہوگا لیکن اگر گیارہ ملی گرام فی صد ہے تو پیشاب میں چونے کی زیادہ مقدار خارج ہوگی۔ غذا میں چونا زیادہ مقدار میں لینے سے اس خارج ہونے والی مقدار پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

چونے کی روزمرہ ضرورت

ایک اوسط آدمی کے لیے تقریباً اعشاریہ آٹھ گرام (آٹھ سو ملی گرام) چونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حاملہ عورتوں کو تقریباً ڈیڑھ گرام اور ایام رضاعت (دودھ پلانے کے دنوں) میں تقریباً دو گرام چونے کی روزانہ ضرورت ہوتی ہے بچوں کی بڑھتی عمر میں ایک اعشاریہ چار گرام (تقریباً ڈیڑھ گرام) چونا روزانہ ضروری ہوتا ہے۔

چونے کی جسم میں اہمیت

چونا ہڈیوں کے بننے میں مدد دیتا ہے۔ یہ خون کے منجمد ہونے (Blood clotting) اور دودھ کے جمنے (Curdling) میں بھی مددگار ہوتا ہے۔ اعصابی عضلی (Neuromuscular) تحریکات کو برقرار رکھنے کے لیے بھی چونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دل کے سکڑ کر خون کو دوران کے لیے باہر نکالنے کے لیے بھی چونے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر چونے کی مقدار بہت زیادہ ہو تو دل سکڑی ہوئی حالت (انقباضی حالت) ہی میں رک جاتا ہے۔ اہداب کی حرکات میں بھی چونا مددگار ہوتا ہے۔

چونے کی کمی سے ٹیٹنی (Tetany) (ایک بیماری جس میں بچوں کے ہاتھ پیر اینٹھتے ہیں) ہو جاتی ہے۔ جس کو چونے کے استعمال سے روکا جا سکتا ہے۔

ہماری غذا میں روزمرہ استعمال ہونے والی مختلف اشیا میں چونے کی مندرجہ ذیل مقدار ہوتی ہے۔

نام اشیا	چونے کی مقدار فی سو گرام
گیہوں	۴۵ ملی گرام

نام اشیا	چونے کی مقدار فی سوگرام	نام اشیا	چونے کی مقدار فی سوگرام
چاول	۷ ملی گرام	آلو	۴ ملی گرام
جو	۲۵ ملی گرام	کیلا	۲ ملی گرام
مٹر سوکھی	۶۸ ملی گرام	مونگ پھلی	۴۸ ملی گرام
مٹر ہری	۱۹ ملی گرام	ناریل۔ گولا	۲ ملی گرام
باجرہ	۴۵ ملی گرام	مٹن	۱۴۷ ملی گرام
جوار	۲۷ ملی گرام	مچھلی چھوٹی	۵۵ ملی گرام
کابلی چنے	۱۸۵ ملی گرام	دودھ پاؤڈر	۱ گرام ۳۷۰ ملی گرام
مسور	۲۷ ملی گرام	گائے کا دودھ	۱۲۰ ملی گرام فی سو ملی لٹر
لال چنے	۱۳۶ ملی گرام	بھینس کا دودھ	۲۳۰ ملی گرام فی سو ملی لٹر

تشریحات

ؔ۱ نامیاتی ORGANIC
ؔ۲ غیر نامیاتی INORGANIC
ؔ۳ غیر نامیاتی نمک INORGANIC SALT
ؔ۴ لحمین PROTEIN
ؔ۵ غدہ مقابل درقیہ PARATHYROID GLAND
ؔ۶ اہداب CILIA.

"جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ مفید ہیں ان کو اختیار کریں جو قابلِ اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں اور جو بُری اور خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں۔ نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اسی سے لپٹے رہیں۔"

سرسید

دیہات کے اسکول

محمد اسحاق*

اس قصہ کے معتبر راوی جناب وجیہ الدین صاحب مرحوم ہیں جو اظہرالدین کرکٹ اسٹار کے نانا تھے۔ وہ اپنی سروس کے آخر زمانے میں فلک نما ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے اور موصوف سے لوکل ٹرین میں اکثر ساتھ رہتا۔ بڑے خوش مزاج اور زندہ دل آدمی تھے۔ موصوف کا بیان تھا کہ یہ قصہ خود انھوں نے جناب محمد حسین جعفری صاحب کی زبان سے سنا تھا جو حکومت آصفیہ کے ناظم تعلیمات تھے۔ ہوا یہ کہ ناظم تعلیمات ایک مرتبہ ضلع محبوب نگر کے دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ انھیں خیال ہوا کہ اچانک کسی چھوٹے سے مدرسے کا بھی معائنہ کرنا چاہیے۔ وہ اس بات کو راز میں رکھے رہے۔ دوسرے دن صبح میں مہتمم تعلیمات (ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر) سے کہا کہ بذریعہ ٹرین ہمیں دیورکدہ کے تحتانیہ مدرسے (جس میں چوتھی جماعت تک تعلیم ہوتی تھی) کا معائنہ کرنا ہے۔ ضلع کے عہدہ دار، کلرک وغیرہ سات آٹھ افراد کا قافلہ بذریعہ ٹرین روانہ ہوا۔ دیورکدہ کرنول لائن پہ ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہ سب کوئی ½ ۱۰ بجے صبح پہنچے۔ چپراسی آگے آگے بھاگ رہے تھے تاکہ اسکول جاکر اطلاع دیں۔ دیکھا باہر ایک چپراسی بیٹھا بیڑی پی رہا ہے اور اسکول میں ایک بچہ بھی نہیں ہے۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ صدر مدرس اور طلبا کہاں ہیں لیکن یہ اسے اسکول میں جانے سے روک رہا تھا۔ یہ کہنے لگا کہ ناظم تعلیمات (ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) معائنہ کے لیے آرہے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ ناظر صاحب تعلیمات نے چار برس سے جھانک کر نہیں دیکھا، ناظم صاحب کہاں سے آسکتے ہیں۔ بہرحال یہ بحث جاری تھی کہ دور سے اس قافلہ پر اس کی نظر پڑی۔ چپراسی ہیبت سے اٹھا، اس وقت ناظر تعلیمات بھی اسکول تک پہنچ چکے تھے۔ دیکھا اسکول خالی ہے اور اجلاس کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ صدر مدرس اور تین مددگار صبح صبح کی میٹھی سیندھی منگا کر جام پر جام نوش کر رہے تھے اور اسکول کو تعطیل دے دی گئی تھی۔ اپنے چپراسی کی وارننگ پر ایک صاحب نے آہستہ سے دروازے کا کواڑ کھولا اور باہر دیکھا تو پورا قافلہ صحن میں پہنچ چکا ہے۔ ان کے تو ہوش جاتے رہے۔ اندر سے دوبارہ دروازہ بند کرلیا اور اجلاس کے پیچھے ایک کھڑکی تھی، جس میں لوہے کی سلاخیں نہیں تھیں، وہ چاروں کود کر رفو چکر ہو گئے۔ ناظم تعلیمات غصہ سے لال پیلے ہو رہے تھے اور ضلع کے عہدہ دار اپنی کارگزاری پر سخت پشیمان۔ اب

* ریٹائرڈ پرنسپل سلطان العلوم کالج آف حیدرآباد

ایک چپراسی کو پچھلی کھڑکی سے اندر اُتارا گیا، دروازہ کھلا تو ناظم صاحب نے دیکھا میز پر تلے ہوئے مرغ کے اجزاے پریشان بکھرے پڑے ہیں، ایک دو جام آدھے رہ گئے ہیں جو لبوں تک آکر چھوٹ گئے ہیں اور سیکنڈ ہی کا جام آدھے سے زیادہ خالی ہے۔ ایک دو جام شکستہ پڑے ہیں، ساقی و میخوار غائب ہیں۔ کیا حال اس مےخانے کا تھا۔ ناظم صاحب اگر صاحب دل ہوتے تو ضرور مینا نہ کی اس بربادی پر افسوس کرتے۔

اب ناظم صاحب اور اہل کاران چاروں کی تلاش میں گاؤں میں نکلے۔ یہ چاروں قریب ہی ایک جھونپڑی میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ سامنے ناظم صاحب اور پیچھے یہ چاروں مجرم سر جھکائے ہوئے چلے آرہے تھے۔ ان کے دل و دماغ پر کیا گزری ہوگی جب انھوں نے یہ دیکھا ؎

"راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا"

(سردار جعفری)

ادھر ناظم صاحب غصہ سے کانپ رہے تھے۔ ایک لفظ منھ سے نہ نکلتا تھا۔ صحن میں پہنچے۔ یہ چاروں ایک قطار میں کھڑے ہوگئے۔ بلا کسی اشارے کے چاروں اپنے کان پکڑ کر اٹھ بیٹھ کرنے لگے۔ یہ منظر کچھ ایسا تھا کہ ناظم صاحب اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ بہت سخت سست کہا، چاروں کا تبادلہ چار سمتوں میں کرنے کے احکام جاری کیے۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔

راقم ایک چھوٹے سے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ قریبی دیہات کے اسکول سے ایک دن ایک اسکول کا چپراسی آیا اور کہنے لگا کہ ہیڈ ماسٹر کی شکایت پر اسے ناظر تعلیمات نے ایک روپیہ جرمانے کی سزا دی ہے۔ واقعات یوں تھے کہ دو مددگار باری باری سے ہر ماہ دس، دس دن کے لیے اپنے گاؤں چلے جاتے اور صدر مدرس ۲۰ دن غائب رہتے۔ اس طرح "رخصت اتحادی" کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ اس چپراسی نے تین یوم کی رخصت لی اور چند رہ دن اسکول سے غائب رہا۔ صدر مدرس نے اس سے جواب طلب کیا اس نے جواب میں لکھا کہ آپ سب اپنی رخصت خاص ہر مہینے چلاتے ہیں، آخر بندے کا بھی کچھ حق ہے۔

ایک مڈل ٹرینڈ ٹیچر کا تبادلہ ترقی پر دور دراز کے دیہات پر ہوگیا۔ جہاں پہنچنے کے لیے صرف بیل گاڑی کا راستہ تھا۔ ناظر صاحب کے لیے گھوڑے کا انتظام کرنا پڑتا تھا اس ٹیچر نے ایک ہوشیار لڑکے کو مانیٹر بنایا اور اپنے دستخط کرنا سکھلا دیا۔ یہ لڑکا استاد کا خاص شاگرد رشید نکلا وہ اپنی چھڑی کے زور پر پورا اسکول چلاتا۔ گاؤں کے پٹیل پٹواری سے اس ٹیچر نے رسم و راہ بڑھائی اور ایک سال کے لیے حیدرآباد آکر کسی اور ٹریننگ میں شریک ہوگئے۔ ہر ماہ جاتے اپنی تنخواہ اور سب کا معمول ادا کرکے واپس آتے۔ اس طرح اس ٹیچر نے دو سال اس گاؤں کے بچوں کی خدمت کی۔

۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ سنگا ریڈی بیسک ٹریننگ اسکول میں مجھے بحیثیت لکچرار کے کام کا موقع ملا۔ یہاں پر ایک اردو میڈیم سیکشن کھولا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے بعد سے ان اردو اساتذہ کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ چنانچہ بہت سے سینیر استاد آکر شریک ہوگئے۔ ان چالیس اساتذہ میں صرف ایک صاحب میٹرک کامیاب تھے۔ باقی سب کے سب منشی، عالم، فاضل، مولوی، ادیب، دبیر وغیرہ تھے دو اصحاب تو شملہ باندھ کر آتے اور داڑھیاں بھی کہیں کہیں سفید ہو چکی تھیں۔ انھیں اپنا شاگرد کہتے شرم آتی تھی، کیوں کہ یہ لکچرر ان کے سامنے بچہ تھا، مگر انھیں پڑھانا شراب طہور پینے سے کم نہ تھا۔ کیوں کہ ان سے بہت سیکھا اور یہ دو سال اپنے پیشے کے بہت زرخیز رہے۔

انھیں ایک دن ایک مضمون لکھنے کو دیا:

"بحیثیت مدرس میرے تجربات"

ایک صاحب نے لکھا کہ جس گاؤں میں ان کا تقرر ہوا تھا وہاں کوئی اسکول کی عمارت نہیں تھی۔ عاشور خانہ برسات میں گر چکا تھا اور مندر کا صحن بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اس مندر کے دیوتا بھی غمگین فرش پر سوئے رہتے تھے۔ گاؤں کے پٹیل کے مکان میں جانوروں کی ڈوڈی تھی جہاں پر ایک کونے میں چالیس پچاس بچے پڑھنے آتے۔ مصیبت یہ تھی کہ یہاں بیل، بھینس بھی بندھے ہوتے۔

ایک مرتبہ ناظر صاحب معائنہ کے لیے تشریف لائے۔ مدرس نے شکایت کی کہ ان جانوروں کے درمیان پڑھانا اور بچوں کی حفاظت کرنا مشکل ہے۔ مدرسہ کے لیے کوئی دوسرا انتظام ہو تو اچھا ہے۔ ناظر تعلیمات نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "ٹیچر بچوں کے ساتھ بیلوں کی بھی نگرانی کرے۔"

میں نے اس مضمون کے حاشیہ پر لکھا:

"ناظر صاحب بھی بیل تھے۔"

۱۹۵۳ء کی بات ہے کہ پروفیسر غیاث الدین صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے بی۔ایڈ کالج میں کام کرتے تھے۔ باہر کی بہت سی ڈگریاں رکھتے تھے۔ موصوف نے ایک مرتبہ قصہ سنایا کہ وہ ابتدائی ملازمت میں کسی دیہات کے اسکول پر معائنہ کے لیے گئے، دیکھا بچے کھیل کود میں مشغول ہیں اور ٹیچر غائب ہے۔ اپنے آدمی سے کہا کہ دیکھیے ٹیچر کہاں ہے۔ وہ واپس آیا اور کہا:

"وہ حجامت بنا رہا ہے۔"

صاحب نے پوچھا:

"خود کی حجامت بنا رہا ہے یا دوسروں کی؟"

"دوسروں کی۔"

"اچھا تو وہ اپنے پیشے پر قایم ہے۔"

صدر مہتمم تعلیمات، ڈی۔آر۔ترکی (ایم۔اے ایڈنبرا) کا نام پرانے لوگوں کو یاد ہوگا۔ ۱۹۵۱ء میں یہ جبر چرنہ اسکول کے معائنے کے لیے تشریف لائے جہاں پر یہ راقم ہیڈ ماسٹر تھا، یہ اونچے پورے، گورے، چٹے پارسی، خوش پوشاک، سوٹ بوٹ میں ملبوس تھے اور بڑی شستہ اردو بولتے تھے۔ اپنا اسکول دو کرایے کے مکان اور ایک سڑک کی دکان پر تقسیم تھا۔ انہیں ایک چھوٹے سے مکان کے اسکول میں لے گیا۔ کویلو کی چھت تھی اور دن میں آسمان کے تارے نظر آتے تھے۔

ترکی صاحب کا معائنہ تین دن کا تھا۔ وہ اس مکان کے ایک کمرے میں داخل ہوئے اور جھٹ سے باہر نکل آئے:

"اس اسکول میں میں اپنے مویشی بھی باندھنا پسند نہیں کروں گا۔"

دو دن ڈاک بنگلہ میں قیام کیا اور پھر معائنہ کا نام نہیں لیا۔

ماں کا حق اور فضیلت

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے اچھے برتاؤ کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا، تمہاری ماں، کہا پھر؟ فرمایا، تمہاری ماں، کہا پھر؟ فرمایا تمہاری ماں، کہا پھر؟ فرمایا، تمہارے باپ۔"

(— بخاری و مسلم —)

یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا اگر ہم اُن ٹیچروں کا تذکرہ نہ کریں جنھوں نے اس گاؤں کی آبادی کی خدمت کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ ایسے لوگوں کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ ان کے نام آبادی کے لوگ بڑی عزت سے لیتے ہیں۔ یہاں پر بے ساختہ انگریز شاعر گولڈ اسمتھ کی شاہ کار نظم "اجڑا گاؤں" کا خیال آتا ہے جب کہ اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب کے دوران دیہات کے لوگ محنت مزدوری کے لیے گاؤں چھوڑ کر کارخانوں کا رخ کرنے لگے۔ اور

دیکھتے ہی دیکھتے دیہات ویرانوں میں تبدیل ہوتے گئے
اس عظیم شاعر نے اسکول ٹیچر کی تصویر کھینچی ہے۔ اُس
گاؤں کا بھی تو ایک ٹیچر تھا جو زمینوں کی پیمائش بھی کرتا
درخواستیں بھی لکھتا اور حساب کتاب بھی کرتا اور گاؤں
والے اس کو حیرت سے تکتے۔

"That one small head
could carry all he
knew".

اس کے اتنے چھوٹے سر میں یہ ساری باتیں کیسے سماگئیں۔
اس قسم کے پرانے قصے آپ کے حافظے میں بھی
ہوں گے۔ آزادی کے چالیس برس بعد بھی دیہات کے اسکولوں
کا حال اچھا نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالات میں
کچھ سدھار ضرور آرہا ہے اور تبدیلیاں بھی آرہی ہیں مگر
ہمارے سامنے جو معیار ہے اس تک پہنچنے کے لیے بہت
عرصہ درکار ہوگا۔ شہری آبادی کو اس کا اندازہ نہیں
ہے۔ گرام پنچایت سے لے کر ممبران پارلیمنٹ تک
۹۰ فی صد لیڈر سب کے سب ان ہی دیہات کے اسکولوں
میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ ان حالات سے اچھی طرح واقف ہیں
لیکن وہ کبھی اس حالت زار کا تذکرہ تک نہیں کرتے۔ وہ
اپنے ہی ماضی قریب سے منھ پھیر چکے ہیں۔

جدید قومی تعلیمی پالیسی کے ایکشن پروگرام (۱۹۸۶ء)
میں بڑے کام کی بات "آپریشن بلیک بورڈ" کی
اسکیم ہے۔ اس پروگرام کے تحت تمام یک مدرسی
مدرس، ڈبل ٹیچر اسکول ہو جائیں گے جن کی تعداد ابھی تک
ایک لاکھ پچیس ہزار ہے۔ یہاں پر ایک لیڈی ٹیچر ضروری
ہوگی۔ دو کمرے بڑے پکے ہوں گے، فرش سیلو کا ہوگا
اسٹیشنری کے لیے کچھ رقم بھی منظور ہوگی اور یہ ساری اسکیم
۱۹۹۵ء تک مکمل کر لی جائے گی۔ لیکن اس کی توقع بہت
کم ہے۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ تین سال میں صرف ۲۵ ہزار
اسکولوں تک یہ اسکیم پہنچ سکی ہے اور اس سے اس
ٹارگٹ کی ناکامی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ کوٹھاری
ایجوکیشن کمیشن اور جدید قومی تعلیمی پالیسی کے ماہرین تعلیم نے
ملک کی قومی آمدنی کا صرف ۶ فیصد تعلیم کے لیے مانگا
ہے جب کہ تعلیم پر قومی آمدنی کا صرف ۲ فیصد خرچ
کیا جاتا ہے۔ یہ مطالبہ بہت کم ہے
لیکن قوم اس کے لیے
بھی تیار نہیں
ہے۔

جو صاحب ہماری تکفیر کا فتویٰ لینے کو مکہ معظمہ تشریف
لے گئے تھے اور ہماری تکفیر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب
ہوا ان کے لائے ہوئے فتووں کو دیکھنے کے ہم بھی مشتاق
ہیں۔

سبحان اللہ! ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی
اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸ ۔ ش ۱۲ (دسمبر ۸۹ء)

توانائی ۔ منظر پس منظر

ڈاکٹر اسلم پرویز ✤

انسان نے توانائی کا سب سے پہلا استعمال آگ کی شکل میں کیا۔ اگرچہ شمسی توانائی سے بھی انسان فیض یاب ہوتا تھا لیکن یہ توانائی نہ تو اس کی پیدا کردہ تھی اور نہ ہی اس کے دائرہ اختیار میں تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت شمسی توانائی کے کل فوائد انسان پر آشکار ابھی نہیں ہوئے تھے وہ تو سورج کی کرنوں میں چھپی حیات بخش حرارت سے ہی لطف اندوز ہوتا تھا۔ نظام کائنات میں ان کرنوں کی بے پناہ اہمیت اس پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ آگ جلانے میں کامیابی حاصل کرنے سے کھانا پکانا سیکھا۔ وہ چیزیں جو بے ذائقہ تھیں یا ناقابلِ ہضم تھیں وہ آگ کی مدد سے لذیذ غذا بن گئیں۔ آگ نے اس کو سرد موسم سے محفوظ رکھا اور جانوروں سے بچایا۔ اپنے پڑاؤ کے گرد آگ روشن کر کے انسان رات کو چین سے سو سکا۔ رفتہ رفتہ آگ کی مدد سے اس نے دھاتوں کو پگھلانا اور مختلف اوزار بنانا سیکھا۔ اس طرح توانائی کی اس پہلی شکل نے اس کے ہاتھ میں پتھر کی جگہ دھات کے اوزار اور ہتھیار پکڑا دیئے۔ تانبہ، پیتل اور لوہے کا چلن چل نکلا۔ لیکن ان چند کاموں کو چھوڑ کر انسان کے بقیہ تمام کام انسانی قوت کی مدد سے ہی ہوتے تھے۔ اس میدان میں دوسری سہولت اسے جب میسر آئی جب اس نے جانوروں کو پالا اور ان کو بار برداری اور سواری کے لیے استعمال کرنا سیکھا۔ جانوروں کی مدد سے انسان کی کام کرنے کی صلاحیت تقریباً تین گناہ بڑھ گئی۔ وہ جانوروں پر سامان لاد کر اور سواری کر کے نسبتاً دور تک اور نئے نئے علاقوں میں جانے لگا یعنی نقل و عمل میں اضافہ ہوا۔ لیکن جانوروں کو پالتو بنانے کا صحیح فائدہ تب ہوا جب انسان نے پہیہ ایجاد کیا۔ پہیئے کی ایجاد کے بعد باقاعدہ سفر کا سلسلہ شروع ہوا۔ انسانی برادری جو چھوٹے چھوٹے خاندانوں پر مشتمل تھی نئے نئے علاقوں کی تلاش میں نکلنے لگی پہیئے کی ایجاد کے کافی بعد پہلی صدی قبل مسیح میں پن چکی وجود میں آئی۔ انسان نے اونچائی پر واقع پانی کے قدرتی ذخائر کا استعمال سیکھا۔ یہ چکیاں اس وقت صرف پسائی کرنے کے کام آتی تھیں لیکن ان کی اہمیت اس معنی میں بہت زیادہ ہے کہ انسان نے اپنی اور جانوروں کی جسمانی قوت سے باہر توانائی کا ایک ذریعہ دریافت کیا۔ پن چکیوں کا استعمال محض ان علاقوں تک محدود رہا جہاں پانی کے قدرتی ذرائع اونچائی پر پائے جاتے تھے۔ بارہویں صدی عیسوی میں انسان نے ہوا کی قوت کو استعمال کرنا سیکھا اور ہوائی چکی وجود میں آئی۔ میدانی علاقوں میں چلنے والی تیز ہواؤں کی مدد سے چلنے والی یہ چکی کئی قسم کے کام کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن چونکہ اس کا انحصار ہوا اور اس کی رفتار پر تھا اس لیے استعمال محدود

✤ ذاکر حسین کالج، دہلی

وقت میں ہی ممکن تھا۔ علاوہ ازیں یہ دونوں اقسام کی چکیاں کچھ خاص جغرافیائی علاقوں تک ہی محدود رہیں۔ سولہویں صدی عیسوی تک توانائی کی ضروریات لکڑی چکی سے ہی پوری ہوتی رہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغربی یورپ میں صنعت سازی کی شروعات انہی کی مدد سے ہوئی۔ لیکن چونکہ ان کی قوت اور استعمال محدود تھا اس لیے اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ہی مغربی یورپ کی صنعتیں توانائی کی قوت کا شکار ہونے لگیں۔ اسٹیم انجن کی ایجاد نے نہ صرف اس قلت کو دور کر دیا بلکہ توانائی کے میدان میں ایک سنگ میل قائم کر دیا۔ توانائی کا یہ نیا ذریعہ ایسا تھا جس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا تھا اور کہیں پر بھی آسانی سے فٹ ہو سکتا تھا۔ شروع میں اسٹیم انجن کا استعمال پانی کو اونچائی تک لے جانے کے لیے ہوتا رہا۔ پانی کو اونچائی پر اکٹھا کر کے اسے گرا کر پن چکی چلائی جاتی تھی۔ لیکن جلد ہی بھاپ سے چلنے والے اس انجن کا استعمال دیگر طریقوں سے بھی ہونے لگا۔ بھاپ سے چلنے والی ان مشینوں میں لکڑی جلا کر بھاپ بنائی جاتی تھی۔ بھاپ سے چلنے والی کشتیاں اور ریل گاڑیاں بھی لکڑی ہی استعمال کرتی تھیں۔ کوئلے کا استعمال ۱۸۳۰ء سے شروع ہوا۔ لکڑی کے مقابلے کوئلہ وزن بہ وزن زیادہ توانائی اور حدت فراہم کرتا تھا اس لیے کوئلے کا استعمال بڑھنے لگا۔ انجن کی ایجاد کے بعد توانائی کے میدان کی اہم ترین دریافت بجلی تھی۔ ۱۸۳۱ء میں مائیکل فیریڈے نے ڈائنمو ایجاد کیا۔ ٹربائن کا استعمال سیکھنے کے بعد انسان پانی، ہوا، بھاپ اور گیس کی مدد سے ٹربائن چلانے لگا اور اس طرح بجلی پیدا ہونے لگی۔ بجلی پیدا کرنے کا یہ اصول بھی مائیکل فیریڈے نے ہی دریافت کیا تھا۔ مختصراً اس اصول کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر تاروں کے ایک کوائل (آرمیچر) کو دو مقناطیسوں کے درمیان گھمایا جائے تو کرنٹ پیدا ہو جاتا ہے۔ تاروں کے اس آرمیچر کو گھمانے کے لیے ہی بھاپ، پانی یا ہوا کی قوت استعمال کی جاتی تھی۔ بجلی توانائی کی نہایت سہل قسم تھی اس کی ایجاد کے محض پچاس سال کے اندر ہی بڑے پیمانے پر اس کا استعمال شروع ہو گیا۔ ۱۸۸۲ء میں پہلا بجلی گھر قائم ہوا جس نے ذاتی استعمال کے لیے عوام کو بجلی مہیا کر دی۔ ان بجلی گھروں میں بھی لکڑی اور کوئلہ ہی استعمال ہوتا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں توانائی کے اُفق پر پیٹرولیم کا سورج طلوع ہوا۔ کوئلے اور لکڑی کے مقابلے پیٹرولیم کو استعمال کرنا اور لانا اور لے جانا زیادہ آسان تھا اس لیے اس کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ ۱۹۱۰ء میں کل توانائی کا صرف ۵ فی صد حصہ پیٹرولیم سے آتا تھا ۱۹۲۵ء میں ۱۸ فی صد ہوا اور اب ۴۴ فی صد سے کچھ زیادہ ہے۔ صنعتی انقلاب نے جو کہ صحیح معنوں میں ۱۸۳۰ء میں شروع ہوا تھا ایک نئے انداز سے شہروں اور قصبوں نیز دیہاتوں کی بنیاد ڈالی۔ صنعتی مراکز رفتہ رفتہ شہروں میں تبدیل ہونے لگے۔ ان شہروں میں توانائی کا استعمال نیز ذرائع بدلنے لگے۔ لکڑی کی جگہ کوئلہ اور پھر پیٹرول آ گیا۔ صنعتی ترقی کی ہی بنیاد پر ممالک کی گروہ بندی ہوئی۔ صنعتی ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ ممالک جیسی اصطلاحات سننے میں آنے لگیں۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو توانائی نے دنیا کی تشکیل و ترتیب میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ پیٹرولیم کے بعد قدرتی گیس منظر عام پر آئی قدرتی گیس کا استعمال ۱۹۳۰ سے شروع ہوا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سے خاص طور سے مقبول ہوا۔

محدود خزانے اور بڑھتی مانگ

صنعتی ترقی نے جہاں انسان کو بے شمار سہولتیں مہیا کر دی ہیں وہاں توانائی پر اس کا انحصار بھی بڑھا دیا ہے۔ آج ہر قسم کے کام کرنے کے لیے ہمارے پاس مشینیں ہیں لیکن ان کو چلانے کے لیے توانائی درکار ہے۔ یہ توانائی کبھی بجلی کی شکل میں چاہیے ہوتی ہے تو کبھی ایندھن کی شکل میں۔ اب تک دریافت شدہ مختلف اقسام کے ایندھنوں میں کوئلہ، پیٹرولیم اور گیس سب سے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ نقل و حمل کا شعبہ تو پوری طرح پیٹرول پر منحصر ہے۔ اسکوٹر ہو یا ٹرک، کشتی ہو یا ہوائی جہاز ان سب کو

پیٹرول کی کوئی نہ کوئی قسم درکار ہے۔ علاوہ ازیں کیمیائی صنعت میں بھی بہت سے کیمیائی مادے بنانے ہیں۔ پیٹرولیم یا اُس سے کشید مادّے استعمال ہونے ہیں۔ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ، انسانی ضروریات اور اُن کے ساتھ ایندھن کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ شہروں میں رہنے والے افراد کا اندازِ زندگی کچھ ایسا رُخ اختیار کر چکا ہے کہ تمام مصروفیات توانائی کے گرد گھومتی ہیں۔ ان تمام وجوہات کی بناء پر توانائی کا استعمال روز افزوں ترقی پر ہے۔ چونکہ بجلی بنانے میں بھی کوئلہ ہی استعمال ہوتا ہے اس لیے بالواسطہ یا بلا واسطہ ہمارے ہی توانائی کے جملہ وسائل کا مرکز پیٹرولیم یا کوئلہ ہی بنتا ہے۔ بدقسمتی سے توانائی کی یہ اقسام محدود اور ناقابلِ تجدید ہیں۔ زمین کے سینے میں پوشیدہ کوئلے کی کانیں، اس میں رواں پیٹرولیم کے چشمے اگرچہ بہت کافی ہیں لیکن بہرحال محدود ہیں۔ ایک نہ ایک دن ان کو ختم ہونا ہے۔ اور یہ دن اب زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ مستقبل کے ان اندیشوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے توانائی کے ماہرین نے توانائی کے ان ذرائع پر توجہ دینی شروع کی ہے جو قابلِ تجدید ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں پیٹرولیم بحران سے گزرنے کے بعد خاص طور سے ماہرین اس تگ و دو میں لگ گئے کہ کسی طرح پیٹرول کا نعم البدل تلاش کیا جائے۔ نیوکلیائی توانائی اگرچہ قابلِ تجدید ذرائع میں نہیں آتی لیکن چونکہ اس میں ایندھن کی بہت کم مقدار استعمال ہوتی ہے اس لیے اس کا شمار بھی توانائی کے متبادل ذرائع میں ہوتا ہے۔ نیوکلیائی دور کی ابتداء ۱۹۴۲ء میں ۲۔ دسمبر کو ہوئی۔ آج اگرچہ دنیا کے بہت سے ممالک نیوکلیائی توانائی استعمال کر رہے ہیں لیکن اس کا استعمال کافی محدود ہے۔ نیوکلیائی ٹکنالوجی سے وابستہ خطرات نے اس کو پھیلنے سے روکا ہے۔ نیوکلیائی ایندھن کا فضلہ ہنوز ایک مسئلہ بنا ہوا ہے اس ایندھن میں کافی تابکاری ہوتی ہے اور اوسطاً لگ بھگ ۵۰۰۰ سال تک اس ایندھن میں سے خطرناک شعاعیں نکلتی رہتی ہے جو کہ نہ صرف انسانی بلکہ ہر قسم کے جاندار کے جسم و صحت کے لیے خطرناک ہیں۔

لامحدود اور قابل تجدید ذرائع

توانائی کے روایتی ذرائع کے علاوہ دیگر وسائل کو دو اقسام میں بانٹا جاتا ہے۔ لامحدود قسم میں شمسی توانائی آتی ہے۔ سورج سے آنے والی کرنوں کو توانائی کی دیگر اقسام میں بہ آسانی بدلا جا سکتا ہے۔ سمندری لہروں کی توانائی، ہوا کی قوت، اور زمینی حدت بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ توانائی کی یہ تمام اقسام تجرباتی سطح سے گزرنے کے بعد اب زیرِ استعمال ہیں۔ قابلِ تجدید ذرائع میں پانی سے پیدا شدہ بجلی، پیڑ پودوں سے حاصل توانائی نیز فضلے سے بنی گیس شامل ہیں۔ مختلف ممالک میں سائنسداں توانائی کے ان نئے وسائل کو بہتر سے بہتر اور قابلِ استعمال بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان تمام وسائل میں سے نیوکلیائی توانائی اور شمسی توانائی کافی ترقی یافتہ شکل اختیار کر چکی ہیں۔ انسانی اور جانوروں کے فضلے سے بنی گوبر گیس گاؤں میں کافی مقبول ہو رہی ہے اس طرح نہ صرف یہ کہ فضلے کو استعمال کر لیا جاتا ہے بلکہ گیس نکلنے کے بعد بچا ہوا فضلہ ایک عمدہ کھاد کا کام کرتا ہے۔ پیڑ پودوں کے فاضل حصّوں یا کوڑے کرکٹ کو بھی اب توانائی کی مختلف شکلوں میں بدلا جا سکتا ہے۔ توانائی کے ان تمام متبادل وسائل کا تفصیلی جائزہ آئندہ تحریر میں پیش کیا جائے گا۔

ملکی صورت حال

ہمارا ملک توانائی کے معاملے میں منفرد ہے۔ یہاں ایک طرف ہزاروں سال سے استعمال ہونے والے روایتی ایندھن مثلاً لکڑی اور گوبر مستعمل ہیں تو دوسری طرف جدید ترین نیوکلیائی بھٹیاں بجلی تیار کر رہی ہیں۔ ہاں اگرچہ شہروں میں پیٹرول

اور گیس کا استعمال ہے لیکن دیہاتوں میں ابھی ایندھن جنگلوں سے سمیٹ کر لایا جاتا ہے۔ اوسطاً ایک دیہاتی عورت روزانہ تین گھنٹے ایندھن اکٹھا کرنے میں لگاتی ہے۔ اگرچہ ظاہرہ طور سے ایسا لگتا ہے کہ اب لکڑی جلانے کا رواج کم ہو چلا ہے لیکن اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اب بجلی گھروں میں استعمال ہونے والی توانائی کا ۴۴ فی صد حصہ لکڑی اور گوبر وغیرہ سے ہی آتا ہے۔ توانائی کی ان اقسام کو غیر تجارتی کہا جاتا ہے کوئلہ، پیٹرولیم، بجلی، گیس اور نیوکلیائی توانائی تجارتی زمرے میں آتی ہیں۔

گذشتہ تیس سالوں کے دوران ہمارے ملک میں بجلی کا استعمال ۱۰ فی صد سالانہ اوسط رفتار سے بڑھا ہے۔ یہ ہمارے ملک میں استعمال ہونے والی توانائی کی سب سے مقبولِ عام قسم ہے۔ مارچ ۱۹۸۸ میں لیے گئے ایک جائزے کے مطابق ہمارے ملک میں ۶۴۲۴۵ میگاواٹ کے بجلی گھر کام کر رہے ہیں جنھوں نے گذشتہ سال ۲۰۲ ارب یونٹ بجلی تیار کی لیکن بجلی کی اتنی بڑی مقدار بھی ہماری ضروریات کے لحاظ سے کم تھی۔ گذشتہ سال یہ کمی لگ بھگ ۱۱ فی صد تھی۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ہمارا پسندیدہ ایندھن بھی پیٹرول ہے ہمارے ملک میں اس وقت پیٹرولیم اور گیس کے قدرتی ذخائر بالترتیب ۵۸۱۰ لاکھ ٹن اور ۵۴۱ ارب مکعب میٹر ہیں ہماری موجودہ سالانہ پیداوار لگ بھگ ۳۲۰ لاکھ ٹن پیٹرولیم ۹٫۵ ارب مکعب میٹر گیس ہے۔ تیل کی اتنی مقدار نکالنے کے بعد بھی ہم کو ۱۷۰-۱۹۰ لاکھ ٹن تیل ہر سال باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک میں لگ بھگ ۱۵۶ ارب ٹن کوئلہ زمین کے سینے میں پوشیدہ ہے۔ اس میں سے تقریباً ۱۸۰۰ لاکھ ٹن کوئلہ ہم ہر سال نکال لیتے ہیں۔ لکڑی کی سالانہ اوسط کھپت ۱۳۰۰ لاکھ ٹن ہے جو کہ ۲۰۰۴-۵ کے درمیان ۲۵۹۰ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔
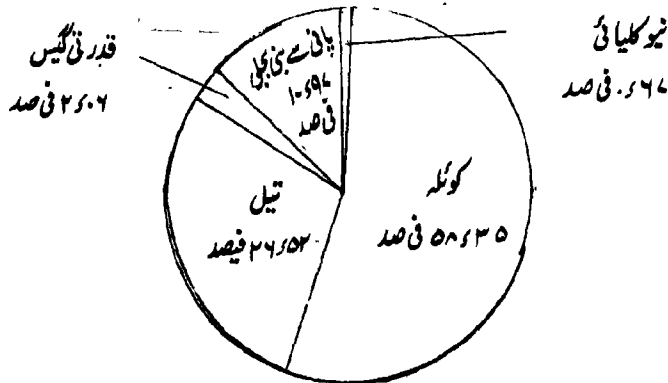
تجارتی توانائی میں مختلف وسائل کا حصہ

صنعت
زراعت
دیگر
نقل و حمل
گھریلو
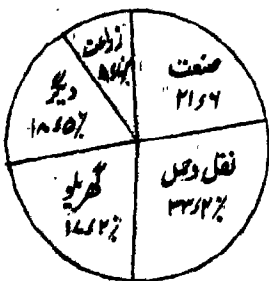
مختلف شعبوں میں تیل کا استعمال
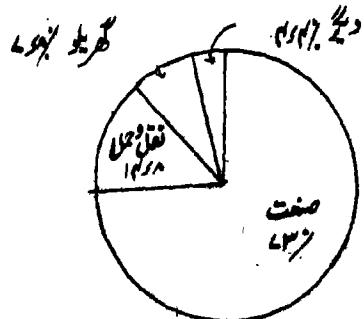
مختلف شعبوں میں کوئلے کا استعمال
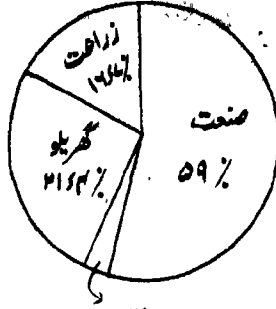
نقل وحمل ۲٫۹%

(مختلف شعبوں میں بجلی کا استعمال)

توانائی کے مشاورتی بورڈ کے اندازے کے مطابق ۲۰۰۴-۵ء کے دوران ہم کو ۴۵۰۰ لاکھ ٹن کوئلہ، ۹۴۰ لاکھ ٹن تیل اور ۵۶۴ ارب یونٹ بجلی درکار ہوگی۔ توانائی کی ضرورت اور فراہمی کے درمیان بڑھتی ہوئی اس خلیج کو روکنے کے صرف دو طریقے ہیں اوّل یہ کہ توانائی کے استعمال میں بے حد کفایت شعاری سے کام لیا جائے اور دوسرے یہ کہ توانائی کے دیگر ذرائع تلاش کئے جائیں تاکہ آنے والی صدی میں ہم توانائی کے قحط سے دوچار نہ ہوں۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی پچھلے علم سے عمل۔ چال چلن۔ تعلیم نفسی نفس کشی شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی۔ قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے۔ اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عافیت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا۔ اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

سرسید

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ جلد ۸۔ شمارہ ۱۱ (دسمبر ۸۹ء)

درس گاہوں میں نظم و نسق کا مسئلہ

امان اللہ خان شیروانی*

آج کل تعلیم میں ڈسپلن سب سے زیادہ بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ پرانے اساتذہ اور بزرگوں کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ روایات شکنی کا یہ طوفان جس میں ہماری نوجوان نسل پھنسی ہوئی ہے سماج کی مکمل تباہی کا باعث بنے گا جب کہ نوجوان نسل کا خیال ہے کہ سارا قصور بزرگوں کے دقیانوسی خیالات کا ہے جس کی بنا پر یہ لوگ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں عمرانیات کے ماہرین اور انسانی نفسیات کے سمجھنے والے کہتے ہیں کہ یہ سب اس لیے ہے کہ آج کے نوجوان میں کچھ تو اخلاقی قدروں کا فقدان ہے اور کچھ موجودہ سماجی زندگی میں نوجوان اپنے آپ کو بے بس اور غیر محفوظ تصور کرنے لگے ہیں۔ بہرحال ان خیالات اور اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ سماج میں ضابطے کی پابندی ختم ہوتی جا رہی ہے اور خصوصاً نوجوان نسل میں نظم و نسق کی کمی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

دراصل الزامات کی گیند کو ایک دوسرے کے کورٹ میں پھینکنے سے مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکل رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس مسئلے کا سائنٹفک اور غیر جذباتی تجزیہ کر کے صحیح نتائج پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس طرح کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ چار قسم کے حالات کی بنا پر نوجوانوں اور طلبا میں بدنظمی ([illegible]) پیدا ہوتی ہے۔ اوّل یہ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جنریشن گیپ کی وجہ سے پختہ ذہن اور تجربہ کار بزرگ حضرات کا نئی نسل سے ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور یہ بزرگ لوگ اپنے کو بہتر، سمجھ دار اور تجربہ کار سمجھنے کی وجہ سے جلد ہی اپنا توازن کھو دیتے ہیں اور اپنے رویے میں شدت لے آتے ہیں اور کبھی کبھی تشدد کا سہارا بھی لے لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ بزرگ اپنا وقت بھول جاتے ہیں اور انھیں یہ یاد نہیں رہتا کہ نوجوانی کی عمر میں وہ بھی کم و بیش اسی طرح سوچتے تھے اور اسی طور پر عمل کرتے تھے اور ان کا برتاؤ بھی اسی طرح کا ہوتا تھا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ تعلیم کے پھیلاؤ اور ذرائع ابلاغ کی ترقی نے نئی نسل میں آزادیٔ خیال، آزادیٔ فکر اور شخصی آزادی کے دروازے کھول دیے ہیں اور آج کے نوجوان ان باہری باتوں سے سیکھ کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں جب کہ ان کے بزرگ انھیں اپنی قید میں رکھ کر اور اپنے طریقے سے جینے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ چوتھی وجہ یہ بھی ہے کہ نوجوان نسل اپنے خام خیالات، ناتجربہ کاری اور بے وقوفی کی وجہ سے بھی غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی کبھی غلط لوگوں کے بہکانے میں آ کر اور خود غرض سیاسی نیتاؤں کے چکر میں پڑ کر اپنے ہی بہی خواہوں سے بغاوت کر اٹھتی ہے اور بدنظمی کا شکار ہو جاتی ہے۔

---

* گل مرگ کالونی، لال ڈگی روڈ، علی گڑھ۔

ان چاروں وجوہ کو دیکھ کر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ چوتھی قسم کے حالات ہی صحیح معنوں میں بدنظمی (ان disciplined) کے زمرے میں آتے ہیں لیکن عام طور پر ان تمام حالات پر جن میں بزرگ لوگ اور نوجوان ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے ہیں اور آپس میں آنکھ نہیں ملا سکتے بدنظمی قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ عمر کے تقاضوں اور وقت کی تبدیلیوں کی وجہ سے خیالات اور طرزِ فکر میں اختلاف کا ہونا ضروری ہے۔

بہر حال ہمیں ان تمام حالات کو سامنے رکھ کر اختلافات دور کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے، اس پر غور کرنا ہے پہلے حالات میں تو بڑوں کو خود پھر سے تعلیم (Re-education) کی ضرورت ہے، انھیں سمجھانا چاہیے کہ وقت کی سوئی ہمیشہ آگے ہی بڑھتی رہتی ہے اور وقت کے ساتھ حالات بدلتے رہتے ہیں اس لیے بچوں کے طور طریقوں میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے۔ انھیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ تہذیب و تمدن جامد چیز نہیں ہے۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں دیکھتے دیکھتے تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا ایک شعر ہے ـــ

ثبات عمر ہے تغیر کو ہر زمانے میں
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں

ان تبدیلیوں سے رسم و رواج، طریقۂ حیات اور طرزِ فکر سب پر اثر پڑتا ہے۔ نوجوان نسل ان تبدیلیوں سے جلد اور سب سے پہلے متاثر ہوتی ہے، اس لیے بزرگوں کو بھی ان تبدیلیوں کو حقیقت مان کر حالات سے سمجھوتا کر لینا چاہیے اور بچوں اور نوجوانوں کے طرزِ زندگی اور ان کے رویّہ میں تبدیلیوں کو تسلیم کرتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ ان کے خیال میں جب یہ تبدیلیاں نقصان دہ اور ناپسندیدہ ہوں تو سمجھا بجھا کر ان کے رخ کو موڑنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

دوسرے حالات میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بچہ جیسے جیسے جسمانی طور پر بڑھتا ہے اس میں جسمانی تبدیلیاں بھی آتی ہیں اور ان جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ خود بخود اس کے طور طریقے بھی بدلنے لگتے ہیں۔ وہ خود ان تبدیلیوں کے لیے ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس کے اندر حیاتیاتی تبدیلیاں اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔ بہر حال بچے "بچے" ہی رہیں گے، انھیں بڑا بننے میں دیر لگے گی اور بڑوں کا یہ خیال کرنا کہ وہ اُن کی طرح کیوں نہیں ہیں غلط خیال ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر بڑے اپنے وقت کو بھول جاتے ہیں کہ جب وہ خود "بچے" تھے تو اس طرح سوچتے تھے اور اسی طرح حرکتیں کرتے تھے۔ جو بزرگ اس بات پر دھیان رکھتے ہیں وہ بچوں اور نوجوانوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں، ورنہ ٹکراؤ لازمی ہے اور ٹکراؤ ہی بدنظمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

تیسرے قسم کے حالات اس زمرے میں آتے ہیں جب نئی نسل تعلیم، ذرائع ابلاغ اور حالات کی تبدیلی سے متاثر ہو کر اپنے خولوں سے نکل آتی ہے۔ اس کی کچھ خواہشیں، مانگیں، اور فرمائشیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر حالات کے مطابق ہوتی ہیں لیکن ان پر غور کرنے کے بجائے بزرگ انھیں خاندانی اور سماجی روایات سے انحراف سمجھنے لگتے ہیں اور بغاوت کہنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت میں بزرگوں کا خیال ہوتا ہے کہ نئی نسل اپنے آپ کو زیادہ عقل مند سمجھنے لگی ہے اور پرانی نسل کو حقارت سے دیکھنے لگی ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ اس لیے بزرگ اس طرزِ فکر کو بدل کر نئی نسل کی مانگوں پر ہمدردی سے غور کریں اور اپنے رویے میں لچکیلا پن لائیں تو مسئلہ کا حل جلد ہی نکل سکتا ہے، ورنہ ٹکراؤ لازمی ہے۔

دراصل چوتھی قسم کے حالات ہی وہ ہیں جنھیں ہم صحیح معنوں میں ان ڈسپلن کہہ سکتے ہیں۔ ان حالات میں نئی نسل خصوصاً طلبا جان بوجھ کر غیر پسندیدہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں اور جذبات کی رَو میں بہہ کر ہر اچھی بات اور اچھے اصول سے انحراف برتنے لگتے ہیں۔ اس زمرے میں طلبا کی وہ بُرائیاں آتی ہیں جنھیں ہم اسکولوں اور کالجوں میں ان ڈسپلن کا نام دیتے ہیں۔ دیر سے اسکول آنا، امتحان میں نقل کرنا، اساتذہ سے اچھی طرح پیش نہ آنا، چوری کرنا، اسکول سے بھاگ جانا،

اسکول یا کالج کی املاک کو دانستہ نقصان پہنچانا وغیرہ لیکن اگر ہم ان مجرمانہ حرکتوں پر غور کریں اور ان کا نفسیاتی اور سائنٹفک تجزیہ کریں اور ان کی جڑ معلوم کرنے کی کوشش کریں تو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ہر اِن ڈسپلن حرکت کے پیچھے اُس کا مجرم ہی ذمّہ دار نہیں ہے بلکہ کچھ اور وجہیں بھی ہو سکتی ہیں جو ان حرکتوں کی اصل محرک ہیں۔ ان میں چند وجوہات یہ ہیں۔

۱- غیر محفوظ ہونے کا احساس۔
۲- جذباتی (Emotional) مشکلات۔
۳- گھر اور خاندان کے حالات کا اثر۔
۴- اسکول یا کالج کی انتظامیہ کی غلط پالیسی اور غلط طریقے۔
۵- اسکول یا کالج میں بد انتظامی۔
۶- کلاس روم میں ناخوشگوار حالات۔

غیر محفوظ ہونے کا احساس زیادہ تر اس وقت ہوتا ہے جب گھر پر بچوں اور نوجوانوں کو وہ شفقت نہیں ملتی جس کے وہ مستحق ہیں اور کبھی کبھی یہ احساس اساتذہ کی طرف سے شفقت میں کمی اور انھیں نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اگر اِس احساس کی وجہ سے طلبا کے برتاؤ میں کچھ تبدیلیاں اور چڑچڑاپن محسوس ہوتا ہے تو یہ اِن ڈسپلن نہیں ہے بلکہ ایک طرح یہ حالات کی ابتری یا بے آہنگی-Mal adjust-ment کا معاملہ ہوتا ہے جس پر اچھی طرح غور کر کے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ ایک بچّہ کی یہ شکایت بار بار میرے پاس آتی تھی کہ وہ کبھی کاپی نہیں لاتا اور کبھی کام نہیں کرتا جس کی وجہ سے اسے کلاس میں سخت سست کہا جاتا تھا اور کبھی کبھی اساتذہ کی طرف سے ہلکی سی سزا بھی مل جاتی تھی میں نے اس سے بڑے پیار سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کئی سوال کرنے کے بعد اسے کچھ ہمدردی کا احساس ہوا تو اس نے بتایا کہ اس کے والدین تو کسی اور شہر میں رہتے تھے اور وہ اپنی دادی کے پاس رہتا تھا۔ دادی سخت بھی تھیں اور اس کی ضرورتوں کو سمجھ بھی نہیں پاتی تھیں۔ اس لیے جب بھی وہ کاپی یا کسی اور ضرورت کے لیے پیسے مانگتا تھا تو وہ بہت ناراض ہوتی تھیں اور کبھی کبھی مار بھی دیتی تھیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس کے چھوٹے بہن بھائی والدین کے ساتھ خوب مزے میں رہتے ہیں۔ میں نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایک نسخہ تجویز کیا۔ اس سے کہا کہ وہ روز صبح اُٹھ کر اور روزانہ اسکول سے واپس جا کر اپنی دادی کو سلام کیا کرے اور کچھ نہ مانگے۔ اِسے اپنی روزانہ کی عادت بنا لے کچھ دن بعد اس کی دادی خود اسے پیسے دے دیں گی۔ اس بچے نے یہی کیا اور چند روز بعد خوش خوش مجھے بتایا کہ اس کی دادی نے اسے پیار بھی کیا اور کاپیوں کے لیے پیسے بھی دیے۔ اس طرح اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔

جذباتی پریشانیاں کبھی کبھی جسمانی نشوونما سے اور کبھی گھر پر غیر معمولی حالات سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان پریشانیوں کی وجہ سے بعض دفعہ طلبا کے رویے میں چڑچڑاپن آ جاتا ہے اور کبھی کبھی وہ ناپسندیدہ حرکات کے شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا علاج نفسیاتی ماہر کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ طلبا غلط کتابوں، سینما، خراب ساتھیوں اور غیر صحت مند سماجی ماحول سے متاثر ہو کر بھی ناپسندیدہ اور غیر صحت مند حرکات اور غلط رویّہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس حالت میں ان کی تعلیم و تربیت کے طریقوں میں کچھ تبدیلی کر دینے اور ان کے لیے اچھا سماجی ماحول بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں سختی اور سزا زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔ اس طرح کچھ معاملات میں طلبا انتظامیہ کے غلط اور سخت رویہ کی بنا پر یا کلاس روم کے ناخوشگوار ماحول کی وجہ سے ضابطہ کو توڑنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مثلاً کلاس روم میں بیٹھنے کے لیے فرنیچر کی کمی، کسی استاد کے درس و تدریس کا نہ سمجھ میں آنے والا طریقہ، اساتذہ کا جانب دارانہ رویّہ اور سب کے سامنے بے عزتی کا احساس غرض کہ بہت سے ایسے حالات ہیں جن کی وجہ سے طلبا ناپسندیدہ حرکتیں کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر مسئلہ کا غور سے مطالعہ

کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو ان وجوہ کو ڈھونڈ نکال کر انھیں دور کرنے کی کوشش کی جائے تو حالات بدل جاتے ہیں۔

بہر حال ان سب حالات کو سامنے رکھ کر ہی طلبا کے ان ڈسپلن کے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ بلا سوچے سمجھے صرف سزا دے کر مسئلہ کا حل اور مشکل ہو جاتا ہے۔ پچھلے زمانے میں جب شاگرد اپنے استادوں کے سامنے سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے اور کسی بات پر "کیوں" کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا" اس وقت ضابطہ کی پابندی یا غیر پابندی کا مسئلہ کوئی خاص مسئلہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب جب کہ انسانی شعور جاگ گیا ہے اور نوجوان نسل بھی اپنے حقوق کو پہچاننے لگی ہے اور جمہوریت کے فروغ نے انسان کے دل و دماغ کو ایک نئی روشنی عطا کی ہے تو ایسی حالت میں ڈسپلن کی شکل اور اس کا روپ بدل گیا ہے۔ اب کلاس میں ایسی خاموشی کہ "پن بھی گرے تو آواز سنائی نہ دے" قسم کا ڈسپلن نہیں رہا۔ وہ اساتذہ اور پرنسپل صاحبان جو اس حقیقت کو نہیں پہچانتے ناکامیاب ہو جاتے ہیں۔ آج کل دو قسم کے اخلاقی اصول نہیں رکھے جا سکتے ایک بڑوں کے لیے اور دوسرے بچوں کے لیے۔ بڑے دیر میں اسکول آئیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں، بچے اگر دیر کریں تو سزا ملے۔ اساتذہ کلاسوں میں پڑھانے نہ جائیں تو یہ جائز ہے لیکن اگر طلبا کلاس میں نہ جائیں تو نالائق ٹھہرائے جائیں۔ اساتذہ اور والدین سگریٹ خوب پئیں تو کوئی بات نہیں اگر طلبا سگریٹ پی لیں تو آوارہ اور نکمے قرار دیے جائیں۔ غرضیکہ یہ دُہری اخلاقی قدریں ختم ہونا چاہئیں۔ جو کچھ ہم بڑے کرتے ہیں طلبا وہی سیکھتے ہیں اور انھیں ایسا کرنے کا حق ہوتا ہے۔ موجودہ نوجوان بہت سمجھدار اور ہوشیار ہے اور اپنے بڑوں کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ اس لیے بڑوں کو ان کے سامنے وہی نمونہ پیش کرنا چاہیے جو انھیں بچوں اور نوجوانوں سے مطلوب ہے۔ ان کے سامنے اچھی اور صحت مند قدروں کو بڑی ہوشیاری دلیلوں اور مثالوں کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ صرف احکامات سے یہ قدریں ان کے دل میں گھر نہیں کر سکتیں۔ کبھی کبھی یہ ضرور ہوتا ہے کہ سختی اور احکامات سے سطحی طور پر بچے اور نوجوان نسل انھیں قبول کر لیتی ہے دل سے نہیں اور وہ کسی ڈر اور خوف کی وجہ سے ظاہراً مخالفت نہیں کرتے لیکن جب بڑوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں ان پر نکتہ چینی بھی کرتے ہیں اور انھیں برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ یہ حالت اچھے ڈسپلن کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو ڈسپلن کا تعلق ظاہر و باطن دونوں سے ہے۔ دوسرے ڈسپلن جسمانی بھی ہوتا ہے اور ذہنی۔ جسم کو مجبور کر کے کسی کام کی طرف راغب کیا جائے اور ذہن اسے قبول نہ کرے تو یہ ڈسپلن نہیں ہے جب دونوں طریقوں سے ہمارے طلبا ہماری باتوں کو مان لیں اور دل سے اس کام کو انجام دینے لگیں تو سچا اور حقیقی ڈسپلن ہے۔

حقیقی ڈسپلن قائم کرنے کے لیے اسکول یا کالج کے سربراہ کو طلبا کی ضرورتوں کا بھرپور احساس ہونا چاہیے۔ پرنسپل اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے طلبا کی کم از کم بنیادی ضرورتوں کو سمجھیں اور جہاں تک ممکن ہو انھیں پورا کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ بنیادی ضرورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ شفقت اور محبت کی ضرورت اور اس کا احساس کہ ہمارا بھی کوئی ہے۔

۲۔ کچھ کرنے کا شوق اور اس کے لیے جائز ضرورتوں کی ہمت افزائی۔

۳۔ ان کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا احساس اور انھیں خود فیصلے کرنے کی آزادی۔

۴۔ خود کو بہتر اور سمجھدار سمجھنے کا احساس۔

جب تک ہمارے تعلیمی پروگرام میں نوجوانوں کی ان بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی ان ڈسپلن کا مسئلہ قائم رہے گا۔ ان ضرورتوں کے پورا کرنے میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے۔ نہ تو اُن کے لیے غیر معمولی

اخراجات کی ضرورت ہے اور نہ کوئی دوسری مشکلات۔ صرف روایتی طرز فکر اور تعلیمی پالیسی میں کچھ تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ روک فیلر Rock Feller نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

"میں لوگوں کو قابو میں رکھنے کی اہلیت کی قیمت زیادہ ادا کر سکتا ہوں بہ نسبت کسی بھی دوسری اہلیت کے۔"

یہ بات تعلیمی انتظام میں بھی کارآمد ہے۔ کوئی بھی استاد یا پرنسپل چاہے کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ طلبا کو قابو میں رکھنے اور نظم و نسق قائم رکھنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو اور انسانی تعلقات کے علم پر اسے عبور حاصل نہ ہو۔

ڈسپلن قائم رکھنے کا طریقہ

اگر کسی تعلیمی ادارے کے سربراہ کو انسانی تعلقات پر عبور حاصل ہے اور اسے انسانی خصوصاً نوجوانوں اور بچوں کی نفسیات کا پورا علم ہے تو اسے اپنے ادارے میں نظم و نسق قائم رکھنے میں زیادہ دقت نہیں ہو سکتی۔ طلبا کو اسکول کے غیر تدریسی کاموں، کھیل کود اور دوسرے پروگراموں کے انتظام میں کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ تاکہ ان کو بھی اپنی شخصیت کے اظہار کا پورا موقع ملے اور انھیں اس کا احساس ہو کہ "اساتذہ اور پرنسپل کا رویہ کسی بھی کام میں جانب دارانہ نہیں ہے اور ان کے ساتھ انصاف کیا جائے گا"۔ اچھے کاموں کے لیے ان کی ہمت افزائی کی جائے اور بنا کسی خاص وجہ کے ان کی تذلیل کی کوشش نہ کی جائے تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں طلبا میں ان ڈسپلن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں اس طرف توجہ نہیں دی جاتی اور ڈسپلن قائم کرنے کے لیے یہ طریقے نہیں اپنائے جاتے۔ طلبا کی آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کی جائز مانگوں کو بھی پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں طلبا نہ صرف اپنی جائز مانگوں کے لیے بلکہ کبھی کبھی ناجائز مانگوں کو لے کر ان ڈسپلن کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ضابطے کی پابندی پر عمل کرانے اور ڈسپلن بہتر بنانے کے لیے کچھ اہم طریقے یہ ہو سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے اہم طریقہ تو یہ ہے کہ ذہنی طور پر طلبا کو ڈسپلن کی طرف راغب کیا جائے۔ انگریزی میں ایک لفظ Motivation ہے۔ یعنی طلبا کو خود احساس ہو کہ ان کی بھلائی کے لیے ڈسپلن کتنا ضروری ہے۔ ڈنڈے کے زور اور سزا کے ڈر سے انھیں خاموش رکھنا مناسب نہیں ہے۔ کلاس روم میں انھیں خود یہ احساس ہو کہ اگر وہ کچھ سیکھنا چاہتے ہیں تو خاموش رہیں اور استاد کی طرف توجہ دیں۔ حالانکہ یہ کام کچھ مشکل ہے لیکن وہ اساتذہ جو Motivation پیدا کر سکتے ہیں اور جنھیں اپنا سبق پُرکشش بنانے کا فن آتا ہے کلاس میں اور کلاس سے باہر بھی ڈسپلن قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے لیے محنت، خلوص اور کوشش کی ضرورت ہے۔ حالانکہ کسی کام کو کرانے یا نہ کرانے کے لیے انعام اور سزا دو چیزیں بھی بڑی کارآمد ہوتی ہیں لیکن اس سے بہتر طریقہ Motivation کا ہے۔

۲۔ انعامات اور شاباشی بھی اس سلسلے میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً چھوٹے بچے تو انعامات اور شاباشی سے بڑے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یقیناً یہ ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے ایک مثبت طریقہ ہے۔ مثلاً پرنسپل کی طرف سے یہ اعلان اس کلاس کو اسپیشل ریفرشمنٹ دیا جائے گا جس کی حاضری ۱۰۰ فی صدی ہوگی یا ان طلبا کو اسمبلی میں شاباشی اور انعامات دیے جائیں گے جن کی حاضری سو فیصدی ہوگی یا جو پورے مہینے یا پورے ٹرم روزانہ وقت پر اسکول آئیں گے وغیرہ۔ تو اس کا اثر یقیناً روزانہ کی حاضری پر اچھا پڑے گا۔ اس طرح انسانی نفسیات کے مطابق شاباشی اور انعام و اکرام کسی کام کو کرانے میں بڑے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ڈسپلن قائم رکھنے کے لیے ایک طریقہ جو بہت کامیاب ثابت ہوا ہے، یہ بھی ہے کہ طلبا کو کبھی خالی نہ چھوڑا جائے

انھیں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھا جائے۔ نہ صرف روزانہ کے پروگراموں بلکہ پورے سال کا ان کا ایسا ٹائم ٹیبل بنایا جائے کہ وہ درس و تدریس کے ساتھ کسی نہ کسی غیر تدریسی کام میں مشغول رہیں۔ کبھی کسی کلب یا ایسوسی ایشن کے فنکشن کی تیاریاں کبھی کلچرل پروگرام میں مصروفیت اور کبھی کسی سوسائٹی یا انجمن کا انتخاب یا پھر امتحان کی تیاریاں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر ان ڈسپلن کا مسئلہ اس وقت اٹھتا ہے جب طلبا خالی ہوتے ہیں اور ان کا ذہن کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔ اس لیے جن اسکولوں اور کالجوں میں غیر تدریسی امور اور مشغلے زیادہ سے زیادہ ہوتے ہیں وہاں کا نظم و نسق بھی اچھا ہوتا ہے اور جہاں کچھ نہیں ہوتا یہاں تک درس و تدریس کا کام بھی سست ہوتا ہے۔ وہاں آئے دن ان ڈسپلن کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔

۴۔ طلبا کو ذمہ داری کے کام دیے جائیں۔ دیکھا گیا ہے کہ طالب علموں کو جب کوئی ذمہ داری کا کام سپرد کیا جاتا ہے تو نظم و نسق کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ کلاس روم میں درس و تدریس کا کام بھی اس طرح کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ ذمہ داری طلبا کے کاندھوں پر ڈالنے کی کوشش ہو تو اس سے ڈسپلن بھی قایم رہتا ہے اور یہ کسی بات کو ذہن نشین کرانے کا بہتر طریقہ بھی ہے۔ مثال کے طور پر ایک استاد کلاس میں کوئی سوال یا کوئی مسئلہ پیش کر کے طلبا سے کہے کہ وہ خود کتابیں پڑھ کر اور ایک دوسرے سے مشورہ کر کے اس کا جواب یا حل تلاش کریں۔ اس کے لیے کلاس کو کئی گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ طلبا مشغول ہو جائیں گے اور ذمہ داری کے احساس سے کام میں لگ جائیں گے ہر گروپ کا ایک لیڈر بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح بڑی ذمہ داری ان لیڈران کے سر پہ آ جائے گی۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض طلبا میں اپنے آپ کو سب سے اونچا رکھنے اور دوسروں سے اچھو تا بننے کی تمنا رہتی ہے۔ وہ اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن سے دوسرے ساتھی اُن کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسے طالب علموں کو اگر کسی قسم کی لیڈرشپ یا مخصوص کام سپرد کر دیا جائے تو وہ بڑی ذمہ داری اور مستعدی سے اس کام کو انجام دیں گے۔ میں نے اکثر دادا قسم کے طلبا کو کالج کا پریفیکٹ بنایا ہے اور ان کو کالج کے فنکشن میں اور کالج فیلڈ پر ڈسپلن قایم رکھنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسے موقعوں پر بہت اچھا نظم و نسق کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا ہے۔

۵۔ سزا : سزا بھی ان ڈسپلن کو روکنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے لیکن تمام دوسرے ذرایع دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ہی اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ موجودہ سماج اور آج کے حالات میں سزا ایک ضروری طریقہ ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ صرف خوف یا ڈر سے ہی قابو میں آتے ہیں اسی لیے مذاہب میں دوزخ اور نرک جیسا تصور رکھا گیا ہے۔ تاکہ انسانوں پر برائی کرنے کے لیے خوف طاری رہے لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ سزا ایک 'ذریعہ' ہے۔ 'مقصد' نہیں۔ سزا دو باتوں کے لیے دی جاتی ہے۔ ایک اس لیے کہ مجرم کو دوبارہ اس کام کے کرنے سے روکا جائے جس کے لیے سزا دی گئی اور دوسرا اس لیے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ کبھی کبھی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جاتی ہیں۔ جرم سے باز رکھنے والی سزا اکثر ناکام بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہ سزا جس کا مقصد اصلاح ہے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ مگر روزانہ کی زندگی میں کبھی ان مثالی اور آئیڈیل اصولوں سے انحراف بھی کرنا پڑتا ہے اور بچوں کو ایسی سزائیں بھی دی جاتی ہیں جو نہایت

" اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی وسعت کے مطابق جو کچھ کمایا اپنے ہی نفع کے لیے اور جو بُرا کیا تو اپنا نقصان کیا۔" (سورہ بقر)

عینیت سے اتفاق نہیں رکھتیں۔ ایک استاد کو نہ تو بالکل نرم مزاج ہونا چاہیے اور نہ سخت مزاج اور جابر۔ درمیانی راستہ سب سے اچھا اصول ہے۔ "سونے کا نوالہ کھلانا اور شیر کی نظر سے دیکھنا" یہ اصول ایک مثالی استاد یا درس گاہ کے سربراہ کے لیے سب سے اچھا اصول ہے۔ عام سی سزائیں جو خود بخود بھی بچوں کو ملتی رہتی ہیں مناسب نہیں ہیں۔ مثلاً ہر دیر سے آنے والے کو ایک سی سزا دی جانا یا اسکول سے غیر حاضری پر عام جرمانہ کیا جانا اچھی سزائیں نہیں ہیں۔ کیوں کہ ہر طالب علم جو دیر سے آتا ہے یا اسکول سے غائب رہتا ہے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور رکھتا ہوگا اور کبھی یہ وجہ ایسی بھی ہو سکتی ہے جو اس کے بس میں نہیں ہوتی۔ اس لیے انفرادی سزائیں جو حالات کے مطابق دی جائیں زیادہ مناسب ہو سکتی ہیں۔ جرمانہ کرنا تو طلبا کے لیے بہت ہی غلط سزا ہے۔ اوّل تو یہ سزا والدین پر پڑتی ہے اور دوسرے اس سے طالب علم جھوٹ بولنا اور چوری کرنا بھی سیکھتا ہے۔

یہ بات بھی ضروری ہے کہ سزا دینے کے مقابلے میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ کسی بھی بچے کو جرم کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مثلاً امتحان میں نقل کرنے کے لیے سزا دینے کے بجائے کڑی نگرانی رکھی جائے۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ لاپروائی کر کے جرم کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور پھر انھیں سزا دی جائے۔

"تواریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جب کہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانے میں یہی حال ہے۔ بلکہ میں نے غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گزر گیا اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے۔"

سرسید

موت اور نظریۂ طب

مظفر بلخی★

فرانسیسی شہر گرینتھیم کے السکا میں رہنے والا ۷۶ سالہ ایک شخص حیرت انگیز طریقے پر اس وقت زندہ ہوگیا جب اس کی تدفین کی تمام تیاریاں مکمل ہوچکیں۔ اس سے پہلے ڈاکٹروں نے اسے اس حالت میں مردہ قرار دیا جب اس کی حرکت نبض بند ہوچکی تھی۔ کسی عمل کے نتیجے میں جوابی حس بیدار نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ قلب اور پھیپھڑے نے بھی کام کرنا بند کردیا۔ ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۶ مارچ ۸۹ء میں شائع خبر کے مطابق اس کے رشتہ دار گیسٹ ہاؤس سے میت قبرستان لے جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ یکایک اس نے سانس لی اور کھانسنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دوبارہ زندگی کی طرف واپس ہوگیا۔ اس کی موت دماغ میں چوٹ لگنے سے ہوئی تھی۔ یہ واقعہ صرف ایک مثال ہے۔ اس جیسے کتنے ہی واقعات تصدیق کے ساتھ اکثر ہوا کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر کبھی ماہرین کی کوئی تدبیر کارگر ہوگئی تو یہ موت سے بچانے کے مترادف قرار دی جاتی ہے۔

آج ترقی کے اس دور میں ماہرین طب کے دعوے صرف زیادہ عمر بخشنے ہی کے نہیں، بلکہ ان کے درمیان یہ خیال بھی ہے کہ مستقبل میں انسان موت پر فتح یاب ہوگا وہ موت کو ایک مرض یا مختلف امراض کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے پیش نظر جسم کے عضوے خاص دماغ، جگر، پھیپھڑے اور دل کے افعال میں باہمی ربط کا ختم ہوجانا موت کے سبب ہے۔ آخری متنازعہ بحث دماغ اور دل کے آپسی ربط میں ہے۔ کوئی دل کو مقدم قرار دے کر اس کے ناکارہ ہونے کو موت کا سبب مانتا ہے۔ اور کسی کے خیال میں قلب موخر ہے اور اس کی حرکت دماغ کی پابند۔ وہ اس لیے بھی کہ ایسے واقعاتی ثبوت موجود ہیں جس میں قلب کی حرکت گھنٹوں بند کردی گئی۔ اذین قلب (Auricles) اور بطنین قلب (Ventricles) کو خون سے خالی کردیا گیا۔ شرائین (Arteries) اور اوردہ (VEINS) خالی ہوگئیں۔ قلب کا فعل بھی معطل ہوگیا لیکن اس کے باوجود موت واقع نہیں ہوئی۔ امریکہ کی ایک خاتون کی دماغی شریان نکالنے کے لیے ایسا ہی ایک آپریشن ڈاکٹر اسٹیون شیڈ نے کیا۔ جسم کا تمام خون نکال لیا گیا۔ قلب کی حرکت بند کردی گئی جسم کے درجۂ حرارت کو کم کرکے ۴ر۴ ڈگری سیلسیس تک سرد کردیا گیا گویا مردہ اس حالت میں وہ عورت ۴۰ منٹ تک رہی۔ لیکن اس کے دماغی افعال قلب کے بغیر اتنے لمبے وقفے تک حالت سکون میں رہتے ہوئے بالقوی قایم رہے ڈاکٹر شیڈ کے مطابق ایسے آپریشن امریکہ کے علاوہ یورپ

★ عالم گنج، ڈاکخانہ گلزار باغ، پٹنہ، ۸۰۰۰۰۷

ملکوں میں بھی کیے جا چکے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز کامیابی ایک کتے پر ہوئے تجربے میں ہوئی۔ امریکہ کے بال سٹرن برگ نے کتے کے جسم اور خون کو علیحدہ علیحدہ فریزر میں جما دیا۔ خون سے خالی کتے کے قلب، شریانوں اور وریدوں میں ایسے مصنوعی اجزا ڈال دیے گئے جن سے ان کی حفاظت ہو سکے۔ یہاں تک کہ کتے کو طبی ماہرین نے تمام طبی اصولوں پر بالکل مردہ قرار دیا۔ درجۂ انجماد سے نیچے کے درجۂ حرارت پر یہ کتا ۹ مہینے تک اسی طرح مردہ رہنے کے بعد زندہ ہو گیا۔ اس تجربہ کو خون کی غیر موجودگی میں سنگین آپریشن کے لیے امید افزا اور حیاتِ انسانی کے لیے نتیجہ بخش قرار دیا گیا۔ ماہرین کے مطابق کامیابی کی یہ اولین منزلیں ہیں۔ مستقبل قریب میں انسان کی عمریں طویل ہوں گی اور بعد کی منزلوں میں موت سے انسان کو بچایا جا سکے گا۔ یہ دعوے آن مذہبی تصورات کے بالمقابل ہیں جن کے پیشِ نظر موت انسانی دائرۂ اختیار میں نہیں۔ جہاں موت کا خالق خدا ہے اور حیات بعد الموت کا بھی۔ قرآن نے تو قطعیت کے ساتھ فیصلہ کر دیا ہے کہ موت انسان کی حدودِ قدرت سے باہر ہے:

"ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے۔" (الواقعہ۔ ۶۰)

"ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔" (العنکبوت۔ ۲۹)

"ان سے کہو کہ موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا۔" (السجدہ۔ ۱۱)

"کسی متنفس میں طاقت نہیں ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ موت کا وقت مقررہ تو لکھا ہوا ہے۔" (آل عمران۔ ۱۴۵)

موت ہی نہیں اپنے اختیار سے زیادہ عمر گھٹنے کا جو انسانی دعویٰ ہے اس کی بھی حیثیت دعویٰ سے زیادہ کی نہیں۔ اپنی دانست میں عمر بڑھانے یا گھٹانے کا کوئی اختیار انسان کو نہیں ہے:۔

"کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔" (فاطر۔ ۱۱)

"اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔" (المومن۔ ۶۷)

ایسی ہی آیتیں مختلف انداز اور عنوان سے قرآن میں بکثرت آئی ہیں جن کے واضح مفہوم میں عمر اور موت کا تنہا خالق اور قادر خدا ہے۔ انسان کو اس معاملے میں بے بس اور لاچار قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف آج موت کی فتح یابی اور اضافۂ عمر کے دعووں نے سوچنے کے ایسے انداز قائم کر دیے ہیں۔ جس سے تذبذب، تشکیک اور کج فکری کو راہ ملتی ہے۔ ایک طبقہ کے مقلدینِ فکر نے دعووں سے متاثر ہو کر مذہبی ہدایات پر شبہات کو پہنچنے کا موقع دیا وہ طبی کامیابیوں کو اعجاز سمجھ کر کسی ایسے دن کے منتظر ہو گئے جب انسان خدا کے مقابلے اپنی قدرتِ کاملہ کا اعلان کر دے دوسرے وہ بھی ہیں جو طب کے غیر معمولی انکشافات کو لائقِ توجہ نہیں سمجھتے نہ ہی انہیں مذہبی روشنی میں سمجھنا چاہتے۔ وہ انہیں قرانی ہدایتوں سے الگ مستقل بالذات مانتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر قرآن طب کی پیش رفت کا احاطہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس طرح وہ جدید طبی پیش رفت اور مذہب دونوں ہی کا دروازہ اپنے لیے بند کر کے اللہ کی نیابت میں انسانی اختیارات کو سمجھنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

موت پر انسان کو یقیناً اختیار نہیں ہے، لیکن موت سے قبل کی منزلوں میں انسانی اختیارات ختم نہیں ہوتے۔ ماہرینِ طب کے دعووں کی روشنی میں بھی خود موت کی منزل اور حقیقت متعین نہیں ہوتی۔ دنیائے طب خود اس منزل کو جاننا چاہتی ہے جو

طبی کوششوں کی آخری حد قرار پائے جس کے بعد کی کوششیں بے سود ٹھہرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین طب کے متفقہ فیصلۂ موت کے باوجود مردے جی اُٹھتے ہیں۔ جیسا کہ فرانسیسی شخص کے ساتھ ہوا۔ اس کی دوبارہ زندگی طبی پیش رفت کے لیے مضحکہ خیز بن گئی۔ وہ ڈاکٹروں کے غلط فیصلے کے نتیجے میں زندہ درگور ہونے سے بچ گیا۔ ایسے بہت سے واقعات میں زندہ جانیں دفن ہو گئیں، جنھیں ڈاکٹر مردہ قرار دے کر مطمئن ہو گئے۔ اس طرح کے واقعات نہ صرف ہوئے بلکہ طبی نظریے سے قطعی بعید از قیاس نہیں۔

ترقی پذیر ملکوں میں جن مرنے والوں کو مردہ قرار دیا جاتا ہے، یورپ اور امریکہ کے ترقی یافتہ ملکوں میں جہاں بہترین ڈاکٹر، جدید آلات، حیات بخش ادویات کی کثرت ہے، مرنے کی اس حالت پر مزید کوششیں جاری رہتی ہیں، کیا بعید کہ وہ بھی اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود ایک زندہ شخص کو مردہ قرار دیتے ہوں۔ مرنے کے قبل کے عوارضات پر قابو پانے کے لیے شاید مزید کوششیں اور معلومات درکار ہوں، جن پر اب تک ان کی دسترس اور علمی رسائی نہ ہو سکی ہو۔ کیونکہ ان کے سامنے کوئی ایسا متعین مقام نہیں جسے وہ موت کہہ سکیں۔ کبھی قلب اور دوران خون کے بغیر زندگی کا تصور محال تھا لیکن آج قلب کے بغیر بھی زندگی کا ثبوت موجود ہے۔ ماہرین طب اس فیصلہ کن مقام پر ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں جہاں سے زندگی کی واپسی ختم ہو جاتی ہے۔ تحقیق کے آگے بڑھنے سے وہ اس کے قریب ضرور ہو رہے ہیں اور اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ جسمانی موت (Somatic Death) کے بعد جب کہ دماغ، پھیپھڑے اور قلب کے افعال ختم ہو جاتے ہیں، خلیاتی زندگی باقی رہتی ہے۔ اس موت کو جس میں تمام خلیے اور نسیج حرکتِ عمل بند کر دیں، سالماتی موت (MOLECULAR DEATH) کا نام دیا گیا ہے اور جب یہ باقی ہے تو زندگی کے واپسی کے آثار بھی۔ سوال

اس کے کہ موت کا وقت مقرر نہ پہنچ چکا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موت کے بعد جسم کا درجۂ حرارت یکایک کم نہیں ہوتا۔ خلیات جن میں زندگی کے بنیادی تقاضے موجود ہیں انفرادی شکل میں دیر تک زندہ رہتے ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو مکمل شکل میں دوبارہ بحال کر سکیں۔ لیکن ہماری تحقیق و علمی کمی، آلاتی بے بسی، تجرباتی کم مائیگی زندہ کو مردہ کہہ کر خود کو آزاد کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہم نے اس خالقِ موت اور علیم و حکیم کے عطا کردہ علم سے بہت کم ہی اکتساب کیا ہے۔ دنیائے طب خود ایک بحرِ ذخار ہے، جس کے خزانے ابھی تک ہم سے پوشیدہ ہیں اور اس کی تھاہ کا ہمیں پتہ نہیں۔

آج نہ صرف خلیہ بلکہ خلیہ کے اندر پائے جانے والے اجسام جن میں کروموسوم (Chromosomes) اور مادۃ الحیات (Protoplasm) جیسے عناصر خصوصیت سے شامل ہیں تحقیق کے شعبوں میں حیرت ناک شکل اختیار کر چکے ہیں۔ خلیے کے مرکزہ میں پائے جانے والے کروموسوم جس میں جینس (Genes) ہے، بہت سی پوشیدہ حقیقتوں کو کھولتے جا رہے ہیں۔ خود جینس کو ایک مستقل سائنس کی حیثیت دے کر زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ خلیہ میں پائے جانے والے مادۃ الحیات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نہ صرف زندگی کا عنصر ہے بلکہ ماہرین نے اس کے لافانی ہونے تک کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لافانی نہیں ہوتے ہوئے بھی مادۃ الحیات میں بقائے حیات کی اتنی بڑی صلاحیت موجود ہے، جس کے ذریعہ موت سے قبل تک کی زندگی زیادہ متحرک بنائی جا سکے۔ اسی رطوبت کی وجہ سے خلیے کو غیر فناپذیر یہ صلاحیت کا حامل سمجھا گیا۔ خلیہ کو زندہ رکھنے کا ایک بڑا تجربہ نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الیکسس کیرل نے ایک مرغی کے بچے پر کیا جس میں اس کے دھڑکتے قلب کی جھلی جسے غشاء القلب۔ Peri-cardium) کہتے ہیں خون کے مادۃ الدم (Pla-sma) میں رکھ دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیوں میں

حیرت ناک نمو ظاہر ہونے لگی۔ خلیات بڑھنے لگے۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ دو سے چار اور چار سے آٹھ کی رفتار میں نئے خلیات پیدا ہونے لگے۔ قدرت کا عملِ زندگی ایک متعین اور خاص رفتار سے شروع ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر مختلف وقتوں میں برتن تراشی نہ جاتیں تو خلیات کا وزن ایک مہینے میں ۴ پونڈ اور ۳ مہینے میں تقریباً ۲۵ ارب پونڈ تک پہنچ جاتا۔ بعد میں جھلی پھینک دی گئی۔

لحمی خلیات سے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان کے درمیان پیوستگی اور بندش کو، خصوصی انزائم کے ذریعے توڑ کر، مزید لحمی مادے جگہ بناتے ہیں لیکن عمر آنے پر باہمی بندش سخت ہو جاتی ہے۔ ارد گرد ایسے لحمی مادے جمع ہو جاتے ہیں جن کے تغذیہ کا قدرتی نظام نہیں ہوتا بالآخر ان میں زہریلا پن آ جاتا ہے۔ ماہرین اس حالت کو موت کی پیش بندی کہتے ہیں وہ ایسے مادے بنانے میں مصروف ہیں جن کے ذریعے زہریلے مادے کو گلا دیا جائے۔ اگر اس میں کامیابی ملی تو ان کے مطابق وہ وقت موت سے ہمیشہ کی رہائی کا ہوگا۔

یہ تحقیقات مستقبل کے لیے یقیناً خوش آئند اور خدائی کی علم و حکمت سے دلچسپی کا مظہر ہیں لیکن ان سے یہ مفروضہ صحیح ثابت نہیں ہوتا کہ موت بھی انسانی دائرۂ اختیار میں ہوگی۔ یا انسان حیات بعد الموت کا خالق ہوگا۔ طب کی وسیع تحقیقات تو صرف جسمانی صحت کو بحال رکھنے کی وہ عظیم کامیابیاں ہیں جو موت سے قبل تک حاصل ہونے والی ہیں۔ جنہیں نادانستگی میں موت کو اپنے وقت سے ہٹانے کا بھی ذریعہ سمجھ لیا گیا، جب کہ موت پر کامیابی کا جہاں تک معاملہ ہے وہ تو صرف مستقبل کے تصورات ہیں اور وہ بھی محدود شکل میں۔ اس کے علاوہ اس کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ صحت مند افراد حادثات کے شکار نہیں ہوں گے۔ ناقابلِ شمار بیرونی زہریلے اثرات کے خلاف بھی جسم میں دفاعی قوت موجود ہوگی، خود کشی کی وارداتیں بھی نہیں ہو سکیں گی قاتلانہ عمل ختم ہو جائیں گے۔ قدرتی آفات کے ذکر کے بغیر [illegible]

سارے اسباب خود ہماری ذات سے تیار ہیں تو موت کہاں کہاں کے دائرۂ حصار میں لیا جائے گا؟ پھر معمول کی طبعی موت پر بھی اب تک جو ہمیں کامیابی ملی ہے، خود قابلِ غور ہے۔ آج آنِ واحد میں دنیا کا وہ صحت مند ترین انسان بیماری کی نذر ہو کر لقمۂ موت ہو جاتا ہے، جسے کبھی بسترِ علالت پر بھی نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح ۵۰ سے ۷۰ سال کی اوسط عمر میں آج ۱۰۰ سے زائد کے ضعیفوں کو مہینوں اور سالوں کی جان لیوا بیماری کا شکار ہو کر نہایت بے بسی کے عالم میں موت کا انتظار دیکھنا پڑتا ہے لیکن تمام حسرتوں اور دعاؤں کے باوجود موت نہیں آتی۔ بات یہ ہے کہ ہر ایک نفس کی موت کا وقت متعین ہے اور جب وہ ساعت موعود پہنچ جاتی ہے تو نہ بڑھتی ہے اور نہ اس میں کمی ہوتی۔

موت سے رہائی پر صرف ہونے والے وسائل اور فکری صلاحیتیں اگر بحالی صحت پر لگا دی جائیں تو یہ ایک موزوں اور نتیجہ بخش انسانی خدمت ہوگی۔ کیونکہ بہتر صحت، انسانی دائرۂ اختیار میں ہے۔ طبی کوششوں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو صحت مند بنایا جا سکتا ہے اور عمر کے زیادہ وقتوں میں صحت بخشی جا سکتی ہے۔ کیونکہ عمر کے اوقات دو حالتوں پر قایم ہیں۔ ایک فعّال (active) سرگرم زندگی کے، اور دوسرے وہ جن میں انسان غیر فعّال inactive غیر متحرک، سست اور جامد (dormant) ہوتا ہے۔ وقفہ عمر کے مکمل حصے پر پہلی حالت بھی غالب ہوتی ہے اور دوسری بھی۔ طب کی موجودہ پیش رفت اگر اسی طرح ہوتی رہی تو امید ہے کہ عمر کا زائد حصہ فعّال ہوگا جس میں بیماریاں کم ہوں گی۔ کسل مندی اور تن آسانی کو کم کیا جا سکے گا اور ممکن ہے کہ انسان اواخر عمر میں بھی اسی طرح تندرست و توانا، چاق و چوبند اور بحال رہے، جیسا اپنی ابتدائی اور وسطی عمر میں رہتا ہے۔ موت سے قبل تک انسان کا جسمانی [illegible]

کامیابی ہے۔ ماہرین طب اگر صحت کے راز کو سمجھنے میں کامیابی کی طرف بڑھتے رہے تو یہ انسانیت کی بڑی خدمت اور اہم حصول یابی ہے۔ غیر فعال یا غیر تندرست زندگی کے ساتھ موت پر کامیابی کی کوشش مضحکہ خیز ہے اور غیر سود مند بھی۔ موت کے ساتھ چند روزہ پُر مسرت پُر طمانیت اور صحت مند زندگی اس سے زیادہ بہتر ہے کہ موت کے بغیر پوری زندگی عذاب جان اور انتظار موت میں ہو۔ موت پر کامیابی کی کوشش دراصل حیات بعد الموت کے انکار یا کمزور یقین کی پیدائش ہے ورنہ یہ خود ایک اہم موضوع ہے کہ طب کے کن کن مقامات پر موت اور موت کے بعد کی زندگی یقینی بنتی ہے۔ اگر کوششوں کی جہت صحیح ہو تو ایک طرف موت کے بعد کی زندگی حیاتیاتی سائنس سے ثابت ہو سکے گی تو دوسری طرف موت سے قبل کی زندگی زیادہ صحت مند اور خوش گوار۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رہنمائی کے ان تقاضوں کی تکمیل کیسے ہو، جن سے طب کو زیادہ فائدہ مند، اصولی اور با مقصد بنایا جا سکے ہے

نوٹس

علی گڑھ شہر میں بچہ مزدور فلاح سوسائٹی کا قیام عمل میں آگیا ہے، جس کا آفس شوبھا سدن جیل روڈ، علی گڑھ پر واقع ہے۔ اس کے مطابق کارخانہ قانون اور بچہ مزدور قانون ۱۹۸۶ء وغیرہ کی رو سے نکالے گئے بچہ مزدور کو ابتدائی تعلیم، صحت عامہ کی دیکھ ریکھ، اچھا کھانا، تکنیکی ٹریننگ کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔ علی گڑھ ضلع کے سارے بچہ مزدوروں کے خاندانوں سے گزارش ہے کہ مذکورہ بالا سہولیات کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں تاکہ بچہ مزدوروں کی فلاح و بہبود ہو سکے۔

ان کاموں کی دیکھ ریکھ کے لیے آپ کے شہر علی گڑھ میں دو فیلڈ آفیسروں کا تقرر کیا گیا ہے جو تالہ اور میٹل ورکس کے کارخانوں اور معاشی اداروں میں جا کر معائنہ کریں گے اور کارخانوں میں کام کرنے والے بچہ مزدوروں کی حفاظت کے لیے ضروری اقدام بھی کریں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ چودہ برس سے کم عمر کے بچوں سے کارخانوں میں کام نہ کرایا جائے۔ علی گڑھ شہر کے تمام شہریوں سے درخواست ہے کہ ہمارے فیلڈ اسٹاف کو اس اسکیم کے لاگو کرنے میں ہر ممکن تعاون دینے کی مہربانی کریں۔

ایس۔ خورشید احمد
آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
اسکیم ڈائرکٹر / سکریٹری
بچہ مزدور فلاحی سوسائٹی، علی گڑھ یو۔پی

ار۔ کے۔ کمار بٹ
آئی۔اے۔ایس۔ ضلع مجسٹریٹ
چیرمین۔ بچہ مزدور فلاحی سوسائٹی
علی گڑھ یو۔پی۔

اعلیٰ بی — بیگم ڈاکٹر شیخ عبداللہ

محمد اسلم صدیقی*

اعلیٰ بی کا اصل نام وحید جہاں بیگم تھا۔ آپ دہلی کے ایک معزز پڑھے لکھے خاندان کی خاتون تھیں۔ آپ کی شادی ڈاکٹر شیخ عبداللہ بانیٔ ویمنس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہوئی تھی۔ شیخ صاحب ریاست کشمیر کے علاقے پونچھ کے ایک گاؤں کے برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے باپ کا نام مہتہ گورمکھ سنگھ اور شیخ صاحب کا نام ٹھاکر داس تھا۔[1]

شیخ صاحب کی ابتدائی تعلیم اردو فارسی کی ہوئی تھی اور شفیق اور مخلص استادوں کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر ۱۶ برس کی عمر میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے اور تادمِ واپسیں اس پر قایم رہے۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور یہیں رہ بس گئے۔ ابتدا ہی سے سرسید کی نظرِ کرم اور شفقت و توجہ آپ کو حاصل رہی۔ سرسید آپ کے قدرشناس اور بہی خواہ تھے۔ چنانچہ آپ کی ہدایت اور خواہش پر آپ نے علی گڑھ میں قیام کا فیصلہ کیا اور وکالت شروع کی۔ آپ نے اپنے پیشۂ وکالت میں بڑا نام پیدا کیا۔ آپ سرسید کے تعلیمی مشن اور خدمات میں ان کے سچے اور مخلص معاون اور اس کے ہراول دستے میں شامل ہے۔ شیخ عبداللہ نے مسلمان خواتین کی تعلیمی پسماندگی کو شدت سے محسوس کیا اور اس کو دور کرنے اور اس طبقے میں تعلیم کو فروغ دینے کا، باوجود شدید مخالفتوں کے آپ نے بیڑا اُٹھایا اور اس کے لیے ہر ممکن سعی اور کوشش کی۔ آپ کے اس عظیم مشن میں آپ کی وفاشعار بیوی اعلیٰ بی نے ہر طرح پورا پورا تعاون کیا۔ چنانچہ جب بچیوں کے لیے مدرسہ قایم ہوا تو اعلیٰ بی اور ان کے ساتھ ان کی بہنوں سکندر جہاں بیگم اور سعید جہاں بیگم نے بھی بچیوں کو پڑھانا اپنے ذمے لیا۔ اردو اور قرآن شریف اعلیٰ بی پڑھاتی تھیں۔ اعلیٰ بی نے اپنے والد سے فارسی بھی پڑھی تھی۔ اس لیے وہ ابتدائی فارسی بھی پڑھاتی تھیں۔ چونکہ وہ بہت خوش خط تھیں، اس لیے بچیوں کو لکھنے کی مشق بھی وہی کراتی تھیں۔ پھر جب کچھ مالی امداد کا سہارا ملا تو دینی تعلیم کے لیے الگ سے بھی استانیاں مقرر کی گئیں۔ اعلیٰ بی قرآن مجید بہت اچھا پڑھتی تھیں۔ اس لیے بچیاں بھی اُن کی طرح خوب اچھا پڑھا کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو ایک جگہ جمع کر کے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر وعظ دیا کرتی تھیں۔ مدرسہ میں دینی تعلیم لازمی تھی اور اس پر پوری پابندی کے ساتھ توجہ دی جاتی تھی۔ اعلیٰ بی اس پر خاص نظر رکھتی تھیں مگر گھر کے کام کاج کے ساتھ آپ اپنے وقت کا بڑا حصہ ان کاموں میں لگاتی تھیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ

---

* [illegible]، سرسید نگر، علی گڑھ۔

بچیوں کا یہ مدرسہ ترقی کرنے لگا اور دوسرے محلوں اور شہروں سے بھی بچیاں یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنے لگیں۔ مدرسہ میں پردہ کا بڑا اہتمام تھا۔ لڑکیاں پردے میں ڈولیوں اور یکوں پر مدرسہ آتیں تو راستے میں شہدے لفنگے لونڈے قہقہے لگاتے، چھیڑتے اور پردہ کھینچا کرتے یہ بچیوں کی تعلیم کے خلاف عناصر کی شہ پر ہوتا تھا۔ شیخ صاحب نے اس کے تدارک کی یہ تدبیر اختیار کی کہ جس جگہ یہ حرکت ہوتی تھی وہاں جاکر وہ ایک جگہ چھپ کر نگرانی کرنے لگے اور جب لڑکیوں کی ڈولیاں گزرنے لگیں تو ان لفنگوں نے قہقہہ لگایا اور پردہ کھینچنے کو لپکے۔ شیخ صاحب نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر ان سبھوں کو للکارا اور اپنی چھڑی سے ان سبھوں کی خوب مرمت کی۔ وہ سب خوف اور شرمندگی کے ساتھ بھاگ گئے۔ اس واقعے کی خوب شہرت ہوگئی اور پھر کبھی ایسی ناشائستہ حرکت نہیں کی گئی۔ لڑکیاں اطمینان سے بے خوف ہوکر مدرسے آنے لگیں۔ مدرسہ ترقی کرکے جب اسکول بن گیا اور بجائے ڈولی کے پردہ والی لاری کا انتظام ہوگیا تو لڑکیاں لاری پر اسکول آنے لگیں۔ پردے کے بارے میں شیخ صاحب نے اپنی خودنوشت سوانح "مشاہدات و تاثرات" میں لکھا ہے کہ:

> پردہ کے بارے میں بیگم عبداللہ کی ایک مثال میرے دوست خلیل احمد مراد (جو یونیورسٹی میں استاد تھے) سے متعلق ہے کہ ایک مرتبہ لاری خراب ہو گئی۔ لڑکیوں کو یکہ میں بٹھلا کر لانے کی نوبت آگئی۔ بیگم صاحبہ نے ہر ایک یکہ کے ساتھ چپراسی یا کسی عورت کو بھیجنے کا انتظام کیا لیکن ایک یکہ کے ساتھ جانے کے لیے کوئی انتظام نہیں ہو سکا تو وہ خود یکہ پر بیٹھ کر گئیں اور مراد صاحب کی صاحبزادی اور ایک دوسری لڑکی کو اپنے ساتھ لائیں۔ مراد صاحب نے فرمایا کہ جب ایک یکہ میرے مکان پر پہنچا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ خود لڑکی کو لینے آئی ہیں تو میرے دل پر ایک عجیب اثر ہوا کہ اس قدر احتیاط تو شاید لڑکیوں کی مائیں بھی نہیں کرتی ہوں گی۔"[2]

اعلیٰ بی کو پردہ اور حفاظت کا اس درجہ اہتمام اور خیال تھا کہ ساتھ جانے کے لیے جب کوئی نہ ملا تو انھوں نے خود یہ زحمت برداشت کی اور اسکول کی روایات کو قائم رکھنے کے لیے تکلیف اٹھا کر کوشش کی۔

اسکول کے لیے جب بورڈنگ کی عمارت بن گئی تو بخیال حفاظت و نگرانی اور لڑکیوں کی دلجوئی کی خاطر، لڑکیوں کے ساتھ اعلیٰ بی اور چند دوسری استانیاں بھی رہتی تھیں۔ لڑکیوں کی مائیں دوسرے شہروں سے اُن کو لے کر آتیں اور بورڈنگ میں قیام کرکے یہاں کے حالات، اطوار و اخلاق اور انتظام کے علاوہ اعلیٰ بی کی ذاتی توجہ اور نگرانی و انہماک اور بچیوں پر شفقت اور تربیت میں اُن کو مصروف پاکر، وہ مطمئن ہوکر اپنی لڑکیوں کو ان کے سپرد کر دیتیں اور یہ کہہ کر واپس چلی جاتیں کہ،

> "لو بی بی! لڑکی کو اللہ پر چھوڑا اور تمہارے سپرد کیا لیکن اب ہمارے خاندان کی لاج تمہارے ہاتھ ہے۔"[3]

حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ بی، ایثار و قربانی، محبت و شفقت ہمدردی و غم خواری، خلوص و اعلیٰ اخلاق اور پاک سیرت و طینت کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں اور ان کی انھیں اعلیٰ خصوصیات نے لوگوں کو اپنی بچیوں کی تعلیم کی جانب راغب اور آمادہ ہونے کے ہمت و حوصلہ پیدا کیا اور یہ اس دور میں بہت اہم بات تھی۔ اس کی مثال سرسید کے ابتدائی دور میں بھی ملتی ہے۔ اس وقت یہی بات لڑکوں کی تعلیم سے متعلق تھی۔

اعلیٰ بی جہاں لڑکوں کے اخلاق و اطوار اور تعلیم پر کڑی نظر رکھتی تھیں وہیں وہ لڑکیوں کے ساتھ زیادہ سے

زیادہ وقت لگاتیں اور ان میں گھلی ملی رہتی تھیں اور ان کی ہنسی خوشی، رنج و دکھ اور بیماری و آزاری میں ان کی ہر طرح شریک رہتی تھیں۔ کوئی لڑکی بیمار ہو جاتی تو اس کی دیکھ بھال علاج معالجہ اور تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی تھیں۔ بالکل اپنی اولاد کی طرح اپنے آرام و راحت سے بے پرواہ ہو جاتی تھیں اور ماں کی طرح اس کی تیمارداری اور دل جوئی کرتیں اور دعا رس دیتی تھیں۔

بورڈنگ میں ایک لڑکی بیمار ہو گئی۔ شبہ ہوا کہ یہ طاعون میں مبتلا ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ بہت سی لڑکیاں اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ وہ لڑکی بخار کی اذیت اور شدت تکلیف سے بے حال ہو رہی تھی اور سمجھی تھی کہ میں طاعون کا شکار ہو گئی ہوں۔ اس خیال نے اس کو نفسیاتی طور پر بالکل نڈھال اور افسردہ و مایوس کر دیا تھا اعلیٰ بی اپنی کوٹھی سے اس کے پاس آگئیں اور اس کو اپنی گود میں لے کر تسلی اور تشفی دینے لگیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا بخشی اور وہ صحت یاب ہو گئی۔ شیخ صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے اُن سے کہا کہ طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کو اُسے گود میں نہ لینا چاہیے تھا۔ مبادا آپ پر اس کا اثر خدا نخواستہ ہو جاتا۔ اعلیٰ بی نے جواب دیا کہ:

"وہ اس مرض سے اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ ڈر تھا کہ مرض سے نہ سہی تو خوف ہی سے وہ مر جائے گی۔ میرے گود میں لینے سے اس کی ڈھارس بندھی اور اس نے یقین کیا کہ اس کو طاعون نہیں ہوا ہے اور وہ ٹھیک ہو گئی۔"

بعد میں تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کو طاعون کا مرض نہ تھا، لیکن اس پر طاعون کے مرض کا خوف اس شدت سے طاری تھا کہ اگر اعلیٰ بی اس کے ساتھ ایسا سلوک، اپنی جان کی پرواہ نہ کر کے، نہ کرتیں تو اُن کا کہنا صحیح ہو جاتا کہ وہ مرض سے نہیں بلکہ خوف سے مر جاتی۔ اعلیٰ بی کا یہ ایک مثالی کردار ہے۔ ایسی خواتین کمیاب و نایاب ہیں۔ یہی وہ اخلاق و کردار ہے جس نے ہزار مخالفتوں کے باوجود اس کالج کو ملک میں اعلیٰ مقام اور شہرت بخشی۔

اعلیٰ بی بڑی خوبیوں والی خاتون تھیں۔ ان کے تذکرے کے لیے سیکڑوں اوراق ناکافی ہیں۔ وہ نماز و تلاوت کی بھی بڑی پابند تھیں۔ لڑکیوں کے ساتھ نماز پڑھتیں اور ان کو برابر اس کی تاکید اور نصیحت کرتی تھیں۔ لڑکیوں کے لیے کھانا وہ اپنی نگرانی میں پکواتی تھیں۔ ذرا بھی خرابی ہوتی تو باورچی پر سخت خفا ہوتیں۔ حتیٰ کہ اس کو الگ کر دیا کرتی تھیں۔ کھانا تیار ہو جاتا تو پہلے خود چکھتیں اور پھر لڑکیوں کو کھلاتی تھیں۔

اعلیٰ بی گھر اور بورڈنگ کے ملازمین کے یہاں شادی و غمی میں شریک ہو کر ان کی دلجوئی فرماتیں۔ لڑکی کی شادی کا موقع ہوتا تو اس کو جوڑا تیار کر کے دیتیں اور لڑکے کی شادی ہوتی تو اپنی کار سجا کر لے جاتیں اور اپنے ساتھ دلہن کو رخصت کرا کے لاتیں اور اس کو منہ دکھائی میں روپیے دے کر رخصت کرتی تھیں۔ اپنے پرائے، ملازمین اور حاجت مندوں کی فراخ دلی کے ساتھ مدد کرتی تھیں۔ اسکول کی لڑکیاں، استانیاں گھر اور بورڈنگ و اسکول کے ملازم، سب ان سے محبت اور ان کا احترام کرتے تھے اور ان کو اپنا ہمدرد و غم خوار سمجھتے تھے۔

باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر قسم کی آسائش و مال و زر سبھی کچھ عطا کر رکھا تھا لیکن وہ ہمیشہ سادہ لباس استعمال کرتی تھیں۔ قیمتی کپڑے اور زیورات رکھے رہتے تھے مگر شاید ہی کبھی ایک آدھ استعمال کر لیا کرتی تھیں۔ ان کو نام و نمود اور دکھاوے سے نفرت تھی۔ شیخ صاحب کا بیان ہے کہ

"اصلیت یہ ہے کہ عبداللہ بیگم نے اس ابتدائی زمانہ میں اپنی ہم قوم اور ہم وطن بیویوں کے سامنے ایثار اور قومی محبت کا ایک عدیم المثال نمونہ پیش کیا ہے۔"

آگے مزید فرماتے ہیں کہ:

جس بیوی کے اپنے بچے ہوں، خدا نے گھر میں سب
کچھ دیا ہو، نوکر چاکر اور مامائیں بھی ہوں، وہ
دوسروں کی خاطر اپنا ہرا بھرا گھر چھوڑ کر بورڈنگ
ہاؤس کے کمرے میں آ کر رہے۔ اس کی زندگی
اور قربانی واقعی دوسروں کے لیے ایک بڑا
نمونہ ہے۔" ؎

شیخ عبداللہ کا یہ سب کچھ کہنا صرف اس لیے نہ تھا
کہ وہ ان کی بیوی تھیں اور وہ اس لیے ان کی تعریف و توصیف
کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک عدیم المثال خاتون تھیں
اور اس کے معترف تمام واقفان احوال تھے۔ چنانچہ رشید احمد
صدیقی فرماتے ہیں کہ

"بیگم عبداللہ (اعلیٰ بی) نے اس سفر میں دشواریوں
کے جتنے ہفت خواں طے کیے اس کی تلافی، اگر کسی چیز
سے ہو سکتی تھی اور ہوتی تو وہ اس اعلیٰ تربیت
کی مرہون منت ہے جو مسلمان لڑکیوں کی کم و بیش
چار نسلوں کو اس ادارے سے نصیب ہے۔" ؎

مزید ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ ادارہ جس بیش بہا روایات کا امین ہے وہ
تمام تر عبداللہ بیگم کی نیکی، محبت اور شرافت کی
دین ہے۔" ؎

پھر ایک طویل مدت تک مسلسل سعی و جہد اور افکار نے ان
کو تھکا دیا اور وہ خستہ و چور ہو گئیں اور ۱۸ر اگست ۱۹۳۹ء
کو وہ اپنا نیک نام اور کام، یادگار چھوڑ کر آسودۂ خواب راحت
ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور
اعلیٰ مقام جنت الفردوس میں عطا فرمائے

حواشی

۱ تا ۷۔ مشاہدات و تاثرات (تلخیص) ڈاکٹر شیخ عبداللہ

۸ و ۹ ویمنس کالج میگزین بیادگار جشن صد سالہ ولادت بانئ درس گاہ
ڈاکٹر شیخ عبداللہ ۱۹۷۵ء

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے۔ ایک آدمی کو کھڑا دیکھ کر اس کے
متعلق دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ یہ
ابو اسرائیل ہیں۔ انھوں نے منت مانی ہے کہ دھوپ
میں کھڑے رہیں، نہ سایہ لیں، نہ بات کریں نہ بیٹھیں اور
روزے رکھیں۔

آپ نے فرمایا: ان سے کہو بیٹھو، بات کرو،
سایہ لو، اور اپنے روزے کو پورا کرو۔" (بخاری)

تخیلات اور تدابیر نفسانی

ابو وارث جمیل *

طب یونانی کی ایک شاخ نفسیاتی علاج بھی ہے شیخ الرئیس پہلا وہ شخص ہے جس نے باضابطہ طب کا نفسیات سے تعلق قایم کیا جب کہ اطباء یونان دور قدیم سے ہی اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں۔

ابو العباس مجوسی کے مطابق "امراض نفسیانی سے بھی بدن میں تغیرات پیدا ہوتے ہیں جس طرح کہ کبھی کبھی کسی مرض سے تغیرات بدنی پیدا ہوتے ہیں یا کبھی کبھی کسی مرض سے صحت کا سبب عرض نفسانی ہوتا ہے" اس ضمن میں شیخ الرئیس بوعلی سینا کا نظریہ مجوسی کے مذکورہ نظریے سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ جیسا کہ شیخ لکھتا ہے کہ

> "جس طرح بدن نفس سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح نفس بھی بدن سے متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ جو مزاج اور جو خلط بدن میں غالب ہوتی ہے وہ اپنے مناسب نفس میں اخلاط پیدا کر دیتی ہے"

مجوسی کا نظریہ ہے کہ جو لوگ حساس ہوتے ہیں اور کسی واقعہ سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں، وہ انہیں حالات نفسانی کی وجہ سے عشق اور دوسرے خراب اور مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن جو شخص کہ اپنی قوت، عقل و دانش اور نفس پر حاوی ہو اور لطافت و پاکیزگی نفس کے باعث غصّے کے وقت اپنے کو قابو میں رکھے، ایسا شخص ان امراض امراض نفسانی سے محفوظ رہتا ہے اور اگر کبھی متاثر بھی ہوا تو اس میں شدت نہ ہوگی۔

تخیلات و احساسات کا صحتِ انسانی سے گہرا تعلق ہے۔ طبیعت انسانی ان ذہنی تصورات اور تخیلات کی محکوم ہے۔ قوت متخیلہ کا مقام دماغ کے بطن مقدم کا پچھلا حصہ ہے۔ چنانچہ خیال اور وہم اسی سے وابستہ ہوتے ہیں جو جسم پر اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں شیخ الرئیس بوعلی سینا لکھتا ہے کہ:

> "کبھی کبھی تصورات نفسانیہ (خیالی اور وہمی) سے بھی طبعی امور (جسمانی تبدیلیاں) پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے مجامعت کے وقت جس شخص کی صورت کا خیال کیا جاتا ہے، بچہ اسی کے مشابہ پیدا ہوتا ہے اور انزال کے وقت جس چیز پر نظر جاتی ہے اسی رنگ کے قریب قریب بچہ کا رنگ ہوتا ہے۔ اسی طرح تصورات وہمیہ میں ایک یہ بھی ہے کہ

---

* ایم۔ ڈی اسکالر۔ ڈپارٹمنٹ آف کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو علی گڑھ

جب کوئی شخص سرخ چیزوں کی طرف دیکھتا
ہے اور غور کرتا ہے تو اس طرف خون کی حرکت
تیز ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکسیر والوں کو
سرخ چیزوں کی طرف دیکھنے سے منع کیا جاتا ہے۔"
یا کسی ترشی کھانے والے کو دیکھ کر دانتوں کا کھٹے ہو جانا
یا دوسروں کے درد کو دیکھ کر اسی قسم کا درد دیکھنے والے
کے عضو میں ہو جانا۔

نوٹ :- شیخ کا مذکورہ بیان کلیاتی نہیں ہے بلکہ
ایسا اس کا اور دیگر لوگوں کا مشاہدہ ہے۔

کبھی کبھی ڈرانے والی یا خوشی کرنے والی چیزوں
کے تصورات سے بھی مزاج بدل جاتا ہے جیسا کہ علامہ قرشی
کی حکایت سے واضح ہوتا ہے کہ

"کچھ لوگوں نے سفر کیا جو دموی مزاج تھے
رات میں کہیں چوروں کی ایک جماعت مل
گئی جس نے بعض مسافروں کو قتل کیا اور
بعض لوگوں کو لوٹا، چنانچہ ان میں سے جو
بچے وہ دموی سے سوداوی مزاج ہو گئے۔"

علامہ قرشی اسی سے متعلق ایک دوسری حکایت بیان کرتے
ہیں کہ،

ایک شخص کسی مزمن مرض میں گرفتار تھا
اتفاقاً سانپ اسے کاٹنے کے لیے دوڑا
وہ شخص ڈر کر بھاگا جس سے اس کا دیرینہ
مرض یک لخت جاتا رہا۔"

تدابیر نفسانی کے ذریعے حکمائے عرب علاج میں کافی مہارت
رکھتے تھے اور ان تدابیر کے ذریعے طبیب حاذق اپنی حذاقت
اور ذہانت سے آج بھی مریض کا علاج کرتا ہے تدابیر
نفسانی کے ذریعے علاج میں سب سے مشہور و معروف
طریقہ تعدیل مزاج ہے جس کے ذریعے مختلف اقسام کے نفسانی
امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ نفسیاتی کیفیات مثلاً خوشی
اور فرحت، رنج و غم اور غصہ وغیرہ سے صحت انسانی بہت
زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ حکماء کے مطابق بعض امراض مثلاً
اختناق الرحم، دق اور دماغی امراض عموماً جذباتی تناؤ اور
عدم تعادل سے پیدا ہوتے ہیں۔

تدابیر نفسانی کے ذریعے علاج میں اسباب امراض
نفسانی کی بہت اہمیت ہے۔ اکثر و بیشتر اس علاج سے مرض
بغیر دوا اور صرف تدبیر جیسے تعدیل مزاج و ماحولیات
میں تبدیلی اور تسلی و تشفی کے ذریعے مریض کو نفسیاتی طور
پر مطمئن کر دینے سے جاتا رہتا ہے۔ اطبائے یونان اس
سلسلے میں موسیقی، سیاحت، اچھی صحت اور قدرتی مناظر
کے معالجاتی اثرات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ تدابیر نفسانی
کے طور پر کبھی کبھی اعراض نفسانی مثلاً غصہ و رنج، خوشی و
فرحت کو بھی بطور سبب ضد کے طور پر استعمال میں لایا جاتا
ہے۔ غصہ کا استعمال ڈرپوک اور ٹھنڈے مزاج والے
مریض میں جسمانی حرارت کو قوی کر کے اس کے مزاج کو اعتدال
پر لانے اور جرأت پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی
طرح فرحت و خوشی ایسے عوارض نفسانی ہیں جس سے ایسے
مریض کو فائدہ پہنچتا ہے جس پر رنج و غم اور فکر و تردد
کا غلبہ ہو۔ مجوسی اس ضمن میں واقعات کا چشم دید راوی
ہے کہ اس نے ایک گروہ کو دیکھا کہ رنج و غم کہیں ہمیشہ
رہنے سے ان کے بدن گھل گئے اور وہ کمزور ہو گئے تھے
لیکن بعد میں جب انھیں سرور، خوشی اور آسودگی حاصل
ہوئی تو ان کی لاغری اور نقاہت دور ہو گئی اور ان کے
بدن کی فربہی اور تازگی ایسی پلٹی کہ جیسے کبھی آسودہ حالی میں
رہی ہو گی اور اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی دیکھے گئے جو اپنے
امراض لاحقہ سے صرف اس وجہ سے شفایاب ہوئے کہ
جس کا انھیں عشق تھا اس محبوب کا انھیں وصال حاصل
ہو گیا۔ لہٰذا اس سے باور ہوتا ہے کہ طبیعت انسانی ذہنی
تصورات اور تخیلات کی کس قدر محکوم ہے۔

تدابیر نفسانی کے ذریعے علاج کی بہت سی حکایتیں اطبا سے منقول ہیں جیسے کہ رازی کی ایک حکایت ہے کہ

"وہ جب علاج کے لیے خلیفہ امیر منصور کو جو کہ جوڑوں کے درد میں مبتلا تھا، حمام میں لے گیا تو خلیفہ کو گالیاں دینے لگا اور چاقو دکھا کر ہلاک کرنے کی دھمکی دی۔ تاکہ خلیفہ کو غصہ آئے جس سے اس کی حرارت غریزی جو کہ ضعیف ہو گئی تھی، بھڑک اٹھے اور طبیعت مدبرہ بدن قوی ہو کر مادۂ فاسدہ اور نضج یافتہ رطوبات کا دفعیہ کر سکے۔"

اسی طرح نفسیاتی علاج کی ایک حکایت بوعلی سینا کی غیر مطبوعہ تالیف کتاب المبدا والمعاد سے منقول ہے کہ

"ایک بادشاہ کی کنیز جب شاہی دسترخوان کو بچھانے کے لیے جھکی تو اس کے جوڑوں میں درد اور سوجن ہو گئی اور اس کی وجہ سے وہ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا طبیب نے مریضہ کا معائنہ کیا اور علاج شروع کیا۔ پہلے مریضہ کی نقاب اٹھائی پھر اس کے پیرہن پہ ہاتھ ڈالا جس سے مریضہ کا جذبہ حیا جوش میں آگیا۔ جس سے اس کے جسم میں حرارت شدید ہو گئی اور درد کا مادہ تحلیل ہو گیا اور مریضہ صحت یاب ہو کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔"

تدابیر نفسانی سے متعلق شیخ الرئیس بوعلی سینا کے بھی بہت سے معالجاتی واقعات مشہور ہیں۔ شیخ جب محمود غزنوی کے خوف سے چھپ کر جرجان پہنچا تو وہاں کے حاکم کا ایک رشتہ دار جنون میں مبتلا تھا جس کے علاج سے تمام مقامی اطبا عاجز تھے۔ لہذا شیخ کو بھی طبع آزمائی کا موقع ملا۔ اس نے پہلے مریض کا معائنہ کیا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مریض مرض عشق میں گرفتار ہے۔ لہذا اس نے ایک شخص کو طلب کیا کہ وہ مریض کے سامنے سڑکوں اور مقامات کا نام لے اور خود وہ نبض دیکھتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصبہ کی ایک سڑک کا نام آنے پر نبض تیز ہو گئی اور جب سڑک کے قرب وجوار میں رہنے والوں کے ہر خاندان کے افراد کا نام گنایا تو ایک لڑکی کے نام پر نبض دوبارہ تیز ہو گئی۔ اس طرح شیخ الرئیس نے لڑکی کا نام، قصبہ، سڑک، مکان وغیرہ سب دریافت کر لیا اور بتایا کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ یہ لڑکا فلاں لڑکی پر عاشق ہے اور اس کا علاج وصال محبوب ہے۔ لہذا اس لڑکی سے اس کی شادی کرا دی جائے۔

چنانچہ شیخ ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

"اگر مریض عشق محبوبہ کا نام و نشان نہ بتلائے تو ایک ایسا طریقہ ممکن ہے جس سے محبوبہ کا پتہ معلوم کر کے مریض کا علاج کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح پر کہ مریض کی نبض پر طبیب انگلی رکھ کر بہت سے نام لینے شروع کرے اور جب یہ دیکھے کہ کسی ایک نام پر پہنچ کر نبض مختلف ہو گئی ہے اور پھر تقریباً منقطع ہو گئی ہے تو سمجھ لے کہ مریض مرض عشق میں مبتلا ہے جو فلاں معشوقہ کے عشق میں مبتلا ہے۔ میں نے بارہا یہ طریقہ خود آزمایا اور اس طریقے سے محبوبہ کا نام معلوم کر لیا ہے۔"

"اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے، کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھروں (یعنی دنیا) میں انجام کار سے ڈرا کرتے تھے، پس اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیا۔ ہم اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ وہ رحمت والا مہربان ہے۔" (طور ع ۱)

شیخ کی مذکورہ اصل عبارت کا شرف الدین اسماعیل جرجانی نے جو ترجمہ کیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"اگر مریض عشق کی آرزو پوری ہو جائے تو وہ بہت جلد صحت یاب ہو جاتا ہے"۔

اسی طرح شیخ سے متعلق ایک دوسری حکایت مالیخولیا کے مریض کی ہے کہ:

"خاندان بویہ کا ایک شہزادہ مالیخولیا میں مبتلا تھا اور اس کے دماغ میں یہ وہم سما گیا کہ میں گائے ہوں۔ لہذا وہ گائے کی طرح آوازیں کرتا اور کہتا کہ مجھ کو ذبح کر کے میرے گوشت کا مزیدار قیمہ پکاؤ اور کھانا پینا بھی اس نے ترک کر دیا۔ مقامی اطبا اس کا علاج نہ کر سکے۔ لہذا شیخ سے رجوع کیا گیا۔ اس نے پہلے تو مریض کو پیغام بھجوایا کہ قصاب تجھ کو ذبح کرنے آرہا ہے۔ مریض یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد شیخ ایک چھرا لے کر کمرے میں داخل ہوا اور مریض کے ہاتھ پاؤں باندھ کر زمین پر لٹا دیا اور جسم کو ٹٹول کر کہا کہ یہ گائے تو بہت کمزور اور دبلی ہے، ابھی ذبح کرنے کے قابل نہیں۔ ذبح کرنے سے پہلے اسے کھلا پلا کر موٹا کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مریضوں کے عزیزوں نے شیخ کی تجویز کی ہوئی بہترین اور مناسب غذائیں کھلانی شروع کیں جس کے نتیجے میں مریض آہستہ آہستہ تندرست اور قوی ہوتا گیا اور اس کا وہم دور ہو گیا اور اسے صحت کامل حاصل ہو گئی"۔

غرضیکہ مذکورہ بالا حکایات سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ امراض نفسانی کا تخیلات دماغی سے گہرا تعلق ہے۔ لہذا تدبیر نفسانی میں یہ اصول مدنظر رکھا جاتا ہے کہ تبدیلیٔ ماحول کے ذریعے یا گفت و شنید کے ذریعے تخیلات دماغی (تصورات وہم) کو تعدیل کیا جائے یا پھر اعراض سبب ضد پیدا کیا جائے ان سب کے لیے پہلی ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ طبیب مریض کو اپنا ہمدرد اور مہربان ظاہر کرے اور پھر دوسری تدابیر اور معالجہ کی طرف متوجہ ہو۔

ماخذ

کتاب		
کتاب الملکی	مصنف	ابو العباس مجوسی
کتاب القانون فی الطب	"	شیخ الرئیس بوعلی سینا
کتاب عیون الانبا فی الطبقات الاطبا	"	ابن اصیبعہ
طب العرب	"	حکیم نیر واسطی
کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی	"	شرف الدین اسماعیل جرجانی

اخلاقیات ـ ماہیت، مقاصد فائدے

محمد حبیب الحق انصاری*

اخلاقیات، سائنس اور فلسفہ

آج کل یہ رجحان عام ہے کہ علم کو سائنس کے ہم معنیٰ مان لیا جائے لیکن کیا اس صدی کی کروڑہا لوگوں کی جانیں لینے والی عالمی اور منطقائی جنگوں نے دنیا کے کونے کونے میں یہ احساس نہیں پیدا کر دیا کہ علوم طبعیہ ہمیں محض ایک ذریعہ مہیا کرتے ہیں جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان علوم کو صحیح طرح سے استعمال کرنے کی جان کاری بھی حاصل کی جائے ورنہ یہی طبعی علوم جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں؟ اچھے اور بُرے کی تمیز اور اپنے فرض کی پہچان کے مطالعے ہی کا دوسرا نام اخلاقیات ہے۔ اخلاقیاتی امور کی تشریح کے طریقے طبعی علوم میں مستعملہ طریقوں سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔

اخلاقیات کو فلسفے کی ایک شاخ مانا جاتا ہے۔ فلسفے کی طرح اخلاقیات نہایت عمومیت یافتہ امور سے بحث کرتی ہے جو سائنس کے دائرے سے خارج ہوتے ہیں لیکن محض فلسفے کے مقابلے میں اخلاقیات کا تعلق عام لوگوں کی زندگی اور ضرورتوں سے زیادہ قریب کا ہوتا ہے۔ اس لیے اخلاقیات کی نوعیت فلسفے سے ایک تعارف کی سی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اخلاقیات اور طبعی سائنس میں ایک طرح کی مماثلت ہوتی ہے۔ جس طرح طبعی سائنس مشاہدات پر مبنی ہوتی ہے لیکن مختلف مشاہدات کو یکجا کر کے ایک منطقی طور پر متناسک اور تناقص سے عاری کل میں ترتیب اپنے وقت سائنس بعض مشاہدات کو رد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے (جیسے کہ خواب میں دیکھی گئی چیزیں) اسی طرح اخلاقیات ہمارے روزمرہ کے تجربات و مدرکات اور اُن پر مبنی فیصلوں کو باہم اس طرح جٹنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایک منطقی طور پر مضبوط اور تضادات سے عاری نظام بن سکے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ سائنسی حقیقت کو بنیاد مان کر محض منطقی طریقوں سے کسی اخلاقی امر کی صداقت ثابت نہیں کی جا سکتی بلکہ ایسا ثابت کرنے کے لیے ہمیں بالآخر کچھ اور اخلاقیاتی امور کو بلا ثابت کیے ہوئے بدیہی طور پر سچ ماننا پڑتا ہے۔ باضابطہ اخلاقیات میں ہم شروعات عام زندگی کے اخلاقیاتی تصورات سے کرتے ہیں۔ اور یہ دریافت کرتے ہیں کہ کوئی بات صحیح ہے تو وہ کیوں صحیح ہے۔ تاکہ عام زندگی کے اخلاقی تصورات کو یکجا کر کے ان کی اس طرح تزئین، تشریح اور ترکیب کر سکیں کہ ایک منطقی طور پر تناقص سے عاری نظام تشکیل پا جائے۔

اچھائی، ذریعہ اور مقصد

اخلاقیات کے دو بنیادی تصورات 'اچھائی' اور

* ریسرچ آفیسر، فزکس ڈپارٹمنٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فرض کے تصورات ہیں۔ ان کی مناسب سمجھ کے بغیر کسی قسم کا اخلاقیاتی فیصلہ زیرکی کے ساتھ کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ جہاں تک اچھائی کا تعلق ہے، یہ بطور مقصد اور بطور ذریعہ یا بطور دونوں کے ہو سکتی ہے۔ مثلاً بیماری کا علاج کروانے کے لیے آپریشن کرانا ضروری ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپریشن کروانے کے لیے ہی آپریشن کرانا ضروری ہے۔ یعنی یہاں آپریشن کرانا محض ایک ذریعے کے طور پر ہی ایک اچھائی ہے جب کہ مقصد اس ذریعے سے کسی کا صحت پا جانا ہے۔ اس پر یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آیا خود صحت یابی بھی اپنے آپ میں ایک اچھائی یا نیکی کہلائی جا سکتی ہے؟ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات کسی شخص کے دانت یوں خراب ہو جاتے ہیں کہ نہ وہ درد کرتے ہیں نہ روزمرہ کے اس کے کاموں میں مخل ہوتے ہیں تو وہ شخص اُن کی طرف سے بے پرواہی رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحت یابی بھی اپنے آپ ایک اچھائی ہونے کے بجائے ایک ذریعہ ہے دراصل خوش رہنے اور صحت یابی کے ساتھ وہ سارے کام کر سکنے کا جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ خوشی یا نیکی وغیرہ بذات خود اپنے آپ میں اچھائیاں ہیں۔ ایسی چیزوں کو خود اپنے آپ میں اچھی یا بطور مقصد اچھی یا داخلی طور پر یعنی بالذات اچھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی اچھائیاں دیگر اور طرح کی اچھائیوں سے زیادہ بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اخلاقیات، بطور علم کے ایسی ہی اچھائیوں سے بحث کرنے سے متعلق ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سوائے بعض حسین چیزوں کے جنہیں بعض فلسفی اپنے آپ میں اچھی چیزیں مانتے ہیں محض مادی چیزیں اپنے آپ میں اچھی نہیں بلکہ ایک ذریعے کے طور پر ہی اچھی ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، وہ جو اپنے آپ میں اچھا ہو وہ سوائے بعض حسین چیزوں کے یا تو ایک تجربہ ہو سکتا ہے یا زندگی یا ذہن کی کوئی حالت ہو سکتی ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہو وہ ایسی چیز نہیں ہو سکتی جس میں شعور کا کوئی دخل نہ ہوتا ہو۔

اچھائی اور سائنس

اخلاقیات بذات خود کافی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی سے ماہرانہ واقفیت بھی ہمارے لیے ضروری ہوتی ہے۔ وہ اس لیے کہ فطرتی سائنس کے مطالعے سے ہی قوانین فطرت کی معلومات اور ان کے اثرات کی وضاحت ہوتی ہے اور یہ معلومات اس بات کے تعین کے لیے ضروری ہوتی ہیں کہ آیا کوئی چیز یا فعل بطورِ ذریعہ اچھی یا اچھا ہے یا نہیں۔ خود فطرتی سائنس ان معنوں میں اخلاقیاتی طور پر متعادل ہوتی ہے کہ وہی سائنسی جانکاری جو کسی مریض کے علاج میں کارآمد ثابت ہوتی ہے ایک بُرے آدمی کے ہاتھوں مریض کی موت کا باعث بھی ہو سکتی ہے، یہ امر اوپر بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ غرض اچھائی کے مفہوم کے کئی پہلو ہیں۔

فرض شناسی اور سائنس

جہاں تک فرض کے مفہوم کا تعلق ہے اس سے مطلب نہ رکھتے ہوئے کہ مقصد اچھا ہے یا بُرا عموماً فرض سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ وہ کیا بہتر سے بہتر ذرائع ہو سکتے ہیں جن سے اس مقصد کا حصول ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اخلاقیات میں فرض سے مراد ہم یہ لیتے ہیں کہ دی گئی اخلاقی سچویشن میں بہتر سے بہتر طریقہ کار کیا ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر صحیح کام فرض کے زمرے میں آئے۔ مثلاً یہ ایک صحیح کام ہے کہ کوئی اپنے قرضے کی چیک کے ذریعے ادائیگی کر دے لیکن یہ ان معنوں میں فرض نہیں کہ قرضہ چیک ہی سے ادا ہو بلکہ فرض صرف اس قدر ہے کہ کسی بھی طرح قرضہ ادا کر دیا جائے جیسے کہ نقد رقم دے کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

فرض شناسی یعنی کسی دی ہوئی سچویشن میں فیصلہ کرنا کہ کیا کرنا ہے، اس سوال کے جواب پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ مجوزہ عمل کا نتیجہ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ یہاں طریقۂ عمل سے کچھ

اسی طرح کی واقفیت کا ہونا ضروری ہوتا ہے جیسی کہ فطرتی سائنس سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ سائنس کے ذریعے وہ علتی قوانین واضح ہوتے ہیں جن سے نتائج کی نشاندہی ہوتی ہے اور تب اخلاقیات کی مدد سے یہ فیصلہ ہوسکتا ہے کہ آیا وہ نتائج اچھے ہیں کہ برے۔ مثال کے طور پر کسی معذور کا علاج کرنے میں دو طرح کے ملحوظات سامنے آتے ہیں ایک سائنسی دوسرے اخلاقیاتی۔ اخلاقیاتی بات تو یہ کہ معذور کو اچھا کرنا چاہیے اور سائنسی بات یہ کہ وہ کیا بہتر سے بہتر علاج ہوسکتا ہے جو اس معذور کو اچھا کر دے گا۔ اس مثال میں اخلاقیاتی پہلو کوئی خاص مسئلہ نہیں پیدا کرتا لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ طریقۂ علاج کا سائنسی پہلو ایک نہایت مشکل مسئلہ ثابت ہو جائے۔ البتہ ایسی صورتِ حال ہمیشہ نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ایٹمی ہتھیاروں کی بابت جہاں ایک پہلو یہ ہوسکتا ہے کہ بہتر سے بہتر ایٹمی ہتھیار کیا ہیں، وہاں دوسرا پہلو جو خالص اخلاقیاتی نوعیت رکھتا ہے، یہ ہوتا ہے کہ آیا ہم ان ہتھیاروں کو استعمال بھی کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو کب؟ یہ آخر الذکر دورِ حاضر کا کس قدر مشکل طلب مسئلہ ہے، سب کو بخوبی معلوم ہے۔

مشاورتی کردار

مذکورہ باتوں سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اخلاقیات محض ایک مشاورتی رول ادا کرتی ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا لیکن یہ بھی کوئی کم اہم رول نہیں کہا جاسکتا جس کسی شخص نے اخلاقیات کا باضابطہ مطالعہ کیا ہو وہ کم از کم کسی سچویشن کے مختلف پہلوؤں کو پرکھنے کے سلسلے میں صحیح قسم کے سوالات تو پوچھ ہی سکتا ہے اور ابتدائی نوعیت کے ذہنی خلفشاروں سے بچ سکتا ہے۔ خود اس کام کے کرنے کی ترغیب دلانا جسے ہم جانتے ہیں کہ کرنا چاہیے مبلغ کا اور مقرر کا نہ کہ خالصتاً عالم الاخلاق کا ذمہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اخلاقیات اسی معاملے میں خود مکتفی ہوتی کہ بذاتِ خود بتاسکے کہ کسی سچویشن میں ہمارا فرض کیا ہے تو نہ صرف یہ کہ یہ الگ عملی سائنس ہوتی بلکہ فقط یہی ایک عملی سائنس ہوتی جب کہ جیسا کہ اوپر سے واضح ہے، ایسا بالکل نہیں ہے۔

غیر قابلِ تخفیف

اخلاقیات کی بنیادی اصطلاحیں جیسے کہ 'اچھا' یا 'فرض' وغیرہ کسی اور غیر اخلاقیاتی تصورات کی اصطلاح میں بیان نہیں کی جاسکتیں۔ یعنی یہ ایک بدیہی، بنیادی طور پر غیر قابلِ تحلیل و تخفیف ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر "اچھے" سے مراد یہ لی جائے کہ "وہ جو انسان چاہتے ہیں"، تو اخلاقیات محض نفسیات کی ایک شاخ بن جاتی ہے۔ اگر "اچھے" کی تعریف یوں ہوتی کہ "وہ جو فطرتی ارتقا کے عمل سے ہم آہنگ ہو" تو اخلاقیات صرف حیاتیات کا ایک جز بن کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر "اچھے" کی تعریف یوں ہو کہ "وہ جو ایک مستقر سماج کے قیام میں مددگار ہو" تو اخلاقیات سماجیات کا جزو بن جائے گی وغیرہ۔ اس طرح کے نظریات مختلف زمانوں میں مختلف لوگوں نے پیش کیے جو سب کے سب

والدین کی خدمت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی ناک خاک آلودہ ہو جس نے اپنے ماں باپ کے بڑھاپے کو پایا اور جنت میں نہ داخل ہوا۔" [یعنی اُن کی خدمت و فرمانبرداری کر کے جنت کا مستحق نہ ہوا]

مسلم شریف

زیادہ ترکسی قدر سادہ لوحی پر مبنی تھے۔ ہمارے لیے یہ ناموزوں ہوگا کہ اس طرح کی باتوں کو بطور "اچھے" کی تعریف کے شروع ہی میں بدیہے کے طور پر مان لیں۔ بعض اور حضرات "اچھے" کی تعریف یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ
"وہ جو خدا چاہتا ہے"
اگر لفظ "اچھے" کے کل معنیٰ محض اسی قدر ہوتے تو اخلاقیات، الٰہیات کا ایک 'جزو' ہی نہیں رہتی لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

ہم اچھائی کی مذکورہ بالا معنوں میں لفظوں سے منطقی تعریف تو نہیں کر سکتے، لیکن ایسا نہیں کہ ہم نے اچھائی کو کبھی بھی محسوس کر کے 'سمجھا نہیں ہے' اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اس کی بابت اس لیے کچھ نہیں جانتے۔ ہم بہت کچھ جانتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ اخلاقیاتی تصورات کو دیگر غیر اخلاقیاتی تصورات میں تخفیف دے دیں۔

خلاصہ

اس طرح ہم نے دیکھا کہ اچھائی مقصد میں بھی ہو سکتی ہے، ذریعے میں بھی اور دونوں میں بھی۔ بہتر سے بہتر ذریعہ متعین کرنے کے لیے سائنسی جان کاری درکار ہوتی ہے فرض کی نشان دہی بہتر سے بہتر ذریعے سے مقصد کی تکمیل کے تعین سے ہوتی ہے، اس لیے یہاں بھی سائنسی جان کاری درکار ہوتی ہے۔ اخلاقیاتی بنیادی تصورات کی تعریف الٰہی غیر اخلاقیاتی تصورات میں تخفیف دے کر نہیں کی جا سکتی اور ایسا نہیں ہوتا کہ اور اخلاقیات کسی اور دوسری سائنس میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت کھو دے اخلاقیات کے باضابطہ مطالعے کی شروعات ہم عوام الناس کے اچھے اور برے اور فرض اور کوتاہی کے عام فہم تصورات سے کر کے ایک ایسے متماسک اور تضادات سے عاری نظام کی تشکیل پر ختم کرتے ہیں، جہاں یہی عام فہم تصورات اصلاح پا کر زیادہ قابل اعتماد اور کارگر روپ دھار لیتے ہیں۔ اخلاقیات کے مختلف نظریوں سے بحث آئندہ مضامین میں کی جائے گی۔

"دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اٹھایا ہے مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے"۔

سرسیدؒ

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پرنٹر پبلشر: اسرار احمد۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات اے ایم یو علی گڑھ۔ پریس: ایس کے آفسیٹ پریس، دہلی

Tahzibul Akhlaq December 1989 Regd. No. L/ALG 343/88 Ph. : 4827